یادگار حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ

عصمت کراچی

پاکیزہ خیالات علمی، ادبی مضامین اور مفید معلومات کا ماہوار ذخیرہ

مسلسل اشاعت کا ستاونواں سال

سالگرہ نمبر ۱۹۶۴ء

نمبر ۱ و ۲ کل نمبر ۹۷۷	جولائی و اگست ۱۹۶۴ء	جلد ۱۱۳

فہرست مضامین

چندہ سالانہ پیشگی
مع سوانح عمری علامہ راشد الخیری
۱۵ روپیہ
غیر ممالک سے ۲۰ روپے
قیمت سوانح عمری ۱۰ روپے (سفید کاغذ ۱۸ روپے)

دکن
انجمن ادبی رسائل
پاکستان

ٹیلیفون نمبر
دفتر ۷۳۲۶۲
گھر ۷۰۸۳۳

دفتر کا پتہ۔ نزد قیصر سینما۔ براہ بندر روڈ۔ کراچی نمبر ۳

باہتمام رازق الخیری ایڈیٹر۔ پرنٹر۔ پبلشر۔ مشہور آفسٹ پریس میں چھپکر دفتر عصمت کراچی نمبر ۳ سے شائع ہوا

چند باتیں

خدائے بزرگ و برتر کا احسان ہے کہ عِصمت نے چھپنواں سال بھی پورا کر لیا۔ برصغیر کے رسالوں کی تاریخ میں ایک اصلاحی ادبی رسالہ کا اتنی مدت تک زندہ رہنا حیرت انگیز اور تعجب خیز کہا جا سکتا ہے۔ اُردو زبان کا کوئی ماہنامہ نہیں جو مسلسل نصف صدی سے نکل رہا ہو اور پاکستان بھر میں ایک پرچہ بھی عِصمت سے پرانا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس ۵٦ سال کی طویل مدت میں عِصمت کو بڑے بڑے طوفانوں اور زلزلوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ تمدن پریس کی ضمانت (۱۹۱۲ء) پہلی آتش زدگی (۱۹۱٦ء) پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) دوسری آتش زدگی (۱۹۱۸ء) خاتون اکرم کی جواں مرگی (۱۹۲۲ء) ایک خطرناک سازش (۱۹۳۴ء) بانیٔ عِصمت کی رحلت (۱۹۳٦ء) دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) ہجرت (۱۹۴۷ء) پاکستان اور بھارت کے درمیان وی پی منی آڈر کا سلسلہ منقطع ہو جانا (۱۹۴۹ء) دفتر میں چوری (۱۹۵۰ء) کتابوں کے گودام میں آگ (۱۹۵۰ء) کاغذ کی نایابی اور اشتہارات کی کمیابی (۱۹۵۳-۵۴ء) اور پھر (۱۹٦۳-٦۴ء) حادثات کی بھی حد ہوتی ہے۔ کتنی ہی دفعہ عِصمت کی کی زندگی کے لالے پڑ پڑ گئے مگر ایسی سبھ گھڑی میں ایسی نیک نیتی سے علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ نے عِصمت جاری کیا تھا کہ حوادث کی آندھیاں بھی چلیں اور مصائب کی بجلیاں بھی گریں مگر یہ سخت جان پرچہ نکل رہا ہے کسی مہینہ بھی ایک دن کی تاخیر ہوئے بغیر اپنی روایتی پابندیٔ وقت سے نکلا چلا جا رہا ہے اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اور نکلتا رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ اُردو زبان و ادب ملک و قوم اور طبقہ نسواں کی کسی نہ کسی حد تک اس سے خدمت لینی چاہے گا۔

اور اب شروع ہوتا ہے ستاونواں سال!
اور اس سالگرہ پر پیش کی جا رہی ہے خواتین پاکستان و بھارت کے محسن اعظم، مشرق کے جامع حیثیات مصنف بانیٔ عِصمت حضرت علامہ راشد الخیری کی سوانح عمری! عِصمت کی یہ اشاعت ضخامت کے اعتبار سے نہیں ادبی لحاظ سے بھی ایک وزن رکھتی ہے۔

سوانح عمری ڈیڑھ سال میں میں نے لکھ لی تھی لیکن اعلان کے مطابق وقت مقررہ پر اس کا شائع ہونا بہت مشکل تھا اگر "کمیٹی فار پروڈکشن آف سیلکٹڈ میٹیریلز"[1] تعاون نہ کرتی۔ جناب اختر حسین صاحب سی ایس پی۔ مرکزی وزارت تعلیم کے ڈپٹی سکریٹری شیخ چاند صاحب اور رائٹرز گلڈ کے سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی صاحب اور نیشنل بک سنٹر کے سکریٹری ابن انشا صاحب نے عِصمت کے اس سالگرہ نمبر کی اشاعت میں جس دلچسپی کا اظہار کیا اس کے لئے میں ان حضرات کا ممنون ہوں۔

رازق الخیری

[1] مرکزی وزارت تعلیم کی خصوصی کمیٹی برائے منتخب ادب

خاتونِ اکرم عصمتی انعامات

جون [illegible] کے عصمت میں آخری صفحوں پر عصمت کے چھتیسویں سال کے مضمون نگاروں اور اُن کے مضامین کی جو فہرست شائع کی گئی ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اس سال کے .. مضمون نگاروں میں سے ۵۷ خواتین ہیں یہ تعداد سالہائے گذشتہ کے مقابلہ میں زیادہ نہیں ہے۔ ان ۵۷ خواتین میں عصمت کی مخصوص و ممتاز مضمون نگار بھی ہیں اور نئی لکھنے والیاں بھی۔ عصمت مرحومہ خاتون اکرم کی یاد میں ۳۹ برس سے مضمون نگار خواتین میں انعامات تقسیم کرتا ہے۔ یہ انعامات مختلف موضوعوں پر دئے جاتے ہیں اور تقسیم صرف اُن خواتین میں کئے جاتے ہیں جن کے سال بھر میں ۴ مضمون سے کم شائع نہ ہوئے ہوں۔

خانہ داری پر ہر سال کی طرح اس سال بھی کارآمد مضامین شائع ہوئے مگر کم سے کم چار مضامین جن خواتین کے شائع ہوئے ہیں اُن میں محترمہ نفیس فاطمہ صدیقی کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن پر ۵ روپیہ انعام دیا جاتا ہے۔

سنگھار و آرائش پر کئی اچھے اچھے مضامین چھپے ہیں مگر اُن کے نہیں جن کے مضامین گنتی میں کم سے کم ۴ ہیں۔

معاشرتی تمدنی مضامین۔ ہر سال بہت اچھے شائع ہوتے ہیں۔ اس سال کے مضامین میں محترمات ع۔ا۔ مسز الطاف حسین اور رخشندہ ناہید کے مضامین ۱۰-۱۰ روپیہ کے انعام کے مستحق ہیں۔ آمنہ نازلی صاحبہ کا مضمون [illegible] یہ طاقت (جنوری) بھی

بچوں کی پرورش اور تربیت کے سلسلہ میں اس سال کچھ زیادہ مضامین شائع نہیں ہوئے۔ تاہم بچوں کا کلب (اگست) از محترمہ بیگم صوفی۔ اور بچوں کا اغوا (دسمبر) از محترمہ و۔ا۔ ۱۰-۱۰ روپیہ کے انعام کے مستحق ہیں۔

تاریخی تحقیقی مضامین اس سال کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں چھپے۔ محمودہ رضویہ صاحبہ کو ان کے مضامین پر ۱۰ روپیہ دئے جاتے ہیں۔

ملکی غیر ملکی حالات اور سیر و سیاحت کے مضامین کے لحاظ سے یہ سال بھی خاصا اچھا رہا۔ محترمات بیگم صوفی، مسز [illegible] اور عابدہ معین صاحبہ کو ان کے مضامین پر ۱۰-۱۰ روپیہ دئے جاتے ہیں۔

مذہبی مضامین۔ جن خواتین کے کم سے کم ۴ شائع ہوئے ان میں رخشندہ ناہید صاحبہ کی خدمت میں ۱۰ روپیہ پیش کئے جاتے ہیں۔

اخلاقی مضامین۔ اس سال بھی محترمہ و۔ا۔ صاحبہ کے قابل ذکر ہیں اور دس روپیہ کے انعام کے مستحق۔

صنعت و حرفت کے سلسلہ میں رخشندہ ناہید صاحبہ کا مضمون ملکی مصنوعات کی بے وقعتی (نومبر) اچھا مضمون ہے جس پر دس روپیہ دئے جاتے ہیں۔

تنقیدی مضامین کے اعتبار سے یہ سال معمولی رہا اور قابل انعام کوئی مضمون شائع نہیں ہوا اسی طرح تعلیمی مضامین میں بھی کوئی خاص مضمون قابل ذکر نہیں۔

صحت اور تندرستی کے موضوع پر کئی مفید مضامین شائع ہوئے۔ دس روپیہ محمودہ حق صاحبہ کو میٹھی نیند (اپریل) پر دئے جاتے ہیں۔

افسانے۔ محترمہ نند سجاد حیدر کا طویل افسانہ ہار جیت (سالگرہ نمبر) عام طور پر پسند کیا گیا۔ آمنہ نازلی صاحبہ کے

بھی ۳ افسانے اس سال شائع ہوئے ان دونوں کی خدمت میں ۱۵-۱۵ روپیہ پیش کئے جاتے ہیں ان کے علاوہ نفیس فاطمہ صاحبہ بھی اپنے افسانوں پر ۱۰ روپیہ کے انعام کی مستحق ہیں۔ ڈرامے کئی شائع ہوئے مگر خواتین کا لکھا ہوا کوئی اس سال نہیں چھپا۔

ترجموں میں محمودہ حق صاحبہ کے ترجمے اچھے رہے جن پر ۱۰ روپیہ انعام دیا جاتا ہے۔

نظموں کے اعتبار سے یہ سال زیادہ قابل تعریف نہیں رہا۔ اس سال بھی محترمات جہاں آرا چودہری۔ آمنہ حزیں اور رضیہ انور ۱۰-۱۰ روپیہ کے انعام کی مستحق ہیں۔

تعداد مضامین۔ سب سے زیادہ گنتی میں ۱۱ مضامین ۱۰ صاحبہ کے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے بعد ۰ مضامین بیگم صوفی صاحبہ کے ہیں۔ تیسرا نمبر ہے مسز الطاف حسین صاحبہ کا جن کے مضامین ۹ شائع ہوئے یہ تینوں علی الترتیب ۲۰-۱۵ اور ۱۰ روپے کے انعام کی مستحق ہیں۔

محترمات۔ امت الوحی۔ بنی فاطمہ۔ نصرت اکرم کا اگر ایک ایک مضمون اور شائع ہو جاتا تو اُن کے مضامین بھی انعامی مقابلے میں پیش نظر ہوتے۔ ان تینوں کے دو دو مضمون بہت اچھے ہیں تینوں عصمت کی پرانی لکھنے والیاں ہیں اور ان کی سلیقہ شعاری قلمی اعانت کا تقاضہ ہے کہ ان کے مضامین بالکل ہی نظر انداز نہ کئے جائیں۔ لہٰذا ۱۰-۱۰ روپیہ ان کی خدمت میں بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

مالیت کے اعتبار سے یہ نہایت ہی حقیر انعامات ہیں اور ۳۰-۳۵ سال پہلے کے مقابلہ میں جب ۵ روپیہ کی بھی وہ قیمت تھی جو آج ۱۵ روپیہ کی نہیں اس قدر حقیر رقموں کو انعام کہتے ہوئے شرم آتی ہے تاہم یہ انعامات چونکہ انعامی مقابلہ میں پیش کئے جاتے ہیں اس لئے امید ہے وقعت کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔

۵۶ چھپنویں سال کے
خاتون اکرم عصمتی انعامات

۱-و-۱- بلقیس بیگم صاحبہ منشی کامل ۱۰+۱۰+۱۰+۲۰=۵۰ روپے
۲- بیگم پاشا صوفی صاحبہ ایم اے تمغۂ خدمت ۱۰+۱۰+۱۵=۳۵
۳- رخشندہ ناہید صاحبہ لاہور ۱۰+۱۰+۱۰=۳۰
۴- آمنہ نازلی صاحبہ ادیب فاضل ۱۰+۵ =۲۵
۵- نفیس فاطمہ صاحبہ صدیقی بدایوں ۱۵+ =۲۵
۶- مسز الطاف حسین صاحبہ راولپنڈی ۱۰+۱۰ =۲۰
۷- محمودہ حق صاحبہ بی اے ملتان ۱۰+۱۰ =۲۰
۸- نذر سجاد حیدر صاحبہ بمبئی ۱۵
۹- مسز برلاس صاحبہ مصنفہ افغان اشرف ۱۰
۱۰- محمودہ رضویہ صاحبہ ایم اے منشی فاضل ۱۰
۱۱- امت الوحی صاحبہ مصنفہ شہید وفا ۱۰
۱۲- بنی فاطمہ صاحبہ کراچی ۱۰
۱۳- عابدہ معین صاحبہ کراچی ۱۰
۱۴- نصرت اکرم صاحبہ بی اے لاہور ۱۰
۱۵- رضیہ انور صاحبہ امروہوی ۱۰
۱۶- جہاں آرا چودہری صاحبہ ڈھاکہ ۱۰
۱۷- آمنہ نفاست حزیں صاحبہ بی اے پرتاب گڑھ ۱۰

رازق الخیری

۵۶ چھپنویں سال کے مضمون نگار

۱۰۰۔ بلقیس بیگم صاحبہ (منشی کالا) عصمت کی مخصوص مضمون نگار ہیں بہت ممتاز درجے کی لکھنے والی ہیں ۳۹-۴۰ سال سے ان کے مضامین شائع ہو رہے ہیں اور اس طویل مدت میں ان کا شاید ایک مضمون بھی ناقابلِ اشاعت قرار نہیں پایا۔ پیرایۂ بیان عام فہم ہے اور باتوں ہی باتوں میں بڑے کام کی باتیں اپنے مضامین میں لکھتی ہیں جو ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔

بیگم پاشا صوفی ایم۔اے تعلیمی مسائل سے دلچسپی کے لئے تہائی صدی سے برصغیر پاکستان اور بھارت میں مشہور ہیں۔ سماجی بہبود کے لئے بھی انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ ان کے مضامین سے معلومات میں دلچسپ اضافہ ہوتا ہے۔ تحریر میں روانی اور برجستگی ہے۔

رخشندہ ناہید صاحبہ قلمی نام ہے۔ تیس چالیس سال سے اخلاقی معاشرتی مسائل پر لکھ رہی ہیں اور دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ اسلامی معاشرت پر مغربی تہذیب کی جو کاری ضرب پڑ رہی ہے اس سے بہت متاثر ہیں۔ ان کے مضامین ایک سچے مسلمان کے دکھے ہوئے دل کی آواز ہوتے ہیں۔

آمنہ نازلی صاحبہ اُردو کی تمام اہلِ قلم خواتین میں مختصر نویسی کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ اسلوبِ نگارش میں دلکشی اور جاذبیت ہے۔ مختصر ڈرامے لکھنے تو انھوں نے چھوڑ ہی دئے۔ مختصر افسانے اس سال بھی ان کے تین چار شائع ہوئے ہیں۔ گنتی میں ان کے مضامین اس سال توقع سے کم شائع ہوئے۔

نفیس فاطمہ صاحبہ صدیقی بدایونی بیٹی ہیں عصمت کے مشہور و معروف حضرت مولانا احسن مجید صدیقی بدایونی مرحوم کی اور بہن ہیں مرحومہ تسنیم جہاں بدایونی کی۔ ان کے مضامین کئی سال سے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ مختلف موضوعوں پر لکھتی ہیں کارآمد مضامین بھی اور دلچسپ نتیجہ خیز افسانے بھی۔

مسز الطاف حسین صاحبہ کے مضامین معقول تعداد میں اس سال بھی شائع ہوئے ہیں جن میں کئی مضمون بہت دلچسپ ہیں۔ تمدنی معاشرتی مسائل پر ان کی گرفت کچھ نہ کچھ وزن ضرور رکھتی ہیں اور خشک پیرایہ میں نہیں دلاویز انداز میں خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

محمودہ حق صاحبہ بی اے کے پہلے زیادہ ترجمے چھپتے تھے اب طبع زاد مضامین بھی لکھتی ہیں۔ ترجمہ بہت سلیقے سے کرتی ہیں۔ اور طبع زاد مضامین کسی نہ کسی دلچسپ مگر مفید موضوع پر ہوتے ہیں۔ افسانے بھی خاصے اچھے لکھنے لگی ہیں۔

نذر سجاد حیدر صاحبہ عصمت کی سب سے پرانی لکھنے والی ہیں اور خواتین میں سب سے پہلی ناول نگار اور سب سے پہلی افسانہ نگار۔ عصمت سے ان کی محبت اور وضعداری کا یہ عالم ہے کہ مدت سے صحت خراب ہے مگر اس حالت میں بھی عصمت کو یاد رکھتی ہیں پچھلے سال

چند روز کے لئے طبیعت سنبھلی تو عصمت کے سالگرہ نمبر کے لئے ایک طویل افسانہ لکھوا کر عنایت فرمایا۔ ان کی خود گذشت داستان حیات جو ایام گذشتہ کے عنوان سے کئی سال سے عصمت میں شائع ہو رہی ہے غیر معمولی دلچسپی سے دیکھی جاتی ہے۔

مسز برلاس صاحبہ تقسیم ہند سے قبل جب جاپان میں تھیں تو مسلسل کئی سال عصمت کی بیش قیمت قلمی اعانت انھوں نے کی تھی۔ اب بھی عصمت کو نہیں بھولیں۔ ان کی تحریر میں روانی ہے اور خیالات میں وسعت۔

محمودیہ رضویہ صاحبہ ایم اے۔ منشی فاضل ایک درجن سے زیادہ کتابوں کی مصنفہ اور عصمت کی قدیم لکھنے والیوں میں سے ہیں۔ خیالی مضامین بھی لکھتی ہیں اور تحقیقی تاریخی مضامین بھی دلچسپ پیرایہ میں۔

امت الوحی صاحبہ عصمت کی مخصوص و ممتاز لکھنے والیوں میں سے ہیں۔ ان کے مضامین زیادہ تر مذہبی رنگ میں اصلاحی ہوتے ہیں مگر غیر دلچسپ نہیں۔ و۔ل صاحبہ کی طرح یہ بھی اپنے تجربے اور مشاہدے دل نشین انداز میں قلمبند کرتی ہیں اور غور و فکر کے بعد اس لئے ان کے مضامین قابل قدر ہوتے ہیں۔

بی فاطمہ صاحبہ بھی پرانی مضمون نگار ہیں۔ دیہاتی زندگی کے متعلق ان کے کئی نہایت دلچسپ مضامین شائع ہوئے ہیں خانہ داری اور حفظان صحت پر بھی ان کے مضامین میں نہایت مفید معلومات ہوتی ہیں۔

عابدہ معین صاحبہ کئی سال سے دلچسپ مضامین لکھ رہی ہیں "یہ کراچی ہے" یہ سلسلہ بھی بہت دلچسپ ہے اور معلومات سے پُر۔ ان کے مشاہدات اور تاثرات دلاویز بھی ہیں نتیجہ خیز بھی

نصرت اکرم صاحبہ کی خاموشی پندرہ بیس سال بعد ٹوٹی تو انھوں نے پچھلے تین چار سال میں بڑے اچھے اچھے مضامین لکھے اور عمدہ عمدہ ترجمے کئے سماجی بہبود کے کاموں کے انہماک میں اس سال ان کے مضامین افسوس ہے بہت کم شائع ہوئے۔

رضیہ انور صاحبہ امروہوی کی نظمیں اس سال خاص تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کی بعض نظمیں تاثیر میں ڈوبی ہوتی ہیں۔

جہاں آرا صاحبہ چودہری کی نظمیں اس سال بھی خلاف توقع کم چھپیں۔ ان کی شاعری کا یہ اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے امہات المومنین کے حالات نظم کئے ہیں۔

آمنہ نفاست حزیں صاحبہ کی نظمیں دو تین سال سے شائع ہو رہی ہیں۔ امید ہے مستقبل میں کامیاب شعرا میں ان کا شمار ہوگا۔

محترمات۔ جمیلہ بیگم کلکتہ۔ زینب گلشن مورن۔ سلمیٰ کمال الدین حیدر آباد دکن۔ ثریا فیروز ایم اے۔ سیدہ نفیسہ دہلوی۔ عفیفہ ناصر حیدر آباد دکن۔ زبیدہ زریں۔ ظفر جہاں بیگم۔ مہر آرا شیخ کے مضامین اس سال خلاف توقع بہت کم شائع ہوئے۔ نئی لکھنے والیوں میں محترمات بیگم عبد اللطیف خاں۔ بیگم منور علی۔ ذکیہ سردار۔ طاہرہ نقوی۔ فیض النساء مدراسی۔ مسز رئیسہ طالبی۔ نور جہاں تنویر کے مضامین ہمیں خوشی ہوگی اگر آئندہ بھی شائع ہوں گے۔

مرد مضمون نگاروں میں حضرات امام اکبر آبادی۔ ڈاکٹر سید آل مرتضیٰ بلگرامی۔ مولانا عبد الغفار الخیری۔ مولانا حامد حسین قادری۔ سردار دیوان سنگھ مفتون۔ خان بہادر تقی محمد خاں۔ میجر ابن حسن شارق۔ حاجی جوہر۔ آغا صادق۔ سید صفا احمد جعفری خواجہ فضل احمد شیدا دہلوی۔ انور عنایت اللہ۔ اکرم علی اختر امرتسری۔ قاضی عباس حسین ظریف دہلوی۔ سید علی ہاشمی۔ چودہری عبد الحق (کوئٹہ) مصلح الدین احمد اور پروفیسر نور مجیانہ خاص طور پر ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ۱۴ اپنے مضامین یا کلام منظوم سے اوراق عصمت کی زینت بڑھائی۔

رازق الخیری

سوانح عمری علامہ راشد الخیری

از

رازق الخیری

دیباچہ

۱۹۳۶ء میں جب میں سایۂ پدری سے محروم ہوگیا تو بہت کچھ خدمات انجام دینی تھیں ان میں والد مرحوم کی سوانح عمری کی اشاعت باقی رہ گئی تھی۔ شدید مشکلات تھیں کچھ دشواریاں کچھ پریشانیاں تھیں، کچھ مجبوریاں مگر رب العزت! کس قلم سے اور کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں کہ تونے اپنے اس عاجز اور ناتواں بے بضاعت اور بے سروسامان بندۂ ناچار کے اس وعدہ کی بھی اپنے فضل وکرم سے لاج رکھ لی۔

مذہبی اور سیاسی رہنماؤں، تاریخی شخصیتوں اور بزرگانِ ادب کی سوانح عمریوں میں گھریلو زندگی کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور ۸۰-۹۰ فیصدی اوراق میں گھر سے باہر کی زندگی کے واقعات اور کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔ علامہ راشد الخیری کے ادب کا ۹۰ فی صدی حصہ مبنی ہے معاشرت پر اور اُن کی تصانیف میں پاکستان اور بھارت کے مختلف طبقوں اور مختلف حیثیتوں کے گھرانوں کی حالت دکھائی گئی ہے۔ علامہ مغفور نے مسلسل ۴۰ سال تک اصلاح معاشرت ہی کے لئے تو جہاد کیا۔ ان کی سوانح عمری کی خصوصیت یہ ہے کہ خود ان کی گھریلو زندگی کے واقعات وضاحت سے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کی اصلی زندگی وہی ہے جو وہ اپنے گھر میں گذارتا ہے۔ بعض واقعات افسانہ کے رنگ میں ہیں تو یہ لکھنے والے کا اسلوب تحریر ہے۔ اس صدی میں تمدن نے وہ کینچلی بدلی اور تہذیب نے وہ پلٹا کھایا کہ یوں بھی اس سوانح عمری کے بعض واقعات قصے کہانیاں ہی معلوم ہوں گے حالانکہ ہر واقعہ مبنی بر حقیقت ہے۔

مصورِ غم علیہ الرحمۃ کی معاشرتی تصانیف کے کردار خیالی یا غیر حقیقی نہیں ہیں۔ کچھ آس پاس گرد و پیش کے تھے، کچھ خاندان اور کنبہ کے۔ اس لحاظ سے خاندانی حالات دلچسپی کا باعث ہوسکتے ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ ان میں اُن بزرگوں کا ذکر ہے جن کی تربیت اور صحبت انھیں ملی اور اس معاشرہ کا بھی جس میں ان کے کالے بھنور بال بگلے کا پر ہوئے تھے۔

اُن کی عادات وخصائل کا گھریلو واقعات سے بہت کچھ اندازہ ہوتا ہے تاہم جن لوگوں کو اُن سے سابقہ پڑتا اور واسطہ رہتا تھا خود ان کے بیانات اور تاثرات "سیرت" کے تحت دئے گئے ہیں اس طرح علامہ مغفور کی سیرۃ کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا۔

سوانح عمری کے علمی حصہ میں مصورِ غم کے ادب پر اہل قلم کے تحقیقی تنقیدی تبصرے اور رائیں اور موقع موقع سے تصنیفات کے اقتباسات کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے اور خاص طور پر یونیورسٹیوں کے طلبا اور ان حضرات کے لئے مفید ہوں گے جو علامہ مغفور کے متعلق کسی موضوع پر تحقیقی کام کر رہے ہیں اور آئندہ کریں گے۔

علامہ راشد الخیری اور حقوقِ نسواں اور اصلاح نسواں یہ دو موضوع ایسے ہیں کہ ان پر الگ الگ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں تاہم جو اقتباسات دئے گئے ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے کتنا زبردست جہادِ مسلسل ۴۰ سال تک کیا۔

رازق الخیری

فہرست

عنوان	صفحہ

باب نواں

تربیت گاہ بنات

باب دسواں

زمانۂ ترقی عصمت کے ۱۰ سال

۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۶ء

باب گیارھواں

آخری تصانیف اور بزم آخر

باب بارھواں

آخری چار سال ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۵ء

فہرست سوانح عمری مصور غم | عصمت جولائی سنہ ۱۹۶۳ء

باب بیسواں

مصور غم کا فن

ا ۔ خصوصیاتِ تحریر

ب ۔ ادبی حیثیتیں

۸ صفحوں پر تصاویر اور عکسِ تحریر

علامہ راشد الخیری کی ددھیال

"چچی اماں"

"چچا ابا" ڈپٹی عبدالحامد

"ننھی پھوپی اماں"

"بڑے پھوپا ابا" ڈپٹی نذیر احمد

مولوی بشیرالدین احمد

مولوی عبدالغفور خیری

حافظ اسعد حسین عرشی

مولوی قطب الدین

مولوی محمد انوارالحق خیری

بہن بھائی

میاں بیوی

۲۶ء میں

گھر والوں کے ساتھ ۳۱ء میں (علامہ مغفور کی گود میں رازقہ)

باب پہلا ـــــــ خاندان

۱ ـ دَدھیال

بنی مکرمہ — حضرت علامہ راشد الخیری کا خاندان رسول اکرم کے جلیل القدر صحابی حضرت عکرمہ بن ابو جہل کی اولاد میں سے ہے۔

علامہ مغفور کے چھوٹے دادا، واعظ سحر بیان مولوی عبد الرب مرحوم، بانی جامع مسجد سہارنپور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ جو اس ثمرہ فردوس آسیہ؟ ان کی معروف تصنیف ہے۔ کتب خانہ اشرفیہ کراچی نے اس کتاب کا جو اڈیشن شائع کیا ہے اس کے آخر میں یعنی صفحہ ۳۰۳ پر قطعہ تاریخ مصنف ہے جس میں فرماتے ہیں:- اک ہزار اور تین سو ۹۰ کم میں اب

بیں جو اس ثمرہ کو یوں لکھ چکا

آخری شعر ہے۔

اور صحیفے میرے سب مقبول ہوں

عبد الرب کی بس یہی ہے التجا

پہلے شعر سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب ۱۲۹۰ ہجری کی (جب عیسوی سال ۱۸۷۰ تھا) تصنیف ہے یعنی آج سے ۹۴ سال پہلے کی۔ صفحہ ۵۹ پر مولوی صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق نے عکرمہ بن ابو جہل کو کہ جد اعلیٰ کاتب الحروف کے ہیں۔ فوج مسلمانوں کی دے کر روانہ کیا تھا

اور حاشیہ پر یہ الفاظ ہیں۔

مصنف کتاب بنی عکرمہ سے ہے

دو قریشی بھائی برصغیر میں — حضرت جعفران ثانی شہاب الدین

شاہجہان بادشاہ کے عہد میں جس طرح جامع مسجد کی امامت کے لئے بخارا سے ایک خاندان شاہجہان آباد دلی آیا تھا اسی طرح شہزادیوں اور شہزادوں کی تعلیم کے لئے عرب سے دو بھائی قبیلہ قریش کی اولاد بنی عکرمہ برصغیر میں وارد ہوئے تھے اور بنی عکرمہ میں سے تھے۔ لاہور پہنچ کر ایک بھائی وہیں کے ہو گئے اور ان کی نسل لاہور اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں پھیلی۔ جب پچیس سال ہوئے محترم مولوی عبد الغفار صاحب کا ایک مضمون لاہور کے روزنامہ انقلاب میں شائع ہوا تھا جس میں ان بزرگ کی نسل کے افراد کے متعلق دریافت کیا گیا تھا مگر کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ خاندان کا شجرہ کسی طرح ضائع ہوا یہ واقعہ آگے آئے گا۔

مولوی حافظ ننھے مرحوم — دوسرے بھائی دلی آئے اور قلعہ میں

شہزادوں اور شہزادیوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ یہ [illegible] سے [illegible] تک کا زمانہ تھا۔ جو بزرگ دلی آکر بسے تھے ان کے پوتے تھے مولوی حافظ ننھے۔ جن کا اصلی نام معلوم نہ ہو سکا۔ ان کی پیدائش سنہ [illegible] کے لگ بھگ ہوئی۔ علامہ مغفور کی چھوٹی پھوپی اماں حافظہ حاجیہ اُم عطیۃ الشام مرحومہ نے [illegible] میں مجھے کہا تھا

کہ مولوی حافظ تھے۔ قلعہ میں شہزادیوں کو پڑھاتے تھے وعظ کہا کرتے تھے۔ کتابوں میں اُن کا ذکر ہے" مگر کتابوں کے نام معلوم نہ ہوسکے۔

مولوی حافظ خیر اللہ صاحب مرحوم

بی بی حاجیہ قاریہ اُم

عطیۃ النساء مرحومہ نے یہی بیان فرمایا تھا کہ مولوی حافظ تھے کے ۴۔۵ بچے ضائع ہوگئے تھے اور مولوی حافظ خیر اللہ صاحب باپ سے ۵۰ سال چھوٹے تھے۔ اُن کی پیدائش ۱۸۰۸ء قرین قیاس ہے۔ ان کے متعلق خاندان کے بزرگوں سے سُنا ہے کہ "سارا شہر اُن کی عزت کرتا تھا کیونکہ عالم تھے اور قلعہ میں اتالیق۔ بہت بڑے مولوی تھے اور وعظ بھی کہتے تھے"

مولوی حافظ خیر اللہ کے چھوٹے بیٹے تھے مولوی عبد الرزاق وہ بھی عالم تھے اُن کے چار پوتے تھے ولی اللہ۔ کلیم اللہ۔ مسیح اللہ۔ خلیل الرحمٰن اور ایک پوتی بڑی بیگم جن کے دو بیٹوں چچا قطب الدین اور چچا فرید الدین کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ چچا قطب الدین والد مغفور کے بے تکلف دوست بچپن سے تھے۔ ان کے صاحبزادے بھائی شمس الدین سرکاری عہدہ دار تھے اب پنشنر ہیں۔ فرید الدین صاحب کے بیٹے خان بہادر الطاف ریاست جے پور میں کسی بڑے عہدے پر ہیں۔ ثنا اللہ صاحب کے بیٹے مسیح اللہ صاحب غالباً بقید حیات ہیں۔ خلیل الرحمٰن صاحب کے بیٹے عزیز الرحمٰن کو ہجرت سے پہلے دلّی میں میں نے دیکھا تھا۔

حافظ خیر اللہ صاحب کے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔

بڑے بیٹے تھے مولوی حافظ عبد الخالق صاحب۔

بیٹی کی اولاد میں تھے مولوی عبد الرحیم صاحب (مولوی محمد قاسم شاید ان کے بیٹے تھے) ان کے پوتے مولوی عبد الحکیم کے چار لڑکے تھے۔ فضل رحیم فضل کریم عبد المجید اور شمس الاسلام۔ مولوی عبد المجید سے میری بھی ملاقات تھی۔ جب میں دلّی کے عربک اسکول میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا تھا تو وہ انٹرنس میں تھے اور فٹ بال بہت اچھی کھیلتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک ہجرت سے متاثر ہوکر افغانستان چلے گئے تھے۔

مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم

مولانا عبد الوہاب

مرحوم اپنے والد مغفور کا نام مخدوس ناسیہ میں اس طرح لکھ رہے ہیں۔

"الشیخ مولوی محمد عبد الخالق قریشی حنفی قادری"

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل شاہجہان آباد کا مشہور محلہ پنجابی کٹرہ اُس جگہ تھا جہاں اب دلّی جنکشن ریلوے اسٹیشن ہے۔ گندہ نالہ کے سامنے (جو جنکشن روڈ کہلانے لگا تھا) ریلوے لائن ہے یہ سب پنجابی کٹرہ تھا اور دلّی کی پنجابی برادری کا محلہ۔ یہیں حافظ خیر اللہ کے بڑے بیٹے مولوی عبد الخالق مرحوم کا مکان تھا۔ پنجابی کٹرہ میں بہت بڑی مسجد تھی جو اورنگ آبادی مسجد کہلاتی تھی۔ اس میں مولوی عبد الخالق صاحب کا مدرسہ تھا اور مولوی صاحب اس مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتے تھے۔

مارچ ۱۹۶۳ء کے عصمت میں محترم مکرم مولانا محمد عبد الغفار خیری کا ایک مضمون سوا سو سال پہلے کی شادی کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں حضرت مولوی عبد الخالق مرحوم کے مدرسہ کے سلسلہ میں محترم مکرم تحریر فرماتے ہیں:۔

"پہلے زمانہ میں اس قسم کے مدارس موجودہ طرز پر تعلیم نہیں دیا کرتے تھے کہ مختلف جماعتیں ہوں متعدد اساتذہ متعدد اسبق ہیں صرف ایک ہی اُستاد ہوتا تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے اعمال و اخلاق پر کڑی نگرانی رکھ کر ان کی اصلاح بھی کرتا رہتا تھا۔ امتحان نہ تھے صرف اُستاد کا نام اور اس کی عطا کردہ سند ہی (جو پورے اطمینان کے بعد دی جاتی تھی) اُس کی قابلیت کی ضمانت تھی اور اُستاد کے زہد و تقویٰ اور علم کے لحاظ سے شاگرد کی وقعت ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ اساتذہ کتابی اور عملی طور پر جب تک اپنا پورا اطمینان نہیں کر لیتے تھے۔ نالائقوں کو اپنا نام (سند) نہیں دیتے تھے۔

پنجابی کٹرہ کی مذکورہ مسجد کے مدرسہ میں حضرت مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم درس دیا کرتے تھے۔ آپ کے علم و فضل کا شہرہ دُور دُور سے طلبا علم کو کھینچ کر اس مدرسہ میں لاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور و معروف عالم و محدث حضرت میاں صاحب شمس العلماء مولوی سید نذیر حسین صاحب مرحوم اسی مدرسہ میں مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم کی تعلیم و تربیت سے فیضیاب ہوئے جو پٹنہ عظیم آباد سے مدرسہ کی شہرت سُنکر صرف بغرض تحصیل علم تشریف لائے اور پھر شفیق اُستاد کی محبت نے حضرت میاں صاحب کو دہلوی بنا دیا۔

آپ کی زندگی دنیا داروں کے بکھیڑوں سے بالکل پاک و صاف تھی۔ کسی قسم کا تکلف نہ تھا طبیعت صفائی پسند ضرور تھی مگر نمود پسند نہیں۔ اپنا کام خود کرتے حتیٰ کہ اپنے حجرے (بیٹھک) کی جھاڑو بھی خود ہی نکالتے۔ آپ کا بستر تین چیزوں پر مشتمل تھا۔ دو کمبل (ایک بچھانے کے لئے دوسرا اوڑھنے کے لئے) اور ایک تکیہ۔

دوسروں کا کام کرنے میں کبھی عار نہ تھا۔ بزرگوں سے سُنتا ہوں کہ تحصیل علم کے لئے آپ کے پاس جن بھی آیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میں نے اپنے والد خان بہادر عبدالصمد صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں مثنوی سحرالبیان عرف مثنوی بے نظیر بدر منیر کے ایک مقام پر حضرت مولوی عبدالخالق صاحب کا لکھا ہوا حاشیہ دیکھا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے زمانہ کے علماء میں ذوقِ ادب بھی تھا اور وہ ایسی کتابیں بھی دیکھا کرتے تھے اور حقیقت میں دیکھنا بھی چاہئے تاکہ عوام کی طبیعت کا رجحان معلوم ہو اور خرابیوں کی اصلاح کی جا سکے۔

میں قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے اس حاشیہ کا مفہوم اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔ افسوس اصل میرے پاس نہیں کہ میں حضرت مولوی صاحب کے الفاظ پیش کرتا مثنوی میں شہزادے سے پری غصہ میں کہہ رہی ہے:۔

تجھے میں نے چڑھنے کو <u>گھوڑا</u> دیا

یا اُس <u>مال زادی</u> کو جوڑا دیا

اس شعر میں الفاظ گھوڑا اور مال زادی دونوں پر خط کھینچا گیا ہے۔ اور حاشیہ پر جو عبارت رقم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اے انسان تجھ کو یہ جسم کا گھوڑا دیا گیا۔ جس کی ترقی و تنزلی کی سب کلیں تجھ کو بتا دیں۔ اس سے مقصد تو یہ تھا کہ تو دنیا کی سیر کرے مطلب و مقصد تو نہ تھا کہ دنیا میں ایسا محو ہو جا اور اس طرح پھنس جا کہ انجام بالکل ہی نظروں سے پوشیدہ ہو جائے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا جو انسان ہی کے لئے بنائی گئی ہے اگر اس میں صحیح اصولوں سے زندگی بسر کی جائے اور اس سے صحیح استفادہ کیا جائے تو یہ کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ مگر جب دنیا کی

مادیت میں اس طرح پھنس جائے کہ زندگی بہائم کی طرح ہو جائے اور اخلاق بداعمال پھر بڑے اور بدا ثر ڈالنے لگے تو پھر اچھی نہیں، یہی دنیا کی اسی حالت کو مال زادی کہا گیا ہے۔ یعنی اس حالت پر جس کی دنیا پہنچ گئی وہ مال زادی ہو گئی۔ شہزادہ جب بدر منیر شہزادی سے مانوس ہوا اور پری کے پاس سے غائب رہنے لگا تو بدر منیر کو مال زادی کا لقب ملا۔ اس سے پہلے تو وہ مال زادی نہ تھی،

"حیات النذیر" میں مولوی افتخار عالم حضرت مولوی عبدالخالق صاحب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مولوی سعادت علی (ڈپٹی نذیر احمد کے والد) کو مولوی صاحب سے تلمذ تھا۔ مولوی صاحب آخر عمر میں دمہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حلقۂ درس و تدریس سے پہلو تہی کر کے اور مجالس وعظ و نصیحت کو خدا حافظ کہہ کر مسجد نشیں ہو گئے تھے مگر مطالعہ کتب کا حد سے زیادہ شغف تھا اور روز و شب کتب بینی میں مصروف رہتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے پاس مختلف علوم کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع رہتا تھا۔

مولوی سعادت علی نے اپنے بیٹوں نذیر احمد اور ان کے بھائی کو مولوی عبدالخالق صاحب کی خدمت میں تعلیم کی غرض سے پیش کیا۔ پنجابی کٹرہ کی مسجد اورنگ آبادی مسجد کے نام سے مشہور تھی جس میں سو سوا سو طالب علم ہندوستان کے مختلف اطراف سے آکر جمع ہوتے تھے۔ مولوی حاجی قاسم بھی کہ مولوی عبدالخالق کے عم زاد بھائی تھے درس تدریس دیتے تھے (مگر) مولوی نذیر احمد اسی مسجد میں رہ کر مولوی عبدالخالق صاحب پیش امام شاہی۔ متولی مسجد کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔"

۱۹۱۸ء کے رسالہ تمدن میں "شاہجہاں آباد کے سدا بہار پھول" کے عنوان سے حضرت والد مغفور نے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جس میں انھوں نے اپنے جد امجد کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم جن کے مزار پر آثار الصنادید فاتحہ کے پھول پڑھا رہی ہے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ مغرب کی نماز ہو چکی۔ شبّو حلال خور "خدا رسول کی امان" کہتا ہوا سامنے آیا۔ بیٹی کے بیاہ کا بلاوا دیا اور کل شام کی دعوت کی۔

دل ان پاک روحوں پر خون کے آنسو گراتا ہے اور سیر نہیں ہوتا آنکھیں وہ مقدس صورتیں چاروں طرف ڈھونڈتی ہیں اور نہیں پاتیں۔ کیسے غول کے انسان تھے۔ اپنی ان ٹوٹ جائے مگر دوسرے کا دل توڑنا نہ جانتے تھے۔ کجا مولوی عبدالخالق جیسا عالم متبحر جس کے نام پر بڈھا بادشاہ تا دم حیات حسن عقیدت کے جواہر نثار کرتا رہا کجا شبّو حلال خور!

دیکھ! دیکھ! چشم بینا غور سے دیکھ، مولوی عبدالخالق شبّو حلال خور کے ہاں دعوت کھا رہے ہیں۔

دیکھ دل بھر کر دیکھ! اب یہ سماں نظر نہ آئے گا

علمائے شاہجہاں آباد میں مولوی عبدالخالق صاحب کا درجہ کس قدر بلند تھا اس کا اندازہ سر سید احمد خاں مرحوم کے الفاظ سے بھی ہوگا۔ آثار الصنادید اُن کی بہت مشہور تالیف ہے اس میں مولوی عبدالخالق کی بابت سر سید لکھتے ہیں:۔

"شہرۂ علم و فضل اتنا بلند ہے کہ گوش فلک کر ہے۔ دیندار۔ تقویٰ شعار۔ ترویج ملت میں ساعی۔ اعلان دین پر داعی۔ وضع میں متین۔ کلام بہت نزدیں۔ اخلاق

ویسا ہی - الا منصرمایات ویسی ہی - اس جامعیت کے ساتھ شکل کم نظر سے گزرا"

شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد مرحوم والد مغفور کے پھوپھا تھے - جب علامہ مرحوم نے سللہ میں رسالہ تمدن جاری کیا تو سب سے پہلا مضمون بڑے پھوپھا ابا مرحوم کا تھا بعنوان "التقریب" اُس میں انھوں نے مولوی عبدالخالق مرحوم کے متعلق لکھا تھا۔

"مولوی عبدالراشد کے پردادا مولوی عبدالخالق مرحوم اپنے عصر میں دلی کے ممتاز مولویوں میں تھے - وہ آخر عمر میں بسبب پیری مشتِ استخواں رہ گئے تھے - اس وقت اُن کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے - مسجد کے ایک در میں اکڑوں بیٹھے ہیں - ایک تپائی سامنے ہے اس پر کچھ کتابیں رکھی ہیں - ان کو دیکھ رہے ہیں اور ان پر کچھ لکھتے جاتے ہیں - مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کا ترکہ یعنی کتابیں ان کی اولاد کو ورثا میں تقسیم ہوا - کچھ کتابیں مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کے حصہ میں آئیں جو مولوی عبدالراشد کے دادا اور میرے خسر تھے - چونکہ میں خانہ داماد تھا - مجھکو ان کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو کوئی کتاب عربی فارسی اُردو کی نہ تھی جس پر مولوی عبدالخالق صاحب کا حاشیہ نہ تھا - یہانتک کہ مثنوی بدر منیر جس سے مولوی صاحب کی وسعتِ معلومات کا کافی ثبوت ملتا ہے اور اس بات کا کہ اگلے بزرگ علم کو علم کے لئے سیکھتے تھے - اس طرح مولوی عبدالراشد نے جو کچھ سیکھا اپنے سے سیکھا"

مولوی عبدالخالق صاحب کے دو بیٹے تھے اور دو بیٹیاں - سب سے بڑے مولوی عبدالقادر صاحب تھے - اُن سے چھوٹے مولوی عبدالرب صاحب - ایک بیٹی رقیہ بیگم تھیں - میاں نذیر حسین محدث دہلوی کی بیوی - دوسری حافظ امجد علی صاحب کی بیوی تھیں - حافظ امجد علی صاحب کالا باغ (ضلع میانوالی) کے خاندانِ سادات میں سے تھے اور دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے - ان کی شادی بھی اُستاد کی دوسری بیٹی سے ہوئی - شادی کے سال بھر بعد گزر گئیں - ایک لڑکی پیدا ہوئیں جو مولوی عبدالحامد کو بیاہی گئیں -

مولوی عبدالخالق صاحب کی بیٹیوں کی شادی

مارچ ۱۹۶۲ء کے عصمت میں محترم مولوی محمد عبدالغفار انجیری صاحب کا جو مضمون مولانا محمد عبدالخالق صاحب کے متعلق شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے مولانا سے موصوف کی بڑی بیٹی رقیہ بیگم صاحبہ کی شادی کا حال لکھا ہے اس زمانہ میں یہ کچھ عجیب سی باتیں معلوم ہوتی ہیں - بہ حال واقعہ اس طرح ہے -

"ایک دن مولوی عبدالخالق صاحب کی اہلیہ محترمہ نے کہا کہ کچھ خبر بھی ہے بیٹی شادی کے قابل ہو گئی تم کو کچھ فکر نہیں -

فرمایا اچھا شادی کے لائق ہو گئی تو فکر کرتا ہوں -

شام کو درس سے فارغ ہو کر مفتی صدرالدین صاحب کے پاس پہنچے اور فرمایا کہ

"میری بیوی نے آج بتایا ہے کہ میری بیٹی شادی کے قابل ہو گئی - مجھکو مشورہ دیجئے -

مفتی صاحب نے جواب دیا کہ بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا - آپ کے مدرسہ میں طالب علم سید نذیر حسین شریف خاندان ہونہار، صالح اور سید نجیب الطرفین موجود ہے - اس میں کیا عیب ہے جو ادھر اُدھر ڈھونڈا جائے"

فرمایا کہ ہاں ہے تو۔ پھر کس طرح بات ہو؟
مفتی صاحب نے فرمایا کہ یہ کام مجھ پر چھوڑیئے
مولوی صاحب واپس آگئے۔
کچھ دنوں بعد مفتی صاحب آئے یا شاید مولوی صاحب کو بلایا اور مطلع کیا کہ معاملہ درست ہو گیا۔ میں نے رضامندی لے لی اور پٹنہ سے بھی منگالی۔ اب تاریخ مقرر کرو اور کارِ خیر کو انجام دو۔ مفتی صاحب اور مولوی صاحب نے مہر و تاریخ کا آپس میں فیصلہ اور تعین کر لیا اور رخصت ہوئے۔

تاریخ و دن مقررہ پر مولوی صاحب نے اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا۔ کہ "آج لڑکی کو نہلا دھلا کر اچھے کپڑے پہنا دینا"۔
اہلیہ محترمہ نے سمجھا کہ شاید کوئی لڑکی کو دیکھنے آئے گا۔ انھوں نے نہلا دھلا کپڑے پہنا دلھن بنا دیا۔
مابین عصر و مغرب مفتی صدالدین صاحب حضرت میاں صاحب کو دولھا بنا کر برات لے کر آگئے۔ جو مسجد مذکور میں بٹھائی گئی۔
عقد نکاح کے بعد مولوی صاحب گھر میں آئے۔ اس گھر میں جو شادی کا گھر تھا مگر اس میں سوائے دلھن دلھن کی والدہ اور دلھن کی چھوٹی بہن کے عورتیں دو چار محلہ والیاں بن بلائے اور تھیں۔
حضرت مولوی صاحب نے آکر فرمایا کہ "لڑکی کے کپڑے گٹھری میں باندھ دو اور جو کچھ ہو وہ باندھ رکھو۔ ڈولی آتی ہوگی"۔
بیوی صاحبہ کو کچھ غصہ آ ہی رہا تھا کہ نہ عزیز و اقربا کو بلایا نہ ملنے والیوں کو۔ غصہ میں کہا کہ سب کو زندہ دفن کر دیا۔ کسی کو خبر تک نہ کی۔ یہ شادی کرنے اٹھے ہیں

یہ کہتے کہتے وارفتگی بڑھی قبلہ مولوی صاحب کی کمر پر ایک دوہتڑ بھی رسید کر دیا۔
حضرت مولوی صاحب نے سب باتوں کو نظر انداز کر کے فرمایا کہ اچھا۔ اچھا لڑکی واپس آنے کی تو سب کو بلا کر کھلا پلا لینا۔ اب اس وقت رخصت کرو ڈولی آتی ہوگی۔
غرضکہ لڑکی رخصت ہوئی اور مفتی صدالدین صاحب جو دولھا کے والد کی نمائندگی فرما رہے تھے بہو کو وداع کرا کر اپنی حویلی لے گئے!!
آپ کی دوسری صاحبزادی بھی حافظ مولوی سید امجد علی صاحب کے ساتھ (جو کاے بلغ پنجاب کے ایک شریف النسب خاندان کے نونہال تھے اور بغرض تحصیل علم دہلی آئے تھے اور اسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے تھے بالکل اسی طرح انجام پذیر ہوئی۔
یہ اُس شخصیت کی بچیوں کی شادیاں تھیں۔ جس کے ایک ذرا سے اشارے پر دہلی کی پنجابی برادری اور دیگر عمائد سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے۔
(عصمت مئی ۱۹۶۲ء)

کیا جن بھی مولوی عبدالخالق مرحوم کے شاگرد تھے؟

دادی اماں مرحومہ کے انتقال کے وقت میں دس سال کا تھا مگر تمھارات کو جب وہ اپنے پاس لٹا کر مجھے کہانیاں سُناتی تھیں اور میں کہانیاں سنتے سنتے سو جاتا تھا تو سات آٹھ سال کی عمر ہوگی۔ سب سے پہلے انھوں نے ہی فرمایا تھا کہ تمھارے دادا کے دادا (مولوی عبدالخالق صاحب) بہت بڑے مولوی تھے۔ جن بھی اُن کے شاگرد تھے"۔ دو تین دفعہ انھوں نے جنوں کے واقعات بھی سُنائے تھے کہ "تمھارے

سکڑوں لوگوں کو روٹی کی ضرورت تھی سو قریب طالب علموں کو جاڑوں میں صدریاں اور لحاف دیا کرتے تھے ایک سال قحط تھا اور روٹی بہت مہنگی بلکہ ملتی ہی نہیں رہی تھی۔ مسجد میں مدرسہ تھا۔ وہاں لوگوں کو پڑھا رہے تھے۔ لڑکوں سے کہا۔ روٹی نہیں مل رہی کہیں بک رہی ہو تو بتاتا۔ دوسرے دن صبح حجرہ کھولا تو روٹی سے بھرا ہوا تھا۔ اُس وقت معلوم ہوا دو لڑکے انسان نہیں تھے جن ہیں مرحوم مولوی صاحب نے انھیں اسی دن مکتب سے اُٹھا دینا چاہا دوسرے دن وہ اپنے باپ کے ساتھ آئے اور اُن کے باپ نے کہا آپ میرے بچوں کو قرآن مجید پڑھا رہے ہیں جو اب ختم کے قریب ہے۔ اگر پورا نہ ہوا تو مجھے اور انھیں بہت رنج ہوگا آپ قرآن ختم کرادیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی سات پشت تک کسی کو نہ ستائیں گے اور آپ کی اولاد کی حفاظت کریں گے۔"

دادی اماں نے فرمایا "وہ جنات کبھی بچوں سے چھیڑ خانی بھی کرتے تھے ایک دن عشا کے بعد سب بچھونوں میں لیٹے ہوئے تھے کہ انھوں نے کنکر پتھر پھینکے۔ چھوٹے بڑے اٹھ کر بیٹھ گئے کہ کہیں چور تو پتھر نہیں پھینک رہے۔ کسی نے کہا چور کہاں سے آجائیں گے۔ وہی ہوں گے۔ سوچا شرارت کرکے بچوں سے کھیل بازی کرو۔ اماں جان (مولوی عبدالخالق صاحب کی بہو اور مولوی عبدالقادر صاحب کی بیوی) نے کہا۔

"اے موؤں تمھیں کنکر پتھر پھینکتے شرم بھی نہ آئی۔ ایسا ہی پھینکنا تھا تو حلوہ سوہن پھینکا ہوتا۔"

یہ سنکر انھوں نے کنکر پھینکنے بند کردئے اور حلوہ سوہن کے ٹکڑے آنے لگے۔"

پھوپھی اماں زاہدہ بیگم صاحبہ نے بھی بعض ایسے ہی واقعات بیان کئے جو ان سے اور ان کی اولاد سے متعلق تھے۔

واجدہ بیگم میری چھوٹی بہن کہتی ہیں "اماں بیچ کے دالان میں موری کے پاس پلنگ چارپائی نہیں بچھواتی تھیں۔ ایک دفعہ موری کے قریب اماں کی چارپائی بچھی تھی کہ ان کے عزیزوں کی شکل کے دو شخصوں نے چارپائی پکڑوا کر موری پر سے ہٹادی۔ اُن کی آنکھ کھل گئی۔ صبح ان عزیزوں سے پوچھا اُنھوں نے کہا "نہیں ہم تو تھے نہیں"۔ واجدہ بیگم نے ایک واقعہ اور سنایا کہ ایک دن اماں بیچ کے دالان کے سامنے موری کے قریب سو رہی تھیں۔ ابا برابر کی چارپائی پر لیٹے تھے کہ اماں اُچھل پڑیں اور آنکھ کھل گئی انھوں نے ابا سے کہا۔ یہ تم نے کیا کیا؟ انھوں نے دریافت کیا کیا؟ اماں نے کہا تم نے میرے پیٹ پر اتنے زور سے ہاتھ کیوں مارا؟ وہ ہنسنے لگے اور کہا سوتے میں تم ڈر گئیں۔ انھوں نے کہا نہیں چوٹ سے ابھی تک دکھ ہو رہا ہے"۔

میں ان سب باتوں کو عورتوں کی توہم پرستی ضعیف الاعتقادی۔ قصے کہانیاں سمجھ لیتا مگر دو بیان ایسے ہیں جن پر غور کرنا ہوگا۔

محترم مولانا محمد عبدالغفار الخیری عالم ہیں انگریزی بھی خوب جانتے ہیں نوّے سال کے قریب عمر ہے۔ ان سے یہ ذکر نکلا تو ان کا بیان قلمبند کرلیا گیا اور اُن کو سنا کر اس پر اُن سے تصدیق بھی کرالی گئی انھوں نے فرمایا۔

"مولوی عبدالخالق صاحب طلبا کو پڑھاتے تھے اور پنجابی برادری ان کی خدمت کرتی تھی۔ جنوں کا واقعہ پنجابی کٹرہ کی مسجد کا ہے۔ روٹی نہیں مل رہی تھی ضرورت سخت تھی۔ دو لڑکے پڑھنے آتے تھے انھیں معلوم ہوا تو

کہا ہم لادیں گے۔ دوسرے دن وہ لے کر آگئے۔ اتنی بھاری تھی کہ اس عمر کے لڑکے اتنا بوجھ اٹھا نہ سکتے تھے۔ اس پر مولوی عبدالخالق صاحب کو شبہ ہوا اور لڑکوں کو بتانا پڑا کہ ہم جنوں کے لڑکے ہیں۔ مولوی عبدالخالق صاحب نے انھیں اُٹھا دیا کہ یہ بھی بچے ہیں کبھی مذاق میں ڈرا یا یا اصلی صورت میں آگئے تو طالب علم کا دم نکل جائے گا۔

مگر وہ کبھی کبھی مولوی صاحب کے پاس آتے رہتے تھے اُن کے بعد (اُن کے بڑے بیٹے) مولوی عبدالقادر صاحب کے پاس بھی آتے تھے۔"

انھیں چچا صاحب کا بیان اِس سلسلہ میں یہ بھی ہے :-

بھائی مالک کی والدہ یعنی چچا صاحب کی پہلی بیوی کے (جو میر شریف حسین کی بیٹی اور میر الطاف حسین شملہ والے کی بہن تھیں) انتقال کے سال بھر بعد جب چچا صاحب کی عمر ۲۳-۲۴ سال تھی تصوف کا زور تھا اور وظیفے وغیرہ پڑھا کرتے تھے اور اکثر مزارات پر جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ قطب صاحب (مہرولی) چلے گئے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر وہاں سے دلی کے لئے چل پڑے قطب صاحب دلی سے گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اُس زمانہ میں موٹر بسیں لاریاں نہیں نکلی تھیں۔ بلکہ تانگے بھی نہیں تھے اور نہ اس راستہ میں بجلی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ راستہ بھول کر کلّو کے تکیہ (یہ قبرستان تھا) کی طرف آگئے۔ اور سوچا کس طرف جائیں۔ آخر ایک پکی قبر سے پیٹھ لگا کر دونوں گھٹنے کھڑے کر کے اُن پر ہاتھ اور ہاتھوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئے۔ غنودگی چھائی تو ایسا محسوس ہوا کسی نے کندھا پکڑا انھوں نے کچھ خیال نہ کیا پھر دونوں مونڈھے پکڑ کر سیدھا کر دیا۔ چچا صاحب فرماتے ہیں کہ اب جو دیکھتا ہوں تو ایک نہایت بزرگ سفید اُجلے پوش کھڑے ہیں۔ انھوں نے پوچھا "یہاں کیوں بیٹھے ہو" میں نے کہا "راستہ بھول گیا" وہ ہنسے اور بولے "صاحبزادے ماں باپ کو پریشان کر کے اللہ کی طلب بالکل بے کار ہے۔ جاؤ گھر جاؤ۔ اللہ سب جگہ ہے"۔

میں نے کہا "راستہ معلوم نہیں" بولے "چلو میرے ساتھ چلو" آگے آگے وہ پیچھے پیچھے میں۔

اُس زمانہ تک دلی کے چاروں طرف فصیل تھی۔ چچا صاحب فرماتے ہیں فصیل کا دروازہ بند رہتا تھا اور سپاہی کا پہرہ ہوتا تھا۔ پھاٹک کی کھڑکی میں قفل پڑا رہتا تھا۔ نام پتہ لکھ کر سپاہی کھول دیتا تھا۔ سپاہی سے اُن بزرگ نے کھڑکی کھلوائی۔ جب کھڑکی کھل گئی تو مجھ سے کہا "جاؤ میاں گھر۔ السلام علیکم"۔ اُس وقت رات کے ۳ بجے ہوں گے۔ گھر پہنچا تو اماں رو رہی تھیں۔ اور ابا انھیں سمجھا رہے تھے کہ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب گھر کے اندر گیا تو سارا واقعہ سنایا۔ ابا نے مجھ سے کہا بہت ممکن ہے وہ بزرگ تمھارے پردادا (مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم) کے شاگرد کوئی جن ہوں"۔

مولوی محمد عبدالغفار الخیری بڑے جید عالم ہیں۔ ان کا یہ بیان قلمبند کر لیا گیا تھا اور انھوں نے دو تین سال بعد اپنے دستخط کر کے اس کی تصدیق کر دی تھی تو تاریخ بھی ڈال دی تھی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۶۳ء مگر اس بیان کے ختم ہونے سے قبل یہ دو سطریں لکھی ہیں۔

"میرا آج بھی یہ خیال ہے کہ وہ بزرگ جن ہوں گے اس لئے کہ ماں باپ کا حال اور کسی کو کیا معلوم ہو سکتا ہے"۔

حضرت والد مرحوم و مغفور سے اس موضوع پر میری کبھی گفتگو نہیں ہوئی البتہ ایک واقعہ انھوں نے سُنایا تھا

شہر کی جامع مسجد کے شمالی دروازے سے سیڑھیاں اتر کر سیدھا راستہ شیا محل کی طرف جاتا ہے۔ دروازے کے بائیں ہاتھ کو ایک ٹکڑا زمین کا تھا جو ۱۹۳۵ء تک سونا پڑا رہتا تھا۔ ۱۹۳۵ء تک دلی کی گلیوں اور سڑکوں پر مٹی کے تیل کی لالٹینیں روشن ہوتی تھیں اور عشاء کی نماز کے بعد سڑک سنسان ہو جاتی تھی۔ مولوی اشرف حسین والد مرحوم کے پھوپھی زاد بھائی ان سے عمر میں دو سال بڑے تھے اور دو کھاری باؤلی سے ان کے ہاں سے آ رہے تھے اور گیارہ بجے رات کا وقت تھا۔ میرا جہاں تک خیال ہے یہ ۱۹۰۳ء کا واقعہ تھا مگر میری پھوپھی بہن ماجدہ بیگم کہتی ہیں کہ شادی ہونے کے بعد کا واقعہ ہے بہر حال جو بھی تھا والد مرحوم گھر آ رہے تھے اور سناٹا پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک بزرگ کو دیکھا۔ سفید داڑھی سفید براق کپڑے، کمبل اوڑھے ہوئے نورانی صورت۔ انھیں دیکھ کر علامہ مغفور ٹھٹکے نہیں۔ ٹھیرے نہیں۔ ڈرے اور گھبرائے نہیں۔ جیسے جا رہے تھے، آواز آئی۔ "ابی"

حضرت والد مرحوم کو گھر والے "ابی میاں" کہتے تھے اور ان سے چھوٹے ماموں ابی۔ چچا ابی۔ بھائی ابی۔

حضرت والد مرحوم فرماتے تھے۔ یہ آواز مجھے ناگوار گزری میں بڑھے چلا گیا۔ پھر آواز آئی۔

"میاں ابی! میاں عبد الراشد! برا مان گئے۔ ذرا ٹھیرو۔" میں ٹھیر گیا اور کہا "فرمائیے"۔

انھوں نے کہا۔

"کوئی رکوع تو سناؤ میاں!"

ابا جان فرماتے تھے پہلے تو میں ڈرا پھر جی کڑا کر کے سورۂ فتح کا آخری رکوع لقد صدق اللہ شروع کر دیا۔

ابا جان کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ جب وہ لحن سے کوئی شعر پڑھتے تو دل پر بڑا اثر ہوتا تھا اور جب کوئی رکوع پڑھتے تو لفظ لفظ دل کے پار ہوتا تھا۔ جوں ہی رکوع ختم کیا تو میں نے دیکھا ان کی آنکھ سے آنسو گر رہے تھے۔

انھوں نے کہا۔

"جیتے رہو۔ جی خوش کر دیا۔ کل پھر اس جگہ ملنا"

مگر دوسرے دن والد مرحوم وہاں نہیں گئے۔ اور جب آپا نے ان سے پوچھا آپ وہاں کیوں نہیں گئے تو کہا "جن میری جوتی۔ میری صدقہ۔"

شیر جن کا باغ

سول لائنز میں بادشاہ کے قریب شیر جن کا باغ تھا۔ پہلے سب علاقہ جنگل تھا۔ گورا ابھی آتے ہوں گے لوگ سمجھتے تھے کہ شیر بھی اس جنگل میں رہتے ہیں۔ یہاں ایک قبرستان ۱۹۰۹ء تک تھا۔ قبرستان کے دونوں طرف اب کوٹھیاں چلی گئی ہیں۔ مشرق کی طرف راجپور روڈ کی کوٹھیاں ہیں اور مغرب میں لڈلو کاسل روڈ سے انڈر ہل روڈ تک قبرستان ہے۔ اس جانب قبرستان سے ملی ہوئی زمین پر خان بہادر شیخ حبیب الرحمن صاحب کے والد مرحوم شیخ عطاء الرحمن صاحب نے سات کوٹھیاں بنوائی تھیں انھیں میں سے ایک میں شیخ حبیب الرحمن صاحب رہتے تھے۔ پنجابی کٹرہ میں جو پنجابی برادری آباد تھی۔ اس کا یہ قبرستان تھا اور عم مکرم مولوی عبد الغفار صاحب کا بیان ہے کہ یہیں ان کے جد امجد مولوی عبد الخالق صاحب کی قبر تھی۔ چونکہ مولوی عبد الخالق صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ جن بھی ان کے شاگرد ہیں اس لیے یہ خیال کیا جانے لگا کہ اس علاقہ میں جن بھی رہتے ہیں۔ شیر جنگ کا قبرستان بھی یہی کہلانے لگا تھا مگر مولوی عبد الغفار

صاحب فرماتے ہیں اصل نام "شیر جن کا باغ" تھا۔

مولوی عبدالخالق صاحب کے

مولوی حافظ عبدالقادر صاحب

بڑے بیٹے تھے مولوی حافظ عبدالقادر صاحب انھوں نے باپ کی زندگی ہی میں اُن کا مدرسہ سنبھال لیا تھا باپ دادا اسکڑ دادا کی طرح لال قلعہ سے اُن کا تعلق تھا وہاں کی مصروفیات بڑھیں تو ان کے بہنوئی میاں نذیر حسین صاحب" محدث دہلوی" نے مدرسہ سنبھال لیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب لال قلعہ کی موتی مسجد کے پیش امام بیگم ولی عہد کے استاد خصوصی تھے۔ پنجابی کٹرہ ختم ہونے کے بعد مولوی عبدالقادر صاحب نے بتاشوں کی گلی میں مکان خریدا یہ مکان میں نے بھی دیکھا ہے بہت بڑا دو منزلہ مکان تھا۔ کھاری باؤلی بتاشوں کی گلی کوچہ نواب مرزا اور نیاریوں کے کٹرہ میں اس سے بڑا شاید کوئی مکان نہ تھا۔

اور یہ وہ مکان تھا جہاں روزانہ ایک کلام مجید ختم ہوتا تھا!

مولوی عبدالقادر صاحب کے انتقال کے وقت حضرت علامہ مرحوم ۱۴-۱۵ سال کے تھے دادا کا ذکر پوتے نے اپنے کئی مضمونوں میں کیا ہے۔

"رفعت زمانی بیگم بادشاہ کی ماموں زاد بہن محمد زمانی بیگم کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد سلطان دولہا نماز روزے کے سختی سے پابند تھے۔ یہ ۱۸۷۵ء کی باتیں ہیں۔ میری عمر آٹھ نو سال کی ہوگی۔ مہینہ میں ایک یا دو دفعہ میرے دادا مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم نے جو دونوں میاں بیوی کے اُستاد تھے اُن کے پاس نظام الدین میں جہاں ان کی مستقل سکونت تھی جاتے رہتے تھے۔ میں بھی اکثر ساتھ ہوتا تھا رفعت زمانی کی عمر جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۴ سال کی ہوگی مگر مجھے یاد نہیں کہ کبھی ہم اُن کے ہاں گئے ہوں اور دونوں میاں بیوی نے مولوی صاحب سے بچی کی شادی کے متعلق فکر نہ ظاہر کیا ہو..... محمد زمانی بیگم کی خواہش تھی کہ لڑکے میں تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) بد مزاج نہ ہو۔ (۲) جھوٹ نہ بولتا ہو۔ (۳) اور اسے روٹی ملا سکے۔

انھوں نے برادری کا ایک اچھا پیام صرف اس لئے رد کر دیا کہ لڑکا کبوتر باز تھا حالانکہ سو روپے ماہوار کا وظیفہ تھا اور اڑتالیس روپیہ ماہوار کی آمدنی کو اس واسطے منظور کر لیا کہ لڑکا رحم دل، نمازی اور نیک تھا۔ مولوی صاحب نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

محمد زمانی کی حقیقی نند سیتا رام کے بازار میں رہتی تھیں ... کسی موقع پر دونوں نند بھاوجوں کی لڑائی ہوئی اور اس لڑائی نے اتنا طول کھینچا کہ ملنا جلنا۔ آنا جانا سب بند ہو گیا سلطان دولہا بھی کبھی بہن کے ہاں نہ جاتے رخصت کی تاریخ مقرر ہو گئی تو مولوی صاحب نے ایک روز محمدی بیگم سے کہا۔

"یہ تو کہیے کہ نند (آصف دلھن) کو بلانے کون جائے گا؟"

محمد زمانی: "جس کو آپ فرمائیے۔"

مولوی صاحب: "تم کو خود جانا چاہیئے۔"

محمد زمانی: "مجھے ان کے ہاں گئے دو سال ہو گئے۔ وہ بھی اس عرصہ میں نہ خود آئیں نہ اُن کا کوئی بچہ پہنچتی ہوں۔ انھوں نے قسم کھالی اور بچوں کو وصیت کر دی ہے کہ سلطان بھائی کو میرے جنازہ پر نہ آنے دیں۔"

مولوی صاحب: "تو تمہارا ارادہ اب کیا ہے۔ کیا بغیر اُن کے لڑکی وداع کر دو گی"

محمد زمانی: "میری تو یہ خواہش نہیں ہے۔ انھوں نے بے خطا مجھے اور اپنے بھائی کو ہزاروں باتیں سنائیں....."

یہ حشر بیجا۔ ہمدی بیگی۔ سب جا بس کر دیا۔"

مولوی صاحب کے جواب کا مفہوم۔

"ہم مان لیتا ہوں کہ تمہارا بیان حرف بحرف صحیح
ہے اور تم بے خطا۔ قصور سرتا سر تمہاری نند کا ہے۔۔۔۔
تمہاری نند اور تمہارے شوہر دونوں نے ایک ہی ماں کی
کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے ایک ہی عورت کا دودھ پیا۔
کیا اس ماں کے دودھ کا یہی حق ہے کہ سلطان دولہا اس
خوشی کے موقع پر۔۔۔ حقیقی بہن کو ۔۔۔۔ اپنے گھر پر آنے
دیں اور تمہارے دسترخوان پر جہاں مجھ جیسے غیر متعلق کھاتے ہیں
سے پیٹ بھریں ماں جائی اور اس کے بچے قطعاً محروم رہیں۔
محمد زمانی بہ شادی اور اس کی مسرتیں فانی ہیں مگر
اس کے اثرات باقی رہیں گے اور اس سے بڑا سنگین
واقعہ تمہاری یہ حرکت ہوگی کہ تم سلطان دولہا کی بیوی
ہونے کی حیثیت سے اس کے عزیزوں کو اس بری طرح
دھتکارو کہ ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ ہو۔۔۔۔

مولوی صاحب کی تقریر سے محمد زمانی اور سلطان دولہا
اس قدر متاثر ہوئے کہ دونوں میاں بیوی فوراً کھڑے
ہوئے۔ ہم دونوں بھی ساتھ تھے: پھپی کی شادی کا نام
سنتے ہی آصف دلہن اچھل پڑیں بھاوج کے گلے میں بانہیں
ڈال دیں اور لپٹ کر رونے لگیں۔۔۔ محمد زمانی بیگم نے بھاوج
کے قدم پکڑ لئے اور دونوں نند بھاوجیں دیر تک روتی رہیں۔
کچھ دیر بعد آصف دلہن شوہر اور بچوں سمیت نظام الدین گئیں

(بہادر شاہ کی بھانجی نند کے قدموں پہ)

از دلی کی آخری بہار

"محمدی بیگم مرحومہ اور ان کے شوہر شہزادے نہیں
فقیر تھے اور صرف اس لئے زندہ تھے کہ مخلوق کی خدمت
کریں۔ میرے جد امجد کی شاگرد تھیں اور ہر جمعہ کو وعظ
فرماتی تھیں۔"

دلی والی اماں (دلی کی آخری بہار سے)

"مولوی عبدالقادر صاحب باوجود علم و فضل و ثقاہت
سنجیدگی کے نہایت زندہ دل ہنس مکھ تھے اور لڑکیوں کی
بہت زیادہ دلداری کرتے تھے۔"

ساٹھ برس پہلے۔ (دلی کی آخری بہار سے)

"مولوی حافظ عبدالقادر صاحب کی آنکھیں جلی ہوئی
تھیں۔ ہوا یہ تھا کہ انہیں شکار کا بہت شوق تھا بندوق
میں بارود کا فدہ وغیرہ بھر کر لوہے کے گز سے ٹھوک رہے تھے۔
بہت زور کا دھماکا ہوا اور دھواں آنکھوں میں جو بندوق
بالکل سیدھی ہوتی تو سارا چہرہ ہی جھلس جاتا۔

(مولوی عبدالغفار صاحب کا بیان)

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی سوانح عمری "حیات النذیر"
میں مولوی افتخار عالم مارہروی لکھتے ہیں۔

"مولوی عبدالقادر صاحب بادشاہ کی بہو مرزا فخرالملک
ولی عہد کی بیٹی محمدی بیگم کے استاد تھے اور مسجد
اورنگ آبادی کے امام بھی تھے اور دربار شاہی میں باریاب
بھی تھے۔ مولوی ذی علم اور صاحب اقبال تھے۔ حاجی
حافظ اور حکیم۔ گو باقاعدہ طب نہیں کرتے تھے لیکن فن
طب میں عبور کامل تھا اور خاص خاص معرکۃ الآرا علاج
کیا کرتے تھے۔ تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے مگر بطور ذریعہ
معاش نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعض عملیات مولوی صاحب
کے اب تک مشہور ہیں۔ ہمیشہ عاشورے کو وعظ کہا کرتے
تھے۔ محمدی بیگم کی زندگی تک ان کو خاندان شاہی سے
پنشن ملتی رہی۔ ایام غدر میں لیسن کی میم کو پناہ دی تھی۔
دہلی کے اعلی رؤسا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔
آدمی بڑے ذی وجاہت تھے۔ تمام شہر ان کو مانتا

تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے تاہم سارا کاروبار دربار شادی بیاہ کا یہی سرانجام دیا کرتے تھے کیونکہ ان کو اس کام میں خاص قسم کا سلیقہ تھا۔ تیس برس ہوئے انتقال ہو گیا۔ رمضان شریف میں تراویح سنایا کرتے تھے۔ قرآن مجید خوب یاد تھا۔ خوش الحان بھی تھے۔ پنجابی کٹرہ کی مسجد کی امامت قلعے کی اساميان نکاح خوانی اور نماز جنازہ بہ خدمتیں مولوی عبدالخالق نے بڑے بیٹے مولوی عبدالقادر کے سپرد کی تھیں مولوی عبدالرب وعظ کی مشق کیا کرتے تھے اور داماد میاں نذیر حسین محدث دہلوی درس طلبا اور فتویٰ دیتے تھے۔" (حیات النذیر)

"دلی کی آخری بہار" میں والد مرحوم کا ایک مضمون "شاہ جہاں آباد کے سدا بہار پھول" کے عنوان سے ہے جو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء کے ماہنامہ تمدن میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ایک صدی پہلے کے مسلمانوں کی انسانیت دکھائی ہے۔ کتاب کے پانچویں اڈیشن صفحہ ۳۴ پر ۵ - ۶ سطریں یہ ہیں۔

"ظہر کی نماز پڑھ کر نکلا تو چار جگہ پیسہ پیسہ کا گوشت لیا حکیم جی کی بیوی نے دال کا پیسہ بھیج دیا تھا۔ وہ لی۔ سلیم کے ہاں کا باجرہ لایا۔ محمود کی اماں نے جوار کا آٹا کہہ دیا تھا خانم کے بازار سے وہ لیا۔ وہیں عصر پڑھی۔ لوٹتے ہوئے کو دھیان آیا کرشتو کی اماں کئی دن سے ڈھوٹ کو کہہ رہی ہیں۔ چوک چلا گیا۔ شام آن پہنچی تھی۔ بھاگم بھاگ آیا اور ماما ایک ایک کے حصے دیئے۔ بیچاری حسینی کا آبخورہ پھر بھی رہ گیا۔ اب مغرب پڑھ کر وہ لایا۔"

ان سطروں میں درحقیقت علامہ راشد الخیری نے اپنے دادا مولوی عبدالقادر صاحب کے کردار کی جھلک دکھائی ہے اور اس کی تصدیق مولوی صاحب کے دوسرے پوتے مولانا عبدالغفار خیری کی اس تحریر سے ہوتی ہے۔

"ہمارے دادا ابا نابینا ہو گئے تھے۔ بڑھاپے کے زمانہ میں۔ اس وقت کوئی ۵۰ برس سے اوپر عمر ہو گی۔ جب کبھی بازار جاتے محلہ کی پردہ نشین اور ضعیف مستورات سے پوچھنا فرض تھا کہ کیا منگوانا ہے۔ ہر ایک کا سودا اس کے گھر پر پہنچا دیتے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ابن کورٹ نہ صدر کا ریلوی کونسل میں ملا چل ہو سکتا ہے مگر مولوی عبدالقادر صاحب کے فیصلہ کی اپیل نہیں ہر کے خدمت کرو تو مخدوم بنو۔ نماز کے بعد بجز بالی [illegible] عزیز اقارب سے ملتے جلتے مغرب کے وقت گھر پہنچے۔ جو سلوک کے قابل ہوتا اس سے سلوک کرتے۔"

مولانا عبدالغفار صاحب کی یہ تحریر ۱۹۳۳ء کی ہے اور ۱۹۳۳ء میں ان کا یہ بیان قلمبند کیا گیا۔

"مولوی عبدالقادر صاحب کا صبح شام دربار لگتا تھا۔ دھوبی کا جہاں مکان تھا اس کی دیوار سے ملی ہوئی ان کی چارپائی بچھتی تھی اور سارے محلہ کی رپورٹیں صبح پیش کی جاتی تھیں اور جن کے متعلق رپورٹیں کی جاتی تھیں وہ سامنے بلائے جاتے اور ان کے جھگڑے ختم کئے جاتے تھے۔ مولوی صاحب کا فیصلہ اٹل ہوتا تھا۔ اگر وہ جرمانے کرتے تو بسر و چشم منظور کئے جاتے تھے۔

خدا بخش نارکش گوندنی والے مکان میں رہتا تھا۔ وہ ان کا کرایہ دار تھا۔ ایک دن صبح دربار کرنے سے پہلے اس کے ہاں پہنچے کہ تین ماہ سے کرایہ نہیں دیا تھا اور کہا بس شام تک کرایہ پہنچا دو تین ماہ سے ٹال رہے ہو (کرایہ ڈھائی روپے ماہوار تھا) جب دربار لگا محلہ کی رپورٹیں گئیں تو خدا بخش کے متعلق کسی نے کہا مولوی صاحب کل سے خدا بخش کے ہاں فاقہ ہے۔

اسی وقت چاول دال گھی خرید کر پھاٹک حبش خاں

میں وہ بیاد پی کے پاس گئے کہ دو گھنٹے میں کھچڑی تیار
ہے ۔ یہ گیارہ بجے کا وقت تھا ۔ جس کے وقت تھوڑی سی
[illegible] جیش کے ہاں پہنچا اور آواز دی ۔ وہ باہر آیا تو کھچڑی
کہ شام کا وعدہ تھا اس وقت لیتے گئے ۔ فرمایا پردہ [illegible]
[illegible] کھانا کھلایا اور پھر برتن خالی [illegible] اترے تک گئے
[illegible] رو کر کہا ۔

"خدا معاف کرنا مجھے معلوم نہ تھا ۔"

عم مکرم مولوی بشیر الدین احمد مرحوم دار الحکومت دہلی
میں اپنے نانا مولوی عبدالقادر صاحب کے متعلق تحریر
فرماتے ہیں ۔

"حافظ حاجی اور دہلی کے مشاہیر میں سے تھے آپ
شیخ [illegible] عبدالقادر الخیری مولوی صاحب مخلوق شاہی کے
امام اور بیگمات کے استاد تھے ۔ قلعہ میں بڑی عزت
تھی اور تازیست ان کی تنخواہ جاری اور برقرار رہی ۔ غدر
میں سرسید کی جان بچائی ۔ ۔ ۔ باقاعدہ علم طب پڑھا تھا
مگر مطب نہیں کرتے تھے ۔"

مولوی عبدالقادر صاحب کے چھوٹے بھائی
مولوی عبدالرب ہر جمعہ کو تو وعظ کہتے ہی تھے ہفتہ میں ایک آدھ
وعظ اور ہو جاتا ہوگا مگر مولوی عبدالقادر صاحب سنا ہے
کہ ۹ محرم کی رات کو واقعہ شہادت بیان کیا کرتے تھے تو ہزاروں
کا مجمع ہوا کرتا تھا اور ان کا یہ وعظ والد مرحوم نے بھی سنا تھا ۔

مولوی عبدالغفار صاحب کا بیان ہے کہ

"مولوی صاحب حافظ تھے اور اپنے گھر میں چھت پر
ہر رمضان میں محراب سناتے تھے اور سارے محلہ میں اس کی
دھوم تھی ۔ اور بہت آدمی آتے تھے ۔"

شجرہ کس طرح ضائع ہوا

مولوی عبدالرب مرحوم نے "فردوس آسیہ"
میں اپنے خاندان کے بارے میں جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں
ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا مولوی حافظ خیر اللہ
صاحب عرب تھے ۔ قریش تھے اور نبی مکرم میں سے تھے مگر
خاندان کا پورا شجرہ معلوم نہ ہوتا یہ عجیب کی بات ہے جگہ
[illegible] صورت [illegible] تمکنی نسل دیکھتے تھے اور
جیسی نہیں چالیس پچاس نسلوں کا شجرہ زیر ہوتا تھا ۔ حافظ
خیر اللہ صاحب کے خاندان کا مکمل شجرہ بھی مولوی عبدالرب
صاحب کے زمانہ تک محفوظ تھا مگر وہ ضائع ہو گیا اور
جس طرح ضائع ہوا یہ واقعہ بذات خود بہت دلچسپ ہے
عم محترم مولانا عبدالغفار الخیری نے یہ واقعہ راقم الحروف
کو سنایا تھا جو قلمبند کر لیا گیا تھا اور ۳۰ جنوری ۱۹۶۳ء
کو محترم نے اس پر اپنے دستخط بھی فرمائے تھے ۔

چچا صاحب نے فرمایا !

"دادا ابا (مولوی عبدالقادر صاحب) کے تمام
کاغذات چونگے میں رہتے تھے (چونگہ بانس کا ہوتا تھا ۔
گرہ یا گانٹھ کاٹ کر خول کے اندر چیزیں چھپا کر رکھتے ہیں
رکھتے تھے) ۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دادا ابا نے ایک میم
کی جان بچائی تھی ۔ یہ سن کی میم تھی ۔ لاشوں کے ڈھیر میں
سے کراہنے کی آواز آرہی تھی اسے سنکر مولوی عبدالقادر اور
میاں نذیر حسین ٹھہر گئے (سالے بہنوئی تھے) میم کو نکال کر
گھر لائے ۔ اُپلوں کی کوٹھری میں چھپا دیا ۔ مرہم پٹی کی ۔
علاج کیا ۔ اچھی ہوئی تو اس نے درخواست کی کہ کیمپ
میں بھیج دی جائے ۔ ہیسن کا رہنے والا تھا انگریز کمانڈر کے
پاس چٹھی بھجوائی گئی ۔ اس کا جواب ملا کہ فلاں دن فلاں وقت
قدم شریف پہنچا دو ۔ وہاں سے ہم لے لیں گے ۔ منت
چڑھانے کے بہانے عورتیں قدم شریف گئیں ۔ دونوں سالے

بہنوئی ساتھ تھے۔ انگریز وہاں سے میم کو لے گئے۔
مولویوں نے فتوے دئے تھے۔ پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی
یہ دونوں بھی پکڑے گئے اور دونوں کو پھانسی کا حکم ہوا۔
دلی دروازہ سے کشمیری دروازہ جو سڑک جاتی ہے۔ اس پر
قلعہ کے سامنے درختوں پر رسیاں تھیں۔ وہاں پھانسیاں
دی جاتی تھیں۔ یہ دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے بندھے
ہوئے کھڑے تھے۔ اسی وقت لیسن اور اس کی میم آ رہے
تھے۔ انھوں نے پہچانا۔ کمانڈر سے گفتگو کی اس نے کہا۔
"اتنی مہلت دے سکتا ہوں۔ قلعہ میں اڈجوٹنٹ جنرل
ہے۔ اس سے اجازت لاؤ۔ چھوڑ دوں گا"

چنانچہ اجازت ملی اور وہ چھوڑ دئے گئے۔ میم
نے کہا ان کو انعام ملنا چاہئے۔ چنانچہ پورا پنجابی کٹرہ اور
روشن آرا باغ مولوی عبدالقادر صاحب کو دیا گیا! احکام
کے یہ کاغذات۔ شجرے کے کاغذات اور یہ شاہی شقے۔
سب کے سب کاغذات چونگے میں رکھے جاتے تھے مولوی
عبدالخالق صاحب کی بھانجی یعنی بہن کی بیٹی (جو مولوی
عبدالمجید فٹ بال پلیئر کی دادی تھیں) کو غصہ آگیا کہ ماموں
زاد بھائی (مولوی عبدالقادر صاحب) کو اتنا بڑا انعام
ملا اور ہم رہ گئے۔ انھوں نے موقع پاکر سارا چونگہ
چولھے میں رکھ دیا!"

مولوی عبدالقادر صاحب کی بیٹی کی شادی

والد مرحوم نے اپنے بڑے پھوپا ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی رحلت پر جو مضمون لکھا تھا اس میں ان کی شادی کا بھی ذکر کیا تھا:۔

"پنجابی کٹرہ جو دلی کے ریلوے اسٹیشن پر اس طرح
قربان کیا کہ آج اس کا نام ونشان تک نہیں میرے آباد
اجداد کا مسکن تھا۔ اور پنجابی کٹرہ کی وہ مسجد جس میں میرے

جد امجد مولوی محمد عبدالخالق صاحب حدیث کا درس دیتے
تھے طلبا کا دارالقیام۔ ۱۸۴۵ء یا اس کے لگ بھگ کا ذکر
ہے کہ علامہ موصوف (ڈپٹی نذیر احمد) تحصیل علوم کی غرض
سے اس مسجد میں داخل ہوئے۔

ان ہی دنوں میری پھوپی کے عقد کی تجویز پیش ہوئی۔
اگلے لوگوں کی باتیں ان ہی لوگوں کی سزاوار تھیں۔ بڑی بڑی
درخواستیں موجود تھیں اور ارمان تھا کہ مولوی زادی کی
پالکی دروازہ پر اترے والیں۔ مولانا مرحوم (ڈپٹی نذیر احمد)
کی طرف کیا عزیز اقارب اور کیا دوست آشنا کسی کا
وہم وگمان بھی نہ تھا اور ہو بھی نہ سکتا تھا۔ امیروں رئیسوں
عالموں فاضلوں کے ہوتے ساتھی ایک پردیسی طالب علم
کو کون پوچھتا۔ مختصر یہ کہ مولوی عبدالخالق مرحوم کے سامنے
سب نام پیش کئے گئے۔ اللہ غنی کس دل گردے کے لوگ
اور کیسے صابر شاکر بندے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم
کیا فرماتے ہیں۔

جس شخص میں یہ تین صفتیں ہوں اس سے کردو۔
نماز کا پابند۔ معاملہ کا اچھا اور زبان کا سچا۔
امیدواروں میں تو ایک بھی اس کسوٹی پر پورا
نہ اترا۔ تلاش کے دائرہ کو وسیع کیا تو نگاہ مولانا مغفور پر
جا کر ٹھٹکی۔ آج مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم اور مولوی نذیر احمد صاحب
مغفور دونوں اس دنیا میں نہیں مگر مولوی عبدالخالق صاحب
مرحوم جیسے جید عالم کی پوتی کا بیاہ لینا جس کے عقد کی شرطیں
یہ کچھ کڑی ہوں استاد مرحوم ہی کا کام تھا۔

خدا غریق رحمت کرے میری بڑی پھوپی کو اپنی شادی کا
ذکر اس طرح فرماتی تھیں کہ جب مسجد میں نکاح ہو چکا ہے تو
دولھا کو ہم سب نے بھی دیکھا۔ کرتہ پاجامہ سفید تھا۔ ٹوپی
بھی خاصی تھی مگر جوتی کے کنتے نکلے ہوئے تھے۔ اماں نے

ایک عورت کے ہاتھ پکنے سے ایک روپیہ بھجوا دیتی تھیں لو۔ تھوڑی دیر بعد عورت ہونے جانے والیس لائی اور کہا سو ا بارہ آنے کی جوتی آئی ہے۔

اقرار نامہ

حیات النذیر میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب نکاح کی موسز میں درج کی گئی ہیں۔

مولوی عبدالقادر صاحب نے داماد سے یہ اقرار نامہ لکھوایا تھا کہ لڑکی کو باہر پردیس میں نہ لے جائیں گے اور میری حیات بیوی کے دوسرا نکاح نہ کریں گے۔ چونکہ داماد نہ صرف پردیسی تھے بلکہ گاؤں کے رہنے والے تھے جہاں کی زبان معاشرت تہذیب دلی سے مختلف تھی اس لئے یہ اقرار نامہ لکھوایا گیا تھا۔ علامہ مغفور نے بھی اپنے دونوں دامادوں سے اسی قسم کا اقرار نامہ لکھوایا تھا۔

میم کی جان بچانے کا واقعہ

علامہ مغفور کے دادا مولوی عبدالقادر صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ایک میم کی جان بچائی تھی اور علامہ مغفور نے تفصیل سے اس واقعہ کو ۱۹۳۱ء کے عصمت میں لکھا تھا۔ یہ مضمون "دلی کی آخری بہار" میں ہے۔ لاہوری دروازہ کے پاس مولوی عبدالقادر صاحب نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی اور پاس گئے اور رات کے ابتدائی حصے میں انگریز عورت کو کندھے پر اپنے گھر میں لائے تو زخمی خاتون سسک رہی تھی اور جسم کے اکثر حصوں سے خون نکل رہا تھا۔ عورتوں نے زخم کو دھویا پانی اور شربت پلایا رات کے دو بجے تھے کہ بہت سے آدمی دین دین پکارتے دروازہ پر آئے سب کی سب ہی ست پر جان تھی مولوی صاحب نے اپلوں کی کوٹھری میں میم کو چھپا دیا۔ پندرہ بیس آدمی گھر میں گھس آئے۔ چپہ چپہ کونا کونا دیکھا اپلوں کی کوٹھری کو دیکھا مگر خدا نے آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور پیچھے پیچھے چلے گئے اس کے بعد علامہ مغفور کے الفاظ میں اس واقعہ کو سنئے۔

"ہفتہ بھر سے زیادہ ہو چکا۔ زخمی کی دوا نیم کی پتیاں اور غذا شوربوں کا پانی ہے مگر قدرت کے تماشے دیکھنے کے قابل ہیں۔ حالت روز بروز بہتر ہو رہی ہے۔ زخم بھر رہے ہیں اور دماغ لمحہ بلمحہ صحیح ہوتا جاتا ہے۔ باغیوں کا زور بھی ٹوٹ چلا ہے بہتر ہے۔ وہ تھا کہ صبح کے وقت مہمان نے میزبانوں سے رخصت طلب کی اور کہا مجھ کو انگریزی کیمپ تک پہنچا دیجئے۔ یہ خواہش بھی کچھ کم خطرناک نہ تھی۔

رات کے آخری حصے میں عورتوں نے اپنے مہمان کو وداع کیا۔ جدائی کے وقت میم نے میزبان سے کہا۔ جب تک شہر کی حالت ٹھیک نہ ہو میں آپ سے نہیں مل سکتی۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو میرا نام یاد رکھئے۔ مسز لیسن۔ میں آپ کے احسانات کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتی۔ امن ہوتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گی۔

روزانہ آٹھ بجے کے قریب کنارے من پر کوتوالی اور دہلی دروازہ کے باہر پھانسیاں ہوتی تھیں اور مٹکاف صاحب کے ایک اشارے پر سینکڑوں بندگان خدا دنیا سے رخصت ہو جاتے ..... مرحوم مولانا عبدالقادر کے حقیقی ہم زلف مٹکاف صاحب کی ناک کے بال تھے اور مخبروں کے سردار ان کی اطلاع پر مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم گرفتار کئے گئے اور چار آدمیوں کی زبانی شہادت پر پھانسی کا حکم ہو گیا......

صبح کے آٹھ بج چکے تھے گورا فوج کا دستہ مسلح کھڑا ہے۔ دو آدمی گھوڑوں پر دلی دروازہ کی طرف سے نکلے ان میں ایک میم تھی ایک انگریز مسٹر لیسن اور مسٹر لیسن مسز لیسن نے مولوی عبدالقادر صاحب کو مشکیں بندھا دیکھا۔ جیب میں سے پنسل نکال اپنی ٹوپی پر لکھا "انتظار کرو" ٹوپی درخت پر لٹکا دی۔ پہرہ دار کو حکم دیا صاحب کو دکھا دینا اور

گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔"

اس واقعہ کو مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کے ایک اور پوتے مولوی عبدالغفار صاحب نے بیان کیا ہے اور اُن کا بیان "شجرہ کس طرح ضائع ہوا" کے تحت ابتدائی صفحوں میں آچکا ہے۔

مولوی عبدالقادر صاحب کی مشکیں کھول دی گئیں تو قاری صاحب کی مشکیں باندھ کر لٹکا دیا گیا۔ علامہ مغفور کا بیان ہے کہ

"جب قاری صاحب پھانسی پر چڑھنے لگے تو مولوی صاحب کی خواہش پر میم نے سفارش کی اور قاری صاحب اس شرط پر چھوڑے گئے کہ دو سال کے واسطے شہر سے باہر چلے جائیں۔ مٹکاف صاحب نے مولوی صاحب کو رتھ پر بٹھایا اور مسز لیبن کو ساتھ لے کر چھاؤنی روانہ ہوئے شام کو ایک بہت بڑی دعوت ہوئی جس میں مولوی صاحب اور مسز لیبن کھانے پر برابر برابر بیٹھے... مسٹر اور مسز لیبن اس کے بعد مولوی صاحب کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ پنشن کے بعد بھی ولایت نہ گئے اور دہلی میں رہ پڑے۔"

(دلّی کی آخری بہار)

مولوی عبدالقادر صاحب کی قبر

مولوی عبدالقادر صاحب موتی مسجد کے پیش امام شہزادیوں کے اتالیق تھے اور بہادر شاہ ظفر نے روشن آرا باغ کی آمدنی اُن کے لئے وقف کر دی تھی۔ بادشاہ کا شقہ یعنی شاہی فرمان کہ مولوی عبدالقادر صاحب کو روشن آرا باغ مرحمت کیا جاتا ہے شجرہ اور دوسرے کاغذات کے ساتھ جلا دیا گیا تھا (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے باغ پر قبضہ کر لیا اور پنجابی کٹرہ کا ایک حصہ میم کی جان بچانے کے عوض مولوی عبدالقادر صاحب کو دے دیا گیا۔ بعد میں پنجابی کٹرہ ختم کر دیا گیا تو مولوی صاحب نے بتاشوں کی گلی میں مکان خرید لیا۔ غدر کے سب ہنگامے اور دبے ہوئے تھے اس لئے روشن آرا باغ کا مطالبہ نہیں کیا۔ شاہی شقہ کی نقل منشی بہادر کے پوتے محمد عبدالوہاب صاحب کے پاس تھی۔

۱۸۸۳ء کے لگ بھگ جب علامہ راشد الخیری کی عمر ۱۴-۱۵ سال تھی مولوی عبدالقادر صاحب نے ۹۶ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ کلو کا تکیہ اور ترکا تکیہ غربا کے دو قبرستان دلّی میں تھے۔ اور مہندیوں میں جہاں شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالرحیم کے مزارات ہیں زمین مہنگی تھی۔ قدم شریف میں بھی سستی نہ تھی مگر درگاہ خواجہ باقی باللہ کی زمین بہت مہنگی تھی اور یہی اس خاندان کا قبرستان تھا۔ درگاہ کے باہر جنوبی سمت دیوار سے ملی ہوئی دو قبریں ایک چار دیواری میں ہیں۔ سرہانے مولوی عبدالقادر صاحب کی قبر ہے اور اس کے پائنتی ان کی بیوی حاجیہ بیگم مرحومہ کی جن کا انتقال ۹۰ سال کی عمر میں ۱۸۷۶ء میں ہوا تھا۔ بڑے رعب داب کی بزرگ تھیں اور "بڑی استانی جی" کہلاتی تھیں زندگی کے آخری دور میں سارے دن قرآن شریف پڑھتی رہتی تھیں۔ کوئی آگیا جزدان کر لیا۔ چلا گیا۔ پھر تلاوت شروع کر دی۔

مولوی عبدالرب صاحب

مولوی عبدالخالق صاحب کے دوسرے بیٹے مولوی عبدالرب صاحب تھے اور انھوں نے باپ کی زندگی ہی میں وعظ کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی تقریر میں بڑا اثر تھا اس لئے "سحر البیان" کہلاتے تھے۔ حضرت والد مرحوم نے ان کے دو لطیفے سنائے تھے۔ سہارنپور میں جامع مسجد دلّی کی جامع مسجد کے نمونہ پر مولوی عبدالرب صاحب نے بنوائی تھی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب مسجد تعمیر ہو رہی تھی۔ ان کے وعظ کے بعد چندہ ہوا کسی عورت نے وعظ سے متاثر ہو کر پاؤں

تھا ایک بھائجن آتار کر دے دیا انھوں نے جو ایک جھائجن دیکھا تو فرمایا "اسے بھی یہ بیچاری کون عورت ہے جس کا ایک پاؤں جنت میں ہے اور دوسرا دوزخ میں" اس عورت نے سنتے ہی دوسرے پاؤں کا جھائجن اُتار کر مولوی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔

دوسرا واقعہ یاد نہیں کس شہر یا قصبہ کا سُنایا تھا کہ مولوی عبدالرب صاحب نے نماز فجر کی اذان سُنی تو مسجد کی طرف گئے۔ مسجد میں پہنچے تو مؤذن نظر نہ آیا مگر اذان ہو رہی تھی۔ آواز کی طرف بڑھے تو حجرہ میں دیکھا مؤذن صاحب لحاف میں لیٹے ہوئے اذان دے رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے پوچھا "یہ کیا حرکت ہے؟" انھوں نے کہا "آپ سوئے کو جگانے سے مطلب تو اذان سے ہے وہ ہو جاتی ہے۔"

مولانا عبدالغفار صاحب کا بیان ہے کہ "چھوٹے دادا ابا سے میری شکل بہت ملتی تھی اور وہ کہا کرتے تھے آگیا میرا ہم شکل۔ میں بارہ تیرہ سال کا تھا۔ آگرہ سے دلّی آرہا تھا کلکتے کے ایک تاجر بھی اس ڈبّہ میں سفر کر رہے تھے۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے مجھے دیر تک غور سے دیکھتے رہے۔ آخر ضبط نہ ہو سکا۔ تو اُٹھے۔ میرے پاس آئے اور کہا "صاحبزادے کہاں جا رہے ہو" میں نے کہا "دلّی" پوچھا "کس محلہ میں" میں نے بتایا "بتاشوں کی گلی کو چہ نواب مرزا" کہنے لگے۔ "مولوی عبدالرب صاحب سے کیا رشتہ ہے؟" میں نے کہا۔ "میرے دادا کے چھوٹے بھائی ہیں؟" یہ سنتے ہی انھوں نے میرے ہاتھ چومے اور مجھے بستر پر لٹا کر میرے پاؤں دبانے لگے۔"

مولوی عبدالقادر صاحب نے جب کھاری باؤلی کا مکان خرید لیا تھا تو مولوی عبدالرب نے تالاب (ہملٹن روڈ) کنجڑیوں کی گلی میں بہت بڑا مکان خریدا تھا یہ کسی وزیر کا تھا اور کم قیمت میں انھیں مل گیا تھا۔

مولوی صاحب کی یادگار رسہار نپور کی جامع مسجد ہی نہیں ہے۔ دلّی میں مدرسہ عبدالرب بھی ۱۹۴۷ء تک موجود تھا۔ مولوی صاحب نے نثر و نظم میں کئی کتابیں لکھی تھیں ان میں "فردوس آسیہ" بہت مشہور ہوئی اور اب بھی مذہبی کتابوں کے پرانے تاجروں کے ہاں مل جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے ساری زندگی باپ دادا اور بڑے بھائی کی طرح دین کی خدمت میں گزار دی۔ مولوی شاہ محمد امان الرحمٰن صاحب وصال الجمیل میں لکھتے ہیں کہ

"زیر جامع مسجد کٹرہ نظام الملک والی مسجد میں بعد نماز جمعہ ۲۹ برس تک خلق اللہ کو اپنے وعظ و ارشاد سے مستفید فرماتے رہے۔"

علم و فضل میں اُن کا پایہ بھی بہت بلند تھا اُن کی بیوی کے ہاں بائیس ۲۲ بچے ہوئے صرف ایک لڑکے مولوی ادریس بچے تھے وہ بھی جوان ہو کر باپ کے سامنے مر گئے اور مولوی عبدالرب کی نسل کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

درگاہ باقی باللہ کے قبرستان میں مولوی عبدالقادر صاحب کی قبر کے سامنے دو تین قبریں چھوڑ کر مولوی عبدالرب صاحب اور ان کے برابر ان کے بیٹے مولوی ادریس صاحب کی قبریں ۱۹۴۷ء تک تھیں۔

شمس العلما میاں نذیر حسین "محدث دہلوی"	مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم کے داماد میاں صاحب

بڑے زبردست عالم گزرے ہیں مولوی عبدالقادر صاحب کا قلعے سے تعلق ہو گیا تو میاں نذیر حسین صاحب نے اپنے خسر کا مکتب سنبھالا پنجابی کٹرہ ختم ہونے کے بعد میاں نذیر حسین مرحوم حبش خاں کے پھاٹک میں آگئے

کیونکہ پنجابی کٹرہ ختم کر کے پنجابیوں کو پھاٹک حبش خاں دیدیا گیا تھا۔ میاں صاحب کا انتقال ۱۰۱ سال کی عمر میں ہوا۔ سرسید آثار الصنادید میں لکھتے ہیں۔

"زبدۂ اہل کمال۔ اسوۂ ارباب فضل و افضال بہت استعداد ہیں خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی کہ اپنے نظائر و قرون سے گوئے سبقت لے گئے ہیں روایت کشی میں آج بے نظیر ہیں"۔

مولوی عبدالقادر صاحب کی اولاد

مولوی حافظ عبدالقادر صاحب کے پانچ بچے تھے۔

(۱) اُم صفیۃ النساء مرحومہ (ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی بیوی)

(۲) اُم ذکیۃ النساء مرحومہ (مولوی احمد حسن تحصیلدار کی بیوی)۔

(۳) مولوی حافظ عبدالواحد مرحوم (علامہ راشد الخیری کے والد)۔

(۴) ڈپٹی عبدالحامد مرحوم (مولانا عبدالغفار کے والد)۔

(۵) حافظ قاریہ اُم عطیۃ النساء مرحومہ (چھوٹی استانی جی)

علامہ مغفور کی پھوپیاں

(۱) بی بی اُم صفیۃ النساء مرحومہ

مولوی عبدالقادر صاحب کی بڑی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے ہوئی۔ اس نکاح کا حال پہلے آ چکا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب مولوی عبدالقادر صاحب کے بھی شاگرد تھے اور میاں نذیر حسین صاحب کے بھی کھانا مولوی عبدالقادر صاحب کے ہاں سے جاتا تھا۔ جس بچی کو وہ گود میں اٹھائے کندھے پر چڑھائے بہلاتے اور کام کاج کرتے تھے وہی ایک دن اُن کی بیوی بنیں۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب علامہ مغفور کے "بڑے پھوپا ابا" تھے۔ اتنا زبردست عالم اس قدر بلند پایہ ادیب ایسی جامع شخصیت برسوں میں جاکر کسی خوش قسمت قوم میں پیدا ہوتی ہے۔ اپنے "ان بڑے پھوپا ابا"، کی رحلت پر علامہ مرحوم نے تحریر فرمایا تھا:-

"مولوی نذیر احمد کی موت ہم سے ایک ایسے بزرگ کو جدا کر گئی جس کی نظیر آنے والی دنیا اب مشکل سے پیدا کرے گی۔۔ مگر مولانا مرحوم نے دلی کی زبان اس طرح حاصل کی کہ اردوئے معلی کا مزہ آ گیا۔۔۔۔ اب عربی مدتوں مولوی نذیر احمد پر حسرت سے آنسو بہائے گا اور قوم ہمیشہ مولانا مرحوم کی بیش بہا خدمات کی ممنون رہے گی"۔ (تمدن سی ۱۹۱۲ء)

مرحومہ اُم صفیۃ النساء کی اولاد

مرحومہ اُم صفیۃ النساء اور مولوی نذیر احمد صاحب کے بچوں میں صرف تین زندہ رہے مولوی بشیر الدین احمد صاحب جو حیدر آباد دکن میں اول تعلقدار تھے اور وظیفہ لینے کے بعد دلی آ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا اور درگاہ خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہوئے۔ ان پھوپی زاد بھائی کی رحلت پر عصمت میں آپا جان کا مضمون شائع ہوا تھا اس میں تحریر فرماتی ہیں۔

"بھائی بشیر میں بعض باتیں اتنی اچھی تھیں کہ اب کم از کم ہمارے خاندان میں ایسے لوگ مشکل سے پیدا ہوں گے۔ ان میں ایک لاکھ روپیہ کی صفت یہ تھی کہ وہ کسی شخص سے بھی سخت سے سخت تکلیف پہنچ جانے کے بعد قطع تعلق کرنا ناپسند کرتے تھے۔ بہت جلد برہم ہو جاتے تھے مگر غصہ بہت جلد زائل ہو جاتا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ان کے مزاج میں سادگی بہت تھی تصنع اور بناوٹ سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ مذہبی عنصر بہت زیادہ غالب تھا"۔ (عصمت جولائی ۱۹۲۷ء)

بڑے ابا مولوی بشیر الدین احمد صاحب کی اولاد میں مولوی شاہد احمد رسالہ ساقی کے ذریعہ اردو ادب کی خدمت

تیس سال عسکری رہے ہیں اور موسیقی کے بھی بڑے عالم ہیں۔
میرے اباّ کی ایک بہن بی بی سکینہ بیگم تھیں جن کے
شوہر مولوی احمد حسن صاحب تھے۔ "احسن التفاسیر" مولوی
صاحب کی بہت مشہور کتاب ہے۔ مولوی اشرف حسین صاحب
کی بیوی حسینہ بیگم صاحبہ انہیں کی بیٹی تھیں۔

پھوپی سکینہ بیگم صاحبہ سے چھوٹی پھوپی صغرا بیگم
تھیں جن کی یاد میں ۱۹۳۶ء میں والد مرحوم نے مضمون لکھا
تھا اس کی چند سطریں یہ ہیں۔

"صغرا بیگم مرحومہ کا اسد خط تھا پاکیزہ تھا کہ آج کل کی
تعلیم یافتہ لڑکیوں میں مشکل سے شاید دو ایک کا ایسا
ہو۔ فارسی بہت اچھی جانتی تھیں۔ مشکل سے ممکن تھا کہ
ان کے سامنے کوئی غلط قرآن پڑھے اور وہ نہ ٹوکیں۔
رمضان بھر مساجد کے فطاریوں کے علاوہ نہ معلوم کتنی
عورتیں ان کے ہاں روزہ کھولتی اور کھانا کھاتی تھیں۔ غریب
عزیزوں کی تنخواہوں کے علاوہ محلے میں جس شخص کو قرض
کی ضرورت ہوتی تھی، چیز رکھی اور روپیہ ان سے لے لیا۔
دو مرتبہ جائداد کی مالک تھیں مگر جب کبھی مرمت کی ضرورت
ہوتی جس قدر چونا اینٹ مٹی آتا پہلے اس سے کسی مسجد کی
مرمت ہوتی۔"

قطب صاحب میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے احاطہ
میں پھلکی والوں کا قبرستان ہے۔ پھوپی صغرا بیگم کی وہیں
قبر ہے۔ ان کے شوہر خان بہادر شرف الحق حیدر آباد میں
کسی بڑے عہدے پر تھے۔ پھوپی صغرا کے دو بیٹے تھے دو
بیٹیاں۔ ڈاکٹر مشرف الحق ایم اے پی ایچ ڈی ڈھاکہ میں پروفیسر تھے
ان کی دوسری بیوی جرمن خاتون تھیں پہلی بیوی کی بیٹی
مرحومہ سعیدی تھیں جن کے شوہر مولوی احتشام الدین
نے ڈاکٹر عبدالحق کی اردو انگریزی لغت تیار کی تھی۔
بھائی مشرف کے نواسے شان الحق حقی ترقی اردو بورڈ کے
سکریٹری لغت اردو کی تدوین کے سلسلہ میں اردو کی اہم
خدمت کر رہے ہیں۔ پھوپی صغرا بیگم کے دوسرے بیٹے
ڈاکٹر اشرف الحق میڈیکل پروفیسر اور سرجن حیدرآباد کے کامیاب
ڈاکٹروں میں تھے۔ والد مرحوم کے رشتے میں۔ دونوں ڈاکٹر بھانجے
تعطیلوں میں اکثر ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ پھوپی صغرا بیگم نے دو
بیٹیاں چھوڑیں آپا اصغری بیگم کا انتقال ہو گیا۔ آپا قیصری بیگم
حیدر آباد دکن میں بقید حیات ہیں۔ اپنی ماں کی طرح ان کا خط
بھی پاکیزہ ہے۔ کئی مذہبی کتابیں لکھی ہیں مگر شائع نہیں ہوئیں
ان کی بیٹی محمدی بیگم بی اے جب تک حیدرآباد دکن میں رہیں
عورتوں کی انجمنوں کی سرگرم رکن تھیں۔ آج کل لاہور میں
ہیں اور سرکاری ملازم ہیں۔

مرحومہ ام صفیۃ النسا کنبہ پر دادی تھیں۔ ڈپٹی
نذیر احمد صاحب کی زندگی میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنے
ماں باپ کے قریب ان کی قبر خواجہ باقی باللہ میں ہے۔

(۲) بی بی اُم ذکیۃ النسا مرحومہ | مولوی عبدالقادر صاحب کی منجھلی

بیٹی تھیں۔ ان کے شوہر مولوی سید احمد حسن صاحب مرحوم
حیدر آباد دکن میں تحصیلدار تھے۔ دادی اماں کے پاس اکثر
آیا کرتی تھیں۔ تین چار دفعہ میں نے بھی دیکھا ہے۔ ہمیشہ
سفید براق کپڑوں میں۔ نورانی صورت تھی اور سفید بھک
بال۔ کبھی کبھی وعظ بھی کہتی تھیں اور لڑکیوں کو قرآن مجید و نماز
پڑھاتی اور مسئلے مسائل بتاتی تھیں۔ غالباً ۱۹۲۰ء میں
آخری دفعہ دیکھا تھا جب میری منجھلی بہن ساجدہ کا سرسام
میں انتقال ہوا تھا اور منجھلی پھوپی اماں نے اسے نہلا کر
کفنایا تھا۔ غربا کی خاموشی سے مدد کرتی تھیں۔

بی بی اُم ذکیتہ النساء مرحومہ کی اولاد

ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ پھوپی حاجرہ بیگم والد مرحوم کی ہم عمر تھیں اور آبا سے تُو تکار کی باتیں ہوتی تھیں۔ اُن کے شوہر آغا حاتم مرزا کوتوال تھے اور بڑے دبدبے کے آدمی۔ جلال ان کے چہرے سے ٹپکتا تھا۔ ان کی اولاد میں صرف بھائی خورشید مرزا بچے تھے جن کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی مگر دیکھنے والی آنکھ کے لئے ان کی زندگی کے آخری تیس سال بڑے عبرت ناک تھے۔ دوسری بیٹی رضیہ بیگم تھیں جنھوں نے دو بچے چھوڑے پروفیسر نورالحسن برلاس مرحوم جو جاپان میں اُردو پڑھاتے تھے اور بہت شریف انسان تھے دوسری آپا نور جہاں جو بقید حیات ہیں۔

ابا جان کی منجھلی پھوپی اماں کے تین بیٹے تھے۔ مولوی اشرف حسین صاحب علامہ مغفور سے عمر میں ۵-۶ سال بڑے تھے۔ نہ صرف بھائی بلکہ دوست بھی تھے دَدھیال اور ننھیال میں سب سے زیادہ انھیں سے تعلقات تھے۔ "شاہ جہاں آباد کے عناصر اربعہ" کے عنوان سے ۱۹۳۶ء میں حضرت والد مرحوم نے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ ساقی میں شائع ہوا تھا اس میں انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے تین دوستوں کا ذکر کیا ہے۔ مولوی اشرف حسین صاحب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"حق یہ ہے کہ قدرت نے دماغ ان کو دیا تھا وہ ہر اعتبار سے بے مثل تھا۔ مدرسے میں ان کے اُستاد مولانا حالی اور خواجہ شہاب الدین دونوں ان کی قابلیت کے معترف رہے۔ کالج میں آلنٹ صاحب نے اپنی تقریروں میں بارہا ان کی ذہانت کا ذکر کیا۔ ان کے مزاج میں جس قدر سنجیدگی تھی اسی قدر ظرافت۔ اور سب سے زیادہ قابل رشک یہ چیز تھی کہ ان کی ہر حیثیت ایک سے ایک ارفع و اعلیٰ تھی، شفیق باپ سعادت مند بیٹا۔ عزیز بھائی۔ محبوب شوہر۔ قابل قدر عزیز۔ اور بے مثل دوست۔

ان کی ملازمت محکمہ زراعت کی انسپکٹری سے شروع ہوئی مگر ان کی صداقت ترقی کے راستے میں زنجیر بن کر ان کے پاؤں میں پڑی ..... اور وہ ترقی کی طرف ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکے۔ انھوں نے گراموفون جیسے خشک مضمون میں ایسی ظرافت پیدا کر دی تھی کہ مخزن کے وہ اوراق جن میں یہ چھپنے والے رجب میں اس کا ایڈیٹر رہا تھا ہاتھوں ہاتھ اُٹھ گئے ..... وہ لکھنے کے چور نہیں تھے مگر ان کا مذاق اس قدر بلند تھا کہ مولانا حالی اپنے اُستاد کی بابت بھی ان کی یہ رائے تھی کہ شعر جتنا اچھا سمجھتے ہیں اتنا اچھے کہتے نہیں۔ میرے اصرار پر انھوں نے مثنوی میر حسن (بدر منیر) کا دیباچہ لکھا اور ایسا لکھا کہ جو پڑھ چکے ہیں انھیں کے دل جانتے ہوں گے کہ مثنوی سحر البیان کیا چیز ہے۔ مرحوم کو شہرت سے اس قدر بیزاری تھی کہ وہ اپنے نام کی اشاعت بھی آسانی سے گوارا نہ کرتے تھے ..... وہ اس قدر غیور طبیعت کے تھے کہ انھوں نے ہر عزیز ہر دوست ہر آشنا پر احسان کیا مگر یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ خود کسی کا احسان اُٹھائیں۔ موسیقی میں ان کا پایہ بلند تھا کبڈی، اچھی اور کرکٹ بہت اچھا کھیلتے تھے۔ تیر ناہم سب سے اچھا جانتے تھے۔ اور نظم کی ترمیم تو ایسی کرتے تھے کہ سبحان اللہ۔

"آج وہ بلبل ہزار داستان جو مولانا اشرف حسین کے جسد خاکی میں کام کر رہی تھی خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں زندگی کے جھگڑوں سے چھوٹ کر میٹھی نیند سو رہی ہے۔"

(ساقی ۱۹۳۶ء)

مولوی اشرف حسین صاحب کے دو بیٹے تھے احسن حسین صاحب چشتی جو علامہ مغفور کے نام سے ساقی میں لکھتے تھے

[illegible] سے چھوٹے [illegible] اجل حسین مرحوم۔ تین بیٹیاں تھیں
آپا حمید خان بہادر ناصر علی خاں صاحب کی بہو اور سید
[illegible] علی صاحب سالٹ سپرنٹنڈنٹ کی بیوی تھیں ان کے
بچے نعمان صبری وکیل پہلے ڈرامے وغیرہ لکھتے تھے اب بیدار
[illegible] آپا صغیرہ کے شوہر قاضی عباس حسین
صاحب نظیف دہلوی بہت اچھی زبان لکھتے ہیں۔ عروس
ادب وغیرہ ان کی تین چار کتابیں نثر میں شائع ہو چکی ہیں
ان کی نظمیں قطعات وغیرہ بھی ظرافت آمیز اور دلی کی
بیگماتی محاوروں سے لبریز ہیں ان گنت ہیں۔ مولوی اشرف حسین
صاحب کی اولاد میں صرف ایک بیٹی بصیرہ بیگم بقید حیات ہیں۔
مولوی اشرف حسین صاحب سے چھوٹے مولوی
نور حسین صاحب تھے جن کی خان بہادر میر ناصر علی کی بیٹی
کبرا بیگم سے شادی ہوئی تھی پہلے حیدر آباد میں تحصیلدار
تھے اور آخر میں سکرٹیریٹ میں ملازم تھے وہ لاولد رہے
بصیرہ بیگم بنت مولوی اشرف حسین کو بیٹی بنا لیا تھا۔
علامہ مغفور کی منجھلی پھوپی اماں کے چھوٹے بیٹے
مولوی حافظ اسعد حسین صاحب عرشی تھے جن کی ملازمت
تھانیداری سے شروع ہوئی اور تھانیداری ہی سے پنشن
لی۔ شاعر تھے اور کلام بہت اچھا تھا ان کے سلام نعتیں
سہرے اور مختلف موضوعوں پر نظمیں عصمت مخزن تمدن
تہذیب نسواں میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کی شادی پھوپی
حامدہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس خاندان کی لڑکیوں کی اولاد
میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ڈاڑھی نہیں رکھی۔

حافظہ قاریہ اُمِ عطیۃ النساء مرحومہ

مولوی حافظ عبدالقادر
صاحب مرحوم کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں ان کی رحلت
پر علامہ مغفور نے عصمت میں جو مضمون لکھا تھا اس کا
ایک حصہ یہ ہے:-

حافظہ حاجیہ قاریہ ام عطیۃ النساء کی تعلیم کا زمانہ
غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل کا ہے۔ ۱۳ سال کی عمر میں بیکہ
سے سسرال رخصت ہوئیں اور چند ہی روز میں اپنی خوش
خلقی فرماں برداری اور قابلیت سے قبولیت میں اپنوں سے
زیادہ ہو گئیں مگر شادی کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ شوہر
کی جوان موت نے حافظہ بی بی کی تمام امیدوں کا خاتمہ کیا
شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ان کے حقیقی بہنوئی میاں
نذیر حسین صاحب محدث دہلوی حقیقی پھوپھا شاہجہان آباد
کے چوٹی کے علماء کا یہ خاندان کس طرح جائز سمجھتا کہ حافظہ
بی بی کا دوسرا نکاح نہ ہو۔ ان کی قابلیت کا شہرہ ہو چکا تھا
اس لئے ہر جگہ سے پیام نکاح آنے شروع ہو گئے۔ حافظہ
بی بی نکاح ثانی کے واسطے تیار نہ تھیں مگر اتنی ہمت نہ تھی
کہ اپنی خواہش کا اظہار بزرگوں کے سامنے کر سکیں۔
خوش قسمتی سے ان کے حقیقی خالو قاری امید علی صاحب
کو بی بی اُم عطیہ کی اس خواہش کا علم ہوا اور انہوں
نے بھانجی کو بیٹی بنا کر اپنے پاس رکھا۔
کیا مبارک زمانہ ہوگا حافظ امید علی جیسا قاری
بی بی اُم عطیہ جیسی ذہین شاگرد کو پوری محنت اور توجہ سے
پڑھا رہا ہے۔ تین سال میں قرآن حفظ کیا اور قرأت کی
ایسی ماہر ہوئیں کہ جب خاندان کے تمام علماء جمع ہوئے
اور حافظہ بی بی نے ایک رکوع سنایا تو دنگ رہ گئے۔
غدر ۱۸۵۷ء کے بعد حافظہ بی بی نے والدین کی خدمت
میں عرض کر دیا کہ وہ بقیہ عمر کلام الٰہی کی خدمت میں بسر
کرنا چاہتی ہیں۔ یہ درخواست منظور کی گئی اور اب
بی بی ام عطیہ نے کھاری باؤلی میں اپنے مکان پر درس شروع
کیا۔ رمضان المبارک میں تراویح کے وقت سیکڑوں عورتیں

مجمع اور مستفیض ہوتی تھیں۔ خوش الحان بی بی پر محراب کے وقت ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ صحیح اس قدر پڑھتی تھیں کہ جید سے جید قاری اور حافظ بھی اُن کا نام مشکل کان پکڑتے تھے بالآخر ایک دن وہ بھی آیا کہ حافظ بی بی کے شاگردوں نے قرآن مجید ختم کیا اور جس وقت حافظوں کا یہ گروہ دلی میں نکلا ہے تو ہر طرف سے حافظ بی بی پر مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوئے۔

ہر جمعہ کو بعد نماز ظہر وعظ فرماتی تھیں۔ بیان اس قدر درد انگیز ہوتا تھا کہ بعض دفعہ مجلس تڑپ اٹھتی تھی۔ دو مرتبہ حج کو تشریف لے گئیں اور یہ اُن ہی کا فیض ہے کہ آج دو چار نہیں سینکڑوں حافظا اور واعظ شہر دلی میں موجود ہیں۔

بیشتر وقت مطالعہ کتب میں صرف کرتی تھی جس روز سے محراب شروع کی آخر وقت تک ناغہ نہ کی۔ دانت ٹوٹنے کا صدمہ صرف اس لئے تھا کہ تلفظ صحیح ادا نہیں ہو سکتا اور قرأت کا لطف جاتا رہا۔ مزاج سخت تھا۔ جھوٹی باتوں سے نفرت تھی۔ اور ہر معاملہ صاف رکھتا اور صاف دیکھنا چاہتی تھیں۔

میری حقیقی پھوپی تھیں اپنی بھتیجی یعنی میری چچا زاد بہن حامدہ بیگم خیری کو بیٹی بنا لیا تھا اور آج حامدہ بیگم میں دنیائے نسواں جو کچھ دیکھ رہی ہے مرحومہ ہی کا طفیل ہے۔

۱۶ مارچ ۱۹۲۵ء کو انتقال ہوا ۷۵ برس کے قریب عمر پائی اور خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئیں۔ جنازہ کے ساتھ اُن کے اپنے شاگرد سینکڑوں حافظ تھے اور اس اعتبار سے آئندہ تو اب ایسا جنازہ کیا اٹھے گا پچھلی چند صدیوں میں بھی مسلمان عورتوں کے ایسے جنازے بہت ہی کم اُٹھے ہوں گے۔"

(عصمت مئی ۱۹۲۵ء)

پھوپی حامدہ بیگم مرحومہ نے اپنی مرحومہ بہن ذاکرہ بیگم صاحبہ کی چھوٹی بیٹی رحیمہ بیگم کی پرورش کی تھی رحیمہ بیگم کا بیان ہے کہ تائی اماں نے پچاس سال سے زیادہ مکتب پڑھایا۔ کبھی ایک پیسہ یا کپڑے کی ایک دھجی کسی سے نہیں لی۔ گھر پر کسی کو پڑھانے نہیں گئیں۔ ان کے جنازہ میں ان کے کئی ہزار شاگرد تھے۔ ان کے شاگرد چار ہزار نادرہ تھے اور دو ہزار سے زیادہ حافظ۔"

علامہ مغفور کے چچا —— ڈپٹی عبد الحامد مرحوم

مولوی حافظ عبد القادر صاحب کے دو بیٹے تھے علامہ مغفور کے والد حافظ عبد الواجد مرحوم اور چچا آبا ڈپٹی عبد الحامد مرحوم علامہ مغفور کے "دادا آبا" کا جب انتقال ہوا تو چچا آبا اورئی (یوپی) میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ پہلے وہ تحصیلدار ہوئے تھے اس کے بعد اورئی جالون وغیرہ یوپی کے کئی اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور لبنوال اپنے منجھلے بیٹے مولانا عبد الغفار صاحب الخیری۔ "کامیاب اور مشہور ڈپٹی کلکٹر تھے"

"چچا آبا" ایسے ہی چچا تھے جیسے عام طور پر ہوتے ہیں۔ "حیات النذیر" میں مولوی افتخار عالم صاحب کا یہ بیان کہ "مولوی عبد القادر صاحب کا دہلی کے رؤسا اعلیٰ میں شمار ہوتا تھا" ثابت کر رہا ہے کہ ڈپٹی عبد الحامد صاحب کو جو دلی کے بڑے رؤسا میں سے تھے جائیداد وغیرہ باپ کے ترکہ میں اتنی ہی ملی جتنی اُن کے بڑے بھائی حافظ عبد الواجد صاحب مرحوم کو مگر چونکہ حافظ صاحب کا انتقال باپ کے سامنے ہو گیا تھا اس لئے علامہ مغفور اور اُن کی بہن کو دادا کی جائیداد میں سے جو کچھ ملتا وہ ان کے چچا اور پھوپیوں میں تقسیم ہو گیا علامہ مغفور فرماتے تھے زبانی "دادا آبا" نے وہ ایک بار فرمایا تھا کہ "امر دو دالامکان" (یہ ایک چھوٹا مکان قریب ہی تھا) اپنی میاں اور زاہدہ کا ہے مگر چونکہ کوئی تحریر نہ تھی یہ بھی نہیں ملا۔ مولانا محمد عبد الغفار صاحب الخیری کا بیان ہے کہ وہ

رہن سہن میں ڈپٹی عبدالحامد صاحب [illegible] ہے کہ حیثیت کے زندہ مخالف تھے اس کے برعکس خاکسار کی والدہ مرحومہ جو علامہ تال کی چچی بھی تھیں اور پھوپی[1] بھی نہایت شفیق ہمدرد اور مجسم ایثار تھیں۔

ابا جان اپنی چچی اماں کو بہت یاد کرتے اور نہایت اچھے الفاظ میں ان کا ذکر کیا کرتے تھے (ان کا حال آئندہ صفحات پر آئے گا) وہ کالا باغ کے سید امجد علی صاحب کی نواسی تھیں جو مولوی عبدالخالق صاحب کے شاگرد تھے۔

خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب دلّی میں بھی کئی سال مجسٹریٹ رہے۔ گورنمنٹ میں ان کا بہت اثر اور رسوخ تھا۔ اس زمانہ میں شہر کے جن آٹھ دس مسلمان رئیسوں کے ہاں گھوڑا گاڑی تھی ان میں مولوی عبدالحامد صاحب بھی تھے۔

مولوی عبدالحامد صاحب نے اپنے بہنوئی مولوی نذیر احمد صاحب کی مراۃ العروس کی طرز پر "زینت العروس" ایک ناول بھی لکھا تھا جس نے خاصی شہرت پائی مگر باوجود تلاش مجھے کہیں سے وہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔

۱۹۰۳ء کے دربار ایڈورڈ ہشتم کے موقع پر دریبہ کلاں دہلی کے ناشر کتب جگل کشور نے صحیفہ زریں ایک ضخیم کتاب شائع کی تھی چچا انوار الحق صاحب کا بیان ہے کہ اس میں خان بہادر ڈپٹی عبدالحامد صاحب کے خاندان اور ان کے حالات بالتصویر شائع ہوئے تھے۔

۱۹۱۳ء میں ڈپٹی صاحب کا انتقال ہوا تو میں نے ابا جان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ خواجہ باقی باللہ کی درگاہ کے اندر قبر ہے۔ عمر ۷۰ سال کے قریب پائی۔

[1] حافظ عبدالواحد صاحب کی پھوپی زاد بہن تھیں اس رشتہ سے علامہ مرحوم کی پھوپی بھی تھیں۔

بی بی حمید الزمانی مرحومہ

کالا باغ (ضلع میانوالی) کے سید امجد علی صاحب مرحوم کی (جو مولوی عبدالخالق صاحب کے دوسرے داماد تھے) نواسی اور خان بہادر ڈپٹی عبدالحامد صاحب کی بیوی تھیں۔ اور علامہ مغفور کی چچی اماں تھیں ان کے دو نام تھے زینب بیگم اور صاحب خانم۔ سسرال سے انھیں "حمید الزمانی" کا خطاب ملا تھا۔ علامہ مغفور کی "چچی اماں" یتیم بھتیجے کا بہت خیال رکھتی تھیں اور والد مرحوم ہمیشہ ادب احترام اور محبت سے ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے ایسی چچی میں نے نہیں دیکھی۔ وہ کس قدر نیک دل عورت تھیں اس کا اندازہ والد مرحوم کے بچپن کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے کئی بار سنایا تھا۔ فرماتے تھے ہم کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بہت بڑا صحن تھا۔ چچی اماں باہر بیٹھی تھیں بتن (مولوی عبدالغفار صاحب) نے گیند پھینکی اور میں نے بہت زور کی ہٹ لگائی تو گیند چچی اماں کے سینہ پر جا کر لگی اور وہ تڑپ گئیں۔ منہ سے زور کی چیخ نکلی تو ہم سب لڑکے بھاگ گئے۔ چچا ابا اندر کمرہ میں تھے وہ بھاگے ہوئے آئے اور گھبرا کر پوچھا کیا ہوا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ بچے گیند بلا کھیل رہے تھے تو انھوں نے پوچھا کون کھیل رہا تھا بلا کس کے ہاتھ میں تھا وہ خاموش رہیں جب بہت اصرار کیا تو کہا "بتن کھیل رہا تھا اسے خیال نہیں رہا کہ میں بیٹھی ہوں۔" ابا جان کہتے تھے ایسی چچی مشکل سے ہو گی کہ یتیم بھتیجے کا نام نہیں لیا۔ بیٹا کا نام لیا۔ جانتی تھیں کہ چچا ابا کو معلوم ہو گیا کہ میں نے ہٹ لگائی تھی تو نہ معلوم مجھے کیا سزا دیتے۔"

علامہ مغفور نے اپنی "چچی اماں" اور "چچا ابا" کا کردار اپنے کئی افسانوں میں دکھایا ہے۔

ڈپٹی عبدالحامد صاحب کی اولاد | ابا جان کے چچا زاد بھائیوں اور بہنوں کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) ڈاکٹر محمد عبدالجبار الخیری - ایم اے پی ایچ ڈی [illegible] ء میں اپنی والدہ ماجدہ بی بی حمید الزمانی کی رحلت کے بعد اپنے چھوٹے بھائی چچا ستار کے ساتھ بغداد اور پھر مصر چلے گئے اور [illegible] ء میں بیروت پہنچ کر امریکن یونیورسٹی میں داخل ہوئے اُن کی ڈاڑھی مونچھیں نہ تھیں چچا ستار اُن سے دس گیارہ سال چھوٹے تھے اور لمبی ڈاڑھی تھی دیکھنے والے اُن کو بڑا اور چچا جبار کو چھوٹا سمجھتے تھے مولانا شبلی مرحوم نے تو انھیں دیکھ کر یہ لکھا تھا کہ باپ بیٹے ایک جگہ پڑھتے ہیں۔ دونوں بھائیوں نے امریکن یونیورسٹی سے ڈگریاں لے کر بیروت ہی میں [illegible] ء میں ایک مدرسہ کھولا اور [illegible] ء میں اپنے وطن دلی آئے تو ایک ماہ ٹھیر کر اپنے منجھلے بھائی مولانا عبدالغفار صاحب کو بھی ساتھ لے گئے۔ [illegible] ء میں یہ مدرسہ کالج بنا اور [illegible] ء میں دارالعلوم ڈاکٹر جبار کے پاس ایک نہ دو سات ڈگریاں ڈاکٹریٹ کی تھیں - دینیات - نفسیات - اقتصادیات - معاشیات - طبیعات - سیاسیات وغیرہ کی - قرآن حدیث فقہ کے بڑے زبردست عالم تھے - سات آٹھ زبانیں جانتے تھے - شام ترکی جرمنی میں اُنھوں نے مسلمانوں کی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں - اقوام عالم کی کانفرنس میں جو غالباً [illegible] ء میں ہوئی تھی پاکستان کا تخیل سب سے پہلے انھوں نے ہی پیش کیا تھا جس میں گنگا جمنا سمیت سات دریاؤں کی سرزمین تھی - کراچی کے روزنامہ ڈان میں خیری برادران کے اس تخیل کے متعلق [illegible] ء میں خطوط بھی شائع ہوئے تھے - بیروت میں سب سے پہلے سکاؤٹ تحریک انھوں نے ہی نے شروع کی تھی - چوتھائی صدی تک یورپ میں اسلام کی خدمت کرنے کے بعد اس شرط پر اپنے وطن دہلی آنے کی انھیں آنے کی اجازت ملی تھی کہ کسی جلسہ میں تقریر نہ کریں گے نہ کسی سیاسی تحریک میں حصہ لیں گے انگریز انھیں اپنا بہت بڑا دشمن سمجھتے تھے - انھوں نے قیام یورپ کے زمانہ میں تصانیف سے اور اخبارات میں مضامین لکھ کر اور مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچروں کے ذریعہ لاکھوں روپیہ کمایا تھا جو وہ دین کی خدمت میں صرف کرنا چاہتے تھے مگر اس کا انتظام نہ ہو سکا -

وطن واپس آکر املی کی پہاڑی پر انھوں نے مکان خرید لیا تھا جو سب سے اونچا مکان تھا اور اس کا نام تھا "غرفہ"، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے ڈاکٹر جبار انگریزوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے - ہمیشہ ان سے اکڑ اکڑ کر بات کرتے تھے - انگریزوں سے کیا وہ کسی سے بھی مرعوب نہ تھے - علی گڑھ یونیورسٹی کی کورٹ کے ممبر تھے اور نظام حیدرآباد سے اس لئے ناراض تھے کہ وہ ڈاڑھی منڈاتے ہیں چنانچہ کورٹ کے ایک جلسہ میں بہت بُرا بھلا کہا - گاندھی جی کو وہ سخت متعصب ہندو کہتے تھے اور ہندوستان میں کسی کو صحیح معنوں میں لیڈر نہ مانتے تھے - ان کے تقریباً تمام عزیز پاکستان آگئے تھے مگر وہ کتابوں کے بیش بہا ذخیرہ کی وجہ سے ترک وطن نہ کر سکے -

علامہ مغفور انھیں "شبتن"، کہتے تھے تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں ان کا [illegible] ء میں دلی میں انتقال ہوا - ان کے بیوی بچے نہ تھے - اپنے پیچھے کتابوں کے علاوہ جائیداد اور روپیہ کافی چھوڑا -

(۳) مولانا محمد عبدالغفار الخیری جنھیں اللہ آمرز مغفور "بھی" کہتے تھے۔ مجھ سے بچا تھے ماموں اور مجھے بھائی کبوتر پاکستان میں سے دو سال بڑے تھے۔ بچپن میں نے تعلیم انھوں اسے ہی حاصل کی مگر انگریزی کا مطالعہ بہت وسیع ہے منطق۔ نفسیات۔ طبیعات سے انھیں بڑی دلچسپی ہے۔ قرآن حدیث اور فقہ کے ماہر ان کی ٹکر کے شاید وہ چار ہی سارے پاکستان میں نکلیں۔ ان کے والد مرحوم ڈپٹی مولوی عبدالقادر صاحب نے انھیں "ضلعدار" بنوا دیا تھا اور محکمہ نہر کے ڈپٹی کلکٹری کے احکام بھی آگئے تھے کہ ایک انگریز افسر سے جھگڑا کر لیا اور جھگڑا ایسا کیا اسے خوب پیٹا اس بات پر کہ اس نے اسلام پر کوئی سخت حملہ کیا تھا۔ وہ اسسٹنٹ انجینئر تھا۔ ہوبس [illegible] اس کا نام تھا۔ وہ اور مولانا صاحب دونوں گھوڑوں پر سوار نہر کی پٹڑی پر سے جا رہے تھے۔ ہوبس نے اسلام کے متعلق کوئی بیہودہ بات کہی جو مولانا صاحب کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ادھر اپنے گھوڑے سے اتر کر انھوں نے اسے گھوڑے سے کھینچ کر مارنا شروع کیا۔ کسانوں نے جو دو آدمیوں کو گتھم گتھا دیکھا تو بھاگے ہوئے آئے اور بیچ بچاؤ کیا دونوں کو اٹھایا اور پھر دونوں پیدل روانہ ہوگئے۔ ادھر دونوں گھوڑے لوٹ کر گاؤں میں پہنچے۔ انھیں خالی دیکھ کر لوگ بھاگتے ہوئے گھبرائے ہوئے آئے کہ سوار کہاں غائب ہوگئے۔ ہوبس نے جو لوگوں کو آتے دیکھا تو مولانا صاحب سے کہا۔ جو ہوگیا سو ہوگیا اب کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ مولانا نے کہا اگر تم نے اپنا قلم روکا تو میں بھی اپنی زبان روکوں گا۔

اس واقعہ کے بعد مولانا عبدالغفار صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ ان کے والد مرحوم نے بہت سمجھایا مگر جو فیصلہ کر چکے تھے اس پر قائم رہے اور پھر ملازمت نہ کی۔

۱۹۱۸ء میں جب چچا جبار اور چچا ستار پیر محمد سے دلی آئے تو ایک مدرسہ قائم کر بیٹھے گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے اور دارالعلوم میں پڑھانے لگے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں انھوں نے اپنا مدرسہ قائم کر لیا۔ میٹرک تک بچوں کی تیاری خود کراتے۔ اور ان میں اسلامیت پیدا کرتے رہے۔ مدرسہ کی فیس فی شاگرد دو روپیہ تھی مگر کسی کے گھر پر پڑھانے نہیں گئے۔ یہاں تک کہ سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ تک کی پیشکش کی گئی انھوں نے ہمیشہ یہ فرمایا میں علم نہیں بیچتا۔ جسے پڑھنا ہو میرے گھر پر آکر میرے مدرسے میں پڑھے۔ ان کا مکان اور مدرسہ پھاٹک حبش خاں میں تھا تقریباً بیس سال وہاں گزار کر قرول باغ کی ایک کوٹھی میں چلے گئے تھے پھر مل بنگش میں آگئے۔ ان کے شاگرد تقریباً سب ہی دلی کے پنجابی برادری کے تھے۔ ہجرت کے بعد حالانکہ حالات میں تین فرق آگیا تھا انھوں نے اپنی خودداری کو کسی قیمت پر فروخت کرنا پسند نہیں کیا۔ مولانا عبدالغفار صاحب کی زندگی ہمیشہ نہایت سادہ رہی معمولی کھانا کھایا اور جو میسر آیا خدا کا شکر ادا کر کے کھایا ستھرے گاڑھا کھدر پہنتے ہیں۔ اپنے دادا کی طرح وہ اب بھی روئی کا فرغل (اوور کوٹ) جاڑوں میں پہنتے ہیں۔ تانگہ موٹر ٹرام میں کسی مجبوری کی بنا پر ہی انھیں بیٹھے دیکھا ورنہ ہمیشہ پیدل دور دور آتے جاتے ہیں۔ قرول باغ اور باڑہ ہندو راؤ سے والد مرحوم سے ملنے جمعہ کے جمعہ ہمیشہ پیدل دلی میں آتے تھے اور کراچی میں بھی میلوں پیدل ہی چلتے دیکھا ہے۔ ان کی عمر نوے سال کے قریب ہے اب تقریباً ایک سال سے گھر پر رہتے ہیں کہ بہت کمزور ہوگئے ہیں

عم مکرم دلی میں کرکٹ کے بابا آدم کہلاتے تھے۔ درجنوں کھلاڑی ان کے شاگرد تھے۔ انھوں نے راقم الحروف

کو چند ماہ کرکٹ سکھایا تھا کہ کالج کی کرکٹ ٹیم میں لے لیا گیا آیندہ ٹرم میں سکریٹری اور پھر کرکٹ کپتان چنا گیا شطرنج وہ اس عمر میں بھی کھیلتے ہیں۔ وہ آپاجان کے ساتھ بھی شطرنج کھیلے ہیں اور اُن کے پوتوں سعد میاں اور طارق میاں کے ساتھ اب بھی کھیل لیتے ہیں۔ شکار کا بھی دِقّی تک شوق تھا۔ چھوٹوں کا دل رکھتے ہیں اور ان سے شفقت سے پیش آتے ہیں وہ جو کہتے ہیں کہ بڑوں میں بڑے اور بچّوں میں بچے یہ بات چچا بیّن ہی میں دیکھی ان کے پوتوں نواسوں سے بھی کم عمر بچے ان سے بڑی دلچسپی سے باتیں کرتے اور ان کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں۔

چچا صاحب فرماتے ہیں ہمارے ہاں سب سے زیادہ عمر میاں صاحب (میاں نذیر حسین) کی ہوئی ۱۱۰ سال۔ اُن سے کم چچا ولی اللہ ۱۰۶ سال۔ اُن کے بعد دادا آبا ۹۶ سال۔ چوتھا نمبر میرا ہے کہ ۹۰ سال کے اوپر ہوں۔ ان کے بچّوں کے نام یہ ہیں محمد عبد المالک۔ عبید الغفار۔ عابد الغفار۔ ناصرہ بیگم۔ ماجدہ بیگم۔ عارفہ بیگم۔ ذاکر الغفار۔ حامد الغفار اور شاہدہ بیگم۔

(۳) مرحومہ عابدہ بیگم صاحبہ کی شادی مولوی حکیم مرزا صاحب سے ہوئی تھی جو یوپی میں تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر تھے مشہور کرکٹر مولوی توقیر مرزا صاحب زرتی جو حیدرآباد دکن میں سشن جج اور پاکستان آکر ریاست قلات میں وزیر تھے اُن کے بڑے بیٹے ہیں۔ باقی چار بیٹوں کے نام یہ ہے۔ محمد مرزا مرحوم۔ صغیر مرزا مرحوم۔ عزیز مرزا مرحوم اور نسیم مرزا جنھیں ہم پیرجی کہتے ہیں۔ فاطمہ بیگم بڑی بیٹی زندہ ہیں۔ چھوٹی بیٹی میمونہ بیگم کا انتقال ہو گیا اُن کے شوہر بھائی فضل عظیم صدیقی بھاولپور میں پرنسپل ادارہ علوم اسلامیہ ہیں۔

(۴) مرحومہ ذاکرہ بیگم۔ چچا ابا مرحوم کی منجھلی بیٹی تھیں اور محمد عبد الستار مرحوم ان کے شوہر نے دہلی کی تحصیلداری میں بادشاہت کی ہے مُنا ہے بہت ہی نیک دل اور فراخ دل انسان تھے ان کی بیٹیوں میں صرف بہن وسیمہ بیگم باقی ہیں جن کے شوہر ہیر جلیل الرحمٰن صاحب بڑے خدا ترس اور شب بیدار تہجد گزار انسان تھے۔ بہن وسیمہ سے بڑی بہن سلیمہ اور ان سے بڑی آپا بانو مرحومہ تھیں۔

(۵) مرحومہ حاجیہ حامدہ بیگم صاحبہ کی تربیت ان کی چھوٹی پھوپی حاجیہ قاریہ اُم عطیۃ النساء مرحومہ نے کی تھی اور اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی تھیں ان کا خط بہت پاکیزہ تھا اور عصمت تہذیب النسواں وغیرہ میں برسوں ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں ان کا حلقہ ملاقات بہت وسیع تھا اور مختلف شہروں کی تعلیم یافتہ خواتین سے خط و کتابت تھی۔ طبعاً ہمدرد اور بڑی محبت والی بی بی تھیں۔ ان کی شادی مولوی سید اسعد حسین صاحب عرشی سے ہوئی تھی جو پھوپی کے بیٹے تھے۔ ان کے بچے ہوئے ایک درجن کے قریب مگر سب چھوٹی چھوٹی عمروں میں گزر گئے بس ایک خالدہ بیگم اللہ رکھی بقید حیات ہیں۔ پھوپی ذاکرہ مرحومہ کی بیٹی وسیمہ بیگم کو انھوں نے بیٹی بنالیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔

(۶) پروفیسر محمد عبد الستار خیری۔ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر جبّار کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں ہندوستان سے چلے گئے تھے اس وقت علی گڑھ میں غالباً ایف اے میں پڑھتے تھے۔ بیروت میں انھوں نے امریکن یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ شام۔ لبنان۔ فلسطین۔ ترکی۔ جرمنی میں مدتوں ان کا قیام رہا اور اٹلی فرانس روس کی کئی بار

بے ستی کی۔ اسلام کی خدمت کے لئے انھوں نے اپنی زندگی
وقف کردی تھی۔ یورپی ممالک میں انھوں نے اپنے بڑے
بھائی ڈاکٹر عبد الستار کے ساتھ تبلیغ اسلام کی۔ قرآن و حدیث پر
انھیں عبور حاصل تھا۔ سات آٹھ زبانیں جانتے اور
مشرقی و مغربی علوم کے جید عالم تھے۔ وہ اس قدر دیندار
مسلمان تھے کہ انھوں نے یورپ میں رہ کر بھی کبھی رمضان کا
ایک روزہ نہ چھوڑا۔ کوئی ادبی صحبت ہوتی یا کوئی جلسہ یا
پارٹی ادھر نماز کا وقت آتا ادھر وہ مالک حقیقی کے دربار میں حاضر
ہو جاتے۔ ان کا دل ایک سچے مسلمان کا دل تھا اور مشرقی
خوبیوں سے لبریز۔ چوتھائی صدی مغرب میں رہ کر بھی ان پر
مغربی رنگ بالکل نہ چڑھ سکا۔ [illegible] میں وہ اپنے وطن
دلی واپس آگئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جرمن اور
فرانسیسی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے وہاں وہ ہمہ تن اس
کوشش میں منہمک رہے کہ یونیورسٹی کے اسٹاف اور طلبہ میں
صحیح اسلامیت پیدا ہو۔ پاکستان کے وہ زبردست حامیوں
میں سے تھے اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مسلم لیگ نے
[illegible] سے [illegible] تک جو ترقی کی اس کی تہہ میں پروفیسر
ستار خیری کا دماغ کس طرح کام کر رہا تھا۔

انھوں نے قیام یورپ کے زمانہ میں جرمن میں
بڑے گراں قدر مضامین لکھے جو انتہائی دلچسپی اور قدر
کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ محبت اور خلوص سے ان کا دل
لبریز تھا۔ سچے آدمی تھے اور سچی باتیں پسند کرتے تھے۔ تصنع
اور بناوٹ سے کوسوں دور رہتے۔ مزاج میں انکسار تھا اور
چہرہ پر تبسم رہتا تھا۔ ان کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ علی گڑھ
سے دلی چند گھنٹوں کو بھی آتے تو ابا جان سے ملتے اور ان کے
بعد اماں جان کے سلام کو اور جب ان کا بھی انتقال ہو گیا
تو میرے پاس ضرور تشریف لاتے تھے۔

جرمنی کے قیام میں انھوں نے شادی کی، چچی صاحبہ
نہایت منتظم، محنتی، جفاکش، ہمدرد خاتون ہیں۔ چچا صاحب
کا علی گڑھ میں ۲۴ ستمبر [illegible] کو انتقال ہوا۔ تین بچے چھوڑے
زینب اور نصرت دو لڑکیاں اور عبد الرحمٰن جو اب پاکستان
فوج میں کرنل ہیں۔

(۷) محمد عبد الوہاب صاحب مرحوم۔ انسپکٹر
اکسائز تھے۔ چونکہ کبھی رشوت نہیں لی اس لئے ترقی بھی نہ کی۔
بے صوفی منش تھے۔ موسیقی سے بھی ذوق تھا۔ بدن کسرتی تھا۔
بہت خاموشی سے تبلیغ اسلام کرتے تھے۔ غیبی خاندان میں
یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ڈاڑھی نہیں رکھی۔ خدا نے انھیں
ہمت بھی اول درجہ کا دیا تھا۔ عزیزوں پر جان چھڑکتے تھے اور پابند
وضع تھے۔ [illegible] میں ہم نینی تال گئے اور تین چار ماہ وہاں
گزارے تو پانچ سات دن میں کوئی نہ کوئی دلی سے آتا جاتا
رہتا۔ راستہ میں بلندی پر چڑھنا تھا۔ چچا صاحب سے ملنے
جو بچہ ساتھ ہوتا دو روپیہ اُسے دیتے۔ [illegible] یا [illegible]
میں چند ماہ کی چھٹی لے کر دلی آئے اور ہمارے گھر کے قریب
ہی کسی مکان میں ٹھیرے تو ابا جان روز صبح اُن کے ہاں
جایا کرتے تھے۔ ابا جان کے مرض الموت میں ایک شب
آن کے یہ چچا زاد بھائی گیارہ بجے سے چار بجے تک جاگتے
رہے۔ ان کی پہلی بیوی سے دو بچے ہیں احمد وہاب اور
ننھی بیگم۔ انھوں نے ایک شادی اور کی تھی ان بیوی سے
بھی پانچ چھ بچے ہیں۔

(۸) محمد انوار الحق صاحب۔ حکومت پاکستان
کے محکمہ ڈاک و تار میں ملازم تھے پنشن لے لی، سہ سال ہوگئے
نئی دلی میں سرکاری ملازمین کے بچوں کے لئے انھوں نے
ایک اسکول کھولا تھا اور اب کراچی میں یتیم بچوں کے لئے
بڑے پیمانہ پر انتظام کیا ہے۔ ذہانت اور ذکاوت میں

یکسی بھائی سے کم نہیں مگر اعلیٰ تعلیم اور زیادہ مطالعہ کا موقع نہ ملا۔ رعب داب کے بزرگ ہیں اور آواز میں گرج اور کڑک ہے چچا صاحب کی عمر اس وقت ۷۰ سال ہے۔ ان کے بچوں کے نام یہ ہیں۔ مظہر الحق جو ۱۲ سال سے رسالہ جام نو نکال رہے ہیں۔ افتخار الحق۔ احسان الحق۔ نذر الحق۔ انصار الحق اور شمس الانوار۔ صدرہ بیگم۔ اور باصرہ بیگم ایم اے۔

"چچی اماں" کے انتقال کے بعد ڈپٹی عبد الحامد صاحب نے دوسری شادی "بریلی والی" سے کی جن سے پھوپی رابعہ ہیں۔ "بریلی والی" کے بعد تیسرا نکاح "بیگم جان" صاحبہ کیرانہ والی سے کیا ان کے بیٹے محمد عبد التواب صاحب ایم اے ایل ایل بی وکیل ہیں جو آپ بھی دلی ہی میں ہیں۔

بنی عکرمہ

شاخ دہلی ۱۲۵۰ء — شاخ تھانہ بھون

مولوی نفے

مولوی حافظ خیر اللہ

مولوی عبد الخالق — مولوی عبد الرزاق — بہن

مولوی ثناء اللہ

مولوی عبد القادر پیدائش ۱۸۳۶ء — مولوی محمد الرب — رقیہ بیگم میاں نذیر حسین کی بیوی — سید احمد علی کی بیوی

مولوی ادریس کے بعد نسل ختم ہو گئی

صغیرہ بیگم ڈپٹی نذیر احمد کی بیوی — حافظ عبد الواحد رحلت ۱۸۶۸ء — زکیہ بیگم مولوی احمد حسن کی بیوی — ڈپٹی عبد الحامد — قادرہ بیگم — [illegible]

[illegible]

محمد عبد الراشد (علامہ راشد الخیری) — حاجیہ زاہدہ بیگم

ب۔ علامہ مغفور کی ننھیال

دادی اماں کے دادا نواب ممتاز الدولہ غلام رسول خاں آخری تاجدار خاندان مغلیہ بہادر شاہ ظفر کے ہم زلف تھے۔ سبزی منڈی اور کوتوالی انھیں کی تھی۔ اس زمانہ میں کوڑیوں کا رواج عام تھا۔ میرے بچپن میں ایک پیسہ میں ۸۰ کوڑیاں ہوتی تھیں۔ ۱۰ کوڑیوں کی ایک ادھی۔ ۲۰ کی ایک دمڑی۔ ۴۰ کا ایک دھیلہ (یعنی ایک پیسے کے دو دھیلے۔ ۴ دمڑیاں ۸ ادھیاں) دو پیسہ کا ایک ٹکہ اور دو ٹکوں کا ایک آنہ اور سولہ آنے یا ۶۴ پیسوں کا ایک روپیہ۔ سبزی منڈی کی تہہ بازاری کی کوڑیاں بوریوں میں بھر کر روزانہ آتی تھیں۔ اسی طرح کوتوالی کی تہہ بازاری کی کوڑیاں بھی۔ یہ گویا زمین کا روزانہ ٹیکس ہوتا تھا اور جس جس کا حصہ ہوتا تھا ان میں نواب

نصل رسول خاں صاحب کی بیوی کو تقسیم کرتی تھیں۔
دلی کے رئیس عبدالرحیم خاں۔ تھے ان۔
کا اور غلام محمد حسن خاں صاحب اور ان کے بھائی
...حسن خاں دادی اماں کے بھائی وزیر محمد خاں صاحب
...ماموں کہتے تھے۔ یہ حضرت نواب غلام رسول خاں یا
...ن کے والد کی اولاد میں سے تھے۔ نواب احمد سعید خاں سے
بھی ددھیالی رشتہ تھا۔

(دو) دادی اماں کی بہن پہاڑ والی خالہ اماں کہتی تھیں
کہ ہمارے ہاں ہاتھی جھولتا تھا۔ یہ نواب فضل رسول خاں
کی ڈیوڑھی کا ذکر تھا۔ نواب ممتاز الدولہ مرحوم کے بیٹے
نواب فضل رسول خاں صاحب ضلع میرٹھ میں پرگنہ جلیسر
کے مالک تھے انھوں نے جائیداد کا بڑا حصہ ضائع کر دیا
تھا پھر بھی ان کے کئی مکانات دلی میں تھے۔

آغا جان کے چھتے کی مسجد کے سامنے اپلوں کی
منڈی میں نے بھی دیکھی تھی یہ نواب فضل رسول خاں
کا فیل خانہ تھا۔ برابر کی گلی میں مہابت رہتا تھا۔ اور
اسی محلہ میں ان کی جائیداد تھی۔ عید بقرعید کی نماز کو وہ
جامع مسجد ہاتھی پر جاتے تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں
جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا نواب فضل رسول کی حویلی
بھی لٹ گئی ان کے بڑے لڑکے جو مرحومہ شہزادہ بیگم سے
چھوٹے اور علامہ مغفور کی والدہ مرحومہ امیر بیگم سے بڑے
تھے اور جن کی عمر اٹھارہ سال تھی اس ہنگامہ میں شہید ہوئے
تھے باپ بیٹے نے ایک بڑا دیگچہ اشرفیوں سے لبالب بھر کر
زمین کھود کر دبا دیا تھا اور اس کے اوپر بوریا بچھا کر تسبیح
لے کر ان کے بیٹے بیٹھ گئے تھے۔ باپ اپنی چار بیٹیوں کو
لے کر پہلے کوٹلہ فیروز شاہ اور پھر چھپتے چھپاتے ٹونک نکل
گئے تھے۔ حویلی لٹی گئی تو ہاتھی بھی لوٹ لیا گیا اور نواب
فضل رسول کے بیٹے کو بھی ظالم مار کر شہید کر دیا گیا۔ جب نو
مہینے بعد نواب صاحب واپس آئے تو بیٹے کی لاش دیکھی۔
حویلی کا صفایا ہو چکا تھا۔ البتہ اشرفیاں بھرا دیگچہ جوں کا
توں اسی جگہ موجود تھا۔ یہی اشرفیاں ان کی بیٹیوں
کی شادی میں کام آئیں۔ ان کی اولاد کی تفصیل یہ ہے۔

علامہ مغفور کی خالائیں اور ماموں

(۱) شہزادہ بیگم مرحومہ۔ والدہ مرحومہ کی بڑی خالہ اماں
۱۸۵۷ء کے غدر میں ۲۰ سال کی تھیں۔ کوئی ۹۰ سال کی عمر
میں انتقال ہوا۔ اعظم خاں کی حویلی میں رہتی تھیں۔ ان کا
ذاتی مکان دو منزلہ تھا ان کا بیٹا جوان گزر گیا تھا اور اس
صدمے سے ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا۔ ایک بیٹی
تھیں چھوٹی اکرامی بیگم۔ ان کے شوہر ڈاکٹر تھے۔ پھوپھی
اکرامی جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں انھوں نے تکلیفیں
اٹھا کر جفاکشی کے بھائی اشرف حسین مرحوم کو پڑھایا۔
آپا جان ان کی ذہانت قابلیت اور سعادت مندی کی وجہ
ان سے بہت خوش تھے بھائی اشرف حسین مرحوم نے بیوہ
ماں کی محنت کی سچی قدر کی اور دل لگا کر پڑھا ہمیشہ اچھے
نمبروں سے کامیاب ہوئے علی گڑھ سے ایم اے کر کے
ڈاکخانے کے محکمہ میں ملازم ہوئے اور پوسٹ ماسٹر جنرل ہو کر
پنشن پائی نہایت شریف اور نیک انسان تھے۔ بہت سی
خوبیوں کا مجموعہ تھے پنشن کے تھوڑے ہی دن بعد انتقال ہو گیا
ان کے چھوٹے بھائی اقبال حسین صاحب منشی فاضل مولوی
فاضل شاید ملتان میں کسی اسکول میں معلم ہیں۔

(۲) امیر بیگم مرحومہ۔ علامہ مغفور کی والدہ مرحومہ
ان کا ذکر آئندہ آئے گا۔

(۳) امراؤ بیگم مرحومہ۔ جو پہاڑ والی خالہ اماں

کہلاتی تھیں۔ ان کی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کے شوہر بابو برکت اللہ صاحب جکروٹہ میں کلکٹر کے ہیڈ کلرک تھے۔ ان کی پہلی بیوی سے دو بچے احسان اللہ خاں صاحب اور آمنہ بیگم تھیں اور مشہور تھا کہ ان دونوں سے پہاڑ والی کو بہت محبت تھی۔ آغا جان کے چھتہ میں مسجد کے مشرقی دروازہ کے تقریباً سامنے چوکیوں والے گھر میں رہتی تھیں۔ جو ان کا ذاتی مکان تھا اور بہت بڑا اردو فارسی کے سینکڑوں شعر یاد تھے۔ میری عمر دس بارہ سال کی تھی ان سے شطرنج کھیلتا تھا تو وہ کبھی سعدی اور حافظ کے شعر پڑھا کرتیں کبھی بہادر شاہ ظفر کے، کبھی مومن ذوق غالب کے۔ ان کے مرض الموت میں والدہ مرحوم نے ان کی بہت خدمت کی تھی۔ ان کے زانو پر سر رکھ کر بیٹے اور گاتے ہوئے میں نے دو بار والدہ مرحوم کو دیکھا تھا۔

(۴) نواب بیگم صاحبہ۔ جے پور میں رہتی تھیں اور "جے پور والی خالہ اماں" کہلاتی تھیں ان کے پہلے شوہر حکیم شریف حسین صاحب راجہ کی ڈیوڑھی کے طبیب تھے۔ پہلے شوہر سے ان کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا تو دوسرا نکاح کیا۔ موافقت ان سے بھی نہ ہوئی اور ان کی رحلت کے بعد دماغ میں کچھ خلل سا آگیا تھا وہ دنیا کا نہیں بارش کا یعنی اللہ میاں کا پانی پیتی تھیں۔ پانچوں بہنوں میں سب سے بہتر پہنا اور سب سے اچھا کھایا "پہاڑ والی خالہ اماں" نے اور سب سے بدتر پہنا اور سب سے خراب کھایا ان "جے پور والی خالہ" نے۔ انھوں نے اپنی دلی اور جے پور کی ساری جائداد بیچ کر روپیہ مکہ شریف بھیج دیا۔ اور سو کے ٹکڑوں پر زندگی کے باقی دن گزارے۔

علامہ مغفور کے ماں باپ میں موافقت نہ ہوئی جے پور والی خالہ اماں اور چھوٹی خالہ اماں اور ان کے شوہروں کے دل کبھی نہ ملے۔ علامہ مغفور ان واقعات سے بہت متاثر تھے۔

(۵) مرحومہ جہاں آرا بیگم۔ علامہ مغفور کی سب سے چھوٹی خالہ تھیں۔ ان کے شوہر تھے محمود علی خاں صاحب جو ریاست جے پور میں تھانیدار تھے۔ انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی اور چھوٹی خالہ اماں دلی میں رہتی تھیں۔ ان کی جوان لڑکی گزر گئی تھی بس ایک بیٹے تھے جو "بھورے" کہلاتے تھے اور نام تھا حامد علی ابا جان اکثر ان کا گانا سنا کرتے تھے یہ بھی جے پور پولس میں تھے ان کی ان کی ایک بیٹی پھول نتھی کی بہو ہیں چھوٹی خالہ اماں کو بھی بہت سے شعر یاد تھے۔ ۶۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ پانچ بہنوں میں "پہاڑ والی خالہ اماں" اور "جے پور والی خالہ اماں" بے اولاد تھیں۔ "بڑی خالہ اماں" کا جوان لڑکا گزرا تھا اور "چھوٹی خالہ اماں" کی جوان بیٹی۔ پانچ بہنوں نے بس چار بچے چھوڑے، بڑی خالہ اماں نے اکرامی بیگم چھوٹی خالہ اماں نے حامد علی عرف بھورے ہاں مرحومہ امیر بیگم صاحبہ کے دو بچے تھے۔

(۱) علامہ راشد الخیریؒ اور (۲) حاجیہ زاہدہ بیگم مرحومہ

(۶) منشی وزیر محمد خاں صاحب۔ باپ کی رحلت کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ پانچ بہنوں میں ایک بھائی تھے اس لئے نہایت چہیتے اور لاڈلے تھے۔ دادا کی جائداد بہت تھی بڑھ کر کیا کرتے۔ چنانچہ کچھ پڑھا نہیں مگر ہمیشہ "منشی جی" کہلائے جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو کئی مکان تھے مگر پانچوں بہنوں میں سے کسی نے مدت تک ترکہ نہیں مانگا کہ ایک تو بھائی ہے۔ اور کچھ پڑھا بھی نہیں کہ نوکری کرے۔ ان کا کرایہ آتا تھا اس کے

علاوہ منیا محل اور حویلی صدر الصدور کے عزیزوں کی
جائیداد کا کرایہ بھی وصول کیا کرتے تھے۔ دریبہ میں کناری
بازار جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں نواب نبی بخش
کی مسجد ہے وہ بادشاہ کے بھائی تھے۔ اس مسجد کی
دکانوں کا کرایہ بھی منشی وزیر محمد خاں وصول کرتے تھے۔
تھے مگر حافظہ بہت اچھا تھا۔ سب روپیہ جمع کر کے
الگ الگ رنگ برنگ تھیلیوں میں رکھتے تھے لکھوتے
تھے زبانی یاد رہتا تھا کہ چار روپیہ وہاں سے کچھ وہاں
سے۔ جب غلام محمد حسن خاں مرحوم دلی میں رجسٹرار
تھے ان کی عدالت میں منشی وزیر محمد دو گواہیاں روزانہ
دیا کرتے تھے فی گواہی انھیں دو روپیہ ملتے تھے جس میں
چار آنے فی گواہی کمیشن قبالہ نویس کے ہوتے تھے اس طرح
دو گواہیوں کے روزانہ انھیں ساڑھے تین روپے مل
جاتے تھے۔ باؤلی میں پڑوسی ایک مسلمان درویش تھے
جو جوگیا کپڑے پہنے رہتے تھے۔ انھوں نے ایک بوڑھی
سے ان سے کہا تمھارے پیچ کے مکان میں خزانہ ہے۔
اس مکان کی کھدوائی کروا ڈالی۔ جب مٹی سے صحن
بھر گیا تو گلی میں مٹی ڈلوا دی رعب دبدبہ کے آدمی تھے۔
کس کی شامت آئی تھی جو ان کی شکایت کرتا مگر پولس
والوں کو معلوم ہوا تو کوتوال سیندے خاں خود آگیا۔
ان کے پاس کرایہ کی رقم جو جمع تھی ادھر تو وہ دے دی۔
اُدھر غلام محمد حسن مرحوم کو خبر کر دی وہ اسی وقت آگئے۔
کوتوال انھیں دیکھ کر دم بخود ہو گیا۔ رقم وہیں چھوڑی۔
اس واقعہ کے بعد کرایہ وصول کرنے کی خدمت انھیں
نہیں دی گئی اور ان کی تنخواہ باندھ دی گئی۔
منشی وزیر محمد خاں صاحب کو چلہ کا بہت شوق
تھا اور ڈیرہ دو دن سے ان کے لئے چلے آتی تھی۔

تقریباً سارے صحن میں چلے کی تیلیاں پھیلے پر چڑھی رہتی تھی چھت
پٹے تھے اور سب پر اونگو شے رشتے کا تھیلا ان کے لئے آتی
تھا۔ منیا محل اور حویلی صدر الصدور کے عزیزوں نے کہا
کہا کچھ شعر یاد کرلو ایک آدھ شعر لے گا مگر انھوں نے
کریما، پند نامہ عطار کے سوا کوئی شعر یاد کر کے نہ دیا۔
والد مرحوم ان کے حقیقی بھتیجے تھے اور وہ ان سے مثنوی
سحر البیان سنا کرتے تھے۔ ابا جان کی آواز میں بہت درد
تھا اور وہ مثنوی نے بھی ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔
چچا بشیر محمد کا بیان ہے کہ ابا بھائی ان کو چمکار کر مثنوی سننے
کی فرمائش کرتے وہ کبھی تو ٹال جاتے اور کبھی سنا دیتے
مگر دو شعر سے زیادہ نہیں سناتے دوسرا شعر ختم ہوا اور
غائب۔ منشی جی مرحوم ایک دفعہ گھوڑا سرپٹ دوڑا
رہے تھے کہ رجنس ٹوٹ گیا۔ مکان ہموار رہے تھے کہ دیوار
گری اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔
دستخط کرنے جاتے تھے۔ ۸۵ سال کی عمر پائی۔
ان کے بڑے بیٹے عزیز محمد صاحب جنھیں وہ پیار
سے جھنو کہتے تھے کوئی ۴۵ سال کے ہو کر دق میں گزر گئے۔
چھوٹے بیٹے بشیر محمد خاں صاحب ساتویں آٹھویں تک
پڑھ کر ڈی اے جے کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور پنشن
لے کر اب کراچی میں ہیں ان کے بیٹوں کے نام یہ ہیں۔
ظہیر محمد خاں۔ سعید محمد خاں اور نصیر محمد خاں۔
اس زمانہ میں کئی جگہ سننے میں آیا کہ سید کی بیٹی
کی شادی پٹھان سے کرنا بے ادبی ہے مگر منشی وزیر محمد خاں
صاحب کی بیوی سیدانی تھیں۔ منشی صاحب موصوف کی
بڑی بیٹی گیتی آرا بیگم مرحومہ کے شوہر سید احمد علی ریاست
کوٹہ میں تھانیدار تھے آجکل پرتاب گڑھ میں ہیں عمر
نوے سال کے قریب ہوگی۔ چھوٹی بیٹی بشیر بیگم جو نعمی کہلاتی
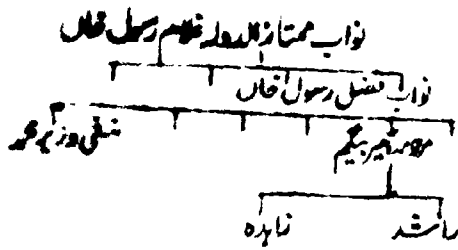
تھیں بقیہ حیات ہیں۔ ۱۸۔۱۹ سال کی عمر میں شادی ہوئی سال بھر بعد وہ بیوہ ہو گئیں۔

نواب ممتاز الدولہ عہد بہادر شاہ ظفر کی مشہور شخصیت تھے اور علامہ مغفور کی والدہ کے دادا تھے۔

نواب ممتاز الدولہ غلام رسول خاں
نواب تفضل رسول خاں
منظور بیگم — تفضل وزیر محمد
راشد — ناہرہ

باب دوسرا ــــ والدین، پیدائش، بچپن، تربیت، بہن

مولوی حافظ عبدالواحد صاحب

مولوی عبدالقادر صاحب کے بڑے بیٹے اور علامہ راشد الخیریؒ کے والد مولوی حافظ عبدالواحد صاحب دلّی میں ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے تھے اُن کے متعلق مولانا عبدالغفار الخیری صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ اس خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے انگریزی سیکھی اور وہ مہارت پیدا کی کہ انگریز تمیز نہ کر سکتے تھے کہ یہ کوئی ہندوستانی بول رہا ہے۔ اس زمانہ میں انگریزوں سے ڈگریاں وصول کرنے اور عدم وصول کی صورت میں ان کو گرفتار کرنے کے لئے انگریز بیلف ہوتے تھے مگر مولانا راشد الخیری کے والد مرحوم پہلے ہندوستانی بیلف مقرر ہوئے۔ طبیعت کے تیز تھے۔ اور بہت دبنگ کسی سے دبتے نہ تھے۔ اس وجہ سے جم کر ملازمت نہ کی اور ملازمت ہمیشہ لونڈی رہی۔ ادھر جھگڑا ہوا چھوڑ دی اور اُدھر کر لی۔ آخری ملازمت آپ کی حیدرآباد دکن کی تھی جہاں آپ مہتمم بندوبست کے عہدہ پر مشاہرہ سات سو روپیہ ملازم ہوگئے"

مولوی صاحب موصوف کا بیان ہے کہ جب وہ بیلف تھے تو سرکاری کام سے آگرہ جا رہے تھے۔ اس زمانہ میں انٹر اور تھرڈ کلاس کے ڈبے بھی یورپینوں کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ وہ انگریزی کپڑے بھی پہنتے تھے اور رنگ بھی صاف تھا۔ مگر چونکہ ڈاڑھی تھی اس لئے ہندوستانی ہونے کا شبہ ہو سکتا تھا غازی آباد اسٹیشن پر جب گاڑی پہنچی تو کوئی یورپین اس ڈبے میں آیا۔ اور ڈاڑھی دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی ہندوستانی ہے۔ سیدھا اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچا۔ وہ عیسائی تھا اُسے ساتھ لایا اور اس نے حافظ صاحب سے کہا یہ درجہ یورپینوں کے لئے وقف ہے اس کا جواب حافظ صاحب نے یوں دیا۔

You are no more European than my self—

اُن کا یہ فقرہ بہت مشہور تھا اور مولوی عبدالغفار صاحب کا بیان ہے کہ میں نے مولوی اشرف حسین صاحب سے بھی یہ فقرہ سنا اور مولوی بشیر الدین صاحب سے بھی۔

حافظ صاحب نے پہلی محراب قلعہ کے قریب سنہری مسجد میں سُنائی تھی اور بہادر شاہ ظفر نے سنی تھی اور سُن کر بہت خوش ہوئے تھے اور خلعت عطا کیا تھا۔ کہا راشدہ کہتی ہیں دادی اماں نے بتایا تھا کہ سات تھان کپڑوں کے تھے۔ زربفت۔ کمخواب۔ چکن۔ لٹھا۔ ململ اور دو تھان دو اور کپڑوں کے۔ ان میں زربفت کا تھان شادی کے لئے محفوظ کر دیا گیا تھا اور دادی اماں کا پجامہ بنا تھا۔ دوسرے سال پھر بادشاہ کو حافظ عبدالواحد صاحب کی محراب

...نے کا انتظام ہو رہا تھا کہ وہ دلی سے باہر یہ کہہ کر چلے
... کہ مجھے لکڑی مل رہی ہے میں اب نہیں سُناتا۔
... اء کی جنگ آزادی کو کئی سال گزر چکے تھے۔
... کے میدان میں (قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان)
... ئیڈ تھا اس کے پاس شام کو لڑکے کبڈی کھیلا کرتے
تھے۔ ایک دن مغرب کے بعد حافظ عبداللہ صاحب
... ہرے جو گزرے تو ٹھوکر لگی اور ایک ڈبیہ پڑی ہوئی ملی۔
کھول کر دیکھا اور گھر لا کر اپنے والد کو دکھائی انھوں نے
... یا عصر کے بعد جب لڑکے وہاں کبڈی کھیلیں تو
... دن تک جا کر آواز لگاؤ کہ کسی کی کوئی چیز کھوئی گئی ہے
تو ... لے۔ چنانچہ تین دن تک انھوں نے یہی کیا اور
... زیں لگائیں جب کوئی دعویدار نہ نکلا تو چوتھے دن
انھوں نے پھر اپنے والد سے ذکر کیا انھوں نے کہا
اب تم اپنی والدہ کے پاس رکھوا سکتے ہو۔

اس ڈبیہ میں ۲ جوڑی جھلنیاں تھیں ایک تو
۸ تولہ کی تھی جس کا سونا دہک رہا تھا یہ جھلنیاں حافظ
صاحب کے والد کے فیصلہ کے مطابق پھوپی زاہدہ بیگم
کو جہیز میں ملی تھیں دوسری جوڑی جڑاؤ تھی جو والدہ
مرحومہ کے چڑھاوے میں دی گئی۔ دونوں زیور غالباً
کسی شہزادی کے تھے۔ آپا راشدہ بیگم کا بیان ہے کہ
پھوپی اماں کی جھلنیاں ۵ انچ کی تھیں۔ اماں کی جھلنیاں
میں نے بھی دیکھی تھیں بہت بڑی تھیں۔

والد مرحوم کی رحلت پر ساقی کے راشد الخیری
نمبر میں میں نے جو مضمون لکھا تھا اس میں دادا ابا مرحوم
کے متعلق ایک پیراگراف یہ تھا۔

"حیدرآباد دکن میں ملازم تھے سات سو روپے
تنخواہ ملتی تھی (سنہ ۱۹۶۳ء کے سات ہزار سے بھی زیادہ) مگر سب
خلق خدا پر اُٹھا دیتے تھے۔ جب دلی آئے تو خلقت میں عید
ہو جاتی تھی۔ بھرے ہوئے پیسے۔ لبالب خوانچے پسا... م
نور سے۔ حلوے والوں سے خرید کر محلہ بھر میں تقسیم کرتے
تھے۔ فصل کی ترکاریاں۔ موسم کے پھل۔ جاڑوں میں پہنے کی
برسات میں اندرسے کی گولیاں اور پھینیاں گرمیوں میں ملائی
کی برف سارے کنبے کو کھلا دیتے اس وقت نئی کرتے
تھے۔ مہاوٹ کی سردیوں میں کسی بڈھے فقیر کو اکڑتا دیکھتے
تو کپڑے اُتار کر دے دیتے تھے۔ کوئی دکھیاری مصیبت
... ری مارا ... جاتی اور ... اپنی بپتا سُناتی تو خود
اس کے ساتھ زار و قطار رونے لگتے۔ اُن کی آواز میں غضب
کا درد تھا کوئی رکوع پڑھتے تو ایک ایک لفظ سُننے والوں
کے کلیجے توڑ دیا تھا۔"

یہ سطریں تاثرات تھے اُن باتوں کے جو دادی اماں
مرحومہ اور خاندان کے دوسرے بزرگوں سے بچپن میں سُنی
تھیں یہ بھی سُنا ہے کہ حیدرآباد دکن جانے سے پہلے جہاں
اُن کے بڑے بہنوئی مولوی نذیر احمد صاحب ملازم تھے۔
انھوں نے کچھ دن ایسٹ انڈیا ریلوے (ای-آئی-آر)
میں بھی یوروپین گارڈ کی حیثیت سے ملازمت کی تھی اور
تونڈلے ڈاک گاڑی دلی لے جاتے تھے۔ ادی اماں
اُن کے واقعات سُناتی تھیں تو کہا کرتی تھیں "تمہارے دادا
ابا چلتی ریل روک لیتے تھے۔" اس زمانہ میں کیا اب سے
۴۰ سال قبل تک کسی ہندوستانی کا میل گارڈ ہونا بڑی چیز
سمجھی جاتی تھی۔ ۳۵-۳۶ سال ہوئے بی بی سی آئی ریلوے
میں میرے بڑے بہنوئی مرحوم شیخ عبدالغفور صاحب میل گارڈ
ہوئے تو دلی سے بمبئی تک دھوم مچ گئی کہ ایک ہندوستانی کو
ڈاک گاڑی کا گارڈ بنا دیا گیا۔ دادا ابا کا میل گارڈ مقرر
ہونا آج سے تقریباً نوے سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس زمانہ

میں حافظ عبدالواجد صاحب کا انگریزی اس طرح بولنا کہ
بقول مولانا محمد عبدالغفار صاحب" انگریز بھی تمیز نہ کر سکتے
تھے کہ کوئی ہندوستانی بول رہا ہے" معمولی بات نہ تھی۔ بزرگوں
سے سُنا ہے وہ اس زمانہ میں اپنا نام اے ڈبلیو ہیرس بھی لکھتے
تھے اور کسی یورپین عورت سے شادی بھی کی تھی مگر اس زمانہ
میں بھی وہ رمضان المبارک میں قرآن مجید کسی مسجد میں
سُنایا کرتے تھے۔

یہ بھی سنا ہے کہ میم بڑی وفادار تھی جب حیدرآباد
دکن میں دادا ابا کا انتقال ہوا تو وہ دن رات روتی تھی
اور ڈیڑھ ماہ بعد اس کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔

حافظ محمد عبدالواجد صاحب کی چھوٹی بہن اُم
عطیۃ النسا چھوٹی عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں پھر انھوں نے
ساری عمر قرآن مجید پڑھانے اور درس و وعظ میں گزار دی
جب پہلی دفعہ انھوں نے حج کیا تو اپنے بڑے بھائی حافظ
عبدالواجد صاحب کو حیدرآباد دکن اپنے ارادۂ حج سے
مطلع کیا اور جب بمبئی پہنچیں اور جہاز کے روانگی کی تاریخ
سر پر آگئی تو سخت پریشان تھیں۔ اُنھیں بھائی کی شفقت
و محبت ہی نہیں کنبہ پروری اور فراخ دلی پر اس قدر اعتماد
تھا بغیر کسی معقول انتظام کے بمبئی پہنچ گئی تھیں۔ جب
جہاز کی روانگی میں صرف ایک دن رہ گیا تو رو رو کر کہتی
تھیں۔ خدا کرے میرے بھائی اچھی طرح ہوں۔ ان کے
دشمنوں ہی کی طبیعت خراب ہوگئی ہوگی ورنہ یہ ممکن نہیں
ہے کہ وہ نہ آتے۔ سُنا ہے وہ حج کا جانا بھول گئیں اور
بھائی کی سلامتی، صحت، اور درازی عمر کی دعائیں اور
ذکر کرتی رہیں۔ رات کو بھائی سے ملاقات ہوئی تو جہاز
کا ٹکٹ ساتھ لے جانے کا ضروری سامان۔ نقد روپیہ
سب چیزیں موجود تھیں۔

دادی اماں سے ایک واقعہ اور سنا تھا اور دوسرے
بزرگوں سے بھی۔

حافظ عبدالواجد صاحب کی طبیعت سے اکثر ہی
عزیز اقارب اور دوست احباب واقف ہی تھے۔ ایک دفعہ
وہ حیدرآباد دکن سے دلی آئے ہوئے تھے کہ ان کے ایک
دوست میر صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا ملنے آئے
اور دوسرے دن کی دعوت کھانے کی کر گئے۔ حافظ عبدالواجد
صاحب وقت مقررہ پر اپنے دوست میر صاحب کے ہاں
گئے ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر گزری
تھی کہ ایک شخص قرق امین کے ساتھ موجود ا کئی دفعہ
کر کے قرض لیا تھا جو باوجود وعدوں کے ادا نہ ہو سکا۔
میر صاحب نے تین دن کی مہلت مانگی مگر قرقی آ چکی تھی۔
اب یا تو روپیہ نقد ادا ہو کر عزت بچ سکتی تھی یا گھر کا سارا
سامان قرق ہونا تھا۔ حافظ عبدالواجد صاحب اپنے
دوست میر صاحب کی بے عزتی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ چار
ساڑھے چار سو روپیہ کا مطالبہ تھا۔ رقم ایک گھنٹہ میں ادا
کر دی۔ بعد میں معلوم ہوا یہ ڈرامہ محض روپیہ وصول
کرنے کی غرض سے کھیلا گیا تھا۔

مولانا عبدالغفار صاحب کا بیان ہے کہ
"بڑے ابا جب ریلوے میں ملازم تھے تو ایک دن
ٹونڈلے سے جو دلی آئے تو عجیب واقعہ ہوا اس زمانہ میں پتلون
تنگ ہوتی تھی نیچے نہ بیٹھا جاتا تھا۔ دادا ابا اُس وقت موجود
نہ تھے بڑی دادی اماں فرش پر بیٹھی ہوئی تھیں انھوں نے
بیٹے سے کہا پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔ وہ اپنی ماں سے باتیں کر ہی
رہے تھے کہ دادا ابا آگئے۔ بڑے ابا کھڑے ہوگئے اور کہا۔
"ابا جان سلام علیکم" انھوں نے جواب میں ایک تھپڑ مارا
اور فرمایا۔

... صاحب ... بیٹھی ہیں ... پر
... کہ کر مولوی عبد الغفار صاحب ... وفیا
... اس کے بعد سے بڑے ابا نے اپنی ماں کی طرف توجہ
... بھی نہیں کی۔"

اُس وقت حافظ عبد الواجد دو بچوں کے باپ تھے!

... عبد الغفار صاحب ہی کا بیان ہے۔

"... بچوں میں کھیل رہا تھا کسی لڑکے نے کتش
کھینچ کر مجھے ... خون میں نہا گیا اُسی وقت بڑے ابا آ رہے
تھے آ گئے مجھے دیکھتے ہی وہ بھاگے ہوئے آئے اور دونوں
ہاتھوں پر اُٹھا کر گھر میں لائے وہ بہت قیمتی سوٹ پہنے ہوئے
تھے کپڑے خراب ہو گئے۔ گھبرا کر پورا جاکر انھوں نے
... گھر میں بھرا۔"

علامہ مغفور کی والدہ

بی بی امیر بیگم ——— رشید الزمانی مرحومہ

علامہ راشد الخیری کی والدہ مرحومہ نواب فضل رسول خاں کی مجھلی بیٹی تھیں، تعلیم کا جو چرچا علامہ مغفور کی دو دھیال میں تھا ننھیال میں نہ تھا۔ مگر دادی اماں کو تاریخی واقعات۔ نبیوں کے قصے۔ بادشاہوں کے حالات۔ سبق آموز کہانیاں۔ اُن کو اشعار بہت یاد تھے اور گیت بھی سُنایا کرتی اور ان کا مطلب سمجھایا کرتی تھیں۔ سر سید احمد خاں کا نام سب سے پہلے میں نے اُنھیں سے سُنا تھا کہتی تھیں۔ سید اتنے قابل آدمی تھے کہ سلطنت ہندوستان میں اُن جیسا ایک بھی مسلمان تھا نہ ہندو۔ انھوں نے علی گڑھ میں مدرسہ نہ بنایا ہوتا تو مسلمان مٹ جاتے۔ ان کا سا دماغ کسی کا ہو ہی نہیں انگریزوں نے اُن کا سر خرید لیا تھا کہ مرنے کے بعد دیکھیں گے اُن کے سر میں کیسا عجیب دماغ ہے۔" آج ان کی ان باتوں پر ہنسی آتی ہے مگر ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سر سید کی عظمت اُس زمانہ میں بھی چار دیواری میں رہنے والی بیبیوں کے دلوں میں تھی۔

دادی اماں بڑے رعب اور دبدبہ کی عورت تھیں۔ اور محلہ پڑوس کی عورتیں اکثر اُن کے پاس آیا کرتی تھیں۔ اُن کی سمدھن یعنی والدہ مرحوم کی اماں جو دیوار بیچ رہتی تھیں مہینوں اور برسوں گھر سے نہ نکلتی تھیں مگر دادی اماں پڑوسنوں کے ہاں جایا کرتی اور ان کے کاموں میں مشورہ دیا کرتی تھیں۔ وہ بہت کفایت شعار خاتون تھیں حالات نے انھیں غایت شعاری پر مجبور کر دیا تھا۔ افسوس میاں بیوی میں موافقت نہ تھی مزاج اور خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا یہ پٹھان تھیں اور حافظ صاحب شیخ۔ ان کے والد بہت پیسہ ضائع کر چکے تھے اس لئے اُن کی تربیت میں کفایت شعاری سکھائی گئی تھی اور حافظ صاحب لکھ لُٹ تھے کہ سینکڑوں ہاتھ میں آتے اور آتے ہی اُٹھ جاتے۔ یہ ایک ایک پیسہ کو حفاظت سے رکھتیں اور وہ پیسہ رکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ وہ انگریزی کپڑے پہنتے جو ان کی رائے میں "موئے فرنگیوں" کا لباس تھا وہ بڑے شوق سے تھان کے تھان کپڑے کے لاتے اور بیٹے کو یہ کہہ کر پیچ دیتیں ... کا ... ہے وہ میز کرسی پسند کرتے تھے اور یہ تخت اور فرش وہ اپنے والد کی فضول خرچی کا انجام دیکھ چکی تھیں اور کہتی تھیں کہ روپیہ کی قدر کرنی چاہئے۔ تم روپیہ کی عزت کرو گے تو روپیہ تمھاری عزت کرے گا اور اس سے تمھاری عزت بڑھے گی۔ حافظ صاحب گڑیوں کی شادی کرانے میں

سینکڑوں روپیہ اٹھا دیتے تھے۔ خاندان کی لڑکیوں میں
ایک کو گڑیا کی ماں بنایا ایک کو گڈے کی۔ سارا کنبہ جمع
ہو رہا ہے اور دعوتیں کی جا رہی ہیں۔

بی بی رشید الزمانی صاحبہ نے ریل کا سب سے
پہلا سفر ۱۸۶۹ء میں کیا تھا اُن کے شوہر حافظ عبد الواحد
صاحب ٹونڈلہ میں میل گارڈ تھے۔ مولوی عبد القادر صاحب
بہو کو لے کر ٹونڈلہ گئے تھے جب اُن کے پوتے "ابی میاں"
گود میں تھے۔ ٹونڈلہ جب بنگلہ پر پہنچے تو حافظ صاحب ڈاک
گاڑی لے کر گئے ہوئے تھے اور بنگلہ بند تھا۔ پڑوسیوں کو
بتا کر میں ان کا باپ ہوں اور بہو کو لایا ہوں قفل توڑ کر
گھر میں گئے۔ شام کو حافظ صاحب تشریف لائے تو دیکھا
بیوی اور بچے کو ابا لائے ہیں۔ مولوی عبد القادر صاحب
۷۔۸ دن وہاں رہے اور بیٹے کو خوش و خرم دیکھ کر واپس
دلی آ گئے مگر ایک مہینہ پورا نہ ہوا تھا کہ حافظ صاحب
نے بیوی سے کہا کہ میری نوکری اس قسم کی ہے کہ ایک
دن یہاں ایک دن باہر۔ رات کو گھر اکثر خالی ہوتا ہے۔
تمھارا تنہا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ اماں اگر آ جائیں
تو پھر ٹھیک ہے۔ انھوں نے بیوی اور بیٹے کے لئے بہت
سے کپڑے خریدے اور کئی سو روپیہ دے کر بیوی بچہ کو دلی پہنچا دیا
اور اپنے والد صاحب سے کہا اُن کے ساتھ یا آپ رہیں یا اماں۔
ننھیال کا وہاں رہنا مناسب نہیں یہ بات باپ کی بھی سمجھ میں آ گئی۔

پیدائش

دَدھیال کھاری باؤلی میں تھی اور ننھیال
کلاں محل میں جسے عوام کالا محل کہتے تھے۔

ٹیریوں کے کٹرہ، بتاشوں کی گلی کوچہ نواب میرزا
میں جو عزیز رہتے تھے وہ بھی "کھاری باؤلی" والے
کہلاتے تھے کیونکہ یہ گلیاں بازار کھاری باؤلی سے ملی
ہوئی ہیں۔

ایڈورڈ پارک کی جنوبی سمت کھڑکی تفضل حسین
سے نکل کر دائیں ہاتھ کو مدرسہ شاہ عبد العزیز تھا اور اس
سے آگے بائیں ہاتھ کو کلاں محل۔ اسی سڑک پر دائیں ہاتھ
کی دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی شیخ ناصر علی مرحوم کی تھی
اور اسی گلی میں بائیں ہاتھ کو تیسرا مکان علامہ راشد الخیریؒ
کی والدہ مرحومہ کا تھا۔ یہ کھنڈر تھا جہاں مکان ۱۸۵۷ء
کے بعد بنوایا گیا تھا۔

اس گلی سے آگے کی گلی "مزار والی گلی" کہلاتی تھی
جس میں داخل ہو کر سیدھے ہاتھ کو پہلا اور دوسرا مکان
دونوں علامہ مغفور کے ماموں منشی محمد وزیر خاں مرحوم
کے تھے۔ دوسرے مکان میں دروازہ کی ڈیوڑھی کے برابر
کمرہ تھا اور اندر دالان در دالان سہ دری کے۔

اس گلی سے ذرا آگے بائیں حضرت آتش جان کا چھتہ تھا۔
جس میں مسجد کے پچھلے دروازہ کے سامنے کوئی دو گز آگے
بڑھ کر چوکیوں والا مکان "علامہ مغفور کی ننھیال تھا۔
"پہاڑ والی" کا تھا۔ یہ گلیاں کلاں محل سے تھوڑے فاصلہ
پر تھیں مگر یہ علاقہ عقب کلاں محل کہلاتا تھا اور ابا جان
کی دَدھیال میں ان گلیوں کے رہنے والے عزیز
"کالے محل والے" کہلاتے تھے۔

مزار والی گلی میں منشی وزیر محمد خاں صاحب کے
دوسرے مکان کے اندر کے دالان میں شمالی رخ بی بی
رشید الزمانی صاحبہ کا پلنگ بچھا ہوا تھا اور اس
کونہ میں جنوری ۱۸۶۸ء میں علامہ راشد الخیری پیدا
ہوئے تھے۔

دلی میں عام طور پر یہ دستور تھا کہ زچہ خانہ

سسرال میں ہوتا تھا پھر یہ تو پہلا زچہ خانہ تھا اُس زمانہ میں
حافظ عبدالواحد صاحب دلی سے باہر ملازم تھے لیکن ان کے
والد مولوی عبدالقادر صاحب اور ان کی بیوی یعنی سسر اور
ساس دونوں دلی میں تھے۔ وہ کسی طرح گوارا کر لیتے کہ
بہو کا پہلا زچہ خانہ میکہ میں ہو اور پھر اس صورت میں
جب مالی حالت بھی سمدھیانہ سے اچھی نہ تھی۔

خود حضرت والد مرحوم نے ایک دفعہ اپنی پیدائش
کا ذکر اس طرح کیا تھا کہ اُس وقت ڈاکیہ آیا تو دادی اماں
آ چکی تھیں۔ انھوں نے ڈاکیے سے کہا۔

"اچھی بٹیا دیکھیو۔ ذرا ایک پیسہ کا شہد تو لا دے
ننھا ہوا ہے" اس واقعہ سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) علامہ مغفور کی والدہ زچگی کے لئے میکہ نہیں
آئی تھیں چند گھنٹوں کے لئے کسی ضروری کام سے آئی
تھیں یا زیادہ سے زیادہ ایک دن قبل۔ موت اور پیدائش
کا وقت کسی کو نہیں معلوم۔ کوئی بہت اہم کام ہوگا جو پورے
دنوں میکے آنے کی ضرورت ہوئی اگر زچگی کے لئے آتیں تو شہد
وغیرہ کا انتظام پہلے سے ہو چکا ہوتا۔

(۲) صبح کی ڈاک ۸-۹ بجے کے قریب تقسیم ہوتی
تھی۔ لہذا پیدائش کا وقت صبح ۸ اور ۹ بجے کے قریب تھا۔

(۳) سنہ ۱۹۶۳ء میں تو شاید چار آنے یا ۲۵ پیسہ کا
بھی شہد نہ ملے اُس زمانہ میں چیزیں اس قدر سستی تھیں
کہ عطار سے ایک پیسہ کا شہد (اور وہ بھی خالص) آسانی
سے مل جاتا تھا۔

(۴) سرکاری ملازم کو ڈاک تقسیم کرنی تھی مگر تھوڑی
بہت انسانیت اکثر و بیشتر آدمیوں میں تھی۔

اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات قابل ذکر ہے
کہ دائی میکہ کی نہیں سسرال کی تھی حالانکہ میکہ کی دائی
اسی محلہ میں رہتی تھی اور سسرال کی خاص کر —

بی بی رشید الزمانی صاحبہ کے میکہ والوں کو جب یہ
معلوم ہوا کہ بچہ کی پیدائش کا وقت آ پہنچا تو اسی انھوں
نے منشی وزیر محمد خاں صاحب کو کھاری باؤلی دوڑایا
انھوں نے بڑی استانی جی یعنی مولوی عبدالقادر صاحب کی
بیوی کو اطلاع دی۔ بڑی استانی جی نے [illegible] خاں کی
بنو دائی جھمی کو جو بڑی تجربہ کار تھی کہلوایا کہ فوراً کالے
محل پہنچو۔ اور پھر خود ڈولی منگا کالے محل آئیں اور اپنی
بیٹیوں کو تاکید کر آئیں کہ جلد سے جلد کالے محل پہنچ جائیں
پیدائش دادی کے پہنچنے کے ایک گھنٹہ اور پھوپھیوں کے
پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہوئی تھی۔ پھوپھیاں جب پہنچیں تو
خالائیں بھی آ چکی تھیں۔

بیوی اور بیٹیوں کو روانہ کرنے کے بعد مولوی عبدالقادر
بھی کالے محل کے لئے روانہ ہوئے اور وہ جب پہنچے تو
پوتے کی پیدائش کو دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ ظہر کی نماز سے
قبل انھوں نے پوتے کو گود میں لیا اور کان میں اذان دی۔

حافظ عبدالواحد صاحب اُس زمانے میں ریلوے
میں ملازم تھے اور ڈاک گاڑی لے کر ٹونڈلہ سے دلی آیا کرتے
تھے اُسی رات کو وہ آئے اور بچے کو دیکھا۔

پانچ روز بعد بی بی رشید الزمانی صاحبہ چھٹی
نہائیں اور بڑی استانی جی بہو اور پوتے کو کھاری باؤلی
لے آئیں۔ دوسرے دن حافظ صاحب دلی آئے تو عقیقہ
ہوا۔ زچہ گیریاں روز گائی جا رہی تھیں۔ ڈومنیوں اور
ہیجڑوں کو انعام ملا۔ عقیقہ پر سر کے بالوں کے وزن کے
برابر چاندی خیرات کی گئی۔ سوا مہینے ہوئے چند روز بعد
ختنہ کی تقریب ہوئی اور جب حافظ صاحب کی بیوی
یعنی رشید الزمانی صاحبہ چلہ نہائیں تو پھر تقریب ہوئی

جن باپ کو بیٹیوں کی شادی کرتے اور کسی نہ کسی تقریب کے بہانے عزیزوں کو جمع کرنے کا شوق تھا بیٹے کی پیدائش پر اُس نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ اُس زمانہ میں میکہ سے چھٹی جانے پھوپھیوں کی طرف سے کرتہ ٹوپی آتے اور بھائیوں سے نیگ لینے کا عام دستور تھا۔ کھٹ کھنٹ باپ نے دل کھول کر روپیہ اُٹھایا۔ اور دادا دادی کی خوشی کا تو کچھ ٹھکانا تھا ہی نہیں۔

نام اور عرف

مولوی عبدالقادر صاحب نے پوتہ کا نام "محمد عبدالراشد" رکھا۔ راشد کے معنی ہیں ہدایت کرنے والا اور کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ علامہ مغفور نے اپنی قوم کو ہدایت کرنے کا حق ادا کر دیا۔

اصلی نام تو صرف مدرسہ اور ملازمت، خط کتابت اور مضمون نگاری کے لئے تھا گھر والے "ابی" کہتے تھے۔ یہ عرف اتنا مشہور ہوا کہ "میاں ابی" جب جوان ہوئے تو "بھائی ابی" اور جب بڈھے ہوئے "ماموں ابی"۔ "چچا ابی" کہلاتے تھے اور بعض رشتہ داروں کو اصلی نام معلوم ہی نہ تھا اکثر محلہ والے اور ملازم بھی نہ جانتے تھے۔ جوانی سے آخر وقت تک "مولوی صاحب" کہلائے۔

بچپن

علامہ مغفور پہلونٹی کے تھے اور خوب صورت تھے۔ پھوپی اماں فرمایا کرتی تھیں۔ بھائی جب ننھے سے تھے تو غیروں کو اُن پر پیار آتا تھا اور وہ لوگ گود میں اُٹھا لیتے تھے۔ دادی اماں کی ایک بڑی اور دو چھوٹی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی مگر چار بہنوں میں بس یہی ایک بیٹے تھے۔ باپ بڑے تنخواہ دار معزز عہدہ دار تھے اور ٹھاٹھ رئیسانہ اور دادا تو بقول افتخار عالم صاحب مارہروی مؤلف حیات النذیر "دلی کے بڑے رئیسوں میں سے تھے" پرورش ناز و نعم میں ہوئی۔

خود فرماتے تھے دادی اماں مجھے اکثر اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر کھلاتی تھیں حالانکہ میں اس وقت خود کھانے کے قابل تھا یہ بھی فرماتے تھے وہ مجھ کو سب بچوں سے اچھا کھانا کھلاتیں۔ دسترخوان پر ڈھیروں اور بچوں کے ساتھ بیٹھتا تو وہ مونگ کی کھچڑی کے بیچ بڑا سا گھی کا گولا چھپا کر طشتری مجھے دیتی تھیں۔

تربیت

مولوی حافظ عبدالواحد صاحب اس خاندان کے پہلے شخص تھے جنھوں نے ماں باپ سے چھپ چھپا کے نہ صرف انگریزی پڑھی اور اس میں غیر معمولی قابلیت حاصل کی بلکہ کوٹ پتلون بھی پہنی اور مغربی معاشرت بھی اختیار کی۔ باوجود اس کے چہرے پر داڑھی تھی اور ہر رمضان شریف میں محراب سناتے تھے۔ مگر باپ کی معاشرت اور خیالات کے برعکس بیٹے کی تربیت ٹھیٹ مشرقی اور خالص اسلامی اصولوں پر مولوی عبدالقادر جیسے جید عالم دادا کی نگرانی میں ہوئی۔

اپنی نندوں کے مقابلہ میں دادی اماں زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر انھیں بہت سے نبیوں کے قصے ازبر تھے۔ جب بیٹے کو باتیں کرنی آ گئیں اور وہ قصے کہانیاں سننے کے قابل ہو گئے تو کبھی حضرت موسیٰ کا قصہ سناتیں کبھی حضرت ابراہیم کا کبھی رسول اکرم کے واقعات سناتیں۔ فرماتے تھے میں شاید پانچ سال کا تھا اماں نے رسول اکرم کے طائف جانے اور سنگباری کا واقعہ سنایا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

خدا کا خوف اور رسول کی عظمت کا سبق انھوں نے اپنے گھر میں پڑھا اور ایسا پڑھا کہ ہمیشہ کے لئے ان کے ذہن نشین ہو گیا یہ سبق ان کی تربیت کا جزو ضروری تھا۔ وہ ایسا دل نشین ہوا کہ رگ رگ میں سما گیا۔

پھوپی اماں کے جہیز کے لئے جمع کی گئی تھیں۔"

شاہ جہاں بادشاہ نے شاہ بخارا کی اجازت سے سید عبدالغفور زول کو جامع مسجد کی امامت کے لئے بخارا سے بلوایا تھا۔ میر عبدالکریم ولد میر حسین تسکین ان کے پڑپوتے تھے۔ میر عبدالعزیز جن کی زاہدہ بیگم صاحبہ سے ۱۸۸۶ء میں شادی ہوئی میر عبدالکریم کے بیٹے تھے۔

شمس العلما مولوی سید احمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی کی ایک ہی بہن تھیں اور ان کے بیٹے تھے میر عبدالعزیز صاحب۔ مرحوم امام صاحب کو اپنے بھانجے سے بہت محبت تھی اور ۱۵ روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ اور شام کا کھانا میر صاحب مرحوم اکثر اپنے ماموں کے ساتھ کھاتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں پھوپی اماں بیوہ ہوگئیں۔

ان کی صحت اتنی اچھی تھی کہ کبھی عینک نہیں لگائی مطالعہ کتب کا انھیں عشق تھا۔ کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتی ہی رہتی تھیں۔ سینکڑوں اردو فارسی کے اشعار نوک زبان تھے۔ خدا جانے کتنی حدیثیں ازبر تھیں۔ تلاوت قرآن مجید کے وقت کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی موجودگی میں زیر و زبر کی غلطی کر سکے۔ قرأت تھے سناتے وقت خود بھی روتیں سننے والوں کو بھی رلاتی تھیں۔ مذہبی مسائل محبت سے سمجھاتی تھیں۔ دلی میں ان کا وعظ مشہور تھا۔ کتاب بھی پڑھتیں۔ زبانی بھی بیان کرتیں۔ آواز میں وہی درد تھا جو ان کے والد اور بھائی کی آواز میں تھا۔ جب نظم پڑھتیں محفل کو سن کر دیتی تھیں۔ سیکڑوں عصمتی بہنوں نے تربیت گاہ کے جشن معراج میں ان کا وعظ سنا تھا۔ خود بھی دلی کے مدرسہ حسین بخش میں جمعہ کی نماز کے بعد وعظ سننے ۱۲ سال سے جارہی تھیں اور اس لئے کہ جگہ اچھی مل جائے گیارہ بجے ہی سے چلی جاتیں اور چار بجے شام کو واپس گھر آتیں خاندان کا کوئی کام ہوتا ان کا جمعہ ناغہ نہ ہوتا۔ اذان کے وقت کوئی بچہ باتیں کرتا تو وہ ٹوک دیتیں۔ ۹۴ سال کی عمر میں بھی انھوں نے رمضان کے روزے قضا نہیں کئے۔ دو دفعہ حج بیت اللہ کو گئیں۔ مدینہ منورہ سے جو نظمیں انھوں نے بھیجیں عصمت میں شائع ہو چکی ہیں۔ انھیں اپنے بھائی سے ہی نہیں بھاوج بھتیجوں بھتیجیوں سے بہت محبت تھی۔"

(عصمت فروری ۱۹۴۰ء)

عقیدت مند ان سے تعویذ لینے آیا کرتے تھے۔ پھوپا ابا کی جائداد کافی تھی اور ان کی پھوپی کے ترکہ میں بھی کئی مکان ان کے بچوں کو ملے تھے۔ پھوپی اماں کے بچوں کو جائداد کبھی نہ آئی۔ آٹھ آٹھ سات سات ہزار کا ایک ایک مکان دو دو ڈھائی ڈھائی ہزار روپیہ میں گیا اور وہ بھی آدھی پونی رقم ٹکڑیوں میں ملی۔

پھوپی اماں نے عینک نہیں لگائی۔ دانت بھی ایک دو ہی ٹوٹے تھے ان کا انتقال چھوٹی بھتیجی واجدہ بیگم کے مکان میں ہوا تھا واجدہ بیگم لعدان کے شوہر سردار میاں نے آخر وقت میں پھوپی اماں کی بہت خدمت کی تھی۔

حاجیہ زاہدہ بیگم مرحومہ کی اولاد | علامہ مغفور کی ان حقیقی بہن کے پانچ بچے تھے۔

(۱) سب سے بڑی مریم بیگم تھیں جنھوں نے دو لڑکیاں چھوڑیں احمدی اور امجدی۔ ان کے شوہر منشی مبارک علی مرحوم ریاست جے پور کی نظامت ہنڈون پھر گنگاپور سٹی میں ملازم تھے۔ علامہ مغفور اپنی بڑی بیٹی راشدہ بیگم کے پاس گنگاپور جاتے تو اپنی بھانجی کے ہاں اکثر جایا کرتے اور دیر تک وہاں بیٹھا کرتے تھے بہت ہی سلیقہ مند اور صفائی پسند خاتون تھیں۔

باب تیسرا — لڑکپن

زمانۂ تعلیم حافظ عبدالواجد صاحب نے اپنے شوق سے چھپ کر انگریزی پڑھی اور اُسی کی وجہ سے وہ ملازمتیں کیں جہاں انگریزی بولنی اور لکھنی پڑتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی زبان سیکھنے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے علامہ مغفور نے سب سے پہلے قرآن مجید اپنی دادی "بڑی اُستانی جی" سے پڑھا۔ فارسی گھر پر پڑھنی شروع کی اس کے بعد دلی کے عربک اسکول میں داخل ہوئے۔ لیکن مدرسہ میں سوائے انگریزی کے اور کسی مضمون سے اُنھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اُردو تاریخ جغرافیہ کے گھنٹوں سے کبھی کبھی اور حساب کے گھنٹے سے اکثر غائب ہو جایا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "دادا آبا بیچارے اسی فکر میں گھلے جاتے تھے کہ ابّی دن بھر محنت سے پڑھتا ہے۔ اُن کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ اِدھر حساب کا گھنٹہ بجا اور اُدھر میں مدرسہ کی نہر پر پہنچا اور تیراکی شروع کر دی یا نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بانسری بجانے یا گانے لگا۔" البتہ انگریزی میں اُنھیں خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اور اس مضمون میں وہ اپنی جماعت میں ہمیشہ اوّل رہتے۔ اور اسی کی وجہ سے کسی جماعت میں فیل نہیں ہوئے۔ اس سلسلہ میں ایک بہت پُرلطف واقعہ سُنایا تھا کہ "ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا کہ امتحان ہوا۔ ایک ہم جماعت تھے عبدالرشید۔ اُن کا حساب اچھا تھا لیکن انگریزی بہت کمزور۔ انگریزی میں میرے سو میں سے ۸۰ نمبر تھے۔ عبدالرشید کے ۱۶ مگر حساب میں میرے ۲۰ نمبر تھے اور اس کے ۸۰۔ روٹن انگریزی میں عبدالراشد اور عبدالرشید ایک ہی طرح لکھتے ہیں۔ بیچارے عبدالرشید فیل ہو گئے اور میں پاس ہو گیا۔"

علامہ مغفور کے چچا زاد بھائی مولانا عبدالغفار الخیری صاحب علامہ مرحوم کے زمانۂ طالب علمی کے واقعات اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ۔

"دادا آبا (مولوی عبدالقادر صاحب) ہر جمعہ کو صبح نہا دھو کپڑے بدل ناشتہ کر کے چل دیتے تو غریب امیر رشتہ داروں سے ملتے ملاتے جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتے اور نماز کے بعد پھر باقی ماندہ عزیز اقارب سے ملتے مغرب کے وقت گھر پہنچتے۔ جو سلوک کے قابل ہوتا اس سے سلوک کرتے۔

ہاں تو جمعہ کا دن تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر چلے تو بھائی ابّی کو ساتھ لیا کہ رستہ میں مدرسہ پہنچا دیں۔ ملتے جُلتے مدرسہ کے وقت تک مدرسہ پہنچے اور اُن کو وہاں چھوڑ کر آگے بڑھے۔ ماسٹر صاحبان ابھی نہ آئے تھے۔ دادا آبا تو مدرسے سے چلے اور یہ اُنھیں کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ مدرسہ قاضی کے حوض پر تھا اور دادا آبا کو بھائی بشیرالدین احمد کی دولھن سے ملنے بُلبلی خانہ جانا تھا۔ دادا آبا گھر میں داخل ہوئے اور ساتھ ہی بھائی ابّی بھی۔ بھابی دولھن نے اُٹھ کر سلام کیا اور بھائی ابّی سے پوچھا۔

"میاں ابّی! اچھے تو ہو؟"

یہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی!

قصہ مختصر اس کے بعد کیا ہوا۔ پوتے مدرسہ میں تھے

عربک سکول میں اُن کے ریاضی کے اُستاد ماسٹر
امتیاز حسین صاحب تھے۔ اُن سے میں نے بھی پڑھا ہے۔ آٹھویں
جماعت میں فیل ہونے کے بعد انگریزی اور حساب دونوں
میں میں ہوشیار تھا مگر ساتویں میں دونوں مضمونوں میں کمزور
تھا۔ ایک دن میں نے حساب کا کوئی سوال غلط حل کیا۔
اور ماسٹر صاحب کو دکھایا تو انھوں نے فرمایا۔

"میں نے تمھارے ابا کو بھی پڑھایا ہے۔ اُن کا بھی
حساب کمزور تھا مگر انگریزی اور تاریخ میں ان کے نمبر بہت
اچھے آتے تھے اور وہ تو اب اڈیٹر اور مصنف ہیں۔ تم اس
خیال میں تو نہیں ہو کہ قابل آدمیوں کا حساب کمزور ہوتا ہے۔"

میں نے والد مرحوم کو یہ واقعہ سنایا تو انھوں نے
ماسٹر صاحب کے پڑھانے کے طریقے کی اور ماسٹر صاحب
کی شفقت اور بزرگی کی بہت تعریف کی۔

علامہ مغفور نے ابھی مڈل پاس نہیں کیا تھا کہ ان کی
ذہانت کا چرچا ہونے لگا تھا ہیڈ ماسٹر شہاب الدین صاحب
اور سیکنڈ ماسٹر مرزا احمد بیگ ان کی انگریزی کی تعریف کرتے
مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے کاش تم کو حساب سے بھی دلچسپی ہوجائے۔

حافظ عبدالواجد صاحب حیدرآباد دکن میں

حافظ صاحب مرحوم کو محبت اپنی تینوں بہنوں ہی سے تھی مگر بڑی بہن
بی بی صفیۃ النساء سے غیر معمولی۔ ایک دن جو ٹونڈلہ سے دلی
آئے۔ تو اپنی والدہ ماجدہ سے کہا "میں نے نوکری چھوڑ کر
حیدرآباد جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آپا مجھے بہت یاد آرہی
ہیں۔ بہت دن سے انھیں نہیں دیکھا۔" ماں اور بہنوں نے
بہت سمجھایا کہ آپ صاحب اولاد ہو۔ سمجھ سے کام لو کب
تک نوکریاں چھوڑتے رہوگے مگر وہ نہ مانے اور حیدرآباد
دکن بہن کے پاس پہنچ گئے اور محکمہ بندوبست میں اعلیٰ افسر
مقرر ہوئے بہن نے کہا "پہلی تنخواہ میری ہوگی۔" پوچھا "کیا
کروگی؟" کہا "کچھ ہی کروں۔" پھر دریافت کیا "بتاؤ تو سہی"
اُنھوں نے جواب دیا "پاؤں کے چھلے بنواؤں گی۔" چنانچہ
پہلی تنخواہ بہن کو دے دی اور انھوں نے سونے کے چھلے
بنوائے۔ اس خاندان میں مرحومہ بی بی صفیۃ النساء پہلی
خاتون تھیں جنھوں نے سونے کے چھلے پہنے۔

بہنوئی یعنی ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم کھانا پہلے
کھالیتے تھے اور بہن بھائی ساتھ کھاتے تھے کسی بات پر
ڈپٹی صاحب حافظ صاحب سے ناراض ہوگئے تو حافظ
صاحب اپنا بستر اور ٹرنک وغیرہ لے کر چلے گئے اور کسی سرائے
میں قیام کیا۔ شام ہوگئی۔ ڈپٹی صاحب کھانا کھا چکے۔
مگر اُن کی بیوی نے بھائی کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا۔
ننگے پاؤں دیر تک بنگلہ میں ٹہلتی رہیں۔ پریشان اور متفکر
آخر میاں سے کہا "عبدالواجد کہاں چلے گئے اے ہے بیٹھے
دیکھ رہے ہو۔ یہ نہیں ہوتا ذرا جا کر معلوم تو کرو۔" ڈپٹی صاحب
نے کہا "آجائیں گے۔ شاید دورہ پر چلے گئے ہوں۔" نیند
ڈپٹی صاحب کو بھی نہیں آئی مگر اُن کی بیوی جاگتی رہیں
اور بھائی کی بخیر واپسی کی دعاؤں میں رات گذار دی۔ صبح
بھی ناشتہ نہیں کیا۔ دوپہر ہوئی کھانا نہیں کھایا سب
نے اصرار کیا تو بہن نے کہا۔

"کھانا تو میں عبدالواجد ہی کے ساتھ کھاؤں گی۔"

تیسرے پہر اپنے باورچی کو ۵ روپیہ دئے اور کہا کہ
"سرکار کو خبر نہ ہو عبدالواجد کو تلاش کرو۔ دفتر والوں سے
پوچھو۔ سرائیں دیکھو۔" اُس زمانہ میں ہوٹل نہیں تھے۔
بڑی مشکل سے پتہ چلایا کہ ایک سرائے کی کوٹھڑی میں
ٹرنک اور بستر جس وہ بستر پہچانتا تھا۔ وہیں ٹھیرا رہا۔
حافظ صاحب آئے تو اُس نے جھک کر سلام کیا اور کہا

...تے آپ آئے ہیں بڑی بیگم صاحب نے کھانا نہیں
... گھر نے نوش نہ کرلی۔ روٹھ جاتی ہیں
... جب آپ آئیں گے اُس وقت کھانا کھاؤں گی
... وقت کو بارہ بجے آؤں گا اور باغ کے فلاں
... کے نیچے ملوں گا۔ چنانچہ وقت مقررہ پر
... دونوں بھائی بہن دونوں نے کھانا کھایا اور کئی وقت
... کے بعد۔ بہن نے ناراضگی کی وجہ پوچھی تو
... کہا اب میں جاتا ہوں۔ بہن نے بہت ٹھہرا تا
... اور کہا ہر روز اسی وقت آیا کروں گا۔ ڈپٹی
... صاحب جاگ رہے تھے۔ سمجھ گئے مگر خاموش
... دن اسی طرح بھائی سے ملتی رہیں۔ میاں سے
... بات کرتیں نہ اُن کی کسی بات کا جواب دیتیں۔
... تھی بہت تھی بڑے پائنچوں کا پاجامہ۔ پہنے بھائی سے
... جا رہی تھیں کہ پاؤں کسی چیز سے اُلجھ گیا۔ اور
... سیڑھیوں سے گر پڑیں اور چیخ نکلی۔

"عبدالواحد میں مر گئی"

ٹانگ ٹوٹ گئی اور بے ہوش ہو گئیں!

اِدھر سے حافظ عبدالواحد صاحب دوڑے اُدھر سے ڈپٹی نذیر احمد صاحب اُٹھا کر اندر لائے اور پلنگ پر لٹایا تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے کہا جا کر کسی حکیم کو لاؤ۔ حکیم نے لیپ وغیرہ دیا جب لگا دیا گیا اور حافظ صاحب جانے لگے تو ڈپٹی صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"اب کہاں جاتے ہو۔ بہن کو تو مار دیا۔ اگر مر گئیں تو میرا گھر برباد ہو جائے گا۔ میں نہیں جانے دوں گا بتاؤ کہاں ٹھیرے ہو"

"رہنے دیجئے بھائی صاحب۔ میں آپا کو دیکھنے آتا رہوں گا"

"اچھا ٹھیرے کہاں ہو؟"

اُنھوں نے پتہ بتایا۔ ڈپٹی صاحب نے سامان منگوایا۔ کھانا کھانے کا بہت اصرار کیا نہیں کھایا تو پوچھا تمہارا یہ فیصلہ ہے" کہا "جی ہاں۔"

"عبدالواحد تمہاری بہن مر جائے گی"

"... مرضی اللہ کی"

بہت کہنے سننے سمجھانے بجھانے سے وہ اس پر رضامند ہوئے کہ بہن کے ساتھ رہیں گے مگر کھانا باہر کھائیں گے۔

دو دن بعد ڈپٹی صاحب نے کہا۔

"یہ سرائے نہیں ہے کہ سونے کے لئے آ جاؤ۔ تم کھانا بھی یہیں کھاؤ اور ایسا ہی ہے تو اس کی قیمت دے دیا کرو"

یہ بات اُن کی سمجھ میں آ گئی، اور کھانا پھر بہن کے ہاں کھانے لگے۔ تنخواہ ملی تو ڈپٹی صاحب کے پاس لائے کہ اس میں سے کھانے کی قیمت لے لیجئے۔ اُنھوں نے کہا اپنی بہن کو دے دو۔ اور پھر اپنی بیوی سے کہا۔ "عبدالواحد سے روپیہ لے کر مجھے دے دیا کرو" چنانچہ ڈپٹی صاحب ہر ماہ رقم بینک میں حافظ صاحب کے نام سے جمع کرتے رہے۔

یہ واقعہ ابا جان نے آپا راشدہ کو سنایا تھا اور اُن سے سن کر میں نے مفہوم اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔

دادا ابا بڑی دادی اماں یعنی اپنی والدہ ماجدہ کو سو روپیہ کا منی آرڈر ہر مہینہ بھیجا کرتے تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی بہو یعنی دادی اماں کو اوپر کے خرچ کے لئے کیا دیتی تھیں۔

دادی اماں سے اور ابا جان سے کئی بار سُنا کہ دادا ابا کے دائیں بازو پر ایک سونے کا کڑا ہمیشہ رہتا تھا۔ آپا راشدہ بیگم کا بیان ہے کہ یہ حیدر آباد دکن کا واقعہ ہے کہ دادا ابا نہا رہے تھے۔ بڑی پھوپی اماں نے جو کواڑ کھولا تو بازو پر کڑا جگمگا رہا تھا۔ جب وہ نہا کر باہر آئے تو انھوں نے کڑے پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہ مجھے دے دو" بھائی نے تامل کیا تو بہن نے پھر اصرار کیا اور کہا "مجھے دے دو میں واپس نہ دوں گی"۔

حافظ عبدالواحد صاحب کی رحلت

حافظ صاحب نے وہ کڑا بہن کو دے دیا اور اتنا ہی بڑا اور ایک کڑا بنوا کر پھر بازو میں پہن لیا اور یہ دوسرا کڑا تختہ پر سے اُترا جب اُنھیں غسل دیا جا رہا تھا۔

بی بی صفیۃ النساء صاحبہ نے اُن دونوں کڑوں کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ جب پھوپی اماں زاہدہ بیگم صاحبہ کی شادی کا وقت آیا تو اُن جوڑوں کے علاوہ جو وہ بھتیجی کی شادی کے لئے تیار کر کے لائی تھیں دونوں کڑے نکال کر اپنی اماں کے آگے رکھ دئے۔ یہ کڑے بھی اور بنک کی کتاب بھی اور کہا کہ میاں عبدالواحد بچوں کے لئے یہ چھوڑ کر سدھارے ہیں۔

بیٹے "میاں ابی" کو چاندنی پر بوٹ پہنے ہوئے چلے آنے پر تنبیہ کرتے اور باپ سے تھپڑ کھانے اور خفگی سُننے کے بعد حیدر آباد آئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ منجھلی بہن بی بی ذکیۃ النساء صاحبہ کا خط پہنچا کہ ان کی بیٹی حاجرہ بیگم صاحبہ کی شادی کی تجویز ہے۔ بہن کے خط کے جواب میں بھائی نے لکھا کہ لڑکیوں کی شادی میں دیر نہیں کرنی چاہئے شادی کی تاریخ ٹھہرا دو میں انشاء اللہ وقت پر پہنچ جاؤں گا میری طرف سے ایک چالا روک لینا۔ دلی میں بیٹی کی شادی کے بعد پہلی دعوت داماد اور سمدھیانہ کی بیٹی کی ماں کی طرف سے ہوتی تھی اور تین اور دعوتیں جو چاہے کہلاتے تھے بھائی بہن چچا ماموں پھوپی خالہ میں سے تین بزرگوں کی طرف سے۔ حافظ عبدالواحد صاحب کے سامنے کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی کہا کرتے تھے کہ سب لڑکیوں کی شادی میں کروں گا۔ چھٹی ملنے میں دیر ہوئی تو انھوں نے اپنے ابا کو تار دیا کہ شادی کر دیجئے میں چار پانچ روز بعد پہنچوں گا۔ میری طرف سے چالا روک رکھنے۔ عین شادی کے دن جب کھانا نکالا جا رہا تھا آدھے آدمی کھانا کھا چکے تھے رات کا وقت تھا کہ روشنی دکھلانے کے لئے جو ڈبیہ کسی کے ہاتھ میں تھی وہ چھوٹ کر دیگ میں گر گئی اور اُن کی منجھلی بہن کے منہ سے جو دیگ کے پاس کھڑی تھیں بے ساختہ نکلا۔

"اللہ خیر کرے"

عورت مرد سب دم بخود تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا تار ملا کہ حافظ عبدالواحد کا ہیضہ سے انتقال ہو گیا! کھانا کھا رہے تھے کرتے ہوئی۔ اور چند گھنٹوں میں ختم ہو گئے۔

شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا!

ددھیال ننھیال میں اللہ آمین

ہر خاندان میں بڑے پوتے کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ علامہ مغفور بڑے بیٹے کی اولاد تھے اور پوتوں میں سب سے بڑے۔ اُن کے دادا اور دادی کو زیادہ محبت ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی دوسری یہ کہ بیٹے بہو میں ناموافقت تھی۔ بہو دلی میں رہتیں اور بیٹا بسلسلۂ ملازمت دلی سے باہر علامہ مغفور ہر وقت دادا دادی کے سامنے رہتے تھے تیسری وجہ یہ تھی کہ ان کے والد کی جوان موت ہوئی۔ یہی سبب تھے وہ اسباب کہ

... کے جگر کے ٹکڑے تھے اور دادی کی آنکھوں
... دادی آخر عمر میں آنکھوں سے جاتی رہی تھیں لیکن
... پوتے جایا کرتے تھے۔ ان کے مکان میں
... بھولا ہوا تھا مگر ابا میاں ماں کے
... خاص بارہ تیرہ سال کی عمر تک دادی کے
... وہ تکیے کے نیچے بادام پستہ اخروٹ کی
... رکھ دیتی تھیں۔ فجر کی نماز کو اٹھتیں تو انھیں
... سے ہلا کر جگاتیں اور پھر تاکید کرتیں کہ تم نماز پڑھ
... تم یہ پڑھا یا ختم کر لو۔ وہ نماز سے فارغ ہوتیں
... اٹھاتیں کہ جاؤ نماز پڑھو۔ وہ کبھی تو نماز
... کبھی اپنی اماں کے پاس جا کر لیٹ جاتے۔
... نماز پڑھتا ہوا نہ دیکھتیں تو انھیں ڈھونڈتیں اور
... سے اٹھا کر لاتیں کہ چلو نماز پڑھو۔ جو کھچڑی
... پکوائی جاتی وہ چپکے سے پوتے کے لئے نکال
...تیں۔ چھوٹی سی پتیلی میں دال چاول اور بہت سا
... ڈال کر چڑھا دیتیں پھر بیچ میں گھی ڈالتیں پانی
... خشک ہو جاتا پھر گھی ڈالتیں یہاں تک کہ
...نی بالکل خشک ہو جاتا تو کھچڑی کٹوری میں نکال
... سے کچا گھی ڈالتیں اور سب سے چھپا کر کھلایا کرتی
تھیں۔ پھوپھیاں بھی اپنے ماں باپ کی نظر پہچانتیں۔
اور ان کی بھی محبت بھری نظریں بھتیجے پر پڑتیں۔

ددھیال ہی میں آن کی اللہ آمین نہ تھی ننھیال
میں بھی خالائیں واری نثار تھیں۔ پہاڑ والی خالہ اماں
اور جے پور والی خالہ اماں کے ہاں تو اولاد ہوئی ہی نہیں
بڑی خالہ اماں جو اعظم خاں کی حویلی میں رہتی تھیں۔
جن کے صرف دو بچے ہوئے ایک لڑکا ایک لڑکی۔
ان کا جوان بیٹا داغ مفارقت دے گیا تھا اور چھوٹی
خالہ اماں کی کوئی اولاد علامہ مغفور کے لڑکپن میں نہ تھی۔
غرض دو بہنوں کی اولاد میں صرف یہی ایک لڑکے تھے۔
اور ان کے ماموں کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ایک طرف
دادا دادی اور پھوپھیاں گرویدہ تھیں دوسری طرف
ماموں خالاؤں میں بھی ان کا لاڈ پیار معمولی نہ تھا۔

چند مہینے ڈپٹی نذیر احمد کی شاگردی میں

ایک سکول کے بیچ کا خواجہ شہاب الدین مرحوم انگریزی کے استاد
مرزا احمد بیگ مرحوم اپنے شاگرد سے خوش تھے خواجہ
الطاف حسین حالی اردو فارسی کے استاد کو بھی کوئی
شکایت نہ تھی مگر ریاضی کے استاد ماسٹر امتیاز حسین
صاحب حساب میں کمزوری کی وجہ سے خوش نہ تھے باپ
کے بعد دادا کی شفقت سے بھی جب محروم ہو گئے تو سکول
سے دل اچاٹ رہنے لگا۔ نویں جماعت میں تھے کہ سکول
جانا چھوڑ دیا اور گھر پر رہنے لگے پہلے تو دادا آبا۔ پکڑ
پکڑ کر لے جاتے تھے اب کون لے کر جاتا۔ دادی کے
بچھونے سے لگے رہتے یا چھت پر کلتے اور تاش کھیلتے یا
گڈیاں (پتنگ) اڑاتے اور باہر نکلنے کا موقع ملتا تو
شام کو کرکٹ کھیلتے۔

چچا ابا اناؤ میں ملازم تھے ماموں خالائیں اور
پھوپھیاں اور سب سے بڑھ کر دادی اور ماں سخت پریشان
تھیں کہ کیا علاج کیا جائے جو راتی میاں کا جی پڑھنے میں
دل لگے بڑی دادی اماں یعنی علامہ مغفور کی دادی نے کہا
صفیہ اور نذیر احمد آنے والے ہیں ان سے صلاح کروں گی
کچھ روز بعد جب حیدرآباد دکن سے پھوپھا پھوپھی آئے تو
دادی نے داماد (ڈپٹی نذیر احمد) سے کہا۔
”راتی میاں نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے میں تمہارے

سپرد کرتی ہوں ۔ انھیں پڑھاؤ۔"

داماد نے دریافت کیا "کیا پڑھاؤں"

ساس نے کہا "حدیثیں پڑھاؤ۔ قران شریف کا ترجمہ پڑھاؤ۔ تاکہ یہ اپنے دادا پردادا کی طرح مولوی بنے۔ قران بہت اچھا پڑھتا ہے آواز بھی بہت اچھی ہے بالکل عبدالواجد کی طرح وہ حافظ تھے اسے قاری بناؤ۔ مولوی بنے یا قاری کچھ ہو تو جائے باپ دادا کے نام کو بٹّہ تو نہ لگے۔"

ماموں ۔ خالائیں ۔ پھوپھیاں ۔ ماں ۔ دادی سب کے یہ الفاظ کان میں پہنچ رہے تھے پہنچتے رہتے تھے۔

"واہ میاں اپّی! عبدالواجد کا نام خوب روشن کر رہے ہو۔ ہائے ایک بیٹا اور وہ بھی نالائق۔ آج کو وہ زندہ ہوتے تو مجال تھی کہ گیند بلّے اور رنگا نے میں وقت برباد کرتے۔"

ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے کہا "اپّی میاں کل صبح سے میرے پاس آنا۔"

چنانچہ دوسرے دن سے وہ اپنے بڑے پھوپا کے پاس جانے لگے۔ وہ کوئی کتاب دے دیتے کہ اس کو پڑھو اور پھر مجھے بتاؤ کیا پڑھا۔ دوسرے دن جگہ جگہ سے پوچھتے۔ کچھ پڑھتے تو صحیح جواب دیتے۔ آئیں بائیں شائیں کرتے۔ اناپ شناپ جواب سن کر بڑے پھوپا آبا کتاب پھینک دیتے اور خفا ہوتے۔ پھر تیسرے دن یہی ہوتا اور چوتھے دن بھی۔ پھر جو کچھ جی میں آیا کچھ پڑھا اور جواب کچھ غلط دینے کے ساتھ کچھ صحیح بھی بتایا۔ کئی دن بعد صحیح جواب دینے لگے تو کہا اب مضمون لکھو۔ کتاب سامنے رکھو۔ یہاں سے یہاں تک پڑھو اور پھر اپنے الفاظ میں یہی باتیں لکھو۔" وہ غلط سلط اُلٹا سیدھا لکھ کر لاتے پھوپا آبا بغیر پڑھے پھینک دیتے کئی دن یہی ہوتا رہا۔ تو بھتیجہ کو بہت ناگوار گزرا کہ پڑھتے تو ہیں نہیں ۔ پھینک دیتے ہیں۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے کہا۔

"پڑھیے تو سہی اور اصلاح کیجئے۔"

پھوپا نے جواب دیا۔

"کیا خاک اصلاح کروں۔ تمھاری اصلاح ہو جائے تو مضمون کی بھی ہو جائے گی۔"

آخر انھوں نے ایک مضمون کا کچھ حصہ لکھا اور کہا "اس کو مکمل کرو۔"

بے دلی کے ساتھ چند سطریں لکھیں وہ ڈپٹی صاحب نے پڑھیں اور پھر خفا ہوئے۔

"ہائے حافظ عبدالواجد کا بیٹا اور اس قدر نالائق! چند سطریں بھی نہیں لکھ سکتا۔"

آپا راشدہ کا بیان ہے کہ آبا کہا کرتے تھے جب اس طرح آبا کا نام لے کر مجھے غیرت دلائی جاتی تو مجھے بہت رنج ہوتا تھا۔

دوسرے دن پھر پھوپا نے چند سطریں لکھ کر دیں کہ آگے تم لکھو۔ ٹھیک لکھو گے تو پڑھوں گا بھی اور اصلاح بھی دوں گا۔

آپا راشدہ کہتی ہیں جب بڑی دادی اماں۔ دادی اماں ۔ پھوپھیاں ۔ خالائیں۔ دادا آبا کا نام لے کر کہتی تھیں کہ میرا باپ کا بیٹا پتھر نکلا تو آبا کہتے تھے ۔ مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ اُس دن بڑے پھوپا آبا تے بغیر خفا ہوئے محبت سے کہا تو میں نے بھی بہت محنت سے دو صفحے اُنھیں لکھ کر دئے۔ اُنھوں نے ۷۔۸ سطریں پڑھنے کے بعد نظر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا۔

"اچھا یہ بات ہے!"

مضمون ختم ہوگیا تو کہا۔
"آج میں تم سے خوش ہوں"۔
پھر انہی سالس (یعنی دادی اماں) کے پاس لائے
... "اگر محنت کریں تو ابی میاں مضمون لکھ سکتے ہیں"۔

[illegible] | ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی چھٹی ختم ہوئی تو وہ اور بڑی پھوپی اماں حیدرآباد دکن

... مگر جانے سے پہلے ڈپٹی صاحب نے اپنے چھوٹے ... تھان بہادر ڈپٹی عبدالحامد کو دہلی خط لکھا کہ ابی ... نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اپنے پاس بلالو۔ ... چہ وہ دہلی پہنچے تو چچا نے گورنمنٹ ایڈیڈ ہائی سکول ... داخل کر دیا مگر ... میں اب دل لگنا مشکل تھا۔ ... دو انگریزی کی کتابیں خود ہی مطالعہ کرتے رہتے۔ ... کا تبادلہ دہلی سے اٹاوہ ہوا تو ان کے ساتھ اٹاوہ چلے گئے۔

[illegible] کی شرارتیں | آپا راشدہ بیگم کا بیان ہے کہ پھوپی اماں نے یہ

واقعہ سنایا تھا اور خود ابا نے بھی اس کی تصدیق کی تھی کہ وہ گیارہ بارہ سال کے تھے۔ طبیعت ٹھیک نہ تھی بڑی دادی اماں نے جلاب دیا۔ مگر بجائے خود پینے کے آنکھ بچا کر پھوپی اماں کو پلا دیا۔ پیٹ میں درد بدستور تھا۔ دادی اور پھوپیاں پیٹ سہلاتیں مگر بے نتیجہ۔ ہاں پھوپی اماں لوٹا لے بار بار جاتیں۔ آخر معلوم ہوا کہ "ابی میاں" نے جلاب خود پینے کی بجائے بہن کو پلا دیا ہے۔

مولانا عبدالغفار صاحب کا بیان:۔

(۱) ہمارا باورچی خانہ بہت بڑا تھا اور اس میں ایک چارپائی بچھی رہتی تھی۔ دادا ابا وہیں کھانا کھاتے تھے۔ چارپائی پر بیٹھ کر کہتے ہاں بھئی حشمت اللہ کھانا لاؤ۔ بھائی ابی کی بڑے بھائی کو اور مجھے ہدایت تھی کہ جب سیٹی بجاؤں تم دونوں جو کام کر رہے ہو چھوڑ کر فوراً آجاؤ۔ دادا ابا کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ باورچی دسترخوان بچھا کھانا رکھتا اور وہ کھانا شروع کر دیتے۔ بھائی ابی کی سیٹی بجتی اور میں اور بڑے بھائی آجاتے اور ہم تینوں باورچی خانہ پہنچتے اور ایک ایک کر کے نوالے ہم بھی کھاتے دادا ابا کے لئے روغنی ٹکیاں پکتی تھیں۔ وہ کہتے ارے بھئی حشمت اللہ یہ چھوٹی چھوٹی ٹکیاں کیوں پکاتے ہو۔ انھیں کیا معلوم ایک نوالہ وہ کھاتے ہیں تو تین تین نوالے ان کے پوتوں کے حلق میں جا رہے ہیں۔ ایک دن ہم یہی شرارت کر رہے تھے بھائی ابی نوالہ بنا رہے تھے کہ دادا ابا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہتھیلی انگلیاں ٹٹول کر کہا کون ہے "ابی میاں ہیں"۔ میرے منہ سے نکل گیا جی ہاں۔ کہا تمھارے ساتھ اور کون ہے میں نے کہا بڑے بھائی۔ دادا ابا نے نہ ہمیں مارا نہ خفا ہوئے۔ دادی اماں سے کہا ان منوں کے لئے بھی روغنی ٹکیاں پکوا کر دیا کرو۔

(۲) "بھائی ابی نے کہیں وعظ میں یہ حدیث سنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہ ہوگی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳-۱۴ سال کی تھی۔ دادی اماں کا قرآن شریف کھلا رہتا تھا وہ تلاوت میں مصروف تھیں کہ بھائی ابی آکر ان کی گود میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے "دادی اماں بڑی بُری خبر ہے" انھوں نے بہت پوچھا تو کہا ایک مولوی صاحب مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے انھوں نے یہ حدیث بیان کی کہ کوئی بڑھیا جنت میں نہ جائے گی"۔

یہ سن کر دادی اماں رونے لگیں اتنے میں ابا آگئے بھائی ابی تو ان کی شکل دیکھتے ہی بھاگ گئے اور ابا اپنی

اماں کو روتا ہوا دیکھ کر ان کے پاس آئے اور پوچھا کیا بات
ہے؟ انھوں نے کہا ابّی میاں! ابھی یہ حدیث سن کر آئے ہیں
وہ ہنسے اور کہنے لگے ابّی بھی شرارتیں کرتا رہتا ہے اور آپ
اُس کے راگ میں آ جاتی ہیں حدیث یوں ہے کہ بڑھیا عورتیں
جوان ہو کر جنّت میں جائیں گی۔

(۳) اگرچہ مولانا کی چچی نے کسی بات میں ایسا موقع
نہیں دیا کہ مولانا گھر کو چچا کا گھر سمجھ سکتے تاہم قدرتاً اور
فطرتاً جو آزادی ہم کو حاصل تھی اس سے مولانا اپنی طبیعت
سے استفادہ نہ کر سکے۔

بڑے بھائی محمد عبدالجبار الخیری بہت بھولے
آدمی تھے۔ اُن کو جنوں کے دیکھنے کا بہت شوق تھا اور دِلّی
میں والد مرحوم نے گھوڑوں اور گائے بھینسوں کے لئے
بہت سی گھانس جمع کر رکھی تھی اور یہ ہمارے کھیل کی
جگہ تھی۔ ہم سب اُس پر اکھٹے ہوتے اور گھنٹوں کھیلتے۔
ایک دن مولانا نے کہا "جن دیکھو گے؟"
بڑے بھائی نے کہا "ہاں دکھاؤ"
مولانا نے کہا "پہلے اس کی خاطر مدارات کا تو
سامان کرو"
بڑے بھائی گھر میں گئے اور کچھ مٹھائی لائے۔
مولانا نے فرمایا آنکھیں بند کرو۔ اس کے بعد
مولانا نے کرتہ اُتارا اور کپڑے گھاس میں چھپائے اور
جھوم کر فرمایا۔
"بول کیوں بلایا ہے۔ ہم بادشاہ جنّات ہیں"
بڑے بھائی صاحب نے مودّب ہو کر کہا۔
"یہ تھوڑی مٹھائی ہے قبول فرمائے"
ارشاد ہوا "تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ ہم بہت
خوش ہیں۔ جب بلاؤ گے آئیں گے۔ یہ کہتے گئے اور کھاتے
گئے اور جب کھا چکے تو کہا اچھا آنکھیں بند کرو۔ ہم جاتے ہیں"
پھر وہی بھائی ابّی موجود۔

ایک مرتبہ بڑے بھائی نے کہا یہ جن ہمیشہ تمھاری شکل
میں کیوں آتے ہیں۔ انھوں نے کہا اگر اپنی شکل میں آئیں تو
ڈر جاؤ گے اس لئے جس کی شکل میں چاہیں آتے ہیں۔

(۴) ایک مرتبہ اتوار کا دن تھا میں اور بڑے بھائی صاحب
اور مولانا ظہر کے بعد نانا ؤ میں ملک عزیزت ملنے جا رہے تھے۔
ہمارے پڑوس کی مسجد میں ایک مؤذن تھا جو کانا تھا اور ہم سب
اُس کو ستایا کرتے تھے اس بنا پر جب کبھی وہ ملتا تو میں
"کانٌ من الکافرین" کہہ کر بھاگ جاتا۔ اُس دن اتفاق سے ہم
تینوں بھائی جا رہے تھے اور مؤذن صاحب سامنے سے آ رہے
تھے۔ میں نے دیکھ کر وہی

کانٌ من الکافرین

کہا۔ مولانا ہم سب سے بڑے تھے مگر زمانہ لڑکپن کا تھا۔ ۱۷-۱۸
برس کی عمر ہی کیا۔ اس مؤذن نے انھیں بڑا سمجھ کر مولانا سے
میری شکایت کی۔ اس کے جواب میں مولانا نے بیساختہ فرمایا۔
"بُرا مت مانا کر دان کا یہ لنڈ سے ہیں جانے بن کا نہے"

(۵) مولانا کو تفریح کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ مگر یہ نہ
چاہتے تھے کہ میں خود چچا سے کہوں۔ چنانچہ ایک دن بڑے
بھائی سے کہا کہ کالے کوّے کے گھونسلے میں ایک لکڑی ہوتی ہے
وہ چیز جس کو لگا دو سونا بن جائے۔ چلو اس کو ڈھونڈیں۔
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہینوں تک روزانہ بڑے بھائی والد صاحب
سے اجازت لیتے۔ سواری تیار ہوتی اور کالے کوّے کے گھونسلوں
کی میلوں تلاش ہوا کرتی"

(۶) وہ زمانہ تھا محبت اور خلوص کا اور ہم تین یعنی
بھائی اشرف حسین بھائی ابّی اور میں آپس میں بھائی بھی
تھے اور دوست بھی۔ بھائی اشرف حسین اپنی نوکری پر جاتے

تھے اور تمہارے والد (بھائی اتی) ان کے ساتھ نظامی آباد
لے جاتی تھی۔ مربّے کے دو مرتبان تحفے والد کے ساتھ
دے کر بھائی اشرف کسی غرض سے ایک طرف چلے گئے۔
لوٹ کر آئے تو ایک مرتبان پلیٹ فارم پر ٹوٹا پڑا تھا۔ دیکھ کر
افسوس سے کہا۔
"یہ کس طرح ٹوٹ گیا؟"
ابّا کہنے لگے بھائی اتی نے دوسرا مرتبان بھی ہاتھ سے
چھوڑ دیا اور کہا۔
"اس طرح۔"
بھائی اشرف کے پہلے تو تیوری پر بل آیا مگر پھر فوراً
ہی ہنس پڑے اور یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔
"ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں۔"
ہوا یہ تھا کہ ایک دن پہلے جا کر ... دو کبوتروں
اور نور جہاں کا لطیفہ بھائی اشرف نے سنایا تھا۔
(۷) ایک دن مولانا بڑے دن کی تعطیل میں آناؤ سے
دہلی آئے اسباب زیادہ تھا۔ دہلی پر ٹکٹ کلکٹر نے روک لیا۔
اس سے جھگڑا ہونے لگا۔ وہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔
ادھر مولانا نے صندوق کھول کر جس طرح ممکن ہوا پتلون
پہ پتلون۔ پاجامہ پر پاجامہ۔ کوٹ پر کوٹ اور سب کے اوپر
لحاف دو توشک اوڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ ٹکٹ کلکٹر جب اسٹیشن
ماسٹر کو لے کر آیا تو مولانا کی جگہ اس نے رستم کے مدمقابل
دیو سپید کو پایا۔ اس ہیبت کذائی کو دیکھ کر اسٹیشن ماسٹر
ہنس پڑا اور مولانا نے کہا "اسباب وزن کر لو" اسٹیشن
ماسٹر نے کہا آپ جائیے۔ چنانچہ مولانا پلیٹ فارم سے باہر
آئے۔ سب چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھا اور گھر کی راہ لی۔"

کھیل اور دلچسپیاں

رحلت سے ڈیڑھ سال قبل
۱۹۳۳ء میں جو مضمون
"شاہجہاں آباد کے وقائع" کے عنوان سے علامہ مرحوم نے
لکھا تھا اور اب کتاب بزم رفتگاں میں بھی کئی بار شائع
ہو چکا ہے اس میں اپنے تین دوستوں مولوی اشرف حسین
قاری سرفراز حسین اور مرزا محمد اشرف کا ذکر کیا ہے۔ مولوی
اشرف حسین مرحوم ان سے کوئی ۵ سال بڑے تھے ان کے
حالات میں تحریر فرماتے ہیں۔
"مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد سے دس گیارہ
گیارہ بجے تک ہم چاروں اس وقت ایک ہی جگہ یعنی مولوی
اشرف حسین کے پاس گزارتے تھے۔ فراغ تعلیم کے بعد دن
رات کے چوبیس گھنٹوں میں مشکل سے سات گھنٹوں کے لئے
جدا ہوتے تھے۔ ورنہ ہماری چوکڑی تھی اور سب تفریح کے مشاغل۔
اس زمانہ میں بہت کم شریف گھرانے ایسے تھے جہاں اکھاڑہ
نہ ہو۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی اکھاڑہ موجود تھا اور ہم دو ڈھائی
گھنٹے کثرت اور ورزش کیا کرتے تھے۔ ہمارے استاد ایک صاحب
میر محفل تھے۔"
"موسیقی میں ان کا پایہ بلند تھا۔ کبڈی بھی اور کرکٹ
بہت اچھا کھیلتے تھے۔ تیرنا ہم سب سے اچھا جانتے تھے۔"
ان دونوں اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ
(۱) علامہ مرحوم لڑکپن میں اپنے گھر کے اکھاڑے میں
دو ڈھائی گھنٹے کثرت اور ورزش کیا کرتے تھے۔ جب ہی تو
جسم گٹھا ہوا تھا اور سینہ چوڑا چکلا۔
(۲) موسیقی سے دلچسپی تھی۔ گاتے بھی تھے ستار
اور بانسری بھی بجاتے تھے اور بزرگوں سے سنا ہے کہ والدہ
مرحومہ نے ان کے ستار کا غلاف بھی ایسا خوب صورت سیا
تھا کہ جو دیکھتا پھڑک اٹھتا تھا۔ یہ میرے ہوش سنبھالنے سے
پہلے کا واقعہ ہے میں نے گھر پر کبھی ستار نہیں دیکھا۔ ستار
بجانا کب چھوڑا یہ واقعہ آئندہ آئے گا۔ بانسری سننے کا

اتفاق مجھے بارہا ہوا۔ نہ صرف گھر پر بلکہ ۱۳ء یا ۱۴ء کے زمانہ میں جب ہم گرمیوں کے زمانہ میں دو ماہ کے لئے قطب صاحب جاتے تھے تو وہ طرّے خاں کے باغ میں اکثر بانسری بجایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے صادق الخیری کو بھی بانسری بجانی سکھائی تھی۔

گھر پر قوالی سنتے تھے ایک دفعہ غالباً ۳۲ء میں قوالی ہوئی تو ہارمونیم بجانے والا باکمال تھا مسلسل چھ راتیں ہوتی رہی۔

(۳) لڑکپن میں کبڈی بھی کھیلی تھی۔ جب دفتر عصمت و تمدن کے ملازم قطب صاحب جایا کرتے تو وہ انھیں بھی کبڈی کھلایا کرتے تھے مگر خود نہ کھیلتے تھے۔

(۴) کرکٹ کا انھیں اچھا خاصہ شوق تھا اتنا زیادہ تو نہیں جتنا عم مکرم مولانا عبد الغفار صاحب کو۔ مگر کرکٹ کھیلا کئی سال اور درجنوں میچ کھیلے۔ جب میں دس گیارہ سال کا تھا تو گھر میں وہ میرے ساتھ بھی کھیلا کرتے تھے۔ میں سینٹ سٹیفنز کالج میں پہنچ کر کرکٹ کھیلتا تھا تو وہ میرے کرکٹ کے استاد چچا بن یعنی مولوی عبد الغفار صاحب سے پوچھتے کہ رازق کیسا کھیلتا ہے اور جب میں کالج کا کپتان ہوا اور مسلم یونیورسٹی سے میچ ہوا تو وہ اپنے بڑے بھائی مولوی اشرف حسین صاحب کے ساتھ میچ بھی دیکھنے آئے تھے۔ وفات سے تین دن پہلے جب مولانا عبد الغفار صاحب آئے تو بہت دیر تک علی گڈھ اور پارسیوں کے ایک کرکٹ میچ کا ذکر کرتے رہے جو سر سید کے زمانہ میں ہوا تھا اور جسے دیکھنے چھٹی لے کر علی گڈھ گئے تھے مجھے جو دو باتیں انھوں نے بچپن میں سکھائی تھیں وہ کالج پہنچ کر بہت کام آئیں ایک یہ کہ بلا ہمیشہ سیدھا رہنا چاہئے دوسرے یہ کہ گیند بلے کو نہ چھوئے بلکہ بلا گیند کو چھوئے۔ کپتانی کے زمانہ میں جب کرکٹ پر کتابیں پڑھیں تو معلوم ہوا دونوں باتوں پر ان میں بہت زور دیا گیا ہے۔

(۵) تیراکی کا بھی انھیں شوق تھا اور جب قطب صاحب ہم جاکر رہا کرتے تھے تو وہ اکثر شمسی تالاب پر جاکر تیرا کرتے تھے۔ مجھے بھی اس تالاب میں انھوں نے تیرنا سکھایا۔ گو میں اچھی طرح نہ سیکھ سکا اور پھر مشق کی ہی نہیں۔

(۶) شطرنج کم اس لئے کھیلتے تھے کہ اس میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے سنا ہے ان کی شطرنج زیادہ تر مولوی اشرف حسین صاحب سے ہوتی تھی جن کی بابت مولانا عبد الغفار صاحب کا بیان ہے کہ بہت اچھی کھیلتے تھے۔

(۷) پچیسی۔ اس دور میں گھروں میں پچیسی بھی کھیلی جاتی تھی اور علامہ مغفور بھی لڑکپن میں کھیلتے تھے۔

(۸) تاش تو عام چیز ہے۔ ترپ وغیرہ مولوی اشرف حسین کی صحبت میں کھیلتے تھے یا مولوی قطب الدینا وغیرہ کے ساتھ۔ اپنے گھر میں تو بیوی بچوں کے ساتھ "غلام چور" کھیلا کرتے تھے، پہلے سے طے کر لیا جاتا کا سے چور بنانا ہے پھر اس کو بنانے کی کوشش کی جاتی اور اکثر اس میں کامیابی ہو جاتی۔ والدہ مرحومہ کو یہ چیزیں سخت ناپسند تھیں اور وہ تاش شطرنج کو منحوس کہتی تھیں مگر "غلام چور" اُن سے بھی کھلواتے اور اُن کا دل بہلانے کے لئے کھیلتے تھے۔ یہ آپا راشدہ کی شادی سے پہلے کی باتیں ہیں یعنی ۱۵ء تک۔ جو چور بنتا اُس کی ٹنگڑی باندھی جاتی تھی۔

(۹) مجھے تیرہ چودہ سال کی عمر تک گڈیاں اُڑانے کا شوق تھا۔ مدرسے سے آکر شام کو اکثر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ

جب تک پتنگ اڑانا تھا کٹی یا ایسا ہوا کہ حضرت
علامہ مغفور نے چھت پر آکر ڈور لے لی اور پیچ لڑا کے
ایک دفعہ وہ پیچ کاٹ کر پتنگ اتار لی اور کہا یہ گڈی
نوشیرواں ہو گئی ہے" اس سے ظاہر ہے کہ انھوں
نے لڑکپن میں پتنگ بازی بھی کی تھی۔
(۱۰) گلی ڈنڈا اور گیڑیاں بھی اپنے چچازاد بھائیوں
کے ساتھ کھیل تھیں۔
(۱۱) ہماری چوکڑی تھی اور سیر و تفریح کے مشاغل:
یہ سیر و تفریح آخر عمر تک جاری رہی اس سلسلے
میں بہت سے واقعات آگے آئیں گے۔

لڑکپن کے دوست

(۱) مولوی اشرف حسین صاحب
علامہ مغفور کو لڑکپن ہی میں
ادبی چسکا پڑ گیا تھا اپنے پھوپی زاد بھائی مولوی اشرف حسین
مرحوم کی صحبت میں جو ان سے عمر میں ۵ سال بڑے تھے۔ ان کا
ذکر انھوں نے اپنے مضمون شاہجہاں آباد کے عناصر اربعہ میں کیا ہے کہ
"رات کے دس دس گیارہ گیارہ بجے تک ہم چاروں اپنا
وقت ایک ہی جگہ یعنی مولوی اشرف حسین کے پاس گزارتے...
ہماری چوکڑی تھی اور سیر و تفریح کے مشاغل.... قدم شریف
کے باہر ایک ٹوٹی مسجد میں ہم چاروں بیٹھے ہیں اور سحر البیان اور
گلزار نسیم پر بحث ہو رہی ہے..." مولوی اشرف حسین کے ذکر
میں کہتے ہیں: "ان کے مزاج میں جس قدر سنجیدگی تھی اس قدر ظرافت
ان کی ہر حیثیت ایک سے ایک اعلیٰ تھی.... شہرت سے اس قدر
بیزار تھے کہ وہ اپنے نام کی اشاعت بھی آسانی سے گوارا نہیں
کرتے تھے.... اس قدر غیور طبیعت کے آدمی تھے کہ انھوں نے
ہر عزیز دوست ہر آشنا پر احسان کیا مگر یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ خود
کسی کا احسان اٹھائیں۔"
اتنا مجھے بھی یاد ہے کہ بڑے ابا مولوی اشرف حسین
صاحب جب دلی آتے تھے تو ابا اور کہیں جاتے یا نہ جاتے ان کے
ہاں ضرور جاتے اور رات کو دس دس گھنٹے گپ شپ کر کے واپس
آتے تھے۔ مولوی اشرف حسین صاحب کی بہت عزت اور ان سے
بہت محبت کرتے تھے۔ علامہ مغفور نے اپنے ان پھوپی زاد
بھائی سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ ان کے بھائی بھی تھے، دوست
بھی، استاد بھی۔
(۲) قاری سرفراز حسین صاحب مرحوم بھی لڑکپن کے
بے تکلف دوست تھے ان کی بابت اس مضمون میں لکھتے ہیں۔
"قدرت نے عجیب دماغ عطا فرمایا تھا وہ جس محفل میں جاتے
لوگ ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ایسا لطیفہ گو، بذلہ سنج،
حاضر جواب آدمی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ روتوں کو ہنسا دیتے تھے۔
ان کی باتوں سے مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔"
(۳) شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی اس چوکڑی کے تیسرے
رکن ہیں جن کا ذکر اس مضمون میں کیا ہے ان کے متعلق تحریر فرمایا کہ
"بہت سیدھے سادے آدمی تھے مذہبیت شروع ہی سے
ان کی طبیعت میں موجود تھی۔ قاری کے دبیلے بنے رہتے تھے۔"
(۴) چچا قطب الدین صاحب جن سے دور کی
رشتہ داری بھی تھی اور جو "میاں ابی" کے دوست ہونے کی
وجہ سے "ابی" کہلانے لگے تھے۔ ایک اور دوست تھے۔ کرکٹ،
کبڈی، تیراکی، پتنگ بازی میں بھی ساتھی۔ انھیں پڑھنے
لکھنے کا شوق نہ تھا۔ علی گڑھ میں سیونگ مشین کا کارخانہ
تھا۔ والد مرحوم سے ملنے آتے تو بڑی محبت سے ملا کرتے تھے۔
(۵) عبدالمجید صاحب مرحوم جنھیں وہ میدو میدو
اور ہم بہن بھائی چچا میدو کہتے تھے۔ پڑھے لکھے نہ تھے اور
بہت غریب آدمی تھے مگر والد مرحوم ان سے بھی بڑی محبت
سے ملتے اور گلے لگاتے تھے۔ رمضان المبارک میں افطار کے
وقت کھانا لینے آیا کرتے تھے۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد

بھی والدہ ماجدہ کے پاس وہ برابر آتے رہتے تھے۔

(۶) ڈاکٹر محمد عبدالجبار صاحب حقیقی چچا کے بیٹے تھے اور علامہ مرحوم سے عمر میں ۳ سال چھوٹے۔ لڑکپن کے زمانہ میں اپنے والد کے ساتھ یوپی کے اضلاع میں جہاں وہ ڈپٹی کلکٹر تھے رہتے تھے اس لئے زیادہ وقت ساتھ رہنے کا نہ ملا مگر اورئی اوناؤ وغیرہ میں خاصہ ساتھ رہا۔

(۷) مولوی محمد عبدالغفار صاحب عمر میں ۵ سال چھوٹے چچازاد بھائی ہیں اپنے عزیزوں میں مولوی اشرف حسین صاحب کے بعد سب سے زیادہ انھیں سے محبت تھی ان کے ساتھ کرکٹ۔ شطرنج۔ کبڈی۔ تیراکی بھی ہوتی اور ادبی علمی گفتگو بھی چچا صاحب ہمیشہ جمعہ پڑھنے کے بعد اپنے بھائی ابّی" سے ملنے آیا کرتے تھے۔

باب چوتھا ——— آغاز شباب

مطالعہ علامہ مغفور کا مشاہدہ بہت تیز تھا اور مطالعہ قدرت بہت وسیع اور عمیق مگر جہاں تک مطالعہ کتب کا تعلق ہے انھوں نے گنتی میں بہت زیادہ نہیں پڑھیں۔ لڑکپن میں دن کو کھیلتے سیر تفریح کرتے مدرسہ جاتے رات کو پچیسی شطرنج قصے کہانیاں۔ علمی بحثیں مگر مطالعہ صبح دو گھنٹے ضرور کیا کرتے تھے۔ صبح چار بجے بیدار ہو جاتے اور مطالعہ کرنے لگتے فرمایا کرتے تھے پڑھنے کے لئے صبح کے یہ دو گھنٹے بہترین ہوتے ہیں اور دلجمعی سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر جو کتابیں طالب علمی کے زمانہ میں وہ پڑھا کرتے تھے وہ مدرسکی بہت کم اور زیادہ تر پرائیویٹ کتب ہوتیں۔ پرانے زمانے کے قصے کہانیوں کی کتابیں۔ مذہبی کتابیں۔ گلستان بوستان۔ شاہ نامہ۔ رومی جامی اور انگریزی میں شکسپیر ٹینی سن ملٹن وغیرہ۔ ان کا حافظہ بھی غضب کا تھا کہ چالیس پنتالیس سال پہلے کی پڑھی ہوئی باتیں اور اشعار انھیں یاد تھے۔

مدرسکی تعلیم سے نہیں ذاتی مطالعہ سے علامہ مغفور نے ترقی کی تھی۔ چنانچہ اُن کے پھوپا ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے ان کے متعلق "تمدن" کے پہلے پرچہ میں" التقریب" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں تحریر فرمایا تھا۔

"اگر کوئی مولوی عبدالراشد کے حسب نسب سے واقف ہو تو اُس کو اُن کے خاندانی حالات سن کر تعجب ہوگا کہ یہ خیالات انھوں نے کہاں سے اخذ کئے۔ مولوی عبدالراشد مولویوں کے خاندان کے ایک ممتاز ممبر ہیں۔ جو اُن کی تعلیم کا زمانہ تھا اُس وقت تعصب مذہبی مسلمانوں میں اس بلا کا تھا کہ مولوی عبدالراشد کے موجودہ خیالات کا آدمی مسلمانوں کی سوسائٹی میں رہ نہیں سکتا تھا۔ میرے نزدیک اصلی تعلیم خاندانی سوسائٹی کی تعلیم ہے جو زمانہ مولوی عبدالراشد کی تعلیم بنانے کا تھا اُن کے خاندان میں مولوی عبدالراشد کے آج کے خیالات پیدا ہونے محال تھے لیکن مولوی عبدالراشد میں ہم کو اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ترقی کا مادہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے۔ غرض مولوی عبدالراشد نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ ان کے فطری خیال میں ان میں خداداد مادہ تھا کہ انھوں نے انگریزی بھی سیکھی۔ انھوں نے جو کچھ سیکھا اپنے سے سیکھا۔ اس نسل میں میں انھیں اُن کے خیالات اور سیلف سٹڈی کے لحاظ سے سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں" (تمدن اپریل ۱۹۱۱ء)

...کہیں میں اسپ اور بھائی میں مذہب کا وسیع ... امام غزالیؒ کی احیاء العلوم وغیرہ پڑھا چکے تھے بھی ... کیا کرتے تھے۔

جناب محمد احسن وکیل مرحوم کا بیان عصمت میں ... ہوا تھا اس کا ابتدائی حصہ یہ ہے۔

"مولانا نے مرحوم ۱۸۹۸ء و ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کے ... دست میں ملازم تھے۔ دو سال تک میں اُن کے ساتھ ... مکان میں رہا۔ میں تنہا تھا اور وہ بھی۔ مولانا اُس ... بھی صوم و صلوٰۃ اور تلاوت قرآن پاک کے سختی سے ... تھے۔ روزانہ بعد نماز صبح صرف دو رکوع دو ڈھائی گھنٹے ... پڑھتے تھے۔ اس قدر وقت اس وجہ سے صرف ہوتا تھا ... ترجمہ و تفسیر پڑھتے تھے۔ ہر لفظ کے معنی نکات پر غور ... شان نزول اور اس کے دیگر متعلقات پر توجہ ... تھے۔ اکثر اوقات پڑھنے کی حالت میں روتے تھے۔ ... روحانی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ کچہری سے واپس ... بعد نماز عصر ایک سپارہ رواں پڑھتے تھے۔ آفس ... اوقات کے علاوہ تصنیف و تالیف میں وقت صرف کرتے تھے۔ ان کا کوئی دوست تھا نہ کہیں جاتے تھے ......

مولانا مرحوم نے کبھی کبھی شعر بھی کہے تھے۔ مگر مستقل طور پر شعر گوئی اختیار نہیں کی بلکہ طبع موزوں ہونے کی وجہ سے کچھ فرما دیا کرتے تھے۔ مثنوی میر حسن تصانیف مولوی محمد حسین آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ صاحب اور رقعات غالب کے بڑے دلدادہ تھے"

(عصمت فروری ۱۹۳۹ء)

پہلی ملازمت | علامہ مغفور کے چچازاد بھائی مولانا عبدالغفار صاحب کا بیان:۔

"اس عرصہ میں مولانا کے چچا کا تبادلہ اورئی سے اناؤ ہوا۔ اناؤ میں بندوبست کے انگریزی دفتر میں انھیں کلرک رکھوا دیا۔ اگرچہ مولانا ملازمت کے لئے خلق نہ کئے گئے تھے۔ ان کی ہنسی مذاق کی باتیں۔ لطیفے۔ چٹکلے دفتر والوں کے سارے فکر و غم دور کر دیتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ڈپٹی صاحب کے بھتیجے ہیں اس نے کام کرنے کی شکایتیں بھی نہ ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود مولانا کا دل یہاں بھی گھبرانے لگا۔

مولانا کی طبیعت میں مزاح تھا۔ اناؤ میں بندوبست کے دفتر میں نئے نئے ملازم ہوئے تھے ڈپٹی کمشنر بھی نئے نئے آئے تھے۔ بہت سے لوگوں نے صاحب کی شان میں قصیدے لکھے۔ دفتر میں ایک ہندو سیکنڈ کلرک تھے مولانا سے درخواست کی کہ اس کے لئے ایک قصیدہ لکھ دیں۔ مولانا نے ایک مزاحیہ قصیدہ لکھ دیا۔ جس کا آخری مصرعہ مجھ کو آج تک یاد ہے۔"

لکڑی ہو تم چترکی بن جاؤ شاید اس سے علاج

وقت کی بات تھی تھا تو مزاحیہ مگر سب سے زیادہ کام کر گیا یہ کلرک تھوڑے دنوں بعد ہیڈ کلرک ہو گئے اور ہمیشہ مولانا کے ممنون رہے۔"

بی بی رشید الزمانی کا مکان کس طرح بنا | حافظ محمد اوحد صاحب کا انتقال ہوا تو مولانا محمد رفعت صاحب کے بیان کے مطابق سات سو روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس سے چند سال قبل پانسو چھ سو ملتی ہوگی۔ خوش خوراک بھی تھے خوش پوشاک بھی فراخ دل اور طبیعت کے فیاض ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ جو کچھ ملتا وہ اُٹھا دیتے۔ آئے دن یتیم بچوں کے کپڑے بنواتے۔ غریب لڑکیوں کی شادی میں نقد بھی دیتے اور زیور بھی۔ بیواؤں کو وظیفے دیتے اپاہجوں محتاجوں کے مہینے بندھے

ہوئے تھے۔ بڑی بہن نے آخر ایک دن کہہ دیا کہ دو بچوں کا ساتھ ہے بندۂ خدا کچھ تو وقت بے وقت کے لئے جمع کرو" کھانے کے نام سے جو رقم وہ ہر مہینہ لے رہی تھیں اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور ہر مہینہ یہ روپیہ حافظ عبدالواجد ہی کے نام سے بنک میں جمع ہوتا رہا اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب پائی پائی جمع کراتے رہے۔ جب حافظ صاحب کا انتقال ہوا اور مرحومہ صفیۃ النساء صاحبہ دلی آئیں تو انھوں نے اپنی ماں کو بنک کی کتاب دے دی اور پھوپا نے بھتیجہ کے نام روپیہ منتقل کروا دیا مگر جس طرح حافظ صاحب کو معلوم نہ تھا کہ بہنوئی ان کے نام سے بنک میں جمع کر رہے ہیں اسی طرح بھتیجہ کو بھی خبر نہ ہونے دی کہ بنک میں تمھارے نام سے روپیہ جمع ہے بنک کے کاغذات پر دستخط اس طرح کرائے ہوں گے کہ انھیں معلوم نہ ہوا۔ حافظ صاحب مرحوم کی جو چیزیں اُن کی بڑی بہن حیدرآباد دکن سے لائی تھیں جب وہ ماں کے سپرد کیں تو بنک کی کتاب اُنھوں نے بیٹی کو واپس کی کہ تم ہی اپنے پاس رکھو انھوں نے کہا نہیں اماں آپ ہی رکھئے میں تو تھوڑے دن بعد حیدرآباد چلی جاؤں گی۔ اتنے میں مولوی نذیر احمد صاحب آگئے اور انھوں نے کہا۔ کڑوں میں زاہدہ کا زیور بنوادیں اور بنک میں جو روپیہ ہے اس میں "میاں ابی" کی شادی کریں"۔

ایک دن بڑی دادی اماں کپڑوں کو دھوپ دے رہی تھیں کہ پوتے کی نظر بنک کی کتاب پر پڑ گئی اور اس میں انھوں نے اپنا نام دیکھ لیا اور موقع ملتے ہی بنک کی کتاب اپنے قبضہ میں کی۔ دادا ابا کا انتقال ہو چکا تھا۔ چچا ابا پردیس میں تھے اور دونوں پھوپا بڑے بھی اور منجھلے بھی حیدرآباد دکن میں نگرانی کرنے والا کوئی بڑا نہ تھا۔

عم مکرم مولانا عبدالغفار صاحب کا ایک بیان اس طرح ہے:۔

(۱) "بھائی ابی کو ترکہ میں کئی ہزار روپیہ ملا تو دہلی کی آب وہوا سے شفیق چچی کے دل میں طرح طرح کے وہم اور خیالات پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنے شوہر (والد مرحوم) کو مجبور کرنا شروع کیا کہ بھتیجے کو اپنے پاس بلالیں اور بالآخر وہ کامیاب ہو گئیں"

اور دوسرا بیان یوں ہے۔

"باپ کے ترکہ کی کافی رقم ملی۔ نگراں کوئی تھا نہیں ایسے موقعوں کی تاک میں بہت سے شہدے رہا کرتے ہیں۔ مولانا کے پھوپا شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد تک اڑتی ہوئی خبریں پہنچیں تو انھوں نے مولانا کے چچا کو جو اودھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے لکھا کہ میاں ابی کو اپنے پاس بلالیں"۔

کل کتنا روپیہ تھا اور کس طرح اُٹھایا گیا مجھے کچھ نہیں معلوم صرف ایک واقعہ یہ سنا ہے کہ کھاری باولی ہی میں ایک یتیم غریب لڑکی کی شادی کے لئے اس کی ماں کو دو دفعہ کرکے چار سو روپیہ دئے تھے اور لڑکی کا سال بھر بعد انتقال ہو گیا تھا۔

جب روپیہ ختم ہو گیا تو اُن کی دادی کو خیال ہوا کہ عبدالحامد کو جب معلوم ہوگا کہ اس کی شادی کے لئے جو روپیہ بنک میں تھا وہ اس نے اُٹھا دیا تو وہ کہیں غصہ میں گھر سے نہ نکال دیں۔ سر چھپانے کو کوئی جگہ ہو کی اپنی ہونی چاہیئے۔

حافظ صاحب کے انتقال کے بعد بھی دونوں بچوں کو لئے مرحومہ امیر بیگم صاحبہ جو سسرال میں رشیدالزمانی کہلاتی تھیں ساس ہی کے پاس "کھاری باؤلی" رہیں۔

ایک دن ساس نے بہو سے کہا۔

"رشیدالزمانی بیٹی اپنے بھائی سے کہو کہ میرے حصہ کی

… زمین …

رہ … ساس کے … تو

پہنچے۔ انھوں نے کہا: بڑی استانی جی کو لے آؤ

… لو۔

شام کو کھاری باؤلی واپس آئیں اور ساس
… بھائی نے کہا ہے ساس نے پہلے تو پس و پیش
… خود بہو کے ساتھ کلاں محل آگئیں۔
ابا کے ماموں یعنی منشی وزیر محمد صاحب نے کہا: یہ
… اور یہ مکان جس طرح آپ چاہیں طے کر دیں۔
بڑی استانی جی نے طے کیا: سات حصے ہوں گے۔
ایک حصہ پانچوں بہنوں کا دو حصے تمہارے۔
"آپ کھنڈر چاہتی ہیں یا زمین؟"
"اپنی ان بہن کو کھنڈر دے دو اور رقم لے آؤ۔"
… چنانچہ رقم سے چھت ہوئی۔

دوسرے دن منشی صاحب نے اپنی بہن بی بی امیر بیگم
صاحبہ کے نام کا کاغذ بنوایا اور کھاری باؤلی جا کر ان کی ساس
کو کاغذ دے آئے۔

چند روز بعد مکان بنوانے کا ذکر نکلا تو بہو نے کہا۔
"بھلا میں کیا مکان بنوا سکتی ہوں؟"
ساس نے جواب دیا: نہیں بیٹی۔ دنیا کے سب
کام تمہیں کرنے پڑیں گے۔ تم ماشاءاللہ ہو۔ خود بنواؤ اور بھائی
سے مدد لو۔"

دادی اماں کے پاس کڑوں کی دو جوڑیاں تھیں۔
ایک تو اس مکان میں لگائی گئی۔ کچھ روپیہ بڑی دادی اماں یعنی
ان کی ساس نے اپنے پاس سے دیا۔ زمین چار سو گز سے اوپر
تھی۔ … کا مکان تھا۔ کواڑوں کی جوڑیاں بھی اس میں
نہ تھیں۔ آپا راشدہ کا بیان ہے کہ بارہ سو روپیہ میں بنا تھا

یہ ذکر … اور … مغفور اپنی … کے اس
مکان میں … تک رہے۔

زاہدہ بیگم صاحبہ کی شادی

جب بہو کا مکان بن گیا تو
بڑی استانی جی نے
پوتے میاں اِن۔ اور پوتی (زاہدہ بیگم) دونوں بچوں
کے ساتھ بہو کو کلاں محل ان کے مکان میں بھیج دیا چونکہ پاس
پاس ان کے بھائی بہنوں کے مکان تھے اس لئے تنہائی کا
بھی فکر نہ تھا۔

اس مکان میں آئے زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ
زاہدہ بیگم صاحبہ کا پیام آیا۔
ڈپٹی عبدالحامد صاحب یعنی چچا آبا کی تجویز تھی کہ
ان کی منجھلی بہن بی بی ذکیۃ النساء کے منجھلے بیٹے انور حسین سے
زاہدہ کی شادی کی جائے کسی وجہ سے یہ تجویز رہ گئی اور
میر عبدالعزیز صاحب کا پیام منظور ہو گیا۔
چچی اماں (ڈپٹی عبدالحامد صاحب کی بیوی) اپنی
بڑی دو لڑکیوں عابدہ بیگم صاحبہ اور ذاکرہ بیگم صاحبہ کا
جہیز تیار کر رہی تھیں زاہدہ بیگم صاحبہ یتیم تھیں ان کے جہیز کی کوئی تیاری
نہ تھی۔ چچا آبا (ڈپٹی عبدالحامد صاحب) نے کسی موقع پر
کہا تھا تینوں لڑکیوں (زاہدہ۔ عابدہ۔ ذاکرہ) کا جہیز
برابر کا ہوگا کپڑے زیور میں کوئی فرق نہ ہوگا۔
زاہدہ بیگم صاحبہ کا پیام آیا تو بڑی دادی اماں
نے بیٹے (ڈپٹی عبدالحامد صاحب) سے کہا: زاہدہ کی شادی
کے لئے روپیہ دو۔"
انھوں نے کہا: تینوں کی شادی ایک ساتھ ہوگی
اور جہیز برابر کا ملے گا اور تینوں کی مہمانداری لین دین
یکساں ہوگا۔ اب آپ بھابی سے کہئے وہ اپنا سلیقہ دکھائیں۔
بڑی استانی جی نے یہ سن کر اپنے آپ کو پیٹ لیا

روتے لگیں اور کہا۔
"وحیدالزمانی (چھوٹی بہو) تو اپنا سلیقہ دکھا سکتی
ہیں۔ رشیدالزمانی کس کی کمائی کا سلیقہ دکھائے گی۔
ہائے عبدالحامد کتنی بڑی بات تمھارے مُنہ سے نکلی ہے"۔
ڈپٹی عبدالحامد بھی روتے اور کہا۔
"بھائی مر گئے اور مجھے مصیبت میں چھوڑ گئے"۔
"ابی میاں" اور زاہدہ بیگم کی اماں بی بی رشیدالزمانی
خاموش تھیں!

اُس وقت بڑی اُستانی جی کی بڑی بیٹی مرحومہ
صفیۃ النسا اُٹھیں اور اپنی ماں کو جو رو رہی تھیں دوسرے
گھر میں لے گئیں اور کہا۔
"ایک بیٹی ہیں چھ جوڑے زاہدہ کے جہیز کے لئے
اور چار جوڑے ابی میاں کی دولھن کے لئے رکھے ہیں اور
دو ایک زیور بھی جو میاں عبدالواحد کی کمائی میں سے بنوائے
گئے ہیں۔ آپ دل بھاری نہ کریں"۔

مرحومہ صفیۃ النسا صاحبہ حیدرآباد دکن سے اپنے
مرحوم بھائی کا جو سامان لائی تھیں اُن میں چینی کے برتن
بھی تھے۔ دو بہت ہی خوب صورت بڑی بڑی قابیں ابّا کو
ملی تھیں اور اماں بڑی احتیاط سے رکھتی تھیں کہ ان کے
مرحوم خُسر کی نشانی ہیں۔

ایک قاب انھوں نے آپا راشدہ کو جہیز میں دی
تھی دوسری واجدہ بیگم کو۔ یہ قابیں خاص خاص موقع پر
نکلتی تھیں۔ تربوزی رنگ کی گول تھیں۔ واجدہ بیگم کو جو
قاب جہیز میں ملی تھی اب بھی موجود ہے۔ بچھونا اور پلنگ
بھی تھا یعنی نواڑ اور بندھے ہوئے پائے پٹیاں۔ بچھونا زاہدہ بیگم
صاحبہ کو ملا تھا اور پلنگ علامہ مغفور کو اس پلنگ پر
اُن کے پوتے سعد میاں بھی سوئے ہیں۔ آپا راشدہ بہت
پھڑ پھڑاتی تھیں کہ یہ پلنگ مجھے دے دیجئے مگر والد مرحوم
نے فرمایا نہیں یہ سعد کا ہے۔ اس پر وہ سوئے گا حالانکہ
اُس زمانہ میں سعد میاں بہت ننھے سے بہت چھوٹے
تھے۔ والد مرحوم کی بڑی پھوپی صاحبہ نے بھائی کا سامان
اللہ کے نام نہیں دیا تھا۔ بلکہ جوں کا توں لا کر اپنی
ماں کے سپرد کر دیا تھا کہ چاہے اللہ کے نام دیں یا
اپنے پاس رکھیں۔ ڈپٹی عبدالحامد صاحب نے پلنگ کی
نواڑ پائے پٹیاں دیکھ کر کہا تھا: "اس پر بھابی سوئیں گی"۔

یہ واقعات آپا راشدہ بیگم سے معلوم ہوئے ہیں
جو میں اپنے الفاظ میں لکھ رہا ہوں۔ مرحومہ پھوپی حامدہ
بیگم نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کہ "آپا زاہدہ یتیم تو ضرور
تھیں مگر جیسا جہیز ان کو ملا کھاری باؤلی میں کسی کو
نہیں ملا"۔ چنانچہ آپا راشدہ بیگم نے بھی کہا "پھوپی
اماں کھاری باؤلی والیوں میں سب سے قیمتی جہیز لے کر
میکے سے رخصت ہوئی تھیں"۔

دادی اور پھوپیوں کی تجویز تھی کہ اس گھر کی لڑکی
کو تہرا گہنا ملنا چاہئے۔ (آج کل کی اصطلاح میں زیور
کے ۳ سٹ) انگوٹھیاں اُن کے علاوہ ہوتی تھیں۔ ڈپٹی
عبدالحامد صاحب نے کہا: "میں سُنار کو بلا کر معلوم کرتا ہوں
زیور کتنے میں تیار ہوگا"۔ یعنی تینوں لڑکیوں کے لئے ہر چیز
۳۔۳۔ مثلاً کانوں کے لئے پتے۔ بالیاں۔ بجلیاں چنانچہ
زیور اسی حساب سے بنا مگر زاہدہ بیگم صاحبہ کے کانوں
کے زیور میں ایک بہت قیمتی زیور تھا وہ بجلیوں کی بہت
بڑی جوڑی تھی جو اُن کے ابّا کو پریڈ کے میدان میں ملی
تھی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس طرح کانوں کے ۹ زیور ہو گئے تھے۔
منجھلی پھوپی اماں (والدہ مولوی اشرف حسین
صاحب) کی تجویز تھی کہ چہرکٹ چاندی کا موسیقا آتا

نے کہا کہ [illegible] چرکٹ چاندی کا دیا گیا تب مجھے عابد اور
ذاکر کے لئے بھی چاندی کا دینا پڑے گا۔ اس لئے تانبہ
ہی کا رہنے دو ۔ دو برس پہلے لوہے کا دلی میں عام رواج
تھا ۔ تانبے کے برتنوں میں ایک بڑی دیگ بھی تھی ۔
ہمارے والد صاحب میں پھوپی اماں کو ۱۲ زیور ملے تھے ۔
جو دوسرے گزرنے حافظ عبدالواحد صاحب نے چھوڑے
تھے ان میں سے ایک کنٹھا زاہدہ بیگم صاحبہ کی شادی
کے وقت کام آیا ۔

علامہ مغفور کی سسرال

والد مرحوم کے بھتیجے مولوی حکیم محمد نجیب الرحمٰن
صاحب نے اپنے خاندانی حالات اور اپنی سوانح عمری
لکھی ہے جو غیر مطبوعہ ہے اس میں وہ لکھتے ہیں ۔ ہم لوگ
ذات (قومیت) کے لحاظ سے لودھی بختیاری پٹھان ہیں"
اور پھر تحریر فرماتے ہیں کہ بابر بادشاہ کی فوجوں سے ابراہیم
لودھی کو ۱۵۲۶ء میں بمقام پانی پت شکست ہوئی ۔
تو ہمارے بزرگ حیدرآباد جا پہنچے تھے" اس غیر مطبوعہ
مسودہ میں آگا نجیب الرحمٰن کے والد مرحوم کپتان مولوی
حبیب الرحمٰن صاحب سی آئی ای کا یہ نوٹ اُن کے
دستخط سے موجود ہے ۔

" ہمارے دادا محمد اللہ خاں عرف رمضان خاں
کے والد ماجد میر سیف اللہ خاں کی جگہ نظام الملک کی
جمعیت میں بمقام حیدرآباد دکن یک صد ہزاری سردار
لشکر تھے مگر اپنی طویل علالت اور ناموافقت آب و ہوا
دکن کے باعث ترک تعلق کر کے ۱۸۲۲ء میں دہلی کی طرف
روانہ ہو گئے تھے کہ اثنائے راہ میں بمقام برہان پور
متصل کھنڈوہ وفات پا گئے ۔ اس واقعہ کے بعد ان کے
صاحبزادے ہمارے جد امجد حمید اللہ خاں صاحب
مع اہل و عیال سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے
بحالت سراسیمگی دہلی پہنچے تھے"

مولوی حاجی شاہ محمد عبدالرحیم ہادی دہلوی

عبداللہ خاں صاحب کے بیٹے تھے اور ۱۸۲۰ء میں
حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے تھے ۔ ۱۴ سال کی عمر میں
بغرض تحصیل علم و تعلیم ہمراہ طلبا کے ساتھ سوات جو سوات
بنیر بھی کہلاتا تھا تشریف لے گئے اور حضرت شاہ عبدالغفور
اخوند صاحب سے بیعت کی اور ۱۴ برس ان کی خدمت میں
حاضر رہ کر علوم ظاہری و باطنی سے فیض یاب ہو کر ۱۸۴۸ء
میں دلی واپس آئے ۔

اُس زمانہ میں ریل نہیں تھی سو دو سو میل کا سفر
بھی طول طویل کہلاتا تھا ۔ ریاست سوات کی سرحدوں
سے ملتی ہے ہمارے لئے تو اندازہ کرنا بھی بہت مشکل ہے کہ
سینکڑوں میل کا سفر کیسی کیسی سخت تکلیفیں اٹھا کر نہ جانے
کتنی مدت میں طے ہوتا تھا ۔ مولوی صاحب ۱۴ سال بعد
دلی واپس آئے تو پتہ نہ چلا کہ اُن کے والدین اور عزیز و
اقارب میں جو زندہ تھے وہ کہاں اور کس حال میں تھے ۔
مولوی صاحب نے دلی میں آکر سلسلہ وعظ شروع کر دیا ۔
اُن کی والدہ سے اُن کے رشتہ کے کسی عزیز نے ذکر کیا ۔
کہ آجکل شہر میں ایک بڑے عالم آئے ہوئے ہیں دو تین
دفعہ میں بھی اُن کا وعظ سن چکا ہوں ۔ جی چاہتا ہے اُن کی
دعوت کروں ۔ جنتی بی بی نے کہا کیا مضائقہ ہے کر دو ۔
چنانچہ مولوی صاحب کی دعوت ہوئی ۔ دالان کے بیچ
میں الگنی باندھ کر پردہ ڈال دیا پردہ کے ایک طرف گھر والے
چل پھر رہے تھے اور دوسرے طرف مہمان کو بٹھایا گیا ۔
مولوی صاحب باتیں کر رہے تھے کہ اُن کی ماں نے پردہ

میں سے جھانک کر دیکھا۔ دیکھا اور تعجب سے دیکھا۔ حیرت سے دیکھا اور بے ساختہ اُن کے منہ سے نکل گیا۔

عبدالرحیم!

مولوی صاحب اس طرح اپنا نام سُن کر ایک دم کھڑے ہو گئے اور اُن کی ماں نے پردہ اُٹھا دوڑ کر بیٹے کو کلیجے سے چمٹا لیا!

۱۴ سال پہلے ڈاڑھی مونچھ کچھ بھی نہ تھی۔ دُبلے پتلے لڑکے تھے اور اب بلند و بالا قد دوہرا بدن۔ بھرواں لمبی ڈاڑھی۔ اور پھر جبہ اور عمامہ میں۔ مگر ماں نے آواز سُن کر اور شکل دیکھ کر پہچان ہی لیا اور پھر

وہ بچھڑے کے دوا برِ غم یوں ملے
کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے (میر حسن)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مولوی شاہ عبدالرحیم خاں صاحب نے دہلی کے ایک سادات خاندان میں شادی کی۔ آج ۱۹۶۶ء میں اس وقت میرے سامنے وہ خاندان ہیں۔ جو پٹھانوں اور سیّدوں میں شادی کے خلاف ہیں۔ ایک لڑکی ڈبل ایم اے ہے مگر چونکہ سیّد ہے اچھے سے اچھے لڑکے کا پیام اس لئے رَد کر دیا جاتا ہے کہ وہ پٹھان ہے۔ ایک لڑکا ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور معقول تنخواہ پر ملازم ہے مگر سیّد کی لڑکی سے اس وجہ سے اس کی شادی نہیں کی جاتی کہ سیّدوں کی شان میں گستاخی ہوگی۔

مولوی شاہ عبدالرحیم نے دلّی ہی میں مُستقل بود و باش اختیار کی اور پھر ایک عرصہ تک فرسٹ ڈیوک آف یارکس ہو لنسں سکنرز ہاؤس میں جو اس وقت اول بنگال لانسرز کہلاتا تھا بہ حیثیت پیش امام ملازمت کر لی اس عرصہ میں کئی حج کئے اور پھر ملازمت چھوڑ کر آخری دفعہ سوات سے آنے کے بعد ضلع رو ہتک اور ہریانہ کے علاقوں میں [illegible] کو وعظ و نصیحت سے اصلاح رسوم پر متوجہ کرنا شروع کیا۔

جنرل لوک ہارٹ ڈپٹی کوارٹر ماسٹر جنرل جو بعد میں کمانڈر انچیف افواج ہند بنا اُن کا شاگرد تھا۔ شملہ سے ۹ اگست [illegible] کو اس نے ایک سارٹیفکٹ دیا تھا کہ میں مولوی عبدالرحیم خاں کو پچھلے تیرہ سال سے جانتا ہوں ان کی عزت اور ان کی قابلیت کا معترف ہوں وہ عربی فارسی پشتو کے بڑے عالم ہیں۔ کوہاٹ یکم مئی ۱۸۶۹ء کو کمانڈنٹ فرسٹ بنگال کیولری جی ڈبلیو سی تھامسن لفٹنٹ کرنل نے لکھا کہ مولوی عبدالرحیم خاں صاحب اس کیولری کے پچھلے ۱۵ سال سے امام ہیں اور اکثر افسروں کو فارسی اور پشتو سکھاتے تھے وہ دہلی کے نیک نہاد روشن خیال شرفا میں سے ہیں اور ساری رجمنٹ ان کی بیحد عزت کرتی ہے۔

مولوی صاحب مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے ہم مشرب تھے اور تخلص جہادی تھا۔ روپوش ہو کر وہ ججھر چلے گئے تھے انھوں نے اصلاح اخلاق اور اصلاح رسوم کی برسوں ان تھک کوششیں کیں خاص طور پر بیواؤں کی شادی کے لئے مسلسل جہاد کیا۔ چنانچہ ضلع رو ہتک کا ڈپٹی کمشنر اوو ڈنے لدھیانہ سے ۲ جولائی ۱۸۸۰ء کو لکھا کہ مولوی صاحب نے رانڈوں کی شادی کے لئے بہت کوشش کی ہے۔ اور شملہ سے ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء کو کمشنر دہلی ڈویژن کرنل اے جے گیبے نے لکھا کہ مولوی صاحب نے ججھر میں اخلاق و تعلیم کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ انھوں نے ججھر میں جو مسجد بنائی اور مدرسہ کھولا وہ دونوں ان کی "پبلک سپرٹ" کے گواہ رہیں گے۔ مندرجہ بالا چاروں سرٹیفکٹ انگریزی میں مطبوعہ ہیں اور مولوی صاحب کے سب سے بڑے پوتے مولوی نجیب الرحمٰن صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔

مولوی صاحب ۔۔۔ کی
۔۔۔ جامع مسجد نہاں گرن کی بڑی
۔۔۔ دیا ۔ جمعہ کی ۔۔۔
۔۔۔ کیا ۔

مولوی صاحب حاجی ۔ حافظ ۔ عالم ۔ واعظ ۔۔۔
۔۔۔ پہلے جہادی تھا پھر ہادی کر لیا اور اس کا
۔۔۔ شنا ۔۔۔ گلشن نے اُن سے کہا تھا کہ جہادی
اچھا لفظ نہیں ہے کوئی اور تخلص رکھو تو انھوں نے کہا آپ
۔۔۔ تو میں یہ حرف اڑا دیتا ہوں اس دن سے
وہ جہادی سے ہادی ہو گئے ۔ تزویج الایامی ۔ رانڈوں کی
شادی ۔ فتح سنت الاسلام ۔ روضۃ النعیم ۔ رحمۃ الرحیم ۔
شہامت العنبر (پرانی طرز کا میلاد شریف) مولوی صاحب کی
تصانیف میں سے ہیں جو نظم و نثر میں ہیں ۔

۔۔ سال کی عمر میں ذیقعدہ ۔۔۔ مطابق ۔۔۔
میں انتقال ہوا اور خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں مدفون
ہوئے ۔

علامہ مغفور کی خوش دامن | "جناب عالیہ نواب سید مظفر خاں بہادر ۔۔۔

ہماری امیر کبیر رئیس اعظم شاہ جہاں آباد کی آخری یادگار تھیں
نہایت خوش عقیدہ ۔ ذکی الطبع ۔ سخی مہمان نواز ۔ نرم دل ۔
صوم و صلوٰۃ کی پابند ۔ ۲۴ مارچ ۱۹۱۶ء بروز جمعہ جوار
رحمت الٰہی میں تشریف لے گئیں "

مولانا شاہ محمد امان الرحمٰن مرحوم ۔۔۔ (وصال الجمیل)
صغر سنی تھی میری عمر چھ سال کی ہوگی ۔ اپنی والدہ
کے ساتھ قلعہ معلیٰ میں جاتا ۔ حضرت ابوالظفر بہادر شاہ غازی
کو آداب بجا لاتا اُن کا مسکرا کر مجھے گود میں بٹھاتا میرے گلے
کی ہیکل کے تعویذوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے ہنساتا ۔
سر پر ہاتھ پھیرنا مجھے اب تک یاد ہے "

مولانا شاہ محمد امان الرحمٰن مرحوم ۔۔۔ (حیات ہادی)
نانی اماں مرحوم کو والدہ مرحومہ "اماں جی" کہتی تھیں
اور ہم بہن بھائی بھی "اماں جی" ہی کہا کرتے تھے رنگ
نہ سانولا تھا ۔ خد و خال نہایت پاکیزہ بال سفید ۔
تک میں نے انھیں چلتے پھرتے نہیں پلنگ پر ہی بیٹھے
دیکھا ہے ۔ ان کے گرد کئی تھیلیاں سجی تھیں جن میں
سے کئی کئی دن کی مٹھائی ڈھونڈ ڈھونڈ کر بچوں کو دیا کرتی
تھیں ۔ نظر کمزور ہو گئی تھی دیا سلائی جلوا کر چیزیں ٹٹولتی تھیں
یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی اُن کے پاس آتا اور وہ کچھ کھلائے بغیر
رخصت کرتیں ۔ سنا ہے جب نانا ابا نے مجھریں جامع
مسجد بنوانی شروع کی تو اماں جی کے پاس زیور بہت تھا اور
انھوں نے سب زیور مسجد کے لئے دے دیا تھا خودداری کی
یہ کیفیت تھی کہ کرایہ کے مکان میں رہتی تھیں مگر کرایہ کسی بچے
سے نہ لیتیں خود دیتی تھیں آخر میں اماں جان کے ساتھ رہنے
لگیں جب بھی اپنے حصے کے ۵ روپیہ کرایہ دیتی تھیں ۔
لیکن بیٹوں کے ہوتے ہوئے بیٹی کے ہاں رہنا اور رخصت
جی بی بی ہی کے گھر سے ہونا تا ہم کرتا ہے کہ وہ اپنے
داماد سے خوش تھیں وہ شادی بیاہ کی شرکت کے علاوہ گھر سے
باہر نہ نکلتی تھیں ۔

سیدانی تھیں ۔ جلال شان میں نے نہیں دیکھی ۔
جمالی شان آخر وقت تک نظر آئی ۔ بھولپن ۔ عاجزی ۔ مسکینی
کم سخنی ۔ غیرت حمیت یہ خصوصیات اُن کی فطرت میں ودیعت
تھیں جو اُن کی اولاد میں والدہ مرحومہ اور منجھلے ماموں جان
(کپتان صاحب) کو عطا فرمانے میں قدرت نے فیاضی سے
کام لیا تھا ۔

مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کی اولاد | (۱) مولوی حافظ

ملک حکیم محمد جمیل الرحمٰن صاحب کے حالات میں ان کے چھوٹے بھائی مولوی شاہ محمد امان الرحمٰن صاحب کتاب "وصال الجمیل" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "۲۳ رجب ۱۲۷۹ھ کو دلی میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار سے کلام اللہ حفظ کیا۔ اور مدرسہ فتحپوری سے کہ نیا نیا جاری ہوا تھا سند تکمیل اور دستار فضیلت کا شرف ۱۸۸۲ء میں حاصل کیا ۱۸۸۶ء میں پنجاب یونیورسٹی میں منشی فاضل مولوی فاضل کے امتحانوں میں کامیابی ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں علم طب کی سند مع تمغہ مدرسہ طبیہ دہلی سے بزمانہ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں ملی۔ ۱۸ ماہ عربی اسکول میں مولانا حالی کی قائم مقامی فرمائی۔ بیس سال سینٹ سٹیفنز کالج کی پروفیسری سے ۱۹۰۸ء میں مستعفی ہوئے۔ مشن کالج کے پرنسپل ایس ایس آلنٹ نے یکم اپریل ۱۸۹۱ء کو جو نوٹ دیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے امتحانوں میں جو جو طلبا مولوی صاحب کے شاگرد شریک ہوئے وہ سب کامیاب ہوئے یعنی نتیجہ ہمیشہ سو فیصدی رہا۔ یہ پادری صاحب بھی مولوی صاحب کے شاگرد تھے۔

عربی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ راشد تخلص تھا۔ ۲۳ اگست ۱۹۲۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا اور درگاہ خواجہ باقی باللہ میں تدفین ہوئی ان کی رحلت پر حضرت علامہ راشد الخیری کا جو مضمون لاہور کے روزنامہ انقلاب میں بعنوان "یہ شمع بھی گل ہوئی" شائع ہوا تھا اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

"بزم جہاں آباد کے وہ شاداب پھول جن کی شمیم انگیزیاں دستہ چلتوں کے دماغ معطر کرتی تھیں ایک ایک کرکے رخصت ہو رہے ہیں۔ وہ پُر رونق مجلس جو کبھی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی آج سنسان ہے۔۔۔۔۔

کالج سے تعلقات منقطع فرما کر یاد الٰہی میں مستغرق ہوگئے درگاہ خواجہ بزرگ اجمیر شریف میں قیام فرما کر تمام مدارج تصوف طے کئے اور طبابت جو خلق اللہ کی خدمت کا افضل ترین مشغلہ ہے ذریعۂ معاش قرار دیا اور باقی وقت روحانیت کے صرف کرنا شروع کر دیا۔۔۔ مریدوں کی تعداد ٹھیک معلوم نہیں مگر ہندوستان کا کوئی قصبہ بمشکل ایسا ہوگا جہاں اس نام کے عاشق نہ ہوں۔

کیفیت استغراق اور کثرت مجاہدات نے کھانا پینا چھڑوا دیا اور اب پانچ سال سے غذا برائے نام رہ گئی تھی۔

مجھے مولانا مرحوم سے خاص تعلق تھا۔ میں ان کی متانت سنجیدگی۔ وضع داری اور خلوص کا شیدا تھا۔ وصیت کر گئے تھے کہ تبر انتقال کی تشہیر نہ ہو اور احکام اسلام کی تعمیل میں خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا جاؤں تاہم خبر موت چھپ نہ سکی"۔

بڑے ماموں جان نے اپنے پیچھے ۳ لڑکیاں چھوڑیں رضیہ بیگم صاحبہ۔ صغرا بیگم صاحبہ اور کبریٰ بیگم اور ۴ لڑکے مولوی شاہ محمد سراج الرحمٰن مرحوم جو ہر سال اپنے والد مرحوم کا عرس بڑے اہتمام سے کرتے تھے اور دُور دراز سے مریدین جمع ہوتے تھے۔ محمد فیض الرحمٰن صاحب۔ محمد نظام الرحمٰن مرحوم اور محمد نور الرحمٰن۔

(۲) رسالدار بہادر کپتان مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ او بی ای پیدائش دلی۔ ۱۰ اپریل ۱۸۶۸ء علامہ مغفور کے ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ عربی اسکول سے مڈل پاس کیا اور انگریزوں کو پڑھانے کا موقع ملا۔ کچھ دنوں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں سررشتہ دار کی حیثیت سے کام کیا پھر اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ اول لانسرز تشریف لے گئے بمقام پشاور جہاں آپ سے چھوٹے بھائی شاہ

پکیں جو گیال ہیں چہرے کھلی جاتی ہیں کیوں باچھیں
بڑا ہو یا کہ چھوٹا ہو۔ عزیز ہو یا کہ ہمسایہ
بصد عجز و ادب ہم شکر کا سجدہ کریں اس کو
کہ جس نے آج ہم کو یہ خوشی کا روز دکھلایا
عطائے بے بہا اس کا۔ کرم اس کا۔ رحم اس کا
میرے بھائی کو جس نے سب رجسٹراری پہ پہنچایا
میرے بھائی کو رکھ ماموں۔ نگاہ میں اے مولا
بہ خیر انجام ہو سب کا۔ یہ ہی ہے آرزو آقا
سعی تھی نہ سفارش تھی وسیلہ تھا نہ ذریعہ تھا
دعا ماں باپ کی شامل تھی اور تھا فضل خالق کا
دعا ماں باپ کی پیارو کلید کامیابی ہے
پھلو پھولو گے دنیا میں بہت سستا ہے یہ سودا
رہیں خوش میرے ماں جائے ہزاری ان کی عمریں ہوں
بسیں پھیلیں، خوشی جم جم تصدق پاک روحوں کا

۲ مئی ۳۳ء کو دلی میں انھوں نے رحلت فرمائی اور دلی دروازہ کے باہر نئے قبرستان میں والد مرحوم کے مزار سے چند قدم کے فاصلہ پر تدفین ہوئی۔ اُن کی رحلت پر میری بیوی آمنہ نازلی کا مضمون عصمت میں شائع ہوا تھا جس کا ایک حصہ یہ ہے۔

ماموں جان اتنی خوبیوں کے حامل تھے جو ایک انسان میں شاذ و نادر ہی ہو سکتی ہیں۔ باوجود عزت حیثیت اور قابلیت کے اُن کا رویہ سب کے ساتھ انتہائی خاکساری اور ہمدردی کا رہا۔ انھوں نے اپنوں ہی کے نہیں غیروں کے ساتھ بھی ایسی مہربانیاں کیں جو بھلائی نہیں جا سکتیں۔ باوجود ضعیفی کے وہ روزانہ صبح شام ٹہلنے ضرور جاتے۔ اسّی سال کی عمر اور چہل قدمی ......

ماموں جان کی شبیہ بہت کچھ اماں جان سے ملتی جلتی تھی اور طبیعت بھی ایسی فرشتہ صفت جیسی کہ ان کی بہن کی تھی۔

کتنے خوش ہوتے تھے رازق صاحب جب ماموں جان تشریف لاتے تھے اور اپنا ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر ماموں جان کے ہمراہ اُن کو گھر تک پہنچانے جاتے تھے ..... اب بھی گئے تھے وہ ... ماموں جان کو پہنچانے اپنی اماں جان کے پاس ... جو مقدس پھولوں کے ہار لئے ان کا انتظار کر رہی تھیں .....

اماں جان کے میکہ کا یہ آخری چراغ اب وہاں روشن ہو گا آب و تاب سے نیکیوں سے معمور۔ مقدس روحوں کے سائے میں رحمت کے پھولوں سے آویزاں"

کپتان صاحب کے سب بچے زندہ سلامت ہیں۔ دو بیویوں سے چھ لڑکے ہوئے۔ لڑکی کوئی نہیں ہوئی۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں۔

مولوی حکیم محمد نجیب الرحمٰن صاحب حاجی لطیف الرحمٰن صاحب رئیس دہلوی۔ محمد شریف الرحمٰن صاحب تینوں بھائی سرکاری ملازم تھے اب پنشن ملتی ہے۔ بھائی لطیف سے بڑے مجیب الرحمٰن صاحب تھے جن کا انتقال ہو چکا ہے آ کا نجیب الرحمٰن صاحب کا بھی ۵ جنوری ۶۳ء کو بعمر ۷۰ سال انتقال ہو گیا۔ دو لڑکے دوسری بیوی سے ہوئے انعام الرحمٰن ۔ جو حکومت ہند کے محکمہ تعلیم میں غالباً ڈپٹی سکریٹری ہیں۔ اور اکرام الرحمٰن شاید ایم اے میں پڑھ رہے ہیں۔

(۳) مولوی شاہ محمد سعید الرحمٰن صاحب ۔ جو "جھجر والے مولوی صاحب" کہلاتے تھے اور جنھیں ہم منجھلے ماموں جان کہتے تھے ۱۲۸۳ھ میں بمقام دہلی ترکمان دروازہ متصل خانقاہ غلام علی پیدا ہوئے۔ فارسی اُردو گھر پر ہی پڑھی اور فوج میں ورنیکلر ماسٹر ہو گئے پھر ملازمت چھوڑ کر جھجر کی جامع مسجد اور مدرسہ قوۃ الاسلام سنبھالا۔ کپتان مولوی

[illegible] الرحمن صاحب انھیں کی جگہ فوج میں ملازم ہوئے تھے
مولوی سید الرحمن صاحب بھی کئی بار سوات تشریف لے
گئے تھے۔ اسی دوران جناب خورشید علی خاں کے اصرار پر
[illegible] میں کئی سال قیام پذیر رہے۔ ان کی طبیعت میں
بہت سادگی تھی اور متانت اور سنجیدگی [illegible]
[illegible] تعویذ گنڈے بھی کرتے تھے۔ میری خیال میں
[illegible] کا شوق سب سے زیادہ انھیں کو تھا ۱۴ مئی [illegible]
دلی میں انتقال ہوا ان کی اولاد میں دو جہات ہیں۔
نسیم الرحمن اور رشید جہاں۔

(۴) مولوی شاہ محمد امان الرحمن صاحب۔
[illegible] میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں شہزادہ ہائی اسکول
[illegible] عربی کے مدرس مقرر ہوئے پھر جاگیر بھڑانسی ضلع علی گڑھ
میں حاجی یوسف خاں کے صاحبزادے محمد ہارون خاں
کے اتالیق ہوئے۔ ۱۸۹۹ء سے ہز ایکسلنسی محمد یعقوب خاں
طورہ آفندی سفیر سلطنت کا شعر کے صاحبزادے عبد الحی
خاں صاحب کے ایجنٹ و اتالیق رہے۔ تصویر ماتم۔
تیغ ستم۔ دافع الاحزان۔ مقام محبت۔ گلشن باری۔
مرغ بسمل۔ حال دل۔ گلاب کا پھول۔ حیات ہادی۔
نالۂ الم۔ وصال الجمیل ان کی تصانیف ہیں۔ ایک
درجن کے قریب بچے ہوئے مگر سوائے محمد انیس الرحمن کے
سب نے بچپن ہی میں غم نصیب باپ کو تڑپتا اور پھڑکتا
چھوڑا۔ دو دفعہ گھر بار چھوڑ چھاڑ درویشی اختیار کی۔

مولوی امان الرحمن صاحب جنھیں ہم ۔ بہن
بھائی "گورے ماموں جان" کہتے تھے نہایت خوش پوش
خوش خوراک۔ بامذاق اور عجیب باغ و بہار انسان تھے
انھیں اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں کمال تھا۔
قانونی باریکیاں ایسی ایسی نکالتے کہ اُن کی باتیں سُننے
والے دنگ رہ جاتے تھے جو کہیں انگریزی تعلیم حاصل کر کے
قانون پڑھ لیتے اور جج یا بیرسٹر ہوتے تو ان کا نام بچے بچے
کی زبان پر ہوتا۔ طبیعت میں مزاح تھا اور بہت زندہ
دل لطیفہ گو تھے۔ جو بات دو منٹ میں کی جا سکتی تھی۔
اسے نہایت تفصیل کے ساتھ دو گھنٹے بلکہ اس سے
بھی زیادہ دیر تک بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔
آغا مجیب الرحمن صاحب اُن کے سب سے بڑے
بھتیجے کا بیان ہے کہ ایک دن میں شام کو دفتر سے سیدھا
ان کے ہاں پہنچا ان کی باتیں سنتے ساری رات گزر گئی۔
اور صبح نو بجے اس وقت اُٹھا جب دفتر کا وقت ہو رہا تھا۔
ان کے ایک دوسرے بھتیجے حاجی مولوی لطیف الرحمن
صاحب رئیس نے ایک دفعہ بیان کیا کہ ترامے کے
پیپل کے درخت کے نیچے کہیں عشا کے بعد مل گئے اب جو
گفتگو شروع کی تو فجر کی اذان ہو گئی۔ میں نے کہا اب
اجازت دیجئے کہنے لگے واہ صبح ہو رہی ہے ناشتہ کر کے
جاؤ چنانچہ ۹ بجے صبح چھائی مار سیدھا دفتر گیا۔ خود
راقم الحروف کے ساتھ ایک دفعہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا
کہ دس ساڑھے دس بجے جب دفتر میں کام کر رہا تھا
ایک دن خیال ہوا تھوڑی دیر گورے ماموں جان کے
ہاں ہو آؤں۔ میں دفتر میں یہ کہہ کر گیا تھا ابھی ایک گھنٹہ
میں آرہا ہوں۔ ماموں جان سے ۵۔۷ منٹ بعد میں نے
کہیں سے یہ سوال کر لیا تھا کہ آپ فتح پوری کے حمام
میں بھی کبھی نہائے ہیں اس کا جواب انھوں نے بہت
تفصیل کے ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ چار بج گئے۔ حضرت
والد مرحوم سمجھ گئے تھے کہ میں ماموں جان کی باتوں میں
پھنسا ہوا ہوں اُنھوں نے چپراسی کو بھیجا کہ لاہور سے
دو آدمی آئے ہوئے ہیں جلد چلئے۔ ۱۸ جنوری [illegible] کو دلی

میں رحلت فرمائی۔

محمد انیس الرحمٰن بس یہی ان کی یادگار تھے اور ۵۰ سال کے نہ ہونے تھے کہ ۷ بچے چھوڑ کر وفات پا گئے۔

۵۔ دفعدار حافظ محمد عثمان الرحمٰن صاحب فوج میں سکول ماسٹر تھے یہ بھی اپنے بڑے بھائی مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کے ساتھ چین کی لڑائی میں گئے تھے۔ پنشن لے کر دلی آئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ نمونیہ میں ایک ہفتہ علیل رہ کر دسمبر [illegible] میں وفات پا گئے۔

نماز روزے کے سخت پابند اور نہایت جفاکش انسان تھے حافظ محمد احسان الرحمٰن "مارخ عثمانی" مرحوم بڑے بیٹے تھے مجھ سے تین سال بڑے۔ زندگی کے آخری ۱۸ سال میرے ساتھ میرے دفتر میں گزارے وضعداری خلوص دیانت کا پیکر تھے ان سے چھوٹے حفیظ الرحمٰن اور سب سے چھوٹے اعجاز الرحمٰن عرف "سید جا جو" بھی باپ کی طرح غیور خوددار محنتی اور بااصول ہیں۔ ایک بیٹے الطاف الرحمٰن ہیں۔

چھوٹے ماموں جان نے رحلت کے وقت تین ننھے ننھے بچے والدہ مرحومہ یعنی اپنی بہن کے سپرد کئے تھے بارہ سال بعد جب اُن میں سے بڑے لڑکے کی شادی ہوئی تو حضرت والد مرحوم نے والدہ مرحومہ کی طرف سے ایک دردانگیز نظم لکھی تھی اور اُس کے ساتھ سہرا بھی۔ اس نظم میں فرماتے ہیں۔

غضب کی موت تھی اس خانماں برباد بھائی کی
کہ چند ہی روز پہلے اس مسافر کا تھا گھر اُجڑا
تماشے تونے جو دکھلائے اِن آنکھوں سے سب دیکھے
دکھایا وقت آخر بہن کو مہماں بھائی کا
نشان موت جب ظاہر ہوئے سکرات ہونے طاری
تو حسرت سے بھری نظروں نے چہرہ بہن کا دیکھا
سقوط نبض کا آغاز تھا اور سانس میں فرق تھا
کہ ماں جائی بہن نے بھائی کے چہرہ پہ منہ رکھا
دیا پھر لپٹ کر سر کو۔ آنسو آنکھ میں آئے
بصد منت، بصد حسرت، بچشم تر یہ فرمایا
جدائی کی گھڑی آئی۔ یہ وقت موت سر پہ ہے
میں اب دنیا سے جاتا ہوں۔ خدا حافظ بہا تیرا
یہ بے کس تین بچے چھوڑتا ہوں، تیری شفقت پر
یہ بن ماں باپ کے بچے۔ نہ ماں ان کی نہ باپ ہوگا
خدا کا واسطہ ان پر رحم کیجو، کرم کیجو،
امانت ہے یہ بھائی کی، ذرا رکھیو خیال ان کا

(۶) فاطمہ خانم جن کا پیدائشی نام فود فاطمہ تھا اور سال پیدائش [illegible] مطابق [illegible] سسرال سے جنہیں "مبارک زمانی" کا خطاب ملا تھا علامہ مغفور کی رفیقۂ حیات تھیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

علامہ مغفور کی شادی

بی بی امیر بیگم صاحبہ مرحومہ جنہیں سسرال سے "مرشد الزمانی" کا خطاب ملا تھا اس لحاظ سے خوش نصیب نہ تھیں کہ ان کے اور ان کے شوہر حافظ عبداللہ جد صاحب کے مزاج اور خیالات میں بُعد المشرقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کے دل نہ ملے پھر حافظ صاحب کی ملازمت تھی دلی سے باہر کی۔ عمر بھر میں صرف ایک بار وہ بھی چند روز کے لئے گونڈا گئی تھیں اور حالات ایسے تھے کہ واپس دلی آنا پڑا شادی کی بہار جسے کہتے ہیں وہ انھوں نے زیادہ نہیں دیکھی اور جوانی ہی میں بیوہ ہوگئیں مگر بڑی "اُستانی جی" سر پر ہاتھ رکھ کر لائی تھیں بیوگی سے اُن کی وقعت و عظمت میں رتی برابر فرق نہ آیا۔ ساری سسرال اُن کا ادب و احترام کرتی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب جیسے تندمزاج تھے جب

[illegible] حیدرآباد سے عطیا [illegible] خود بھی
[illegible] نے [illegible] کے دوسرے دن مگر وہ
[illegible] بالکل نہ جاتی تھیں تو بھی [illegible] بھاوج
[illegible] بڑی کرار یا ملکی تھیں۔ ویسا ہی تھے۔ ڈپٹی
[illegible] صاحب وہ بھی جب دلّی آتے تو دوسرے دن
[illegible] بڑی بھاوج کے سلام کو آیا کرتے تھے۔ جن
[illegible] نے اپنے بزرگوں کی نظروں میں بی بی رشید النساء
[illegible] یہ قدر و منزلت دیکھی تھی وہ بھی ان کا احترام کیوں
نہ کرتے؟ میرا اتنا جاننا کہ بی بی صفیۃ النساء کے بڑے بیٹے
مولوی بشیر الدین احمد صاحب جو ریاست حیدرآباد دکن میں
[illegible] تعلقدار تھے جب دلّی آتے تو سب سے پہلے اپنی بڑی
ممانی کے سلام کو حاضر ہوتے تھے اور ان کی بہن بی بی صغرا
بیگم بھی کئی کئی سال بعد جب دلّی کا پھیرا کرتیں تو سب سے
پہلے انھیں ممانی کے پاس آتی تھیں۔ بی بی رشید النساء نی
بہت صاف گو آدمی تھیں کسی کی کوئی بات اچھی معلوم
نہ ہوتی تو منہ پر ہی کہہ دیتی تھیں۔ ہمارے ابا مولوی بشیر الدین
احمد صاحب کی دوسری بیوی جو چھوٹی دلھن کہلاتی تھیں
ایک دفعہ جو حیدرآباد سے آئیں تو دوسرے دن ممیا ساس
کے سلام کو حاضر ہوئیں۔ جب وہ جانے لگیں تو بی بی
رشید الزمانی نے کہا: "بیٹی دولھن اب تو تم ساڑھی
پہن کر آئی ہو آئندہ میں تمھارے بدن پر ساڑھی نہ
دیکھوں۔ حیدرآباد میں اسے برا نہیں سمجھتے۔ دلّی میں بہو
بیٹیوں کا ساڑھی پہننا عیب ہے۔" والدہ مرحومہ سے
بڑی اماں یعنی چھوٹی دولھن مرحومہ کا بہناپا تھا اور
دونوں میں محبت تھی۔ شام کو والد مرحوم آئے اور انھیں
واقعہ معلوم ہوا تو اپنی والدہ سے کہا "آپ نے کیوں خواہ
مخواہ منع کیا؟" بس اُن کے سر ہو گئیں کہ "تم بڑوں کے معاملہ
میں دخل دینے والے کون؟" بڑی اماں مرحومہ نے بھی مجھے
ابا مولوی بشیر الدین صاحب سے ذکر کیا تو وہ برا نہیں مانے
بلکہ خوش ہوئے اور دوسرے دن آکر ممانی سے لپٹ گئے
کیونکہ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ جو کچھ کہا تھا وہ خالص
محبت کے الفاظ تھے۔ اُس زمانہ میں خاص دلّی کے مسلمانوں
میں ساڑھی پہننا بہت ہی معیوب تھا۔ شرفاء کے طبقہ
میں خواتین کے صرف پاجامے ہوتے تھے اور وہ بھی ڈھیلے
پائنچوں کے یا تنگ موری کے۔

زاہدہ بیگم صاحبہ یعنی بیٹی کی شادی سے فارغ ہونے
کے بعد اب بی بی رشید الزمانی صاحبہ کا سب سے بڑا
ارمان یہ تھا کہ ابّی میاں کی شادی ہو جائے مگر شاید اُن
کی یہ آرزو [illegible] اُن کی ساس کا تھا پھوپھی حامدہ بیگم
صاحبہ کا بیان ہے۔

"دادی اماں مرحومہ مغفورہ عبداللہ ابّی سے بہت
محبت کرتی تھیں ان کا پہلا ارمان تھا کہ کسی طرح ابّی
کو دولھا بنا دیکھوں۔ کئی مرتبہ والد سے کہا "میاں عبداللہ
اس کی شادی کر دو۔" وہ جواب دیتے "اماں کیسے کر دوں
بڑھاپے نہ لکھتا""

(عصمت راشد الخیری نمبر)

بی بی رشید الزمانی صاحبہ کا جب اپنا مکان بن گیا
اور وہ کھاری باؤلی (سسرال) سے کلاں محل آگئیں تو
پڑوس کے ایک ایک گھر کی خیر خبر رکھنے لگیں۔ اور زاہدہ بیگم
صاحبہ کی شادی کے بعد ظہر کی نماز پڑھ کر اکثر پڑوسنوں سے
ملنے چلی جاتیں اور عصر تک واپس اپنے گھر آ جاتی تھیں۔
اور ضرورت مندوں کی ممکن مدد کیا کرتی تھیں۔ دیوار بیچ
مولوی عبدالرحیم صاحب مصنف رانڈوں کی شادی
وغیرہ اور بانیٔ جامع مسجد جھجر کی بیوہ رہتی تھیں۔ اُن کے

پانچ بیٹے تھے اور ایک بیٹی فاطمہ خانم۔ دیوار بیچ ہو کھا یعنی بڑا سا سوراخ تھا جس میں سے یہ دونوں پڑوسنیں کبھی کبھی باتیں کیا کرتی تھیں۔ مولوی عبدالرحیم صاحب کی بیوہ تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں مگر حافظ عبدالواجد صاحب کی بیوہ تین چار دفعہ اُن کے ہاں ہو آئیں اور اُن کی بیٹی فاطمہ خانم صاحبہ کو دیکھ چکی تھیں۔ ایک دن انھوں نے بڑی اُستانی جی یعنی اپنی خوشدامن صاحبہ کو کھاری بلوَلی سے بلایا۔ جب وہ تشریف لے آئیں تو کیکری کٹاؤ کے کام کی کوئی چیز دکھا کر کہا۔

"اماں برابر کے مکان میں ایک مولوی صاحب کی بیوہ رہتی ہیں۔ اُن کی لڑکی بہت سلیقہ مند سُگھڑ ہے۔ یہ کام اُس کے ہاتھ کا ہے۔ تیرہ چودہ برس کی عمر ہوگی۔ گھر کا سارا کام وہی کرتی ہے۔ بڑی تمیز کی اور حیادار لڑکی ہے۔ آپ اسے دیکھ لیجئے پسند آجائے تو اپنے میاں کا پیام دے دیجئے" پھوپی حامدہ بیگم صاحبہ کا بیان ہے کہ "جب انھوں نے یہ کہا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے وہ اس قدر اپنی اِن بہو سے محبت کرتی تھیں کہ آنسو دیکھ کر بے قرار ہو گئیں" اور بہو پاس قدر اعتماد دکھا کر بغیر غور کئے فرمایا۔

میرے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب تمھیں لڑکی پسند ہے تو ضرور اچھی ہوگی"۔

بہو نے کہا "آپ دیکھ کر میاں عبدالحامد سے ذکر کر دیجئے" انھوں نے فرمایا اس کی ضرورت نہیں۔ بس تمھاری پسند کافی ہے"۔

اس کے بعد ساس بہو دونوں موکھے کے پاس آئیں اور لڑکی کی ماں کو بڑی اُستانی جی نے پوتہ کا پیغام دے دیا۔ بیٹی کی ماں نے نہایت عاجزی اور مسکینی سے چند روز کی مہلت مانگی تو انھوں نے کہا میں دو روز ٹھیر جاتی ہوں پرسوں تم جواب دے دو۔ جب تک ہاں نہ کرو گی میں تمھاری باوَلی نہ جاؤں گی"۔

یہ صبح کا وقت تھا۔ ایک دن قبل شاید مولوی عبدالرحیم صاحب کی سالانہ فاتحہ تھی اور پانچوں لڑکے اتفاق سے دلی میں موجود تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد جب پانچوں بیٹے گھر آئے اور کھانے سے فارغ ہوئے تو ماں نے بیٹوں سے پیام کا ذکر کیا۔

مولوی عبدالقادر صاحب کو سارا شہر جانتا تھا۔ مولوی عبدالرحیم صاحب کی بیوی نے اپنے لڑکوں کو بتایا کہ "لڑکا اُن کا پوتہ ہے باپ حیدرآباد میں نوکر تھے انتقال ہو چکا ہے۔ لڑکے کا نام عبدالراشد ہے۔ لمبا قد۔ چھریرہ ڈیل۔ ننھی سی ڈاڑھی۔ گول ٹوپی۔ عربی اسکول میں پڑھا کرتا تھا اب نوکری کی تلاش ہے۔ اس کی اماں میری بہن بنی ہوئی ہیں"۔

وہ کچھ اور آگے بتاتیں کہ ایک بیٹے نے کہا "آپ نے اُسے دیکھا ہے جو اُس کا یہ حلیہ بتا رہی ہیں" ماں نے کہا "جو سُنا وہ بتا دیا میں کہاں سے دیکھ لیتی"۔

اُنھیں بیٹے نے کہا "میں نے دیکھا ہے اور جانتا ہوں۔ ایک دن اُسے نہر پر نہاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ بانسری بجاتے ہوئے۔ گانے کا بھی اس کو شوق ہوگا۔ کئی دفعہ رگٹ پٹ کرتے ہوئے (انگریزی بولتے ہوئے) میں نے اپنے کانوں سے سُنا ہے"

ایک بھائی نے جواب دیا "گٹ پٹ تو میں بھی ضرورت کے وقت کرتا ہوں۔ میرے ہی ساتھ مڈل پاس کیا ہے۔ میرا ہم جماعت ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔

برائی کی چیز نہیں [illegible] ہونی چاہئے۔ اور تم نے
[illegible] کہاں دیکھا ہے۔"
"جوڑی یا نسبت بجائے [illegible] بھی لگے گا اور
[illegible] بھی۔ میں نے خود [illegible] نہیں دیکھا مگر
[illegible] جنگ پسند نہیں پھر نوکری بھی نہیں جائیداد
بھی نہیں۔ بس [illegible] کا خاندان ہے اور کیا رکھا ہے۔"
ایک بیٹے صاحب تجھے سے اکڑ گئے۔ ایک ناکرتے
رہے اور دوسرے نے پیام پسند کیا ایک نے کہا "ہاں جی
آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔"
بیٹوں سے ذکر کرنے سے پہلے بیٹی کی اماں نے اپنے
ایک بھائی سے جن کا مکان اُن کے قریب ہی تھا
جن کا نام تھا عبدالکریم صاحب ذکر کیا تو انھوں نے
کہا میں تمھارے لڑکے کو دیکھوں گا چنانچہ مغرب کی نماز کے
بعد وہ محلہ کی مسجد کے پاس کھڑے ہو گئے تاکہ نماز پڑھ کر جانے
والے ایک ایک نمازی میں بتائے ہوئے حلیے کے لڑکے
کو دیکھیں مگر اُس شام کو وہ نہ دیکھ سکے۔ دوسری رات کو
انھوں نے بہن سے کہا آج بھی لڑکے کو مسجد سے نکلتے نہیں
دیکھا اب کل اور جاؤں گا۔"
اور وہ کل جب آئی تو موکھے میں سے تقاضہ ہوا کہ
"لاؤ جواب" مولوی شاہ عبدالرحیم صاحب کی بیوہ نے کہا۔
"بڑی اُستانی جی دو دن کی مہلت اور دیجئے پرسوں
عرض کروں گی۔"
سہ پہر کو یہ گفتگو ہوئی اور مغرب کی نماز کے وقت
سید عبدالکریم صاحب پھر محلہ کی مسجد میں! جب نمازی
ایک ایک کرکے جانے لگے تو جس حلیہ کا لڑکا بتایا گیا تھا
اُسے دیکھ لیا اور گھر آکر بہن سے کہا۔
"لو اب تم اللہ کا نام لے کر نھی کی شادی کر دو۔
میں نے لڑکے کو دیکھ لیا ہے اس کی آنکھوں میں حیا اور
شرافت ہے۔"
موکھے میں سے باتیں تیسرے پہر ہوا کرتی تھیں جب
ہوئی تو بڑی اُستانی جی نے بہو کی پڑوسن سے کہا۔
"آج میں کھاری باؤلی جا رہی ہوں اب تم ہاں کر لو۔
تاکہ اطمینان سے چلی جاؤں۔"
اور بیٹی کی ماں نے کہا۔
"بڑی اُستانی جی آپ کی بات میں نہیں ٹال سکتی۔"
ساس بہو دونوں کی آنکھوں میں خوشی سے
آنسو آگئے۔

پھوپی حامدہ بیگم صاحبہ نے تحریر فرمایا تھا "بکھر
میں نے نہیں سنا کہ کیا باتیں ہوئیں کیونکہ موکھا اونچا تھا اور
میرا قد نیچا اور نہ مجھ کو ان باتوں میں لطف آ سکتا تھا۔ ہاں
مجھ کو یہ یاد ہے کہ تیسرے پہر جب میں دولھن کے گھر بھاگی
ہوئی دیکھنے گئی تو دولھن کی اماں نے میرے سامنے دسترخوان
بچھایا اور ناشتہ رکھا جس سے یہ ثابت ہوا کہ بات ٹھیر گئی
جب میں گھر آئی تو دادی اماں بڑی خوشی سے ہر ایک سے
کہہ رہی تھیں "ہم تو اپنے ابی میاں کی بات ٹھیرا آئے اور
میں بھی اڑ گئی کہ ہاں کروا کر جاؤں گی۔ اللہ اللہ کیسے شریف
لوگ تھے کہ ایک بزرگ بی بی کے کہنے کو نہ ٹالا۔"
(عصمت راشد الخیری نمبر)
پھوپی حامدہ بیگم مرحومہ نے اسی مضمون میں لکھا تھا۔
"مولوی نذیر احمد صاحب اور مولوی راشد الخیری
دونوں صاحبان اپنی اپنی شادی سے پہلے معمولی حیثیت
اور معمولی تعلیم کے اشخاص تھے جب ان بزرگوں کی شادیاں
ہوئیں تو یہ کچھ بھی نہ تھے سوائے شرافت خاندانی کے۔"
اور شادی کے حال میں تحریر فرمایا تھا۔

"آہ بھائی دولھا بنے تھے ایسے خوبصورت دولھا نے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس وقت بھی میری آنکھوں میں وہ نقشہ پھر رہا ہے۔ میں نے اور آپا زاہدہ بیگم نے آنچل ڈالا۔ دولھن کی پالکی میں بیٹھے۔ دادی اماں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ مگر بہت چھپ کر رو بھی لیتی تھیں۔ اپنے بیٹے کو یاد کر کے۔ یہی حال بہو کا تھا کہ ساس کی آنکھ بچی اور آنکھوں سے جلدی جلدی دوپٹے سے آنسو پونچھ لئے ہماری بھابی جہیز بہت سا لائیں"

ابا جان کی شادی کی اچکن میں نے بھی دیکھی اور دیکھی ہی نہیں پہنی تھی۔ عنابی مخمل کی تھی جس کی آب میں اٹھارہ انیس سال بعد بھی فرق نہ آیا تھا۔ میں ۹ سال کا تھا جب اسی اچکن میں سے میری اچکن بنی تھی اور میں نے دو تین سال عید۔ بقرعید اور شادی بیاہوں میں پہنی تھی

۲۲ رجمادی الثانی ۱۳۱۷ھ مطابق ۵ جنوری ۱۸۹۹ء کی صبح کو محمد عبدالراشد صاحب خلف حافظ عبدالواجد صاحب مرحوم کا عقد نکاح محترمہ نور فاطمہ عرف فاطمہ خانم صاحبہ بنت مولوی شاہ عبدالرحیم مرحوم سے حافظ سید محمد صاحب امام جامع مسجد نے پڑھایا مہر گیارہ ہزار روپے تھا۔

بلاوے ڈپٹی عبدالحامد صاحب نوشہ کے چچا کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔

جہیز

آپا راشدہ بیگم صاحبہ کا بیان ہے کہ چڑھاوا معمولی تھا ہاں وہ جھلنیاں جو دادا ابا کو ملی تھیں بہت شاندار تھیں۔ جہیز کی تفصیل آپا راشدہ بیگم نے یہ بتائی۔

گلے میں چمپا کلی۔ ٹیپ۔
کانوں میں سچے بالیاں۔
پاؤں میں چاندی کے چھلے۔ چوڑیاں جھانجن۔
۲ انگوٹھیاں۔

برتن۔ ۲۰۰ تانبے کے۔ ۱۰۰ چینی کے برتن دو بہرے تھے۔ مثلاً پٹاریاں ۲ سلپچیاں ۲۔ بڑے بھگونے اور چھوٹے پتیلے۔ علاوہ پتیلیوں کے۔

۴۱ جوڑے تھے جن میں ۲۵ بڑے یعنی ڈھیلے پائنچوں کے تھے فرشی جو ہاتھ سے پکڑے جاتے تھے۔ اور باقی تنگ پاجامے۔ دو دو رضائیاں دلائیاں چھپر کھٹ تانبے کا۔

جب والدہ مرحومہ علی گڑھ میں والد مرحوم کے ساتھ تھیں اس زمانہ میں سب برتن اور کچھ زیور بھی بک گیا تھا۔

وہی چھپر کھٹ آپا راشدہ بیگم کو جہیز میں دیا گیا تھا ۱۹۱۵ء میں پھر جب واجدہ بیگم کی شادی کا وقت آیا تو آپا راشدہ سے خرید کر واجدہ بیگم کو جہیز میں دیا گیا ۱۹۲۷ء میں۔

چھپر کھٹ ۱۹۴۷ء میں میں نے اپنی بڑی لڑکی رازقہ کے لیے واجدہ بیگم سے خرید لیا تھا مگر کراچی ہجرت کرنی پڑی اور چھپر کھٹ کراچی پہنچا بھی تو بہت خستہ خراب حالت میں۔

۱۹۴۳ء میں اماں جان کی رحلت پر میں نے عصمت میں جو مضمون لکھا تھا اس موقعہ پر اس کی چند سطریں نقل کرنی مناسب ہوں گی۔

"وہ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئی تھیں اور ابھی سات آٹھ سال کی تھیں کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئیں ان کی والدہ ایسی دین دار عورت تھیں کہ اپنا سارا زیور خانۂ خدا کی تعمیر کے لئے دے دیا۔ دردمندی کی یہ کیفیت تھی کہ کنبہ کی دکھیاریاں ہر تکلیف اور پریشانی میں انھیں کے دامن میں پناہ لیتی تھیں۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ عورت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے لئے نہیں کام کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے ان خیالات اور اس طبیعت کی ماں سے

بلند ہوا کہ مصنف کے افسر اعلیٰ نے ایک موقع پر لکھا۔

He has lately turned his hand towards novel writing and bids us farewel to achieve distinction as a writer of urdu fiction

اب جہاں علمی شوق اور ادبی ذوق ترقی کر رہا تھا۔ وہاں میل جول سے نفرت ہو رہی تھی۔ دفتر کے کمرے میں تنہا بیٹھ کر دروازے بند کر لیتے اور اپنے خیالات میں اس طرح منہمک ہو جاتے کہ چپراسی اور کلرک چیختے اور خبر نہ ہوتی۔

ایک دفعہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مہتمم بندوبست علی گڑھ ساڑھے نو بجے کے قریب دفتر آیا اور اس کو کئی منٹ دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اس کے مزاج میں مذاق تھا۔ اس نے ایک موقع پر جب خزانچی پہلی تاریخ کو رخصت جا رہا تھا تنخواہ کی تقسیم کا کام اُن کے سپرد کر دیا ہزاروں روپیہ اور سینکڑوں آدمی۔ چار بجے وہ روپیہ لائے اور آدمیوں کی صورت دیکھ کر کچھ ایسی وحشت ہوئی کہ اندر سے کمرہ بند کر خاموش بیٹھ گئے۔ لوگوں نے چلانا شروع کیا۔ تو دوسرے دروازے سے روپیہ اور استعفیٰ لے کر افسر کے پاس پہنچے وہ سمجھ گیا اور روپیہ دوسرے آدمی کے سپرد کیا۔

علامہ مغفور کے ذاتی اوصاف میں ایک بڑی چیز خودداری تھی جسے انھوں نے ملازمت میں بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ علی گڑھ میں بندوبست کا دفتر سوسائٹی کی عمارت میں تھا اور علامہ مغفور کا وقت زیادہ تر کالج میں بسر ہوتا تھا۔ ایک موقع پر اسسٹنٹ مہتمم بندوبست نے شام کو بلایا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مین پوری کا تبادلہ اس ریمارک کے ساتھ ہوا کہ "اس شخص کی چھٹیوں کے دن کام کے دنوں سے زیادہ ہیں"

بقول مولانا عبدالغفار صاحب۔

"بھائی ابّی ملازمت کے لئے خلق ہی نہ ہوئے تھے"۔ عمر بھر کوئی نوکری نہ کی۔ اپنے والد مرحوم کی طرح ایک چھوڑتے دوسری کرتے پھر چھٹیاں لیتے اور بالآخر چھوڑ دیتے۔ سکول میں جو مضامین پڑھائے جاتے تھے ان میں ریاضی وہ مضمون تھا جس میں اُن کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ ملازمت میں بھی جب حساب کتاب کا کام کرنا پڑتا تو جی کس طرح لگ سکتا تھا۔

اُن کے چچا ابا نے نائب تحصیلدار کروا دیا تھا گھوڑے کی سواری اچھی جانتے تھے مگر اتفاق کی بات سرکاری کام سے جا رہے تھے کہ گھوڑے پر سے گر گئے۔ اور سخت چوٹ آئی۔ نوکری چھوڑ دی اور پھر کبھی گھوڑے پر نہیں بیٹھے۔ آپا راشدہ کا بیان ہے کہ ابا نے مجھ سے کہا تھا کہ

"میں بہت جلد ڈپٹی کلکٹر ہو جاتا مگر میں نے ڈپٹی کلکٹری پر تھوک دیا"

آخری ملازمت کے بارے میں مُلّا محمد واحدی صاحب لکھتے ہیں۔

"مولانا ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف کے دفتر میں سب آڈیٹر تھے۔ دو اور دو چار اور چار اور چار آٹھ گننے سے انھیں مطلق مناسبت نہ تھی۔ شیخ عبدالقادر صاحب کی تجویز پر ملازمت چھوڑ دی"

(رخصت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر)

باب پانچواں — ادبی زندگی کے ابتدائی دس سال

۱۸۹۵ء تا ۱۹۰۵ء

ادبی زندگی کا آغاز

علامہ مغفور نے آنکھ کھولی ایسے گھر میں جہاں دن رات قرآن و حدیث کا چرچا تھا۔ چھوٹے اور بڑے اُن لوگوں میں جو خدا کے خوف سے کانپتے اور رسول اکرم کے نام کے عاشق تھے۔ مولویوں کے اس خاندان کے سوا اگرچہ علماء رہتے تو علم و فضل میں عورتوں کا درجہ بھی بلند تھا۔ دن رات علامہ مغفور کے کان میں دینی باتیں پڑتی رہتی تھیں اس لئے مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق اور آگے جا کر خاندانی مولوی ہی نہیں بلکہ جیسی کہ ان کی دادی کی خواہش تھی سچ مچ عالم اور واعظ پھر ادیب بن جانا ذرا تعجب انگیز نہیں۔ لڑکپن سے اپنے پھوپی زاد بھائی مولوی اشرف حسین صاحب کی صحبت میں اُن کا وقت زیادہ گزرتا تھا۔ دس سال عمر میں بڑے تھے اور جب علامہ مغفور نویں جماعت میں تھے تو وہ بی اے میں۔ والد مغفور فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اشرف حسین جب بی اے میں تھے تو فلسفہ اور فارسی کے ایم اے کے لڑکے ان سے اپنی مشکلات حل کیا کرتے تھے۔ ان ہی کے متعلق تو عناصر اربعہ میں لکھا تھا کہ اپنے استاد مولانا حالی کے متعلق بھی ان کی رائے یہ تھی کہ شعر جتنا اچھا سمجھتے ہیں اتنا اچھا کہتے نہیں۔ علمی و ادبی ذوق انھیں مولوی اشرف حسین مرحوم کی صحبت میں پیدا ہوا اور پھر قابلیت میں چار چاند لگے مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کی شاگردی میں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ صالحات علامہ مغفور کی پہلی تصنیف ہے مگر خود صالحات ہی کے دیباچہ سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے علامہ مغفور نے ایک عشقیہ ناول احسن و دیموہ لکھا تھا مگر اپنے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی ناراضگی کی وجہ سے ضائع کر دیا۔ اس داستان کو مولوی محمد احسن صاحب وکیل[1] نے جنھیں علی گڑھ میں ۱۹۰۲ء میں ایک ہی گھر میں علامہ مغفور کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تھا اس طرح بیان کیا ہے۔

"سب سے پہلی تصنیف ایک عشقیہ ناول احسن و دیموہ تھا جو "روہیل کھنڈ گزٹ" بریلی میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ جب ایک حصہ پورا ہو گیا تو اپنے پھوپھا شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کو اس امید میں دکھایا کہ داد ملے گی۔ مگر بجائے داد ملنے کے اُلٹی ڈانٹ پڑی اور انھوں نے بہت برا بھلا کہا کہ تم کو اگر تصنیف کا شوق ہے تو میرا تتبع کرو۔ میرا بھتیجا اور ایسی مخرب اخلاق کتاب کا مصنف۔ مولانا نے دہلی سے واپس آ کر اس کتاب کے تمام مسودات اور دوسرا حصہ جو اخبار مذکور کو بھیجنے کے واسطے لکھا تھا حوالۂ آتش کر دیا۔ اب اخبار سے تقاضے آنے شروع ہوئے مگر مولانا نے جواب دے دیا۔ اس اخبار کی بکری جو اس دلچسپ ناول کی وجہ سے بہت بڑھ گئی تھی کم ہو گئی۔ اڈیٹر صاحب نے بڑے خوشامدانہ خط لکھے مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ بڑے بڑے لالچ دیئے مگر راضی نہ ہوئے جب زیادہ مجبور کیا اور ڈپٹی صاحب کی نصیحت کا حال لکھا تو [illegible]

---

[1] اقبال احمد صدیقی مؤلف کپڑوں کی چھپائی کے والد مرحوم۔

خود مصنف کا بیان اس تصنیف کے متعلق دیباچۂ صالحات آٹھواں اڈیشن صفحہ ۷۵ پر اس طرح ہے:-

"کچھ اوپر دو برس ہوئے۔ اس بڑے دن کی تقریب میں دوستوں کی صحبت سے دل شاد اور افکار دنیوی سے آزاد تھا۔ جہاں اور لطف و مذاق کی باتیں ہوتی تھیں کچھ زمانہ حال کے ناولوں کا چرچا ہوا۔ ہنسی کی پھبتی ہوئی تھی کہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔ دوستوں کی فرمائش پہلے ہی سے تھی کہ یہی اِدھر اُدھر کی باتیں جو تم بیان کرتے ہو اگر ایک قصہ کی صورت میں جمع کر دو تو اچھا ناول ہو جائے۔ اس مرتبہ مولوی صاحب نے بھی (جن کی شاگردی کا مجھکو فخر حاصل ہے) اس فرمائش کے پورا کرنے کی تاکید فرمائی۔ چھٹی ختم ہوئی۔ صحبت احباب کے خواب سے آنکھ کھلی تو وہی دفتر کی تیاری جو آگے تھی وہ اب بھی ہے۔ چھٹی کے بعد گھر سے واپس آکر ایک عرصہ تک تو یوں ہی جی اُچاٹ رہتا ہے۔ یہ تو کچھ منرکار کا اقبال کچھ نوکری کا خیال ہے جو پھر کام پر دل لگا دیتا ہے مگر کجا بندوبست کا کام کجا ناول کا سرانجام۔ تصنیف کے دشوار گذار میدان کو دیکھکر ہمت پست ہوئی جاتی تھی اور رستے کی تکالیف سے جی چھوٹا جاتا تھا مگر اُستاد کے حکم کی تعمیل فرض تھی۔ چار نہ چار تیار ہونا پڑا۔ ٹوٹے پھوٹے خیالات کا توشہ ساتھ لیا اور چل کھڑا ہوا۔ چند روز حیران و سرگرداں رہنے کے بعد ایک خطۂ گلزار نظر آیا جس کے ہر جانب بے شمار راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ سخنور اپنی اپنی محنت کے گلدستے ہاتھ میں لئے مختلف رستوں سے داخل ہو رہے تھے۔ ایک رستہ ایسا دکھائی دیا جو بالکل صاف تھا۔ اہل لائق دوستوں کے گروہ کا تانتا اُسی طرف بندھا ہوا تھا۔ وہی آسان معلوم ہوا۔ "احسن میمونہ" کا پشتارہ بغل میں دبا اُن ہی لوگوں کے پیچھے ہو لیا منزل پاس تھی اور راستہ صاف۔ دقت ہوئی نہ تکلیف۔ بہت جلد مسافت طے ہو گئی ہمراہیوں سے مل جل کر جی خوش ہوا۔ منزل پر پہنچ کر ہر ایک اپنا اپنا ذخیرہ دکھاتا تھا اور فخر و ناز کرتا تھا۔ اس پشتارے کو بھی دیکھا خوش ہوئے۔ تعریفیں کیں۔ دل بڑھایا۔ مگر افسوس جس کے حکم کی تعمیل تھی اُس کی خوشنودی نہ حاصل ہوئی۔ ناپسندیدگی کے ساتھ غیرت دلائی اور تعجب کے ساتھ فرمایا۔

راستہ غیروں کا تتبع کر کے اُس وطن کو بدنام کرتے ہو جس خاک نے کیسے کیسے لعل بے بہا اُگلے! کیا تمھارے ہاں کوئی اس لائق نہ تھا جو غیروں کو رہنما بنایا؟ ان کلمات کی وہ ندامت ہوئی کہ آج تک سر نہیں اُٹھتا۔ پھر اُسی میدان کی طرف نگاہ دوڑائی قابل ہموطن پیوند زمین ہو چکے تھے۔ مگر اُن کا نقش پا اس آب و تاب سے چمک رہا تھا کہ قیامت تک مٹائے نہ مٹے گا۔ رستہ سنسان تھا اور ہو کا میدان۔ راہ کٹھن تھی اور منزل کڑی۔ جرأت نہ ہوتی تھی کہ قدم رکھوں۔ مگر ارادہ مصمم تھا اور غیرت ہمراہ خدا کا نام لیا اور قدم بڑھایا"

حیات صالحہ یعنی صالحات کا دیباچہ اگر ۱۸۹۹ء میں لکھا گیا تھا تو "کچھ اوپر دو برس" کے معنی یہ ہوئے کہ ۱۸۹۷ء میں "احسن و میمونہ" روہیل کھنڈ گزٹ بریلی میں شائع ہونا شروع ہوا تھا اور مصنف نے بقیہ غیر مطبوعہ حصہ ضائع کر دیا تھا۔

صالحات اور منازل السائرہ

"احسن و میمونہ" کی تصنیف سے مصنف کے استاد ناراض ہو گئے تو پھر۔

"رستہ سنسان تھا اور ہو کا میدان۔ راہ کٹھن تھی اور منزل کڑی۔ منزل کی دشواریوں نے اکثر جگہ بیدل کیا بیسیوں ٹھوکریں کھائیں اور سینکڑوں ٹیلوں سے پیر پھسلا۔ ہزاروں نشیب و فراز دیکھے مگر کارساز حقیقی نے ہر حال میں دستگیری کی۔ اُستاد کی آن جان کے ساتھ تھی۔ صبح یا شام کہیں مقام نہ کیا۔ اس دن رات کی محنت اور مسافت کا سرمایہ کل کا نتیجہ

۔۔۔ حیات صالحہ ہے جو صالحات کے نام سے
۔۔۔ ہوئی ہے۔"
صالحات کے تیسرے اڈیشن کا ایک ناممکل نسخہ
۔۔۔ تھا۔ دیباچہ کئی بار پڑھا تھا۔ مگر سمجھ میں نہ آتا
۔۔۔ احسن و میمونہ کا پشتارہ بغل میں دبایا اور ان ہی
۔۔۔ نے پیچھے ہو لیا" کا کیا مطلب تھا استاد کون تھے
۔۔۔ س کیوں ہوئے تھے۔ غالباً ۱۹۳۰ء میں مصنف سے
۔۔۔ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے۔
"سب سے پہلے میں نے ایک فضول سا قصہ احسن
۔۔۔ لکھا تھا جو دہلی کے ایک اخبار میں چھپتا تھا۔ بڑے
۔۔۔ بابا کو معلوم ہوا تو بہت خفا ہوئے کہ ایسے لغو قصے لکھتے
ہو۔ جیسی کتابیں میں لکھتا ہوں ایسی کیوں نہیں لکھتے۔
میں نے مراۃ العروس توبۃ النصوح کا مطالعہ کیا تو خیال پیدا
ہوا ایسی کتابیں لکھنی کون سی بڑی بات ہے۔ میں بھی لکھ
سکتا ہوں۔ چنانچہ صالحات شروع کر دی جب بڑے
پھوپا ابا نے صالحات دیکھی تو بہت خوش ہوئے"

عصمت جولائی ۱۹۴۰ء

صالحات مصنف نے ۲۷-۲۸ سال کی عمر میں لکھی
تھی اس حساب سے ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء میں ختم کی مگر اس کی
طباعت میں بہت وقت لگا مرحوم محمد احسن صاحب
وکیل لکھتے ہیں:-

"یہ کتاب افضل المطابع دہلی میں طبع ہوئی۔ اس
کتاب کے طبع ہونے کے دوران میں مالک مطبع نے مولانا مرحوم
سے کہا کہ تمہاری کتاب نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ کاتب۔
مصحح کنندہ۔ مقابلہ کنندہ۔ سب روتے ہیں۔ اور بعض اوقات
ایک ایک ورق کو لکھنے میں دن دن بھر گزر جاتا ہے۔ جب
جی بھر کر رو لیتے ہیں۔ پھر آگے لکھنا شروع کرتے ہیں۔ اس

وجہ سے اشاعت میں دیر ہو رہی ہے"

عصمت فروری ۱۹۳۹ء

یہ داستان مشہور اہل قلم جناب ضیاء الحق ۔۔۔
نے بھی انگریزی اخبار بمبئی کرانیکل میں لکھی تھی۔
"ایک موقعہ پر مولانا نے مجھے اپنی اس تصنیف کے
متعلق چند باتیں بتائیں جو یہاں قابل ذکر ہیں۔
تصنیف کی تکمیل کے بعد وہ ایک ناشر کے پاس لے
گئے۔ اس نے یہ کتاب پڑھنے کے لئے رکھ لی اور کہا آپ مجھ سے
کچھ دن بعد ملئے۔ جب مولانا اس سے ملے تو وہ کہنے لگا۔
میاں تم نے کچھ اچھی کتاب نہیں لکھی۔ مگر میں اسے چھاپ
دوں گا اگرچہ مجھے بہت سے مصارف برداشت کرنے پڑیں گے
مگر میں تم کو پچاس روپیہ سے زیادہ نہیں دوں گا۔ تم ابھی
بچے ہو یہ نہیں جانتے کہ اس کو بیچنے کے لئے مجھے کتنا روپیہ
لگانا پڑے گا۔ مولانا راضی ہو گئے۔ لیکن ناشر نے صرف
پچیس ہی بڑھانے چاہے اور آخر میں یہ کہہ کر فروخت ابھی
نہیں ہوئی کل ہم سولہ روپے دئے۔ ناشر نے اپنی ہوشیاری
سے سولہ روپیہ کے عوض تمام حقوق اپنے نام محفوظ کرا لئے تھے۔"
ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے جو "احسن و میمونہ"
دیکھ کر ناراض ہوئے تھے۔ "حیات صالحہ" دیکھ کر خوش
ہوئے اور فرمایا۔
"اپنی کتابوں کے علاوہ قصص میں یہ پہلی کتاب ہے
جو میں نے شروع سے آخر تک پڑھی ہے اگر مجھ کو یقین کامل
نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ صالحات میری لکھی ہوئی ہے اور
مسودہ چوری گیا۔"
حضرت علامہ مغفور کے دوسرے استاد مولانا
حالی نے بھی حیات صالحہ کی تصنیف پر حوصلہ افزا الفاظ
فرمائے تھے۔

۱۹۱۲ء میں جب تیسری دفعہ اس کتاب کی چھپائی ختم ہوگئی تو ۹ صفحوں کی ایک کاپی ضائع ہوگئی تھی پبلشر صاحب کو پہلے اور دوسرے اڈیشن کا (جو غالباً دو سال بعد شائع ہوا تھا) کوئی نسخہ انتہائی تلاش و کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہوا تو مصنف سے دوبارہ لکھوانے کی کوششیں کیں اور ۹ صفحہ کا معاوضہ سو روپیہ تک لگائے مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے۔ آخر ۱۹۲۹ء میں راقم الحروف نے اس کتاب کا کاپی رائٹ چار سو روپے دے کر واپس لیا اور ۱۹۳۲ء میں مصنف نے اپنی کتاب پر نظر ثانی کی تو کہیں کہیں لفظی تبدیلی کردی۔ علامہ مغفور اکثر امام غزالی کی احیاء العلوم کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے اور جیسا کہ محمد احسن صاحب وکیل نے تحریر فرمایا تھا قران مجید کے ایک ایک لفظ پر غور فرماتے اور تفاسیر دیر دیر تک دیکھا کرتے تھے مقدمہ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ۵-۶ صفحہ کا تھا اور مولویانہ رنگ اور فلسفیانہ انداز میں لکھا گیا تھا جو ۱۹۳۲ء میں نظر ثانی کرتے وقت خارج کر دیا تھا۔

خدا بخشے مولوی محمد ظفر مرحوم وکیل، مشہور اہل قلم صالحات سے بہت متاثر تھے۔ ان کے پاس دوسرے اڈیشن کا ایک نسخہ موجود تھا۔ اس پر علامہ مغفور نے ۱۹۳۲ء میں نظر ثانی فرمائی تھی۔

(عصمت جولائی ۱۹۳۷ء)

مولوی محمد احسن صاحب وکیل کا بیان حیات صالحہ کے بارے میں اوپر نقل ہو چکا ہے۔ منازل السائرہ کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون میں یوں کیا ہے۔

"مولانا نے ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے رنگ میں منازل السائرہ لکھی جو علی گڈھ میں میرے مصارف سے طبع ہوئی۔ اور میرے ہی ذریعہ فروخت ہوئی۔ مولوی ممتاز علی مرحوم منیجر تہذیب نسواں نے عجیب و غریب ریویو لکھا جس کا ایک فقرہ یاد ہے کہ یہ کتاب مراۃ العروس بنات النعش توبۃ النصوح کا لب لباب ہے۔ دیگر اخبارات میں دھوم مچ گئی۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولوی بہادر علی ایم۔اے جو تعلیم نسواں کے اس زمانہ میں بڑے حامی تھے۔ سید کرامت حسین صاحب جج ہائی کورٹ اور شیخ عبد القادر اڈیٹر مخزن نے تعریفی خطوط بھیجے۔ ڈپٹی نذیر احمد اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا مجھے امید ہے میرا بھتیجہ میرا نام میرے بعد قائم رکھے گا۔ اس کتاب کا دو تین ہی مہینہ میں پہلا اڈیشن ختم ہو گیا"

(عصمت فروری ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۰۰)

منازل السائرہ ۱۸۹۷ء یا ۱۸۹۸ء میں لکھنی شروع کی تھی زیادہ سے زیادہ ۳۰ سال کی عمر میں مگر شائع ہوئی۔ ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء میں کیونکہ محمد احسن صاحب وکیل جنھوں نے علی گڈھ میں اپنے مصارف سے طبع کرائی اور فروخت کی۔ ان کا اور مصنف کا ساتھ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء میں ایک ہی گھر میں دو سال رہا تھا۔ منازل السائرہ کا دوسرا اڈیشن شیخ عبد القادر مرحوم اڈیٹر مخزن نے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا تھا اور اس ناول ہی کی وجہ سے انھیں "اُردو کا چارلس ڈکنز" کا خطاب دیا تھا شیخ صاحب کی رائے کا خلاصہ یہ ہے:-

"منازلُ السّائرہ مولوی صاحب کے مشہور طرز تحریر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ مولوی نذیر احمد کی کتب کے بعد منازل السائرہ ہی ان کے ڈھنگ پر ایسی کتاب لکھی گئی ہے جس کا مطالعہ خاص مستورات کے لئے مفید ثابت ہوگا۔"

اس دوسرے اڈیشن کی ضخامت ۲۲×۱۸ کے تین سو صفحات کے قریب تھی اور خاص اہتمام سے شائع کیا گیا تھا کاغذ ولائتی چکنا اعلیٰ درجہ کا دبیز۔ ٹائیٹل بہت موٹا خوب صورت سرخ اس پر کتاب اور مصنف کا نام سنہرے حروف میں تھا۔ شیخ صاحب موصوف کے دنیا سے جانے اور ایسی

کے بعض حصوں کی مصروفیات کی وجہ سے منازل السائرہ آٹھ دس سال تک پھر نہ چھپ سکی۔ [illegible] میں واحدی صاحب نے اس کے حقوق اشاعت حاصل کئے تو مصنف نے نظر ثانی کرتے وقت یہ ترمیم کی کہ ابواب کے جو عنوانات پہلے ایڈیشن میں تھے وہ سب نکال دیئے۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مقدمہ یا دیباچہ بھی تھا یا نہ تھا بہرحال اگر تھا تو وہ بھی نکال دیا گیا تھا۔ واحدی صاحب نے تیسرا ایڈیشن شائع کیا تو کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ حصہ اول میں سائرہ کی پیدائش سے کنوارپنے کے حالات اور حصہ دوم میں شادی سے موت تک کے واقعات۔ یہ اصلاحی ناول [illegible] مرتبہ شائع ہو چکا تھا کہ حضرت مصنف کی رحلت کے بعد میں نے اس کے حقوق اشاعت واپس لے لئے۔

بی بی رشید الزمانی کی وقعت سسرال میں

بی بی رشید الزمانی یعنی اپنی والدہ مرحومہ کے حالات زندگی سے علامہ مغفور بہت متاثر تھے۔ پہلی بدنصیبی تو دادی اماں مرحومہ کی یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے قیامت برپا کر دی اور ان کے والد کی حویلی وغیرہ لٹ گئی۔ اور مالی حالت بگڑ گئی۔ دوسری یہ کہ شادی ہوئی تو میاں بیوی کے دل نہ ملے تیسری یہ کہ جوانی ہی میں سہاگ اُجڑ گیا۔ عیش انھوں نے دیکھا ہی نہیں مگر اللہ بخشے دادی اماں مرحومہ بڑی سمجھدار خاتون تھیں ساس کے بکھیڑے سے وہ دور نہ رہیں۔ جب ساس ہی نے ان کے لئے الگ مکان کا انتظام کیا اُس وقت وہ کلاں محل گئیں ورنہ ساس کے پاس ہی بیوگی کا وقت بھی کاٹ رہی تھیں یہی وجہ ہے کہ علامہ مغفور کا بچپن ہی نہیں لڑکپن بھی کھاری باولی یعنی ان کی ددھیال میں گزرا اور وہیں سن شعور کو پہنچے۔ بیوگی کا دوسرا یا تیسرا سال تھا بی بی رشید الزمانی پان بنا رہی تھیں بڑی اُستانی جی (ان کی ساس) نے دیکھ لیا آدھا پان تھا۔ وہ بنا چکی اور منہ میں رکھ رہی تھیں کہ ساس کا دھموکا پیٹھ پر پڑا ان الفاظ کے ساتھ

"آدھا پان کھانے کی تمہاری اوقات ہے"

پھر بہت روئیں۔ جوان مرگ بیٹے کو یاد کر کے روتی رہیں زار و قطار اور بہو سے کہا۔

"آج کو جمالا زندہ ہوتے تو آدھا نہیں پورا پان کھاتیں۔"

اس واقعے کے بعد جب تک دادی اماں زندہ رہیں۔ اُنھوں نے ہمیشہ ایک پان کے چار ٹکڑے کئے اور چار دفعہ کر کے ایک پان کھایا۔ آدھا پان کبھی نہیں کھایا ہاں اپنے بیٹے "ابّی میاں" کو پورا پان دیتی تھیں۔

بڑی اُستانی جی آخر میں فالج زدہ تھیں تیسرے چوتھے مہینے بیوہ بہو کے پاس آیا کرتی تھیں۔ ڈولی مکان کے اندر پلنگ کے پاس آ کر لگتی تھی۔ پست بہو کے جہیز کی چوکی اور گونڈا وہیں رکھ دیا جاتا۔ بی بی رشید الزمانی مرحومہ کوٹھا باہرے جا کر رکھتی تھیں۔ بھنگن دالان میں نہ آ سکتی تھی۔

بڑی اُستانی جی مرحومہ جب بیوہ بہو کے پاس آتیں تو پوتی یا پوتے بہو کے ساتھ کھانا نہ کھاتی تھیں بلکہ دادی اماں اپنی ہنڈیا میں ہی اُن کے لئے پکاتی تھیں۔ جب بڑی دادی اماں کھا لیتی تھیں اس کے بعد اُن کی بہو کھاتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنی ساس کے ساتھ کبھی نہیں کھایا۔ بڑی دادی اماں بیٹے کے دسترخوان پر نہیں بیٹھی تھیں۔ سب سے پہلے اُن کا کھانا نکل کر سینی میں آتا اور ان کے تخت پر رکھا جاتا تھا۔

بی بی رشید الزمانی رانڈ تھیں اور امیر آدمی بھی نہ تھیں مگر محلہ سمدھیانہ سسرال سب پر ان کا رعب تھا۔

بڑی باوقار خاتون تھیں۔ ان کے بڑے نصوعلی ڈپٹی نذیر احمد مرحوم حیدرآباد دکن سے آتے تو ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اُن کی بیٹی پھوپی صغرا بیگم مرحومہ حیدرآباد دکن سے آتیں تو سب سے پہلے بی بی رشید الزمانی کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور کہتیں کہ ممانی جان میں کھاری باولی سے واپس آؤں گی تو چند روز کے لئے میرے پاس ضرور آیئے۔" چنانچہ وہ دو تین دن کے لئے اُن کے ہاں چلی جاتی تھیں۔ اُن کے بھائی مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم دلّی آتے تو وہ بھی دوسرے ہی دن ممانی کے سلام کو آیا کرتے اور علامہ مغفور سے چونکہ ۵۔۶ سال بڑے تھے اس لئے اُن پر خفا ہوا کرتے تھے کہ میں بڑا ہو کر آتا ہوں اور تمھیں توفیق نہیں ہوتی کہ میرے پاس آؤ۔" علامہ مغفور کو میں نے خود دیکھا ہے کہ اپنے ان پھوپی زاد بھائی سے بہت ادب سے گفتگو کرتے اور کہتے حاضر ہوں گا۔ بہت اچھا۔ جی ہاں۔ بہت بہتر۔ بڑے آپا مرحوم والدۂ مرحومہ سے بہت شفقت سے باتیں کرتے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ان کی سلیقہ شعاری کی تعریف کرتے خود پان مانگتے۔ دوسری نند کے بڑے بیٹے مولوی اشرف حسین صاحب پردیس سے جب دلّی آتے تو اپنی ان ممانی کے آداب کو آیا کرتے تھے بی بی رشید الزمانی مرحومہ کے پاس اُن کی نندیں اکثر آیا کرتیں اور گھنٹوں اُن سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ خاندان کے معاملات میں یہ ممکن نہ تھا کہ بی بی رشید الزمانی کا مشورہ شریک نہ ہوتا۔ ان کی رائے بہت وزنی ہوتی تھی۔ وہ بیوہ تھیں مگر اُن کی ساس چونکہ اُن سے بہت محبت کرتیں اور ان کا بہت خیال رکھتی تھیں اس لئے سسرال میں ان کی وقعت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بڑی اُستانی جی بہو پر خود خفا ہوتیں نصیحتاں بھی کرتیں مگر یہ گوارا نہ کر سکتی تھیں کہ ان کی بیوہ بہو کے خلاف ایک لفظ بھی کسی کی زبان سے نکلے وہ جب فالج کی حالت میں بھی بہو کے پاس آتی تھیں تو اُن کی اولاد اور اولاد کے بچوں میں کسی کی مجال ہو سکتی تھی کہ اُن کی طرف سے تغافل برتے۔

آپا راشدہ کی پیدائش

سنہ۱۸۹۱ء میں آٹھ ماہ کا مرا ہوا لڑکا ہوا تھا۔

سنہ۹۲ء یا سنہ۹۳ء میں دوسرا لڑکا ہوا اور پندرہ دن بعد گزر گیا۔ وہ نو دس دن کا تھا کہ والدہ مرحومہ نے تربوز کھا لیا تھا۔ بچہ گزر گیا تو آپا راشدہ کا بیان ہے کہ آپا کی ننھیال اماں کے سر ہو گئی کہ تم نے کیوں احتیاط نہیں کی۔ تمھاری بد احتیاطی سے بچہ مرا ہے۔ اماں نے تربوز اس کے بعد بہت کم کھایا جب بچوں کو دودھ پلاتیں اس زمانہ میں گھر میں آتا ہی نہ تھا اور یوں بھی آپا کو زیادہ پسند نہ تھا۔ ساری فصل میں ایک یا دو دفعہ آتا تھا حالانکہ خربوزے روز آتے تھے۔ دادی اماں پیر جی محمد عمر ایک بزرگ کی معتقد تھیں۔ وہ اکثر تشریف لایا کرتے اور وہ اور اماں اگر کوئی خواب دیکھتیں تو اُن سے تعبیر لیا کرتی تھیں۔ دادی اماں کی بھاوج کے ایک بھانجے تھے پیر جی جمشید۔ دادی اماں کو بہت فکر تھی کہ شادی کو ۷ سال ہو گئے ابّی میاں کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ انھوں نے پیر جی محمد عمر سے دعا کے لئے کہا اور پیر جی جمشید کا ذکر بھی کیا۔ اُنھوں نے کہا میری اُن سے ملاقات کرا دو۔ پیر جی محمد عمر نورانی صورت کے معمر بزرگ تھے اور پیر جی جمشید جوان مگر پیر جی محمد عمر ان کی ملاقات سے بہت متاثر ہوئے اور کہا تم صوفی جمشید سے دولھن کا علاج کرواؤ۔ بہت عالم شخص ہے۔ چنانچہ دادی اماں نے صوفی جمشید سے بہو کے علاج کو کہا۔ صوفی صاحب بولے۔

...تے ہیں آپ ملی بہو کو دیکھ لیں۔ چنانچہ اماں گئیں اور
... واپ کیا انھوں نے چند روز بعد گنڈہ تعویذ
... مدت بعد جب انھیں معلوم ہوا کہ بچہ ہونے والا
... کا ایک چراغ بنوایا۔ یہ چراغ مجھے بھی یاد
... تھا تقریباً ۹ انچ کے چاروں کنارے تھے
... دن پر اسرافیل۔ میکائیل۔ جبرئیل کندہ کیا گیا تھا
... نقش تھا جہاں دو کنارے ملتے تھے وہاں گڑھا سا
... چاروں کونوں پر بتی رکھنے کے لئے۔ ہدایت یہ تھی کہ
... بچہ کی پیدائش میں ایک ماہ رہ جائے تو تیل ڈال کر
... رات جلا دی جائے اور بہو پلنگ پر لیٹیں تو
...غ کی طرف ان کا منہ ہو۔

ولادت کے ہر موقع پر چراغ پر ایک پیسہ کی تنی ہوتی تھی ہر رات ایک بتی اور ہر دسویں دن چلّے تک چاروں بتیاں جلتی تھیں اور بچہ کا منہ چراغ کی طرف ہوتا تھا۔

یہ سب بیان آپا راشدہ کا ہے انھوں نے بتایا کہ اماں کا یہ علاج صوفی جمشید نے پیر جی محمد عمر کے مشورہ سے کیا۔ مجھے تو یہ صرف لکھنا ہے کہ آپا راشدہ اپریل [illegible] میں پیدا ہوئیں۔ البتہ اس علاج کے سلسلہ میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ علامہ مغفور تعویذ گنڈے کے قائل نہ تھے۔ گو اُن کے دادا مولوی عبدالقادر صاحب بھی شہر میں اس روحانی علاج کے لئے مشہور تھے۔ دادی اماں نے یہ علاج بیٹے کی لاعلمی میں کیا لیکن چراغ تو سب کو ہی جلتا نظر آتا تھا اور اس پر علامہ مغفور اور ان کی رفیقہ حیات میں کئی دفعہ جھک جھک بھی ہوئی اور والدہ معظمہ نے فرمایا "اس میں تمھارا حرج ہی کیا ہے مٹی کا دیا نہ جلا۔ تانبہ کا چراغ جل گیا۔ تیل تو اُتنا ہی خرچ ہوتا ہے۔"

اس زمانہ میں بجلی نہیں تھی۔ لالٹین۔ لیمپ چمنی کی ڈبیہ اور مٹی کے چراغ جلتے تھے۔

بی بی رشید النساء کا دوسرا سفر ریل

علامہ مغفور بسلسلہ ملازمت دلی سے باہر کئی شہروں میں رہے مگر تنہا۔ [illegible] میں جب دو سال ڈیڑھ سال کے ماں کی گود میں تھے تو ان کی والدہ مرحومہ بی بی رشید النساء اپنے بچے کے ساتھ ٹونڈلہ (آگرہ) اپنے شوہر کے پاس گئی تھیں وہ اُن کا ریل کا پہلا سفر تھا۔ تیس سال بعد [illegible] میں بہو اور پوتی کو لے کر بیٹے کے پاس میرٹھ گئیں کیونکہ بیٹے کو پردیس میں تنہائی کی تکلیف تھی۔ یہ خیال اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ حضرت والد مغفور میرٹھ میں تھے اور میرٹھ چھاؤنی میں اماں کے دو حقیقی بھائی فوج میں تھے اور وہ خبرگیری کر سکتے تھے چنانچہ وہ آٹھویں روز ہمیں کے پاس آتے رہتے تھے۔ دو ہفتے بعد بی بی رشید النساء۔ پھوپھا ابا میر عبدالعزیز کے ساتھ دلی واپس آگئیں۔ اور پھر پھوپھی اماں کو بھیج دیا دس پندرہ دن بعد اُن کا جی گھبرایا وہ دلی آگئیں تو ان کی بیٹی آپا مریم کو بھیج دیا جو ۱۰-۱۱ سال کی تھیں اس زمانہ میں اماں پھوپھا ابا سے پردہ کرتی تھیں مگر وہی میرٹھ اور اس کے بعد علی گڑھ لے جاتے تھے اور انھیں کے ساتھ دلی واپس آیا کرتی تھیں۔

میری پیدائش

دادی اماں والے گھر میں میری پیدائش ۲۸ ستمبر [illegible] کو پیر کو ہوئی۔ اماں کی سسرال کی دائی نجمی جو آپا کی پیدائش کے وقت تھی آپا کی اور میری پیدائش کے وقت بھی وہی لگی تھی۔ چار پانچ روز سے ہلکی جھڑی لگی ہوئی تھی اور بارش بھی ڈھلائی دھوئی کی تھی کہ چاروں طرف سے مکانوں کے

گرنے کی آوازیں چلی آرہی تھیں کیونکہ اُس زمانہ میں چونہ گچی کے پختہ مکانات کم ہوتے تھے۔ دادی اماں کا مکان بھی پختہ نہ تھا۔ دوسرے دن کہارکو بھیج کر کھاری باولی خبر کی گئی۔ تیسرے دن ابا کے چچا ابا ڈپٹی عبدالحامد صاحب کا پرچہ اور دو ڈولیاں آئیں۔ پرچہ دادی اماں کے نام تھا کہ بھابی تم سب فوراً آجاؤ۔ اگر تمھارے آنے میں دیر ہو تو ایک ڈولی روک کر دوسری ڈولی میں میاں ابّی کی دولھن اور دونوں بچّوں کو فوراً بھیج دو۔ یہ بارش نہیں طوفان ہے اور گھر کی حالت بہت مخدوش ہوگی۔ ابا گھر پر موجود تھے انھوں نے چچا کے ہاں جانا پسند نہیں کیا . . . .

. . . . . دادی اماں خفا ہوئیں تو وہ پہاڑ والی خالہ اماں کے ہاں چلے گئے اور دادی اماں نے ڈولی میں گدّے چاندنی۔ تکیہ بچھوا بہو اور ڈھائی سال کی پوتی اور تین دن کے پوتہ کو سوار کرکے ڈولی پر دو دو لحاف ڈال کھاری باولی بھیجا۔ چچا ابا صحن میں ٹہل رہے تھے جب ڈولی پہنچی انھوں نے خود بھتیج بہو کو اُتروایا۔ دالان میں انگیٹھی روشن کروادی۔ دادی اماں نے بیٹے اور بیٹی سے بہت کہا کہ کھاری باولی چلے چلو دیکھو کیسی محبت سے میاں عبدالحامد نے بلوایا ہے مگر بیٹے رضامند ہوئے نہ بیٹی۔ آخر دادی اماں خود بہو کے پاس شام کو چلی گئیں۔ رات گزر گئی صبح ہوئی بارش کسی طرح تھمنے کا کیا کم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جس کمرہ میں پھوپی اماں تھیں اُس کی چھت گری اور ان کا سال بھر کا بچہ امین گزر گیا۔ کھاری باولی خبر پہنچی۔ ڈپٹی عبدالحامد صاحب کو چچی اماں حمیدالنسا صاحبہ نے بھیجا وہ آئے پھوپی اماں پر بہت خفا ہوئے اور ابا پر بھی۔ بھتیجی کو ساتھ لے کر گئے اور دوسرے دن ابا کو بلوایا اور اُن پر بہت خفا ہوئے (ابا نے کبھی چچا ابا کو جواب نہیں دیا۔ چچا کو کیا کسی کو بھی جواب نہیں دیا) چچا کی طرف سے اُن کا دل صاف نہ تھا مگر چچی اماں مرحومہ کی ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے۔

کلّوبی کی سِتار

شیخ ناصر علی مرحوم کی گلی میں دادی اماں کا مکان تھا۔ ماموں مظفر احمد اُن کی بہن زاہدہ بیگم صاحبہ دونوں اُسی مکان میں اپنی اماں کے ساتھ رہتے تھے۔ کلاں محل کی طرف جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کو جو دوسری گلی تھی اُس میں ایک بی بی رہتی تھیں جو رنگ کالا ہونے کی وجہ سے کلّوبی کہلاتی تھیں۔ وہ پھوپی اماں کی بہن بنی ہوئی تھیں اور پھوپی اماں اُن کے ہاں وعظ بھی کہنے جاتی تھیں۔ سُنا ہے اُن کی آواز بہت اچھی تھی پھوپی اماں کے ساتھ جب وہ سلام پڑھتیں تو سماں بندھ جاتا تھا پھوپی اماں کا وعظ سنکر وہ بہت روتی تھیں۔ ایک دن جب سب چلے گئے اور صرف پھوپی اماں اور کلّوبی رہ گئیں اور کسی ضرورت سے اندر کوٹھڑی میں پھوپی اماں گئیں تو انھوں نے مچان پر ستار رکھا ہوا دیکھا بہت پوچھ گچھ کی تو بتایا کہ میرے شوہر کو شوق تھا انھوں نے مجھے سکھایا تھا۔ اُن کے بعد میں نے بجانا چھوڑ دیا۔ پھوپی اماں نے کہا "بھائی کو ستار کا بہت شوق ہے انھیں سناؤ تب بات ہے"۔ کلّوبی نے کہا "یہ تو نہیں ہو سکتا۔ میں انھیں کس طرح سُنا سکتی ہوں اور اب تو بالکل ہی چھوڑ چکی ہوں"۔ پھوپی اماں نے گھر آکر ابا سے ذکر کیا۔ اُنھیں اشتیاق ہوا۔ اپنی اماں سے کہا کلّوبی کا ستار سُنوا دیجیے۔ وہ خفا ہونے لگیں پھر ایک دن پہاڑ والی خالہ اماں کے ہاں گئے اور ان کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئے اور رونے لگے۔ اور وہ سر سہلانے لگیں پھر کہا "اپنی خالہ اماں بھولی تو ایک کام کردیں گی"۔ انھوں نے دریافت کیا تو کہا "اماں سے چل کر کہیے کہ کلّوبی سے ستار سنوا دیں"۔ پہاڑ والی

خالہ اماں دوسرے دن آئیں تو بہن سے کہا: "کیا حرج ہے
بی میاں کو ستار سنوا دو۔" دادی اماں نے کہا: "وہ غیر مرد کو آواز
کیسے سنا سکتی ہے۔" علامہ مغفور نے جواب دیا۔
"جب ناہید وعظ کہتی ہے تو گلی میں چلنے والے مرد اس کی
آواز سن کر گلی میں ٹھیر جاتے اور وعظ سنتے ہیں یا نہیں سنتے؟
علیٰ نیز دس میں آواز جاتی ہے یا نہیں جاتی؟ وہاں تو آواز
جائز ہے اور جو میں کلثوم کا ستار سن لوں گا تو غیر مرد ہوں
نا جائز ہوگا۔ یہ کیا بات ہوئی پھر وہ مجھ سے تو میں بھی سنا
سکتی بڑی ہیں۔" بہاڑ والی خالہ اماں نے کہا "ٹھیک تو
ہے اپنی میاں تین چار بچوں کے باپ ہیں وہ انھیں بھائی
کہتی ہیں۔ چلو ان سے چل کر کہیں۔" پھوپی اماں
اپنی والدہ اور خالہ کے ساتھ گئیں اور کلثوم نے وعدہ کرلیا
کہ کسی موقعہ پر ستار سنا دیں گی۔

بات آئی گئی ہوئی، دو ڈھائی ہفتے بعد علامہ مغفور
کے ماموں کی بڑی بیٹی (پھوپی کبیتی آرا بیگم مرحومہ) کی
شادی تھی۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے جب وداع ہوگئی
اور مہمان اپنے اپنے گھر چلے گئے تو علامہ مغفور نے اپنی
بہن سے کہا اب سنواؤ کلثوم کا ستار۔ پھوپی اماں نے
کلثوم سے کہا۔ انھوں نے کہا اچھا منگاؤ بڑے میاں کو بھیج کر
ستار آیا اور ایک بجے رات کے کلثوم نے ستار بجایا۔
مگر بغیر گائے۔ علامہ مغفور اور ان کے ماموں اوپر کو ٹھے
پر تھے نیچے ستار بج رہا تھا۔ کوئی گھنٹے سوا گھنٹہ بجا اور
علامہ مغفور سنتے رہے۔ جب ستار بند ہوا پھوپی اماں
اوپر آئیں تو ابا نے کہا: "کلثوم بہت اچھا ستار بجاتی
ہیں۔" پھوپی اماں نیچے دالان میں آئیں تو کلثوم نے کہا۔
"تمھارے بھائی اچھا ستار بجاتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں
ذرا یہ تو معلوم کرو میں نے بجایا کیا ہے؟" انھوں نے
اوپر جاکر اپنے بھائی سے کہا۔ انھوں نے جواب دیا: "سب
تو میں نہیں سمجھا دو تین چیزیں البتہ سمجھ میں آئیں اور
وہ یہ تھیں" انھوں نے تین مختلف غزلوں یا گانوں کا ایک
ایک مصرعہ لکھ دیا۔ پھوپی اماں وہ کاغذ کلثوم کے پاس
لائیں تو انھوں نے کہا: "بے شک یہی چیزیں تھیں۔"
ایک مصرعہ تھا۔

ارے او حسن زیبائی خدا جانے کہاں ہے تو

میں نے والد مغفور کو یہ گاتے ہوئے کئی بار سنا ہے۔

ارے او حسن زیبائی خدا جانے کہاں ہے تو
تیری صورت پہ مائل ہوں!
تیری آنکھوں کا گھائل ہوں
نہ تو نے شکل دکھلائی
خدا جانے کہاں ہے تو
خدا جانے کہاں ہے تو

ستار چھوڑ دیا

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد آپا راشدہ نے جب ان کی عمر
پانچ چھ سال تھی کوٹھری میں ستار دیکھ کر والد مرحوم
سے ضد کی کہ مجھے سنائیے۔ انھوں نے ٹالنا چاہا۔ مگر ضد
بڑھتی گئی۔ آپا نے فرش پر لیٹ کر ایڑیاں رگڑنی شروع
کیں اور رونے لگیں کہ نہیں میں تو ابھی سنوں گی۔ علامہ
مغفور نے بیٹی کی ضد پوری کردی۔ تھوڑی دیر ستار
بجایا مگر اس کے بعد ستار بجانا چھوڑ دیا۔ آپا راشدہ
کہتی ہیں ممکن ہے ابا کو یہ خیال آیا ہو کہ میں بیٹی کا باپ
ہوں۔ یہ شوق اچھا نہیں۔ ممکن ہے یہ خیال ہوا ہو کہ
لڑکی کو گانے اور ستار وغیرہ کا شوق نہ ہو جائے۔ بہرحال
اس واقعہ کے بعد ابا نے پھر ستار نہیں بجایا ہاں
بانسری زیادہ بجانے لگے۔

آپا راشدہ بیگم کی بسم اللہ

آپا راشدہ فرماتی ہیں "تمہارا اُس وقت عقیقہ بھی نہیں ہوا۔ ہوتا کس طرح۔ بارش کے طوفان میں تم پیدا ہوئے خلقِ خدا حیران پریشان تھی بارش نہیں خدا کا قہر تھا یست ہی ست پر سب کی جان تھی ہاں میری بسم اللہ دھوم دھام سے ہوئی۔" وہ بڑی بہن ہیں میں مان لیتا ہوں کہ انھوں نے بڑھا چڑھا کر اپنی بسم اللہ کے واقعات نہیں سُنائے۔ مگر وہ اس سے انکار نہیں کرسکتیں کہ اُنھیں اور ساجدہ مرحومہ کو (جو مجھ سے دو سال چھوٹی تھی) دادی اماں ایک ایک پیسہ دیتی تھیں اور مجھے دو پیسے۔ بھائی کا شرعی حق بہن سے دوگنا جو ہے:

آپا نے جو واقعات سنائے تھے میرے الفاظ میں وہ یہ ہیں۔

میں ساڑھے چار برس کی ہوگئی تو ابا علی گڈھ میں تھے۔ دادی اماں کھاری باولی بڑی دادی اماں کے پاس گئیں اور کہا "راشدہ اب ساڑھے چار برس کی ہوجائے گی آپ کہیں تو اب کے جمعہ کو اس کی بسم اللہ کردوں۔" ساس نے کہا "بوا بسم اللہ کرو۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ اپنی سمدھن کو ابھی سے بتادو اور عبدالحامد کو اور ابی میاں کے سالوں کو خط لکھوادو۔ ابی میاں تو اتوار کو آئیں گے ہی۔ انھیں معلوم ہوجائے گا۔" دادی اماں تیسرے پہر واپس آئیں اور سمدھن کے ہاں پہنچیں اور کہا "راشدہ ساڑھے چار برس کی ہوگئی آئندہ جمعہ کو تم کہو تو اس کی بسم اللہ ہوجائے۔"

نانی اماں "اللہ مبارک کرے۔ میں تو بہت غریب آدمی ہوں کیا کرسکتی ہوں۔"

دادی اماں "بہن تم کروگی تو سب کچھ۔ مگر جو تمہارا جی چاہے رکھنا تاکہ جہیز کے وقت کام آئے۔ مجھے اس وقت تم سے کچھ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

نانی اماں "بہن میں کیا اور میری اوقات کیا۔"

دادی اماں "تم کروگی وہی جو تمہارا جی چاہے گا۔ مگر مجھ سے مشورہ لے لینا۔"

دوسرے دن دادی اماں نے ماموؤں کو اور چچا ابا کو خط لکھوائے۔

جمعہ کو بسم اللہ ہوئی اِدھر سے چچا ابا اور چچی اماں آگئے تھے اُدھر سے منجھلے اور سنجھلے ماموں جان۔ بڑے اور گورے ماموں جان دلی ہی میں تھے۔ چھوٹے ماموں جان کو چھٹی نہیں ملی۔

آپا راشدہ کہتی ہیں اماں جی نے میری بسم اللہ پر یہ چیزیں دی تھیں۔

نانا ابا کا لایا ہوا ایک بہت خوب صورت لاہور کے چھوڑیے کا ٹکڑا تھا زعفرانی رنگ کا اس پر سبز دھاریاں تھیں۔ یہ تنگ پاجامے کے لئے تھا۔ سرخ بابل لیٹ کا دوپٹہ اور کُرتہ۔ یہ بغیر سلا جوڑا تھا اور میری شادی کے وقت سلا کر جہیز میں دیا گیا تھا۔ پکا جوڑا یعنی تیار شدہ سرخ ساٹن کا گرا ڈیل کا کرتہ اور سرخ رینگ کا دوپٹہ۔

دو تولہ کی ٹیپ۔ جوڑے کے ساتھ مٹھائی اور مہندی۔

رحل۔ قاعدہ مع جزدان ٹکا ہوا۔ سرخ سوزنی۔

دادی اماں نے منع کردیا تھا پھر بھی انھیں چکن کا سفید دوپٹہ فیتہ ٹکا ہوا اور پھوپی اماں کو رینگ کا دوپٹہ کامدانی کا اور چار انگل چوڑا ٹکا ہوا دیا تھا۔

زنانہ میں منجھلی پھوپی اماں اور پہاڑ والی خالہ اماں نے کھانا کھلوایا تھا اور مردانہ میں پھوپا ابا نے۔ کھانا کھلایا جارہا تھا کہ ابا بھی علی گڈھ سے آگئے۔ شام کو کھانا زردہ

تھا اور صبح آلو کا سالن۔ مہمان ظہر کی نماز پڑھ کر آئے
دوسرے دن کھانا کھا کر دوپہر کو گئے رات بھر عورتوں
میں گانا بجانا ہوتا رہا۔

جب کھانا کھایا جا رہا تھا اور ابا بھی آچکے تھے تو
ایک ڈولی آئی اُتروانے کے لئے عورتیں دروازہ پر پہنچیں
تو سواروں نے کہا کہ ابّی میاں کے دوست کی بیوی ہیں
یہ ابّی میاں خود آکر اُتروائیں گے پردہ کی بہت پابندی تھی
سب پڑی ہوئی تھیں کہ کوئی جھانک کر نہ دیکھ لے۔ عورتوں
میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ کون بے باک بے حیا عورت
ہے جسے کوئی مرد اُتروانے جائے۔ آخر ابا کو بھیجا۔ وہ گئے
اور مہمان کو اندر لائے ڈھیلا فرشی پاجامہ گھونگھٹ نکلا ہوا۔
دیکھ کر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ چچا جان (مولانا عبدالغفار
صاحب) زنانہ کپڑے پہن کر آئے تھے!

آپا راشدہ کہتی ہیں سب نے مجھے پانچ پانچ روپے
دیے تھے۔ چچی اماں کے پانچوں روپے جھنک سے تھے۔
یہ اکتوبر [illegible] کا واقعہ ہے۔

مضمون نگاری

مولوی محمد احسن صاحب وکیل جو
دو سال علی گڑھ میں ایک ہی مکان
میں علامہ مغفور کے ساتھ رہے تھے سنہ ۱۹۰۱ء و سنہ ۱۹۰۲ء کے
حالات میں اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

مولانا مرحوم کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے مگر مستقل
طور پر شعر گوئی اختیار نہیں کی بلکہ طبع موزوں ہونے کی وجہ
سے کچھ فرمادیا کرتے تھے۔

اُس زمانہ میں جب ڈپٹی صاحب کا رنگ مولانا
پر خوب چڑھ گیا تو مولانا شرر کی تصانیف اور زبان پر نہایت
سخت تنقید لکھی اور میرے نام سے ایک مضمون اخبار وکیل
امرتسر میں شائع کرا دیا جس کا ایک فقرہ یاد ہے کہ مولانا شرر
نے اُردو زبان کا ستیاناس کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی
اور قلعہ معلیٰ کی سیدھی سادی پاک اور شستہ زبان پر
انگریزی کا رنگ چڑھا دیا۔

اس مضمون سے بڑی سنسنی پھیلی بعض لوگوں نے
تائید بھی کی۔ نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ مولانا شرر نے اُس کے بعد
سے تصانیف کا رنگ بدل دیا۔ فردوس بریں اُس بدلے
ہوئے رنگ کی پہلی تصنیف ہے جو پہلے کی تصانیف سے
مختلف ہے۔

یاد پڑتا ہے کہ حکیم محمد علی طبیب کی زبان کے خلاف بھی
ایک مضمون شائع کروایا تھا۔

یہ لوگ اُس زمانہ کے مسلّم الثبوت ادیب تھے۔
مگر مولانا نے اُن کی غلطیوں کو ٹوکنے میں نہایت جرأت سے
کام لیا اور بہت سے اخباروں نے ان کی تائید کی۔

وہ نہایت خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ اور نہایت
ستھرا مذاق فرمایا کرتے تھے۔

ایک بات اُس زمانے میں یہ بھی دیکھی تھی کہ اکثر
گھنٹوں خاموش رہ کر کچھ سوچا کرتے تھے اور اگر میں مخل ہوا
تو فرمایا کرتے تھے کہ ایسے وقت میں بات نہ کیا کرو خیالات
بدل جاتے ہیں۔

مولانا آخر میں آسمانِ ادب کے نیرِ اعظم بن کر چمکے
اور چونکہ میرے ہی مکان سے یہ آفتاب طلوع ہوا تھا اس
واسطے مجھے مولانا کی دوستی پر ناز تھا۔"

(عصمت فروری سنہ ۱۹۳۹ء)

بی بی رشید الزمانی پردیس میں اپنے شوہر کے ساتھ
نہیں رہیں بیٹے کی شادی کر دی تو سات آٹھ سال تک
پردیس میں بیٹے کے ساتھ بہو کو نہیں بھیجا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۱ء
سے سنہ ۱۸۹۹ء تک کا زمانہ وہ ہے کہ علامہ مغفور ملازمت کے

سلسلہ میں دلی سے باہر تنہا رہے اور اسی زمانہ میں انھوں نے احسن و میمونہ اور صالحات دو کتابیں لکھیں۔ منازل السائرہ علی گڑھ میں لکھی گئی اور چند مضامین محمد احسن صاحب کے نام سے شائع ہوئے۔

کہانیاں لکھنے کی ترغیب حقیقت میں بی بی رشید الزمانی نے اپنے بیٹے کو دی۔ کہتیں ابی میاں تم کہانیاں کیوں نہیں لکھتے اور پھر وہ کہانیاں سناتیں کہ یہ لکھو۔ ایک دن ماں نے دو پیسے کی کاپی، ایک پیسے کی پنسل منگا کر کہا لو اب تم کہانی لکھو۔ بیٹے نے کہا کیا لکھوں کہا اچھا میں تمھیں ایک قصہ سناتی ہوں چنانچہ انھوں نے دو یتیم لیسیر بچیوں کا قصہ سنایا جن کے ماموں نے ان کی طرف سے سخت لاپرواہی برتی اور خالہ نے بھائی کو خط لکھا کہ ان پر رحم کرو۔ یہ قصہ سُن کر کہانی ایک خط کی صورت میں لکھی اور مخزن لاہور کو بھیج دی۔

اُس زمانہ میں معیاری ادبی رسائل برصغیر میں دو تین ہی تھے۔ اور اُن میں اُردو کا مخزن بہت ممتاز تھا سر عبدالقادر مرحوم جو اس وقت شیخ عبدالقادر تھے۔ اُس کے اڈیٹر تھے۔ سنہ ء کے مخزن میں علامہ مغفور کا یہ افسانہ بصورت خط شائع ہوا تھا اور اس کا عنوان تھا "نصیر اور خدیجہ" اڈیٹر نے جو نوٹ مضمون سے پہلے لکھا تھا وہ یہ تھا۔

"یہ مضمون مدت کے تقاضوں کے بعد ہمیں اپنے دوست مولوی محمد عبدالراشد صاحب مترجم عدالت بندوبست سے ملا ہے۔ صاحب موصوف شمس العلما مولانا حافظ نذیر احمد کے عزیزوں میں ہیں اور زبان پر خوب قدرت رکھتے ہیں خصوصاً مستورات کی زبان بے تکلف لکھتے ہیں چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب کی لاجواب کتابوں کے بعد مولوی عبدالراشد صاحب کی کتاب منازل السائرہ اپنے قسم کی ایک لاجواب کتاب ہے جس میں مستورات کی زبان نہایت خوبی سے لکھی ہے۔ اس مضمون میں بڑی بہن خدیجہ اپنے بھائی نصیر کو خط لکھتی ہے اور دوسری مری ہوئی بہن کے بچوں کی خراب حالت کی طرف اس کو توجہ دلاتی ہے۔ خط اس بے ساختہ پن سے لکھا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

"مدت کے تقاضوں کے بعد" کا ایک مطلب تو یہ ہوگا کہ منازل السائرہ شیخ صاحب کو بہت پسند آئی اور انھوں نے مخزن کے لئے مضامین لکھنے کے لئے کئی بار خطوط لکھے اور مدت کے تقاضوں کے بعد سنہ ء میں یہ مضمون شائع کیا۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سنہ ء یا سنہ ء میں ایک یا دو مضمون شائع ہوئے ہوں اور پھر کئی ماہ یا سال ڈیڑھ سال مخزن کے لئے کوئی اور مضمون نہ لکھا ہو اور شیخ صاحب نے تقاضہ پر تقاضہ کیا ہو تب کہیں جا کر سنہ ء میں یہ مضمون شائع ہوا ہو۔ چونکہ سنہ ء اور سنہ ء کے مخزن کا فائل ہمارے پاس نہ تھا بلکہ سنہ ء کا بھی صرف یہی ایک پرچہ موجود تھا۔ جس میں مضمون شائع ہوا تھا اس لئے "مدت کے تقاضوں سے" ہم نے یہی مطلب لیا کہ مخزن میں پہلا مضمون سنہ ء میں شائع ہوا اور نوٹ کی باقی عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرا مطلب کہ اس سے پہلے بھی مخزن میں کوئی مضمون شائع ہوا بالکل ہی بعید از قیاس نہیں مضمون نگار کے متعلق تعارفی نوٹ کا سلسلہ ممکن ہے اڈیٹر نے سنہ ء سے ہی شروع کیا ہو اور سنہ ء یا سنہ ء میں بغیر تعارفی نوٹ مضمون شائع ہوتا ہو۔ مولوی محمد احسن صاحب وکیل کے بیان سے یہ تو ثابت ہے کہ "نصیر اور خدیجہ" علامہ مغفور کا پہلا مضمون نہ تھا اخبار وکیل امرتسر میں جو مضمون محمد احسن صاحب کے نام سے شائع کرایا تھا وہ اس مضمون سے پہلے

...نے لکھا کہ چونکہ مخزن کے پہلے سال کا فائل
...ملتا نہیں اس لئے ہم فہرست خدیجہ بیگم ہی کو ان کا پتہ
...تے ہیں۔

خط کی چند سطریں یہ ہیں:-

"دادا جان کیا لکھتے تھے کہ قدرت سے پچاس ساٹھ
...صورت تھا۔ آج جاکر دیکھو۔ گُڈّو کا ایک کواڑ
... مٹی کی ایک دیوار کھنچی ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
...مجھے پچھتاوا نہ ملے پلنگ پر آتی پائی بیٹے کا کُرتہ بھی
...تک بے تابی دیتی ہیں بیٹے اسکا نام۔ بدن میں
...نہیں۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں۔ چلنے پھرنے سے مجبور
...منقود ہو گئیں تھیں تو ایک آدھ کرتے دو ایک ٹوپیاں
...تیں۔ اب اتنی بھی نہیں۔ پڑوس کا حق سمجھو۔
...وقت جاؤ۔ ہاتھ پاؤں کی خیرات کہو۔ تمہی جان تیرہ
مدرسے چھوٹی تھی ہمیں بس یہ کل کائنات ہے۔ اس میں کیا آپ
...بچیوں کو کھلائیں۔ تم مدرسے جا نہ ہم ساتھ لڑکی کا
ساتھ ...کیا کریں کیا نہ کریں۔ تین روپے مہینے کا سوکھا اناج
...جو جو کچھ لکھا تھا سب ہی کچھ کر چکیں۔ چکیاں جیسی
سلائیاں کیں۔ ہاں اتنی بات رہ گئی کہ در در ہاتھ نہیں پھیلایا۔

خط کی آخری چند سطروں یہ ہے۔

"مگر خدا عقل سے کام لو۔ ساری دنیا میں بدنام ہوں
میری چھوٹی بچیاں اکھڑواؤں۔ ابا باوا کی ناک کٹواؤں۔ دادا
دادی کو پہنچاؤں جب ان کو ساتھ رکھنے کا نام لوں۔ میں
خود پرائے بس میں ہوں۔ شہر کا معاملہ۔ سسرال کی بات۔
ساس نندوں کا ساتھ۔ ہر وقت کی جھک جھک، رات دن کی
پھٹ پھٹ۔ کنبہ بھر میں ذلیل ہوتا۔ عمر بھر کے لئے مٹی پلید کرنی۔
گھروں میں لڑائیاں ڈالنی۔ دلوں میں فرق ڈالنے کس خدا
نے بتائے ہیں"

مخزن میں مضامین چھپنے شروع ہوئے
...تک ایک درجن سے زیادہ افسانے اور مضامین
شائع ہوئے۔ عصمت و حسن (جس میں درد انگیز نظم بھی ہے)
دارالغرور۔ بیاہتا بیوی کا خط۔ مردیلے مقصود۔ بدنصیب
کالال۔ ایک مظلوم بہن کا خط اسی زمانہ میں چھپے۔ ناظرین
مخزن تصویر کے بہت مشتاق تھے۔ ...ء میں تصویر
شائع ہوئی۔

بی بی زاہدہ بیگم کے مواعظ

والد مغفور کی بڑی پھوپی اپنے شوہر ڈپٹی نذیر احمد
صاحب کی ملازمت کے سلسلہ میں دلی سے باہر رہتی تھیں
منجھلی پھوپی بھی کبھی کبھار وعظ کہتیں مگر چھوٹی پھوپی قاریہ
حاجیہ اُمِ عطیۃ النساء کی مجلس واعظ شہر بھر میں مشہور تھی۔
اُن کی چار بھتیجیوں میں سب سے بڑی علامہ مغفور کی حقیقی
بہن پھوپی زاہدہ بیگم صاحبہ تھیں اور وہ بھی اپنی چھوٹی
پھوپی کی طرح وعظ کہا کرتی تھیں۔ یہ وعظ مہینے دوسرے مہینے
اپنے ہی گھر میں برکت کے لئے ہوتا تھا۔ ایک آنہ چھ پیسے
اماں دیتیں اتنے ہی پھوپی اماں۔ اور تین چار آنہ ملا کر
۵-۶ آنے میں دادی اماں وعظ کا انتظام کرتیں اور اپنی
بہنوں کو کہلا بھیجتیں۔ ڈولی کے کرایہ کا کوئی پیسہ نہ دینا پڑتا
کیونکہ چھتوں ہی چھتوں وہ بزرگ بیبیاں آجاتیں۔ سینے
لگے یا ٹپک ٹکے ہوئے یا سادے دوپٹے ہوتے تھے۔
سیر بھر میٹھی کھیلیں ۲ آنے کی منگائی جاتیں جو وعظ کے بعد
تقسیم کی جاتیں۔ دو پیسے کے پھول۔ دو تین پیسے کی اگر
بتیاں اور لوبان۔ چار پیسے کے پان جو بیس بائیس ہوتے
تھے اور ہر پان میں سے تین تین ٹکڑے کئے جاتے تھے۔ دادی
اماں کی بہنوں کے علاوہ محلہ پڑوس کی عورتیں بھی آجاتیں
اور دونوں گھر بھر جاتے۔ پھوپی اماں کا وعظ بعد ظہر ہوتا

جب مرد باہر گئے ہوئے ہوتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ والد مغفور گھر میں ہوتے اور وہ اندر کوٹھری میں بیٹھے ہوئے بہن کا وعظ سنتے۔

پھوپی اماں محرم کی دس تاریخ کو اپنے گھر میں صبح نو بجے سے بارہ بجے تک ذکر شہادت پڑھتی تھیں۔

علامہ مغفور کے والد کی آواز خاندان کے بزرگوں سے سنا ہے بہت ہی اچھی تھی اور دونوں بچوں علامہ مغفور اور ان کی بہن زاہدہ بیگم صاحبہ کی آواز بھی باپ کی طرح تھی۔ درد میں ڈوبی ہوئی۔ پھوپی اماں جب نظم پڑھتیں تو دل پر چوٹ لگتی اور سننے والی بیبیوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ میں نے بھی اُن کا وعظ سنا ہے۔

ان کے وعظ کا سلسلہ غالباً ۱۹۰۳ء سے شروع ہوا تھا۔ بہت اصرار سے وہ کسی ملنے والی کے ہاں بھی وعظ کہنے چلی جاتی تھیں مگر ان کے بھائی کی تاکید تھی کہ وعظ کا ایک پیسہ بھی کسی سے نہ لینا اور اس پر انھوں نے ہمیشہ عمل کیا۔

ایک سیدانی بی بی رشید الزمانی کی پناہ میں

ریاست ٹونک (راجپوتانہ) کے ایک شریف اور معزز خاندان کی ایک سیدانی کو اُن کے شوہر نے کوئی نامناسب بات کہدی تھی۔ غیرتمند سیدانی اپنی بڑھیا ماں اور ۷-۸ سال کے بچہ کو لے کر گھر سے نکلی اور دلی پہنچی اور کسی نہ کسی طرح بی بی رشید الزمانی کے پاس آئی۔ مولوی عبد القادر صاحب مرحوم کا نام اس نے سنا تھا مگر اُن کی بڑی بہو تک کس طرح پہنچی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا۔

بی بی رشید الزمانی نے حال سنا پوری کیفیت معلوم ہوئی تو بڑی بی کو بہن اور اُن کی جوان بیٹی کو بیٹی بنا لیا اور اپنے ہاں رکھ لیا۔ اُن خاتون کا نام زینب تھا۔

پھوپی اماں کے بچے جو آپ سے بڑے تھے انھیں خالہ زینب کہتے اس لئے آپا اور میں ہم دونوں بھی انھیں خالہ زینب ہی کہتے تھے۔

خالہ زینب جب دلی آئیں تو پیٹ میں بچہ تھا۔ بی بی مبارک زمانی یعنی بہو کے زچہ خانے اُن کے ہی کمرے میں ہوئے تھے مگر منہ بولی بیٹی یعنی خالہ زینب کا زچہ خانہ بی بی رشید الزمانی کے اندر کے دالان میں ہوا۔ منہ سے بیٹی کہا تھا تو دل سے بیٹی سمجھا اور حتی الوسع کوشش کی کہ کچھ ہی ہو جائے اُس شریف سیدانی کا دل میلا نہ ہو۔ خالہ زینب کے یہ دوسرے بیٹے جو ہمارے گھر میں پیدا ہوئے تھے آپا سے سال بھر بڑے تھے اس کے معنی یہ ہوئے کہ خالہ زینب ۱۸۹۰ء میں بی بی رشید الزمانی مرحومہ کی پناہ میں آئی تھیں۔

خالہ زینب اپنی اماں کو بوا کہتی تھیں چنانچہ سوائے بی بی رشید الزمانی کے جو انھیں بہن کہا کرتی تھیں سارا گھر اُنھیں بوا کہتا۔ مجھے خواب سی یاد ہیں شاید ۱۹۰۹ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

بی بی رشید الزمانی نے بوا کو بہن اور خالہ زینب کو بیٹی تو بنا لیا اور اپنے پاس اپنے دالان کا ایک کونہ بھی دیدیا مگر اب سوال تھا روٹی کپڑے کا۔ بی بی رشید الزمانی چلن کی آدمی تھیں اور چال تھی ملکے گز کی۔ اُن کی ساس اُنھیں کتنا ہی سمجھتیں کتنا ہی خیال رکھتیں بہرحال بیوگی کو بیس سال ہو گئے تھے۔ اِدھر اُن کے اخراجات کی ذمہ داری ان کے لئے مشکل تھی اُدھر سیدانی انتہائی غیور طبیعت لے کر آئی تھیں کہ ایک پائی کا بار ڈالنا بھی گوارا نہ کر سکتی تھیں۔ بی بی رشید الزمانی مرحومہ نے اُن کے لئے مزدوری پر سلائی کڑھائی کا انتظام کر دیا۔ اُن کے پاس ٹوپیاں کلابتو

نی کے لیے آتی تھیں اور بیل دار کرتے سیا کرتی
ہ آنے معاوضہ کی مزدوری کر لیتی تھیں۔ صورت کی
یں۔ جوانی کا زمانہ پھر پردہ کی سخت پابند۔ بی بی
ماں گوارا کر سکتی تھیں کہ غیر مرد اُن کی آواز سنے
دار شام کو آتا تو بی بی رشید الزمانی دن بھر کا کام
ے کر پیسے لیتیں اور دوسرے دن کا کام اور پیسے لاکر
ینب کو دے دیتی تھیں۔ آپا راشدہ بیگم کا بیان ہے
ہ زینب نے اماں کے یا پھوپی اماں کے حد درجہ کہ
اماں کے دسترخوان پر بھی کبھی کھانا نہیں کھایا۔
چیں کر پیٹ بھر لیا اور بچوں کا بھر دیا مگر کبھی ذرا سا
یا دال نہیں مانگی۔ اُن کا چولھا الگ تھا۔ دادی اماں
یا پھوپی اماں خود ہی کوئی چیز بھیج دیتیں تو وہ دوسری
تھی۔ ایک دن بی بی رشید الزمانی کی سسرال سے
بیگم بی بی آئیں اُس وقت وہ کارخانہ دار سے خالہ زینب
لئے پیسے لے رہی تھیں۔ انھیں سخت ناگوار
اتفاق سے اُسی وقت علّامہ مغفور بھی آ گئے۔ اُن
نے بی بی رشید الزمانی سے کہا "تمھاری گری جھنکار
ی۔ کیا خبر خالی تھی یا بھری۔ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ تم
ماری بہو یا بیٹی سلائی کی مزدوری کرتی ہیں۔ ہوا
ہو گئی تو شہر بھر میں تھو تھو ہو گی۔ خاندان کی عزت پر
لگے گا۔" بی بی رشید الزمانی نے کہا "میں نے اس
سیدانی کو پناہ دی ہے اسے بیٹی بنایا ہے تو میرا فرض ہے
اس کا خیال رکھوں۔ یہ مجھ پر اپنا بار نہیں ڈالنا چاہتی
کیا میں اس کی مدد بھی نہ کروں۔ کیا تمھارا یہ مطلب ہے
خود کارخانہ دار سے بات کرے اور اُس کے آگے ہاتھ
پھیلائے۔ ہوا میرے جیتے جی تو ایسا ہو نہیں سکتا اور میرے بعد
ی ابّی میاں اس کا خیال رکھیں گے کہ بہن کی عزت برقرار
رہے۔"

گھر تک مرد دو تھے۔ ابّا اور پھوپا ابّا۔ خالہ زینب
نے ایک گھر میں رہنے کے باوجود دونوں سے پردہ کیا۔
کتنی ہی ضرورتوں سے وہ صحن میں آتی جاتیں۔ چلتی پھرتیں
مگر گھونگٹ نکلا ہوتا۔ شروع شروع میں علّامہ مغفور کو
وہ بھائی صاحب کہتی تھیں بی بی رشید الزمانی نے ایک
دن کہا "بیٹی! زاہدہ ابّی میاں کو بھائی کہتی ہیں پھر تم کیوں
بھائی صاحب کہتی ہو۔ نہیں تم بھی بھائی کہا کرو۔"

علّامہ مغفور نے خالہ زینب کے بڑے بیٹے کو کارچوبی
کے کارخانے میں بٹھا دیا تھا وہ کام کم کرتے زیادہ تر مچھلی کے
شکار کو جایا کرتے تھے۔ چھوٹے بیٹے بھائی ابراہیم میرے
ساتھ گڈیاں اڑاتے اور تاش کھیلتے تھے جب وہ بڑے
ہوئے تو انھیں بھی کارچوب کا کام سکھوا دیا۔

اڑوس پڑوس محلہ کٹرہ کی غریب عورتیں بی بی
رشید الزمانی کے پاس اپنی امانتیں رکھواتی تھیں کوئی رکھ
اٹھتی بیچ کرتی تو کوئی چونی دونی۔ اور کوئی گہنا پاتا۔ اُن کے
پاس رنگ برنگ تھیلیاں تھیں جو آٹے چاول کی گول
گول بڑے مٹکوں میں پڑی رہتی تھیں۔ اور کوٹھڑی کی کنجیاں
بہو کے پاس رہتیں نہ بیٹی کے بلکہ خالہ زینب کے پاس
رہتی تھیں۔ کوئی کچھ جمع کرانے آیا تو اس کے جانے کے
بعد خالہ زینب سے کہتیں "بیٹی اس گول میں سے منجھلی
سبز رنگ کی تھیلی کھول کر یہ اس میں ڈال دو۔" انھیں یاد
رہتا کہ کس کی کون سے رنگ کی تھیلی ہے۔ دادی اماں کو
گھر بھر میں سب سے زیادہ اعتماد انھیں خالہ زینب پر تھا۔
بی بی رشید الزمانی مرحومہ کو خالہ زینب کی دلداری
کا کس قدر خیال تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے
بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مرغیاں پال رکھی تھیں اُن کا

ایک مرغ علامہ مغفور کے سرہانے صبح آکر اذان دیتا۔ تین چار
دن تو علامہ خاموش رہے۔ چوتھے روز اپنی ماں سے کہا یہ زینب
کا مرغا ہے۔ ۵ روز سے علی الصبح میرے سرہانے آکر اذان دیتا
ہے۔ ان سے کہئے یا تو اسے بیچ دیں یا ذبح کر دیں۔"
ماں نے کہا۔
"اری میاں زینب کا مرغ تو یہیں رہے گا۔ تم جو
چاہو انتظام کر لو۔"

جب بی بی رشیدالزمانی کا انتقال ہوا تو خالہ
زینب پچھاڑیں کھاتی اور زار زار روتی تھیں۔ اُس وقت
علامہ مغفور نے اُن کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"زینب جس طرح زاہدہ میری بہن ہے اسی طرح
تم بھی میری بہن ہو۔ میں زاہدہ اور راشدہ کی اماں
تینوں تمھارے خدمت گزار ہیں جس طرح اماں کے سامنے
سب تمھارا ادب کرتے تھے اسی طرح اب بھی اس گھر کا
کونہ کونہ تمھاری عزت کرے گا۔"

یہ سنہ ۱۰ء کا واقعہ ہے سنہ ۱۱ء میں خالہ زینب کے شوہر
دلّی آئے محلہ فراش خانے میں کرایہ کا مکان لے کر ٹھہرے اور
بیوی بچوں کی تلاش شروع کی انھیں ٹونک میں بس اتنا
معلوم ہوا تھا کہ کسی مولوی صاحب کے ہاں ان کی ساس اور
بیوی ٹھہری ہوئی ہیں۔ اور ان مولوی صاحب کا نام عبدالرشید
ہے اور کھاری باؤلی کے رہنے والے ہیں۔ نام اور پتہ صحیح
ہوتا تو دقت نہ ہوتی دلّی آئے تین مہینے گزر گئے سارا فراش
خانہ اور کھاری باؤلی چھان ماری بیوی بچوں کا کچھ پتہ
نہ چلا۔ تین ماہ بعد معلوم ہوا کہ کالے محل کے پاس مولوی
عبدالقادر صاحب کے پوتے مولوی عبدالراشد رہتے ہیں
اُن کی والدہ کے ہاں ان کی بیوی بچے ہیں۔ پوچھتے پوچھتے
صحیح مقام پر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو علامہ مغفور موجود تھے
علیک سلیک کے بعد کہا۔
"اسمٰعیل کی اماں کیا آپ کے ہاں رہتی ہیں؟"
"جی ہاں۔"
"میں بدنصیب اسمٰعیل کا باپ ہوں اور بیوی بچوں
کو لینے حاضر ہوا ہوں۔"

آپا راشدہ کہتی ہیں آپا کچھ دیر سوچتے رہے پھر
پوچھا آپ کا نام کیا ہے کہاں سے تشریف لائے ہیں اور کیا
کام کرتے ہیں۔ انھوں نے نام بتایا اور کہا ٹونک سے آیا
ہوں اور یہ کام کرتا ہوں۔"
"کہا اچھی بات ہے آپ کل شام کو اسی وقت
تشریف لائیے۔"

وہ چلے گئے تو اندر آئے اور خالہ زینب کو بتایا۔ وہ
زار و قطار رونے لگیں تو تسلی تشفی دی اور کہا "وہ کل
آئیں گے تم زینہ پر سے انھیں دیکھ کر مجھے بتانا کہ وہی شخص
ہیں یا کوئی اور کیونکہ جب تم نے ٹونک چھوڑا تھا تو ان کی
ڈاڑھی سیاہ نہیں تو کھچڑی ہوگی اور اب سفید جھک ہے
تیرہ چودہ سال گزر گئے۔ اب بڈھے ہیں اس وقت ادھیڑ
ہوں گے۔"

خالہ زینب نے کہا "بھائی میں اب انھیں دیکھنا بھی
نہیں چاہتی۔" مگر انھیں سمجھا بجھا کر رضامند کیا کہ کل وہ
آئیں تو دیکھ کر مجھے بتانا کہ اسمٰعیل کے ابا ہی ہیں یا کوئی
اور شخص ہے۔

دوسرے دن بھائی اسمٰعیل کے ابا آئے۔ خالہ زینب
نے انھیں دیکھ لیا اور پہچان لیا اور راستے کوٹھے میں آکر رونے
لگیں۔ علامہ مغفور تھوڑی دیر بعد اٹھے اور کہا۔
"میں پان لے کر حاضر ہوتا ہوں۔"
اندر آئے خالہ زینب سے پوچھا تو انھوں نے کہا۔

[illegible] ہی [illegible] کی ہیں"

اب علامہ مغفور پھر چھوٹے گھر میں آئے اور [illegible]
[illegible] سمٰعیل کے ابا سے کہا۔

"میری والدہ مرحومہ نے آپ کی خوشدامن کو بہن
[illegible] زینب کو بیٹی کہا تھا۔ میں نے بھی زینب کو زاہدہ
[illegible] اپنی بہن سمجھا۔ آپ سُن کر تعجب کریں گے کہ ایک
[illegible] میں رہنے کے باوجود زینب کا مجھ سے اور میرے مرحوم
[illegible] سے جن کے انتقال کو دو سال ہوئے سخت پردہ رہا
[illegible] اس سال میری والدہ بھی رحلت کر گئیں ان کے
[illegible] قال سے زینب کو سخت صدمہ پہنچا۔ روتے روتے اس کی
[illegible] حالت تھی اُس وقت البتہ میں نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ
رکھ کر سب کے سامنے تسلی دلاسہ دیا۔ اماں کے بعد وہ
[illegible] میری پناہ میں ہے۔ آپ حق رکھتے ہیں کہ اُسے لے
جائیں بشرطیکہ وہ جانے کو رضامند ہو، آپ تشریف
رکھئے۔ میں جا کر سمجھاتا ہوں۔"

بھائی اسمٰعیل کے ابا علامہ مغفور کی گفتگو سے
بہت متاثر ہوئے اور روتے رہے۔

علامہ مغفور نے خالہ زینب سے کہا۔

"اماں آج موجود ہوتیں تو وہ بھی یہی کہتیں۔ جو
میں کہہ رہا ہوں۔ اسمٰعیل کے ابا نے تم سے جو الفاظ کہے
تھے اس پر وہ نادم ہیں اور رو رہے ہیں تم ان کی غلطی
معاف کر دو۔ خدا تمہاری غلطیوں کو معاف کرے گا۔ تم
اس وقت اُن کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں زبان دے کر آیا
ہوں۔ کل دوپہر کو زاہدہ اور راشدہ کی اماں تمہارے
پاس آئیں گی۔ اور میں بھی تیسرے چوتھے دن آیا کروں گا
کیسی اچھی بہن ہو بھائی کی بات نہ ٹالو۔"

خالہ زینب کی ہچکی بندھ رہی تھی بھائی اسمٰعیل
اور بھائی ابراہیم کو ان کے والد کے پاس علامہ مغفور
نے بھیج دیا تھا۔ باہر آ کر بھائی اسمٰعیل سے ڈولی لانے کو
کہا اور اُن کے والد سے کہا: آپ کے ارشاد کی تعمیل
کر رہا ہوں۔ مصیبت ماری ہے۔ چھ سال سے تکلیفیں
اُٹھا رہی ہے قابلِ مبارکباد ہیں وہ خاندان جن میں ایسی
نیک غیرت مند بے زبان مسکین عورتیں ہوں۔"

خالہ زینب نے اپنے ساتھ کوئی چیز نہیں لی خالی
ہاتھ کھڑی ہو گئیں۔ دونوں بچوں کو ساتھ لے شوہر کے
ساتھ فراش خانہ چلی گئیں۔

دوسرے دن علامہ مغفور نے بہن اور بیوی کو بھیجا
گھنٹہ بھر ٹھہر کر وہ واپس آئیں اور شام کو علامہ مغفور کو
بتایا کہ خانہ داری کے سارے سامان کا اسمٰعیل کے ابا
نے پہلے ہی سے انتظام کر رکھا تھا۔

میاں بیوی کو ساتھ رہتے ہوئے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا
تھا کہ خالہ زینب کو بخار آیا۔ دلی کے بہتر سے بہتر طبیب
کو علامہ مغفور نے دکھایا بھائی اسمٰعیل کے والد نے علاج
میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ مگر وقت آ چکا تھا۔ بخار اُترتا
تھا نہ اُترا اور خالہ زینب کا انتقال ہو گیا۔

خالہ زینب کے واقعات سے علامہ مغفور بہت
متاثر تھے "عصمت و حُسن" "بیاہتا بیوی کا خط" "بدنصیب
کا لال" "مظلوم بیوی کا خط" وغیرہ کیا تعجب ہے یہ افسانے اور
مضامین انھیں کے حالات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہوں۔
اور مظلوم عورتوں کی بے بسی اور بے کسی پر اُن کا دل تمام
عمر جو خون کے آنسو رویا عجب نہیں اس کی تہ میں خالہ
زینب کے حالات بھی ہوں۔

واجدہ بیگم کی پیدائش

[illegible] میں علامہ مغفور
کی دوسری بیٹی ساجدہ

پیدا ہوئی جو چھ سال کی ہو کر گزر گئی ۱۹۲۲ء میں واجدہ پیدا ہوئیں۔ ان کی پیدائش مجھے یاد ہے۔

ٹونک کی سیدانی خالہ زینب جنھوں نے دادی اماں کے ہاں پناہ لی تھی وہ صدر والان میں دادی اماں کے ساتھ رہتی تھیں اور وہیں اُن کا زچہ خانہ ہوا تھا مگر والدہ مرحومہ کو جو بغلی کمرہ ملا ہوا تھا اُن کے بچے اسی کمرے میں پیدا ہوئے۔ دائی اماں کی سسرال کی ہر موقعہ پر آتی تھی مگر واجدہ بیگم کی پیدائش پر محلہ کی دائی "کلو کی اماں" آئی۔ واجدہ بیگم کی پیدائش پر دادی اماں بہت روئی تھیں اور کہتی تھیں "نانی میاں کو اب تین تین بیٹیوں کو بنجنا ہے ہائے یہ تو بہت ہی سیدھا ہے نہ جانے کیسے لوگوں سے سابقہ پڑے نیک داماد اور شریف سمدھیانے تو خوش نصیبوں کو ملتے ہیں یہ تو ایسی قسمت لے کر آیا کہ چھوٹی عمر ہی میں یتیم ہو گیا اور اب تین تین بیٹیاں بھاری پتھر کس طرح سرکیں گی اے اللہ نانی میاں کی عزت رکھنے والا تو ہی ہے"

ماں کی دعائیں بیٹے کے ساتھ تھیں۔ جس پوتی کی پیدائش پر وہ روئی تھیں اُنھیں معلوم نہ تھا کہ اس کی شادی ایک انتہائی شریف لڑکے سے ہوگی۔

شجر بار آور

حضرت علامہ مغفور کی دادی اماں جنھیں ہم بچے "بڑی دادی اماں" کہتے تھے مجھے خواب سی یاد ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ فروری ۱۹۲۷ء کے عصمت میں ان کی اور ان کی دیورانی کی تصویر شائع ہوئی تھی جو اُن کے ایک اور پوتے محمد عبدالستار نے اُتاری تھی۔ اس تصویر پر ان کا نام نہیں لکھا تھا بلکہ یہ الفاظ تھے "شجر بار آور" اور اسی عنوان سے علامہ مغفور نے ایک مختصر سا مضمون تحریر فرمایا تھا جس میں لکھا تھا۔

"مغرب میں جہاں ایک طرف مادی اسباب کی پرستش

کرنے والا گروہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ عورت بچے کی پیدائش اس کی پرورش اس کے اخراجات وغیرہ سے بالکل محفوظ رہے وہاں ایسی انجمنیں بھی موجود ہیں جو ہر سال اس عورت کو جو سب سے زیادہ بچوں کی ماں ہے ایک گراں قدر انعام دیتی ہیں۔

اس سلسلہ میں آگے تصویر کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ دہلی کے ایک نہایت ممتاز خاندان کی اس معمر خاتون کی تصویر ہے جن کے پیٹ سے سات آٹھ بچے پیدا ہوئے موت کے وقت اس محترم خاتون کے ۲۰۵ بچے موجود تھے۔ انھوں نے اپنی چار نسلیں دیکھیں یعنی نواسی کی نواسیاں۔ ان کی برسی قریب قریب ان کے تمام بچے ہندوستان اور بیرون ہند میں مناتے ہیں اور امید ہے ابھی کئی صدی تک ان کا وجود دنیا کے واسطے بہت کچھ مفید ہوگا کیونکہ ان کے بچے ملک کی نہایت مفید خدمات انجام دے رہے ہیں ....

دوسری تصویر ان کی حقیقی دیورانی کی ہے جو لاکھوں روپیہ کی جائیداد مال و متاع کی مالک تھیں مگر اس سے گزر کر ان کا کوئی بچہ نہ رہا فاتحہ تو درکنار آج کوئی ان کا نام لینے والا بھی نہیں ہے۔"

بی بی رشید النسائی نے بہو کو کس طرح پیسہ جمع کرنا سکھایا

بی بی رشید النسائی سے ایک دن اُن کی بہو نے کہا: "اماں جان مجھے پانچ روپیہ قرض دے دیجیے۔"

ساس نے کہا: "بیٹی یہ تم نے قرض لینا کب سے سیکھا! اللہ نہ کرے کہ کوئی قرض کے پھیر میں پڑے۔ اور پھر مجھے معلوم بھی تو ہوا آخر ایسی کیا سخت ضرورت آ پڑی ہے"

بہو نے ضرورت بتائی۔ کسی زیور کے سلسلہ میں تھی وہ سنار کو روپے دینے تھے۔ ساس کچھ دیر تو خاموش

کہا:-
"مبارک ہو اماں جان! میرے پاس تو ہیں نہیں۔ تم ہی
روپیہ رکھ لو۔ بہ شرطیکہ روپیہ میں تم کو دلوا
دوں:
پتیلا نکلا۔ بی بی رشیدالنسا نے اپنی بہو کا پتیلا
وہاں بھجوا دیا اور کوٹھری کھلوا کر خالہ زینب سے
پیسے منگوا بہو کو دے دئے۔
تیسرے یا چوتھے دن وہ زیور آگیا۔ پہلے ساس
وہ دیکھ کر خوش ہوئیں اور پھر بہو سے کہا "تم نے
اچھا کیا۔ مگر بیٹی ذرا یہ تو بتاؤ تم قرضے کے پانچ روپے
کس طرح ادا کرو گی۔ اور کب کرو گی؟"
"تنخواہ ہی میں سے بچا کر دو ڈھائی مہینہ میں ادا
کروں گی"
"مگر بچاؤ گی کس طرح؟ کونسا خرچ کم کرو گی؟"
"کوئی سا بھی کم نہیں ہو سکتا"
"تم یوں کرو کہ آج سے یہ سمجھ لو کہ روپیہ سولہ آنہ کا
نہیں پندرہ آنے کا ہے۔ جب روپیہ بھناؤ۔ اس میں سے
ایک آنہ چاہے اپنے پاس جمع کرو۔ چاہے میرے پاس تھیلی
میں نکال دیا کرو۔ سولہ آنے میں تم جو خرچ کرتی ہو وہ اب
پندرہ آنے میں کرو"
"بہت اچھا اماں جان"
علامہ راشدالخیری کی رفیقۂ حیات نے ساس کی
نصیحت کو ہمیشہ کے لئے گرہ میں باندھ لیا۔
کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے دن بی بی رشیدالنسا
کی چھوٹی تھیلی اور بہو کی تھیلی آتے یا چاول کے مٹکوں
سے نکلتی اور اس میں پیسے یا اکنیاں ڈال دی جاتیں۔
ڈھائی مہینہ بعد ساس نے کہا "بیٹی ذرا اپنی تھیلی نکال لاؤ
اور گن کر کتنے روپے ہوگئے۔"
ساس بہو دونوں نے مل کر پیسوں کی
ڈھیریاں الگ لگائیں اور اکنیوں کی الگ۔ کل نو روپے
چھ آنے تھے۔
ساس نے کہا: "لو! پانچ روپے تو مجھے دے دو میں
تمہارا پتیلا منگا کر تمہارے حوالے کروں اور باقی بچے چار
روپے چھ آنے ان کا جو تمہارا جی چاہے کرو"
"آپ کا جو حکم ہو وہی کروں۔ میرے خیال میں تو
اپنے پاس ہی رہنے دیجئے"
"مگر میرے پاس رہنے سے فائدہ کیا؟ اگر اسی طرح
تم نے روز کچھ پیسے نہ ڈالے"
"جی نہیں اب ایسا ہی کیا کروں گی"
پتیلا "پہاڑ والی خالہ اماں" کے ہاں سے آگیا اور
ساس نے نو روپے کی ان اکنیوں یا پیسوں کے روپے بنوا کر اپنی
تھیلی میں ڈال لئے۔ وہ پہلے بھی نو روپے دے سکتی تھیں۔
مگر انھیں تو بہو کو پیسے جمع کرنے کا سبق دینا تھا۔ یہ سبق
اس قدر کارگر ہوا کہ بہو نے ہمیشہ کے لئے یہ سمجھ لیا کہ روپیہ
کے پندرہ آنے ہوتے ہیں۔ ہر روپیہ میں سے ایک آنہ علامہ
مغفور کی وفات تک نہیں اپنی وفات تک جمع کیا۔ اور
عصمت و تمدن کے لئے بڑی بڑی رقمیں اسی "ایک آنہ
فی روپیہ" کی بچت میں سے نکال نکال کر دیں۔
علامہ مغفور نے اپنے کئی ناولوں اور افسانوں میں کئی
کردار ایسی خواتین کے دکھلائے ہیں جنھوں نے بیٹیوں کی
شادی پر یا وقت پڑنے پر جتا گنا کر کے جمع کی ہوئی بڑی
بڑی رقمیں نکال نکال کر شوہروں کی عزت رکھی ہے۔

چھٹا باب — زمانۂ وعظ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۰ء

سلسلۂ وعظ

علامہ مغفور دلّی کے جید علمار کے خاندان میں سے تھے اُن کے دادا چھوٹے دادا۔ پردادا۔ سکڑدادا سب نے وعظ کہا تھا اور علامہ مرحوم نے بھی کہا ہے۔ میں نے ۸۔ ۹ سال کی عمر میں محلہ کی مسجد میں جو آغاجان کے چھتے سے ملی ہوئی تھی اُنھیں وعظ کہتے اور سامعین کو روتے دیکھا ہے۔ ایک اور جگہ ان کے ساتھ اُن کے وعظ میں دو دفعہ گیا تھا۔ لال کنوئیں کے پاس زینت محل کا کمرہ مہاراجہ پٹیالہ کے پاس تھا۔ وہاں ان کا وعظ ہوا کرتا تھا۔ زینت محل کا کمرہ وہی جگہ تھی جہاں شاہان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو مقدمہ کے دوران میں انگریزوں نے نظر بند کر دیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم کا عصمت کے راشد الخیری نمبر میں جو مضمون شائع ہوا تھا اس میں یہ سطریں بھی ہیں۔

"میری مولانا سے ۱۹۰۹ء میں ملاقات ہوئی جبکہ وہ زینت محل کے کمرہ کی ایک اسلامی انجمن میں کبھی کبھی تقریر کرنے جایا کرتے تھے۔ اُس وقت وہ ڈاک خانہ کے محکمۂ حساب میں نوکر تھے"۔

اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ ۱۹۰۹ء میں وعظ کا سلسلہ جاری تھا دوسرے یہ کہ ۱۹۰۹ء میں سرکاری ملازم تھے۔

علامہ مغفور کی والدہ مرحومہ نے جس طرح مضمون نگاری کی بیٹے کو ترغیب دی اُسی طرح وعظ کہنے کی بھی۔ ایک دن فرمایا "ابّی میاں تم وعظ کیوں نہیں کہتے۔ تمھارے دادا پردادا چھوٹے دادا سب ہی تو وعظ کہتے تھے"۔ کبھی کہتیں "ابّی میاں تم وعظ کہا کرو۔ عالموں کے خاندان سے ہو۔ اور واعظ کے بیٹے ہو"۔ آپا راشدہ بیگم کہتی ہیں وہ اکثر اسی طرح وعظ کہنے کی تلقین کرتیں۔ ایک دن جب ابا ان کے پائنتیوں بیٹھے تھے اور دادی اماں وعظ کہنے کی تاکید کر رہی تھیں انھوں نے مسکرا کر کہا "مولوی تو بے ایمان ہوتے ہیں"۔

یہ الفاظ منہ پھیر کے انھوں نے اس طرح ادا کیے کہ دادی اماں نے تو نہیں سُنے۔ پھوپی اماں نے سُن لیے اور اُنھیں کو سُنانے کے لیے کہے گئے تھے۔ پھوپی اماں نے کہا۔

"اے ہے اماں سُنا آپ نے۔ بھائی نے کیا کہا ہے"۔ انھوں نے فرمایا "میں نے تو نہیں سُنا"۔

"یہ کہہ رہے ہیں کہ مولوی تو بے ایمان ہوتے ہیں"۔

دادی اماں نے اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا۔

"ابّی میاں تمھیں ہو کیا گیا۔ مولویوں کو بُرا کہتے ہو شرم نہیں آتی۔ گانے بجانے میں تمھارا دل خوب لگتا ہے۔ خدا رسول کا ذکر کرنے کو اس طرح کہتے ہو۔ تمھارے باپ کے تو سینہ میں قرآن تھا اور تمھاری زبان سے تھوڑا سا نصیحت کا بیان بھی لوگوں کو نہیں سُنایا جاتا۔ تم سے تو چھوٹی بہن اچھی کہ اتنے سال سے وعظ کہہ رہی ہے۔ اس سے ہی سبق لو۔ آخر مجھے بتلاؤ تو۔ تم مولوی کیوں نہیں بنتے"۔

انھوں نے کہا "میرے نام کے ساتھ مولوی کتابوں اور رسالوں میں چھپتا ہے یا نہیں؟ آپ نے خود لکھا ہوا دیکھا ہے۔ اب اور کیا چاہیے"۔

فرمایا "سچ مچ کے مولوی بنو۔ چھپنے سے کچھ نہیں ہوتا نہ خاندانی مولوی کہلانے سے۔ بلکہ سچ پوچھو تو اب تو تمھیں

ہو جاتا ہے
بیٹے نے کہا کہ آپ کبھی نہیں کہا کرتیں۔ میرے مضمون
میں کمی ہے۔ اب آپ کہتی ہیں وعظ کہو۔ کل کہیں گی
سے کہ محفل میں گانا بجایا کرو۔"
کہ تمھیں کی کہ کی تھی خدا نہ کرے کہ تم محفل میں
ار بجا کر گاؤ۔ ایسے الفاظ زبان سے نکال کر اپنے آپا
کو کیوں تکلیف پہنچاتے ہو۔"
اور پھر ایک دن جب ان کی پہاڑ والی بہن آئی ہوئی
بیٹے سے کہا
وئے غالب کی غزل تو خوب گا لی جاتی ہے۔ اور
سے میر حسن کی مثنوی بھی لہک لہک کر پڑھتے ہو۔
یوں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ کل جب مر گئی تو تمھارے
جواب دوں گی۔ وہ کہیں گے میں حافظ قرآن تھا۔
یاں سے وعظ تک نہ کہا گیا۔ اس سے تو زاہدہ ہی اچھی
اور دوسرے عورتیں اس کا وعظ سننے آتی ہیں جیسے
نے مولوی بھی نہ بنایا۔ بتاؤ میں اس وقت کیا جواب
گی۔"

علامہ مغفور نے اپنی والدہ مرحومہ سے عرض کیا۔
"آپ جو وعظ وعظ کو فرماتی رہتی ہیں تو وعظ کیوں کر
یں۔ میرے پاس صافہ تو ہے ہی نہیں"
پہاڑ والی خالہ اماں نے کہا "اے آپا ٹھیک تو کہتا
بغیر صافہ کے بھی کہیں مولوی ہوا ہے۔ تم جو اس کے پیچھے
ں ہوئی ہو کہ وعظ کہے۔ وعظ کہے تو پہلے صافہ بنوا دیا ہوتا
ں کے بعد کہتیں تو ایک بات بھی تھی۔"
دو تین بعد بیلی رشید الزمانی مرحومہ نے اپنے دو
پٹے بنے تین تین گز کے تھے جوڑ کر دے کر
"لو اب تو وعظ کہو۔"

جمعرات جمعہ کی رات تھی محلے کی مسجد میں نماز عشا کے بعد
علامہ مغفور نے پہلا وعظ کیا۔ وہاں اور عورتوں نے بھی سنا
اور بہت خوش ہوئیں۔

پھر تو وعظ والوں کا اصرار ہونے لگا اور ہر مہینہ کی پہلی
جمعرات کی رات کو آغا جان کے چھتے کی مسجد میں ان کا وعظ
ہونے لگا۔ تین مہینہ بعد انھوں نے اپنی اماں سے کہا۔
"لیجیے میں نے آپ کی یہ خوشی بھی پوری کر دی۔ اب تو
بغیر جبہ کے وعظ نہیں ہوگا۔"
چنانچہ دو جبّے بنے۔ گرمیوں کے لیے سفید اور جاڑوں
کے لیے کالا۔ پھر زعفرانی عمامہ بھی بیوہ ماں نے بنوا دیا۔
اور زینت محل کے کمرہ میں وعظ ہونے لگا۔ بہت خوش الحان
تھے۔ قرآن پاک کا رکوع قرات سے اور مثنوی مولانا روم اور
فارسی اردو کے اشعار ایسے پڑھتے تو سننے والوں کو لطف
آجاتا۔ پھر انداز بیان ہوتا دردانگیز۔ زینت محل کے کمرہ کا
صحن ندی سا بھرتا، سڑک آدمیوں سے پٹ جاتی تھی سامنے محلہ
کی مسجد میں وعظ سننے کے بعد سامعین مصافحہ کرتے تو
ایک ایک دو دو روپیہ پیش کرتے مگر وہ نہ لیتے۔ تیسرے یا
چوتھے وعظ کے دوران میں اعلان کیا کہ میں پیشہ ور مولوی
نہیں ہوں۔ سرکاری ملازم ہوں اور تنخواہ خدا کا شکر ہے
میری ضروریات کے مطابق مل جاتی ہے۔ کوئی صاحب
مجھے مصافحہ کرتے وقت کچھ نہ دیں۔ چنانچہ انھوں نے بسلسلہ
وعظ ایک پیسہ کبھی کسی سے نہیں لیا۔ زینت محل کے کمرہ
میں ان کا وعظ سننے والوں میں دو بہت معتقد تھے۔ ایک
تھیں "کلکتہ والی" دلی کی پنجابی برادری کے کوئی صاحب
کلکتہ میں بڑے پیمانہ پر تجارت کرتے اور اس لیے کلکتہ والے
کہلاتے تھے۔ یہ ان کی شاید بیوی تھیں اور زینت محل کے
کمرہ علامہ مغفور کا وعظ سننے آتی تھیں۔ ایک دن ام صبیح

اپنے شوہر یا بھائی کو بھیج کر علامہ مغفور کو بلایا اور کہا۔ مجھے کچھ نصیحتیں کیجئے پھر بھائی بنالیا اور درخواست کی کہ میرے ہاں وعظ کہہ دیجئے۔ علامہ مغفور نے ان کے ہاں وعظ کہا۔ وعظ کے بعد دستر خوان بچھا تو کھانے سے علامہ مغفور نے انکار کردیا اور کہا میں کھانا کہیں نہیں کھاتا پھر کلکتہ والی نے خاصدان میں پان کے ساتھ ایک اشرفی رکھ کر بھیجی تو وہ بھی قبول نہیں کی اور کہا میں پیشہ ور واعظ نہیں ہوں پھر آپ جب مجھے بھائی کہتی ہیں تو میں بہن سے کچھ نہیں لے سکتا۔ تیسرے چوتھے مہینے کلکتہ والی کے ہاں ان کا وعظ ہوتا تھا یہ سلسلہ دو ڈھائی سال چلا۔ کلکتہ والی کے ہاں سے وہی بڑے کی ہنڈیاں آیا کرتی تھیں اور کبھی کبھی کپڑوں کے تھان بھی۔ ایک اور صاحب تھے محمد حسین کوئلے والے زینت محل کے تکرہ کے وعظ کا سارا انتظام وہی کیا کرتے تھے۔ مرحوم حکیم مقصود علی خاں (نواب مقصود یار جنگ بہادر) جن سے بیس پچیس سال بعد حیدرآباد دکن میں علامہ مغفور کی ملاقات ہوئی تھی زینت محل کے تکرہ اکثر وعظ سننے آیا کرتے تھے انھوں نے مجھے جو تعزیت نامہ لکھا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ

"مرحوم سے میرے تعلقات ۳۰-۳۵ سال سے تھے۔ اور میرے دل میں ان کے علم و فضل کی اور ان کی ادبی و قومی خدمات کی جو مرحوم نے زندگی بھر انجام دیں بے انتہا عزت تھی مرحوم کو جو محبت اور عقیدت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی اس سے میں ایک حد تک واقف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ صرف یہی ایک جذبہ ان کی نجات کا ذریعہ ہوگا۔"

عصمت مارچ ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۴۴

علامہ مغفور کے پھوپی زاد بھائی مولوی بشیر الدین احمد صاحب کو بھی ان کا وعظ سننے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ "دار الحکومت دہلی" میں ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"شروع شروع میں کچھ دنوں وعظ کہنا شروع کیا تھا اور بہت اچھا ڈھنگ ڈالا تھا۔ بہت لوگ آپ کی طرف جھک پڑے تھے کیونکہ تقریر آپ کی تحریر سے بھی زیادہ موثر تھی اور عجب نہیں کہ اگر یہ مشغلہ جاری رہتا تو جناب عبدالرب صاحب دہلی کے مشہور واعظ (چھوٹے دادا) کے قائم مقام ہوتے۔"

علامہ مغفور کے دادا مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کے حالات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ ۹-۱۰ محرم کی درمیانی رات وہ اپنے مکان میں شہادت نامہ پڑھتے تھے اور ساری گلی آدمیوں سے پٹ جاتی تھی۔ سننے والے دور دور سے آتے تھے۔ یہی وہ رات ہوتی جب مولوی صاحب مرحوم کے بڑے پوتے علامہ مغفور محلہ کی مسجد میں واقعات شہادت بیان کرتے اور دس تاریخ کی صبح ۹ بجے سے بارہ بجے تک اپنے مکان میں مولوی صاحب مرحوم کی بڑی پوتی علامہ مغفور کی حقیقی بہن مرحومہ زاہدہ بیگم صاحبہ واقعہ کربلا بیان کرتی اور شہادت نامہ پڑھتی تھیں۔

سلسلۂ وعظ کا یہ دور [illegible] سے [illegible] تک رہا۔ ادھر کلکتہ والی پھر محمد حسین صاحب کوئلے والے کا انتقال ہوا ادھر عصمت کو جاری ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں پھر ان کی والدہ مرحومہ کا جن کی خوشی کے لئے وعظ کہنا شروع کیا تھا سایہ سر سے اٹھ گیا تو وعظ کہنا چھوڑ دیا اور پھر تو دس سال تک نہیں کہا۔ دوبارہ کب کہا یہ ذکر آگے آئے گا۔

الخیری کا کیا مطلب ہے	بی بی حمید الزمانی بیگم اپنی والدہ مرحومہ کے انتقال

کے بعد محمد عبد الجبار صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی

تھے اور بعد میں جہاں مولانا محمد علی مرحوم رہتے تھے اور ہمدرد کامریڈ کا دفتر تھا اس مکان کے مقابل شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ مرحوم کا مکان تھا۔ ہمارے کرم فرما خواجہ حسن نظامی بھی جب شہر میں آتے تو اسی کے قرب و جوار میں ٹھہرتے تھے مولانا راشد الخیری کا گھر بھی قریب تھا۔ مرحوم قاری سرفراز حسین عزمی بھی زیادہ دور نہ تھے۔ علمی ذوق رکھنے والے نوجوانوں میں مسٹر آصف علی جو اب میدان سیاست کے شہسوار ہیں اُن کا گھر بھی میل والے مکان کے دیوار بہ دیوار تھا۔ میں صبح کچہری والے دفتر میں کام کرتا اور سہ پہر کو دفتر مخزن میں جاتا جس کی کارپردازی شیخ محمد اکرام کے ذمے تھی [illegible] وہیں مقیم تھے۔ شام کو محفل ادب گرم ہوتی۔ ہمارے مکرم آغا شاعر دہلوی اگر دہلی سے باہر نہ ہوتے تو اکثر وہ بھی رونق افروز ہوتے تھے۔ مولوی ذکا اللہ صاحب جن کے مقابلہ میں ہم سب خوردے تھے کبھی کبھی وہاں تشریف لاکر ہمیں مستفید کرتے تھے مگر باقی سب تو اکثر مل بیٹھتے تھے اور ہنسنے بولنے کے علاوہ اُردو کی ترقی کی صلاحیں مشورے ہوتے رہتے تھے۔"

ان سطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شام کو علامہ مغفور دفتر مخزن جایا کرتے تھے۔ توسیع تعلقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ۔

عصمت جاری ہوا۔ صبح زندگی لکھی گئی اور علامہ مغفور نے ملازمت چھوڑ دی!

گیارہ ساسوں کی بہو

والدہ مرحومہ فرمایا کرتی تھیں کہ میں گیارہ ساسوں کی بہو تھی۔ اپنی ساس۔ ساس کی ساس۔ تین پھوپیا ساسیں۔ چار خلیا ساسیں ایک ایک ممیا ساس اور چچیا ساس۔ ذرا کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو سب ہی کی فضیحتیاں سنی پڑتی تھیں۔ بتیس دانتوں میں ایک زبان تھی۔ ممیا ساس ذرا الگ تھلگ رہتیں اور چچیا ساس کا زیادہ وقت پردیس میں چچا ابا کے ساتھ گزرا۔ زیادہ واسطہ ساسوں سے پڑتا تھا وہ بات بات میں جمع ہو جاتیں اور ذرا سی بھی کوئی غلطی ہوتی تو خوب آڑے ہاتھوں لیتی تھیں۔ خفا ہوتی تھیں مگر محبت بھی کرتی تھیں۔

ساس بہو اور نند بھاوج کے تعلقات

جس گھر میں رات دن میں ریں چیں چیں رہتی ہے ساس بہو کے جھگڑے۔ نند بھاوج کی نوک جھونک آئے دن ہوتی رہتی ہے سکون و اطمینان اُس گھر سے غارت ہو جاتا ہے۔ علامہ مغفور کے بزرگ اُن پر خفا ہوتے تو وہ پلٹ کر کسی کو جواب نہ دیتے۔ ہنس ہنس کر سنتے اور معاملہ اہم ہوتا تو سنجیدگی اور خاموشی سے غور کرتے۔ اسی طرح ساس [illegible] اور نند بھاوج کے معاملات میں بھی بالکل دخل نہ دیتے تھے۔ انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات کو زبان سے نہیں اپنے طرز عمل سے یہ یقین دلادیا اور یہ حقیقت خوب اچھی طرح ذہن نشین کردی تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی بیوہ ماں کو رنجیدہ اور اپنی بہن کو افسردہ نہیں دیکھ سکتے نہ یہ گوارا کرسکتے ہیں کہ ان کی کسی پھوپی یا خالہ کو اُن سے شکایت ہو۔ سونے پر سہاگہ تھی ان کی رفیقۂ حیات کی طبیعت کی مسکینی عاجزی اور امن پسندی۔ اور وہ مجسمہ تھیں صبر و ضبط اور ایثار و قربانی کا۔ اُن کی رحلت پر میں نے جو مضمون لکھا تھا اس کا ایک حصہ یہ تھا۔

"میکے سے رخصت ہو کر سسرال پہنچیں تو دنیا ہی نئی تھی۔ غیر لوگ۔ جانے نہ پہچانے۔ نئی نئی صورتیں دیکھی نہ بھالی۔ میکہ میں عیب بھی ہنر ہے مگر سسرال

بھائی ... عیب نکالتے ہیں۔ وہاں کی خفگی
میں بھی پیار ہوتا ہے ... میاں کی محبت بلند کی بات
... غصے سے بدل جاتی ہے مگر اماں جان کچھ ایسی طبیعت
لے کر آئی تھیں کہ انھوں نے جلد ہی جھیوں کو اپنا بنالیا
ان کا عقیدہ تھا کہ شوہر سر کا تاج ہے اور ساس سر کا سرپوش
شوہر کی خوشنودی حاصل کرنا بیوی کا فرض اولین ہے تو
ساس کی اطاعت بھی ایک اہم فرض۔ چنانچہ انھوں
نے فرماں برداری اور خدمت گزاری سے چند سال ہی
میں اپنی ساس کا دل فتح کرلیا جو کام کرتیں ساس کی
اجازت اور مرضی سے۔ حد سے کھانے تک کے لئے پوچھتیں
"اماں جان اس وقت کیا پکاؤں؟" جب تک دادی
اماں زندہ رہیں اماں جان نے کوئی کپڑا بغیر اُن کی صلاح
اور مشورے کے خود نہیں خریدا۔

علامہ مغفور کو ملازمت کے سلسلے میں دس بارہ سال
باہر رہنا پڑا۔ آٹھ سال تک وہ ساس کے ساتھ ہی رہیں
اور آٹھ سال بعد جب میرٹھ کی ملازمت تھی پہلی دفعہ
ساس ان کو اپنے ساتھ لے کر گئیں وہ بھی اُس وقت
جب گود میں ایک بچی تھی۔

انھوں نے بیوہ ساس کو چھوڑ کر خود شوہر کے
ساتھ جانے کی کبھی خواہش نہ کی اور جب پردیس گئیں
تو اس بات کا خیال رکھا کہ ساس کو میری عدم موجودگی
میں جو تکلیف ہو رہی ہے اُس کی کسی حد تک تلافی کسی
نہ کسی طرح ہوتی رہے۔"

(عصمت مارچ سنہ ۱۹۴۴ء)

سردیوں کا زمانہ ہے۔ مولوی اشرف حسین صاحب
دلی آئے ہوئے ہیں۔ علامہ مغفور دفتر سے آکر دو گھنٹہ
گھر ٹھیرے اور پھر کھاری باولی پھوپی زاد بھائی کے پاس
چلے گئے۔ سارا گھر ۹ بجے سو گیا۔ اب صرف دو آدمی جاگ
رہے ہیں۔ بیوی جو بالعموم ساڑھے ... بجے تک مطالعہ کرتی رہتی
ہیں اور شوہر کو گرم کھانا کھلاتی ہیں اور بیوہ ماں جن کی جان
بیٹے میں پڑی ہوتی ہے۔ دس ساڑھے دس بج رہے
ہیں کہ کنڈی کھٹکھٹانے کی ہلکی سی آواز آتی ہے۔ بہو کنڈی
کھول کر آ رہی ہیں کہ ساس نے پہلے بیٹے کی خبر لی۔

"شریفوں کے گھر آنے کا بھلا یہ کیا وقت ہے؟
دولہن کی تکلیف کا تمہیں ذرا بھی خیال نہیں۔ اب کھانا کھلاتے
کھلاتے گیارہ بجے تک نیند آئے گی۔ دیر میں آنکھ کھلی اور
نماز قضا ہوئی تو خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ نیند نہیں بھرے گی۔
تو بیمار پڑ جاؤ گے۔" یہ تو دلی بھیج کر بیمار کو چلاتا ہوا اور پھر
بہو پر خفا ہونا شروع کر دیا۔

"مبارک زمانی! سارا قصور بیٹی تمہارا ہے۔ اگر تم
ایک دن کنڈی نہ کھولو اور باہر سردی میں سوں سوں کرتے
صبح ہو جائے تو آپ میاں کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ بھلے
آدمیوں کے گھر آنے کا یہ وقت ہے! تم تم ایسی بہو نکلیں
آئیں کہ سارا محلہ جاگ اٹھے۔ بیٹی کچھ دیر تو صبر کیا ہوتا۔
یہ کیا کہ آواز آتے ہی کنڈی کھولنے چلی گئیں۔ اتنی رات
گئے اب تم کھانا گرم کر کے کھلاؤ گی۔ تمہاری بھی جان ہے
یا نہیں ہے؟ یہ تو بڑے مزے میں ہے۔ کوئی سزا ملی ہوتی تو
آئندہ باز آتے۔ نہیں بیٹی تم نے ہی ان کی عادتیں بگاڑی ہیں"

رعب ٹھونسا نہیں جاتا۔ بری چیز رکھ رکھاؤ ہے۔
جو بو کر گندم نہیں کاٹا جا سکتا۔ انھوں نے افتاد ہی ایسی
ڈالی تھی کہ بیٹا بہو اُف کر سکتے تھے نہ چوں کر سکتے۔

مچھلی علامہ مغفور کا من بھاتا کھاجا تھا۔ جب مچھلی
والا جس کا نام حبیب ہوگا۔ ہفتہ میں دو تین دفعہ گلی کے
چکر لگاتا اور علامہ مغفور سے مڈ بھیڑ ہو جاتی تو مچھلی کی

علامہ منظور کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے میرے
... ساجدہ پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کا وقت قریب آیا
تو ان کی والدہ مرحومہ کا جو کمرہ ملا ہوا تھا وہ مغرب کے رُخ
تھا۔ علامہ منظور نے دفتر جانے سے قبل اپنی والدہ مرحومہ
سے عرض کیا۔

"اماں! آجکل گرمیاں ہیں۔ آپ کی بہو کے کمرہ میں
سہ پہر تک دھوپ بھری رہتی ہے۔ آپ مناسب
سمجھیں تو اس دفعہ اپنے دالان میں انتظام کر دیں۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انھوں نے بیٹے سے
کہا "نہیں وہ اپنے ہی کمرے میں جایا کریں۔ دلہن کیا خود
تم سے نہیں کہہ سکتی تھیں جو تم کو لگایا تھا اور تم نے اُن کے
کہنے میں آکر مجھ سے یہ کہا۔ عورتوں کے معاملہ میں تم دخل
دینے والے ہو کون؟ سیدھے سیدھے دفتر جاؤ اور آئندہ کبھی
کوئی ایسی بات نہ کہنا۔"

وہ اُٹھ کر دفتر چلے گئے۔ دوپہر کو وہ سمدھن کے
پاس پہنچیں اور کہا: "بہن سنا تم نے! دولہن نے اپنے میاں
سے کہا کہ اب کے جاپا میرے دالان میں ہو جائے۔ کیا وہ
خود مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھیں؟"

سمدھن نے کہا: "بہن آپ جانیں اور آپ کی بہو۔
تمھی نے دولھا میاں سے کہا تو واقعی غلطی کی۔"

ادھر اُدھر کی اور کچھ باتیں کر کے وہ چلی گئیں تو نانی
اماں مرحومہ نے بیٹی کو بلا کر نصیحتیں کیں اور معلوم ہوا کہ
انھوں نے اس بارے میں کوئی گفتگو کی ہی نہیں تھی۔ یہ
علامہ منظور کی اپنی تجویز تھی جو نامنظور کر دی گئی۔ غالباً زینب
ٹونک کی سیدانی جنھوں نے بی بی رشیدالنسانی کے
ہاں پناہ لی تھی اُن کا بچہ ابراہیم تو ان کے دالان میں پیدا
ہوا مگر بہو کے چار بچوں کے بعد یہ پانچواں جاپا بھی بہو کے
کمرہ میں ہوا۔ دو سال بعد جب ساجدہ بیگم پیدا ہوئیں تو
ساس نے خود ہی بہو سے کہا۔

"بیٹی گرمیاں ہیں۔ دھوپ تمھارے کمرے میں بھری
رہتی ہے اس دفعہ بچی کی پیدائش میرے یا بہو کے دالان
میں ہوگی۔"

بی بی رشید الزمانی اگر کمزور طبیعت کی ماں اور ساس
ہوتیں تو باوجود اس کے کہ طبعی شرافت میں بیٹا اور بہو دونوں
ایک دوسرے سے بڑھے ہوئے تھے مگر اُن کی غلطیوں پر
چشم پوشی اختیار کرتیں اور ڈھیلی ڈوری چھوڑ دیتیں یقیناً
دور اندیشی اور عاقبت بینی کے خلاف ہوتا چنانچہ واقعات
بتا رہے ہیں کہ اُن کے مزاج کی سختی بیٹے اور بہو دونوں کے
حق میں اکسیر ثابت ہوئی۔

"آج کی تہذیب میں پندرہ بیس سال کی چھٹائی
بڑائی بھی کوئی چیز نہیں۔ بیس سال کی لڑکی رشتہ
کے بزرگ سے چالیس سال کے عمر کے عزیزوں کا بے
تکلف نام لیتی ہے لیکن اماں جان نے رشتہ میں بڑی
ہونے کے باوجود نند کا نام کبھی نہیں لیا ہمیشہ بہن کہا
اور پھوپی اماں نے بجائے بھابی کہنے کے دولہن پکارا۔
ہم بھائی بہنوں کا بچپن جس گھر میں گزرا ہے پھوپی اماں
وہیں رہتی تھیں اور اُن کے بچوں کی اور ہماری خوب
لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اور کبھی ہم بالکل بے قصور ہوتے
تھے مگر ابا جان یا اماں جان کبھی اپنے بچوں کی حمایت میں
بول کر پھوپی اماں کے جذبات مجروح نہ کرتیں۔ ابا جان
کوئی کپڑا یا کھانے کی چیز لاتے تو اماں جان سب سے پہلے
پھوپی اماں اور ان کے بچوں کا حصہ بھیج دیتیں اُس کے بعد
ہم چھو سکتے تھے۔

[illegible] میں جب ہم کرایہ کے مکان میں چلے گئے اور

پھوپی اماں اپنے ذاتی مکان میں تو شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہوگا جس میں کم سے کم ایک دفعہ اماں جان اُن سے ملنے نہ گئی ہوں یا پھوپی اماں کو نہ بلایا ہو۔ بغیر اُن کے صلاح مشورے کے کبھی کسی قسم کی تقریب کا خیال تک زبان پر نہ لاتیں۔"

عصمت مارچ ۱۹۴۴ء

پھوپی اماں [illegible]ء میں بیوہ ہوئیں تو روزانہ دوپہر کا کھانا ان کے بھائی کے ہاں سے جاتا تھا سوائے اُس زمانے کے جب ہم گنگا پور جایا کرتے تھے۔ علامہ مغفور کی رحلت کے بعد بھی پھوپی اماں کا دوپہر کا کھانا ان کی بھاوج آخر وقت تک روزانہ بھیجتی رہیں۔ حالانکہ پھوپی اماں کی جائداد تھی اور چار چار بیٹے جوان کماؤ تھے۔

باپ اور بیٹا

۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء وہ زمانہ تھا جب علامہ مغفور کی عمر انتالیس چالیس سال تھی۔ اُن کے والد حافظ عبدالواحد صاحب کا انتقال ۵۹ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ کئی باتوں میں بیٹے باپ کا ہو بہو نمونہ تھے اور بعض باتوں میں باپ سے مختلف۔

باپ نے اپنے بزرگوں سے چھپ کر انگریزی پڑھی اور اس قدر قابلیت بڑھائی کہ بقول مولانا عبدالغفار صاحب "کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ ہندوستانی بول رہا ہے۔" بیٹے نے سکول کے مضامین میں خاص طور پر انگریزی میں دلچسپی لی تو کلاس ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر نے اور ملازمت کے زمانہ میں اُن کے لکھے ہوئے ڈرافٹ اور ترجموں کی اُن کے افسروں نے تعریف کی۔

باپ نے جم کر نوکری نہیں کی۔ بقول مولانا عبدالغفار صاحب "چار سو کی چھوڑ سو کی کسل وہ چھوڑی ۳۰۰ کے ہو گئے۔ مشہور تھا کہ نوکری اُن کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے چلتی ہے۔" بالکل یہی حال بیٹے کا تھا۔ اٹاوہ میں جی نہ لگا۔ دلی آ گئے پھر ان کے چچا تایا نے ناشپہ تبادلہ کروا دیا گھوڑے سے گرے نوکری چھوڑ دی۔ پھر کی تو جی بھر گیا۔ دلی واپس آئے۔ آخر ڈی اے جی کے دفتر میں ۷۔۸ سال رہ کر بیالیس۴۲ سال کی عمر میں ہمیشہ کے لئے نوکری کو خیرباد کہہ دیا۔

باپ نے بڑی بڑی تنخواہوں پر نوکری کی مگر روپیہ جمع نہیں کیا۔ بہت فیاض اور سخی تھے۔ بیٹے اس معاملہ میں باپ سے پیچھے کیوں رہتے۔ جو آیا خرچ۔ جمع کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔

باپ کی خوش الحانی بیٹے کو ورثہ میں ملی۔ (بیٹی بھی بہت خوش الحان تھیں) "حافظ صاحب" رمضان المبارک میں محراب سناتے تو سننے والے سُن ہو جاتے "مولوی صاحب" کوئی نوحہ یا مولانا رُوم اور میر حسن کی مثنویوں کے اشعار پڑھتے تو پتھر دل پسیجتے میں نے بھی دیکھے ہیں۔

باپ بہت دبنگ انسان تھے تو بیٹے کے چہرہ پر بھی بہت رُعب اور دبدبہ اور آواز میں کڑاکا تھا۔

مخلصانہ ہمدردی اور خدمت خلق حافظ عبدالواحد صاحب کا ایک بڑا وصف تھا اور علامہ راشد الخیری کی عملی زندگی میں انسانیت کا ایک بڑا جزو۔

باپ نے کسی ملازم کو خود علیحدہ نہیں کیا۔ بیٹے نے بھی کسی نوکر کو خود جواب نہیں دیا۔

مگر باپ بیٹے کے خیالات اور طبائع میں اختلاف بھی تھا۔

باپ نے انگریزی لباس پہنا اور مغربی معاشرت بھی اختیار کر لی تھی۔ بیٹے نے انگریزی لباس بہت کم بہر حال پہنا۔ اور ریل کے سفر میں یورپین درجہ میں سفر کرنے کی غرض سے ہیٹ بھی لگایا مگر معاشرت خالص مشرقی رہی۔

منگواتی تھیں جیسے چاری دال دیتی تھی اور سال بھر تک یہ مونگ کی دال دو روپیہ کی چلتی تھی۔ اُس زمانہ میں چینی نہیں ہوتی تھی کھانڈ تین آنے سیر آتی تھی اور باگڑ کا گڑ روپیہ کا ۸ سیر باریک چاول ۱۰ سیر کے البتہ کنکی ایک روپیہ کی ۸ سیر۔ سرسوں کا تیل روپیہ کا ۵ سیر مٹی کے تیل کی بوتل ۵ یا ۴ پیسے کی آتی تھی بڑے کا لوا ایک آنہ سیر۔ اروی بھجیا کے لئے چھوٹے آلو ۲ پیسے سیر گوبھی کا پھول خوب بڑا ایک آنہ یا تین پیسہ کا۔ چقندر شلجم دو دو پیسے سیر۔

لٹھا ایک روپیہ کا ۸ گز۔ مہین ململ ایک روپیہ کی ۸ گز موٹی ململ ایک روپیہ کی ۱۰ گز۔

چھالیہ جہازی ایک روپیہ کی ۴ سیر۔ کتھا ایک ۱۰ روپیہ چار آنے کا سیر بھر۔ قلعی سیسہ کی تانبے کے برتنوں پر ایک پیسہ میں دو درکا بیاں۔ پتیلی اوسط درجے کی دو پیسے۔ پانی کے کونڈے ایک پیسہ میں دو۔ انگنائی ہر مکان میں ہوتی تھی۔ ایندھن لکڑیاں اور کوئلے عام طور پر کم زیادہ تر اُپلے جلائے جاتے تھے اور من بھر کا گٹھا چار آنے کا آتا تھا۔ پانی کی مشک ایک پیسے کی دو۔ اُس زمانہ میں مکان بنوائے جاتے تو راج کو ۸ آنے اور بیلدار کو ۴ آنے دئے جاتے تھے۔ منھائی گھی کے بھاؤ ملتی تھی۔ مہنگی سے مہنگی دو پیسہ سیر۔ گڑ کی گجک (گزک) پیسے کی چار آنے سیر۔ تلوں کے ۵ آنے سیر۔ کرسیاں بیت کی ڈھائی ڈھائی روپے علامہ مغفور نے ۱۹۰۵ء میں خریدی تھیں۔ چیجی دھلائی کا رواج عام طور پر نہ تھا ہمارے ہاں دھوبن کو ایک روپیہ مہینہ جاتا تھا۔ ماما کی تنخواہ ایک روپیہ تھی اور خشک تنخواہ یعنی بغیر کھانے کے تین روپیہ مہینہ۔ بھنگن آٹھ آنے مہینہ۔ کرایہ کا مکان دالان در دالان ایک کمرہ دو کوٹھڑیاں خاصہ بڑا صحن ۶-۷ روپیہ ماہوار میں شرفا کے محلہ میں مل جاتا تھا۔ کرکٹ فٹ بال میچ کے ٹکٹ نہیں ہوتے تھے۔ سینما بھی اُس زمانہ میں نہ تھا۔

تھیٹر سرکس دنگل کا ٹکٹ چار آنے آٹھ آنے ایک روپیہ ہوتا تھا۔ ایک پھول کی مردانی جوتی سلیم شاہی بارہ چودہ آنے کی اور گول پنجہ کی زنانہ جوتی بارہ آنے کی آتی تھی۔

پوسٹ کارڈ ایک پیسہ لفافہ دو پیسہ۔

کالی سیاہی العنخانی ایک پیسہ کی پڑیا دو اسٹیل نیزے ایک پیسے کے دو۔ ہولڈر دو پیسہ کا تب یعنی تختی ایک پیسہ کی۔ سفید کاغذ کا ایک دستہ یعنی ۲۴ کا غذ چھ پیسے۔ میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا تو فیس تیرہ آنے جاتی تھی چھٹی جماعت میں ایک روپیہ دو آنے میٹرک میں سوا دو روپے گڈیاں (پتنگ) دو مرچیل (پیسے کی چار) دھیل چیل پیسے کی دو اتھاڑی پتنگ دو پیسہ کی۔ ڈور کا ریل شیر مارکہ ۵ پیسے کا۔ بھوت مارکہ چھ پیسے کا۔ ٹینس کی پرانی گیند جو ربڑ کی گیند کہلاتی تھی اور جس سے ہم فٹ بال کھیلتے تھے تین آنے کپڑے کی گیند جس سے گھر میں گیند بلا کھیلتے ایک پیسہ کی۔ کرکٹ بال چمڑے کی پانچ آنے کی۔ ہاکی سٹک تیرہ آنے۔ تاش کھردرے کاغذ پر ایک آنہ چکنے دو آنے۔ شطرنج لکڑی کے مہرے چھ آنے ایک پیسے کی مونگ پھلیوں میں اچکن کی جیب بھر جاتی تھی اسی طرح ایک ایک پیسہ کے جھاڑی بوٹی کے بیر۔ باغی بیر۔ سنگھاڑے۔ امرود یا لوکاٹ آٹھ میں اور اسی طرح ایک ایک پیسے کے سہال۔ نمکین سیو۔ بہادر شاہی سیو میں پیڑے پیسے کے چھ آتے تھے۔ ملائی کے لڈو۔ گولے کے کباب (سیخ کے) پیسے کے دو گولے۔ کلیجی پانی میں اُبلی ہوئی ایک پیسہ میں دونا بھر جاتا تھا۔ انڈا ایک پیسہ۔ بسکٹ جواب ایک آنے کا آتا ہے اس زمانہ میں بنڈل کا کہلاتا تھا اور ایک پیسے میں دو آتے تھے۔ چھوٹے ایک پیسے کے چار۔ علی گڑھ کے بسکٹ اچھے ہوتے تھے۔ ڈبل روٹی جواب چھ آنے کی آتی ہے اسے اُس وقت نان پاؤ کہتے تھے اور دو پیسہ کی ملتی تھی بیوٹیاں تو کراچی میں

...نہیں دو آنے کی ایک جیتی مرغی پچھی آتی ہے۔ اتنی
...روپے کے پیسے جوڑیاں تی تھیں اور صبح اس کا ناشتہ
...گوشت کی سالن سے اور شیروانی کی۔ دو روپے
پائی ہی وقت دس روپے پر شملہ دہ روپیہ
ملتی تھی۔ سوٹ کیس بائیس روپے کا تھا اور
...دلی جوا تھا ہی بھی کہلاتی تھی پندرہ روپے کی ہوتی
...نے اور استعمال کے برتن تانبے کے ہوتے تھے اور
...تا جو دہ آنے سیر تھا۔

عصمت کا اجرا

سر شیخ عبد القادر مرحوم کے جس مضمون کا ذکر صفحہ ۱۱۲ پر ہے اس میں فرماتے ہیں:۔

انھیں دنوں میں دوستانہ مراسم کے علاوہ مولانا راشد الخیری نے دفتر مخزن کا کچھ علمی کام اپنے ذمے لے لیا۔ ...دونوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک رسالہ عورتوں کے فائدے کے لیے بھی جاری کیا جائے۔ مشورہ سے یہ قرار پایا کہ شیخ محمد اکرام اس رسالہ کی ایڈیٹر ہوں اور مولانا راشد الخیری اس کے لیے مضامین لکھیں جو لڑکیوں کے لیے خاص طور پر موزوں ہوں جنھیں پڑھنے سے انھیں دلچسپی بھی ہو اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہو۔ بہت غور و فکر کے بعد اس رسالہ کا نام عصمت تجویز ہوا اور رسالہ بڑے آب و تاب سے نکلا اور نکلتے ہی مقبول ہوا ... [illegible]ء میں میں نے اپنے پرانے مسکن یعنی لاہور کی راہ لی۔ مخزن پھر لاہور سے شائع ہونے لگا مگر عصمت بدستور دہلی سے شائع ہوتا رہا۔"

کوچہ چیلاں کے پیل والے مکان سے جہاں مخزن کا دفتر تھا بعد میں کامریڈ اور ہمدرد کا دفتر ہوا عصمت جاری ہوا اور ایسی شبھ گھڑی کا جاری ہوا کہ آج ۵۶ سال سے مسلسل نکل رہا ہے چونکہ علامہ مغفور اس زمانہ میں سرکاری ملازم تھے ایڈیٹر یا مرتب کی حیثیت سے ان کا نام رسالہ پر نہ چھپ سکتا تھا۔ [illegible]ء میں جب انھوں نے ملازمت چھوڑی تو ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا نام ٹائیٹل پر بھی لکھا جانے لگا اور اب انھوں نے اپنے نام سے مضمون نگاروں سے خط و کتابت شروع کر دی۔

صبح زندگی

عصمت جب جاری ہوا تو علامہ مغفور سرکاری ملازم تھے اور طویل طویل چھٹیاں لیتے رہتے تھے۔ اس زمانہ کا ذکر سر شیخ عبد القادر صاحب نے اپنے مضمون "قم باشد" (مطبوعہ راشد الخیری نمبر [illegible]) کیا ہے اور لکھا ہے۔

"ایک دن میں نے مولانا راشد سے کہا کہ جو مضامین وہ لکھ رہے ہیں وہ بجائے خود مفید ہیں۔ اگر وہ ایک کتاب لکھیں جس میں کہانی کا بھی لطف ہو اور لڑکیوں کے لئے معلومات بھی ہوں تو اس سے لڑکیوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ لکھیں گے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کتاب کا نام میں نے تجویز کیا۔ جب مولانا نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تو اکثر ایسا ہوتا رہا کہ جو حصہ لکھا جاتا وہ شام کو پڑھا جاتا یعنی مولوی صاحب پڑھتے اور محمد اکرام اور میں سنتے اور حسب موقع داد دیتے۔ صبح زندگی بعد تکمیل مخزن پریس سے شائع ہوئی اور اسے قبولیت عام کا خلعت حاصل ہوا۔ پہلی اشاعت کا حق دفتر مخزن نے مولانا مرحوم سے لیا تھا۔"

مخزن میں علامہ مغفور کے جو مضامین شائع ہوئے ان میں سے کئی مضمونوں کے لکھنے کی ترغیب کی داستان دلچسپ تھی ایک دن انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ابّا میاں سائرہ تو بہت بری لڑکی تھی جس کا حال تم نے لکھا ہے اب ایک ایسی لڑکی کا حال لکھو جو بہت ہی اچھی تھی۔ بیٹے نے کہا

اماں وہ کون سی لڑکی تھی۔ ماں نے کہا میں بتاؤں گی۔

مرحومہ بی بی رشید النساء کی تواڑی پلنگ پر سفید چادر بچھی رہتی تھی وہ تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ جاتیں اور ان کے بیٹے یا تو پائنتیوں اسی پلنگ پر بیٹھتے (اپنے بزرگ کے پلنگ پر وہ پائنتیوں ہی بیٹھتے تھے) اور وہ تو ماں تھیں جن کے پاؤں میں جنت تھی) اور یا برابر میں کھڑی چارپائی پر لیٹ کر اپنی اماں سے باتیں کرتے۔ ماں واقعات سناتیں اور بیٹے بہت غور سے سنتے۔ جس زمانہ میں شیخ عبدالقادر صاحب نے صبح زندگی کی فرمائش کی تھی یہ انھیں دنوں کی باتیں ہیں۔ ایک دن کہیں سے حصہ آیا تھا میں پانچ سال کا تھا۔ حصہ دیکھ کر مچلنے لگا جب جماری چلی گئی اور اماں طشتری میں سے میرے لئے نکالنے لگیں تو ان کی ساس کی ڈانٹ پڑی۔

"خبردار دولہن مجھ سے برا کوئی نہیں جو تم نے اس وقت رازق کو جیبہ بھر بھی دیا۔ کیا اس نے کبھی حصہ نہیں دیکھا۔ ایسا ندیدہ ایسا بدنیت اٹھاؤ گی تو پھر سر پہ ہاتھ رکھ کر روؤ گی۔ بیٹی کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نظر سے۔"

حضرت والد مرحوم کے سامنے کا یہ واقعہ ہی صبح زندگی کا پہلا واقعہ ہے۔

آپا کی اور میری تربیت بڑی توجہ سے ہو رہی تھی اور کئی واقعے ان سے اور مجھ سے متعلق ہیں کئی واقعات وہ ہیں جو مصنف کی والدہ نے سنائے تھے۔ وہ پرانے گیت رسمیں کہاوتیں بیوی اور ماں سے پوچھتے رہتے تھے۔ اور جب ان کی والدہ گیت گا کر سناتیں یا کوئی کہانی کہتیں یا کوئی واقعہ بیان کرتیں تو وہ بڑی توجہ سے ایک ایک لفظ سنا کرتے تھے صبح زندگی میں کھانے پکانے اور سینے پرونے کے ابواب علامہ مغفور نے اپنی رفیقہ حیات کے مشورے سے لکھے تھے۔

جب صبح زندگی شائع ہوگئی تو مجھے یاد ہے اس کا معاوضہ ڈیڑھ سو روپے سر عبدالقادر مرحوم خود لائے تھے اور چاندی کی ایک کشتی میں روپے رکھ کر دئے تھے اور یہ کشتی اپنی والدہ مرحومہ کی خدمت میں مصنف نے نہایت ادب اور عاجزی سے جھک کر پیش کی تھی۔ اور دادی اماں نے آنکھیں لگا کر بہت سی دعائیں دی تھیں۔ انھوں نے صبح زندگی شروع سے آخر تک پڑھوا کر سُنی تھی اور زیادہ حصہ خود بیٹے ہی نے ماں کو سُنایا تھا۔

صبح زندگی کے معاوضہ کی جو رقم ڈیڑھ سو روپیہ دادی اماں کو لا کر علامہ مغفور نے دی تھی اس میں پوتی یعنی آپا راشدہ کے لئے دو بالیاں بنوائی گئی تھیں چار چوڑیاں بہو کے لئے اور دو بیٹی کے لئے۔

شیخ محمد اکرام

شیخ صاحب لاہور کے رہنے والے اور شیخ عبدالقادر مرحوم کے بہت عزیز دوست اور مخزن کی ادارت میں ان کے شریک تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جب مخزن کا دفتر دلّی آگیا تو شیخ محمد اکرام صاحب دفتر مخزن ہی میں مقیم رہے۔ میں انھیں چھوٹے شیخ صاحب اور شیخ عبدالقادر صاحب کو بڑے شیخ صاحب کہتا تھا۔ شیخ محمد اکرام خوش لباس خوش خوراک بہت شاندار آدمی تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مخزن لاہور چلا گیا تو نہ صرف "عصمت" کی بلکہ "تمدن" کی ادارت میں بھی جو علامہ مغفور نے ۱۹۱۱ء میں جاری کیا تھا ان کے شریک رہے۔ بہت اچھے منتظم تھے اور دفتر مخزن و عصمت کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں وہ بیرسٹری کے لئے لندن چلے گئے اس زمانہ میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گذرا کہ علامہ مغفور کا خط انھیں اور ان کا خط علامہ مرحوم کو نہ ملتا ہو کیونکہ شیخ صاحب کو خرچ وغیرہ بھیجنے کا انتظام بھی علامہ مغفور کے ذمہ تھا۔

[illegible] خارج
ہوگئی۔ [illegible] کے بعد پنجاب یوپی کے کئی شہروں میں
انھوں نے پریکٹس کی آخر میں سرکاری وکیل بھی ہو گئے
تھے۔ [illegible] کے بعد فالج نے انھیں نیم جان کر دیا تھا۔
کئی کتابیں بھی لکھیں تھیں اور عورتوں کے لئے ایک رسالہ
"انیس نسواں" بھی انتقال سے ۳-۴ سال قبل جاری
کیا تھا۔ [illegible]ء میں دلی میں انتقال ہوا۔

تھیٹر اور سرکس

[illegible] یا [illegible] کا ذکر ہے علامہ مغفور نے ایک دن اپنی والدہ مرحومہ سے کہا۔

"اماں ایک بہت بڑے مولوی آئے ہوئے ہیں۔ عشاء کے بعد وعظ شروع کرتے ہیں اور دیر تک کہتے رہتے ہیں۔ بہت آدمی جاتے ہیں اور جب تک ختم نہ کرلیں کوئی اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا۔"

اُنھوں نے کہا "وعظ کہاں کہتے ہیں؟"

"قریب ہی چھپل والوں میں۔"

"آج بھی وعظ ہے۔"

"جی ہاں آپ چلیں تو اپنی بہو اور زاہدہ سے بھی کہہ دیں ثواب کا کام ہے بچے بھی سُن لیں۔"

"اچھی بات ہے۔"

چاندنی کی رات تھی۔ علامہ مغفور کے پاس دو وقتی [illegible] تھے لیکن انھوں نے پہنا ایک۔ ان کے بہنوئی سید عبدالعزیز صاحب سے جنھیں وہ "میر صاحب" کہتے تھے۔ اُن سے کان میں کچھ کہا۔ وہ ذرا پہلے روانہ ہوئے اور [illegible] اور بچے سب عشاء کے بعد دادی اماں مرحومہ کے فرشتوں نے بھی کبھی تھیٹر نہیں دیکھا تھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے [illegible] درجہ کا ٹکٹ آٹھ آنے تھا اور مردوں کے ٹکٹ چار آنے آٹھ آنے ایک روپیہ اور دو روپیہ کے۔ مردوں کا بھی آٹھ آٹھ آنے کا ٹکٹ لیا گیا تھا۔ تماشہ تھا "کنگ لیئر" کنگ بھائی تھا [illegible] باپ کو قتل کر کے [illegible] بالآخر بھتیجے سے شکست کھائی اور گرفتار کر کے پہنچا۔ دادی اماں نے ماں نے بھی اماں نے غالباً سب سے [illegible] سب سے پہلے تھیٹر دیکھا تھا۔ تماشہ ڈیڑھ بجے ختم ہوا اور دو بجے کے قریب ہم گھر ہوئے۔ اُس زمانہ میں سڑکوں پر بہت [illegible]۔ ہلکی روشنی لالٹین کی ہوتی تھی سپاہی دریافت کرتا کون اور راہ گیر اس سناٹے میں جواب دیتا "رعیت"۔ پھر سپاہی کو یہ بھی بتانا پڑتا کہاں سے آئے کہاں جا رہے ہو اور اس وقت کیوں گھر سے باہر ہو۔ دادی اماں راستہ میں خاموش رہیں اور گھر آکر بھی کچھ نہ بولیں صبح جب بیٹے سلام کو حاضر ہوئے تو سلام کا جواب نہیں دیا۔ کھڑے رہے ماں نے منہ پھیر لیا۔ پاس بیٹھ گئے تو ماں نے خفا ہونا شروع کیا۔

"اب جھوٹ بھی بولنے لگے۔ شاباش بیٹا شاباش۔ خدا کا خوف بھی دل سے جاتا رہا یہ بھی خیال نہ کیا کہ بڈھی ماں کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے [illegible] جم جم ایسی بہوئیں آئیں جو خاندان کی ناک کٹائیں تم نے بھی مجھے نہ بتایا کہ یہ ناٹک دکھانے جا رہا ہے"

بہو کو پہلے سے کچھ معلوم نہ تھا دم بخود خاموش تھیں۔

بیٹے نے کہا "اچھا اماں یہ بتایئے تماشہ تھا کیسا؟"

"بھاڑ میں گیا تماشہ۔ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا یہ بتاؤ۔"

بتلانے کیا ماں خفا ہوتی رہیں اور بیٹے ہنستے رہے۔ اور پھر ماں کی گود میں لیٹ گئے۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ بیوی کو تھیٹر دکھانے کے بہانے

[illegible] کرگئے اُن کی دلی خواہش یہ تھی کہ اماں بھی تھیٹر دیکھ لیں۔ ورنہ سارے گھر کو لے جانے کی ضرورت نہ تھی۔

اور چند ماہ بعد بیچ کہہ دیا "اماں ایک بڑا زبردست سرکس آیا ہوا ہے شیروں ہاتھیوں کو ایسا سدھایا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایسے ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے"۔ وہ نہیں نہیں کرتی رہیں مگر ماں کو رضامند کرنے میں زیادہ کوشش نہ کرنی پڑی کیونکہ اپنی پچھاڑ والی خالہ اماں "کو سکھا پڑھا کر لے آئے تھے۔ انھوں نے بھانجے کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور سب سے پہلی دفعہ سرکس بھی ہم نے اُسی سال دیکھا۔

بہن کی بیوگی

علامہ مغفور کے بہنوئی۔ بی بی زاہدہ بیگم کے شوہر میر عبدالعزیز صاحب بہت زندہ دل اور بے فکرے انسان تھے۔ مکانوں کا کافی کرایہ تھا اس لئے ملازمت وغیرہ کی انھوں نے پرواہ کی ہی نہیں۔ سالے بہنوئی میں بہت محبت تھی اور میرٹھ اور علی گڈھ کے زمانہ میں "میر صاحب" کئی کئی ہفتہ علامہ مغفور کے پاس جاکر رہتے تھے۔ انھیں شطرنج پتنگ بازی سیر تماشہ کا بھی شوق تھا اور خربوزے لڑانے کا بھی۔ باتار گئے دیکھا خربوزے والے کی دوکان پر جمگھٹ ہے شرط ہو رہی ہے کہ یہ میٹھا دوسرا کہہ رہا ہے۔ نہیں یہ میٹھا ہے اب دونوں خربوزے کاٹے گئے قتلہ قتلہ ایک پھانک کا ہم۔ ہ آدمیوں نے دونوں خربوزوں کو چکھا اور بتایا کس کا خربوزہ زیادہ میٹھا ہے۔ جس کا خربوزہ زیادہ میٹھا نکلا اس نے دونوں خربوزے جیت لئے اور ہارنے والے نے دونوں کی قیمت ادا کی۔ پھوپا ابا کو خربوزے کی بڑی اچھی پہچان تھی۔ وہ خربوزے لڑاتے اور جیتتے یہ اُن کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ آٹھ آٹھ۔ دس دس خربوزے اسی طرح جیت کر لایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اور پھوپی اماں دوپہر کے کھانے کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے شطرنج کھیلتے رہے کھیل [illegible] اماں نے کچھ پیسے دے کر خربوزے لے آؤ مگر دیکھ [illegible] لانا۔ انھوں نے پیسے بچوں کو دے دئے اور باہر گئے۔ آنا جانا کے چھت کے چھت گرائی جا رہی تھی پرانے زمانہ کا چونا لگا تھا کہ کدالیں ٹوٹ رہی تھیں مگر چھت نہ ٹوٹتا تھا۔ طاقتور اور جانباز تو وہ تھے ہی مزدوروں کے پاس پہنچ کر کہنے لگے کیسے نہیں ٹوٹتا لاؤ مجھے دو کدال۔ پہلی کدال بہت کامیاب رہی۔ اب جو دوسری دی تو چھت کے ساتھ ہی وہ بھی نیچے اور ٹانگیں اُس میں پھنسی ہوئی! ہنس ہنس کر لوگوں سے اُسی حالت میں باتیں کرتے رہے۔ خدا ہی جانتا ہے کس طرح نکالا ہوگا۔ اب جو ٹانگوں پر نظر پڑی تو ہڈیاں چور چور ہو چکی تھیں۔ دیکھا اور غش آگیا۔ سول ہسپتال پہنچایا گیا جو جامع مسجد کے پاس تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ علامہ مغفور دفتر گئے ہوئے تھے شام کو گھر واپس آ رہے تھے کہ راستہ میں معلوم ہوا۔ اُلٹے قدموں ہسپتال پہنچے تو اُوپر کا سانس اُوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ بی بی رشید النسائی کو داماد کی جو یہ خبر پہنچی تو گُم سُم تھیں اب جو بیٹے کے بھی گھر آنے میں دیر ہوئی تو اُن کی پریشانی ناقابل بیان تھی معمول سے دو گھنٹہ بعد وہ گھر آئے۔ اور سب کو تو انھوں نے دلاسہ تسلی دی مگر ماں سے کہہ دیا میر صاحب اگر بچ جائیں تو معجزہ ہی ہوگا۔ دونوں ٹانگیں کاٹی گئیں اور تیسرے روز ان کا انتقال ہوگیا۔ میر صاحب جیسے محبت کرنے والے بہنوئی کی جوانمرگی اور بہن کی بیوگی کا جتنا بھی ملال ہوتا کم تھا۔ اچھی خاصی جائیداد پھوپا ابا چھوڑ کر گئے تھے اور بعد میں اُن کی پھوپی کی طرف سے کئی مکان ملے تھے۔ باوجود اس کے کہ بہن سے بہت محبت کرتے تھے مگر بہن اور ان کے بچوں کی جائیداد کے معاملات میں علامہ مغفور نے دخل

[illegible] بتانا سب [illegible]

[illegible] راشدہ کا [illegible] — [illegible] اماں کے مکان کا گھر [illegible] سامنے آیا

[illegible] سدہ کے [illegible] سے چھلا [illegible] گرانے
[illegible] جان کی رشتہ کی بہنیں [illegible] سیدن اور نار
[illegible] میدن کرا با جان [illegible] دیئے جاتے۔ رشتہ کنبہ کی
[illegible] رکیاں آتیں۔ کڑاہی چڑھتی۔ پکوان اترتے گلگلے
[illegible] میں چھانتیں اور ہنس ہنس کر لڑکیاں بالیاں
[illegible] کی گیت گاتیں۔ دادی اماں کی زندگی تک یہ چہل
[illegible] راشدہ کے چہرے کے کلاوے جاتے تھے۔ دادی
[illegible] ماں۔ پھپھی اماں تینوں خوش ہوتی اور کام کرتی
[illegible] اماں بی یعنی نانی اماں کا گھر بھی ملا ہوا تھا وہ بھی
تشریف لے آتی تھیں، بڑی گہما گہمی ہوتی تھی اور علامہ
مغفور اس کا خوب لطف اٹھایا کرتے تھے۔

دفتر عصمت مٹیا محل میں ۱۹۰۹ء — ۱۹۰۹ء میں کوچہ چیلاں

کے اس تاریخی مکان سے جو میل والا مکان کہلاتا تھا۔
جہاں سے عصمت جاری ہوا تھا دفتر مٹیا محل آگیا۔ مرحوم
عبدالرحیم خاں کے مکان کے قریب۔ یہ مکان دو منزلہ اور
بہت بڑا تھا۔ سامنے دالان در دالان تھا جہاں کلرک
خزانچی کاتب وغیرہ بیٹھتے تھے۔ بیچ کی کوٹھڑی میں جہاں چلمنیں
پڑی رہتی تھیں علامہ مغفور مضامین لکھتے۔ مضمون نگاروں
سے خط کتابت کرتے اور آنے والوں سے ملتے تھے پیچھے
کے دالان میں پریس تھا۔ غرض چند ماہ بعد لاہور چلا گیا
اور عصمت اس وقت تک اسی مکان سے نکلتا رہا۔
جب شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹری کے لئے
ولایت گئے۔

ماں کا سایہ بھی اٹھ گیا — [illegible] میں علامہ مغفور کی والدہ ماجدہ علی امیر بیگم

رشید النساء صاحبہ کا بابرکت سایہ اٹھ گیا۔ اپنی بیوہ
ماں کو خوش رکھنے اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کی جو
کوشش علامہ مغفور کرتے رہے اور جیسی ان کی خدمت
کی اس زمانہ میں تو اس کی مثال ذرا مشکل سے ملے گی۔
بٹلر اور لیہ۔ ان کے انگریز افسر ان سے بہت خوش تھے
اور اپنے ساتھ یہ دونوں دورہ [illegible] بڑی تنخواہ پر لے جانا
چاہتے تھے مگر ماں کی خوشنودی کے لئے انھوں نے اس کی
بھی پرواہ نہ کی۔ وہ کہتی تھیں بس کوئی ریل گاڑی تک
کی نوکری کرو۔ تین چار گھنٹہ سے زیادہ کا سفر نہ ہو۔ اور
اتوار دلی میں گزرے۔ دادی اماں کو اپنے شوہر کی طرف سے
شکوہ نہ پہنچا مگر بیٹے نے بیوہ ماں کا دل مٹھی پر لے رکھا تھا
اور کوئی کام ان کی مرضی کے بغیر نہ کرتے تھے۔ وہی ہوتا تھا
جو وہ چاہتی تھیں۔ خدا نے بہو بھی خدمت گزار اور اطاعت
شعار دی تھی جس کا عقیدہ یہ تھا کہ شوہر کی رضامندی ساس
کی خوشنودی پر منحصر ہے۔ ملازمت کے زمانہ میں تنخواہ لاکر
وہ بیوی کو نہیں ماں کو دیا کرتے تھے اور جھک کر ہاتھ پر
ہاتھ رکھ کر نہایت ادب سے۔ جب دادی اماں کا انتقال
ہوا تو علامہ مغفور کی شادی کو بیس سال ہو چکے تھے وہ اس
وقت دس بچوں کے باپ تھے مگر براہ راست ایک پیسہ
بھی بیوی کو نہ دیتے تھے۔ تنخواہ دادی اماں اپنے ہاتھ سے
اماں کو دیتیں اور بیچ میں کوئی ضرورت اشد پیدا ہو جاتی
تو ساس سے ہی کہتی تھیں۔ دادی اماں کی بیماری میں آپا
نے جو خدمت کی اس کی تفصیل آپا راشدہ بیگم نے اپنے
اس مضمون میں لکھی تھی جو عصمت راشد الخیری نمبر میں
شائع ہوا تھا۔ مضمون کا یہ حصہ علامہ مغفور کی انسانی

[illegible] کے [illegible] آنے کا انتقال [illegible] کردی تھی۔

”جس طرح تم نے مجھے خوش رکھا اسی طرح خدا تم کو خوش رکھے۔“ وہ جب قبر کا انتظام کرنے خواجہ باقی باللہ گئے تھے تو میں دس سال کا تھا اور اُن کے ساتھ گیا تھا۔ دو دفعہ ان کی طبیعت بھر آئی تھی اور آنسو ڈاڑھی پر گر رہے تھے۔ اُن کے یہ الفاظ مجھے یاد ہیں۔

”آج دعاؤں کا دروازہ بند ہوگیا۔“

[illegible]ء کا ایک خط

علامہ مغفور کی چچازاد بہن حامدہ بیگم مرحومہ کی پرورش شوسا میں دادی اماں نے کی تھی اور پھر ان کی چھوٹی پھوپی اماں نے جن کا کوئی بچہ نہ تھا اُنھیں بیٹی بنا لیا تھا۔ پھوپی حامدہ بیگم مرحومہ نے [illegible] میں مجھے حضرت والد مغفور کا ایک خط دیا تھا جو اُن کے نام تھا۔ خاندانی جھگڑوں سے کوئی خاندان محفوظ نہیں۔ یہ خط بھی ایک خاندانی جھگڑے ہی سے متعلق تھا مگر اس سے علامہ مغفور کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعے سے متعلق اشخاص یہ تھے:-

علامہ مغفور کی منجھلی پھوپی اماں۔ اُن کے دو بیٹے اور بہو یعنی چچا انور، چچا اسعد اور ان کی بیوی حامدہ بیگم (جو شوہر کے ماموں کی بیٹی تھیں) ان منجھلی پھوپی اماں کی نواسی (مرحومہ بیٹی کی لڑکی جو نانی کے پاس رہتی تھی)۔

پھوپی حامدہ بیگم سے دس سال بڑی اُن کی بہن پھوپی ذاکرہ بیگم کا [illegible] میں انتقال ہوگیا تو پھوپا عبدالستار اُن کے شوہر کے عقد ثانی کے لئے [illegible] میں ان کا نام تجویز کیا گیا۔ ان کی کہیں نسبت ہو چکی تھی مگر کسی وجہ سے نسبت ٹوٹ گئی تھی اور ان کی عمر [illegible] سال ہو گئی تھی ان کی شادی کی تجویز منجھلی پھوپی اماں کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے پہلے تو اُسے پسند کیا مگر کسی کے بہکانے بھڑکانے [illegible] بعد میں ناپسند کر دیا۔ اُن کے منجھلے بیٹے چچا انور [illegible] کے ہمنوا ہوگئے حالانکہ وہی اس تجویز کے سبب [illegible] تھے۔ پھوپی حامدہ ان کی ایک رشتے سے خالہ [illegible] رشتے سے ممانی۔ اُن کے شوہر اسعد حسین صاحب [illegible] میرٹھ میں سب انسپکٹر تھے۔ ماں کو خط لکھ کر ماموں نے بھانجی کو اپنے پاس سردھنہ بلا لیا تھا۔ وہاں سردھنہ ہی میں تھیں کہ عبدالستار صاحب علامہ مغفور کو لے کر سردھنہ گئے اور ان کے حقیقی ماموں اسعد حسین صاحب نے ان کا نکاح عبدالستار صاحب سے کر دیا۔ نکاح کی ذمہ داری تمام تر حقیقی ماموں پر تھی لیکن ممانی پھپیا علامہ مغفور پر۔ خط ۵۰ سال پہلے کا ہے کاغذ کئی جگہ سے کٹا پھٹا شکنیں پڑا ہوا ہے۔ بعض الفاظ [illegible] بھی ہیں۔ خط یہ ہے۔

Delhi
20-7

۲۰ر جولائی [illegible]

ہمشیرہ عزیزہ سلام و دعا۔

تمہارے کارڈ نے تفکرات میں ایک اور اضافہ کر دیا۔ تعجب ہے کہ تم نے ایک ایسی فضول خبر اور بے [illegible] افزا مجھ سے [illegible] کرنے کے قابل سمجھا۔ مجھ سے منجھلی پھوپی سے صرف دو منٹ کے سوا اس معاملہ میں کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی۔ منجھلی پھوپی اماں کو جس وقت میں نے یہ خبر دی الفاظ یہ تھے: ”میاں عبدالستار کا نکاح ان سے کل سردھنہ میں ہو گیا۔“

اتنا مشکور وہ جس قدر برہم ہوئیں اور ان کو صدمہ ہوا ناممکن ہے کہ میں اس کا اظہار تم پر کر سکوں۔ جس شخص نے دریافت کیا میں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کا الزام بالکل میاں اسعد پر ہے۔ خود چھوٹی پھوپی اماں سے میں نے یہی الفاظ کہے ہیں کہ حامدہ مجبور تھی۔ وہ بیوی تھی اسعد کی۔ خاندان [illegible]۔

بیا فزا جس سے ساس بہو کے تعلقات بہا [illegible]

چچا صاحب زیادہ نہیں دو ڈھائی سال ہی عمر میں بڑے تھے بہر حال بزرگ تھے۔ علامہ مغفور کی امن پسند طبیعت نے بے خطا بے قصور ہونے کے باوجود بڑے بھائی کے ناگوار ہی نہیں نامناسب الفاظ کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اُن کی خاموشی کے یہ معنی نہ تھے کہ پانی مر رہا تھا بلکہ یہ تھے کہ کسی نیک کام کو خدا واسطے انجام دینے میں برائی ملتی ہے اور مشتعل ہو کر زبان سے سخت الفاظ نکالنا اور رد و بد کرنا انتہائی جہالت اور بد وبلدی اور شرافت نفسی کے خلاف ہے۔

محترم واحدی صاحب جن کے ۲۲ برس علامہ مغفور سے تعلقات رہے اور تقریباً روز ہی جن سے ملاقات ہوتی تھی فرماتے ہیں کہ "میں نے مولوی صاحب کو خوش بھی دیکھا اور غمگین بھی مگر غصہ کی حالت میں کبھی نہیں دیکھا۔ ۲۲ برس میں ایک دو موقعے ایسے آئے کہ انھیں غصہ اور سخت غصہ آسکتا تھا مگر انھوں نے انتہائی ضبط سے کام لیا اور اٹھ کر چلے گئے۔ اور زبان سے کبھی غصہ کا اظہار نہیں کیا۔

(۴) علامہ مغفور کو عبدالستار صاحب کے اس نکاح سے دلچسپی اس وجہ سے تھی کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہو رہی تھی جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اُس وقت لڑکی تیرہ چودہ برس کی ہو جاتی تو اس کی شادی کا سہم ماں کے سر پر سوار رہتا اور راتوں کی نیند اُچاٹ ہو جاتی تھی۔ اُن کی ماں گزر چکی تھیں اور وہ نانی کے ہاں رہتی تھیں اور اُس وقت ۱۹ برس کی تھیں۔ اس دور کی معاشرت میں لڑکی کی یہ بڑی عمر تھی۔ علامہ مغفور نے اپنی متعدد تصانیف میں بتایا ہے کہ سن شعور کو پہنچتے ہی لڑکی کی شادی کا فکر کرنا چاہئے کیونکہ

"ذرا غور کر کے جواب دیجئے کہ جس فضا میں آجکل مسلمان لڑکیاں وقت کی طاقت کی بدولت پہنچ گئیں اس میں اُن کا باعزت رہنا کس قدر مشکل ہے ..... ایک مسلمان لڑکی کی جوانی سینکڑوں قسم کی دقتیں سامنے لاتی ہے۔ آپ خود درندوں کی طرح اس کے پھاڑ کھانے کو چاروں طرف پھر رہے ہیں اور اس کے واسطے پناہ کی کوئی جگہ نہیں۔ آپ کی تباہ کاریاں ذلیل انگیں۔ چپہ چپہ پر سنگین حملے کر رہی ہیں۔ مذہب نے آپ کو ہمارا محافظ بنایا تھا مگر کس قدر افسوس ناک ہے یہ حالت کہ خود آپ ہی لوگ حفاظت کرنے کی بجائے قصاب بن گئے اور حفاظت کے بدلے ہماری آبرو ریزی آپ کا شیوہ ہو گئی"

عصمت ۱۹۳۸ء
خدائی راج

"مچھیرن کا جھولا"

اس واقعہ کے دس سال بعد ۱۹۴۸ء میں جو دردناک افسانہ "سودائے نقد" شائع ہوا تھا اُس میں جوان لڑکی کی شادی نہ ہونے کا نہایت ہولناک درد انگیز نتیجہ دکھایا ہے۔

"جوان بچی کا کنوارا پن ایک ناگ ہے جو ہر وقت کھیل رہا ہے ایک آگ ہے جس کے شعلے ہر لمحہ بھڑک رہے ہیں ایک مصیبت ہے جو گھر پر نازل ہے ..... اس ناگ کو کچلو اس آگ کو بجھاؤ اس مصیبت کو ٹالو"

(۵) کپڑے سے سلے ہوئے ٹوکرے میں آم پھوپی حامدہ نے اپنے چچازاد بھائی کو بھیجے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ انھیں اپنے ان بھائی سے محبت تھی۔

(۶) وکیل کا کام ہے مقدمہ لینا امام جی علامہ مغفور کے کسی عزیز کے خلاف جو پھوپی حامدہ کا بھی عزیز تھا دعویٰ کرنے والے تھے لیکن شیخ عبدالقادر مرحوم کو دوستی کا پاس تھا کہ کہیں علامہ مغفور کو جن کی عظمت ان کی نگاہ میں تھی رنج نہ پہنچے۔ شیخ صاحب طبیعت کے اس قدر نیک تھے کہ انھوں نے آمدنی پر دوستی کو ترجیح دی۔

اُس زمانہ کی معاشرت	"اس زمانہ کی مستورات کی رگ رگ میں خوف خدا پیوست اور

[illegible] ان کے ذہن [illegible] ہر حرکت
[illegible] دیکھ رہا [illegible] مثلاً کبھی
[illegible] سے [illegible] کی عادت
[illegible] کے آگے سر خم کردیتے
[illegible] تازہ وضو کرکے [illegible] پھرتی تھیں۔ کڑکڑاتی سردی میں
[illegible] نہ ہوتا تو ٹھنڈے پانی سے وضو کرکے نماز پڑھتی
[illegible] اگر کوئی لڑکا صبح نماز نہ پڑھتا تو اسے ناشتہ بھی نہ
[illegible] اگر قضا پڑھتا تو آدھا ناشتہ ملتا تھا۔ اذان کی آواز
[illegible] وقت کان میں آتی اگر گراموفون بجتا ہوتا تو بند کردیا جاتا
[illegible] ہوتیں تو سب خاموش ہوکر جل شانہٗ کہتے۔ اگر کسی
[illegible] موسیقی کا کھیلا ہوتا تو ڈھک دیا جاتا۔ پانچوں وقت
[illegible] پابندی سے ماتھے اور دادیاں نانیاں ہی نہیں لڑکیاں
[illegible] پڑھتی تھیں۔ عورتوں کی دینداری کا اثر تھا کہ مرد ایک نہ
[illegible] وقت کی نماز مسجد میں پڑھتے تھے اس لئے مسجدیں آباد تھیں۔

رمضان کا مبارک مہینہ آتا تو کسی گھر سے [illegible]
[illegible] اٹھتا نظر نہ آتا تھا۔ سات سات آٹھ آٹھ سال کے
بچے بھی روزے رکھتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے کوئی روزہ نہ رکھتا تو
کوٹھری یا کسی کونے میں چھپ کر کھاتا صحن میں نہ کھاتا کیونکہ
[illegible] ان کے ذہن نشین کرادیتی تھیں کہ آسمان دیکھ رہا ہے اور
قیامت کے دن گواہی دے گا کہ اس شخص نے فلاں دن روزہ
نہیں رکھا تھا۔ سحری کا بچا ہوا معمولی کھانا ملتا تھا جس کا روزہ
نہ ہوتا روزہ کے دنوں کا وہ بھی احترام کرتا تھا اور مسلمان ہی
نہیں اس زمانہ کے شریف ہندو بھی اپنے مسلمان دوستوں
کے سامنے کھانے پینے کی احتیاط کرتے تھے۔ افطاری میں ایک
حصہ محلہ کی مسجد کا ہوتا۔ سحری افطاری میں غریب رشتہ داروں
بیواؤں اور یتیموں کا حق بھی سمجھا جاتا تھا۔

زکوٰۃ خیرات کا اخباروں میں اعلان نہ ہوتا اس طرح
مستحقین کی مدد کی جاتی تھی کہ ایک ہاتھ سے دیتے تو دوسرے کو خبر
نہ ہوتی تھی۔ پڑوسیوں کے متعلق شرم تھی۔ حق ہمسایہ کا جا بجا
جن کتابوں میں ذکر ہوتے ان سے بھی گھر والیاں مردوں کے ساتھ
اپنی بیٹیاں گھر کے کام دھندوں میں لگی رہتی تھیں۔ پلنگ
چارپائیاں اٹھانا بچھانا۔ نواڑ دوان کسنا۔ بچھونے بچھانے
اٹھانے۔ جھاڑو۔ بہارو۔ برتن مانجھنا۔ مصالحہ پیسنا۔ آٹا گوندھنا
چکی پیسنا گرمیوں میں چھتوں پر بھیگے ہوئے یا پٹیاں لے جاکر چھڑکاؤ
کرنا یہ ایسے کام تھے جن سے اُن کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی
تھی اس لئے وہ بیمار بھی کم پڑتی تھیں ڈاکٹر حکیم اُس وقت آتا
جب مریض کی حالت خطرناک ہوتی ورنہ عورتیں خود ہی چھوٹی
موٹی بیماری کا علاج کوڑیوں اور پیسوں میں کرلیتی تھیں۔

سیانی لڑکی باپ بڑے بھائی کے سامنے بھی دوپٹہ لپیٹ کر
آتی تھی سیانی لڑکیوں کا کھلا سر۔ آڑی مانگ۔ دو چوٹیاں۔ مسی
سے ہونٹوں کا گلابی ہونا۔ خوشبودار تیل سر میں ڈالنا یا پھول
پہننا یا بالوں میں لگانا اور چٹر پٹر باتیں کرنا۔ دن کے وقت لیٹنا
آنکھ ملاکر بزرگوں سے باتیں کرنا۔ جھانجن پہن کر چھن چھن کرتے
اُن کے سامنے آنا۔ آنکھ ابرو یا ہاتھوں سے اشارہ کرنا اور
شمالی ہند میں تو ساڑھی باندھنا یہ سب باتیں معیوب سمجھی
جاتی تھیں۔ سفید چادر لڑکیوں کے بچھونے پر دیکھی جاتی تھی۔
لباس اور وضع قطع سے شادی شدہ اور کنواری لڑکیوں میں
نمایاں فرق ہوتا اور گڑیوں کے کھیل سے انھیں خانہ داری کی
بہت سی باتیں کم عمری میں سکھادی جاتی اور بارہ تیرہ سال کی عمر
میں کھانے پکانے ہی نہیں سینے پرونے کے فن میں بھی ماہر کردیا
جاتا تھا۔ زنانہ کپڑے اور مردوں کے کرتے بجائے درزیوں سے
سلوانے کے گھر والی کی بدنامی تھی۔ کامدانی یا کارچوبی یا سلمہ کا
کام سوزن کاری کوئی نہ کوئی زنانہ دستکاری بھی لڑکیوں کو ضرور
سکھائی جاتی تھی۔

[illegible] گھروں میں کنواری لڑکیاں کوٹھڑیوں میں چھپ جاتی تھیں۔ پردہ کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ڈولیوں پر بھی کپڑا ڈالا جاتا تاکہ [illegible] گلی میں تانگہ نہ آسکتا تو گلی میں چادریں تان کر پردہ کرایا جاتا اور پھر تانگہ پر چادریں باندھ دی جاتیں تانگے تو بعد میں چلے تھے پہلے تو بند گاڑیاں تھیں جن کی کھڑکیوں کی تیلیاں چڑھادی جاتیں۔ غیر مرد سے وہ خواہ محلہ کا منڈا ہی کیوں نہ ہوتا اشد ضرورت ہوتی تو بڑی بوڑھیاں پس پردہ گفتگو کرلیتیں۔ معزز گھرانوں کی عورتیں بازار جاکر خود سودا سلف نہ خریدتیں گھر کے مرد لایا کرتے تھے ہاں برسوں کی لگی بندھی پنہاریاں۔ منہاریاں۔ دھوبنیں۔ کاچھنیں۔ گھوسنیں ڈومنیاں اپنے ٹھکانوں میں آتی تھیں یا بنئے اور قصائی کے آٹھ آٹھ دس دس برس کے لڑکے یہ پوچھنے کہ آٹا دال یا گوشت کتنا آئے گا بزاز گھروں پر آکر کپڑا پسند کراتے تھے۔

اور بزازنیں نہیں۔ بیل فیتے والے۔ گوٹہ پٹھ والے۔ ٹاٹ بورے والے۔ دھنیئے۔ کسیرے۔ قلعی گر۔ بڑھئی۔ کھٹ بنے لوہار۔ موچی۔ بساطی۔ جیبی۔ چھالیہ والے۔ پان والے۔ تیلی۔ تنبولی۔ پھول والے۔ لونگ چڑے والے کھیلیں بتاشے والے۔ چنے پرمل والے۔ مونگ پھلی والے۔ بسکٹ نان پاؤ والے گزک ریوڑی پٹی والے۔ پھل والے۔ سبزی ترکاری والے۔ سودے والے گلیوں میں آوازیں لگاتے اور پردہ میں بیٹھنے والیاں گھر بیٹھے ضرورت کی ہر چیز خریدتی تھیں دروازہ سے باہر قدم نکالے بازار کی صورت دیکھے انھیں ہفتوں نہیں مہینوں گزر جاتے تھے۔

کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا بھائیوں کا بہنوں سے بہتر ہوتا کنوارے رہتے ہی میں لڑکیوں کا پتہ مار دیا جاتا تاکہ پرایا گھر بسانا ہے اور نہ معلوم کیسے لوگوں سے سابقہ پڑے لڑکی تیرہ چودہ سال کی ہوئی تو ماں کی نیند اس کی شادی کی فکر سے اڑ جاتی

بالعموم چودہ پندرہ سال تک لڑکیوں کی شادی کر دی [illegible] اٹھارہ سال کی ہوجاتیں تو بہت بڑی عمر کی [illegible] اور پاٹھا کہا جاتا تھا اور صورت بیہ [illegible] بزرگوں میں ہوتی اور بھائیوں سے [illegible] رخصت دی جاتی تھی لڑکیوں کا پیغام ہوتا [illegible] کوٹھڑیوں میں گھس جاتیں اور رشتے والیوں میں [illegible] کے کان میں ضروری باتیں ڈال دیتی تھیں اور ماں کی رضا ان کی خاموشی سے معلوم ہوجاتی تھی شادی کے معنی [illegible] پھر نام مرنا پالکی نکلنے کے بعد جنازہ ہی نکلتا تھا۔ ساسیں [illegible] کی نئی بہوؤں کو سمجھتی اور بہوئیں ماں سے بڑھ کر ساس کی خدمت کرتی تھیں صبر و ضبط لڑکیوں کی گھٹی میں ہوتا فرماں برداری اور تابعداری میں ہوش سنبھالتیں تھوڑی سی مارا ماری ہوتی اور چند روز کی سختی۔ خدمت سے سسرال میں عظمت حاصل ہوتی اور اپنی محبت سے غیروں کے دل فتح کرلیتیں۔

مکانات بڑے بڑے ہوتے تھے اور ایک باپ کے بیٹے۔ کنوارے اور بیاہے سب ایک ہی جگہ رہتے تھے کوئی سو روپیہ کماتا کسی کی آمدنی دو سو کی اور کسی کی تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار ہوتی مگر روپیہ آتا تھا ماں کے ہاتھ میں اور پچاس روپیہ والے بیٹے کی اولاد اور دو سو روپیہ والے کے بچوں کے کھانے پینے میں فرق نہ ہوتا تھا انفرادی عزت سے زیادہ خاندانی عزت سمجھی جاتی۔ ایک بھائی کی امیری دوسرے بھائی کی غریبی کا مضحکہ نہ اڑاتی تھی۔ مائیں بچوں کے ذہن نشین کرادیتیں کہ ایک نوالے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی غریب بھائی کے بچے پہلے ہوتے اور اپنے بچے بعد میں جوان بالوں کو اپنے بچوں کا فکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہوتی جب ان سے زیادہ فکر کرنے والے ان سے زیادہ خیال رکھنے والے بڈھے ماں باپ موجود ہوتے ایک جگہ رہنے سے بچوں میں چشم چوٹ۔ [illegible]

پندرہ بیس روپیہ ماہوار کی آمدنی والا غریب پچاس روپیہ والا متوسط الحال اور چار سو روپیہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا تا وہ امیر سمجھا جاتا تھا۔ ماما کھانا پکانے والی دو تین روپیہ مہینہ لیتی تھی اور مرد ملازم آٹھ روپیہ اور وہ باہر کا کام کاج کرتا تھا اور اگر بہت بڑھا ہوتا تو لڑکیاں پڑھا کرتی تھیں بیٹا۔ بیٹی کی شادی آپس میں نہ ہوتی تو سمدھیانہ بالعموم دور ہوتا تھا مگر حصہ بخرے آتے جاتے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر سمدھیانہ کے بلاوے کو افضل سمجھا جاتا اور ایک دوسرے کا ادب لحاظ اور عزت کرتے تھے صرف زبانی ہاں پر بیٹا بیٹی پرائے ہو جاتے تھے۔ اور زبان سے جو کہہ دیتے آخر وقت تک نبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اولاد کی شادی کے وقت دولت پر خاندان کو ترجیح دی جاتی اور خیال رکھا جاتا تھا کہ بڑی اچھی ہو تمول کے اعزاز کے مقابلہ میں شرافت کا اعزاز وزن رکھتا تھا۔

داماد کا انتخاب ہوتا تو یہ مدنظر رہتا کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔ بہو کی تلاش ہوتی تو اس نظریہ سے کہ لائیے سمجھنوں کی بیٹیاں جو رکھیں نیچوں کی لاج منگنی عام طور پر کئی مہینے پہلے ہوتی اور اس کی مٹھائی سارے کنبہ اور سمدھیانوں میں تقسیم کی جاتی تھی پھر جب شادی کا وقت آتا تو لڑکی کئی دن پہلے مایوں بیٹھتی پھر بڑی آتی سارے کنبہ کو جمع کیا جاتا۔ روٹھے ہوؤں کو منایا جاتا گھر گھر بلاوے پھرتے۔ کئی کئی دن کی مہمانداری ہوتی۔ غریب اور متوسط حیثیت باپ کو بالعموم کھانے دانے اور اوپر کے خرچ کا انتظام کرنا پڑتا ماں گلہری کے گودڑ کی طرح جہیز بیٹی کی پیدائش کے دن ہی سے جمع کرتی رہتی تھی کبھی کوئی کپڑا خرید کر ڈال دیتی کبھی کوئی برتن۔ روپیہ میں ساڑھے پندرہ آنے خرچ کرتی اور دو پیسے فی روپیہ بیٹی کے جہیز کے لئے بچاتی تھی۔ شوہر کے سر پر جب بیٹی کو وداع کرنے کا فکر ہوتا اس وقت بیوی کا سلیقہ تیار جہیز نکال کر جوہر شرافت دکھاتی کہ سمجھنوں کی بیٹیاں نیچوں میں کس طرح شوہر کی لاج رکھتی اور ناک اونچی کرتی ہیں۔

جہیز اور چڑھاوے میں ایسے لوگ بھی ہوتے جو اٹھے تلنگے کا زیور دیتے یا سونے کے جن کڑوں کو ٹھوس کہا جاتا وہ کھوکھل ہوتے تھے شادی بیاہ میں بڑی رنگینی ہوتی۔ ڈومنیاں منڈھا اور سہرا گاتیں اور نقلیں کرتیں۔ نکاح کے بعد بیٹے والوں کی طرف سے مٹھائی یا چھوارے تقسیم ہوتے بیٹی والوں پر برات کو کھانا کھلانے کا بار نہ پڑتا مگر جب بیٹی وداع ہوتی تو اس کے ساتھ بھوڑے کا کھانا جاتا تھا دوسرے دن لڑکے والوں کی طرف سے دعوت ولیمہ ہوتی اور دولھن والوں کے یہاں چوتھی۔ سمدھن داماد سسرال میں دولہا کے چار جانے ہوتے پہلا ساس کی طرف سے باقی تین چچی پھوپی خالہ ممانی یا بڑی بہن کی طرف سے، جسے بیٹی دیدیتے خاندان میں اس کے معزز ہونے میں کسے کلام ہو سکتا تھا۔ سالی کی شادی پر بہنوئی کی رائے وقیع ہوتی کسی تقریب میں دیگ کا منہ اس وقت کھلتا جب داماد آجاتا تھا۔ بیوی کے بھائی کی شادی ہوتی تو دولہا بنانے کا نیگ بہنوئی کو ملتا تھا عید بقرعید پر سسرالی رشتہ داروں کے اداب کو داماد جاتا تو چاہے آٹھ آنے کی مٹھائی کی ٹوکری ہوتی ساتھ لے کر جاتا۔ خالی ہاتھ نہ جاتا تھا اور حسب حیثیت اُسے عیدی ملتی تھی۔ چھوٹے بڑوں کے سلام کو حاضر ہوتے اور دو پیسے ہی عیدی ملتی سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ بھائی دولہا بنتا نکاح کے بعد زنانہ میں آرسی مصحف کو آتا تو بہن دوپٹہ کا آنچل سر پر ڈال کر لاتی تھی۔

محلہ اور کنبہ کی لڑکی کو اپنی لڑکی سمجھا جاتا تھا اور جس گاؤں سے لڑکی وداع ہوتی وہ سارے گاؤں کی بیٹی

...ی جاتی تھی۔ بچہ کی پیدائش پر زچہ کے کھانے کا خاص طور
خیال رکھا جاتا تھا۔ گوند کمر کے لیے ستھورا وغیرہ دیتا تھا۔
بڑے بڑے کلاں اور کھڑیاں ... جاتی تھیں۔ بیٹی کی ماں
... اور بیچ رسم کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو
... دیکھو۔ زچہ کے لیے کپڑے کھانے وغیرہ
بھیں لاتیں اور بھائی بہنوں کو حق دیتے تھے بہن کا پس
... ہوتی اور بھائی پلنگ پر بچھا جیب میں بہنوں کا حق
یہ کا ہوتا اور بھائیوں کو دینے کا۔ بھاوج کے ہاں بچہ ہوتا
تو نیگ لے کر جاتی اور بھائی سے نیگ لیتی اور لڑ لڑ کر
لیتی تھی۔ اسی طرح جو تھے بچوں پر [illegible] ہوتی وہ بھی
... ماں ہی کے ساتھ تھے۔ اتاشے [illegible] دودھ
بھی اپنی ماں کی مجبوری سے رکھتے تھے تو خوب اچھی طرح تحقیق
کرکے کہ شریف خاندان کی ہو تاکہ دودھ کی خرابی سے بچے میں
خراب عادتیں پیدا نہ ہوں بیٹی کے ہاں رہنا تو بڑی بات
تھی کھانا تک کھانا بھی بعض جگہ ناپسند کرتے تھے اس زمانہ
میں یہ مثل عام تھی بہن کے گھر بھائی اور ساس کے گھر جنوائی
یعنی داماد کتا ہوتا ہے۔ لڑکیاں شادی کے بعد اگر خدا توفیق
دیتا تو اپنی بہنوں کا نہیں بلکہ نندوں کا جہیز تیار کرتیں۔ اور
سخت احتیاط کرتیں کہ شوہر کا روپیہ میکہ والوں پر نہ اٹھے اور
اگر ایسی ہی سخت مجبوری ہو تو شوہر کے علم میں اس کی اجازت
سے اٹھے۔

میت کے ساتھ چالیس قدم جانا اور کندھا دینا
اور امیروں کی غریبوں کی دعوتوں میں شرکت کسر شان نہ
سمجھی جاتی تھی۔ میت کے پھول چالیسویں اور پیر جی کی طرح
مدارات تعویذ گنڈوں کے چکر اور نذر نیاز اور بعض مراسم
کی پابندی پر بھی روپیہ اٹھتا تھا اور نمود اور کمزور عقیدوں
کی وجہ سے قرض بھی سر پر سوار رہتا تھا۔ لڑکیاں شوہروں
سے اور میاں بیوی ہی نہیں بچوں سے بھی باپ اور چچا
ہی نہیں بڑے بھائی کے سامنے بھی بلا ضرورت بات نہ
کرتے تھے۔ عورتیں شادی کی محفلوں اور درس و وعظ کی
مجلسوں میں حتی المقدور ... تھیں اور باوجودیکہ بعض خاندانوں
کی مستورات غیر قوم کی عورتوں سے پردہ کرتی تھیں لیکن
پردہ پارٹیاں بھی ہونے لگی تھیں۔

ترکِ ملازمت ۱۹۱۰ء

سر عبد القادر مرحوم نے اپنے مضمون غمِ راشد
(مطبوعہ عصمت راشد الخیری نمبر) میں لکھا تھا۔

"خط و کتابت کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ مولانا
راشد الخیری محسوس کرتے تھے کہ سرکاری دفتر کی میز اور
اس کی خشک مصروفیتیں ان کے لیے ایک قید بے زنجیر
تھیں اور ان کی خداداد ذہانت اور جودت طبع کا کوئی
صحیح مصرف وہاں نہیں ملتا۔ ایک دفعہ جب انھوں
نے خط میں اس خیال کا اظہار کیا تو میں نے انھیں یہ مشورہ
دیا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر کوئی علمی کام کریں خدا اسی
میں برکت دے گا۔ یہ مشورہ ان کو پسند تو ضرور آیا مگر ایک
عرصہ تک متذبذب رہے۔ لگا ہوا مستقل روزگار چھوڑ کر
ادبی مشاغل کی غیر مستقل آمدنی سے گزارہ کرنا مشکلات سے
خالی نہ تھا۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ وہ پہلے رخصت لے کر
گھر آئیں اور کچھ علمی کام شروع کریں۔ اور اگر کام چلتا نظر
آئے تو ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلیں"

یہ ۱۹۱۰ء یعنی مخزن کے دلی آنے سے پہلے کی باتیں
ہیں۔ دلی میں انھوں نے (ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل (ڈی
اے جی) کے دفتر میں ملازمت کی تھی۔ اور کلاں محل سے
قدسیہ باغ سے آگے پیدل دو میل روزانہ جاتے اور دو میل
آتے تھے۔ سر عبد القادر مرحوم کے بیان سے ظاہر ہے علامہ مغفور

کا دل دلی کی اس ملازمت میں بھی نہ لگا۔ دفتر کے قریب ہی قدسیہ باغ تھا اور وہ دفتر کے کسی کلرک کو ایک دو روپیہ دے کر اس سے اپنا کام لیا کرتے اور خود دو تین گھنٹے باغ میں جا کر مضمون لکھا کرتے تھے۔ مخزن کے دلی آنے کے بعد عصمت جاری ہونے سے پہلے ہی سے وہ تین تین چار چار مہینے کی چھٹیاں لینے لگے۔ چھٹی جب ختم ہوتی ڈاکٹری سارٹیفکٹ پیش کر دیتے۔ کبھی گڑگاؤں کے سول سرجن کا کبھی میرٹھ کے۔ کبھی رہتک کے میڈیکل افسر کا سارٹیفکٹ ہوتا تو کبھی علی گڈھ کے۔ دادی اماں مرحومہ کی رحلت کے بعد جب آخری چھٹی ختم ہو رہی تھی تو عصمت کے جاری رہنے کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ اب ملازمت بالکل ہی ترک کر دیں کیونکہ شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹری کے لئے ولایت جانے والے تھے۔ چھٹی ختم ہوئی تو وہ ڈی اے جی سے ملنے گئے۔ انگریز نے کہا میں خوش ہوا کہ بالآخر تم کام پر آ گئے۔ انھوں نے فرمایا۔ نہیں میں تو میڈیکل سارٹیفکٹ دینے آیا ہوں۔ ڈی اے جی اس جواب پر بھنا گیا مگر چند لمحے سکوت کے بعد انھیں بٹھایا اور کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے تم مصنف ہو۔ تمھاری کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ تم اخباروں میں مضامین لکھتے ہو۔ تمھیں نوکری کی ضرورت نہیں۔ اسی لئے تم لمبی لمبی چھٹیاں لیتے ہو۔ اس سے دفتر کا نظام خراب ہوتا ہے۔ دوسروں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور میری مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تم نوکری نہیں کرنی چاہتے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ شریف آدمیوں کی طرح چھوڑ دو"

یہ سُن کر علامہ مغفور نے کہا۔

"آپ ہمیشہ اینٹھ کر اکڑ کر تمکنت سے بات کرتے تھے اس کا جواب یہی تھا کہ میں چھٹی پر چھٹی لوں اور لئے چلا جاؤں آپ کہتے تھے کہ تمھیں میڈیکل سارٹیفکٹ اب نہیں مل سکتا۔ تو میں دوسرے شہروں سے لاکر پیش کر دیتا تھا اور آپ چھٹی منظور کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ آپ کی رعونت کا جواب مجھے یہی دینا چاہئے تھا۔ آج آپ بھلے آدمیوں کی طرح گفتگو کر رہے ہیں۔ شرافت کا جواب شرافت ہی ہونا چاہئے۔ اس لئے پیش ہے استعفیٰ"

اُس وقت تنخواہ سو روپے سے کچھ کم تھی۔

باب ساتواں ۔ زمانہ تمدن و سہیلی سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۱۶ء

دفتر عصمت ذاتی مکان میں

سنہ ۱۱ء کے شروع میں کلاں محل کے قریب شیخ ناصر علی کی گلی کے اُس بڑے مکان میں جو علامہ مغفور کی والدہ کا تھا دفتر عصمت آ گیا۔ بغلی کمرہ میں دو دستی پریس چلنے لگے باہر کے دالان میں کاتب کلرک بیٹھتے اور اندر کے دالان میں ایک بڑی میز علامہ مغفور کے لکھنے اور کام کرنے کے لئے تھی۔ برابر میں نواڑی پلنگ جہاں دوپہر کو کچھ دیر آرام کرتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں فرشی پنکھا ایک چاری جھلا کرتی تھی۔ کمرہ کی کوٹھری ۴ گز لمبی ۳ گز چوڑی تھی گھریلو چیزوں کے بکس بچھونوں وغیرہ کے لئے تھی۔ باہر کی کوٹھری میں دفتر کے کاغذات کتابیں وغیرہ رکھی جاتی تھیں۔

...چھوٹے مکان میں پہلے رہا کرتی تھیں اور والدہ مرحومہ
...نئی ماں کے مکان میں چلی جاتی تھیں۔

تمدن اور مطالبہ حقوق نسواں

عصمت بہت آب ... کتابت جاری

...مضامین کے اعتبار سے تو بہترین ادبی رسالہ تھا
...مضامین کے لحاظ سے بھی بہت کامیاب تھا
اور ظاہری شکل و صورت میں بھی دلکشی تھی۔ اعلیٰ
...کا چکنا ولایتی دبیز کاغذ۔ بہترین لکھائی چھپائی۔
...موٹا چکنا مضبوط خوب صورت ٹائیٹل کا کاغذ
...گلابی رنگ کا۔ روپہلی بیل۔ سیاہ حروف رسالہ کا
...نام۔ غرض عصمت کا شمار ہندوستان کے بہترین
...رسالوں میں ہوتا تھا مگر پڑھنے والوں کو ایک
...مدت طویل معلوم ہونے لگی اور انھوں نے اصرار
کیا کہ ایک ہفتہ وار زنانہ پرچہ جاری کیا جائے اور یہ ممکن
نہ ہو تو عصمت ہی کو ہفتہ وار کر دیا جائے۔ مخزن لاہور
جا چکا تھا اور علامہ مغفور بجائے ایک ہفتہ وار زنانہ
پرچہ جاری کرنے یا عصمت کو ہفتہ وار کرنے کے ایک
ادبی ماہنامہ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے مگر ایک
خاص مقصد سے اور وہ مقصد تھا حقوقِ نسواں کی
حفاظت اور حمایت کیونکہ

"جس طرح کسی بچے کے منہ در منہ اس کی حمایت لینا
اس کو اور زیادہ جرأت دلاتا ہے اسی طرح عصمت میں
حقوقِ نسواں کا مردوں سے مطالبہ یہی شکل تھی کہ ہم
فرقِ نسواں کے حقوق پر دل کھول کر بحث نہ کر سکے۔ بہت
سی باتیں تھیں کہ منہ پر آکر ... اور بہت سے خیالات تھے جو
دماغ میں چکرا کر رہ گئے۔ باتیں کہیں مگر دبی زبان سے۔
خیالات ظاہر کیے مگر ڈرتے ڈرتے" (عصمت فروری ۱۹۱۸ء)

"میری طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ... کو تحریک
کی ترغیب دوں۔ خود لکھتا تو دلکتا ہی سے ... ویسے
ایسے مضامین بھی عصمت میں شائع کرنے پہنچا ہی جو
بغاوت پیدا کریں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ لڑکیوں کی حمایت
ان کے منہ در منہ نہ کروں ان کو تیار کروں" (عصمت ...)

اپریل ۱۹۱۱ء میں تمدن نکلا تو اس نے مضامین
کی دلچسپی کے اعتبار سے مخزن کی جگہ لے لی۔ بہت مقبول
ہوا مگر حقوقِ نسواں کی پھانس وہ مطالبہ تھا جو مردوں
کے دل میں کھٹکتا رہا۔

"دل کبھی کبھی یہ صدا بھی دیتا تھا کہ بہنوں کے بھائی
اور بیٹیوں کے باپ ہم آہنگ ہو کر ہاتھ بٹائیں گے اور
خدا کی ہزارہا مخلوق میں چند صورتیں ایسی بھی نکلیں گی جو
ان مصیبت ... پر دو آنسو گرائیں گی جو پہاڑ کی
راتیں بچے ہوئے گودڑوں میں گزار رہی ہیں"

مشہور انشا پرداز جناب ل احمد اکبرآبادی کا جو مضمون
دلی مرحوم کے عنوان سے عصمت ... سالگرہ نمبر میں
چھپا تھا اس میں انھوں نے علامہ مغفور کے ایک خط کی یہ
سطریں نقل کی ہیں۔

"ہر طرف سے یہ اصرار ہے کہ میں حقوقِ نسواں سے ہاتھ
اٹھا لوں۔ خیال فرمائیے کیسی غلط خواہش ہے"

تمدن جاری ہوا تو اس کا اپنا پریس تھا اور پانسو
روپیہ سرکاری خزانہ میں ضمانت داخل کی گئی تھی۔ جو پہلے
ہی سال میں ضبط ہو گئی۔ اس زمانہ میں ترکوں سے اٹلی
جنگ کر رہا تھا اور علامہ مغفور کے کئی مضمون ترکوں کی حمایت
میں شائع ہوئے تھے۔ جس مضمون پر ضمانت ضبط کی گئی تھی
اس کا عنوان تھا "طرابلس سے ایک صدا"، اور شروع
اس طرح ہوا تھا۔

ہے جمیتی تو شاید مگر بے ایمانی یقیناً ہوگی اگر ہم اس موقعہ پر اُس کیفیت کا اظہار نہ کریں جو واقعات طرابلس سے دل پر گذری اور گذر رہی ہے۔ جس دیدہ دلیری سے یورپ نے طرابلس میں اپنی بے اخلاقی، دغابازی اور مکاری کا ثبوت دیا ہے اس کی داد نہ دینا ستم ہے۔ ہمارے مقدس نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بدنام کرنے والے اطالیہ والوں نے نہ صرف ہم کو بلکہ تمام دنیا کو یقین دلا دیا کہ یورپ میں آج بھی وہی وحشی بس رہے ہیں جو آج سے ہزاروں برس پہلے آباد تھے اور جو صفحۂ تاریخ پر جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ جنگ طرابلس نے اچھی طرح ثابت کر دیا کہ یہ تہذیب و تمدن کے مدعی انسان دنیا کے واسطے اتنے سود مند ہیں کہ اپنی محترم خواتین کو سیاہ دوکانوں پر بٹھا کر لوگوں کو آوارگی کی طرف مائل کریں ورنہ ہمدردیٔ بنی نوع انسان جو انسانیت کا سچا زیور ہے ان میں نام کو نہیں"۔

اگر تمدن کا سب سے بڑا مقصد مطالبۂ حقوقِ نسواں نہ ہوتا تو تمدن ضمانت ضبط ہونے کے بعد بند ہو جاتا مگر ہیں کیا رکھا تھا جو نقد یا نسو روپیہ پھر سرکاری خزانہ میں جمع کئے جاتے۔ لے دے کے ایک ہی صورت تھی کہ دادی اماں والے دونوں مکان رہن رکھے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تمدن نکلتا رہا مگر

مار ڈالنے کی دھمکی

"کیا کیا جائے صرف اس وجہ سے کہ تمدن حقوقِ نسواں کا مطالبہ کرتا ہے عزیز نہ ہو سکا رفتار زمانہ متقاضی ہے کہ اب تمدن اس خیال کو ورد کرے اور وقت کا ساتھ دے مگر اُن معصوم بچیوں کی تصویر آنکھ کے سامنے ہے جن کی مصیبت ناک زندگی پر در و دیوار رو رہے ہیں جو میکہ میں ناز و نعم سے پلیں اور سسرال پہنچتے ہی بے دام کی غلام بن گئیں۔ طرّہ یہ ایک مردانہ پرچہ حقوقِ نسواں کی آواز منہ سے نکالے تو لوگ گلا گھونٹنے کو تیار ہیں۔ جس مذہب نے علی الاعلان یہ حکم دیا تھا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں جیسا مرد اُن کے ساتھ آج اس کے پیرو ایسے شخص کو جو اُن حقوق کا مطالبہ کرتا ہے جو شرع اسلام نے عطا کئے مار ڈالنے کی دھمکی دیتے ہیں"

(تمدن دسمبر ۱۹۱۲ء)

دو آنسو عورت کی مظلومیت پر

عورت کی مظلومیت بے چارگی اور بے بسی کے نہ جانے کتنے واقعات علامہ مغفور کی آنکھوں کے سامنے گذرے ہوں گے جو اُن کے دل میں اس غضب کا درد اور ان کی تحریر میں اس شدت کا خلوص تا دم واپسیں رہا۔ ایک واقعہ ۱۹۱۲ء کے عصمت میں تحریر فرمایا تھا:۔

"شروع جنوری میں میں نے ایک غریب بڑھیا کو دیکھا جو اس قدر رو رہی تھی کہ پھوٹ پھوٹ رہی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اُس کی بیٹی جس کی شادی کو سات آٹھ مہینے ہوئے ہیں۔ شوہر کے ظلم میں گرفتار ہے۔ مار پیٹ تو خیر معمولی بات تھی اس کا اتنا حکم نہیں کہ وہ ماں سے بات کر سکے میں اس بڑھیا کے ساتھ اس کے داماد کے پاس گیا جو ایک نمازی حاجی ہے اس کی گفتگو ثابت کر رہی تھی کہ بیوی کا وہ نعوذ باللہ خدا ہے اور دنیا میں کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ اُس کے معاملے میں دخل دے۔ میرے زیادہ اصرار سے یہ جھگڑا ایک مولوی صاحب کے سپرد ہوا جو خیر سے واعظ بھی تھے اور میں نے اپنے کان سے یہ الفاظ مولوی صاحب کی زبان سے سنے کہ

اگر سقہ پانی نہیں لایا تھا تو یہ پیاسی مر جاتی۔ مگر ہمسائے سے پانی منگوا کر کیوں پیا یہ تھی کون گھر کی میں جانے والی۔ رہا ماں سے ملنا اُس کے لئے بھی جب شوہر نے منع کر دیا تو پھر ماں سے بات کرنی نافرمانی ہے۔

خفا ہیں۔ پتہ میں ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو پکڑے جائیں گے۔
خطوط کے جوابات تین قسم کے ہوتے ایک وہ جو کلرک خود لکھتے۔ ایک وہ جن کے جوابات علامہ مغفور خود لکھواتے۔ تیسرے وہ جن کے جوابات وہ خود تحریر فرماتے تھے۔ معاون مدیر کوئی نہ تھا۔ موصول مضامین کو دیکھنا۔ درست کرنا۔ لکھی ہوئی کاپیاں پڑھنا۔ مضمون نگاروں سے خط کتابت یہ سب کام خود انجام دیتے تھے۔ وی پی منی آرڈر وغیرہ خود وصول کر کے خزانچی کو دیتے اور پھر وہ کوپن کا اندراج وغیرہ کرنے کے بعد کلرکوں کے حوالے کرتے تھے۔ تنخواہ کی تاریخ مقرر ضرور تھی مگر اس کی پابندی ہر ماہ نہ ہوتی تھی روزانہ آمدنی اچھی ہوتی تو چار دن پہلے تقسیم کر دیتے ورنہ دو چار دن بعد۔

گرمیوں میں ایک بڑھیا چماری فرشی پنکھا کھینچا کرتی تھی اور اسے دو ڈھائی آنے روز دئے جاتے تھے۔ علامہ مغفور کی نشست اندر کے دالان میں تھی اور سب باہر کے دالان میں فرش پر عملہ بیٹھتا تھا۔ دروں پر چلمنیں پڑی رہتی تھیں۔ اندر کے دالان میں علامہ مغفور بیٹھتے تھے۔ بڑھیا چماری پنکھا کھینچتی اور کلرک کاتب وغیرہ اسے چھیڑا کرتے اور وہ انھیں گالیاں اور کوسنے دیتی اور پھر علامہ مغفور سے شکایت کرتی "دیکھ لے بابو یہ منسی کا جنا نہیں مانتا" وہ دریافت فرماتے کون ہے کیا ہے اور وہ کہتی "وہی ہے لال لال داڑھی والا۔ کہے ہے سلوی کر لے سرم نہیں آوے ہے۔ پلٹو (اس کا بیٹا) کیا کہوے گا"

علامہ مغفور جوان لڑکوں کو کلرک نہیں رکھتے تھے۔ ان کے زمانہ میں سارے کلرک بڈھے یا کم سے کم ادھیڑ نیک چلن اور اولاد والے تھے۔ چند ماہ ایک لڑکے نے کام کیا تھا۔ ایک دن اسے جیب میں کچھ رکھتے ہوئے علامہ مغفور نے دیکھ لیا۔ تلاشی لی تو کنواری لڑکیوں کے پتے تھے۔

ریاستوں میں اڈیٹروں کی بہت خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ سوائے ریاست مالیر کوٹلہ کے جو پنجاب کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی علامہ مغفور کسی ریاست میں عصمت یا تمدن کے لئے نہیں گئے۔ مرحوم شیخ عبدالقادر مرحوم شیخ محمد اکرام مرحوم مولانا ظفر علی خاں مرحوم ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے اپنے پرچوں کی توسیع اشاعت کے لئے دورے کئے ہیں علامہ مغفور بھی اس سلسلہ میں دلی سے باہر گئے۔ مشرقی پنجاب کے ضلع حصار کے تحصیلدار یا ضلعدار کوئی صاحب بہر حسین تھے انھوں نے بہت اصرار کر کے بلایا تھا۔ شاید ۱۹۱۳ء میں علامہ مغفور وہاں گئے تو ان صاحب نے شہر کے رئیسوں زمینداروں پٹواریوں کو جمع کیا اور تین تین روپے بھی منگوائے۔ جب وہ جمع ہو گئے تو علامہ مغفور کا تعارف کرایا کہ یہ دلی کے بہت بڑے مولوی ہیں۔ تمدن ایک رسالہ نکالتے ہیں جس میں قصے کہانیاں مسئلے اور نماز روزہ کی باتیں چھپتی ہیں تم اس رسالے کے خریدار ہو جاؤ۔ ہر مہینہ گھر بیٹھے ملا کرے گا۔ چنانچہ تمدن کے ۱۴۰ خریدار ہو گئے اور ۸۔۔۱۰۰ عصمت کے بھی۔ دو گھنٹہ میں خریداروں کا چندہ ساڑھے چار سو روپیہ جمع ہو گیا۔ وہ سب ہی ان پڑھ تھے۔ حقوق نسواں اور حمایت نسواں کہکر کچھ کہے بھی تو چراغ پا ہو گئے اور سال ختم ہونے پر جب وی پی گئے تو تقریباً سب ہی واپس آئے۔

اس زمانہ میں پوسٹ کارڈ ایک پیسہ کا آتا تھا لفافہ دو پیسہ کا۔ منی آرڈر کی فیس صرف ایک آنہ تھی عصمت و تمدن کا وی پی ۵۔۵ پیسہ کا جاتا تھا۔ ایک پیسہ محصول ڈاک چار پیسے وی پی کی فیس۔ عصمت اور تمدن میں دبیز چکنا سفید ولایتی کاغذ جو آیوری فنش کہلاتا تھا ۲۲×۱۸ تقطیع کا

...ہونے کا ایک رسم ہوتا تھا اور رخصت کا ...
... کہتے ہیں چھوچھو آنے کی رسم۔

مکانوں کی قربانی

... علامہ راشد الخیری کا مکان ... دو مکان ... ایک بڑے مکان کا تھا دوسرا چھوٹے مکان کا۔
چھوٹے مکان میں پھوپی اماں رہتی تھیں اور بڑے مکان میں دفتر اور پریس تھا۔ والدہ مرحومہ اپنی اماں کے مکان میں چلی گئی تھیں جو بڑے مکان سے ملا ہوا تھا۔
زر ضمانت سرکاری خزانہ میں جمع کرنے کے لئے دونوں مکان رہن رکھنے پڑے تھے۔ سود بڑھتے بڑھتے زر ... گنے کے قریب ہوگیا اور ادائیگی کی کوئی صورت نہ نکل سکی تو بالآخر مکان فروخت کرنے پڑے۔
یہ تمام مصیبت اس شخص پر گذر رہی تھی جس کے دوست ... پہچان بھی محدود سے چند ہی تھے۔ ظاہر غور سے دیکھا تو کچھ زیادہ تھا۔ صورت انسان سے کوسوں دور بھاگنے والا وحشی اسی سزا کا مستحق تھا۔ تعلقات کے محدود دائرے نے گلے کے سب بل نکال دئے۔ واقعات نے ثابت کردیا کہ کامیاب وہی ہیں جو فضائے عالم میں شہرت کے پر لگا کے اڑیں۔ جھوٹے سچے دوست، اچھے برے معتقد جان کے ساتھ ہوں۔ عمر کا بڑا حصہ ملاقاتوں میں بسر ہو ... دل میں .... زبان پر نعرۂ مذہب، وہ اصول ہے جو ... عالم اسلام کو چشم زدن میں مسخر کرلے۔ تفکرات کا سلسلہ کسی طرح منقطع نہ ہوتا تھا کہ تمدن کا زر ضمانت (جس کا افسوس آج اظہار ہوتا ہے کہ قرض تھا) دگنے کے قریب پہنچا، یہ مطالبہ ایسا سخت تھا جس نے امیدوں کا خاتمہ کردیا۔ مگر زبان سے نکلے ہوئے الفاظ واپس نہ آئیں گے اور یہ دنیا قبر تک ساتھ رہے گا۔ المختصر تمدن کی زندگی باقی تھی۔ ... لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کل میں اس کو امراض سے پاک اور نقائص سے دور پاتا ہوں جب نظر پر تمدن کے شکر ... ہوں گے کہ ایک ایسی عزیز شے جو بزرگوں کی نشانی تھی تمدن پر قربان ہوچکی ....
مگر داغ جب تک ... قابل ... سے گا ... سے پہلے کہ موت ان ارمانوں کو پورا کرسکے کان یہ سن لیں گے کہ تمدن کی خریدار ایک عورت کی بھی زندگی سنوار دی تو عمر بھر کی محنت ٹھکانے لگی اور ... جو ... ہوچکی وصول ہوگئی ... معلوم مگر دل اس خیال سے باغ باغ ہے کہ ایک وقت ضرور ایسا آئے گا کہ یہ خون اپنا رنگ لائے۔ یہ بیج بار آور ہوں اور ہماری مظلوم بیویاں اپنے گھروں میں سچ مچ کی ملکہ ہوں۔"

تمدن مارچ ۱۹۱۳ء

مکان فروخت ہونے کے بعد اب ہماری حیثیت کرایہ دار کی تھی۔ اس گلی میں ایک بزرگ شیخ صاحب رہتے تھے ان کے دو نوجوان لڑکے اپنے مکان سے دو منزلہ کی چھت پر کبوتر اڑایا کرتے تھے اور ہمارے ہاں کا سامنا ہوتا تھا۔ ایک دن ان دونوں میں سے ایک سے علامہ مغفور نے کہا شیخ جی اگر دو منزلہ کی چھت پر چڑھنے سے پہلے آواز دے لیا کرو تو مہربانی ہوگی۔ تمہاری بھاوج اور بھتیجی بیٹھی اٹھتی ہیں سامنا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا بہت اچھا مولوی صاحب۔ کچھ مدت تو انھوں نے اس کا خیال رکھا مگر بغیر آواز دئے چھت پر جانا پھر شروع کردیا۔ علامہ مغفور نے اور ایک دفعہ ان سے کہا اور پھر وہ چھت پر جانے سے پہلے آواز دے لیتے لیکن انھوں نے پھر وعدہ خلافی کی۔ علامہ مغفور کسی سے زبان نہیں ملاتے تھے۔ انھوں نے

سے کیا کہ دل خراب کرنے اور زبان بدلنے سے کوچہ بدلنا
بہتر ہے چنانچہ ۲۰ سال کی سکونت کے بعد ۱۹۱۵ء میں
محلہ ہی چھوڑ دیا۔

بیگم راشد الخیری کی خطرناک علالت

۱۹۱۲ء میں والدہ

مرحومہ ایسی سخت بیمار پڑیں کہ اُن کی زندگی کے لالے پڑ گئے
تھے۔ دو جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے ایک تو پیدا ہی مرا ہوا
تھا۔ دوسرا سسک رہا تھا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ
بھی مر گیا۔ والدہ مرحومہ کی کمزوری انتہا درجہ کی تھی ۔
اُس زمانہ میں ڈاکٹرنیاں تو ہوتی نہ تھیں۔ علامہ مغفور پہلے
بلی ماران حکیم اجمل خاں مرحوم کے ہاں گئے وہ کہیں باہر
گئے ہوئے تھے پھر حکیم صادق علی خاں مرحوم کو لے کر آئے
انھوں نے نبض دیکھی اور کہا یہ نسخہ پلایئے، بظاہر ان کی
زندگی خطرہ میں ہے لیکن خدا ایں بڑی قدرت ہے۔ کل
پھر میں آکر دیکھوں گا۔ حکیم صاحب کے ہاتھ میں اللہ
تعالیٰ نے شفا دی تھی تین دن تک وہ آئے اور نبض
دیکھتے رہے۔ تیسرے دن انھوں نے کہا اب خطرہ نہیں
معلوم ہوتا۔ یہ تین راتیں اور تین دن علامہ مغفور کے
انتہائی تشویش اور پریشانی میں گذرے تھے۔

"مگر کام کرنے والا دماغ آخر انسانی تھا اور علائق
وافکار لازمۂ حیات۔ اگست ۱۹۱۲ء وہ مہینہ تھا جس نے
بائیس برس کی ہمدم و ہمراز بیوی کی زندگی خطرے میں ڈال
دی۔ کچا ساتھ۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ تبدیلی آب
ہوا کی غرض سے دلی چھوڑنی پڑی اور کامل چھ مہینے اسی طرح
بسر ہوئے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش نہ تھا۔ رات کے ان
حصوں میں جب خلق خدا خواب استراحت اور مریضہ
بستر علالت پر ہوتی تخیل زندگی کی ان دشوار گذار گھاٹیوں
میں لے جاتا جہاں ہر طرف تعلقات کے مہیب اژدہے
منہ کھولے بیٹھے ہوتے مگر اس حالت میں بھی تمدن کے
خیال نے مفارقت نہ کی" تمدن مارچ ۱۹۱۳ء

بھانجی کو ۔ بہن کو ۵ بھی نہیں

پھوپی اماں کو اُن کے بچے

آپا اماں اور ان کی بیٹی آپا مریم کو جو پہلوٹھی کی تھیں سب
چھوٹی آپا کہتے تھے۔ آپا راشدہ کو میں آپا کہتا اور آپا
مریم جو اُن سے دس سال بڑی تھیں میں بھی چھوٹی آپا
ہی کہتا تھا۔ والد مغفور کو اپنی بھانجی سے بہت محبت
تھی۔ اُن کے شوہر ریاست جے پور میں سررشتہ دار تھے
ان کے پاس ۵-۶ گائے بھینسیں تھیں۔ ایک گھوڑا۔
دو لونڈیاں تین چھوکرے روپیہ کی ریل پیل تھی۔ وہ سخت
بیمار پڑے تو حالات بالکل بدل گئے ملازمت بیماری
کی بھینٹ چڑھ گئی۔ گائے بھینس گہنا پاتا روپیہ
پیسہ سب علاج کی نذر ہو گیا۔ سر میں درد اُٹھا تو اس
غضب کا کہ تین سال تک جان پر بنی رہی۔ آمدنی
کچھ نہیں رہی اور جمع پونجی ختم ہو گئی تو علامہ مغفور کے
مشورہ سے آپا مریم بیگم نے ایک گھوڑا گاڑی خرید لی
اس کا کرایہ تین ساڑھے تین روپے روز آجاتے تھے اس
آمدنی میں گھوڑے کا گھاس دانہ، اصطبل کا کرایہ کوچوان
کی تنخواہ نکال کر سوا ڈیڑھ روپیہ روز بچ جاتا تھا۔
۵-۶ ماہ بعد گھوڑا مر گیا۔ آپا مریم کو خبر ہوئی۔ وہ
بہت روئیں۔ علامہ مغفور نے اُسی وقت کوچوان سے
کہا کالے خاں دوسرا گھوڑا کل صبح تک دیکھ کر لے آؤ
سہ پہر کو کوچوان نے آپا مریم سے کہا گاڑی تیار کھڑی
ہے۔ وہ خوش ہو گئیں اور پھر روزانہ آمدنی ہونے لگی۔
کوئی تین چار دن بعد پھوپی اماں نے ایک

بکری دیکھی جو موٹی تازی تھی اور بہت سستی مل رہی تھی
وہ فوراً خریدنا چاہتی تھیں مگر ان کے پاس پیسے نہ تھے
انھوں نے اپنے بھائی سے کہا "مجھے پانچ روپے
دے دیجیے" اور پھر بکری کی تعریف کی۔
انھوں نے جواب دیا: "میرے پاس نہیں ہیں"
دوسرے دن جب پیسے ... خالہ اماں آئیں تو اُن سے بھائی کی
شکایت کی۔
"اے خالہ اماں دیکھیے۔ ایسے بھائی بھی کہیں ہوتے
ہوں گے۔ مریم بیگم کو ۷۰ روپیہ کا گھوڑا خرید کر دے دیا۔ اور
میں بہن ہوں پانچ روپیہ مانگوں تو کہہ دیں میرے پاس نہیں
ہیں۔ مفت بھی تو نہیں مانگے قرض مانگے تھے۔"
شکایت علامہ مغفور نے بھی سنی اور انھیں کو
سنانے کو کہا تھا وہ مسکراتے ہوئے کہیں باہر چلے گئے۔ واپس
آئے تو کہا "اچھا جی شکر کرو دے دوں گا خرید لو بکری"
پھوپی اماں نے کہا: "بک بھی گئی وہ موئی۔ اب
کیا رکھی ہوئی ہے اب دینے سے کیا فائدہ"
فرمایا "بہت اچھا ہوا"
پھر سمجھایا "تمھیں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ قرض دے
دیجیے پہلے میں نے کبھی قرض دیا ہے جو اب قرض دیتا۔ بھائی
بہنوں میں کیا قرض۔ تم نے مرغیاں پال کر اپنا گھر اور ڈیوڑھی
گندی کر رکھی ہے اب بکری پال کر اور گندگی میں اضافہ
کرتیں۔ لال، پیڑیاں، مینا، طوطے، گلدم اتنے پرند موجود ہیں۔
کہاں تک جانور پالو گی۔ بکری چند روز بعد دودھ دینا
بند کر دیتی پھر فائدہ کیا تھا سوائے اس کے کہ صحن خراب
کرتی اور دن بھر مکھیاں بھنکتیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی
ضروری ہے نہ کہ یہ فضول شوق"

ساجدہ اور باسط کے صدمے ساجدہ محمد سے چھوٹی
اور ساجدہ بیگم سے بڑی تھیں [illegible]ء میں پیدا ہوئی تھی اور بچوں
بہنوں میں سب سے اچھی صحت کی تھی۔ باتیں ایسی بنا بنا
کے کرتی۔ چڑیاں کی طرح ایسی چہکتی اور ایسی تمیز سے کپڑے
پہنتی اور صاف ستھری رہتی کہ سب کہتے تھے خدا اسے نظرِ بد
سے بچائے۔ چھ سال کی تھی کہ ٹائیفائڈ ہوا اور ہوتی جو [illegible]
اور جانبر نہ ہو سکی۔ پیچوٹی کا بچہ مرا ہوا پیدا ہوا، تھا وہ لڑکا
پندرہ دن کا ہو کر گذرا مگر ساجدہ چھ سال کی تھی!
ساجدہ کی موت کو چند ماہ گذرے تھے کہ باسط پیدا
ہوئے۔ بعض بچے بہت بھاگوان سمجھے جاتے ہیں۔ عورتیں
ہی نہیں شاید علامہ مغفور بھی اس بچہ کو بھاگوان سمجھتے تھے۔
انھیں روپیہ کی ضرورت ہوتی اُسے بلا کر لاتے۔ پکڑ کر
بٹھاتے مگر وہ بھاگ بھاگ جاتا اور ڈاک تھوڑے سے
روپے لاتا کبھی انھیں زیادہ ڈاک کی توقع نہ ہوتی ڈاک
زیادہ آتی تو وہ دیکھتے کہ میز کے نیچے کاغذوں میں باسط
پڑا سو رہا ہے۔ چھ سال کی عمر میں اپریل [illegible]ء میں اسے
ٹائیفائڈ ہوا اور پھر سرسام اور بالآخر موت! اس بچہ کے
ضائع ہونے کا علامہ مغفور کو بہت صدمہ ہوا۔ عصمت و
تمدن کی اشاعت میں بے قاعدگی ہو گئی۔ اس کے
گذرنے پر مرحوم "واپسی" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا
اس کی چند سطریں یہ ہیں:۔

"عورت جس کے پہلو میں ایک زخمی دل چٹکیاں لے
رہا تھا جو اسی قسم کے ایک داغ سے پہلے گھائل ہو چکی تھی گھور رہی
تھی اُن آنکھوں کو جن سے محبت کی شعاعیں نکلتی تھیں۔
تک رہی تھی ان ہونٹوں کو جن سے پھول جھڑتے تھے اور
دیکھ رہی تھی اُن ہاتھوں کو جو گلے میں پڑ کر عالم حیات کی
تمام تکالیف زائل کر دیتے تھے۔
فضائے عالم میں پھرنے والی پاک روحوں تم ہم کو

فراموش کر گئیں مگر ہمارے دل تمہاری یاد سے غافل نہیں تمہارا عارضی قیام مدتوں خون رُلوائے گا۔ تم ظاہری آنکھوں سے بچھڑ گئے لیکن حافظہ تم کو نہیں بھولتا۔ کھلنے سے پہلے مرجھانے والی کلیوں آج تک دماغ میں تمہاری بو بسی ہو۔ آنکھیں تمہاری خاک سر پر رکھ رہی ہیں، کہاں ہو کلیجہ کے ٹکڑو چاند سی صورت دکھا دو۔ برکت والے بندوں دل کی راحت لے گئے اور داغ چھوڑ گئے دل و دماغ بیکار ہو گئے۔ زندگی میں موت کا مزہ چکھا دینے والے پیاروں کان تمہاری باتوں کو ترس گئے۔ چاروں طرف خاک چھان لی مگر تمہارا پتہ نہیں چلتا کیسی پُر لطف تھی تمہاری شبِ حیات اب وہ رات میسر نہیں ہوتی اور کس قدر ظالم تھی وہ صبح جس نے تمہاری بزمِ وصال درہم برہم کر دی . . . . . . اب تم کہاں اور ہم کہاں دل کی بستی سُونی ہو گئی اور اب اس کی آبادی اللہ ہی اللہ ہے۔ مگر دل تمہاری محبت کے دم بھر رہے ہیں اور مفارقت کے وہ پھول جو تم اپنے پاک ہاتھوں سے ہمارے کلیجہ پر رکھ گئے تا دمِ حیات شاداب رہیں گے"

(تمدن مئی ۱۹۱۳ء)

بڑی بیٹی کی تعلیم | آپا نے قرآن شریف پھوپی اماں سے پڑھا پھر اُردو اماں سے کبھی کبھی ابا بھی پڑھاتے تھے۔ اور ان کے خالہ زاد بھائی حامد علی مرحوم تھے جنھیں ہم چچا بھورے کہتے تھے چند روز آپا نے ان سے حساب پڑھا تھا۔ اُس زمانہ میں دلّی میں لڑکیوں کا کوئی مدرسہ نہ تھا اور لڑکیوں کا انگریزی پڑھنا سخت معیوب تھا اور دادی اماں کے سامنے آپا کو انگریزی پڑھانے کی جرأت والد مرحوم کر بھی نہ سکتے تھے۔ دادی اماں کے بعد انھوں نے ایک میم کا انتظام کیا۔ جو روزانہ آپا کو انگریزی پڑھانے آتی تھی۔ کنگ پیر اٹمر کے بعد انھوں نے کنگ ریڈر اول و دوم بھی پڑھ لی تھی انگریزی لکھنا بولنا بھی کچھ کچھ سیکھ لیا تھا کہ ایک دم والد مغفور نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہوا یہ کہ میم صاحب دو ڈھائی مہینے تو خاموش رہیں اس کے بعد آپا کو انجیل دی اور عیسائی خیالات پھیلانے شروع کئے۔ والد مغفور کو معلوم ہوا تو انھوں نے یہ کہہ کر میم صاحب کو موقوف کر دیا کہ بھاڑ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

مصورِ غم کی زندہ دلی | مصورِ غم علیہ الرحمۃ غم کے مضامین لکھتے تھے مگر تصویرِ غم نہ تھے۔ بزلہ سنجی اور زندہ دلی انھیں عطا کرنے میں قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ سیر و تفریح کا انھیں بہت شوق تھا فرمایا کرتے تھے چھ دن کام کے ایک دن تفریح کا۔ ۱۹۱۴ء تک یہ سلسلہ رہا کہ تقریباً ہر اتوار کو اوکھلے جاتے تھے۔ اوکھلا شہر (دلّی دروازہ) سے نو میل کے فاصلہ پر جمنا کے کنارے ایک ننھا سا گاؤں تھا۔ یہاں جمنا کا پانی کئی سمتوں میں جمع کیا گیا تھا۔ خالہ زینب کے بڑے بیٹے بھائی اسمٰعیل سولہ سترہ سال کے ہوں گے انھیں مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا اور علامہ مغفور مچھلی بہت شوق اور رغبت سے کھاتے تھے۔ مگر بھائی اسمٰعیل کو شکار کا ہی شوق تھا مچھلی نکالنے کے ماہر نہ تھے وہ بھائی اسمٰعیل کو اکثر چھیڑا کرتے کہ تمھیں مچھلی نکالنی تو آتی نہیں خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے ہو وہ کہتے بھائی کل اتوار ہے چل کر دیکھئے کہ مچھلیوں کا ڈھیر لگا دیتا ہوں یا نہیں۔ کبھی وہ خود ہی کہتے کہ اگر ایکے آپ اوکھلے سے بغیر مچھلی کھائے آجائیں تو جو چور کا حال وہ میرا کبھی دادی اماں بیچ میں بولتیں اور آبا جان سے کہتیں۔ یہ جانتا دانتا خاک نہیں تم اس کے راگ میں کیوں آتے ہو۔ پھر وہاں سے کھوتے بھٹکتے آؤ گے اور یہ بہانے کرے گا کہ کانٹا ٹوٹ گیا۔ ڈور کمزور تھی چارہ ختم ہو گیا۔ موٹر میں

ز مانہ میں تھیں نہیں گھوڑا گاڑی اور بیل گاڑی کا
ج تھا۔ ایک گھوڑے کی بند گاڑی جس کی کھڑکیوں
بلبلیاں ہوتی تھیں۔ سوا دو یا ڈھائی روپے میں سار
کے لئے ہو جاتی تھی۔ صبح سویرے چلتے اور دو گھنٹے میں
لے پہنچ جاتے سارا دن سیر و تفریح میں گزرتا اور چار بجے
ہو کر مغرب تک گھر لوٹ آتے تھے۔ مگر تمدن جاری
نے کے بعد ۱۲ سے ہو کے جانا کم ہو گیا اور مئی جون
لئی میں مہینہ سوا مہینہ قصبہ مہرولی میں گزر جاتا۔ جو
ب صاحب کہلاتا تھا کہ وہاں حضرت خواجہ قطب الدین
یار کاکی کی درگاہ ہے اور قطب الدین ایبک کی لاٹھ۔
گاڑی جسے بہار کس کہتے تھے قطب پہنچانے کے ڈھائی
ن روپے لیتی تھی۔ شام کو چار آنے چنگی سائی کے دے
ئے جاتے تو سویرے تڑکے بیل گاڑی (بہارکس) دروازہ پر
پہنچی تیار ہوتے ہوتے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا بچے
ے سب مل ملا کر دس بارہ آدمیوں کا کنبہ ایک گاڑی
ں کیونکر سما سکتا تھا لیکن بیل گاڑی کی چال بہت
سست ہوتی ہے۔ کچھ چڑھتے کچھ پیدل چلتے عورتوں کو
س زمانہ میں گھر سے باہر نکلنے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔
اس لئے شہر سے باہر پیدل چلنے میں بھی ان کی تفریح ہو جاتی
تھی چاروں طرف سناٹا ہوتا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں آتی
جاتی نظر آجاتی تھیں کچھ دور چل کر بیٹھنے والیاں اُتر جاتیں
اور پیدل چلنے والیاں گاڑی میں آ بیٹھتیں بچے بھی
کبھی اُترتے کبھی چڑھتے۔ فاختہ کبوتر چڑیوں کا شکار
کرتے غرض ہنستے بولتے سیر کرتے تین ساڑھے تین گھنٹے
میں سات میل کا سفر طے کر کے مدرسہ پہنچتے (صفدر جنگ
کا مدرسہ جو منصور کا مقبرہ بھی کہلاتا تھا۔ جس کے پاس
اب ہوائی اڈہ ہے) بچے وہاں کھیلتے کودتے اُچھلتے دوڑتے
بھاگتے اور موقع ملتا تو بزرگوں کے بار بار منع کرنے پر بھی
آنکھ بچا کر پھول توڑتے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہاں دم لے کر
کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھ کر پھر روانہ ہو جاتے اور بقیہ ۳ میل
دو گھنٹے میں اس طرح چڑھتے اُترتے طے کر کے عصر تک قطب
صاحب پہنچ جاتے۔ لب سڑک کسی مکان کی اوپر کی منزل
میں ایک دو کمرے اسی وقت کرایہ پر مل جاتے صبح ہوتی
کسی دن پرانے جھرنے کا رُخ ہوتا کسی دن نئے جھرنے کا
اور کسی روز شمسی تالاب کا جہاں والد مرحوم تیرتے اور مجھے
بھی تیرنا سکھاتے۔ کبھی شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے مقبرے
میں جاتے کبھی اولیا مسجد کبھی ظفر خاں کے باغ جاتے
آم کے کسی درخت پر چڑھ کر میں سبق یاد کرتا اور درخت
کی چھاؤں میں ایک چارپائی پر آبا جان بیٹھے مضمون
لکھتے اور برابر کی چارپائی پر اماں جان بیٹھی کھانا پکواتیں۔
قطب کا پانی بہت ہلکا تھا۔ دلی کے مقابلے میں کھانا
یہاں زیادہ کھایا جاتا۔ کبھی جھولے پڑتے۔ پینگیں بڑھتیں
اور آپا ملہار گاتیں۔ کبھی کڑھائی چڑھتی۔ پکوان اُترتا۔
گھٹا چھاتی۔ بادل آتے۔ آموں کی بھری بالٹیاں خالی
کر دی جاتیں۔ گراموفون بجتا۔ کہانیاں لطیفے ہوتے۔
داستانیں سنائی جاتیں۔ پیڑوں پر کوئل کوکتی اور چارپائی
پر لیٹے تکیہ لگائے ابا جان بانسری بجاتے اور باغ گونج اُٹھتا۔
ڈاک کا انتظام یہ تھا کہ دلی سے ایک معتمد چپراسی
آنے جانے والے خطوط اخبارات رسالے کتب مرتبہ کا پیا
اور روپیہ لے کر مدرسے یعنی صفدر جنگ کے مقبرہ پہنچ جاتا۔
ادھر قطب صاحب سے دوسرا ملازم ایک دن پہلے کی آئی
ہوئی ڈاک لے کر مدرسہ وقت مقررہ پر پہنچتا اور دفتر سے بھیجی
ہوئی ڈاک لے کر کاغذات و ہدایات وغیرہ لے آتا۔ اس طرح
قطب صاحب چند ہفتوں کے لئے آ جانے سے دفتر کا کچھ

ہوجاتا دیوتا۔

علامہ مغفور سیر و تفریح اپنی بیوی بچوں اور عزیزوں ہی کے ساتھ نہ کرتے تھے بلکہ اس میں ان کے ملازم بھی شریک ہوتے تھے اور دفتر پریس کے سب ملازمین ہو ہفتہ کو عشا کے وقت تک قطب صاحب آتے اور اتوار کو عصر کے بعد دلی واپس ہوتے تھے۔ اُن کے لئے زردے میدے کے پراٹھے اور قورمہ پکتا۔ خربوزوں سے بھرے ٹوکرے آتے اور گرمی زیادہ نہ پڑتی۔ دن ابر آلود ہوتا تو آموں کا ڈھیر لگ جاتا۔

جنگ بلقان

زرضمانت ضبط ہونے کے بعد ہو سکتا تھا کہ عصمت یا تمدن میں پھر کوئی ایسا مضمون شائع نہ ہوتا جو انگریزی حکومت کو ذرا بھی کھلتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ طرابلس کے بعد جنگ بلقان شروع ہوئی اور یورپ کی چار عیسائی طاقتوں نے مل کر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کیا اور ترکوں اور عربوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ اُس وقت ممکن نہ تھا کہ علامہ مغفور کا دل جو اسلام کے درد میں ڈوبا ہوا تھا متاثر نہ ہوتا۔ ایک عرب سیدانی روضہ اطہر پر" "ترکن ملمانی" "دو آسمانی مسافر" "شہید طرابلس" جیسے پُر تاثیر دردانگیز افسانے اور مضامین عصمت تمدن میں شائع ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں کتابی صورت میں بعنوان "شہید مغرب" شائع ہوئے۔ "روضہ اطہر پر" کی چند سطریں :-

"کشتیٔ اسلام کے ناخدا عیسائیوں کی متفقہ طاقت اسلام پر حملہ آور ہے۔ اور ترک صرف اس لئے کہ روضۂ اطہر کے محافظ ہیں اپنی جانیں لڑا رہے ہیں اے وہ مقدس روح (روحی فدا) جس نے الخلق عیال اللہ کی تلقین ڈنکے کی چوٹ دی۔ اے وہ پاک رسول جس نے بھرے مجمع میں حاتم کی لڑکی کو اپنی چادر اوڑھا کر نامحرم نظروں سے بچایا آج تیری اُمت کی بیاہی ہوئی عورتیں اور کنواری لڑکیاں بھٹکی جاتی ہیں۔ ظالم بآواز بلند پکار رہے ہیں کہ کعبۃ اللہ اور مدینہ منورہ تاراج کرتے ہیں۔ مسیحی دنیا ان کے ارادوں پر مرحبا کہتی ہے اور اس وقت کی منتظر ہے کہ اسلام روئے زمین سے نیست و نابود ہو جائے"

صادق میاں کی پیدائش

باسط کا صدمہ قانون قدرت کے بموجب کچھ کم ہوا تو واحد پیدا ہوا۔ آپا کہتی ہیں میرے عقیقے کے بعد دھوم دھام سے عقیقہ واحد ہی کا ہوا تھا۔ علامہ مغفور چھوٹے بچوں کو گود میں بہت کم لیتے تھے۔ لیکن واحد کو وہ اکثر گود میں لیا کرتے اور اس سے دل بہلایا کرتے تھے۔ یہ بچہ صورت کا بھی بہت اچھا تھا۔ اور بقول آپا بہت بھاگوان تھا۔ وہ تو یہ بھی کہتی ہیں اُسے نظر لگ گئی تھی۔ واحد سال بھر کا نہ ہوا تھا کہ اُس کا انتقال ہوگیا۔ اُس کی وفات کے تین چار ماہ بعد صادق میاں پیدا ہوئے۔ ۱۱ر مئی ۱۹۱۵ء صبح نو بجے۔ میں مدرسہ گیا ہوا تھا۔ واپس گھر آیا تو معلوم ہوا بھائی ہوا ہے۔ مجھے یاد ہے میں نے اُسی دن اُنھیں گود میں لیا اور پیار کیا تھا۔ دادی اماں کے بھائی منشی وزیر محمد خاں مرحوم کے مکان کے اندر کے دالان میں جس کونہ میں علامہ مغفور پیدا ہوئے تھے وہی کونہ صادق میاں کی پیدائش کا تھا۔ صادق میاں کی پیدائش نے بظاہر واحد کا زخم بھر دیا تھا مگر ساجدہ باسط اور واحد کی یاد غم زدہ والدین کو جب آتی کلیجے کھُرچ کر رکھ دیتی تھی۔

فوجی اخبار کے لئے مضامین

منجھلے ماموں جان سردار بہادر کپتان مولوی حبیب الرحمٰن خاں مرحوم سی۔ آئی۔ ای۔ او بی۔ ای وغیرہ جب فوجی اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر ہوکر شملہ چلے گئے تو اُنھوں نے والد مغفور کو خط لکھا کہ فوجی

اخبار کے لئے کبھی کبھی مضامین لکھ کر بھیج دیا کریں۔ چنانچہ والد مغفور فوجی اخبار کے لئے مضامین بھیج دیتے تھے اور شاید ہر سال تھاپہ منی آرڈر کے ذریعہ معاوضہ کی رقم آیا کرتی تھی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں فی مضمون شاید تین روپیہ ملتے تھے اوسطاً ماہی میں کبھی تین کبھی چار مضمون پہنچتے تھے۔ یہ مضامین مضمون نگاروں کے نام سے نہیں اڈیٹر کی طرف سے شائع کئے جاتے تھے اور ان میں حکومت سے وفاداری کی ترغیب دی جاتی تھی۔ فوجی اخبار میں علامہ مغفور کے مضامین ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۸ء تک شائع ہوئے تھے۔ بڑے سے بڑا مضمون عصمت کے سوا یا ڈیڑھ صفحہ کا ہوتا تھا۔ اور اُردو کے علاوہ رومن رسم خط میں بھی چھاپا جاتا تھا۔ میرے پاس فوجی اخبار کا فائل موجود ہوتا تو میں حضرت علامہ مغفور کے مضمون نکال سکتا تھا وہ اُن کے نام سے نہیں چھپے مگر اُن کا رنگ کہاں چھپ سکتا ہے۔

محلہ چوڑی والوں میں | دادی اماں کا مکان عصمت و تمدن پر قربان ہو چکا تھا

اور والدہ مرحومہ کا زیور بھی۔ ۱۹۱۵ء میں علامہ مغفور چوڑی والوں کے محلہ میں چھتہ شیخ منگلو سے نکل کر مسجد کے سامنے نکری والوں کے محلہ کے ایک بڑے دو منزلہ مکان میں آ گئے یہ کرایہ کا مکان تھا۔ اور ایک صوفی منش بزرگ حاجی محبوب الٰہی کی ملکیت تھا۔ اس مکان میں رہائش تھی اور پھاٹک میر شمس الدین میں پھوپی اماں کے بڑے مکان کے قریب ان کا ایک چھوٹا مکان تھا اس میں پریس اور دفتر عصمت تھا۔

تمدن کی رخصت اور سہیلی | ۱۹۱۳ء سے تمدن کی اشاعت میں بے قاعدگی

ہونے لگی تھی اور ہر ماہ اُس سے نقصان ہو رہا تھا۔ تمدن حقوق نسواں پر جس قدر زور دے رہا تھا اس قدر اشاعت گر رہی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں خریدار ... کے قریب تھے اور ۱۹۱۵ء میں ... سے بھی کم۔ سوا چار سال جاری رہ کر تمدن بند نہیں کیا گیا بلکہ علامہ مغفور نے اپنے بھیپن کے دوست قاری سرفراز حسین مرحوم کے بیٹے قاری عباس حسین صاحب کو دے دیا اور وہ کئی سال تک لکھنؤ سے شائع کرتے رہے۔ تمدن کو رخصت کرتے وقت علامہ مغفور نے لکھا۔

"تمدن پہلا پرچہ تھا جس نے حقوق نسواں کی حمایت میں آواز بلند کی اس وقت کوئی مرد اد پرچہ حقوق نسواں کا حامی قوم میں موجود نہ تھا اور مجھے یقین کامل ہے آئندہ بھی دس بیس برس تک موجود نہ ہوگا۔

تمدن کا شائع ہونا تھا کہ پرچہ پر چاروں طرف سے لعن طعن شروع ہوئی۔ میں اپنی طرف سے منت سماجت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر حقوق نسواں کی حمایت ایسا گناہ کبیرہ تھا کہ میرا قصور معاف نہ ہو سکا۔ میں اپنی محترم بہنوں اور بچیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ خواہ ان کو ایک خریدار بھی میسر نہ ہو مگر وہ حقوق نسواں کی حمایت میں ایک مولانہ پرچہ ضرور جاری رکھیں"

۲۰ سال بعد ۱۹۳۵ء میں جب عصمت کے علاوہ بنات اور جوہر نسواں دو اور ماہنامے میری اڈیٹری میں نکل رہے تھے۔ اور عصمت بک ڈپو خوب ترقی پر تھا۔ میں تمدن کو دوبارہ جاری کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ علامہ مغفور نے رحلت فرمائی اور تمدن پھر جاری نہ ہو سکا۔

تمدن کو رخصت کرنے کے بعد ۱۹۱۵ء ہی میں ہفتہ وار پرچہ سہیلی جاری کیا گیا اس کے ۲۲x۱۸ کے ۲۰ صفحے ہر ہفتہ

ہوتے تھے اور مضامین زیادہ تر علامہ مغفور ہی لکھتے تھے۔ سہیلی بھی کئی ماہ جاری رہنے کے بعد مالی نقصانات کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔

آپا راشدہ کی شادی

آپا راشدہ چودہ سال کی بھی نہ ہوئی تھیں کہ ان کے پیام آنے شروع ہو گئے تھے۔ سب سے زیادہ ساعی دلی ہی کے ایک صاحب تھے جو قریب ہی کے ایک شہر میں کوتوال تھے۔ وہ اکثر دفتر عصمت وتمدن میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن جو کچھ جی میں آئی تو علامہ مغفور خاموشی سے اس شہر میں اُن صاحب کے پاس پہنچے۔ اُنھوں نے بہت خاطر مدارات کی مگر ساتھ ہی اپنی افسری کا رُعب جمانے کے خیال سے ایک روزہ دار سپاہی کو گھنٹہ سوا گھنٹہ دھوپ میں کھڑا رکھا اور ایک کوبے وردی سے پیٹا۔ رعب تو بھلا کیا پڑتا۔ اُلٹا اثر ہوا اور اُنھوں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ ایسا سخت دل شخص میری دامادی کے قابل نہیں۔

شیخ عبدالغفور صاحب ضلع الہ آباد کے ایک بڑے زمیندار شیخ امام الدین صاحب کے بیٹے اور بمبئی بڑودہ سنٹرل انڈیا (بی بی سی آئی) ریلوے میں گارڈ تھے اور متھرا سے دلی ہفتہ میں کبھی ایک کبھی دو بار آیا کرتے تھے اور بی بی زاہدہ بیگم کے بیٹے بنے ہوئے تھے۔ دو تین سال سے علامہ مغفور بھی اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ اور بہن نے بھائی سے اُن کا ذکر بھی کر دیا اور بالآخر اُن کا پیام بھی دے دیا تھا۔ علامہ مغفور کے تین بزرگ جن کی جوان کنواری بیٹیاں بیٹھی تھیں یہ دیکھ کر کہ ابّی میاں تو راشدہ کی شادی یہاں کرتے نہیں اور لڑکا بہت اچھا ہے۔ کوشش کر رہے تھے کہ ان کے ہاں رشتہ ہو جائے مگر پھوپی اماں کہتی تھیں کہ نہیں میاں عبدالغفور کی شادی تو راشدہ ہی سے ہو گی۔ ایک دن بھائی کی کچھ تیز گفتگو ہوئی۔ پھوپی اماں نے کہا پردیس ہونا کوئی عیب تو ہے نہیں میاں صاحب (میاں نذیر حسین محدث دہلوی مرحوم) کون سے دلی والے تھے۔ بڑے پھوپا ابّا (ڈپٹی نذیر احمد مرحوم) بھی پردیسی تھے۔ ہمارے خاندان کی عورتیں نوشوہروں کی ملازمت کے سلسلہ میں کائے کوسوں حیدرآباد دکن گئی ہیں متھرا کونسا دور ہے۔ ۳۔۴ گھنٹہ ہی کا تو سفر ہے۔ راشدہ میرے پیٹ کی بیٹی ہوتی تو میں دو سال پہلے میاں عبدالغفور سے کر چکی ہوتی۔ پیٹ کی بیٹی اور بھائی کی بیٹی کا فرق مجھے اب معلوم ہوا۔"

پھر کہا "آپ کے اطمینان کے لئے میں آدھی جائداد لڑکی کے نام لکھ دیتی ہوں"۔ اماں بھی پھوپی اماں کی ہم خیال تھیں مگر حضرت والد مرحوم کو اطمینان نہ ہوا تھا۔ علامہ مغفور کے ایک دوست کا میل جول متھرا کی ایک گانے والی سے تھا۔ علامہ مغفور نے ایک دن امیدوار سے کہا۔ ایک صاحب کا یہ خط فلاں جگہ پہنچا دینا چنانچہ اُنھوں نے پہنچا دیا۔ خط میں یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ صاحبزادے ایک عزیز کے ہاں شادی کرنی چاہتے ہیں۔ تم اُن کے متعلق اپنی رائے ڈاک کے ذریعہ لکھو۔ خط بند تھا اور لاکھ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس کا جو جواب دوست کے ذریعہ علامہ مغفور تک پہنچا وہ یہ تھا کہ لڑکا بہت شرمیلا اور حیادار ہے جب تک بیٹھا رہا نظریں نیچی رہیں اور باتیں بھی رُک رُک کر تمیز سے کرتا رہا میرا خیال ہے کسی شریف خاندان کا نیک لڑکا ہے۔

ایک دن کہا کہ تم ۶۰ روپیہ مہینہ بہن کے پاس جمع کرا دیا کرو۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ تم اپنی بیوی کا خرچ اُٹھا سکتے ہو یا نہیں۔

شاید باقاعدہ [illegible] پر بھی عمل ہوتا رہا۔
پھر ایک ... لکھا جس میں ایک اقرار نامہ لکھا
خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ قول دینا پڑے گا کہ اپنی
بیٹی کو بغیر اس کی خوشی رضامندی الہ آباد سے کہیں نہ جانے دیں گے
اور اس کی موجودگی میں اور نکاح نہ کریں گے وہ جب دل
چاہے گی اس کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہ ہوگی۔
انہوں نے ان سب باتوں کو بھی منظور کر لیا اور ان کے
والد کی طرف سے باقاعدہ پیام آیا اور نومبر [illegible] میں
جب محرم الحرام کی ۲۲ تاریخ تھی بڑی بیٹی کی شادی
کر دی۔

جہیز میں ۲۵ جوڑے تھے اور ڈھیلے پائنچوں کے
باقی تنگ پاجامے۔ ساڑھی کا دو تین ہی اس زمانہ میں
بالکل رواج نہ تھا۔ گہنا دوہرا تھا۔ برتن تانبے کے ڈھیر
چھپر کھٹ والدہ مرحومہ کا تھا جس پر قلعی کروائی گئی تھی۔
اس کا پردہ زردوزی مخمل کا تھا جو ایک روپیہ چھ آنے گز کے
حساب سے خریدا گیا تھا۔ گراموفون اور اس کے ساتھ
تین درجن ریکارڈ بھی تھے گراموفون پر بعض عزیزوں نے
اعتراض کیا تھا۔ یہ جہیز ۲ اور پھوپی اماں کے جہیز کے
مقابلہ میں حالانکہ شادی کے وقت دونوں یتیم تھیں بہت
ہلکا تھا اور یہ جہیز بھی والدہ مرحومہ کے سلیقہ کی بدولت
چھپکے چھپکے تیار ہوتا رہا [آپا کی شادی کے وقت علامہ
مغفور کا ہاتھ تنگ تھا۔ ہزار ہا روپیہ کا نقصان اٹھانے
کے بعد ... رخصت کر دیا گیا تھا عصمت کی اشاعت
باقاعدہ نہ تھی۔ "سہیلی" کی بالکل ابتدائی حالت تھی۔
کتابوں کی بھی کوئی خاص آمدنی نہ تھی اس زمانہ میں
کسی ... میں ہی کی ڈاک آتی کوئی دن کورا نکل جاتا
آپا راشدہ نے شفقت پدری سے محروم ہونے کے بعد

عصمت راشد الخیری نمبر میں جو مضمون لکھا تھا اس کا وہ حصہ
ان کی شادی کے متعلق تھا وہ یہ تھا۔

"وداع کا وقت لڑکی کے لئے بہت نازک ہوتا ہے
مگر میں اس سے ناواقف ہوں۔ البتہ اتنا یاد ہے۔ گرمیوں کا
موسم تھا بڑے دالانوں کی چھت پر سب سوتے تھے۔ ہمارا
پرانا بڈھا ملازم سلطان چھوٹی چھت پر سویا کرتا تھا وہ اپنی مستی
میں اکثر گایا کرتا تھا علی الصبح اس کی آنکھ کھلی اور مزے
کے کچھ اشعار گانے لگا وقت کی بات تھی میری آنکھ کھل گئی اور
طبیعت پر خاص اثر ہوا میں اپنے پلنگ سے اٹھ کر اپنے
کمرہ میں چلی گئی اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ابا جان کی آنکھ اسی
وقت کھل گئی۔ ملازم کو روک دیا اور گھبرائے ہوئے میرے
کمرے میں آئے اور میرے پلنگ پر بیٹھ گئے فرمایا "اندر کیوں
آئی ہو" چونکہ آنکھوں میں آنسو تھے جواب دینے سے قاصر تھی۔
پھر خود ہی فرمایا۔
"راشدہ بیگم میں دنیا کی رسم ادا کر رہا ہوں۔ اپنی بچی
کو جدا نہیں کروں گا جس طرح لڑکے کے مستقبل کا ذمہ دار
باپ ہے اسی طرح لڑکی کے مستقبل کا بھی۔ میں نے تمہارے
لئے بہت گہری نظر سے مطالعہ کر کے انتخاب کیا ہے مجھے یقین
ہے تم ہمیشہ خوش رہو گی مگر شرط یہ ہے شوہر کو خوش رکھنا خدا کی
رضامندی اور زندگی کا مقصد سمجھنا" ابا جان کی آواز کسی قدر
بھرا گئی تھی مشکل سے میرے پاس دس منٹ گذرے ہوں گے
کمرے سے باہر تشریف لے گئے۔ آدھ گھنٹے بعد پھر تشریف لائے
اور ادھر ادھر کی باتیں فرمانے لگے"۔

بھائی عبدالغفور مرحوم نہایت شریف اور نیک
انسان تھے بے نظیر داماد اور لاجواب بہنوئی ثابت ہوئے۔
خلوص صداقت محبت مروت ایثار ہمدردی ان خزائن
سے ان کا دل مالا مال تھا۔

متھرا سے بھائی صاحب کا تبادلہ ریاست جے پور کی نظامت گنگاپور سٹی ہوا۔ سال میں مہینہ سوا مہینہ کے لئے گرمیوں میں جو ہم قطب صاحب ہر سال جایا کرتے تھے وہ سلسلہ ختم ہو گیا اور اب گرمیوں کے یہ پانچ چھ ہفتے گنگاپور سٹی میں گذرنے لگے۔

ایک حاجیہ سیدانی

غالباً ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ پنجاب کی ایک عورت نے جو اپنے نام کے ساتھ بعد میں حاجیہ اور سیدہ لکھتی تھیں علامہ مغفور کو اپنی دُکھ بھری کہانی لکھی۔ اور اُن سے امداد چاہی۔ خط کا لب لباب یہ تھا کہ میرے شوہر ایک بڑی جاگیر اور زمین کے مالک ہیں بُری صحبت میں روپیہ برباد کر رہے اور میری طرف سے انتہائی تغافل برت رہے ہیں۔ ان کو ہر طرح سمجھایا مگر اُن کا دل کسی طرح نہیں پسیجتا۔ عصمت میں بلکہ اخبارات میں مضامین لکھ کر انھیں ان قابلِ ملامت افعال پر قائل کیجئے اور خود ملتان آکر انھیں سمجھائیے۔ خاتون موصوفہ سے کئی ماہ خط کتابت رہی۔ دو دفعہ علامہ مغفور نے سخت گرمی کے دنوں میں طویل سفر بھی کیا اور ایک دفعہ شملہ بھی گئے۔ ان کے شوہر سے بھی غالباً ملاقات ہوئی۔ مگر یہ کوشش کارگر نہ ہوئی اور میاں بیوی میں مقدمہ بازی ہوتی رہی۔ فیصلہ کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔ کچھ نہ کچھ لوگ ہر شخص کے خلاف خواہ مخواہ بھی ہو جاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں بغض للہی۔ علامہ مغفور کی شہرت بعض آدمیوں کو ناگوار گذرتی تھی۔ چنانچہ ایک بزرگ کو اُن خاتون نے اپنے واقعات سُنائے تو اس سلسلہ میں علامہ مغفور کا بھی ذکر کیا۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ دلّی جا کر مولانا کو یہ پیغام بھیجو کہ آپ نے میری مدد جتنی کرنی چاہئے تھی نہیں کی اور میں اخبار میں آپ کی شکایت کرتی ہوں۔ دلّی آکر وہ خواجہ حسن نظامی مرحوم سے ملیں۔ علامہ مغفور کی رحلت پر عصمت کا راشد الخیری نمبر شائع ہوا تھا اس میں خواجہ صاحب کا بھی مضمون تھا۔ اس مضمون کا ایک ٹکڑا اسی واقعہ سے متعلق ہے۔ تفصیل مجھے نہیں معلوم نہ اس واقعہ کے متعلق جس کا خواجہ صاحب نے ذکر کیا ہے نہ اس عورت کے حالات کا مجھے کچھ زیادہ علم ہے۔ بہر حال خواجہ صاحب نے یہ لکھا تھا!۔

"پنجاب کی ایک عورت نے مولانا کی نسبت مجھ سے کہا کہ اس کے شوہر کے مقدمہ میں مولانا نے باوجود وعدہ کے اس کی مدد نہیں کی۔ اس بولنے والی عورت نے ایسا سماں باندھا کہ میں اس کو مظلوم سمجھنے لگا اور میں نے مولانا پر زور ڈالا کہ عورت مظلوم ہے اور آپ نے اس کی امداد میں کوتاہی کی ہے۔ مولانا نے میرے کہتے ہی تلافی کر دی مگر جب بعد میں معلوم ہوا کہ عورت مذکور بناوٹی باتیں بنانے میں بہت مشاق ہے اور اُس نے بہت سی باتیں فرضی بنائی ہیں تو مجھے بہت صدمہ ہوا اور ہمیشہ میری نظریں مولانا کے سامنے جھکی رہیں کہ میں نے مولانا پر بے انصافی کا الزام لگانے میں غلطی کی تھی" عصمت راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۰۰

کپتان صاحب کا دوسرا نکاح

والدہ مرحومہ کے بھائی سردار بہادر کپتان حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم سی آئی ای وغیرہ کی بیوی کا غالباً ۱۹۳۰ء میں انتقال ہو گیا۔ ماموں جان مرحوم کی بیٹی تو کوئی تھی نہیں۔ بہو بھی نہیں۔ چار لڑکے تھے اور سب شادی شدہ۔ اور اب ماموں جان تنہائی کی زندگی گذار رہے تھے۔ حضرت والد مغفور نے والدہ مرحومہ سے فرمایا کہ بھائی کے دوسرے نکاح کا انتظام کرو۔ انھوں نے کہا ہاں ضرورت تو ہے مگر لڑکوں سے ہیں۔ بڑی بہو

دی گئی۔ فرمایا کہ بچوں کی خفگی بھائی کی محبت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر والدہ مرحومہ کی طرف سے ماموں جان کو ایک خط لکھا گیا جس میں پہلے ان مرحومہ کی خوبیوں کا اعتراف کیا گیا تھا اس کے بعد لکھا ہوگا کہ اماں بی آج اگر موجود ہوتیں تو آپ کی خا دیاں اُن سے نہ دیکھی جاتی۔ آپ کی کوئی بڑی بہن بھی نہیں جو آپ کی اُن تکالیف کو محسوس کرکے جو آپ اٹھا رہے ہیں تدارک کرتی۔ میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ضرور ہے مگر حالات سامنے رکھ کر نہایت ادب سے عرض کرتی ہوں کہ گھر میں ذمہ دارانہ حیثیت سے کوئی عورت ایسی ہونی چاہیے جو آپ کے دکھ سکھ میں شریک ہو اور جن تکالیف کا اس وقت آپ کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کو راحت سے بدل دے۔ اس خط کا جواب جیسی کہ والدہ مرحومہ کو توقع تھی یہ آیا کہ بہن تمہارا مطلب اس خط سے یہ ہے کہ میں دادا بنے کے بعد اب دوسرا نکاح کرکے اپنا مذاق اُڑواؤں اپنی مٹی خراب کروں۔ دوسرا خط والدہ مرحومہ کی طرف سے جو لکھا گیا تھا اس کا مفہوم غالباً یہ ہوگا کہ دوسرے نکاح کے وقت حالات سامنے رکھنے بہت ضروری ہیں بچوں کو سوتیلی ماں کے مظالم کا نشانہ بننے کا تو کوئی موقع ہے ہی نہیں ماشاءاللہ سب کھاتے کماتے اور اپنے گھر بار کے ہیں۔ آپ کی تنہائی کی زندگی راہبانہ زندگی ہوگی جو احکام اسلام کے خلاف کہی جا سکتی ہے۔ اُدھر سے انکار اِدھر سے اصرار بالآخر بہن کا خلوص بھائی کے ارادہ پر غالب آیا اور انھوں نے لکھا کہ تم جو اپنی بات پر اڑی ہوئی ہو تو مجھے بھی تو معلوم ہو تم نے کون سی ایسی عورت تلاش کرلی ہے جسے میرے لئے موزوں سمجھتی ہو۔ اس کا جواب یہ گیا کہ آپ نے ضرورت تسلیم کرلی ہے اب تلاش کی جائے گی۔ تین چار ماہ کی تلاش میں وہ کامیاب ہو گئیں۔ ماموں جان اس وقت پچاس سے اوپر تھے۔ والدہ مرحومہ نے تیس سال سے زیادہ عمر کی ایک بیوہ کو ڈھونڈ نکالا جن کا کوئی بچہ نہ تھا خاندان اچھا تھا اور ماموں جان کی طرح مذہبی۔ حالانکہ ماموں جان کا انگریزوں سے بہت ملنا جلنا تھا مگر والدہ مرحومہ نے اُن کے لئے کسی ایسی عورت کو موزوں نہ سمجھا جس پر مغربیت کا تھوڑا سا بھی اثر ہو۔ ماموں جان مرحوم اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بہن جو کچھ کر رہی ہیں اس کی تہ میں بھلائی کا ہاتھ ہے۔ نکاح ہو گیا اور چند ماہ بعد سے انھیں بھائی کے جنھوں نے پہلا خط لکھنے پر بہن پر خفگی کا اظہار کیا تھا جو خطوط آئے ان میں بجائے دعا گو تمہارا بھائی کے، لکھا ہوتا تھا اور برسوں لکھا گیا۔
"شکرگزار تمہارا بھائی"

دوسری ممانی جان نہ صرف خدمت گزار اطاعت شعار بیوی ثابت ہوئیں بلکہ سوتیلی ماں کی حیثیت سے بھی بہت بلند کردار خاتون نکلیں۔

انسانی ہمدردی کے دو واقعات

"والدہ مرحومہ کے ایک عزیز ایک مقدمہ میں بہت بُری طرح پھنسے۔ ان کے والد صاحب معقول شخصیت کے مالک تھے۔ یہ معاملہ اُن کی اور اُن کے سارے خاندان کی عزت کا تھا۔ بیچارے مغرب کے وقت منہ پر رومال ڈال کر گھر سے نکلتے تھے۔ وکیلوں کے ہاں انھوں نے بھاگ دوڑ نہیں کی۔ جو لوگ مفید ہو سکتے تھے۔ اُن کے پاس تشریف نہیں لے گئے۔ آدھی آدھی رات تک بھوکے پیاسے اِدھر اُدھر نہیں پھرے بلکہ جو شخص بڑے سے بڑے آدمیوں سے ملنے سے متنفر تھا

اس کی انسانیت کا یہ عالم تھا۔ کہ دوسروں کی آگ میں کود کر حقیقی باپ سے بازی لے گیا۔ دو دو بجے رات تک بھوکے پیاسے رہے۔ اور جہاں اپنوں کے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہاں اس غیر نے انسانیت کے گلہائے سدابہار کھلا کر جاننے والوں کو بتادیا کہ اس کی خالی خولی باتیں نہ تھیں۔ وہ پیکر عمل تھا۔" (وداع راشد)

"۱۹۱۵ء میں ہمارے ایک عزیز کچھ مدت سے ہمارے ہاں رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ ہو بیوی بچوں کو لے کر بطور مہمان ہمارے ہاں ٹھہرے کسی زمانہ میں ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی مگر اس وقت افلاس کے ڈیرے پڑ چکے تھے۔ بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا لیکن بے فکر شوہر کو کسی بات کا خیال نہ تھا۔ صبح کو دائی کو لینے کو گئے تو ایسے غائب ہوئے کہ شام ہوگئی۔ اور وہ نہ پلٹے۔ رات کو دو بجے جب دائی کی سخت ضرورت تھی۔ ہمارے یہ عزیز بھی دائی کو لانے کے بجائے چپ سادھ گئے تو اسی اندھیری رات میں خاموشی کے ساتھ دو بجے رات کے تین چار فرلانگ کے فاصلے سے دائی کو لانا اور اس سلسلہ میں ہر قسم کی ضرورت کا پورا کرنا ہر طرح کی آسانی پیدا کرنا کسی دوسرے کا نہیں ابا جان ہی کا کام تھا۔

بچہ آٹھ دن کا تھا۔ کہ بچے کے باپ تشریف لائے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ کہاں چلے گئے تھے تو فرمایا۔ "مولوی صاحب موجود تو تھے پھر میں فکر کس بات کا کرتا۔" وداع راشد

۱۹۱۶ء کی آتشزدگی

تمدن رخصت ہو چکا تھا۔ سہیلی چلا نہیں۔ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا اشیاء کی قیمتیں دوگنی تگنی ہو چکی تھیں عصمت کی اشاعت میں بے قاعدگی آگئی اور کاروباری لحاظ سے نقصان ہو رہا تھا کہ مرے پر سو درے دفتر میں آگ لگی۔ اور مالی حالت اور کمزور ہوگئی۔

باب آٹھواں — تابڑ توڑ تصانیف کا زمانہ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۲ء

جامن والے گھر میں

۱۹۱۸ء میں چوڑی والوں کا محلہ چھوڑ دیا اور چند ماہ کے لئے ہم مٹیا محل کی ایک گلی میں ایک چھوٹے مکان میں آگئے جو جامن والا گھر کہلاتا تھا اور علامہ مغفور کے ننھیالی بھائی ڈاکٹر محمد عمر کے گھر کے پاس تھا۔ والدہ معظمہ بچوں کے ساتھ آپا کے پاس گنگا پور گئی ہوئی تھیں۔ میں اس زمانہ میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور امتحان قریب ہونے کی وجہ سے گنگا پور نہ جا سکتا تھا اس لئے والد مغفور بھی میری وجہ سے دلی ہی میں تھے والدہ مرحومہ کے پاس ماما ہمیشہ رہی۔ وہ بھی ان کے ساتھ گنگا پور چلی گئی تھی۔ اب کھانے کا انتظام میرے سپرد تھا۔ میں علی الصبح چھ پیسے کی نہاری لاتا جس میں ایک جیب کی بوٹی ہوتی تھی۔ چار پیسے کی خمیری روٹی۔ چھ پیسے کا گھی کر چھے میں ڈال کر بگھارنا مجھے آتا ہی تھا۔ چار آنے میں باپ بیٹے دونوں خوب سیر ہو کر کھا لیتے تھے۔ شام کو بجائے نہاری کے گولے کے کباب ہوتے اور بجائے خمیری کے چپاتی۔ خرچ وہی

پورا نے ہوتا اس طرح آٹھ آٹھ دس دس روز میں ہم دونوں وقت
پیٹ بھرتے۔ چائے کا اس زمانہ میں رواج نہ تھا۔
صبح کے وقت دودھ پیتے تھے۔ اسی ڈیڑھ ماہ میں شام
زندگی اور رحمت کے بہت سے مضامین لکھے گئے تھے۔

"آہ شملہ کے وہ دن آنکھوں میں پھر رہے ہیں
کہ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابا جان پلنگ پر
لیٹے حقہ پی رہے ہیں اور مضمون پر مضمون لکھوا رہے ہیں۔ ان کے
مخصوص رنگ کے مضامین تو بہت کم ہوتے تھے مگر
معمولی سے معمولی مضمونوں میں جو انھوں نے اپنے نام
سے شائع نہیں کئے فقرے کے فقرے بہت مؤثر ہیں ان کی
وہ خفگی بھی یاد ہے کہ میں نے کوئی لفظ اچھی طرح نہیں سنا
یا سمجھ میں نہیں آیا تو فرماتے "بس رکھ دو قلم۔ میں خود لکھ
لوں گا۔ تمھیں کس جاہل نے جماعت چڑھا دیا کہ معمولی
سا لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلے سنو۔ اس کے بعد لکھو
اور اگر کوئی لفظ مجھے معلوم نہ ہوتا اور ان کی زبان سے
نکلتے ہی میں پوچھنے لگتا کہ "اس کے کیا معنی ہوئے" تو فرماتے
"پہلے مضمون ختم کر لو۔ پھر جو پوچھو گے۔ بتا دوں گا۔ جب
بڑے ہو گے اور لکھو گے اس وقت معلوم ہوگا کہ اس
طرح بار بار سوال کرنے سے خیالات بٹ جاتے ہیں۔ اب
آگے کیا خاک لکھواؤں۔ بس رکھ دو پھر لکھنا" اور پھر میں
معافی چاہتا اور کہتا اچھا یہ مضمون تو ختم کروا دیجئے۔ اس
طرح ڈیڑھ ماہ تک اور قریب قریب روز ہی کوئی نہ کوئی
مضمون لکھواتے تھے" (رحمت کی کہانی)

شامِ زندگی

ملا واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ نے شامِ زندگی
شائع کی تھی۔ یہ کتاب کس طرح لکھی گئی یہ داستان
واحدی صاحب ہی کی زبانی سنئے:۔

"شام زندگی لکھنے کا جب فیصلہ ہوا تو مولانا
مہینوں آڑان گھاٹیاں دیا کئے۔ مولانا نے بے شمار کتابیں
تیار کر ڈالیں لیکن مجبور ہوئے بغیر قلم ہاتھ میں نہیں پکڑا
کرتے تھے۔ اپنی طبیعت سے مجبور ہو جائیں یا بچوں اور
دوستوں کی خواہش سے دب جائیں پھر کہیں لکھتے تھے۔
زبردستی ہونے سے۔ اور لکھتے تھے تو دس منٹ سے گیارہواں
منٹ لکھنے پر صرف نہیں کرتے تھے۔ دس منٹ لکھا اور
باہر آ گئے۔ میرے ہاں تشریف لے آئے۔ کسی تانگہ والے
کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ کسی دوکاندار سے باتیں کرنے
لگے۔ اور پھر جا کر لکھنا شروع کر دیا اور پھر دس منٹ بعد
کرسی کاٹنے لگی۔ یہی سلسلہ تمام دن جاری رہتا تھا۔
میں نے شام زندگی لکھنے کے فیصلہ میں جب رخنہ پڑتے
دیکھا۔ تو ایک بہت چھوٹی سی کوٹھری میں میز کرسی بچھوا دی
لیٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ اور مولانا کی آمد کا انتظار کرنے لگا
اور مولانا جب آئے تو اُن سے کہا کہ "چلو اس کوٹھری میں"
اور ان کے کوٹھری میں گھستے ہی کنڈی لگا دی اور سنا دیا
کہ چاہے لکھو چاہے نہ لکھو۔ دو گھنٹے سے پہلے کنڈی نہیں کھلے گی
وہ کوٹھری اس وقت میرے سامنے ہے اور کیا عرض کروں
کہ میرا کیا حال ہے۔ میں نے مولانا کو کتنی تکلیف دی تھی
اور کتنا ستایا تھا اس کا خیال کر کے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اور
جی چاہتا ہے کہ مولانا کی قبر پر چلوں اور ان کی پائنتیوں سر
جھکا کر معافی مانگوں لیکن میں نے تنہا نہیں۔ ان کے
بے تکلف مگر قدر دان دوست مولانا عارف نے بھی سر جھکایا
نہیں تھا بلکہ سر قدموں پر رکھ دیا تھا۔ جب مولانا دو گھنٹے
لکھ کر پسینوں میں ڈوبے مسکراتے ہوئے کوٹھری سے نکلے اور
شام زندگی کے ابتدائی صفحات ان کی زبان سے ہمارے
کانوں میں پہنچے تو ایک صف ماتم بچھ گئی۔ مولانا عارف

خود اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ مگر بے تکلفی اور اپنی لیڈری وغیرہ سب بھول گئے اور مولانا کے پاؤں میں لوٹنے لگے۔ بیس دن میں شام زندگی ختم ہوئی تھی۔ بیس دن برابر میرے ہاں یہی ڈراما ہوتا رہا۔

گرمی کا موسم تھا۔ اور کوٹھری میں پنکھا نہیں تھا ہم ظالم روز اس کے اندر مولانا کو بند کر دیتے تھے اور دو گھنٹے کے حبس بیجا کے بعد مولانا خوش خوش ہمیں مسودہ سناتے اور ہم انھیں سجدے کرتے تھے۔ مولانا نے ایک دفعہ عارف صاحب سے فرمایا تھا کہ "اے بچے خدا نے کانگریس کی محبت اس لئے دی ہے کہ تو بار بار جیل جائے اور میرے حبس بے جا کا بدلہ اُترے۔ اچھا ہے یہیں بھگت لے ورنہ خدا کے ہاں کی بیدیں کھانی پڑتیں"

شام زندگی چھپنے پر ادکھلے نہر کے کنارے ایک دعوت ہوئی جس میں ہم کسی نوکر کو نہیں لے گئے تھے۔ یہ دعوت صبح سے شام تک رہی، اور سب کام ہم سب اپنے آپ کرتے رہے۔ میری اور عارف صاحب کی عمر اس زمانہ میں پچیس ۲۵ چھبیس ۲۶ برس کی ہوگی اور خواجہ فضل احمد صاحب کی تینتیس چونتیس برس کی اور مولانا پچاس کے لگ بھگ تھے۔ مگر وہ بالکل ہماری طرح لطف لے رہے تھے"

عصمت راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

شام زندگی پہلی دفعہ اپریل ۱۹۱۰ء میں چھپی اور نومبر تک یعنی ۹ ماہ میں اس کے تین اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔

مصورِ غم | اُردو میں سب سے پہلے علامہ مغفور نے نثر میں حزن نگاری کی۔ ان کے غم انگیز دردناک افسانے اور مضامین درجنوں شام زندگی سے پہلے شائع ہو چکے تھے مگر مصورِ غم کا خطاب قوم نے اس تصنیف پر دیا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم علامہ مغفور کے نام کے ساتھ قلم اور لکھنے لگے تھے "مصورِ غم" سب سے پہلے اسوۂ حسنہ میرٹھ کے ایڈیٹر میاں احسان الحق مرحوم نے لکھا تھا۔

الزہرا | بنت رسول خاتون جنت بی بی فاطمۃ الزہرا کے حالات "سیدۃ النسا" کے عنوان سے [illegible]ء کے عصمت میں مسلسل لکھ رہے تھے مگر دوسری مصروفیات کے سبب تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ شام زندگی ختم کرتے ہی الزہرا شروع کر دی۔ شام زندگی اصلاحی ناول ہے۔ ۲۰ روز میں لکھ لیا۔ الزہرا تاریخ و سیرت ہے چھ مہینے میں لکھی گئی۔ وعظ کا سلسلہ جب جاری تھا اس وقت بھی اور مخزن میں جب مضامین شائع ہوتے تھے اس دور میں بھی نام سے پہلے مولوی کہا اور لکھا جاتا تھا اور آخر وقت تک "مولوی صاحب" ہی کہلائے۔ ادبی دنیا میں البتہ تمدن جاری ہونے کے بعد انھیں مولانا سے خطاب کیا جانے لگا اور جب الزہرا شائع ہوئی تو نام سے پہلے علامہ لکھا جانے لگا۔

تصانیف کا ڈھیر | ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کے زمانہ میں علامہ مغفور نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا۔ سراب مغرب۔ بنت الوقت اور سات روحوں کے اعمال نامے ۱۹۱۸ء ہی میں یہ ناولٹ واحدی صاحب کے لئے اور لکھے ان کے علاوہ ان کے رسالوں خطیب اور نظام المشائخ میں بھی طویل افسانے چھپے جو بعد میں کتابی صورت میں ہم نے شائع کئے۔ منازل ترقی، آمین کا دم واپسیں۔ سودائے نقد۔ ویدیا کی سرگزشت۔ حسن منظر طرابلس اُسی زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ واحدی صاحب نے منازل السائرہ اور صبح زندگی کے حقوق حاصل کر کے ان کے بھی کئی کئی اڈیشن شائع کئے۔

اب علامہ مغفور کی تصانیف کے اوپر تلے کئی کئی اڈیشن شائع ہو رہے تھے اور زندہ مصنفین میں سب

...نس کی کتابیں [illegible] کتب فروخت کر رہے تھے۔ ...بی ناشرین کتب نے مصنف سے کتابیں لکھوا کر ...سود حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کر ڈالیں ... بعض کامیاب بھی ہو گئے۔

...بار تہذیب نسواں کے مالک و مدیر مولوی ...ممتاز علی صاحب نے "لڑکیوں کی انشا" کے حقوق ...ہونے کے چند ماہ بعد ہی [illegible] میں حاصل کر لئے جناب ...ل احمد اکبرآبادی نے مخزن اور عصمت کے ...کے مضامین کے حقوق خرید لئے تھے ان سے ...ممتاز علی نے "مقطرات اشک" اور "شاہد رعنا" ...حقوق حاصل نہیں کئے بلکہ "سوکن کا جلاپا" اور ...مرحوم کے حقوق بھی براہ راست مصنف سے ...ان کے علاوہ تین نئے ناول بھی لکھوائے۔

ماہ عجم۔ بزم آخر۔ اور سبز رنگ۔

...سید ممتاز علی صاحب کے صاحبزادے سید امتیاز علی ...تاج نے رسالہ کہکشاں [illegible] میں بڑی آب و تاب ...شائع کیا تھا اور بزم آخر کے دو تین ٹکڑے کہکشاں میں ...شائع کئے گئے تھے۔ کاتب صاحب کی غفلت سے مسودہ کے دو مختلف ورق ضائع ہو گئے اور مسودہ یوں ہی پڑا رہا ۱۹۳۹ء میں میں نے اس ناول کے حقوق واپس لے لئے اور دو جگہ سے جو عبارت ضائع ہو گئی تھی وہ لکھ چکا ہوں اور امید ہے جلد [illegible] میں یہ غیر مطبوعہ ناول شائع کر سکوں گا۔

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے [illegible] میں طوفان حیات لکھوایا یہ ناول پیر پرستی قبر پرستی اور رسوم پرستی کے خلاف ہے۔

اُس زمانہ میں پنجاب کا رسالہ صوفی بہت مقبول تھا اس کے ایڈیٹر مولوی ملک محمد الدین صاحب نے تین ناول لکھوا کر حقوق حاصل کئے۔ اس زمانہ میں اصلاحی ناول اور طویل افسانے بھی لکھے، جو مختلف ناشرین نے شائع کئے۔ [illegible] یعنی نوبت پہنچی۔ وزیر زادہ ظفر لکھنے سے قبل کچھ اور تصانیف شائع ہوئیں۔

بیوی کی بھتیجی کا خیال

آپا ماشاءاللہ بیگم کی رائے ہے کہ آپ کے مزاج میں سختی تھی اور انھوں نے اماں کی کسی غفلت کو نظر انداز نہیں کیا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ مغفور نے اپنی رفیقۂ حیات کی کسی جائز خواہش کو حتی الوسع رد نہیں کیا اور ان کے جذبہ خلوص کا ہمیشہ احترام کیا۔ والدہ مرحومہ کے منجھلے بھائی مولوی سعید الرحمن صاحب کی پہلی بیوی سے ایک بچی تھیں۔ سعیدہ بیگم کنبہ کے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں اس لئے "آپا باجی" کہلاتی تھیں۔ وہ پردیس قائم گنج ضلع فرخ آباد بیاہی گئی تھیں۔ بن ماں کی لڑکیوں کا دل یوں ہی تھوڑا ہوتا ہے۔ چند روز میکہ رہ کر جب سسرال جانے لگتیں تو اماں جان سے چمٹ کر اس درد سے روتی تھیں کہ دیکھنے والوں کے کلیجے کٹے جاتے تھے۔ بھتیجی داماد رسالدار بہادر حاجی فرزند علی خاں مرحوم کے متعلق مشہور یہ تھا کہ مزاج کے سخت ہیں۔ لیکن وہ بہت ہی معقول آدمی تھے اور علامہ مغفور اور والدہ مرحومہ کے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ نہایت شریفانہ رہا۔ جب کبھی اماں جان نے انھیں بلایا بلا تامل آ گئے۔ اُن کے آنے سے ابا جان اور اماں جان بہت خوش ہوتے تھے۔ والدہ مرحومہ کو اپنی پردیسن بھتیجی کا اور علامہ مغفور کو اپنی رفیقۂ حیات کا کس قدر خیال رہتا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب بھتیجی کی سات آٹھ سالہ بچی کے انتقال کی خبر پہنچی تو والدۂ مرحومہ علامہ مغفور کو اور بچوں کو ساتھ لے کر قائم گنج گئیں۔ دو جگہ

گاڑی بدلتی تھی۔ رات کا سفر تھا نہ اُنھوں نے سفر کی تکلیف کا خیال کیا نہ علاّمہ مغفور کی تیوری پر بل آیا۔ انھیں بھتیجی کا بڑا لڑکا خورشید علی خاں تعلیم کے سلسلہ میں کئی سال تک ان کے پاس رہا جب اس کی شادی ہوئی تو علاّمہ مغفور بیوی کی خوشی کے لئے انھیں اور بچّوں کو لے کر قائم گنج گئے۔ جب بھتیجی کے مرض الموت کی اطلاع ملی تو والدہ مرحومہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی مگر انھیں ساتھ لے کر گئے کہ وہ اپنی بھتیجی کو زندہ دیکھ لیں۔

خواتین کو مضمون نگاری کی ترغیب

عورتوں میں مضمون نگاری

کا شوق پیدا کرنا بھی عصمت کے مقاصد میں سے تھا۔ عصمت کے دورِ اوّل اور دورِ دوم میں عورتوں کے لکھے ہوئے قابلِ اشاعت مضامین بہت کم آتے تھے اور ہر پرچہ کے لئے علاّمہ مغفور کو خود متعدد مضامین لکھنے پڑتے تھے ایک مضمون جو ان کے رنگ میں لکھا ہوا ہوتا ان کے نام سے شائع ہوتا تھا کبھی کبھی دو مضمون ورنہ کئی کئی مضمون ایک ہی پرچہ میں وہ مختلف زنانہ ناموں سے لکھا کرتے تھے۔ اپنی بیوی اپنی بہن اپنی بیٹی کے نام اپنے عزیزوں اور جاننے والی خواتین کے نام مشہور کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ ان عورتوں کے ناموں سے جن کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ یہ مضامین زیادہ تر خانہ داری حفظانِ صحت بچّوں کی پرورش اور تربیت اور اصلاحی معاشرتی مذہبی اخلاقی تاریخی موضوعوں پر ہوتے تھے۔ اور لکھے جاتے تھے نہایت سیدھی سادی زبان اور عام فہم انداز میں اور انھیں پڑھ کر لڑکیوں اور عورتوں کے دل میں خیال پیدا ہوتا کہ مضمون لکھنا اگر اسی کو کہتے ہیں تو ایسے مضمون تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں۔ مضمون نگاری کے لئے کسی اسکول یا کالج کی تعلیم ضروری نہیں۔ جن کی تعلیم صرف گھریلو تھی ان کو ان مضامین سے مضمون لکھنے کی ترغیب دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ دو چار نہیں بیسیوں لڑکیوں اور عورتوں نے مضمون نگاری کی اور ان میں متعدد نے نام بھی پیدا کیا اور مضامین ہی نہیں کتابیں بھی لکھیں۔ اور اپنے فرقہ کی خدمات بھی انجام دیں۔ اس قسم کے مضامین کی چند سطریں:۔

پھوہڑ کا بچّہ کیسا ہی خوب صورت۔ کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو۔ مگر جب دیکھو ناک بہ رہی ہے۔ چیپڑ لگ رہے ہیں۔ خاک میں بھرا۔ کیچڑ میں لتھڑا۔ بدتمیز۔ بے ادب۔ شکل صورت کا کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر اول تو لینے ہی کو جی نہ چاہے گا اور اگر شرما شرمی کسی وقت ضرورت بھی پڑی یا جی بھی چاہا تو پیشاب کر دینے میں اسے باک نہیں۔ کاٹ کھانے میں اسے عذر نہیں۔ غرض لباس خراب ہونے کا اندیشہ اس سے۔ تکلیف پہنچنے کا احتمال اس سے اسی واسطے کہا ہے خدا اگر دے تو
سگھڑ کی جھاڑو نہ دے۔ پھوہڑ کا بچہ نہ کھلائے

(گدڑی میں لال) ۱۹۱۲ء

"جس عورت کے گھر میں ڈھنگ کا بچھونا تک نہ ہو۔ کوئی ملنے آئے تو شکوں کی یہ کیفیت کہ پانی پینے کو جی نہ چاہے وہ کس منہ سے جنّت کی طلب گار ہے اس نے پہلے ہی اپنے شوہر کا گھر دوزخ کر دیا۔ اور اس کے بدلہ میں دوزخ ہی اس کا گھر ہوگا"

(گدڑی میں لال) ۱۹۱۲ء

جھوٹ کا پردہ کبھی نہ کبھی اٹھ کر رہتا ہے اور جس وقت وہ اٹھ جاتا ہے روشنی صاف دکھائی دینے لگتی ہے اور یہ جھوٹ کی سیاہی اس جھوٹ بولنے والے کے منہ پر آ لگتی ہے کیسی خوش نصیب اور اچھی ہیں وہ بیویاں جن کے منہ ایسے کالے داغوں سے بچے رہیں اور گو ان کا رنگ سانولا اور کالا ہو مگر ایمان کی صفائی سے ان کا چہرہ روشن ہو۔ (فریب ہستی) ۱۹۱۲ء

کاغذ سیاہی وغیرہ رکھی جاتی تھی اور باہر کا کمرہ میرا تھا۔

میری تعلیم و تربیت کے چند واقعات

محلّہ کی مسجد میں جو کلاں محل کی پٹعت پر لب سڑک تھی بچے قرآن مجید پڑھتے تھے میں ساڑھے چھ یا سات سال کا تھا کہ والد مغفور نے مجھے وہاں داخل کر دیا مگر پانچ سات دن بعد ہی اٹھا لیا۔ اٹھانے کی وجہ یہ تھی کہ جو لڑکے وہاں پڑھتے تھے اُن کی صحبت اچھی نہ تھی۔ ایک لڑکے نے جو دس بارہ سال کا تھا بتایا کہ "کلان کا میل آنکھوں پر لگا لیا جائے تو آنکھیں سوجھ جاتی ہے۔ مسجد میں آنے اور پڑھنے کو میرا جی نہیں چاہتا تو میں یہی ترکیب کرتا ہوں۔ میں نے والد مغفور سے اس لڑکے کی گفتگو دوہرائی تو انھوں نے فرمایا ایسے لڑکوں سے باتیں نہ کیا کرو۔ چوتھا یا پانچواں دن تھا کسی حرارت پر ڈانٹ پڑی تو روٹھ کر پیاز کی گٹھی بغل میں دبا کر چھت پر دھوپ میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد آواز پڑی تو خاموش لیٹا رہا۔ خود چھت پر آئے۔ تو قدموں کی آہٹ سنکر میں نے آنکھیں میچ لیں۔ ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا تو پیاز کی گٹھی بغل میں سے گری۔ اُس وقت تو خاموش ہو گئے مگر دوسرے دن چمکار کر پوچھا کہ پیاز بغل میں دبا کر دھوپ میں کیوں لیٹے تھے۔ عرض کیا اسی لڑکے نے بتایا تھا کہ بخار چڑھانے کی یہ آسان ترکیب ہے۔ مسجد سے اُسی دن اُٹھا لیا گیا۔

اُردو والدہ مرحومہ اور دادی اماں مرحومہ نے شروع شروع میں پڑھائی اور انگریزی اور حساب خود والد مرحوم نے۔ اجمیری دروازہ کے باہر عربک سکول تھا جہاں چوتھی جماعت سے دسویں جماعت یعنی انٹرنس تک پڑھائی ہوتی تھی۔ کلاں محل سے اجمیری دروازہ کا فاصلہ ایک میل سے کم ہی تھا۔ اس سکول کی شاخ چتلی قبر پر تھی اور گھر سے بہت قریب مگر وہاں صرف تیسری جماعت تک تعلیم کا انتظام تھا۔ [illegible] میں مجھے اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں چوتھی جماعت میں داخل کر دیا گیا مگر حساب میں کمزور تھا اور کمزوری کو پورا کرنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ انگریزی والد مغفور تھوڑی دیر روز دیکھتے اور منظور الدین احمد صاحب جو کلاس ماسٹر تھے روزانہ گھر پر پڑھانے آنے لگے۔ ماسٹر صاحب اجمیری دروازہ سے کلاں محل پیدل آتے جاتے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روز سوائے انگریزی کے سارے مضامین پڑھاتے تھے۔ مدرسہ کی فیس تین آنے تھی ماسٹر صاحب کی فیس چھ روپیہ۔ اس زمانہ میں چار کنبہ بھر میں صرف دو تین بزرگ پیتے تھے۔ اور ہمارے ہاں سردیوں میں جمعہ کے جمعہ علی الصبح بنتی تھی جب میں طلوع آفتاب سے قبل مدرسہ جایا کرتا تھا۔ اور چار کے ساتھ ایک اُبلا ہوا انڈا بھی ملتا تھا۔ ماسٹر صاحب کی تواضع پان سے تو روزانہ کی جاتی ہی تھی کبھی کبھی شربت اور مٹھائی یا موسم کے پھلوں سے بھی۔ آٹھویں جماعت کا امتحان ہوا تو تاریخ میں ناکام تھا۔ ایک سوال تھا سلوکس کون تھا اور میں نے لکھا تھا آدمی تھا۔ جغرافیہ کا ایک سوال تھا وہ کون سا شہر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے ضرور دیکھ لو اور میں نے لکھا تھا۔ مکہ شریف۔ میرے فیل ہونے سے ماسٹر صاحب کی بدنامی ہوتی اس لئے جب امتحان ختم ہو گیا تو انھوں نے مجھ سے کہا شام کو میرے کمرہ میں آنا۔ وہ بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ میں وقت مقررہ پر پہنچا تو ماسٹر صاحب نے حساب کے سوالات کا حل اور امتحان کی کوری کاپی سامنے رکھ دی کہ اسے جلدی سے نقل کر دو۔ میں نے اُن کے حکم کی تعمیل

[illegible] پاس [illegible] کی
کی [illegible] پوچھا تا تھا۔
[illegible] ناراض ہو جاتے ہیں۔
[illegible] ماں باپ کے سامنے جھوٹ
[illegible] کے سامنے
[illegible] اگر ماں باپ سے کوئی جھوٹ بولے تو اللہ
میاں جتنے بھی ناراض ہوں کم ہے۔ یہ بات میرے
ذہن نشین کر دی گئی تھی۔ چنانچہ میں نے پاس ہونے
کے بعد جماعت چھٹنے کا واقعہ ابا جان کو سنایا تو وہ خفا
ہوئے کہ اب تک کیوں باخبر نہیں کیا تھا۔ اس طرح
کی کامیابی کو انھوں نے بے ایمانی سے تعبیر کیا اور سزا
یہ دی کہ ماسٹر صاحب کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

چوتھی جماعت میں تھا ایک دن صبح جو آنکھ
کھلی تو نجانے کیا دل میں آیا کہ سٹول رکھ والد مغفور کی
اچکن کی تلاشی لینے لگا۔ اوپر کی جیب میں کچھ پیسے تھے
ایک دوانی (بہت چھوٹی ہوتی تھی) نکالی۔ وہ گر پڑی۔
مڑ کر دیکھا کہ ابا تو نہیں دیکھ رہے۔ اُن کی تو آنکھ نہیں
کھلی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ اطمینان ہو گیا کہ سو رہے
ہیں۔ نہیں وہ جاگ رہے اور بیٹے کی اس حرکت کو دیکھ
رہے تھے۔ دوانی لے خوش خوش مدرسہ جانے کی تیاری
کی۔ وہ خاموش رہے۔ شام کو جب دفتر سے واپس
آئے تو پاس بٹھا کر پچکار کر پوچھا "آج کیا کیا کھایا؟"
جھوٹ بولنے سے اللہ میاں کی ناراضگی کا ڈر دل میں
بیٹھا ہوا تھا۔ جو کچھ کھایا تھا سب سچ سچ بتا دیا۔
پوچھا "اتنے پیسے کہاں سے آ گئے؟"
جواب میں خاموشی تھی۔
فرمانے لگے "میں اپنے بیٹے کو ماروں گا نہیں۔
مجھے معلوم ہے مگر میں چاہتا ہوں تم خود بتاؤ۔" عرض کیا
"صبح آپ کی اچکن میں سے دوانی نکالی تھی۔"
فرمایا "یہ جو نکالی تھی یہ جو چرائی تھی۔ کسی کی
چیز بغیر اُس کی اجازت پوچھے لے لینا ہی تو چوری ہے
یوں تم نے چوری کی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اللہ میاں دیکھ
رہے تھے یا نہیں؟"
"جی ہاں"
"تو کیا اللہ میاں اس لڑکے سے خوش ہو سکتے ہیں
جو چوری کرے؟"
"جی نہیں"
"پھر اب بتاؤ میں کیا کروں۔ میرے بیٹے نے اللہ
میاں کو ناراض کر دیا۔ تم مجھ سے ایک دوانی لیتے۔
دو لیتے۔ چار لیتے۔ آٹھ لیتے جتنی ضرورت ہوتی لیتے۔ مجھ سے
لیتے۔ میں خوشی خوشی تمہیں دیتا۔ تم نے چوری کر کے مجھے
بھی اللہ میاں کی نظر میں ذلیل کیا۔ وہ کہے گا۔ یہ چور لڑکے
کا باپ ہے"
میری آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
فرمایا "وضو کر کے آؤ۔" میں نے وضو کیا جانماز
پر بیٹھا تو اللہ تعالیٰ سے معافی منگوائی اور آئندہ کسی کا مال
بغیر اجازت نہ لینے کا عہد کروایا۔

سنہ ۱۲ یا سنہ ۱۳ء کا واقعہ ہے گرمی کا موسم تھا۔
چلچلاتی دھوپ چڑھی تھی۔ گھر میں جو زینب خالہ رہتی
تھیں ان کے چھوٹے لڑکے سے جسے میں بھائی ابراہیم
کہتا تھا تاش کھیلنے میں لڑائی ہو گئی کوئی دو گھنٹہ بعد
پھوپی اماں کے بڑے لڑکے بھائی سید عزیز الرحمن
صاحب (شیر خان) اور دو تین گلی کے لڑکوں کے ساتھ سدھرا
کی نہر پر نہانے چلا گیا۔ تیرنا اچھی طرح آتا نہ تھا۔

اندر دالان میں باہر انگنائی میں اوپر چھت پر کہیں نہ ملا تو والد مغفور پریشان ہو گئے۔ بھائی ابراہیم نے کہا چلئے میں بتاؤں۔ "موسرا کی نہر پر نہانے گئے ہیں۔" میں نہر میں نہا رہا اور خوش ہو رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں دھوپ میں والد مغفور بھائی ابراہیم کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ خون ہی تو خشک ہو گیا۔ فوراً باہر نکل کپڑے پہن ندامت سے سر جھکا اُن کے پاس آیا اور گھر ہم واپس ہونے تو آگے آگے والد مغفور اور پیچھے پیچھے میں۔ والد مغفور سے ندامت تھی اور بھائی ابراہیم پر غصہ آرہا تھا۔ بھائی ابراہیم ساتھ ساتھ تھے فاتحانہ مسرت سے سرشار۔ گھر پہنچ کر والد مغفور نے فرمایا۔

"تم سے چار غلطیاں ہوئی ہیں۔ پہلی یہ کہ بغیر میری اجازت گھر سے باہر قدم نکالا۔ دوسری یہ کہ اس دھوپ میں جب چیل انڈا چھوڑ رہی ہے بجائے اندر دالان میں لیٹنے کے تم اتنی دور گئے۔ تیسری یہ کہ تمھیں تیرنا آتا نہیں اور ڈباؤ پانی میں نہانے پہنچے۔ چوتھی یہ کہ گلی کے لڑکوں کے ساتھ گئے جن کی صحبت اچھی نہیں۔ اگر نہر میں نہانے کو تمھارا جی چاہ رہا تھا تو کیا تم مجھ سے نہیں کہہ سکتے تھے"

راستہ ہی میں گھڑوں پانی پڑ چکا تھا۔ دم بخود تھا۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

"مجھے اس وقت تمھاری کھال اُدھیڑ دینی چاہیے۔ مگر میں اپنی بیت کیوں توڑوں۔ اپنے ہاتھ کیوں تھکاؤں جاؤ اپنے دل سے پوچھو تم نے اپنے باپ کو کس قدر اذیت دی ہے اور اللہ میاں کو کتنا ناراض کیا ہے۔"

مدرسہ میں اپنے پھوپی زاد بھائیوں کے ساتھ جاتا تھا اور [illegible] تک واپسی ملازم کے ساتھ ہوتی تھی۔ گھر لوٹتے وقت کتابیں یا بستہ میں اسے دے دیتا تھا۔ گرمیوں میں وہ چھتری لے کر جاتا تھا۔ مدرسہ جاتے آتے کہیں راستہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی۔

میرے امتحان انٹرنس کی تیاری اور کامیابی

ماسٹر منظور الدین احمد کا سلسلہ منقطع ہونا اور آٹھویں جماعت

میں فیل ہونا نہایت کار آمد ثابت ہوا اور اب جو خود محنت سے پڑھنا شروع کیا تو سہ ماہی ششماہی سالانہ ہر امتحان میں اول یا دوم آنے لگا۔ مڈل پاس کر کے انٹرنس میں پہنچا تو اُردو اور سائنس اِن دو میں سے ایک مضمون لینا تھا۔ اُردو کے نمبر سو تھے اور سائنس کے ڈیڑھ سو۔ اُردو چھوڑ سائنس لی اور نویں جماعت کا امتحان ہوا تو سائنس میں ساری جماعت میں اوّل تھا ڈیڑھ سو میں سے ایک سو اٹھائیس نمبر تھے۔ اُردو میں بہت آتے اسّی آجاتے۔ مڈل پاس کر کے اُردو اس لئے چھوڑی تھی کہ سائنس کے ۵۰ نمبر زیادہ تھے مگر سائنس کی وجہ سے مر مر کر انٹرنس میں کامیابی ہوئی۔ ہوا یہ کہ گوجرانوالہ کا ایک کُند ذہن نہایت شریر لڑکا تھا نذیر پریکٹیکل ہو رہا تھا۔ اس نے میرے تجربات بگاڑ دیے۔ ایسڈ ا چکھی اور رومال پہ بھی گرا یا۔ اور کاغذوں پر بھی۔ اس نے سوچا اپنے ساتھ اسے بھی لے ڈوبوں۔ طبیعات اور کیمیا دونوں پرچے لکھے کے اچھے ہوئے تھے۔ مگر پریکٹیکل میں پاس ہونا ضروری تھا۔ پریکٹیکل میں فیل ہونے کی وجہ سے سائنس کے پورے ڈیڑھ سو نمبر کٹ گئے۔ چونکہ باقی سب مضمونوں میں پاس تھا اس لئے سال تو ضائع نہیں ہوا مگر نمبر ہیڈ ماسٹر اور کلاس ماسٹر صاحب کی توقع کے خلاف بہت کم تھے۔ کوچہ چیلاں سے محلہ چوڑی والاں تک پندرہ سولہ لڑکے

ن میں بیٹھے تھے سوائے میرے سب طفل تھے اور
ی پاس ہو تو فیل ہی ہوتے ہوتے بچا۔
ویں جماعت کے امتحان سے سوا ڈیڑھ مہینہ پہلے
ے واقعہ ابھی تک ذہن میں ہے۔ امیر ایک ہم جماعت
و ایک بہت بڑے رئیس کے بیٹے۔ جماعت میں
ے کمزور تھے۔ سگریٹ نوشی کی وجہ سے اُن سے دوستی
ی۔ انھوں نے کہا تم ہمارے ہاں شام کو آجایا کرو۔
پڑھیں گے۔ حضرت والد مغفور اس بات کا بہت
رکھتے تھے کہ مدرسے کے جن لڑکوں سے میرا ربط ضبط
ہے وہ کس خاندان کے اور کس طبیعت کے لڑکے
امیر کے خاندان سے وہ اچھی طرح باخبر تھے اور یہ
معلوم تھا کہ اسے پڑھنے کا کچھ شوق نہیں والدین
لاڈ پیار میں رہتا ہے تاہم جب میں نے اُن سے عرض
کہ میں وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے پڑھنے چلا جاؤں تو
ہوں نے کچھ سوچا اور اجازت دے دی مگر بجائے
ائی کے گھنٹہ سوا گھنٹہ تاش ہوتے رہے واپسی پر پوچھا
کیا کیا پڑھا۔ میں نے عرض کیا ان کی کتابیں کاپیاں
نہیں بس تاش ہوتے رہے۔ وہ مسکرا کر خاموش
گئے دوسرے دن پھر جانے کی اجازت طلب کی اور پھر
ازت مل گئی۔ اُس دن بھی پڑھنے لکھنے کی بجائے تاش
ے۔ واپسی پر مسکرا کر فرمایا کہو آج کیا پڑھا میں نے
ن کیا وہ تو وقت ضائع کرتے ہیں آج بھی تاش کھیلتے
ے فرمایا میاں امیر اور غریب کا نہ کوئی رشتہ ہوتا
نہ دوستی۔ وہ امیر آدمی کے بیٹے ہیں اگر ایک حرف بھی
پڑھیں تو ان کی جائداد کا کرایہ اتنا ہے کہ دس کو کھلا کر
کھائیں گے۔ وہ روپیہ کے بل بوتے پر زندگی گذاریں گے
تم غریب آدمی کے بیٹے ہو محنت سے علم حاصل کرو گے

جب ہی دنیا تمھاری عزت کرے گی۔ کہو کل بھی اُن کے
ہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

میں نے عرض کیا "جی نہیں"۔

اور پھر تین چار روز بعد میں نے امیر کی انگلی میں
چمکتی ہوئی انگوٹھی دیکھی تو خیال ہوا کہ واقعی امیر غریب
کی دوستی کیسی۔ میں ایسی قیمتی انگوٹھی کہاں سے لا سکتا ہوں

ایک دن شام کو جب دفتر میں انٹرنس کے
امتحان کی تیاری کر رہا تھا والد مغفور دروازہ تک آئے
اور میری آواز سن کر ٹھہر گئے اور والدہ ماجدہ سے فرمایا۔

"جاکر دیکھو تو سہی رازق میاں امتحان کی کیسی
سخت تیاری کر رہے ہیں"

برقعہ اوڑھے وہ اندر آئیں اور میرے ہاتھ سے
کتاب چھین لی اور کہا۔

"یہ ہو رہی ہے امتحان کی تیاری؟"

میں مثنوی میر حسن گا گا کر پڑھ رہا تھا اور مضمون
تھا فراق کا اور اُس وقت یہ شعر زبان پر تھا۔

تلاطم میں شب بھر طبیعت رہی
نہ صورت رہی اور نہ رنگت رہی

اور میں جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔

نہ صورت رہی اور نہ رنگت رہی

کتاب چھین کر فرمایا "گھر چلو"۔

قفل لگا میں سیدھا اُن کے ساتھ ہو لیا اور دل
میں چوٹا چوٹا سا۔ چولہا تو جل ہی رہا تھا۔ کتاب
اُس میں جھونک کر فرمایا۔

"شرم نہیں آتی امتحان سر پر ہے اور تم یہ بیہودہ
کتابیں پڑھ رہے ہو۔ کیا اس کا امتحان ہوگا"

میرے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ ندامت سے سر جھکا

ہوا تھا مگر کچھ دیر بعد ہی ہنس کے کہا۔

"تو میرے ڈھائی آنے تو دے دیجئے کل ہی دو روپیہ سے خرید کر لایا تھا"

اب والدہ مرحومہ خفا ہو رہی تھیں اور دوسرے طرف منہ کئے والد مرحوم ہنس رہے تھے!

انٹرنس یعنی میٹرک میں کامیابی ہوئی تو کنبہ بھر میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ اُس زمانہ میں انٹرنس کو آج کے بی اے سے زیادہ اہمیت تھی۔ اور ۱۹۱۸ء سے چوتھائی صدی قبل تو مڈل بھی بڑی چیز تھی۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں بی اے میں تھا والدہ مرحومہ کے پاس نانی اماں کی خالہ زاد بہن نانی جہاں آرا آئی ہوئی تھیں عمر اسی سے اوپر تھی مجھ سے کہنے لگیں۔

"اے بیٹے دیکھو تو نے مڈل پاس کر لیا؟"

سنہ ۱۹۱۹ء کی آتش زدگی اور پریس کا خاتمہ

مسجد کالے خاں کی گلی کے جس مکان میں پریس تھا اس کا ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ اپریل کا مہینہ تھا ایک دن مغرب کے وقت پریس بند ہو رہا تھا کہ پریس مین نے جلتی ہوئی بیڑی بے خیالی میں پھینک دی اور کاغذات نے آگ پکڑ لی۔ کہیں ۹ بجے جاکر ہمیں خبر ہوئی مگر جو ذخیرہ بھی پریس کتابوں رسالوں فرنیچر کا تھا نصف سے زیادہ جل چکا تھا۔ بہت سے قیمتی کاغذات راکھ کے ڈھیر تھے۔ مخزن، عصمت، تمدن، سہیلی کے پرانے فائل۔ ذاتی لائبریری کی کتابیں۔ تبادلے میں جو رسالے آتے تھے ان کی جلدیں ان چیزوں کا بڑا حصہ ہی ضائع نہیں ہوا بلکہ فروخت کے لئے مطبوعات کا جو سٹاک تھا ان کتابوں میں بھی زیادہ تر جل چکی تھیں۔ اس آتش زدگی سے پریس کو بھی شدید نقصان پہنچا تھا جس کی تلافی پھر نہ ہو سکی۔

زیور کی پہلی قربانی

ماں کا سایہ علامہ مغفور کے سر سے اٹھ چکا تھا مگر ان کی رفیقہ حیات کو "مبارک زمانی" کہنے والے پانچ سات بزرگ ابھی موجود تھے۔

مرحوم رشید الزمانی صاحب نے اپنی بہو کو ہر روپیہ میں سے ایک آنہ بچانا کا جو سبق دیا تھا وہ ایسا ذہن نشین ہوا کہ آخر دم تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ ملازمت چھوڑے علامہ مغفور کو دو سال ہو چکے تھے اور اب وہ عصمت و تمدن دو رسالوں اور تمدن پریس ایک چھاپہ خانے کے مالک تھے مگر رسالوں سے آمدنی اتنی نہ ہوتی تھی کہ روپیہ کی ریل پیل ہو جاتی۔ بندھی ہوئی آمدنی تو تھی ہی نہیں روزانہ وی پی منی آرڈر آتے کبھی آٹھ دس کبھی بیس چالیس کبھی اس سے بھی زیادہ کاغذی سکے یعنی نوٹوں کا اُس زمانہ میں زیادہ رواج نہ تھا ۱۵ روپیہ کی اشرفی ہوتی تھی جسے اٹھاشی یا گنی بھی کہتے تھے۔ پچاس روپیہ کی ڈاک آتی تو ڈاکیہ تین اشرفیاں اور چاندی کے ۵ روپے دیتا تھا۔ پریس اور دفتر کا خرچ روزانہ تھا۔ گھر کے خرچ کے لئے بھی تین روپیہ روز دئے جاتے تھے اور انھیں تین روپیہ میں والدہ مرحومہ ایک آنہ فی روپیہ کے حساب سے جمع کرتی تھیں۔

محلہ میں ایک دیندار بزرگ رہتے تھے مرزا یوسف بیگ۔ زردوزی ریشم کا ان کا کارخانہ تھا۔ علامہ مغفور کا وعظ انھیں بہت پسند تھا۔ اور اُن کے معتقدین میں سے تھے۔ گوٹہ۔ ٹھپہ۔ کپڑا زیور اُنھیں کی معرفت آیا کرتا تھا۔ اُن کے ذریعہ آپا کے لئے دو بالیاں بنوائی گئیں آپا نے وہ دیکھ لیں۔

کچھ دن پہلے اُنھوں نے گھر کی کوئی بات والد مرحوم سے کہہ دی تھی اس پر دادی اماں کی ڈانٹ پڑی تھی کہ گھر

بی سلیقہ کی باتیں ہوتی ہیں۔ مردوں سے سب نہیں کہی جاتیں آج باپ سے کہا کل خصم سے کہو گی۔ جھگڑے کھڑے ہوں گے۔ دلہا والوں سے بُرے دل ہوں گے۔ خبردار جو ہر بات بیاہ والے جڑیں۔

آپا اپنی بالیوں کی خوشی میں دادی اماں کی نصیحت بھول گئیں اور جس دن بالیاں آئی تھیں۔ اسی دن موقع دیکھ چپکے سے والد مرحوم سے کہہ دیا۔ "کہ میری بالیاں بن کر آئی ہیں"۔

انھوں نے دریافت کیا کہاں رکھی ہیں تو بتا یا کہ ڈبیہ میں اور ڈبیہ صندوق میں نیچے رکھی ہے۔ اُن دنوں میں ڈاک کچھ کم آرہی تھی اور روپیہ کی تھی ضرورت۔ تین چار دن بعد والدہ مرحومہ سے فرمایا "تم اپنے کپڑوں کو دھوپ دے لیا کرو۔ کہیں خدا نخواستہ کیڑا نہ لگ جائے۔"

"ہاں دوں گی"

"میرے خیال میں تو کئی مہینے سے تم نے دھوپ نہیں دی"

"ہاں کسی دن دھوپ دے لوں گی"

تیسرے دن پھر کہا اور چوتھے دن پھر تو انھوں نے فرمایا "تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے کہ دھوپ دوں۔ دے لوں گی۔ آخر جلدی کاہے کی ہے"

"نہ دو۔ نقصان ہوگا تو تمھارا۔ میری جوتی کی نوک سے۔ میں نے تو تمھارے ہی بھلے کی کہی تھی۔ کیا اُلٹا زمانہ ہے"

کپڑوں کو دھوپ دی گئی تو موقع تاک کر ڈبیہ میں بالیاں دیکھ وہیں ڈبیہ رکھ دی اور تین چار روز بعد کہا۔ "شریف بیویوں کی تعریف یہ ہے کہ وہ شوہروں کی عزت بڑھائیں۔ اُن کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھیں۔ ان کے فکر و پریشانی کو دُور کریں۔ اور اگر ضرورت ہو تو روپیہ پیسہ زیور گہنے کو میاں سے عزیز نہ رکھیں"

والدہ مرحومہ بہت سیدھی آدمی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس تمہید کا کیا مطلب ہے۔ کہنے لگیں۔

"مجھے کیوں یہ سُنایا جا رہا ہے۔ میں نے کون سی چیز تم سے عزیز رکھی۔ دو دفعہ میرا زیور چوری گیا۔ جہیز کی ساری بھاری بھاری چیزیں جب ہم ملی گڑھ میں تھے تو بک گئے اس کے بعد پھر زیور گیا۔ اب میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ لے لو اگر ضرورت ہے۔ ہیر پھیر کی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟"

"تم کچھ جمع نہیں کرتیں؟"

"دیکھو میرا مزاج نہ بگڑ واؤ۔ دیتے بھی ہوتا بھر بھر جھولیاں۔ تین روپلی روز میں میرا ہی دل جانتا ہے جس طرح پوت پورا کرتی ہوں۔ جمع کہاں سے کروں گی اور کس طرح کروں گی؟"

"راشدہ کا کچھ فکر نہیں ہے"

"ہاں اللہ رکھے اب خاصی سیانی ہوگئی ہے۔ اس کے لئے بڑی مشکل سے دو بالیاں بنوائی ہیں"

جب یہ قبولوا لیا تو کہا۔

"بغیر پتوں کے بالیاں بھی کوئی زیور ہے"

"وہ تم بنوا دو۔ بیں جس لائق تھی میں نے بنوادیں تم باپ ہو تم بنوا دو"

"ہاں ہاں ضرور بنوا دوں گا۔ بس تم یہ بالیاں تمھاری رائے میں کانوں کا یہ زیور معقول ہوگا"

"اللہ دے تو تہرا کر دو چوہرا کر دو"

"مجھے تو جھلنیاں پسند ہیں۔ وہ بنواؤں گا مگر تم

مجھے ذرا بالیاں بھی تو دکھاؤ دیکھوں کیسی ہیں یا نہیں"
ڈبیہ دی۔ بالیاں دیکھیں اور منہ بنا کر کہا۔
"یہ تو کچھ بھی نہیں۔ بہت ہی معمولی ہیں۔ تم نے کس کے ذریعہ بنوائیں ؟ ماموں کے"
"نہیں یوسف بیگ کے"
"جب ہی ایسی ذلیل ہیں۔ کچھ تو بھاری ہوتیں خیر اب تم کل مجھے دے دینا میں سُنار سے بھاری بنوا دوں گا جن میں ایک ایک بڑا پھول بھی ہوگا"

دوسرے دن بالیاں لے لیں۔ دس دن گذرے بیس دن گذرے ایک مہینہ گذرا۔ دوسری بالیاں نہ آئیں تقاضہ شروع ہوا فرمایا۔

"سُنار کمبخت بھاگ گیا۔ تھوڑے سے روپے تو میں نے وصول کر لئے تھے۔ ایک دن راستہ میں مل گیا پھر کچھ وصول کئے۔ اب پانچ سات رہ گئے ہیں وہ بھی اس سے رکھوا لوں گا۔ گھر تو مجھے معلوم ہو ہی گیا ہے"

والدہ معظمہ یہ سُنکر خفا سی ہوئی ہوں گی۔ چند روز بعد کہا۔

"آج کل ڈاک بہت کم آرہی ہے۔ تمدن کا کاغذ آنا ضروری تھا اور کچھ کاغذ عصمت کا بھی۔ انشاءاللہ اس سے اچھی بالیاں بنوا دوں گا۔ پتے بھی اور جھلنیاں بھی۔ تم اپنا دل بھاری نہ کرو۔"

اور اس طرح جو بالیاں چپکے ہی چپکے والدہ معظمہ نے بنوائی تھیں وہ تمدن اور عصمت پر قربان ہوگئیں اور وہ بالیاں ہی نہیں۔ والدہ معظمہ کے کئی گہنے کئی زیور اسی طرح اپنے پیچ کی باتوں سے لے کر کاغذ۔ یا ٹکٹ یا تنخواہوں کے لئے فروخت کئے مگر جب موقع ہوا بنوا بھی دئے چنانچہ والدہ کی نہ صرف آپا کی بالیاں بلکہ پتے اور جھلنیاں بھی بنیں۔

محتاجی بُری چیز ہے

علامہ مغفور نے چودہ پندرہ سال عصمت ایڈیٹ کیا۔ پانچ سال تمدن ڈیڑھ دو سال مخزن اور کئی کئی مہینے دو دفعہ ہفتہ وار سہیلی۔ اور ان رسالوں کی ضرورت کے ہر قسم کے مضامین وہ خود لکھ لیتے تھے۔ فرماتے تھے اڈیٹر میں اتنی قابلیت ہونی چاہئے کہ اپنے پرچہ کے لئے ضرورت جس قسم کے مضامین کی ہو اگر موجود نہ ہوں تو خود لکھ سکے۔ یہ نہیں کہ وہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا ہوا ہے مضامین نہیں آئے اس لئے رسالہ وقت پر شائع نہیں ہوسکتا۔ ایک بہت چھوٹے واقعہ سے علامہ مغفور نے یہ رائے قائم کی تھی اور ان کی والدہ مرحومہ کے الفاظ ان کے دل نشین ہوگئے تھے

پھوپی اماں (زاہدہ بیگم صاحبہ) مینڈھیاں اچھی گوندھتی تھیں اور نہ صرف اُن کی بھتیجیاں بلکہ محلہ ٹولہ کی بھی بعض لڑکیاں اُنھیں سے گندھواتی تھیں۔ ایک دن چھوٹی بھتیجی واجدہ مینڈھیاں گندھوانے اُن کے پاس گئیں۔ اُس وقت اُن کا جی نہ چاہا اُنھوں نے کہا۔

"میرے پاس کیوں آتی ہو۔ اپنی اماں سے گندھواؤ"

بی بی رشیدالزمانی مرحومہ نے سُن لیا اور بیٹی سے کہا "مبارک زمانی بیٹی تم واجدہ کی مینڈھیاں گوندھ دو" انھوں نے کہا "اماں جان مجھے نہیں آتیں" فرمایا "جیسی بھی آتی ہیں گوندھ دو" جب انھوں نے گوندھ دیں تو کہا "اچھی خاصی گوندھی ہیں۔ گوندھتے گوندھتے اچھی بھی گوندھنے لگو گی۔ کار بکثرت۔ انسان کو چاہئے کسی معاملہ میں کسی کا محتاج نہ رہے"

علامہ مغفور اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ماں کے یہ الفاظ سنے اور گرہ میں باندھ لئے۔

سید رؤف علی اور آصف علی

سید رؤف علی اور سید آصف علی دونوں بیرسٹر ادیب علامہ مغفور کے تحریک کے مداح اور معتقد تھے۔ اور علامہ مغفور دونوں سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ سید رؤف علی ولایت سے بھی عصمت اور تمدن کے لئے مضامین بھیجتے تھے۔ زبان اچھی لکھتے تھے افسوس ان کا جوانی ہی میں انتقال ہوگیا۔ کاش اُن کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوجاتا۔

سید آصف علی بیرسٹر نے اپنے ابتدائی تاثرات کا ذکر اُس مضمون میں کیا تھا جو "حضرت راشد" کے عنوان سے عصمت راشد الخیری نمبر میں چھپا تھا اور وہ یہ تھے!

"مجھے وہ دن خوب یاد ہیں کہ عبد القادر صاحب مدیر "مخزن" دلی آئے۔ "مخزن" کا دفتر ہمارے گھر کے برابر ہی تھا جہاں بعد میں محمد علی مرحوم نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا دفتر اور اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ ہم ان دنوں میں شاید ۱۹۰۳ء کی بات ہے کالج میں پڑھتے تھے۔ ہر مہینہ "مخزن" کو اس طرح پڑھا کرتے تھے جیسے گویا آسمانی صحیفہ اُترا ہو۔ مہینہ بھر انتظار کرتے اور مہینے کے آخر میں اُدھر "مخزن" تیار ہوا اور اِدھر ہم نے اسے کالج میں گھر پر بلغ میں جہاں موقعہ ملا بیٹھ کر پڑھا۔ اب یہاں سے تمہارے والد کا تعارف ہوتا ہے۔ ایک مضمون "گدڑی کا لعل" "مخزن" میں نکلا۔ دلی کی وہ زبان جو پردے کے گھروں کی بڑی بوڑھیوں تک محدود ہوکر رہ گئی تھی پہلی دفعہ نظروں سے گذری۔ ہماری اور ہمارے دوستوں کی خوشی اور ناز کی انتہا نہ رہی۔ کہ پہلی دفعہ وہ زبان جو ہم بولتے تھے لکھی ہوئی ملی ورنہ لکھنے والے یا تو اکتابی اُردو لکھتے تھے یا کتابی اُردو۔

مگر یہ زبان کہاں۔ اس دن سے ہر رسالہ میں راشد الخیری کی تلاش رہتی تھی۔ دوسرا مضمون نکلا "حسن دمشق"۔ اس کے پڑھنے کے بعد تو بےچین ہوگئے اور راشد الخیری کون ہیں کہاں ہیں روزمرہ کے سوال ہوگئے۔ آخر میں نے ایک دن اکرام صاحب سے جو اُس وقت "مخزن" کے نائب مدیر تھے اور گھر کے برابر رہتے تھے پوچھا کہ جناب یہ راشد صاحب کون ہیں وہ بولے: "لیجئے آپ دہلی والے ہیں اور مولانا راشد کو نہیں جانتے" اور پھر کہا کہ "وہ تو یہیں پاس ہی کلاں محل میں رہتے اور "اکاؤنٹنٹ جنرل" کے دفتر میں ملازم ہیں۔ میں نے کہا اگر اُن سے ملاقات نہیں ہوسکتی تو ان کی تصویر تو چھاپ دیجئے۔ وہ بولے بلاک بنتے کہاں ہے۔ ایک آپ ہی اُن کی صورت دیکھنے کے شائق نہیں۔ سب طرف سے یہی مانگ آرہی ہے۔"

شاید ۱۹۱۲ء میں آصف صاحب ولایت سے آئے تو اکثر اُن سے ملاقات ہوتی۔ عصمت راشد الخیری نمبر میں انھوں نے کئی واقعات بیان کئے ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے۔

"جس دن "نوبت پنج روزہ" ختم کر چکے تو آئے اور کہنے لگے: "میاں اب کے تم خوش ہوجاؤ گے۔ بجھتے ہوئے چراغ کی لَو ذرا اُبھار دی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ اس کے بتانے والے بھی نہ رہیں گے۔ جس دن تمہاری نانی اماں اور والدہ کی خدانخواستہ آنکھیں بند ہوگئیں تو وہ زبان بولنے والے بھی نہ رہیں گے جو میں لکھ رہا ہوں۔ اور میں نے کہا جس دن ہم مرگئے اس دن اس زبان کو سمجھنے اور اس کا مزہ لینے والے بھی کم ہوجائیں گے۔ ہنسنے لگے: "آصف میاں یہی باتیں کرنے تو تمہارے پاس آیا کرتا ہوں۔"

اور یہ بھی لکھا تھا کہ "اکثر اُردو کے نثاروں اور شاعروں اور کبھی کبھی انگریزی کے ادیبوں کے تذکرے

رہا کرتے تھے۔"

آصف علی صاحب کٹر کانگریسی ہوگئے تھے۔ اسمبلی کے ممبر ہوئے اور تقسیم ہند کے بعد سفیر اور صوبہ اڑیسہ کے گورنر ہوئے۔ علامہ مغفور فرمایا کرتے تھے کہ کانگریس نے ایک ہونہار ادیب کو چھین لیا جن لوگوں نے علامہ مغفور کو کانگریس میں لانے کی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوئے اُن میں مرحوم آصف علی بھی تھے۔ آصف علی مرحوم نے ٹیگور کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا اور خود بھی کئی طبع زاد افسانے تمدن میں لکھے تھے۔ ۶۔۷ سال ہوئے اُن کا بھی انتقال ہوگیا۔

آخری مکان

۱۹۱۰ء میں کالے خاں کی مسجد کے دونوں مکان چھوڑ کر بیس پچیس قدم آگے لب سڑک ایک دومنزلہ بڑے مکان میں ہم منتقل ہوگئے دریا گنج کی طرف سے کوچہ چیلاں میں داخل ہو کر بائیں ہاتھ کو ترکاری منڈی تھی اور دائیں ہاتھ کو یہ دوسرا مکان تھا اس مکان میں ۲ بڑے کمرے ۴ دالان ۲ کوٹھریاں تھیں اور اوپر چھت پر ۲ گز لمبا ایک کمرہ اس کا کرایہ اُس زمانہ میں ۳۰ روپیہ تھا۔ ایک کمرے میں دفتر تھا۔ اوپر علیحدہ کمرہ مجھے ملا میں کالج میں داخل ہوچکا تھا۔ علامہ مغفور کا انتقال اسی مکان کے اندر کے کمرہ میں ہوا تھا۔ اس سے ملا ہوا مکان جس کا دروازہ سڑک پر ہے، پہلے ہمارے پاس کرایہ پر تھا پھر ہم نے خرید لیا تھا۔

جنگ عظیم کا اثر عصمت پر

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ۱۹۱۶ء میں ہر چیز کی قیمت پر آگ پڑ رہی تھی ۱۹۱۷ء میں ادھر گرانی کی انتہا ادھر دفتر میں آتش زدگی۔ عصمت کی اشاعت میں بے قاعدگی ہی نہیں ہوئی اس کے حُسن ظاہر پر پانی پھر گیا۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں پرچہ پھر سنبھلا اور باقاعدہ شائع ہو رہا تھا گرانی کی کیفیت علامہ مغفور کے الفاظ میں یہ تھی۔

"کاغذ اور دوسرے سامان پریس نے جو مصیبت ڈھائی ہے اس کی تفصیل بے سود ہے۔ مختصر یہ کہ یہ سفید کاغذ جس پر عصمت چھپ رہا ہے اور جس کی اصلی قیمت ایک روپیہ گیارہ آنے تھی اب ساڑھے آٹھ روپیہ میں وہ بھی بدقت مل رہا ہے۔ گرانی کی موجودہ رفتار سے کاغذ ناپید ہوتا جا رہا ہے قیمت پانچ گنی ہوگئی ناممکن ہے کہ عصمت یہ شان قائم رکھ سکے۔" (اگست ۱۹۱۸ء)

اور ۱۹۲۰ء میں یہ تحریر فرمایا۔

"تہذیب جیسے قدیم اور قابل قدر پرچہ کو اپنا کاغذ گھٹا کر بتانا پڑا کہ زندگی کی ضرورتوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا درجہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ گرانی کا موجودہ دور میں ہر شے کی قیمت تگنی چوگنی ہوگئی لیکن ہر ضرورت جس طرح پہلے رفع ہوتی تھی آج بھی ہو رہی ہے صرف ادب اور تعلیم نسواں ہی ایسی غیر ضروری چیزیں ہیں جو زندگی کی ضرورتوں میں شامل نہیں اور جس کا ثبوت ہم کو ہر لمحہ ناظرین سے مل رہا ہے۔ جس کاغذ پر بجائے تین روپیہ کے ساڑھے نو روپیہ جس چھپائی پر بجائے دو کے ساڑھے چار جس تصویر پر بجائے پندرہ کے اکیاون روپیہ صرف ہو وہ کہاں سے فراہم ہوں گی"

۱۹۲۱ء کی آتش زدگی نے پریس قریب قریب ختم کر دیا مگر عصمت ختم نہیں ہوا۔ گرانی نے ہوش اُڑا رکھے تھے پرچہ بے قاعدہ شائع ہوا۔ خریدار کم ہوگئے مگر استقلال اور ہمت سے پرچہ جاری رکھا گیا۔

صدائے راشد

غیر منقسم ہند نے علامہ راشد الخیری سے بڑھ کر عورتوں کے حقوق کا حامی اور ساتھی پیدا نہیں کیا۔ انھوں نے مسلم خواتین کے حقوق کے لئے مسلسل ۴۰ سال تک جہاد کیا مگر ایک معاملہ میں ان کی

مخالفت نے ملک بھر میں تہلکہ مچادیا۔

مسلم لیڈیز کانفرنس ہندوستان بھر کی مسلمان بیبیوں کی سب سے بڑی جماعت تھی۔ اُس کا سالانہ اجلاس ندوری شاشہ میں ہوا اس کی ایک تجویز یہ تھی کہ کوئی مسلمان عورت اپنی لڑکی ایسے شخص کو نہ دے جس کی پہلی بیوی موجود ہو۔

علامہ مغفور کی ساری عمر خواتین ہی کی خدمت میں بسر ہوئی رسالوں سے اخباروں سے مضمونوں سے کتابوں سے تحریروں اور تقریروں سے اور روپیہ پیسہ سے ہاتھ پاؤں سے جب تک اس دنیا میں رہے عورتوں کو اسلامی اصولوں پر اعلیٰ تعلیم ملنے کی کوشش فرماتے اور اُن کے حقوق کی پامالی پر آنسو بہاتے رہے۔

تعلیم نسواں کی کوششوں کے سلسلہ میں جب تربیت گاہ بنات قائم کی اس وقت خود تحریر فرمایا تھا۔

"خدا معلوم تعلیم نسواں مسلمانوں میں کس قدر پھلے پھولے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھ جیسا تعلیم نسواں کا شیدا یہ چراغ سحری ہے خاک ہندوستان سے جلد اٹھتا نظر نہیں آتا۔"

(عصمت مارچ ۱۹۱۲ء تعلیم نسواں نمبر)

عورتوں کے اسلامی حقوق کی حمایت میں جس قدر مضامین ہندوستان کی تمام زبانوں میں شائع ہوئے ہیں اگر ایک جگہ جمع کردئے جائیں تو ان مضامین کا وزن اور ان کی سطریں یقیناً کم ہوں گی اس لٹریچر کے مقابلے میں جو خواتین ہند کے محسن اعظم نے عورت کی حمایت میں چھوڑا ہے۔

مگر اس تجویز کی حضرت علامہ نے مخالفت کی!۔

"ستیوگ" "سوکن کا جلاپا" "شام زندگی" غرض متعدد ناولوں میں "بھنور کی دلہن" "بیاہتا بیوی کا خط" "مظلوم بیوی کا خط" "بے قصور تھی" المختصر کتنے ہی افسانوں اور مضامین میں مرحوم علیہ الرحمۃ نے ایک بیوی کی موجودگی میں دوسرے نکاح کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور کثرت ازدواج کے نہایت دردناک نتائج دکھائے ہیں۔

مخالفین کے لئے یہ بڑا اچھا موقعہ تھا۔ انھوں نے ترقی یافتہ خواتین کو شہ دے کر ابھارا اور اُکسایا اور خواتین کے محسن اعظم کی مخالفت میں کئی عورتوں کی طرف سے مضامین شائع کئے گئے۔

اس سلسلہ میں ملّا واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ نے عصمت کے سالہ جوبلی نمبر میں لکھا تھا کہ

"مولانا کا قول تھا کہ مسلمان ایک بیوی کو پیٹ بھر کھانا اور ڈھنگ کا کپڑا تو دے نہیں سکتے۔ دوسری شادی کس برتے پر کرتے ہیں۔ لیکن لیڈیز کانفرنس کے رزولیوشن پاس کرنے کو انھوں نے قانون اسلام میں دخل دینا قرار دیا۔ وہ قانون کے استعمال کے خلاف تھے قانون کے خلاف نہیں تھے۔" چنانچہ اگست ۱۹۱۸ء کے عصمت میں ایک مضمون کے دوران میں حضرت علامہ مغفور نے خود تحریر فرمایا تھا۔

"نکاح اور چیز ہے نتیجہ نکاح اور چیز۔
مسلم خواتین نکاح نہیں نتیجہ نکاح کی مخالفت کریں
نکاح کا فیصلہ انسانی نہیں خدائی فیصلہ ہے۔
اور اس کے برخلاف لب کشائی کرنا مسلمان کے واسطے
جائز نہیں۔"

نوسال بعد جنوری ۱۹۲۷ء میں ۱۹۱۸ء کے عصمت پر بانیٔ عصمت نے ریویو فرمایا تھا تو یہ بھی لکھا تھا۔

"ایک دوسرا اعتراض عصمت پر یہ بھی ہے۔ خواہ عصمت پر سمجھنا چاہئے یا میری ذات پر کہ عصمت بھی اور میری تصانیف بھی لڑکیوں کو غلامی کی ترغیب دیتی ہیں اور ایک

شتادہ پرچہ میں میرے یا عصمت کے خلاف اس قسم کے مضامین
شائع ہوئے تھے۔ مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے
کہ عصمت سخت سے سخت نقصان اٹھانے پر بھی دائرہ صداقت
سے باہر نہ نکلا۔ ناظرین عصمت کو وہ وقت یاد ہوگا۔
جب لیڈیز کانفرنس نے کثرت ازدواج کے خلاف ۱۸ء
میں رزولیوشن پاس کیا تو گو تمام زنانہ پرچے کانفرنس
کے ہمنوا ہوگئے ——— مگر

عصمت نے باوجود اس کے کہ میں خود کثرت
ازدواج کو مسلمانوں کے واسطے زہر سمجھتا ہوں اس
رزولیوشن کی مخالفت اس واسطے کی کہ
یہ نص قرآنی کے خلاف تھا"

اسلام نے مرد کو جو ایک سے زیادہ نکاحوں کی
اجازت دی ہے وہ وقتی یا ہنگامی نہیں ہے۔ اس تجویز
کو تسلیم کر لینے کے تو یہ معنی تھے کہ مرد کو نکاح ثانی کی اجازت
دینے میں شریعت سے فروگذاشت ہوگئی تھی جس کی
اصلاح کی ساڑھے تیرہ سو سال بعد ضرورت محسوس
ہوئی۔ یہی نص قرآنی کی مخالفت تھی۔

اب جو علامہ مغفور کے قلم سے اس تجویز کی مخالفت
ہوئی تو ترقی یافتہ خواتین حیرت میں رہ گئیں۔

علامہ مغفور کو صدمہ یہ ہوا کہ یہ تجویز پاس ہوئی
غصہ اس پر آیا کہ جلسہ میں کچھ ہندو اور عیسائی خواتین
بھی موجود تھیں جنھوں نے خوش خوش ہو ہو کر تالیاں
بجائیں گویا اس طرح غیر مسلموں سے اسلام کا مضحکہ
مسلم لیڈیز کانفرنس نے اُڑوایا۔ انھوں نے اسی
کیفیت میں وہ مشہور نظم لکھی جو "صدائے راشد"
کے عنوان سے مارچ ۱۸ء کے عصمت میں
چھپی اور عصمت سے کئی اخباروں میں نقل
کی گئی۔

عصمت کے ۵۰ سال ——— (عصمت جوبلی نمبر ۵۰ء)

نظم سے پہلے یہ نوٹ ہے۔

"میں شعر کہنے کا مدعی نہیں ہوں میرے خیالات
اتفاق سے اس نظم کے شکل میں ڈھل گئے ہیں۔ کوئی
صاحب مہربانی فرما کر انھیں شاعری کی کسوٹی پر
نہ پرکھیں"

نظم بہت مؤثر ہے پہلے بند کے چند اشعار یہ ہیں۔

برسات کی یہ رات اور پچھلا پہر سر پہ گھٹا
ہے کس قیامت کا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا
اس عالم سنسان میں جھونکے ہوا کے کان میں
انگنائی میں دالان میں لاتے ہیں یہ کیسی صدا
دلکش نہیں کہرام ہے نغمہ نہیں پیغام ہیں
دھوکا نہیں اسلام ہے از ابتدا تا انتہا
قران کے الفاظ ہیں، حکم نبی کے راز ہیں
راشد کی اس آواز میں۔ دیکھو تو کیا کیا ہے چھپا

دوسرے بند کا پہلا شعر ہے۔

شرم و حیا کی دیویو! مہر و وفا کی پتلیو
اے معدن صدق و صفا۔ خوشیوں کی منبع تھا

اور آخری شعر۔

الحق کہ اب اسلام کی باقی حمیت تم سے ہے
لاریب وصد فنا کہ اب دنیا کی زینت تم سے ہے

اس کے بعد تیسرا بند اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

ہشیار مسلم بیبیو! آنکھیں ذرا اونچی کرو
مغرب سے دیکھو جھوم جھوم کر اٹھی ہے یہ کیسا گھٹا

اور پھر اسی بند میں فرماتے ہیں۔

جدت کی لذت اس میں ہے۔ ننگ حکومت اس میں ہے

لطف دستہ اس میں ہے بس اس میں جھگڑا
بچوں کو گھر میں چھوڑ کر۔ شوہر کی رسّی توڑ کر
کھیلوں میں جا قدد کر۔ یہ وقت ہے کچھ کام کا
دھوکے کی ٹٹی ہاتھ میں۔ مذہب کے نعرے ساتھ میں
لفظ شرع ہر بات میں ہے یہ گم ہے بس اسلام

اور چوتھے بند میں مزید صراحت ہے۔

شوہر کی طاعت عار ہو۔ بچوں کی الفت عار ہو
نخوت گلے کا ہار ہو۔ ہمراز و ہمدم آئینہ
سرمہ بلائے جان ہو۔ جھاڑو سے سر شان ہو
مرغوب شاہ دوسرا۔ مردود ہو رنگ حنا
مثنیٰ ثلاث اور ربع جس وقت سمجھو ظلم ہے
وقتی ضرورت کا سبب، جب ہو خدائی فیصلہ

پانچواں اور چھٹا بند دونوں بہت دردانگیز ہیں۔

نظم اس طرح ختم ہوتی ہے۔

پھولوں کی نکہت تم میں تھی فطرت کی زینت تم ہی تھی
اور تھے فرشتے جھوم کر کہتے صدائے مرحبا
تعلیم حکم عام ہے اسلام میں کچھ شک نہیں
لاریب اس میں امتیاز ہرگز نہیں ہے مرد کا
لیکن یہ لغزش ہو گئی بے شک ہوئی بے شک ہوئی
تعلیم نسواں میں مسلمانوں نے مذہب تج دیا
اب یہ نتیجہ پُرخطر، جو کچھ کہ ہے پیش نظر
انجام اس غفلت کا ہے، لیکن ابھی ہے ابتدا
اسلام دین اللہ ہے آؤ جھکا دو اپنے سر
آتا ہے ورنہ وقت وہ، روؤگے سر پہ ہاتھ دھر

یسیر بچیوں کی ماں کا مہر

ملا محمد الواحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ نے علامہ مغفور کی ۶-۷ کتابوں کے حقوق حاصل کر کے متعدد اڈیشن ان تصانیف کے شائع کئے۔ واحدی صاحب کی علامہ مغفور سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ان کی پہلی بیوی نے دو بچیاں چھوڑ کر انتقال کیا تو واحدی صاحب شاید ۳۳-۳۴ سال کے تھے۔ کچھ مدت بعد ان کا دوسرا عقد طے ہوا تو علامہ مغفور نے فرمایا کہ خاتون اور رابعہ کی ماں کے مہر میں یہ سکونتی مکان ان بچیوں کے نام آپ لکھ دیجئے۔ واحدی صاحب کو باپ کی طرف سے ترکہ میں کئی مکانات اور دوکانیں ملی تھیں اور ان میں سے آدھے سے زیادہ وہ نظام المشائخ وغیرہ رسالوں کی نذر کر چکے تھے۔ اور اس وقت شاید دو تین ہی مکان رہ گئے تھے۔ انھوں نے علامہ مغفور کی تجویز پر غور کیا اور کہا "بہت اچھا ان کے نام لکھ دوں گا" فرمایا: "لکھ دوں گا نہیں لکھ دیجئے۔ باقاعدہ رجسٹری کر دیجئے اس کے بعد دوسرا نکاح ہوگا۔"

چنانچہ واحدی صاحب نے یتیم ماں کی بچیوں کے نام مکان لکھ دیا اس کے بعد دوسرا عقد ہوا۔

سیاہ داغ

مرحوم خواجہ حسن نظامی اور محترم ملا واحدی نے خدا جانے کتنے پرچے جاری کر کے بند کئے بلکہ شاید یہ کہنا بے مبالغہ ہو کہ واحدی صاحب ایک زمانہ میں ہر سال ایک نیا پرچہ جاری کرتے۔ چاہے چند ماہ بعد ہی وہ بند ہو جاتا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے اخبار انقلاب جاری کیا اور اس کی ادارت کے فرائض مرحوم مولانا عارف ہسوی کے سپرد کئے جو دلی کے مشہور کانگریسی رہنما تھے اس زمانہ میں کانگریس کا بہت زور تھا۔ جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست اور جزیرۃ العرب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے مسلمانوں کو انگریزوں سے بہت رنج تھا۔ جنرل ڈائر کے حکم سے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں بیگناہوں پر گولی چلائی گئی تھی۔ اس سانحہ پر اخبار انقلاب نے شہید نمبر شائع

کرنے کا اعلان کر کے حضرت علامہ مغفور سے مضمون کا سخت اصرار کیا۔ اُنھوں نے یہ کہکر ٹالنا چاہا کہ تمھارا اخبار بند ہوجائے گا مگر ندا احمدی صاحب نے نہ مانا۔ عارف صاحب حضرت علامہ مغفور نے "سیاہ داغ" افسانہ لکھکر دے دیا جو اُن کے نام سے تو شائع نہیں ہوا مگر اخبار سے شاید دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ اور اخبار بند ہوگیا۔

بارہ تیرہ سال بعد جب میں نے حضرت علامہ مغفور کے سیاسی مضامین اور افسانوں کا مجموعہ "شہید مغرب" شائع کیا تو اس افسانہ کو بھی اس میں شامل کر دیا لیکن وہ تمام فقرے نکال دئے جو حکومت برطانیہ برداشت نہ کر سکتی تھی افسانہ کا اصلی لُطف جاتا رہا مگر افسانہ بالکل ضائع بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ جب کتاب چھپکر پریس سے آگئی اور اُن کی خدمت میں پیش کی گئی تو میں ڈر رہا تھا کہ ابا جان خفا ہوں گے کہ وہ افسانہ کیوں دوبارہ شائع کیا گیا انھوں نے سب سے پہلے وہی افسانہ دیکھا مگر خفا نہیں ہوئے۔ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔"

(عصمت جوبلی نمبر ۱۹۵۸ء)

مضمون جس صورت میں کتاب شہید مغرب میں شائع کیا گیا تھا اس کے ابتدائی دو ٹکڑے یہ ہیں! اصل میں سے بہت سے فقرے بہت سے الفاظ نکالنے کے بعد:۔

"حکومت کے ذلیل گھمنڈ اور لغو زعم میں فتح کامل اور تیقن غضب سے تمام مراحل طے ہوجانے کے بعد اس وقت جب اراکین دربار ہاتھ باندھے خاموش بیٹھے تھے سلطان کی چشم قہر آلود اوپر اُٹھی اور کہنے لگا۔

"شہر کے یہ گستاخ انسان جو کتوں گدھوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اس قابل ہوگئے کہ قصر شاہی کی طرف منہ کر کے بھونکیں ان کو نہیں معلوم کہ محض مابدولت کے اقبال شاہی کے طفیل دونوں وقت ان کے پیٹ بھر جاتے ہیں۔ یہ اطمینان سے سوتے اور مزے سے رہتے ہیں۔ ہمارے احسانات کا معاوضہ یہی تھا کہ کل رات کہاں کی مکروہ آوازوں نے ہماری نیند میں خلل ڈالا۔ یہ محسن کش یہ نمک حرام۔ انسان نما جانور اس جرم کی سزا پائیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ حکومت کیا طاقت رکھتی ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ بادشاہ کیا اختیار رکھتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ حاکم و محکوم کا رشتے کے کیا معنی ہیں۔ یہ تلوار جس نے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک خون کے دریا بہادئے ایک دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ ایک عالم میں قیامت برپا کر دی ابھی ان ہاتھوں میں موجود ہے۔ یہ ذلیل کمینے ناپاک اپنی اصلیت کو بھول کر آج مابدولت کے سامنے منہ کر کے بھونکتے ہیں۔ اچھا ان سب کے ماتھوں پر ایک سیاہ داغ لگادو۔"

"کچھ شک نہیں حکومت کی طاقت بہت زبردست ہے مظالم حد سے گذر جانے کے بعد یہ حکومت سے زیادہ طاقتور ہیں۔ چیونٹی کو شیر۔ پر کو پہاڑ اور تل کو من بنانے کی طاقت بھی ان میں پوشیدہ ہے۔ تاریخ سلطنت تیری ہستی سے شروع نہیں ہوتی۔ یہ سرزمین جس پر آج تیرا ڈنکا بج رہا ہے تجھ جیسے کتنے ہی اس پر کھیل کر پار ہوگئے۔ یہ بہت سی آنکھیں دیکھ چکی ہے۔ آج وہ تاجدار اس کی آغوش میں نہ ہوں مگر ان کے اعمال اس کے سینے پر موجود ہیں۔ بادشاہ باہر نکل اور غور سے دیکھ۔ ویران کھنڈر تجھ کو بتادیں گے کہ طاقت سے نہیں محبت سے رعیت کا دل فتح کرنے والے۔ بادشاہ ہوکر فقیروں کے آگے سر جھکا دینے والے اس خاک سے اُٹھ چکے ہیں۔ جس سرزمین پر آج تو نے مظالم کے پہاڑ چُن دئے اور جس بے گناہ مخلوق کو کچوکے دے دے کر ذبح کیا اس سرزمین ہند نے

وہ گوہر پیدا کئے جو ملت کے سینہ پر اپنا خون بہاتے تھے۔"

تین یتیم بچوں کی پرورش

والدہ مرحومہ کے چھوٹے بھائی

محمد عثمان الرحمن صاحب مرحوم فوج میں ملازم تھے پنشن لے کر دلی آئے اور چند ماہ بعد ہی انتقال ہو گیا ممانی صاحبہ پہلے ہی گذر چکی تھیں۔ اب تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کا معاملہ تھا ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ یتیم خانہ میں داخل کر دو۔ ایک چچا نے پندرہ روپیہ ماہوار کھانے کے مقرر کر دیئے لیکن پرورش کی ذمہ داری اٹھانے کو کوئی تیار نہ تھا۔ ماموں جان کا انتقال ہمارے گھر میں ہی ہوا تھا۔ والدہ مرحومہ ادھر بھائی کی موت سے رنجیدہ تھیں ادھر یتیم بھتیجوں کی پرورش کے مسئلے سے سخت متفکر اور پریشان۔ والد مرحوم والدہ مرحومہ کو کسی حالت میں مغموم نہ دیکھ سکتے تھے۔ انھوں نے فرمایا "اللہ جہاں ہمارے بچوں کی پرورش کرا رہا ہے وہاں ان کی بھی کرائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔" چنانچہ اپنی پھوپی جان اور پھوپا جان کے زیر سایہ یہ بچے جوان ہوئے۔ واجدہ بیگم لکھتی ہیں کہ "چھوٹا بچہ بہت چھوٹا اور شریر تھا اکثر دوپہر کو جب ابا جان لیٹتے تو وہ ایک پتھر اس زور سے دروازہ پر مارتا کہ وہ اٹھ جاتے۔ اماں جان ڈر جاتی تھیں کہ کہیں غصہ نہ آ جائے لیکن ابا جان مسکرا کر کہتے "یہ ہوگا کون جا جو ہی شریر ہوگا" اور شام کو اماں جان سے کہتے "اے بی جا جو کو ایک آنہ کا دودھ منگوا دینا" اماں جان ابا جان کی طرف دیکھ کر کہتیں "تم نے ہی اسے سر پر چڑھایا ہے"۔

جب بڑا بچہ برسر روزگار ہو گیا تو اس کی شادی اس طرح کی گئی جس طرح اپنے بچوں کی کی تھی۔ اس موقع پر حضرت علامہ مغفور نے ایک دردانگیز نظم لکھی تھی۔ جس کے آخر میں دولھا کا سہرا بھی تھا یہ نظم علامہ مغفور کی چھوٹی بیٹی واجدہ نے جب عزیزوں کے بھرے مجمع میں پڑھی تھی تو سب ہی متاثر ہو گئے تھے اور بہت سی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ نظم عصمت میں چھپی اور پھر گرفتار قفس معتوب قوم کی نظموں کے دوسرے مجموعہ میں چند اشعار یہ ہے۔

غضب کی موت تھی اس خانماں برباد بھائی کی
کہ چند ہی روز پہلے اس مسافر کا تھا گھر اجڑا
دیا بوسہ لپٹ کر سر کو۔ آنسو آنکھ میں آئے
بصد منت بصد حسرت، بچشم نم یہ فرمایا
جدائی کی گھڑی آئی۔ یہ وقت موت سر پر ہے
میں اب دنیا سے جاتا ہوں خدا حافظ ہوا تیرا
یہ بےکس تین بچے چھوڑتا ہوں تیری شفقت پہ
یہ بن ماں باپ کے بچے نہ ماں ان کی نہ باپ ان کا
خدا کا واسطہ ان پر رحم کیجو۔ کرم کیجو
امانت ہے یہ بھائی کی۔ ذرا رکھیو خیال ان کا
فنا قائل ہوا کہہ کر۔ مقولہ رہ گیا باقی
مگر بچوں کی خدمت سچ تو یہ ہے کام ٹیڑھا تھا

سہرے کا پہلا شعر۔

چمک یاقوت سے افضل۔ دمک میں لعل سے بڑھ کر
زمرد اس پہ جھکیاں یہ ہے کس کان کا سہرا

اور آخری شعر ہے

دلہن دی چاند سی تم کو تو دولھا اس کو ہیرا سا
کہ رکھو یاد تم دونوں[۱] یہ پھوپی جان کا سہرا

ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب کا کام

ڈاکٹر سر محمد اقبال

مرحوم کی تجویز پر پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے علامہ مغفور

[۱] لڑکی دوسرے بھائی کی بیٹی ہے۔

سے اُردو نصاب کی پانچ یا آٹھ کتابوں کی زبان درست کروائی اور چند مضامین بھی لکھوائے تھے اُن سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم اور مولوی سید احمد دہلوی مغفور نے یہ کام کیا تھا مگر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے جو معاوضہ لیا تھا وہ بہت زیادہ تھا حالانکہ کام چند دنوں ہی کا تھا۔ ڈائرکٹر کوئی انگریز پارکن سن تھا۔ کاش اُن انگریزی خطوط کی نقل محفوظ رہ جاتی جو علامہ مغفور نے اس کے خطوط کے جواب میں لکھے تھے۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں یہ خط کتابت ہوئی تھی۔ میں نے خطوط کی نقل کرلی تھی مگر ۱۹۴۷ء کی ہجرت میں ضائع ہوگئے۔ انگریز ڈائرکٹر نے لکھا تھا کہ آپ نے معاوضہ بہت زیادہ لکھا ہے اس سے پہلے . . . کو یہ معاوضہ دیا گیا تھا، اور اس خط کا جواب یہ گیا تھا کہ میرے دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال بیچ میں ہیں اس لئے میں نے معاوضہ زیادہ نہیں لکھا۔ یہ جوابات بڑے دلچسپ تھے۔

دفتر کا کچھ کام میرے ذمّہ

۱۹۱۰ء میں میں نے میٹرک (انٹرنس) کیا اور ۱۹۱۲ء میں انٹر (ایف اے) کرلیا تو میرے منجھلے ماموں جان سردار بہادر کپتان مولوی حبیب الرحمٰن مرحوم سی آئی ای او بی ای وغیرہ نے والدہ مرحومہ کو لکھا کہ "رازق میاں کو شملہ بھیج دو انھیں سرکاری ملازمت مل جائے گی"۔ اس خط کو پڑھ کر والد مرحوم نے اماں جان سے فرمایا تھا۔

"ہمیں ملازمت نہیں کرانی"

مغرب کے بعد یعنی چراغ جلے پیچھے تو گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت تھی نہیں شملہ جانے اور پھر ملازمت کرنے کی اجازت کس طرح مل جاتی۔ کالج کی دلچسپیاں حالانکہ بہت تھیں اور میں تو کرکٹ کا کھلاڑی تھا اور سینٹ سٹیفنز کی کرکٹ ٹیم کا کپتان اور دلّی کے سارے کالجوں کے لڑکوں کے آپس کے جھگڑے چکاتا تھا مگر دفتر کا کچھ نہ کچھ کام ۱۹۱۶ء سے کر رہا تھا۔ حضرت والد مغفور عصمت کی ضرورت کے مطابق مضامین لکھوا دیتے ورنہ وہ مستقل تصانیف میں مصروف رہتے۔ مضمون نگاروں سے خط و کتابت بھی بالعموم میں کرتا۔ مضامین کے انتخاب میں بھی میرا کچھ دخل تھا۔ کاتب کو مضامین بھی میں دیتا اور کتابت شدہ کاپیاں کی تصحیح بھی اُلٹی سُلٹی کرتا اور پھر دفتر کے انتظام میں بھی حصہ لیتا تھا"

عصمت کے ۵۰ سال — عصمت جوبلی نمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۶۴

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۳ء تک جب میں دفتر کا کام کر رہا تھا میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور میرے اختیارات کچھ بھی نہ تھے عصمت کسی سال پابندیٔ وقت سے شائع ہوا کسی سال اشاعت میں بے قاعدگی رہی۔ کاغذ چھپائی بھی اُس زمانہ میں معیار کے مطابق نہ رہ سکی اور اشاعت ساڑھے بارہ سو سے آگے نہ بڑھی۔ علامہ مغفور کی تصانیف آدھی سے زیادہ اُسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں اس مصروفیت کی بنا پر وہ پرچہ کی شان قائم رکھنے پر توجہ نہ فرما سکے اور میری حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ تھی نہیں۔

ڈاک بنگلہ مالیرکوٹلہ کا واقعہ

"ریاست مالیرکوٹلہ مشرقی پنجاب میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کے والی نواب احمد علی خاں عصمت کو ڈھائی سو روپے سالانہ دیتے تھے۔ ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے علامہ مغفور مالیرکوٹلہ جانے لگے تو ان کے ایک بے تکلف دوست بھی ساتھ ہوگئے جو بڑی حیثیت کے تھے۔ ریاست کے وزیر سید عبداللہ مرحوم بھی رسالہ

کے فرمایا اور اشعار بھی کہتے تھے بہت معقول آدمی تھے۔ حضرت علامہ مغفور نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری شیخ بشیر حسن صاحب کے ہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ انھیں ذوقِ ادب تھا اور شعر بھی کہتے تھے۔ علامہ مغفور نے شیخ صاحب کے ہاں قیام کیا اور ان کے ساتھی نے ڈاک بنگلہ میں۔ دو دن قیام رہا اور ریاست سے دو سال کا چندہ پانسو روپیہ مل گیا۔ ڈاک بنگلہ آئے تو ان کے دوست نے شراب پینی شروع کر دی خانساماں کو معلوم ہوا کہ ان کو روپیہ ملا ہے تو اس نے شامی کبابوں میں دھتورہ ملا دیا۔ علامہ مغفور نے اپنے دوست کو ڈاک بنگلہ میں شراب پینے اور وہاں کچھ کھانے سے بہتیرا منع کیا وہ نہ مانے۔ خانساماں کی نظروں سے علامہ مغفور کو کچھ شبہ ہوا سو وہ دوسری طرف گیا ادہر انھیں ایک بلی نظر آئی۔ شامی کباب کا ٹکڑا اس کے آگے ڈال دیا بلی نے ٹکڑا کھا چند لمحے تو میاؤں میاؤں کی اور پھر غش ہو گئی۔ اب حضرت علامہ نے ۵ روپے خانساماں کو دے شہر سے کچھ لانے کی ہدایت کی۔ اِدہر اُس نے پیٹھ موڑی اور شہر کا رُخ کیا اُدھر انھوں نے اپنے دوست سے چلنے کو کہا مگر شراب اور دھتورہ کا کافی اثر تھا۔ اُنھوں نے اپنے دوست کا اور اپنا بستر ایک جگہ کیا اور ایک ہاتھ میں بستر لے دوسرے ہاتھ سے اپنے دوست کو گھسیٹتے ہوئے دوسرے دروازہ سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے۔ جو کوئی پاؤ میل دُور تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ تب جان میں جان آئی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد خانساماں دو مشٹنڈے ساتھیوں کو لے کر اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ مگر وہاں کیا کر سکتا تھا۔ دانت پیستا اور خون کے گھونٹ پیتا رہ گیا کہ آیا ہوا شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

عصمت کے ۵ سال ـــ عصمت جوبلی نمبر ۱۹۳۸ء

عصمت ایک ڈبو کی بنیاد

والدۂ مرحومہ مجھے دو آنہ اور پھر ڈھائی آنہ روز جیب خرچ دیتی تھیں ۱۹۰۷ء میں جب میں دسویں جماعت میں پہنچ گیا یعنی میٹرک میں جو اس وقت انٹرنس کہلاتا تھا تو تین آنے روز کے حساب سے چھ روپے ماہوار مقرر ہوئے۔ لیکن ایک ایک روپیہ کر کے والدۂ مرحومہ نہیں والد مغفور دینے لگے۔ بچوں کے ہاتھ میں اکھٹے روپے یوں بھی نہیں دئے جاتے تھے اور پھر جبکہ کوئی بندھی ہوئی ماہوار نہ تھی بلکہ روزانہ ڈاک آتی تھی تو اکھٹے کا سوال ہی نہ تھا۔ والدۂ مرحومہ کے ذمہ جب تک میرا جیب خرچ تھا روزانہ پیسے ملتے تھے اور کبھی کبھی پیشگی بھی۔ مگر والد مغفور کے ذمہ جب ہوا تو پانچویں چھٹے روز ایک روپیہ ملنے لگا۔ کبھی ایک ہفتہ گذر جاتا کسی مہینہ میں بجائے چھ کے پانچ ملتے۔ کبھی چار۔ اِس طرح چھ روپیہ ابا جان کے ذمہ ہو گئے۔

تاجرانِ کُتب مجھ سے کہتے تھے اور میں خود بھی کچھ کچھ سمجھتا تھا کہ یہ جو ابا جان کتابیں لکھ لکھ کر دوسروں کو دے رہے ہیں اگر خود چھپوائیں تو مالی فائدہ ہوگا۔ جس کا جی چاہتا راگ پٹی دے اُلٹی سیدھی باتیں بنا تھوڑے سے دام بھر ایک چھوٹی سی کتاب لکھوا ہمیشہ کے لئے اس کے حقوق لے لیتا۔ کوئی کہتا یہ سو روپیہ کی پہنچیاں بیچ کر لایا ہوں۔ کوئی اپنے بیٹے کے لئے چند مضامین کے حقوق خریدتا۔ تو لکھتا کہ برخوردار نے جیب خرچ میں سے یہ بیاسی روپیہ سوا چھ آنے جمع کئے ہیں۔ قبول فرما کر اُس کا دل رکھ لیجئے۔ لحاظ مُروّت کا یہ عالم تھا

کر انکار نہ فرماتے۔ میں دیکھتا تھا اور کھولتا تھا مگر دَم نہ مار سکتا تھا۔ ڈاک کسی دِن میرے ہاتھ میں آتی اور اُس میں کسی تاجر یا ناشر کا خط ہوتا کہ ہمارے لئے ایک کتاب لکھ دیجئے تو میں وہ خط پھاڑ ڈالتا۔ مگر جب لوگ اُن سے ملنے آتے اور زبانی درخواست کرتے تو میں خون کے سے گھونٹ پی کر چُپکا ہو جاتا تھا۔ میں نے دو تین دفعہ بڑی ہمت کر کے عرض کیا تو فرمانے لگے کُتب فروشی ہمیں نہیں کرنی یہ دردسری ہمارے بس کی نہیں۔

مگر جب میرے چھ روپیہ اُن کے پاس جمع ہو گئے تو میں نے ۱۹ء ہی میں اُن کی تین چار کتابوں شامِ زندگی الزہرا وغیرہ کا عِصمت میں اشتہار دے دیا۔ اور جب فرمائشیں آئیں تو والد مرحوم سے پیسے لے کر واحدی صاحب سے کتابیں خرید کر فرمائشوں کی تعمیل کر دی مجھے تاجرانہ کمیشن ۳۳ فیصدی ملتا تھا یعنی ۳ روپیہ کی کتابیں دو روپیہ میں اس طرح جو روپیہ آتا وہ اماں جان کے پاس جمع ہوتا تھا اکتوبر ۱۹ء میں جب ابا جان کو معلوم ہوا کہ اماں جان کے پاس میرے بیاسی روپیہ جمع ہو گئے ہیں تو اُنھوں نے شبِ زندگی حصہ اوّل کا پہلا باب لکھا اور رسالہ میں کتاب کا اعلان بھی نومبر میں کر دیا گیا۔ لیکن وہ بعض اوقات دُو دو تین تین کتابیں ساتھ ساتھ لکھتے۔ صبح کو اور دوپہر کو اور رات کو کوئی اور۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک کتاب لکھ رہے ہیں کہ کسی خاص موضوع پر ناول کی فرمائش ہوئی اور حقِ تصنیف کے پیشگی روپیہ بھیج آ گئے تو اُنھوں نے پہلی کتاب چھوڑ کر یہ دوسری کتاب لکھ ڈالی مجھے خیال یہ ہوا کہ جو کتاب میرے لئے لکھ رہے ہیں کہیں کوئی اور صاحب اِس پر ہاتھ صاف نہ کر دیں اِس لئے میں مسودہ اپنے بکس میں مقفل رکھتا جو صفحے لکھے وہ مجھے دیتے جاتے تھے ڈیڑھ سو روپیہ کی کتاب آج ۱۹ء میں تقریباً سات سو روپیہ میں چھپتی ہے ٹائیٹل کے ڈیزائن بلاک جلد سازی اور پھر ڈسٹری بیوشن میں کوئی تین سو روپیہ کے قریب اُٹھ جاتے ہیں۔ اُس زمانہ میں سولہ سو روپیہ میں سفید کاغذ پر ایک ہزار نسخے ایک روپیہ قیمت کی کتاب کے چھپ جاتے تھے۔ جب میرے پاس اُن کی تصانیف کی فروخت کے کمیشن سے سوا سو روپیہ جمع ہو گئے تو انھوں نے شبِ زندگی حصہ اوّل مکمل کر کے میرے حوالے کیا۔

جولائی ۱۹ء میں کتاب کا اعلان ہوا اور دو مہینہ میں پہلا ایڈیشن نکل گیا تقریباً سات سو جلدیں تو تاجران کتب ہی نے خرید لیں یہ کتاب شائع کر کے میں ۷۰۰ روپیہ سے زیادہ کا مالک تھا۔ جو والدہ مرحومہ کے پاس جمع تھے اب میں نے والد مرحوم کے مختصر افسانے وغیرہ جمع کرنے شروع کئے سودائے قفس (نظموں کا مجموعہ) اور جوہرِ عصمت (تین افسانوں کا مجموعہ) شائع کیا۔ فروری ۱۹۲۳ء میں میری شادی ہوئی تو خاتون اکرم مرحومہ کی رُونمائی میں اُنھوں نے شبِ زندگی حصہ دوم دیا۔ حیدر آباد دکن میں ایک تاجر کتب تھے۔ مولوی محمد ابراہیم مرحوم جنھوں نے بعد میں مکتبہ ابراہیمیہ قائم کیا تھا۔ پریس سے آتے ہی ہر نئی تصنیف کے ۵۰۰ نسخے تو صرف وہی منگا لیتے تھے۔ ۱۹ء میں چھ کتابوں کا اضافہ ہوا اور پھر تو ہر سال ۱۰۔۱۲ نئی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ۱۹ء میں پونے دو سو مطبوعاتِ عصمت بکڈپو کی تھیں۔ ۱۹ء کے چھ روپیہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسی برکت دی کہ اپریل ۱۹ء میں ایک لاکھ بارہ ہزار روپیہ کی مطبوعاتِ عصمت تھیں "

عِصمت کے ۵۰ سال ______

عِصمت جوبلی نمبر ۱۹ء

اُس زمانہ کی معاشرتی اور سیاسی تحریکیں

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنی لڑکی کی شادی کی تو جہیز کی مخالفت میں مضمون تحریر فرمایا اور اپنے رسالہ استانی میں لکھا کہ

"مسلمانوں کی مفلسی کا علاج یہ ہے کہ ایک کپڑے کی دھجی اور ایک تلنے کا تار بھی لڑکیوں کو جہیز میں نہ دیا جائے"

بنگال کے جگر خراش واقعات اور جہیز کی بدولت لڑکیوں کے ستی ہونے اور رسوم کی پابندی کے دردناک نتائج محسن نسواں کو خوب اچھی طرح معلوم تھے مگر لڑکیوں کو بالکل ہی جہیز نہ دینے کی علامہ مغفور نے مخالفت کی اس لئے کہ

"مسلمانوں میں جہیز رسم میں داخل نہیں۔ اسوۂ رسول ہے۔ خواہ وہ ایک تنکا ہی تھا مگر حضور اکرم نے جناب سیدہ کو جہیز دیا تھا"

خلع کی حمایت اور رواج کے خلاف شریعت کے مطابق لڑکیوں کے ترکہ پدری کے متعلق اس زمانہ کی متعدد تصانیف میں علامہ مغفور نے جہاد کیا تھا اور عصمت میں بھی بہت موثر مضامین لکھے اور شائع کئے تھے۔

۱۹۱۹ء میں گاندھی جی گرفتار ہوئے۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے بے گناہوں پر گولی چلوائی اور انسانوں کو جانوروں کی طرح پیٹ کے بل چلوا کر انگریزوں کے اُن بے پناہ مظالم کی یاد پھر سے تازہ کر دی جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بے گناہ نہتے مسلمانوں پر انتہائی سنگدلی اور بے دردی سے توڑے گئے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے بھائی شوکت علی پانچ سال کی نظر بندی کے بعد رہا ہوئے تو کانگریس میں شرکت کی۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ حکومت برطانیہ نے مسلمانوں سے جو وعدے کئے تھے ان سب سے پھر گئی اور دوسری مغربی طاقتوں کے اتحاد سے جزیرۃ العرب کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے شروع کر دیے۔ مسلمانوں کا دل انگریزوں کی بدعہدی اور وعدہ خلافی سے کھٹا ہو گیا اور وہ بھی کانگریس میں شریک ہوئے۔ حکومت سے عدم تعاون کی تحریک سارے ملک میں پھیلی تو مسلمانوں نے سرگرمی سے اس میں حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں ملک کی بنی ہوئی چیزوں بالخصوص سودیشی کپڑے کے استعمال کی تحریک نے بہت زور پکڑا۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں نے عظیم ترکی سلطنت کی بچی کھچی مملکت کو بالکل ہی نیست و نابود کر دینے کے لئے اُس پر یونان سے حملہ کروایا۔ اور شمالی افریقہ میں ریفی لیڈر عبدالکریم نے فرانس اور اسپین کے مظالم کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔

عصمت کے ۵۰ سال ——— (عصمت جوبلی نمبر [illegible])

علامہ مغفور باوجودیکہ سیاسی آدمی نہ تھے مگر اُن کا دل اسلام کے درد سے لبریز تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بالکل خاموش رہتے۔ انھوں نے عصمت ہی میں نہیں دوسرے پرچوں میں بھی مضامین اور افسانے اپنے نام سے بھی لکھے اور دوسرے ناموں سے بھی۔ ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا عکس "سیاہ داغ" "کلونتیاں" "صدائے دلگداز وغیرہ" میں آج بھی نظر آ رہا ہے۔ عربوں اور ترکوں پر جو ظلم و ستم ڈھایا گیا اس پر وہ تڑپ تڑپ اُٹھے اور انھوں نے ایسے ایسے دردانگیز مضامین لکھے کہ پڑھنے والے آج بھی تڑپ جائیں گے۔ یہ مضامین اور

افسانے اکٹھے کر کے میں نے "شہید مغرب" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیے تھے۔

پہاڑ والی خالہ کی دُعا

حضرت والد مرحوم کی چار خالائیں تھیں اور دادی اماں سے دو سال چھوٹی خالہ "پہاڑ والی" کہلاتی تھیں کیونکہ اپنے شوہر کے ساتھ ان کے کئی سال چکرونہ پہاڑ پر گذرے تھے۔ ان کا "چوکیوں والا" مکان آغا جان کے چھتہ کا سب سے بڑا مکان تھا۔ اور اس کے سامنے آٹھ دس قدم دائیں طرف وہ مسجد تھی جس میں جمعرات جمعہ کی درمیانی شب ایک زمانہ میں علامہ مغفور نے وعظ کہا تھا اور اُن کی خالہ اماں کو اپنے بھانجہ کا وعظ سُننے کا کئی بار موقع ملا تھا۔ اور وہ بھانجہ کو ایک بڑا عالم سمجھ کر سنجیدگی سے کوئی مسئلہ دریافت کرتیں تو ہنسی مذاق میں علامہ مغفور جواب دیا کرتے تھے۔ چھیڑ خانی تو اُن کی طبیعت میں تھی ہی۔ اُن کے ہاں جاتے تو چھیڑنے کے لئے کوئی ایسی بات چھیڑ دیتے کہ وہ خفا ہونے لگتیں اور پھر نہایت ادب کے ساتھ وہ خفگی سنتے اور مُسکراتے۔ خالہ کی خفگی کا لطف اُٹھاتے اور ہنستے۔

دادی اماں کے انتقال کے سات آٹھ سال بعد پہاڑ والی خالہ اماں کا آخر وقت آیا تو اُن کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ اپنے وارثوں کے لئے اپنے پیچھے ہزاروں کی جائیداد اور نقد روپیہ چھوڑ رہی تھیں۔ آبا جان کو جب یہ معلوم ہوا کہ اُن کی حالت نازک ہوگئی ہے اور کوئی اُن پر ایک پیسہ اُٹھانے اور طبیب کو بُلانے کا روادار نہیں تو خود گئے۔ اور جو کچھ ہو سکا اُن کی خدمت کی طبیب کو دکھایا اور خود دوا لائے اور رات رات بھر اُن کے پاس بیٹھے۔ آخری بار جب نلکی کی مدد سے اباجان نے انھیں شربت پلایا تو ان کی آنکھوں میں آ[illegible] آگئے اور انھوں نے فرمایا: "ابی میاں مجھے یہ معلوم تھا کہ تیرے دل میں خدا کا خوف اس قدر ہے۔ اللہ [illegible] ہمیشہ خوش رکھے اور تیری عزت بڑھائے۔"

تصانیف پر اعتراض اور مقبولیت

علامہ مغفور کو [illegible] حسد کی آگ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ دُور رکھا۔ انتہا امن پسند طبیعت تھی۔ بحیثیت اڈیٹر اُن کے قلم نے کـ[illegible] کی دل آزاری نہیں کی۔ وہ کبھی کسی سے اُلجھے ہی نہیں [illegible] اصولی اختلاف دوسری چیز ہے جیسے خواجہ حسن نظا[illegible] مرحوم کی تجویز جہیز نہ دینے کی اُنھوں نے مخالفت کی مسلم لیڈرز کانفرنس کے تعدد ازدواج کے خلاف تجو[illegible] پاس کرنے کی مگر بغض للہی کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں۔

عصمت اور علامہ مغفور کی تصانیف کی مقبولیـ[illegible] ایک ہم عصر کے دل میں پھانس کی طرح مدتوں سے بُر[illegible] طرح کھٹک رہی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں اس نے اصلی یا فر[illegible] مضمون نگاروں کی طرف سے علامہ مغفور کی تصانیف [illegible] خلاف مسلسل مضامین شائع کئے۔ جس نیت سے [illegible] مضامین لکھے گئے تھے اس کا خیال آج بھی میرے لئے سخ[illegible] تکلیف دہ ہے۔ علامہ مغفور نے اُن مضامین کو اُس وق[illegible] بھی کوئی اہمیت نہ دی اور میں اِس وقت بھی اِس بار[illegible] میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا کہ وہ پرچہ بھی برسوں گذر[illegible] بند ہو چکا اور اس کے اڈیٹر بھی اب دنیا میں موجود نہیں [illegible] اور اب گڑے مُردے اُکھاڑنے سے فائدہ کیا!

علامہ مغفور کی تصانیف کے خلاف جو زہر پھیلا[illegible] جا رہا تھا اس کا جواب عصمت کی ایک مضمون نگا[illegible]

ہر سطح پر حسن کا نمونہ اس طرح دیا تھا۔

"حق یہ ہے کہ علامہ راشد الخیری کی تصانیف نے مظلوم عورتوں کے واسطے آبِ حیات کا کام کیا ہے۔ اگر یہ کتابیں نہ ہوتیں تو نہ معلوم بدنصیب لڑکیاں اسلام کے ساتھ کیا کچھ کر بیٹھتیں۔ میرا چونکہ یہ ایمان ہے میں نماز فجر کے بعد پہلے کلام اللہ اور پھر علامہ مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ کرتی ہوں" (عصمت ۱۹۳۱ء)

اور علامہ مغفور نے اپنی تصانیف کے بارے میں بعنوان "میں اور میری تصانیف" تحریر فرمایا تھا۔

"اب میں وہ تمام مراحل طے کر چکا ہوں۔ جب ایک مصنف تعریف سے خوش اور اعتراض سے ناخوش ہو سکتا ہے۔ میں نے جس طرح معترضین کی تحریر پڑھی اسی طرح موافقین کی۔ تصنیف کے بعد ایک کامیاب مصنف کی جو توقعات ہو سکتی ہیں وہ میری اچھی طرح پوری ہو گئیں۔ اور میرا یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ شاید اس پوری صدی میں بھی مشکل سے کوئی ایسا مصنف سرزمین ہندوستان میں پیدا ہوا ہو جس کی معمولی نہیں ضخیم کتابیں ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں اس کی آنکھوں کے سامنے دس دس بارہ بارہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی ہوں۔ ایک کتاب شائع ہوتی ہے دوسری ختم۔ تیسری تیار ہوتی ہے چوتھی ختم۔ تماشے اُن کے بنے۔ امتحانوں میں یہ داخل کی گئیں ترجمے اُن کے ہوئے۔ دستور العمل یہ قرار دی گئیں۔ المختصر قبولیت کی انتہا ہو یا عمر کا تقاضہ اب طبیعت تعریف سے اس قدر سیر ہو چکی ہے کہ اعتراض اور تعریف دونوں برابر ہیں" (عصمت اکتوبر ۱۹۳۱ء)

جب میں کالج میں تھا انٹرنس کرنے کے بعد میں علی گڑھ جانا چاہتا تھا مگر حالات نے اجازت نہ دی تو کیا ۴۰۰-۵۰۰ روپیہ کی یکمشت رقم ہر ماہ وقت طلب تھی یا میرے علی گڑھ جانے سے جو تھوڑا بہت کام دفتر عصمت کا ہو رہا تھا وہ بھی چوپٹ ہو جاتا؟ نہیں اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت والد مغفور اپنے بچوں کو اپنی آنکھ سے اوجھل کرنا پسند نہ فرماتے تھے اُس زمانہ میں دلی میں صرف تین کالج تھے۔ سینٹ سٹیفنز۔ ہندو اور رامجس۔ تعلیم اور کھیل دونوں کے اعتبار سے سینٹ سٹیفنز بہتر تھا اور حیثیت دار گھرانوں کے اکثر شرفا اُس میں پڑھتے تھے۔ مغربی اداروں کی تعلیم والد مغفور کو ناپسند تھی تاہم میں اُسی میں داخل ہوا۔ کالج کھلنے کے بعد پڑھائی شروع ہوئی تو مجھے بخار آ رہا تھا ایک ہفتہ بعد کالج گیا تو جماعت میں مسلمان لڑکے ایک چوتھائی کے قریب تھے۔ چار پانچ عیسائی دو سکھ اور باقی سب ہندو۔ پہلی دفعہ دیکھا کہ اکثر لڑکے ننگے سر ہیں۔ ایک تہائی سے زیادہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے۔ اور تقریباً اُتنے ہی لڑکوں کے عینک لگی ہوئی۔ یہاں ہمیشہ چار پیسے کی پنسل سے لکھا اور وہاں اکثر و بیشتر کے پاس فاؤنٹن پن۔ فضا نامانوس تھی مگر جلد ہی نہ صرف جماعت کے بلکہ سینیئر لڑکوں سے بھی گھل مل گیا۔ اُس زمانہ میں حکومت سے ترکِ موالات کا بہت زور تھا نہ صرف سرکاری ملازمتیں چھوڑی جا رہی تھیں بلکہ اُن کالجوں کا بھی مقاطعہ کیا جا رہا تھا جن پر حکومت کا پورا اثر تھا۔ رتی رام کٹڑ کانگریسی تھے اور لڑکوں کو کالج چھوڑنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ مسلمان لڑکوں پر میرا خاصہ اثر تھا اور آئے دن رتی رام سے میری جھک جھک ہوتی تھی۔ ایک دن خوب رام ہوسٹل میں جہاں رتی رام بحیثیت بورڈر رہتے تھے۔

میٹنگ ہوئی اور میں نے اُن کی تجویز کی مخالفت کی۔ جو مسلمان لڑکے وہاں موجود تھے وہ سب میرے ہمنوا ہو گئے۔ والد مغفور سے میں نے ذکر کیا تو اُنھوں نے فرمایا۔

"حُبِ وطنی تو بڑی اچھی چیز ہے مگر تم یہ غور کرو کہ ترکِ موالات سے بحیثیت قوم مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ اور کیا سرکاری نوکریاں چھوڑ دینے اور کالجوں کے مقاطع سے مسلمانوں کی حالت بہتر ہو جائے گی فرض کرو ملک آزاد بھی ہو گیا تو کیا مسلمانوں کی جو حالت اس وقت ہے اُس سے بہتر ہو گی جبکہ ہندو اکثریت میں ہیں اور تعلیمی تجارتی مالی حیثیت سے مسلمانوں سے کہیں بہتر اور برتر۔ تم ان باتوں میں نہ پڑو۔ پڑھنے سے کام رکھو۔ ہاں تقریریں سُننے تم جلسوں میں جاتے ہو جاؤ مگر الگ تھلگ رہو۔ کسی چیز میں عملی حصہ نہ لو"

رتی رام نے چند روز بعد کالج چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ آٹھ دس ہندو لڑکوں نے بھی۔ مسلمانوں میں صرف دو لڑکوں نے مقاطع کیا۔ عبدالستار اور عبدالعلی نے مولوی عبدالستار صاحب برسوں حیدرآباد دکن میں رہے اور کسی کالج میں اُردو پڑھاتے رہے مولوی عبدالعلی ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے سکریٹری ہو گئے تھے پھر مولوی عبدالحق مرحوم کے۔ رتی رام سوامی شردھانند کے خاص چیلے تھے اور لالہ دیش بندھو گپتا کے نام سے بہت شہرت پائی۔ اخبار تیج کے اڈیٹر تھے اور آخر میں اسمبلی کے ممبر بھی ہو گئے تھے جب ملاقات ہوتی تپاک سے ملتے آخری ملاقات مسٹر آصف علی بیرسٹر مرحوم کے مکان پر ہوئی تھی۔ افسوس ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ وہ متعصب ہندو اور اپنے اصولوں کے بہت سخت مگر اچھے دوست تھے۔

ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی دھرم پال گپتا وفا اخبار تیج کے اڈیٹر ہوئے۔ ان سے بھی راہ و رسم تھی۔ اخبار تیج کے کرشن نمبر کے لئے والد مغفور سے مضمون لکھوانے کے لئے یہ دو تین مرتبہ تشریف لائے تھے۔

سیکنڈ ایر کا ٹسٹ ہوا تو میں چار میں سے تین مضمونوں میں فیل تھا پرنسپل رُودرا نے بلایا اور کہا کیا بات ہے تم نے اس کالج میں پہلا امتحان دیا تو چاروں مضمونوں میں پاس تھے فرسٹ ایر کے امتحان میں دو مضمونوں میں اور اب سوائے ایک کے سب مضمونوں میں فیل ہو۔ اس نتیجہ کو سامنے رکھ کر میں تمھیں روک لوں اور تمھارا نام یونیورسٹی نہ بھیجا جائے تو تم مجھ سے شکایت نہیں کر سکتے۔ میں نے عرض کیا " ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا میرے والد مجھ سے سخت ناراض ہو جائیں گے " انھوں نے والد کا نام پوچھا اور میں نے بتایا تو کہنے لگے " ہاں ہاں میں نے نام سُنا ہے تم ان کے بیٹے ہو اور مولوی نذیر احمد سے بھی تو تمھارا رشتہ ہے " میں نے بتایا تو کہا تو پھر اور بھی افسوس کی بات ہے کہ کس خاندان کے ہو اور نتیجہ اس قدر خراب " میں نے کہا میں روز کرکٹ کھیلنے آتا ہوں اور کوئی ادبی میٹنگ ایسی نہیں ہوتی جس میں شریک نہ ہوتا ہوں اب میں پڑھنا شروع کر دوں گا۔ آپ میرا نام بھیج دیجئے میں انشاءاللہ پاس ہو جاؤں گا " کہنے لگے۔ " اچھا میں تمھیں نہیں روکتا تمھاری زبان پر بھروسہ کرتا ہوں مجھے امید ہے تمھاری ناکامی سے کالج کی بدنامی نہ ہوگی " میں شکریہ ادا کر کے چلا آیا اور گھر آ کر والد مرحوم سے یہ گفتگو دہرائی اُنھوں نے فرمایا۔

"تمھارے پرنسپل نے جس اعتماد پر تمھارا نام بھیجنے کا وعدہ کیا ہے مجھے امید ہے تم اُسے مجروح نہ کرو گے"

امتحان میں صرف چھ مہینے باقی تھے اب جو دل لگا کر پڑھا تو بارہ تیرہ چودہ چودہ گھنٹے روز محنت کی۔ نتیجہ آیا تو بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا۔ ۴ نمبر اور آجاتے تو فرسٹ ڈویژن تھی۔

بی اے میں پہنچا تو والد مرحوم بہت خوش تھے راشدی صاحب کا بیان ہے کہ مولوی صاحب کو تمہارے بی اے میں پہنچنے سے بہت خوشی ہوئی تھی ایک دن کہنے لگے اب دو سال بعد رازق میاں بی اے کرلیں گے۔

تھرڈ ایر (بی اے پہلا سال) کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ کمرہ میں ٹہل ٹہل کر فلسفہ کی کتاب سمجھ رہا تھا نیچے دیوار پر پرچھائیں پڑ رہی تھی۔ والدہ ماجدہ کی آنکھ کھل گئی ہاتھوں سے پڑھنے کے دوران میں اشارے کر رہا تھا۔ کبھی ہاتھ جھٹک کبھی سر کے پاس لے جاتا۔ والدہ مرحومہ نے گھبرا کر والد مغفور کو جگایا کہ دیکھو تو سہی رازق میاں یہ کیا کر رہے ہیں کہیں ان کے دماغ پر کچھ نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا "کچھ نہیں پڑھ رہے ہیں اور کیا۔ سو جاؤ۔ خواہ مخواہ میری نیند خراب کی۔"

سنہ ۲۳ء میں کالج کے ہنگاموں میں دلچسپی بہت بڑھ گئی پروفیسر سی بی ینگ انگریزی کے بہت قابل استاد تھے ان کا لیکچر ہوتا تو اکثر بجائے غور سے سننے اور سمجھنے کے کرکٹ میچ میں جن لڑکوں کو کھلانا ہوتا ان کی فہرست بنائی جاتی۔ کرنل سی ایچ سی شارپ کی میم صاحب نفسیات پر پروفیسر سین اخلاقیات پر لیکچر دیتے تو میں کرکٹ پر رنجی کی کتاب کا کبھی کبھی مطالعہ کرتا ہوتا۔ کرکٹ کپتان گیمس سکریٹری اور اردو انجمن مسلم ایسوسی ایشن کا سکریٹری ایک ساتھ تین تین عہدے میرے پاس تھے۔

جب اسکول میں تھا تو بعد مغرب گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ بی اے میں پہنچا تو اجازت ملی کہ جاڑوں میں ساڑھے چھ اور گرمیوں میں ۸ بجے تک گھر سے باہر رہ سکتا تھا۔

ایک دن میں والدہ کو اطلاع نہ دے سکا اور واپسی میں دیر ہو گئی۔ محلہ ہی میں فارسی کے استاد ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب مرحوم رہتے تھے وہ ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ سوا آٹھ بج گئے تو حضرت والد مغفور ان کے ہاں پہنچے اور تشویش ظاہر کی کہ رازق میاں ابھی تک گھر نہیں آئے انھوں نے کہا آج ایسوسی ایشن کا جلسہ ہے۔ مجھے بھی جانا تھا کہ میں صدر ہوں مگر بخار ہو گیا اس لئے نہیں گیا۔ وہ سکریٹری ہیں ان کی شرکت ضروری ہے کرکٹ کے بعد میدان سے وہ سیدھے کالج چلے گئے ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں گھر آجائیں گے۔ نو بجے میں گھر آیا تو والدہ معظمہ نے فرمایا تم نے اطلاع بھی نہیں کی کہ دیر میں آؤ گے۔ مجھے یاد آیا کہ کہنا بھول گیا تھا۔ سخت ندامت ہوئی۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی کا لیکچر ختم ہوا کہا۔ "اس جماعت میں ایک بچہ پڑھتا ہے۔ کل اسے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی تو اس کے ابا ڈھونڈتے پھرے۔ بھلا بتاؤ وہ کون ہے" لڑکے تو کیا بتاتے اور کس کو بتاتے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ڈاکٹر صاحب نے کہا "اچھا وہ صاحب خود ہی کھڑے ہو جائیں" ابا جان کا شب گزشتہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں جانے کا مجھے بالکل علم نہ تھا مگر یہ سنتے ہی میں کھڑا ہوا تو لڑکے ہنسنے لگے استاد نے طلبا سے کہا یہ بڑا خوش نصیب لڑکا ہے جس کے باپ کو بیٹے کا اتنا خیال ہے اور باپ بھی وہ جس کی تحریر کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بج رہا ہے اور پھر انھوں نے بتایا کہ مصور غم نے خواتین کی اور اردو ادب کی کس قدر گراں بہا خدمت کی ہے۔

ایک دوست نے جو عربک اسکول میں ہم جماعت تھے ہم دس بارہ لڑکوں کی دعوت کی۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور بہت سی دولت ہاتھ لگی تھی ۔ روشن آرا باغ کے قریب کوٹھی تھی۔ بہت پُرتکلف کھانا کھلایا اس کے بعد جلسہ تھا۔ جس کا مطلب تھا طوائف کا ناچ گانا۔ تھیٹر میں ناچ کئی بار دیکھا تھا مگر دور سے۔ اس قدر قریب سے گاتے ناچنے والی کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا ایک صاحب نے سمجھا ہی دیا تھا جو وہ بار بار ناچتی ہوئی میرے قریب آ جاتی تھی۔ مجھے پسینے چھوٹ گئے۔ سخت پریشانی میں مبتلا تھا کہ کہاں آن پھنسا۔ کسی بہانہ سے اٹھ کر کوٹھی کے دوسرے دروازہ سے نکل بھاگ بھاگ گھر پہنچا والد مغفور جاگ رہے تھے۔ چونکہ والدہ سے کہہ کر گیا تھا دیر میں آنے پر باز پرس نہیں کی۔ دوسرے دن شام کو دو لڑکے آئے گنڈی کھٹکھٹائی تو والد مغفور خود باہر آ گئے۔ دونوں کو پہچانتے تھے فرمانے لگے آپ بھی تو کل شام کو دعوت میں گئے ہوں گے۔ انھوں نے کہا جی ہاں "کب تک وہاں رہے" ایک لڑکے نے کہا۔ "دس بجے تک مگر رازق صاحب تو بھاگ آئے تھے" دریافت کیا "کیوں" ان حضرت نے کہہ دیا "ناچ تھا" اتنے میں میں بھی آگیا۔

دوسرے بھی نہیں تیسرے دن پاس بٹھا کر جو کچھ فرمایا مفہوم اس کا یہ ہے۔

"طوائف کے ہاں جا کر یا گھر پر بلا کر ناچ گانا سننا بات ایک ہی ہے۔ آج جس کا ناچ اور گانا اچھا معلوم ہوا کل وہ خود اچھی معلوم ہونے لگے گی تعلقات بڑھیں گے۔ نتیجہ یہ کہ ایک طرف نہایت شرمناک مہلک جسمانی بیماریوں میں جن کا نام بھی کسی شریف آدمی کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ گرفتاری اور دوسری طرف روح کی اس گندگی اور غلاظت سے آلودگی۔ مجھے اس بارے میں تو کچھ نہیں کہنا کہ تم اب اپنے برے بھلے کو خوب اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہنا صرف یہ ہے کہ تم نے اس دعوت کا مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا۔"

میرے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ ندامت سے گردن جھکی ہوئی تھی فرمایا۔

"اچھوں میں بیٹھو چباؤ ناگر پان۔ بروں میں بیٹھو کٹاؤ ناک اور کان"

والدہ معظمہ نے فرمایا "اسے کیا معلوم تھا کہ وہاں رنڈی کا ناچ ہوگا"

فرمایا مگر یہ تو معلوم تھا کہ جس نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا دونوں ہاتھوں سے باپ دادا کی کمائی لٹا رہا اور اپنی زندگی برباد کر رہا ہے وہ ملنے کے قابل نہیں۔ کیا خورشید کے واقعات ان کے کان تک نہیں پہنچے۔ لاکھ کا گھر راکھ ہوگیا۔ اسی صحبتِ بد کی بدولت۔

سلسلہ وعظ کا دوسرا دور | پھوپی اماں کی بیٹی آپا مریم بیگم تھیں تو بھاجی

لیکن ابا جان کو ان سے بیٹیوں کی سی محبت تھی۔ گنگا پور سٹی اسٹیشن پر آپا رہتی تھیں اور قصبہ میں آپا مریم مرحومہ جہاں ان کے شوہر منشی مبارک علی ریکارڈ نویس تعلقات میں تھے۔ گنگا پور پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنی بھاجی کے پاس ابا جان جاتے تھے۔ اسٹیشن سے ان کے گھر کا فاصلہ ڈیڑھ میل کے قریب تھا اور راستہ بھی کچا مگر وہ پیدل خوش خوش جایا کرتے تھے آپا مریم نے منت مانی تھی کہ میری لڑکی بارہ سال کی ہوگی تو بھائی کا وعظ کہلواؤں گی (پھوپی اماں ابا جان کو بھائی کہتی تھی آپا مریم بھی بجائے

ون کہنے کے بعد ہی کہا کرتی تھی) جب ان کی لڑکی
سال کی ہو گئی تو انھوں نے بڑے چاؤ سے سالگرہ
تیاری کی اور ابا جان سے وعظ کہنے کی درخواست کی
نھوں نے فرمایا: یہ شرط ہے کہ آپ کسی مولوی کو بلا لو ۔
امر یہ نے کہا میں نے تو آپ کے وعظ کی منت مانی ہے۔
جان نے فرمایا مجھے وعظ چھوڑے ہوئے دس گیارہ سال
ہو گئے ۔ میں اب وعظ نہیں کہتا۔ دلی سے جس مولوی کو
کہیں بلائے دیتا ہوں۔ مگر وہ برابر اصرار کرتی گئیں کہ
ہیں وعظ تو آپ ہی کا ہو گا میں نے منت آپ کے وعظ
کی مانی تھی۔ آخر کار ابا جان نے وعظ کہا۔ اُس دن سے
گنگا پور شگر کا ریلوے اسٹیشن میری چھٹیوں کا انتظار کیا کرتا
تھا کہ کب کالج بند ہو اور کب مولوی صاحب گنگا پور آئیں۔
ہر ایک کی خواہش یہی رہتی تھی کہ آج ہمارے ہاں وعظ
فرمائیں ۔ آج ہمارے ہاں آئیں۔

وعظ کہنے کا یہ دوسرا دور غالباً [illegible] میں شروع
ہوا تھا۔ قصبہ گنگا پور میں تو پھر کوئی وعظ نہیں کیا ہاں ریلوے
کوارٹروں میں ہفتہ میں دو تین وعظ عشا کی نماز کے بعد
ہو جاتے تھے۔ اور گھڑی دیکھ کر صرف ایک گھنٹہ بیان فرمایا
کرتے تھے۔ علامہ مغفور کے مواعظ سے اس قصبہ کی مسجد
تعمیر ہونے اور اس کے ساتھ مدرسہ چلنے میں بہت بڑی مدد
ملی تھی۔

اپنا شرعی حصہ نہیں لیا

علامہ مغفور کو جائیداد ددھیال سے ملی نہ ننھیال
سے۔ آٹھ نو سال کے تھے کہ اُن کے والد کا حیدر آباد دکن میں
انتقال ہو گیا۔ اُن کے دادا مولوی عبدالقادر صاحب کے
متعلق "حیات النذیر" کے مؤلف مولوی افتخار عالم لکھتے ہیں۔
"دہلی کے اعلیٰ رؤسا میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔" اُن کی بہت
کافی جائیداد تھی۔ جس مکان میں اُن کی رہائش تھی بہت
بڑا تھا اور وہ اُن کے چچیرے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد صاحب کو
ملا قریب ہی ایک چھوٹا سا مکان جامود والا کہلاتا تھا
مولوی عبدالقادر صاحب چاہتے تھے کہ نذیر پوتے کو دے دیں
مگر اُن کے چچا نے وہ بھی اپنے پاس ہی رکھا چونکہ باپ کا
انتقال دادا کے سامنے ہو گیا تھا اس لئے شرعاً وہ دادا کی
جائیداد میں حصہ دار نہ رہے تھے۔ چار خالائیں تھیں جن میں
دو بے اولادی رہیں۔ سب بہنوں میں ان کی والدہ کا سب
سے پہلے انتقال ہوا۔ غرض انھیں ترکہ ورثہ میں پھوٹی
کوڑی ددھیال سے ملی نہ ننھیال سے۔

اُن کی چھوٹی پھوپی اماں مرحومہ قاریہ حاجیہ اُم
عطیۃ النسا صاحبہ جس مکان میں درس دیا کرتی تھیں وہ
اُن کا اپنا تھا انھوں نے ڈپٹی عبدالحامد صاحب کی چھوٹی
بیٹی مرحومہ حامدہ بیگم صاحبہ کو بیٹی بنا لیا تھا اُن کا اپنا
کوئی بچہ نہ تھا۔ [illegible] یا [illegible] میں ایک دن وہ ہمارے
ہاں تشریف لائیں تو پھوپی حامدہ بیگم صاحبہ بھی ساتھ
تھیں۔ علامہ مغفور سے اُن کی چھوٹی پھوپی اماں نے کہا۔
"اچھے میاں میں یہ چاہتی ہوں یہ گھر حامدہ کو دے دوں۔"
علامہ مغفور سمجھ گئے کہ ان کا کیا مطلب تھا۔ انھوں نے
کہا: "بہت اچھا۔" اور اُسی وقت ایک کاغذ پر یہ لکھ کر
دے دیا کہ میں اپنی چھوٹی پھوپی اماں حافظ قاریہ اُم
عطیۃ النسا صاحبہ سے بہت کچھ لے چکا ہوں اس مکان
میں شرعی حصہ اب میرا ایک پائی بھی نہیں نکلتا۔
کھڑے ہو کر جھک کر نہایت ادب سے یہ تحریر پھوپی کو
پیش کی۔ انھوں نے پڑھا تو آنکھ میں آنسو آ گئے۔ کہنے
لگیں: "بیٹا میں نے تجھے بہت کچھ کیا دیا ہے"
"کہا یہ جو آپ نے ساری عمر مجھے دعائیں دی ہیں۔

لاکھوں روپیہ بھی تو ان کی قیمت نہیں ہو سکتی"

شرعی حق سب بھتیجوں کا برابر کا تھا مگر علامہ مغفور نے اس کی پرواہ کی ہی نہیں۔

میری پہلی شادی

میں ایف اے (پہلے سال) میں تھا اور اس وقت میری عمر اٹھارہ سال تھی کہ حضرت والد مغفور کی چچا زاد بہن پھوپی حامدہ بیگم مرحومہ کی اکلوتی بیٹی خالدہ بیگم سے میری منگنی کر دی گئی حالانکہ رشتہ داری دُور کی نہ تھی تاہم مجھ سے اقرار نامہ لکھوایا گیا تھا۔ ہمارے گھر میں بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھائے گئے اور حلوائی نے بڑی بڑی کوئی سیر کی ۸ یا ۷ بالوشاہیاں تیار کی تھیں۔ یہ ڈھائی من مٹھائی سمدھیانہ بھجوائی گئی تھی جس کے جواب میں ڈھائی من میوہ (پستہ بادام اخروٹ کا جو کھوپرا وغیرہ) ہمارے ہاں آیا اور کنبہ میں تقسیم ہوا تھا۔ ڈھائی سال بعد میں بی اے (آخری سال) میں تھا کہ والدۂ مرحومہ نے پھوپی حامدہ مرحومہ سے کہا کہ نکاح اس وقت کر دیا جائے۔ پھوپی صاحبہ نے فرمایا لڑکی کم عمر ہے تین سال سے پہلے تو نکاح وداع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ والدۂ مرحومہ کے شروع کے دو لڑکے ضائع ہو گئے تھے۔ شادی کو ۳۱-۳۲ برس گزر چکے تھے اور بہو اب تک نہ آئی تھی۔ منگنی ٹوٹ گئی اور چند ماہ بعد حضرت والد مغفور نے مئی ۳۲ء کے عصمت میں صفحہ ۴۹ پر یہ اشتہار دیا۔

شادی کی ضرورت

ایک ایسے لڑکے کے واسطے جس کے باپ کی آمدنی کا اوسط ڈھائی تین سو روپیہ ماہوار ہے ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو کم از کم اُردو اچھی طرح لکھ پڑھ سکے۔ نماز روزہ کی پابند اور موجودہ فیشن کے نقائص سے باخبر ہو۔ ضروری نہیں کہ لڑکی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو۔ صرف آنکھ ناک سے درست ہونی چاہئے اور بظاہر کوئی خاص نقص نہ ہو۔ لڑکا بی اے میں تعلیم پا رہا ہے اور بی اے کے بعد ایل ایل بی میں جائے گا۔ نکاح اِس وقت بلکہ اور وداع ایل ایل بی کے بعد۔

ا۔ ج معرفت منیجر عصمت دہلی

اس اشتہار کو اس طرح سمجھنا چاہئے۔

(۱) بی اے میں جو لڑکا پڑھ رہا ہے وہ طالب علم ہے لہٰذا آمدنی اُس کی نہیں اُس کے باپ کی دیکھی جائے گی جو ڈھائی تین سو روپیہ ماہوار بتائی گئی ہے۔ اُس آمدنی کی اُس زمانہ میں وہی حیثیت تھی جو آج دو ڈھائی ہزار کی ہے مگر آج دو ڈھائی ہزار والے بھی روتے ہیں اور چالیس سال پہلے ڈیڑھ دو سو روپیہ والوں کے گھروں میں برکت اور سکون تھا

(۲) اُردو اچھی طرح لکھنے پڑھنے سے یہ مطلب نہ تھا کہ معمولی خط لکھ لے یا رسالہ کتاب پڑھ لے بلکہ اُردو میں اچھی استعداد ہو۔ انگریزی جاننا ضروری نہ تھا۔

(۳) نماز روزہ کی پابندی انتخاب کی ضروری شرط تھی

(۴) موجودہ فیشن کے نقائص سے باخبر ہونا بہت بلیغ جملہ ہے جس کا مطلب کم سے کم یہ ہے کہ لڑکی اگر تہذیب جدید سے مرعوب ہے تو عاقبت میں معاملہ فہم نہیں اور اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں چراغ خانہ نہیں شمع انجمن ہے لہٰذا گھر کا گھروا ہوگا۔

(۵) حضرت علامہ راشد الخیریؒ نے اپنے سینکڑوں مضمونوں افسانوں ناولوں میں حُسنِ صورت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ سیرت کے مختلف پہلو دکھلائے ہیں چنانچہ بہو کے انتخاب میں اُنھیں خوب صورتی کی تلاش نہ تھی۔

(۶) اُن کا خیال تھا کہ میں تعلیم سے فارغ ہو کر وکالت کروں۔

یہ چالیس سال پہلے کی باتیں ہیں۔ آج [illegible] میں

باپ کی نہیں لڑکے کی اپنی اصلی دیکھی جائے گی دوسری بات کو کہیں گے جہالت۔ تیسری کا مضحکہ اُڑے گا۔ چوتھی کو دیانتداری سے تعبیر کیا جائے گا اور پانچویں بات یہ ہے کہ زبان سے آدمی کا بچہ ہی کہیں گر دل سے چاہیں گے جنت کی حور یا کوہ قاف کی پری۔

اس اشتہار کے سلسلے میں جو خطوط آئے تھے۔ ان میں کوئی بھی قابلِ جواب نہ تھا البتہ پنجاب سے ایک خط ملا تھا جس میں تحریر تھا کہ ان باتوں کی تصدیق ڈاکٹر عبدالغفور صاحب مظہر سے کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب مظہر کی بیٹی خاتون اکرم اپنے زمانے کی بہت مشہور ادیبہ تھیں۔ اُن کے بعض مضامین مس مظہر۔ اور ہمشیرہ احسن الغفور کے نام سے بھی شائع ہوتے تھے۔ اخبار تہذیب نسواں لاہور، عصمت دہلی، شباب اُردو لاہور۔ استانی دہلی وغیرہ پرچوں میں اُن کے مضامین ۸۔۹ سال سے شائع ہو رہے تھے۔ کئی مضمونوں پر انھیں انعام بھی ملے تھے۔ اُن کے مختصر افسانے اُن کے تاریخی اور خانداری کے مضامین معاشرتی اور تمدنی مسائل پر اُن کی مدلل اور پُر اثر بحثیں بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں بالخصوص حقوقِ نسواں کی حمایت میں اُن کے مضامین کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا حضرت اکبر الٰہ آبادی کے بعض اشعار پر اُن کی تنقید شائع ہوئی تو بڑے بڑے ادیبوں نے خاتون اکرم کی قابلیت کی داد دی علامہ راشد الخیری۔ مولوی ممتاز علی۔ خواجہ حسن نظامی اور خود حضرت اکبر نے خاتون اکرم کی تحریر کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ تحریر میں اس قدر روانی اور وقار خیالات میں اس قدر پختگی سنجیدگی اور اپنی جنس کا اس قدر درد پختہ عمر کی عورت میں ہو سکتا ہے نہ کہ ایک نوعمر لڑکی میں یہی خیال اُن کے مضامین پڑھ کر ہو سکتا تھا۔

یہ خط دیکھ کر خود مرحومہ خاتون اکرم کی طرف علامہ مغفور کا ذہن منتقل ہوا۔ انھوں نے مرحومہ کے دو تین مضمونوں کا مطالعہ کیا اور مرحومہ کے والد مغفور ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب مظہر سے خط کتابت شروع کی۔ ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ بجائے اس کے کہ دوسرے ذرائع سے معلومات حاصل کی جائیں ہم اپنی کمزوریاں خود ہی کیوں نہ بیان کر دیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ جس مکان میں ہم رہتے ہیں یہ کرایہ کا ہے۔ ۵۔۶ خطوط کے تبادلے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ آپ صاحبزادے کے ساتھ ایک روز کے لئے اگر تشریف لا سکیں تو بڑی عزت افزائی ہوگی۔ چنانچہ ہم دونوں جھانسی پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب انشاپرداز اور شاعر تھے۔ اور اب سے ساٹھ سال پہلے کے رسالوں میں ان کے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے "فرہنگ ہمرنگ" ادیبوں کے لئے بہت محنت سے تیار کی تھی جس میں اپنی بیٹی خاتون اکرم سے انھیں بڑی مدد ملی تھی۔ یہ لغت اُن کے پوتے پروفیسر ڈاکٹر معین احسن جذبی کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بیٹے محمد احسن الغفور صاحب علیگ ڈپٹی انسپکٹر مدارس جھانسی اسٹیشن پر موجود تھے۔ گھر پہنچ کر ناشتہ کے بعد میں تو میاں معین سے جو اُس وقت دس گیارہ سال کے تھے باتیں کرنے لگا اور والد مغفور کی گفتگو ڈاکٹر صاحب سے ہوتی رہی میاں معین سے معلوم ہوا کہ پھوپی جان کے پیام آتے رہتے ہیں مگر ابّا (دادا) منظور ہی نہیں کرتے بعد میں تفصیل معلوم ہوئی تھی تین ادیب تھے۔ ا۔ کئی اعتبار سے مجھ سے بہتر تھے مگر انھوں نے کالج کے ڈرامہ میں پارٹ کیا تھا۔ ب۔ بھی مشہور ادیب تھے لیکن عمر زیادہ تھی۔ ف۔ دولت مند تھے مگر بیوی اور دو بچے موجود تھے۔

ناشتہ سے قبل ڈاکٹر صاحب نے عطردان نکال کر

ایک شیشی حضرت والد مغفور کو دی ایک مجھے۔ مجھے اس سے
قبل عطر کی شیشی کسی سے لینے کا اتفاق نہ ہوا تھا میں جیب
میں رکھنے لگا تو والد مغفور نے گھور کر مجھے دیکھا اور جو شیشی
اُن کے ہاتھ میں تھی کھولی اور جیب میں سے رومال نکال کر
اُس پر عطر ر۔ اُن کی دیکھا دیکھی میں نے بھی یہی کیا اور
ادب سے جھک کر شیشی واپس کر دی۔

دوپہر کو کھانے کے لئے بیٹھے تو والد مغفور نے شامی
کباب کا ایک ٹکڑا کھا کر پھر نہیں کھایا ڈاکٹر صاحب نے
شامی کباب کے لئے اصرار کیا اور وہ جی ہاں کہتے رہے آخر
ڈاکٹر صاحب نے خود چکھا تو نمک تیز تھا۔ اُسی وقت اُٹھ
کھڑکی میں آ زور سے آواز دی "خاتون۔ خاتون"

جواب میں آواز آئی "جی ابا"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "بیٹی تم نے شامی کباب
کا نمک نہیں چکھا۔ یوں ہی بھیج دیا۔ تمھیں معلوم ہے مولانا
صاحب اتنی دور سے تمھارے رشتہ کے لئے آئے ہیں۔
اب وہ تو یہی سمجھیں گے اسے کھانا پکانا نہیں آتا۔

اور پھر ڈاکٹر صاحب معذرت کرتے ہوئے
دستر خوان پر بیٹھے۔

"مولانا صاحب یہ کھانا خاتون ہی نے پکایا ہے
معاف کیجئے اُسے نمک چکھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ مگر یہ
اس سے بڑی غلطی ہوئی ہے آپ دلی جاکر بیگم صاحب کو
بتا دیجئے گا کہ کبابوں میں نمک تیز تھا"

ڈاکٹر صاحب کے ہاں ماما بھی تھی نوکر بھی۔ کیا
حرج تھا اگر یہ نہ بتایا جاتا کہ جس بیٹی کے رشتہ کے لئے
مہمان آئے ہیں اسی کی غلطی سے نمک تیز ہو گیا۔ اب تو
زمانہ کا یہ رنگ ہے کہ ماں پھوپی نانی دادی نے کھانا پکایا
ہے اور تعریف ہو رہی ہے بیٹی کی۔ رشتہ ہی کے سلسلہ
میں ۱۹۴۶ء میں ایک جگہ کھانے کا اتفاق ہوا لڑکی کے بھائی
ہر قابل تعریف چیز پر بہن کا نام لیتے کہ یہ بھی عائشہ نے
پکائی ہے حالانکہ عائشہ کبھی بھول کر بھی باورچی خانہ نہ
جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب شریف آدمی تھے معاملہ کے پکے
زبان کے سچے۔ تصنع اور بناوٹ وہ جانتے ہی نہ تھے۔
جو حقیقت تھی اس سے بے خبر نہ رکھا۔ انھوں نے بتا دیا کہ
خوش ذائقہ یا بدمزہ ایسا کھانا لڑکی پکاتی ہے۔ وہ
فرشتہ نہیں انسان ہے غلطی کا اس سے امکان ہو سکتا
ہے شامی کباب میں نمک تیز ہونے کی ذمہ دار سراسر وہ
اور صرف وہ ہے۔

آج ۱۹۶۳ء میں مسلمانوں میں کتنے شخص ایسے
ہو رہے ہیں جن میں لڑکوں لڑکیوں کی کمزوریاں خود ہی
بیان کر دی اور بتا دی جائیں۔ دیانت داری اور ایمانداری
کے ساتھ اور گفتگو میں صرف صداقت کو ملحوظ رکھا جائے؟

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے دوران گفتگو میں یہ بھی فرمایا
تھا کہ "خاتون معمولی صورت کی لڑکی ہے۔ احسن (بھائی)
سے شکل ملتی ہے ایسے ہی خد و خال ہیں۔ خاتون اکرم تاریخی
نام ہے ۱۷ر نومبر ۱۹۲۰ء تاریخ پیدائش ہے تین ماہ بعد
بائیس سال کی ہو جائے گی۔ میری پنشن ۴۰ یا ۵۰ (ٹھیک
یاد نہیں) روپیہ ہے تھوڑا سا روپیہ بنک میں بھی ہے لیکن
لڑکی کی شادی اور کرنی ہے۔ بہت غریب آدمی ہوں۔
دینے دلانے کو کچھ نہیں ہے۔ احسن کی تنخواہ اور میری پنشن
مل ملا کر بس لشتم پشتم گذر ہو رہی ہے۔ ان باتوں کو انکسار
نہ سمجھئے۔ حقیقت ہے"

یہ اگست کا مہینہ تھا۔ ۲۸ر دسمبر کو شادی طے
ہوئی۔ والد مغفور کے ساتھ میں ایک میرے رشتہ کے
بھائی اور ایک اور صاحب بس ہم چار آدمی جھانسی پہنچے

اور دلّی میں دلہن کی آمد کا انتظار ہونے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا مولانا صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بغیر کسی ذمّہ دار عورت کے آئے ہم لڑکی کو کس طرح وداع کردیں۔ تیاری بھی تو کچھ نہیں کی۔ اس کے لئے مہلت دیجئے اس وقت نکاح کرلیجئے۔

ا۔ب اور ف ان تین آدمیوں کے علاوہ جن کا ذکر ہوا ڈاکٹر صاحب کے دو عزیز بھی تھے جو یہاں رشتہ کے حامی تھے اور کئی سال سے سخت کوشش کر رہے تھے۔ بہکانے کا اس سے بہتر اور کونسا موقع تھا ایک صاحب م اور ر سے ملے۔ انھوں نے کہا "مولانا صاحب جن مضمونوں کو پڑھ کر اپنے بیٹے کی یہاں شادی کرنے آئے ہیں وہ باپ اور بھائی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ عمر ۳۵ سال سے کم نہیں پھر نہ تو پیسہ ہے نہ صورت شکل۔ آخر آپ کیا دیکھ کر کر رہے ہیں اور پھر تو غور کیجئے بلایا شادی کے لئے اب کہتے ہیں بس نکاح کرلو۔ آپ انجان پردیسی لوگ ہیں۔ اِس چال کو نہیں سمجھے"۔

حضرت والد مغفور نے اُن صاحب کو تو کچھ جواب نہ دیا اُٹھ کر سیدھے ایک حکیم صاحب کے ہاں پہنچے۔ حکیم صاحب دلّی یا اطراف دلّی کے تھے اور پہلے سے ملاقات تھی۔ نام شاید ریاض الدین تھا؟ اُدھر میرے رشتہ کے بھائی مجھ سے کہہ رہے تھے "میاں رنجیدہ ہوں تمہارے دشمن۔ لڑکیوں کی بھلا تمہارے لئے کیا کمی۔ کل صبح تو دلّی پہنچ ہی جائیں گے وہ . . . . اور وہ . . . . اور وہ . . . . تین لڑکیاں تو یہی میرے ذہن میں ہیں۔ صورت بھی ہے روپیہ بھی۔ رہی تعلیم اُسے کیا لے کر چاٹنا ہے۔ کل ہی جہاں چاہو پیام بھجوا دو اور پرسوں شادی کرلو۔ م نے جو باتیں کہی ہیں سب ٹھیک معلوم ہوتی ہیں"۔

حضرت والد مغفور حکیم صاحب کے ہاں پہنچے تو سلام علیک کے بعد دریافت کیا کہ "م خود تو یہاں شادی نہیں کرنی چاہتا"۔ حکیم صاحب نے کہا "خیریت کیا بات ہے؟" انھوں نے گفتگو دہرائی تو کہا "جی ہاں خود چاہتا ہے۔ مگر لڑکی کے اور اس کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے جو پیام آتا ہے بہکا دیتا ہے اور گمنام خطوط بھیجتا ہے۔ مضمون وہ خود لکھتی ہے باپ اور بھائی کی اصلاح کی محتاج نہیں۔ ہندی اور انگریزی بھی جانتی ہے عمر ۳۵ سال تو بہ تو بہ میری دیکھی ہوئی ہے انیس بیس سال کی ہوگی۔ رہا ڈاکٹر صاحب کا کہنا کہ کوئی ذمّہ دار عورت آئی ہوتی تو لڑکی کو اس کے سپرد کیا جا سکتا تھا اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔ آپ کی بیگم صاحب آئی ہوتیں تو ہم بھی کہہ سکتے تھے کہ نکاح کے ساتھ ہی وداع بھی کردیجئے حالانکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے وداع کی کوئی تیاری ابھی نہیں کی"۔

بعد مغرب نکاح ہوا اور رات کی گاڑی سے ہم دلّی واپس آئے کچھ کم دو ماہ بعد والدۂ معظمہ۔ پھوپی اماں۔ چھوٹی بہن ایک ممانی ایک رشتہ کی چچی یا پانچ عورتیں اور ۶ سے ۷ مرد سب مل ملا کر بارہ تیرہ آدمیوں کی بارات لے کر والد مغفور جھانسی پہنچے۔ ۲۴ر فروری ۱۹۲۳ء کو وداع ہوئی اور ۲۶ر کی صبح رازق دولہن بن کر خاتون اکرم جب دلّی آئیں تو والدہ مرحومہ نے کامدانی کام کے ۲۸ دوپٹے جو رشتہ کے ماموں شاہ عبدالحکیم صاحب مرحوم کی پہلی بیوی کی معرفت تیار کروائے تھے میری دُور دُور تک کی دُدھیال اور ننھیال جتنی بھی بہنیں تھیں سب کو جمع کرکے پھوپی اماں کے ہاتھوں تقسیم کروائے۔

ودیعتوں کی تیاری کا علم کسی کو نہ تھا اور ابا جان مرحوم کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ چپکے ہی چپکے شوہر کی عزت بڑھانے کے لئے ان کی رفیقۂ حیات نے یہ تیاری کی تھی۔

والدہ مغفور نے بہو کو رونمائی میں شبِ زندگی حصہ دوم دیا۔ اس کی سنہری اور سرخ جلد بندھی ہوئی تھی۔ اس کا پہلا صفحہ یہ تھا۔

"میں تو ڈیڈی کیشن کو بھی چودھویں صدی کی بدعت ہی سے تعبیر کرتا ہوں کہ مصنف صاحب جس پر مہربان ہوئے یا کچھ توقع ہوئی اُٹھایا اور کتاب ڈیڈی کیٹ کر مفت کا احسان سر پر دھر دیا۔ الحمدللہ میں اس بدعت سے آج تک محفوظ ہوں اور اس وقت جو کچھ کر رہا ہوں وہ یکہ ایک جذبۂ محبت سے متاثر ہو کر اپنے بڑے بچے میاں رازق کی دولہن کو یہ کتاب رونمائی دیتا ہوں۔

تحفۂ عروس

رازق دولہن! آج کیسا مبارک دن ہے کہ میری مدتوں کی کوشش کامیاب اور برسوں کے ارمان پورے ہوئے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس وقت میری آنکھیں یہ سماں دیکھ رہی ہیں کہ تم اس گھر میں مالکانہ حیثیت سے داخل ہوتی ہو۔ رازق دولہن بیٹی یہ گھر اور اس کا اسباب ظاہری چیزیں ہیں حقیقتاً تمہارا گھر میری آنکھوں میں اور تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔

عزیز اقارب اپنی اپنی حیثیت کے موافق رونمائی دے رہے ہیں۔ دستور زمانہ میرے لئے بھی ہے۔ روپیہ پیسہ زیور کپڑا آنی جانی چیزیں ہیں۔ میرا جذبۂ محبت اور جذبۂ مسرت ان سے بہت بڑھا ہوا ہے اور حق رکھتا ہے کہ میں تم کو وہ دوں جو تمہارے نکاح کی مستقل یادگار ہو اور جس کا فائدہ تمہاری ذات پر ختم نہ ہو بلکہ تمہارے تمام طبقہ کے واسطے مفید ہو اس لئے یہ چند اوراق اس دعا کے ساتھ تحفتہً دیتا ہوں۔

اللہ العالمین عزیز بچی رازق دولہن کو ان بچوں کی ماں بننا نصیب ہو جو خیری خاندان کی بساط پر چاند کی طرح چمکیں اور ہم دونوں ماں باپ دولہا دولہن کو شاد و خرم چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوں۔

فروری ۱۹۲۳ء راشد الخیری

خاتون اکرم اُردو کی دنیائے افسواں میں ایک اہم نام تھا ادیب شہیر مرحوم سید سجاد حیدر یلدرم نے علامہ راشد الخیریؒ کو مبارکباد کا جو تار بھیجا تھا اس میں لکھا تھا۔

"آپ نے ہندوستان کا ہیرا انتخب کیا ہے"

نہیں سے ہاں

واجدہ بیگم کے الفاظ میں یہ واقعہ یوں ہے۔

" بھائی میاں کی شادی پر جھانسی جانے والیوں میں میرا بھی نام تھا مگر اُس زمانہ میں کنواری سیانی لڑکیوں کو سمدھیانے لے جانا معیوب سمجھتے تھے جس وقت منجھلے ماموں جان کے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی تو اللہ بخشے انھوں نے مخالفت کی۔ ابا جان خاموش ہو گئے۔ اماں جان اپنے بھائی کی مرضی کے خلاف بھلا کس طرح لے جاتیں۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ منجھلے بھائی کی مرضی نہیں ہے میں نہیں لے جاتی۔ میں رونے لگی۔ ابا جان نے جب دیکھا تو ہنس کر کہنے لگے "بے وقوف ہوئی ہے۔ دیکھو تو سہی اُنہی سے کہلوا کر لے جاؤں گا" شادی کا گھر تھا۔ روزانہ سب آتے جاتے رہتے تھے۔ دو تین دن کا وقفہ دے کر منجھلے ماموں جان سے کہنے لگے "بھائی صاحب رازق میاں کی والدہ تو خرچ اُٹھانے سے بہت گھبراتی ہیں۔ اب آپ خرچ کا انتظام منجھلی بھابی کے سپرد کر دیجئے۔" منجھلے ماموں جان کو معلوم تھا کہ روپیہ پیسہ میرے پاس رہتا ہے اور منجھلی ممانی جان بھی برات کے ساتھ جھانسی جا رہی تھیں۔ منجھلے ماموں جان نے جب یہ سُنا تو کہنے لگے "نہیں بھئی لڑکی کو بھی لے چلو۔ خرچ وغیرہ اسی کے پاس رہنا ٹھیک ہے"

ماموں جان تو جھینپ گئے۔ اماں جان مسکرانے لگیں۔ کہنے لگے۔ "دیکھو بی کس طرح اُنہی سے کہلوا دیا!"

پہلوٹی کی پیدائش

۹ رنومبر [illegible] کو علامہ مغفور کو اللہ تعالیٰ نے پوتہ عنایت فرمایا۔ اُس زمانہ میں علامہ مغفور کی جو تصنیف چھپتی حیدرآباد دکن کے محمد ابراہیم مرحوم تاجر کتب اُس کی . . ۵ جلدیں منگاتے تھے لاہور کے شیخ مبارک علی صاحب کا آرڈر بھی دو ڈھائی سو جلدوں سے کم کا نہ ہوتا۔ مولود مسعود کی پیدائش سے دو روز قبل ہزار روپیہ سے زیادہ کتابوں کے آگئے۔ اس کے علاوہ تربیت گاہ بنات کو بھی ریاست ٹونک سے بڑا چندہ ملا۔ دادا نے کہا بچہ مبارک و مسعود اور اقبال مند ہے۔ نام سعد راشد الخیری رکھا۔ نانا نے تاریخی نام نکالا بشاشت الرازق۔

رُو نمائی میں غصے نے جو دعا مانگی تھی اس کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ سعد جیسے سعید نیک شریف بچے۔ بہت کم خاندانوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے امتحانات میں فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی اور ساڑھے بیس سال کی عمر میں ایم اے ال ال بی کر لیا (فرسٹ ڈویژن) آئی سی ایس کی جگہ آئی اے ایس کا امتحان ہوا تو باوجود اس کے کہ تیز بخار میں دو پرچے کئے تھے کامیاب ہوئے اور سارے مسلمان اُمیدواروں میں اوّل۔

خاتون اکرم کی جواں مرگی

خدا کی باتیں خدا ہی جانے سان نہ گمان۔ خواب نہ خیال۔ اچھی بھلی۔ توانا تندرست۔ خوش و خرم شاداں فرحاں کہ ایک دم بیمار پڑیں ایک ہفتہ دماغی بخار رہا اور ۱۴-۱۵ رنومبر [illegible] کی درمیانی شب ۲۴ سال کی عمر میں خاتون اکرم کا انتقال ہو گیا!!

میری تعلیم چھوٹ گئی۔ دفتر کا جو کام کر رہا تھا وہ بھی چوپٹ ہوا اور مسلسل ۵ ماہ تک عصمت شائع نہ ہو سکا۔ صبح شام دیر دیر تک قبرستان میں رہتا۔ کچھری میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو گیا اور کیوں ہو گیا۔ والد مغفور نے اُس زمانہ میں میرا دل بہلانے کی حد سے بڑھ کر کوشش کی۔ علی گڑھ کی نمائش میں لے کر گئے۔ آگرہ کا تاج محل دکھایا مگر میرا غم کسی طرح غلط نہ ہوتا تھا۔ خود اُنھیں کس قدر زبردست صدمہ ہوا اس کا اندازہ اُن مضامین سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے چند روزہ مہمان بہو کی یاد میں لکھے اور جن میں خون کے آنسو بہائے۔ یہ مضامین عصمت نظام المشائخ اور قوم میں شائع ہوئے اور پھر کتابی صورت میں بعنوان "وداع خاتون" یہ کتاب ۶ . . ۵ دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ پہلے مضمون مہمان دولہن کا ابتدائی ڈیڑھ صفحہ یہ ہے۔

"باغبان کی ہزار ہا توقعات کے سایہ میں ننھا سا پودا لہلہا لہلہا کر پروان چڑھ رہا تھا۔ سبز پتیاں دن بھر تمازت آفتاب کی آغوش میں پھولتیں اور رات کو جب متحرک زرکت خاموش ہو جاتے تو پودہ سرسرا سرسرا کر جاتے اٹکھیلیاں کرتا۔ شبنم کے آبدار موتی اُس کا منہ چوم کر محبت کے ہاتھ گلے میں ڈالتے اور خاتمۂ شب پر صبا ٹھنڈے جھونکوں کا غسل دیتی۔

پودہ بڑھ رہا تھا ——— سرسرا سرسرا کر لہلہا لہلہا کر۔ کس کو خبر تھی یہ پودہ کیسے کیسے گل کھلائے گا۔ اس کا پہلا پھول بہار حُسن کو معطر کر دے گا اور خبر گلیں نگہ عروس اس کی خوشبو سے ہمکنار رہتی ہوئی بلند ہو گی۔ اس کی نازک پنکھڑیاں شب عروس کی گود میں کھیلیں گی اور سُرخ آدمیے ان کی بہار پر قربان ہوں گے۔

پودہ پروان چڑھ رہا تھا۔ پھول پھول کر اور جھوم جھوم کر

جب بہار خزاں سے بدلے گی اور لُو کے تند و گرم جھونکے
شاداب و سبز پتوں کو جھلسیں گے ہری ہری کونپلیں ٹوٹ
ٹوٹ کر زمین کا دامن بھریں گی۔ اُس وقت یہ نازک پودہ
اپنی پوری طاقت سے خزاں کے مقابلہ کو آگے بڑھے گا۔
ایک دردناک کشمکش ہوگی اور نظام عالم کا ایک پُرلطف
قہقہہ بجلی بن کر گرے گا فتح کا سہرا خزاں کے سر باندھتا ہوا
اس ہونہار پودے کو تاراج و برباد کر دے گا۔ لیکن اس سے
کچھ پہلے جب بلبل آخری مرتبہ شاخِ گل پر چہچہائے گی یہ آخری
پھول مرجھانے سے قبل ہوا کو بدستور معطر کرے گا۔

کون جانتا تھا جس کا پہلا پھول زینتِ عروس تھا
اس کا آخری پھول آرائشِ قبر ہوگا۔ جس کے پہلے پھول نے
دولہن بنایا اس کو آخری پھول قبر میں دیکھے گا۔ انسانی
پودہ بھی قبر بسانے کو دولہن بن رہا ہے جس کے ساتھ ارمانوں
کا ڈھیر ہوگا۔ یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور اس لئے
پودا چاروں طرف پھیل رہا ہے۔ ہنس ہنس کر اور کھِل کھِل کر

زمین کے منہ سے باہر آنے والی وہ تمام اشیاء جو
مختلف ناموں سے چشمِ انسانی کے سامنے آتی ہیں اگر ایک طرف
ڈھیر لگا دی جائیں اور دوسری طرف وہ حسرت و ارمان
جمع کئے جائیں جو پھول سے جسموں کے ساتھ زمین میں دفن
ہوئے تو یقیناً ان کا وزن زیادہ ہوگا شاید اسی لئے زمین
پال رہی ہے باغبان کے پودے کو انسانی پودے کے
استقبال کے واسطے

پودہ بڑھ رہا تھا۔ چڑھ رہا تھا۔ پھیل رہا تھا۔
پھول رہا تھا۔ کھلتا ہوا اور گھلتا ہوا۔
اس کے بعد بہو مرحومہ کے چند واقعات ہیں۔
(۱) شادی کے چوتھے روز ساس کو بخار چڑھا۔ ٹانگوں
میں سخت درد تھا رات کے ایک بجے بخار ہلکا ہوا پسینہ آیا
تو دیکھا چار دن کی دولہن شام سے بیٹھی پاؤں دبا رہی ہے!
(۲) گھر کی بڑھیا کسی بات پر بگڑ اور روٹھ کر چلی گئی۔
علی الصبح یہ دیکھ کر سب دنگ رہ گئے کہ گھر کے چپے چپے اور
کونے کونے کی جھاڑو دی ہوئی ہے۔ صفائی اور گھر سب
چندن بنے ہیں۔ دوسری صبح بھی گھر پر اسی طرح آگئی اور
تیسری رات کو ساس جب قصداً جلد اٹھیں تو دیکھا ہفتہ
بھر کی دولہن جھاڑو دے رہی ہے اس سے فراغت پا کر
وضو کر نماز پڑھ اپنے کمرے میں جا دبک دبکا دولہن بن کر بیٹھ گئی۔
(۳) شادی کو تین ماہ ہوئے ہیں۔ گھر پر بزاز آیا
چادرہ صرف ایک تھا لے لیا اور بہو کو دے دیا گیا تو بہو نے
کہا "میرے پاس دو چادرے اور ہیں یہ چادرہ واجدہ بیگم
کو دے دیں۔ وہ بھی خوش ہو جائیں گی اور میں بھی۔ کنواری
بچیوں کے دل بہت تھوڑے ہوتے ہیں بہوؤں کا حق مستقل
ہے۔ بیٹیوں کا عارضی۔ ان کی دلجوئی ہمارا فرض ہے۔ ...
آپ یہ چادرہ اُن کو اُڑھا کر میرا دل خوش کر دیجئے"
ان واقعات کے بعد بخار کے پہلے دن کا ذکر ہے اور پھر۔
"باغ کی چہل پہل بدستور ہے۔ درخت جھوم رہے ہیں۔
پتیاں سرسرا رہی ہیں۔ موتیا مہک کر طوطی لہک کر۔ بلبل
چہک کر فضائے چمن کی رونق دوبالا کر رہے ہیں۔ باغبان کا
پودا جس کے پہلے پھول نے خاتون کو دولہن بنایا تھا کہیں
کا کہیں پہنچ گیا۔
جوانی کی ترنگ میں۔ شوق کی امنگ میں۔ پودہ جھوم
رہا ہے لہک لہک کر اور چٹک چٹک کر۔
اس کے بعد علالت کے ۲۰ دن کے حالات اس قدر
دردانگیز ہیں کہ پڑھ کر ہچکی بندھ جاتی ہے۔
مضمون کا آخری حصہ۔

وہ ایسی چیل بیاہ دلت سے لالا مال تھی جس نے پہلے
ہی ہفتے میں سارے سسرال کے دل فتح کر لئے۔ اس میں
شک نہیں رازق دولہا کی موت نے میری بہت سی خوشیوں
کا خاتمہ کر دیا مگر وہ اپنی قابلیت اور فرماں برداری کے ایسے
سہانے پھول میرے دل پر کھلا گئی کہ میں جب تک زندہ
ہوں اس کو فراموش نہیں کر سکتا۔ مرنے والی خاتون دلّی
والوں کو دکھا اور کنبے والوں کو بتا گئی کہ بہو کیا ہوتی ہے اور
بہو کس کو کہتے ہیں وہ میرے گھر میں صرف دو سال کی مہمان
تھی۔ آئی رہی چلی گئی۔ مگر اس کا قیام بہوؤں کے لئے
سبق اور بیٹیوں کے لئے نمونہ ہے۔ جس بات کو یاد کرتا
ہوں وہی خون کے آنسو رلاتی ہے۔ لکھنے میں پوری مددگار
تربیت گاہ میں برابر کی شریک۔ کس کس خدمت کو
روؤں۔ بہو نہیں بیٹی تھی اور بیٹی بھی ایسی خدمت گزار
کہ دنیا میں ایسی بچیاں کم ہوں گی۔ ہر حال میں خوش۔
ہر کیفیت میں راضی میرا دل پھٹتا ہے جب اس کی غربت
یاد کرتا ہوں اور اس کی کیفیت کا خیال آتا ہے۔ آج
اسلامی دنیا بہوؤں سے پٹی پڑی ہے اچھی بھی ہیں بری
بھی۔ فرماں بردار بھی۔ غیر معقول بھی مگر ایسی بہو کہاں
ہو گی کہ بائیس سال کنوار پنے میں صرف کالی مرچ کا سالن
کھایا لال مرچ چھوئی تک نہیں، بیاہی گئی تو دلی میں مرچوں
کا گھر۔ جہاں سیر بھر گوشت میں ۲۵-۳۰ مرچیں پڑیں۔
زبان کا قیمہ ہوا۔ منہ کا دلیہ بنا۔ ہونٹ سوجھ گئے۔ حلق
زخمی ہوا۔ المختصر مرتے مر گئی مگر پتہ نہ چلنے دیا کہ مرچ
نہیں کھا سکتی"

دوسرا مضمون تعزیت نامہ ہے جو سمدھی کو لکھا گیا
تھا اس کی بھی ایک ایک سطر میں درد و غم ہے۔

"اس پونے دو سال کے عرصہ میں وہ ہمارے دلوں پر
ایسا سکہ بٹھا گئی کہ ہمارا بچہ بچہ خون کے آنسو رو رہا ہے۔
سسرال کی کٹھن منزل سر کرنا آسان نہیں۔ اچھی اچھی
سمجھدار اور بڑی بڑی ہوشیار لڑکیاں اس میدان میں
ڈگمگا جاتی ہیں لیکن مرحومہ خاتون پھول کی طرح اس دریا
سے پار ہوئی۔ ساس نندوں کو دکھا اور مجھے بتا گئی کہ بہو
کس کو کہتے ہیں . . . . . . یہ کیا انقلاب ہو گیا کل جس
بچی کی پالکی دروازہ پر آئی تھی آج اس کا جنازہ صحن میں
رکھا ہے۔ آنکھیں چکرا رہی ہیں حواس زائل ہیں کیا دیکھ
رہا ہوں یہ موت اس کی ہے جس کے منہ سے پھول جھڑتے
تھے۔ جس کو گود میں اٹھایا تھا آج اس کا جنازہ اٹھا ہے۔
. . . . . . اس کی آرزو تھی کہ شوہر کے ہاتھ سے پیوند
زمین ہو آج آپ کی بچی کا ارمان پورا ہوتا ہے۔ آپ نے
مجھے اس کے نکاح میں شریک کیا جو پھولوں میں مہک رہی
تھی میں آپ کو اس کے دفن میں بلاتا ہوں جو کافور میں
ڈوبی ہوئی ہے۔ آپ نے وداع کے وقت اس کی آنکھ میں
آنسو دیکھے ہوں گے لیکن میں نے مرض الموت میں بھی اس کی
آہ نہ سنی . . . . بخار تھا۔ فالج تھا۔ سرسام تھا لگن زبان پر
ہائے نہ تھی۔ کلیجہ کٹتا ہے جب خیال کرتا ہوں کہ دم واپسیں
میں مجھ کو بلایا۔ زبان بے کار تھی۔ دورے پڑ رہے تھے۔ شرم
و حیا کی مجسم تصویر نے سر ڈھانکنے کی ہر چند کوشش کی لیکن
ہاتھ نہ اٹھا۔ شکریہ کی کیفیت آنکھ میں اور منت و عجز
کے آثار چہرے پر ظاہر ہوئے اور روتی ہوئی آنکھوں سے
اپنا لال میرے سپرد کر آنکھیں بند کر لیں"

خاتون کی رحلت کو ڈیڑھ پونے دو مہینے گزر چکے تھے
کہ یہ دو شعر لکھ کر دئے کہ مرحومہ کی قبر کے سرہانے پتھر پر کندہ کرا دیا۔

خدارا اس طرف آنا تو پڑھ کر فاتحہ جانا
غریب و نیک بچی بے زبان و بے وطن ہے یہ

بہو آشد کی ہے" خاتون اکرم" ہادی نسیں
دولہن جھانسی سے جو آئی تھی وہ رازق دولہن تھی یہ
خاتون اکرم کی جواں مرگی پر متعدد اخبارات رسائل
میں اظہارِ ملال کیا گیا تھا۔

"خاتون اکرم تہذیب کی ممتاز اور کامیاب
نامہ نگاروں میں تھیں۔ اور ہر تہذیبی بہن کے دل میں
ان کی بیحد محبت و عزت تھی۔ وہ ایسی نوعمری میں دُنیا
سے چل بسیں اس کا جتنا بھی رنج کیا جائے تھوڑا ہے۔

سید ممتاز علی ——— (تہذیب نسواں)

"خاتون اکرم بڑی لائق اور صاحب قلم تھیں اور
بڑی خلیق اور ملنسار"

مولوی بشیر الدین احمد دہلی ——— (تہذیب نسواں)

"خاتون اکرم مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی
تعلیم یافتہ سلیقہ شعار بہو ملک کی ان چند مسلمان خواتین
میں تھیں جن پر طبقہ نسواں فخر کر سکتا ہے"

تنظیم امرتسر

"خاتون اکرم رازق دولہن تعلیم یافتہ خاتون تھیں
اور ملک کے زنانہ رسالوں میں مفید مضامین لکھا کرتی تھیں"۔

ہمدرد دہلی

"خاتون اکرم ایک ہونہار ہستی تھیں مسلم خواتین
ہند کے لئے مرحومہ کا وجود مغتنمات سے تھا"۔

النساء حیدر آباد دکن

"علمی و ادبی حلقوں میں عموماً اور طبقہ اناث میں
خصوصاً یہ خبر نہایت رنج واندوہ سے پڑھی جائے گی کہ
علامہ راشد الخیری کی بہو خاتون اکرم رازق دولہن کا
انتقال ہوگیا۔ رسالہ عصمت کی باہمت کارکن فرقہ نسواں
کی درد خواہ اور مولانا کے پاکیزہ خیالات کی سچی تصویر کی جگہ
خالی ہوگئی"

الکمال

"محترمہ خاتون اکرم رازق دولہن کامیاب انشاپرداز
تھیں نوعمری ہیں ان کی اچانک بے وقت موت سے فرقہ
نسواں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے"

شباب اُردو لاہور

"افسوس طبقہ نسواں کی قابل قدر ہستی عصمت
تہذیب نسواں شباب اُردو وغیرہ کی مایۂ ناز مضمون نگار
اُردو کی مشہور انشاپرداز محترمہ رازق دولہن خاتون اکرم
صاحبہ نے عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ انھوں نے
فرقہ نسواں کی شاندار خدمت بیش بہا مضامین کے ذریعہ
انجام دیں۔ اس قومی نقصان کی برسوں تلافی ہوتی نظر
نہیں آتی" الکلام بنگلور

"خاتون اکرم ان چند مسلم خواتین میں سے تھیں۔
جن پر فرقہ نسواں کو ناز ہے" وکیل امرتسر

ادیبوں اور ناظرینِ عصمت کے تعزیت نامے
دسمبر ۱۹۲۴ء کے عصمت میں ۸۔۱۰ صفحوں پر شائع ہوئے تھے۔
دلی دروازہ کے باہر ڈسٹرکٹ جیل کے عقب میں
خواجہ میر درد روڈ پر بائیں ہاتھ کو "مہندیاں" ہیں جہاں
حضرت شاہ ولی اللہ شاہ عبدالرحیم شاہ عبدالعزیز شاہ
عبدالقادر صاحب کا خاندان ابدی نیند سو رہا ہے۔ درگاہ سے
کوئی ۱۲۔۱۴ قدم پہلے بڑا سا چبوترہ تھا جس پر متولی عبدالعزیز
مرحوم بیٹھے رہتے تھے اس چبوترے سے ۸۔۱۰ قدم پہلے داہنے
ہاتھ کو خاتون اکرم مرحومہ کی پختہ قبر ہے۔

جوان بیٹے کا داغ

مجھ سے چھوٹے دو بھائی تھے۔
عبدالخالق آٹھ سال چھوٹے اور
اور عبدالصادق ۱۴ برس چھوٹے۔ صادق تو خیر لڑکپن میں
بہت شریر تھے، میں نے بھی لڑکپن میں شرارتیں کی ہیں

کہ ہمارا یہ منجھلا بھائی بڑی مسکین طبیعت لے کر آیا تھا۔ کم سخن اور بہت شرمیلا تھا بظاہر لگتا تھا کہ وہ ہم سب سے الگ تھلگ معلوم ہوتا تھا مگر اس کے دل میں دور پرے کے رشتہ داروں کی بھی محبت تھی۔ والد مغفور سے ہم تینوں بھائیوں نے انگریزی پڑھی اور عبدالخالق نویں جماعت میں جسے آجکل پری میٹرک کہتے ہیں پڑھتا تھا گرمیوں کے دنوں میں دو ماہ کے لئے ہم آپا کے ہاں گنگاپور سٹی چلے جاتے تھے۔ والد مغفور شیشم کے درخت کے سایہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روز عبدالخالق کو انگریزی پڑھاتے تھے اور لکھواتے تھے۔ یہیں اس کے درد سر شروع ہوا اور پھر اس غضب کا ہوا کہ جان ہی لے کر ٹلا۔ دلی آئے۔ ہوشیار سے ہوشیار ڈاکٹروں کا علاج ہوا مگر بے سود۔ خاتون اکرم کے انتقال کے ۷ ماہ بعد ۱۴ جون ۱۹۳۳ء کو اٹھارہ سال کے جوان شیر کی مچھپاتی میت نکلی!

ایک روز پہلے والد مغفور نے چھوٹی بیٹی واجدہ سے کہا کہ خالق میاں کے کپڑے کتابیں ساری چیزیں مقفل کردو۔ آج کے بعد اس کی کوئی چیز میری نظر سے نہ گزرے۔ جس وقت میاں خالق دنیا سے رخصت ہو رہے تھے ٹھیک اس وقت محلہ میں والد مغفور کے ایک دوست کے بیٹے کی شادی کا باجہ بج رہا تھا۔ انتقال مغرب کے بعد ہوا تو نہلانے کفنانے کے بعد میت کو صبح لے جانے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ سب عزیزوں کو اطلاع نہ کی جا سکتی تھی والدہ مرحومہ نے فرمایا اللہ نے اپنی امانت ہم سے لے لی۔ اب اسے صبح تک اللہ کے گھر میں لے جا کر رکھو۔ چنانچہ میت گیارہ بجے رات کو محلہ کی مسجد میں لے جا کر رکھی گئی۔ خاتون اکرم کی قبر سے بائیں ہاتھ کو چھ قبروں کی جگہ چھوڑ کر سو قبر میں پیچھے علامہ راشد الخیری کے اس جوان شیر کا مدفن ہے۔ انتقال کے بیس بائیس دن بعد دو شعر لکھ کر دیئے کہ قبر پر کندہ کرا دیا۔

کلیجہ کی جو ٹھنڈک تھا اور آنکھیں جس کا مجموعہ
یہ سناٹا یہ خاموشی اب اس کی خوابگاہ ٹھہری
پیام مرگ تھا جس کا شباب بے بہا ہی بچہ
جوانی موت تھی جس کی وہ ہے یہ خالق الخیری

عصمت [illegible] کے بعد

۴۵–۵۰ سال پہلے کے عصمت کے سلسلہ میں

ملا محمد واحدی صاحب لکھتے ہیں۔

"ایسا آدمی کاروبار نہیں کر سکتا۔ تاہم عصمت کو مولانا نے کسی نہ کسی طرح گھسیٹا۔ رسالہ عصمت مولانا کا کاروبار نہ تھا۔ ایک لگن تھی جو مولانا سے خدمت کرا رہی تھی۔ لگن نہ ہوتی تو اس زمانہ میں عصمت کی قسم کا رسالہ نکالنا دودھ پینا بھی کھیل نہ تھا۔ زنانہ رسالے نکالنے والوں کو خطرناک دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حقوق نسواں کی حمایت میں مولانا کو تو قتل تک کی دھمکی دی گئی۔ اخبار رسالے زنان خانوں میں گھس نہیں سکتے تھے کسی لڑکی کا نام چھپا ہوا نظر آجاتا تو ناک بھنویں چڑھ جاتی تھیں۔ اس لگن کی خاطر مولانا نے سارا زیور ختم کیا۔ دو مکان بیچے۔

مولانا رسالہ مخزن میں بھی تمام مضامین اسی لگن کے تحت لکھتے تھے اور رسالہ عصمت تو جاری ہوا تھا اس لگن کی وجہ سے ہی۔ وہ لگن تھی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت۔ عورتوں کو اس قابل کر دینا کہ مرد انھیں اپنا سا انسان سمجھیں"

عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر

تربیت گاہ بنات قائم کرنے سے حضرت علامہ مغفور کی مدرسہ کی مصروفیات بہت بڑھ گئیں اور میری کالج

کی دلچسپیاں ۲۱ء اور ۲۲ء میں عصمت کی اشاعت میں پھر بے قاعدگی ہونے لگی۔ بعض پرچے دو دو ماہ کے شائع ہوئے یعنی سال میں بجائے ۱۲ کے ۹۔۱۰ پرچے۔ ستمبر ۲۲ء میں عصمت سے دوگنی تقطیع پر ہفتہ وار اخبار سہیلی دوبارہ جاری کیا گیا اور عصمت سہیلی کا ماہوار اڈیشن ہوگیا۔ مضامین کی ترتیب بھی اور ڈھنگ سے ہونے لگی۔ عروس مشرق۔ چمنستان مغرب۔ خلیۂ رواج اصلاح معاشرت نئے نئے مستقل عنوانات قائم کئے گئے۔ ہفتہ وار پرچہ کے لئے ایک مددگار مدیر ضروری تھا اس کا انتظام ہوا نہیں مضامین کا آدھا حصہ علامہ مغفور خود ہی لکھتے۔ فروری ۲۳ء میں میری شادی ہوئی خاتون اکرم دلی آئیں مارچ میں ہمارے محلہ میں طاعون کا زور ہوا۔ سب گنگا پور ستی آبا کے پاس چلے گئے میں اطمینان کے ساتھ بی اے کا امتحان نہ دے سکا نہ پرچوں کی اشاعت میں باقاعدگی رہ سکی۔ ہم سب دلی واپس آئے تو دو ڈھائی ماہ سے عصمت چھپا تھا نہ سہیلی۔ حضرت والد مغفور کو ان کے بعض احباب نے مشورہ دیا کہ عصمت بے قاعدگی اشاعت کی وجہ سے بدنام ہوگیا ہے اور کسی نام سے رسالہ نکالا جائے مگر میں نے اور خاتون اکرم مرحومہ نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ سہیلی تو ۸ ماہ جاری رہ کر بند ہوگیا اور عصمت نے نیا چولا بدلا۔

عصمت میری ادارت میں

اڈیٹری کا کچھ نہ کچھ کام میں کئی سال سے کر رہا تھا مگر اختیارات نہ ملے تھے اپریل ۲۳ء کا پرچہ شائع ہونے کے بعد حضرت علامہ مغفور نے عصمت میرے اور خاتون اکرم کے سپرد کر دیا۔ اڈیٹری میں میرا نام مئی ۲۳ء کے پرچے سے پڑنے لگا۔ یہ پرچہ میں نے بہت محنت سے مرتب کیا تھا۔ کئی مضمون خود لکھے کئی درجے والد مغفور کا ایک درد انگیز افسانہ شائع ہوا تھا "... کا کرتہ" اور خاتون مرحومہ کا مضمون "فانی دنیا"۔ جنوری ۲۴ء سے پرچہ پھر باقاعدہ ہر ماہ شائع ہونے لگا اشاعت میں بھی خاصی اچھی ترقی ہوئی۔ خاتون مرحومہ نے اپنی ادبی سہیلیوں اور مشہور لکھنے والیوں کو خطوط لکھ کر مضامین منگئے۔ اکتوبر ۲۵ء میں عصمت کو جنوری ۲۶ء سے بلند معیار پر شائع کرنے کی اسکیم تیار کی غرض امیدوں سے دل لبریز تھے اور عصمت کا مستقبل نہایت شاندار نظر آرہا تھا کہ اچانک خاتون اکرم دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

مرحوم مولانا محمد علی جوہر کا مشورہ

خاتون مرحومہ کے بعد میں دن رات رنجیدہ رہتا تھا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ ایک دن والد مغفور مجھے مولانا محمد علی جوہر کے پاس لے گئے۔ جن کا دفتر ہمدرد و کامریڈ دفتر عصمت سے تھوڑے ہی فاصلہ پر میل والے یعنی اس مکان میں تھا جہاں سے ۰۸ء میں عصمت کا پہلا پرچہ شائع ہوا تھا۔ مولانا مرحوم میرے حالات سے باخبر تھے فرمانے لگے "تمہارے آبا اتنی مدت سے جو محنت کر رہے ہیں کیا وہ یوں ہی بے کار چلی جائے گی۔ تم نالائق یا جاہل یا بچہ ہوتے تو ہمیں بھی صبر آجاتا کہ یہ تو اپنے مدرسہ میں مصروف ہیں بیٹا اس قابل تھا نہیں کہ باپ کا کام سنبھال سکتا۔ تمہاری سعادتمندی یہ ہے کہ اب سب کچھ بھول کر عصمت نکالو۔ نوکری میں کچھ نہیں رکھا۔ نوکری اچھی چیز ہوتی تو تمہارے آبا کیوں چھوڑتے۔ میں کیوں چھوڑتا۔ قومی خدمت سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوسکتی ہے"

(عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر)

عصمت کی اشاعت میں باقاعدگی

اسی شام کو مجھے اپنے پاس بلا کر علامہ مغفور نے فرمایا:۔

"بظاہر عصمت ختم ہو چکا ہے مگر تمہاری محنت سے پھر زندہ ہو سکتا ہے۔ جس عصمت پر خاتون مرحومہ نے اپنا روپیہ اٹھایا اور دن رات محنت کی اب تمہاری محبت کا تقاضا اور شرافت یہ ہے کہ اس شان سے نکالو جس کی مرحومہ کوشش کر رہی تھی"

یہ الفاظ دل میں کچھ ایسے گڑے کہ میں نے عصمت جاری رکھنے کا وعدہ کر لیا رسالہ کو شائع ہوئے کئی ماہ گذر چکے تھے دو دو ماہ کے اکٹھے پرچے کیے بعد دیگرے شائع کئے یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۲۵ء میں اشاعت وقت پر آگئی اور پھر جو وقت پر آئی تو ایسی بجھ گھڑی کی اور خدا کا فضل وکرم شامل حال ہوا تو ایسا کہ آج ۲۸ سال ہو گئے کسی سال کے کسی ایک ماہ کے پرچہ کی اشاعت میں ایک دن کی دیر نہیں ہوئی۔

ڈیڑھ سال تک خریداروں کا چندہ وصول نہیں ہوا

۱۹۲۵ء سے عصمت پابندی وقت سے شائع ہونے لگا اور عمدہ سفید چکنے کاغذ پر دیدہ زیب سرورق کے ساتھ اور باتصویر لیکن خریداروں سے رسالہ کا چندہ وصول ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا ستمبر ۱۹۲۵ء کے پرچہ میں حضرت علامہ مغفور نے تحریر فرمایا تھا۔

"میں اکیلا آدمی کیا کیا کر سکتا ہوں۔ مدرسہ کا انتظام کروں۔ روپیہ فراہم کروں۔ کتابیں لکھوں۔ رسالہ دیکھوں ایک انار صد بیمار۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ جو میری دوسری مصروفیتوں کے باعث پرچہ میں وقتاً فوقتاً تاخیر ہوتی اس کی تلافی رازق دولہن کے آجانے سے ہو جائے گی اور میں رسالے سے بالکل سبکدوش ہو جاؤں گا مگر خدا کو یہ منظور نہ ہوا۔ اُن کے بعد رازق میاں دہیچک طرف توجہ کر کے بی اے کے امتحان میں شریک ہو کے تاہم میں عصمت سے غافل نہ تھا...... اس صدمہ کا اثر گو قدرے کم کے بوجب نسبتاً کم ہوا تو ۲۰ روز کے بعد رازق میاں بھی ۱۸ اکی عمر میں رخصت ہوا۔ اس صدمہ نے میری کمر توڑ دی مگر عصمت اور مدرسہ دونوں چیزیں میرے دم کے ساتھ ہیں..... ستمبر ۱۹۲۵ء کا پرچہ روانہ ہونے کے بعد ناظرین کو اس ڈیڑھ سال کے پرچے اس طرح پہنچے ہیں کہ اُن سے ایک پیسہ چندہ نہیں لیا گیا"

مصورِ غم کی ایک رات

رسالہ الحمرا لاہور میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا بعنوان "مصورِ غم کی تین راتیں"۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا۔

"سرسری مشاہدات اور محدود معلومات کی بنا پر بعض ناقدین نے اعتراض کیا ہے کہ علامہ مغفور نے کردار نگاری میں مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک واقعہ بھی مافوق الفطرت نہیں بلکہ عین ممکن الوقوع ہے۔ جس دور کے یہ کردار ہیں اس زمانہ میں نفسی نفسی کا یہ عالم نہ تھا۔ مقصد براری اور مطلب پرستی کی یہ کیفیت نہ تھی جو آج عام ہے کہ سلام علیک بھی بے غرض نہیں۔ چوتھائی صدی کے اُلٹ پھیر میں مسلمانوں کا تمدن بہت کچھ بدل گیا۔ وہ ماحول نہیں رہا مگر فطرت انسانی وہی ہے۔ علامہ مغفور نے جو کچھ لکھا اپنے ماحول کے مطابق۔ انسانی فطرت کے پیش نظر۔ اور خلوص قلب کے ساتھ انھوں نے اپنی تصانیف میں زیادہ تر دلیلِ انسانی

ہمدردی پر جس کی زندہ مثال وہ خود تھے . . .

[illegible]ء کی بات اور سردیوں کی رات ہے یعقوب علیم جنھیں محلہ والے مولوی صاحب کہتے تھے ان کے گھر سے دس بارہ قدم آگے ایک پھاٹک میں ستر بہتر سال کا ایک ضعیف انسان آنکھوں سے معذور۔ لنگڑا۔ لولا بھی اور مفلوج بھی (جس کے دیکھنے والے پانچ دس اب بھی زندہ ہیں) تھوڑی دیر بعد کھانس رہا اور کراہ رہا ہے۔ ہوا کے فرّاٹے اور رات کے سنّاٹے میں اُس کے درد کرب کی آواز پڑوس کے مکانوں میں اکثر آتی رہتی ہے۔ گیارہ بجے کا عمل ہے۔ مولوی صاحب کے گھر سے صدر دروازہ کی کُنڈی کھُلنے کی آواز آتی ہے۔ مولوی صاحب کو جاڑے کی سردی میں بے وقت باہر جاتے دیکھ کر کوئی اور شخص چپکے چپکے پیچھے پیچھے ہولیتا ہے۔ مولوی صاحب پھاٹک میں داخل ہوتے ہیں ۔ چند ساعت ٹھیر کر وہ شخص بھی آگے بڑھتا ہے تو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ مشرق کا سب سے بڑا حزن نگار جس نے اپنی اکثر و بیشتر تصانیف میں دردمند مسلمانوں کا یہ کردار دکھایا ہے کہ خوف خدا سے تھرّا اُٹھتے اور کانپ کانپ جاتے ہیں ۔ جس نے بار بار اپنی قوم کو یہ بتایا کہ خالق کی رضامندی اس کی ناچار اور بے بس مخلوق کی خدمت میں پوشیدہ ہے خود پیکرِ عمل ہے اور گفتار کے آئینہ میں اس کے کردار کی تصویر اس اندھیری رات میں روزِ روشن کی طرح نظر آرہی ہے! پڑھنے اور سننے والے یقین میں تامّل کریں اور نفاست پسند، تہذیب یافتہ، ترقی پرست طبیعتوں کو شاید گِھن آنے لگے مگر دیکھنے والی آنکھ نے دیکھا کہ گوشت کا لوتھڑا اپنی گدڑی میں دُبکا سکڑا سمٹا پڑا ہے اور علامہ راشد الخیری اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر اُسے کِھلا رہے ہیں!"

اور یہ وہ انسان تھا جس کے مرثیہ میں آغا شاعر دہلوی نے کہا تھا۔

"سامنے لیکن سلاطین کے وہ سر جُھکتا نہ تھا"

(الحمرا لاہور فروری ۱۹۵۲ء)

یسیر بچیوں کا حصہ

علامہ مغفور کے بہنوئی میر عبدالعزیز مرحوم صاحب جائیداد تھے۔ اُن کی پھوپی کا انتقال ہوا تو چونکہ وہ بے اولاد تھیں اور بھائی بھی کوئی نہ تھا اس لئے ان کی تمام جائیداد کے مالک ہوئے پھوپا آبا کے بچے جو علامہ مغفور کے بھانجے تھے۔ علامہ مغفور کو اپنی بہن مرحومہ زاہدہ بیگم صاحبہ سے بے انتہا محبت تھی مگر روپیہ پیسہ کے معاملہ میں انھوں نے بالکل دخل نہیں دیا یہاں تک کہ ان کے بھانجوں نے جائیداد کا بڑا حصہ ضائع کر دیا لیکن جب اُن بھائیوں کی بڑی بہن آپا مریم بیگم صاحبہ کا انتقال ہوگیا تو اب بن ماں باپ کی دو بچیاں تھیں۔ جائیداد ابھی تک تقسیم نہیں کی گئی تھی اب علامہ مغفور نے بہن کو مشورہ دیا کہ چاروں لڑکوں کے نام کی جائیداد الگ کردو اور مریم بیگم کا اگرچہ انتقال ہوچکا ہے مگر ان کا حصہ بھی ان کی لڑکیوں کو دو۔ بھانجوں نے اس تجویز کی دبی زبان سے مخالفت بھی کی مگر علامہ مغفور نے بن ماں باپ کی بچیوں کے نام ایک مکان کرادیا۔

باب نواں ـــــــ تربیتِ گاہ بنات

سنہ ۱۹۲۲ء تا سنہ ۱۹۳۵ء

لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت ـ ایک گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ لڑکیوں کو صرف کلام اللہ اور اردو خط و کتابت آجائے تو بہتر ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں ان کو کچھ تاریخ جغرافیہ انگریزی حساب وغیرہ سے بھی واقفیت ہونی ضروری ہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم وہ اس قابل تو ہو جائیں کہ تار لکھ پڑھ سکیں منی آرڈر دے سکیں۔ گھر کا حساب کتاب لکھ سکیں اور اگر کبھی سنیں کہ آج طرابلس میں یہ واقعہ ہوا تو سمجھ سکیں کہ طرابلس کیا ہے اور کہاں ہے ایک تیسرا فریق یہ کہتا ہے کہ تعلیم کسی حالت میں مضر نہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم میں تفریق لغو اور فضول ہے۔ جس حد تک لڑکوں کی تعلیم ضروری اور جائز خیال کی جاتی ہے اسی حد تک لڑکیوں کی تعلیم بھی مناسب اور اولیٰ ہے۔

فریق اول کے تو خیر دو چار ٹوٹے پھوٹے مکتب بھی موجود ہیں۔ مگر فریق دوم کا مشکل سے ایک آدھ نکلے گا اور فریق سوم کا جواب تو صفر کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

میں اس مسئلہ پر بحث کرتا ہوا یا رہا اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور علی الاعلان کہتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم سے زیادہ انکی تربیت قابل توجہ ہے اور جب تک مسلمان لڑکیوں کی تربیت کا لحاظ نہ رکھیں گے بعض خرابیوں کا انسداد قطعاً ناممکن ہے اس وقت سینکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمان گھرانے ہوں گے۔ جہاں میاں بیوی کے اختلاف مزاج نے نہ صرف اپنے ہی دونوں زندگیاں برباد کیں بلکہ ان کی رنجش اور تکدر نے معصوم بچوں تک کو تباہ کر دیا۔ اس ناچاقی کی وجہ صرف یہ ہے ایک بچی کو شروع ہی سے یہ تعلیم دی گئی کہ بساط حیات پر مرد اور عورت دونوں برابر کے مہرے ہیں۔ مرد کے فرائض جدا اور عورت کے جدا۔ جس طرح بیوی کو یہ حق نہیں کہ شوہر پر حکومت کر سکے اسی طرح مرد کو بھی مجاز نہیں کہ بیوی کو محکوم سمجھے۔ یہ تعلیم اس کے دل پر نقش کالحجر ہو گئی آنکھ کھول کر اس نے گرد و پیش بھی ایسے ہی زن و شوہر دیکھے۔ مگر جب خیالات راسخ ہو گئے۔ اس وقت ایسے شوہر کے سپرد کی گئی جس کا عقیدہ یہ کہ عورت محکوم اور مرد حاکم یا اسی طرح ایک لڑکی شوہر کے ہاں یہ یقین لے کر پہنچتی ہے۔ کہ شوہر خدائے مجازی ہے اور وہ اس کی کنیز۔ شوہر بیوی کو برابر کا شریک۔ بلکہ اس سے بھی افضل سمجھ رہا ہے۔ اور اس کی کسر نفسی بسا اوقات سخت روحانی اذیت پہنچاتی ہے تو ان حالات میں جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔

ان اختلافات کی بنا پر جو اوپر بیان ہوئے تعلیم نسواں کا کوئی معیار متفق علیہ نہیں بلکہ ایک لڑکی کا وہی فعل جو ایک مسلمان کی نگاہ میں معقول اور پسندیدہ ہے دوسرے کی رائے میں مردود اور قابل اعتراض ہے۔ اسی واسطے میں دس بارہ سال سے چلا رہا ہوں کہ لڑکیوں کی تربیت تعلیم سے کم ضروری نہیں اور تربیت کسی ایک اصول کے ماتحت نہ ہو بلکہ خاندانی حالات پیش نظر رکھ کر تربیت میں شادی کے متعلق والدین کے خیالات و توقعات محفوظ رہیں اور تعلیم میں جدت و قدامت دونوں سے استفادہ ہو"

دسمبر سنہ۲۰ء کے مسلم پریس میں علامہ مغفور کا ایک مضمون "حامیانِ تعلیم نسواں سے ایک درخواست" کے عنوان سے شائع ہوا تھا اور یہی مضمون رسالہ عصمت میں شائع ہوا تھا جس کا کچھ حصہ اوپر نقل کیا گیا۔

اِس مضمون میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ

"میں نے گزشتہ بیس سال تک صرف اسی مسئلہ پر غور کیا ہے اور جو ہمیشہ کہتا ہوں وہی اب بھی کہوں گا کہ مسلمانوں کی ترقی کا تمام انحصار صرف لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر ہے اور جب تک وہ مذہب سے پوری طرح باخبر اور زمانہ کی رفتار سے اچھی طرح واقف نہ ہوں گی مسلمان وہ ترقی کر سکتے ہیں جو حقیقی ترقی ہو نہ اُن کے گھر نمونہ جنت بن سکتے ہیں۔"

تربیتِ گاہ کی تجویز

پھر دسمبر سنہ۲۰ء کے عصمت میں بعنوان "تربیتِ گاہ بنات" جو مضمون شائع ہوا تھا اس کا ایک حصہ یہ تھا۔

"مسلمانوں میں بہت سی خرابیوں کا انسداد صرف اس طرح ممکن ہے کہ بچیوں کو معقول تعلیم و تربیت دی جائے اور ایک ایسی درسگاہ قائم ہو جہاں جدت و قدامت دونوں سے استفادہ ہو اور مدرسہ کا کوئی قدم دائرہ مذہب سے باہر نہ جانے پائے اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ میں گذشتہ بیس سال کے تجربے کے بعد جس قسم کی لڑکیاں کتابوں میں پیش کر رہا ہوں قوم میں ان کی کافی دھوم دھام ہو چکی اور اب کہ میری عمر کا بڑا حصہ ختم ہو گیا چاہتا ہوں کہ ایسے مدرسہ کی بنیاد ڈال دوں جہاں سے میرے سامنے ہی اگر میں پانچ برس اور زندہ رہ جاؤں تو چند لڑکیاں ایسی نکل آئیں جن کو میں قوم کے واسطے مایۂ ناز سمجھوں گا اس اعلان کے بعد میرے پاس افتتاح مدرسہ کی ضرورت پر کثرت سے خطوط آئے اور میں نے بعض ان مقامی حضرات سے جو میرے علم میں تعلیم نسواں سے دلچسپی رکھتے ہیں مشورہ کیا چنانچہ یہ قرار پایا کہ پہلے مدرسہ کا ایک بورڈ قائم کیا جائے اور حضرات ذیل کا بورڈ قائم ہوا۔

(۱) میر جالب صاحب ایڈیٹر "ہمدم" لکھنؤ۔

(۲) ملا محمد واحدی صاحب ایڈیٹر خطیب و نظام المشائخ

(۳) مرزا عبدالقادر بیگ صاحب ایم اے ایل ایل بی۔

(۴) مولوی عبدالغفار صاحب خیری۔ سابق پروفیسر ٹرکش یونیورسٹی بیروت۔

بچیوں کی تعلیم کنڈرگارٹن کے طریقہ پر ہوگی اور کوئی بچی، جو گیارہ سال سے زیادہ عمر کی ہے داخل نہ کی جائے گی۔ بورڈنگ مدرسہ کے ساتھ ہوگا"

مارچ سنہ۱۹۲۱ء کا عصمت "تعلیم نسواں نمبر" تھا اور اس میں لڑکیوں کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر کئی قابل قدر مضمونوں میں بحث کی گئی تھی عصمت کے اس خاص نمبر میں تربیت گاہ بنات کے قواعد و ضوابط بھی شائع کئے گئے تھے دو مضامین مدرسہ کے متعلق علامہ مغفور کے تھے ان میں جو مضمون "یہ اسلام کی لاج ہے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

تربیت گاہ کے قواعد و ضوابط

خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر چھ سال سے گیارہ سال کی عمر تک کی لڑکیاں داخل کی جائیں گی گیارہ سال سے زیادہ عمر کی لڑکیوں کے لئے سینیر سپیشل کلاس پر غور کیا جائے گا۔ تربیت گاہ کا مقصد مسلمان بچیوں کو دینی و دنیاوی تعلیم دینا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ لڑکیاں بورڈنگ میں رہیں اور جو کچھ تربیت گاہ میں سیکھیں گھر جا کر گرد و پیش کے اثرات

اس کو نائل نکر دیں۔ یتیم لاوارث بچیوں کے مصارف کی ذمہ دار تربیت گاہ ہوگی۔

پڑھائی میں دینیات پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ سات سال سے زیادہ عمر کی بچیوں کو نماز پنج وقتہ پڑھائی جائے گی اور نو سال سے زیادہ عمر کی بچیاں اگر روزہ رکھنا چاہیں گی یا ان کے ورثا خواہش کریں تو اس کا انتظام کیا جائے گا۔

انگریزی ہر لڑکی کے واسطے کوشش ہوگی کہ اتنی قابلیت پیدا کرے کہ تار آسانی سے لکھ پڑھ سکے منی آرڈر چیک کاروبار کی چٹھیاں اچھی طرح پڑھ اور سمجھ لے۔ ریاضی اوسط درجہ کی اور سائنس اس قدر کہ بچیاں توہمات سے محفوظ رہیں اور وہ معاملات جو روزانہ خانہ میں ہیں اچھی طرح سمجھ سکیں۔

تاریخ جغرافیہ نقشہ کشی ریاضت جسمانی حفظانِ صحت بھی نصاب میں ہیں۔ طوطے کے ذریعہ بچوں کی تربیت کا سبق بھی۔ مدرسہ کے وقت میں دو حصہ تعلیم اور ایک حصہ خانہ داری۔ کپڑوں کی قطع برید۔ کھانا پکانا۔ سینا پرونا۔ صنعت و حرفت۔ کاڑھنا بننا وغیرہ۔

اس کے بعد بورڈنگ کے قواعد تفصیل سے درج کئے گئے تھے۔

تربیت گاہ کا افتتاح چندہ کی رفتار بہت سست تھی تاہم اپنے رہائشی مکان کے ایک حصہ میں مدرسہ کا انتظام کرکے اعلان کیا گیا۔

"بورڈنگ کا مکان چونکہ ابھی میسر نہ آسکا اور یہ بالکل ناکافی ہے اس لئے وہ لڑکیاں داخل ہوں گی۔ جن کی رہائش کا انتظام خود والدین شہر میں اپنے طور سے کر سکتے ہیں۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو بورڈنگ کا انتظام فوری سے ہو جائے گا۔ اس وقت باہر کی لڑکیاں تربیت گاہ کی ذمہ داری پر داخل ہوں گی"

یکم فروری [illegible] کو تربیت گاہ کا افتتاح ہوا اور نائب مہتمم کی طرف سے اطلاع شائع ہوئی کہ

"تمام مہینے مدرسہ میں چہل پہل اور گہما گہمی رہی اور آج ۲۰ فروری تک کہ مہینہ کا آخری دن ہے اکیس بچیاں مدرسہ میں داخل ہو چکی ہیں جن میں دو لاوارث ہیں اور ان کا تمام بار تربیت گاہ کے ذمہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس مہینہ میں چار استانیوں نے اپنے فرائض ادا کئے"

تین ماہ بعد تین ماہ بعد فرزند علی صاحب کی ایک چٹھی مسلم اخبارات میں شائع ہوئی تھی اور رسالہ عصمت میں بھی:۔

"اخبارات میں اس مدرسہ کا حال پڑھ کر ۱ اپریل کو اپنی بچی کو جو ۶ سال کی ہے داخل کرنے کی غرض سے میں دہلی گیا اور ۱۱ کی صبح تربیت گاہ بنات میں حاضر ہوا۔ اس وقت مدرسہ میں ۴۴ بچیاں تھیں جن میں ۴ بورڈرز تھیں۔ یہ سب تین جماعتوں میں منقسم تھیں جس توجہ اور جانفشانی سے کارکنان تربیت گاہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اس کو دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔ تربیت گاہ کوچہ چیلاں ۱۴۸ میں واقع ہے اور اس کے متصل ۱۴۹ میں بورڈنگ ہاؤس ہے اور دونوں مکانوں کا دروازہ مشترک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بورڈنگ شاندار وسیع نہیں۔ تاہم موجودہ ضرورتوں کے واسطے کافی ہے۔ اس ڈھائی مہینوں میں بچیوں نے اس قدر حاصل کر لیا ہے کہ شاید سال بھر میں وہ مشکل سے گھر پر حاصل کرتیں۔ استانیوں کی محنت اور جانفشانی کے علاوہ مولوی عبدالغفار صاحب خیری سابق پروفیسر

ترکش یونیورسٹی بیروت اور محمد واحدی صاحب اڈیٹر خطیب واستانی کے لیکچروں نے جو کہانیوں کی صورت میں دئے جاتے ہیں ان بچیوں میں ایک خاص شوق پیدا کر دیا۔ نوشت و خواند کے علاوہ خانہ داری کی تعلیم پر تربیت گاہ کی توجہ خصوصیت سے ہے اور بحیثیت مجموعی تربیت گاہ بنات کا وجود حق رکھتا ہے کہ قوم علامہ راشد الخیری مدظلہٗ کی اس بے بہا خدمت کی شکر گذار ہو"

سرکاری امداد لینے سے انکار

دوسرے سشن میں تعلیمات کے

انگریز سپرنٹنڈنٹ ای ٹی واٹکنس نے تربیت گاہ کو دیکھا تو تحریری تعریف کی اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ چونکہ نصاب ہمارا نہیں ہے اس لئے ہم کوئی مدد نہیں دے سکتے۔

جنوری ۱۹۲۳ء میں علامہ مغفور نے اس سلسلہ میں لکھا تھا کہ

"اگر میں سرکاری مدد لینے پر جس کا پہلا نتیجہ نصاب سرکاری کا داخل کرنا ہے مجبور ہو گیا تو میری رائے میں یہ تربیت گاہ بنات کی پہلی ناکامی ہوگی۔ جو حضرات مجھ کو سرکاری اعانت لینے کی ترغیب دے رہے ہیں میں ان کی ہمدردی کا شکر گذار ہوں لیکن میں اس زریں مشورے کو قبول کرنے کے واسطے تیار نہیں"

علامہ مغفور کی یہ قطعی رائے تھی کہ نصاب مروجہ مسلمان لڑکیوں کے لئے بے کار ہے اس لئے انھوں نے چندہ جمع کرنا پسند کیا اور سرکاری اعانت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

دو خط تربیت گاہ پر ۱۹۲۲ء سے اعتراضات بھی شروع ہو گئے تھے جو علامہ مغفور شائع بھی کر دیتے تھے۔ فروری ۱۹۲۲ء کے عصمت میں بعض اعتراضات کے جواب میں علی گڑھ کے مشہور وکیل مولوی محمد سمیع اللہ صاحب کا یہ خط علامہ مغفور کے نام شائع ہوا تھا۔

"خدا کے واسطے مولانا آپ ان لغویات کی مطلق پرواہ نہ کیجئے۔ آپ وہ کر رہے ہیں کہ اگر تمام قوم ایک زبان ہو کر آپ کے احسانات کا شکریہ ادا کرے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ آپ وہ کر رہے ہیں کہ ہزار جواہر آپ پر سے قربان کر دیں تو اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے میں نے ۳ مرتبہ تربیت گاہ کو دیکھا آپ کا شغف وانہماک دیکھ کر میں عش عش کرتا تھا۔ میری متواتر درخواستوں پر آپ علی گڑھ تشریف لائے۔ آپ کا جذبہ آپ کا استغراق ہر چیز میرے واسطے ایک غیرت تھی۔ یہ ہماری انتہائی بد نصیبی ہے کہ آپ جیسے مقتدر اور بے مثل ہستیوں کی ان بیش بہا خدمت پر معترض ہوں" (صفحہ ۷۹)

بڑودہ سے سید غلام دستگیر صاحب جمعہ کی بچی رابعہ بیگم تربیت گاہ بنات میں داخل تھی ۲۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو دہلی تشریف لائے اور بڑودہ واپس جا کر لکھا۔

"میری بچی نے چھ مہینہ میں جس قدر پڑھ لیا یہ دوسری جگہ دو برس میں بھی نہ پڑھ سکتی تھی۔ تربیت گاہ مسلمانوں کے واسطے ایک ایسی نعمت ہے جس کا شکریہ قوم ادا نہیں کر سکتی۔" (عصمت اپریل ۱۹۲۲ء صفحہ ۵۸)

مسلمانوں کی ٹھکرائی ہوئی بچیاں تربیت گاہ میں

۱۹۲۳ء میں ارتداد کا فتنہ ہندوستان میں اٹھا تربیت گاہ بنات نے اس سلسلہ میں جو کام کیا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا جو علامہ مغفور نے مسلم اخبارات کو بھیجا اور ان میں شائع ہوا تھا۔

"۱۶ مئی ۱۹۲۳ء کا جگر خراش واقعہ جو مسلمانوں کے

نقاش کا نتیجہ ہے یقیناً ہر مسلمان کے واسطے درس عبرت ہوگا...... صبح ۸ بجے جب بیگم شاکر حسین صاحبہ ہیڈ مسٹریس لاک تشریف کوری کے انتظار میں جو تربیت گاہ کے محلہ کے پاس تشریف رکھتی تھیں میں موٹر کے پاس کھڑا مولوی رضا اللہ صاحب انجینئر سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک غیر مسلم جماعت کے مسلمان متعلقین نے مجھکو اطلاع دی کہ آج دو مسلمان یتیم بچیاں مرتد ہو رہی ہیں پتہ پوچھ کر گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی لڑکیاں موجود ہیں مگر ارتداد کی تحریک شروع ہوگئی ہے اور تمام کارروائی نہایت خفیہ طور پر ہو رہی ہے۔

یہ دونوں بچیاں اس بے مثل خاندان کی نام لیوا ہیں جس نے تمام ہندوستان میں علم و فضل کا ڈنکا بجا دیا۔ جس نے ایک دو نہیں پانچ چھ پشتوں تک ایسے جید علما پیش آئے جن کی روشنی اس وقت بھی ملک کو منور کر رہی ہے۔ خدا کی قدرت ہے غدر نے اس خاندان پہ جس نے لاکھوں مسلمان کر دیئے وقت ڈالا..... بچیوں کی بڑھیا نانی نے جو غالباً نابینا ہے جس وقت اپنی داستان مصیبت سنائی تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے وہ کہتی تھی مولانا ابو الخیر کی زندگی تک ہم کو تکلیف نہیں ہوئی ان کے بعد ہم پر دو دو تین تین دن کے فاقے پڑ رہے ہیں آج پندرہ مہینے سے یہ بچیاں ننگے پاؤں پھر رہی ہیں کھانا اور کپڑا تو درکنار ہمارے بیٹھے کو بھی ٹھکانہ نصیب نہیں ہے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ ان لڑکیوں کو کسی کے حوالے کر دیں کہ فاقے سے تو بچیں گی۔

خدا کا شکر ہے دونوں بچیاں کل شام کو تربیت گاہ میں داخل ہوگئیں"

(عصمت اگست ۱۹۲۵ء صفحہ ۵۶، ۵۷)

سالانہ امتحان ۱۹۲۵ء اور انسپکٹر مدارس کی رائے

عصمت کے اسی پرچے میں سالانہ امتحانات کا نتیجہ بھی شائع ہوا تھا تینوں جماعتوں میں شہری لڑکیاں ۲۷ تھیں جن میں ۲۶ کامیاب ہوئیں پردہ نشین خوشحال و کم استطاعت سب کی سب کامیاب یتیم و لاوارث ۳ سب کامیاب۔ ممتحن حضرات یہ تھے۔

(۱) چودھری عبد المجید صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس۔ (۲) مولوی فضل اللہ سب ڈویژنل افسر (۳) خان بہادر کپتان حبیب الرحمٰن سی آئی ای او بی ای۔ (۴) ملا واحدی اڈیٹر نظام المشائخ۔ (۵) سید آصف علی بیرسٹر ایٹ لا۔ (۶) مولوی رضا اللہ سول انجینئر۔ انسپکٹر مدارس کی رائے یہ تھی۔

"مہتمم تربیت گاہ بنات علامہ راشد الخیری کی خواہش پر میں نے آج درس گاہ کا معائنہ کیا۔ ۳۵ لڑکیاں ہیں اور یہ ایسے خاندانوں سے ہیں جو پردہ کی پابند ہیں۔ بچیوں کی سواری کا انتظام قابل اطمینان ہے روپیہ کی کمی کی وجہ سے چونکہ ڈولی کے سوا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا اس لئے یہی انتظام کرنا پڑا۔ تعلیمی حالت کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ دہلی کے اوسط سے بالاتر ہے نیز تعلیم کے اس نصاب کے لحاظ سے جو ہندوستان کے اس سلسلہ میں بہترین مصنف خود علامہ راشد الخیری نے پیش کیا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ درس گاہ مفید خدمات انجام دے رہی ہے اور اگر مہتمم حکام سے خواہش کریں تو گورنمنٹ خوشی سے ایک خاص گرانٹ دے گی۔ صورت جیسے دور دراز مقامات سے بچیوں کا آنا اور رہنا مہتمم اور عملہ

کی خصائل کی خوبی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔"

دو مشہور خواتین نے کیا دیکھا

۲ جنوری ۱۹۲۶ء کو بمبئی کی مشہور خاتون محترمہ عطیہ بیگم فیضی نے تربیت گاہ کو دیکھ کر اردو انگریزی اخبارات کو ایک پیام بھیجا جس میں انھوں نے لکھا تھا:۔

"میں نے جس وقت تربیت گاہ بنات کو دیکھا بے ساختہ میرے دل سے دعا نکلی۔ مولانا راشد الخیری نے یہ مدرسہ تین سال سے جاری کیا ہے اور انھوں نے سرکاری گرانٹ لینے سے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ نصاب پر مشروط تھی۔ مولانا صاحب مذہبی اور معاشرتی تعلیم لڑکیوں کو دے رہے ہیں۔ اور ہندوستان کے تمام حصوں سے مفلوک الحال لڑکیاں لے رہے ہیں۔ مدرسہ کو دیکھ کر مجھ پر ایک عجیب اثر ہوا۔ مولانا صاحب میری تعریف کے محتاج نہیں نہ اس کی ضرورت ہے مگر میں اپنے دلی جذبات کا مسلمانوں کے سامنے اظہار ضروری سمجھتی ہوں جو مدرسہ کو دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوئی اور دعا کرتی ہوں کہ معبود حقیقی اپنی برکتیں اور رحمتیں ان کی ذات پر ان کے مدرسہ پر اور مدرسہ کی عزیز بچیوں پر نزول کرے۔ ... میں مسلمانوں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ آئیں اور مولانا کی کوششوں کو دیکھیں۔ ان کی عمر پر غور کریں اور زندگی کے اس فلسفہ کو جو اسلام کی حقیقی خدمت ہے سمجھیں۔ (عصمت جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ ۹)

پنجاب کی مشہور قومی کارکن اور مضمون نگار محترمہ کنیز محمد بیگم منشی فاضل کے مضمون مندرجہ عصمت مارچ ۱۹۲۶ء سے۔

"۳۱ جنوری کو میں نے اسلام کی زندہ مثال تربیت گاہ بنات کو دیکھا... محترمہ بیگم راشد الخیری صاحبہ اپنا قیمتی وقت بچیوں کی تربیت پر صرف کرتی ہیں اور بورڈر لڑکیوں کی ہر قسم کی ضروریات بجا اپنی ماتحتی میں انجام دیتی ہیں...... مولانا موصوف نے کسی بڑے کالج کی بنیاد نہیں ڈالی انھوں نے موسیقی ڈرائنگ وغیرہ کو فروغ نہیں دیا۔ بلکہ وہ بتا رہے ہیں کہ ایک مسلمان بیٹی بہن ماں اور بیوی ہونے کی حیثیت میں اس کے فرائض کیا ہیں.... چار سال کی بچی نے جس کی ابھی چوٹی بھی نہیں گندھی نہایت سلاست اور روانی سے خلفائے راشدین کے اسمائے مبارک مع صفات بیان کئے چھ اور آٹھ سال کی بچیوں نے حمد اور حضرت عمرؓ کے ایثار کی مثال نظم کے پیرایہ میں ایسی خوش الحانی سے بیان کی کہ پتھر دلوں کو بھی موم کردے...... میں دعوئی کے ساتھ کہتی ہوں ایسی تربیت گاہ پنجاب میں ہوتی تو یقیناً اس وقت ڈیڑھ سو لڑکیاں اسکول میں ہوتیں۔ تمام مسلمانوں کو دل و جان سے تربیت گاہ کی امداد میں حصہ لینا چاہئے۔"

مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی رائے

"اردو کے مشہور انشا پرداز جناب راشد الخیری صاحب دہلوی نے اپنے زیر اہتمام دہلی میں جو تربیت گاہ مسلمان بچیوں کے لئے کھول رکھی ہے وہ ایک بڑی حد تک اس کی حقدار ہے کہ اسے اسلامی تربیت گاہ کیا جا سکے..... یہ سفید بالوں والا شخص جس مدرسہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لے گا اس کے قابل اطمینان اور قابل اعتماد ہونے کا خود ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے..... تربیت گاہ میں کمسن بچیاں لی جاتی ہیں۔ اس وقت بورڈنگ میں پندرہ

موجود ہیں اور شاید ۳۰-۴۰ روزانہ باہر سے آتی ہیں۔ اکثر بچیاں مفلس اور نادار ہیں اور بعض خوش حال گھرانوں کی بھی ہیں" (سچ لکھنؤ ۲۶ مارچ [illegible])

عنایتوں کا شکریہ

واجدہ بیگم علامہ مغفور کی چھوٹی بیٹی اور عشرت زمانی صاحبہ ہیڈ مسٹرس بچیوں پر دن رات محنت کر رہی تھیں حقوق نسواں کی مشہور حامی وساعی اور اُردو کی نامور ادیبہ محترمہ خاتون اکرم فروری ۱۹۳۶ء میں جب رازق زوجہ بن کر دلی آئیں تو انھوں نے تربیت گاہ میں غیر معمولی دلچسپی لی اور علامہ مغفور کو اُن سے بڑی بڑی توقعات ہو گئیں مگر نومبر ۱۹۳۶ء میں اُن کی جواں مرگی نے علامہ کی توقعات کا خاتمہ کر دیا پھر سات ماہ بعد گیارہ برس کا جوان بچہ عبدالخالق ضائع ہوگیا یہ دونوں صدمات بڑے زبردست تھے مگر تربیت گاہ ان صدمات سے کچھ زیادہ متاثر نہ ہوئی اور برابر اپنا کام کرتی رہی۔ لیکن اس پر اعتراضات وقتاً فوقتاً ہوتے رہے چنانچہ عنایتوں کے شکریہ کے عنوان سے عصمت اگست ۱۹۳۶ء میں بھی جواب لکھا تھا۔

"کام کرنے والے کو ابتدا میں جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ تربیت گاہ بنات بھی اس سے محفوظ نہیں۔ میں اگر مسلمانوں کی ان عنایتوں سے متاثر ہو جاتا ہوں جو انھوں نے مجھ پر کیا اور بری طرح سے میرا دل توڑا تو شاید تربیت گاہ کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ میں نے اُن کے تمام اعتراض ہمیشہ سر آنکھوں پر رکھے لیکن مجھے اُن سے یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے کہ آخر آپ خود کچھ نہیں کر سکتے تو کام کرنے والوں کو اتنا مورد الزام نہ ٹھہرائے کہ ان کو ناقابل برداشت تکلیف پہنچے۔ مسلمان محض ایک رائے قائم کرنے کے واسطے ہیں۔ میں ان کی رائے کا بُرا نہیں مانتا۔ اگر اس سے تسلی بھی کہیں تو بسر و چشم مگر خدارا چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹکائیں اور تکلیف فرما کر آئیں۔ کام کو دیکھیں اعتراض کریں، جلائیں، دیں، مشورہ دیں، یہ سچے مسلمانوں کا کام ہے۔"

اور پھر ۱۹۳۶ء میں ایک خاتون کے اعتراضات کا جو جواب دیا اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

"اس وقت تک کم و بیش سو سوا سو بیرونی مرد اور عورتوں نے تربیت گاہ کو دیکھا ان میں سے اکثر کی رائے اخبارات میں شائع ہوئی زمیندار میں بیگم صاحبہ ہز ایکسلنسی سید یعقوب خاں نے ایک مفصل کیفیت تحریر فرمائی۔ تہذیب نسواں میں مولوی حافظ اسعد [illegible] صاحب سب ایڈیٹر نے۔ ہمدرد۔ ہمدم۔ اور تمدن۔ وکیل۔ تنظیم وغیرہ کے صفحات بھی اس کے شاہد ہیں..... اس رمضان المبارک میں محترمہ کی دو پڑوسن بیگمات کی تشریف آوری کا فخر تربیت گاہ کو حاصل ہو چکا ہے مخدومہ بیگم چودھری محمد رفیع صاحب ممبر اسمبلی اور بیگم سید امتیاز علی تحصیلدار اور عزیز موصوفہ کی ہم وطن یعنی پنجاب کی عزیز بہن بیگم سلطان صاحب [illegible] محمد حسن خاں صاحب مجسٹریٹ کے جو الفاظ شائع ہو چکے ہیں میں ان کا اعادہ اس لئے کہ وہ سراسر میری تعریف ہے مناسب نہیں سمجھتا۔ آخر مارچ میں بیگم عطاء الرحمٰن صاحب سپرنٹنڈنٹ آبکاری نے تربیت گاہ کو دیکھنے کے بعد تانگہ میں سوار ہوتے وقت سپرنٹنڈنٹ صاحب کی موجودگی میں جو الفاظ فرمائے ہیں چونکہ ان الفاظ کا مستحق نہیں اس لئے ان کی اشاعت ضروری نہیں..... یہاں تک پہنچنے کے بعد ایک دوسری بات پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جن بچیوں نے تربیت گاہ میں تعلیم پائی اور پا رہی ہیں وہ اور ان کے ورثا کیا رائے رکھتے ہیں اس سلسلے میں معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر سب سے پہلے

خاں صاحب شیخ عبدالغفور صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ناگپور کا اسم گرامی ہے جن کی بچی نے تعلیم پائی اور بھتیجی تعلیم پا رہی ہے۔ انگولی ضلع سلطانپور (اودھ) کے رئیس قاضی عابد علی صاحب کی بچی دو سال سے تعلیم پا رہی ہے۔ منیر الدین احمد صاحب الحینیش ماسٹر بھیا ضلع شاہ آباد (بہار) کی بچی کا بھی یہ دوسرا سشن ہے جمعیۃ العلماء کے صدر مولوی مفتی کفایت اللہ صاحب نے دہلی میں سینکڑوں مدارس ہونے کے باوجود اپنی بچی کے واسطے تربیت گاہ کو منتخب فرمایا اور یہ بچی زیر تعلیم ہے۔ ڈاکٹر محمد امیر خاں صاحب اسسٹنٹ سرجن (سی پی) کے ہاں کی بچی حلیمہ تیسرا سشن پورا کر رہی ہے۔

یہ توقع کہ میں مسلمان بیبیوں سے تشریف آوری کی التجا کرتا جس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ معائنہ کے بعد چند روپے بطور چندہ عطا فرمائیں یا لڑکیوں کے ہاتھ پہ رکھ دیں غلط سرتاپا غلط قطعی غلط۔ ان یتیم بچیوں کی تحقیر میری اور میرے بچوں کی تحقیر ہے۔ لیڈیز کانفرنس کے موقعہ پر مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ ریاست بھوپال تشریف لائے انھوں نے بچیوں کی تعلیمی حالت ملاحظہ فرمائی۔ اُن کی سلائی وغیرہ کے کام دیکھے۔ سرکار عالیہ کے پرائیویٹ سکریٹری صاحب تشریف فرما ہوئے۔ میں اگر اس خیال کو پسند کرتا تو سرکار عالیہ کے تشریف لانے کی کوشش کیوں نہ کرتا۔ مگر میں اس معاملہ میں جو رائے رکھتا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط۔ میری زندگی تک تو انشاء اللہ وہی قائم رہے گی . . . تربیت گاہ کے دروازے ہر مسلمان مرد عورت کے واسطے کھلے ہیں بشرطیکہ وہ ان کو کلیجہ سے لگانے اور سینہ سے چمٹانے آئیں نہ کہ وہ مغرورانہ انداز سے ان کو حقیر سمجھ کر کچھ روپیہ ہاتھ پر رکھ دیں میں ان کو مسلم

مائیں بنانے کی کوشش کر رہا ہوں ان کو بھیک مانگنی نہیں سکھا رہا کہ ان کی خودداری فروخت کر کے ان کا پیٹ بھروں۔

مضمون کی آخری سطروں میں جس بات پر زور دیا اسے نومبر ۲۸ء میں پھر ان الفاظ میں دہرایا ہے۔

اس سے پہلے بھی میں مسلمانوں سے عرض کر چکا ہوں کہ وہ جس نظر سے قوم کے دوسرے یتیم خانوں کو ملاحظہ فرماتے ہیں اس سے تربیت گاہ کو معاف فرمائیں بلاشبہ تربیت گاہ کے غریب سیکشن کی بچیاں یتیم ہیں کم حیثیت ہیں محتاج ہیں لاوارث ہیں مگر یہ کس وقت آپ سے بھیک مانگنے آئی ہیں جو آپ ان کو ذلیل سمجھیں؟ آپ کو کیا حق ہے کہ ان کی تحقیر کریں؟ آپ کو معلوم ہے میں عام مسلمانوں سے چندہ نہیں لے رہا۔ میں صرف ان مسلمانوں کا روپیہ شریک کرتا ہوں جن کے دل میں درد ہے اور درد میں کرب ان ماؤں کی اعانت چاہتا ہوں جن کی آنکھ میں ماتا کی لہریں موجود ہیں صرف ان مردوں اور عورتوں کے کرم کا خواستگار ہوں جن کے جسم خوف خدا سے کانپتے ہیں"

ایک خط کے جواب میں

"آپ کو دور حاضرہ کے مسلمانوں کی ہر خرابی کی وجہ صرف یہ ملے گی کہ وہ اسلام کے زریں اصول شخصیت پر قربان کر چکے آپ کو شرع اسلام نے اجازت دی تھی کہ آپ عورت کو قبل از نکاح ملاحظہ فرما لیتے اس کے حالات سے باخبر ہوتے اب اگر وہ جاہل یا نااہل ثابت ہوئی تو فرمائیے اس کی ذمہ داری مرد پر کس قدر ہوگی اور عورت پر کس قدر؟۔

میں ایک حال کا واقعہ سناتا ہوں۔ دلی کے مشہور بیرسٹر مسٹر آصف علی کی شادی ایک برہمو سماج لڑکی سے سول میرج ایکٹ کے رو سے قرار پائی لڑکی کی

عمر سولہ سال تھی اور سینہ پر کمیرج پاس۔ شادی کا اعلان ہوا تو مسلمانوں نے اعتراض کیا۔ ہر غیر مسلم حضرات بار ۵ جسٹے اور مقامی سوال بعد ازیں تال ہے ان لوگوں کی پوری جماعت نے مخالفت کی اور نکاح ہو جانے کے بعد بھی اس کے یعنی لڑکی کے حقیقی چچا کی تحریک پر کلکٹر نے ممانعت کا نوٹس جاری کر دیا۔ اب ذرا اس حالت کا اندازہ فرمائیے کہ مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ مینی تال کا فریق مخالف بغلیں بجا رہا ہے۔ ادھر میاں آصف حیران و پریشان ہیں کہ مذہب مقدس اپنے گنہگار بندوں کی حمایت کو سامنے آتا ہے۔ رسول علیہ السلام ایک بوڑھا بیرسٹر کہتا ہے لڑکی کو فوراً مسلمان کرو اور نکاح کرو۔ اسلام نے کھلے ہوئے الفاظ میں اجازت دی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکی اپنے نکاح کی خود مجاز ہے۔ دنیا کے تمام مذہب رکھے کے رکھے رہ گئے۔ لڑکی اُسی وقت مسلمان ہوئی اور نکاح ہو گیا۔ جب دوسرے روز میاں آصف علی غیر مسلم حکام سے ملے تو انہوں نے بھی اعتراف کیا کہ صرف اسلام آپ کو پناہ دے سکتا تھا۔ . . . .

. . . . دلی کی ایک نہایت معزز شریف خاندان کی سیدانی عورت بیوہ ہوتی ہے۔ سال گذشتہ میں ایک صاحب دھوکا دے کر نکاح کر لیتے ہیں اس کا اور اس کی یتیم چھ سالہ بچی کا زیور کھا جاتے ہیں اور اس کے مکان پر جو اس کا تھا اتی ہے یا نسو روپیہ قرض لیتے ہیں۔ ایک عیسائی عورت ارتداد کی ترغیب دیتی ہے۔ عورت عیسائیوں سے آریوں کے پھندے میں پہنچی۔ . . . میں کسی نہ کسی طرح لے کر تربیت گاہ میں لایا۔ وہ اُس مردود سے حاملہ ہے۔ . . .

میں خلع کا مطالبہ کرتا ہوں تو کیا غلط ہے؟

عصمت مارچ ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۸۹

ایک اور خط کے جواب میں

مسز وسا میں ہیں جنہوں نے بھی تربیت گاہ کا بورڈ سکریٹری خزانچی خاک دھول سب ہی کچھ بنایا مگر جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو کام سے بہت زیادہ نام کی ضرورت ہے تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس کا فرضی شوں شاں کو پھاڑ کر پھینک دوں اور ان مسلمانوں کو جن کی زندگی کا مقصد صرف چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے دونوں ہاتھوں سے سلام کروں اور محض اپنے بھروسہ پر جو کچھ کر سکتا ہوں وہ کروں۔ میں اس کے لئے آج بھی تیار ہوں کہ اگر کوئی صاحب پسند کریں تو زیادہ نہیں صرف ایک سال کے واسطے تربیت گاہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور کام کریں۔ مگر آپ کی رائے میں کتنے مرد اور عورتیں مسلمانوں میں ایسی ہیں جو راتوں کو اپنی میٹھی نیند قربان کر کے معصوم بچیوں کو پالنے کی پاخانہ لے جانے کی اور پیشاب کا بچھونا بدلنے کی تکلیف اُٹھائیں گے۔ شیخ عبد الغفور صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کی بچی کی آنکھیں دکھیں ڈاکٹر نے صرف روغنی روٹی اور شکر کھانے کو کہا بچی اندھیرے کمرے میں آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ ماما کھانا لے کر گئی کہ کھلائے۔ اتفاق سے اُدھر ایک اُستانی کسی ضرورت گئی تو دیکھا کہ ماما ایک نوالہ خود کھاتی ہے اور ایک بچی کو دیتی ہے۔ کیا یہ عورتیں اس قابل ہیں کہ وہ بچیاں جو محض میری ذمہ داری پر اپنے ماں باپ سے جدا ہو کر تربیت گاہ میں آئی ہیں ان کے سپرد کر دوں؟ کیا بیگم راشد الخیری صاحب کے سوا جو میری زندگی کی شریک ہیں ———

——— کوئی دوسرا شخص میری ذمہ داری میں شریک ہو سکتا ہے۔ کیا میرا ایمان میرا ضمیر اس کو جائز رکھے گا کہ میں تربیت گاہ کی بچیوں کو خواہ وہ یتیم ہوں یا خوشحال دوسروں پر چھوڑ دوں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو کتنے مسلمان

اپنے کلیجہ کے ٹکڑوں کو بلا اطمینان کلی تربیت گاہ کے سپرد کردیگی
اپنی لڑکیاں تو الگ رہیں یتیم بچوں کے وارث بھی اپنی دُور دراز
کی بچیوں کو اچھی طرح مدرسہ کو پرکھ پرکھا کر ہی حوالہ کریں گے
بالخصوص ان حالات میں کہ لڑکیاں اتنی چھوٹی اور اس قدر
کم عمر ہوں۔ منیر الدین احمد صاحب اسٹیشن ماسٹر بھیا آرہ کی
بچی ٹائی فائیڈ بخار میں مبتلا ہوئی دلی کے مشہور ڈاکٹر محمد عمر
صاحب اور سعید احمد صاحب معالج تھے اور متحیر تھے کہ کس طرح
راشد اور بیگم راشد الخیری اس کی تیمارداری کر رہے ہیں
میں دو سال سے بیت اللہ کا قصد کر رہا ہوں مگر میرے احباب
جن میں مستند علما شامل ہیں یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہم دونوں جو
کچھ کر رہے ہیں یہ بھی حج سے کم نہیں۔

تربیت گاہ کا خرچ چھ سات سو روپیہ ماہوار کے قریب ہے اور اس کی مستقل آمدنی سو روپیہ ماہوار بھی نہیں ہیں اگر کوشش کرتا یا کروں تو بھوپال۔ حیدر آباد۔ ٹونک۔ جاورہ وغیرہ میں ایسے ذرائع موجود ہیں جہاں سے میں بہت کچھ امداد لے سکتا ہوں مگر جب بے لئے یہ یورش ہے تو شاید لینے کے بعد تو مسلمان نہ معلوم میرا اور تربیت گاہ کا کیا حشر کریں۔
میں ان یتیم بچیوں کی خودداری کا جس قدر خیال کرتا ہوں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج تک ان بچیوں کو دلی کے کسی امیر و رئیس کے دستر خوان پر حاضر ہونے کی عزت حاصل نہیں ہوئی باوجود سخت اصرار اور طلبی کو بھی اس کو جائز نہیں سمجھتا میں یہاں تک گوارہ نہیں کرتا جو حضرات تربیت گاہ کے معائنہ کو تشریف لائیں وہ ان بچیوں کے ہاتھ پر کچھ رکھ دیں۔
برقی پنکھے اور خس کی ٹٹیاں مجھے بھی ٹھنڈک پہنچا سکتی ہیں۔ بجلی کی روشنی اور نواڑی پلنگوں پر میں کبھی سویا ہوں مگر آج ہمارے جذبات اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہندوستان بھر کی یہ یتیم و معصوم بچیاں جو تربیت گاہ میں آ رہی ہیں ہمارے کلیجہ کی ٹھنڈک اور آنکھوں کی روشنی ہوں . . . . مگر قلق یہ ہے کہ ہماری تمام امنگیں ہمارے تمام جذبات اور آرزوئیں مسلمانوں کے ہاتھوں خاک میں مل چکیں“ (بنات ماہ جون [illegible] صفحہ [illegible])

تربیت گاہ کے لئے دورے

”مجھے دلی سے باہر نکلے مدتیں ہو گئیں“

گو اس عرصہ میں اپنی ذاتی ضرورتیں بھی بارہا پیش آئیں احباب اور معتقدین کے بھی تقاضے ہوئے مگر گھر سے نکلنے کی ہمت نہ ہوئی اور ہمیشہ اس اصول پر عمل رہا کہ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔ مزاج وحشی اور طبیعت تنہائی پسند کا فدا قلم کے سوا کوئی مونس نہ ہوا۔ تنہائی کی چاٹ اور وحشت کا زور اتنا بڑھا کہ گھر سے نکلنے میں تکلف ہونے لگا۔ اور گنتی کے چند آدمیوں کے سوا ہفتوں کسی سے بات چیت کرنے کی نوبت نہ آئی۔ لوگ ملنے آتے اور دُور دُور سے تو جبراً قہراً ان سے دو باتیں کر لیتا مگر دوران گفتگو میں بھی یہی چاہتا کہ کہیں جلد سلام علیک کی آواز آ جائے اور رخصت ہوں۔
مگر تربیت گاہ کی ضرورت اور تعلیم نسواں کی خدمت نے طبیعت کو درست کر دیا اور جب دو صاحبوں نے یہ لکھ دیا کہ بچیاں حاضر ہیں مگر پہنچانے کی استطاعت نہیں خود آیئے اور لے جایئے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ باہر نکلوں اور مسلمانوں کو تعلیم نسواں اور تربیت گاہ پر متوجہ کروں

سیاحت ہند ———— (عصمت ۱۹۲۳ء)

علامہ مغفور کی رحلت کے بعد ۱۹۳۶ء میں جب میں نے اُن کے وہ مضامین جو سیاحت کے عنوان سے عصمت و بنات اور دوسرے پرچوں میں شائع ہوئے یکجا کر کے کتابی صورت میں بعنوان ”سیاحت ہند“ کے تو دیباچہ میں لکھا تھا کہ

"... ان خصوصیات سے مصنف کی طبیعت کا بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ نام و نمود خود نمائی و خود پسندی سے انھیں کس قدر نفرت تھی میل جول بڑھانا اور وسیع تعلقات کا تو کیا ذکر نئے لوگوں سے جو اُن کے قدردان اور اُن کی فضیلت کے معترف تھے ان سے ملنے سے بھی تکلف فرماتے تھے ..... مگر جب ١٩٢٢ء میں تمام ہندوستان کے مسلمان بچیوں کا مدرسہ قائم کیا تو اُس کی ضرورتوں نے دلّی سے باہر دورہ پر تشریف لے جانے پر مجبور کیا۔ شہری لڑکیاں ٢٥ سے ٥٠ تک ہوتی تھیں۔ ان سے کبھی فیس کا ایک پیسہ نہ لیا گیا۔ بورڈرز بچیوں میں جو کم استطاعت ہوتی تھیں ان کے والدین بآسانی جو کچھ دے سکتے تھے وہی لیا جاتا تھا۔ یتیم و نادار بچیوں کے تمام اخراجات کا مدرسہ کفیل تھا اور یہ سب کی یہ تمام خصوصیات اس وجہ سے تھیں کہ مسلمان بچیاں مالی حالت درست نہ ہونے کی وجہ سے زیورِ تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ دلّی کے محکمۂ تعلیم کے سپرنٹنڈنٹ اور انسپکٹرس نے تربیت گاہ کے طریقۂ تعلیم وغیرہ کی بہت تعریف کی مگر امداد اس وجہ سے نہ دی کہ نصاب سرکاری نہ تھا۔ خواتین ہند کے محسن اعظم کی تصانیف اور رسالوں سے اگرچہ مدرسہ کو امداد مل رہی تھی لیکن وہ تمام اخراجات کے لئے کسی طرح بھی پوری نہ ہو سکتی تھی المختصر اپنی وضع اور طبیعت کے قطعی خلاف تربیت گاہ کے لئے ہندوستان کے مختلف صوبوں کا حضرت علامہ مغفور نے دورہ فرمایا مگر اس دورہ میں چند اصول ہمیشہ ساتھ رہے"

فروری ١٩٢٥ء کے عصمت میں تحریر فرمایا تھا۔

"میں نے اخبارات میں اعلان کر دیا تھا کہ میں ایک طویل دورہ کرنے والا ہوں جس میں میرے سامنے دو مقصد ہوں گے۔ پہلا مقصد یہ کہ جو حضرات میری رائے سے متفق اور میری ذات پر بھروسہ رکھتے ہوں مالی اعانت میں شریک ہوں۔ دوسرا یہ کہ مسلمان اپنی بچیوں کو جہاں تک ممکن ہو نہ ہی تعلیم سے محروم رکھیں اور حالات موافقت کریں تو تربیت گاہ میں بھیجیں۔"

"شہر ہوتے یا چھوٹے چھوٹے گاؤں جن کو خدا نے تھوڑا بہت ذوقِ ادب عطا فرمایا تھا یا جنھیں عورتوں کی صحیح ترقی کا کچھ خیال اور خواتینِ ہند کے محسن اعظم کی خدمات کا کچھ احساس ہوتا وہ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جو خواتین و حضرات اُن کی سیاحت میں کسی قسم کی سہولت بہم پہنچاتے۔ اُن کے آرام کا خیال رکھتے یا خلوصِ قلب سے اُن کے مقاصد کی تکمیل میں حصہ لیتے یا اپنا وقت ان کی خدمت میں یا ان کے کام میں صرف کرتے" (دیباچہ سیاحت ہند صفحہ ٢) اُن کے اسمائے گرامی اور اُن کا ذکر عصمت و بنات کے صفحات اور کتاب سیاحت ہند کے اوراق میں آج بھی موجود ہے۔

١٩٣٥ء تک مختلف مقامات کے جو دورے علامہ مغفور نے کئے وہ چار چار پانچ پانچ روز کے ہوتے تھے یا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کے اور سال میں تین چار دفعہ سفر کی تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ ١٩٢٦ء سے والدہ مرحومہ بھی اُن کے ساتھ جاتی تھیں اور اُن کی وجہ سے لوگ مطمئن ہو کر خوشحال اور کم استطاعت والدین اپنی بچیوں کو تربیت گاہ میں بھیجتے تھے۔ ١٩٢٩ء سے ١٩٣٣ء تک یہ پانچ سال ایسے گذرے کہ اگست ستمبر کی چھٹیوں میں جب بورڈنگ بند ہوتا تھا پانچ چھ ہفتے طویل دورہ کیا جاتا تھا۔ ١٩٢٥ء سے میں بھی ساتھ ہوتا تھا والدین کی خدمت ہر ممکن طریقہ سے اولاد کا فرض ہے اور اسی احساس

کی بنا پر میں اپنے دفتر سے مہینہ سوا مہینہ غیر حاضر رہتا تھا۔

محترمہ و۔ا بلقیس بیگم

زنانہ رسائل کی مشہور و معروف مضمون نگار محترمہ و۔ا بلقیس بیگم منفی کامل ۱۹۲۶ء میں دلّی تشریف لائیں اور تربیت گاہ کی ہیڈ معلمہ کی جگہ قبول فرمائی۔ علامہ مغفور نے ان کے متعلق ایک نوٹ یہ شائع کیا تھا۔

"محترمہ بلقیس بیگم صاحبہ و۔ا کی تشریف آوری سے جو فائدہ تربیت گاہ بنات کو پہنچا اور پہنچ رہا ہے وہ الفاظ میں مشکل سے ادا ہوگا۔ عزیزہ موصوفہ پر اکثر اعتبار سے خدا کا فضل ہے مالی حالت کے اعتبار سے اُن کی بیوگی لاکھوں سہاگنوں سے بہتر ہے مگر اُن کا یہ جذبہ کہ باقی وقت مسلمان بچیوں کی خدمت میں بسر ہو کروڑوں مسلمان عورتوں میں عدیم النظیر ہے۔ پچھلے دنوں جب تربیت گاہ کی ایک بورڈر میاں عبدالحمید بی اے ال ال بی کی بچی ممتاز سلطان سلمہا دفعتہً بخار میں مبتلا ہوئی اور حرارت ۱۰۴ سے زیادہ ہوئی تو وہ باوجود ماماؤں اور دوسری عورتوں کی موجودگی کے اپنا گھربار چھوڑ چھاڑ پیاری ممتاز کو اپنے ساتھ لے کر سوئیں اور جس توجہ سے اُس کی تیمارداری کی میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ خداوند کریم بلقیس بیگم کی عمر میں برکت دے اور تربیت گاہ اُن کی بیش بہا خدمات سے ہمیشہ مستفید ہو" (عصمت فروری ۱۹۲۷ء صفحہ ۱۵۲)

جشن معراج

۱۹۲۹ء سے تربیت گاہ میں ۲۷ رجب کو بہت اہتمام سے جشن معراج منایا جاتا تھا۔ جس میں نہ صرف شہر کی بیگمات تشریف لاتی تھیں بلکہ بیرون دہلی سے بھی۔ مگر اس موقعہ پر بھی تربیت گاہ کے لئے کوئی چندہ نہیں کیا جاتا تھا۔

۱۹۳۰ء کا سالانہ امتحان

"میں جب سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قومی تعلیم دھاڑ اور غل غپاڑے نے مسلمانوں کو پریشان کر دیا اس وقت سے تربیت گاہ کی کوئی مراسلت کسی اخبار میں نہیں بھیجتا اور نہیں چاہتا کہ ان کے اکارین اپنی طرف سے ایک اور اضافہ کروں گو میں نے تربیت گاہ کی امداد عام تو کبھی نہیں کی اور حتی الوسع اس کو اپنے حلقہ تک محدود رکھا تاہم میرا خیال یہ ہے کہ تربیت گاہ جہاں تک اس کے امکان میں ہو نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے۔ تعریفوں کے پل باندھنے اور لمبی چوڑی رپورٹوں کی نقل اور مشتہر کرنے سے میری طبیعت ہمیشہ گریز کرتی ہے اور میں ....

تربیت گاہ کو اپنے نقطۂ نظر سے اب تک پوری طرح کامیاب نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً مدرسہ اور بورڈنگ کے مکانات ہی ناقص اور بوسیدہ ہیں لیکن بعض حالات اس بُری طرح مجھے مجبور کرتے ہیں کہ اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ اپنی طبیعت کے خلاف تربیت گاہ کی تعریف اور توصیف اور اس کی خدمات شائع کروں۔

سالانہ امتحان کے موقع پر میں سربرآوردہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت منتخب کر لیتا ہوں جن کو لڑکیوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے اور تربیت گاہ کی کوششوں میں میرے ہمنوا ہیں چنانچہ اس موقعہ پر بھی حضرات ذیل ۱۳ رہ بروہ اپریل تشریف فرما تھے۔ برادر محترم خان بہادر کپتان۔ مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں سی آئی ای اوبی ای رجسٹرار۔ مسٹر ایم رضا اللہ بی اے۔ سی۔ ای۔ انجینیر۔ مولانا محمد جعفری صاحب ایڈیٹر روزنامہ ملت۔ اور پروفیسر ایم آر خاں صاحب دہلوی۔

مولوی رضا اللہ صاحب بی اے انجینیر جن کی بچی

تربیت گاہ کی تعلیم یافتہ ہے اور جس کے دل میں قوم کا تمنا
درد موجود ہے۔ افتراض امتحان کے بعد شمر ہے کہ ہر ڈ کی
رائے تمام اخبارات میں شائع ہو۔ میں نے مخالفت کی اور
کہہ دیا کہ صحیح اور غلط سے بحث نہیں میری رائے غلط سہی
مگر میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں اور آپ حضرات کے
اصرار پر عصمت میں شائع کر دوں گا۔" (عصمت مئی [illegible])

"مدرسہ کی شاندار کامیابی کے بعد اب ہم تربیت گاہ
ے یتیم سیکشن پر متوجہ ہوتے ہیں۔ قوم میں بہت سے یتیم
انے اور لڑکیوں کے سینکڑوں مدرسے کام کر رہے ہیں
ر ہر مدرسہ اور یتیم خانہ بجائے خود کسی نہ کسی خدمت کا
ی ہے مگر تربیت گاہ کی خدمات کا یہ حصہ جس کے یتیم خانہ
ں قریب قریب ہر لڑکی اپنے ساتھ انقلاب کی ایک تاریخ
ھتی ہے خصوصیت سے ہمارے متوجہ ہونے کا مستحق ہے
ے پور کے سررشتہ دار کی لڑکی یوپی کے ایک معزز اہلکار
لیس کی دو لڑکیاں پنجاب کے ایک ڈاکٹر کی بچی ہماری
نکھوں کے واسطے ایک سبق ہے اور یہ وہ بچیاں ہیں
ہ اگر تربیت گاہ کا وجود نہ ہوتا تو یقیناً یہ مسلمانوں کے
معمولی یتیم خانوں میں جانے والی نہ تھیں مرتد ہوتیں
ور جو نقصان ہم کو پہنچتا اس کی تلافی آسان نہ تھی۔
ماری رائے میں اس اعتبار سے تربیت گاہ کی یہ نمایاں
صوصیت ہے کہ جھوٹی نمائش یہاں نظر نہیں آتی اور
ستمول اور یتیم بچوں میں کوئی غیر معمولی فرق نہیں ہے میں نے
غالباً کسی انگریزی اخبار میں اپنی ایک بہن کے یہ الفاظ
تربیت گاہ کے متعلق پڑھے تھے کہ شہر کے تیرہ و تاریک
محلہ میں ایک بوسیدہ مکان کی دیواریں ان مسلم جواہر
کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ آج میں ان ہی الفاظ
کا اعادہ کرتا ہوں کہ خدا وہ مبارک گھڑی جلد لائے جب

علامہ راشد الخیری اور ان کی بیگم صاحبہ کی یہ خاموش
محنت بارآور ہو۔ خدائے عزوجل ان کی عمروں میں برکت
اور ہم کو توفیق دے کہ ہم اس ضروری کام میں ان کا ہاتھ
بٹا کر انسانیت کا فرض ادا کریں۔ اور ان معصوم صورتوں
پر اپنی تھوڑی سی مسرت روپیہ کی صورت میں قربان کریں۔
رضا اللہ (بی اے سی ای) (عصمت مئی [illegible])

اورنگ آباد دکن کی بورڈر خوش حال بچی

"عصمتی بہنوں اور بناتی بچیوں کو یاد ہوگا کہ نومبر [illegible] میں
اورنگ آباد دکن کے مشہور وکیل مرزا رحیم بیگ صاحب کا خط
اشاعت کی غرض سے آیا تھا۔ مرزا صاحب نہایت پختہ خیال
اور ذی فہم مسلمان ہیں۔ ان کے دل میں قوم کا حقیقی درد
موجود ہے۔ اور جو کامیابی ان کو اپنے فن میں حاصل ہوئی
ہے۔ وہ محض ان کے خلوص اور سادگی کا نتیجہ ہے مرزا
صاحب کو تعلیم سے خاص دلچسپی ہے ان کے دو بچے ولایت
میں تعلیم پا رہے ہیں۔ سال گذشتہ میں انھوں نے اپنی
آٹھ سالہ بچی حمید النسا بیگم کو ہندوستان کی ایک مشہور
زنانہ درسگاہ میں بھیجا۔ مگر بچی کی واپسی پر ان کو اس درسگاہ
کے متعلق ایسی سخت شکایات پیدا ہوئیں کہ وہ اس کے
خلاف مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے میں نے مرزا صاحب
سے درخواست کی کہ اظہار شکایت کی بجائے اگر اصلاح
پر توجہ فرمائیے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ میں مرزا صاحب
کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری درخواست منظور فرمائی
اور وہ شکایت رفع دفع ہو گئی۔ سال گذشتہ کے دورہ
میں جب میں اورنگ آباد پہنچا تو مرزا صاحب ہی کے یہاں
مقیم ہوا اور بیگم راشد الخیری صاحبہ سے مل کر مرزا صاحب
کی محترم بیگمات نے حمید النسا بیگم کو تربیت گاہ میں بھیجنے کا

مصمم قصد کر لیا۔ چنانچہ یہ کی سسٹن پورا کرنے کے بعد تعطیل کلاں کے سلسلے میں اپنے گھر گئی تو مرزا صاحب نے اس کی واپسی پر جو خط لکھا میں اس کو صرف اس لئے درج کرتا ہوں کہ حیدرآباد کے ایک دو صاحبوں نے تربیت گاہ پر اعتراضات فرمائے تھے اور میں نے جواب میں عرض کیا تھا کہ ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ جو مناسب سمجھے فرمائے مگر مجھ سے زبانی جواب کی توقع نہ رکھے میں عملی جواب دینا بہتر سمجھتا ہوں! اگر عام مسلمانوں کو نہیں تو عصمتی بہنوں اور بناتی بچیوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس قسم کی شہرت اور غل غپاڑہ کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ اور یہ خط بھی بدرجہ مجبوری شائع کرتا ہوں"

جناب مولانا دام ظلہم۔ سلام علیک۔ حمید النساء بیگم مع الخیر پہنچیں وہ آپ کے یہاں سے بہت خوش آئیں۔ آپ نے اور آپ کی بیگم صاحبہ جس محبت و بزرگانہ شفقت سے اس کو تعلیم و تربیت دی اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(مرزا رحیم بیگ) عصمت اگست ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۷۴

فتنۂ ارتداد کا مقابلہ

تربیت گاہ بنات کے بورڈنگ میں صرف خوش حال کم استطاعت اور نادار و یتیم بچیاں ہی نہ تھیں تربیت گاہ مسلمان لڑکیوں کو مرتد ہونے سے کس طرح بچا رہی تھی اس کا ایک واقعہ پہلے درج کیا جا چکا ہے علامہ مغفور ہی کے الفاظ میں ایک اور واقعہ ۱۹۳۱ء کا یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"بردوان کے ایک اسٹیشن ماسٹر صاحب نے جن کی بابت سُنا ہے کہ نہایت متمول آدمی ہیں پہلی بیوی کے انتقال کے بعد جو شاید ایک بچی چھوڑ مری تھی دوسرا نکاح ایک نوعمر لڑکی سے کیا۔ سوتیلی ماں کے مقاصد کی تکمیل میں سوکن کی بچی روڑا بن کر اٹکی۔ نفسانیت کی آنکھوں کو زندگی کی پُر لطف سیجوں پر بن ماں کی بچی کانٹا نظر آئی اور قلب نا انجام نے جو ایمان وانصاف اور رحم وانسانیت سے قطعاً محروم تھا مطالبہ کیا کہ راستہ صاف ہو اور مرحومہ ماں کی زندہ بچی ایسی جگہ ماری جائے جہاں پانی تک نصیب نہ ہو۔

میں مستجاب الدعوۃ ہوتا تو کہتا کہ آسمان پھٹ جاتا زمین شق ہو جاتی جب اپنے صنف کی دختر کو مجروح کرنے والی ماں کے زبان سے یہ الفاظ نکلے" کہ پانچ سو روپے اس شخص کو دوں گی جو اس بچی کو ایسی جگہ چھوڑ آئے کہ یہ پھر یہاں نہ آسکے...... آج اس غیور قوم کا ایک فرد سلطان نامی چند نقرئی یا طلائی سکوں کی توقع پر دولت النساء بیگم کو جس کی عمر میری رائے میں تیرہ سال کے قریب ہوگی بردوان سے لے کر چلا اور ملک کی دوسری سمت مظفر نگر کے اسٹیشن پر چھوڑ کر چمپت ہوا۔ لڑکی کا بیان ہے کہ مجھے ماں نے یہ کہہ کر بھیجا کہ میری بہن نے تجھے بلایا ہے۔ چند روز کے واسطے وہاں چلی جا۔ مظفر نگر کے اسٹیشن پر سلطان پانی کا لوٹا لے کر غائب ہو گیا۔

حیران و پریشان لڑکی اسٹیشن پر چاروں طرف روتی پھرتی تھی کہ ایک شخص دامودر کے ہتھے چڑھی جس نے اس کو مظفر نگر کی مشہور طوائف بلاقن کے ہاتھ فروخت کر دیا آخر کار وہ رات آگئی جب روسیاہ سوتیلی ماں کے مظالم کی شکار بچی دولت النساء بیگم کو اپنی تحفظ عصمت کے واسطے شور مچانا پڑا اور مسجد سے کچھ آدمی اس کی حمایت کو پہنچے اور معاملہ پولیس کے سپرد ہوا۔ کلکٹر مظفر نگر نے لڑکی کے باپ کو اطلاع دی جس کا جواب سنکر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس نے لکھا کہ لڑکی میری ہے مگر میں اس سے کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہتا"

مجھے اس مقدمہ کا علم ہو چکا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ قرعہ فال میرے نام نکلے گا کلکٹر صاحب نے تقریب قریب تمام

متعلقین کی واپسی اور لڑکی کے واسطے حکم دیا کہ تربیت گاہ بنات میں مولانا راشد الخیری کے سپرد کی جائے۔ میں تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کی طرف سے کلکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک مسلمان لڑکی کو ان مصائب سے رہائی دلوائی گو اس بچی کا داخلہ تربیت گاہ کے قواعد کے خلاف ورزی ہے کیونکہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہے لیکن ان حالات میں خلاف ورزی کرنی لازمی تھی چنانچہ ۳ اگست کو یہ لڑکی دولت النسا بیگم عرف کنیز تربیت گاہ بنات میں داخل ہو گئی۔"

(عصمت نومبر ۱۹۳۱ء)

"...... مسلمانوں کو اصغری بیگم کا ارتداد یاد ہو گا۔ جس نے تمام ہندوستان میں آگ لگا دی تھی ..... اگر تربیت گاہ بنات کا وجود نہ ہوتا تو دولت النسا بیگم عرف کنیز فاطمہ کا دوسرا ارتداد بھی وہ سن لیتے یہ وہ لڑکی ہے جو کلکٹر مظفر نگر کے حکم سے باوجود غیر مسلموں کی انتہائی کوشش کے میرے سپرد کی گئی ہے یہ لڑکی بردوان کے ایک تعلیم یافتہ معزز متمول باپ کی بیٹی ہے مگر میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اس کے نکاح کی تجویز کی اور اس نے بیگم راشد الخیری صاحبہ سے کہا کہ اسلامی نکاح کے مقابلے میں موت بہتر ہے۔ یہ لڑکی تربیت گاہ کے واسطے سانپ کی چھچھوندر بن گئی ہے غیر مسلم اس کے حصول کی کوشش میں سرگرم ہیں ورثہ کا پتہ نہیں۔ نکاح کرتی نہیں ہیں اگر صرف اس کو ارتداد سے بچانے میں کامیاب ہو گیا تو سمجھوں گا کہ تربیت گاہ کی تمام محنت وصول ہو گئی۔" (عصمت نومبر ۱۹۳۱ء)

مسلمانوں کی ذہنیت اور مشن ۱۹۳۱ء کی بچیاں

"جس طرح شادی بیاہ کے موقعوں پر ایک مسلمان کا بڑا فرض یہ ہے کہ وہ فریقین کو گمراہ کرے اور لڑکے لڑکی میں ایسے عیب پیدا کر دے کہ تجویز مسترد ہو جائے۔ اسی طرح اس کا کام یہ بھی ہے۔ خود کوئی کام نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا کرنے کا ارادہ کرے تو اس میں روڑے اٹکائے۔ میں نے اپنی طرف سے اپنے بھائیوں کو اس زحمت سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تربیت گاہ کے متعلق کسی دوسرے پرچے میں لکھنا چھوڑا عام چندہ سے پرہیز کیا۔ اور مجبور ہو کر یہاں تک اعلان کر دیا کہ جن صاحب کو مجھ پر اعتماد ہو وہ روپیہ دیں اور جن کو مجھ پر بھروسہ ہو وہ اپنی بچیاں بھیجیں۔ مگر اس ذہنیت کا کیا علاج نہ پہچان نہ واسطہ نہ غرض اڑنگا لگانا ضرور۔

اس سلسلے میں محمد ناظم خان صاحب سینٹری انسپکٹر سرسگنڈہ (بہار) کی داستان نہایت دلچسپ ہے۔ جو ۱۱ اکتوبر کی صبح کو اپنی بچی صدیقہ خاتون کو لے کر دہلی تشریف لائے۔ وہ فرماتے تھے کہ تین چار اسٹیشن چل کر جب ہم کو ایک جنکشن پر گاڑی بدلنی پڑی تو وہاں کے ایک ریلوے عہدیدار نے فرمایا" میں دہلی کا رہنے والا ہوں راشد الخیری اور تربیت گاہ سے خوب واقف ہوں۔ آپ کیا غضب کرتے ہیں کہ بچی کو وہاں لے جا رہے ہیں۔ وہاں تو ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے" میں نے عرض کیا کہ اب میں جا کر خود ہی دیکھ لوں گا۔ آگے بڑھ کر چونکہ گاڑی دہلی رات کو پہنچتی تھی وہ دہلی اتر گئے۔ یہاں ریاست چرکھاری کے مہاراج تشریف لائے ہوئے تھے اور ان کے اسٹاف میں ایک صاحب ان کے عزیز تھے۔ دوران گفتگو میں ایک صاحب نے فرمایا حضرت مدرسہ کا وجود ہی نہیں۔ آپ کہاں جا رہے ہیں حیران ہونا ہے تو جائیے" انھوں نے فرمایا کہ جناب کیا عرض کروں۔ خیر اب خود جا کر

دیکھ لوں گا۔ چنانچہ وہ خود ان کی بیگم صاحبہ ان کے بھائی بھاوج یہ سب تشریف لائے اور آج چار روز سے تربیت گاہ کے مہمان ہیں اور میرے اصرار پر صرف اس لئے کہ بچی اچھی طرح مانوس ہو جائے۔ تین چار روز اور قیام فرمائیں گے۔ انھوں نے تعجب سے یہ تمام واقعات سنائے اور کہا مسلمانوں کی ذہنیت کو کیا ہوگیا۔

خوش حال سیکشن میں اس وقت تک نئی بچیوں میں میر سعید حسن صاحب گورنمنٹ پریس شملہ۔ مولوی مقبول احمد صاحب محلہ حکیم رحمت اللہ لدھیانہ پنجاب اور محمد ناظم خاں صاحب ستر اسگڈھ (بہار) کی بچیاں داخل ہو چکی ہیں" (عصمت نومبر ۱۹۳۱ء)

آمد خرچ کا حساب

حالانکہ علامہ مغفور تربیت گاہ کے لئے عام چندہ نہ کرتے تھے اور بار بار یہ اعلان کیا کہ جس کو مجھ پر اعتماد ہو صرف وہ چندہ دے جسے ذرا بھی شک ہو وہ چندہ نہ دے۔ میں حساب شائع کرنے کا پابند نہیں اس کے باوجود وہ سالانہ آمد خرچ کا حساب رسالہ بنات میں شائع فرما دیتے تھے۔ آمدنی کا سالانہ اوسط چھ ہزار روپیہ بھی نہ تھا۔ ایک تہائی سے بھی کم آمدنی بذریعہ منی آرڈر ہوتی اور دو تہائی رقم وہ اپنے دورے میں فراہم کرتے اور عصمت سے لیتے تھے سوائے چند خوش حال بورڈر بچیوں کے کسی سے کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ مکان کا کرایہ۔ تین تین چار چار اُستانیوں کی تنخواہیں۔ چپراسن۔ ڈولی کے کہاروں کی تنخواہ یا گھوڑا گاڑی کا خرچ۔ ٹاٹ دریاں۔ کتابیں۔ کاپیاں۔ چارٹ۔ نقشے۔ مرمت سفیدی۔ کاغذ چھپائی۔ ڈاکخانہ کے ٹکٹ۔ ڈاکٹر۔ دوائیں۔ یتیم نادار بچیوں کا نہ صرف کھانا بلکہ لباس، بستر، بچھونا ان سب پر پانسو روپے ماہوار سے زیادہ ہی اٹھتا تھا اور مدرسہ اکثر و بیشتر مقروض رہتا اور تنخواہیں کئی کئی ماہ کی چڑھ جاتی تھیں کوئی مستقل آمدنی تو تھی نہیں۔ تربیت گاہ بنات کی ضرورتیں ہی طول طویل دورے کے لئے علامہ مغفور کو مجبور کرتی تھیں۔ ۱۹۳۲ء میں جب آمد و خرچ کا حساب شائع کیا گیا تو اس کے ساتھ علامہ مغفور نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا۔

"میں نے جس وقت تربیت گاہ قائم کرنے کا قصد کیا تھا تو میرے سامنے صرف ایک چیز تھی اور وہ یہ کہ یہ یتیم نادار لاوارث بچیاں جو دن بھر خاک اڑاتی پھرتی ہیں اور جن کی جہالت کے کرشمے ان کے پیٹ سے قوم کے بدترین بچوں کی صورت میں پیدا ہو رہے ہیں کسی طرح انسانی صورت اختیار کریں اور صحیح کے مسلمان ہوں میں ایک حد تک اس کوشش میں کامیاب ہوا اور مدرسہ کے یتیم سیکشن میں ملک کے اکثر حصوں سے بچیاں آئیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مجھ جیسی حیثیت کا آدمی جو مالدار نہیں تو فقیر بھی نہیں ہے ان تمام چالیس سالہ خدمات کے بعد جو انجام دے چکا ہوں اس عمر میں کہ اب سب کچھ ختم کر چکا ہوں خیال کرتا تھا کہ تربیت گاہ کی مالی مشکلات میرے سامنے نہ آئیں گی اور چند ہی روز میں مدرسہ کو پونا اور ڈیرہ دون کی طرح ایک نہایت نمایاں درسگاہ بنادوں گا میں خوب سمجھتا تھا کہ سرکاری اعانت مذہبی نصاب کی وجہ سے مجھے نہ ملے گی مگر اس کمی کو میں اپنی جیب سے پورا کرنے کے لئے تیار تھا اور کر رہا ہوں مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ مسلمان مسلمانوں کی تعلیم پر تو کیا یتیموں کی تھوک پر بھی نہ پسیجیں گے۔ اور تربیت گاہ کا یتیم سیکشن روٹیوں کا محتاج ہوگا اور اس پیرانہ سالی میں گھر سے باہر قدم رکھنا میرے لئے مصیبت ہے ہر سال دریوزہ گری کروں گا

میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے پاس بہ کام میں روڑا اٹکانے کے سوا کچھ نہیں ہے ان کے بغض و کینہ کی داستانیں ان کی ہرا گھمں اور درسگاہ کی دیواریں جرائد اور پمفلٹ سنا رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں بار بار اعلان کرتا تھا کہ صفائی قلب کے ساتھ جو مسلمان آئے گا تربیت گاہ کے حساب کو آئینہ کی طرح صاف دیکھے گا۔ لیکن رخنہ و فساد کی نیت سے کوئی شخص حق نہیں رکھتا تھا کہ مجھ سے حساب طلب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ میں صرف ان لوگوں کا روپیہ تربیت گاہ میں شریک کر رہا ہوں۔ جن کا مجھ پر اعتماد ہے چنانچہ اسی سبب سے میں نے تربیت گاہ کے لئے عام مسلمانوں سے اپیل کی نہ ایسے شخص کا چندہ لیا جو مجھ سے یا میرے کام سے واقف نہیں ہے۔ ایک عزیز بچی جو بردوان کے کسی ڈپٹی کلکٹر کی صاحبزادی ہیں۔ تربیت گاہ کی مدد کے واسطے پوری طرح آمادہ ہوئیں اور انھوں نے خواہش کی کہ اخبارات میں لکھیں مگر میں نے اس کو جائز نہ سمجھا۔ یہ جو کچھ روپیہ تربیت گاہ میں وصول ہوا یہ زیادہ تر ناظرین عصمت و بنات کا ہے یا ان کی وساطت کا جو بذریعہ منی آرڈر وصول ہوا۔ میں اپنے دورہ میں بھی انھیں مسلمانوں کی اعانت کا طلب گار رہا جو عصمت و بنات کے ذریعہ تربیت گاہ کی ناچیز خدمات سے باخبر ہیں۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جو حضرات کبھی ایک پیسہ چندہ نہ دیں وہ اعتراض کرنے کو سب سے پہلے موجود ہیں۔ میں نے جالندھر میں ایک صاحب سے شکایت سنی خوش قسمتی سے اسی ہفتہ میں جالندھر کے مشہور رئیس خاں صاحب محمد غلام حسن خاں صاحب تربیت گاہ میں تشریف لائے اور ان کو تعجب ہوا کہ کس طرح ایسی درسگاہ کی کوئی شخص شکایت کر سکتا ہے، اس طرح کوئی جیتا بیٹھا نہیں جاتا کہ قوم کے معزز افراد تربیت گاہ کا معائنہ فرما کر اس کے مداح نہ ہوں۔ مگر خدا رحم کرے اس قوم پر جس کا کام محض انہدام و بربادی ہو تعمیر و آراستگی نہ ہو۔ میں آج بھی وہی اعلان کرتا ہوں جو اس سے پہلے کئی بار کر چکا ہوں کہ مخالف حضرات میں سے نہ میں کسی کی رائے پر عمل کروں گا نہ کسی کو حق حاصل ہے کہ وہ انتظامی معاملات میں دخل دے۔ اس کے متعلق وہ حضرات جن کی بچیاں تعلیم پا چکی ہیں یا اب تک ہیں مسلمانوں سے پھر التجا کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے وہ اپنی لغویات سے مجھے پریشان نہ کریں کبھی حساب کا اڑنگا لگا دیں کبھی انتقام کی پھانس چبھو دیں کبھی ذاتی خدمت کے لئے یتیم بچیوں کا مطالبہ کریں کبھی شادی کے واسطے لڑکی تلاش فرمائیں۔"

(بنات اپریل ۱۹۳۲ء)

مختلف مقامات کی بورڈرز بچیاں

(اپریل ۱۹۳۲ء کے بنات میں)

دو فہرستیں بورڈرز بچیوں کی شائع ہوئی تھیں۔ ۱۹۲۸ء تک کسلیا ضلع میرٹھ۔ بڑودہ۔ جے پور۔ شاہجہاں پور۔ قائم گنج۔ لاہور۔ سورت۔ آگرہ۔ بیاول (خاندیس) جل گاؤں (خاندیس) سیونی (سی پی) دھمتری رائے پور۔ حیدر آباد دکن۔ ناگپور۔ سلطان پور اودھ۔ (آرہ بہار)۔ بھرت پور۔ مادھو پور (راجپوتانہ) علی گڈھ کی بچیوں کے اور ان کے باپوں یا سرپرستوں کے نام شائع ہوئے تھے۔ دوسری فہرست ان بچیوں کی تھی جو اکتوبر ۱۹۲۷ء سے ستمبر ۱۹۳۱ء تک تربیت گاہ کے بورڈنگ میں ایک یا دو یا تین سال یا اس سے بھی زیادہ مدت رہی تھیں۔ وہ بچیاں کھنڈوہ (سی پی) سیف اللہ گنج (یوپی) انبالہ۔ فرخ آباد فتح گڈھ۔ میرٹھ۔ جبل پور۔ سہارنپور۔ لاہور۔ گورداسپور۔

بدو ملہی (سیالکوٹ) تھرپارکر (سندھ) کلکتہ۔ مانگرول۔ گنگاپور سٹی۔ بھوپال۔ پنجاب۔ اورنگ آباد دکن۔ صاحب گنج۔ (بنگال) اور ناگپور کی تھیں۔ ان میں خوش حال بھی تھیں۔ کم استطاعت بھی۔ نادار اور یتیم بھی اور وہ بھی جنھیں تربیت گاہ پناہ نہ دیتی تو عیسائیت یا ہندو دھرم کی آغوش میں پہنچ جاتیں۔

ایک سید صاحب کی ناراضگی

"میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ جب کبھی کوئی بات اپنے خلاف میرے علم میں آئے ناظرین و ناظرات تک پہنچا دوں تا کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ بعض حضرات مجھ کو ایسا بھی سمجھتے ہیں"

عصمت اکتوبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۷۰

سنہ ۱۹۳۲ء میں دو روز کے لئے شاہجہاں پور کا دورہ فرمایا تھا اور وہیں ایک سید صاحب کا عتاب نامہ ملا تھا۔ جس کے مفصل جواب کا ضروری اقتباس یہ ہے:۔

بیگم راشد الخیری کے ہمراہ ہونے پر آپ معترض ہیں۔ غالباً عصمت و بنات کے ملاحظہ کی آپ کو فرصت نہیں ہوتی ان کی موجودگی مجھ سے زیادہ ضروری ہے صرف ایک دفعہ وہ میرے ہمراہ نہ تھیں ہر سمت سے لڑکیوں کی یہ صدا بلند ہوئی کہ جب تک بیگم صاحبہ ساتھ نہ ہوں آپ کا دورہ بے سود۔ میں صرف مردوں تک پہنچ سکتا ہوں مدرسہ کی کیفیت اور بچوں کی حالت تو وہی بتا سکتی ہیں اور عورتوں کا معلوم ہونا مردوں سے کم ضروری نہیں مائیں خواہ وہ مفلوک الحال ہوں یا خوش حال جب تک اپنا اطمینان نہ کر لیں اور یہ نہ دیکھ لیں کہ ہم اپنا کلیجہ کا ٹکڑا جس عورت کے سپرد کر رہے ہیں وہ کس طبیعت اور کس عادت کی ہے اس وقت تک بچیاں کس طرح بھیجی جا سکتی ہیں اور اس کا پورا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوگا۔

دکن اورنگ آباد کے مشہور وکیل مرزا رحیم بیگ صاحب نے جن کے دو بچے ولایت میں تعلیم پا رہے ہیں مجھ کو ایک مشہور زنانہ مدرسہ کے خلاف اپنی بچی کے متعلق ایک شکایت بہ غرض اشاعت بھیجی میں نے جواباً عرض کیا کہ اس مضمون کی اشاعت سے مدرسہ کو نقصان پہنچے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے وجود سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچ رہا ہے اس کی تلافی کس طرح ہوگی۔ آپ اگر پسند کیجئے تو بچی کو تھوڑے روز کے واسطے تربیت گاہ میں بھیج دیجئے مرزا صاحب نے مجھ کو یا تربیت گاہ کو جواب کے قابل بھی نہ سمجھا مگر جب ہم اورنگ آباد گئے تو ان کی بیگمات نے بیگم راشد الخیری سے ملتے ہی فیصلہ کیا کہ بچی تربیت گاہ میں بھیج دی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا . . . . . ۱۹۳۱ء تک کا مطلب بنات میں شائع کر چکا ہوں اس کے ملاحظہ سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تربیت گاہ پر میرا روپیہ کس قدر صرف ہو رہا ہے اور کیا اس کے بعد بھی مجھ سے یہ جائز توقع ہے کہ اپنی خودداری مٹا کر نا خواندہ مہمانوں کی طرح گھر پر بیٹھوں اور لڑکیوں کی حیثیت کی تذلیل و تضحیک کروں اور جو تھوڑی بہت وقعت خدا نے مجھے دی ہے اور جو آرام و آسائش مجھ کو اس کے فضل سے میسر ہے اس کو اس جرم میں کہ ایک اچھا کام کرنے نکلا ہوں خاک میں ملا دوں"

سید صاحب کا دوسرا خط بھی حرف بحرف نقل کر کے جون کے بنات میں اس کا مفصل جواب دیا گیا تھا اس دوسرے جواب میں علامہ مغفور نے تحریر فرمایا تھا:۔

آج سے شاید آٹھ دس سال پہلے اخبار رعیت نے میرے متعلق یہ الفاظ لکھے تھے کہ اگر مولانا سے مذاق کرنا مقصود ہو تو ایک نئے آدمی سے تعارف کرا دیجئے اور

بیت دیکھئے۔ یہ اپنی فطرت سے مجبور ہوں کہ باوجود
مدست کے وہ خداوند کریم مجھ سے لے رہا ہے اور جس کی
ونت کے آدمیوں سے ملنا پڑتا ہے۔ میں اپنی لاقامہ
رہ حتی الوسع محدودی رکھتا ہوں . . . .
ی صفات جس پر وہ معاشرتی ہر کوشش کی کامیابی
نحصار ہے مجھ سے ہزاروں کوس دور ہے . . . .
شخص سے سید صاحب کی یہ توقع کہ وہ صبح یہاں سے چلا
یا اس علاقے کہ جس کے پاس جا رہا ہوں کہ وہ کس
بت اور مزاج کا آدمی ہے اس کے گھر پر دھونی دے دیتا
انا بہتر جانتا ہے کہ کہاں تک صحیح ہے۔

. . . سید صاحب کا اختلاف یہیں سے شروع
ا ہے کہ میں ڈاک بنگلہ میں کیوں ٹھیرا۔ میں سمجھتا ہوں
بے حمیت سے بے حمیت مسلمان بھی جس کو اپنی قوم کے
افراد سے سابقہ پڑ رہا ہو کہ گھر میں ہونے کے باوجود
لت سے اس لئے انکار ہے کہ مفت کی مہانداری یا
ہ کی مصیبت سر پڑ جائے یہ دیکھ کر دو تاروں کے بعد
کوئی متنفس اسٹیشن پر نہیں ہے یہ گوارا کرتا کہ
ان حضرات کے گھر پر جوتیاں چٹخاتا ہوا پہنچتا جن کو
دانست میں آنے کی اطلاع دے چکا ہے۔

سید صاحب سے میرا اختلاف یہی ہے ساب میں
اطمینان کے لئے ایک واقعہ لکھتا ہوں تاکہ مصور قوم
شخصیت ان کے ذہن نشین ہو سکے۔ مجھے حسرتی لڑکیوں
خواہش کی تکمیل کے واسطے ان کے اصرار پر دو دفعہ
رآباد جانے کا اتفاق ہوا اور دونوں دفعہ ضرور دکن
اعلیٰ حضرت کرم گستری و بندہ نوازی مجھے خاصہ مرحمت فرمایا اور
طلب کیا۔ کوئی گھنٹے کے قریب پہلی مرتبہ اور اس سے
زیادہ دوسری مرتبہ گفتگو کی عزت عطا فرمائی۔ کیا

سید صاحب یہ یقین فرمائیں گے کہ باوجود اس قدر موقعہ
کے میسر آنے کے میری زبان سے ایک حرف بھی سوال کی
صورت میں نہ نکلا۔

جب بادشاہوں کا بادشاہ سال گذشتہ شاہجہان
آباد میں تشریف فرما ہوئے تو صبح سے شام تک قصر عالی پر
مسلمانوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا شاید سید صاحب اس کا
یقین فرمائیں کہ خود متعلقین قصر کی خواہش پر بھی یہ جسد
خاکی بلا طلبی در دولت کی حاضری سے محروم رہا۔

. . . . آپ کو شاید یہ علم نہ ہوگا کہ اس وقت اغیار
کس طرح اپنا جال پھیلا کر غریب اور مفلس مسلمانوں کو اپنے
پھندوں میں پھنسا رہے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے
کہ شادی غمی تیج تہواروں کے موقع پر بھی یہ لوگ پیسہ
سے کام لیتے ہیں اور نادار و مفلوک الحال اور یتیموں سے
سلوک کر کے ان کے ایمان ڈگمگاتے ہیں۔ عید اور بقر عید
کے موقعوں پر ان کے تہوار منواتے ہیں روپیہ سے کپڑے
لتے سے مدد کرتے ہیں کہ کس طرح اپنی طرف مائل کریں۔
تربیت گاہ کی بچیاں یہاں سے فارغ ہو کر انہی مدارس
میں جاتی ہیں اور اگر حفظ ما تقدم نہ کیا جائے تو احتمال ہے
کہ وہ ہاتھ سے نکل جائیں۔ میں سمجھتا ہوں شاید آپ
اس کو پسند کریں گے کہ ایک یتیم مسلمان بچی غیر مسلم کے
دسترخوان پر روزہ افطار کرے۔ اس کے جسم پر عید کے
کپڑے مسلمان جیسے کے نہ ہوں اس لئے رمضان بھر افطار
و سحری کا اہتمام تربیت گاہ سے ہوتا ہے۔ یتیم بچیاں اور
رانڈیں مدرسہ میں روزہ کھولتی اور کھانا کھاتی ہیں اور
سحری کے واسطے لے جاتی ہیں اس تقسیم کا علم اگر تمام شہر
کو نہیں تو کوچہ چیلاں کو اچھی طرح ہے لیکن کسی کو یہ نہیں
معلوم کہ یہ کیوں ہو رہا ہے اور اس کی تہ میں کیا ہے . . . .

آپ کو حساب میں یہ رقم کہیں نہ ملے گی۔

. . . . . عزیزمن تربیت گاہ نے آج تک کسی شہری بچی سے ایک پیسہ فیس کا نہیں لیا نہ کوئی فیس ہے نہ داخلہ اور ہو کہاں سے سکتا ہے تربیت گاہ کا مقصد اول غریب نادار یتیم بچیوں کا تحفظ ہے اس کے بعد تعلیم و تربیت شہری بچیوں میں اچھی اچھی خوش حال بچیاں بھی آئی ہیں۔ لیکن ان سے بھی کچھ نہیں لیا گیا کیونکہ مقصد تو ان بچیوں کو بچانا ہے جن کے جھاڑ کے جھاڑ علی الصبح بال بنائے اور کلپ لگائے دوسرے مدارس میں جاتی ہیں۔

گاندھی کے متعلق آپ نے جو کچھ فرمایا صحیح ہے لیکن آپ کو یہ علم نہیں کہ گاندھی اردن سمجھوتہ کے وقت شب و روز ہر وقت دو موٹریں اس کی قوم کی طرف سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر جہاں وہ مقیم تھا متعین تھیں اور اس کے ہمراہیوں کی دعوت میں ڈاکٹر صاحب کا سینکڑوں روپیہ صرف ہوا تھا . . . . . مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا۔ مولانا محمد علی مرحوم فرماتے تھے کہ وہ اور مالویہ احمد آباد میں موٹر میں چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص میلے کچیلے کپڑوں میں آتا دکھائی دیا وہ موٹر کو دیکھ کر ایک گلی میں گھس گیا۔ مالویہ نے مولانا سے کہا تم نے اس شخص کو دیکھا۔ اس نے آج سے چار سال قبل مجھ کو ایک لاکھ روپیہ دیا تھا کہ کسی اچھے کام میں صرف کر دو۔ اس وقت یہ اس لئے سامنے سے ہٹ گیا کہ اس کی صورت دیکھ کر کہیں مجھے یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ یہ اپنے روپیہ کے متعلق مجھ سے کوئی سوال کرے۔"

ہندو اخبار کی رائے

تیج آریہ سماج کا مشہور روزنامہ ہے جو دلی سے شائع ہوتا ہے اور فتنۂ ارتداد کے بانی سوامی شردھانند نے جاری کیا تھا۔ تربیت گاہ کے سلسلہ میں اس نے لکھا تھا۔

"اردو کے مشہور مصنف و حامی حقوق نسواں علامہ راشد الخیری کا مدرسہ تربیت گاہ بنات کے نام سے مشہور ہے۔ اور نہایت خاموشی کے ساتھ ایک مدت سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے یتیم اور غریب مسلمان لڑکیوں کو تعلیم دینا اور انہیں گمراہی سے بچانا اس مدرسہ کا خاص مقصد ہے۔ اگرچہ اس مدرسہ کا ذکر اخبارات میں نہیں آتا تاہم اس کی نیک نامی روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ پچھلے دنوں مجسٹریٹ مظفر نگر نے بھی ایک مسلمان لڑکی کو تربیت گاہ میں بھیجا۔ مولانا راشد الخیری اور ان کی تربیت گاہ کی خدمات دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خاموشی سے کام کرنے والے بھی اپنی قوم و ملت کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں"

بنات اکتوبر ۳۲ء

ایک سال سات مہینے کی بچی

"جس طرح پچھلے سال میں مظفر نگر والی لڑکی کے سلسلہ میں اس قدر مصروف رہا کہ تین مہینوں میں سے چھ سات جینے بھی دردہ نہ کر سکا اسی طرح اس سال بھی آخر جون میں یہ اطلاع ملی کہ ایک مسلمان ماں کی بچیاں اس لئے کہ یتیم و مفلس اور لاوارث تھیں غیر مسلم قبضہ میں جا رہی ہیں میرا ان بدنصیب بچیوں کو اس اعتبار سے لاوارث کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کے عزیز موجود ہیں لیکن اس اعتبار سے درست ہوگا کہ ان کی موجودگی میں یہ معصوم بچیاں آغوش اسلام سے نہ صرف جدا ہو رہی تھیں بلکہ ہو ہی گئی تھیں . . . . . ان بچیوں کے حاصل کرنے میں مجھکو کیسی کیسی دقتیں پیش آئیں یہ اس کو چھوڑ دیتا

ں ۔۔۔ کر میں نے کبھی پسند کیا۔ میں گو اکیلا
ایک [illegible] میرے ساتھ تھی جو تمام قوتوں
۔۔۔ کا اور میں ان بچیوں کو ظالموں کے منہ اور [illegible]
۔۔۔ سے نکال لایا اور اس وقت تربیت گاہ
۔۔۔ ب سے چھوٹی بچی ایک برس سات مہینے کی ہے"
(بنات اکتوبر [illegible])

ج کا شکار ایک یتیم لڑکی تربیت گاہ میں

"تربیت گاہ بنات کے قائم کرنے کے بعد مسلمان مردوں

[illegible] خراش واقعات میرے سامنے آئے ہیں ان کو
اچھی طرح سمجھتا ہوں اور جب تک میں مجبور
ہو جاتا ہمیشہ یہ ہی کوشش کرتا ہوں کہ دوسر
۔۔۔ ں کو یہ حالت سنا کر تکلیف نہ دوں مگر بعض حالات
ا ہو جاتے ہیں کہ ان واقعات کو طشت از بام
کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ بہار کی لڑکی کنیز
۔۔۔ ں کو مظفر نگر کے حکام نے میرے پاس بھیجا ابھی
۔۔۔ نانی بچیوں کو بھولی نہ ہوگی۔ اس کے بعد الہ آباد
۔۔۔ معزز خاندان کی لڑکی جس کو شوہر نے اس لئے
۔۔۔ تھا کہ وہ تعلیم نسواں کے خلاف تھا اور دہ
۔۔۔ ر کی شائق تربیت گاہ میں دفعتاً بغیر کسی اطلاع
۔۔۔ شی کے ساتھ تن تنہا آگئی اور چند روز کے بعد
شوہر صاحب بھی بیوی کو ڈھونڈتے ہوئے تشریف
۔۔۔ خدا کا شکر ہے وہ معاملہ طے ہوگیا۔ مجھے
۔۔۔ اسے یاد ہے میں ان کے متعلق ۔۔۔ یا بنات
۔۔۔ مر طور پر کچھ لکھ چکا ہوں اب پھر ایک حادثی
۔۔۔ د نما ہوا ہے جس کا اظہار میرے واسطے ضروری
۔۔۔ وہ یہ کہ:۔

۱۸ اگست کی صبح کو پندرہ سولہ برس کی ایک مسلمان
لڑکی جو اپنا نام جمیلہ خاتون بتاتی ہے تربیت گاہ میں آئی
بات چیت گفتگو اور صورت ظاہری سے وہ کسی شریف خاندان
کی خاتون معلوم ہوتی ہے۔ اس کے حالات خود اسی کے
ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اسی پرچے میں شائع کر رہا ہوں۔ اس کا
بیان ہے کہ میں لکھنؤ سے ملی گڈھ آئی اور علی گڈھ سے دہلی۔
میں تربیت گاہ کے قواعد کے مطابق ۱۲ یا اس سے زیادہ
عمر کی لڑکیوں کے داخلہ پر مجبور نہیں ہوں لیکن اس لڑکی کی
درخواست کو ٹھکرا دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ آغوش اسلام
اس کو اغیار کے منہ میں پھینک دے گی۔
بنات اگست ۱۹۳۳ء

جمیلہ کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کی بھاوج
آئے دن نند کے خلاف اپنے شوہر کے کان بھرتی
اس پر تہمت لگاتی اور بہتان اٹھاتی تھی آخر ایک دن
بیوی کے کہنے میں آکر بھائی نے بہن کو گھر سے نکال دیا
اور وہ دلی علامہ مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ جمیلہ
کا بیان بہت دردناک تھا۔

تربیت گاہ کے وجود سے انکار

مئی ۱۹۳۵ء کے رسالہ بنات میں علامہ مغفور کا ایک مضمون مندرجہ بالا عنوان سے شائع
ہوا تھا جس کا پہلا صفحہ یہ ہے:۔

"میرے مرحوم استاد مولانا حالی۔ حکیم محمود خاں
کے مرثیہ میں میرے عزیز وطن جہاں آباد سے خطاب کرتے
ہوئے فن طب کے متعلق فرماتے ہیں۔

لیکن آخر طبع دوراں کا ہے جیسے اقتضا
ہر ترقی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا
گو رہا جبکہ تو دنیا میں پورا کر چکا

وقت اے جان جہاں تیرا بھی آخر آ لگا
گردشِ افلاک کے ہوتے تھے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر کر گئی کرنے بہار

لڑکیوں کی اچھی بری جیسی خدمات مجھ سے ممکن ہوئیں انجام دینے کے بعد جب قوائے جسمانی میں انحطاط شروع ہوا عمر ساٹھ سال کے قریب پہنچی اور لڑکیوں کے ارتداد کی خبروں سے کلیجہ پک گیا تو دل نے یہ صدا دی کہ ایک ہائی اسکول مسلمان لڑکیوں کے لئے بنا دوں۔ یہ وہ وقت تھا کہ رازق میاں بی اے کی تیاری کر رہے تھے خاتون اکرم جیسی دولہن گھر میں آ چکی تھی اور بیگم راشد الخیری شہر کے ایک جید عالم کی صاحبزادی جنھوں نے لڑکوں کو کبھی نیکر کے استعمال کی اجازت نہیں دی اولاد کی تعلیم و تربیت سے قریب قریب فارغ ہو چکی تھیں غرض ہمارے سامنے زندگی کی کوئی ایسی اہم ضرورت نہ تھی جو اس قصد کو کمزور کر دیتی اس لئے ہم دونوں مدرسہ کے ابتدائی انتظام میں مصروف ہو گئے۔ عصمت اور کتابوں کا کام میاں رازق کے حوالہ کیا اور گھر مرحوم خاتون اکرم کے سپرد کیا۔ رازق میاں کی طبیعت سے میں اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ جو بچہ، بچہ کا باپ ہو جانے پر بھی اتنا آزاد نہیں ہے کہ رات کو ۹ بجے کے بعد بغیر ماں کی اجازت کے گھر سے باہر قدم رکھ سکے وہ دنیا کے نشیب و فراز سے کیا واقف ہوگا۔ اسی واسطے میں نے منجملہ دوسری نصیحتوں کے یہ کہدیا تھا کہ

دنیا میں عزت کے ساتھ زندہ رہنا آسان نہیں ہے۔ سعادتمند اولاد وہی ہے جو باپ دادا کی عزت پر حرف نہ آنے دے۔ یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا اور آفات کا ہجوم ہے ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کسی شخص پر غیر معمولی بھروسہ نہ کرنا۔

نو دس سال سے ایک صاحب میاں رازق کے پاس کام کرتے تھے انھوں نے دفتر سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ایک رسالہ جاری کیا۔ میرے واسطے یہ کہنا مشکل ہے کہ رازق میاں کی سادگی اور ناعاقبت اندیشی حقیقتاً اس کی ذمہ دار ہو سکتی ہے یا ان صاحب کی فراست اور ہوشیاری۔ اس رسالہ کے اجراء کے بعد جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ سب کو معلوم ہے اور مجھ پر جس قدر حملے ہوئے اور ہو رہے ہیں وہ بھی ناظرین عصمت و بنات کے علم میں ہیں، افسوس اس کا ہے کہ تربیت گاہ بھی اس نفسانیت کا شکار ہو رہی ہے۔ حالانکہ یہ غریب بچیاں لینے میں نہ دینے میں"

اس کے بعد فتنۂ ارتداد کے متعلق چند سطریں لکھ کر تحریر فرمایا تھا۔

"ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا سب سے پہلا کام ان دختران اسلام کا تحفظ تھا چنانچہ میں نے مدرسہ کی ترقی مڈل یا ہائی اسکول کا خیال ترک کیا اور فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہوگا ان بچیوں کو ارتداد سے بچاؤں گا"

اس کے آگے ایک پوسٹر کا ذکر ہے۔

"اس رسالہ کی خوش قسمتی سے چند حضرات کا ایک گروہ دہلی وارد ہوا جس میں کوئی صاحب حکیم ہیں ان حضرت کے متعلق اخبار ریاست سے معلوم ہوا ہے کہ بھوپال میں انسپکٹر جنرل پولیس کے خلاف کچھ ناشائستہ الفاظ فرمائے تھے اور شاید بھوپال کے متعلق بھی جس کی پاداش میں یہ حکم ہوا ہے کہ ایک مہینہ کے اندر بھوپال نہ پہنچے تو اس کی اور ان کے عزیزوں کی تمام جائداد ضبط ہو جائے گی۔ اس نئے رسالہ کی اعانت شامل ہوتے ہی ان کی عنایت مجھ پر نازل ہوئی"

اور وہ عنایت یہ تھی ایک پوسٹر چھپوایا گیا جو تقسیم

ں کیا گیا دیواروں پر نہیں لگایا گیا بلکہ پبلک میٹنگ
ے مجھے بھجوایا گیا۔ اس پوسٹر میں حضرت علامہ مغفور
ے متعلق نا شائستہ الفاظ لکھے گئے تھے اور تربیت گاہ
متعلق یہاں تک لکھا گیا تھا:

"مولانا کے زیر اہتمام نہ کوئی مدرسہ ہے نہ بورڈنگ"

جس دن یہ پوسٹر میرے پاس بھیجا گیا تھا اس کی شام
شیخ عبدالحمید صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل دہلی کا جن کی
صاحبزادی ممتاز بیگم بنت مولوی عبدالحمید صاحب وکیل
ردواسپور نے تربیت گاہ میں تعلیم پائی ہے یہ خط ملا تھا اور
سالہ بنات بابت مئی صفحہ ۲۰ پر شائع ہوا تھا۔

"میری ہمشیرہ زادی ممتاز بیگم نے تربیت گاہ بنات
ں ۲ سال بحیثیت بورڈر تعلیم پائی ہے اس کی تعلیم و تربیت
نہایت قابل اطمینان ہے اور میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا
ہوں کہ تربیت گاہ بنات نہایت مفید ثابت ہو رہی ہے"

بنات کی اسی اشاعت سے یہ سطریں بھی منقول ہیں:
مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلما
ہند جو مدرسہ سے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر رہتے ہیں۔
چار پانچ روز بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"میری بچی کنیز فاطمہ بھی مولانا اور مدرس گاہ کی
مرہون منت اور شکر گذار ہے درس گاہ میں نہ صرف دہلی
کی بچیاں معقول تعداد میں تعلیم پاتی ہیں بلکہ بعض بیرونی
مسلمان لڑکیاں بھی فیض علمیہ سے بہرہ یاب ہوتی ہیں"

سید حسنین صاحب تحصیلدار دہلی اور واحدی
صاحب میونسپل کمشنر جو تربیت گاہ کے بالکل قریب
رہتے ہیں تحریر فرماتے ہیں۔

"لڑکیوں کا ایسا مدرسہ جس کے اہتمام کی باگ
مولانا راشدالخیری جیسے عورتوں کے مسلّم خیرخواہ کے ہاتھ
میں ہو صرف تربیت گاہ بنات ہی ہے۔ صبح زندگی شام
زندگی کے بزرگ مصنف اگر بے توجہی سے کسی بچی کو ایک
سبق پڑھا دے تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ دوسروں کے ہزار
سبقوں سے بڑھ کر نہ ہوگا۔ ممکن ہے نئی وضع کے حضرات
نئی وضع کے اسکولوں کے مقابلہ میں تربیت گاہ بنات کو
وقعت نہ دیں لیکن جو لوگ دہلی کے پرانے گھرانوں کی سی
تربیت اپنی اولاد کو دلانے کے خواہشمند ہیں ان کے لئے
اب اس کے سوا کوئی اور مدرسہ نہیں ہے"

علامہ مغفور نے سارا پوسٹر مضمون کے دوران میں
نقل کر دیا تھا۔ ان کے رسالوں کتابوں مضامین اور
ان کی ذات کے خلاف جو مضامین شائع ہوتے تھے وہ
ان کا جواب ضروری نہ سمجھتے تھے مگر تربیت گاہ پر جو اعتراض
ہوتا وہ من و عن شائع کر کے اس کا جواب بھی تحریر فرماتے تھے

معافی نامہ

پوسٹر چھاپ کر حکیم صاحب اور ان کی
جماعت نے یہ سمجھ کر مجھے ایک کاپی بھیجی
تھی کہ اسے دیکھ کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل جائے گی۔
ہوش و حواس میں کھو بیٹھوں گا اور ایک بڑی رقم تر ئی
کے ہے بھول وہ مجھ سے جھڑوالیں گے اور میں ڈر کر سہم کر ان کی
منت خوشامد کروں گا کہ خدا اور رسول کے لئے یہ پوسٹر تقسیم
نہ کریں مگر جب ان حضرت کو یقین ہو گیا کہ الٹی آنتیں گلے
پڑنے والی ہیں تو حکیم صاحب نے معافی نامہ ارسال فرمایا
کہ "مجھے اعتراف ہے کہ وہ واقعات جو اس پوسٹر میں لکھے گئے
ہیں صحیح نہیں اور مجھے شہر کے بعض معزز اصحاب سے معلوم
ہوا کہ وہ واقعات درحقیقت صداقت پر مبنی نہیں ہیں میں
ان پوسٹروں کو نذر آتش کر چکا ہوں اور اپنے پوسٹر کی اشاعت
پر اظہار افسوس کرتا ہوں امید ہے آپ میری لغزش کو
معاف فرمائیں گے۔ حضرت مولانا راشدالخیری صاحب کو

اور آپ کو اس پوسٹر کی طباعت سے جو تکلیف پہنچی ہے اس پر اظہار ندامت کرتا ہوں "

(منقول از بنات مئی ۱۹۳۶ء)

معروف شخصیتوں کی رائے

(۱) حضرت خواجہ حسن نظامی نے تحریر فرمایا۔

"میں سالہا سال سے تربیت گاہ بنات کو جانتا ہوں وہ کوچہ چیلان میں لب سڑک واقع ہے اور اس کا بورڈ منظر عام پر لگا ہوا ہے۔ میں کئی بار اس مدرسہ کا معائنہ کر چکا ہوں اور لڑکیوں کا امتحان بھی لے چکا ہوں"

(۲) مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا نے لکھا تھا۔

"دلی کی تہذیب اور شرافت کے وہ دلدادہ جو اپنے گھروں میں اس چراغ سے دوسرے دیئے روشن کرنا چاہتے ہیں اپنی بچیوں کو حضرت راشد الخیری کی نگرانی میں تربیت دلانا چاہتے ہیں۔ اس تربیت کا معاوضہ تو کیا ہو سکتا ہے مگر جو اخراجات کے کفیل ہوتے یا ان میں شرکت کرتے ہیں وہ حقیقت میں محض اپنا خراج عقیدت مولانا کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔"

(۳) اور شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے لکھا۔

"مولانا راشد الخیری اور بیگم راشد الخیری بحیثیت مشنری کے یتیم و نادار بچیوں کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ یقیناً قابل قدر ہے اور اس سلسلہ میں ان کی ذات ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے۔ (منقول از بنات مئی)

بیگم صاحبہ مولانا محمد علی جوہر نے لکھا تھا "جب سے علامہ راشد الخیری مرحوم نے لڑکیوں کے لئے تربیت گاہ بنات قائم کی اس وقت سے مجھ کو اس مدرسہ کو دیکھنے کا اکثر موقع ملا اور میں وہاں جاکر دیکھا کرتی تھی کہ وہاں غریب اور نادار لڑکیوں کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا جاتا تھا اور ان میں اور امیر لڑکیوں میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔۔۔ میں اس مدرسہ میں جاکر اکثر بچیوں کو دیکھ کر متاثر ہوتی تھی"

عصمت راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

آخری دورہ

۱۹۳۱ء میں دورۂ دکن اور ۱۹۳۲ء میں دورۂ مدراس و میسور میں میں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ طول طویل سفر وہ بھی ریل کے تھرڈ کلاس میں نہ صرف والدہ مرحومہ بلکہ خود علامہ مرحوم کے لئے سخت تکلیف دہ ہے بالخصوص اس حالت میں کہ دو دو تین تین دن بعد ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر کرنا پڑتا تھا اور اگر ریل کا سفر بھی ہوتا تو تانگہ ہوتا یا موٹر کئی کئی جگہ روزانہ آنے جانے سے حضرت علامہ مغفور تھک کر چور چور ہو جاتے تھے۔ ۶۰ سال سے اوپر کی عمر آرام کی ہوتی ہے نہ کہ اس قدر جفاکشی اور محنت مشقت کی مگر ایک لگن تھی جس کے سامنے ان تکالیف کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ۱۹۳۳ء کی تعطیل کلاں میں جب انھوں نے مشرقی ہند کا دورہ طے کیا تو میں نے ریل کے سفر کی مخالفت کی۔ میرے پاس بڑی اچھی حالت میں شیور موٹر تھی اور ۵ آدمی اس میں آسانی سے سفر کر سکتے تھے۔ اتفاق سے ان دنوں میرے پھوپی زاد بھائی حاجی سید محمد میاں بخاری مرحوم بھی جو بہت ہوشیار موٹر میکنک تھے اور جنھیں عرب کے ریگستان اور پہاڑوں میں موٹر چلانے کا تجربہ تھا دلی ہی میں تھے انھوں نے صرف میری تجویز کی تائید کی بلکہ ساتھ چلنے پر بھی آمادگی ظاہر کی علامہ مغفور ہمارے اصرار سے رضامند ہو گئے۔ چنانچہ یہ دورہ کانپور۔ لکھنؤ۔ بنارس۔ کلکتہ اور واپسی میں پٹنہ۔ الہ آباد کا ہوا بذریعہ کار۔ الہ آباد میں علامہ مغفور علیل ہو گئے تھے اس دورہ کا مختصر حال

...ماحت ہند" میں لکھ چکا ہوں۔

[illegible] میں سنہ بہاولپور کا خیال تھا کیونکہ کئی سال سے علامہ صاحب آ رہے تھے مگر جب تعمیل کام کے لئے تربیت گاہ بند ہوئی تو والدہ مرحومہ کی صحت اچھی نہ تھی وہ صحت یاب ہوئیں تو علامہ مغفور کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ [illegible] گزر گیا تو جنوری [illegible] میں جب تربیت گاہ کئی ہزار مقروض تھی حضرت علامہ مغفور نے عصمت کے ذریعے ساڑھے تین ہزار کی رقم لے کر قرض کا بار ایک حد تک ہلکا کر دیا تھا مگر [illegible] میں بھی وہ دورہ پر نہ گئے۔ آخر جولائی [illegible] میں ان کی طبیعت گری گری رہتی تھی اور دوران سر کے علاوہ حرارت ہو جاتی تھی۔ علامہ مغفور نے پھر عصمت سے ایک بڑی رقم لے کر تربیت گاہ کے قرضہ میں دی اور تین ساڑھے تین ماہ بعد جو بچا، بچا تو جان ہی لے کر ٹلا۔

مکتب بنات

اکتوبر [illegible] سے تربیت گاہ بند کر دی گئی اور مدرسہ کی حیثیت مکتب بنات کی رہ گئی۔

اگست [illegible] میں علامہ مغفور کا جو مضمون "انسداد ارتداد و مکتب بنات" کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس کے پہلے حصہ میں ارتداد کے اسباب پر بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں تربیت گاہ کے بورڈنگ سسٹم کو ختم کرنے کا اعلان ہے۔

"میں نے پچھلے کسی پرچہ میں لکھا تھا کہ گذشتہ دس بارہ سال سے یعنی جب سے تربیت گاہ قائم ہوئی ہے، دہلی میں کسی مسلم خاتون کا ارتداد میں نے نہیں سنا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میرے ان الفاظ میں کسی قسم کی نخوت یا تمکنت تھی جو اسلام کے منافی تھی۔ ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ مجھے ایک اشتہار ملا جو دیواروں پر چسپاں تھا ایک باپ نے کس لفظ دیکھے ہیں

"میری بچی نا سمجھ ہے لہذا وہ معصوم ہے مجھ پر بھی نہ رہی۔"

[illegible] میں جب یہ دورہ پڑ گیا تو خرابی صحت کی وجہ سے بھاولپور میں ٹھہرنا پڑا۔ بلکہ سفر کے قابل بھی [illegible] سے میری صحت [illegible] رہی ہے۔ دوران سر اور اختلاج قلب ہر وقت پیچھا نہیں چھوڑتے اور میں اب اس قابل نہیں کہ سفر کر سکوں۔ قریب قریب یہی کیفیت بیگم صاحبہ کی ہے [illegible] نے ان کی حالت خراب کر دی اور اب ہم اس فیصلہ کو ملتوی نہیں کر سکتے جو تربیت گاہ کے بورڈنگ کی بابت کیا جا رہا ہے۔ جن بچیوں نے ہمارے پاس رہ کر کچھ حاصل کیا ہے اور جو اب ماشاء اللہ بچوں والیاں ہیں ان کو معلوم ہے کہ بیگم راشد الخیری صاحبہ کی شفقت نے ان کو ماں کی محبت بھلا دی تھی۔ مجھے وہ رات ہمیشہ یاد رہے گی جب خاں صاحب شیخ عبد الغفار صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل بھوپال کی چھوٹی بچی دسمبر کی ایک رات کو جب ہوا کے جھونکے چل رہے تھے لحاف سے اوڑھتی اور اتار اتار کر پھینک رہی تھی۔ بیگم مغفورہ نے اس چار برس کی بچی کا شلوکا رات بھر میں تیار کیا اور باوجود پیرانہ سالی اور ضعف بصارت کے نماز فجر سے قبل اس کو پہنا دیا۔ اسی طرح عزیزہ بلقیس بیگم (سلمہا) دختر سابق ہیڈ [illegible] خاں صاحب عبد الغفور صاحب جیلر گورداسپور کی بچی ممتاز سلمہا کی علالت میں جو تیمارداری کی وہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اب بڑھاپے نے ہم کو اس قابل نہ رکھا کہ ہم بورڈنگ کا انتظام کر سکیں اس لئے جو بچیاں یہاں سے مستفید ہو کر گئی ہیں اور جو قریب قریب ہر صوبہ میں موجود ہیں اپنی تربیت و تعلیم عام کریں اور اس طرح (اس مضمون کی) دفعہ ۲ کی تکمیل کریں۔ میں اب اس خدمت کے قابل نہیں ہوں اس لئے

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں بورڈنگ سسٹم بند کرتا ہوں اور آئندہ کسی لڑکی کو بورڈنگ کی حیثیت سے نہ لوں گا ہاں دفعہ ۹ کے سلسلہ کی جو خدمت ممکن ہے اس کے واسطے حاضر ہوں۔

ان حالات میں تربیت گاہ کی حیثیت اس نئے سشن سے مکتب بنات کی ہو گئی۔ میں ۱۹۳۵ء ہی میں یہ اعلان کرنے والا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مالی مشکلات پریشان کریں گی لیکن یہ فطرت انسانی تھی کہ اب بھی زندگی کی امید اور صحت کی توقعات موجود تھیں...... میں یہ تو خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ ضرورتیں اب بھی پوری نہیں ہو سکتیں مگر میں تربیت گاہ کو نہیں اپنی مشکلات کو محدود کر رہا ہوں۔ مسلمان یہ سُن کر متعجب ہوں گے کہ ہزارہا ناظرین عصمت و بنات میں سے گنتی کے چند ہاتھ ہیں جو بلا طلب اس طرف اُٹھ رہے ہیں اور ان کا کرم بھی اتنا نہیں ہے کہ مجھے گھوڑا گاڑی کے مصارف اور اُستانیوں کی تنخواہوں سے سبکدوش کر دے اس لئے ۱۹۳۵ء کے سشن سے صرف دو اُستانیاں رکھوں گا خوش حال لڑکیوں کے لئے ہر شہر میں مشن اور میونسپلٹی کے مدارس موجود ہیں اس لئے مکتب بنات میں صرف وہی لڑکیاں لی جائیں گی جو دفعہ ۹ کے مطابق ہوں گی۔ .... سر دست میں تیس لڑکیاں لوں گا جن کے لئے بدستور گھوڑا گاڑی کام کرے گی تربیت گاہ کی طرح مکتب بنات بھی میرا پرائیویٹ مدرسہ ہو گا...... میں نے شاہجہاں آباد کے در و دیوار پر جہاں میرے آباؤ اجداد نے صدیوں تک قرآن و حدیث کے ڈنکے بجا کر چمنستان اسلام کی آبیاری کی ہے اس باپ کے پوسٹر کو پڑھ کر جس پر بجلی گری ہے اپنا فرض اسلامی ادا کیا ہے۔ مکتب میں جو تعداد رکھی ہے وہ اپنی صحت۔ حیثیت اور توقعات کو دیکھ کر۔ مجھے افسوس ضرور ہے کہ میں مذہب مقدس اور آقائے تاجدار کی جس کے پاک نام پر قربان ہونا میرا ایمان ہے کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ صحت کی بربادی تقاضائے عمر تھا۔ سفر کے قابل نہ تھا ورنہ دماغ اتنا صحیح رہتا کہ سیدہ کا لال لکھنے کے بعد اس چار سال میں آٹھ دس نہیں چار پانچ نہیں تو دو کتابیں تو اور لکھ دیتا اور ایک ہائی اسکول کی بنیاد ڈال دیتا مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(بنات اگست ۱۹۳۵ء)

"آئندہ کام کرنے والے دیکھ لیں کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں اور کیسے کیسے کانٹے جسم کو لہولہان کر دیتے ہیں"

(عصمت اکتوبر ۱۹۳۵ء)

باب دسواں ——— زمانۂ ترقئ عصمت کے ۵ سال

۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۱ء

گنگا پور سٹی میں بالعموم ہر اتوار کو او کھلے اور پھر ہر سال گرمیوں میں ڈیڑھ سوا مہینہ قطب صاحب جانا آپا کی شادی یعنی ۱۹۲۵ء تک رہا۔

شادی ہو کر راجستان کی سابقہ ریاست جے پور کی نظامت گنگا پور سٹی میں جو بی بی سی آئی آر کا ایک بڑا ریلوے اسٹیشن تھا آپا چلی گئیں تو میرے اسکول اور

...کالج کی موسم گرما کی چھٹیوں میں ہم گنگا پور چلے جاتے۔ کالج کی دلچسپیاں وہاں کہاں رکھی تھیں۔ میرا تو جی نہ لگتا مگر علامہ مرحوم کو یہ جگہ بہت پسند تھی اور شیشم کے درخت کے نیچے چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کئے وہ اکثر مضامین سوچا کرتے تھے۔ کبھی اُن کے وعظ کا سلسلہ شروع ہوتا وہ روزانہ ہی چلتا رہتا۔ ریلوے کے ملازم اور قصبے کے مسلمان اُنہیں گھیرے رہتے۔ اُن کی خوش طبعی سے اُن لوگوں میں چہل پہل ہو جاتی۔ آٹھ دس بچے دس کے کوارٹروں میں جو ملازمین رہتے تھے علامہ مغفور روزانہ شام کو اُنہیں ایک دسترخوان پر کھانا کھلواتے۔ سب کا کھانا کسی مقررہ جگہ پر آجاتا تھا۔ گنگا پور والے گرمیاں آتے ہی اُن کا انتظار کرتے تھے۔ حضرت علامہ مغفور اُن کے آپس کے اختلافات بھی مٹاتے تھے۔ ذاتی معاملات میں بھی وہاں والوں کو مشورہ دیتے اور اُن کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ نامیر کی مسجد کے لئے اُن کو مواعظ سے معقول چندہ ہو جاتا تھا۔ اس مسجد کی توسیع اور مدرسہ کی ترقی بہت کچھ علامہ مغفور کی تقریروں کا نتیجہ تھی۔ یہ ڈیڑھ دو مہینے کا زمانہ گویا علامہ مغفور کی تفریح کے دن ہوتے تھے۔"

(عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر)

لیکن ان تفریح کے دنوں میں بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتے ضرور تھے۔ جس ریلوے کوارٹر میں وہ قیام فرماتے ریلوے اسٹیشن اُس سے تیس چالیس قدم دور تھا۔ دن کو ایک بجے کے قریب ڈاک گاڑی (فرنٹیر میل) دہلی سے آتی اور شام کو پانچ بجے دہلی جاتی تھی۔ علامہ مغفور دوپہر کی ڈاک پر اکثر ریلوے اسٹیشن ٹہلنے چلے جاتے۔ کبھی کوئی جاننے والا مل جاتا اس سے باتیں کرتے۔ قریب ہی ڈاکخانہ تھا وہاں سے ڈاکخانہ پہنچے۔ دلّی سے جو خطوط اخبارات وغیرہ آتے وہ لیتے اور پوسٹ ماسٹر اور ریلوے والوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ۱۹۳۵ء سے تربیت گاہ بنات کے سلسلہ میں طویل دورہ پر جانے لگے۔ جب بھی گنگا پور یعنی عشرہ کے لئے اپنی بڑی بیٹی کے پاس ضرور جاتے اور گنگا پور کے ریلوے والے مسلمانوں کا صبح شام جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ گنگا پور سٹی آخری دفعہ ۱۹۳۶ء میں گئے تھے۔

شہر خاب کا دم واپسیں اور ستونتی

حضرت علامہ مغفور نے عصمت میں اپنی کئی نظمیں اپنے نام سے شائع نہیں کیں۔ وہ فرماتے تھے "میں شاعر نہیں ہوں۔ ان نظموں میں شاعری کی غلطیاں ہوں گی۔ یہ میرے جذبات ہیں۔" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے بڑے بڑے شعرا نے بھی اپنے خیالات اس طرح نظم کے سانچے میں بہت کم ڈھالے ہوں گے جس طرح مصور غم نے "شہر خاب کا دم واپسیں" ۸ صفحہ کی پوری منظوم کہانی اس طرح لکھوا دی کہ گنگا پور سٹی میں شیشم کے درخت کی چھاؤں میں ایک کھری چارپائی پر لیٹ کر وہ اشعار فرماتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا یعنی ۱۹۳۳ء میں یہ نظم تین دن میں اسی طرح قلمبند کی گئی تھی طبیعت کی روانی ایک دریا تھا کہ بہا چلا جا رہا تھا۔ لکھتے لکھتے میرا ہاتھ دکھ جاتا تھا مگر جذبات نگاری کے شہنشاہ کی زبان نہ رکتی تھی میں اس نظم کو الہام کہتا اور وہ سن کر مسکرا یا کرتے تھے"

(ساقی راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء)

"گنگا پور سٹی ہی میں اُسی شیشم کے درخت کے نیچے طویل افسانہ "ستونتی" تصنیف فرمایا تھا اس طرح کہ حضرت علامہ مغفور بولتے جاتے اور میں لکھتا جاتا تھا مصور غم کی تصانیف میں یہ خصوصیت اسی کتاب کی ہے کہ شروع سے

آخر تک سارا افسانہ اسی طرح ۸ روز میں لکھوایا تھا خود اس کی ایک سطر نہیں لکھی۔ یہ جولائی ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے"
(ساقی۔ راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء)

"مسٹر خلب کا دم واپسیں" منظوم کہانی کے ابتدائی ۶۔۷ اشعار یہ ہیں۔

کنارِ بام پتھر پر ایک جا – نشیمن تھا چھوٹا سا مسٹر خلب کا
گزرتے بہت دور انسان کے – نر و مادہ دونوں وہاں رہتے تھے
خوشی اس نشیمن پہ قربان تھی – یہ گٹیا مسرت کی ایک کان تھی
پرستش میں تھی نر کی مادہ اگر – تو قربان سو جان سے اس پہ نر
نشے میں محبت کے سرشار تھے – کہ مونس تھے آپس میں غم خوار تھے
مسرت کی نخوت میں اینٹھا ہوا – یہ جوڑا تھا انڈوں پہ بیٹھا ہوا

اور آخری ۳ شعر یہ ہیں۔

میری طرح لاکھوں بہت ماشیاں – مٹیں اور دیتوری پہ بل لائیاں
کہاں تک یہ نفسانیت کب تلک – ذرد رنگ لائے گا اک دن فلک

بہارِ چمن سب یہ جانے کو ہے
خزاں اس میں اک رونا آنے کو ہے

ستونتی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"بڈھے ٹھڈوں، پرانے دھرانوں، دقیانوسی، قل آعوذیوں، گلے تعویذ بازوں اور لمبی ڈاڑھیوں کی تضحیک افضال کی صحبت کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ اتوار کی رات کو اول تو وہ خود ہی ورنہ اُس کا کوئی اور دوست، سبز عمامہ باندھ، چغہ پہن اور مصنوعی داڑھی لگا، درویش، مولوی عالم کا بھیس بھرتا۔ کبھی وعظ کی ہنسی اُڑتی، کبھی چندہ کا مضحکہ ہوتا۔ کوئی اسلام اسلام" کہہ کر سینہ کوبی کرتا اور کوئی درد قوم کا بیمار بن کر اس طرح پیٹ پکڑے پکڑے پھرتا کہ ہنسی کے مارے سب کے پیٹ میں بل پڑ جاتے"

تعلیم نسواں اور حقوقِ نسواں پر تقریریں

"مگر تربیت گاہ کی ضرورت اور تعلیم نسواں کی خدمت نے طبیعت کو درست کر دیا .... تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ باہر نکلوں اور مسلمانوں کو تعلیم نسواں اور تربیت گاہ بنات پر متوجہ کروں" (سیاحت ہند صفحہ ۵ سیاحت ۱۹۳۲ء)

تربیت گاہ کے لئے علامہ مغفور نے غیر منقسم ہندوستان کے دور دراز مقامات کے دورے کئے اور مسلمان عورت کی مختلف حیثیتوں پر جگہ جگہ لیکچر دیے اور تقریریں کیں۔ وہ تقریر کرنی پسند نہ کرتے تھے۔ اور صرف اس وقت اس کے لئے رضامند ہوتے جب اصرار حد سے بڑھ جاتا تھا۔ ان کے لیکچر کے موضوعات ہوتے تعلیم نسواں۔ پردۂ نسواں۔ حقوقِ نسواں۔ فرائض نسواں وغیرہ۔

"تیسرے روز متواتر کئی جگہ سے چائے اور کھانے پر طلبی ہوئی اور اس سے زیادہ کالج کے طلبا اور مساجد کے خطیب اور انجمنوں کے ناظموں نے وعظ کی خواہش کی اور یہ اصرار اتنا بڑھا کہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میں نے کھلے ہوئے الفاظ میں یہ عذر کیا کہ میں حیدر آباد میں دعوتوں کے واسطے نہیں آیا۔ اور یہ خیال کہ میں واعظ ہوں قطعاً غلط ہے۔ میں نے چالیس سال ایک موضوع یعنی مسلمان عورت پر بسر کئے ہیں۔ میرے سامنے سوا اس کے کوئی چیز نہیں ہے۔ دُنیا متغیر ہو چکی۔ قوم بدلی اس کی معاشرت بدلی۔ تمدن بدلا۔ خیالات بدلے مگر میں اُسی جگہ کھڑا ہوں جہاں چالیس سال قبل سب سے پہلی کتاب "صالحات" لئے کھڑا تھا"

(سیاحت ہند صفحہ ۹ سیاحت حیدر آباد دکن ۱۹۳۲ء)

علامہ مغفور نے کسی جگہ تربیت گاہ کے تئے عام چندہ

طالب علم بی اے نے میری خدمات پر ایک تقریر کی جس کے جواب میں مختصر طور پر میں نے نوجوان مسلمانوں کو حقوقِ نسواں پر متوجہ کیا اور بتایا کہ اسلام میں عورت کا کیا مرتبہ ہے اور مسلمانوں نے عورت کی کیا حیثیت بنا رکھی ہے"

(سفر امراؤتی ۱۹۳۲ء سیاحت ہند صفحہ ۲۹)

"میں مسجد میں تقریر کرنے سے اس لئے گھبراتا ہوں کہ وہاں حقوقِ نسواں کی صدا کان میں پہنچتے ہی کفر کے فتوے شروع ہو جاتے ہیں تاہم قاضی صاحب کے اصرار پر بعد جمعہ مسجد میں تقریر کی" (سفر جامنیر ۱۹۲۵ء سیاحت ہند صفحہ ۳۵)

"دوسرے روز شہر کے مقتدر مسلمانوں کے اصرار پر میرے پبلک لیکچر کا انتظام ہوا۔ مہاراناصاحب آمور نے صدارت کی۔ اور شہر کا تعلیم یافتہ طبقہ اچھی تعداد میں جمع ہوا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک میں نے حقوقِ نسواں پر تقریر کی اور مسلمانوں کو بتایا کہ عورت کے ساتھ آج کیا سلوک کیا جا رہا ہے اور اسلام نے اس کو کیا حقوق عطا فرمائے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس تقریر کا مسلمانوں پر اچھا اثر پڑا" (سفر بروچ ۱۹۲۵ء سیاحت ہند صفحہ ۶۲)

"بمبئی کے انگریزی اور گجراتی اخبارات میں میرے دورے کی خبر شائع ہو چکی ہے یہاں آکر معلوم ہوا۔ میرے حالاتِ زندگی "بمبئی کرانیکل" میں شائع ہوئے ہیں اور آمد کی اطلاع بھی۔ بمبئی میں میرے دو تین لیکچر ہوئے جن میں خصوصیت سے وہ لیکچر قابلِ ذکر ہے جو محترمہ عطیہ بیگم فیضی کے ہاں ہوا ...... عطیہ فیضی صاحبہ کی طرف سے میری آمد پر ٹی پارٹی رفعت محل میں دی گئی تھی جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے مسلمان ہندو پارسی انگریز حضرات کو مدعو کیا گیا تھا میرے لیکچر سے پہلے جو عورت کی ترقی کے موضوع پر تھا عطیہ فیضی صاحبہ نے انگریزی میں تقریر کی اور چونکہ ۱۹۲۶ء میں تربیت گاہ کو دیکھ کر اور کام پسند کر کے انگریزی اخبارات میں ایک مضمون "مسلمانوں کو ایک پیام" بھیج چکی تھیں اس لئے تربیت گاہ کے متعلق بھی رائے ظاہر فرمائی"

آخری سطر میں لفظ "بھی" ظاہر کر رہا ہے کہ یہ ٹی پارٹی تربیت گاہ کے لئے نہیں کی گئی بلکہ علامہ مغفور کی شخصیت کی وجہ سے کی گئی تھی اور برسبیل تذکرہ تربیت گاہ کے متعلق بھی اپنی رائے ظاہر کر دی تھی۔

"لیکچر کے بعد مولانا شوکت علی صاحب نے جو خلافت کمیٹی کے مشہور اراکین کے ساتھ تشریف لائے تھے موثر تقریر کی اور میری ناچیز خدمات کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا"

(سفر بمبئی ۱۹۲۵ء سیاحت ہند صفحہ ۶۵)

"یہاں میرے دو لیکچر ہوئے ایک انجمن میں دوسرا اسلامیہ اسکول میں۔ مجمع دونوں موقعوں پر اچھا تھا اور لیکچر حاضرین نے غور و توجہ سے سُنے اور اچھا اثر لیا"

سفر جنجیرہ - سیاحت ہند صفحہ ۶۸

"عید میلاد کی مجالس پر میں ضرورت سے زیادہ بحث کر چکا ہوں اس لئے اب اس پر کچھ لکھنا بے سود ہے جلسہ ختم ہوا تو حاضرین نے خواہش کی کہ میں بھی کچھ کہوں۔ میں نے کہا میں واعظ نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر لکھنے والا بولنے والا بھی ہو مگر اُن حضرات نے تسلیم نہ کیا اور میں تقریر کرنے پر مجبور ہوا۔ بیس منٹ کے قریب تقریر کرنے کے بعد نماز مغرب کا وقت آگیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور خاموش ہو گیا مگر بعد مغرب پھر کچھ کہنا پڑا"

(سفر دکن ۱۹۳۰ء - سیاحت ہند صفحہ ۷۶)

جس طرح مرد کو طلاق کا حق حاصل ہے اسی طرح اسلام نے عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ مرد اپنے حق سے تو خوب فائدہ اُٹھا رہا ہے مگر عورت کا حق اس نے ٹکرا دیا

...کے خلاف علامہ مغفور نے نہ صرف بہت کچھ لکھا بلکہ
مختلف مقامات پر لیکچر بھی دئے۔ پنجاب اور ہند کے
بعض علاقوں میں رواج کو شرع پر ترجیح دی جاتی ہے اور
لڑکیوں کو ترکہ پدری سے محروم رکھا جاتا ہے اس کے خلاف
...کاٹھیاواڑ وغیرہ میں علامہ مغفور نے متعدد
تقریریں کیں۔

انجمن حمایت الاسلام لاہور نے اپنے چالیسویں
سالانہ جلسہ میں علامہ مغفور کو مدعو کیا تھا اور اس جلسہ
میں انہوں نے وہ قیامت خیز تقریر کی تھی کہ مجمع زار
زار رو رہا تھا۔ میاں سر محمد شفیع مرحوم اور سر شیخ عبدالقادر
مرحوم نے تقریر ختم ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے اس کی
اہمیت تسلیم کی اور اعلان کیا تھا کہ ہمیں اس کا ضرور
کچھ انتظام کرنا ہے۔ مجمع میں سے ایک صاحب نے جو
زمینداروں کے پیر تھے لڑکیوں کو ترکہ نہ دینے کی وجوہ
ظاہر فرمائیں اور ارشاد کیا کہ ہم لڑکیوں کو شادی کے
وقت اس قدر دے دیتے ہیں کہ قرضدار ہو جاتے ہیں مگر
زمین ایک انچ دینی نہیں چاہتے۔ تقریر میں پنجاب
پر جو الزام عاید کیا گیا تھا اور اس کی صفائی میں میاں
صاحب اور شیخ صاحب نے اسلام کے احکام مقدس
کے سامنے اپنے سچے مسلمان ہونے کا جو ثبوت دیا اور
فیصلہ خداوندی کے آگے سر جھکائے پیر صاحب کی
تقریر اس کے بالکل خلاف تھی اور خود میاں صاحب
اور شیخ صاحب نے ان کو روک دیا تھا"

عصمت جنوری ۲۶ء صفحہ ۴

اس تقریر کے دوران میں علامہ مغفور نے
فرمایا تھا:۔

"مجھے معلوم ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ ہر مذہبی
حکم کو عقل کی ترازو اور فلسفہ کی کسوٹی پر تولتے اور پرکھتے
ہیں۔ اس لئے مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ حقوق نسواں
کے سلسلہ میں میری زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے مذہب
سے علیحدہ ہو کر بھی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے عقل
سلیم متفق نہ ہو۔"

"قبل از اسلام لڑکیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا
تھا وہ بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ اس میں شک نہیں
وہ زندہ دفن کر دی جاتی تھیں مگر وہ موت اس زندگی
سے بہتر ہے جس میں موت کا مزہ آجائے"

(عصمت جنوری ۲۶ء)

یہ تقریر عصمت کے ۴ صفحوں پر شائع ہوئی تھی
آخری حصہ یہ تھا۔

"پنجاب کو خدا نے اس وقت اتنی طاقت دی ہے
کہ اگر مسلمان متفقہ قوت سے کام لیں تو وہ گورنمنٹ کا
رُخ بدل سکتے ہیں۔ یہ قانون اور رواج تو ان کے اپنے
ہاتھ کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں۔ پنجاب ہر شعبہ
میں بہت کچھ ترقی کر رہا ہے مگر لڑکیوں کو ترکۂ پدری سے
محروم کرنے میں جو کلنک کا ٹیکہ پنجاب کے ماتھے پر
لگا ہوا ہے وہ کسی طرح دور نہیں ہو سکتا اور اشد ضرورت
ہے کہ پنجاب اس طرف توجہ کرے"

(عصمت جنوری ۲۶ء صفحہ ۸)

اس تقریر کے بعد علامہ مغفور خاموش نہیں رہے
ممبران اسمبلی و کونسل سے بھی ملے اور ملتے رہے کہ

"حمایت اسلام لاہور کے گذشتہ اجلاس میں
لڑکیوں کے ترکہ پدری سے محروم ہونے کے متعلق جو تحریک
میں کر چکا ہوں وہ ضرورت اندر ہی اندر میرے دل میں
چٹکیاں لے رہی تھی اور گو میں پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس

کی خواہش پر خاموش ہو چکا تھا لیکن میں اس سے غافل نہ تھا اور معاملہ کو یہاں تک پہنچا چکا تھا کہ کونسل کے ممبران یہ مسودہ پیش کریں اور اس ایکٹ کو منسوخ کرائیں جس میں شرع اسلام کے مقابلہ میں رواج کو قرار دے دیا ہے"

(سیاحت ہند صفحہ ۳۷)

"شام کو جب ہواد جلسہ تھا میں نے اپنی تقریر میں لڑکیوں کے ترکۂ پدری پر بھی روشنی ڈالی۔ غصب حقوق کی حد جالندھر ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ ایک نہایت معزز بزرگ نے مجھ سے فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیوں کو حصہ دینے کے حکم کی تعمیل کس طرح ممکن ہے میں نے ان کو اس کا کچھ جواب نہیں دیا مگر اپنے لیکچر میں سب جواب عرض کر دیا"

(سفر جالندھر ۲۶ء سیاحت ہند صفحہ ۲۶)

علامہ مغفور کی یہ مسلسل کوشش بالآخر بار آور ہوئی اور تقسیم ہند سے قبل اسمبلی میں شریعت بل پاس ہوا۔ اس بل کے پاس ہونے میں قائد اعظم مرحوم نے نمایاں حصہ لیا تھا۔

عورتوں سے حسن سلوک کی تلقین وہ ہر لیکچر اور ہر تقریر میں قران و حدیث کے حوالے سے فرماتے۔ اور قران مجید کی آیات اور رسول اکرم کے اقوال سنایا کرتے تھے

"عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور مرد عورتوں کا"

(سورہ بقر آیت ۱۸۲)

"عورتوں کے ساتھ بھلائی سے سلوک کرو"

(سورہ نسا آیت ۲۳)

"عورتیں اپنے حقوق پر تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں"

(سورہ نور آیت ۲۵)

"نیک عورت دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے" (حدیث)

"عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو یہ تمہارے حوالے ہیں۔ ان کی لغزشوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو" (حدیث)

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کا سلوک اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے"

(حدیث)

"عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی میں تمہیں وصیت کرتا ہوں"

(حدیث)

۲۷ء میں حضرت علامہ مغفور نے بھارت سے صوبہ بہار کا دورہ کیا تھا اور وہاں پردہ کی شدت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے تھے اور اس کے خلاف اس صوبہ کے کئی شہروں اور قصبوں میں لیکچر بھی دئے تھے۔ اور واپس آکر عصمت اکتوبر میں "بہار کا پردہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس کا کچھ حصہ یہ ہے:۔

"میں شرع کے مقابلہ میں مصلحت اور ضرورت کو وقعت نہیں دیتا۔ احکام شرع میں آج کی ہر مصلحت و ضرورت ملحوظ تھی۔ میں اگر یہ عقیدہ نہ رکھوں اور احکام اسلام کو اس سے ناآشنا سمجھوں تو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ اسلام دین فطرت نہیں ہے..... شرع کی آڑ میں مسلمانوں نے عورتوں پر کافی زیادتی کی اور کر رہے ہیں مگر وہ اتنا نہ سمجھے اور اب بھی نہیں سمجھے کہ ایک ظالم مظلوم پر ایک طاقتور کمزور پر ایک با اختیار لاچار پر بہت کچھ قابو رکھتا ہے تو جس وقت مظلوم کمزور اور لاچار بپھرے گا تو ظلم طاقت اور اختیار سب رکھے کے رکھے رہ جائیں گے۔ نہ دانی کہ چوں گربہ عاجز شود۔ برآرد بہ چنگال چشم پلنگ ہندوستانی مسلمان عورت کا یہی مشورہ اگر مرد اس کے ساتھ زیادتی روا نہ رکھتے۔ تو ان کو مسلمان عورتیں بے پردہ نہ دکھائی دیتیں اور خبر ارتداد ان کا کلیجہ نہ بھونتی۔ پردہ کا حکم شرعی ہے اس میں مصلحت اور دور اندیشی کو دخل ہے مگر پچھلے دنوں جب مجھے صوبہ بہار میں جانے کا اتفاق ہوا

سیلکوئی اتحاد ہے۔ غضب خدا کا آٹھ برس کی بچی کو
نہیں کہ کسی غیر عورت کے بھی سامنے جا سکے! ممکن ہے
عام نہ ہو مگر بہار اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اگر دس گز
لے پر کسی دوسرے گھر میں جانا ہو تو ڈولی اور سواری کے بغیر
ممکن نہیں اور موٹر اور گاڑی پر چار طرف سے اس قدر
ہو کہ آنکھوں تک مدد دکھائی دے۔ بیگم راشد الخیری کا تے
بعد ایک موٹر میں مجھیں ان کے ساتھ دو تین بیگمات تھیں
وں نے چاہا کہ پردہ وہ نجا کر دیں کہ کچھ ہوا کا گذر ہو دوسری
ات ہاتھ جوڑنے لگیں کہ ایسا غضب نہ کیجئے ہمارے مرد
ت توڑ دیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مسلمانوں کو اس
کا کیا حق حاصل ہے؟ اور جب غیر مسلم یہ اعتراض کرتے
کہ اسلام میں عورت کی وقعت پالتو جانور سے زیادہ نہیں
س منہ سے کہتے ہیں کہ اسلام میں عورت کی عزت مردوں
کے برابر ہے۔ میں بہار میں ایسے کئی حضرات سے ملا جو پردہ
سختی اور جگر خراش نتائج کو رو رہے ہیں۔ مجھکو ۴-۵
یسے سرکاری عہدہ داروں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کی
بیگمات سل کا شکار ہو گئیں یا مبتلا ہیں۔
میں نے آرہ مونگیر وغیرہ کے لیکچروں میں بالتفصیل
ردہ پر بحث کی اور اخبار اتحاد میں مضمون بھی لکھا ہے۔
مجھے امید ہے بہار کے مسلمان اس طرف توجہ کریں گے"
حقوقِ نسواں پر علامہ مغفور کے لیکچر صرف مردانہ جلسوں
میں ہوتے تھے۔ زنانہ جلسوں میں وہ عورت کے مختلف
فرائض پر تقریر فرماتے اور بتاتے تھے کہ اسلام ان سے
کیا توقع رکھتا ہے اور بیٹی بہن بیوی ماں کی حیثیتوں میں
ان کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔

ترقیٔ عصمت | دفتر کا کچھ نہ کچھ کام میں ۱۹۱۶ء سے
کر رہا تھا مگر ۱۹۲۱ء میں عصمت کی ادارت میرے سپرد
کر دی گئی مگر روپیہ پیسہ کے معاملہ میں میرا کوئی اختیار نہ تھا
۱۹۲۵ء کی آخری سہ ماہی تک جب عصمت کے سیاہ سفید
کا مالک مجھے بنا دیا گیا تو میں نے سب سے پہلے تمدن پریس
جو اب صرف نام کا چھاپہ خانہ رہ گیا تھا بند کیا اور محبوب
المطابع کے مالک مرزا محبوب بیگ مرحوم سے معاملہ طے
کیا۔ چھاپہ خانہ سے متعلق ملازمین کی جھوٹی باتیں اور غلط
وعدے میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پریس بند کرنے کی
بڑی وجہ یہی تھی۔ مرزا صاحب سے یہ طے ہوا کہ جس تاریخ
کو جس وقت کام دینے کا وعدہ کریں گے خواہ کچھ ہی ہو
اس میں چند منٹ کا بھی فرق نہ آئے گا۔ خدا ان کی
مغفرت کرے انھوں نے جو وعدہ کیا تھا مرتے دم تک
پورا کیا اور دسمبر ۱۹۲۵ء سے جو عصمت وقت کی پابندی سے
نکلنا شروع ہوا تو آج ۳۹ سال ہوگئے اس پابندی میں
کسی ماہ ایک دن کی تاخیر اشاعت نہیں ہوئی باوجود
سخت سے سخت مشکلات کے۔ مضامین کا معیار پہلے سے
بلند کر دیا گیا اور پھر خواتین کے مذاق اور مطلب کے بہترین
لکھنے والے مردوں عورتوں کے مضامین شائع ہونے لگے۔
سال کے پورے بارہ پرچے شائع ہوئے۔ کاغذ چکنا سفید
لگنے لگا۔ ٹائیٹل دو دو رنگ کا بہترین رنگین ولایتی کاغذ
پر مثل سابق چھپنے لگا۔ غرض ظاہری اور باطنی خوبیوں
میں عصمت ۱۹۲۶ء کی پہلی ہی سہ ماہی میں ملک کے
بہترین ادبی رسالوں میں پھر شمار ہونے لگا۔ ۱۹۲۶ء
کے عصمت پر بانیٔ عصمت نے خود ریویو فرمایا تھا۔
اس کا ایک حصہ یہ ہے۔
" خریداروں کی تعداد اور بے قاعدگی اشاعت کی وجہ سے

اس قدر گھٹ چکی تھی کہ کامیابی محال معلوم ہوتی تھی مگر میں رازق میاں کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ انھوں نے نہایت استقلال سے کام کیا اور کامیاب ہوئے سنئے پرچہ کم چندہ پر زیادہ سامان دینے کی کوشش کر رہے تھے بجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے اس کی بھی پرواہ نہ کی اور سرگرمی سے محنت کرتے رہے۔ جب سینکڑوں وی پی واپس ہوئے تو یہ واپسیاں کام کرنے والے کو مایوس کرنے کے لئے بہت کافی تھیں لیکن رازق میاں نے نہایت استقلال سے وقت کا مقابلہ کیا اور آج خدا کا شکر ہے وہی لوگ جو عصمت سے مایوس ہو چکے تھے اُن کی بہت سے امیدیں عصمت سے وابستہ ہیں۔ عصمت اس سال جس آب وتاب اور پابندیٔ وقت سے شائع ہوا اور جیسے قابل قدر پاکیزہ مضامین شائع کئے ان کو دیکھ کر رازق میاں کو ان کی کامیابی پر نہایت خوشی سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اس میں شک نہیں انھوں نے بے غل وغش روپیہ خرچ کیا ہے اور رسالہ کو کامیاب بنانے میں کوئی فروگذاشت نہیں کیا۔ سب سے بڑی بات جسے دیکھ کر میں مطمئن ہوا یہ ہے کہ جس مقصد کو لے کر عصمت کا پہلا پرچہ سنہ ء میں نکلا تھا سنہ ۲۶ء میں بھی ان مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے ۔ . . . . . .

سنہ ۲۶ء عصمت کا ایک نہایت کامیاب سال ہے۔

(عصمت جنوری سنہ ۲۷ء)

جولائی سنہ ۲۷ء کا سالگرہ نمبر ڈھائی ہزار چھپا۔ سنہ ۲۸ء میں ۲۰ سالہ جوبلی نمبر شائع ہوا تو رسالہ کا سائز ۲۲×۱۸ سے بڑھا کر ۳۰×۲۰ کر دیا گیا اور خاص نمبر چار ہزار چھپا پھر اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ دوسرا اڈیشن چھاپنا پڑا ۲۰ سالہ جوبلی نمبر بڑی آب وتاب سے شائع ہوا تھا اس زمانہ میں لاہور کے متعدد ادبی رسالوں کے خاص نمبر بہت ضخیم شائع ہو رہے تھے۔ عصمت کا نقرئی جوبلی نمبر اُن سے کسی اعتبار سے کم نہ تھا تین سو صفحات میں ایک تہائی صفحوں کی چھپائی رنگین تھی کئی کئی رنگوں کی ہاف ٹون بلاک کی تصاویر مضامین کے متعلق تھیں ۔ تصاویر ۶۰ سے اوپر تھیں۔ اخبارات اور رسائل میں اس خاص نمبر کی بڑی تعریف کی گئی بڑے بڑے معرکۃ الآرا مضامین اس میں شائع ہوئے تھے۔ سنہ ۲۹ء میں سنہ ۲۸ء سے بھی بڑھ کر ہر اعتبار سے رسالہ نے ترقی کی اور علامہ مغفور نے اس کے متعلق تحریر فرمایا۔

"میں نے جس وقت عصمت رازق میاں کے سپرد کیا تھا۔ اس وقت میرے اہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اپنی آنکھوں سے عصمت کو اس قدر کامیاب دیکھ سکوں کا کہ اس کی اشاعت ہندوستان کے کسی زنانہ پرچہ سے کم نہ ہوگی اور ملک کے بہترین اہل قلم اس کی نامہ نگاری میں معروف ہوں گے اور پیچیدہ سے پیچیدہ زنانہ مسئلہ عصمت کے ذریعہ سے حل ہوگا۔ سنہ ۲۹ء عصمت کا نہایت کامیاب سال ہے اس لئے نہیں کہ ہر مہینہ کا پرچہ پابندیٔ وقت سے ٹھیک ۳۰ تاریخ کو شائع ہوا بلکہ اس لحاظ سے کہ باوجود مالی ترقی کے یہ مواقع موجود ہونے کے کہ بعض اشتہارات کی توقع سے بہت زیادہ اجرت پیش کی گئی اور یہ ہونے کے کہ سرکاری اشتہارات اس میں شائع ہو سکیں عصمت نے نہایت استقلال سے کام لیا اور ان اشتہارات سے پرہیز کیا جو خواتین کے واسطے کچھ مفید نہیں تھے . . . . میرے دوران ادارت میں ہر پرچہ پر جو صرف ہوتا تھا اس وقت بلامبالغہ چوگنا زیادہ صرف ہو رہا ہے مگر اشاعت چوگنی نہیں ہے۔ اخراجات میں تصاویر ہی کی ایک ایسی مد ہے کہ میں دیکھ کر متحیر اور ششدر ساکت ہو جاتا ہوں . . . . مجھے سب سے

یادہ تو ان اس بات کی ہے کہ بھنی کے مضامین سے اس کے اوراق پلٹ رہے"

۱۹۰۳ء میں علامہ مغفور نے بنات جاری کیا اور یہ دیر سروقیات اور بڑھ گئیں لیکن عصمت پر کوئی اثر نہ پڑا اور سال بہ سال ترقی کرتا رہا۔ ۱۹۳۰ء میں عصمت کی اشاعت ساڑھے پانچ ہزار تھی۔ ۱۹۳۳ء سے سال میں گیارہ پرچے شائع ہوتے تھے۔ ماہ ستمبر اور جولائی اگست دو ماہ کا یکجا پرچہ ڈھائی تین سو صفحوں کا سالگرہ نمبر جس میں ۴-۵ رنگین تصاویر بلاک کی چھپائی کی ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں عصمت کا ایک خاص اڈیشن آرٹ پیپر کا ہوتا تھا جس کا سالانہ چندہ والیان ریاست سے سو روپے اور عوام سے دس روپیہ تھا۔ ایجنٹوں کے ذریعہ رسالہ فروخت کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ انفرادی خریدار ۵ ہزار سے اوپر تھے۔

پیر جی کا سہرا دُور پرے کے ایک عزیز مجھ سے ۴-۵ سال بڑے تھے۔ لڑکپن میں اُن کے ساتھ میں کھیلا بھی کرتا تھا۔ اور خاصی بے تکلفی تھی۔ کچھ مدت انھوں نے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام بھی کیا تھا۔ وہ پیر جی کہلاتے تھے اُن سے کچھ ایسی حرکتیں سرزد ہوتی رہتیں اور بعض باتیں وہ کچھ اس انداز سے کرتے تھے کہ حضرت والد مغفور ان کا خوب لطف اُٹھایا کرتے تھے اور ہم سب کو ہنسی آجاتی تھی۔ ان کی شادی دلّی سے باہر ایک قصبہ میں تھی۔ دو دن پہلے والد مرحوم کے بھائی مولوی محمد امان الرحمٰن صاحب کے ہاں والد مغفور تشریف لے گئے تو میں ساتھ تھا ماموں جان مرحوم اپنے بھائیوں میں خوش طبع تھے اور ہنسی مذاق کی باتوں سے بہت محظوظ ہوتے تھے انھوں نے کہا۔

"بہشتی دولہا پیر جی کا سہرا ہو جائے" والد مغفور نے فرمایا اچھی بات ہے۔ مجھے حکم ہوا لکھو۔ وہ فرماتے گئے اور میں لکھتا گیا۔ ایک ایک شعر پر ماموں جان مرحوم ہنستے ہنستے دوہرے ہو ہو جاتے تھے ۱۰۔۸ اشعار تھے۔ چند یاد رہ گئیں۔

آئے ہیں مجلس تک بن کر آج دُولھا پیر جی
ہاتھ میں سہ دس پنا۔ اور سر پہ جُولھا پیر جی

پھول بستر کے نہ ہوں میلے رہے اتنا خیال
ہاں دولہن کے سامنے بھی ہو دمے کُولھا پیر جی

(پہلا مصرعہ یاد نہیں رہا)
لوگ کہتے ہیں کہ ہے تھوڑا سا لُولا پیر جی

کیا کریں مجبور ہیں ورنہ ——— کے لئے
بھیج دیتے ایک دلّی سے گُنڈولا پیر جی

مولوی عبداللہ کا لطیفہ میں شام کو ہوا خوری کے لئے باہر جاتا تو والد مرحوم کو اور وہ کسی وقت موجود نہ ہوتے تو والدہ مرحومہ کو یہ بتا کر جاتا کہ کہاں اور کس کے ساتھ جا رہا ہوں ۱۹۲۷ء میں گرمیوں کی ایک شام کا ذکر ہے دریا گنج کی سڑک کے بیچ میں جو پٹڑی تھی (اور میرے بچپن میں جہاں نہر تھی) وہاں ٹہل رہے تھے۔ والدہ مرحومہ سے اجازت لے کر میں سینما تنہا جا رہا تھا۔ والد مرحوم نے دیکھا تو دریافت فرمایا "کہاں کا ارادہ ہے" میں نے عرض کیا "سینما جا رہا ہوں" "پتھر والے کنوئیں پڑ" فرمایا "آج کوئی ساتھی نہیں ملا۔ خیر جاؤ" میں اڈورڈ پارک تک پہنچا تھا کہ نہایت تیز قدموں سے پیچھے پیچھے مولوی عبد اللہ تشریف لا رہے تھے۔ یہ کسی عربی مدرسہ کے پڑھے ہوئے تھے اور حضرت والد مرحوم نے دفتر میں انھیں رکھوا دیا تھا۔ اُن کا کام

---

[1] دست پناہ۔ دلّی میں عام طور پر دس پنا کہتے تھے۔

تھا کتابت شدہ کاپیوں کی تصحیح مگر مجھے خود ہی کاپیاں دیکھنی پڑتی تھیں کیونکہ مولوی عبداللہ "کلنگ کے ٹیکے" میں ک اور ل کے بیچ میں پیش لگا دیتے اس لئے کہ کلنگ ایک جانور ہوتا ہے اور کاتب اگر خود دار بہن کی جگہ برخوردار بہن اور قوانین کی بجائے خواتین لکھتا تو وہ اسے جائز سمجھے تھے۔ علامہ مغفور نے جیسے ایک دفعہ ملازم رکھا اُسے کبھی خود جواب نہیں دیا۔ مولوی عبداللہ کو میں کس طرح خود علیحدہ کر دیتا۔ جب مولوی عبداللہ میرے بالکل قریب پہنچ گئے تو سلام علیک کے فوراً بعد ہی انھوں نے فرمایا "آپ کیا ولایت جا رہے ہیں"؟ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا کہنے لگے "مولانا صاحب فرما رہے ہیں،" میں سمجھ گیا کہ تنہائی کے خیال سے انھوں نے عبداللہ صاحب کو بھیجا اور یہ مذاق کیا ہے۔ میں نے کہا "ہاں بھئی سوچ تو رہا ہوں"۔ کہنے لگے "مگر آپ کو مولانا صاحب اکیلا جانے دیں گے؟ یہ بات سمجھ میں نہ آئی"

"تو مولوی صاحب آپ ہی بتایئے اتنی دور میرے ساتھ بھلا کون جانے کو تیار ہو جائے گا؟"

"پھر یہ بندۂ ناچیز کس کام آئے گا؟ مجھ سے جو خدمت ہو سکتی ہے ہر طرح حاضر ہوں"

"لیکن مولوی صاحب وہاں تو انگریزی کپڑے پہننے پڑیں گے"

"اگر بغیر انگریزی کپڑے پہنے گذارا نہیں ہو سکتا تو خیر پہن لیں گے نماز تو اُن میں بھی ہو جاتی ہے"

"اور ڈاڑھی کا کیا کریں گے؟"

عبداللہ صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر جھٹ سے بولے "انگریز بھی تو ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ ان کے پادریوں کی تو لمبی ڈاڑھی ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کا پادری بن جاؤں گا اور بن کیا جاؤں گا ہوں ہی۔ آخر نماز پڑھاتا امامت کرتا ہوں یا نہیں"

"مگر میرے ساتھ پادری بن کر رہنا تو آپ کا مشکل ہوگا"

"چلئے تو ڈاڑھی اُڑا دیں گے پھر رکھ لیں گے"

"لیکن شراب کا کیا کریں گے۔ وہاں تو ۹ ماہ سخت سردی پڑتی ہے جب ہی تو پانی وہاں نہیں پیتے"

"پانی تو وہاں ضرور ہوتا ہوگا"

"مگر حضت سخت سردی میں کس کو مرنا ہے جو ٹھنڈا پانی پئے۔ اسی لئے ہلکی سی شراب پی لیتے ہیں"

اب پھر مولوی عبداللہ سوچ میں پڑ گئے اور پھر فرمایا۔ "مجبوری سب ہی کچھ کراتی ہے۔ خیر۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے"

اتنے میں سینما آگیا۔ ٹکٹ خریدے۔ تصویر دیکھی تانگہ پر واپس ہوئے اور گھر آکر یہ واقعہ والد مرحوم کو سنایا تو ہنستے ہنستے اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے اور والدہ مرحومہ سے فرمایا۔

"سنا تم نے یہ ہوتے ہیں مولوی"

چینی ترکستان کے حاجی صاحب کا انتقال

۲۵ء یا ۲۶ء کا واقعہ ہے کہ علامہ مغفور اپنی بڑی صاحبزادی کے ہاں گنگا پور سٹی گئے ہوئے تھے۔ ایک دن تیسرے پہر بمبئی سے جو پسنجر ٹرین اسٹیشن آئی تو اس میں چینی ترکستان کے ایک حاجی صاحب کراہ رہے تھے۔ چند اسٹیشن قبل دروازہ کھول کر وہ وضو کر رہے تھے کہ چلتی گاڑی میں سے گر پڑے اور دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں چُور چُور ہو گئیں۔ گنگا پور کے ریلوے ہسپتال میں انھیں پہنچایا گیا۔ علامہ مغفور کو علم ہوا تو اسی وقت وہاں پہنچے۔ حاجی صاحب اُردو۔ فارسی انگریزی نہ جانتے تھے۔ علامہ مغفور کو اُن سے گفتگو

نے ہر کسی طرح کامیابی نہ ہوئی تو قرآن مجید کی آیتوں کی
سے انھوں نے گفتگو کی اور یہ معلوم ہونے پر کہ چینی
ستان کے ہیں رات کو جو گاڑی دلی جاتی تھی اس سے
صاحب کو دلی بھیج مفتی کفایت اللہ مرحوم سے
رسے امینیہ سے دو طالب علم چینی ترکستان کے
نے۔ انگریز ڈاکٹر فوراً دونوں ٹانگیں کاٹنی چاہتا
اس کا خیال تھا کہ ٹانگیں کٹنے کے بعد زندہ رہنے
سلمان زیادہ ہے علامہ مغفور نے کہا کہ ہندوستان
ہوں یا ترکستان کے مسلمانوں کو ہر معاملہ میں احتیاط
تنے کی تاکید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حاجی صاحب آپریشن
کے بعد جانبر نہ ہوں اس لئے ان کے حالات اور وصیت
معلوم کرلینی ضروری ہے۔ انگریز ڈاکٹر کو بالآخر انتظار
کرنا پڑا۔ ادھر دلی سے چینی ترکستان کے دو طالب علم
گئے۔ علامہ مغفور نے دو راتیں اور ایک دن ہسپتال
مریض کے پاس گذاریں اور قرآن مجید کی آیتوں سے
ور پھر ان طالب علموں کے ذریعہ مریض کی وصیت لکھ
ی۔ حاجی صاحب کی دو بیویاں تھیں اور سات بچے۔
جائداد بھی تھی اور کاروبار بھی۔ آپریشن کے دوسرے روز
حاجی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ علامہ مغفور نے اپنے
پاس سے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور نہ صرف ریلوے
اسٹاف کے مسلمان بلکہ قصبہ کے مسلمانوں نے بھی
نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔

مصورِ غم کی سحر نگاری

"غیر منقسم ہند کے صوبہ یو پی کے ایک معزز عہدہ دار
سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ آخر فروری ۱۹۲۶ء میں
ان کی بیوی کی طلاق کے متعلق مجھے اشاعت کی غرض
سے ایک مضمون موصول ہوا۔ میں نے یہ مضمون ابا جان
کو سنایا تو انھوں نے میرا خیال معلوم کرنے کے لئے فرمایا
کہ مناسب سمجھو تو چھاپ دو۔" میں نے عرض کیا "میں تو
شائع نہ کروں گا۔ پہلا ظلم طلاق دوسرا ستم اس مصیبت
ماری کی بدنامی۔" فرمایا "تو پھر مطلقہ کی حمایت میں عصمت
کو لکھنا چاہئے۔" میں نے عرض کیا "ضرور لکھے گا۔" شاید ایک
ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ یہی مضمون ایک زنانہ پرچہ میں شائع
ہوا اور دوسرے ہفتہ میں ایک اور زنانہ پرچہ میں۔ مجھے
بہت ناگوار گذرا اور میں نے ابا جان سے عرض کیا "اب
تو اس کا بہت سخت جواب ہونا چاہئے۔" فرمایا "تم اس
ماہ کے پرچہ کے لئے افسانہ کہنے کہہ رہے ہو۔ میں اس میں
اس کا جواب بھی لکھ دوں گا۔" علامہ مغفور نے افسانہ
شروع کر دیا تو ایک بہن کا مضمون پہنچا کہ زنانہ پرچے
جو ہمارے اپنے کہلاتے ہیں ہمیں بدنام کرتے ہیں اور پھر
ہماری ہمدردی کے دعویدار ہیں۔ عصمت نے یہ مضمون
بھی شائع نہ کیا۔ البتہ مصیبت ماری بہن کی حمایت میں
حضرت مصورِ غم کا دردانگیز افسانہ "طلاق کا سفید بال"
شائع کیا گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جن صاحب نے اپنی
بیوی کو طلاق دی تھی انھوں نے ارشادِ رسول کی تعمیل کی
اور رجوع کرلیا۔

مصورِ غم کی سحر نگاری کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔
ان کی مستقل تصانیف اور عصمت کے مضامین نے
ایک دو نہیں دس بیس نہیں۔ ہزاروں گھروں کو تباہی
اور بربادی سے بچا کر جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔"
(عصمت کی کہانی)

بڑی اماں حسینہ بیگم مرحومہ

اپنی "چچی اماں" بی بی حمید الزمانی
کے علاوہ علامہ مرحوم بڑی اماں حسینہ بیگم مرحوم کی بہت

تعریف کیا کرتے تھے وہ بڑی پھوپی اماں "اُم صفیۃ النسا کی نواسی اور پھوپی سکینہ بیگم کی بیٹی تھیں اس رشتہ سے وہ والد مرحوم کو "ماموں ابّا" کہا کرتی تھیں اور چونکہ وہ اُن کے پھوپی زاد بھائی مولوی اشرف حسین صاحب کی بیوی تھیں اس لئے والد مرحوم انھیں "بھابی حسینہ" کہتے تھے۔ علاّمہ راشد الخیری کے ناولوں اور افسانوں میں جن خواتین کے کردار پیش کئے گئے ہیں وہ خیالی نہیں ہیں نہ اُن میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے "لڑکیوں کی تربیت" کے عنوان سے ان کا ایک مضمون عصمت میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے بڑی اماں حسینہ بیگم صاحبہ کا حال لکھا تھا۔

"بیبی بی اس وقت ارض حجاز میں ہیں۔ شمس العلما مولوی نذیر احمد کی نواسی اور مولوی اشرف حسین صاحب کی بیوی۔ ان کی پرورش اور تربیت کا زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کے آٹھ دس سال بعد کا ہے۔ انھوں نے تعلیم بھی گھر پر پائی اور تربیت بھی گھر میں ہوئی۔ اُن کی تربیت کا سہرا میری بڑی پھوپی مولوی نذیر احمد صاحب کی بیوی مرحومہ صفیۃ النسا کے سر ہے۔ میں اس وقت بھی دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی تعلیم یافتہ سو لڑکیاں منتخب کی جائیں تو ایک مسلمان عورت کی تمام حیثیتوں کا مجموعہ جس قدر ان کی ذات میں ہے دوسری اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت میں مشکل سے ہوگا۔ اُن کا خط اگر سو سے بدتر ہوگا تو ہزار سے بہتر۔ وہ انگریزی نہیں جانتیں۔ مگر بچوں کی پرورش اور تربیت کا ملکہ اس قدر کافی ہے کہ شاید زیادہ سے زیادہ کسی مدرسے کی تعلیم یافتہ لڑکی کا بھی اتنا ہی ہوگا وہ بچوں کی بیماریوں اور ان کی دواؤں کی خاصیت سے باخبر ہیں۔ انھوں نے اپنے بچے

معمولی شکایتوں میں کبھی حکیم کے ہاں نہیں بھیجے بلکہ ایک موقعہ پر اُن کا اپنا بڑا بچہ شاید دو سال کا بیمار ہوا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سانس کی شکایت ہوئی۔ صبح کے وقت بعض کی رائے ہوئی کہ پسلی اُم الصبیان کا اندیشہ ہے۔ حکیم شجاعت علی خاں کو جو اس وقت کے مشہور طبیب تھے بلانا چاہئے۔ مگر انھوں نے اس سے اتفاق نہ کیا خود بازار سے دوائیاں منگوائیں اور کافل کی دو پوٹلیاں بناکر ایک سینہ پر لگادی دوسرے دن بچہ کی حالت میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔

سوئی کا کام کنبہ کی اکثر عورتیں اتنا ہی اور دو ایک اُن سے بہتر جانتی تھیں۔

مگر ایک دفعہ اُنھوں نے اپنے شوہر کے واسطے تکیہ کا غلاف اور کرتہ کاڑھا مولانا اشرف حسین مرحوم اُس وقت لکھنؤ میں انسپکٹر زراعت تھے احباب نے غلاف بہت پسند کیا اور صدر قانونگو صاحب جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے کرتہ پر ایسے ریجھے کہ اُس کا گریبان اور بوٹی دکھانے کے واسطے اپنے گھر لے گئے۔

کھانا پکانے کے واسطے اُن کے پاس دو مامائیں تھیں اور جب شوہر کے ساتھ جاتی تھیں تو ایک باورچی بھی۔ مگر شوہر کا کھانا ہمیشہ اپنے ہاتھ سے پکاتی تھیں۔ اور مختصر یہ ہے کہ کھانا پکتے وقت اُن کا تمام وقت اسی میں صرف ہوتا تھا اور بہت کم باورچی خانہ سے الگ ہوتی تھیں۔ مولانا مرحوم کانپور کی تحصیل اکبرپور کا معائنہ کر رہے تھے۔ فضل علی خاں ڈپٹی کلکٹر کا کیمپ بھی وہیں تھا اور میں بھی وہاں تھا شام کے چار بجے تھے کہ فضل علی خاں نے آکر کہا۔ بیگم صاحب آج راجہ صاحب آ گئے ہیں ان کے کھانے کا انتظام آپ کر دیجئے لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور

، کے شوقین۔ ملّی کا تمام ہو جائے۔ رات کے دس
ں علی خاں صاحب مع مہمانوں کے آ گئے۔ کھانا چُنا گیا۔
صاحب نے بہت تعریف کی اور فرمایا لکھنؤ میں
ر جلد اتنا اچھا کھانا آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا
ان کے مزاج کی سادگی کنبہ میں مشہور ہے۔ محلّہ
حاجتمند عورتیں اُن کے پاس اپنی ضرورتیں لے کر
در مشکل سے ناکام جاتیں ان کی فراخ حوصلگی کا
واقعہ جو آج تک راز تھا اور میرے علم میں ہے بیان
ہوں۔ ایک ہمسایہ کی بیوی بیمار ہوئی اور علاج میں
قدر روپیہ صرف ہو گیا کہ ان کو قرض لینے کی ضرورت
۔ بیچارہ نے پچاس روپیہ ایک عزیز سے جو آج
زندہ ہیں قرض مانگے مگر نہ ملے۔ بیگم صاحب کو بھی
وئی ان کو دیکھنے گئیں اور چلتے وقت نہایت خاموشی
پاس روپیہ کے نوٹ اُن کی جیب میں ڈال دیے۔
اُس وقت وہاں موجود تھا . . . .
سے دیکھ لیا۔ لیکن حاجتمند کو پتہ نہ چلا۔ انھوں نے
سے ذکر بھی نہ کیا مگر میں خاموش رہا۔

شوہر کے ساتھ اُن کے تعلقات آجکل کے
ں کو کہانیاں معلوم ہوں گی مگر اس کے دیکھنے والے
چار نہیں۔ کنبہ کا کنبہ موجود ہے ان کو اپنے شوہر
مانا اشرف حسین مرحوم سے محبت نہیں عشق تھا۔
دو تین تین مامائیں دو دو تین تین نوکر لڑکے مگر مولانا
ام کا حُقّہ اپنے ہاتھ سے بھرتی تھیں جاڑوں میں کوٹھے
اور گرمی میں دو منزلہ پر خود لے کر جاتی تھیں۔ اور
ش ہوتی تھیں۔ جہیز میں معقول جائداد ملی تھی۔
ہمیشہ ساس نندوں کے ساتھ بسر کی۔
اُن کا سب سے بڑا انصاب گھر کی تربیت اور

بزرگوں کا فیض بہت تھا کہ ہر وقت قرآن و حدیث کا چرچا
تھا۔ آٹھویں دسویں روز وعظ۔ جیسے دوسرے جیسے مولوی محمد حسین
صاحب محدّث کی باتیں یہی تھیں وہ چیزیں جنھوں نے ان کو
مسلمان عورت بنایا۔ شوہر کے بعد اُن کا دل دنیا سے بیزار
ہو گیا۔ بیٹے بیٹیاں۔ نواسے نواسیاں۔ پوتے پوتیاں غرض
بھرا گھر موجود ہے لیکن آنکھ کا آنسو نہیں تھمتا۔ ایک دفعہ خواب
میں دیکھا کہ شوہر کے ساتھ حج کر رہی ہوں اسی سال حج کو
تشریف لے گئیں۔ واپس آئیں مگر یہاں دل نہ لگا مشکل سے
دو سال کاٹے ہر وقت مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تسبیح تھی
اس سال پھر گئی ہیں اور یہ فرما گئی ہیں کہ ان شاء اللہ سال ڈیڑھ
سال وہاں رہ کر دوسرے حج کے بعد واپس ہوں گی"

عصمت ۲۶ء

دوسائل

واجدہ بیگم لکھتی ہیں کہ ہماری آپا گنگا پور میں رہتی تھیں بھائی میاں کی چھٹیوں کے زمانے میں ہم سب وہاں جایا کرتے تھے۔ تربیت گاہ کی عمارت اپنی تو تھی نہیں کرائے کی تھی۔ اسکول کا کرایہ کہاروں اور اُستانیوں کی تنخواہ سے ابا جان کافی مقروض تھے۔

ایک روز رات کو ۱۱ بجے دو سائل آئے اور انھوں نے سوال کیا بابا کھانا کھلا دو۔ دروازے کے پاس کریمن ملازمہ سوتی تھی اماں جان نے آواز دی کریمن ان کو کھانا دے دو۔

تھوڑی دیر میں کریمن آئی اور کہا بیگم صاحب وہ کہتے ہیں کہ مائی کے ہاتھ کا ہی کھائیں گے۔ اماں جان نے ابا جان سے پوچھا "میں کھانا دے آؤں" ابا جان نے کہا "ہاں دے آؤ" تو سائل بولے "مائی ہم تو تیرے ہاتھ کا کھائیں گے" کریمن نے آٹا گوندھا۔ لکڑیاں رکھ کر چولھا جلایا۔ اماں جان نے چار روٹیاں پکائیں اور کہا سالن دوں انھوں نے کہا نہیں "گھی لگا دوں" انھوں نے کہا نہیں "بابا چینی کی چٹکی

رکھ دوں" کہا نہیں ۔ روکھی دو دو روٹیاں دونوں نے کھا کر پانی پیا اور کہا مائی تو پریشان ہے اللہ کو یاد رکھ ۔ اماں جان نے کہا میں تو ہر وقت اللہ کو یاد رکھتی ہوں ۔ انھوں نے کہا تو پھر پریشانی کیسی دیکھ مائی ۔ آٹھ دن میں تو ادھر جائے گی (ہاتھ کے اشارے سے بتایا) تیری پریشانی دور ہو جائیگی اور لڑکی کے لئے ۔ وہ تو تیرا جانا پہچانا ہے ۔ تیرے سامنے ہی کھڑا ہے ۔ سائل یہ کہہ کر چلے گئے ۔ اماں جان نے حقّہ بھر کر کرمن کے ہاتھ بھجوا دیا تھا ۔ ابّا جان حقّہ پی رہے تھے اب جو اماں جان گئیں تو کہا "کھلا آئیں کھانا کیا بتا گئے؟" اماں جان نے کہا صبح بتا دوں گی " دیکھو بی ابھی بتا دو" اماں جان نے بتا دیا کہ یہ کہہ گئے ہیں اب کیا تھا صبح سے شام تک خاندان کے سارے لڑکوں کے نام گنوائے جاتے "کہو بی کس سے کر رہی ہو؟ کہو بی کب جا رہی ہو ادھر؟" ہنستی بھی تھیں اماں جان اور کھسیانی بھی ہو جاتی تھیں اور ہم سب بھی ہنستے تھے ۔ دونوں باتیں سچی نکلیں ۔

چار پانچ دن بعد ابّا جان ایک دم شیشم کے درخت کے نیچے سے لکھتے لکھتے آئے اور کہا "تم اور رازق میاں میرے ساتھ چلو" اماں جان نے کہا کہاں ۔ انھوں نے کہا بس میرے ساتھ چلو چنانچہ وہ ٹونک ۔ جاورہ یا سورت گئے ۔ چندہ میں معقول رقم لائے اور دوسرے ہی دن استانیوں اور کہاروں کی تنخواہ اور مدرسہ کا کرایہ دلی بھجوایا ۔ میری شادی بھی جلدی ہو گئی ۔ ان کا پیام عزیزی خورشید علی خاں کی معرفت آیا ۔ میرا یہ بھانجا ہمارے ساتھ ہی رہتا اور ابّا جان کی سرپرستی میں دلی میں زیر تعلیم تھا ،،

واجدہ بیگم کی شادی

آپا کی شادی ۱۷½ سال کی عمر میں ہوئی تھی لیکن واجدہ بیگم شادی کے وقت ۲۲ سال کی تھیں اور اُس زمانے کے لحاظ سے شادی کی یہ عمر زیادہ تھی ۔ آپا کی پرورش بہت ناز و نعم میں ہوئی تھی اُن سے قبل دو لڑکے ضائع ہو چکے تھے ۔ واجدہ بیگم کا وہ لاڈ پیار نہ ہوا بلکہ والدہ مرحومہ نے ان کا رپتہ ہی مار دیا تھا اور گھر بھر کا سارا کام دن بھر وہ کرتی رہتی تھیں، ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول کیا چھوٹا کیا بڑا ۔ ہر ایک کی خدمت میں مصروف ۔ آپا دادی کی بھی چہیتی تھیں اور نانی کی بھی ۔ بہتر سے بہتر پہنتیں اور اچھے سے اچھا کھاتیں ۔ اور زیادہ وقت ان کے پاس گذارتیں ۔ واجدہ بیگم کی تربیت میں خاص طور پر والدہ مرحومہ کے سامنے یہ اصول تھا کہ اسے پرایا گھر آباد کرنا ہے اگر اچھا کپڑا اور اچھا کھانا میسر نہ ہو جب بھی ہنسی خوشی زندگی گذار سکے ۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیوڑھی پر ملازم اور ماندر ماما موجود ہونے کے باوجود واجدہ بیگم گھر کے ہر قسم کے کام کی ذمہ دار تھیں ۔ والدہ معظمہ نے جس اصول پر واجدہ بیگم کی تربیت کی وہ اُن کے حق میں اکسیر ثابت ہوئی اور تپ کردہ کندن بنیں ۔

اُن کے پیام کئی آئے ۔ ایک صاحب کی بیوی موجود تھی اور دو بچے بھی تھے ۔ چار پانسو روپیہ کے ملازم اور صاحب جائداد تھے ۔ ایک لڑکا جس کی تعلیم ایف اے تک تھی خوش حال باپ کا بیٹا اور کماؤ بھی تھا مگر فضول خرچ اور غیر ذمہ دار تھا اور جھوٹ بھی بولتا تھا ۔ ایک بیرسٹر صاحب مالدار ضرور تھے مگر مغرب زدہ اور شراب بھی پیتے تھے ۔ علامہ مغفور نے یہ سب پیام رد کر دئے میں کالج میں پڑھتا تھا اور بہت سے لڑکوں سے میل جول تھا اور بڑا بھائی ہونے کے لحاظ سے اپنا فرض سمجھتا تھا کہ بہن کے لئے موزوں بر تلاش کروں ایک دوست کو

...بہت پسند کرتا تھا ان سے شادی بیاہ کا ذکر نکلا تو
...نے لگے انسان کی حیثیت بننے کے دو ہی مواقع ہوتے ہیں
...دی اور ملازمت - میں اس لڑکی سے شادی کروں گا
...ہیں مکان لائے - ایک اور لڑکا مجھے اچھا معلوم
... وہ کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور شہری اور دیہاتی
...ما سرت میں بڑا فرق ہے -

علامہ مغفور کے رشتہ کے ایک بھانجے معقول
...اہ پر سرکاری ملازم تھے مگر ماحول تعلیم یافتہ نہ تھا -
...ن کی والدہ ہمارے ہاں اکثر آتی تھیں - پیام کے سلسلے
... کئی کئی گھنٹے کے لئے آتیں اور رات کو دس دس گیارہ
...بارہ بج جاتے - ایک دن والدہ مرحومہ نے ان سے کہا
...بوا تم جانو تمھارے بھائی جانیں - مجھے تو کوئی انکار
...ے ہیں - ایک روز انھوں نے والدہ مرحومہ سے کہا -
اچھ بوا ایں دونوں مکان مہر میں لکھوا دیتی ہوں - والدہ
مرحومہ نے علامہ مغفور سے ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا -
"اس وقت کے بعد پھر کبھی ذکر نہ کرنا میں دیکھ رہا تھا کہ
تم کتنے پانی میں ہو"

۱۹۲۶ء میں ایک بڑے باپ کے بیٹے کا پیام آیا
لڑکا کنوارا تھا باپ کی مالی حالت اچھی تھی اور خود بھی
برسر روزگار تھا مگر خیالات میں قدامت پرستی غالب
تھی اور خاندان میں تعلیم کا کچھ زیادہ چرچا نہ تھا - علامہ
مغفور کو ایسے لڑکے کی تلاش تھی جو اُن حقوق سے بے خبر
نہ ہو جو اسلام نے عورت کو دئے ہیں" - اسی زمانہ میں
میرے رشتہ کے بھانجے خورشید علی خاں کے ذریعہ
سردار محمد خاں کا پیام آیا - یہ قائم گنج ضلع فتح گڑھ کے
رہنے والے ہیں - ان کے سر پر باپ کا سایہ نہ تھا علی گڑھ
میں بی اے میں تعلیم پا رہے تھے - ان کے والد شیر محمد
خاں صاحب مرحوم کی شرافت طبعی کا حال دوسرے ذرائع
سے معلوم ہوا تھا اور یہ بھی کہ سردار میاں کی والدہ بہت
ہی نیک نفس خاتون ہیں - سردار میاں کی اُس وقت
کچھ بھی حیثیت نہ تھی مگر اُن کی طبیعت کی شرافت سچائی
بُردباری شرمیلا پن - خاکساری اور کم سخنی نے دو دفعہ
کی ملاقات میں علامہ مغفور کے دل میں گھر لیا - سردار
میاں نے دوسری ملاقات کے بعد علی گڑھ جا کر جو خط حضرت
والد مرحوم کو لکھا تھا وہ یہ تھا: -

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۲۷ء

مکرم و معظم جناب قبلہ مولانا صاحب دام برکاتہ'
بعد السلام علیک کے التماس خدمت عالی میں
یہ ہے کہ ہر ایک انسان اپنے فرائض کا ذمہ دار ہوتا ہے
اور والدین کو ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے فرائض
سے سبکدوش ہو جائیں اس لئے میں بھی اپنا اظہار خیال کرتا
ہوں - امید ہے کہ جناب کے ناگوار خاطر نہ ہوگا - عرض یہ
ہے کہ میں آپ کے ہاں حلقہ بگوش غلامی میں قبول کئے
جانے کا متمنی ہوں اور یہی آرزو ہے - میں یہاں علی گڑھ
میں بی اے (فورتھ ایر) کلاس میں تعلیم پاتا ہوں اور
جملہ حالات ...... کے ذریعہ سے آپ کو بخوبی معلوم
ہو جائیں گے - اس لئے میں خود تحریر کرنا مناسب نہیں
سمجھتا - مجھکو خط لکھنے کی اس لئے ضرورت پڑی کہ علاوہ اور
پیغامات کے آپ اس ناچیز کا بھی خیال رکھیں - اس
مختصر تحریر کو میری تمنا کا لب لباب تصور فرمائیں - اب
زیادہ کیا عرض کیا جائے فقط زیادہ والسلام حد ادب -

تابع دار و فرماں بردار
سردار محمد خاں متعلم بی اے کلاس

اس خط کے ایک ایک لفظ سے سادگی بھولپن اور شرافت ٹپک رہی تھی اور علامہ مغفور اس سے بھی متاثر ہوئے۔ تیسری دفعہ جب سردار میاں دلی آئے تو اُنھیں اور واجدہ بیگم دونوں کو موقع دیا گیا کہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور وہ اس طرح کہ ہم سب قطب صاحب سیر کو گئے تو سردار میاں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ دوسرے دن سردار میاں سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میری گفتگو ہوئی اور میں نے اُن سے کہا کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ واجدہ کی نہ تعلیم اعلیٰ ہے نہ وہ خوب صورت ہے۔ آپ نے کیا دیکھ کر پیام دیا ہے۔ اس سوال کا جواب اُن کے یہ الفاظ تھے "سب سے بڑی دولت تو شرافت ہے"۔

یہ گفتگو والدہ مغفور کے سامنے دوہرائی گئی تو انھوں نے کہلوایا کہ شادی کا پیام باقاعدہ تمھاری والدہ معظمہ کی طرف سے آنا چاہئے۔ سردار میاں کی والدہ مرحومہ بہت ضعیف تھیں اور سفر کے قابل نہ تھیں۔ ایک ہفتہ بعد سردار میاں علی گڈھ سے دلی آئے تو والدہ مرحومہ کے نام اپنی ماں کا خط لائے۔ جو بیٹے کی شادی کا پیام تھا۔ یہ خط دیکھنے کے بعد علامہ مغفور نے والدہ معظمہ کی طرف سے منظوری کا خط لکھوایا اور پھر آپا کی شادی کے وقت بھائی عبد الغفور مرحوم سے جو اقرار نامہ لکھوایا گیا تھا وہ سردار میاں کے آگے رکھ دیا گیا اور انھوں نے بھی لفظ بلفظ نقل کر کے دستخط کر دئے۔

علامہ مغفور نے اپنے کئی مضمونوں میں مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ لڑکی کی شادی کے وقت داماد سے یہ اقرار نامہ لکھوالیں کہ لڑکی کو خلع کا حق ہوگا۔ مہر کی زبانی معافی قابل قبول نہ ہوگی نااتفاقی کی صورت میں نصف آمدنی پہلی بیوی کو دینی پڑے گی وغیرہ۔

علامہ مغفور عملی آدمی تھے جو جو کچھ انھوں نے اپنی قوم سے کہا پہلے خود اس پر عمل کیا۔ بھائی عبد الغفور مرحوم اور سردار میاں دونوں غیر کفو اور پردیسی تھے۔ علامہ مغفور کے دادا مولوی عبد القادر صاحب نے بھی ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے اقرار نامہ لکھوایا تھا۔ سردار میاں نے جو اقرار نامہ لکھا تھا وہ پانچ روپیہ کے اسٹامپ پر تھا اور عبارت یہ تھی۔

"میں اپنی اہلیہ سے اُن کے اُن تمام حقوق کی ادائیگی میں جو شرع اسلام نے عورت کو عطا فرمائے ہیں کبھی کوتاہی نہ کروں گا۔ میں اہلیہ ام کو کسی ایسے مقام یا مکان میں رکھنے پر مجبور نہ کروں گا جس میں اُن کو یا اُن کے کسی عزیز کو اعتراض ہو۔ میں واجدہ بیگم صاحبہ کی موجودگی میں کبھی دوسرا نکاح یا دوسرے نکاح کا قصد نہ کروں گا۔ میں یہ بھی معاہدہ کرتا ہوں کہ خدا نخواستہ بصورت نااتفاقی اہلیہ ام واجدہ بیگم میری آمدنی کا نصف حصہ جس جگہ چاہیں گی حاصل کر سکتی ہیں۔ بحیثیت ایک سچے مسلمان اور انسان کے میرا فرض ہوگا کہ میں واجدہ بیگم صاحبہ کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کروں اور اُن کو یا اُن کے ورثا کو کسی حال میں شکایت کا موقع نہ ملے اور میں ایک سچا انسان ثابت ہوں۔

میرا نکاح چونکہ غیر کفو میں ہو رہا ہے اس لئے معاہدہ میں اس قدر اضافہ کرتا ہوں کہ جب تک مہر کا حصہ معجل ادا نہ کروں میرا دوسرا نکاح ناجائز ہوگا اور میں ہرگز نکاح ثانی بلا ادائیگی مہر نہیں کر سکتا۔ معافی مہر اُس وقت جائز ہوگی جب تحریری ہو اور روبرو منکوحہ کے دستخط ہوں اور دو شاہد ہوں۔

سردار محمد خاں بقلم خود

لے پہا کہ نکاح اسی وقت ہوگا اور وداع کچھ مدت
بعد۔ نکاح کا رقعہ ۴½ × ۳½ سائز کے سفید کارڈ پر
... اس کا حاشیہ چاروں طرف سے گلابی رنگ کا تھا۔
... یہ تھا۔

الحمد للہ کہ میری بچی واجدہ بیگم خیری کا نکاح
... محرم ۱۳۴۵ھ بروز جمعہ صبح ۸ بجے قرار پایا ہے۔
... ملتمس خدمت ہوں کہ تاریخ و وقت مقررہ
پر تشریف لاکر شریک عقد ہوں اور ممنون فرمائیں۔

نیازمند

راشد الخیری

۴۲۳۔ دریا گنج کوچہ چیلاں۔ دہلی

علامہ مغفور کی بڑی بیٹی کی شادی بھی محرم کے
مہینہ میں ہوئی تھی اور چھوٹی بیٹی کا نکاح بھی محرم ہی
میں ہوا۔

جس روز نکاح کے رقعے چھپ کر آئے اُس سے
ایک دن قبل مغرب سے کچھ پہلے والدۂ مرحومہ کے ایک
بھائی ایک اور بھائی کو ساتھ لے کر تشریف لائے۔ بعض
وجوہ سے وہ نہیں چاہتے تھے کہ واجدہ بیگم کی شادی سردار
میاں سے ہو۔ انھوں نے پہلے بھی مخالفت کی تھی اور اس
وقت اُن کے ایک اور بھائی اُن کی تائید کو موجود تھے والدۂ
معظمہ اپنے بھائیوں کی بہت عزت کرتی تھیں لحاظ و
ادب کا یہ عالم تھا کہ اُن کے سامنے منہ کھول کر بات تک
نہ کرتیں۔ بہت ہی سیدھی اور بھولی آدمی تھیں۔ انھیں
پرچا لینا کیا مشکل تھا۔ والد مغفور اُس وقت چھت
پر کوئی مضمون لکھ رہے تھے۔ بہن اور ایک بھائی کو
لے کر یہ بزرگ پہنچے اور پھر مخالفت شروع کی اور اُن کے
بھائی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ والد مرحوم نے والدہ
مرحومہ کے بھائیوں کا ہمیشہ احترام کیا۔ خالی خولی احترام
ہی نہیں وہ اُن سب سے محبت بھی کرتے تھے مگر اُس
وقت اُن کے تیور بدل گئے اور انھوں نے فرمایا "آپ
حضرات واجدہ کے رنج میں مجھ سے بڑھ کر نہیں ہو سکتے۔
اس کے دکھ درد پر جس قدر میرا کلیجہ کٹے گا آپ کا نہیں۔
اس کی راحت اور چین سے جو خوشی مجھے ہوگی وہ آپ
حضرات کو نہیں ہو سکتی۔ اس کی پرورش میں میں نے
تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ اس کے مستقبل پر غور کرنے میں
میری راتوں کی نیند اُچاٹ ہوئی ہے۔ آپ حضرات جب
نرم گرم بچھونوں میں میٹھی نیند کے مزے لیا کرتے تھے
اس وقت اس کی بیماری میں دیوانوں کی سی میری کیفیت
ہوئی ہے۔ وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میری جان ہے۔
اس کے مستقبل کو میں بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ سردار کو
اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ وہ یتیم ہے۔ اُس کا کوئی
سر دھرا نہیں ہے۔ اُس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ کیا
آپ نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کس قدر نیک دل اور بے زبان
ہے اور اس کے خیالات کس قدر شریفانہ ہیں۔ نکاح کے
رقعے چھپ چکے ہیں۔ آپ کی طرح اگر آپ کی بہن
یہ رشتہ پسند نہیں کرتیں تو اُنھیں اپنے ساتھ لے جائیے۔
واجدہ کا نکاح یہیں ہوگا اور اس سلسلہ میں مزید گفتگو
بے سود ہوگی۔"

میں نے والد مغفور کو کبھی کسی سے ایسی سخت گفتگو
کرتے نہیں سنا۔ نماز مغرب کا وقت تھا۔ یہ کہہ کر وہ
اُٹھ گئے۔ وضو کیا اور الگ کمرے میں جاکر نماز پڑھی
اس کے بعد سڑک پر جاکر ٹہلتے رہے۔

نکاح میں تین روز باقی تھے۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ
سردار محمد خاں کتنے ہی نیک ہوں کہیں اُنھیں کوئی

بھگا نہ دے۔ تین دن تک رعنا تھے۔ ۵ گھنٹے انھیں سیر کے بہانے باہر لے جایا کرتا تھا۔

۱۰ جولائی ۱۹۳۲ء نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی اور وقت آٹھ بجے صبح۔ پانچ چھ سو آدمیوں کا بلاوا تھا۔ ہمارا گھر اتنا بڑا نہ تھا کہ اتنے آدمی اس میں سما سکتے۔ قریب ہی پیر جی صابر بخش کی درگاہ تھی وہاں نکاح کا انتظام کیا گیا۔

آٹھ بجنے میں ایک منٹ باقی تھا اور صرف اٹھارہ بیس آدمی اس وقت مجلس نکاح میں موجود تھے کہ علامہ مغفور نے مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم سے کہا۔

"بسم اللہ نکاح پڑھائیے"

ٹھیک آٹھ بجے نکاح ہو گیا!

ہمارے خاندان میں گیارہ ہزار مہر کا رواج تھا بڑی دادی اماں۔ دادی اماں۔ اماں۔ پھوپی اماں اور آپا کا مہر گیارہ ہزار تھا۔ واجدہ بیگم کا مہر بھی گیارہ ہزار ہی مقرر ہوا۔

نکاح کے گواہوں میں مفتی کفایت اللہ مرحوم۔ مولانا احمد سعید مرحوم اور ملا محمد واحدی اڈیٹر نظام المشائخ کے دستخط نکاح نامہ پر ہیں۔

دلی میں یہ دستور تھا کہ نکاح کے بعد دولھا والے مٹھائی (جو عام طور پر بالوشاہی کی چار ڈلیاں ڈیڑھ پاؤ وزن کی ہوتی تھیں) تانبے یا بلور کی طشتری میں رکھی اور رومال سے بندھی ہوئی تقسیم کرتے تھے اور دولھن والوں کی طرف سے بن سپاری کی طشتری دی جاتی تھی۔

تانگہ پر تانگہ اتر رہا اور آدمی پہ آدمی چلا آرہا تھا اور درگاہ کے باہر آنے والوں میں یہ کہہ کر مٹھائی تقسیم کی جارہی تھی کہ "نکاح ہو گیا"

آنے والے وقت کی پابندی نہ کرنے پر نادم ہو ہو کر حصے لے رہے تھے!

علامہ راشد الخیری کی بیٹی کی شادی اور مجلس نکاح میں اٹھارہ بیس آدمی واقعی تعجب کی بات تھی مگر علامہ مخترم کو تو اپنے عمل سے مہمانوں کو وقت کی پابندی کا سبق دینا تھا۔ انھوں نے لوگوں کا اعتراض سننا پسند کیا مگر یہ پسند نہ کیا کہ آٹھ کے سوا آٹھ بجیں!

طے یہ ہوا تھا کہ جب سردار میاں بی اے کے امتحان سے فارغ ہو جائیں گے اس وقت وداع ہوگی مگر ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی ایک دن خاموشی سے وداع کر دی گئی۔ کوئی خاص مہمانداری نہیں ہوئی۔

بڑی بیٹی کو جہیز میں گراموفون اور اس کے ساتھ رکارڈ دیے گئے تھے واجدہ بیگم کو سلائی کی مشین۔ تانبے کے برتن البتہ کچھ زیادہ تھے۔ آپا کو ۵۰ جوڑے دیے گئے تھے جن میں وہ کپڑے بھی تھے جو دادی اماں اور نانی اماں نے بنائے تھے واجدہ بیگم کو ۲۵ جوڑے دیے گئے جن میں ۵ اڈھیلے پائنچوں کے پائجامے تھے۔ شرفائے دلی میں اس زمانہ تک ساڑھیاں معیوب سمجھی جاتی تھیں۔ ہاں شادی شدہ خواتین اپنے بزرگوں سے چھپ چھپاتے رات کو کبھی کبھار باندھ لیتی تھیں۔ زیور دستہ ہرا ہی تھا۔ آپا راشدہ کو جو والدہ مرحومہ کا چھپر کھٹ دیا گیا تھا وہی اُن سے خرید کر واجدہ بیگم کے جہیز میں دیا گیا۔

۱۹۳۵ء میں سردار میاں نے بی اے کر لیا۔ اسی سال کراچی میں انھیں ڈھائی سو روپیہ کی نوکری مل رہی تھی۔ علامہ مغفور نے فرمایا پردیس کی اور اتنے دور کی ڈھائی سو کی نوکری سے دلی میں سو روپیہ کی نوکری بہتر ہوگی۔ چند ماہ بعد ہی گورنمنٹ آف انڈیا میں وہ

ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے سپرنٹنڈنٹ ہوئے اور
امت پاکستان سے پنشن پا رہے ہیں۔

سردار محمد خاں امید سے بڑھ کر اور توقع سے بہت
نیک اور شریف انسان ثابت ہوئے۔ چالاکی
یری مطلب براری۔ غلط بیانی اور مصلحت اندیشی
وں سے وہ ہمیشہ ہزاروں کوس دور رہے۔ نخوت
ت۔ دبوس تصنع بناوٹ ان کے پاس آکر پھٹکی
ں۔ سیدھے سادے۔ بھولے بھالے سچے مسلمان
نا جیسے نیک نفس بے ضرر انسان اس زمانہ میں
کم ہوتے ہیں۔

علامہ مغفور کے دونوں داماد ہیرے نکلے۔ شاید
ئے کہ انھوں نے اپنی بیوہ ساس کی خوشنودی
بشہ خیال رکھا۔ یا شاید اس لئے کہ معصوم بچیوں
ظلوم بیویوں کی حمایت میں ساری عمر جہاد
تے رہے۔

...دہ بیگم سسرال میں

واجدہ بیگم لکھتی ہیں:۔
"میں پہلی دفعہ

سسرال گئی تو جاڑا کڑاکے کا پڑ رہا تھا۔ میں جب
... کے لئے نیچے آئی تو ابا جان نے پوچھا "تم کیا کیا
... ئے ہو" میں نے بتایا کہ گرم قمیص۔ ایک صدری
ایک سویٹر" اماں جان سے کہا "وہ صدری دے دو"
... ت فرمایا "یہ پہن لو سب سے اوپر" میں بہت
... ی کہ موٹی اور روئی کی آستینوں والی صدری ہے
سوچنے لگی کہ اس پر برقعہ کس طرح اوڑھوں گی۔
... یا "سوچ کیا رہی ہو۔ پہن لو جلدی" اور کہا "دیکھو
... کی جیب میں کچھ نوٹ ہیں ضرورت ہو تو خرچ کر لینا"
... رس کے اسٹیشن پر جب میں دو بجے رات کو

آخری تو سردی اس غضب کی تھی کہ دانت بج
رہے تھے۔ اس وقت مجھے اس صدری کی قدر ہوئی اور
اس کی وجہ سے بڑا آرام ملا۔

جب میں گھر سے روانہ ہونے لگی تو ابا جان نے دو
نصیحتیں کی تھیں۔ ایک تو یہ کہ دیکھو کبھی تمہارے گھر میں
کنواں ہے تم جاتے ہی اپنی ساس سے کہنا کہ اس پر پٹڑا
ڈھکوا دیں کیونکہ سعد میاں اور عاصم میاں چھوٹے چھوٹے
بچے تمہارے ساتھ ہیں۔ ایسا نہ ہو کنوئیں کی طرف یہ بچے
چلے جائیں۔ دوسری نصیحت یہ کی تھی دیکھو جس قدر ممکن
ہو اپنی ساس کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا اُن کی خوشی
میری خوشی ہے۔ میری ساس اللہ اُن کو جنت نصیب کرے
نہایت نیک اور شفیق ساس تھیں۔ وہ بہت صبح اٹھتیں
نماز سے فارغ ہو کر ناشتہ کا بندوبست کرتی تھیں۔
اتفاق کی بات کہ ایک روز ملازمہ نہیں آئی وہ باورچی
خانہ میں جانے لگیں۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔
پتلی جھاڑو کی لکڑی تھی اس کی لپٹ میری کلائی میں لگ
گئی اور کلائی پک گئی میری ساس اور نند نے بہت منع
کیا اور کہا دیکھو اس لئے منع کرتے تھے کہ باورچی خانہ
میں مت آؤ لیکن جب میں دلی آئی اور ابا جان نے
کلائی پر پٹی بندھی ہوئی دیکھی تو پوچھا کہ کیا ہوا۔ میں نے
واقعہ بیان کیا تو میرے اس فعل سے بہت خوش ہوئے
اور کہا "خوش نصیب ہے وہ بہو جس کی ساس اُس سے
خوش ہو"

جب عاصم کے ابا ملازم ہو گئے اور پہلی تنخواہ
میرے ہاتھ میں آئی تو مجھے ابا جان نے ہدایت فرمائی کہ
دیکھو اپنی ساس نند کا حق ہمیشہ یاد رکھنا چنانچہ دوسری
تاریخ کو میں اپنی ساس کو منی آرڈر کروا دیا کرتی تھی۔

اگر بیچ میں اتوار پڑ جاتی تو خفا ہوتے کہ منی آرڈر کیوں نہیں کیا۔ ایک دفعہ ہفتہ کو تنخواہ آئی تو اتوار اور پیر دو دن ڈاکخانہ بند تھا منگل کو منی آرڈر کیا تو چوتھی تاریخ تھی بہت خفا ہوئے اور فرمایا اگر تمھارے پاس روپیہ نہ تھا تو مجھ سے لیتیں رازق میاں سے لیتیں اپنا زیور بیچتیں مگر منی آرڈر ہفتہ کو کر دیتیں۔ یہ کیا غضب کیا۔ دو دن تمھاری ساس کے کان ڈاکئے کی آواز پر لگے ہوں گے۔ تمھارے پندرہ بیس روپے کی وہ بھوکی نہیں مگر تمھاری سعادتمندی میں فرق کیوں آیا۔ یہ غفلت تم نے کیوں برتی؟"

جمال ہمنشیں کا دیباچہ

علامہ مغفور کی حیات میں ان کی ۵۷-۵۸ کتابیں شائع ہوئی تھیں سوائے ۳-۴ کتابوں کے انھوں نے کسی تصنیف کا دیباچہ نہیں لکھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنی تصنیف ہو یا کسی اور مصنف کی دیباچہ، مقدمہ، تعارف یا پیش لفظ اشد ضرورت ہو جب ہی لکھنا چاہئے ورنہ یہ ایک غلط رسم پڑ گئی ہے۔ کتاب میں جان ہوگی تو بغیر کسی دیباچہ یا پیش لفظ کے نکلے گی ورنہ ایک نہیں دس مقدمے دیباچے لکھوا لئے جائیں ایک دو اڈیشن کے بعد کوئی نہ پوچھے گا۔ میرا جہاں تک خیال ہے انھوں نے کسی مصنف کی کسی کتاب پر مقدمہ یا دیباچہ نہیں لکھا مگر ۱۹۲۶ء میں جب میں نے مرحومہ خاتون اکرم کے چند ادبی مضامین کا مجموعہ مرتب کر لیا تو حضرت علامہ مغفور نے اپنی مرحومہ بہو کی کتاب کا نام ہی "جمال ہمنشیں" تجویز نہیں کیا بلکہ اس کا دیباچہ بھی تحریر فرمایا۔ جس کا ایک حصہ یہ ہے۔

مرحومہ کے نام سے نہ صرف پڑھی لکھی عورتیں آشنا ہیں بلکہ مرحومہ کی لیاقت و قابلیت سخن شناس مردوں سے بھی خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اس جانبازبچی نے مرحوم سید اکبر حسین الہ آبادی کے بعض ایسے اشعار کے خلاف صدا بلند کی جن میں عورت کی حقارت کا پہلو نکلتا تھا اور میں نے مرحومہ سے اختلاف کیا تو سید مرحوم نے مجھ کو ایسا خط لکھا جس میں اُن کو مرحومہ معترضہ کی رائے سے قریب قریب اتفاق کرنا پڑا۔ اس سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ خاتون اکرم مرحومہ کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی کس حد تک تھی۔ اُس جنتی بچی کو اتنا بھی گوارا نہ تھا کہ اس کی جنس کے ساتھ ذرہ بھر بھی اہانت آمیز سلوک کیا جائے ...

..... یہ مجموعۂ مضامین ثابت کر رہا ہے کہ مرحومہ کی نگاہ دور بین اس عمر میں بھی کہ آغاز شباب تھا زندگی کے تمام مراحل طے کر رہی تھی مرحومہ کا وہ جوہر جس کی نظیر مشکل سے ملے گی یہ تھا کہ باوجود مغربی اور مشرقی تمدن و معاشرت سے پوری طرح باخبر ہونے کے ایک سچی مسلمان لڑکی تھی۔ نماز کی سختی سے پابند خیرات و زکوٰۃ کی عادی۔ خُلق و کرم کا مجسمہ۔

جمال ہمنشیں کا تعلق جہاں تک تبصرہ یا دیباچہ سے ہے قریب قریب ختم ہو گیا مگر اس لئے کہ مرحومہ کی حیثیت میرے سامنے بہو کی بھی تھی اور اشد ضرورت ہے کہ مسلمان لڑکیاں اُس کی زندگی سے سبق لیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند سطریں اس کی خانگی زندگی پر بھی لکھوں اور جس طرح نابدہ مرحومہ کی موت پر وہ خود لکھ رہی ہیں کہ

"کیا آئیں اور کیا چلیں"

میں بھی اس واسطے کہ روح کو بعد الموت اہل دنیا سے تعلق باقی رہتا ہے اُسی طرح دریافت کروں۔

کیوں بچی دو سال کے عرصہ میں پالکی اور جنازہ دونوں رنگ دکھا دیئے۔ سہرے کے پھول بھی منگوائے اور موت کے بھی۔ سوئیں بنی تھیں ماں بچے کو اور دلی آئی تھیں قبرستان بسانے کو!!"

تاخیر کبھی نہیں ہوئی۔ ۲۰ مارچ ۳۶ء کو ادھر والدہ ماجدہ کا جنازہ جا رہا تھا اور ادھر بنات پوسٹ کیا جا رہا تھا!!

اس ۴۷ سال کی مدت میں بنات سے مجھے ہزاروں روپیہ کا نقصان ہو چکا ہے مگر میں اسے صرف اس لئے بند نہیں کرتا کہ عصمت کی طرح یہ بھی حضرت والد مرحوم کی یادگار ہے اور لڑکوں کے لئے تو بہت سے پرچے نکل رہے ہیں مگر بچیوں کے لئے سوائے بنات کے اور کوئی رسالہ نہیں ہے۔

خدمت یا تجارت

۳۲ء میں میں نے عصمت کے چند پرچے عم مکرم پروفیسر محمد عبدالستار خیری کو برلن بھیج کر اُن سے عصمت کے لئے مضامین لکھنے کی درخواست کی جسے انھوں نے منظور فرما لیا اور نہ صرف نہایت دلچسپ اور بہت مفید مضامین سے بلکہ جرمنی کے بنے ہوئے تصاویر کے بلاکوں سے بھی عصمت کی قلمی اعانت فرمائی اور جب کپڑے دھونے کی مشین اور خوب صورتی کا آلہ وغیرہ مضامین شائع ہوئے تو میرے پاس فرمائشوں کا ڈھیر لگ گیا۔ کپڑے دھونے کی ۵۰ مشینوں کا ایک آڈر تو صرف ریاست بھوپال ہی کا تھا۔ مالی منفعت کا میرے لئے یہ بہت اچھا موقع تھا مگر میں اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھا سکا۔

ستمبر ۲۷ء میں حضرت والد مغفور نے فرمایا کہ یہ کاروبار بُرا نہیں ہے اور تمھیں دو ڈھائی ہزار کا کھٹا فائدہ پہلے ہی دفعہ ہو جائے گا لیکن اس تجارت سے روپیہ پیدا کرنے کا چسکا پڑنے کے بعد پھر تم پرچہ پر پوری توجہ نہ کر سکو گے۔ جو کام اب کر رہے ہو اس سے تمھیں عزت کے ساتھ روٹی مل رہی ہے اور ساتھ کے ساتھ اللہ تعالیٰ تم سے قومی خدمت بھی لے رہا ہے در آمد برآمد میں پڑ کر مالی حالت ضرور اچھی ہو جائے گی مگر قومی اور ادبی خدمت کا موقع نکل جائے گا۔ آبا کے روپیہ کا بڑا حصہ خلق خدا پر اُٹھتا تھا۔ دادا ابا اور ان کے ابا بھی غریب دے تھے خلق خدا کی خدمت انھوں نے اچھی کی اور ایسی کی کہ آج تک ان کے نام روشن ہیں۔ اس وقت تجارت سے تم ضرور روپیہ پیدا کر سکتے ہو مگر کس کام کی وہ امیری جو نفس پروری میں مبتلا کر دے اور نخوت مزاج میں آ جائے۔ انفرادی عزت پر احمق جان دیتے ہیں۔ اصلی عزت تو خاندانی عزت ہے۔ اِس وقت بھی تمہارے خاندان میں کئی لکھ پتی ہیں مگر اُن کا روپیہ صرف اُن کی ذات کے لئے ہے۔ ہاں تمھارے بزرگوں کو خدا نے علم کی جو دولت دی اُس سے ایک دنیا فیضیاب ہوئی۔ بہرحال یہ میری اپنی رائے ہے۔ تم اپنے حالات دیکھ کر جو مناسب سمجھو وہ کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا"

بالآخر مجھے جرمنی سے کپڑے دھونے کی مشین اور خوب صورتی کا آلہ منگانے کا خیال ترک کرنا پڑا۔

داماد کی حمایت

آپا کی شادی ہوئی تو بھائی عبدالغفور مرحوم کے پاس اُن کے بڑے بھائی کے بیٹے عبدالشکور رہتے تھے اُن کی عمر ۸-۹ سال تھی اور بھائی صاحب کو اپنے اس بھتیجے سے بہت محبت تھی۔ نہ صرف اُن کے ساتھ کھاتے بلکہ اُن کے بعض کام بھی خود ہی کرتے تھے باہر سے گھر آنے میں دیر ہو جاتی تو بے چین ہو جاتے تھے آپا کی شادی کے سال سوا سال بعد وہ الہ آباد چلے گئے اور پھر کوئی دو ڈھائی سال بعد واپس آئے تو بھائی صاحب کی محبت اور فریفتگی کا وہی حال تھا۔ ایک دن آپا علامہ مغفور کی موجودگی میں والدہ مرحومہ سے شکایت کر رہی تھیں کہ شکورا تنے بڑے ہو گئے

ع صاحب انھیں اب بھی نظا بچہ سمجھ کر ان کے کام
ہیں اور بغیر ان کے کھانا نہیں کھاتے۔ علامہ مغفور
ں حمایت میں بچی کو ڈانٹ دیا اور فرمایا "آس سے
فائدہ ہو جانا چاہیے تھا کہ تمھارے میاں کو خدا نے
محبت بھرا دل دیا ہے۔ جس دل میں بھتیجے کے لئے
ست ہے اس میں بیوی کے لئے بھی محبت ہو سکتی
ٹھیک بیوی شریف ہو اور ایسی تنگ نظر تنگدل اور
نہ ہو۔ جس سے وہ محبت کرتے ہیں تمھیں بھی اس سے
ہونی چاہیے یہ تو ہے شرافت۔ اور رذالت یہ ہے کہ
محبت کا دائرہ محدود کر دو۔ تمھاری آئندہ شکوے کے خلاف
زبان پر ایک لفظ بھی نہ آنے"۔

. بھائی عبد الغفور مرحوم کو جو تنخواہ ملتی پائی پائی لاکر
دیتے تھے البتہ بھتیجے کی آدھی رقم اپنے پاس رکھتے
کے والد مرحوم شیخ امام الدین صاحب ضلع الہ آباد کے
زمینداروں میں سے تھے بھائی صاحب مرحوم نے
ں زمین جاگیر وغیرہ کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھا
ں۔ وہ کئی بچیوں کے باپ تھے اس لئے اُن کا
تھا کہ اُن کے پاس روپیہ محفوظ ہونا چاہیے اور
تھے روپیہ پیدا ہوتا ہے بزنس سے مگر وہ خود کوئی
بار نہ کر سکتے تھے ایک طرف تو ان کا یہ خیال تھا
ی طرف اُن کا دل انسانی ہمدردی سے کوٹ کوٹ کر
تھا۔ وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں کی حتی الامکان
د بھی کیا کرتے تھے۔ اُن کی اس طبیعت سے اُن کے
ملنے والوں نے غلط فائدہ اُٹھایا۔ وہ اس خیال سے
ملنے والے کو روپیہ دیتے کہ کاروبار میں روپیہ بھی
گا اور اس شخص کو بے روزگاری سے اور مالی
پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔ کبھی لکڑی کی ٹال

کھلتی۔ کبھی کوئلہ کا کاروبار ہوتا۔ کبھی پیاز کبھی سرسوں کے
تیل کا۔ آگرہ کے ایک صاحب ہاتھی خریدتے اور فروخت
کرتے تھے۔ انھیں کئی دفعہ روپیہ دیا۔ ایک صاحب کو
دو دفعہ ہوٹل کرا دیا۔ ایک حکیم صاحب کو دواخانہ کھلوایا۔
ان کی ملی مدد سے ایک صاحب نے ٹرنک بنانے کا ایک
خاں صاحب نے فرنیچر بنانے کا کارخانہ کھولا مگر فائدہ کسی
ایک بزنس میں بھی نہ ہوا۔ ہر دفعہ روپیہ ڈوب گیا بلکہ
جن جن حضرت کو روپیہ انھوں نے دیا ان کے دلدر ضرور
پار ہو گئے۔ آپا برسوں سے یہ تماشے دیکھ رہی تھیں ایک
دن باپ کی موجودگی میں ماں سے شوہر کی شکایت کر رہی
تھیں کہ اس طرح روپیہ برباد کرتے مدت گذر گئی ان کی
آنکھیں ہی نہیں کھلیں۔ میں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے
دم سادھے ہونٹ سیئے کب تک یہ کھیل دیکھتی رہوں گی
ابا یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا داماد کو سمجھائیں۔

علامہ مغفور نے فرمایا "میری ایک بات کا جواب
دو گی"۔ انھوں نے عرض کیا "جی ہاں کیوں نہ دوں گی"۔

فرمایا "تم جو یہ کہہ رہی ہو کہ تمھارے میاں اپنے
ملنے والوں کے راگ میں آکر روپیہ ضائع کر رہے ہیں تو
تم نے یہ بھی کبھی سوچا کہ وہ بُری صحبت میں پڑ کر بھی روپیہ
برباد کر سکتے تھے۔ اچھا یہ بتاؤ جو روپیہ وہ دوسروں کو
دیتے ہیں وہ تمھارے ابا کی کمائی کا ہے یا تمھارے بھائی کی؟

آپا خاموش تھیں۔ فرمایا "جب تمھارے پاس
اس سوال کا جواب ہوگا اس وقت پھر گفتگو کر سکتی ہو"۔
یہ کہہ اچکن ٹوپی پہنا، بید (چھڑی) لے کر
باہر چلے گئے۔

آپا کا مکان

اس واقعہ کے کئی ماہ بعد موقع دیکھ کر
ایک دن بھائی صاحب سے فرمایا۔

"میاں عبدالغفور ذرا یہاں آنا"

خسر نے داماد کو پہلے کبھی اس طرح نہ بلایا تھا۔ وہ گھبرا گئے مگر حسب عادت مسکراتے ہوئے پاس جاکر بیٹھ گئے۔

فرمایا "تمھیں یاد ہے شادی کے وقت تم نے ایک وعدہ کیا تھا"

بھائی صاحب سوچ ہی رہے تھے کہ فرمایا "تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں دلی میں مکان خرید لوں گا"

بھائی صاحب مسکرائے اور کہا "جی ہاں وعدہ کیا تھا۔ یاد آگیا۔ مگر آپ نے بھی تو اتنی مدت گذر گئی۔ یاد نہ دلایا۔

ہنسی آتے آتے روک کر فرمایا۔

"وعدہ تم کرو یاد میں دلاؤں"

بھائی صاحب نے کہا "بہت اچھا تو میں اب جلد خرید لوں گا"

فرمایا "تو میں دیکھوں کوئی مکان" انھوں نے عرض کیا "جی ہاں دیکھئے اسی محلہ میں مل جائے تو اچھا ہے"

اور پھر جب بھائی صاحب گنگا پور گئے تو آپا سے انھوں نے کہا کل مولوی صاحب نے یہ گفتگو کی تھی اگر میں نے جلد سے جلد مکان نہ خریدا تو مولوی صاحب سمجھیں گے کہ میں شریف نہیں ہوں۔ اپنی زبان سے پھر گیا۔ تم اب دلی جاؤ تو سو کام چھوڑ کر مکان تلاش کرو"

اسی محلہ میں ننھے خاں کی گلی میں اُسی سال آپا نے مکان خرید لیا۔ وہ بیری والا گھر کہلاتا تھا۔ آپا گنگا پور رہتی تھیں اس لئے مکان مقفل رہتا تھا کبھی کبھی اُسے کھلوا کر وہاں جایا کرتے تھے ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں کئی مضامین اس مکان میں لکھے تھے۔ چونکہ بہت بوسیدہ تھا نئے سرے سے اس کی تعمیر شاید ۱۹۴۲ء میں علامہ مغفور کے بعد ہوئی تھی۔ اسی گلی کا سب سے بڑا دو منزلہ مکان جس میں چھ سال سے دفتر عصمت تھا ۱۹۴۴ء میں میں نے بھی خرید لیا تھا۔

داتا کی شادی

اگست یا ستمبر ۱۹۲۸ء میں آمنہ نازلی اپنے ماموں صاحب کے ہاں گنگا پور سٹی آئی ہوئی تھیں۔ والدہ مرحومہ اور آپا نے انھیں پہلی دفعہ وہیں دیکھا تھا۔ غالباً انھیں اور ان کی والدہ کو اپنے ہاں بلانے اور مجھے دکھانے کی غرض سے یہ تجویز کی گئی تھی جس کے واقعات مجھ سے زیادہ آمنہ نازلی کو یاد ہیں اس لئے اُنھیں کے الفاظ میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

"گنگا پور سٹی میں ابا جان تشریف لاتے تو ریلوے کالونی میں جان پڑ جاتی دن کا بیشتر حصہ لکھنے لکھانے میں وہ صرف کرتے۔ مکان کے باہر کچی سڑک کے کنارے گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بان کی چارپائی پر دو تکئے رکھ کر وہ کبھی لیٹ جاتے اور کبھی آلتی پالتی مار کر تیزی سے لکھتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دماغ حاضر ہے اور قلم رواں سوچنا یاد کرنا کیسا کسی مداخلت سے بھی اُن کے لکھنے کا تسلسل نہ ٹوٹتا۔ اور جب وہ ہنسی مذاق کرنے لگتے تو کیا بچے کیا بوڑھے سب ہنستے اور خوش ہوتے۔

جمیل مرزا صاحب جو داتا کے نام سے مشہور تھے۔ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ داتا گنگا پور میں اپنے بھائی کے پاس رہتے تھے۔ بچپن میں پاؤں پر پتھر گرنے سے ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جو بعد میں ٹیڑھی جڑی اس لئے ذرا لنگڑا کر چلتے تھے۔ گورے میدہ شہاب ستواں ناک بڑی بڑی آنکھیں۔ کالی ڈاڑھی۔ پچاس اکیاون سال کی عمر میں بھی ایسے زندہ دل کو لوگ جوق در جوق داتا کے

...حاضر تھے۔
...دا تا کا پیشہ کچھ نہ تھا البتہ کبھی کبھی لنگا پورے کی
...شرو تیک کی شکل کے ہوتے تھے بھوریں باندھکر
...اور راستے میں دا تا کا کمی پکڑا جاتا لوگ
...اور دا تا خود بھی ہنس کر واقعہ بیان کرتے یہ
...وہ بیٹے کے خاطر کرتے۔ بیٹا دا تا کا نہیں تھا۔
...ن کا بیٹا تھا جس کو انھوں نے بیٹا بنا لیا تھا دا تا
...کی دیکھ بھال کرنواسے ہی کرتے۔ البتہ عزیز رشتہ دار
بیٹے والوں کو پاس پڑوس والوں کو دا تا کی شادی کا
...ن تھا کہ کیا بیٹا بیٹی کا ہوگا۔ اور دا تا بھی یار
... کی خاطر ہر دم شادی کے لئے تیار۔ رشتے لکھے
...پیام جاتے مگر روزناول رہتا دا تا کی شادی ایک
...لبن بن کر رہ گیا تھا۔ ابا جان نے بھائی عبد الغفور
...ب کے ہاں کچھ لوگوں کی دعوت کی تو دا تا بھی تشریف
...دا تا نماز روزے کے سخت پابند تھے وظیفے پڑھتے
...بھی کھینچتے تھے۔ کبھی کبھی وہ تعویذ کے لئے کالا مرغا
...ہونکہ کالے مرغ کے خون سے تعویذ لکھا جاتا۔ لوگ
...ہوئے کالے مرغ لاتے اور یہ مرغ علی الاعلان
...بھی کام آتے۔ ابا جان نے کہا کہ دا تا لڑکی موجود
...اس وقت شادی پر آمادہ بھی ہے اگر ہفتہ تک
...ی کرلو تو تم سے ہی نکاح کر دیا جائے ورنہ پھر
...اس کا نصیب۔ خاندان اچھا ہے توشت پوست
...شکل ہر لحاظ سے مناسب اور موزوں کہو کیا کہتے
...تا نے ڈاڑھی پہ لمبا ہاتھ پھیر کر کہا الحمد للہ بندہ
...ہے رہلوے کے سب باپوؤں نے ابا جان کا شکریہ
...کہ آپ کی کوششوں سے ہم لوگ بھی دا تا کا سہرا
...یں گے ورنہ جہاں بھی پیغام گیا کوئی نہ کوئی بہانہ بیچ

نکال دی جاتی ہے۔ چنانچہ ہفتہ کے دن لائنوں کے
اُس پار بابو جلیل مرزا صاحب گارڈ کے مکان سے بارات
روانہ ہوئی۔ دولھا میاں کو جامہ وار کی شیروانی پہنائی گئی۔
سر پہ عمامہ۔ کمر میں چادر کا پٹکا۔ سات لڑیوں کا سہرا۔
جو کھیلوں بتاشوں سے تیار کرائے دولھا کے لئے بھیجا گیا
تھا دولھا میاں بھی ایسے کہ ہر قدم پر لڑی پکڑی اور
بتاشہ منہ میں۔ بارات میں سب ہی پیدل چلنے والے
تھے۔ بوڑھے بچے جوان . . . ہنستے ہنستے سب کا بُرا حال۔
کئی لڑکوں نے بارات روک کر سمجھایا کہ دا تا کیا غضب کرتے
ہو دولہن کے گھر تک تو سہرا رہنے دو مگر دا تا کہنے لگے یار
پیدل چل رہے ہو گاڑی نہ تانگہ۔ چلتے چلتے بھوک لگنے لگی
۔ بہر حال اس سج دھج سے یہ بارات بھائی عبد الغفور صاحب
کے مکان پر پہنچی۔ دریاں چاندنی قالین روشنی بڑی
گہما گہمی تھی۔ اڑوس پڑوس کی عورتوں اور بچوں سے بھی
گھر بھرا تھا۔ باہر دالان میں دولھا کو بٹھایا گیا۔ خود ابا
جان نے بارات کا خیر مقدم کیا اور دولھا میاں گاؤ
تکیہ کے آگے بٹھا دئے گئے مگر وہی حرکت یعنی سہرے
لڑی پکڑی اور بتاشہ منہ میں اصل میں یہ سہرا اس لئے
بھیجا گیا تھا کہ دولھا میاں کی رال ٹپکے گی اور وہ بتاشے
کھالیں گے۔ جب نکاح کا وقت ہوا تو ایک گارڈ
صاحب نے خطبہ نکاح پڑھنا شروع کیا۔ لطف یہ تھا کہ
ایک لفظ صحیح نہیں تھا مگر لہجے نے کچھ ایسا سماں پیدا کیا
کہ سارا خطبہ باوجود مہمل الفاظ کے آواز کے عربی زیر و
بم سے اصل معلوم ہو رہا تھا۔ نکاح ہوا چھوارے نہیں
بلکہ کھوپرے لٹیں۔ اور پھر دا تا کا سہرا پڑھا گیا جو ابا جان
نے لکھا اور رازق صاحب نے پڑھا۔ سہرے کے ہر شعر پر
لوگ پیٹ پکڑ پکڑ کر دوہرے ہو رہے تھے۔ اور دولھا میاں

بار بار استغفراللہ کہکر کہتے تھے ارے یار سنو تو اور وہ ہاتھ کے اشارہ سے منع کر رہے تھے کہ سہرا نہ پڑھا جائے مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا تھوڑی دیر بعد آواز آئی کہ لو میاں دلہن باہر آ رہی ہے دادا تانے ہیں ہیں کر کے تعجب سے کہا یار کہیں دلہن بھی باہر آتی ہے یہ کیا قصہ ہے بہرحال یہ بتایا گیا کہ لڑکی ولی کی ہے اور وہاں اب یہ ہی قاعدہ ہو گیا ہے۔ دلہن کو باہر لاکر آرسی مصحف کرایا جائے

چنانچہ دولہن لمبے لمبے فرشی پاجامے کے پائنچے پکڑے گھونگھٹ نکالے چھما چھم کرتی دو چھوٹی بچیوں کے ہمراہ باہر لائی گئی اور دولہا کے سامنے بٹھا دیا گیا اوپر سے لال ڈوپٹہ سارسی مصحف کے لئے آئینہ دیا گیا۔ قرآن شریف کے بدلے ایک موٹی سی کتاب جزدان میں رکھ کر دی گئی اور دولہا سے کہا گیا کہ قرآن شریف کی ہوا دے کر سورۂ اخلاص پڑھ کر دلہن کے منہ پر دم کر کے آئینہ میں منہ دیکھ لیں۔

دولہا نے جب دم کرنے کے لئے دلہن کا گھونگھٹ اُٹھایا تو دلہن نے اُچک کر دولہا میاں کی ناک پکڑ لی اور پیچھے دھکیل کر سینہ پر سوار! طلاق طلاق طلاق دادا نے گھبرا گھبرا کر کہا .... محفل میں ہنسی اور قہقہوں کی وجہ سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ دلہن کے روپ میں ایک صاحبزادے نے جب جھوم ہٹا کر خشخشی بالوں کی کھوپری کھولی تو دادا نے زور زور سے لاحول اور استغفراللہ کہا۔
یہ سارا ڈرامہ ابا جان کی ہدایات کے تحت بڑا کامیاب رہا۔ لڑکے بالوں نے خوب لطف اُٹھایا اور دادا کبھی ناراض ہوتے تھے کبھی ہنستے تھے"

آمنہ نازلی

علامہ مغفور نے جو سہرا لکھا تھا اس کے اشعار یہ تھے۔ دلی سے کراچی آتے ہوئے ستمبر ۱۹۴۷ء میں جو ٹرین جلائی گئی تھی اس میں ۳ بکس ہمارے بھی تھے۔ اور ان ۳ بکسوں میں سے ایک بکس میں علامہ مغفور کے متعلق کاغذات تھے۔ اس سہرے کے بس دو شعر یاد رہ گئے ہیں پہلے شعر میں اس کھیل کی طرف اشارہ ہے۔ جو "جھائیں مائیں" کہلاتا ہے۔ اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہاتھ پھیلا کر چک پھیریاں کھاتے اور کہتے ہیں۔ "جھائیں مائیں کوے کی بارات"۔

جھائیں مائیں جو برات آئی میرے نوشاہ کی
جھائیں پوئیں میرے نوشاہ کے باندھا سہرا
چیل لٹو ہوئی، کوے ہوئے قرباں جس دم
سا نفہ ڈاڑھی کے چلا دُم کو ہلاتا سہرا

معاصرین سے تعلقات

ادبی زندگی کے آغاز میں علامہ مغفور نے مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم کی بعض تصانیف پر تنقید کی تھی مگر اپنے نام سے نہیں مولوی محمد احسن وکیل مرحوم کے نام سے جیسا کہ اُن کے بیان سے ظاہر ہے۔ ۱۹۲۵ء میں علامہ مغفور دو روز کے لئے لکھنو ٹھیرے تو مولانا شرر مرحوم کی ملاقات کے لئے اُن کے دولتکدہ پہنچے وہ سو رہے تھے ملاقات نہ ہوسکی۔ ۱۹۲۶ء میں میں نے اُس وقت کے ممتاز اہل قلم کی فہرست بنائی تاکہ عصمت کے لئے مضامین حاصل کروں۔ یہ فہرست اُنھیں سُنائی تو انھوں نے مولانا شرر کا نام بڑھانے کی ہدایت فرمائی میں نے عرض کیا وہ تو عاشقانہ ناول لکھتے ہیں فرمایا ہاں مگر عصمت کے لئے وہ بہترین مضمون لکھیں گے۔ چنانچہ میں نے مولانائے مرحوم کو خط لکھا تو جواب میں

انھوں نے ایک نہایت دلچسپ مضمون عنایت فرمایا۔
اور علامہ مغفور کو سلام لکھا اور اُن کی خیریت دریافت کی۔
ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی کتاب "امہات الامہ"
شائع ہوئی تو مولانا شبلی کے بعض معتقدین نے اس کی
مخالفت کی اور علمائے اسلام نے ڈپٹی صاحب پر کفر کا
فتویٰ دے کر کتاب نذر آتش کروا کر ہی دم لیا۔ ۱۹۱۰ء
میں علامہ راشد الخیری کی کتاب [illegible] شائع ہوئی تو
مولانا شبلی کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے
معارف میں اس پر تبصرہ کیا۔ علامہ مغفور کی طبیعت حالانکہ
[illegible] پسند تھی اور اُن کے کسی مضمون یا کتاب پر
کوئی اعتراض ہوتا تو وہ اس کا جواب نہ دیا کرتے تھے۔
لیکن مولانا سلیمان کی تحریر کا جواب انھوں نے رسالہ
خطیب میں دیا۔ اُس زمانہ میں بعض ادیبوں کا کچھ اس
قسم کا خیال تھا کہ ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری
ناول نویس اور افسانہ نگار ہیں تاریخ کے لئے ان کا
قلم موزوں نہیں۔ میرے سامنے اِس وقت نہ مولانا
سلیمان ندوی مرحوم کا تبصرہ اور اعتراض ہے نہ علامہ
مغفور کا جواب مگر یہ یاد ہے کہ علامہ مرحوم کے قلم سے
مولانا مرحوم کی ذات کے خلاف ایک لفظ بھی نہ تھا۔
۱۹۳۳ء میں مولانا سلیمان ندوی دلی تشریف لائے اور
علامہ مغفور سے ملنے آئے تو دو محبت بھرے دلوں کی
ملاقات معلوم ہوتی تھی۔

خطیب ہی میں دو سال بعد ایک مضمون
اُردو کی بربادی اور جذبات کے تغیر کے عنوان سے
علامہ مغفور نے لکھا تھا۔ خیالات اور معلومات کے
لحاظ سے کوئی مضمون کتنا ہی ارفع و اعلیٰ ہوتا۔ زبان
کی غلطیاں۔ ناموس ترکیبیں۔ اوق پیچیدہ عبارت۔
عربی فارسی سنسکرت الفاظ کی بھرمار اور ٹھونس ٹھانس
علامہ مغفور کو یہ باتیں سخت ناپسند تھیں۔ اس
مضمون کی دو سطریں یہ تھیں۔

"جو مفہوم سادہ الفاظ با آسانی ادا کر سکتے ہیں ان کو
ہیر پھیر کر ایک معمولی فقرہ کی جگہ دو سطروں میں بیان
کرنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے"

اس کے بعد ایک مشہور ادیب کی چار سطریں
نقل کر کے اس مفہوم کو آدھی سطر میں ادا کیا تھا۔

علامہ مغفور نے اس مضمون میں کسی ادیب
کا نام نہیں لکھا تھا۔ اس لئے مجھ کو بھی یہ حق نہیں کہ
میں یہ کہہ سکوں کہ رُوئے سخن کس طرف تھا۔ لیکن میرا
ذاتی خیال یہ ہے کہ جن صاحب کی وہ چار سطریں نقل
کی گئی ہیں اُن پر اس زمانہ میں ٹیگور کا رنگ چھایا
ہوا تھا اور وہ بہت لمبے لمبے فقرے اور جملے لکھتے تھے
اگر وہ صاحب وہی بزرگ ہیں جن کا نام میرے ذہن
میں ہے تو علامہ مغفور کے ان سے دوستانہ مراسم
تھے۔ اور دلی میں جب اُن کا قیام تھا اکثر علامہ مغفور
سے اُن کی ملاقات ہوتی تھی۔ علامہ مغفور نے کسی کو
شہرت کو نقصان نہیں پہنچایا کسی سے انھیں بغض
عناد نہ تھا۔ انھوں نے مضمون مذکورہ بالا میں بحث
اصولی کی تھی کسی کا نام لئے بغیر۔

مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ حکیم
سید ناصر نذیر فراق۔ خان بہادر میر ناصر علی۔
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ سید بے خود۔ نواب
سراج الدین خاں سائل یہ سب علامہ مغفور سے عمر
میں بڑے تھے اور علامہ مغفور بڑے تپاک سے ان
حضرات سے ملا کرتے تھے۔

۱۹۱۰ء سے جناب ملا محمد واحدی صاحب علامہ مغفور کی تصانیف شائع کر رہے تھے۔ ۱۹۱۸ء سے وہ علامہ مغفور کے نام کے بعد "یادگار شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم" لکھنے لگے۔ ڈپٹی صاحب مرحوم کے بیٹے مولوی بشیر الدین احمد صاحب اس زمانہ میں پنشن لے کر دلی آچکے تھے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ دو آدمیوں کو لڑا کر سیر دیکھنے میں انھیں بہت لطف آتا ہے۔ چنانچہ دو ایک صاحبوں نے بڑے ابا مرحوم کو جا کر لگایا بڑے ابا مولوی بشیر الدین احمد صاحب والد مرحوم کی طبیعت سے خوب اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ ابی میاں اُس طبیعت کے نہیں ہیں کہ خود جانشین یا یادگار لکھتے ہوں۔ یہ شوشہ واحدی یا اُن کے دوستوں نے چھوڑا ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب کئی کتابوں کے مصنف تھے اور اُن کی اُن تصانیف کی جو اُنھوں نے عورتوں کے لیے لکھی تھیں علامہ مغفور نے عصمت و تمدن میں دل کھول کر داد دی تھی۔ مولوی صاحب مرحوم بھی اپنے ماموں زاد بھائی کی رائے کو وقیع سمجھتے اور ان کی تحریر کی خوبیوں کے معترف تھے۔ والد مغفور بڑے ابا مرحوم سے عمر میں ۶ سال چھوٹے تھے اور ان کی بزرگی کا احترام اور ان کی محبت کی قدر کیا کرتے تھے۔

"لسان العصر" اور "ترجمان حقیقت" سے علامہ مغفور کی خط کتابت مخزن اور تمدن کی اڈیٹری کے زمانہ سے رہی۔ ان دونوں کے بہت سے اشعار انھیں یاد تھے اور اکثر پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں مرحومہ خاتون اکرم نے مولانا اکبر الہ آبادی کے بعض اشعار پر اعتراضات کئے تو حضرت اکبر کا خط علامہ مغفور کے نام آیا تھا جس میں مرحومہ کے بعض اعتراضات کی معقولیت کا اعتراف تھا۔ ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں میں نے ان سے عصمت کے لئے کچھ کلام مرحمت فرمانے کی درخواست کی تو انھوں نے خط میں والد مرحوم کی خیریت پوچھی اور ان کی دو تصانیف طوفان حیات اور جوہر قدامت کو بہت بڑی قومی خدمت سے تعبیر فرمایا تھا۔

۱۹۲۴ء میں سرگودھا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے فارغ ہو کر علامہ مغفور دو روز کے لئے لاہور ٹھیرے اور مولانا سالک مرحوم کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گئے تو ڈاکٹر اقبال مرحوم دُور سے دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا "ارے مولانا آپ کس طرح گھر سے نکل آئے" دیکھتے ہی پہچان جانے سے ظاہر تھا کہ پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ جب مخزن دلی سے شائع ہوتا تھا اس زمانہ میں پہلی ملاقات ہوئی تھی اور ان کے ساتھ اوکھلے قطب صاحب کی سیر کی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں والد مرحوم کی رحلت کو چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ علاج کی غرض سے دلی تشریف لائے اور میں صادق میاں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی آواز بیٹھی ہوئی تھی تاہم دیر تک باتیں کیں اور فرمایا "آپ کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ عصمت جاری رہے اور مولانا کی کتابیں برابر شائع ہوتی رہیں"

علامہ مغفور کے نام مولانا اکبر الہ آبادی اور ڈاکٹر محمد اقبال کے کئی خطوط میرے پاس ۱۹۴۷ء تک محفوظ تھے۔

مولانا محمد علی جوہر مرحوم سے دوستانہ مراسم تھے۔ دفتر عصمت اور دفتر کامریڈ و ہمدرد ایک ہی محلہ میں تھے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں ۵ سال کی

ی کے بعد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی رہا ہوئے
ن میں ان کا شاہانہ زبردست جلوس نکلا تو خواتین
طرف سے جو ایڈریس پڑھا گیا تھا وہ علامہ مغفور نے
تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے ان دونوں بھائیوں کی
دمت کی اُن کے دل میں کس قدر وقعت تھی ۔
کے لگ بھگ مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی
ی جنگ چھڑی ۔ علامہ مغفور کے دونوں سے تعلقات
ان کی امن پسند طبیعت کی وجہ سے کوئی بھی ان کے
سے برا نہ مانا۔ مولانا محمد علی انھیں "دُکھیا" کہتے تھے۔
موت پر علامہ مغفور نے لکھا تھا۔

"وہ مسلمانوں کا عاشق ۔ جری ۔ بے لوث صادق
ایسا مخلص مسلمان تھا کہ اسلام کی تمام خوبیاں اپنے
ھ سے گیا"

مولانا عبدالماجد دریابادی سے [illegible] میں شاید
ملاقات ہوئی تھی ۔ اس کے بعد مولانا جب دلی آتے
مغفور سے ضرور ملتے تھے۔ بلکہ وہ تو ایسے پابند وضع بزرگ
ابا جان کے بعد بھی جب دلی اور پھر کراچی آئے تو
خانہ پر اپنی تشریف آوری سے راقم الحروف کی
بڑھائی ۔ علامہ مغفور کو آخری زمانہ میں جس نئے
اروں کا انداز تحریر پسند تھا ان میں مولانا عبدالماجد
ادی ہیں ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا یہ اردو کے جان
ن ہیں۔

ی ممتاز علی اور خواجہ حسن نظامی

بزرگان ادب میں
مرانہ چشمک ہر دور میں رہی ہے ۔ علامہ مغفور دو دو رسالوں
یٹر تھے رشک و حسد اُن کی طبیعت میں تھا ہی نہیں ۔
پے کی آگ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں ہمیشہ محفوظ رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ کسی مصنف یا اڈیٹر کے خلاف اُن کے قلم
سے ایک لفظ بھی کبھی نہ نکلا ۔ جن بزرگوں کا ذکر اوپر کیا گیا
ہے وہ ان سب سے الگ تھلگ ایک خاص مقصد سامنے
رکھ کر لکھتے رہے ۔ ان کا خاص موضوع تھا معاشرت اور
اسی موضوع پر انھوں نے اپنی ساری زندگی گذاری ۔
اُردو کی پامالی اور جدیدیت کا تغیر جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے
اُس میں تحریر فرماتے ہیں ۔

"معاشرت ہمارے ادب سے روز بروز کم ہو رہی ہے
اور یہ رفتار اس قدر ترقی پر ہے کہ خیال نہیں یقین کامل
ہے آنے والی نسلیں شاید معاشرت کو زندگی کا جزو ضروری
ہی خیال نہ کریں یا معاشرت کے معنی صرف میاں بیوی کے
تعلقات اور عاشق و معشوق کی محبت سمجھیں"

سچ تو یہ ہے کہ معاصرانہ چشمک علامہ مغفور کی کسی سے
نہ تھی تاہم دو بزرگ ان کے حریف یا مدمقابل سمجھے جا سکتے
تھے اڈیٹر کی حیثیت سے مولوی سید ممتاز علی مرحوم اور
مصنف کی حیثیت سے خواجہ حسن نظامی ۔

مولوی سید ممتاز علی صاحب علامہ مغفور سے
عمر میں سات آٹھ سال بڑے تھے ۔ انھوں نے [illegible]
میں لاہور سے اخبار تہذیب نسواں جاری کیا تھا جو نصف
صدی تک قوم کی بیش بہا خدمات انجام دیتے اور پاکستان
بننے کے بعد بند ہو گیا۔ مولوی صاحب مرحوم نے اس
اخبار کے ذریعہ طبقہ نسواں کی جو خدمت کی وہ کبھی نہیں
بھلائی جا سکتی مسلم خواتین ہمیشہ اُن کی ممنون احسان
رہیں گی ۔ اردو ادب کی ترقی کے لئے بھی ان کی کوششیں
ناقابل فراموش ہیں عصمت [illegible] میں جاری ہوا اور
بہت شان اور دھوم دھام سے [illegible] میں اس کی مخالفت
میں چند مضامین تہذیب میں شائع ہوئے تو علامہ مغفور

نے انھیں کوئی اہمیت نہ دی پھر ۱۹۱۸ء اس کے بعد ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں نامہ نگاران تہذیب نے عصمت اور علامہ مغفور کی تصانیف پر ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۳ء میں تربیت گاہ بنات پر اعتراضات کئے تو انھوں نے خندہ پیشانی سے اُن کا مطالعہ کیا اور اعتراضات کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام سے کام رکھا اور جواب میں دو تین مضامین شائع بھی کئے تو تہذیب نسواں اور مولوی ممتاز علی صاحب کی گراں بہا خدمات پیش نظر رکھ کر مولوی صاحب مرحوم میں اور علامہ مغفور میں ایک اختلاف تھا۔ تہذیب نسواں میں حقوقِ نسواں کی حمایت میں اکثر مضامین شائع ہوتے تھے اور عصمت کے مقابلے میں وہ زیادہ روشن خیال پرچہ سمجھا جاتا تھا۔ علامہ مغفور فرماتے تھے کہ حقوقِ نسواں کا مطالبہ مردانہ رسالوں اور اخباروں میں ہونا چاہئے۔ زنانہ پرچوں میں عورتوں کے حقوق کی رٹ لگانا کمزور کو شہ دے کر پٹواتا ہے۔ زنانہ پرچوں میں وہ مضامین شائع ہونے چاہئیں جن سے عورتوں کو اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو اور وہ اپنی اصلاح کرسکیں چنانچہ تمدن حقوق نسواں ہی کے مقصد سے جاری کیا گیا تھا۔ جہاں تک مولوی سید ممتاز علی صاحب کی ذات کا تعلق تھا حضرت علامہ مغفور مرحوم اُن کی خدمات کی بہت قدر فرماتے تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ پھر ۱۹۱۸ء میں وہ دلی تشریف لائے تو تقریباً روز ہی کالے خاں کی مسجد والے مکان میں شام کو آیا کرتے تھے اور ڈیڑھ دو گھنٹہ نشست رہتی تھی۔

آخری ملاقات ۱۹۲۶ء میں لاہور میں ہوئی تھی علامہ مغفور کی نظر میں مولوی صاحب مرحوم کی دوسری بیوی محترمہ محمدی بیگم کی بہت وقعت تھی وہ اس زمانہ میں تہذیب نسواں کی اڈیٹری میں مولوی صاحب کی مدد کرتی تھیں جب عورتوں کا مضمون لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

مرحومہ نے خواتین کے لئے نہایت مفید کئی کتابیں بھی لکھی تھیں جن میں نہایت قیمتی مشورے لڑکیوں اور عورتوں کو دئے گئے ہیں ۱۹۱۸ء میں جب تہذیب کا جوبلی نمبر شائع ہوا تو علامہ مغفور نے "بقائے دوام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں مرحومہ کی قومی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔

مولوی صاحب مرحوم سے علامہ مغفور کی خط و کتابت کئی سال رہی ۱۹۳۵ء میں جب مولوی صاحب مرحوم کی مسلسل علالت خطرناک صورت اختیار کر گئی تو علامہ مغفور نے مجھ سے دریافت فرمایا تھا کہ تم نے مولوی ممتاز علی کی علالت پر کوئی نوٹ عصمت میں نہیں لکھا کہ ان کی صحت کی دعا کی جائے۔ میں نے عرض کیا۔ جی ہاں لکھنا چاہئے تھا اب آئندہ ماہ لکھوں گا اس ماہ کا پرچہ تو پریس میں جاچکا۔ بس پہلی کاپی رہ گئی ہے۔ فرمایا؟ نہیں اسی ماہ کے پرچہ میں دعاء صحت کے لئے لکھو" دوسرے دن میں نے نوٹ لکھ کر دکھایا تو اس میں یہ الفاظ بڑھائے تھے۔

"اُن کی خدمات ہمیشہ عورت کی ترقی میں کندن کی طرح دمکیں گی۔ والد صاحب قبلہ کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیشہ اس قدر خوشگوار رہے کہ اب موجودہ دنیا میں اس کی نظیر ملنی آسان نہیں ہے مگر چونکہ دونوں کے سامنے مقصد ایک تھا اس لئے نفسانیت کبھی سامنے نہ آئی"

خواجہ حسن نظامی مرحوم میں بہت سی انسانی خوبیاں تھیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔

...ں نے بہت سے آدمیوں کو فائدہ پہنچایا۔ ان کے
...ہزار ہا کی تعداد میں غیر منقسم ہند میں تھے۔ علامہ
...ر کا یہ مسلک نہ تھا۔ خواجہ صاحب پروپگنڈے
...ں میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے علامہ مغفور کو غل
...ا نکال پسند نہ تھا۔ وہ شہرت و نام و نمود سے دور
...تے تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم کتابیں فروخت کرتے
...ا ہیں بھی۔ علامہ مغفور اپنی کتابوں کے حقوق
...دوسروں کو دے دیتے تھے۔ جناب واحدی صاحب
...نام زندگی کا رسالہ خطیب میں اعلان کیا تو صرف
...علان پر اُن کے پاس ۱۱۰ درخواستیں
...عشرہ میں آگئیں اُس زمانہ میں کوئی دینی رسالہ
...ا اور اخبار پانچ ہزار چھپا تو بہت کامیاب سمجھا
...تھا آج بعض رسالوں کی اشاعت جوڑ توڑ کر
...۵۰ ہزار سے اوپر بتائی جاتی ہے اور بعض اخبارات
...اس سے بھی زیادہ تعلیم کا اوسط بھی پہلے سے بہت
...دہ ہے اور ادب کا چرچا بھی مگر ہم نے تو سُنا
...ہیں کہ اس ۴۵ - ۴۶ سال کی مدت میں اردو کی کسی
...یک کتاب کے صرف ایک اعلان پر ہفتہ عشرہ میں
...۵ فرمائشیں آگئی ہوں اُس زمانہ میں علامہ مغفور کی
...یک ایک تصنیف کے ایک ایک سال میں کئی کئی
...ڈیشن نکل رہے تھے۔ [illegible] سے علامہ مغفور کی رحلت
...تک کا زمانہ وہ تھا جب مصنفین اُردو میں سب سے
زیادہ کتابیں تاجران کتب دلی کے دو مصنفوں کی
منگاتے تھے علامہ راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی
کی۔ علامہ مغفور کی تصانیف کی سو سو دو دو سو جلدیں
حیدرآباد دکن مکتبہ ابراہیمیہ کے مالک محمد ابراہیم مرحوم
اور لاہور کے شیخ مبارک علی صاحب کی ہر فرمائش میں
ہوتی تھیں اور سال میں کئی کئی فرمائشیں آتی تھیں۔ علامہ
مغفور کی تصانیف کی مقبولیت میں ان کا کوئی حریف
اگر ہو سکتا تھا تو وہ خواجہ صاحب تھے جن کی بعض تصانیف
مثلاً غدر دہلی کے افسانے بیگمات کے آنسو۔ محرم نامہ۔
میلاد نامہ۔ رسول جیتی سی پارۂ دل۔ بیوی کی تعلیم وغیرہ
کے دو پہرٹ کئی کئی اڈیشن شائع ہونے تھے۔ خواجہ
صاحب نے استانی اور عورتوں کا اخبار روزنامے بھی
جاری کئے۔ مدرسہ بھی کھولا۔ تبلیغ کے لئے بھی بہت
کام کیا مگر دلی کے آخری دور کے یہ دونوں مصنف تام
کو بھی کبھی ایک دوسرے سے نہیں اُلجھے صرف ایک دفعہ
اختلاف رائے ہوا لڑکیوں کو جہیز دینے کے سلسلہ میں خواجہ
صاحب سے علامہ مغفور کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ
رہے اور جیسا کہ انھوں نے خود بھی لکھا تھا اس میں کبھی
جھول نہیں آیا۔

صوبہ بہار میں اُردو ہندی کی ترقی کے شعبہ سے اور سر علی امام کی حکومت

ہندی کی ترقی کے سلسلہ میں شروع ہونے کی غرض سے سنہ ... ں زبانوں کے ۵۰۰ نامور ادیبوں کو پٹنہ بلایا تھا۔ اُردو سے حضرت علامہ مغفور، سید سجاد حیدر مرحوم، میر ... مولوی عبدالحق مرحوم نے شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر سر ... علالت کی وجہ سے جا سکے۔ سر علی امام مرحوم کی تحریک ... کی صدارت ہی میں یہ کمیٹی ہوئی تھی اور انہیں کے ہاں ... ادیبوں نے قیام کیا تھا۔ مگر والد مرحوم کا قیام ایک حسن عسکری کے ہاں تھا۔ جاڑے کا زمانہ تھا اور رات ... بجے تھے کہ نئے پٹنہ میں غلغلہ بلند ہو۔ سر علی امام کے ... سارا پٹنہ ان کی عزت کرتا تھا۔ بہار علیحدہ صوبہ انہیں کی کوششوں سے بنا تھا۔ ریاست حیدرآباد دکن کے جواب ... سے بھی شادی کی تھی وہ صدر اعظم رہ چکے تھے۔ شمالی مشرقی ہند سے مسلمانوں کو دکن میں بسانے کی جو سکیم ... ں نے تیار کی تھی۔ نظام حیدرآباد منظور کر لیتے تو ریاست ... ست ونابود اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت ... دہ ہوتی۔ سر علی امام جب پوچھتے پوچھتے "حسن عسکری صاحب" کے مکان پہ پہنچے تو سید صاحب سر علی کے سامنے آنے سے ... پائے۔ سر علی نے علامہ مغفور سے بہت اصرار کیا کہ میرے ... چلئے آپ میرے مہمان رہیں۔ مگر والد مرحوم نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ سید عسکری غریب آدمی ہے اُس کا دل ٹوٹ جائے گا ... علی نے سید صاحب کو بلایا۔ بڑی مشکل سے وہ آئے تو ان سے ... "اپنا معزز مہمان آپ مجھے دیجیے"۔ اس پر علامہ مغفور نے فرمایا "حضرت میں ان کا مہمان نہیں ہوں۔ ان کی بیوی کا ... مہمان ہوں"۔ سر علی یہ سن کر بولے کہ لیڈی علی امام کی بھی خواہش ... ہے کہ آپ ہمارے ہاں قیام کریں"۔ والد مغفور نے فرمایا "میرے چلے جانے سے بیگم عسکری کو جو رنج پہنچے گا اس کے دل کو جو ٹھیس لگے گی ذرا اس کا تو خیال کیجئے۔ میرے جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ تمول یا حسن غریبی کی ذلت میں نے گوارا کر لی"۔

سر علی متاثر ہو گئے اور والد مرحوم اس وقت اُن کے ہاں نہیں گئے اور بیگم عسکری ہی کے یہاں رہے۔

دُوسرے دن لنچ بھی سر علی ہی کے ہاں تھا اور ڈنر بھی۔ جب بعد مغرب ہم وہاں پہنچے تو سر علی کے صاحبزادے جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں جو بچپن ہی میں ولایت گئے تھے اور بیرسٹر ہو کر واپس وطن آئے تھے دروازہ پر کھڑے تھے اور مہمانوں کی ٹوپیاں اور کوٹ لے کر کھونٹیوں پر ٹانگ رہے تھے۔ والد مغفور اچکن پہنے ہوئے تھے اُسے لینے کیلئے اُنہوں نے ہاتھ بڑھائے تو ابا جان بولے۔

"بیٹے یہ اچکن اتاروں گا تو نیچے خالی کرتا ہی ہے"۔

اتنے میں سر علی بھی آ گئے تھے۔ اس لطیفے پر خوب ہنسے۔

(عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر صفحہ ۵۰، ۵۹)

دُور پرے کے عزیزوں کی تلاش

والدہ مرحومہ کو ابا جان کے اور اپنے غریب کنبہ والوں کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ ابا جان کے ساتھ دورے پر کسی ایسی جگہ جاتیں جہاں کوئی شخص دُور پرے کے رشتہ کا ہوتا تو تلاش کروا کر اُس سے ملتی تھیں۔ ... ل کر خوش تو علامہ مغفور بھی ہوتے مگر تلاش بہت مشکل مرحلہ ہوتا۔ امرتسر گئیں تو نانی اماں کی خالہ زاد بہن کے نواسے بھائی عبدالرحمٰن مرحوم زردوزی کا کام کرتے تھے اس سے زیادہ انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ علامہ مغفور سخت پریشان کہ محلہ سڑک کچھ بھی تو نہیں معلوم کس طرح ڈھونڈیں وہ کہتیں غریب ہے مل جائے گا تو خوش ہو جائے گا اُس کی خوشی کی خاطر

اُسے تلاش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ مل گئے تو جب ہم لاہور گئے انہیں ساتھ لے گئیں۔ اور علامہ مغفور نے ان کی کرخنداری زبان اور دلچسپ باتوں کا لطف اُٹھایا۔ سہارن پور تشریف لے گئیں تو ان کی ... کی چھوٹی بہن پہاڑ والی خالہ اماں ؒ کی سوتیلی بیٹی کی تلاش کی گئی۔ علامہ مغفور نے انہیں بھی ڈھونڈ نکالا۔ بمبئی پہنچیں تو ٹونک کی جو سیدانی "خالہ زینب" دادی اماں کی پناہ میں برسوں رہی تھیں ان کے بیٹے بھائی ابراہیم کو جو کارچوبی کا کام کسی کارخانے میں کرتے تھے انہیں تلاش کروایا اور برسوں بعد دیکھا تو بہت خوش ہوئیں۔ علامہ مغفور ان دور پرے کے رشتہ کنبہ والوں کو بغیر ملنے پتے کے تلاش کرنے سے جو رشتہ مودت کی خنگی کا اظہار فرماتے جب عزیز مل جاتے تو دیر تک باتیں کرتے تھے۔

علامہ مغفور کی خط وکتابت

علامہ مغفور کی خط وکتابت اپنے عزیزوں سے کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔ رشتہ داروں میں ان کے تعلقات سب سے زیادہ اپنے پھوپی زاد بڑے بھائی مولوی اشرف حسین صاحب سے تھے۔ مختصر خطوط انہیں بارہا لکھے ہوں گے۔ دو دو چار چار خطوط اپنے چچا زاد بھائیوں کو بھی ممکن ہے لکھے ہوں۔ جب اُن کی ملازمت باہر کی تھی تو ماں اور بیوی کو بھی خطوط لکھے تھے۔ اور بڑی بیٹی آپا رشیدہ کو بھی گنگا پور میں۔ رشتہ داروں میں ان کی خط وکتابت سب سے زیادہ ان کی چچا زاد بہن مرحومہ حامدہ بیگم صاحبہ خیری سے ہوئی۔ میری نسبت کے سلسلہ میں۔ اور پھر مرحومہ خاتون اکرم کے والد مغفور ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب سے ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ چند خطوط ۲۳-۱۹۲۲ء میں خاتون مرحومہ کو لکھے تھے۔ اور ۱۹۲۹ء میں آمنہ نازلی کی والدہ مرحومہ زبیدہ بیگم صاحبہ کو دوست کی حیثیت سے اُن کی خط وکتابت سب سے زیادہ شیخ محمد اکرام مرحوم سے ہوئی جب وہ لندن بیرسٹری کے لئے گئے تھے۔ روپیہ بھجوانے کا انتظام علامہ مغفور ہی کرتے تھے۔ یہ زمانہ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک کا تھا۔

نجی خطوط کے علاوہ اُنہوں نے تین اور حیثیتوں سے بھی خطوط لکھے تھے۔

(۱) بحیثیت اڈیٹر۔ مضمون نگار کی حیثیت سے ...

گزٹ کے اڈیٹر کو سب سے پہلے ناول احسن ومیمونہ کے سلسلے میں خطوط لکھے۔ اس کے بعد سر شیخ عبدالقادر کو جب مخزن لاہور سے دور اوّل میں شائع ہوتا تھا اور وہ اس کے اڈیٹر تھے۔ ۱۹۰۸ء میں عصمت جاری ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں عصمت کے علاوہ مخزن بھی اڈیٹ کر رہے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں ملازمت چھوڑ کر ۱۹۱۱ء میں تمدن جاری کیا۔ اُس زمانے میں اڈیٹر کی حیثیت سے مضامین کے سلسلے میں جن اہل قلم خواتین وحضرات سے ان کی خط وکتابت رہی وہ یہ تھے۔

مولانا حالی۔ مولانا شبلی۔ مولانا اکبر الٰہ آبادی۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ سید سجاد حیدر۔ نظم طباطبائی۔ مسز جہاں آبادی۔ نذر سجاد حیدر۔ خجستہ اختر سہروردی۔ بیگم نواب خدیو جنگ۔ عطیہ فیضی۔ زہرہ فیضی۔ حامدہ بیگم خیری۔ زہرا آبادی۔ مسز عبداللہ۔ بیگم باعکظ۔ صغرا ہمایوں مرزا۔ مسز علی اکبر عباسی بیگم۔ رضیہ مسعود الحسن۔ رؤف علی بیرسٹر۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت۔ مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ جواد علی خاں عالی۔ سید خورشید علی۔ میر مہدی شہید۔ عبدالرزاق بسمل۔ سید ابو العاص۔ مفتی انوار الحق۔ پیارے لال شاکر۔ نوبت رائے نظر لکھنوی۔ خواجہ دل محمد۔ سید علمدار حسین واسطی۔ منشی تلوک چند محروم۔ امداد عظیم آبادی۔ قرشی دہلوی۔ ارشد تھانوی۔ ل احمد۔ مولانا نیاز فتح پوری۔ مہاراج بہادر برق۔ اختر جوناگڈھی۔ سورج نرائن مہر۔ شوق قدوائی۔ بالکے رام فکر۔ سید راحت حسین۔ حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی۔ امجد حیدرآبادی

[illegible]الدین احمد برنی - مولانا کاپرشاد آتش - ڈاکٹر شرف الحق
محمد شریف گورگانی - محمد حسن خلیقی دہلوی - عبدالخالق
دہلوی - مشتاق احمد زاہدی - ان میں دو چار بقیدِ حیات
ہیں باقی سب اللہ کو پیارے ہوگئے۔

۳۔ مصنف کی حیثیت سے کئی ناشرین کتب سے
معاملات ہوئی۔ مولوی سید ممتاز علی مرحوم اڈیٹر تہذیب
نسواں مالک دارالاشاعت پنجاب اور ان کے بیٹے سید
امتیاز علی تاج نے آٹھ کتابوں کے حقوق اشاعت خریدے
تھے ان دونوں سے [illegible] سے [illegible] تک خط وکتابت
رہی۔ معارف پبلشنگ ہاؤس پنڈی بہاؤالدین گجرات نے
کتابوں کے حقوق خریدے تھے۔ ایک کتاب مولانا عبدالمجید
سالک نے ایک ظہورالدین صاحب مالک مخزن لاہور نے
ایک سید مبارک علی صاحب گیلانی لاہور نے لکھوائی تھی
ان تینوں سے [illegible] اور [illegible] کے زمانے میں خط وکتابت تھی۔

۴۔ تربیت گاہ بنات کے سلسلے میں جب دورہ
پر جاتے تو چند عصمتی بہنوں کو اطلاع دیتے تھے۔ یہ
اطلاع ایک ہی مضمون کی چند سطریں ہوتی تھیں۔

[illegible] سے جب میں نے یہ اعلان کیا کہ میں اشاعت
کی غرض سے علامہ مغفور کے خطوط جمع کر رہا ہوں تو بعض
خواتین و حضرات کے نام کے خطوط آنے شروع ہوگئے تھے
اور [illegible] تک ۲۰۰ خطوط جمع ہوگئے تھے۔ دلی سے
کراچی پہنچ کر ہجرت کی تو علامہ مغفور کے متعلق اور بہت سے
کاغذات کے ساتھ یہ خطوط بھی اُن تین بکسوں میں سے ایک
بکس میں تھے جو ریل میں کراچی آرہے تھے اور یہ وہی ریلوے
ٹرین تھی جو راستے میں جلائی گئی تھی۔

میرا دُوسرا نکاح | خاتون اکرم مرحومہ کی رحلت کے
ساڑھے چار سال بعد میرا دوسرا نکاح

تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت علامہ مغفور کا جو مضمون عصمت
مئی [illegible] میں شائع ہوا تھا اور کتاب "شادی کا انتخاب"
میں بھی نقل کیا گیا ہے اور کتاب کے ۹ صفحوں میں ہے، اس کے
چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:-

"یہاں تک گزشتہ برس ایک دردناک واقعہ ہوا۔
جو میرے ایک عزیز لڑکے کا تھا۔

خاتون مرحوم کے رزاق ابدی نے مجھے رزاق میاں کی
حالت پر [illegible] معلوم ہوا کہ وہ تقریباً [illegible]
زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دُنیا کے تمام تعلقات کو ختم کر چکے
اور ان کے سامنے دوست کی مہمان بیوی کا خیال اور
اس کی تصویر کی پرستش ہے۔ ان کی بڑی بہن راشدہ بیگم
اور پھوپھی بہن راحیلہ بیگم ہجرت کی والدہ محترمہ نے مختلف
موقعوں پر نکاح کی ترغیب دی مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئیں
اب چونکہ میں خود اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا اس لئے
مجھے ان کی موجودگی میں اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار
کیا۔ یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی اب اس کے سوا چارہ نہ
تھا کہ میں براہ راست ان سے گفتگو کروں۔ چند ایک
موقع ایسے ہوئے اور گو انہوں نے آمادگی ظاہر کی
مگر میں نے ان کے علم میں ایک بہترین لڑکی منتخب کی اور نکاح
کا پیام دے دیا ... میرے وہم وگمان میں بھی یہ
خیال نہ تھا کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی
برسوں کی [illegible] ہوسکتی ہے ... مجھے رازق میاں
کی یہ رائے معلوم ہوئی کہ جب تک جواب قطعی نہ ہوجائے ہم
کو دوسری طرف خیال نہ کرنا چاہیئے ..... رازق میاں
کی رائے یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکی بہترین بیوی ہوسکتی ہے
بیگم راشد الخیری صاحبہ کا خیال یہ ہے کہ اس زمانے کی
پڑھی لکھی لڑکیاں بیوی کے فرائض اچھی طرح ادا نہیں

کر سکتیں۔ میری رائے یہ ہے کہ تعلیم بغیر تربیت قطعاً فضول بلکہ بجائے فائدہ پہنچانے کے مضر ہے۔ میں اس معاملہ میں اس قدر سخت ہوں کہ لڑکیوں کے موجودہ نصاب کو ان کے واسطے زہر ہلاہل سمجھتا ہوں . . . . . رازق میاں کا اصرار تھا کہ جو معاملہ چل رہا ہے اس کا یکسو ہو جانا ضروری ہے۔ اور جب تک اُدھر سے فیصلہ قطعی نہ ہو جائے دوسری طرف خیال کرنا انسانیت کے خلاف اخلاقی کمزوری ہے۔ مگر میں ان کی رائے کو کوئی وقعت نہ دیتا تھا اور جن سے کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آزمودن را آزمودن جہل است۔" (عصمت مئی ۲۹ء)

نسبت جہاں چل رہی تھی اُن لوگوں نے معاملہ کو اُدھر میں لٹکا رکھا تھا ہاں ناں میں جواب آتا ہی نہ تھا۔ آتا تھا تو یہ کہ دو ماہ بعد تین ماہ بعد جواب عرض کیا جائے گا۔ بات یہ تھی جو بعد میں کسی ذریعہ سے معلوم ہوئی کہ اپنے اطمینان کے لئے وہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ لڑکے کی کوئی غیر منقولہ جائداد ہونی چاہیئے اور وہ تھی نہیں۔

ستمبر ۲۸ء میں ہم چند روز کے لئے آپا کے پاس گنگا پور سٹی گئے ہوئے تھے۔ پنجاب کے شیخ غلام محمد صاحب مرحوم ٹھیکہ دار ریلوے کی بیٹی آمنہ بیگم کو والدہ مرحومہ اور آپا نے وہیں دیکھا تھا اور مجھ سے آپا نے ذکر بھی کیا تھا مگر میں نے انکار کر دیا تھا۔

حضرت علامہ مغفور کے مضمون کے آگے کے اقتباسات:۔

"اتفاق یہ ہوا کہ ماہ فروری میں بیگم راشد الخیری صاحبہ سخت بیمار پڑیں۔ شدید درد کا دورہ ہوا اور بخار ۱۰۵ تک پہنچ گیا۔ ڈاکٹروں نے پچکاریاں دیں مگر نبض کی حالت مخدوش رہی۔ دوسری صبح کو جب مریضہ نے آنکھ کھولی تو حالت نسبتاً بہتر تھی۔ رازق میاں صورت دیکھ کے بیتاب ہو کر لپٹ گئے تو ان کی والدہ محترمہ نے فرمایا اگر میں مر گئی تو تمہارا صدمہ لے کر جاؤں گی۔ اتنا سنتے ہی رازق میاں کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ ماں کے قدموں پر گر پڑے۔ پاؤں کو بوسہ دیا اور کہا "میں غلام ہوں۔ جب حکم دیجئے۔ جہاں حکم دیجئے اور جس طرح حکم دیجئے۔ تعمیل کو حاضر ہوں"۔ مگر بہر حال یہ تھا کہ جو کچھ رازق میاں نے زبان سے کہہ دیا وہ پورا ہو گا۔ اس لئے ان کی والدہ محترمہ اور تمام عزیز باغ باغ ہو گئے اور ان کے الفاظ نے ان کی والدہ صاحبہ کی بیماری میں مسیحائی کا کام کیا۔ انہوں نے دوسرے ہی روز راشدہ بیگم کو زبیدہ بیگم صاحبہ بنت مرزا اصغر علی بیگ صاحب ڈپٹی کلکٹر آگرہ کی خدمت میں پیام نکاح دے کر روانہ کیا اس لئے کہ آمنہ بیگم کو وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔ گھر کی معاشرت اور عادات و خصائل سے واقف تھیں۔ اور یہ بھی جانتی تھیں کہ ہمارے متعلق اس خاندان کی رائے اچھی ہے۔ راشدہ بیگم رات کے دو بجے آگرہ پہنچیں۔ زبیدہ بیگم صاحبہ بیگم نواب مرزا صاحب تحصیلدار بیگم تصدق علی بیگ صاحب اسپیشل مجسٹریٹ کی عنایت کا ممنون ہوں کہ انہوں نے چند گھنٹوں کی مہلت مانگ کر تمام عزیزوں کو جمع کیا اور ہماری التجا منظور فرمائی۔ راشدہ بیگم نے اُسی وقت ایک گلوبند اور کچھ پھولوں کا گہنا اپنے ہاتھ سے لڑکی کو پہنا دیا اور کچھ مٹھائی تقسیم کرنے کے بعد رات ہی کو واپس آ گئیں۔"
(عصمت مئی ۲۹ء)

اور جب آپا آگرہ سے واپس آئیں تو دوسرے دن میری اُن سے گفتگو ہوئی۔ اُن کے مندرجہ ذیل جوابات سے معلوم ہو گا کہ میں نے کیا باتیں پوچھی تھیں۔

(۱) "ہاں ریاض سے بڑی ہی ہے۔ ہو گی انیس بیس سال کی"

...راشد الخیری

...آمنہ بیگم رازق صاحب سے چھوٹی ہیں۔ اور
... سال کی تھیں مگر معلوم ہوتی تھیں محلہ میں

... ہاں ہاں آٹھ نو جماعتیں پڑھی ہونگی۔"
... بالکل یتیم معلوم ہوتی ہے۔"
... گھر کا سب کام کاج اُس کے سپرد ہے۔"
... خدا سے ضرور ڈرتی ہوگی۔ ورنہ ناز کی اس قدر
... ی۔ سبھی یہی سنا ہے کہ بہت نیک اور بے زبان ہے۔"
... مضمون کے مضمون کا آگے کا اقتباس۔
... یل کو ہم آگرہ پہنچے ۲ تاریخ کی صبح کو نکاح ہوا
... ی روز وداع۔ وہ تمام رسوم جو محض نام و نمود
... سے مروج ہیں قطعی اڑا دی گئیں اور ایک ہفتہ
... ۱۰ تاریخ کو ہم دہلی آگئے . . . . میں رازق میاں
... ہمداری سے بہت خوش ہوں کہ انہوں نے میرے
... ل کی۔ اگرچہ یہ جو کچھ ہوا انہیں کی بہتری کے واسطے
... ن کو معلوم ہوا اور معلوم ہو جائے گا کہ والدین کے
... کس نیت پر مبنی تھے . . . . یہ عزیز بچی اپنی جنس
... کے بہترین خدمت گزار ثابت ہو اور حقوق نسواں
... بنا بیٹے ہوئے ہیں رازق بیگم کے ہاتھوں بار آور
... ۔" (عصمت مئی ۱۹۲۹ء)

والد مرحوم نے ۱۹۳۱ء میں مجھے بتایا تھا کہ دلہن کے
... بڑے آدمی تھے اور ان کی ماں چشم بینا کے لئے تصویر عبرت ہیں۔
... ۴ سال بعد جب میرے منجھلے لڑکے حازق الخیری
... کی شادی ہوئی تو میں نے عصمت میں جو مضمون لکھا تھا
... چند سطریں حازق میاں کی والدہ کے متعلق تھیں۔
"یہ روپیہ پیسے کے لحاظ سے ایک بڑے باپ کی
... ہیں۔ ان کے والد شیخ غلام محمد مرحوم پنجاب کے بہت

شہور لوگوں سے کہ ذی عزت تھے۔ جب یہ پانچ چھ سال کی تھیں
تو ان کی پرورش گورنس تھی۔ شیخ صاحب مرحوم پر جب فالج کا
حملہ ہوا تو علاوہ بڑی جائداد کے جو بھٹنڈہ، ریواڑی، فرخ نگر،
ضلع فرخ آباد اور آگرہ میں تھی، کئی لاکھ روپیہ نقد بنک میں
موجود تھا۔ چشم فلک نے بڑے بڑے زبردست انقلاب
دیکھے ہیں۔ دس سال کے اندر اندر چھ چھوٹے چھوٹے یتیم
بچوں اور بیوہ ماں کا کوئی سہارا سوائے سو اسو روپیہ ماہانہ
کرایہ کے نہ رہا۔ ٹھیکہ دار مرحوم جن عزیزوں پر جان چھڑکتے
تھے، انہوں ہی نے حق داروں کا حق غصب کیا۔"

آمنہ نازلی

آمنہ بیگم کا قلمی نام آمنہ نازلی تجویز کیا گیا۔

"۱۹۲۹ء میں میرا دوسرا نکاح ہوا تو آمنہ نازلی زیادہ
عمر کی بھی نہ تھیں اور علمی استعداد بھی کم تھی۔ لیکن وہ خوش
نصیب ہیں کہ زیادہ دو سال والد مرحوم سے کئی بلند مرتبہ مصنفین
اُردو کی نظم و نثر کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کا انہیں موقع ملا
پھر جب انہوں نے ادیب فاضل کی تیاری کی تو مولوی احمد سیر
لکھنوی جیسے اُستاد انہیں میسر آئے جو ایک ایک سطر کا مطلب
سمجھانے میں بال کی کھال نکالتے اور غضب کے سخن فہم تھے
اور سمجھاتے بھی اس طرح کہ مطلب ذہن نشین کر دیتے تھے۔ کئی
سال کی مشق کے بعد جب وہ مضمون نگاری میں مشاق ہو گئیں
تو آمنہ نازلی کا نام عصمتی حلقہ میں اور ادبی دنیا میں چمکنا شروع
ہوا۔ شروع شروع میں وہ عصمت کی ادارت میں مجھے
کوئی خاص مدد نہ دے سکیں۔ البتہ نئی کتابوں کی تیاری
میں ان سے مدد ملنی شروع ہو گئی۔ کھانے پکانے کے
موضوع پر سات کتابیں انہیں کی محنت سے شائع ہوئیں۔"
(عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر ص۳۱)

آمنہ نازلی کے شروع کے کئی مضامین کو علامہ مغفور نے

درست کیا سنہ ۳۵ء میں ان کے مضامین دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔

آمنہ نازلی اب ۱۳۔ ۱۵ کتابوں کی مصنفہ ہیں ان کے مختصر ڈراموں اور مختصر افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں اور کھانے پکانے اور زنانہ دستکاری کی کتابیں بھی۔ ان کی ایک کتاب "عصمتی دسترخوان" ۱۷ دفعہ شائع ہو چکی ہے ان کی تحریر میں انفرادیت ہے۔ جاذبیت اور دلآویزی ان کے اصلاحی مضامین میں بھی ادبی شان ہوتی ہے۔

صالحات کا جدید اڈیشن

سنہ ۰۰ء سے سنہ ۲۲ء تک کے زمانہ میں حضرت علامہ مغفور نے اپنی ۲۷ تصانیف کے حقوق اشاعت دوسرے ناشران کتب کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے ان میں سے اکثر و بیشتر کتابیں حضرت مصنف مرحوم کی حیات میں دس دس پندرہ پندرہ دفعہ شائع ہوئیں اردو کے کسی مصنف کی کتابیں اس کی زندگی میں مختلف جگہ سے چھپ کر اس قدر مقبول آج تک نہیں ہوئیں حضرت علامہ مغفور نے اپنی کتابوں کی جو مقبولیت دیکھی وہ اردو کے کسی مصنف کو دیکھنی نصیب نہیں ہوئی ان کتابوں سے ناشران نے ہزاروں روپیہ کمایا سنہ ۱۶ء اور پھر سنہ ۱۹ء کی آتش زدگی کے باعث ہمارے ہاں چھپائی کا معقول انتظام نہ رہا تھا۔ کتابوں کی باقاعدہ اشاعت کس طرح ہوتی۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود مجھے حضرت والد مرحوم کا دوسروں کو تصانیف کے حقوق اشاعت دینا شاق گزرتا تھا۔ مگر میں دم نہ مار سکتا تھا اور جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ایک آدھ دفعہ عرض کیا تو جواب ملا کہ ہمیں کتب فروشی نہیں کرنی۔ گرچہ روپیہ سے عصمت کٹنے پر کی بنیاد پڑنے کے کئی سال بعد جب میں نے پرانے رسالوں سے ان کے مطبوعہ مضامین تلاش کر کے کئی مختلف مجموعے شائع کر دیے اور تین کتابیں شب زندگی۔ ستونتی اور وداع ظفر بھی شائع ہوگئیں تو میں اس فکر میں رہنے لگا کہ جن کے حقوق اشاعت فروخت کر دیے گئے تھے چاہے کسی رقم دوگنی تگنی ادا کرنی پڑے واپس لے لوں خاص طور پر یہ احساس اس وقت ہوا جب میں نے والد مرحوم کی تصانیف نہایت گھٹیا کاغذ پر چھپی ہوئی دیکھیں اور کہ ان میں کتابت اور زبان کی غلطیوں کی بھرمار تھی۔

ناشرین کو تو کم سے کم لاگت میں زیادہ سے زیادہ کمانا تھا۔ خلقت مصنف کے نام پر گر رہی تھی۔ کتابت غلطیاں ہیں تو ہوں، مصنف کی شہرت پر اس کا اثر پڑے تو پڑے۔ اُن کی بلا سے۔ حقوق اشاعت واپس لینے کی سنہ ۲۹ء سے بارآور ہونے لگی اور سنہ ۳۰ء میں میں نے صالحات شائع کی۔ یہ جیسی بائیس سال سے ناپید تھی۔ کیونکہ پاس سوائے ایک نسخہ کے اور کوئی نسخہ نہ تھا اور وہ بھی تھا اور جو تھا اس میں ۱۶ صفحے غائب تھے۔ اس کتاب کا معاوضہ حضرت مصنف نے لیا تھا اس سے بیس گنا ادا کر کے میں نے حقوق اشاعت واپس لیے اور میرے محترم دوست مولوی محمد ظفر ایم۔ اے نے مجھے صالحات کے پہلے ایڈیشن کا مکمل نسخہ دیا جس پر حضرت مصنف مرحوم نے نظر ثانی کی اور کتاب تقریباً جو تھا ذ صدی بعد شائع ہوئی تو دو بہت سے اڈیشن چھپے اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔"

(عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر صفحات ۱۴

مولانا محمد علی کی دعوت

مولانا محمد علی جوہر مرحوم مغفور کو دکھیا تھے

ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ان کی رہائش گاہ دفتر اسی پل والے مکان میں تھا جہاں کسی زمانے میں رہ چکا تھا اور جہاں سے عصمت جاری ہوا تھا۔ علامہ مغفور کبھی مولانا سے ملنے چلے جاتے تھے اور کبھی سڑک پر ملاقات

محمد علی ر بر تک گھنٹے باتیں کرتے۔ جاڑوں میں ایک
حضرت اپنے احباب کو نہاری کھلاتے تھے۔ چنانچہ
۱۹۲۸ء میں ایک دن صبح مولانا محمد علی اور ان کے
ی مولانا شوکت علی کو ابا جان نے نہاری پر بلایا
زمانہ ۱۹۲۵ء کا تھا گھر آگئے ہم دونوں بھائی
ن کے پاس گیا اور کہا مہمان تو دم لگنے سے پہلے
لے ہو گا۔ انہوں نے فرمایا۔
"گھر کی کیا بات ہے اور ہو گا ہی کیا۔ ابھی سب
ہو جائیگا۔ جاؤ ہاتھ دھلوا کر دسترخوان بچھواؤ۔"
دونوں بھائیوں اور ان کے ساتھیوں نے دل کی
ی خوب مزے لے لے کر کھائی۔ مولانا محمد علی نے اپنے
سے تین نلیوں کا گودا نکالا۔ تیسری نلی ختم کر رہے تھے
مولانا شوکت علی نے کہا "محمد علی ذرا روٹی اٹھانا" ان کا ہاتھ
ن کی طرف بڑھا اور ادھر مولانا شوکت علی نے ہاتھ بڑھا
کر وہ جو مولانا محمد علی نے نلیوں سے جمع کیا تھا اٹھا کر
میں رکھ لیا۔ مولانا محمد علی نے ان کی طرف دیکھا مسکرائے
اور فرمایا "سگ باش برادر خورد مباش"۔
مولانا شوکت علی نے علامہ مغفور کی یاد میں جو مضمون
لکھا تھا اس میں اس دعوت کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہ علامہ
مغفور خود دسترخوان پر نہیں بیٹھے بلکہ روٹی گرم کر کے کھلاتے
رہے۔ جب مولانا محمد علی چلنے لگے تو انہوں نے ابا جان سے
فرمایا۔
"بھائی کی مہمان نوازی اور خوش انتظامی کی بڑی
تعریف سنی تھی۔ واقعی وہ تعریف کی مستحق ہیں۔ دیکھا!
بہت خوش نصیب ہوا۔"

مہر کی ادائیگی

۱۹۳۰ء میں ایک دن شام کو ہوا خوری کے
لئے جانے سے قبل حسب معمول میں خدمت
میں حاضر ہوا تو فرمایا۔
"آؤ بیٹھو۔ میں انتظار کر رہا تھا۔ تم میرا قرضہ کب
ادا کرو گے؟"
میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوچ رہا تھا کہ خود ہی فرمایا۔
"تم نے لڑکپن میں ایک دن کہا تھا کہ میں ان کے کپڑے
نہیں پہنوں گا۔ کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔ جو کچھ مجھ پر خرچ
کیا ہے سب ادا کر دوں گا۔ پھر تم نے حساب بھی لکھا تھا۔ یاد ہے؟"
ہوا یہ تھا کہ میں نو دس سال کا تھا کسی غلطی پر ایک
تھپڑ مارا کہ مجھے غصہ آگیا تھا اور میں نے کرتا اتار کر پھینک دیا
تھا اور کاغذ کاٹ کر لئی سے جوڑ کر پاجامہ بنایا تھا۔ اور رات
کو وہی پہن کر سویا تھا اور کہا تھا کہ اب ان کے بنائے ہوئے
کپڑے بھی نہیں پہنوں گا اور کھانا بھی نہیں کھاؤں گا اور
جو پیسے مجھ پر اٹھائے ہیں سب ادا کر دوں گا۔ شام کو والدہ
مرحومہ نے کھانے کو بہت کہا نہیں کھایا۔ بھوکا پیٹ کروٹیں
بدلتا رہا۔ کوئی دس بجے کے قریب اٹھا تو یہ سمجھ کر کہ سب سو گئے
ہوں گے باورچی خانے میں جا لالٹین کی بتی اونچی کر کے کھانا
خوب ڈٹ کر کھایا۔ حضرت علامہ مغفور بھی جاگ رہے تھے۔
اور والدہ مرحومہ بھی۔ دونوں نے دیکھا اور خاموش رہے۔
اور میں پانی پی کر سو گیا۔ صبح اٹھا تو کاغذ کا پاجامہ پھٹ چکا
تھا۔ دوسرا کاغذ کا پاجامہ بنانے لگا۔ ناشتہ کے لئے آپا نے
آواز دی اور میں نے کہا مجھے بھوک نہیں ہے۔ تو والدہ مرحومہ
نے فرمایا۔
"بھوک اس وقت کہاں ہوگی۔ رات کو باورچی خانہ
میں رات کا کھانا بھی کھا چکے ہیں اور صبح کا ناشتہ بھی کر لیا ہے۔"
قلعی کھل چکی تھی آپا نے کہا "بھانڈا تو پھوٹ ہی
گیا چلو کپڑے پہنو اور بھوک ہو تو ناشتہ بھی کر لو پھر جو
کچھ تم پر خرچ ہوا ہے اس کا حساب لکھ لو۔ کہو گے تو میں

لکھوا دوں گی۔"

چنانچہ اس روز حساب لکھنا شروع کیا۔ ایک مہینے میں کتنے کا کھانا کھایا۔ کتنے کے کپڑے پہنے۔ کتابوں پر کیا خرچ ہوا۔ گڑیاں ایک مہینے میں کتنے کی آئیں۔ پیدائش پر دائی کو کیا دیا۔ شہد کتنے کا آیا۔ یہ حساب آپا کے مشورہ سے تیار کیا گیا۔ آپا نے کہا پھوپی اماں کو جو نیگ کے ۵ روپے دئے تھے وہ بھی لکھو۔ بھانڈ ہیجڑے۔ ڈومنیاں آئی ہوں گی انہیں انعام دیا گیا ہو گا وہ بھی جوڑو۔ وہ دن اسی حساب میں گذر گیا دوسرے دن آپا سے اسی حساب کے سلسلے میں لڑائی ہو گئی اور وہ پرچہ پھاڑ دیا گیا۔ بہرحال میرے یہ الفاظ آبا جان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ اور میرے بھی کہ مجھ پر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ میں ادا کر دوں گا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا بیس سال بعد۔

میں نے عرض کیا "وہ تو لڑکپن کی حماقت تھی۔"

فرمایا "تم مسلمان ہو نا" عرض کیا "جی ہاں الحمدللہ"۔

فرمایا "لڑکپن ہو یا جوانی مسلمان تو اپنی زبان کا پکا ہوتا ہے۔"

والدہ مرحومہ نے مسکرا کر فرمایا "تم بھی کیا بچوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ بچپن کی باتیں جوانی میں کون پکڑتا ہے۔"

"تمہارے خاندان میں زبان سے پھر جاتے ہوں گے اللہ کا شکر ہے ہم لوگوں کو اپنی زبان کا ہمیشہ پاس رہتا ہے۔"

اور اس طرح وہ اماں کو چھیڑتے رہے۔ پھر مجھ سے فرمایا "تمہاری کیا رائے ہے۔ تمہاری اماں کا مہر ادا کر دوں۔"

اور پھر گردن سے اشارہ کیا جس کا مطلب میں یہی سمجھا کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جس سے مذاق کا پہلو نکلے۔

"مہر سے زیادہ آپ اماں کو دے چکے۔ کئی دفعہ زیور میرے سامنے بنوا کر دیئے۔"

"بھئی تم بہت ایمان دار آدمی ہو۔ اللہ خوش رکھے۔"

اور والدہ ماجدہ نے بلند آواز سے مجھ سے فرمایا۔

"کون کون سے زیور انہوں نے بنوا کر دئے ہیں۔ ذرا بتاؤ تو۔ چھاپہ خانہ کے لئے تمدن کے لئے، عصمت کے لئے میرا زیور ایک دفعہ اجڑا ہو دو دفعہ گیا ہو تین دفعہ لیا گیا ہو تو بتاؤں۔ بجائے ایمان کی بات کہنے کے ان کی سی باتیں کرنے لگے۔ میرے منہ در منہ۔ کوئی تو مرے پہ طوفان اٹھاتا ہے تم زندہ پر اُس کے روبرو کہہ رہے ہو۔ شاباش ہے تمہیں۔"

علامہ مغفور یہی چاہتے تھے کہ ان کی رفیقۂ حیات ذرا چیخیں۔ وہ اپنی والدہ مرحومہ تک سے مذاق کیا کرتے تھے۔ انہیں چھیڑنے چڑانے میں لطف آتا تھا۔ والدہ مرحومہ کی یہ باتیں سن کر وہ خوب ہنستے۔ والدۂ مرحومہ کی خفگی دور کرنے کو میں نے عرض کیا۔

"آپ مہر میں مجھے دے دیجئے۔"

فرمایا "نہیں بیٹے کو کوئی نہیں دیتا۔ ہاں تم کہو تو ایک بیٹی کو دے دیتا ہوں۔"

آپا جو اب تک خاموش تھیں کہنے لگیں "دو بیٹیاں ایک بیٹے کے برابر ہوتی ہیں۔"

"بس تو جاؤ دونوں ہی کو ان کے مہر میں دے دیا۔"

"اے رہنے بھی دو بیاہی تیاہی بیٹیاں تمہارا ایمان کیا زور۔ میں نے تو کہیں بھی نہیں سُنا کہ بیٹیوں کو یا بیٹوں کو کوئی مہر میں دے۔ اور پھر یہ تو بتاؤ شادی کو اتنی مدت گذری مہر کا لفظ کبھی میری زبان پر آیا بھی ہے؟ تم کیا باتیں کر رہے ہو۔ میں نے مہر معاف کر دیا۔ میں اپنا آخرت کا ثواب کیوں کھونے لگی۔"

"ہوں جب ہی آج صبح بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں۔"

"اے تو میں نے کون سی بُری بات کہہ دی جو ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

[illegible] علامہ مغفور نے گفتگو شروع کی: "اچھا بھئی تم یہ بتاؤ کہ
[illegible] دو سو کتابوں کی کوئی کتاب بھی کتاب فروخت کرو گے؟"
[illegible] فرمانے لگے:
"دس سال پہلے پانسو لے رہے تھے تو اب ہزار
[illegible] ہوں گے۔ لیکن اب حقوق فروخت کرنے کی خواہش
[illegible] نہیں حقوق واپس لے رہا ہوں۔ اور آپ کیا آپ بھی
[illegible] لیں گے؟"
اس کے جواب میں انہوں نے انگریزی میں پوچھا:
"تمہارے پاس نقد چار ہزار روپے ہیں؟"
عرض کیا: "جی ہاں۔"
فرمایا: "اچھا اب آپ ٹہلنے جائیے۔ کہاں گئی [illegible]"
گاڑی دیکھ کر کہا: "پہلے سینما کا خیال تھا اب یہ ہو گی
[illegible] بہن کے ہاں ہو آؤں۔"
فرمایا: "اچھا اپنے چچا کو میری طرف سے سلام کہہ دینا۔"
میں نے چلتے اور پھر آتے وقت بہت سوچا۔ مگر
میری سمجھ میں نہ آیا کہ آج ایسی کیا بات گھر میں ہوئی جو ابا جان نے
[illegible] یہ گفتگو فرمائی۔ رات کو آپ سے بات کرنے کا موقع
[ملا] تو انہوں نے بتایا کہ کل رات کو جب ابا پھوپی اماں کے
[گئے] ہوئے تھے تمہارے ماموں جان آئے تھے وہ ماں
بہت خفا ہوتے رہے۔ مفہوم یہ تھا کہ دادی نانی بن گئیں
[illegible] ہو گیا۔ دانت ٹوٹ گئے مگر عقل ہی نہ آئی۔ سولی کی
[illegible] والی اور دلی ہی میں کرایہ کے مکان۔ بس سوچو تو کتنی
بڑی [illegible] ہے۔ جس کا اپنا رہنے کا ٹھکانا بھی نہ ہو اس کی
ناک عزت۔ یوں اپنے دل میں چاہے جو کچھ سمجھ لو۔ تمہارے
میاں نے بہت کمایا مگر رکھنا نہ آیا۔ آٹھویں دن کی سیر و تفریح
مقدم۔ تیسرے دن کی چہل ضروری۔ کہیں اس طرح تھوڑی روپیہ
جڑتا ہے۔ تمہاری ساس نے اللہ بخشے دو دو مکان چھوڑے

تمہارے میاں نے دونوں بیچ کر چچا کی خلد کی اور رخصت
کی نذر کر دیے۔ وہ چاہتے تو ایک نہیں کئی مکان خرید چکے
ہوتے۔ مگر تمہاری آنکھوں پر بھی تو پٹی بندھی ہوئی ہے۔
[illegible] میں شیر کی طرح روپیہ اڑ رہا ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی
ٹھنڈا کرو۔ کیا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مہینہ مالک مکان کرایہ
لینے دروازہ پر کھڑا ہے۔ تمہارے ہاں اللہ رکھے کسی چیز کی کمی
نہیں ہے۔ مگر ایک مکان اپنا نہ ہونے سے گھر کی ہوا اکھڑی
ہوئی ہے۔ عقل کے پیچھے لٹھ لے کر کب تک پھرو گی۔ دلیری کر
کے اپنے میاں سے بات کرو۔ جیسے بنے تو اسی سال مکان
خرید لو گی اور جو تم نے اس معاملہ میں زور نہ دیا تو مر جاؤ گے [illegible]
والدہ مرحومہ نے صبح علامہ مغفور سے گفتگو کی۔ مگر
زیادہ گفتگو نہ ہوئی تھی کہ دروازہ میں کسی نے آواز دی پھر وہ
ادھر چلے گئے۔ اور پھر جو واپس آئے تو یہ گفتگو جاری نہ رہ
سکی اور انہوں نے موقع پا کر آپ سے پوچھا کہ جب میں
گیا ہوا تھا کون کون آیا تھا۔ تمہارے گورے ماموں جان
تو نہیں آئے۔ انہوں نے بتایا کہ جی ہاں وہ آئے تھے اور [illegible]
فرما گئے ہیں۔
دو ہفتے بھی نہ گذرے تھے کہ چھوٹا مکان جس میں ہم
دس سال سے رہتے تھے خرید لیا گیا۔ اور دوسرے سال
نئے سرے سے اس کی تعمیر انہیں ماموں صاحب کے زیر اہتمام
ہوئی تو دو کمرے اوپر بھی تھے۔
آمنہ کا لال اور سیدہ کا لال دونوں نئی کتابوں
کے کئی اڈیشن اوپر تلے ڈھائی تین سال کے اندر نکل گئے تھے
اور وداع ظفر کے بھی۔ پرانی تصانیف میں سے کئی کتابوں
کے حقوق اشاعت واپس لے کر میں نے شائع کرنے شروع کر دیے
تھے۔ ان سے بھی بہت اچھی آمدنی ہوئی اور اسی طرح مکان
کی صورت میں علامہ مغفور نے اپنی رفیقۂ حیات کا مہر ادا فرما دیا۔

رازقہ کا عقیقہ

[illegible] میں میری بڑی بیٹی رازقہ پیدا ہوئی تو دوسرے دن میری موجودگی میں فرمایا "بیٹیاں خدا کی رحمت ہیں" اور جب اس کے عقیقہ کے لئے والدہ مرحومہ مرحوم دین محمد کو روپے دینے لگیں کہ ایک بکری منگاؤ تو فرمایا

" ایک بکری اس لئے منگوا رہی ہو کہ یہ لڑکی ہے لڑکا ہوتا تو دو منگواتیں۔ نہیں دو منگواؤ۔ معلوم ہے بیٹیوں سے رسول اللہ کو کتنی محبت تھی "۔

صادق میاں کا نکاح

[illegible] کے آخر میں مَیں تین بچوں کا باپ تھا۔ دونوں بہنیں اپنے اپنے گھر کی تھیں۔ اب صرف صادق میاں کی شادی کا ابا جان اور اماں جان کو خیال تھا اور اس وقت وہ انٹرنس کر چکے اور ایف اے (اول) میں پڑھ رہے تھے۔

ستمبر یا اکتوبر کی کوئی سی تاریخ تھی حضرت والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا تمہاری اماں نے صادق میاں کے لئے لڑکی دیکھ لی ہے۔ فضل احمد کی بھتیجی۔ محمد احمد کی لڑکی۔ دبلی پتلی سیدھی سادی ہے۔ ساتویں جماعت میں پڑھ رہی ہے "۔

میں خاموش تھا فرمانے لگے۔

" خاموش کیوں ہو۔ بڑے بھائی ہو۔ چودہ پندرہ برس بڑے۔ تمہیں اظہار رائے کا پورا حق ہے "۔

پھر مسکرا کے فرمایا " روپیہ جو خرچ کرو گے اس لئے خاموش ہو "۔ میں نے عرض کیا " یہ بات خیر ہو ہی نہیں سکتی۔ سب روپیہ سب کام کاج آپ ہی کا ہے۔ میں آپ کا ہوں میری ہر چیز کے مالک آپ ہیں "۔

" پھر کیا بات ہے؟ "

" صادق میاں ابھی چھوٹے ہیں بی اے تو کر لینے دیجئے "۔

" اور آپ کو یقین ہے کہ میں اور تمہاری اماں دونوں اس وقت تک زندہ رہیں گے۔ میری صحت گر رہی ہے۔ تمہاری اماں کی صحت بھی اچھی نہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے سامنے نکاح تو کر ہی دیں۔ خاندان میں کوئی زہیر محمد احمد بہت شریف انسان ہے۔ لڑکی موزوں ہے اور کیا چاہیئے "۔

حضرت علامہ مغفور کی خاص نوٹ کتابوں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر دولت اور صورت کو کہیں بھی کسی کتاب میں کسی افسانے کسی مضمون میں اہمیت نہیں دی گئی اور صرف تحریری میں نہیں انہوں نے اپنی عملی زندگی میں بھی اپنے بچوں کی شادی کے موقعہ پر روپیہ کو وقعت دی۔ نہ صورت کو۔ تعلیم البتہ انہوں نے ضرور دیکھی اور اس سے زیادہ تربیت، احول، خیالات اور خاندان۔ خواجہ فضل احمد صاحب شیدا دہلوی سے علامہ مغفور کے تعلقات اس زمانے سے تھے جب وہ ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں تھے دور پرے کی کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ چچا محمد احمد خاں صاحب ان کے چھوٹے بھائی اس میں شک نہیں نہایت شریف الطبع انسان تھے۔ وہ بھی اس دفتر میں ملازم تھے۔ گھر اور مسجد کے علاوہ کہیں آتے جاتے نہ تھے۔ چچا فضل احمد صاحب نہایت دلچسپ بزرگ ہیں اور بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ چچا محمد احمد کم سخن کم گو کم آمیز تھے۔ چچی صاحبہ یعنی ان کی بیوی شاہ جہاں پور کی ہیں۔ بڑے رکھ رکھاؤ کی۔ محنتی۔ جفاکش سلیقہ مند۔ ان کی جٹھانی بڑی چچی صاحبہ اپنے شوہر خواجہ فضل احمد صاحب کی طرح نہایت زندہ دل اور دلچسپ۔ اس گھرانے کی ایک بات جو اس زمانے میں بہت ہی کم نظر آئے گی یہ تھی کہ ایک ہی گھر میں دونوں جٹھانی دیورانی نے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ دو چار سال نہیں

[illegible] نے اکٹھے گزار کر دکھا دیا کہ اصل عزّت خاندانی ہے۔ اور اتحاد و اتفاق سے اس کا برقرار رکھنا جوہر [illegible]

۲۲ نومبر سنہ ء کو نفیس بیگم سلمہا سے صادق میاں [illegible] اور دلّی کے دستور کے مطابق بعد نکاح مٹھائی [illegible] کی چاندی کی ڈلیاں (طشتری میں رکھی رومال میں بندھی) [illegible]ہیں۔ نکاح مرحوم یعقوب بیگ ٹھیکہ دار کے [illegible] میں ہوا تھا۔ جو واحدی صاحب کے مکان کے برابر [illegible] اس محلّہ کے بہت بڑے مکانوں میں سے تھا۔

حضرت والد مغفور کے پھوپی زاد بھائی مولانا [illegible] حسین صاحب عرشی دہلوی نے سہرا لکھا تھا۔ آپ کے [illegible] بڑے ہی دلآویز ہوتے تھے۔ عم مکرم مولوی عبد الغفار صاحب کے بڑے بیٹے بھائی عبد المالک کی شادی پر جو سہرا انہوں نے لکھا تھا اُس کا ایک شعر یہ تھا۔

عورتوں کی ضرورت کیا ہے حق ہے خدیجہ کا
جو باندھے گی دولہا کے۔ دولہا کی بہن سہرا

صادق میاں کا سہرا بھی اُنہوں نے بڑی محبت سے لکھا تھا۔ ایک شعر یہ تھا

مبارک صادق الخیری کا سہرا راشد الخیری
دکھائے مقصد کا بھی تم کو ربّ العالمین سہرا

دلّی کے دستور کے مطابق عید بقرعید پر صادق میاں کا حصّہ ان کی سُسرال سے آتا تھا۔ یہ تین چار بڑی بڑی سینیاں جا[illegible] زرتار خوان پوشوں سے ڈھکی پھل مٹھائی وغیرہ سے بھری ہوتیں اور یہ حصّہ سارے کنبے میں نہیں تو اُن عزیزوں میں تقسیم کیا جاتا جو گود پیٹ کے کہلاتے تھے۔ اس قسم کے حصّے ہمارے ہاں بھی آتے تھے۔ سمدھیانے سے ناشپاتیاں اگر ۲۴ آتیں اور حصّے تقسیم کئے جاتے ۴۸ تو آدھی آدھی ہر حصّہ میں آتی تھی۔ والد مرحوم اس طرح کی تقسیم پسند نہ فرماتے تھے۔ صادق میاں کی سُسرال سے اگر چار چار درجن کیلے سنگترے سیب آتے اور حصّے ہوتے ۴۸ تو وہ ایک ایک درجن چیزیں خود بازار سے منگواتے اور اس کی قسم کی پرواہ نہیں کہ سمدھیانے سیب ۵ روپیہ درجن کے آئے اور وہ ۳ روپیہ درجن کے منگواتے۔ آدھے پاؤ یا سوا ڈیڑھ کے وہ قائل نہ تھے۔ ہر چیز دو دو تین تین یا کم سے کم ایک ایک ہر حصّہ میں رکھواتے تھے۔ رحلت سے چند روز قبل آخری عید پر سمدھیانے سے جو پھل مٹھائی وغیرہ آئی تھی اپنے سامنے تمام فہرست بنوا کر اس میں سے ایک ایک حصّہ خود لگوایا اور بھجوا دیا تھا۔

حضرت علامہ مغفور کا خیال تھا کہ ۳۳ء میں نفیس انٹرنس اور ۳۵ء میں صادق میاں بی اے کر لیں گے تو دو ماہ کو کسے آئیں گے۔ مگر شادی والد مرحوم کی رحلت کے ڈھائی سال بعد سنہ ء میں ہوئی۔

شکار کا شوق

علامہ مغفور بہت ہی نرم دل انسان تھے انہوں نے اپنے ہاتھ سے شاید مرغی بھی کبھی ذبح نہیں کی۔ بقرعید پر قربانی کے بکرے آتے مگر خود چُھری نہ پھیرتے تھے۔ شکار کو وہ کبھی کبھی جایا کرتے تھے مگر بندوق کبھی نہیں چلائی۔ عم مکرم مولوی عبد الغفار صاحب نے اُن کی جوانی کا یہ واقعہ سُنایا تھا۔ شاید بلند شہر کی طرف کو ہم بیل گاڑی میں جا رہے تھے کہ ہرن کی ڈار نظر آئی۔ میں نے بندوق چلائی۔ ایک کالا گر پڑا تو تمہارے ابّا دوڑے ہوئے گئے اور ہم سب سے پہلے پہنچ گئے۔ مگر ہرن ذبح میں نے ہی کیا"۔ جب میرے پاس کار تھی تو جاڑوں میں کبھی کبھی میں شکار کو جایا کرتا تھا۔ تاکید یہ تھی کہ اپنے چچا یعنی مولوی عبد الغفار کے ساتھ جاؤ یا ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کے۔

ایک دفعہ ہم دلّی سے تیس چالیس میل دُور ایک

جھیل پر گئے تو علامہ مغفور بھی ساتھ تھے۔ چچا صاحب کا نشانہ بہت اچھا ہے اُنہوں نے کئی مرغابیاں ماریں۔ ایک دفعہ نیل ہرن کے شکار کو گئے جب بھی وہ ساتھ تھے۔ اتفاق سے چار ہرن ہم لائے تو دو ہرنوں کا گوشت غریب رشتہ داروں اور غریب محلّہ والوں میں تقسیم کروایا۔ گنگا پور وہ اپنی بڑی بیٹی کے پاس سال میں دو تین بار تشریف لے جاتے وہیں ان کے بھانجے داماد منشی مبارک علی مرحوم کسی ریاست کے ملازم تھے اُن کا نشانہ باوجود بڑھاپے کے بہت اچھا تھا۔ اُن کے پاس پُرانی طرز کی بندوق تھی جس میں بارود کاغذ وغیرہ رکھ کر گز سے ٹھونکنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی اُنہیں لے کر شکار کو جایا کرتے تھے۔ مگر بندوق کے شکار سے زیادہ انہیں مچھلی کے شکار کا شوق تھا۔ اور جب ہم ادھر جایا کرتے تھے تو ڈور کانٹا ضرور ساتھ ہوتا تھا۔ اور لڑکے بالے شکار کھیلتے تھے دو ایک دفعہ اُنہوں نے بھی مچھلی نکالی تھی۔ گنگا پور میں بھی تین چار میل دُور ایک جگہ تھی۔ جہاں مچھلی کا شکار ہوتا تھا مگر ناہموار اور کچا راستہ تھا۔ اس لئے پیدل جاتے تھے ایک دفعہ اُن کی بڑی نواسی نازلی عطیہ مت المغفور ساتھ تھی۔ ہوگی اس وقت کوئی دس بارہ برس کی۔ چلتے چلتے تھک گئی تھی اور روتی شکل بنی ہوئی تھی کہ ایک دیہاتی پاس سے گذرا۔ علامہ مغفور نے پیچھے سے ایک ہلکا سا چانٹا نواسی کے مار کر دیہاتی سے کہا "کیوں بھئی بچّی کو کیوں مارتا ہے" دیہاتی نے سُنا یا نہیں سُنا مگر نواسی دیہاتی سے لڑنے لگی اور وہ حیرت سے مُنہ دیکھنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ نواسی خفا ہو رہی تھی اور نانا ہنس رہے تھے۔ راستہ کی کوفت اس طرح ہنسی اور دلچسپی سے وہ دُور کیا کرتے تھے۔

ایک ظالم کے پنجہ سے مظلوم عورت کی رہائی

کوٹلہ فیروز شاہ ہمارے گھر سے تھوڑی دُور تھا۔ علامہ مغفور اکثر شام کو ماموں صاحب عارف صاحب اور خواجہ فضل احمد صاحب کے ساتھ بغرض تفریح وہاں جایا کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے یہ چاروں ٹہلنے میں مصروف تھے کہ علامہ مغفور نے ایک دم مڑ کر دیکھا اور کہا کسی عورت کی آواز ہے۔ چلو چل کر دیکھیں۔ جا کر دیکھا تو واقعی ایک عورت کانوں میں سونے کی بالیاں اور گلے میں سونے کی کنٹھی پہنے مَنت کا چراغ جلانے آئی تھی اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا وہ کھیلتے کھیلتے کہیں دور چلا گیا تھا۔ کسی شخص نے دیکھ لیا کہ یہ بالیاں اور کنٹھی پہنے ہوئے اکیلی عورت ہے وہ نہایت درد کے ساتھ آواز سے رہی تھی "ارے بھولو" جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس کا بھولو تو وہاں نہ تھا۔ مگر ایک آدمی اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس رہا تھا ان چاروں کو دیکھتے ہی وہ آدمی بھاگ گیا۔ علامہ مغفور نے اس کے بچے کو تلاش کیا اور نہایت ہمدردی سے سمجھایا کہ کبھی اکیلی مت آیا کرو۔ دو چار عورتیں مل کر آؤ یا کسی مرد کو ساتھ لایا کرو۔ وہ بے شمار دُعائیں دینے لگی۔ علامہ مغفور نے اس کے گھر تک اسے پہنچایا اور آ کر سارا واقعہ اماں جان کو سُنایا اور یہ کہا تھا۔

"لو جی آج ایک عورت کی جان اللہ نے بچوا دی"۔

ایک شریف خاندان کو پناہ

علامہ مغفور کی چھوٹی بیٹی واجدہ بیگم لکھتی ہیں:۔

"یہ تو مجھے یاد نہیں کہ طاعون کس سن میں پھیلا تھا۔ یہ یاد ہے کہ بخیرن کی اماں اور نصیر خاں اپنے چار بچوں کو لے کر ابا جان کے پاس آئے تین لڑکیاں تھیں اور ایک چھوٹا سا لڑکا اب مجال تھی کہ وہ شریف بی بی کسی اور گھر میں قدم رکھتیں۔ نصیر خاں کو تو ابا جان نے دفتر میں جگہ دے دی اور بخیرن کی اماں اماں جان کے ساتھ رہنے لگیں۔ اپنے

سڑک پر ٹہل رہے ہیں۔ آٹھ دس سال کے بچے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے چپکے سے ایک بچے کے ہلکا سا چانٹا لگایا اور آگے بڑھ گئے۔ لڑکا گھبرا کر والے نے مارا ہے اس نے ایک تھپڑ اُس کے رسید کیا۔ اس نے بھی اس کا جواب دیا دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ اب معصوم علامہ پرے کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ پھر خود ہی پلٹے، بیچ بچاؤ کیا اور کچھ پیسے بھی دیئے۔

میں نے ان کی خوش طبعی کا یہ رنگ ایک دفعہ دیکھ لیا تو فرمایا۔

"انگریز اسی طرح ہندو مسلمانوں کو لڑاتا ہے"۔

قوالی کی محفلیں

علامہ مغفور محفلِ سماع میں شرکت کے لئے شاید کبھی کہیں نہیں گئے۔ لیکن کبھی کبھی خود اُن کے ہاں قوالی ہوتی تھی۔ مگر وہ باہر محفل میں آکر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ صحن کی اوٹ میں زنانخانہ میں بیٹھے ہوئے سنا کرتے تھے اور کوئی چیز رسول اللہ صلعم کی شان میں گائی جاتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ میں نے اس شعر پر

خاکِ احمد کے در کی خدا کی قسم
ہم تو سُرمہ بنا کر لگاتے جائیں گے

اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔

اور جوانی میں اپنے خالہ زاد بھائی چچا جمو مرحوم سے بارہا فرمائش کرکے یہ سنتے ہوئے دیکھا ہے۔

تمنا ہے درختوں پر تیرے روضہ کی جا بیٹھوں
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

قوالی کی محفل میں شگفتگی پیدا کرنے کے لئے وہ کرایہ پر بھی حال کھلواتے تھے۔ اور اس معاملہ میں ہمیں پیش پیش ہوتا تھا۔ ایک رسالہ میں سنے یہ واقعہ پڑھا تھا کہ قوالی کی ایک محفل میں کسی شخص کی اس شعر سے طبیعت بگڑ گئی تھی۔

مجھ کو جنگل میں اکیلا چھوڑ کر
قافلہ مضطر روانہ ہو گیا

اور ایسی بگڑی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ حال سے بے حال ہو گیا سر پٹک پٹک کر مر گیا۔ میں سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ وجدانی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ تفریح اور تفنن کی غرض سے میں اپنے دفتر کے ایک کلرک کو کچھ روپے دے دیتا اور وہ احسان کے بجائے خوب حال کھیلتے۔ اور قوالوں کے گلے مل مل کر داد دیتے تھے میرا موٹر ڈرائیور بھورا بھی گانا سنا تا اور ایسی آوازیں نکالتا اور نقلیں کرتا کہ ہنستے ہنستے سب کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ وہ بھی حال کھیلا کرتا تھا۔ بھائی عبدالغفور مرحوم کے ایک دوست تھے خان صاحب اصغر علی خاں مرحوم۔ نماز روزے کے سخت پابند۔ عمدہ کھانے کے بے حد شوقین اور بعض نہایت لذیذ چیزیں پکانے کے ماہر۔ ان کا کمال یہ تھا کہ ہر رنگ کی محفل میں رنگ جما دیتے تھے۔ میں انہیں آگرہ سے تار دے دے کر بلایا کرتا تھا۔ قوالی کی ایک محفل میں وہ حال کھیلنے کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ ساری محفل۔ وہ جھومتے جھلتے ہاتھ ہلاتے حلقہ کے اندر چل رہے تھے جب ایک بے تکلف دوست کے قریب پہنچے تو اس نے کہا "اماں خاں صاحب کیوں بن رہے ہو"۔ خان صاحب نے سنا اور آگے بڑھ گئے۔ چکر پورا کر اب جو اُن دوست کے قریب پہنچے تو جھومنے کی حالت میں ہاتھ تو پھیلے ہوئے تھے ہی سیدھا ہاتھ ذرا اونچا کر "بے خودی" کے عالم میں اُن کی گردن پر جڑ دیا۔ علامہ مغفور چلمن کی اوٹ میں سے یہ سب تماشے دیکھا کرتے تھے۔

چیف کمشنر سے نہیں ملے

والدہ مرحومہ کے منجھلے بھائی "سردار بہادر کپتان مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب سی آئی ای۔ او بی ای وغیرہ

...زنی حجاب کی توجہ طمانیت کی وجہ سے حکومت میں
...وقت تھی۔ ایک دن دلّی کے چیف کمشنر سرجان ہاسن
...مغفور کے ٹرسٹ کا ان سے ذکر کیا اور یہ بھی کہا ہوگا۔
...وقت نہیں ہوئی۔ منجھلے ماموں جان نے فرمایا میں ملاؤں
...بور لیستی ہیں۔ دوسرے دن منجھلے ماموں جان
...آئے تو والد مرحوم سے ذکر کیا۔ اور یہ بھی
...اسی روز چل کر صاحب سے مل لو۔ غرض چلا۔ تو ہو
...گئے۔ فرمایا "بہرحال اور قیمتی عصمت اور سنبل کا
...[illegible] حاصل کرنے کے لئے مجھے ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں
...باضابطہ حاضر ہونا پڑا۔ میری غرض تھی جانے پر مجبور
...ہاسن صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو شوق سے
...جب بھی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ اپنے
...کے پاس ایک کرسی ان کے لئے بچھوا دوں گا ——
...میاں کے ملاقات کے کمرے میں گئی اُن سے ملنا مناسب
...رکھا۔" علامہ مغفور تو چھوڑ دوں کی خوشی بھی پوری کر دیتے
... منجھلے ماموں جان تو رشتہ میں بڑے تھے اور عمر میں بھی
...ایک سال گر چیف کمشنر کی ملاقات کے لئے جانا انہوں نے
...فرمایا۔ تین چار دن بعد پھر منجھلے ماموں جان نے یہ ذکر
...تو ہنس کر مومن کا یہ مصرع پڑھا۔

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

سنہ [illegible] میں جنوبی افریقہ کے ایک سیٹھ صاحب کو
...کا جو جواب لکھا تھا اُس میں اِس واقعہ کا خود بھی مختصر
...ذکر فرمایا تھا۔

ٹونک کے چند گھریلو واقعات | راجپوتانہ میں ایک چھوٹی سی ریاست مسلمانوں کی

...ٹونک۔ علامہ مغفور دو تین مرتبہ وہاں تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ
...والدہ مرحومہ کے اور میرے علاوہ ماموں شاہ امان الرحمٰن صاحب
بھی ساتھ تھے۔ ٹونک گئے تو بھائی نور الحسن کے پاس [illegible] قیام
کیا جو رشتہ میں علامہ مغفور کے بھانجے تھے۔ بھائی [illegible]
تب ہم ٹونک کے چند اوقات [illegible] —— سابق نواب
ٹونک کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ عبدالوہاب خاں مرحوم کے زیر
عدالت [illegible] دونوں وقت کا کھانا [illegible] آتا تھا پہلے روز
[illegible] میں [illegible] سخت تھی [illegible] ایک لقمہ منہ میں رکھ
کر فوراً تھوک دیا اور [illegible] اس وقت صاحبزادہ صاحب
مرحوم کے نام رقعہ لکھوایا کہ [illegible] کا شکر گذار رہتا ہوں
[illegible] سخت [illegible] جتنی [illegible] کی بجائے پھیکے
کھانے عنایت فرمائے۔ [illegible] صاحب نے منع کیا لیکن آپ نے
فرمایا "میں صاف گوئی کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں مگر [illegible] کا
معاملہ تھا [illegible] صاحب صاحبزادہ مرحوم سے [illegible] کر خود
معذرت کی وہاں معلوم ہوا کہ کھانا سرکاری مہمان خانے سے
نہیں آتا بلکہ وہ خود بھیجتے ہیں۔ علامہ نے اپنی صاف گوئی کے
مقابلہ میں مصلحت کا بھی خیال نہ کیا جب ہی تو انہیں گورنمنٹ سے
کوئی خطاب نہیں ملا۔ ورنہ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کو شمس العلماء
کے خطاب سے سرفراز نہ کیا جاتا۔ آپ کا کھانا برابر آتا رہا مگر ایک
وقت تک نہ دیکھا۔ میں ہی خوان کھول کر دکھا دیا کرتی تھی اور
آپ دیکھ کر فرمایا کرتے تھے "ابھی اپنے نوکروں چاکروں میں تقسیم کرا دو"
پہلے روز شام کو مجھے اپنے پاس بلا کر دریافت کیا اور یہ بھی
تو بتاؤ کہ خدانخواستہ گھر میں کسی کو سوء ہضمی کی شکایت ہو تو تم
لوگ کیا پیتے ہو میں نے عرض کیا ٹونک میں نل نہیں ہیں کنویں
ہیں ان کا پانی ہاضم ہوتا ہے۔ اس پانی کو سوڈا واٹر سمجھئے
آپ نے فرمایا کیا ریاست بھر میں کوئی سوڈے کی دوکان نہیں
میں نے کہا صرف سرکاری مہمان خانے سے سوڈا مل سکتا ہے۔ فرمایا
تمہاری حالت [illegible] ہے۔ میں نے رات کے آٹھ بجے سرکاری
مہمان خانے سے سوڈا منگوایا اور چپراسی کو آئندہ روز لانے

کی حمایت کی۔

ایک روز مجھ سے فرمایا کہ اب تمہارے امتحان کا وقت ہے۔ مچھلی پکا کر کھلاؤ۔ میں نے مچھلی پکائی۔ آپ باہر بیٹھک میں تھے جب گھر میں تشریف لائے تو میں باورچی خانہ میں تھی وہیں سے فرمانے لگے بھئی مچھلی کی خوشبو سے گھر مہک رہا ہے۔ یاس ہوتی معلوم ہوتی ہے کھانے پر بہت پسند کی اور تعریف کر کے بہت ہمت افزائی فرمائی۔ اپنی زبان سے تعریف کرنے پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ مامانی جان صاحبہ اور رازق بھائی سے کہتے تھے بر کو بھی ہے۔ میری موجودگی میں آپ پہلی دفعہ تشریف لائے تھے اس لئے مجھے بہت لحاظ آتا تھا۔ دو تین وقت میں کھانے کی میز پر نہیں بیٹھی تو آپ نے بلایا اور کہا میرے ساتھ بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔ اور جب تک میں ہوں ہمیشہ ساتھ کھاؤ۔

تلن پاؤ کے ٹکڑے میں اچھی طرح نہیں پکا سکتی تھی۔ برلاس صاحب نے ہاتھ بٹایا اور بہت عمدہ ٹکڑے تیار ہو گئے جب کھانے پر ماموں جان کے سامنے آئے تو آپ میری تعریف فرمانے لگے۔ رازق بھائی بول اٹھے یہ بھائی صاحب کی کرامت ہے۔ وہ دوپہر بھر باورچی خانہ میں رہے اب تو بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے یہ نہ سمجھنا کہ ہمارے خاندان کے مرد ٹھوٹ ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے سوا یہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ پھر میری خوشدامن صاحبہ مرحومہ کی تعریفیں کرنے لگے کہ وہ بڑی لائق تھیں۔ بے انتہا ہنرمند کیوں نہ ہو انہیں کے بیٹے ہیں۔ جب میں نے کہا حلوے ایسے بنانے ہیں کہ ٹونک بھر میں مشہور ہیں اور مردانہ پاجامہ بھی کترنا جانتے ہیں اس پر ہنسی کے مارے دوہرے ہو گئے۔ کہنے لگے تم نے بھی کچھ سیکھا۔ میں نے کہا حلوے بنانے میں شاگرد بنی تھی مگر پوری طرح نہیں۔ فرمانے لگے میاں بیوی میں شاگردی نہیں چلتی۔

ایک دفعہ سب مل کر ایک سیرگاہ میں گئے دو بہلیاں منگوائیں۔ یہی ٹونک کی سواریاں ہیں۔ ایک بہلی میں عورتیں تھیں دوسری میں مرد۔ جب وہاں پہنچے تو سواریاں چھوڑ سیر گشت میں مشغول ہو گئے۔ چلنے پھرنے میں میرا ایک بندا گر گیا کہیں آپ کی نظر پڑی۔ مامانی جان سے کہہ کر اٹھوا لیا مجھے اس غفلت کی تنبیہ کرنی چاہتے تھے۔ ذکر نہ کیا۔ گھر واپس آئے۔ میرا ہاتھ کان پر پڑا۔ بندا ندارد۔

اتنے میں ماموں جان بھی آ پہنچے اور دریافت کیا کیا ڈھونڈ رہی ہو۔ میں تو خاموش رہی۔ مامانی جان نے کہا دلہن کے کان کا بندا گر گیا۔ بہت بگڑے فرمانے لگے عورتوں پر زیور کھونے کی مار ہوتی ہے۔ پہننے کا شوق ہے احتیاط کی نہیں جانتی۔ یہ برقع کا اتنا بھاری لبادہ کیوں لادا جاتا ہے۔ اس میں الجھ کر زیور گرنے لازمی ہیں۔ اب جھکتے کھڑی کیا دیکھ رہی ہو۔ میاں کا دم سلامت رہے اور خواہ تم کھونے سے باز نہ آنا۔ میں دم بخود کھڑی کی کھڑی رہ گئی مامانی جان کو ترس آیا اور دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں اشارے کئے۔ آخر ان کی مرضی پا کر مامانی جان نے کہا چلو اللہ مالک ہے مل ہی جائے گا۔ اس پر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ اور میں نے بے تاب ہو کر پوچھا کیا

"کیا آپ کو مل گیا ہے؟" وہ ہنس دیں اور بندا میرے حوالہ کیا۔

(ساقی راشد الخیری نمبر)

باب گیارھواں — آخری تصانیف اور بزم آخر

۱۹۲۰ء سے حضرت علامہ مغفور نے اپنی تصانیف کے [illegible] اشاعت فروخت کرنے بند کر دیے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد [illegible] بہت ہی کم لکھیں۔ کیونکہ تربیت گاہ بنات کی مصروفیات [illegible] تھیں۔ ۱۹۲۰ء سے ہم نے کتابوں کی اشاعت کا [illegible] انتظام شروع کر دیا تھا اور شب زندگی کے علاوہ [illegible] نظموں کا مجموعہ، منازلِ ترقی، ایمن کا رحم و ابلیس [illegible] نوبت، نغمۂ شیطانی، تفسیرِ عصمت، [illegible] [illegible] منتظرِ ابلیس، مجموعہ افسانے اور جوہرِ [illegible] [illegible] ثانی عشرہ، سیلابِ اشک۔ قلبِ حزیں، [illegible] [illegible] سیدہ مغرب۔ وداعِ خاتون، مطبوعہ افسانوں اور مضامین [illegible] سے ۱۹۳۰ء تک شائع کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ کئی تصنیف [illegible] اور صبحات صالحہ اور انگوٹھی کا راز۔ دو تصانیف کے [illegible] واپس لے کر ان کے جدید ایڈیشن شائع کیے۔

اگست ۱۹۳۴ء میں حضرت علامہ مغفور نے

وداعِ ظفر!

وداعِ ظفر یعنی آخر تاجدار مغلیہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کی پانچ نوبتیں لکھنی شروع کی تھیں اور پہلی نوبت گنگا پرشادی میں لکھ دی تھی کہ پہلے خاتونِ اکرم جیسی بیاہی بہو اور پھر خالق الخیری جیسے ہونہار سعادت مند بیٹے کے صدمات اٹھانے پڑے۔

"بھلا میں اس وقت کچھ لکھنے کے قابل ہوں ۴ نومبر کو رازق [illegible] ۲۶ جون کو میاں خالق، یعنی انھوں نے سات مہینے میں دو جوان بچوں کو قبر میں سلا دیا۔ تم ہی بتاؤ اس دل کی کیا کیفیت ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ دو جوان جنازوں کا گھر سے نکل جانا معمولی بات نہیں ہے۔ جوان بھی نہیں کہ چلیں، جوانی دیکھیں۔ سینکڑوں ارمان ساتھ لے گئیں اور مجھ کو زندہ در گور کر دیا۔"

(وداعِ خاتون ساتواں ایڈیشن صفحہ ۲۲)

دوسری نوبت ۱۹۳۶ء تک لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ۱۹۳۶ء میں جب ہم نے بہت اصرار کیا تو دو ماہ میں کتاب پوری کر دی۔

آخری نوبت کا کچھ حصہ مصنف مرحوم نے اپنے بعض دوستوں کو سنایا تھا۔ اس صحبت میں خواجہ حسن نظامی مرحوم۔ ملا محمد واحدی صاحب۔ مولانا عارف ہسوی اور خواجہ فضل احمد صاحب شہید تو ضرور تھے۔ مجھے خیال نہیں کہ مرحوم آصف علی بیرسٹر موجود تھے یا نہیں۔ ان بزرگوں کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں جاری تھیں۔ مصنف مرحوم دو ڈھائی گھنٹہ تک ان درد مند دوستوں کو رلاتے رہے۔ دوسرے دن مصنف کو مشورہ دیا گیا کہ یہ نوبت بہت انتہا جوش میں لکھی گئی ہے۔ حکومت برداشت نہ کر سکے گی کتاب کے ضبط ہو جانے کا پورا اندیشہ ہے۔ مجھے اتنا خیال ہے کہ حضرت علامہ مغفور نے آخری نوبت میں کئی پیرے گراف کاٹ دیے۔ فقرے کے فقرے نکال دیے۔ اور سطریں کی سطریں بدل دی تھیں۔ کاش آخری نوبت بغیر ترمیم کے اُسی طرح شائع ہو جاتی تو غیر منقسم ہند میں اسلامی حکومت کے مٹنے اور مشرقی تہذیب کے اُجڑنے پر قیامت کا مرثیہ ہوتی!

نوبت پنج روزہ یعنی وداعِ ظفر پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ مصنف کو اپنی کتابوں میں وداعِ ظفر بہت عزیز تھی۔ جب میں اُن کی کتابوں کی مقبولیت اور نئے نئے ایڈیشن شائع ہونے کا ذکر کرتا تو وہ اس کتاب کے متعلق خاص طور پر دریافت فرماتے کہ کیسی نکل رہی ہے؟

نوبت پنج روزہ کے چند اقتباسات

"راتیں ہوئیں کہ ختم، اور وہ سماں درہم برہم ہوا۔ پیاری پیاری صورتیں آنکھ سے اوجھل ہوئیں اور ہنس مکھ چہرے قبروں میں جا سوئے مگر صحبتِ شب کی یادگار ابھی کچھ داغ دل پر باقی ہیں! شمع بجھ چکی لیکن دھواں اٹھ رہا ہے۔ پھول مرجھا چکے مگر نکہت موجود ہے۔

ہاں اے سرزمین شاہجہاں آباد کیا ہوئی وہ رات جس میں تو دلہن بنی اور کہاں گئے وہ ہاتھ جنہوں نے تجھ کو لباسِ عروسی پہنایا۔ تیرا سہاگ اجڑ گیا مگر تیرا رنڈسالہ ابھی اُس چاند سی صورت کا نشان دے رہا ہے جس کو غدر کی شب نے خاک میں سلا دیا۔ تیری صورت بگڑ گئی لیکن تیری بربادی ابھی اُس نوشہ کا مرثیہ پڑھ رہی ہے جس نے تاجدارانِ مغلیہ کی لاج رکھی۔"

(دیباچہ کا پہلا صفحہ)

"جامع مسجد سے مغرب کی اذان کا غلغلہ بلند ہوا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل ہے "اللہ اکبر" کے ختم سے پہلے کہاروں نے جس جگہ تھے وہیں تام جھام رکھ دیا اور سب دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں پناہ اذان کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئے۔ کفش بردار نے فوراً زیرپائی سامنے رکھی۔ جہاں پناہ نے جوتی پہنی اور مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ قلعہ معلی کے کنگرے اور جامع مسجد کی برجیاں یہ تماشہ دیکھ چکی ہیں۔ آگے آگے دولھا پیچھے پیچھے برات، مغرب کی نماز کو جا رہے ہیں۔ مسجد میں داخلہ ہوا۔ یہاں تعظیم و ادب سب معاف ہیں۔ جہاں پناہ نے خود ہی فرمایا "سلام علیک" حوض پر تشریف لائے۔ کلی کی۔ خواص نے دست پاک کر دیا۔ ہاتھ پونچھے۔ استادوں کے ساتھ صف میں آ شامل ہوئے نماز ختم ہوئی، سلام پھیرا، دعا مانگی۔ جہاں پناہ اُٹھ کھڑے ہوئے تو "اللہ اکبر" کی متفقہ صدا سے مسجد گونج اُٹھی۔ قلعہ کی سڑک اب روشنی سے جگمگا رہی ہے سونے چاندی کے عصا اور برچھی بھالے چمک رہے ہیں۔ بادشاہ تام جھام میں بیٹھے۔ پیش خواص نے آواز دی
"اقبال زیادہ آگے بڑھو"

(معمولی دن آخری صفحہ)

"ہیوڈسن اور ولسن دونوں بادشاہ کے قتل پر آمادہ تھے اور اگر یہ آمادگی پوری ہو جاتی تو صرف اس بدبخت کا پردہ ڈھک جاتا بلکہ بہت سے افکار و آلام سے رہائی ملتی لیکن نظر بند گرفتاری کی تجویز ہوئی اور دوپہر تک ہیوڈسن مع پچاس مسلح سپاہیوں کے مقبرہ کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ یہ وہ درد انگیز منظر تھا جس کا خیال دل کپکپا دیتا ہے۔ غریب شہزادیاں جنہوں نے گورے کی صورت تک نہ دیکھی تھی تھر تھر کانپنے لگیں۔ معصوم بچے کونوں میں گھس گئے۔ زینت محل بادشاہ بیگم نے شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ بادشاہ نے رو رو کر بیوی کو اور لپٹا لپٹا کر بچوں کو خدا کے سپرد کیا۔ اپنے چھوٹے بچے جواں بخت کو حسرت سے دیکھا۔ پاس بلایا کچھ پڑھ کر دم کیا اور اس طرح رویا کہ جواں بخت کی ہچکی بندھ گئی۔ ہیوڈسن کے تقاضے برابر آ رہے تھے۔ لاچار بادشاہ باہر نکلا اور اس کے پیچھے پیچھے بادشاہ بیگم اور جواں بخت پالکی میں بیٹھے ..... جاں بخشی کے سلسلے میں ہیوڈسن نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ "میں بادشاہ کو زندہ لانے کی بجائے مردہ لانا زیادہ پسند کرتا تھا" تاہم ان الفاظ کے ساتھ یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ "بادشاہ بے گناہ تھا اور بغاوت میں عملی حصہ لینے سے بری" سلطنت مغلیہ کے اس تاجدار نے جس کو وائسرائے نذر دیتا تھا اس وقت جنرل ولسن سے ملنے کی خواہش کی مگر پوری نہ ہوئی اور بہادر شاہ لال کنوئیں پہ

...بارت میں جو نوبت محل کے کمرے کے نام سے مشہور ہے
...ہو گیا اور پہرے لگا دیے گئے۔" (پانچویں نوبت)
...ماہ آسمان کے سیارے زحل و مشتری سے نحوست میں فلک
...ے تھے جو دہم نے مشرقی شہنشاہیت کا آفتاب ڈوب رہا ہے"
...ں دنیا کے بہت سے انقلاب دیکھے اور خورشید جلال
...ہوا۔ اگر آج تک اس تاریخ سے خشک نہیں ہوا۔
...سے تیرہ و تار ہوگی اور قلب کے پیچھے اڑیں گے ...
...سے جیسا اندھیرا ہو جائے گی جب یہ سنے گی کہ جن دلیروں نے
...ہے۔ مارشل تھا ان کی حرمت بچانے والی خواتین کی قیمت
...رٹیاں یا سیر دو سیر آٹا تھا۔ دل نہیں چاہتا کہ لکھوں لیکن
...گر زبان پر وہ الفاظ آتے ہیں جو قلب کے ٹکڑے اڑا
...کس لیے ہوں اور رو کر کہتا ہوں۔ کتنا نازک وقت ہے
...وتھے یہ کیا رنگ دکھاتے ہیں کہ بیچارے بہادر شاہ
...زادوں کا شکار حسینی پور جیسے ہوتا ہے!!"

"تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"

...ن کے بعد جو عبارت ہے اس پر یہ آخری نوبت ختم ہوتی
... یہ عبارت برما کی آزادی اور پاکستان قائم ہونے کے بعد
بادشاہ کی قبر تلاش کرکے ایک پتھر پر کندہ کی گئی تھی، اور
اخبارات میں اس کا عکس شائع ہو چکا ہے عبارت یہ ہے۔

"آج ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو وہ بدبخت روح جو نواسی سال
بہادر شاہ کے جسم میں موجود رہی، زندگی کے تمام تماشے دیکھ کر
معراج کی تیاریاں کر رہی ہے۔ دن ڈھل چکا اور اس کے
ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو گیا۔ رنگون کی
خاک اس کو اپنے آغوش میں لیتی ہے جو خاندان تیموریہ کا
آخری چراغ تھا جس نے جہاں آباد میں جنم لیا وہ وطن سے
ہزاروں کوس دور ایک معمولی پلنگ پر دم توڑ رہا ہے سکرات
طاری ہے۔ سانس اکھڑ گیا۔ جس کی زندگی پیچ و خم کا سبب تھی
جس نے زندگی کا ہر لمحہ جشنوں میں گزارا آج مرتے وقت
آدمی ایک بیوی اور دو بچے اس کے دم واپسیں میں ساتھ
ہیں۔ آفتاب ابھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس بدنصیب بادشاہ
نے فانی دنیا کو اپنی حسرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ
کیا۔ بادشاہ جہاں آباد کا یہ گوہر آبدار رنگون کی خاک میں
ابدی نیند سو گیا۔" (ختم)

آمنہ کا لال

"ایک فرقے کی رائے ہے کہ مجلس میلاد کا منعقد کرنا بدعت
ہے ... دوسرے فرقے کی رائے ہے کہ رسول اللہ کی محبت
مسلمانوں کا جزو ایمان ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم مجالس
میلاد کثرت سے منعقد کریں ... اصل وہ چیز جس کی وجہ
سے یہ جھگڑا شروع ہوتا ہے حامیان مجالس میلاد کا غلو ہے
یعنی مجلس میلاد میں جس کتاب کا نام مولود شریف ہے
اس میں زیادہ تر یا غلط اور جعلی روایتوں کا ڈھیر ہوتا ہے
اس پر اعتراض کرنے والا خواہ وہابی ہو خواہ اہل حدیث حق
رکھتا ہے کہ وہ ان مجالس اور ان روایتوں کا مضحکہ اڑائے
سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت جبکہ کان کسی ایسی بات
کے قبول کرنے کے واسطے تیار نہیں ہیں جو مافوق الفطرت
یعنی فطرت انسانی کے خلاف ہو کیا ذکر ولادت میں کوئی
چیز بھی فطرت انسانی کے موافق نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے
تو انا بشر مثلکم یعنی میں تمہارا ہی جیسا ایک انسان ہوں
بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ اور اسلام جس کا دعویٰ تھا کہ وہ
دین فطرت ہے فلسفہ کی ایک پھونک میں اڑ جائے گا۔
مولود خواں منبر پر بیٹھ کر یا آراستہ پیراستہ تخت پر تشریف
فرما ہو کر اپنی یا اپنے ہمراہیوں کی خوش الحانی سے سامعین
کے دل مسخر کر سکتا ہے مگر وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس تیجہ کی تہ میں

اس نے اسلام کو کس قدر نقصان پہنچایا اس نے جھوٹی اور لغو روایتیں بیان کیں۔ مسلمان ٹھیک اس پر جھومنے لگے مگر ہوا ان کو سند مل گئی اور وہ لیپ کر آئیں کہ سچے مسلمانوں کی گردنیں جھک گئیں اور مقابلہ تو درکنار ان سے بات کرنے کی بھی طاقت نہ رہی مگر حقیقت یہ ہے کہ مولود خواں غریب کا چنداں قصور نہیں وہ جب تک ان لغویات کا ڈھیر نہ لگا دے اور گنگری اور تانوں کو آسمان تک نہ پہنچا دے۔ نہ صاحب خانہ مطمئن ہوتا ہے نہ حاضرین۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج مجالس کا رنگ بدل جائے اگر مولود شریف میں ان لغویات کو چھوڑ کر رسول کریم کی پاک زندگی کے سچے واقعات بیان کئے جائیں تو بانی مجلس اور حاضرین مجلس مطمئن نہ ہوں گے اور شاید ان کی رائے میں اس مجلس کا نام مولود کی مجلس ہی نہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ میں نے گذشتہ سال بھی کہا تھا کہ سرور کائنات کا روز پیدائش حق رکھتا ہے کہ ہر مسلمان اس دن اظہار مسرت اور مجالس میلاد منعقد کرے۔ ۔ ۔ مگر اشد ضرورت ہے کہ مسلمان جس طرح بھی ممکن ہو اس موضوع پر ایسی کتابیں فراہم کریں جو لغویات سے قطعاً مبرا ہوں۔"

یہ اقتباس حضرت علامہ مغفور کے اس مضمون سے ہے جو اکتوبر ۱۹۲۵ء کے عصمت میں شائع ہوا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کائنات صلعم کے حالات پاک بیان کرنے میں خطیبن اور مولود خواں کس قدر غلط بیانی سے کام لیتے یعنی مضحکہ خیز جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے بڑودہ میں حضرت علامہ مغفور کے لیکچر کا اعلان ہوا تھا۔ کئی ہزار کا مجمع تھا اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے پہلے ایک مولوی صاحب نے وعظ فرمایا اور رسول اکرم کے نکاحوں کے سلسلہ میں فرمایا کہ حضور میں سو آدمیوں کی طاقت تھی جب ہی اتنے سارے نکاح کئے۔

میں اس موقع پر موجود تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ہندو ان مولوی صاحب کی ان باتوں پر مسکرا رہے تھے۔ علامہ مغفور کے لیکچر کا موضوع تھا مسلمان عورت۔ انہوں نے سب سے پہلے ان مولوی صاحب کی لغویات کی تصحیح فرمائی اور حاضرین کو بتایا کہ اسلام میں تعدد ازدواج کا مطلب کیا ہے پھر فرمایا کہ طاقت کا سوال تو اس وقت پیدا ہو جب ذاتی ضرورتوں سے رسول اللہ نے نکاح کئے ہوتے۔ پہلے دو نکاحوں کو چھوڑ کر کہ اس میں بھی بی بی سودہ بڑھیا تھیں کوئی نکاح دنیاوی اغراض سے کیا ہی نہیں اور پھر اس کی شرح بیان فرمائی اور بتایا کہ ان نکاحوں کی کیا مصلحت تھی اور ان سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا۔ آخر علامہ مغفور نے خود ہی نومبر ۱۹۳۵ء میں آمنہ کا لال یعنی مولود شریف کی کتاب شروع کی۔

"مولود شریف کی سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکیں اور ہو رہی ہیں۔ مگر میری رائے میں مسلمان لڑکیوں کے واسطے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو رطب و یابس سے بالکل پاک ہو۔ اور نہ صرف ان ہی کو مطمئن کر سکے بلکہ وہ اپنی مجلسوں میں غیر مسلموں کے سامنے بھی اپنے رسول کو پیش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کتاب میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے یقین میں قیاس تامل کر سکے اور یہ حقیقت بھی ہے"

اس کتاب کی یہ خصوصیت بیان کرتے ہوئے علامہ مغفور نے دو باتیں اور بھی تحریر فرمائی ہیں۔

(۱) "استعارے اور تشبیہ مصنف کا جائز حق ہے اس کو مبالغہ سمجھنا غلطی ہوگی۔"

(۲) "میں شاعر نہیں ہوں مگر میں نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں ایک مصرعہ بھی کسی دوسرے کا شامل نہ ہو۔ اس لئے یہ غلط سلط اور ٹوٹے پھوٹے اشعار محض میرے جذبات ہیں جن کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس کتاب کی ضخامت سو اسو صفحوں سے بھی کم ہے

بڑھ رہا تھا کہ آمنہ بی بی کے پہلو میں ننھے بچے کے رونے کی
آواز بلند ہوئی جس پر دُنیا کے قہقہے قربان تھے۔ فضائے آسمانی
کی تاریکی نُور سے بدلی۔ رات نے دن کا لباس پہنا اور آسمان
نے زمین کے کان میں دلی مبارکباد پیش کی۔ شگن کے خوش
الحان طائر معروف نواسنجی تھے۔ قریش کی عورتیں لڑکے
کی پیدائش پر باغ باغ ہوئیں۔ عبدالمطلب نہال نہال
تھے اور آمنہ بی بی کی باچھیں کھل رہی تھیں"۔ (صفحہ ۳۴)

" رسالت اور صداقت کا فرق مسلمانوں کو غار ثور نے بتایا
اور ہم نے اس کسوٹی پر دیکھا کہ افضل البشر اور رسول ہاشمی
میں کیا فرق تھا۔ فطرتِ انسانی دونوں دلوں میں کام کر رہی
تھی۔ چنانچہ حضرت صدیق نے فرمایا کہ اعدا کی تعداد زیادہ
ہے اور ہم دو ہیں رسالت مآب کا جواب یہ تھا کہ
" ہم دو نہیں ہیں۔ تیسرا ہمارے ساتھ خدا ہے" صہ۸

" گرمی کے سخت موسم میں جب آسمان سے انگارے برستے
معمولی بڑھیا دونوں جہان کے بادشاہ کو لے کر سڑک میں
بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں باتیں کرتی جھاپیں بجبیں ہونے لگر
حضور کی تیوری پر بل نہ آتا۔ بڑھیوں کھڑیوں کا گروہ کا
گروہ خدمت اقدس میں بیٹھکر ادب سے اپنے حقوق مانگتا
عاجزانہ لڑتا جھگڑتا۔ بچوں تک کا حق طلب کرتا۔ دیکھنے اور
سُننے والے جلتے اور بگڑتے مگر وہ نفس پاک خندہ پیشانی سے
اُن کی التجائیں پُوری کرتا۔ غریب رانڈیں اور مصیبت ماریاں
روتی ہوئی آتیں اور ہنستی ہوئی جاتیں۔ شکایتیں لے کر
گھستیں اور دعائیں دے کر نکلتیں۔ دنیا اپنی اولاد اور متعلقین
کے واسطے ہزاروں کا اور لاکھوں کا اثاثہ چھوڑتی ہے مگر
سرورِ دوعالم کا وہ ایثار جو شہر رسالت کی بارآور شاخوں
میں بی بی خدیجہ کی دولت سے شروع ہوا۔ بنی نوع انسان
کی ہمدردی کے احکام زکوٰۃ اور خیرات و صدقات کا اعلان

ہونے کے بعد اس فیصلہ پر ختم ہوتا ہے کہ اولاد پر
پر یہ سب حرام ہے"۔ (صفحہ ۱۱۰)

اندھے کنویں عرب کے دامان کوہ وصحرا
شاہد ہیں اُس ستم کے جو لڑکیوں پہ ٹوٹا
صورت کی بھولی بھالی۔ باتوں کی جیسی مینا
زندہ دبیں گڑھوں میں۔ دَم تک مگر نہ مارا
عورت کی ہر حقارت، تھی مرد کو گوارا
گلّے کا جانور تھی۔ دانہ تھا اور نہ چارا

یہ بزمِ طرب اور خوشی کی گھڑی
مسرّت کی ہرسو لگی ہے جھڑی
عقیدت سے یاں دست بستہ کھڑی
مگر آنکھ تجھ بِن ہے سُونی پڑی
فدا تجھ پہ سو بار نسلِ علی
زمین و زماں تجھ پہ قربان ہو
ملائک سے ارفع تری شان ہو
تو دُنیا کا بے مثل انسان ہو
خدا تیرا حافظ نگہبان ہو
فدا تجھ پہ جاں جلد آ جلد آ

خدا کا فضل تھا انعام تھا نورِ خدا تو
شمع توحیدِ باری کی جو تیج پہ مجھو ضیا تو
ترے احکام نے ختم رُسل ساکت زباں
نہ ہوتا قتل گر تُنہ پہ تو بتلاتے کہ کیا
درود ہے تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ

زبان احسان اخلاق کہاں تک تیرے گنوائے
تیرے میں جو تونے پھول کھلا کے ان کو چنوائے
احسان کا دنیا میں بدلا ہے تو اب ہے
کر نہ تیرا خود سنے اوروں کو سنوائے
تجھ پہ اے مولا سلام ہے تجھ پہ اے آقا

سیدہ کا لال

جامع مسجد کے پاس اردو بازار تو بعد میں بنا کہ تاجران
کی دوکانیں پہلے دریبہ کلاں میں تھیں۔ اس بازار میں ایک
خاکسار نظام الدین صاحب کی بھی تھی۔ ان کے بیٹے
دین صاحب خاکسار نظامی میونسپل کمیٹی میں ملازم تھے اور
دوکان پر بیٹھتے تھے۔ جنوری سنہ میں ایک دن جو
مسجد میں سے جا رہا تھا تو بھائی محمد دین صاحب نے سلام علیک
تو مجھے اشارہ سے بلایا اور جب میں بیٹھ گیا تو ادھر ادھر
کی باتوں کے بعد کہا کہ مولوی صاحب سے کربلا کے حالات بھی
لکھوالو۔ میں نے کہا از سرا اور دوس کربلا میں کربلا کی داستان کم
انہوں نے کہا نہیں جس طرح مولوی صاحب نے مولود شریف
کی کتاب لکھی ہے اس طرح شہادت نامہ بھی لکھ دیں تو بہت
بکے گا۔

مولود شریف کی کتاب کی طرح شہادت کی ایسی کتاب
کی ضرورت پر بہت عرصہ سے سنیوں اور شیعوں کو علامہ
مغفور متوجہ فرما رہے تھے جس میں واقعات کربلا اس طرح لکھے
جائیں کہ کتاب غیر مسلموں کے سامنے بھی پیش کی جا سکے جس میں
محض عقیدت ہی نہ ہو بلکہ واقعات صحیح بیان کئے گئے ہوں
مارچ سنہ میں انھوں نے شہادت نامہ لکھنے پر آمادگی ظاہر
فرمائی تو میں نے شہادت کی بہت سی کتابیں جمع کر لیں مگر انہوں نے
ان کے مطالعہ سے قطعی انکار فرمایا۔ البتہ تاریخی واقعات اور
ان کی ترتیب نوٹ کرا دی گئی۔

اپریل سنہ میں قطب صاحب مہرولی میں کتاب
شروع کی تھی اور ڈیڑھ ماہ بعد آخر جون میں یہ مکمل تاریخ شہادت
ڈھائی سو صفحوں کی ضخیم کتاب ختم کر دی تھی۔ بالعموم ایک گھنٹہ صبح
اور ایک گھنٹے تیسرے پہر یا عصر کی نماز کے بعد کبھی کبھی دوپہر کو لکھنے
بیٹھتے تھے اور سینے میں درد اٹھتے تھے۔

کتاب اس طرح لکھی تھی کہ جب ایک بیان ختم کر لیتے تو فرماتے
آگے کیا لکھوانا چاہتے ہو۔ اور میں نوٹ سنا دیتا تھا۔

حضرت علی اکبر کی شہادت کے ۳ سلپ لکھے تھے میں نے
عرض کیا یہ تو بہت اہم شہادت ہے۔ ۳ سلپ تو بہت کم ہیں
فرمانے لگے اچھا کل دوبارہ لکھ دوں گا۔ دو دن بعد شہادت
علی اکبر کے ۱۰/۹ سلپ لکھ کر دئے تو غضب کا مرثیہ تھا۔

حضرت بی بی زینب کے بچوں کی شہادت لکھنے بیٹھے تھے
کہ سامنے گھر کے بچے جو ایک روز پہلے سینما میں تلوار کی لڑائی
دیکھ کر آئے تھے سرکنڈوں اور ٹین کی تیلیوں سے کھیل رہے
تھے یہ منظر مصور غم کے تخیل کو میدان کربلا میں لے گیا اور اسی
حالت میں عون و محمد کی شہادت کا مرثیہ لکھا۔

سیدنا حسین کی شہادت جس دن لکھ رہے تھے پسینہ
میں نہا رہے تھے پیاس کے مارے بری حالت تھی۔ دو دفعہ
برف کا پانی رکھے رکھے گرم ہو چکا تھا مگر پانی نہ پیا۔

یہ کتاب پہلی دفعہ جولائی سنہ میں شائع ہوئی تھی
اور پانچویں مرتبہ ۳۵ء میں۔ سیدہ کا لال دو حصوں میں منقسم
ہے پہلا حصہ تاریخ شہادت ہے۔ حضرت خدیجہ اور جناب سیدہ
کے اسلام پر احسانات اور خصائل اور سرور عالم کی رحلت کے
بیان کے بعد حضرت عثمان حضرت علی حضرت حسن کی شہادتوں
جمل اور صفین کی لڑائیوں کے مفصل حالات اور امیر معاویہ
کی سیاست اور یزید کی حکومت کا ذکر ہے اس کے مطالعہ سے

واقعہ کربلا کے اسباب ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

دوسرا حصہ مراثی کربلا ہے۔ واقعات کربلا کے بعد ابن زیاد اور یزید کے دربار کے حالات ہیں پھر قاتلان حسین کا انجام اور شیعہ سنی اختلاف پر تبصرہ ہے۔

سیدہ کے لال کے چند اقتباسات

"یہ روزہ دار لاش اس کی ہے جس کے احسانات کا میرے اور تیرے مولا نے اقرار کیا۔ تو نے دیکھا یا سنا ہوگا کہ جب مسجد نبوی میں جماعت کے واسطے جگہ تنگ ہوئی تھی رحمۃ اللعالمین نے بآواز بلند فرمایا "وہ کون اللہ کا بندہ ہے جو اس مسجد کو بڑھائے" اس وقت جس شخص نے زمین خرید کر وقف کی اور نمازیوں کے لئے مسجد بنوا دی وہ یہی امیرالمومنین تھا جو آج افطار کے وقت مسلمانوں کے ہاتھ سے بے گناہ شہید ہوا۔ تیرے کان آشنا ہوں گے یا آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ جب حضور اکرم یہاں تشریف لائے تو صرف ایک کنواں بیر رومہ یہودیوں کی ملکیت تھا جس سے مسلمان پانی پیتے تھے۔ جب وہ کنواں یہودیوں نے مسلمانوں کے واسطے بند کر دیا تو مسجد نبوی کی دیواریں صدائے رحمۃ اللعالمین کی شاہد ہیں۔ جب حضور کی آواز اس فضا میں گونجی کہ کون ہے جو بیر رومہ مسلمانوں کے واسطے وقف کر دے اور رحمت سے پیاسے مسلمانوں کو سیراب کرے، تو ارشاد نبوی کی تعمیل جس شخص نے کی اور کنواں خرید کر مسلمانوں کے حوالہ کیا وہ یہی امیرالمومنین تھا جس کی لاش خون آلود تیری آنکھیں دیکھ رہی ہیں جس کی پنڈلی کبھی دوستوں نے نہ دیکھی وہ آج بے گور و کفن ننگا دھڑنگا اس گھر میں پڑا ہوا ہے"

(حصہ اول۔ شہادت عثمان صفحہ ۱۰۵ اسود الدوش)

"جس وقت دونوں بچے خیمہ کے دروازہ پر پہنچ کر ماں کے آخری سلام کو جھکے تو دل کا قدرتی جذبہ امڈ آیا مگر ضبط سے کام لے کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر گلے سے لگا کر پیار کیا اور کہا "دنیا کی مائیں بچوں کو سدھارتے وقت دعا دیتی ہیں کہ جس طرح پیٹھ دکھائی اس طرح منہ دکھاؤ مگر عون و محمد کی ماں یہ کہتی ہے کہ جاؤ زندہ جاؤ اور شہید ہو کر آؤ۔ سر دے کر جاؤ اور سر کٹا کر آؤ۔ دیکھو میرے الفاظ یاد رکھنا عمر و سعد کو پتہ چل جائے کہ تم زینب کے بچے ہو"

(حصہ دوم۔ عون و محمد کی شہادت صفحہ ۲۰۹)

"شمر تیری آنکھیں پھوٹ جاتیں اس سے پہلے کہ زینب بنت علی پر نظر ڈالتا۔ زمین شق ہو جاتی اور میں سما جاتی اس سے پہلے کہ بے حجاب تیرے سامنے کھڑی ہوتی آج میرے معصوم چہرے کو تیری خونخوار نظروں سے بچانے والے شہید ہو چکے۔ جفاکار اپنی آنکھیں پھوڑ ڈال اور مجھ کو نہ دیکھ او سنگدل میں زینب بنت علی ہوں اس وقت میرا باپ علی اور میرے بھائی حسن اور حسین زندہ نہیں ہیں۔ او ملعون میرے دونوں بچے تیری فوج نے ذبح کر دئے۔ ملعون میرے سامنے سے ہٹ جا۔ میں رسول زادی ہوں اس رسول کی نواسی جس نے حاتم طائی کی قیدی لڑکی کو اپنے ہاتھ سے ردا اڑھائی تھی" (صفحہ ۲۸۹)

میلاد ناموں کی طرح شہادت ناموں میں بھی نہایت لغو سراسر غلط روایتیں جو عقل و قیاس سے ہزاروں کوس دور ہیں فخریہ بیان کی جاتی ہیں لیکن سیدہ کا لال کی شان کچھ اور ہی ہے۔ دیباچہ میں حضرت مصور غم خود تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں نے ایک واقعہ بھی ایسا نہیں لکھا جس کے تسلیم کرنے میں عقل سلیم کو تامل ہو۔ میں جانتا ہوں کہ بعض مسلمان مراثی نثر پر پہلا اعتراض یہ کریں گے کہ جو کچھ لکھا گیا یہ

خلق کے گیت گاتے ہونٹوں پر گزرے جو — اُن کو عمودِ رحمت کی گھڑی پہنا آئی
دامن میں اس کے موتی سیپوں میں گر کر جو — چادر ظلمت جہاں میں وقت لٹاتی آئی
دولت کے بیوپاری دم بھر میں گٹ چکیں گے — گلوکشت سے صبح صادق موتی لٹاتی آئی

جس طرح خیریت سے گذری یہ شب خدایا
یوں ہی یہ دن بسر ہو۔ قربان تیرے مولا

آخری مضامین

"ہندوستانی مسلمانوں میں اِس وقت لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ کسی اہم مسئلہ سے کم نہیں ہے۔ بہت کم خاندان ہوں گے جہاں والدین پریشان نہ ہوں کہ جوان لڑکیاں بیٹھی ہیں اور بر نہیں جُڑتا۔ لڑکیاں اِس معاملے میں دَم بخود ہیں۔ اور والدین بھی حالات کے تحت کرنے پر مجبور۔ لڑکیاں شادی کے وقت کیا کریں۔ مذہب اسلام نے اُن کو کیا حق دیا ہے۔ دُنیا کی ضرورتیں اور سوسائٹی اُن کو کس قدر اختیارات دے رہی ہے۔ یہ سب باتیں اُنہیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے بر کے انتخاب میں لڑکے کی مالی حالت اور حسب نسب کا تو خیال رکھا جاتا ہے۔ مگر لڑکے کی ذاتی شرافت' اس کی عادات وخصائل' اس کے طور طریقے' اُس کے خیالات اور توقعات' اُس کی عمر اور صحت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اسے اپنی ذمہ داریوں کا کس حد تک احساس ہے۔ اسلام نے بیوی کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں ان سے وہ کہاں تک باخبر ہے ان امور کی طرف بہت کم ذہن جاتا ہے۔ اسی طرح دُلہن کے انتخاب میں حُسن' دولت' اعلیٰ تعلیم کی تو تلاش ہوتی ہے مگر اس کی چھان بین نہیں کی جاتی کہ لڑکی خانہ داری کی ذمہ داریوں کو کس حد تک اٹھا سکتی ہے۔ وہ سلیقہ شعار' سگھڑ ہنرمند' منتظم' کفایت شعار بھی ہے یا نہیں۔ لڑکے کے اور اس کے خیالات' مذاق اور عمر میں اور لڑکے والوں اور لڑکی والوں کی معاشرتی حیثیت میں تو کچھ زیادہ فرق نہیں۔ یہ تمام اُمور ایسے ہیں کہ ان پر مفصل بحث کی سخت ضرورت ہے۔ خواتین ہند کے محسنِ اعظم نے اگرچہ مختلف تصانیف میں ضمناً ان پر بحث کی ہے۔ لیکن علیحدہ ایک مستقل کتاب اس موضوع پر اکتوبر ۳۵ء میں شروع فرمائی تھی۔ مگر ابھی ابتدائی ۸ صفحے ہی لکھے گئے تھے کہ بیمار پڑ گئے اور موت نے تکمیل کتاب کی مہلت نہ دی۔

اب ایک ہی صورت تھی کہ جس قدر صفحے لکھے جا چکے تھے اُن کے ساتھ عصمت کے تیس سال کے فائل سے تلاش کرکے اس موضوع پر حضرت علامہ مغفور کے زیادہ سے زیادہ مضامین جمع کرکے شائع کئے جائیں چنانچہ یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے۔ پہلا مضمون "اسلام میں بیوی کا درجہ" غیر مطبوعہ ہے اور اُس کتاب کی نامکمل تمہید ہے جو حضرت مصور غم مرحوم کے ذہن میں تھی اور صرف ۸ صفحے اکتوبر ۳۵ء میں تحریر فرمائے تھے۔"

(دیباچہ شادی کا انتخاب)

مئی ۳۴ء میں عصمت کے سالگرہ نمبر کے لئے علامہ مغفور نے افسانہ لکھنا شروع کیا تھا اور ۳، ۴ سلپ لکھ لئے تھے کہ اِدھر اُدھر ہو گئے دو دن تک بہت تلاش کئے وہ سلپ نہ ملے آخر ایک اور افسانہ تحریر فرمایا جو سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ یہ سلپ جو اُس وقت کھو گئے تھے کئی ماہ بعد کسی کتاب میں رکھے ہوئے ملے۔ مگر آگے ایک سطر بھی علامہ مغفور تحریر نہ فرما سکے اور چوں کے توں میرے پاس محفوظ ہیں۔

نومبر ۳۵ء میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم اور حکیم محمود خاں کی ایک ملاقات کا حال قلمبند کرنا شروع کیا تھا کہ بیمار پڑ گئے یہ نامکمل تین سلپ تھے۔ جو نغمۂ ناتمام کے عنوان سے بعد رحلت عصمت میں شائع کئے گئے اور پھر کتاب "بزم رفتگاں" میں

باب بارھواں — آخری ۴ سال ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء

حقوقِ اشاعت کی واپسی

حضرت علامہ مغفور نے مرنے سے [illegible] میں شبِ زندگی کا پہلا اور [illegible] میں دوسرا حصہ تحریر فرمایا اور اس دوران میں سُعاد تفس (نظمیں) اور جوہرِ عصمت (افسانے) دو مختصر سی کتابیں میں شائع کر چکا تھا [illegible] میں جب مجھے عصمت کے پورے اختیارات مل گئے تو میں نے کتابوں کی اشاعت کا کام تیزی سے شروع کر دیا۔ [illegible] میں مطبوعہ افسانوں میں سے کتابی صورت میں پانچ مجموعوں کا، اور پھر ہر سال اچھا خاصہ اضافہ ہوتا چلا گیا ایک طرف میں مطبوعہ افسانے اور مضامین کتابی صورت میں شائع کر رہا تھا تو دوسری طرف انتہائی خواہش یہ تھی کہ والد مرحوم کی کُل تصانیف کے حقوق واپس لے لوں مگر یہ بہت مشکل کام تھا کیونکہ دو ایک نہیں، بارہ ناشرین کے پاس ان تصانیف کے حقوق اشاعت تھے۔ تصانیف اور ناشرین کے نام یہ ہیں۔

	تصانیف	ناشرین
۱	صالحات	(۱) محمد شفیع الدین مالک اقبال پرنٹنگ ورکس دلی
۲	صبحِ زندگی	(۲) محمد واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ دلی
۳	شامِ زندگی	
۴	منازلِ السائرہ	
۵	الزہرا	
۶	سرابِ مغرب	
۷	بنتُ الوقت	
۸	سلت روحوں کے اعمالنامے	
۹	طوفانِ حیات	(۳) مولانا عبدالمجید سالک مرحوم لاہور
۱۰	آفتابِ دمشق	(۴) محمد ظہور الدین مالک ساقی [illegible]
۱۱	فسانۂ سعید	(۵) حافظ عزیز حسن بقائی اڈیٹر پیشوا دلی
۱۲	جوہرِ قدامت	(۶) صوفی پبلشنگ ہاؤس پنڈی بہاؤالدین گجرات پنجاب
۱۳	عروسِ کربلا	
۱۴	سودَورہ	
۱۵	یاسمینِ شام	
۱۶	تیغِ کمال	
۱۷	اُمّت کی مائیں	(۷) منشی عبدالحمید صاحب مالک رسالہ مولوی دلی
۱۸	اندلس کی شہزادی	
۱۹	لڑکیوں کی انشا	(۸) دارالاشاعت پنجاب لاہور
۲۰	سوکن کا جلاپا	
۲۱	گوہرِ مقصود	
۲۲	ماہِ عجم	
۲۳	سنجوگ	
۲۴	قطراتِ اشک	
۲۵	شاہین ودرّاج	
۲۶	بزمِ آخر (غیر مطبوعہ)	
۲۷	محبوبۂ خداوند	(۹) انوار فہمی صاحب مالک اخبار دین دنیا دلی
۲۸	نوحۂ زندگی	(۱۰) قاری عباس حسین صاحب اڈیٹر قوم دلی
۲۹	درِ شہوار	
۳۰	انگوٹھی کا راز	(۱۱) حکیم محمد یعقوب صاحب دلی
۳۱	تربیتِ نسواں	(۱۲) سید مبارک علی شاہ گیلانی مالک گیلانی پریس لاہور
	یاسمن کا چاند	

ان میں سے ہر تصنیف کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے تھے

علامہ راشد الخیری جیسا مقبول مصنف اُردو کے نام کسی سے
… پا تھا ایک ایک کتاب کے نئے نئے ایڈیشن چھپتے
… تھے ناشرین کو ان تصانیف سے ہر سال معقول
… شاعت ملتا تھا بھی اُن کے لئے باعث کشش
… تھا ۔ (عصمت کے ۵۰ سال جولائی ۱۹۵۸ء)
… کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا اگر قاعدے
… سے کی جائے جس بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے روز
… تھا ۔ اور اس محنت کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر میں
… تو حضرت علامہ مغفور کے سامنے کئی مکانوں کا مالک
… تھا مگر میں نے جائداد پیدا کرنے پر والد مغفور کی تصانیف
… کی واپسی کو ترجیح دی حکیم محمد یعقوب صاحب …
… کرتے تھے اور عصمت میں ان کا اشتہار شائع ہوتا
تھا ۔ ان کی طرف اشتہار کی کچھ اُجرت نکل رہی تھی کچھ اس کا
… کچھ میرا اصرار انہوں نے انگوٹھی کا راز کے حقوق
واپس کر دئے اور اسی زمانے میں صالحات کے حقوق اشاعت
مجھے اس لئے واپس مل گئے کہ سابقہ پبلشر صاحب کے پاس
جو ایک نسخہ رہ گیا تھا اُس میں سے ۸ صفحے غائب تھے اور بغیر
ان صفحوں کے کتاب ناقص تھی ۔ پھر اُن پبلشر صاحب سے میں نے
یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ علاوہ نقد معاوضہ کے میں سال بھر تک ان کا
اشتہار پورے صفحہ کا مفت شائع کروں گا ۔ ۱۹۳۶ء تک میں
علاوہ ان دو کتابوں کے جدید ایڈیشن شائع کرنے کے ۵ درجن
مطبوعات اور شائع کر چکا تھا اور ناشرین کتب کو اب عصمت
بک ڈپو کی مطبوعات کی ضرورت بھی تھی اور مجھ سے تعلقات
رکھنے کی بھی ۔ مشرقی پبلشنگ ہاؤس کے ڈائرکٹر جناب ملک
محمد دین صاحب کو میں نے خط لکھا تو شروع میں تو وہ ٹال گئے مگر
میرے اصرار پر انہوں نے بھی پانچوں کتابوں کے جو اُن کے
پاس تھیں حقوق واپس کر دئے ۔ میرے مرحوم دوست مولانا
عبدالمجید سالک ایڈیٹر روزنامہ انقلاب نے بڑا دلچسپ خط لکھا تھا
کہ میرے پاس بہت بڑا پریس ہے ۔ ہزاروں کا کاغذ مجھے ادھار
مل سکتا ہے ۔ کتاب کی نکاسی کے ذرائع بھی ہیں اور پھر سب سے
بڑھ کر یہ کہ طوفان حیات میرے پاس مولانا مرحوم کی یادگار ہے ۔
لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں آپ کی خواہش رد نہیں کر سکتا ۔
سنہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک ۱۰ سال کی کوشش میں چھ ناشروں
سے گیارہ تصانیف کے حقوق میں نے والد مرحوم کی حیات میں
واپس لے لئے ۔ باقی ۲۰ تصانیف میں سے ۱۸ تصانیف کے
حقوق اُن کے بعد واپس لئے ۔ ملا محمد واحدی صاحب پر جب
میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ میں
مولوی صاحب کی حیات میں حقوق واپس نہ کرتا کہ میری روٹی
ان سے چل رہی ہے ۔ مگر آپ کا جذبہ بہت قابل قدر ہے ۔
دارالاشاعت پنجاب لاہور اور سید مبارک علی صاحب گیلانی
لاہور سے تصانیف مصور غم کے حقوق واپس لینے میں کافی
مشکلات پیش آئیں اور صرف اس کام کے لئے مجھے دو دفعہ
لاہور کا سفر کرنا پڑا ۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے
مولانا عبدالمجید سالک کو اُن کی کوششوں سے گیلانی صاحب نے
حقوق واپس کر دیئے ۔ دار الاشاعت کا معاملہ زیادہ پیچیدہ تھا
دس سال کی کوشش سال بھر کی خط کتابت اور ڈھائی ہزار روپیہ
کا چیک پیشگی بھیج دینے کے باوجود مسئلہ حل نہ ہوتا تھا ۔ آخر سالک
صاحب نے ہی اس گتھی کو بھی سلجھایا اور نہ صرف مطبوعہ ساتوں کتابوں
کے حقوق اشاعت واپس دلائے بلکہ غیر مطبوعہ ناول "بزم آخر"
کا مسودہ بھی مجھے مل گیا ۔

حضرت مصور غم نے اپنی ۳۱ تصانیف کے حقوق اشاعت
فروخت کئے تھے اُن میں سے ۲۹ کے حقوق میں نے واپس لے لئے
بس دو کتابیں منشی عبدالحمید صاحب ایڈیٹر مولوی کے پاس رہ
گئیں ۔ منشی صاحب سنہ … میں مٹیا محل کے مکان میں دفتر عصمت

کے سٹاک کے انچارج تھے اور سنہ ۱۸ء سے سنہ ۲۳ء تک عصمت کی چھپائی کے مہتمم۔ منشی صاحب حضرت والد مغفور کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے مجھ سے بھی محبت کرتے اور اپنے خطوط میں مجھے "آقا زادہ" لکھتے تھے مگر اس معاملہ میں انہوں نے انکار کر دیا۔

اُردو کے مشہور مصنّفین کو ۲۲ x ۱۸ سائز کا معاوضہ عام طور پر فی صفحہ چار آنے سے ایک روپیہ صفحہ تک ملتا تھا علامہ مغفور دو روپیہ فی صفحہ لیتے تھے لیکن اُن میں لحاظ و مروّت حد درجہ کی تھی۔ بعض صاحبان نے جو رقم حساب سے ملنی چاہیئے تھی اس سے بھی کم ادا کی۔ کسی نے لکھا بر خوردار کو جو روزانہ پیسے میں دیتا ہوں وہ بچا کر یہ رقم جمع کی ہے اسے قبول فرما کر اس کا دل رکھ لیجئے۔ کوئی کہتا بیٹی کی ہنچیلا رہن رکھ کر بمشکل تمام یہ رقم مہیا کر سکا ہوں اسے قبول کر کے ایک کتاب مجھے دے دیں گے تو میرے بھی دن پھر جائیں گے۔

حضرت علامہ مغفور نے ۲۹ نہیں جیسا کہ میں نے عصمت جوبلی نمبر سنہ ۵۰ء میں لکھا تھا بلکہ ۳۱ تصانیف کے حقوق اشاعت سات ہزار روپیہ میں فروخت کئے تھے حقوق اشاعت کی واپسی کی صحیح رقم سترہ ہزار روپیہ سے اُوپر ہوتی ہے اور کتابوں کا جو اسٹاک خریدا گیا یا جدید ایڈیشنوں کے جو نسخے پیش کئے گئے اس کے علاوہ تھے۔

حضرت والد مرحوم کی جن تصانیف کے حقوق فروخت کر دیئے گئے تھے اُن کی واپسی میری دلی آرزو تھی جو خدا کا شکر ہے پوری ہوئی۔ سنہ ۲۷ء سے میں اس کوشش میں منہمک تھا۔ آخری معاملہ سنہ ۳۹ء میں ہوا اور ۳۱ میں سے ۲۹ کتابوں کے حقوق میں نے واپس لے لئے۔

تصانیف پر نظرِ ثانی حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ ہر تصنیف ناول یا افسانہ پر نظر ثانی نہ فرماتے اور جب ختم کر لیتے تو احتیاطاً بھی ایک نظر ڈالنے سے تھے۔ بلکہ بعض تصانیف کے مسودہ کا بڑا حصہ پبلشر کے پاس خاتمۂ کتاب سے پہلے ہی پہنچ جاتا تھا جس طرح تصانیف مصورِ غم کی یہ خصوصیات ہیں کہ سوائے دو چار کے نہ اُن میں دیباچے مقدمے وغیرہ ہیں نہ کسی کے نام ڈیڈیکیٹ کی گئی ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ لکھنے کے بعد نظر ثانی نہ فرماتے بلکہ کہتے تھے کہ جتنی دیر میں میں نظر ثانی کروں کچھ اور کیوں نہ لکھ لوں۔ مگر جب میں نے حقوق اشاعت واپس لینے شروع کئے اور اُن سے نظر ثانی کی درخواست کی تو اس لئے بھی کہ بعض تصانیف کی پہلی اشاعت کو کافی مدت گذر چکی تھی اور اُن میں کتابت وغیرہ کی بے شمار غلطیاں تھیں انہوں نے میری درخواست منظور فرمالی اور مندرجہ ذیل تصانیف پر نظر ثانی فرمائی۔

(۱) حیاتِ صالحہ یعنی صالحات (۲) لنگوٹی کا راز (۳) موؤدہ (۴) درِ شہوار (۵) عروسِ کربلا (۶) یاسمینِ شام (۷) طوفانِ حیات (۸) نوحۂ زندگی (۹) جوہرِ قدامت (۱۰) تیغِ کمان (۱۱) فسانۂ سعید۔

بیگم صاحبہ کا تکیہ علامہ مغفور کی رفیقۂ حیات کا ایک تکیہ بالعموم میلا کچیلا ان کے سرہانے رہتا تھا کبھی اس پر غلاف بھی چڑھتا تو بہت معمولی پرانے کپڑے کا۔ سنہ ۳۲ء میں ہم سب گنگا پور سٹی آپا راشدہ کے ہاں گئے ہوئے تھے کہ ایک دن تکیہ غائب تھا۔ پلنگ پر تکیہ نہ آیا تو والدہ مرحومہ دم بخود ہو گئیں۔ اُوپر کا سانس اوپر نہ اور نیچے کا نیچے۔ بہت ڈھنڈیا پڑی۔ بہت تلاش کیا گیا۔ سوئی تو تھی نہیں کہ نظر نہ آتی۔ اتنی بڑی چیز ہوتا تو ملتا۔ آخر کوٹھے پر کسی کی نظر پڑی اور اٹھا کر اندر لایا۔ دیکھا اور ٹھنڈا سانس بھر کر خاموش ہو گئیں۔

سب نے پوچھا اس میں کیا تھا کیا۔ کچھ جواب نہ دیا۔

پہ سال سے ٹھیک اگرمیں ملازمت کر رہی تھی،
پہلے بچے ہی تھے۔ اس پر شبہ تھا۔ ہر طرح
تھول۔ آٹھ دن بعد دلّی واپس ہوئی تو وہ لڑکی
پھر معلوم ہوا اس سے کاتیں بجنسیں پال کی
فروخت کرتی ہے۔
مغفور نے اپنی رفیقۂ حیات سے بہت پوچھا کر
یہ کم بخت میں تھا کیا جو تم اس قدر خاموش
ان بچوں کے نل تھے۔ پیٹ کے بال سے اور
ست سو دشمن کسی مخالف کے ہاتھ پڑگئے
نے ٹیکے سب ہی کچھ ہو سکتے ہیں۔
مغفور نے فرمایا "میری سمجھ میں تو یہ بات

نہیں آئی تو سناتے۔ میرے پیچھے کیوں ہاتھ
رکھوا بیٹھی تو دیا تھا میرے پاس کوئی گجھا
مجھ سے الٹی سُلٹی باتیں نہ کیا کرو۔"
روز بعد اصرار فرمایا تو کہا
وعدہ کرو کہ میرے جواب کے بعد پھر کوئی اور
سکے گے۔"
مغفور نے وعدہ کیا تو کہا "روپے کتنے یاد
آپ اور سوال نہ کرنا قول دے چکے ہو۔"
میں سلام کو حاضر ہوا تو علامہ مغفور نے فرمایا
تو تین سو روپے لیتے آنا ہے دو پہر کو روپے
ایا" اپنی اماں کو دید اس بیچ تکیہ کا ماتم نہ کریں۔
ہوگئیں۔ روپے رکھ لئے۔ تیسرے پہر ماشتہ ناول
روپے انہیں دے کر کہا کوئی زیور بنوا لینا۔"
مغفور کی رحلت کے تین سال بعد صادق میاں
ہو چکی تھی آپا ماشاء اللہ نے کہا "اب تو بتا دیجئے

کتنے روپے تھے۔ تے کوئی تین چار سو؟"
فرمایا "ٹھیک یاد نہیں۔ زیادہ ہی تھے۔"
"کیا صادق میاں کی شادی کے لئے جمع کئے تھے؟"
فرمایا "حج کے لئے۔"
"مگر اماں چپکے ہی چپکے آپ جمع کرتی رہیں کانوں کان
کسی کو خبر نہ کی۔ تکیہ کی طرف تو کسی کا خیال ہی نہ جا سکتا تھا۔"
مسکرائیں اور پھر فرمایا "میں تمہیں کئی دفعہ بتا چکی
ہوں کہ اماں جان نے مجھے نصیحت کی تھی کہ بیٹی روپیہ کو جیتے
پسندہ آنے کا سمجھنا۔ ہر روپیہ میں سے ایک آنہ بچانا۔ ان کی
نصیحت پر میں آج تک عمل کر رہی ہوں۔ جب روپیہ بھنایا
ایک آنہ الگ کر دیا۔ اگر ایسا نہ کرتی تو عصمت کے لئے تمہارے
آبا کو رقمیں نکال نکال کر کہاں سے دیتی۔ زیور کہاں سے
بنتے۔ تمہارا اور واجدہ کا جہیز کہاں سے آجاتا۔ رازق میاں کی
شادی کیونکر ہوتی۔ تمہارے آبا تو بس یہ کہہ کر چھٹ جاتے
تھے کہ "دکھاؤ اپنا سلیقہ۔" بیوی کو شوہر کی عزت کا خیال نہ
تو گھر اور بازار میں فرق ہی کیا رہا۔ جب تک اماں جان زندہ
رہیں تنخواہ اُن کے ہاتھ سے ملتی رہی۔ اُن کے بعد تمہارے آبا
نے خود خرچ دیا۔ اور یہ تو شروع ہی میں اماں جان نے جتا
دیا تھا کہ بیٹی اب اوُ نیا بھر کے خرچ تمہیں اسی میں پورے کرنے
ہیں۔ اپنے میاں سے کبھی ایک پیسہ نہ مانگنا۔ مرد کی کمائی کے ساتھ
عورت کا سلیقہ بڑی چیز ہے۔ بُوندیاں بُوندیاں کر کے تالاب
بھرتا اور پیسوں سے روپے اور روپوں سے نوٹ بنتے ہیں۔
اکٹھی رقمیں کئی دفعہ نکال نکال کر تمہارے آبا کو دیں تو کیا آسانی
سے جمع ہو گئی تھیں۔ بہت جتا کھتا کر کے پیسہ جمع ہوتا ہے۔
اور وہ روپے تو حج کے لئے تھے اور کئی سال میں جمع ہوئے تھے۔

میری سالانہ چھٹی ایک ماہ کی

حضرت والد مغفور طویل
دورہ بر ہر سال جب تشریف

نے جاتے تھے تو میں ان کے ہمراہ کیوں ہوتا تھا جبکہ کتابوں کی اشاعت بڑے پیمانہ پر ہورہی اور رسالے نہایت پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہورہے تھے۔ دفتر میں مصروفیت کا جب یہ عالم تھا کہ روزانہ دس بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا تو ۵-۵ اور ۶-۶ ہفتہ کے لئے دلی سے باہر کس طرح جاسکتا تھا۔ یہ سوالات اس زمانے میں پیدا ہوسکتے تھے اور آج بھی کئے جاسکتے ہیں پھر جب میں علامہ مغفور کے ساتھ مختلف شہروں میں جاتا تو کاروباری نقطۂ نظر سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا تھا کہ رسالوں کے کئی کئی سو نئے خریدار پیدا ہوتے۔ محکمہ تعلیم کے افسروں سے مل کر سکولوں کالجوں کی لائبریریوں کے لئے رسالے اور کتابیں منگانے کی کوشش کرتا۔ ہرسال کئی ہزار روپیہ کا آمدنی میں اضافہ ہوتا۔ پھر اشتہارات بھی اچھے خاصے مل سکتے تھے غرض ان دوروں میں کاروباری ترقی کے زریں مواقع تھے۔ مگر میں نے ان میں سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ جس زمانے میں تربیت گاہ تعطیل کلاں کے لئے بند ہوتی اور حضرت والد مرحوم دورہ پر تشریف لے جاتے اس سے چند ہفتے قبل ہی میں عصمت کا بہت ضخیم سالگرہ نمبر دو ماہ کا اکٹھا شائع کرتا اور اس طرح مجھے چھٹی منانے کا ایک ماہ مل جاتا تھا والدہ مرحومہ ساتھ اس لئے ہوتی تھیں کہ اُن کی وجہ سے بورڈنگ بچیاں مدرسہ میں آتی تھیں۔ میرے والدین کا بڑھاپا تھا۔ والدہ مرحومہ کو گال سٹون کی شکایت تھی اور جب دورہ پڑتا نیم جان کردیتا تھا اور آٹھ دس روز تک چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہتی تھی۔ والد مرحوم کو بھی اختلاج قلب کی شکایت ہوتی کبھی دردسر کی۔ ریل کے طویل طویل سفر کے علاوہ کبھی بیل گاڑیاں اور تانگوں کے بھی جھٹکے اور ہچکولے سخت تکلیف دہ ہوتے تھے۔ مختلف جگہ مختلف کھانوں کا بھی صحت پر بُرا اثر پڑنے اور بیمار ہوجانے کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ یہ حالات ایسے تھے کہ کاروبار بڑھانے یا روپیہ پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے والدین کو راحت و آرام پہنچانے کے لئے میں اُن کے ہمراہ ہوتا اور سال میں ایک ماہ کی چھٹی اس طرح منایا کرتا تھا۔

ساتھ لے چلنے اور سفارش کرنے سے انکار | اسی حضرت

علامہ مغفور نے حیدرآباد دکن کا دورہ فرمایا تو اعلیٰ حضرت نظام نے خاص طور سے سرفراز فرمایا اور ملاقات کے لئے بلایا۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کی تو فرمایا

"مولوی وعظ کہنے جاتا ہے تو بڑا صاحبزادہ بھی ہوتا ہے اس کا بیٹا بھی ساتھ ہوتا ہے کہ کھانا کھائے بھی اور ساتھ بھی لائے کیا تم ملا کے بیٹے بننا چاہتے ہو" پھر فرمایا

"مجھے بلایا ہے۔ تمہیں نہیں۔ تمہاری بھی کچھ شخصیت ہے دو رسالوں کے اڈیٹر ہو۔ بہت سی کتابوں کے پبلشر ہو۔ بن بلائے جاکر اپنی شخصیت کو کیوں مجروح کرتے ہو"

۱۹۳۳ء میں کار میں کلکتہ کا سفر کیا تھا واپسی میں الہ آباد ٹھیرے تو ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن جو علامہ مغفور کی تصانیف کے دلدادہ تھے روز حاضر خدمت ہوتے مجھے کچھ خیال آیا تو چوتھے دن میں نے عرض کیا۔

"آپ اشارۃً بھی ذکر کردیں تو رسالے اور کتابیں یہ مدرسوں کے لئے بہت سی خرید لیں گے" فرمایا

"جس عقیدت سے یہ آتے ہیں اُس سے غلط فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ تم دفتر جاکر وقت طے کرکے ان سے ملو۔ اپنی فہرست اور نمونے دکھاؤ۔ وہ پسند کریں گے تو خریدیں گے۔ میں تمہاری خاطر ایک دن اور ٹھیر سکتا ہوں۔ مگر میرا اُن سے کہنا مناسب نہیں"

محفل میلاد کے سلسلہ میں ایک خط | خان بہادر حاجی غلام محمد حسن خان دلی

کراچی پشاور سیالکوٹ وغیرہ میں فوجی ٹھیکے ہوتے تھے وہ

کسی پر تہمت لگا کر کیوں گنا بیٹھتے ہو۔ کچھ دیر بعد علامہ مغفور والدہ مرحومہ کے ساتھ ٹہلتے ہوئے انہیں عزیز کے ہاں پہنچے تو بکری موجود تھی۔ گھر واپس آکر خوب ہی چھیڑا کہ اور اُسے رو لی ٹھاؤ اور سر کھپاؤ۔ والدہ مرحومہ نے فرمایا بکری پھرتی پھراتی پہنچ گئی ہوگی کوئی وہ خود تھوڑی لے گئے ہیں اور اگر لے بھی گئے ہیں تو وہ تم سے چھوٹے ہیں کیا ہوا اور آجائے گی۔

ایک مسئلہ کس طرح سلجھا

ایک دن شام کو علامہ مغفور کے ایک عزیز کی اور ان کی بیوی کی لڑائی ہو رہی تھی اور بہت زور زور سے جس بنگلہ میں ہمارا قیام تھا وہاں تک آواز آرہی تھی۔ علامہ مغفور نے سُنا تو والدہ مرحومہ سے کہا۔ "چیخ رہا ہے۔ میاں بیوی لڑ رہے ہیں چلو وہاں چلیں" میں پھاٹک میں کھڑا تھا۔ عرض کیا "موٹر میں بیٹھ جایئے" فرمایا "دو قدم کے لئے کیا موٹر میں بیٹھیں۔ اچھا خیر چلو" وہاں پہنچے تو اُن کے عزیز دیکھتے ہی یہ کہتے ہوئے دوڑے "بھائی اس گھر میں اب یا تو میں ہی رہوں گا یا یہ" علامہ مغفور نے کہا "اس کا فیصلہ ہو جائے گا گھبراؤ نہیں اندر تو چلو۔" اندر گئے تو ان کی بیوی نے کہا کہ بچہ کو بخار ہے اس پر خفا ہوئے جلتے ہیں۔ علامہ مغفور نے مجھ سے پوچھا "جیب میں دس پندرہ روپیہ ہیں؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں" فرمایا "کہیں جانا ہے" عرض کیا "جی نہیں" پھر اپنے اُن عزیز سے کہا "اچھا تم میرے ساتھ آؤ" انہوں نے کہا "آپ فیصلہ تو کر دیجے" فرمایا "ہو جائے گا۔ میرے ساتھ آؤ" کار میں جب ہم بیٹھ گئے تو انہوں نے ڈرائیور سے کہا "چلو چاندنی چوک" وہاں پہنچ کر فوارہ کے قریب جو سینما تھا اس میں گئے۔ تصویر جب ختم ہو گئی اور واپسی میں قاضی کے حوض کے پاس پہنچے تو انہیں عزیز نے مجھ سے کہا "میاں ذرا گاڑی رکوانا۔ ظ کو بخار ہے اس کے لئے نارنگیاں خریدتا چلوں" انہوں نے نارنگیاں خریدیں پھر گھر پہنچ کر موٹر ٹھہروا کر انہیں اُتار کر کہا "تو بس اب گھر جاؤ"

اور یوں انہوں نے میاں بیوی اور ماں باپ بیٹی کی لڑائی کا فیصلہ اس طرح کر دیا گویا کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی۔

ایک خط ایک نسبت کے سلسلہ میں

علامہ مغفور کی تربیت گاہ ہندوستان بھر کی نادار و یتیم بچیوں کا بورڈنگ اور مدرسہ شہری بچیوں کا مکتب ہی نہ تھا بلکہ اس کوشش میں بھی منہمک تھا کہ مسلمان بچیاں عیسائیوں اور آریوں کے قبضہ میں نہ پہنچیں کنیز و ایک لڑکی کو اللہ نے مرتد ہونے سے بال بال بچایا اور کلکٹر مظفر نگر نے اُسے علامہ مغفور کے سپرد کیا۔ تربیت گاہ تو عمر گیارہ سال تک بچیوں کے لئے تھی۔ مگر خاص خاص حالات میں بڑی عمر کی لڑکیوں کی بھی پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ اُس لڑکی کے حالات اخبارات میں شائع ہوئے تو شادی کے لئے کئی پیام آئے۔ ایک پیام کا جو جواب علامہ مغفور نے دیا تھا اس کی نقل کاغذات میں سے نکل آئی ہے۔ یہ خط واحدہ بیگم نے نقل کیا تھا اور آخر میں علامہ مغفور کے دستخط ہیں۔ درخواست نرکٹیاگنج ضلع سوتی ہاری (بہار) کے ایک معزز عہدہ دار کی طرف سے تھی اور جواب یہ بھیجا گیا تھا۔

مخدومی و مکرمی۔ سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ کنیز فاطمہ کے عقد کے سلسلہ میں پہونچا۔ آپ نے میرے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا میں گو اس کا حقیقی مستحق نہیں لیکن شکر گزار ہوں۔ اس عقد کے متعلق جو پیام پہنچے یا حضرات تشریف لائے اُن پر عزیزہ موصوفہ کا استصواب احکام اسلام کے موافق ضروری ہے چنانچہ اس وقت تک تین پیام منتخب ہوئے ہیں۔ جن میں ایک آنجناب کا ہے اور وہ صرف اس لئے نہیں کہ ہم وطن ہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ مجھے آپ کی تحریر میں اخوت اور خلوص اسلامی کی جھلک دکھائی دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کا فیصلہ غالباً

راشد الخیری

ں آسانی سے کر سکیں گے۔ کیونکہ اُس وقت تک
ت معلوم ہو جائیں گے۔ اور جنوری میں اگر خدا
ے تو اس سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ آپ کے
کہ آپ کا پہلا عقد ہے یا دوسرا۔ کیا آپ براہِ کرم
یں گے۔ یہ معلوم ہونے کی بھی ضرورت ہے کہ آپ
یا کس قدر مہر مقرر فرماتے ہیں۔ بیگم راشد خیری
رتے ہیں بہار اور دہلی کی مراسمِ نکاح میں اختلاف
ں نے احکامِ شرعی کے موافق جوتا چڑھاوا صاحب
ہو۔ چاہیئے کیا آپ مجھے ازراہِ مہربانی اطلاع
ر آپ جوڑے چڑھاوے وغیرہ میں کس قدر صرف
ہیں۔ مجھے ان سوالات کا جواب جس قدر جلد ممکن
فرمایئے۔

اجب یہ بھی فرماتی ہیں کہ اس نوع کی رسوم کے مطابق
پڑھاوا جہیز کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ چونکہ جہاں
رت نہیں ہے۔ اس لئے ہم کو اس سوال کا حق اتفاق
ہیں لیکن شرعی طور پر شاید غلط نہ ہوگا کیونکہ سرورِ
ں نے جناب سیدہ کے واسطے شیرِ خدا کی زرہ کی قیمت
فرمایا تھا۔ اس واسطے ہم کو اپنی طرف سے اصرار
اچاہیئے۔

راشد الخیری ۳۱/۱۲/۱۲

(دوسرا خط) "جو رجسٹری روانہ کر چکا ہوں۔
ں کے آخر میں بیگم صاحبہ کے یہ الفاظ اور بڑھا لیجئے
رے چڑھاوا جو کچھ بھی ہوگا اس سے ہم کو کوئی واسطہ
ہیں۔ یہ عزیزہ موصوفہ کی ملکیت ہوگا جو وہ اپنے
ہمراہ ساتھ لے جائے گی۔"

ہمسایہ ماں کا جایا

جنوری یا فروری ۱۹۳۲ء کی ایک صبح ہے۔ بساطِ عالم سے شب کی
تاریکی چھٹنی شروع ہو گئی ہے۔ فجر طلوع کا وقت ہے ادھر مؤذن
کی صدائے اللہ اکبر بلند ہوئی اُدھر دلّی کے کوچہ چیلان کے ایک
مکان میں اس کی بیگم نمازِ تہجد پڑھتی ہوئی بیدار ہوئیں اور
چولھا روشن کیا گھر میں نوکر بھی ہیں اور ماما ئیں بھی۔ مگر ان جنتی
بیویوں میں سے ہیں جن کا ایمان ہے خدا کی خوشنودی اور زندگی
کی کامیابی کا راز شوہر کی خدمت میں پوشیدہ ہے۔ ادھر وضو
کے لئے پانی گرم ہو رہا ہے اور ادھر انہوں نے حقہ تازہ کر چلم بھر
پاؤں کا انگوٹھا ہلا شوہر کو جگایا۔ سر اٹھا، سو رہا ہے بچہ دونوں
میاں بیوی نمازِ فجر سے فارغ ہو گئے۔ تب شوہر نے اوورکوٹ
پہنا۔ اور بیوی نے برقعہ اوڑھا اور ماما کو جگا کر دونوں چہل
قدمی کے لئے روانہ ہو گئے۔

کوئی گھنٹہ بھر میں لوٹے تو ڈگن تانگے والے کا خیال
آیا۔ ان کے گھر سے ملا ہوا جو کمرہ ہے اس میں وہ رہتا ہے۔ نمونیہ
میں گرفتار۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے وہ کھانس رہا ہے
کہ مولوی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کمرہ میں داخل ہوئے۔
مولوی صاحب نے کہا "السلام علیکم کہو بھئی ڈگن کیا حال ہے؟"
غریب پڑوسی نے اپنی تکلیف بیان کی۔
مولوی صاحب نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ اللہ مالک ہے۔
جلد آرام ہو جائے گا دوا برابر پیتے رہو۔"
بیگم صاحبہ نے دوا کے لئے ایک روپیہ دیا۔ اور دونوں
آٹھ دس منٹ وہاں گذار اپنے گھر آ گئے۔

اس واقعہ کے تین سال بعد علامہ مغفور کا انتقال
ہو گیا۔ اور اُن کے انتقال کے کوئی دو ماہ بعد ڈگن تانگے والا
اُن کو یاد کر کے یہ واقعہ سُنا رہا تھا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ
ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا "یہ بات سوائے بیگم صاحبہ
کے یا میری اندھی ماں کے کسی کو نہیں معلوم کہ مولوی صاحب
پندرہ دن تک روز صبح نماز کے وقت سردی میں مجھے دیکھنے

آتے، اور بیگم صاحبہ ایک روپیہ روز دوا کے لئے دیتی تھیں"۔

(میری ایک ریڈیو تقریر کا ابتدائی حصہ)

آخری وعظ

۱۹۳۵ء میں ایک دن میں نے علامہ مغفور سے عرض کیا: "سُنا ہے اماں جان نے آپ کو انگرکھے سی کر پہنائے ہیں۔ اب تو اچکنوں کا وہ زور ہے کہ انگرکھا کبھی کبھار ہی نظر آتا ہے۔ کاش میں بھی آپ کو انگرکھا پہنے دیکھتا۔"

فرمایا "تم بھی کیا جوانی کی باتیں یاد دلا رہے ہو۔ انہوں نے تو میرے ستار کا غلاف بھی سیا تھا اور ایسا سیا تھا کہ جس نے دیکھا پھڑک اُٹھا۔ اب نہ یہ سی سکتی ہیں نہ میں پہنتا اچھا معلوم ہوں گا۔"

بات آئی گئی ہوئی تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ مرحوم کیتان مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کی بہو اور والدہ مرحومہ کے بھتیجے مولوی لطیف الرحمٰن صاحب رئیس دہلوی کی بیوی اپنی پھوپی جان سے ملنے آئیں۔ والد مرحوم اُس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے تو بھابی صاحبہ نے اُن سے عرض کیا کہ "پھوپا جان نویں تاریخ کو میرے ہاں آپ وعظ کہہ دیجئے۔" علامہ مغفور نے فرمایا "بیٹی میں اب وعظ نہیں کہتا۔ پہلے کبھی کہا کرتا تھا۔" انہوں نے کہا "میں نے تو منت مانی ہے کہ پھوپا جان سے وعظ کہلواؤں گی۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ ایک دفعہ آپ کے منہ سے شہادت کا بیان سُن لوں۔ میری یہ دلی آرزو ہے اسے پورا کر دیجئے۔"

فرمایا "اچھا بیٹی میں آ جاؤں گا۔"

بھابی صاحبہ کے جانے کے بعد اماں جان سے کہا۔ "یہ لطیف والی دلہن کو کیا سوجھی کہ میرے وعظ کی منت مان لی" اُنہوں نے فرمایا "مجھے کیا معلوم۔"

ہنسنے لگے پھر فرمایا "پچیس سال پہلے جب وعظ کہا کرتا تھا تو تم میرے انگرکھے اور چغے سیا کرتی تھیں۔ اب ایک شرط پر تمہاری بھتیج بہو کے ہاں شہادت کا بیان پڑھوں گا کہ تم میرے لئے انگرکھا سی کر دو۔ رازق میاں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔"

وہ خاموش ہو گئیں۔ کوئی اور صاحب آ گئے ان سے باتیں ہونے لگیں۔ شام کو مجھ سے والدہ مرحومہ نے فرمایا: "۵ روپیہ لاؤ اور گاڑی نکلواؤ مجھے چاندنی چوک جانا ہے۔"

وہ چاندنی چوک سے بڑی خوبصورت چکن خرید کر لائیں اور ۵ روز میں چکن کا انگرکھا سی دیا۔ بہو بھانجیاں کسی کا ہاتھ نہ لگنے دیا قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اُس وقت سیتیں جب حضرت والد مغفور کہیں باہر گئے ہوئے ہوتے یا پچھلے پہر۔ دو انگرکھا سی کر بکس میں رکھ لیا اور والد مغفور کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

۹ محرم کی صبح والدہ مرحومہ کے منجھلے بھائی یعنی مولوی حبیب الرحمٰن صاحب آئے تو اپنی بہن سے کہا۔ "آج بھائی مولوی صاحب کا لطیف دلہن کے ہاں وعظ ہے۔ دو تین روز سے چرچا ہو رہا ہے۔"

والد مرحوم یہ سُن کر بولے "سُن تو میں بھی رہا ہوں مگر پہلے زمانہ میں جب میں وعظ کہتا تھا تو یہ میرے لئے انگرکھے اور چغے سیا کرتی تھیں۔ چغہ یا انگرکھا انہوں نے دے دیا تو میں آ جاؤں گا۔"

دوپہر کو بھابی لطیف آئیں تو اُن سے بھی ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ اُنہوں نے کہا "پھوپا جان آپ نے جو شہادت کی کتاب لکھی ہے اس میں سے بھی آپ پڑھیے اور زبانی بھی کہیے۔"

فرمایا "بیٹی جس طرح تم کہو گی اس طرح کہہ دوں گا مگر آئندہ کوئی ایسی منت نہ ماننا جس میں میرا نام آئے۔"

…ت کرتے تھے جب بھائی لطیف اپنے پھوپھا جان (ع
…جوتی کو پہنتا آسکے تو گرمیوں کا زمانہ تھا علامہ مغفور نے
…کر بھی نہیں جڑا تو لاؤ جاڑوں کی گرم اچکن ہی دیدو۔
…دہ مرحومہ نے بکس میں سے انگرکھا نکال کر دیا۔
…جان نے وہ پہنا۔ خاص نظروں سے والدہ مرحومہ کو دیکھا
…ور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس وقت ہم سب بچے بیٹھے ہوئے
…تھے انہوں نے صرف یہ فرمایا۔
…جھریاں پڑے ہوئے ہاتھوں سے سیا ہے جب
… [illegible] سیتیں"
…اس وقت سفید نورانی ڈاڑھی۔ سفید سر سفید صافہ
…سے وہ خوبصورت چکن کا انگرکھا کیا بہار دے رہا تھا
…آنسو آنکھوں میں بھر رہے تھے نورانی چہرے پر سفید لباس
…معلوم ہوتا تھا سر سے پاؤں تک نور کی بارش ہو رہی ہے۔
بھائی لطیف نے بہت بڑے پیمانہ پر وعظ کا انتظام
کیا تھا اور دونوں مکان مردوں اور عورتوں سے کھچا کھچ بھرے
ہوئے تھے۔ حضرت مصور غم نے پہلے زبانی واقعہ کربلا کا مختصر
حال بیان کیا۔ پھر سیدہ کے لال میں سے حضرت علی اصغر
کی شہادت کا بیان پڑھا اور پھر جس بہادری جرأت اور دلیری
کے ساتھ خواتین کربلا نے مصائب کا مقابلہ کیا اس کا ذکر فرمایا
دونوں مکانوں کی چھتیں۔ منڈیریں۔ گلی اور سڑک آدمیوں سے
پٹی ہوئی تھی اور چھوٹا بڑا مرد عورت جو تھا اشک بار۔
یہی انگرکھا پہن کر علامہ مغفور اپنے کئی دوستوں کے
ہاں اپنے اور اپنی رفیقۂ حیات کے کئی عزیزوں کے ہاں گئے
اور فرمایا "راشدہ کی اماں نے بڑھاپے میں یہ سیا ہے"۔

باپ کا اضطراب

دلی کے پرانے شرفا میں یہ عام دستور تھا کہ لڑکے دونوں وقت ملتے چراغ جلے تک گھر آجاتے تھے۔ کالج میں داخل ہونے سے پہلے تک میں بھی سوائے کسی اشد ضرورت کے مغرب کے بعد گھر سے باہر نہ رہ سکتا تھا۔ کالج کے جلسے پارٹیاں وغیرہ ہوتیں تو اجازت لیکر کبھی کبھار رات کے آٹھ نو بج جاتے تھے۔ [illegible]ء میں میں تین بچوں کا باپ تھا۔ شام کو ہوا خوری کے لئے کار میں دو ڈھائی گھنٹے کے لئے بالعموم نئی دہلی جایا کرتا۔ اور آٹھ بجے تک واپس گھر آجایا کرتا تھا۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کے بعد گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ گرمی کے زمانہ میں تین چار ماہ کے لئے ہم نئی دہلی کا کوئی بنگلہ کرایہ پر لے لیتے تھے اور حضرت والد مغفور رات وہاں گذارتے تھے [illegible] میں شام کو ایک دن میں قرول باغ عزیزہ محمدی بیگم کی والدہ محترمہ آپا قیصری بیگم سے جو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی نواسی ہیں ملنے گیا۔ محمدی بیگم بھی آئی ہوئی تھیں۔ آپس میں جیسے ہوتی ہیں تو وقت گذرتا معلوم نہیں ہوتا۔ ساڑھے آٹھ بج گئے۔ آپا قیصری اور عزیزہ محمدی نے کھانے کا بہت اصرار کیا اور آپا قیصری چھیڑتی رہیں کہ تمہارے ابا تمہیں ماریں گے نہیں۔ ہم سفارش کا خط لکھ دیں گے۔ اور محمدی بیگم نے دسترخوان بچھا کھانا چن دیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے نو بج گئے۔ گھبرا گیا تھا اور ڈرتے ڈرتے کار میں بیٹھا کہ بہت دیر ہو گئی تھی۔ کار چلاتا ہوا ایڈورڈ روڈ پر پہنچا یہ سڑک مجھے بہت پسند تھی۔ شام کے حسن کی وجہ سے حالانکہ رات تھی میں اسی راستے واپس ہوا۔ اتفاق کی بات پنکچر ہو گیا اور ڈرائیور کی گھنٹہ بھر کی محنت کے بعد کار چلنے کے قابل ہوئی۔ بنگلہ پر پہنچا تو ساڑھے دس بج چکے تھے اور مجھے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ ابا جان سخت پریشان ہوں گے۔ سونا کیسا وہ سڑک پر ٹہل رہے ہوں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ایک موڑ پہلے سے نکڑ پر جو بنگلہ سے تیس چالیس قدم آگے تھا وہ بے قراری اور بے چینی کی حالت میں ٹہل رہے تھے۔ گاڑی دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ مجھ سے کچھ نہیں فرمایا۔ ڈرائیور سے پوچھا

"ارے میاں کیا ہو گیا تھا - بڑی دیر تم نے آج لگادی ۔"
اس نے عرض کیا "پنجرا پر رج سوڑ پہ ہو گیا تھا اور وہاں اندھیرا تھا -"

سخت ندامت اور شرمساری سے میں نے اپنے کمرے میں آکر کپڑے بدلے چپکے سے بچھونے پر جا کر لیٹ گیا دوسرے دن والدہ مرحومہ نے فرمایا تمہارے ابا ایک گھنٹے سے سڑک پر ٹہل رہے تھے وہ کہتے تھے کبھی اتنی دیر نہیں لگاتی نہ معلوم کیا افتاد پڑی بہت پریشان تھے ۔"

شوہر کی بے چینی

علامہ مغفور بیوی بچوں کی ذرا سی تکلیف سے بھی پریشان ہو جاتے تھے ۔ والدہ معظمہ کو گال سٹون کی شکایت تھی، جب دورہ پڑتا جسمانی تکلیف میں وہ مبتلا ہوتیں اور روحانی تکلیف میں ان کے رفیق حیات سنہ ۳۲ء میں یہ دورہ بہت سخت پڑا تو علامہ مغفور سے یہ تکلیف نہ دیکھی جا سکتی تھی کبھی انگنائی میں کبھی سڑک پر - ڈاکٹر کو لینے - ایک آدمی کو دوڑایا تھوڑی دیر بعد دوسرے کو اور پھر تیسرے کو - مجھے پریشان دیکھ کر فرمایا "یہ تو ایک دن ہونا ہی ہے - ماں باپ کی موت دیکھنے کے لئے تمہیں ہر وقت تیار رہنا چاہیئے - دیکھ رہے ہو تمہاری اماں کیسی سخت تکلیف اٹھا رہی ہیں - ڈاکٹر کے آنے اور انجکشن ملنے تک خدا ہی ہے جو زندہ رہ جائیں ۔" یہی فرما رہے تھے کہ ڈاکٹر آیا انجکشن دیا طبیعت کچھ دیر بعد بہتر ہوئی - دوسرے دن صدقہ کا بکرا کیا -

سعد میاں کا روزہ

پوت ہوا جب جانئے جب پوتا آنگن کھیلے - میرے بڑے بیٹے سعد راشد سے انہیں محبت نہیں عشق تھا - اکثر اپنے ساتھ ناشتہ کراتے، اپنے منہ کا پان ذرا سا نکال کر ان کے منہ میں رکھتے - گرمی کے دنوں میں کھری چارپائی پر تہمد باندھے علامہ مغفور لیٹے ہوتے اور ۴، ۵ سال کا پوتا اُن کے پیٹ پر اُچکتا اور پھدکتا - اور وہ اس سے لپٹے لپٹے کشتی لڑتے اور اپنے پاس گرا کر کہتے "وہ مارا جھانسی کے پہلوان کو دلی والے نے" اور پھر بازو ڈھیلے کر دیتے اور سعد میاں پھر ان کے پیٹ پر بیٹھ کر زور آزمائی کرتے ۔

ہمارے ہاں کیا دلی کے شرفا میں سالگرہ کسی کی نہیں منائی جاتی تھی بلکہ پہلے تو صحیح تاریخ پیدائش بھی بہت کم معلوم ہوتی تھی - مگر سعد میاں کی سالگرہ ہر سال منائی جاتی - دیگ کا کھانا پکتا اور اللہ والوں کو کھلایا جاتا - نہ صرف ہر سالگرہ بلکہ عید بقرعید پر بھی سعد میاں کو وہ ماں یعنی خاتون اکرم مرحومہ کی قبر پر سلام اور فاتحہ کے لئے بھیجا کرتے تھے - سنہ ۳۲ء میں جب سعد میاں گیارہ سال کے تھے اُن کا پہلا روزہ ہوا اور اچھے پیمانہ پر مہمان داری کی گئی - اُن کے مدرسہ کے اُستادوں میں لدھیانہ کے ماسٹر تاج محمد صاحب بھی تھے جن سے ساتویں آٹھویں جماعتوں میں میں نے بھی پڑھا تھا - سحری کی چہل پہل اور افطاری کی گہما گہمی میں دادا کی بے پایاں محبت کام کر رہی تھی، سعد میاں کا پہلا روزہ ایسا سبھ گھڑی ہوا کہ جب وہ پاکستان فارن سروس میں آکر ایران اور امریکہ میں دو دو سال رہے جب بھی اُنھوں نے رمضان المبارک کے پورے روزے رکھے -

مسجد میں سفیدی

ماجدہ بیگم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ محلہ کی ایک مسجد میں سفیدی کی ضرورت ہوئی - اس زمانے میں دس روپے میں ہو جایا کرتی تھی میں نے اماں جان سے پوچھ کر دس روپے سفیدی کے لئے دے دیئے - جب ابا جان نے سُنا تو بہت ہی خوش ہوئے - اور کہا اس وقت تو نہیں مگر میں تمہیں پچاس روپے دوں گا اور اللہ میاں جو تم سے خوش ہوئے ہیں اس کا بدلہ تم کو الگ ملے گا -

...نصاب

...کے مروجہ نصاب کو علامہ مغفور زہر ہلاہل سمجھتے
...پنی مضمونوں میں وہ صاف الفاظ میں یہ تحریر فرم
...یت گاہ بنات کو بڑی آسانی سے سرکاری مڈل
...صاب چونکہ وہی سرکاری ہوتا اس لئے انہوں نے
...کا نیعت گوارا کیں اور سرکاری اعانت قبول نہ
...پہلے انہوں نے لڑکیوں کے اردو نصاب کا کام
...۔ ان کی ہدایت کے مطابق میں نے اور قاری
...میں صاحب نے پہلی کتاب سے لے کر پانچویں کتاب
...تھی۔ حضرت علامہ مغفور مجھے عنوانات بتلا دیتے
...لیا کیا باتیں مضمون میں آنی چاہئیں۔ پھر جس اور
...ب ہفتہ میں دو دن دو دو تین تین گھنٹے تبادلہ
...نے مل کر لکھتے کبھی قاری صاحب جو کچھ لکھ کر لاتے
...تا دوسرے تیسرے مہینے جو کچھ لکھا جاتا اس
...نور ایک نظر ڈالتے اور مناسب ترمیم اور اضافہ
...ڈھائی سال میں اردو کی ۵ کتابیں تقریباً تیار ہو چکی
...دران کی تصدیر بن رہی تھیں اور تاریخ جغرافیہ حفظان صحت
...دو دو کتابوں کا ڈھانچہ بھی تیار کر لیا گیا تھا کہ قاری صاحب
...دکن ۱۹۳۵ء میں چلے گئے لیکن کام کچھ نہ کچھ اس کے
...ہوتا رہا۔

اردو نصاب کے بعض مضامین رسالہ بنات میں
...کئے گئے تھے۔ علامہ مغفور کی رحلت کے بعد میں نے ان کی
...ت کے حقوق کی واپسی اور مضامین کے مجموعوں کی
...ت سب سے مقدم سمجھی اور ۱۹۴۲ء تک اس میں مصروف
...پھر دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے کاغذ کی کمیاب نایابی
...گئی تو لڑکیوں کا نصاب شائع کرنے کا موقع نہ ملا اور

۱۹۴۷ء میں جب زر پی ہجرت کی توجہاں ساست ... درجن
کتابوں کے مسودے ضائع ہوئے وہاں لڑکیوں کا نصاب
بھی۔ مضامین بھی اور تصاویر بھی کم سے کم ساڑھے تین ہزار
روپیہ اس کام پر صرف ہو چکا تھا۔ محنت اس کے علاوہ تھی
جس کی کوئی قیمت نہ ہو سکتی تھی۔

عصمت کے راشد الخیری نمبر کی اجازت نہیں ملی

خود نمائی سے علامہ مغفور کو سخت چڑ تھی اور وہ اسے
انتہائی کم ظرفی اور چھچھورپن سے تعبیر فرماتے تھے۔
انہوں نے اپنی تصانیف میں اپنی تصویر شائع نہیں
کی۔ ۱۹۲۰ء میں عصمت کا ۲۰ سالہ نمبر شائع ہوا تو میں نے بہت
کوشش کی کہ ان کی تصویر سے اس اشاعت خاص کی زینت
بڑھے مگر کامیابی نہ ہوئی ۱۹۳۳ء میں جب عصمت کے سالگرہ
نمبر کے لئے بلاک بن گیا اور تصویر بھی چھپ کر آ گئی۔ رسالہ بالکل
تیار ہو گیا اور ایک دن قبل انہیں بتایا تو اس وقت بھی انہوں نے
تصویر کی اشاعت پسند نہ کی۔ اور ستمبر کے عصمت میں ایک
مضمون پرچہ کے اور مرحومہ خاتون اکرم کے متعلق تحریر فرمایا
تو یہ بھی لکھا۔

"ہر وہ شخص جس کو پڑھنے لکھنے کا کچھ بھی شوق ہوگا زندگی
کے گل غبار سے حتی الوسع الگ رہنے کی کوشش
کرے گا اور اس کی دلی آرزو یہی ہوگی کہ اس کے سر پر
خاموش آسمان، قدموں میں ساکت زمین، اور آنکھ کے
سامنے قدرت کی ہری بھری گل کاریاں ہوں۔ ممکن ہے
میرے دل میں یہ خواہش بدرجہ اولیٰ سرایت کر گئی ہو۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھ کو کچھ آج ہی نہیں کہ زندگی
کے آخری دن ہیں بلکہ اس وقت بھی جب چستان خیال
میں ڈیرے پڑے ہوئے تھے جو لطف تخیل میں آتا تھا

اس کا شائبہ بھی اصلیت میں نہ تھا۔ ایک معمولی سا مکان اور چند کتابیں میری دُنیا تھی۔ جہاں گنتی کے دو تین آدمیوں کے سوا کسی کا گذر نہ تھا۔ یہاں تک کہ سر عبدالقادر کی قدردان آنکھیں، جس جگہ گھسیٹ لائیں اور انہوں نے باتوں ہی باتوں میں وہ تصویر کھنچوا دی جو دسمبر ۱۹۰۸ء کے مخزن میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد نہ معلوم حلقۂ ادب سے کس قدر اور کیسے کیسے تقاضے ہوئے مگر میں تعمیل نہ کر سکا۔ اس وقت بھی اس کے واسطے تیار نہ تھا لیکن میاں رازق کا اصرار غالب آیا۔ بہرحال میں ان سب کا جو اس تصویر کی اشاعت سے خوش ہوئے دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں"

عصمت ستمبر ۱۹۳۲ء

سوائے شب زندگی حصہ دوم کے کہ مرحومہ خاتون اکرم کو روشناس کرانے میں دیا گیا تھا کوئی تصنیف کسی کے نام ڈیڈی کیٹ نہیں کی۔

سوائے تین چار کتابوں کے کسی تصنیف کا دیباچہ نہیں لکھا اور وہ بھی تین چار تصانیف وہ ہیں جن میں دیباچہ لکھنا ضروری تھا۔

کسی تصنیف میں تعارف تعریظ پیش لفظ کسی سے نہ لکھوایا۔

غرض اپنی کسی تصنیف میں اپنا نام کہیں نہ آنے دیا سوائے ٹائیٹل کے کہ اس پر مصنف کا نام شائع ہونا ضروری ہے۔

مخزن عصمت تمدن اور سہیلی میں انہوں نے ایسے خطوط شائع نہیں کئے جن میں ان کی خدمات کی یا ان کی ذات کی تعریف ہوتی تھی۔ عصمت کی تعریف میں خطوط یا اخبارات کے تبصرے بھی وہ اوراقِ عصمت پر پسند نہ کرتے تھے۔

ان تمام واقعات سے باخبر اور اُن کی طبیعت سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود میں نے ۱۹۳۴ء میں عرض کیا کہ میں راشد الخیری نمبر شائع کرنا چاہتا ہوں جس میں آپ کی مختلف ادبی حیثیتوں اور آپ کی خدمات کے متعلق مضامین ہوں گے۔ یہ خاص نمبر نہ صرف اُردو ادب کے لئے بلکہ قوم کے لئے بالخصوص لڑکیوں کے لئے نہایت مفید ہوگا۔ اس پر انہوں نے یہ فرمایا تھا۔ " تم کو اس کی ضرورت ہوگی۔ مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میری زندگی میں تم عصمت میں میرے متعلق کچھ نہیں چھاپ سکتے۔ میرے بعد تمہیں اختیار ہے "

(عصمت راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء)

دو شاگرد حضرت علامہ مغفور تربیت گاہ بنات کی کئی درجن بورڈر بچیوں کو جو مختلف صوبوں کی تھیں کہانیاں سُناتے اور کہانیوں ہی کہانیوں میں بڑے کام کی باتیں اُن کے ذہن نشین فرمایا کرتے تھے۔ کسی کتاب کی کوئی بات کسی بچی کی سمجھ میں نہ آئی تو بڑے دلچسپ انداز میں اس کی تشریح کرتے تھے مگر یہ سب بچیاں کم عمر تھیں۔ لکھنے کی ترغیب انہوں نے لڑکیوں اور عورتوں کو اپنے اُن مضامین سے دی جو وہ عورتوں کے فرضی ناموں سے بہت آسان زبان میں پندرہ سولہ سال تک عصمت میں لکھتے رہے۔ اُن مضامین سے لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اور عصمت بیسیوں نئی نئی مضمون نگار ہر سال پیدا کرتا رہا۔ براہ راست جنہیں علامہ مغفور نے لکھنا سکھایا وہ دو ہیں۔

شادی ہو کر آمنہ نازلی دلی آئیں تو انہیں اپنے خسر سے مضمون نگاری سیکھنے کا بھی موقع ملا اور چند کتابیں پڑھنے کا بھی۔ علامہ مغفور انہیں کوئی چھوٹی سی کتاب افسانوں وغیرہ کی دے کر فرماتے کہ اسے پڑھ کر بتاؤ اس میں کیا خوبیاں اور کیا خامیاں رہ گئی ہیں۔ زبانی نہیں تحریری معلوم کرتے تھے۔ پھر انہیں مشورہ دیا کہ رسالوں میں جو کتابوں پر تبصرے آتے ہیں انہیں

[illegible] سے پڑھا کریں۔ ۱۹۳۳ء میں آمنہ نازلی کو ادیب فاضل کا امتحان [illegible] دیا اور خود تین چار کتابیں پڑھائیں۔ ڈپٹی نذیر احمد [illegible] اور مولانا حالی کا مقدمہ شعر و شاعری۔ اور [illegible] علامہ حضور ایک گھنٹہ روز جو کو پڑھاتے ایک [illegible] مطلب بیان کرتے اور نثر کے ایک ایک پیرے کا [illegible] تشریح فرماتے۔ محاوروں کا مطلب بتاتے۔ [illegible] فصاحت کی خوبیاں ذہن نشین کرتے۔ تو ہوا یہ کہ [illegible] اس طرح ہوئی جو آمنہ نازلی ہی کی زبانی داستان [illegible] ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ریڈیو سے اُن کی تقریر [illegible] نے مضامین لکھنا اس طرح شروع کیا" یہ تقریر ماہنامہ عصمت ۱۹۳۷ء کے [illegible] میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ابتدائی حصہ یہ ہے۔

شادی کے بعد مجھے ماحول ایسا ملا جہاں میرے واسطے [illegible] تھا۔ ۱۹۳۶ء میں میں نے پہلا مضمون [illegible] لکھا اور اپنے خسر علامہ راشد الخیری کی خدمت [illegible] بغرض اصلاح لے گئی۔ پہلے اس مضمون میں ایک بچی کے [illegible] ڈوبنے کا واقعہ لکھا تھا۔ علامہ مرحوم نے مضمون [illegible] ملاحظہ فرمانے کے بعد فرمایا کہ" تم نے بچی کو دریا میں ڈبو تو دیا لیکن [illegible] پڑھنے والوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ بیکار اور فضول مضامین جن میں سوائے الفاظ کے کوئی جان نہ ہو نہ قوم کے لئے مفید ہو سکتے ہیں اور نہ مضمون نگار حصول مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لڑکی کے ڈوبنے کی وجہ ایسی بیان کرو جس کا کوئی نتیجہ نکلے۔ بچی کے ڈوبنے کی ذمہ داری اُس کی ماں پر ہے آخری فقرہ میں لڑکی کی موت کو ماں کی لاپرواہی کا نتیجہ قرار دے کر مضمون کو ختم کرو . . . . " میں نے اس بات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔"

آمنہ نازلی کی جب شادی ہوئی تو ان کی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی مگر ان میں صلاحیت تھی۔ انھوں نے اپنے خسر کے مشورہ کے مطابق مطالعہ جاری رکھا۔ بہت غور و توجہ سے ایک ایک کتاب اور ایک ایک مضمون پڑھتیں اور مضامین لکھنے کی مشق جاری رکھتیں۔ چند سال بعد ان کی تحریر میں ادبی شان پیدا ہو گئی۔ اور ان کے مضامین نہ صرف عصمتی بہنوں میں بلکہ ادبی حلقوں میں بھی پسندیدگی سے دیکھے جانے لگے۔ ۱۹۴۶ء میں جب ان کے مختصر ڈراموں کا مجموعہ دو شالہ شائع ہوا تو ادیبوں اور اخبارات و رسالوں نے اُن کی تحریر کو خراج تحسین ادا کیا۔ مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے اخبار انقلاب میں لکھا کہ" جذبات و کردار کی تصویر کھینچنے میں محترمہ آمنہ نازلی کو ملکہ خصوصی حاصل ہے زبان نہایت پاکیزہ۔ ظرافت بے پناہ۔ لیکن سنجیدہ۔ ڈرامے کی ترکیب اور ساخت بالکل فطری اور بے ساختہ۔ پھر بیبیوں اور عورتوں کی زبان بے حد دلفریب۔"

حیدرآباد دکن کے رسالہ ہندوستانی ادب نے لکھا کہ" روزانہ گھریلو واقعات کو فاضل مصنفہ نے اپنے طرز نگارش سے اس قدر دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ آنکھوں کے سامنے حقیقت آجاتی ہے۔ لطف یہ کہ تمام ڈراموں کے پلاٹ اور مکالمہ میں خالص ہندوستانی نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ زبان نہایت سادہ اور ستھری اس مجموعہ کو ہندوستانی ادب میں ایک اچھا اضافہ سمجھنا چاہیئے۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے اخبار صدق میں لکھا" محترمہ آمنہ نازلی ادیب نامور مولانا راشد الخیری کے گھر کا چراغ ہیں۔ کردار نگاری تصویر جذبات، واقعاتی تسلسل کی بنا پر یہ خاکے جاندار نظر آتے ہیں اور سلیس انداز بیان اور صاف ستھری زبان نے شگفتگی اور ادبی چاشنی پیدا کر دی ہے۔"

شمالی ہند ملتان۔" محترمہ آمنہ نازلی خوب لکھتی ہیں۔ ہندوستان بھر میں جو چند انشا پرداز خواتین ہیں ان میں

آمنہ نازلی صاحبہ بہت نمایاں درجہ رکھتی ہیں۔"

چمنستان دلی ؛ "محترمہ آمنہ نازلی ان مخصوص لکھنے والیوں میں سے ہیں جو کوئی نہ کوئی جدت اپنی تحریر میں لئے ہوئے ہیں۔"

علامہ مغفور نے مجھے بھی پڑھایا عبد الخالق مرحوم کو بھی اور صادق میاں کو بھی۔ صادق میاں نے لکھنا بھی باقاعدہ ابا جان سے سیکھا اور وہ اس طرح کہ وہ کسی افسانہ کا پلاٹ بتا کر کچھ سطریں لکھ دیتے اور پھر فرماتے اس طرح آگے لکھو۔ صادق میاں لکھ کر دکھاتے اور وہ اس میں ترمیم فرماتے کچھ حصہ رہنے دیتے۔ کچھ بدلنے کی ہدایات فرماتے۔ بعض الفاظ اور جملے نکال کر اُن سے بہتر الفاظ اور جملے بتاتے۔ جو تصحیح کی جاتی اس کی کیوں ضرورت ہوتی یہ بات صادق میاں کے ذہن نشین فرما دیتے شروع شروع میں صادق میاں کے جو افسانے شائع ہوئے ہیں وہ اسی طرح لکھے گئے تھے۔ صادق میاں بڑے خوش نصیب ہیں کہ انہیں والد مرحوم سے باقاعدہ مضمون نگاری سیکھنے کا موقع ملا۔ اُنہوں نے بہت جلد نوجوان ادیبوں میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا اگرچہ ترقی پسند ادب کے رجحان کی وجہ سے اُنہوں نے بعض افسانے ایسے بھی لکھے جو نہ لکھتے تو میری رائے میں بہتر تھا۔ ان کا انداز بیان، ان کی زبان، افسانوں کا پلاٹ، کردار۔ منظر نگاری، مکالمے غرض مجموعی حیثیت سے ان کے افسانے جاندار ہوتے تھے اور بڑے بڑے ادیبوں نے ان کی تحریر کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ دس بارہ سال تک ادبی دُنیا میں نام پیدا کر کے وہ ملازمت اور پھر کاروبار میں ایسے منہمک ہوئے کہ لکھنا ہی چھوڑ دیا۔

ایک خطرناک سازش

میرے دفتر میں ایک کاتب ۲۶ء سے کام کر رہا تھا وہ روزانہ دیکھتا کہ سو ڈیڑھ سو اور کبھی تین چار سو روپیہ کی ڈاک آتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں سے ذکر کرتا تھا۔ لالچ بُری بلا ہے اس کے چار دوستوں نے پانچ پانچ سو روپیہ جمع کئے اور اس کا برابر کا حصہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ عصمت کے خریداروں کے پتے چرائے۔ چنانچہ اس نے دفتر کے ایک نئے کلرک کو ملا کر خریداروں کے پتے چُرا لئے اور رہبر نسواں کے نام سے ایک زنانہ رسالہ نکالا جو گویا عصمت کا ہی چربہ تھا۔ البتہ ٹائیٹل کا فرق تھا اور یہ کہ رسالہ کا نام عصمت سے مشابہ نہ تھا دوسرا یہ کہ عصمت کے اڈیٹر رازق الخیری کا وجود نہ تھا۔ مگر اس رسالہ کی ایڈیٹر کا وجود ہی نہ تھا۔ نوے فیصدی زنانہ پرچوں کی اڈیٹر عورت ظاہر کر کے مرد ہی کام کرتے ہیں۔ اس لئے اس رسالہ کے اڈیٹر کا فرضی زنانہ نام درج کرنا نئی بات نہ تھی۔ چند دن ہی گزرے تھے کہ عصمتی بہنوں کے خطوط آنے شروع ہوئے کہ ہمارا پتہ سوائے دفتر عصمت کے کسی کو نہیں معلوم کیا یہ بھی دفتر عصمت ہی کا رسالہ ہے۔

جس کاتب اور نئے کلرک نے پتے چرائے تھے انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ تھی۔ میں نے اپنے دفتر کے کسی آدمی سے کبھی بداخلاقی نہ برتی تھی۔ کسی سے بدکلامی نہ کی تھی۔ کبھی کسی پر جرمانہ نہ کیا تھا۔ کئی کئی دن کی غیر حاضری پر بھی کسی کی تنخواہ نہ کاٹی تھی۔ تنخواہ دینے کی جو تاریخ مقرر تھی اس میں کبھی ایک دن کی دیر نہ ہوئی تھی۔ ۴۳ء کے بعد بھی آج تک کسی کو اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ شاید یہ وجہ بھی ہو کہ دفتر عصمت کے چپراسی نے دوسری جگہ کے ۲۵ روپیہ کے ۱۵ کو کلرک نے کسی اور اخبار یا رسالہ یا کتابوں کے دفتر کے ۶۰ پر دفتر عصمت کے ۴۰ کو اور کاتب نے دوسرے کاموں کے ڈیڑھ سو پر یہاں کے سو روپیہ کو ترجیح دی۔ اس کاتب اور کلرک کو میرے ہاں کوئی تکلیف نہ تھی اس لئے ان کے اس رکیک فعل کا مجھے بہت افسوس ہوا جب میرے پاس عصمتی بہنوں کے خطوط رہبر نسواں کے متعلق آنے لگے تو ان کی غلط فہمی دور کرنی میرا فرض

اندیشہ تھا کہ خواتین کے ان تیروں سے بچا نے
... تھایا جائے اس لئے نہ عصمت رہا ت
... عصمت کا اور کسی پرچے سے کوئی تعلق
... حوچہ دفتر عصمت میں درج ہے اس پتہ پر کوئی
... نہیں کچھ لینا چاہیئے کہ ان کا پتہ نا جائز ہے
... ہے جس اس جماعت کو نقصان پہنچا نا چاہ
... لوگوں کے نام لکھے : اس رسالہ کا نام۔ مگر میرے
... ج ہونے پر وہ حضرات بہت دشمن ہو گئے اور
... تیں ... شروع کر دیں۔ میرے کا رسالہ کو
... رج کرانے کی انتہائی کوششیں کی گئیں میں
... یہ تھا کہ اس جماعت نے حضرت والد مغفور
... ن پر شرافت سے گرے ہوئے حملے کرکے تربیت
... وجود کے سے انکار کر دیا۔ حضرت والد مرحوم
... انتہا درجہ کا تھا مگر ... ہیں جو سخت صدمہ ہو
... ج کو میرے بے انتہائی تکلیف دہ ہے۔
... رسالے کو نکلتے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ جو
... اس جماعت نے جمع کئے تھے وہ اور جو آمدنی ہوئی
... ختم ہو چکی تھی ساتھ لوگوں نے ڈیڑھ ہزار روپیہ بھیجا
... سائز پر تین رنگ کے بلاک کا ٹائیٹل چھاپ
... نمبر نکالا اور چھ سو وی پی خریداروں کو بھیجے
... ت کو وہ لوگ غلط سمجھے تھے۔ عصمت کی قوت
... کا اندازہ نہ تھا چھ سو میں سے شاید آٹھ یا نو وی
... وسے۔ اور ان حضرات کا سارا زور اللہ تعالیٰ نے

(عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر)

...ہیں جتنی دعائیں ناتوانوں کی دادا ابا نے جاڑوں میں
... ہوا کر نے دیکھا تو اپنے کپڑے اتار کر اسے پہنا دیے
تھے یہ واقعہ میں نے دادی اماں سے اور والد مغفور کی چھوٹی پھوپی
اماں قادرہ صاحبہ علیہ الرحمہ سے سنا تھا۔ ایسے ہی چند
واقعات والد مرحوم کے بھی ہیں اور واجدہ بیگم کے الفاظ
میں یہ ہیں۔

"ایک دفعہ ابا جان گھر سے ایک آدھی آستین کی روئی
کی صدری پہن کر نکلے تو خوب کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ واپس
گھر آئے تو خالی کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ اماں جان نے حیرت
سے پوچھا صدری کیا ہوئی۔ مسکرا کر کہنے لگے اسے ہی ایک بڈھا
خالی کرتہ میں کپکپا رہا تھا۔ اس کو دیدی۔"

پھر ایک دفعہ جاکر رضائی اوڑھ کر باہر نکلے کسی فقیر نما سے
کو دیکھا کہ وہ سردی میں سکڑ رہا ہے۔ اس کو رضائی دیدی۔ یوں تو
صدریاں رضائیں لحاف غریبوں کو تقسیم کرواتے ہی تھے لیکن
اپنے بدن کے کپڑے بھی اتار کر اکثر جاڑوں میں دے دیا کرتے
تھے۔ ایک دفعہ چھوپی اماں کے پاس سے جو چوڑی والوں کے
محلہ میں رہتی تھیں رات کو نو بجے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں
کسی اللہ والے کو دیکھا سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں اسے اچکن اتار کر
دیدی۔ گھر آئے تو اماں جان نے کہا اتنے زور کی سردی پڑ رہی
ہے اچکن کیا ہوئی"

کہنے لگے "ہاں نئی اچکن درزی کے ہاں سے آجائے گی
یہ اچکن پرانی ہو گئی تھی ایک ضرورت مند کو دے آیا وہ صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں کے والد احمدی مرحوم کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

متاع بے بہا ہے دستگیری نیم جانوں کی
خریدا کر ملیں جتنی دعائیں ناتوانوں کی

جوہرِ نسواں خاتون اکرم جنت مکانی کی یادگار عصمتی انعامات
ہر سال مضمون نگاروں میں تقسیم ہو رہے تھے۔
اور آج تک تقسیم ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود میں مرحومہ کی ایک
مستقل یادگار ایک نئے پرچے کی صورت میں بھی قائم کرنی

چاہتا تھا اور اس کے لئے سنہ ۲۳ء میں مینے چار ہزار روپیہ کی رقم الگ محفوظ کردی تھی۔ انہیں دنوں مجھے یہ خیال ہوا کہ لڑکیوں کا آدھے سے زیادہ وقت اسکول کی نذر ہوجانے کے بعد اُمور خانہ داری بالخصوص سینے پرونے کاڑھنے بُننے اور کھانے پکانے کا فن سیکھنے کا موقع انہیں کم ملتا ہے۔ زنانہ دستکاری کی جو کتب سنہ ۱۹ء سے میں شائع کر رہا تھا۔ اُن کی مقبولیت دیکھ کر بھی میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایسے رسالہ کی عورتوں کے لئے ضرورت ہے جو انہیں دستکار اور ہنرمند بنا سکے اور چونکہ خاتون اکرم مرحومہ خود بہت اچھی دستکار تھیں۔ اور اُونی کام کاربٹ کا کام کروشیا اور تارکشی کے کام کی ماہر تھیں اس لئے ان کی یادگار ایسا پرچہ موزوں رہے گا۔ مینے یہ خیال والد مغفور پر ظاہر کیا تو اُنہوں نے پسند تو کیا مگر یہ بھی فرمایا کہ تم اکیلے کیا کیا کام کروگے۔ اتنا بڑا اشاعت گھر ہے۔ دو دو رسالوں کی اڈیٹری ہے صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح جُتے رہتے ہو نیا رسالہ نکالوگے تو کام اور بڑھ جائے گا۔ منیجر نائب منیجر تو ہیں معاون اڈیٹر کا انتظام اب کرنا چاہئے۔ بہرحال تجویز مناسب ہے اور میرا خیال ہے یہ نیا رسالہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ معلوم ہوکر مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے اس کے لئے چار ہزار روپیہ الگ محفوظ کر لئے ہیں۔ مگر کیوں صاحب یہ چپکے ہی چپکے ہمیں خبر بھی نہیں کی۔"

اپریل سنہ ۳۴ء کے عصمت میں مینے نئے رسالہ کی تجویز شائع کردی مگر ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا کہ اگر واقعی خواتین کو ایسے رسالہ کی ضرورت ہوئی تو میں یہ رسالہ نکالونگا ورنہ نہیں۔ ایک مہینے کے اندر ہی ڈہائی تین سو خطوط میرے پاس آگئے کہ یہ رسالہ جلد سے جلد جاری کیا جائے ستمبر سنہ ۳۴ء میں اس کا پہلا پرچہ شائع ہوا تو خواتین میں اس کی دھوم مچ گئی۔ اس کا سرورق دبیز آرٹ پیپر پر بلاکوں کی رنگین چھپائی کا تھا۔ آخری صفحہ پر بلاکوں کے نمونے۔ مضمونوں اور نمونوں کا کاغذ سفید چکنا۔ لکھائی چھپائی مصوری اچھی دیدہ زیب پہلا سالگرہ نمبر سنہ ۳۵ء میں شائع ہوا تو جوہرِ نسواں کے مستقل انفرادی سالانہ خریدار پونے دو ہزار کے قریب تھے عصمت و بنات کی طرح جوہرِ نسواں بھی دفتری کے ہاں سے دفتر آتا تو سب سے پہلے حضرت علامہ مغفور کے لئے ملاحظہ کے لئے بھیجا جاتا اور وہ اسے دیکھ کر خوش ہوتے کہ عورتوں کے لئے ایک اور پرچہ ان کی سرپرستی میں مفید کام کر رہا ہے۔ جوہر نسواں کے متعلق علامہ مغفور نے دو تین دفعہ زریں مشورے بھی دئے۔ پہلا سالگرہ نمبر دیکھ کر فرمایا تھا "انشاءاللہ یہ بھی نکلتا رہے گا۔"

جوہرِ نسواں کی مسلسل اشاعت کو اگست سنہ ۶۴ء میں تیس سال ہوجائیں گے۔ اس پر بھی عصمت و بنات کی طرح بہت سخت وقت آئے ہیں مگر اس کی اشاعت میں ۳۰ سال کے طویل عرصہ میں کبھی ایک دن کی بھی دیر نہیں ہوئی۔ اور اس رسالے نے سو بچاس نہیں ہزاروں لڑکیوں اور عورتوں کو دستکار سگھڑ اور سلیقہ شعار بنادیا۔

رسالوں اور کتابوں کے نام

ستمبر سنہ ۳۴ء میں مینے زنانہ دستکاری کا رسالہ جوہرِ نسواں جاری کیا۔ اس کا تیسرا یا چوتھا پرچہ شائع ہوچکا تھا فرمایا ہے "اخباروں اور رسالوں کا نام تو ایک لفظی ہی اچھا معلوم ہوتا ہے اور کتابوں کا نام دو لفظوں کا۔"

علامہ مغفور نے جو رسالے جاری کئے عصمت تمدن سہیلی بنات سب کا نام ایک ایک لفظی تھا۔ تصانیف میں ۷۰-۸۰ کے سوا سب کتابوں کے نام دو دو لفظی ہیں ایک ایک لفظ کے نام صرف چار کتابوں کے ہیں الزہرا۔ موؤدہ۔ سنجوگ سنوبتی۔

ہندی والوں کا ایک وفد

سنہ ۳۵ء میں جب جوہرِ نسواں کے

کبھی صبح کے سلام کے لئے حاضر ہونے میں آٹھ بج جاتے تو اکثر فرماتے "ساری نحوست اس گھن بیری کی ہے۔ یہ خرفیوں کے اُٹھنے کا وقت ہے۔"
(دوام راشد صفحہ ۱۹)

طیارہ کی سیر کی اجازت نہیں ملی

سنہ [illegible] یا سنہ [illegible] میں اشتہارات تقسیم ہوئے کہ دس روپیہ میں ہوائی جہاز میں بیٹھ کر شہر کی سیر کی جا سکتی ہے۔ قاری عباس حسین صاحب، مفتی شمسی صاحب اور ان کی جرمن بیوی نے یہ ذکر کیا تھا۔ میں نے دوسرے روز انہیں مدعو کیا اور جب یہ تینوں آ گئے تو میں جانے کے لئے تیار ہو کر حضرت والد مرحوم سے اجازت لینے حاضر ہوا۔ میں عصر کے بعد ہوا خوری کو جایا کرتا تھا اُس وقت ۴ بجے تھے۔ بے وقت باہر جانے کے لئے مجھے تیار دیکھا تو فرمایا "ابھی سے کہاں جا رہے ہو؟" میں نے عرض کیا "کچھ نہیں ذرا ہوائی جہاز کی سیر کریں۔ قاری صاحب بھی آئے ہوئے ہیں اور میاں معین اور میم صاحب بھی۔ سوا ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔"

فرمایا "کس کی اجازت سے تم نے انہیں بلایا ہے اور یہ خیال تمہارے دل میں پیدا ہی کیوں ہوا کہ ہوائی جہاز کی سیر کروں۔ جی نہیں آپ نہیں جا سکتے۔ اور قاری کی تو اچھی طرح خبر لوں گا۔"

میں ہنستا ہوا واپس ملاقات کے کمرے میں داخل بھی نہ ہوا تھا کہ قاری صاحب ہنس رہے اور فرما رہے تھے۔
"نہیں ملی نا اجازت؟"
"نہیں ملی"
"میں نے تو پہلے ہی میم صاحب سے میاں معین سے کہہ دیا تھا کہ مولوی صاحب اجازت نہیں دیں گے۔ اور تمہیں یقین نہیں تو ابھی چلو اپنی بھابی سے پوچھ لو۔ ان سے یہی کہہ کر آیا ہوں۔ کہ آج رازق صاحب پر مولوی صاحب خفا ہوں گے۔"

"خیر آپ کی بھی نہیں ہے۔ آپ سے جواب طلب ہوگا۔"
پھر ہم تو چاہتے رہے اور ملازم لڑکے نے دو دفعہ آکر دیکھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔
پانچ بجے کے قریب میں پھر حاضر ہوا اور عرض کیا "اچھا سینما ہو آئیں۔"
فرمایا "ہاں چلے جاؤ۔ اگر معین کی میم نہ آئی ہوتی تو میں کہتا سعد میاں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ کل یا پرسوں اُسے سینما دکھا دینا۔"
اور بجائے طیارہ میں سیر کرنے کے سینما دیکھا اُس وقت میں تین بچوں کا باپ تھا۔

خالہ صبرا

واجدہ بیگم لکھتی ہیں کہ ابا جان بزرگوں کا بہت لحاظ کرتے چھوٹوں پر شفقت فرماتے اور غریبوں سے ہمدردی۔ غریب رشتہ داروں سے نہایت محبت اور عزت سے ملتے اور ان کی خوشی میں شریک ہوتے اور بیماروں کی عیادت کو جایا کرتے تھے۔ ہاں امیر رشتہ داروں سے بس رسمی مل لیتے تھے خالہ صبرا اماں کی دور پرے کی رشتہ دار تھیں ان کے بیٹے پنجاب میں کام کرتے تھے اور منی آرڈر ابا جان کے نام کیا کرتے تھے۔ بعض دنوں میں تو خالہ صبرا قریب قریب روز ہی آیا کرتی تھیں ابا جان کی ہنسی مذاق کی عادت تھی۔ ان سے کہتے "لو بی آپا اب اپنے دو بول تو پڑھ ڈالو" وہ نانی دادی تھیں مگر محض اُن کو ہنسانے کے لئے کہا کرتے تھے "لو چلمن میں سے دیکھ لو۔ چاہے جس مفتی کو پسند کر لو۔" آخر ایک دن اُن سے "ہاں" کی گردن ہلوا ہی لی جس پر سارا گھر خوب ہی ہنسا۔

چیزوں کی قیمتیں

علامہ مغفور کے بچپن میں چیزوں کی جو قیمتیں تھیں ۳۵ — ۴۰ سال بعد یعنی سنہ [illegible] کے لگ بھگ تو تیوڑی ہو گئی تھیں۔ اور چوتھائی صدی بعد سنہ [illegible] میں سنہ [illegible] کے مقابلہ میں دوگنی تگنی ترتیب

لاہ منظور نے سنہ میں تحریر فرمائی تھی۔ اس زمانہ میں
ا جو بھاؤ تھا اُس کا مختصر سا ذکر ایک پڑھے لکھے کرخندار کی
طرح ہے:۔

ایک دفعہ کارخانہ دار کے یہاں کوئی آدمی بہار سے
اُنہوں نے کہا تھا وہاں آٹا چھ سیر کا ہے تو میں چونک
روپیہ کا چھ سیر، تو صاحب یہ خبر تھی کہ ہم کو پانچ
بیسہ نہ ہوگا۔ غضب خدا کا آدمی کو کوئی ڈیڑھ سیر بھی
تھا پانچ آنے اور چھ آنے۔ دھوبیوں کا وہ زور ہے
ہے۔ نائی کو گھر پر بلاؤ تو چار آنے مانگتا ہے چنگن
ن خاں کی جنی بنی ہوئی ہے۔ پھر ساہوکار تو جو کریں
ج سے شام تک پاولی دھیلی کماتے تھے۔ سر آتی تھی
آتی تھی۔ اچھے سے اچھا کھانا اور بہتر سے بہتر پہننا۔
نہ دینا ..... خدا کی قدرت ہے روپیہ کا آٹھ کپڑے
رالے آؤ۔ پوٹلی میں رکھ لو ..... میں کوئی تیرہ برس
گا خاصے ہوش کی بات ہے ..... ہم صبح ہی کام پر چلے
ادھر جاکر پاڑواڑ لگائی۔ اُدھر ملٹے کو دو پیسے دے
جاکر پراٹھا پکوالا۔ کوئی تیس چالیس کاری گر تھے۔ دو
پیسے سکے ملائے جاتے تھے۔ روپیہ سوا دو پیسے کے ٹکے
لئے۔ مساکر کے ڈیڑھ گھنٹہ لگتا تھا سلٹہ گرم پراٹھے اور
ملے آتا تھا۔ اب اس کا حساب سُنو تو عقل دنگ رہ جاتی
۔ ایک پیسہ کا آٹا ڈھائی پاؤ۔ سوچو تو سہی دھیلے کا گھی آدھی
انک۔ دمڑی کا شوروا۔ آدھی پکوائی۔ آدھی کا پان۔ اب
سا نہیں کہ ایک پراٹھا آدمی پورا کھالے جو بچ گیا وہ خلے کے
غربا کو۔ ستہ بھنگی کو ..... دو بجے ذرا بھوک لگی کا چبن
دمڑی کے کچالو بنوا لئے آج چار پیسے کے بھی اتنے
ملیں گے۔ انار پیسے کے آٹھ آٹھ۔ امرود پیسے کے دو سیر
بیر جو آج پانچ چھ آنے سیر آتے ہیں ہم نے سوا پیسہ سیر
کھائے ..... شام کو مزدوری ملی بستے میں پیسے کی ریوڑیاں
بچوں کے لئے لیں۔ کبھی پیسے کی گنڈیریاں پیسے کے سنگھاڑے
غرض سیر دو سیر سودا لے لیا ..... پرسوں دلدار آم لایا تھا
روپیہ کے چار سنگھاڑے۔ یہ ہمارے عمل کا پھل ہے۔ سمت ۱۹۰۰
کا کال پڑا ..... لیکن بارہ سیر کا آٹا تھا۔ سونا اس روپیہ تولہ
بک گیا تھا ..... اب کیا ذکر ہے مٹی کا بورا تین آنہ کو
ہم نے ہمیشہ ڈیڑھ روپیہ کا لیا ..... آج کوئی چھٹا دن ہے۔
چھوٹی سی کھٹولی بنوائی تھی ..... کھٹ بُنا کہنے لگا ....
چھ آنے سے کم بنائی کرنے کا۔ جی میں آیا ایک دو ہتھڑ لگا رسید
کروں کہ عمر بھر یاد رکھے ..... کھٹولی کی مزدوری دو پیسے۔ بڑی
چارپائی کا بھی ایک آنہ ایسا ہی جگا دہری پلنگ ہوا دو پیسے اور
سہی یہ بھی کوئی غضب ہے کہ کھٹولی کے چھ آنے ...... یہ
دو گز نے جو لئے تھے تین روپے لگ گئے۔ بھلا غور تو کرو
ڈیڑھ دو آنہ گز کا کپڑا بکنے لگا۔ ململ بارہ آنے اور نیچا چودہ آنے
..... یہ تمہاری برابر والی جاجم دُکانیں بنا کر ڈھائی
سو روپیہ ہے ہمارے سامنے مرزا مغل کے پاس تباؤ کے کام
میں پندرہ روپیہ کو تھیں۔ دریہ سب ہنگی ہنگی ہو رہے تھے۔ اب
ڈھائی سو میں کوئی اُف بھی نہیں کرتا کہ کیا ہو رہا ہے"

اشیا کی قیمتیں پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے
دوران میں بڑھی تھیں۔ ہر چیز کی قیمت پر آگ پڑ رہی تھیں۔
لڑائی کے بعد بعض چیزوں کا بھاؤ گر گیا تھا۔ مگر پھر چڑھتا چلا گیا
اور ۱۹۰۰ء کے مقابلہ میں ۱۹۲۲ء میں چیزوں کی قیمتیں آسمان سے
باتیں کر رہی تھیں۔

گھی خالص اور اصلی ذرا مشکل سے ملتا تھا۔ ورنہ کچھ نہ
کچھ ملاوٹ ضرور ہوتی تھی۔ پونے دو روپیہ سیر۔ دودھ
چار آنے سیر۔ بکرے کا گوشت چار آنے سیر
اور گائے کا گوشت تین آنے سیر۔ گیہوں کا رواج دلّی میں

کم ہوگیا تھا۔ عام طور پہ آٹا ایک روپئے سے خریدا جاتا تھا اور روپیہ کا دس سیر۔ دالیں ڈھائی تین آنے سیر۔ چینی چار آنے سیر۔ گڑ تین آنے سیر۔ باسمتی چاول چار آنے سیر۔ گھی ایک روپے کی ساڑھے پانچ سیر۔ سرسوں کا تیل آٹھ آنے سیر۔ مٹی کے تیل کی بوتل چھ پیسے کی۔ بڑے آلو دو آنے سیر۔ بھُجیا کے چھوٹے آلو چقندر شلجم چھ پیسے سیر۔ گوبھی کا پھول بڑا۔ دو آنے کا۔ مٹر کی پھلیاں دو آنے سیر۔ لٹھا ڈیون چھ آنے گز۔ بہین ململ بڑے عرض کی چار آنے گز۔ کچی ململ ایک روپیہ کی ۵ گز۔

جہازی چھالیہ ایک روپیہ کی ڈھائی سیر۔ کتھہ دو روپیہ سیر۔ قلعی تانبے کے چھوٹے برتن روپیہ فی پتیلی اوسط درجہ چار پیسے۔ اُپلوں کا گٹھا من بھر کا آٹھ آنے۔ لکڑیاں روپیہ کی چار من۔ پانی کی مشک دو پیسے۔ مٹھائی گھی کے بھاؤ۔ ماما کی تنخواہ چھ روپے اور خشک تنخواہ بغیر کھانے کے بارہ روپے کرایہ کا جو مکان سنہ۱۹۳۰ء میں ۷۰ روپیہ میں ملتا تھا وہ سنہ۱۹۳۳ء میں ۴۰ روپیہ سے کم کرایہ پہ ملتا تھا۔ سلیم شاہی جوتی دو ڈھائی روپیہ کی آتی تھی مگر اس کا رواج بہت کم ہوگیا تھا۔ اور فونو اوسط درجہ کا ۷، ۸ روپیہ کا آتا تھا۔ پوسٹ کارڈ دو پیسے۔ لفافہ چار پیسے۔ کالی سیاہی کا رواج بہت کم ہوگیا تھا۔ نیلی سیاہی کی ٹکیاں پیسہ پیسہ آتی تھیں ہولڈر مع نب چھ پیسے۔

سفید کاغذ کا ایک دستہ تین آنے۔ مونگ پھلیاں بسکٹ سنگھاڑے۔ گنڈیریاں۔ امرود۔ لوکاٹ۔ آڑو۔ فالسے سنہ۱۹۳۰ء میں جتنے ایک پیسے کے آتے تھے چوتھائی صدی بعد اُن کی قیمتیں چوگنی سے کم نہیں۔ درزی۔ نائی۔ دھنیے۔ کھٹ بُنے۔ بڑھئی لوہار۔ سُنار۔ راج۔ بیلدار۔ سقہ۔ بھنگی سب نے سنہ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں کئی گنی اجرت بڑھا دی تھی۔

موسیقی اور صادق میاں کی دلچسپیاں

علامہ مغفور کو موسیقی سے لڑکپن ہی سے دلچسپی تھی۔ شادی کے بارہ تیرہ سال بعد انہوں نے ستار بجانا چھوڑ دیا تھا مگر بانسری آخر وقت تک کبھی کبھی بجایا کرتے تھے۔ لڑکیوں سے نظمیں ترنم سے سُنتے اور خود بھی میر حسن کی مثنوی، غالب، حالی، داغ وغیرہ کی غزلیں لے سے پڑھتے تھے۔ جوانی میں ان کے خالہ زاد بھائی حامد علی خاں مرحوم اور بھلنجے سید انیس الرحمن اکثر انہیں گانا سُناتے تھے۔ انتقال سے دو ہفتے قبل فرمائش کر کے میری چھوٹی سالی ماجدہ سے میرے بھتیجے معین احسن جذبی کی وہ غزل سُنی جس کا مطلع ہے۔

مرنے کی دُعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا اب دُنیا دنیا کون کرے

مجھے موسیقی سے زیادہ کرکٹ سے دلچسپی رہی اور میٹرک کے بعد کئی سال کرکٹ کھیلا۔ سنہ۱۹۳۳ء یا سنہ۱۹۳۴ء میں ایک فلم آئی تھی شکنتلا میں نے یہ تصویر سات دفعہ دیکھی۔ اس میں ایک موقع پر ستار بجایا جاتا تھا۔ بس یہ ستار سُننے کے لئے میں ۶ دفعہ اور گیا اور جب وہ منظر ختم ہو جاتا واپس اٹھ کر چلا آتا۔ والد مغفور سے میں نے اس فلم کا اور ستار کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی وہ فلم دیکھی اور گھر آکر فرمایا واقعی خوب بجاتا ہے۔ ابا جان اکثر فرماتے تم بہت بد مذاق ہو کوئی ساز نہیں سیکھا اور میں عرض کرتا پہلے شطرنج اور پنگ پانگ (ٹیبل ٹینس) کھیلتا تھا میٹرک کے بعد کرکٹ کھیلا پھر شوق ہوا کار چلانے کا اب ساز سیکھنے کے لئے وقت کہاں سے لاتا پھر ایک دن میں نے کہا صادق میاں انٹر میں پہنچ گئے کوئی کھیل نہیں کھیلتے۔ گانے کا بھی شوق نہیں۔ کوئی ساز ہی سیکھ لیں۔ فرمایا "تم بڑے بھائی ہو کیوں انتظام نہیں کرتے"۔ اس زمانہ میں حبیب سیٹھ کی تھیٹریکل کمپنی دلّی میں تھی۔ اس کے ڈائرکٹر سے میں ملا۔ اور صادق میاں کے لئے وائلن سکھانے کا انتظام کیا۔ جو شخص انہیں ہفتے میں دو دن سکھانے آتا تھا وہ پارسی تھا اور اپنے فن کا ماہر

ر صادق میاں اچھا خاصا وائلن بجانے لگے تھے
انے سے اُن کی طبیعت کو اتنا بھی لگاؤ نہ تھا
تھا۔ کچھ روز وائلن بجایا اور پھر چھوڑ دیا۔ والد
سنہ ء میں ان کو گراموفون خرید کر دیا بہت سے
ے ریکارڈ بھی منگائے۔ یہ شوق بھی چند روز رہا۔
گراموفون سے زیادہ صادق میاں کو اپنے دوستوں
تی یہ سب ترقی پسند نوجوان ادیب تھے ان کے ساتھ
بل کا وقت بہت اچھا گزرتا زیادہ تر لکھنے پڑھنے
یں ہوتیں اور کبھی کبھی شرارت بھی سوجھتی۔

صادق میاں کو تھیٹر کا ہمیشہ سے شوق رہا۔ جو تر
ڈرامہ دیکھنے میں کبھی انہوں نے تامل نہیں کیا۔
دوست سب ہی نوجوان ادیب تھے۔ دو یا تین
حضرات نے ڈرامہ بھی کیا اور ایکٹنگ بھی کی۔ مگر
میاں نے اس "مظاہرۂ فن" میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

جو پابندی میرے لئے تھی وہ اُن کے لئے بھی رہی
نا سے قبل وہ ہمیشہ گھر آجاتے تھے خواہ ان کے
ی صحبت کتنی ہی دلچسپ ہوتی۔ والد مغفور کی حیات
صادق میاں رات کو دو تین گھنٹے ضرور پڑھا لکھا کرتے تھے۔

ڈراما نہیں لکھا

افسوس ہے علامہ مغفور نے کوئی ڈراما نہیں لکھا گو اُن کے متعدد
نوں اور ناولوں میں ڈرامائی عنصر موجود ہے۔ اُن سے
ا لکھوانے کی دو دفعہ کوشش کی گئی مگر بارآور ایک دفعہ
نہ ہوئی۔ سنہ سنہ کے زمانے میں دلی میں دو پختہ
پڑیکل ہالز تھے ایک راما تھیٹر کہلاتا تھا اور یہ چاندنی چوک
کوتوالی اور سنہری مسجد کے سامنے فوارے کے بالکل قریب
ا۔ سنہ ء میں وہاں جو سینما گھر تھا اس کا نام اس وقت
یاد نہیں۔ دوسرا جامع مسجد کے قریب مچھلی والوں کے
پاس ایڈورڈ پارک کے سامنے سے ذرا ہٹا ہوا سنگم تھیٹر تھا۔
جو سنہ میں جگت سینما کہلاتا تھا۔ سنہ و سنہ میں
اس میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی اور اس کے مالک
کا نام تھا حبیب سیٹھ ان صاحب کو میں نے کئی بار والد مرحوم کی
خدمت میں حاضر ہوتے دیکھا تھا اور اُن کی فرمائش پر انہوں نے
ایک ڈرامہ لکھنا شروع کیا تھا شاید اس کا پہلا شعر یہ تھا۔

بے خبر کیوں خاموش ہو۔ یہ آج ہے کیسا ماجرا
کیوں دوستوں سے کچھ کہا ناراض ہوئی یا ماجرا

ایک منظر میں ڈرامہ کی ہیروئن شوہر کے مظالم یا
ساس کی زیادتیوں سے تنگ آکر گھر سے نکلتی ہے اس کے
ساتھ دو بچے ہیں وہ انہیں بھیک کے سوکھے ٹکڑے کھلا رہی
اور گا رہی ہے۔

: حد ہو گئی کیا مقدر ہر آنی

ڈرامہ کا تھوڑا ہی حصہ لکھا تھا کہ علامہ مغفور کا جان یار
بیٹا باسط بیمار پڑا اور داغِ مفارقت دے گیا۔ ڈرامہ رہ
گیا اور عصمت و تمدن کی اشاعت میں بے قاعدگی ہونے لگی۔

نومبر سنہ میں حیدرآباد دکن کے چند تعلیم یافتہ افراد
قومی خدمت کے جذبہ کے تحت ایک ڈرامہ اسٹیج کرنا چاہتے
تھے۔ کوئی صاحب تھے سید افتخار حسین صاحب کوچہ گزاری صاحب
دارالشفاء کے۔ اُن کا خط میرے نام آیا تھا:۔

"علامہ صاحب قبلہ کی تحریر مقبول عام ہے۔ اور خصوصاً
حیدرآباد دکن میں اُن کی قابلیت عظمت اور وقعت اور
خاص عزت ہے۔ اور علامہ صاحب قبلہ خود حیدرآباد تشریف
لا چکے ہیں اور یہاں کی پبلک کے مذاق اور علمی رجحان سے
واقف ہیں اس لئے علامہ موصوف سے بڑھ کر ہم کو اس وقت
اس قومی امر میں مدد دینے والا اور کوئی نہیں مل سکتا۔ اگر
علامہ صاحب مدد فرمائیں گے تو ہم پوری طرح اپنے مقصد

میں کامیاب ہوں گے۔ یوں تو بہت سے ڈرامے موجود ہیں۔ اور دوسرے حضرات کو تکلیف دے کر لکھوائے جا سکتے ہیں مگر وہ زورِ قلم اور حقیقی جذبات اور وہ دل کو لگنے والی باتیں نہیں ہوں گی جن کا دل متمنی ہے۔"

سید انتصار حسین صاحب کے دو خط پرانے کاغذات میں سے برآمد ہوئے ہیں اور علامہ مغفور کا جواب بھی۔ دوسرا خط براہِ راست علامہ مغفور کے نام تھا۔ اور انہوں نے جو جواب لکھوایا تھا وہ جوں کا توں ان دونوں خطوط کے ساتھ ہے لیکن جواب کے آخر میں علامہ مغفور کے دستخط نہیں ہیں۔ اب مجھے یاد نہیں کہ یہ خط صاف کروا کر دستخط کر کے بھجوایا تھا یا خط بھیجنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کیونکہ اس زمانہ میں کئی ہفتے طبیعت ناساز اور سست رہی تھی بہرحال جواب یہ تھا۔

"مکرمی۔ سلام مسنون

کاش آپ بجائے میرے کسی جوان تندرست اور ایسے شخص کا انتخاب فرماتے جو زیادہ مصروف نہ ہوتا تو آپ کو زحمت انتظار نہ ہوتی۔ میں آج نوروز سے بخار میں مبتلا ہوں۔ صبح کچھ کمی ہوئی اس نے پہلا کام آپ کے گرامی نامہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔

یہ کچھ مجھ پر منحصر نہیں۔ ہر لکھنے والے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تحریر اگر بے مثل دکھائی نہ ہو تو پڑھنے کے قابل تو ہو۔ ان حالات میں پچھلے مضامین کا انتخاب نہ اس اعتبار سے موزوں ہوگا نہ اس لحاظ سے کہ اس میں نئے کام سے کم محنت نہ ہوگی۔

میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ میری کوشش یہ ہے کہ میری بقیہ زندگی کا ہر لمحہ میرے مدرسہ میں صرف ہو۔ اور میں اب جب تک زندہ رہوں ان یتیم و نادار بچیوں کے واسطے۔ اس لئے میں جو کچھ کر رہا ہوں یا کروں گا وہ ان ہی کے لئے۔

میں ڈرامہ کا مستقل حق تصنیف کسی حال میں نہ دوں گا۔ آپ ایک مدت کا تعین فرما سکتے ہیں۔ اس عرصہ تک آپ کو یا آپ کی انجمن کو یا اس جماعت کو جو حق لے رہی ہوگی کہ آپ اس کا استعمال فرمائیں لیکن حق نہ ہوگا کہ آپ کسی کمپنی یا دوسری انجمن یا جماعت کے پاس اس حق کو منتقل کر دیں۔ جیسے تین سال کے واسطے آپ کو یہ حق دے سکتا ہوں۔ اور اس کا معاوضہ پندرہ سو روپیہ لوں گا۔ اور شرائط کی منظوری کے بعد آپ خود یا کوئی ذمہ دار صاحب بغرض مشورہ و اصلاح نصف ڈرامہ ہو جانے پر میری طلبی پر تشریف لائیں گے اور تبادلۂ خیالات کریں گے۔

میں زیادہ سے زیادہ دو مہینے میں ڈرامہ ختم کر دوں گا مگر کوشش یہ کروں گا کہ چھ ہفتے سے زیادہ صرف نہ ہوں۔

اگر آپ یا آپ کی جماعت میں سے کوئی صاحب پلاٹ لکھنا چاہیں تو شوق سے لکھ دیں میں دیکھوں گا کہ کس حد تک اس سے متفق ہو سکتا ہوں۔

آپ کو غالباً اس کا علم ہوگا کہ میرے خیالات میں قدامت کا رنگ غالب ہے۔"

صادق میاں کی علالت

جون ۱۹۳۰ء میں صادق میاں بی اے کے امتحان سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اب سے دوسرا ٹائیفائڈ بخار میں مبتلا ہو گئے۔

سعد میاں کو اب سے دو ۱۹۲۹ء میں ٹائیفائڈ بخار ہوا تھا اور ان کی تیمارداری بڑے اہتمام سے کی گئی تھی۔ بخار اترنے کے بعد کی احتیاط اچھی طرح نہ کی جائے تو بخار پھر آ جاتا ہے اور وہ ہوتا ہے بہت خطرناک۔ مریض چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ چلنے پھرنے اور کھانے کو اس کا جی بہت چاہتا ہے اور انہیں دونوں باتوں کی احتیاط سخت کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل و کرم

"میاں صادق کی بیماری میں مولانا اپنا سکھ چین بھول گئے تھے - رات رات بھر جاگتے تھے اور ان کی پٹی سے لگے بیٹھے رہتے تھے - چچی صاحبہ اگر فرماتی بھی تھیں کہ اب تم سو رہو میں جاگ رہی ہوں تو کہتے کہ نیند اچاٹ ہو گئی - ایسی خدمت کی کہ کوئی نرس بھی کیا کرے گی - ذرا ٹھنکا ابھرا اور اُن کی جان بے کل ہو گئی - مولانا ہی کا دل گردہ تھا کہ اُنھوں نے اس ضعیفی میں دن رات ایک کر دیا اور اپنی جان کو جان نہ سمجھا - غفلت ہو گئی ہے یا مریض کی آنکھ جھپک گئی ہے تو اب گھنٹے پر مولانا کی ٹکٹکی لگی ہوئی ہے کہ اُس کی بات کی آواز سے مریض کے آرام میں خلل نہ پڑ جائے - چنانچہ جب بجنے کا وقت ہوتا تھا تو آواز دینے والے تار اور ننھی سی ہتھوڑی کے بیچ میں اُنگلی رکھ دیتے تھے - خدا جانے یہ پہاڑ سی گھڑیاں مولانا نے کس طرح گن گن کر کاٹی ہوں گی۔"

صادق میاں کی اس علالت میں ان کی بھاوج آمنہ نازلی نے دیور کی جو خدمت کی آج ۲۸ سال بعد بھی مجھے یاد ہے - گھر میں بیٹیاں بھی تھیں بھانجیاں بھی مگر نانا مغفور کو اعتماد سب سے زیادہ بہو پر تھا کہ ۹ بجے سے بارہ بجے تک ۳ گھنٹے رات کو تیمارداری کے فرائض اُن سے انجام دلواتے - اور جب بارہ کا وقت ہو جاتا تو فرماتے "بس بیٹی جاؤ تم سو رہو اب میں جاگوں گا۔" سوتے وہ اس سے پہلے بھی نہ تھے - مگر ان تین گھنٹے کی ذمہ داری بہو کے سپرد کر دی تھی کہ مریض کی خبرگیری میں کسی قسم کی ہلکی سی بھی غفلت نہ ہو سکے - صادق میاں بھی بھاوج سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ اُن ہی کے ہاتھ سے دوا پیتے، وہی پھل شوربا وغیرہ دیتیں اور وہی ہاتھ دھلاتی تھیں۔

شملہ میں دس دن

والدہ معظمہ کے منجھلے بھائی کپتان مولوی حبیب الرحمٰن مرحوم کی حکومت میں بڑی عزت تھی - اور ان کی فوجی خدمات کے صلہ میں بڑے بڑے خطابات دئے گئے تھے - کمشنر ضلع کو افسر تک سب ہی ان کی عزت کرتے تھے - مگر امر واقعہ یہ ہے کہ انسان بھی بہت اچھے تھے - بہت بھولے بہت سیدھے جھوٹ شاید انھوں نے کبھی بولا ہی نہیں - مجھ پر جو شفقت فرماتے تھے اُس نے کسی حد تک مجھے گستاخ بھی کر دیا تھا۔ اور ان کے ذاتی معاملات میں بھی میں دخل دینے لگا تھا۔ سنہ ۳۵ء کے شروع میں جو ایک دن میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا مجھے آپ سے ایک پیاری شکایت ہے - اگر آپ نے اماں سے ذکر کر دیا تو ابا مارے جوتوں کے بھرتا کر دیں گے - اور اس گستاخی کی سزا میں شاید گھر سے ہی نکال دیں۔"

کہنے لگے کہ "میاں تم بے کھٹکے یہ باتیں تو چھوڑو - میں کسی سے کچھ نہ کہوں گا - بتاؤ تمہیں وہ کیا شکایت ہے جو پیاری بھی ہو سکتی ہے"

میں نے عرض کیا آپ کے احسانات اپنے سب بھائیوں پر ہیں - میں نے تو یہ سُنا ہے کہ نانا ابا نے انتقال کے وقت یہ فرمایا تھا کہ میرے پاس جو کچھ روپیہ تھا سب خانۂ خدا میں لگا دیا اور جھنجھر میں جامع مسجد بنا دی - جائداد میرے پاس اب کچھ نہیں - سب سے بڑی جائداد میں حبیب الرحمٰن کو چھوڑ کر جا رہا ہوں" ہنسنے لگے اور فرمایا "بندۂ خدا جو لوگ دنیا میں نہیں رہے اُن پر تو تہمت نہیں تراشنی چاہیئے"

میں نے عرض کیا "جناب یہ میرے الفاظ نہیں ہیں - میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا سنی سنائی بات کہہ رہا ہوں اور واقعی آپ اپنے بھائیوں کے لئے جائداد ہی تو ثابت ہوئے - لیکن جناب بہن کا بھی تو کچھ حق ہے - اتنی مدت آپ شملہ میں رہے اور اماں کو شملہ کی سیر نہ کرائی ہو" فرمایا

نہاری ماں کو خط بھی لکھے زبانی بھی کہا مگر وہ
ائی مولوی صاحب سے بھی ذکر آیا وہ بھی ٹال گئے
ں سے مدرسہ کے لئے باہر نکلنا شروع کیا تو میں
رلی آگیا۔ تمہاری شکایت اس حد تک ٹھیک ہے
رشتہ دکھا سکا مگر میں کہہ سکتا تھا لکھ سکتا تھا
ے

ت آئی گئی ہوئی۔ مئی کی سخت گرمی سے پریشان
ہفتوں کے لئے شملہ جانے لگے تو حسب معمول
نے شملہ آنے کی بہن بہنوئی کو دعوت دی مگر حالات
ر اُن کے ارشاد کی اُس وقت بھی تعمیل نہ ہو سکی۔
ولائی میں اکیس دن بعد صادق میاں کا بخار اترا
لے سے زیادہ احتیاط کی جاتی کہ کوئی ٹھوس چیز نہ کھ
جانے اور وہ چند قدم بھی پیدل نہ چلیں۔ نقاہت
کی تھی ہی کچھ اور شکایتیں پیدا ہو گئیں تو ڈاکٹر
بر جانے کا مشورہ دیا۔ تو بہت گھبرائے ماموں جان نے
سادق میاں کی علالت کی خبریں مل رہی تھیں بخط
خار اُترتے ہی چند روز کے لئے تبدیلی آب و ہوا
شملہ آجاؤ۔ لیکن اب میرا معاملہ تھا کہ دو تین ہفتے
مجھے کس طرح جدا کر دیتے۔ اس زمانے میں عصمت
رہ نمبر کے سلسلہ میں بہت مصروف تھا اور کتنا ہوں
ی بہت تھا۔ ساتھ نہ جا سکتا تھا۔ آخر بیٹے فرمایا
دن میں کام ختم کر کے بیوی بچوں کو لے کر شملہ آجاؤ۔
ا مرحومہ اور صادق میاں کے ساتھ ایک ملازم کو لے
لے گئے۔ روزانہ ایک تار خیریت کا وہ روانہ فرماتے۔ اور
ار میں بھیجتا۔ روزانہ خط اس کے علاوہ ہوتا تھا۔

ی علالت اور صحت

لیکن قدرت کے انتظامات میں
انسان کو دخل نہیں دہلی میں ہیضہ
پھوٹ پڑا۔ میری بیوی اس میں مبتلا ہوئیں ابا جان کا خط آیا
کہ ہیضہ کی خبر اخبار میں پڑھی ہے۔ کھانے پینے میں بہت احتیاط
کرنا۔ صبح جو خط میں نے ڈاک میں ڈالا اس میں لکھا تھا کہ آمنہ
کی طبیعت کچھ ناساز ہے مگر کل شام کو امید ہے ہم روانہ ہو جائیں
گے۔ دہلی میں وبا اور بہو کی ناسازی طبع کی خبر سن کر پریشان ہو گئے
اور دوپہر کو تار آیا کہ ہم دہلی آرہے ہیں۔ تین روز میں آمنہ میں اتنی
بھی طاقت نہ رہی تھی کہ خود اٹھ کر بیٹھ سکتیں۔ سول لائن چلا جانا
تھا۔ کہ وہ تشریف لے آئے۔ ان کی موجودگی میرے لئے باعث اطمینان
اور خوشی کی ضامن تھی۔ بہو کی حالت دیکھ کر آنسو نکل پڑے
چمٹ گئے۔ پیار کیا۔ تسلی دی۔ اور دوسرے ڈاکٹروں کو بلایا۔
اور اپنے ہاتھ سے نسخہ شفا دیا۔ دو روز بعد خطرہ ٹل چکا تھا۔
(وداع راشد)

صادق میاں کی بی اے میں کامیابی اور ام اے میں داخلہ

صادق میاں کا بی اے کا نتیجہ آیا اور وہ اچھے نمبروں سے
پاس ہوئے تو علامہ مغفور کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بخار
کے دنوں میں بھی صدقہ کے بکرے ہوتے تھے اب اللہ تعالے کا
شکرانہ صدقہ کی صورت میں بھی ادا کیا گیا۔ صادق میاں نے
عربک کالج سے بی اے کیا تھا اور ام اے کے لئے وہ علی گڑھ
جانا چاہتے تھے میں بھی ان کی رائے سے متفق تھا مگر والد مرحوم
اپنے بچوں کو اپنی آنکھ سے اوجھل کرنا پسند نہ فرماتے تھے میٹرک
کے بعد میری خواہش بھی علی گڑھ جانے کی تھی۔ لیکن دلی کے
سینٹ سٹیفنز کالج میں پڑھا۔ عربک کالج میں اس زمانے
میں ام اے کا انتظام نہ تھا۔ صادق میاں سخت بیماری سے
اٹھے تھے۔ بہت کمزور تھے۔ داخلہ کے لئے خود نہ جا سکتے تھے
بارہ سال بعد میں سینٹ سٹیفنز کالج گیا۔ میرے جاننے والے
کئی پروفیسر اب بھی تھے۔ اسی دن ان کا داخلہ ہو گیا۔ صادق میاں

کا شمار اپنی کلاس کے بہت ذہین لڑکوں میں ہونے لگا۔ اور ایم اے کے پہلے ہی سال میں جب وہ آل انڈیا تقریر کے لئے گئے تو انہیں اوّل انعام ملا۔

انسانی ہمدردی کا ایک اور واقعہ

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے ایک دن خاندان کے ایک بزرگ تشریف لائے پریشانی ان کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ اُن کی لڑکی جو دو بچوں کی ماں ہے زنانہ ہسپتال میں جا کر بُری طرح پھنس گئی تھی داخلے کے بعد فوراً نکالنا آسان نہ تھا۔ بیچارے رو رہے تھے کہ سب کوشش کر چکا وہ تکلیف سے تڑپ رہی ہے۔ گھر سے واپس لانے کی اجازت نہیں ملتی۔ مجھے ان کے تشریف لاتے ہی بھیج دیا تھا کہ "جاؤ کام کرو"۔ میں صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ انہیں کے خیالات میں غرق تھا کہ آواز پڑی" رازق میاں کار نکلواؤ"۔ کار نکلی ہسپتال پہنچے اور ڈاکٹرنی سے ملے۔ بی اے تک میں نے بھی انگریزی پڑھی ہے ــ اور صادق میاں (اب ایم اے میں پڑھ رہے تھے۔ مگر ہم دونوں بھائی ان کی سی انگریزی نہ بول سکتے تھے۔ میں خاموش تھا مگر وہ دریا سے بھر رہے تھے۔ موزوں الفاظ گرج دار آواز گفتگو کی معقولیت دلائل کا اثر، اور پھر سب سے بڑھ کر اُن کی شخصیت انگریز ڈاکٹرنی کو اس لڑکی کو واپس بھیجتے ہی بنی۔ جب وہ لڑکی لے کر آئے ہیں تو اُسے دیکھ کر اس کے باپ کی آنکھ میں خوشی کے آنسو آ گئے ان آنسوؤں کو سمجھنے والا ابا جان کے سوا کوئی نہ تھا۔"

(وداع راشد)

بہادر یار جنگ مرحوم اور محترمہ شائستہ سہروردی

ٹھیک یاد نہیں ۱۹۳۴ء تھا یا ۱۹۳۵ء ایک دن شام کو ہوا خوری سے واپس آیا تو علامہ مغفور نے فرمایا "حیدر آباد کے بہادر یار جنگ آئے تھے۔ بہت عقیدت اور محبت سے ملے۔ کبھی موقع ہو تو ان سے ملنا۔ اچھے آدمی ہیں۔ اچھے خیالات ہیں"

میری عدم موجودگی میں باہر کے لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ مجھ سے اُن کا ذکر تو فرمایا کرتے تھے مگر کسی سے ملنے کے لئے کبھی نہ فرمایا تھا۔ بہادر یار جنگ مرحوم کا اس طرح ذکر کرنے کے ساتھ جب یہ فرمایا "ان سے ملنا" تو میں نے دل میں کہا بہت ہی اچھے انسان ہوں گے جو اُن کے لئے خاص طور پر یہ فرمایا ہے۔

علامہ مغفور کی رحلت کے بعد مسلم لیگ زور پکڑ تی گئی اور دلّی میں اس کے بڑے زبردست اجلاس ہوئے جن میں قائد اعظم مرحوم اور بہادر یار جنگ مرحوم کی تقریریں سُننے کا اتفاق ہوا۔ بہادر یار جنگ رات کو ایک یا دو بجے تقریر شروع کرتے تو ختم اُس وقت ہوتی جب مؤذن کی صدائے اللہ اکبر فضا میں گونجتی۔ علامہ مغفور کے چھوٹے دادا مولوی عبدالرزاق صاحب بانیٔ جامع مسجد سہارن پور کے متعلق یہ سُنا تھا کہ وہ سحر البیان تھے۔ بہادر یار جنگ مرحوم کو یہ دیکھا کہ وہ تقریر نہیں جادو کرتے تھے کہ ایک متنفس بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکتا تھا پتھر کی طرح جامد تصویر کی طرح ساکت ہو جاتا تقریر سُننے کے بعد ملاقات کا اشتیاق بڑھتا ہی چلا گیا۔ کارونیشن ہوٹل میں ان کا قیام تھا۔ وہاں گیا تو وہ تشریف نہ رکھتے تھے دُوسرے دن معلوم ہوا واپس چلے گئے۔ پھر سال دو سال بعد دلّی میں بہت بڑا جلسہ ہوا۔ پھر تقریر سُنی۔ اور جس دن وہ واپس ہو رہے تھے اسٹیشن پہنچا۔ اس گاڑی سے عصمت کی مشہور شاعرہ خورشید آرا بیگم صاحبہ اور ان کے شوہر صدیق علی خاں صاحب بھی جا رہے تھے۔ خاں صاحب سے ملاقات تھی انہوں نے جا کر بہادر یار جنگ مرحوم سے ملایا۔ نام سُنتے ہی لپٹ گئے دیر تک علامہ مغفور کی تصانیف کا ذکر کرتے رہے اور کہا "ماہ مجسم میں اٹھارہ دفعہ پڑھ چکا ہوں"۔ "جوہر قدامت" اور

...ان سیاست کے نقیب کے نقیب، نہیں حفظ تھے۔ بہت
...ت سے ملے اور کہا "علامہ کے مشن کو زندہ رکھنا آپ کا
...ون کا نام نہیں ہے۔" گاڑی روانہ ہونے لگی اور میں
...ث ... پر اترا تو کہا "کبھی حیدر آباد آئیے اور ایسے نکلئے
...ے جب میں وہاں موجود ہوں۔" اس ملاقات کو زیادہ مدت
...ں تھی جو یہ خبر اخبارات میں پڑھی کہ انہیں حقے میں زہر
دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بہادر یار جنگ کی موت پیش خیمہ تھی
...ریاست دکن کی تباہی کا!

عصمت کی مضمون نگار خواتین میں ۳۰، ۳۹ سال
...ے میں ہر سال انعامات تقسیم کرتا ہوں۔ علامہ مغفور اس
...عصمت پر ایک نظر ڈالا کرتے تھے ۱۹۳۵ء میں عصمتی انعامات
...کی فہرست دیکھ کر فرمایا "خجستہ اختر بیشہ زمانہ کی نہایت قابل
مسلمان خاتون تھیں۔ شائستہ ان کی بھتیجی ہے اور مستقبل
میں یہ بھی نام پیدا کرے گی۔ اس سے مضمون لکھواتے رہنا۔"

اور رحلت سے چند روز قبل جب کمزوری اس
حد تک بڑھ گئی تھی کہ اچھی طرح بات نہ کر سکتے تھے اور بہن
شائستہ ان کی خیر صلاح کو آئی تھیں تو ان کے جانے کے
بعد پھر فرمایا تھا "اس لڑکی سے مضامین لکھواتے رہنا
اس کے خیالات بہت پاکیزہ ہیں۔"

علامہ مغفور کی خواہش تھی کہ کرنل حسان سہروردی
مرحوم کی بیٹی اور حافظ ولایت اللہ مرحوم کی بہو شائستہ
جنہوں نے مستقبل میں بیگم اکرام اللہ کے نام سے نہ صرف غیر
منقسم ہند میں بلکہ پاکستان سے باہر بھی نام پیدا کیا مضمون نگاری
کریں اور کرتی رہیں۔ چنانچہ پچھلے ۲۰ سال میں عصمت میں سب سے زیادہ
مضامین انہیں کے چھپے اور سب سے زیادہ عصمتی انعامات انہوں نے
ہی حاصل کئے اور آج یہ "بیگمات پاکستان" کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی
خاتون اور اردو کی سب سے بڑی مضمون نگار ہے۔

جیتے جی مرحوم

۱۹۰۹ء میں جب تختی لکھنے کا زمانہ ختم ہو چکا
تھا اور میں کاپی پہ اسد کی چوتھی یا پانچویں
سے نشتہ مرغ اور رسالہ مخزن میں سے علامہ مغفور کا مضمون
سارس کی تارک الوطنی کی عبارت سطحین پڑھتا اور کالی سیاہی سے
ایک کاپی پر نقل کیا کرتا تھا۔ عصمت و مخزن کے لکھنے والوں
کے نام کے ساتھ شروع میں مولوی۔ مولانا۔ ڈاکٹر۔ شیخ وغیرہ
چھپا ہوا دیکھتا اور بعض ناموں کے آخر میں لفظ مرحوم جیسے
مولانا آسی مرحوم۔ سر سید مرحوم۔ داغ مرحوم۔ خیال ہوا یہ بھی
کوئی عزت کا لفظ ہوگا۔ چنانچہ میں نے کاپی پر لکھا "مولوی
محمد عبدالراشد الخیری مرحوم" والدہ ماجدہ کی نظر کاپی پر پڑی
اور اس کے ساتھ ہی گردن پر ایک زور کا چانٹا۔ میں رونے
لگا اور دوڑ کر کوٹھڑی میں گھس گیا۔ علامہ مغفور شام کو گھر
آئے تو ان سے آپا نے کہا۔ آج رازق کو اماں نے مارا ہے
اور وہ کوٹھڑی میں گھسا رو رہا ہے۔ انہوں نے کوٹھڑی
میں سے نکالا۔ میں نے واقعہ سنایا تو بہت ہنسے اور پھر سمجھایا
کہ بیٹے جو آدمی مرجاتا ہے اس کے نام کے آگے مرحوم لکھتے
ہیں۔ تمہارا باپ تو ابھی زندہ ہے۔ جب ہم مرجائیں گے پھر نام
کے آگے یہ لفظ لکھنا۔" ان کے الفاظ "جب ہم مرجائیں گے" تیر
کی طرح دل میں پیوست ہوگئے۔ اور پھر بلبلا کر رونا شروع
کردیا۔ انہوں نے چمکارا پیار کیا۔ بازار لے گئے۔ خربوزے لائے۔

اس واقعہ کے ۲۶ سال بعد کا ذکر ہے کہ ۱۹۳۵ء میں اردو
کانفرنس دلی کے عربک کالج میں ہوئی۔ حضرت علامہ جلسوں
پارٹیوں وغیرہ میں شریک نہ ہوتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم
مرزا محمد سعید مرحوم پرنسپل مشتاق احمد زاہدی مرحوم اور عاصدی صاحب
کے اصرار پر اس کانفرنس میں چلے گئے۔ جلسہ کی صدارت جن
صاحب نے کی انہیں زبان سے کوئی لگاؤ یا ادب سے دور کا
بھی واسطہ نہ تھا۔ صدر انہیں اس لئے بنایا گیا تھا کہ دولت مند

گئے تھے۔ خطبۂ صدارت اُنھوں نے اٹک اٹک کر پڑھا اور غلط سلط پڑھا۔ اور حضرت علامہ اُس کا لطف لیتے رہے۔ جب صدر صاحب کی زبان مبارک سے مولوی نذیر احمد مرحوم مولانا شبلی مرحوم کے بعد علامہ راشد الخیری "مرحوم" نکلا تو حاضرین نے حیرت سے اور بعض نے غصہ سے صدر کی طرف دیکھا اور ایک صاحب نے ٹوک بھی دیا کہ علامہ تو خدا کا شکر ہے زندہ سلامت ہیں۔" اور صدر صاحب نے فرمایا "یہ ہی لکھا ہوا ہے" تو جلسہ میں زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ اور علامہ مغفور نے اپنے نام کے آگے لفظ "مرحوم" اور اس سے زیادہ صدر صاحب کے گھبرائے ہوئے جواب کا خوب لطف اُٹھایا۔

مصنفِ "طوفانِ حیات" کا تعویذ!

علامہ مغفور کے دادا مولوی عبدالقادر صاحب دلی کے جید علماء میں سے تھے۔ سُنا ہے وہ رُوحانی علاج بھی کرتے تھے اور ضرورت مندوں کو مفت تعویذ گنڈے دیا کرتے تھے۔ تعویذ گنڈوں کی ان کی ایک کتاب پھوپی اماں حاجیہ زاہدہ بیگم مرحومہ کے پاس تھی۔ وہ وعظ بھی فرمایا کرتی تھیں اور تعویذ بھی دیتی تھیں اور اس غرض سے نہ صرف عورتیں بلکہ مرد بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے لیکن وہ اس بات کا انتظام رکھتی تھیں کہ اُن کے بھائی یعنی علامہ مغفور کے سامنے کوئی اُن سے تعویذ وغیرہ کی گفتگو نہ کرے کیونکہ انہیں اپنے بھائی کی خفگی کا ڈر رہتا تھا۔ علامہ مغفور ان باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ان کے خلاف نہ صرف متعدد مضامین عصمت اور سہیلی میں لکھے اور مختلف تصانیف میں ضعیف الاعتقادی کے نقصانات دکھائے بلکہ ایک مستقل تصنیف اصلاحی ناول "طوفانِ حیات" لکھا جس میں قبیح رسوم کی پابندی شرک بدعت۔ تعویذ گنڈوں ضعیف الاعتقادی اور قبر پرستی کی وجہ سے ایک شریف خاندان کی بربادی کے

دل ہلا دینے والے واقعات ہیں۔

گنگا پور ستی اپنی بڑی بیٹی کے پاس علامہ مغفور گرمیوں میں چند ہفتوں کے لئے جایا کرتے تھے۔ یہ راجپوتانہ کا ایک گاؤں ہے۔ جس کے ریلوے اسٹیشن پر ڈاک گاڑیاں آنے کے وقت کچھ دیر کے لئے کچھ رونق ہو جاتی تھی۔ دلی کی ڈاک گاڑی گیارہ بجے کے قریب آتی تھی۔ اور اکثر علامہ مغفور خود ہی ڈاک لینے کے لئے ریلوے اسٹیشن چلے جاتے تھے جو کوارٹر سے تیس چالیس قدم کے فاصلہ پر تھا۔ کبھی کوئی ملاقاتی ریل میں سفر کرتا ہوا مل جاتا اور اُن کے پاس پانوں کی ڈبیہ ہوتی تو پان سے اس کی تواضع کرتے۔ کبھی کنوئیں کے ٹھنڈے پانی کی صراحی ملازم لڑکا لے کر ان کے ساتھ جاتا اور ٹھنڈے پانی سے خاطر کرتے۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا عارف۔ مولانا عرفان۔ اور مولوی احمد سعید انصاری ایڈیٹر زمیندار۔ اور کئی صاحبوں کی خاطر تواضع ریلوے اسٹیشن پر کنوئیں کے ٹھنڈے پانی اور دلی کے زرد دیسی پانوں سے کی تھی۔ اسٹیشن کے قریب ہی ڈاک خانہ تھا۔ علامہ مغفور وہاں جاتے سب پوسٹ ماسٹر سے کچھ دیر باتیں کرتے اور ڈاک لے کر قیام گاہ پر واپس آجاتے۔ سب پوسٹ ماسٹر ایک برہمن تھا وہ دیکھتا تھا کہ مولوی صاحب کے نام خطوط کے علاوہ اخبار رسالے بھی روز آتے ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ مولوی صاحب نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اُس نے یہ بھی سُنا کہ مولوی صاحب بہت بڑے عالم ہیں اور اُن کے وعظ بھی ہوتے ہیں تو ایک دن وہ وعظ سُننے آیا اور دُوسرے دن شام کو علامہ مغفور کی خدمت میں عرض کیا کہ کوئی تعویذ دے دیجئے۔ وہ خوش حال تھا میاں بیوی کے تعلقات بھی اچھے تھے مگر شادی کو بارہ سال ہو چکے تھے اور کوئی بچہ نہ تھا۔ اولاد نہ ہونے کا ذکر اس نے علامہ مغفور سے کیا تھا اور انھوں نے اس کی بیوی کو کسی قابل

بیٹی کی ڈاکٹری دکھلانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن اب تک وہ
سے بے زار تھا۔ علامہ مغفور نے کہا تعویذ سے کچھ نہیں ہوتا۔ آج
اگر اولاد ... سے دعا مانگو۔ لیکن وہ صاحب نہیں مانے۔ کہنے
لگے شام کو آئے اور منت سماجت کرنے لگے گڑگڑا کر کہنے
لگے آپ بہت بڑے پیر اور بہت بڑے مولوی ہیں اور پہنچے ہوئے
ہیں آپ کے تعویذ سے میرا بیڑا پار ہو جائے گا۔" علامہ مغفور
نے فرمایا "میں خاندانی مولوی ہوں لیکن بہت بڑا مولوی نہیں ہوں
اور پیر تو کیا چھوٹا سا پیر بھی نہیں۔ تعویذ میں کیا رکھا ہے خدا
... اولاد اور عزت سب کچھ دینے کی قدرت صرف خدا
میں ہے۔" ایک دن بیٹے کا ذکر ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر ایک
... گارڈ نے علامہ مغفور کو دیکھ کر ایک بیکری کے مالک سے
جو ... ہیں اس کے ہاں ڈبل روٹی کیک وغیرہ جاتے
تھے دریافت کیا "میں ان کو اکثر دیکھتا ہوں یہ کون ہیں؟"
اس نے کہا "جس طرح تمہارے پادری ہیں اسی طرح یہ ہمارے
پادری ہیں۔" ریلوے اسٹیشن سے ڈاک خانہ جا کر سب پوسٹ
ماسٹر سے یہ گفتگو اس نے دہرائی اور یہ جملہ بھی بڑھایا تھا کہ بہت
پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ اور اس جملے کے بڑھانے کی وجہ شاید
یہ تھی کہ اس کے لڑکے نے امتحان دیا تھا اور بیٹے کے نتیجہ کی
طرف سے فکرمند تھا۔ اور علامہ مغفور نے کہا تھا گھبراؤ نہیں
پاس ہو جائے گا۔ چونکہ اس نے محنت کی تھی اور ذہین تھا۔
پاس ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ علامہ مغفور نے ٹالنے کی ہر چند
کوشش کی۔ مگر پوسٹ ماسٹر صاحب کسی طرح مانتے ہی نہ تھے
آخر علامہ مغفور نے فرمایا "اگر میں نے آپ کو تعویذ دے دیا تو وہ
جلالی قسم کا ہوگا اور آپ اس پر عمل نہ کر سکیں گے۔" وہ خوش
ہو گیا اور عرض کیا "میں سب کچھ کر لوں گا۔ جلالی کیا ہوتا ہے"
فرمایا "اسے بھئی آپ برہمن ہیں گائے کے گوشت کو کس طرح
ہاتھ لگا سکتے ہیں؟ جس کمرے میں آپ سوتے ہیں تین تین بوٹیاں
چاروں کونوں میں گاڑنی پڑیں گی وہ آپ اپنے ہاتھ سے
گاڑیں گے۔ اور ایک ایک آپ کی بیوی اپنے ہاتھ سے کچھ دیر
تک وہ سوچتا رہا اور پھر کہا "مولوی صاحب مجھے منظور ہے۔"
"تمہیں تو منظور ہے۔ تمہاری بیوی شاید پسند نہ کریں۔
ان سے پوچھ کر مجھے بتاؤ۔ اور کل ٹھیک اس وقت آؤ جب
دونوں وقت گلے مل رہے ہوں۔"
اس نے کہا "جی وقت کب گلے ملتے ہیں؟"
فرمایا "بھئی شام کو جب تم میرے پاس آؤ تو نماز
مغرب کی اذان ہو رہی ہو۔"
اس نے کہا "بہت اچھا" اور رخصت ہوا۔
اندر آکر انہوں نے والدہ مرحومہ و ہم بچوں کے سامنے
گفتگو دہرائی اور فرمایا "جان کھا گیا۔ پیچھے ہی پڑ گیا۔
سوائے اس کے ٹالنے کی کوئی اور صورت تھی ہی نہیں
اس کی بیوی انکار کر دے گی اور میری جان چھٹے گی۔"
دوسرے دن عصر کے بعد شیشم کے درخت کے نیچے
کھری چارپائی پر سرہانے تین تکیے رکھے لیٹے ہوئے تھے
مجھے دیکھ کر فرمایا "ذرا ایک سادہ سفید کاغذ اور قلم لانا"
میں نے قلم اور کاغذ پیش کر دیا تو انہوں نے تعویذ لکھا۔
سنا ہے تعویذ زعفران سے یا مرغ کے خون سے
لکھا جاتا ہے یا پھر کالی روشنائی سے اور دو سطریں نیلے
سے رنگ یعنی ہولنڈ اور انگریزی سیاہی یعنی بلو بلیک سے
لکھے ہوئے کسی کو دیکھا نہ سنا۔ بہرحال میں نے تعویذ
دیکھا تو یہ عبارت لکھی تھی۔
"اولاد عزت، زندگی موت سب اللہ کے اختیار میں ہے"
"جوتے مار مار کر شیطان کا بھیجا پلپلا کر دو"
میں دوسری سطر پڑھ کر بہت ہنسا اور عرض کیا "بندے
بھی تو لکھے جاتے ہیں۔" فرمایا "لکھے ہاں وہ نقش ہوتا ہے

تم کہ دو ۳ بجکر ہیں سیدھی تین آنکھی ہفتلے ہوں گے۔ ایک سے ۹ تک ہندسے لکھ کر رکھ لو۔ وہ آئے تو اسے دے دینا کاغذ موڑ کر تہ کر کے میں نے اس طرح نقش بنایا۔

۱	۴	۷
۲	۵	۸
۳	۶	۹

اور دکھایا تو اُنھوں نے فرمایا "دیکھنا ہی کیا ہے یہ سب فضول باتیں ہیں"

گھنٹہ سوا گھنٹے بعد سب پوسٹ ماسٹر آئے اور کہا ان کی بیوی عمل کے لئے رضامند ہیں۔ علامہ مغفور نے کاغذ کے دونوں پُرزے خود موڑ کر فرمایا خیر چھوڑو آ سے میں دوسری قسم کا دے دیتا ہوں۔ یہ بڑا پرچہ اپنے کمرے کی اندر کی چوکھٹ کے بیچ میں گاڑ دینا اور یہ چھوٹا اپنے پلنگ کے سرہانے بائیں طرف کے پائے کے نیچے۔ زمین ایک ایک بالشت کھودنا اور اگر کی دو دو بتیاں اور تھوڑا سا لوبان سُلگانا اور خدا سے دُعا کرنا کہ ہمارے دل کی مُراد سوائے تیرے کوئی پُوری نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر تم نے یہ پرچے کھولے یا کسی کو دکھائے تو ان کی تاثیر جاتی رہے گی۔ دیکھو لیڈی ڈاکٹر کا علاج جاری رکھنا۔ یہ جو کہا تعویذ نہیں کہا۔

اس واقعہ کو دس ماہ پورے نہ ہوئے تھے بھائی عبدالغفور مرحوم دلی آئے اُنہوں نے بتایا کہ سب پوسٹ ماسٹر بہت خوش ہے اس کو خدا نے بیٹا دیا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ مولوی صاحب کے تعویذ سے بیٹا ہوا ہے"

ابا جان بہت ہنسے اور پھر فرمایا لاحول ولا قوۃ! یہ تو محض مذاق تھا۔ اور اُس سے جان چھڑانے کی ترکیب۔ اگر تعویذ سے مُرادیں پُوری ہونے لگیں تو خدا کی خدائی آج ختم ہو جائے۔ لیڈی ڈاکٹر کا علاج ہو رہا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اپنا فضل کیا"

دوسرا یا تیسرا دن تھا سب پوسٹ ماسٹر صاحب دو تھال مٹھائی سے بھرے ہوئے لے کر دلی پہنچے۔ والد مغفور کہیں گئے ہوئے تھے تھوڑی دیر میں آ گئے پوسٹ ماسٹر صاحب نے ان کے قدم چھوئے اور فرمایا۔

"آپ کی کرپا سے بچہ ہوا ہے"

علامہ مغفور نے فرمایا "ایسی بات مت کہو یہ کہو خدا نے دیا ہے"

دو بیٹیاں

شاید اکتوبر ۳۵ء کا ذکر ہے میری دُوسری بیٹی سائرہ جو سال بھر کی تھی اسے گود میں لئے ہوئے تھے کہ میں حاضر ہوا۔ دیکھ کر فرمایا۔ بیٹیوں کے متعلق کوئی حدیث معلوم ہے۔ میں خاموش تھا کر فرمایا۔

"شاید مشکوٰۃ میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا جس شخص نے دو بیٹیوں کی پرورش کی اور اچھی طرح کی اُس کے اور میرے درمیان (دو انگلیاں اٹھا کر فرمایا کہ) اتنا فاصلہ ہوگا"

یہ کہہ کر اُن کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ افسوس وہ بچی دو سال کی ہو کر گذر گئی۔

سوانح عمری کی تجویز

عصمت ستمبر ۳۵ء میں صفحہ ۲۲۳ پر میرے نام یہ خط شائع ہوا تھا۔

"برادرم میں آپ کو ایک امر خاص میں تکلیف دینا چاہتی ہوں آپ کے اخلاق و محبت سے توی اُمید ہے کہ توجہ فرمائیں گے۔ میرے دل میں ایک خیال عرصے سے ہے اور مجھے اس امر پر بے چین کئے ہوئے ہے کہ جلد سے جلد اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔ بھائی دُنیا مردہ پرست ہے کیسا ہی صاحب کمال ہو زندگی میں کوئی قدر نہیں کرتا۔ اگرچہ الحمدللہ قبلہ وکعبہ جناب علامہ کی کافی قدردانی

ہو چکی ہے۔ اور ہر فرد قوم کے سامنے ان کی خدمات کے
سلسلے میں۔ لیکن میری تمنا ہے کہ پھر بھی ان کے متعلق
کچھ لکھوں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے
صرف مسلمانوں کی تعلیم و بہبودی کی کوششوں میں اپنی
ساری زندگی وقف کر دی۔ لہٰذا میرا دل بے چین ہے کہ
کسی طرح محسن کا شکریہ ادا کیا جائے اور سوائے اس کے
کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کے سوانح حیات لکھوں
کہ بہنوں کی بھلائی کے لئے انہیں کیسی کیسی زبردست
مشکلات کا سامنا ہوا اور کن کن سے کام پڑا
پڑ گئے۔ وہ کر رہے ہیں۔ اور اس کے صلہ میں ہم لوگوں کو
کیا کرنا چاہئے اور کس طرح ان کی خدمات کا اظہار دے سکتے
ہیں۔ اور ان کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں تاکہ وہ اس سے زیادہ
کام کر سکیں۔ اب آپ اس بارے میں میری مدد فرمائیں۔ کچھ
مسالہ فراہم کر کے اور قبلہ ظلہ کے مختصر حالات لکھ کر روانہ
فرما دیجئے کہ میں سفرنامہ ایران ختم کرتے ہی اس کام میں لگ
جاؤں۔"

ایک بہن
کلکتہ — صغرا سبزواریہ

یہ خط میں نے اپنے اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

"محترمہ ایس کے صغرا بیگم صاحبہ سبزواریہ کا یہ پاکیزہ
جذبہ کہ حضرت علامہ راشد الخیری قبلہ کے حالات زندگی شائع
کئے جائیں یقیناً حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔ مختصر حالات تو
عصمت کے علاوہ اردو پرچوں میں کئی بار شائع ہو چکے ہیں ضرورت
مفصل سوانح عمری کی ہے۔ لیکن جو لطف آپ بیتی میں ہے
جگ بیتی میں کہاں۔ اگر آغا جان قبلہ خود ہی اپنے حالات زندگی
تحریر فرما دیں تو مختلف حیثیتوں سے بے مثل چیز اور خواتین ہند
پر ایک اور احسان ہو گا۔ میں نے یہ خیال کئی بار قبلہ موصوف
پر ظاہر کیا۔ خدمتیں کی اصرار بھی مگر جس طبیعت کو شہرت و نام
و نمود سے اس درجہ نفرت ہو کہ میری ایک ماہ کی مسلسل
کوشش کے باوجود ۳۸ء میں جوبلی نمبر عصمت کے موقع
پر تصویر تک کی اشاعت کی اجازت نہ ملی۔ اس طبیعت سے
صاف جواب ہی مل سکتا تھا۔ بہن سبزواریہ نے کئی سال کی
دبی ہوئی تجویز کو زندہ کیا ہے۔ اب پھر عرض کرنے کا موقع تھا
مگر دو تین سال سے آغا جان قبلہ کی صحت درست نہیں
ادھر والدہ ماجدہ کی خرابیٔ صحت ادھر خود انہیں سوءِ ہضم اور اختلاج
قلب کی شکایات یہی وجہ ہے کہ اب کے سالگرہ نمبر میں کوئی
افسانہ یا مضمون شائع نہ کر سکا اور بہت سی بہنوں کو
مجھ سے شکایت کا موقع ملا۔ عصمتی بہنیں بعد نماز خدائے کریم
کی درگاہ میں خلوص دل سے دعا کریں کہ وہ اپنے حبیب پاک
کے تصدق میں علامہ موصوف کو صحت و اطمینان عطا فرمائے
میری تجویز سے اگر بہنوں نے اتفاق کیا تو ان کے خطوط قبلہ
قبلہ کی خدمت میں پیش کر کے پھر ایک دفعہ کوشش کروں گا
صحت درست ہونے کے بعد ممکن ہے اپنی عزیز بچیوں کے
اصرار پر وہ اس طرف توجہ فرما سکیں۔"

رازق الخیری

عصمت کے اس پرچے میں یہ خط اور میرا نوٹ ملاحظہ سے
گزرا تو مجھے بلایا۔ میں حاضر ہوا تو پرچہ ان کے ہاتھ میں دیکھ کر
سمجھ گیا کہ اب باز پرس ہو گی۔

فرمایا "میاں مجھ سے اس خط کا ذکر بھی نہیں کیا اور
بغیر مجھ سے پوچھے شائع بھی کر دیا"

"آپ منع جو کر دیتے۔"

"بری باتوں ہی کو تو منع کرتا ہوں۔ چھچھورپن۔ کم ظرفی
نمود۔ اچھی باتیں ہیں یا بری؟ میرے ہی پرچے میں میری
تعریف خود ستائی پھر کسے کہتے ہیں؟"

"لیکن یہ تو ادب کی ایک اشد ضرورت ہے!"

"خط بجائے شائع کرنے کے مجھے دے دیا ہوتا۔"

"تو پھر خط شائع کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اپنے
[illegible] کی تائید میں کچھ خطوط اگر آ سکے تو شاید میں خدمت
[illegible] کے جذبہ کے تحت شغل شکی ہو۔"

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک ماموں صاحب تشریف
لے آئے اور میں دفتر لوٹ آیا۔ تین چار دن بعد ہی سے علامہ
مغفور کی سوانح عمری کی تائید میں خطوط آنے شروع ہو گئے۔
اور دس بارہ دن بعد جب میرے پاس تیس بتیس خطوط آ گئے۔
تو میں نے پیش کر دئے اور انہوں نے بالآخر وعدہ فرما لیا "اچھا
میں تمہاری یہ خوشی پوری کر دوں گا۔ آج کل طبیعت ذرا گری گری
ہے۔ دعاؤں کی کتاب ختم کرنے کے بعد یہ شروع کر دوں گا"۔
یہ گفتگو وسط ستمبر ۳۵ء میں ہوئی تھی یعنی بیمار
پڑنے سے دو ماہ قبل۔

یلدرم پریم چند اور آغا شاعر

سید سجاد حیدر یلدرم مرحوم
سے خط و کتابت اُس زمانہ
میں بھی تھی جب علامہ مغفور مخزن ایڈٹ کیا کرتے تھے پھر
جب تمدن جاری کیا تو سید صاحب مرحوم تمدن کے مضمون
نگاروں میں سے تھے۔ اُردو ہندی کی ترقی کے مشورے کے لئے
حکومت صوبہ بہار نے [illegible]ء میں اُردو کے پانچ ادیبوں کو
پٹنہ بلایا تھا۔ علامہ مغفور کو دیکھتے ہی سید صاحب مرحوم دوڑتے
ہوئے آئے اور ان سے لپٹ گئے۔ یہ واقعہ دو باتوں کا ثبوت
تھا ایک تو یہ کہ وہ علامہ مغفور سے پہلے مل چکے تھے اور
انہیں پہچانتے تھے دوسرے یہ کہ خدا نے انہیں محبت بھرا
دل دیا تھا۔ میں اس وقت موجود تھا اور دیکھ رہا تھا کس قدر
محبت اور خلوص کی باتیں دونوں دوستوں میں ہو رہی تھیں
پہلے تو اُردو کی نامور ادیبہ محترمہ نذر سجاد حیدر کی صحت کے
متعلق علامہ مغفور دریافت کرتے رہے پھر جو ادبی گفتگو
شروع ہوئی تو گھنٹہ سوا گھنٹہ گزر گیا۔ شعر و شاعری پر بھی
دیر تک باتیں ہوئیں۔ اور دونوں طرف سے مناسب
اشعار کا تبادلہ ہونے لگا۔ یلدرم مرحوم نے جس وقت

یہ صحبت یہ جلسے یہ عالم کہاں
خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں

تو علامہ مغفور جھوم اٹھے اور بار بار یہ شعر دہرایا
اور جب علامہ مغفور نے میر حسن کا یہ شعر پڑھا کہ

نہ ملنے کے دکھ اس کے سب میں سہے
مگر اپنے جی سے وہ جیتا رہے

تو مرحوم سید سجاد حیدر پر جدائی کیفیت سی طاری
پھر اقبال۔ عبدالقادر۔ نیرنگ۔ قاری سرفراز حسین
طباطبائی۔ وحشت و مخزن و تمدن کے لکھنے والوں کے
بھی باتیں ہوئیں۔ اب یاد نہیں ۳۳ء تھا یا ۳۴ء
معلوم ہوا اور میں نے عرض کیا کہ سجاد حیدر صاحب دلی آئے
ہوئے ہیں اور زاہدی صاحب کے ہاں ٹھہرے ہیں تو فرمایا
"چلو سجاد سے مل لیں" زاہدی صاحب کے ہاں پہنچے تو
مرحوم باہر کھڑے تھے۔ کیسی محبت سے دو دوست ملے۔
کہ آج بھی آنکھوں میں وہ سماں پھر رہا ہے۔ شاید ۳۷ء
دو روز کے لئے میں لکھنؤ گیا اور سجاد صاحب اور محترمہ نذر
کی خدمت میں حاضر ہوا تو سجاد صاحب دیر تک ابا جان
یاد کرتے اور ان کی ہی باتیں کرتے رہے۔

منشی پریم چند عصمت کے مخصوص افسانہ نگار
میں سے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ عصمت
کے علاوہ اُردو کا کوئی رسالہ معاوضہ نہیں دیتا۔ میں نے ان کا
ایک افسانہ واپس کر دیا تھا۔ کیونکہ افراد قصہ کو بہت زیادہ
آزاد دکھایا گیا تھا۔ کوئی اور بڑا ادیب ہوتا تو برا مان
مگر منشی جی آنجہانی نے لکھا "زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے
عصمت ابھی تک بہت قدامت پسند ہے لیکن میں

آپ کے نسل کی [illegible] کہ ہمارے ملک میں ایک سالہ
[illegible] سکتا ہے [illegible]
[illegible] منشی جی سے علامہ مغفور
کی ملاقات دلی میں ہوئی تھی۔

[illegible] دفتر میں تشریف لائے تو میں نے آبا جان کو پرچہ
[illegible] اصلاح کی۔ وہ آتے ہی منشی جی سے بغل گیر ہوئے اور
ایسی گھل مل کر دونوں نے باتیں کیں کہ معلوم ہوتا تھا برسوں
کی ملاقات ہے۔ اردو ناول۔ افسانہ۔ سینما کی تصویریں۔
تمدن مغربی۔ سماج میں عورت کی حالت۔ مشنری خواتین
کی کوششیں ان موضوعوں پر گھنٹہ بھر تک باتیں ہوتی رہیں
جب [illegible] میں ہم کار میں کلکتہ گئے تو بنارس میں
منشی جی سے ملنے گئے اور وہ اسی محبت اور خلوص سے ملے
علامہ مغفور فرمایا کرتے تھے کہ شریفانہ ناول یا افسانہ شریف
انسان ہی لکھ سکتا ہے۔ خیالات عکس ہوتے ہیں انسان
کے کردار کا۔ منشی پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا مقصد
اصلاح اخلاق ہے۔ کیونکہ خود ان کا اخلاق بہت وسیع
تھا۔ اور سجاد حیدر یلدرم مرحوم کی طرح آنجہانی منشی پریم چند
بھی ایسے انسانوں میں سے تھے جن سے محبت کی جائے۔
شریف النفس مخلص۔ وضع دار۔

آغا شاعر مرحوم سے تعلقات مخزن کے زمانے سے
تھے۔ آغا صاحب اکثر دفتر میں کرم فرمایا کرتے تھے۔ ایک
دفعہ میں نے اطلاع نہیں کی کہ آغا صاحب آئے ہیں تو ناخوشی
کا اظہار فرمایا کہ "آغا آیا اور مجھے خبر بھی نہیں کی" آغا صاحب
داغ کے بہترین شاگردوں میں سے تھے زبان محاورہ
اور روزمرہ کے اعتبار سے بھی ان کا کلام بہت بلند
داغ کی شوخی اور تیکھا پن بھی اُن کے اشعار میں نمایاں
علامہ مغفور کی ان سے بے تکلفی تھی۔ ادھر اُدھر کی چھیڑیں
بھی ہوتیں اور آغا مرحوم کا کلام ان کی زبانی سنتے بھی۔ کبھی
آغا صاحب سے دروازہ پر ہی ملاقات ہو جاتی تو گلے میں
ہاتھ ڈالے ملاقات کے کمرے میں لا کر آدھے پونے گھنٹے تک
ہنسی مذاق کرتے اور پھر مجھے بلا کر فرماتے کہ بھئی آغا آپ تم
[illegible] بزرگ ہوں نصیحتیں کرو۔ دل لگی بازی ہو چکی آغا صاحب
علامہ مغفور کی علالت میں دو تین بار تشریف لائے اور
انہیں دیکھ کر دیر تک روتے رہے۔ دوست کی رحلت پر
انہوں نے تین مرثیے لکھے تھے ایک مرثیہ کا ایک بند یہ تھا۔

خوبیوں کا اُس کی شاعر ہو کہاں تک اختصار
اک محبت ہی وہ تھی جس کا نہیں کوئی شمار
دیکھ کر مجھ کو بہٹ جانا وہ اس کا بار بار
بے سواری بھیجنا مجھ کو جسے تھا ناگوار
ہنسنے مرنے والے! اب بتا کیسے ہم یہ سنائیں
دفتر عصمت میں جائیں بھی تو کس کے پاس جائیں

جھوٹ موٹ کی خفگی

ایک دن علامہ مغفور کی رفیقۂ حیات اپنی بڑی نواسی نازلی حفیظہ [illegible]
سے اپنے مرحوم بچوں کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ باہر دالان میں
تھیں۔ اور علامہ مغفور اندر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے
تھوڑی دیر بعد انہوں نے نواسی کو اشارہ سے بلا کر کہا
"جا کر اپنی اماں جان سے پوچھنا کہ آپ کی ساس نے آپ کی
شادی میں کیا چڑھایا تھا" چنانچہ نواسی نے نانی کے پاس
آ کر اُن سے پوچھا تو وہ ٹالتی رہیں کہ "بوا اس وقت میری
طبیعت حاضر نہیں ہے" لیکن نواسی نے جب بہت اصرار
کیا تو انہوں نے تفصیل بتائی اور مخمل اور چرزمل کے ایک
روپہلی گوٹے کے جوڑے کا بھی ذکر کیا اس زمانے میں زیادہ
تر سنہری گوٹے کا رواج تھا۔ علامہ مغفور تو اس کے منتظر
ہی تھے یہ سنتے ہی فرمانے لگے "جم جم ایسی بہوئیں آئیں جو

نیز اُس کا مذاق نواسی کے سامنے اُڑائیں؟ آپ اُن کی رفیقۂ حیات ہزار قسمیں کھا رہی ہیں کہ یہ پہیلی میرے سر ہو گئی تو میں نے کہہ دیا اور وہ جو سُنہری جوتوں کا میں نے ذکر کیا وہ تم نے نہیں سُنا۔ میں نے تو فقط ایک بات کہی تھی تو یہ تو یہ اس سے میرا مقصد مذاق اُڑانا تو نہیں تھا" مگر علامہ مغفور کیا ماننے والے تھے دیر تک چھیڑ چھیڑ کر انہیں جھنجھلاتے رہے اور اس جھنجھلانے سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ وہ جو مرحوم بچوں کی یاد میں محو تھیں اُن کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جائے۔

جنوبی افریقہ سے ایک خط اور اُس کا جواب

اکتوبر ۳۵ء کے عصمت میں علامہ مغفور کے نوٹ کے ساتھ جنوبی افریقہ کا ایک خط اور اس کا جواب شائع ہوا تھا۔

"میں کسی ایسے خط کی اشاعت جس میں کسی اعتبار سے بھی میرا تعریفی پہلو نکلتا ہو پسند نہیں کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہونا فطرتِ انسانی ہے اور میں بھی کچھ نہ کچھ متاثر ہوتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس منزل کو طے کر چکا جہاں نفس مُرجھائے ہوئے پھولوں سے کھیلتا ہے۔ میری آنکھیں اس قسم کے بہت سے تماشے دیکھ چکیں۔ اور مسرتوں کے شاداب پودے جن کو زندگی کی اُمنگیں سینچ رہی تھیں آپ سامنے سے اُوجھل ہو چکے۔ پھر بھی کسی ایسے خط کو جو جماعت سے متعلق ہوتا ہے شائع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔۔۔

۔۔۔۔ بایں ہمہ محمد قاسم صاحب کا گرامی نامہ اس لئے نقل کرتا ہوں کہ آئندہ کام کرنے والے دیکھ لیں کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں اور کیسے کیسے کانٹے جسم کو لہولہان کر دیتے ہیں؟"

عصمت اکتوبر ۳۵ء

خط۔ بندہ نے متعدد خطوط حضورِ والا کے نام ارسال کر حضور والا نے میرے کسی خط کا بھی جواب ارسال نہ فرمایا۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔ مدت سے مجھے اس کا اشتیاق ہے کہ دلّی کی وہ آخری یادگار ہستیاں، جن کا وجود اکیسویں صدی کے رجال میں غنیمتات میں سے ہے اُن سے خط و کتابت کر کے ان سے دُعائیں لوں۔ آج حضور والا کے نام پھر یہ تا ویضہ ابلاغ کر رہا ہوں۔ دیکھئے کتنی اُمیدوں کے ساتھ لکھ رہا ہوں (خدا نخواستہ) اس مرتبہ جواب سے محروم تاکہ ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کہنے کی نوبت آئے۔ مدرسہ بنات کے متعلق افریقہ میں جو معلوم ہوئے ہیں کہ مدرسہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔ وغیرہ وغیرہ نیز حضور والا کی ذاتِ گرامی پر دل آزار حملے ہو رہے ہیں اس کی اصل حقیقت سے ضرور آگاہ ہی فرمائیں کیونکہ افریقہ میں حضور والا کے ساتھ محبت رکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اس لئے اس بدگمانی کو دُور کرنا ضروری ہے۔ حضور والا شبیہِ مبارک اور مختصر لائف (چند سطر ہی) ہی میں بھیجا ارسال فرمائیے گا۔ مجھے حضور کے حالاتِ زندگی سُننے کا شوق ہے۔ اس وقت حضور کی عمر شریف کیا ہے کے ہوا ہیں۔ فی الحال مشغلہ کیا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ایک مرتبہ حضور افریقہ کی سیر و سیاحت فرمانا گوارا فرمائیں۔ باقی خیریت۔ اپنی خیریت ضرور لکھئے۔ فقط والسلام مع الاکرام

راقم محمد قاسم۔ نارتھ اسٹریٹ ڈربن (نشان) عارگس

جواب: آپ کے خطوط مجھے اس لئے یاد ہیں کہ آپ کا رجسٹری خط خلوص اور حُسنِ عقیدت سے لبریز تھا اور حق رکھتا تھا کہ میں اس کا شکریہ ادا کروں۔ مگر جس شخص کو قدرت نے تو بیسیوں تعلقات کا اس قدر جکڑ بند بنایا ہو کہ

وہ شہر میں بھی [illegible] کے وقت گھر سے باہر نکلا گیا۔ یاد کیسے ہو
[illegible] وجہ سے عام لوگ کی کیا کسی کو تکلیف دے۔ جس میں تنہا
گوشہ نشینی کا سفینہ اور تنہائی کا سلسلہ ہو کہ متواتر گئے
[illegible] پہاڑ کے سے اور جنگل کے درختوں میں وقت بسر کرتے ہو
[illegible] کا ہم زبان ہے۔ اُس کی ہر خلق بیت
کا تقاضا اور مجبوری ہے جو قابل رشک ہے۔ میں [illegible]
[illegible] ہوں جو اس کا کافی ثبوت ہیں۔

ہندوستان کے ایک بڑے شخص نے جس کی
گردش چشم بہت کچھ کر سکتی ہے۔ مجھے یاد فرمایا۔ میرے سے
[illegible] جلسہ میں [illegible] تھی۔ عزیز صاحب نے زبردستی
بٹھا دیا۔ ایک بے جان انسان کی طرح سامنے بیٹھی
تھی۔ جس وقت مجھ سے ایک سوال کیا گیا تو میں میر انیس
کے اس شعر کا دوسرا مصرع سوچ رہا تھا ؎

"سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم وہاں قدم رکھتے ہیں"

اسی طرح [illegible] صاحب چیف کمشنر نے [illegible] کے سلسلے
میں میرے ایک کرم فرما سے میری تصانیف کے متعلق اچھے
الفاظ فرمائے اور انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں جا کر
شکریہ ادا کر دوں:

میں نے ان سے بھی یہی عرض کیا۔

"آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے"

"وہ مسلم حضرات جو یہاں افسروں کی حیثیت سے
تعینات ہوتے ہیں مدرسہ کو دیکھنے یا مجھ سے ملنے تشریف
لاتے ہیں ان سے بھی یہی عرض کر دیتا ہوں کہ ملاقات بادوست
کی توقع نہ رکھئے۔ جو وقت آپ کی ملاقات میں صرف ہوگا
معصوم بچیوں کے ساتھ زیادہ پُر لطف ہوگا۔ آپ کی خدمت
میں مجھ جیسے بہت سے آتے رہتے ہیں لیکن ان کو پوچھنے
والے بہت کم ہیں ان کے سر سے جو کچھ اٹھ چکا ہے مجھے اسکی
تلافی کرنے دیجئے:

"مجھے اعتراف ہے کہ آپ کے محبت آمیز خطوط کا
جواب نہ دینے میں ایک حد تک میری بد خلقی ثابت ہوتی ہے
لیکن فطرت کے علاوہ اس میں کیفیت کا بھی دخل ہے۔
میں نے بعض کتابیں نہایت محنت سے لکھیں الزہرا
آمنہ کا لال - مسدس کا لال۔ اس کا صدر یہ ملا کہ
ہر طرف گالیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ وہ جس سے بدتر لفظ سننے
پڑے۔ یہاں تک کہ شیطان کی بخشش ممکن ہے مگر تمہاری
نہیں۔ میں نے تربیت گاہ بنات قائم کی اُس کا انعام بھلا
کر مختار [illegible] مستمر اب کلیجہ پک چکا اور اس کے
سوا اب میں اور کچھ نہیں چاہتا کہ بیکس بچیاں گود میں آس
اور سردار دو جہاں کا کلمہ زبان پر ہے۔

تو ہو تیرا جلوہ ہو اور عالم تنہائی

مسلمانوں کی طرف سے کسی ایسے کام کی مخالفت جو جماعت
سے متعلق ہو اگر نیک نیتی سے کی جائے تو سبحان اللہ مگر
آنکھیں یہ دیکھ اور کان یہ سن رہے ہیں کہ نفس حقیقت پر
غالب ہے۔ کہیں حسد ہے کہیں عداوت۔ کہیں شہرت ہے
کہیں مفاد کی کوشش۔ الغرض نفسانیت کا ایک جال ہے
جو اسلام کی آڑ میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ تربیت گاہ بنات
کی مخالفت یہاں تو شروع ہی سے ہوتی رہی مگر پچھلے دنوں
چند حضرات نے خصوصیت سے اس طرف توجہ فرمائی میری
ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جب کبھی کوئی بات اپنے خلاف
میرے علم میں آئے اپنے ناظرین و ناظرات تک پہنچا دوں تاکہ
اُن کو معلوم ہو جائے کہ بعض حضرات مجھ کو ایسا بھی سمجھتے
ہیں۔ اس سلسلے میں نے وہ پوسٹر جس میں مدرسہ کے وجود سے
انکار ہوا تھا اور مفتی کفایت اللہ صاحب جن کی بچی نے
تربیت گاہ بنات میں تعلیم پائی ہے۔ مسٹر آصف علی بیرسٹر

ایم ایل اے۔ جو تربیت گاہ کے قریب ہی رہتے ہیں۔ شیخ محمد اکرم بیرسٹر (جو بہت قریب رہتے ہیں) شیخ عبدالرحیم صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل (جن کی ہمسائیگی نے بہ حیثیت بطور تسلیم پائی ہے۔ ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ (جو اور بھی قریب رہتے ہیں) سید حسین صاحب تحصیلدار دہلی (جو بالکل پاس رہتے ہیں) وغیرہ کی رائیں بھی شائع کردیں۔ مذہب مقدس نے مجھے کسی مسلمان سے بدظن ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے میں مخالفین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اُن سے بھی اور خدا سے بھی دُعا کرتا ہوں کہ اگر میرا خیال غلط ہو تو معاف کیا جاؤں۔

۱۔ میں اور بیگم راشد الخیری تحفظ ارتداد کے سلسلے میں جو کچھ امکان میں ہے کرتے ہیں۔ بچیوں کے علاوہ ہم اُن غریب مفلس اور لاوارث کلمۂ توحید کی پڑھنے والیوں سے بھی بے خبر نہیں ہیں جن کے دن اور راتیں اللہ ہی اللہ کرتے بسر ہو جاتے ہیں۔ ہم بینڈوں کے سیمل پھریری کا ڈول اور انواع و اقسام کے کھانوں کے قابل تو نہیں ہیں مگر رمضان المبارک میں افطار کے وقت جب بچیاں اور بڑھیاں آقائے دوجہاں کا نام جپتی ہیں اور خدا کی مجسم رحمتیں مکتب بنات پر نازل ہوتی ہیں تو یہ تماشا محلہ والے اپنی آنکھوں سے روزانہ دیکھتے ہیں مگر الحمداللہ ہم نے آج تک کسی سے کوئی درخواست نہیں کی۔

۲۔ خدا کا شکر ہے۔ اس وقت تک ہماری کوئی بچی یا کوئی شخص متعلق کسی کے ہاں کھانا کھانے یا چندہ مانگنے نہیں گیا۔ رمضان المبارک یا شادی غمی کے موقع پر جن حضرات نے یاد فرمایا شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ جن حضرات نے پرورش کی آڑ میں لڑکیوں کے لینے کی خواہش ظاہر کی ان کی ذہنیت پر دل میں افسوس اور زبان سے انا اللہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

۳۔ ہم نے آج تک اپنے کاموں کا اعلان کرنے اور چندہ کے واسطے اس لئے کہ ہم اس کے اہل نہیں ہیں کوئی جلسہ نہیں کیا۔ البتہ ۲۷ رجب کو جو معراج کی رات ہے تمام رات بزم میلاد منعقد ہوتی ہے۔ شہر کی بھی اور باہر کی بھی خواتین کرم فرماتی ہیں اور مدرسہ کی بچیاں اپنے آقا و مولا کی خدمت میں درود بھیجتی ہیں اور اپنے مربیوں کے واسطے صحت و سلامتی کی دُعا کرتی ہیں۔ مگر قربان ایک بار نہیں ہزار بار اُس پاک نام پر جس کے طفیل یہ سب کچھ ہوتا ہے اور کبھی کسی قسم کی تحریک چندہ کی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کی خواہش تھی کہ یہ جلسہ عام کر دیا جائے مرد بھی شریک ہوں۔ علما بھی وعظ فرمائیں اور چندہ بھی کیا جائے۔ مگر ہم اس تجویز سے متفق نہ ہو سکے۔

میں جانتا ہوں کہ اسلام رد دعوت کو صحیح نہیں سمجھتا مگر ان لڑکیوں کو اس قسم کی روٹیاں کھلانی ان کی خودداری کو فنا کرتا ہے۔ میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی صاحب مدرسہ میں تشریف لا کر لڑکیوں کے ہاتھ میں روپیہ دیں یا اپنے سامنے کھانا دیں اور مٹھائی کھلائیں۔ آپ نے ازراہ کرم میری سیر و سیاحت کے واسطے تحریک فرمائی ہے۔ آپ کی عنایت و محبت کا شکر گذار ہوں۔

سیر و سیاحت ختم ہو چکی ہے۔ اب تین تین سال سے دوران سر اور اختلاج قلب نے اس کو بھی ختم کر دیا۔ پچھلے دنوں میں عصمتی بچیوں کے انتہائی اصرار پر صرف اس لئے کہ مدرسہ میں چھٹیاں ہوتی تھیں اور لڑکیوں کو میری تکلیف سے کچھ فائدہ پہنچ جاتا تھا۔ میں چلا جایا کرتا تھا مگر میں نے اپنا اصول کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ لیکن اب صحت روز بروز خراب ہو رہی ہے اور

آٹوگراف علامہ مغفور کے بہت سے آٹوگراف میں نے جمع کرلئے تھے مگر دلی سے ہجرت کے سلسلہ میں ضائع ہوگئے بس یہ دو چیزیں بچ گئی ہیں۔

"مجھے بڑے بڑے ادیبوں اور شعراء کے آٹوگراف حاصل کرنے کا شوق ہے اور کوشش یہ کرتا ہوں کہ وہ میرے سامنے ہی میری البم پر کچھ لکھ دیں۔ لیکن مجھے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ میں سخت متعجب رہ جاتا ہوں جب یہ "بڑے بڑے لوگ" آٹوگراف لکھنے کے لئے میری البم کچھ وقت اپنے پاس رکھنی چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوتی تھی جب میں دیکھتا تھا کہ حضرت مصور غم آٹوگراف لکھنے میں ایک لمحہ کا بھی توقف نہ فرماتے۔ بلکہ قلم کو کاغذ پر رکھتے ہی ان کے دماغ میں خیالات کا سمندر موجزن ہونے لگتا تھا۔ یہاں تک کہ جب دوسرے شہروں سے لوگ اپنی البم اڈیٹر عصمت کو بھیجا کرتے تھے کہ حضرت علامہ سے آٹوگراف لکھوا دیجئے تب بھی حضرت علامہ البم پر فوراً ہی کچھ لکھ کر اسی وقت واپس کر دیتے تھے۔ کبھی صرف اپنا نام اور تاریخ کبھی مذہب کبھی عورت کی فطرت یا اس کے رتبے کے متعلق۔ کبھی حیات مستعار کے متعلق ایسی دو تین سطریں تحریر فرماتے تھے جو بلند تخیل اور پاکیزگی الفاظ کی وجہ سے ادبی شہ پارے ہیں۔ کبھی موقع محل کی مناسبت سے کوئی شعر یا مصرعہ لکھ دیا کرتے تھے۔ نوجوان [illegible] حضرات کی البموں میں عموماً ایسی نصیحتیں تحریر فرماتے تھے جو طبیعتوں میں قومی اور مذہبی جوش پیدا کرتی ہیں۔

میری آرزو تھی کہ حضرت علامہ میری البم پر "محبت" کے متعلق کچھ لکھ دیں۔ لیکن اس کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ تاہم ایک دفعہ آرزو پوری ہوگئی جب میں نے البم پیش کی تو مسکرا کر فرمایا "تمہیں بھی شوق ہوگیا" عرض کیا "جی ہاں"۔

فرمایا کیا لکھوں؟ عورت کے متعلق"

میں نے نیچی نظریں کرکے کہا "محبت کے متعلق لکھ دیجئے"۔

فرمایا "اچھا" اور میرے لئے باعث فخر ناز البم پر حیات انسانی کے رفیع ترین جذبہ یعنی محبت کے متعلق ادب کے یہ بیش بہا موتی بکھیر دئے۔

"محبت کے مدعی! دیکھ ایسا نہ ہو تیرا دعویٰ محبت محبوب کو نقصان پہنچا دے"۔ راشد الخیری

صادق الخیری —— ساقی راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

۱۹۳۶ء میں جب میں دہلی گئی تو دو تین مرتبہ مجھے اور میرے شوہر صاحب کو بلایا اور کئی دفعہ خود بھی ہماری قیام گاہ پر تشریف لائے میں نے آٹوگراف میں کچھ لکھ دینے کی درخواست کی تھی اسی وقت یہ سطریں تحریر فرما دی تھیں۔ جو اب میرے پاس ان کی نشانی ہیں۔

"اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہاری نماز اور زندگی اور موت سب اللہ کے واسطے ہے۔"

"آج ۳۰ نومبر کی سہ پہر کا وقت عزیزہ سیدہ صغرا ہمایوں مرزا کی چاہ پر گذرا۔ سیدہ صاحب کی گفتگو سے سیدہ صغرا کے خیالات کس قدر پاکیزہ اور شستہ تھے۔ بے انتہا فرحت ہوئی۔

یہ دونوں محترم میاں بیوی قوم پر بجنت کا جو درد دل میں رکھتے ہیں کاش دوسرے مسلمان اس سے سبق لیں"

۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء —— راشد الخیری

آخری خط "جب میں نے حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم کو خط لکھا تو حضرت علیل تھے مگر وہ بسے

خلوص و ہمدردی کا نمونہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے جواب دیا۔ خط پڑھتے پڑھتے سوچا تھا کہ علامہ اتنے بیمار ہیں، کسی اور کے ہاتھ سے جواب آئے گا۔ واقعی اس کو کہتے ہیں خدمت خلق۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا بڑا آدمی اپنی علالت اور کمزوری کے باوجود کسی ادنیٰ سی لڑکی کے خط کا جواب اپنے ہاتھ سے دے گا۔"

(بیگم زادی نادر جہاں طاہرہ۔ سیونی، سی پی)

محترمہ۔ السلام علیکم

آپ کے خط کے جواب میں اس لئے دیر ہوئی کہ میں خود لکھنا چاہتا تھا مگر ہاتھ کام نہیں دیتے۔ رعشہ ہو گیا ہے۔ آپ کی ہمدردی اور محبت کے جذبات جو دخترانہ اور عقیدت مندانہ ہیں شکریہ کے مستحق ہیں۔ میں نے جو کوششیں لڑکیوں کے واسطے کیں۔ بہت سی میرے سامنے کامیاب ہو گئیں۔ باقی کے بیج بو چلا ہوں۔ یہ بھی انشاءاللہ بار آور ہوں گی۔ میں مطمئن نہیں ہوں۔ انفرادی رائے میری یہ ہے کہ اگر میرے اختیار میں ہو تو ہر شہر میں لڑکوں کے مدرسے توڑ کر لڑکیوں کے بنا دوں۔ اسلام کی خدمت اس وقت اس سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے کہ لڑکیاں ارتداد سے محفوظ رہیں اور افلاس ان کو آغوش اسلام سے نہ نکالے۔ ان کی تعلیم پر جو روپیہ جائے وہ بہترین مصرف ہے۔

افسوس میں اب صحت کے اعتبار سے کسی قابل نہیں ہوں۔ تصنیف و تالیف کے قابل ہوتا تو ایک لاکھ اسکول کی بنیاد ڈال دیتا۔ تاہم جو کچھ ممکن ہے کر رہا ہوں۔ دعا کیجئے کہ معبود حقیقی اسلام پر خاتمہ کرے اور رسول اللہ کا کلمہ زبان پر ہو۔ یہ پچاس برس کی مشقت سے کتب بنا رکھی ہیں۔ میری مغفرت کا سبب ہوں اور میری خدمت قبول ہو جائے۔ دعا ہے کہ آپ خوش و خرم رہیں۔

دعا گو

جمعہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء　　　راشد الخیری

علامہ مغفور کا یہ خط نومبر ۱۹۳۵ء کے عصمت میں شائع ہوا تھا۔ اور غالباً یہ آخری خط تھا جو انہوں نے خود تحریر فرمایا تھا۔

باب تیرھواں ——— سفرِ آخرت

"حیاتِ راشد کا آخری باب" اس عنوان سے علامہ مغفور کی علالت اور وفات کے حالات میں نے مارچ ۱۹۳۶ء کے عصمت میں لکھے تھے جو بعد میں "وداعِ راشد" کے نام سے کتابی صورت میں بھی تین مرتبہ شائع ہوئے۔ یہ کتابچہ [illegible] کے ۸۰ صفحے ہیں جن کا خلاصہ چند واقعات کے اضافہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

علالت کے پہلے تین ہفتے

جون ۱۹۳۵ء میں اپنے دور صادق میاں بیمار پڑے تو علامہ مغفور کے تین ہفتے انتہائی پریشانی میں گزرے اور قویٰ بہت تیزی سے مضمحل ہونے لگے۔ بیمار پڑنے سے مہینہ مہینہ بھر پہلے سے بھوک بہت کم رہ گئی تھی۔ ان کی رفیقہ حیات اور بچے عرض کرتے کہ بھوک کا علاج ہونا چاہیے تو کبھی وہ فرماتے کہ "قانون قدرت کا علاج کون کر سکتا ہے؟" کبھی یہ جواب ہوتا کہ "اچھا میں ڈاکٹر سے مشورہ کروں گا" اور کبھی یہ کہتے کہ اس عمر میں بھوک

سب کی یوں کم ہو جاتی ہے۔" پیر جی صاحب کی درگاہ میں جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ ۱۰ دسمبر کو جمعہ پڑھ کر آئے تو حرارت تھی۔ دو روز بعد بخار، ایک کھانسی بار بار اٹھتی تھی اور نزلے سے سینہ جکڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب کا علاج ہو رہا تھا مگر نہ کھانسی میں کمی ہوتی تھی نہ بخار اترتا تھا۔ سالہا سال سے رمضان کے مبارک مہینے میں بیواؤں یتیموں مسکینوں محتاجوں غریبوں کے لئے کھانے اور افطاری کا اہتمام فرماتے تھے۔ آٹھ دس روز سے طبیعت صاف نہ تھی۔ مگر شعبان کی آخری تاریخ کو اسی حالت میں پیر کو پلنگ سے اتر قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے اور خود اُن لوگوں کی فہرست تیار کی۔

دوسرا جمعہ لوٹ تھا اور حرارت ۹۹ کی۔ دوپہر کو مولانا عارف ہسوی سے جن کا جنوری سنہ ۳۶ء کے تیسرے ہفتہ میں انتقال ہوا۔ ڈولی میں بیٹھ کر ملنے گئے اور دو گھنٹے بعد واپس آئے۔ میں نے عرض کیا "طبیعت تو ٹھیک ہے نہیں بخار میں آپ کہاں چلے گئے تھے" تو فرمایا "عارف کو دیکھے بہت دن ہو گئے تھے۔ ۵۰ برس کے تعلقات ہیں۔"

دوسرے دن دوپہر کو پھر بخار ۱۰۰ تھا۔ میں شام کو ہوا خوری کو جاتا تھا۔ دوپہر کو جو کام دروازہ پر آ کر لگی بارش کی آواز سُنی ہو مجھے دیکھا تو فرمایا "اس وقت کہاں جا رہے ہو" میں نے عرض کیا "ڈاکٹر کو لینے" فرمایا "میں اتنا بیمار نہیں ہوں جتنی تمہاری پریشانی مجھے بیمار کر دیتی ہے۔ جاؤ تم کام کرو میں ڈاکٹر برکت کو بلا لیتا ہوں۔" تیسرے دن شام کو مجھے بلایا اور فرمایا "تم ہوا خوری کو اب تک کیوں نہیں گئے۔ گاڑی کیوں نہیں نکلائی۔ روز کہنا پڑ رہا ہے۔ دن بھر کے کام کے بعد تھوڑی دیر بھی تفریح نہ کرو گے تو کام کس طرح کر سکتے ہو۔ چلو میں بھی چلوں کس طرف چلو گے۔" میں نے عرض کیا "جدھر آپ فرمائیں چلئے" ارشاد ہوا "اب کون چلے۔ کل پر رکھو۔"

رات کو والدہ مرحومہ سے فرمایا "اس گھر میں میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ دو ایک روز میں نئی دہلی یا قطب صاحب چلو۔" یہ رات گذر گئی تو عرض کیا "بڑے مکان میں چلے چلئے دفتر ادھر آ جائے گا۔"

"تمہارے کلرکوں اور کاتبوں کو جو تکلیف ہوگی اور خود تمہاری نشست کہاں ہوگی؟"

میں نے عرض کیا "یہ سب انتظام ہو جائے گا آپ اس کا فکر نہ کیجئے۔" بڑا مکان جس میں دفتر تھا اس کی اور اس ملحقی مکان کی مشترک دیوار میں دروازہ تھا۔ بڑے مکان میں جس کی پُشت کی دیوار لب سڑک تھی ۱۱ کے بخار میں تشریف لائے اور پھر ملحقی مکان میں جانا نصیب نہ ہوا۔

یہ مکان وسیع اور کشادہ تھا لیکن پانچ روز تک دھوپ نہ نکلی۔ مطلع ابر آلود رہا۔ بوندیاں بھی پڑیں اور سرد ہوائیں بھی چلیں۔ دو دو ڈاکٹر روز آ رہے تھے۔ ۱۰ تاریخ سے کھانسی زیادہ ہو گئی اور ۱۱ دسمبر کی شام کو بخار ۱۰۲.۵ تھا۔ میں نے صادق میاں کو نئی دہلی ڈاکٹر جاولہ کو لانے کے لئے بھیجا۔ وہ آیا تو صادق میاں پر خفا ہونے لگے کہ "بغیر میری اجازت کیوں لائے" انہوں نے عرض کیا "مجھے تو بھائی میاں نے بھیجا تھا" ڈاکٹر سے فرمایا۔

"میں بالکل اچھا ہوں۔ یہ دھڑکے پاگل ہیں۔ مجھے بھی تو معلوم ہو کہ آخر تشویش کی کیا بات ہے۔ کیا بخار زیادہ نہیں ہوتا؟ کھانسی نہیں ہوتی؟ رہی گھبراہٹ تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مجھ سے زیادہ گھبراہٹ شاید ہی کسی کو ہوتی ہو۔"

زہر ہلاہل

دوپہر کو مونگ کی پتلی کھچڑی کھا رہے تھے کہ شلجم کے اچار کے مرتبان پر نظر پڑ گئی۔ ماما کو اشارہ فرمائی کہ چمچے سے نکال لائے۔ اُس کے قتلے بھی کھائے اور چمچے سے اس کا پانی بھی پیا۔ اُن کی چچا زاد بہن بھوپالی ملیحہ بیگم

ایک انگوٹھی دوں۔ لادو گے؟" ابھی جیجے" یہ کہہ میں نے اوور کوٹ پہنا۔ فرمایا "ٹھہرو تو سہی بھاگے کہاں؟ کس کے سامنے جا رہے ہو۔ سعد میاں کو لے جاؤ اسے انگوٹھیوں کا شوق بھی ہے" ایک خاص نمونے کی انگوٹھی اور وہ بھی سفید نگ کی۔ نئی دہلی کی بڑی سے بڑی دوکانیں دیکھ ڈالیں چاندنی چوک کی کوئی دوکان نہ چھوڑی خدا خدا کرکے دریبہ کی ایک دوکان پر انگوٹھی ملی۔ اور سعد میاں کی پسند سے لے کر ساڑھے دس بجے رات کو آیا بہت خوش ہوئے۔ بے شمار دعائیں دیں۔ اپنے ہاتھ سے اماں جان کو انگوٹھی پہنائی تو آپا جان نے کہا "کتنی اچھی معلوم ہو رہی ہے" مسکرائے مگر ان کی مسکراہٹ میں موت کہہ رہی تھی "یہ آخری نشان ہے" ——— (وداع راشد۔ صفحہ ۲۳)

تشویش اور پریشانی

۳۰ دسمبر کی رات کو جو کھانسی اٹھی تو پھر خون نکلا۔ دیکھا اور فرمایا۔

"اچھا۔ باقی رہے نام اللہ کا"

صبح ڈاکٹر آیا اس نے کہا "عکس ریز کرانا ہی پڑے گا" انہیں معلوم ہوا تو خفا ہونے لگے۔ فرمایا کیا تاریخ ہے میں نے کہا "۳" فرمایا "عصمت جا رہا ہے" عرض کیا "آپ کی دعا سے سب کام ٹھیک ہو رہے ہیں" ارشاد ہوا "پرچہ تو لاؤ۔ ایک نظر ڈال لوں" اس وقت جنوری ۱۹۳۶ء کا عصمت پیش کیا گیا صادق میاں نے علالت کا حال پڑھ کر سنایا تو مجھے آواز دی حاضر ہوا تو فرمایا۔

"تم نے بغیر میری اجازت میری علالت کا حال کیوں لکھ دیا؟"

میں نے عرض کیا "اس لئے لکھا کہ آپ کی ہزاروں بیٹیاں خلوص دل سے دعا مانگیں گی جن کی خدمت کرتے ۴۰ سال ہو گئے وہ غیر نہیں آپ کی اپنی بچیاں ہی تو ہیں" فرمایا "اچھا"

خون بند ہونے کے انجکشنوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بنگالی ڈاکٹر مکرجی کا علاج شروع کیا۔ اس نے کہا "فلو ہے" آٹھ دس روز سے مدرسہ والے مکان کے صحن میں ڈولی میں بیٹھ کر جاتے اور دھوپ میں ۴۔۵ گھنٹے روز بیٹھتے تھے۔ ۱۳ دسمبر کو بہت زور کی کھانسی اٹھی تو خون بہت نکلا اتنا زیادہ کہ نڈھال ہو کر گرنے لگے۔ میں سرہانے تھا۔ گود میں لیا۔ سب کی طرف حسرت سے دیکھا اور فرمایا "اللہ اللہ!"

مصورِ غم کا پیغام

"یہ سن کر کہ جنوری کے عصمت اور دوسرے اخبارات و رسائل میں علالت کا حال اور دعائے صحت کی التجا کی گئی ہے ابا جان نے فرمایا۔

"میں مسلمان لڑکیوں کے نام ایک پیغام دینا چاہتا ہوں"

ابا جان ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ بھائی میاں نے یہ کہہ کر انہیں کچھ فرمانے نہ دیا "ابا جان اللہ آپ کو جلد اچھا کر دے پھر جتنے چاہے مضامین لکھیئے اور یوں تو آپ کی ہر تصنیف ایک پیغام ہے" کچھ دیر بعد بھائی میاں کسی کام سے کمرے سے باہر گئے تو مجھ سے فرمایا "احتیاطاً کہتا ہوں رازق تو دیوانہ ہو گیا ہے۔ کوئی بات ہی نہیں کرنے دیتا۔ انسان کو کامیابی اور ناکامی ہر معاملہ کے دونوں پہلو سامنے رکھنے چاہئیں لکھو" میں بت بنا ہوا تھا اور عورتوں کا محسن اعظم بستر مرگ سے الفاظ کے بیش بہا موتی بکھیر رہا تھا۔ الفاظ مجھے یاد نہیں جو ایک آدھ بات ذہن میں رہ گئی ہے اپنے شکستہ اور بے جان الفاظ میں لکھتا ہوں۔

"مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک مرد عورتوں کو ان کے جائز حقوق واپس نہ کر دیں وہ حقوق جو اسلام نے انہیں عطا کئے۔ اور مردوں نے اپنی خود غرضی اور ہٹ دھرمی سے غصب کر لئے۔

اس کے ساتھ عورتیں بھی اپنے فرائض کو پہچانیں۔ ایک طرف وہ جہالت کی چار دیواری سے نکل کر تعلیم اور ترقی کی

قلب کی بجتی ہے۔ میں نے آپا کو بیجا کہا کہ بلا لاؤ۔ یہ خود نہیں آئی آتا تا آپا کی بھی یہ خواہش نہ تھی۔ اسے بلانے والا میں ہوں۔ یہ آپ کی ہزار برس کی بہو ہے۔"

"اچھا اچھا۔" آنکھیں کھول دیں۔ "آؤ بیٹی کس طرح ہو۔" میں بیمار کے کمرے میں چلا گیا۔ دو ایک باتیں کیں کہ میں نے یہ الفاظ سُنے۔

"مگر تم اُس وقت آئیں جب میرا آخر وقت ہے۔"

میں اُلٹے قدموں لوٹا اور پاؤں سے چمٹ گیا۔ "ابا جان یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ مارچ میں یہ امتحان سے فارغ ہو جائیں گی بس اپریل میں لے آئیے۔"

فرمایا "بیٹی اب تو تم ماشاء اللہ خوب بڑی ہو گئیں۔ میں نے تو سات آٹھ سال کا دیکھا تھا۔ جب تم چھوٹی تھیں۔ تمہارا امتحان کب ہے؟ کیا کیا مضامین ہیں؟ کچھ لکھتی ہو؟ دستکاری بھی کچھ جانتی ہو؟ گانے کا بھی شوق ہے؟" آٹھ دس منٹ باتیں کرتے رہے۔ پھر والدہ مرحومہ سے کہا "صادق کہاں ہے؟" واحدہ بیگم نے کہا "ملاقات کے کمرے میں۔" فرمایا

"اس نے دیکھ تو لیا ہوگا۔ بہت خوش ہوگا۔"

آدھ گھنٹہ پہلے یخنی پینے سے انکار کر دیا تھا۔ صادق دلہن نے یخنی پلائی اور اوولٹین بھی پھر مجھے بلا کر حکم دیا۔

"اس کے سر پر ہاتھ رکھو اور پیشانی پر بوسہ دو۔"

میں نے عرض کیا "خدا آپ کا سایہ اس کے سر پر سلامت رکھے ہاتھ آپ رکھیے۔ بوسہ آپ دیجئے۔ یہ میرے پاس نہیں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہے میں نے دلہن سے کہا "جھک جاؤ" وہ جھک گئیں تو میں نے ابا جان کا ہاتھ اُٹھا کر سر پر رکھ دیا۔ مسکرائے اور فرمایا "اب میری خوشی یہ ہے کہ تم سر پر ہاتھ رکھو اور بوسہ دو" میں نے تعمیل حکم کی چند باتیں اور کرنے کے بعد صادق دلہن سے فرمایا "بیٹی اب تم جاؤ۔ تمہیں دیکھ کر اور تم سے باتیں کر کے طبیعت

بہت خوش ہوئی۔ خدا ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔" جب سلام کر کے کھڑی ہوئیں تو والدہ مرحومہ سے فرمایا "تم نے دیکھا صادق دلہن کو اس وقت میرا دل بہت خوش ہے۔" پھر مجھے آواز دی اور فرمایا "میری طرف سے سلامی دو۔"

"ابھی لیجئے ابا جان مگر آپ اپنے ہاتھ سے دیجئے۔"

سلامی دی اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

خون دو روز بعد بند ہو گیا۔ مگر بھوک نہ کھلی کھانسی کا دورہ زور رہا اور کمزوری روز بروز بڑھتی گئی۔ لیکن صادق دلہن کو دیکھنے کے بعد طبیعت کئی روز تک بحال رہی ایک ایک سے کہتے "بس اب میں دو مہینے بعد صادق دلہن کو لے آؤں گا۔"

رات کو وہ بجے میں پیٹھ دبا رہا تھا فرمایا۔

"بیٹا یہ کام لڑکیوں کے ہیں کئی دفعہ منع کر چکا ہوں۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا" جب میں نے ضد کی تو فرمایا۔

"اچھا میاں تمہاری خوشی۔ رازق تم نے بہاء کو بلا کر میری طبیعت خوش کر دی۔ اب دیکھو میں بہت جلد اچھا ہو جاتا ہوں۔"

رشتہ کی نواسی کا خیال

"انہیں دنوں میں کنبہ کی ایک غریب لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ یہ لڑکی رشتہ میں ابا جان کی نواسی لگتی۔ کسی ضرورت سے ابا جان نے چپراسی کو بلایا۔ تو اس نے کہا "میں بکرا لینے جا رہا ہوں"۔ ابا جان نے سُنا فرمایا "دو لاؤ" اور مجھے بلا کر ارشاد ہوا "ارے میاں میں بیمار پڑ گیا تو تمہیں بھی اس بدنصیب کا خیال نہ رہا جس کا باپ ہے نہ ماں۔ اپنے باپ کے لئے صدقہ کا بکرا منگا رہے ہو اس بدنصیب کے دولہا کی دعوت بھی کر سکتے تھے۔ جس کے ساتھ دنیا میں کسی کو ہمدردی نہیں۔ مگر جو خدا کی راج کی مالک ہے۔"

میں نے عرض کیا "ابا جان میں اس پریشانی میں کس طرح کسی کی دعوت کا انتظام کر سکتا تھا۔" فرمایا "فرائض کی ادائیگی کا اگر

احساس ہوتا کوئی چیز کا مزہ نہیں چکھ سکتی۔ کھانا پکوانے
کا کام کسی کارکن کے سپرد کر رکھا ہے۔ کھانا کھلانے کا انتظام
مرزا ریاض کر سکتے تھے جبکہ مکان میں لا سکتے۔"

میں خاموش تھا۔ فرمایا "کس دادا کے پوتے ہو؟
اُس کے جس نے فقیروں کا پیٹ بھرتے ہوئے دیکھ کر
اپنی قیمتی شہد آنکھ کر بہا دیا۔ اس باپ کے بیٹے ہو جس نے
بیٹے کو بھی پیسہ ہی نہ سمجھا۔ اور اس بے کس زندگی کی دعاؤں
سے سدا مالا مال رہا۔"

پھر فرمایا "بیس روپیہ دو۔" میں نے پیش کئے اور
ندامت کے ساتھ عرض کیا "ابا جان معاف فرمائیے کچھ
خیال ہی نہ رہا۔ اللہ بھی میری اس غفلت کو معاف فرمائے۔"
جن کی خفگی کا ایک ایک لفظ ساری دُنیا کی
مجموعی محبت اور ہمدردی سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ ان کی
آنکھوں کے مقدس کونوں پر دو بے بہا موتی چمک رہے
تھے۔ میں نے آنسو پونچھے اور کہا "ابا جان آپ کیوں رو
رہے ہیں؟" فرمایا "میرے بچے کو کسی کی نظر نہ لگ جائے
جاؤ بیٹا ناشتہ کرو میں ابھی اوولٹین پیتا ہوں . . . ."

اوراق راشد صفحات ۷۴، ۷۵

بچوں کا خیال

جنوری کی ۱۷ تاریخ تھی۔ صادق میاں
باہر کے دالان میں ناشتہ کے لئے بیٹھے۔
چلمن پڑی ہوئی تھی۔ اندر سے باپ کی نظر جو پڑی تو فرمایا
"ناشتہ یہاں لاؤ" دیکھا اور والدہ مرحومہ سے فرمایا
"یہ ناشتہ اس کے لائق ہے؟" ایک ماما کو بلا کر
فرمایا "صادق میاں کی خوشدامن سے جا کر کہو صادق
کے لئے ناشتہ آپ بھجوایا کریں۔" پھر والدہ مرحومہ سے
کہا "میری بیماری کے یہ معنی تو نہیں کہ میرے بچے نوکروں
سے پوچھ کر کھانا کھائیں"۔

میں صحن میں تھا آواز سن کر ماما نے عرض کیا۔
"ماما کو وہاں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ آج سے
صادق میاں میرے ساتھ ناشتہ کریں گے۔"
فرمایا "بس اب مجھے اطمینان ہو گیا۔"
آپا کے شوہر بھائی عبدالغفور مرحوم کا ذکر ہوتا تو
فرماتے: "ایسے سیدھے آدمی کو داماد کی تلاش میں نہ جانے
کیسی کیسی دقتیں اٹھانی پڑیں۔" ۲۰ جنوری کو ان کی بچی
نواسی رقیہ اوولٹین بنا کر لائی تو زور سے فرمایا "ارے
اس کا کیا ہوگا۔ اس قدر بھولی لڑکی کا بھی عبدالغفور کس
طرح ڈھونڈے گا۔"

۲۳ جنوری کو میری بڑی بچی رازقہ کو بلایا۔ وہ
اُس وقت ۵ سال کی تھی۔ گلے سے لگایا پیار کیا اور
اماں جان سے فرمایا "میں نے ساری عمر لڑکیوں کے ساتھ ہمدردی
کی ہے۔ میری بچیوں کے ساتھ کون ہمدردی کرے گا۔"
آنکھ میں آنسو تھے۔ چند سیکنڈ خاموش رہنے
کے بعد فرمایا:۔
"الٰہی یہ میرے جگر کے ٹکڑے میرے پیاروں
کے پیارے یہ بھولی بھالی بچیاں تیرے سپرد ہیں۔"
جس طرح ابا جان نے اپنے بڑے پوتے کی پرورش
فرمائی جس طرح اسے بچپن میں پالا جیسی جیسی ناز برداریاں
فرمائیں حقیقت یہ ہے منتوں مرادوں کی اولاد کے لئے
بھی کوئی نہ کرے گا۔ ایک آدمی صرف اس بچے کو مدرسے
پہنچانے اور لانے اور کھیل وغیرہ میں ساتھ جانے کے لئے
تھا۔ جنوری کا غالباً تیسرا ہفتہ تھا۔ رات کے وقت
سعد میاں سر سہلا رہے تھے فرمایا "جاؤ بیٹا کھیلو"
وہ اٹھ کر جانے لگے تو ملازم کا نام لے کر دریافت فرمایا۔
"وہ تمہیں روز مدرسے پہنچانے جا رہا ہے؟" انہوں نے

عرض کیا "آج تو نہیں گیا" اس قدر مجھ پر خفا ہوئے کہ راحت کرا دو شین کیا دو انگ نہ پایا۔

بیمار پڑنے سے تین روز قبل کا ذکر ہے سعد میاں ایک کبوتر بندوق سے زخمی کرکے خوشی خوشی لائے اور کہا "ابا جان آپ کے لئے شکار لایا ہوں"۔

فرمایا "بیٹا جس نے تمہاری پناہ لی اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ شکار کے لئے جنگل ہے دکھ اپنا گھر"۔

سعد میاں کو لال اور چڑیاں پکڑنے اور پالنے کا شوق ہوا۔ اور ضد کی تو اس شرط پر اجازت دی کہ روز جتنے پکڑو اتنے ہی چھوڑ دو۔ اور کوئی لال یا چڑی دو روز سے زیادہ بند رکھو"۔

(وداع راشد)

ریڈیو تقریر کوئی نہیں کی

دلی میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہو چکا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے آغا محمد اشرف مرحوم کی دلی تمنا تھی کہ علامہ مغفور کی تقریر نشر ہو جائے۔ وہ اسی خیال سے آئے تو علامہ مغفور کی نقاہت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ انہیں لے کر میں حاضر ہوا اور کہا "آغا اشرف ریڈیو پر تقریر کرانے آئے ہیں"۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ آغا صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آداب کیا تو فرمایا "جیتے رہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ بس اللہ ہے"۔

بستر مرگ پر اردو کا خیال

"مولانا کے انتقال سے ۱۱ دن پہلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ آخری ملاقات میں ساری عمر نہیں بھول سکتا۔ مولانا آنکھیں بند کئے کروٹ سے لیٹے ہوئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ کھانسی اٹھی اور میاں صادق نے جلدی سے اُن کے منہ سے اگالدان لگا دیا۔ بہ دقت تمام وہ تھوک سکے۔ ذرا ہوش بحال ہوئے تو میاں صادق نے اُن کی خاموشی کے وہم کو توڑنے کی غرض سے کہا "بھائی شاہد آئے ہوئے ہیں۔ آپ کا مزاج پوچھ رہے ہیں"۔ مولانا کے چہرے پر احساس کی ایک چمک پیدا ہوئی۔ مگر آنکھیں نہ کھلیں۔ بہت دیر میں آہستہ اور نحیف آواز میں بولے :-

"میاں شاہد! سر جوڑ کر کام کرو۔ اُردو کو اگر زندہ رکھنا چاہتے ہو تو مل کر کام کرو۔ اُردو کو زندہ رہنا چاہئے ہندوؤں کو ملاؤ۔ انہیں تم الگ نہیں کر سکتے۔ ہندوؤں نے بھی اُردو کو ترقی دی ہے۔ کوئی انجمن بناؤ۔ انہیں برابر کا شریک کرو۔ اُن سے مل کر کام کرو۔ یہ کام اب تمہارے کرنے کے ہیں میں تو مر چکا"۔

"میں حیران تھا کہ اس درجہ شدید تکلیف میں بھی زبان کا یہ خیال! موت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور اُردو کی بربادی کا ملال! ہائے یہ دل کہاں سے آئے گا۔ ہاتھ پاؤں جواب دے چکے۔ زبان بھی مشکل سے اُٹھتی ہے مگر ایک ہی دُھن ہے اُردو۔ جس شخص نے اپنی ساری عمر زبان کی خدمت میں صرف کر دی اس کے جذبات کا ہم کس طرح صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مولانا نے اس چمنستان کو نصف صدی تک اپنے خون سے سینچا تھا اور اس کی خزاں کو بہار سے بدل رہا تھا۔ ان کے دم کے ساتھ اُردو بھی دم توڑ رہی ہے اس لئے مرتے مرتے بھی انہیں اپنی زبان کا خیال ستا رہا تھا۔ کہنے کو دو سطریں ہیں مگر کم و بیش دس منٹ میں مولانا کے منہ سے ادا ہو سکیں"۔

شاہد احمد دہلوی ساقی راشد الخیری نمبر

آخری شعر

صبح سے رات تک عیادت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور حکم تھا کہ کسی کی خاطر مدارات میں کمی نہ ہو۔

"ہائے یہ وہی خطیب تھا جس کے خطبات کی گونج

آج تک سننے والوں کے کانوں میں گونج رہی ہے جس کی
راز کا کردار کا اپنے استاد مولوی نذیر احمد کی طرح مشہور تھا
آج وہ مرض ملازمت کے ہاتھوں اس وجہ مجبور ہو گیا ہے
دروغہ پیسے میں ہی سے تکلف ہوتا تھا ... تھوڑی
دیر بعد ان رازق سے مولانا کی کیفیت پوچھتا رہا۔ اتنے میں
رخصت ہوں کر بڑی بھابھی کھانا لئے چلی آتی ہیں۔ میں نے کہا۔
"آپ کیا غضب کر رہی ہیں۔ سارے گھر والے پریشان خود
مرا دل پریشان مجھ سے کھایا نہ جائے گا" وہ بولیں "آپ نے
کہا ہے میاں شاہد کو کھانا کھلا کر بھیجنا"

شاہد احمد دہلوی — ساقی راشد الخیری نمبر

اور اس دن کچھ اور عزیز آئے ہوئے تھے اور
ان کے سامنے سینے میں بلغم رکے ہوئے تھے وہ کھانس رہے
اور انہیں نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک
شعر پڑھا۔ یہ ان کا آخری شعر تھا اور کچھ اس طرح تھا۔

ہے یہ بہار آخری۔ اس کو غنیمت جانئے
صحبت شب پھر کہاں راشد کے اٹھ جانے کے بعد

روحانیت

"مولانا کی وفات سے چار دن پہلے میں ملنے
گیا تو وہ پلنگ پر لیٹے تھے اور ان کے
بڑے فرزند رازق الخیری صاحب ان کے پہلو میں بیٹھے ان کی
خدمت کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا خواجہ صاحب آئے
ہیں۔ مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل سے لگا لیا۔ اور
ایسی محبت ہاتھ کو دل سے لگانے میں ظاہر کی کہ مجھے پرانے
زمانے والوں کی دوستیاں یاد آگئیں جن کا ذکر کتابوں میں
پڑھا ہے۔ اس وقت مولانا کی روحانیت کی طرف بہت ہی
توجہ معلوم ہوتی تھی اور ان کا دل خدا کی طرف پوری طرح
راغب تھا جو ان کی گفتگو سے ظاہر ہوا جو اس وقت انہوں نے
کی تھی"۔

خواجہ حسن نظامی — عصمت راشد الخیری نمبر

مایوسی کے بادل

بہر حال علم میں ترقی حیات تندرستی ہوا دن
یہ پیچھے کو ہٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی
تھی یہاں تک کہ موجوں کا وہ شور کم ہونا شروع ہوا اور ساحل
مراد نظر آنے لگا۔ مگر کسے خبر تھی کہ یہ بڑھ رہی تھی کنارے پہ
پہنچنے کے لئے اور چلی جا رہی تھی غرق ہونے کے واسطے۔
خزاں کے زبردست حملے نے سکون و اطمینان کا باغ ویران
کر دیا تھا مگر اب پھر امیدوں کی کلیاں پھوٹ رہی تھیں بہار
کی ہوائیں سرسرا رہی تھیں، لیکن کیا معلوم تھا کہ کلیاں
پھوٹ رہی تھیں مرجھانے کے لئے اور ہوا کی سرسراہٹ
تھی بادِ سموم بننے کے واسطے۔ دل امیدوں سے معمور تھے
آنکھوں میں کامیابی کی جھلک تھی۔ ہونٹوں پر شادمانی کی
مسکراہٹ اور چہروں پر اطمینان کا خون اس لئے کہ مرض
میں کمی ہو رہی تھی۔ مگر آہ سنبھل نہیں رہے تھے سنبھالے
رہے تھے۔ ۲۳ جنوری کی صبح آغاز تھا اس اجمال کا
جو ۳ فروری کو نظر آتا تھا۔ ۵ بجے کا وقت تھا کہ کھانسی زور
سے اٹھی اور اس کے ساتھ پھر خون!
دیکھا۔ گھبرا گئے۔ فرمایا
"ارے یہ تو پھر خون ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"

(وداع راشد)

ڈاکٹر ظفریاب حسین۔ ڈاکٹر برکت علی مرزا۔ ڈاکٹر
مکرجی تینوں نے دیکھا۔ تینوں کے مشورہ سے نسخہ تجویز
ہوا۔ انجکشن تیسرے چوتھے روز لگ رہا تھا آج بھی لگا۔
شام کو بخار تیز ہو گیا فرمایا۔
"علاج میں کمی نہیں ہوئی۔ لیکن اللہ ہی کو صحت
منظور نہیں۔ مرض اور طبیعت میں دو ماہ تک لڑائی ہوتی
رہی۔ طبیعت نے مرض کو غالب نہ ہونے دیا۔ لیکن اب
طبیعت روز بروز گر رہی ہے اور کمزوری بڑھتی چلی جا رہی ہے"

پھر ہاتھوں کو دیکھ کر فرمایا۔

"ہائیں! یہ میرے ہاتھ ہیں، جھریاں نکل آئیں۔ کسرتی جسم تھا۔ بڑی ریاضت کی تھی۔ . . . آخر کہاں تک۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"

دوپہر کو آمنہ نازلی یخنی تیار کر کے لائیں تو بیٹے عرض کیا "یہ تو پی لیجئے۔ بہت مزے دار ہے۔"

فرمایا "تو بھئی مزے دار بھی نہ ہو گی۔ تم ہو بھی تو دلی کے سب سے بڑے باورچی" پھر بہو کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "اور ان کے تو کیا کہنے۔ حقیقی دسترخوان انہیں کی بدولت" ہنسا کر پھر رُلا دیا "میری جان کس طرح پیوں۔ بھوک اُڑ چکی۔ خدائی معاملہ میں دخل نہ دو۔" دفعتاً خیال آیا اس فقرے سے سب پریشان ہو گئے ہوں گے فرمایا "اچھا لاؤ۔ پی لوں مگر بھئی بھوک کچھ کھل کر لگے تب بات ہے۔"

آخری بارش

قدرتی مناظر کا بہت لطف اُٹھاتے تھے۔ بجلی کڑکتی اماں جان ڈرتیں مگر وہ صحن یا انگنائی میں ہوتے، مینہ برستا۔ دھوپتال پانی پڑتا۔ اور وہ باہر کے دالان میں آجاتے۔ چاند تاروں کی محفل جمتی اور وہ سردیوں میں بھی انگنائی میں چارپائی بچھوا کر آسمان کو دیکھتے۔ دریا کی لہروں کو درخت کے سرسبز پتوں کو ہری بھری گھاس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ جنوری کی سخت سردی تھی کہ بارش ہونے لگی۔

فرمایا "ذرا چلمن اُٹھا دو۔ بارش ہو رہی ہے میں بھی تو دیکھ لوں۔"

انجام کا اشارہ

رات کے گیارہ بجے تھے ٹائم پیس کی طرف دیکھ کر فرمایا "ایک گھنٹہ بعد آج کا دن ختم ہو جائے گا۔"

"مگر ابا جان پھر دوسری تاریخ شروع ہو جائے گی۔"

فرمایا "ہاں اس طرح انسانی زندگی کے مختلف دور آتے ہیں۔ ہر انجام کے بعد ایک آغاز ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہے پھر فرمایا۔

"رازق میاں! جس دنیا نے رسول اکرم سے وفا نہ کی وہ کسی سے وفا نہیں کر سکتی۔"

حمیدہ بیگم نے بیماری میں باپ کی بہت خدمت کی اتنی کہ بہت کم بیٹیوں کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے انہیں خود بخار ہو گیا تھا۔ مگر باپ کے پلنگ کی پٹی نہ چھوڑتی تھیں۔

بے چینی

۲۵ جنوری کو فرمایا "میری صحت چاہتے ہو تو ایک کام کرو۔ موٹر نکلواؤ اور مجھے سیر کے لئے لے چلو۔ اتنے دن پڑے پڑے موت کا مزہ آ گیا۔" میں نے عرض کیا بہت اچھا ابھی ڈاکٹر سے دریافت کرتا ہوں۔" فرمایا "ڈاکٹر کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ویری سوری VERY SORRY کہہ کر چلا جائے گا۔ مگر تم سب ساری عمر روؤ گے۔"

عرض کیا "ابھی کار نکلواتا ہوں۔"

اماں جان نے اشارہ سے منع فرما کر بعد میں سمجھایا کہ "اُٹھنے کی طاقت تو ہے نہیں بیٹھیں گے کس طرح۔ دوسرے دن بھی پھر اصرار فرمایا۔ ہم کو ڈاکٹر آیا تو کہا "یہ لڑکے تو خیر بچے ہیں آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ جو شخص ایک جگہ کبھی دس منٹ کے لئے بھی نہ ٹھہر سکتا ہو۔ جس کی سیمابی طبیعت ہو آج اُسے کمرے میں پڑے پڑے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا۔ میں آپ کا علاج بند کر دوں گا۔ پہلے گاڑی منگوا لیجئے میں ہوا خوری کو جاؤں گا۔"

ڈاکٹر کا کیا بگڑتا تھا۔ خوب ہاں میں ہاں ملائی۔ دق اور سل کے ماہر ڈاکٹر ابس لنے لطیف نے دیکھا

مسکرائی اور ڈاکٹر یکت سے انگریزی میں کہا "
ے اہم نہیں ہیں مجھے شبہ ہے کہ یہ جو خون آرہا
نی تپ دق کی وجہ سے ہے "
نگریزی میں جواب دیا " ڈاکٹر تمہاری تشخیص غلط ہے
نہیں ہے - اور یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ حالت
خطرناک ہے - تم نے دیکھ کر کیا تیر مارا " ڈاکٹر کی
سے بے ساختہ نکلا " مولوی صاحب انگریزی بھی
ہیں "
اور پھر ڈاکٹر پی سی سین نے بھی دیکھا - مگر چار چار
پانچ ڈاکٹروں کے مشورہ کے باوجود کوئی علاج
ہوتا تھا - کوئی دوا اثر نہ کرتی تھی - کوئی کوشش بارآور
نہ تھی -

آخری غسل کی ہدایت

۲۹ جنوری کی صبح انجکشن دیا تو والدہ مرحومہ نے فرمایا " انجکشن
بہت تکلیف ہوتی ہے " پھر اسی رات کو فرمایا " نہائے
دن ہو گئے - رازق میاں کے کھانے کے بعد میں نے
وہاں جا کر نہا لوں " انہوں نے جواب دیا " اب اس
رات کو کہاں جاؤ گے کل سہی " فرمایا " اچھا " یہ ہدایت
آخری غسل کے متعلق !!

روضۂ اقدس کی حاضری کی حسرت

پچھلا پہر تھا فرمایا :-
" مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا - دنیا کی
نعمت خدا نے مجھے دی " آگے کچھ اور فرمانے کہ آپا جان
لیں " آپ جیسے انسان بھی تو بہت کم ہوتے ہیں "
فرمایا " سب ہی ارمان پورے ہو گئے - صادق لاہن
بھی رازق میاں نے دکھا دیا - ہاں روضۂ اقدس پر حاضر
نہ ہو سکا - اس کا افسوس ہے "

میں نے عرض کیا " مگر آپ آنحضرت کے قول کے معتقد
ہیں - آپ کو یاد ہے کس عقیدت سے بادضو کتاب آپ نے
لکھی ہے "
فرمایا " یاد ہے بیٹے - میرا نذرانہ خدا کرے بارگاہِ
رسالت میں قبول ہو گیا ہو "

ناامیدی کا

پندرہ بیس منٹ خاموش رہے پھر فرمایا " آج
سے چالیس سال قبل دنیا کی کیا حالت تھی -
میں نے عرض کیا " وضعداری کے چشمے پھوٹ رہے
تھے محبت کے پھول کھل رہے تھے "
" اس وقت مسلمان عورت کی کیا حالت تھی تم اندازہ
نہیں کر سکتے "
" آپ ہی کی کتابوں سے اندازہ کیا ہے - اس وقت
عورت کی حالت بہت خراب تھی - جہالت رسوم کی پابندی
مرد کے مظالم - پردہ کی سختی - آپ نے عورتوں کو جھنجھوڑا - ان میں
بیداری کی روح پھونکی - ان کے حقوق کے لئے سارے
ہندوستان سے لڑے "
" جی یہ چاہتا تھا کہ عورت کو خلع کا حق مل جاتا
اور پنجاب میں مسلمان لڑکی کا نزکہ ملنے لگتا "
- گھبرائیے نہیں - مسلمان عورت کے لئے ابھی
آپ کو اور بہت کچھ کرنا ہے جلدا چھے ہو جائیں گے "
آنکھیں کھلیں - پھر بند کرلیں - پھر چند لمحے نیم وا
آنکھوں سے حسرت سے دیکھا اور فرمایا -

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

آپا نے کہا " آبا ایسی باتیں نہ کیجئے "
فرمایا " رازق میاں حالی کی اس غزل کے کچھ اور
شعر یاد ہوں تو سناؤ "

وہ شعر سنائے۔ مٹنے اور فرمایا: "تمہیں مطلع یاد نہیں؟"

یاد تھا مگر کس دل سے سناتا۔ فرمایا "تو سنو مجھے یاد آگیا"

اُن کے جاتے ہی کچھ اور ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

فرمایا "بیٹے ہمیشہ خوش رہو۔ خوش ہی رہو گے۔ اب تم جا کر سو جاؤ تو میں خوش ہو جاؤں"

پھر اپنی رفیقۂ حیات سے فرمایا:-

"تمہاری خدمات اے بیگم بہت قیمتی ہیں۔ معاف کرنا ان کا معاوضہ ادا نہ کر سکا۔ فاطمہ ۴۵ برس کا ساتھ چھوٹ رہا ہے کیا کروں صحت میرے اختیار میں نہیں مگر میرے بچے تمہارے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے"

آنے والے وقت کا دھڑکا

۳۰ جنوری کو دو حکیم آئے اور دو ڈاکٹر۔ اور ڈاکٹر ظفریاب نے صاف کہدیا "حالت خطرناک ہے"۔

دو گھنٹے بعد بیٹے اپنے چھوٹے بہنوئی واجدہ بیگم کے شوہر سردار محمد خاں سے کہا "پیارے بھائی آثار اچھے نظر نہیں آرہے ۔ ۔ ۔ ۔ کلیجے پر سِل رکھو اور جدید قبرستان میں جا کر باپ کے کس طرح کہوں ان کے مکان کا انتظام کرو۔ جگہ اُونچی اور تین قبروں کی ہو"۔

سردار میاں کی آنکھ سے آنسو جاری تھے کہنے لگے "بھائی میاں آپ نے میرے سپرد بہت مشکل کام کیا ہے"۔

بڑے مکان میں آیا آپا نے کہا "وہاں کیا کر رہے تھے چلو ابا کے پاس چل کر بیٹھیں"۔ بیٹے اُن سے کہا "کس منہ سے ان کے سامنے جاؤں۔ انجکشنوں سے ان کا سارا جسم چھید ڈالا۔ انہیں غلط فہمی میں مبتلا رکھا اور جھوٹی تسلی دیتا رہا کہ اچھے ہو جائیں گے۔ یہ اچھے ہونے کے آثار ہیں؟"

ڈاکٹر ظفریاب سے دوپہر کو فرمایا "اچھا ہو جاؤں تو سب سے پہلے نصاب شائع کر دوں"۔ پھر فرمایا "میری بیماری میں میرے بچوں نے پوشہ ٹھیک دیا۔ مگر اتنا نہیں سمجھے کہ بُوا خوری کی مجھے کتنی ضرورت ہے آپ ہی کار کا انتظام کر دیجئے"۔

شام کو ان کے چچا زاد بھائی مولوی عبدالغفار صاحب خیری آئے تو حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ابھی تین روز قبل وہ آئے تھے تو سرسید کے زمانے کے ایک کرکٹ میچ کا جو علی گڑھ اور پارسیوں کے درمیان ہوا تھا چالیس تینتالیس منٹ پورا حال سُناتے رہے۔ آج کمزوری نے بالکل نڈھال کر دیا تھا فرمایا "ایک کام کروگے بتن" انہوں نے وعدہ کیا ارشاد ہوا "یٰسین سُنا دو" ایک ہفتہ پہلے منجھلے ماموں جان مولوی سعیدالرحمٰن شاہ صاحب سے بھی یٰسین سُنی تھی۔ آج جب چچا بتن سے کہا تو انہوں نے بھی یٰسین سُنائی اور دُعا مانگی۔ سب کے آنسو جاری تھے فرمایا "خدا کے کلام میں بڑی برکت ہے"۔

صدقے کے ۵، ۶ بجے ہو چکے تھے۔ تیسرے چوتھے دن ایک بکرا صدقہ کیا جاتا تھا۔ کسی نے کہا اکھٹے سات بکرے ہونے چاہئیں۔ سات بکرے اکھٹے صدقہ کئے گئے۔ علامہ مغفور کو معلوم ہوا بلایا اور فرمایا "سات بکرے کئے ہیں تم نے" عرض کیا "جی ہاں" آنکھیں ضعف سے نہ کھلیں آہستہ آہستہ فرمایا "اللہ کے معاملہ میں دخل نہ دو"۔

دم گھٹ رہا تھا کے جمع میں دل کے پار ہونی تھی نحیف ہو چکی تھی۔ گو دانہ کا کام تو ختم ہو چکا تھا۔ دعا اور جو ہزاروں

رات کو بہت آہستہ آہستہ کہا "ارے بھئی نصاب جلد

"شائع کردو" دریافت کیا "داعدی صاحب کی لڑکی کا
... ہوگیا" پھر فرمایا "گاڑی منگاؤ ہوا خوری کو۔ میرا
... من گھبرا رہا ہے"
... دیر سے دو فرمایا "گاڑی کتنی دیر میں آئے گی۔
... مجھے جانے دو۔ جی گھبرا رہا ہے۔ مجھے اس کمرے
... لے جاؤ۔ یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ ارے بھئی جلدی کرو
... گاڑی آئی"

عکس ریز بھی ہوگیا

دو روز سے عکس ریز کرانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ عکس ریز بھی
... پڑی تھا۔ کپڑے اتارنے اور ہلنے جلنے سے بہت
تکلیف ہوئی جب ڈاکٹر چلے گئے اپنی رفیقۂ حیات سے
فرمایا "رازق میاں نے آخر عکس ریز بھی کرا ہی لیا۔ تم سمجھا ...
... ہیں۔ ٹھیکری کی طرح روپیہ اُٹھ رہا ہے۔ بڑی مشکل
سے روپیہ پیدا ہوتا ہے"

...ہن کا خیال

تیسرے پہر پھوپی اماں سامنے بیٹھی ہوئی تھیں مجھے بلا کر کہا "اس کا کوئی نہیں ہے۔
... سن رہے ہو بیٹا"

دوا پینے سے انکار

یکم فروری کو سوائے اولٹین اور شہد کے ہر قسم کی غذا بند ہو چکی تھی
طاقت کی دوا پینے سے بھی انکار فرمایا یہ کہہ کر کہ اس میں
شراب ہے اور موت اس سے بہتر ہے کہ شراب کا کوئی قطرہ
حلق میں پہنچے"

اپنی ایک نظم کے چند اشعار سُنے

خون کا دل کا بیٹھ چکا تھا مگر جس طرح
ساری عمر خدا کا شکر ادا کرتے گذری تھی مرض الموت میں بھی
شکر خدا زبان پر جاری تھا۔ آنکھیں بند تھیں کہ کھانسی زور
سے اُٹھی اور اس کے ساتھ بہت سا خون! فرمایا "پرنالے
نکل گئے" پھر فرمایا "شکر ہے مولا"
دس پندرہ منٹ بعد مجھے آواز دی اور فرمایا:-
"میری کوئی نظم سناؤ"
تین چار نظموں کے عنوانات سن کر خاموش ہو رہے اور
جب پوچھا "مظلوم حسینؑ روضۂ اقدس پر" تو فرمایا "ہاں"
تین چار شعر سن کر کہا "آخری دو شعر سناؤ" وہ سنائے
یہ تھے :-

بلا سے اس نے عرش و کرسی، ملائکہ آنکھوں سے مل رہے ہیں
یہ خون نہیں، نیکیوں کے چشمے، بدن سے تیرے اُبل رہے ہیں
تمہیں سے روشن ہے بزمِ احمدؐ رکھی محمدؐ کی لاج تم نے
مٹا کے دنیا میں اپنی ہستی، کیا خدائی میں راج تم نے

تھوڑی دیر بعد جان ہار بیٹھے اور جواں مرگ بہو نظر
آئے فرمایا۔
"خالق ... خاتون ۔ آؤ آؤ میرے بچو"

ڈاکٹروں کا آخری بورڈ

ڈاکٹر مختار احمد انصاری بمبئی گئے ہوئے تھے۔ آٹھ دن سے
ان کا انتظار تھا۔ رات کو وہ آئے اور یکم فروری کی صبح ڈاکٹر
ظفر یاب نے انہیں لا کر دکھایا۔ ان سے بھی کوئی بات نہ کر سکے
سوائے سلام علیک کا جواب دینے کے۔ ۲ فروری کو تین
ڈاکٹر آئے مگر بے سود! اب مریض کے منہ میں پانی بھی ڈالا
جاتا تو کلی کر دیتے تھے۔

بلی کی خوفناک آوازیں

تین دن سے برابر مکان کی چھت پر نہ معلوم کہاں سے
آ کر ایک بلی آدھی رات گذرنے کے بعد خوفناک آوازیں نکالتی
اور روتی تھی۔ پتھر پھینک کر ہم اُسے بھگانے کی کوشش کرتے
مگر وہ نہ جاتی۔ پرے ہٹ جاتی۔ اور پھر منڈی پر آ کر رونے
لگتی۔ ۲۰۳ فروری کی درمیانی شب ایک بجے وہ آخری

دھشت ناک اور ہی ڈراؤنی چیخیں اور دہشت ناک آوازیں نکالیں جیسے کی سسردی - کرے کا جاڑا - رات کے سناٹے اور بھیانک اندھیرے میں وہ سات آٹھ منٹ تک روتی رہی - اور سننے والوں کے دل دھڑ دھڑ کرتے رہے - سہمتے رہے -

سہاگ کی آخری رات

۲ فروری کی رات کو حالت نازک ہو گئی - دن بھر کھیل کا دانہ بھی اڑ کر منہ میں نہ گیا - آٹھ بجے شب ڈاکٹر آئے تو ان کے چہرے پر تفکرات کے آثار ہویدا تھے - انہوں نے کہا نقاہت خطرناک حد تک پہنچ گئی - اور نبض کمزور ہو رہی ہے - کسی نہ کسی طریقہ سے دوا اور برانڈی نہیں تھوڑی سی غذا ہی پیٹ میں پہنچ جائے مگر وہ ہٹا دیتے تھے - ڈاکٹروں نے کہا صرف انجکشن کے ذریعہ کچھ ہو سکتا ہے . . . اماں جان باہر آئیں ہم سب کو گلے لگایا اور پُرنم ہو کر فرمایا " آج میں دوا کی اجازت نہیں دیتی - اِس صبح فیصلہ کر سکوں گی - تمہارے ابا اب انجکشن کی تکلیف نہیں اُٹھا سکتے - بچوں اب دوا کی نہیں دُعا کی ضرورت ہے " ہم سب خاموش تھے اور بھائی میاں پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہو گئی تھی - اُنہوں نے اندر جانا چاہا - لیکن اماں جان نے منع کر کے فرمایا - خبردار کوئی بچہ اس طرح اندر نہ جائے - تمہارے باپ کو تکلیف ہو گی "

رات کے بڑے حصے میں اماں جان بآواز بلند قرآن شریف سُناتی رہیں - ایسی ضابطہ و صابر و شاکر عورت مشکل سے ہو گی کہ شوہر پڑا دم توڑے اور اس کی اشکبار آنکھیں اپنے رفیق حیات کے چہرے پر ہیں اور دل خدا سے لو لگائے ہوئے ہے - بیماری کو ڈہائی ماہ ہو گئے تھے لیکن اماں جان اباجان کے سرہانے سے دم بھر کو نہ سرکیں . . . اباجان کے ذاتی کاموں میں وہ کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھیں . . . سکرات کا عالم تھا کہ اماں جان برابر کے کمرے میں آئیں اور فرمایا تم میں سے جو ضبط کر سکتا ہے وہ اندر آجائے - دیکھو ایسا نہ ہو کسی کے رونے کی آواز ان کے کانوں تک پہنچے -

صادق الخیری — عصمت اپریل [illegible]

دَم واپسیں

پاؤں ہاتھ دیکھے جاتے - کبھی گرم کبھی سرد - نبض معلوم کی جاتی کبھی موجود کبھی غائب ! ڈہائی ماہ کے مریض نے کیسی کیسی سخت تکلیفیں اٹھائیں مگر خدا کا شکر زبان پر تھا - ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی لیکن اس رات تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک چیخ نکل جاتی - اور یہ چیخ ہوتی " اللہ " ڈیڑھ ڈیڑھ ماہ سے چت لیٹنے میں تکلیف ہوتی اُس وقت کراہتے ہوئے کبھی دوسری کروٹ لیتے کبھی چت لیٹنے کی کوشش کرتے - کانوں کی لَویں مُڑ چکی تھیں کنپٹیاں بیٹھ چکی تھیں - ڈاڑھی کے بال چھدرے پڑ گئے تھے کہ مؤذن کی صدائے برحق مسجد سے بلند ہوئی - جو ہاتھ تین روز سے کمزوری کے سبب کپکپا رہے تھے وہ خدا جانے کس طرح کانوں تک پہنچے اور دونوں ہاتھ باندھ " اللہ اکبر " کہہ نماز پڑھ لی - ساری رات کلام اللہ پڑھا گیا - دائیں طرف بہن تھیں اور بائیں طرف پلنگڑی پر بیوی - ہاتھ بار بار ڈاڑھی کی طرف جا رہا تھا - یہ نزع کا عالم تھا - آنکھیں پتھرا چکی اور دیوار پر جمی ہوئی تھیں اور میں تین چار گز کے فاصلہ پر کمرے کے کونے میں بیٹھا ہوا تھا کہ پتھرائی ہوئی آنکھوں نے عجیب تماشہ دکھا دیا - بائیں آنکھ کی پُتلی پھرتی ہوئی میری طرف آکر نصف منٹ کے لئے رُک گئی - اور پھر سامنے کی دیوار پر جم گئی - سب حیران رہ گئے کہ یہ کیا ماجرا تھا ! یہ آخری نگاہ بڑی معنی خیز تھی -

سانس اکھڑ چکا تھا - نبضیں جا چکی تھیں - مگر دماغ اب بھی صحیح تھا - پھوپی اماں نے اماں جان سے فرمایا - " تم اب چلی جاؤ " وہ پائنتی بیٹھی ہوئی تھیں کہ پتھرائی ہوئی آنکھ کی پُتلی آخری دفعہ پھری اور نگاہ وہی نصف منٹ تک اماں جان

...ی بلکہ [illegible] تھی اور ۷۰ سال کی پوری
...ی تھی۔
...خر جس وقت [illegible] تھا وہ آ کر رہا اور ۳ فروری ۱۹۳۶ء
...کا وہ [illegible] کی مسلمانوں میں آخری ہچکی
...سے [illegible] ایک منہ سے [illegible] کو [illegible] گئی!

...اور تکفین آج سے [illegible] کی بالکل [illegible] حیثیت
مصنف اور خواتین ہند کے محسن اعظم
...لت آناً فاناً بجلی کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ اور دیکھتے
دیکھتے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب سے پہلے پیدل
...ستے بھی آ رہے تھے اور امیروں کی سواریاں
...ینوں مکان کھچا کھچ بھر گئے مگر آنے والوں کا تانتا نہ ٹوٹا۔
چار روز قبل فرمایا تھا کہ "طارق میاں کے کھانے
...ے میں لے چلو وہاں نہاؤں گا۔" وہ الفاظ والدہ مرحومہ
...ن میں تھے۔ مجھ سے انھوں نے فرمایا "اپنے کھانے کے
...یہاں میز بھی ہے اپنے ابا کو لے جا کر غسل دو۔"
غسل دے کر تکفین کے بعد میت وسط صحن میں
...ئی اور والدہ مرحومہ اور پھوپھی اماں مرحومہ نے سب نے
...نے کی اجازت دی، تینوں مکانوں میں کہرام مچ رہا تھا
...س کے مکانوں کی چھتوں سے عورتوں اور بچوں کے
...نے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور سڑک آدمیوں سے پٹی
...ی تھی اور دور دور تک راستہ رک گیا تھا کہ بہن بیوی
بیٹیوں نے خدا کے سپرد کیا۔

...جنازہ اور تدفین لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے الفاظ
...ہو رہی تھی گو بجے اور جنازہ اٹھا تو رونے
...ے جتنے اپنے تھے ان سے زیادہ پرائے۔ اپنے بچیاں تڑپ
...رہے تو غیر بھی بلبلا رہے تھے گھر والے آٹھ آٹھ آنسو
رو رہے تھے تو سڑک والوں کی آنکھیں بھی نمناک تھیں!
دلی دروازے سے باہر نکل کر نماز جنازہ جناب
الحاج مولانا محمد عبدالغفار الخیری نے پڑھائی۔ تو ان کی آواز
میں رقت تھی!
جدید قبرستان میں جنازہ داخل ہوا تو خلقت
خونی دروازے تک تھی۔
منجھلے بھائی [illegible] الرحمٰن اور چچا زاد
بھائی محمد عبدالوہاب الخیری نے قبر میں اتارا اور [illegible]
بجے دوپہر کو علامہ راشد الخیری کا جسد خاکی سپرد
زمین کر دیا گیا!

مزار کوٹلہ فیروز شاہ (ویلنگٹن [illegible]) کے قریب
ریلوے پل سے ذرا پہلے۔ دائیں ہاتھ کو جدید
قبرستان کا صدر دروازہ ہے۔ اس دروازہ میں داخل
ہو کر ۲۵، ۳۰ قدم چل کر بائیں طرف اونچائی پر دوسری قطار
میں سنگ مرمر کی قبر ہے اور اس کی خوبصورت جالیاں
دور سے ہی نظر آتی ہیں۔ یہی علامہ مغفور کی دائمی آرام گاہ ہے۔
برابر ہی میں ان کی رفیقۂ حیات دائمی نیند سو رہی
ہیں جن کا انتقال ۲۰ مارچ ۳۳ء کو ہوا تھا۔
ادھر دلی چھوڑے ہوئے سولہ سال سے زیادہ
ہو گئے معلوم نہیں مزار کا کیا حال ہے۔ البتہ دلی سے
آنے والے بیان کرتے ہیں کہ مزار موجود ہے۔ مگر جنوری ۳۶ء
سے ۴ اگست ۴۷ء یعنی ہجرت سے پہلے تک جب نماز
فجر کی اذان فضا میں گونجتی تھی تو بہشتی مزار کو غسل دیتا
اور سورج کی پہلی کرن اس پر پڑتی تو اس سے قبل مالی پھول
چڑھاتا تھا اور پھر ایک حافظ کلام پاک کی تلاوت کرتا
تھا۔ اور صبح نہیں تو ظہر اور شام نہیں تو رات کو میں حاضر
ہوا کرتا تھا۔ دوسرے تیسرے مہینے والدہ مرحومہ دلی میں

بیٹھکر با صوم کسی نواسی کو ساتھ لے کر وہاں جاتیں اور کچھ دیر بیٹھکر قرآن مجید پڑھا کرتی تھیں۔ سوا کے اُس زمانہ کے جب میں دلّی سے باہر ہوتا۔ اور اس ایک ماہ کے جب درد گردہ کی وجہ سے میں پلنگ پر پڑا رہا۔ ساڑھے گیارہ برس میں ایک تاریخ بھی ایسی نہ گذری کہ میں مزار اقدس پر حاضر ہوا ہوں۔ بارش اور آندھی کے طوفان میری راہ میں حائل ہوئے نہ کالی سیاہ اندھیری بھیانک خوفناک راتیں روُکے جھکڑ نہ تیر کی طرح تیز یخ بستہ ہوائیں ؛۔

باب چودھواں[۱۴] ——— مصورِ غم کا ماتم

خراجِ عقیدت اور اعترافِ فن و خدمات

مضامین نثر

حیاتِ راشد کا آخری باب[۱]	رازق الخیری
شاہجہان آباد کا شریف انسان	قاری عباس حسین
مشرقی تہذیب کا پرستار	فائقہ اختر بانو سہروردی
عورتوں کا حقیقی درد مند	جمیلہ بیگم
آہ میرے بھائی	مولوی عبد الغفار الخیری
حامیٔ نسواں	کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد
ہماری ڈوبتی کشتی کا ناخدا	صغرا سبزواریہ
عورتوں کا سہارا	صغرا ہمایوں مرزا
ہمارے محسن	زہرہ بیگم فیضی
علامہ راشد الخیری مرحوم	ملّا واحدی
چراغِ ہدایت	جہاں بانو بیگم ایم اے
ہمارے محسنِ اعظم	امت الوحی
آفتابِ علم	محمودہ ناز صاحبہ
ادیبِ سحر طراز	شرافت بیگم
	(عصمت مارچ سنہ ۳۶ء)

آہ! ابّا جان	صادق الخیری
آہ! سچا حامی اُٹھ گیا	سردار محمدی بیگم
ہائے علامہ راشد الخیری	صوفیہ قیصر
آفتابِ ادب	قاضی عباس حسین
شعلۂ غم	اختر
ادیبِ اُردو کا محسن	بی ان آنسہ ابراہیم
علامہ محترم کی جادو بھری تحریر	محمود گل
نسوانی دُنیا کا مصوّر	بیگم مرزا جعفر حسین
ہمارے ابّا جان	رفعیہ نازلی
اظہارِ عقیدت	سیدہ خاتون
مولانا راشد الخیری مرحوم کی یادگاریں	مولوی محمد ظفر ایم اے ال ال بی
مصوّرِ غم کے مضامین	مرزا حسین علی بیگ
آہ علامہ راشد الخیری	منشی عبد الحمید اڈیٹر مولوی
مصوّرِ غم علامہ راشد الخیری	قاری محمد عباس حسین
	(بنات مارچ سنہ ۳۶ء)
ابّا جان کی یادگاریں	رازق الخیری
دلّی کے تمدن کی آخری یادگار	مرزا محمد سعید آئی ای ایس
ماہرین تعلیم کے لئے شمع ہدایت	ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

---

[۱] حیاتِ راشد کے نام سے بصورت کتاب ۳ بار شائع ہو چکا ہے۔

عنوان	مصنف
...ندی یاد میں	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

عصمت اپریل ۳۶ء

عنوان	مصنف
...شد الخیری نمبر	رازق الخیری
...باتیں	رازق الخیری
...کا بہت بڑا ادیب	آنریبل سر شیخ عبدالقادر سابق ایڈیٹر مخزن
...مصور غم	پروفیسر طاہر رضوی ایم اے
...میں چند کار نمایاں	ایس بی طاہرہ
...سے آپا جان	آمنہ نازلی

عصمت مئی ۳۶ء

عنوان	مصنف
...و شگفتہ پھول	ماجدہ بیگم خیری

(عصمت جون)

عنوان	مصنف
...ر نسواں کا ہمدرد	خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی
...مصور غم	عبیدہ خاتون
...ل کا ماتم	سلام مچھلی شہری
...علامہ راشد الخیری کی قومی خدمات	سید وصی اشرف (بنات اپریل)
...مصور غم	مسعودہ بیگم
...ارہ نمبر	مسز الیف احمد
...مصور نسواں کی یادگار	سلطانہ بیگم مراد آباد
...بنات کے لئے روپیہ بھیجا جائے	رازق الخیری (بنات مئی)
...جلیل القدر ہستی کی رخصت	صوفیہ قیصر بھوپال (بنات جون)
چند باتیں	رازق الخیری
عصمت کے ۲۵ سال	رازق الخیری
...شفیق باپ — بے نظیر بیٹا	راشدہ بیگم خیری
...بھائی ابا اور بھائی صاحب کے تعلقات	حامدہ بیگم خیری
آہ بھائی علامہ	کپتان حبیب الرحمن سی آئی ای
...راشد	سر عبدالقادر

عنوان	مصنف
باغ اردو میں خزاں	مسز موشیلا دیوی ایم اے بی ٹی
پیغمبر ادب	شہر بانو
آہ محسن نسواں	بیگم مولانا محمد علی جوہر
ہندوستانی زبان کا جنازہ	مسز بروس
علامہ راشد الخیری کا درجہ ناول نگاری کے فن میں	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی
مشرقی تہذیب کے مجسمے پر آنسو	شائستہ سہروردی
مولانا راشد الخیری کا آٹوگراف	صغرا ہمایوں مرزا
مصور غم کے معتقد	گ ن کپور رتشلہ
مصور غم کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر عظیم کریوی
علامہ راشد الخیری کی ملاقاتیں	ڈاکٹر محمد احمد خاں ضمیر واتی
سیدہ کا لال علامہ راشد الخیری کی نظر میں	خطیب اعظم مولوی سید محمد یحییٰ
ہندوستانی عورتوں کا زبردست نقصان	مسز ناگ بی اے بی ٹی
آہ علامہ راشد الخیری	نواب میر مسعود علی خاں سی آئی ای
مصور غم کا پیام مسرت	مولوی عبدالحی عباسی
بیسویں صدی کا مصلح اعظم	مولوی احسان اللہ خاں بی اے
علامہ راشد الخیری کے سوشل افسانے	منشی پریم چند
جناب مولانا راشد الخیری مغفور	خان بہادر شیخ عبداللہ
دلی مرحوم	لطیف الدین احمد اکبر آبادی
مصور غم کی خوش طبعی	ملا محمد واحدی
دلی کی زبان ختم ہو گئی	ڈاکٹر مولوی عبدالحق
اردو ادب میں مصور غم کا رتبہ	جمیلہ بیگم کلکتہ
مصور غم کا غم	مولوی سید نواب علی ایم اے
روحانی تعلیم	سلطان ابراہیم
علامہ راشد الخیری کی شاعری	ڈاکٹر سید احمد بریلوی
علامہ راشد الخیری کی ٹریجڈی	کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد
ایسی موت پر ہزاروں زندگیاں قربان	مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

عنوان	مصنف
مولانا راشد الخیری کی اردو	پرنسپل مشتاق احمد زاہدی
مصور غم کی ظرافت نگاری	صادق الخیری
آمنہ کا لال	سلطانہ بیگم
امام ادب	پروفیسر طاہر رضوی
ہمارے رہنمائے اعظم	ا۔ یہ۔ شیخ ضیاء الدین
علامہ مغفور کے چند اوصاف	محمد لیاقت اللہ ایچ سی ایس
علامہ راشد الخیری کی ایک جھلک	خلیق صدیقی سہارنپوری
مولانا راشد الخیری	خواجہ حسن نظامی دہلوی
علامہ راشد الخیری کے لٹریچر میں	شاہد احمد دہلوی
شاعرانہ عنصر	اڈیٹر ساقی
مولانا کی تبلیغ	مولوی محمد ظفر ایم اے
مہاپرش راشد الخیری	کماری شکنتلا دیوی
مصور غم کی تصنیفات پر سرسری نظر	پروفیسر علی عباس حسینی
آہ مصور غم	خان بہادر حافظ ولایت اللہ
آمنہ کا لال	شمس العلما مولوی عبد الرحمٰن
حقوق نسواں پر علامہ مغفور کی تقریر	مریم یوسف علی بی اے
مصور غم کے سفر نامے	مولوی نصیر الدین ہاشمی
علامہ راشد الخیری مرحوم	مولانا شوکت علی ایم ال اے
حضرت راشد	سید آصف علی بیرسٹر ایٹ لا
علامہ راشد الخیری مرحوم	خان بہادر ڈاکٹر نجم الدین جعفری بیرسٹر
شہنشاہِ اقلیمِ الم	جہاں بانو بیگم نقوی ایم اے
استری جاتی کا رکھشک	شریمتی چندرا دیوی
مصور غم کے تاریخی ناول	سید محمود مورخ بی اے
تصانیف مصور غم کی تاریخ	رازق الخیری

(عصمت راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء)

عنوان	مصنف
مصور غم کی نئی کتابیں	رازق الخیری
ہماری باتیں	صادق الخیری

عنوان	مصنف
بنات	صادق الخیری
مولانا راشد الخیری مرحوم	ضیاء الدین احمد برنی بی اے
مصور غم	رازق الخیری
مصور غم کی تحریر کا جادو	انیس فاطمہ بھوتی
آخری تصنیف	ا۔ م
ادبِ اردو کا زریں تاج	فہمیدہ از لاہور
علامہ مغفور کی قومی خدمات	جمیلہ بیگم کلکتہ
حالتِ نسواں کا ترجمان حقیقی	گ ن۔ کپور تھلہ
شام زندگی پر ایک نظر	ر۔ ف۔ کھراؤں
عورتوں کا محسن اعظم	بیگم ڈاکٹر غلام رسول
شہنشاہ قلم	صالحہ خاتون قادری
صدایۂ دل	ایس۔ آر۔ کرانیہ
رہبر قوم کی یاد میں	ایم احمد
مصلح نسواں	محمد بشیر آزاد
حضرت علامہ راشد الخیری خلد آشیاں	غدیرہ فاطمہ
حقیقت شناس بزرگ	مولانا محمد اسلم جیراجپوری
آہ علامہ راشد الخیری	ح۔ خاتون
مصور غم شاعر کی حیثیت سے	ڈاکٹر ادیب خیالی
علامہ راشد الخیری کا آٹوگراف	محمد احمد بی اے اسپیشل مجسٹریٹ
مولانا راشد الخیری علیہ الرحمۃ	محمد احمد سبزواری
علامہ راشد الخیری	ادیس احمد ادیب ایم اے
مولانا کی یادگار	بنت سراج الدین
سیدہ کے لال پر ایک نظر	فاطمہ جعفر منشی فاضل
نذرِ عقیدت	
مصور غم کا اخلاق	بنت کیپٹن امان احمد
مصور غم کی سیاسی رہنمائی	قاسم علی شاستری

(بنات راشد الخیری نمبر)

عنوان	مصنف
حیف بزرگ مصورِ غم	جلال الدین حیدر دہلوی
(رسالہ ساقی راشد الخیری نمبر)	
نوحہ خوانی مصورِ غم کی	پرجبیں جہاں جادرہ
اشک ہائے غم	خورشید اقبال حیا میرٹھی
نکلیے قلبِ حزیں مضطرب بہ برسات	رابعہ پنہاں
دنیائے نسواں کا محسنِ اعظم	خلیق برانپوری
آنسو	گوہر اقبال حور
فسانۂ غم	سید محمود حسن کتیل
آہ علامہ راشد الخیری	کوکب شادانی
(جوہرِ نسواں راشد الخیری نمبر)	

ج ۔ گھر گھر کہرام

عنوان	مصنف
مصورِ غم کا کوہِ الم	نذر سجاد حیدر
رانڈوں کا حامی	جمیلہ بیگم
عورتوں کی دنیا بگڑ گئی	حمیدہ نذیر
ملک کا ناقابلِ تلافی نقصان	مولوی محمد ظفر ایم اے
دورِ حاضر کا شریف ترین انسان	ضیا الدین احمد برنی بی اے
پتھروں کو موم کرنے والا انسان	مولانا عبد الماجد دریابادی
اُردو ادب کا صدمۂ عظیم	ڈاکٹر سر محمد اقبال
نسوانی حقوق کا حامی	منشی پریم چند بی اے
شہنشاہِ ادب کی دائمی جُدائی	بشیرہ ضیاء الدین احمد
دلّی کا آفتاب	مسز ذکا احمد علیگ
عورتوں کا رُوحانی باپ	قمبر بانو
بےکس فرقہ کا حقیقی حامی	پروفیسر خورشید آرا بیگم
ادبِ اُردو کا آخری چراغ	اہلیہ ناصر علی وحیدی
خواتین کی دولت بے بہا	سعیدہ ضمیر الدین
اُردو ادب کی موت	امام اکبرآبادی

عنوان	مصنف
بلند پایہ سحر نگار ادیب	س۔ع۔ علی بیگم
ہمارا شفیق باپ	مریم یوسف علی بی اے
چمنِ اُردو کی بہار لُٹ گئی	معصومہ
ہمارے سچے خیرخواہ اور مصلح	بیگم سید محمد کاظم
دلّی کی بدنصیبی	شیخ محمد تقی
ہمارا گوہرِ نایاب	احمدی بیگم
مظلوم عورتوں کا سچا ہمدرد	علیمہ خاتون
طبقۂ اناث کی یتیمی	اہلیہ شیخ عطا محمد
آہ! طوطیِ ہند	کنیز محمد بیگم منشی فاضل
پیغمبرِ نسواں	ممتاز رفیع بیگم
خدمتِ نسواں کا سب سے بڑا علمبردار	پروفیسر حامد حسن قادری
ہمارا سب سے بڑا محسن	ایس۔ بی طاہرہ
زندہ جاوید مصنف	بلقیس صمد بیگم
اُردو کا زبردست محسن	ادریس احمد ایم اے
خواتینِ ہند کی بدنصیبی	بیگم ڈاکٹر غلام رسول
ہمارا رہنما	صالحہ بیگم شروانیہ
حقوقِ نسواں کا حامی	حفیظ جمال
بے یار و مددگار طبقہ کا ہمدرد	والدہ رفیق النساء بیگم
ہمارے غمخوار کی رحلت	مسز ملک غلام محمد
عورتوں کا سہارا	علی احمد خاں
آہ ہمدردِ نسواں	د۔ا
مادرِ گیتی کوئی راشد سا	بنت محمد سعید
طبقۂ نسواں کا مخلص سرپرست	اہلیہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن
حقوقِ نسواں کا علمبردار	شفیعہ رحمان
فرقۂ نسواں کا وکیل	بنت محمد اسماعیل
نہ بھولنے والا محسن	فہمیدہ بیگم
دلّی اُجڑ گئی	سید اکرم علی

عورتوں کی تعلیم و ترقی کا بت — بڑا حامی — مستقیمۃ الرحمٰن الہ آباد
نسوانی دنیا کے لئے صدمۂ جانکاہ — سرور رعنا بی اے
دل ہلا دینے والی خبر — ایس کے لاہور
ناقابلِ تلافی نقصان — محمد شریف
وہ ذات جو قابلِ صد فخر و افتخار تھی — ادیب عثمانی
مظلوموں لاوارثوں کا غمگسار — سید عبدالقادر
دل ہلا دینے والی خبر — مرزا ادیب اڈیٹر ادب لطیف
طبقۂ نسواں کا سب سے بڑا محسن — نفیسہ خاتون
عورتوں کا محسن اعظم — مسز محمد اسحاق حیدر آباد دکن
(بنات فروری ۱۹۳۶ء)
طبقۂ نسواں کو نقصانِ عظیم — نصیر فاطمہ
حامئ نسواں کی رحلت — بنت مولوی آفتاب احمد
عورتوں کا محسن — الماس
ہمارا مہربان رہنما — ہمشیرہ ضیاء الدین ایم اے
ہمارا خیر خواہ — سیدہ
ناقابلِ فراموش خدمات — ہمشیرہ میاں ضیاء الدین بیرسٹر
بے بدل ہستی — غدیر فاطمہ
مسلمانوں کا سچا خیر خواہ — اہلیہ وصی حسن
سایۂ رحمت — سرور خاتون
قابلِ فخر ہستی — زرینہ خاتون
عظیم المرتبت مصلح — بیگم مظاہر حسین
ہماری مایہ ناز ہستی — کشور یونس لکھنؤ
مصورِ غم کا غمگین تصور — دختر جلال الدین
ہمدرد اعظم — شوکت جہاں
لاثانی ہستی — آئی ایچ صدیقی
قوم اور ملک کو نقصان — وزیر بیگم لاہور

ادیب و ہمدرد — اختر فاطمہ
عورتوں کا ناخدا — ب-ن مدراس
خواتین کا بہی خواہ — صالحہ عبدالعزیز
قوم کو صدمۂ عظیم — والدہ محمد اکرم
شریف ترین انسان — امین الرب حیدر آباد دکن
ہمارا خیر خواہ — ایس - کے
شمع علم — سیدہ خورشید ناگپور
بے نظیر ہستی — فرخندہ اختر
موت العالِم موت العالَم — ا۔ ب جعفری
اردو کا آخری ادیب — غلام رسول
حادثۂ عظیم — بیگم مہتاب علی تحصیلدار
عورتوں کا حامی — فرحت زمانی
عورتوں کا سرپرست — شمس النساء
عورتوں کا سچا ہمدرد — حوا بائی
ہمارا ہمدرد محسن — زبیدہ ایس بی
ہمارا ہمدرد لیڈر — رفیعہ خانم
قوم کا ماتم — حسن آرا بیگم
ہماری حالت پہ رونے والا — بنت ڈاکٹر خلیل الرحمٰن
آہ محسنِ نسواں — مسز ایم فاروقی
قدردان انشا پرداز — بیگم خان عبدالرشید
ہمارا چراغ گُل ہوگیا — ہمشیرہ محمد عبدالغنی
ناخدا جاتا رہا — نثار فاطمہ
نعمتِ عظمیٰ چھن گئی — نزہت آرا بیگم
ہمارے حقیقی ہمدرد — آمنہ سلطان
دہلی کا چراغ — بنت ظہیر عالم
ناقابلِ فراموش انسان — شہر بانو
سب سے بڑے مونس — عبدالکریم بیگ

مسلمانانِ ہند کا نقصانِ عظیم	بشیرہ محمد احمد
[illegible] عادل محسن	مسز خاں بمبئی
طبقۂ نسواں کا زبردست حامی	محمد بلقیس
… سچا رفیق	پروفیسر علی عباس حسینی
[illegible]	صفیہ غلام
… حقوق کا حامی	مسز بے خان
… محسن کی جدائی	بنت محمد ابراہیم پرنسپل
… ہند کا ماتم	بلقیس احمد الدین
… تنہا	بیگم خان بہادر میر علی
… ادیب	عبدالحفیظ بی۔اے
… سے زیادہ چاہنے والا محسن	مسز شیخ محی الدین
… نسواں کا محافظ	مسز سید عزیز الرحمٰن
… کے مسلمانوں کا نوحہ	اہلیہ حسین علی خاں
ہندوستانی عورتوں کو بلندی پر پہنچانے والا	بنت محمد عبدالصادق
حامیٔ نسواں	بنت راجہ غلام مہدی
ہندوستان کا نقصان	شیخ محمد الرحمٰن
نسائیت کی موت	بیگم عظمت الٰہی
ہمارا سرپرست	علیا ظفر لاہور
ہر شخص کا ممدوح	مسعود فاطمہ بیگم
بہترین انسان	طیبہ فیروز
اُردو کا چراغ گل ہوگیا	بیگم محمود علی خاں
ادب کا نقصانِ عظیم	مرزا عبدالرحمٰن ایم اے
ہماری اُمیدیں پامال ہوگئیں	آنسہ جمال
بےکس بچیوں کا سہارا	بنت میجر ملک عبدالرحمٰن
طبقۂ نسواں کا رفیق	جمیلہ خاتون
ادب کا درخشندہ ستارہ	کشفی شاہ نظامی رنگون

عزیز ترین عزیز کی جدائی	خواجہ حبیب
معصوم عورتوں کا ترجمان	شائستہ سہروردیہ بی اے
سب سے بڑا ہمدرد	سارہ خاتون
نسوانِ ہند کا واحد حامی	خدیجہ بائی
اُردو کا رہبرِ اعظم	بنت پروفیسر حامد حسن
زندۂ جاوید	بلقیس جمال
دورِ حاضرہ کا سب سے بڑا مصنف	امتیاز فاطمہ
خوبیوں کا مجسمہ	نجیبہ بیگم

(بنات مارچ ۱۹۳۶ء)

ندرتِ تحریر عالیٔ خیال کی موت	حکیم عبدالمنتقم تبسم
انمول ہستی	بشیرہ پیارے سے پور
قیامت ٹوٹ گئی	محمد حامد صدیقی مولوی فاضل
بےکس صنف کا ملجا و ماویٰ	کشور سلطانہ دہرہ دون
بےکسوں کا سہارا	ح۔ا۔ابو رنگون
ہمارا سچا ہمدرد سچا رہبر	طاہرہ بیگم بریلوی
ہمارا فریادرس، درسِ علم	صالحہ خاتون بریلوی
یتیموں کا والی بیواؤں کا وارث	سلطان جہاں بیگم
طبقۂ نسواں کا رفیقِ اعظم	زبیدہ خاتون رانچی
بلند پایہ سحر نگار ادیب	عروج زیدی بدایونی
بلبل نغمہ گو۔ شریف النفس انسان	مس علی احمد مدراس
مظلوموں کا والی یتیموں کا حامی	مس اختر جبیں
طبقۂ نسواں کا ہمدرد محسن	اکرم خاتون نشتری
وہ جس کا نعم البدل نہ ملے گا	لطیفہ بیگم آگرہ
حقوقِ نسواں کے علمبردار	مسز حکیم ظہور حسن تابہ
اپنی طرز کے نرالے اہلِ قلم	شریمتی آر۔اے لاہور
محسنِ اعظم	مسز احمد اسلم جاپور
نعمتِ غیر مترقبہ سے محرومی	زاہدہ فاطمہ ہزاری باغ

(بنات اپریل ۱۹۳۶ء)

د- تعزیت کے تار

قوم کا نقصانِ عظیم — پروفیسر طاہر رضوی صفا سبزواری
غمِ بے حد — شائستہ اختر سہروردی کلکتہ
زبردست صدمہ — سردار محمدی بیگم آف ٹونسی
ملی رنج و ملال — انجمن خواتین ناگپور
بے وقت جدائی — زیب سلطانہ جے پور
عظیم ترین نقصان — حمید علی و امتیاز علی تاج لاہور
نقصانِ عظیم — محمد خالد کان پور
(عصمت مارچ ۳۶ء)

محسنِ اعظم کی جدائی — رفیقہ بیگم مدراس
بے بہا خدمات — شرافت بیگم سیونی
ادیبِ اعظم کی موت — احمد حسن بمبئی
(عصمت اپریل ۳۶ء)

س- تعزیت کے جلسے

خواتین دہلی کا ماتمی جلسہ — امت الوحی
خواتین ناگپور کا جلسہ — خورشید آرا بیگم
سرونٹس آف اسلام لیگ لاہور کا جلسہ — عبدالسلام خورشید
انجمن اشاعت علوم امرتسر کا جلسہ — محمد سعید شیدا
انڈین لائبریری مریدکے کا جلسہ — عبدالاحد
نصرت پردہ لیڈیز کلب بلی کا جلسہ — مسز رشید
نذیریہ گرلز اسکول دہلی کا جلسہ — سید محمد عبدالرؤف
مسلم خواتین ہنڈولہ کا جلسہ — مسز اظہر علی فتح علی
بزمِ سخن پشاور کا جلسہ — مرزا رضا حسین رضا
کرسچین کالج اندور کا جلسہ — محمد مبشر علی صدیقی

بہار شریف کا جلسہ — کنیز حمید میونسپلٹی کا
درگاہ صابر بخش دلی کا جلسہ — نامہ نگار
عصمت مارچ ۳۶ء

مسلم ویمنز کانفرنس لاہور کا جلسہ — بیگم عبدالغنی
ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن امرتسر کا جلسہ — خواجہ غلام مصطفیٰ
سیونی سی۔پی کا جلسہ — سرفراز بیگم
نگینہ کا جلسہ — بنت سید صفات سا
نرسنگھ پور سی پی کا جلسہ — سید محمد قاسم علی بشا
شیخو پور بدایوں کا جلسہ — عزیز مصطفیٰ خاں ترو گو
آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کلکتہ کا جلسہ — صغرا سبزواریہ
دلی میں المناک ماتم — ممتاز حسین بی اے بی
اورینٹل سوسائٹی دلی کا جلسہ، عربک کالج یونین کا جلسہ — مظہر الدین
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انجمن اردوئے معلیٰ کا جلسہ — محمد ابو اللیث صدیقی
(عصمت اپریل)

چیتاپور دکن کا جلسہ — حفیظہ خاتون
انجمن اصلاح خواتین میرٹھ کا جلسہ — بیگم احمد علی خاں
زنانہ پارک دہلی کا جلسہ — امت الوحی
(عصمت مئی ۳۶ء)

جاورہ میں فاتحہ خوانی — ممتاز رفیع بیگم
نیلور جنوبی ہند میں انجمن خواتین کا جلسہ — خیر النسا بیگم
(عصمت مئی)

غیر منقسم ہند کے پریس کا خراج عقیدت

...ض اخبارات نے مقالات خصوصی لکھے ۔ ...نے پورے پورے کالم میں خراج عقیدت پیش ...ض رسالوں میں دو دو تین تین صفحوں کے مضامین ...ئع ہوئے ۔ ان میں سے اکثر و بیشتر عصمت ، بنات ...سوال و دری تاجون میں نقل کئے جاچکے ہیں ۔ صرف ...و چار سطریں ان مضامین سے یہاں نقل کی جاتی ہیں ۔

"...ردو کے سب سے بڑے ناول نگار اور عصمت کے مالک ...شد الخیری انتقال فرماگئے ۔ مرحوم نہ صرف ایک اعلیٰ ...ناول نگار تھے بلکہ سوسائٹی کی اصلاح بھی ۔ ان کا بہت بڑا ...آپ کا مشہور ناول [illegible] کے متعلق تسلیم کیا ...بہ کہ ہندوستانی زبانوں کی بہترین الف لیک تصنیف ...ہے ۔ زبان کی پاکیزگی اور بلند معیار تمثیل آپ کی ...صنعت کا جوہر ہے ۔ انہوں نے عورتوں میں تعمیر کی ...روح پھونک دی تھی ۔" (انگریزی روزنامہ نیشنل کال دلی ۔)

" اردو کے مشہور آفاق انشاپرداز اور پرانے اخبار نویس علامہ راشد الخیری ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے ...وہ اردو ادب کے مشہور شہسوار تھے ۔"

(انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز دلی)

" مشہور اردو ناول نگار اور اخبار نویس مولانا راشد الخیری اس دار فانی سے کوچ کر گئے ۔ آپ کے ...تم ناول نہایت بلند معیار نتیجہ خیز اور اخلاق آموز ہیں"

(انگریزی روزنامہ اسٹیٹسمین دلی)

" مولانا راشد الخیری اردو ادب انشاپردازی کے بادشاہ تھے ۔ ایک جدید طرز تحریر کے موجد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وضعداری کا یہ عالم تھا شروع سے جو مسلک اختیار کیا مرتے دم تک ترک نہ کیا ۔ نہایت خوش مذاق زندہ دل انسان تھے ۔ ان کا سانحہ ارتحال عام سانحہ قومی ہے ۔"

روزنامہ خادم

" علامہ راشد الخیری کے پرملال انتقال نے گھر گھر ماتم بپا کردیا ہے ۔ حقوق نسواں کی اہمیت مردوں کے دلوں میں بٹھانے میں جو کچھ علامہ مرحوم نے کیا اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ ان کی موت سے ملک ایک بے مثال ادیب اور سحر نگار افسانہ نویس سے محروم ہوگیا ۔"

ماہنامہ جدید عصمت دلی

" مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کی موت سے دنیائے [illegible] سخت نقصان پہنچا ہے ۔ آپ کی ہستی اردو دنیا کے ادب میں خاص وقعت رکھتی تھی ۔ ٹھیٹھ دلی دلی کی پاکیزہ زبان خصوصاً نسوانی روزمرہ لکھنے اور ہماری معاشرت کا صحیح ترین چربہ اتارنے میں مولانا کو جو کمال حاصل تھا اس کی مثال ہندوستان بھر میں موجود نہیں ۔ سنگدل سے سنگدل پڑھنے والے کو بے اختیار اشکبار کردینے کا جو سلیقہ قدرت نے اس شیوا بیان اور بے مثال انشاپرداز کو ودیعت کیا تھا اس کی مثال اردو زبان کی تاریخ میں مفقود ہے ۔"

روزنامہ انقلاب ۔ لاہور

" افسوس اردو زبان کے بہت مشہور ادیب اور تحریک نسواں کے بہت بڑے حامی مولانا راشد الخیری نے وفات پائی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنا ایک خاص اور بہت ہی موثر طرز تحریر رکھتے تھے اور المیہ لکھنے میں ان کے قلم کی قوت اپنی آپ ہی مثال تھی ۔" روزنامہ پیام حیدرآباد دکن ۔

" مولانا راشد الخیری صاحب بہت مشہور ادیب تھے ۔ میری ان کی چالیس سال سے دوستی تھی جو آج موت

سے ختم کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی تصانیف نہایت صاف اور عام فہم اُردو زبان میں ہیں اور ہندوستان بھر میں مقبول ۔ ۔ ۔ ۔

خواجہ حسن نظامی کے روز نامچہ کی چند سطریں ۔ (منادی دہلی)

" کل انہیں اوراق پر مولانا راشد الخیری کی صحت و عافیت کی درخواست کی جا رہی تھی اور آج ان کے مرقد پر تعزیت کے پھول چڑھائے جا رہے ہیں ۔ مرحوم نے عورتوں کو اسلامی حقوق دلوانے کے لئے تمام زندگی گذار دی ۔ ان کا قلم ان کا دماغ ان کی جدو جہد ہر شئے اس مقصد جلیل کے لئے وقف تھی ۔ ۔ ۔ ۔ افسوس اسلام اور مسلمانوں کا درد مند اور رفیق ادیب آج دُنیا سے اُٹھ گیا " مدینہ بجنور

" مولانا مرحوم اُردو زبان کے بہت بڑے محسن ایک خاص طرز تحریر کے مالک تھے ۔ زبان کے اعتبار سے مولانا کی تحریروں کا پایہ نہایت بلند ہے ۔ آپ شمالی ہند کے سب سے بڑے ادیب تھے ۔ ہندوستان ایک ایسے ادیب سے محروم ہو گیا جو آپ ہی اپنی نظیر تھا "

ہفتہ وار دین دُنیا دہلی

" آپ کی تمام عمر حقوق نسواں کی تبلیغ اور حفاظت میں گذری آپ کی ۷۰ کتابیں تھیں کی تمام خواتین کی اصلاح معاشرت کے متعلق ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے ملک کی خواتین کی نہایت ہی بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں ۔ آپ کی وفات کو شدت سے محسوس کیا جائے گا "

ہفتہ وار دور جدید لاہور

" مولانا راشد الخیری اُردو کے مشہور و معروف انشاپرداز اور ناول نگار تھے "

سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور

" مولانا راشد الخیری مرحوم کی ذات گرامی موجودہ دور میں اُردو ادب کے لئے بیش بہا سرمایہ تھی ۔ انہوں نے اُردو زبان کی صنف افسانہ نویسی میں ایک ایسی طرز جدید کا اضافہ کیا تھا جو اُن کے ساتھ ختم ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ افسانے کے رنگ میں جو اصلاحی تحریکات انہوں نے جاری کیں وہ رہتی دُنیا تک ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے "

(سہ روزہ الجمعیۃ دہلی)

" اُردو کے بہت بڑے ادیب اور طبقۂ نسواں کے بہترین ہمدرد اور غمگسار مولانا راشد الخیری کا انتقال بہت ہی افسوس ناک حادثہ ہے " (روزنامہ الفضل قادیان)

" طبقۂ نسواں کے محسن اعظم اور ہندوستان کے مشہور ادیب مولانا راشد الخیری صاحب کا انتقال پُر ملال اسلامی ہند کا ایک نہایت ہی المناک حادثہ ہے ۔ آپ حقوق نسواں کے زبردست حامی بہترین خطیب اور سحر طراز انشاپرداز تھے "

(ہفتہ وار تیغ)

" مصور غم علامہ راشد الخیری کے اُردو پر ۴۰ سالہ احسانات ایسے نہیں جنہیں کسی حال میں بھی فراموش کیا جا سکے ۔ ۔ ۔ آپ نے ۷۰ کتابیں تصنیف کیں جن کی مقبولیت اور شہرت نے غیر فانی زندگی حاصل کر لی ہے "

(ہفتہ وار عبرت کلکتہ)

" قوم آج نوحہ زن ہے کہ ملک کا وہ بے نظیر و بے مثل ادیب چل بسا جس کے پاکیزہ ادب نے زبان کو بہت بلند رتبہ بخشا ۔ مسلم عورت کے آنسوؤں کی جھڑی بندھی ہوئی ہے کہ اس کا وہ بزرگ موت نے چھین لیا جس کے دل کی دردمندیاں اس کی صورت میں تیرو نشتر بن کر بے حس دلوں کو زندہ کر گئیں ۔ ۔ ۔ ملک و ملت انہیں ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھے اور ان پر رحمت و سلام بھیجے گی " (مسلم جالندھر)

" افسوس قضا نے اُردو کا بہترین انشاپرداز ہم سے چھین لیا ۔ ۔ ۔ ۔ فرقہ نسواں میں آپ نے بیداری کی جو

روح ہوگئی ہے وہ ہمیشہ تک زندہ رہے گی۔"
(اخبار خاتون بمبئی)

"مولانا راشد الخیری صاحب کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں ... انہوں نے اُردو ادب کی فسانہ نویسی میں ایک جدید طرز کا اضافہ کیا تھا جو نہایت موثر اور دلچسپ ہے۔ اور جس کے ذریعے انہوں نے اصلاح تمدن و معاشرت کی بڑی قابل قدر قومی خدمت انجام دی ..... عورتوں کی تعلیم و اصلاح معاشرت کے لئے جو مساعی جمیلہ مولانا مرحوم نے ساری عمر کیں وہ ان کو قیامت تک زندہ رکھیں گی۔"
(اخبار رہنما مرادآباد)

"علامہ مرحوم عصر حاضر کے بہترین انشا پرداز اور ادیب تھے۔"
(اخبار اتحاد پٹنہ)

"مولانا راشد الخیری کی وفات سے اُردو ادب ایک بے مثل مصنف کی خدمات سے محروم ہوگیا ..... وہ خضر نسواں تھے۔"
(رسالہ شاہکار لاہور)

"مسلمان عورتوں کی حالت زندگی کی صحیح تصویر کشی کرنے والا ہماری معاشرتی خرابیوں اور طبقہ نسواں پر مروجہ مظالم کی جاں گداز داستان سنانے والا بے مثال و صاحب طرز کا افسوس انتقال ہوگیا۔ طبقہ نسواں اپنے محسن اعظم کی اس المناک جدائی پر برسوں ماتم کرے گا اور ادب اُردو سوگوار رہے گی۔"
(شاہ جہاں دہلی)

"مشہور انشا پرداز اور مصنف اور مظلوم طبقہ کے محسن مولانا راشد الخیری نے ۳ فروری کو انتقال کیا ... وہ عورتوں کے حقوق کے پُرزور حامی تھے۔ عصمت کو کامیابی سے چلا رہے تھے اور تربیت گاہ کے نام سے یتیم لاوارث بچیوں کی تعلیم و تربیت کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔"
(تہذیب نسواں۔ لاہور)

"علامہ مرحوم ہندوستان کے ایک زبردست کامیاب مصنف تھے آپ کی تصانیف یادگار زمانہ ہیں۔"
(صدائے نسواں دہلی)

"علامہ راشد الخیری کی وفات نسوانی طبقہ کے لئے ایک بہت بڑی اندوہناک موت ہے۔"
(مستورات کانپور)

"گذشتہ ہفتہ کا اہم ترین واقعہ نامور اور جادو نگار ادیب مولانا راشد الخیری کا انتقال ہے۔"
(اقبال)

"مصور غم کے انتقال پر شاید ہی کوئی دل ہو جو دھک سے نہ ہوگیا ہو اور شاید ہی کوئی آنکھ ہو جس سے دو آنسو نہ ٹپک پڑے ہوں۔ جیسا آجاتا ہے اس خیال سے کہ علامہ مرحوم اپنے مشن میں کامیاب ہوئے ... ہم آج جو ترقی خواتین میں دیکھتے ہیں اُن آنسوؤں کا نتیجہ ہے جو مرتے دم تک ختم نہ ہوئے ..... ان آنسوؤں کے پیچھے اُن کی متاع حیات لُٹ گئی ..... مگر ان کا نام رہتی دُنیا تک زندہ رہے گا۔"
(ساقی دہلی)

"طبقہ نسواں اپنے ایک بڑے معلم اور اپنے حقوق کے ایک بڑے محافظ سے اور ہندوستانی زبان ایک بڑے محسن کی خدمات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی ... وہ حقوق نسواں کے سب سے بڑے حامی ہونے کے ساتھ شریعت اسلامی کی حدود کا پاس نگاہ میں رکھتے تھے .... وہ ہندوستانی زبان کے مشہور ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔"
مولانا سید سلیمان ندوی (معارف اعظم گڑھ)

"مولانا کے اُردو ادب پر جس قدر احسانات ہیں وہ احاطۂ شمار میں نہیں آسکتے ..... ان کی تمام تصانیف اُردو کی مستند زبان کا معیاری نمونہ ہیں۔"
شاعر آگرہ

"حق یہ ہے علمِ نسواں میں جو ترقی آج نظر آرہی ہے اس کے اوّلیں داعی حضرت مولانا ہی تھے خلع بل اور قانون انفساخ نکاح کی ضرورت پر سب سے پہلے مصورِ غم ہی نے توجہ دلائی۔" —— (رسالہ پیشوا دہلی)

"تمام ہندوستان میں بزرگ ترین ہستی علامہ راشد الخیری کے انتقالِ پُر ملال کی خبر پہنچ چکی ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے ٹمٹماتے چراغ کی روشنی پر الفاظ سے آپ نے جو آنسو گرائے اور ادب کی جو خدمتِ عظیم انجام دی وہ بڑی ادبی اہمیت رکھتی ہے۔" —— (ہندی رسالہ چتر پٹ)

حضرت علامہ کی وفات یقیناً دنیائے ادب اور تمام ملک کے لئے ایک ناقابلِ تلافی صدمہ ہے آپ نے اُردو ادب کی جو خدمت کی ہے اسے دُنیا قیامت تک نہیں بھلا سکتی۔ اُنھوں نے اپنی اصلاحی تصانیف سے ہندوستانی خواتین کی ذہنیت میں انقلاب برپا کردیا۔ ان میں اصلاحی و تعلیمی بیداری کے آثار پیدا ہوچکے ہیں۔ ان کا یہی احسان اتنا عظیم ہے کہ دنیا بھلانا چاہے تو نہیں بھلا سکتی ہماری تجویز ہے دہلی میں راشد اکیڈمی کے عنوان سے ادارہ کھول دیا جائے —— (کنول۔ آگرہ)

"مولانا راشد الخیری صاحب کی ہستی فرقہ اناث کے لئے ایک بے بہا نعمت تھی۔ اُنھوں نے اپنی ساری زندگی صنفِ نازک کی خدمت میں گذار دی۔" (ہیلی امرتسر)

آپ ہی کی وہ ہستی تھی جو عورتوں کی تہذیب و تعلیم کی رہنمائی میں پیش پیش نظر آتی تھی۔ . . . . آپ کی ہستی مغتنمات میں سے تھی۔" (مصحف۔ عمر آباد۔ جنوبی ہند)

"علامہ راشد الخیری کی موت نے سب کو دلی صدمہ پہنچایا ہے۔ آپ کی ساری عمر مسلمان عورتوں کی اصلاح کی کوشش میں گذری۔" (پیام تعلیم دہلی)

"کل تک جو سب کو رُلا رہا تھا آج خود اس پر کون ایسا ہے جو نہ روئے گا۔ صبحِ زندگی، شامِ زندگی، شبِ زندگی وجود جب تک اُردو میں ہے کوئی ان کے مصنف کو کیسے بھول سکتا ہے۔ ان سطور کے راقم نے اپنے ابتدائی میں جن چند اہلِ قلم کے مضامین و تصانیف سے اُردو سیکھا ان میں ایک مرحوم بھی تھے۔ لوگوں نے اسے مصورِ غم کہہ کے پکارا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے غم کی مصوری کا ادا کرکے رکھ دیا ہے۔"

مولانا عبد الماجد دریابادی —— (صدق جدید لکھنؤ)

"نسوانی زندگی کا کون سا پہلو اُن کی نگاہ سے رہ گیا، کس ظلم پر نہیں روئے؟ کس حق تلفی پر نہیں گرجے؟ کس ضرورت پر صدا بلند نہیں کی؟ ان کی ایک ایک کتاب نے خاندانوں کے خاندانوں میں زندگیوں کے نقشے بدل دیے۔ جس نے پڑھا۔ رویا۔ سمجھا۔ راہ پر لگا اور زندگی کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جب تک اُردو ادب زندہ ہے زمانہ کا ہر دور میں مصورِ غم کی شخصیت کے بلند آستانہ پر جبینِ نیاز سجدہ ریز کرتی ہوگی . . . . مصورِ غم مرگئے مصورِ غم"

(رسالہ عروس خیال دہلی)

"مولانا راشد الخیری بہت مشہور ادیب اور آزادیِ نسواں کے علمبردار تھے . . . . لیکن سب سے زیادہ سانحہ پر ہمدردی ہمیں ہندوستانی عورت سے ہے جس کا ایک بڑا دردمند آج نہیں ہے۔" (تعلیم دہلی)

"مولانا راشد الخیری کا انتقال ایک ناقابلِ سانحہ ہے۔ مرحوم ہندوستان کی ادبی محفل کے صدر نشینوں میں سے تھے۔ ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوگئی وہ پُر ہونا محال ہے۔"

(مولانا ظفر علی خاں) —— (زمیندار۔ لاہور)

"مولانا راشد الخیری اس زمانے کے سب سے مقبول مصنفین میں تھے کوئی تعلیم یافتہ گھرانا ایسا مشکل سے ہوگا جو ان کی صبح زندگی اور شام زندگی یا دوسری تصانیف سے ناآشنا ہو . . . . خواتین میں علم و ادب کے چرچے بہت کچھ انھیں کے رہین منت تھے . . . . صرف قلم ہی سے خواتین کی خدمت نہیں کرتے تھے بلکہ تقریروں کے ذریعہ نیز ذاتی کوشش سے عورتوں کی ترقی اور اصلاح میں ساعی رہتے تھے۔" (الناظر لکھنو)

"مرد بھی ان کی تصانیف نہایت شوق سے پڑھتے تھے ان کی طرز تحریر نہایت ہی دردناک اور پُرسوز ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی صاحب ذوق ہو اور ان کی کتاب ختم کرنے سے پہلے ایک بار اپنا چشم پُرنم آہ نہ کر اٹھے" (نیرنگ خیال لاہور)

"ان کی وفات سے ایک خاص طرز انشا پردازی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور حقوق نسواں کا ایک زبردست حامی اٹھ گیا۔" (معیار)

علامہ مرحوم کا انتقال اُردو کی ادبی دنیا میں اس سال کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ مرحوم کی قومی اور اسلامی خدمات سے قطع نظر ان کا ادبی مرتبہ بھی مسلمہ طور پر اس قدر بلند ہے کہ اب ان کی مسند پر کوئی اور شخص بیٹھنے کے قابل نظر نہیں آتا . . . . . افسانہ نویسی میں جدت فن اور اثر آفرینی کے ساتھ قدرت زبان انتخاب الفاظ اور حسن نگارش کا جو انداز انہوں نے پیدا کیا وہ انہیں کا تھا اور انہیں کے ساتھ ختم ہوگیا . . . . . وہ اصلاح کے ماہر کامل تھے . . . عورتوں کا محسن اعظم چل بسا . . . . . راشد الخیری کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔" (ہمایوں لاہور)

"علامہ کی وفات ایک مشرقی تہذیب کے پرستار بزرگ، عورتوں کے حقیقی دردمند محسن قوم و ملت، اُردو زبان کے ایک بہت بڑے عالم و ادیب فسانہ نگار ایک جلیل القدر ادیب بے بدل زبان داں کی وفات ہے . . . . ." (شباب اُردو۔ لاہور)

اخبار حق لکھنو۔ عصر جدید کلکتہ۔ خلافت بمبئی اور متعدد اُردو انگریزی گجراتی بنگالی اخباروں نے بھی علامہ مغفور کی وفات پر ادارئیے لکھے تھے مگر وہ بہم دستیاب نہ ہوسکے۔

ص - تاریخ ہائے وفات

وفات کی تاریخیں عصمت، بنات، جوہر نسواں ساقی وغیرہ میں ۶۰، ۶۵ شائع ہوئی تھیں اُن میں سے چند یہ ہیں :-

علامہ راشد الخیری رحمتہ اللہ علیہ
۱۹۳۶ء — حامد حسن قادری

راشد الخیری کو جنت مل گئی
۱۹۳۶ء — دعا ڈبائیوی

اگر وہ اور بھی دو سال جی گئے ہوتے
تو ہوتی نام سے تاریخ راشد الخیری
۱۳۵۶
۱۳۵۴ھ
حامد حسن قادری

پیام مرگ ادب، مرگ راشد الخیری
۱ ۹ ۰ ۳ ۹ — احسن مارہروی

معمور غم راشد الخیری
۱۹۳۶ء — سید عبد القادر احمد

علامہ روزگار راشد الخیری
۱۹۳۶ء — شاہ واجد پھلواری

بالیقین داخل بہشت ہوا
۱۳۵۴ھ — مرزا عبد الرحمن بیگ ایم اے

گل ہوا دلی وہ ادب کا چراغ

آفتاب ادب غروب افسوس

محمد راضی مارہروی

مسند الخیری واصل جنت ہوئے

۱۹۳۶ء

سید ذاکر علی لوکی

مسند راشد پہ مغفور مرقد

۱۹۳۶ء

راشد سال تیرہ سو چھپن تھی ہجری

۱۹۳۶ء

حکیم اسمٰعیل ذبیح ٹانڈوی

راشد سبب جگر خراش

۱۹۳۶ء

رقیہ خاتون پوتی آفتاب لکھنوی

راشد الخیری کی شام زندگی کا سوگ ہو

۱۹۳۶ء

سرور قادری حاجی والوی

راشد الخیری ادب کی جان سے تھے

۱۹۳۶ء

حمید ردولوی

تو ہماری کہاں مصور غم

۱۹۳۶ء

سید راحت حسین فلسفی بہار

مقیم آج ہیں خیر سے وہ جناں میں

۱۳۵۴ھ

نواب فصاحت جنگ جلیل

اٹھائیسویں برسی کی تاریخ

آج پھر اس کا یوم وصال آگیا

ہے نواؤں کی دم ساز جس کی نوا

اس کی برسی کی تاریخ درکار تھی

یا خدا راشد الخیری آئی صدا

اس کی برسی کی ہے یہی تاریخ

انتقال مصور غم آہ

حفیظ ہوشیار پوری ۱۹۶۲ء

باب پندرھواں ۱۵ ————— متفرقات

حُلیہ قد لمبا۔ بدن کسرتی۔ ڈیل بھاری جسم دوہرا۔ پشت کا اوپر کا حصہ چلتے وقت جھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سینہ کشادہ چہرہ کتابی جس پر وجاہت رعب اور دلالت برستی تھی۔ رنگ جوانی میں صاف تھا۔ بڑھاپے میں گندمی لیکن چہرہ پر سرخی جھلکتی تھی۔ کلائی کی ہڈی چوڑی۔ ڈاڑھی بھرواں۔ اوسط درجہ کی مونچھیں جھکی ہوئی۔ عینک صرف لکھتے یا پڑھتے وقت دس بارہ سال سے لگانے لگے تھے۔ آگے کا ایک اوپر کا دانت بائیں طرف کا اور کئی ڈاڑھیں ٹوٹ گئی تھیں۔ سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی کے درمیان کلائی پر روپیہ کے برابر "مستن" تھا جو پہلے زمانہ کے لوگوں میں انتہائی خوش نصیبی سمجھا جاتا تھا جب لکھتے تھے تو اس "مستن" پر ہی قلم کا بالائی حصہ ہوتا تھا۔

فرش یا پلنگ پر بیٹھنے کا خاص انداز تھا۔ کبھی کبھی آلتی پالتی مارکر بھی بیٹھتے تھے۔ ورنہ بالعموم اس طرح بیٹھتے تھے کہ ایک ران پر دوسرے پاؤں کی پنڈلی ہوتی تھی۔ اور جاگنے کی حالت میں لیٹنے کا انداز یہ تھا ایک گھٹنے پر دوسری پنڈلی۔ البتہ کبھی مضمون سوچتے یا کسی خاص معاملہ پر آنکھیں بند کر کے غور فرماتے۔ یا حقہ پیتے تو کروٹ سے بھی لیٹتے تھے۔

چلتے وقت نظر نیچی رکھتے۔ ہاتھ میں لکڑی ہوتی لکڑی بھی رکھی۔ سر عموماً ننگا ہوتا۔ رحلت سے پندرہ پندرہ بیس بیس سال پہلے سے ٹوپی بہت کم پہنتے گرمیوں میں تو چلتی۔ ڈرتے کہا جوان بھی ننگے سر پھرتے۔ کو کہا تے جاتے ہیں کہ ان کے ہم عمر ہی نہیں ان سے چھوٹے کنٹوپ پہنتے اور انگیٹھیاں دہکا کر بیٹھتے مگر وہ ننگے سر باہر سڑک پر ٹہلا کرتے تھے۔

ارکانِ اسلام

علامہ مغفور ۸، ۱۰ سال کی عمر تک اپنی دادی اماں کے پاس سوتے تھے۔ وہ بیدار ہوکر انہیں جگاتیں اور میوے کی پڑیا کھانے کو دیتیں اور نماز فجر سے فارغ ہوکر تلاوت کلام مجید شروع کرنے سے پہلے انہیں نماز پڑھنے کے لئے ارشاد دیتی تھیں۔ شادی کا پیام گیا تو ۲۱، ۲۲ سال کی عمر تھی۔ اور ایک دن جب وہ مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے گھر جارہے تھے کہ ان کی بیوہ خوش دامن کے ایک رشتہ کے بھائی نے انہیں دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں علامہ مغفور ۲۲، ۲۳ سال کے تھے۔

اس زمانے کے متعلق مولوی محمد احسن صاحب وکیل مرحوم نے لکھا تھا (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۷) کہ مولانا صوم وصلوٰۃ اور تلاوت قرآن پاک کے سختی سے پابند تھے۔ روزانہ بعد نماز صبح صرف دو رکوع دو ڈھائی گھنٹے میں پڑھتے تھے مع ترجمہ و تفسیر ہر لفظ کے معنی و نکات پر غور فرماتے۔ شانِ نزول اور اس کے دیگر متعلقات پر توجہ فرماتے۔ اکثر اوقات پڑھنے کی حالت میں روتے تھے۔ اور وجدانی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی۔ بعد نماز عصر ایک سیپارہ روز پڑھتے تھے۔"

سنہ ۱۹۱۸ء میں ان کی عمر چالیس سال کے قریب تھی اور میں نے خود دیکھا ہے کہ اس زمانہ میں اور ان دنوں جب کہ بلا کے کا جاڑا اور چلے کی سردی پڑتی وہ علی الصبح اٹھ کر محلہ کی مسجد میں جایا کرتے تھے۔

دادی اماں کے انتقال کے بعد ملازمت چھوڑ چھاپہ خانہ کرنے، تصنیف کی مصروفیات بڑھ جانے اور جاری ہونے کے بعد جب سلسلہ وعظ بالکل ترک کردیا تو وقت کی نماز کی پابندی میں فرق آگیا تھا۔ [illegible] نے ایک دن عرض کیا کہ آپ بیس سال پہلے آغا جان چھتہ کی مسجد میں علی الصبح نماز پڑھنے جاتے تھے اور عشا نماز بھی وہیں پڑھتے تھے۔ پھر ایک دم مسجد میں جانا چھوڑ دیا۔ فرمایا یوسف بیگ کا رسیلم کا کارخانہ تھا اور نمازیوں میں سب سے سوز [illegible] تھے۔ جس نماز میں میں وعظ کہتا وہ میرے سر ہوجاتے کہ آپ نماز پڑھائیں۔ میں تو کبھی پڑھانے کو بھی تیار نہ ہوتا یہ کہ کبھی لگ گئی تھی کہ امامت ہی کروں۔ امامت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اور میں اپنے سر لینی پسند نہ کرتا تھا۔ کئی دفعہ دنیاوی خیالات کے دوران میں آتے۔ یوسف بیگ سے اور دوسرے نمازیوں سے کئی دفعہ کہا مجھے معاف کردو۔ وہ لوگ نہ مانے آخر مسجد میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ نہ صرف وہاں نماز پڑھنا بلکہ کہنا بھی۔ بڑھاپے میں جمعہ کی نماز درگاہ صابر بخش میں پڑھتے مگر محلہ کی مسجدوں میں جانے کی بجائے گھر پر ہی روزانہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ ٹوپی ادھر ادھر ہوتی تو ننگے سر ہی نماز پڑھتے۔ نماز مختصر ہوتی اور دعا بہت مختصر۔

سنہ [illegible] اور سنہ [illegible] کے زمانے میں بھی رمضان کے پورے روزے رکھتے تھے۔ دادی اماں کے سامنے سحری قبل چراغ روشن نہ ہو سکتا تھا۔ سحری کے لئے وہ پچھلے سب اٹھتے اور تازہ کھانا تیار ہوتا۔ سحری کے بعد قرآن مجید تلاوت کرتے پھر نماز پڑھتے اور تھوڑی دیر سوتے اور اٹھ کر دفتر جایا کرتے تھے۔

[illegible] جب روزے پُورے
نے کبھی روزہ [illegible] روزہ کھلوانے کا کھانا کھلاتے
اور سحری [illegible] تھے۔ گھر میں کسی بچے کا چھوٹا
[illegible] اگر روزہ نہ ہوتا تو یہ مجال نہ تھی کہ وہ حضرت
کے سامنے پہنچ سکے۔ کسی کا روزہ نہ ہوتا تو جب بھی رمضان المبارک
کا احترام کیا جاتا تھا۔ یہ [illegible] میں رکھنا نہیں بلکہ ماہ
مبارک کا احترام ہوتا تھا کہ روزہ نہ ہوتا اور گھر سے باہر چلے
[illegible] کرکے اور ترتیب سے قریب و عزیز کے
ہاں بھی کچھ صدقے بھیجتے تھے۔ ہمارے ہاں چار بجے شام
ہی سے افطار کی تیاری ہونے لگتی تھی اور پچاس ساٹھ
روزہ دار مساکین بیوائیں اور یتیم افطاری کھانا اور سحری
کھا جایا کرتے تھے۔ رمضان المبارک کو اللہ کا اس کے
رسول کا مہینہ ضبط و صبر کا مہینہ اللہ کی رحمت کا مہینہ اور
ماہ مبارک فرمایا کرتے تھے۔

علامہ مغفور نے کسی بنک میں حساب نہیں رکھا
ان کے پاس نقد اتنا روپیہ ہوتا ہی نہ تھا کہ بنک میں حساب
کھولتے۔ والدہ مغفور کے پاس بھی زیور کچھ بہت زیادہ نہ
تھا۔ تاہم زکوٰۃ جس قدر واجب ہو سکتی تھی اس سے بہت
زیادہ نقد اور کپڑے وغیرہ کی صورت میں مساکین کو خفیۃً
دے دیا کرتے تھے۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جس مال پر زکوٰۃ
دی جاتی ہے اس پر کبھی آنچ نہیں آتی۔

روضۂ رسولؐ پر حاضری کی حسرت دل ہی میں لے گئے
[illegible] سے [illegible] یعنی میری ہجرت تک ہر سال اللہ تعالیٰ نے ان کے
حج بدل کا انتظام کروا دیتا تھا۔ [illegible] میں جب رحلت کو
شاید ڈیڑھ ماہ ہوا تھا والدہ مرحومہ کے منجھلے بھائی کپتان
مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کے ذریعہ حج بدل کا انتظام
کیا تھا ذی الحجہ کی ۹، تاریخ کو حج ہوتا ہے اور ۱۰ تاریخ کو
بقر عید ۹-۱۰ کی درمیانی شب میں نے خواب دیکھا کہ بہت بڑے
مکان میں ایک وسیع تخت پر چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ اور
وہ سپید براق کپڑے پہنے شاداں و فرحاں بیٹھے ہیں رات
چاندنی ہے اور نور کی بارش ہو رہی ہے اور وہ مجھ سے
فرما رہے ہیں:۔

"لو بھئی میرا تو حج ہو گیا"

صبح بقر عید تھی میں والدہ مرحومہ کی خدمت میں حاضر ہوا
انہیں خواب سنایا تو وہ خوش ہو گئیں اور فرمایا "تمہارے
ابا کا حج بدل اللہ نے قبول کر لیا"

لکھتے کس طرح تھے

لکھنے کے لئے نہ صرف تنہائی کی
ضرورت ہے بلکہ سکونِ قلب کی،
خیالات یکسو ہونے کی، جوانی میں علامہ مغفور کے لئے بھی
ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ مگر بڑھاپے کا رنگ تو
کچھ عجیب ہی تھا۔ لکھتے لکھتے انہیں اپنے خیالات کے اظہار
کرنے پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ عمر عزیز کے
آخری پندرہ بیس سال اس طرح گزرے ہیں کہ لکھنے کے لئے
کوئی خاص جگہ مقرر تھی نہ کوئی میز کرسی مخصوص۔ کوئی وقت
معین تھا نہ تنہائی کی کوئی خاص ضرورت اور نہ خاموشی کی
شرط۔ سیاہی نب کاغذ کیسا ہی ہوتا ان کے لئے سب چیزیں
برابر تھیں۔ خود لکھتے یا لکھواتے تحریر کی خوبی میں کوئی فرق
نہ آتا تھا۔ خود ضرورت محسوس فرماتے تو مضمون ہوتا یا
کتاب جلد اور بہت جلد لکھ دیتے تھے اور جب ختم کر چکتے
تو نظر ثانی نہ فرماتے تھے۔ اگر خود جلد ضرورت محسوس نہ فرما
تو ہفتوں ٹہلاتے رہتے تھے۔ شروع کرنے سے پہلے پوچھ لے
فرماتے تھے کہ مضمون یا کتاب کتنے صفحوں کی ہوگی لکھنے کا
ڈھنگ یہ تھا کہ چند سطریں لکھیں پھر حقہ پینے لگے۔ پھر چند
سطروں کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ سڑک پر ٹہلنے چلے گئے۔

کوئی جان پہچان ملا دو چار باتیں کیں۔ واپس آئے چند سطریں
اور لکھیں پھر والدہ ماجدہ سے جن کا پلنگ ہمیشہ برابر بچھا
ہوتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ مضمون درد انگیز
ہوتا کہ پڑھنے والے کے آنسو نکل آتے۔ مگر وہ ہنستے اور ہنساتے
جاتے اور لکھتے جاتے تھے۔ ان کے بچھونے پر تین چار تکیے
سرہانے یا کروٹ کے لئے ہوتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں تہمد
باندھے، کھری چارپائی پر آلتی پالتی مار کر یا پاؤں لٹکائے
بیٹھے ہیں۔ عینک لگی ہوئی ہے۔ اور لکھ رہے ہیں۔ خیالات
کا سمندر زور شور سے لہریں لے رہا ہے۔ کہ کسی بچے نے کہا
"السلام علیکم ابا جان" اب انہوں نے گردن اٹھا کر بہت
بلند آواز سے جواب دیا "وعلیکم" اور پانچ سات منٹ تک
اس سے مذاق کرتے رہے۔ پھر لکھنا شروع کر دیا۔ تین چار
سطریں ہی اور لکھی ہیں کہ دروازے پر کسی کی آواز آئی حضرت
مولوی صاحب! لڑکے بھی بیٹھے ہیں، بچے بھی نوکر بھی ہیں مامائیں
بھی مگر خود اٹھ کر دروازے پر پہنچے۔ واپس آئے پھر لکھنا
شروع کیا کہ مدرسے کی کوئی بچی آگئی۔ اس سے دو چار باتیں
کیں یا کسی استانی کے زور سے خفا ہونے کی آواز سنی تو
اُدھر متوجہ ہوئے۔ پھر لکھنا شروع کر دیا۔ غرض اس طرح سے
صفحہ پورا ہوا تو اب ناممکن ہے کہ وہ آگے کچھ لکھیں۔ کس کا
باب یا پیرے گراف اور کہاں کا فقرہ یا جملہ پورا کرنا آخری سطر
کا آخری لفظ لکھتے ہی قلم اٹھا کر رکھ دیا۔ دن کا وقت۔ بھرا
پرا گھر۔ برابر میں مدرسہ، ادھر دفتر زور زور سے باتیں ہوتیں
یا بچے اور مامائیں غل مچاتیں مگر اُن کے خیالات منتشر نہ ہوتے
عصمت یا بنات کے لئے مجھے ایک آدھ دن ہی میں مضمون
کی ضرورت ہوتی اور ضرورت اشد۔ تو دریافت فرماتے
کتنے صفحے کا چاہیے اور جب میں عرض کرتا کہ اتنے صفحے
کا تو فرماتے "اچھا کار نکلواؤ آج ہی لکھ دوں گا۔" کبھی بلاؤ
دن ہوتا۔ گھٹائیں اٹھتیں۔ اور بچے جو اُن کی طبیعت سے
خوب واقف تھے آپس میں باتیں کرتے کہ آج ابا جان ہمیں
سیر کو لے جائیں گے۔ تو مجھے بلوا کر فرماتے تم بھی کیا یاد کرو گے
آج ہی میں ایک مضمون لکھ دیتا ہوں چلو دکھلانے کے لئے
تیار ہو جاؤ۔" دوسرے عزیزوں اور مدرسے کی بچیوں کو بھی
ساتھ لیتے۔ دریا کے کنارے کڑاہی چڑھتی پھلیاں تلتیں
پھل ترکاریاں کھائی جاتیں۔ بچے کھیلتے۔ بڑے باتیں کرتے اور
وہ کسی درخت کے نیچے مضمون نگاری بھی کرتے جاتے اور
سب کی سیر و تفریح میں بھی شرکت فرماتے۔

نقش پا از رازق الخیری ——— (ساقی راشد الخیری نمبر ۳۶ء)

اس سلسلہ میں علامہ مغفور کے رفیق خاص ملا واحدی
صاحب لکھتے ہیں:۔

" مولانا لکھنے کے دھنی تھے لیکن لکھتے اس شان
سے تھے کہ جم کر نہیں بیٹھتے تھے۔ پندرہ بیس منٹ لکھا اور
اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھر والوں سے ہنسے بولے۔ باہر لوگوں سے
باتیں کیں۔ میرے ہاں تشریف لے آئے۔ غرض پندرہ بیس
منٹ اِدھر اُدھر گزار کر دوبارہ قلم سنبھال لیا۔ ایسا آدمی کاروبار
نہیں کر سکتا۔ تاہم عصمت کو مولانا نے گھسیٹا۔ رسالہ عصمت
مولانا کا کاروبار نہ تھا۔ ایک لگن تھی جو مولانا سے خدمت کرا
رہی تھی۔ لگن نہ ہوتی تو اس زمانے میں عصمت کی قسم کا رسالہ
نکالنا ہنسی کھیل نہیں تھا" (عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر)

مطالعہ | علامہ مغفور" اوریجنل رائٹر تھے لکھنے کے لئے
انہیں مطالعہ کی ضرورت نہ تھی۔ لڑکپن اور جوانی
میں وہ صبح ۴ بجے سے ۶ بجے تک مطالعہ کیا کرتے تھے۔ کتابیں
ادب اور مذہب پر ہوتی تھیں۔ نماز فجر کے بعد قرآن مجید پڑھتے
تھے۔ پھر ترجمہ و تفسیر دیکھتے۔ آخری بیس سال میں امام غزالی
کی احیاء العلوم اور تفسیر اور تاریخ اسلام کی کتب کبھی کبھی دیکھا

کرتے تھے۔ روزانہ اخبارات کا مطالعہ فرماتے۔ ہمدرد، نیشنل کال
زمانہ پرچے تھے۔ ملک سے زمیندار۔ انقلاب۔ تنظیم۔ وکیل
ہمدم۔ ہمدم۔ آتے تھے۔ ایک لندن سے بھی آتے تھے۔
مستورات کے تبادلے میں درجنوں رسالے آیا کرتے تھے۔
ان میں معارف۔ اُردو۔ سچ اور پھر صدق۔ ریاست۔ مدینہ۔
اولیا۔ شاہکار۔ ہمایوں۔ شباب اُردو۔ نگار۔ ساقی۔
صبح امید۔ زمانہ۔ نقیب۔ نظام المشائخ۔ خطیب۔ اُستانی۔
الفضل۔ تہذیب نسواں۔ حور۔ عصر نو۔ الناظر۔ دین و دنیا۔
جامعہ ان کی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ان رسالوں
کا کوئی مضمون پڑھتے بھی تھے۔ روزانہ تقریباً ایک گھنٹہ اخبارات
و رسائل کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ عصمت میں تبصرے
کے لئے جو کتابیں آتیں ان میں سے بعض کتب پر بھی کبھی کبھی
سرسری نظر ڈالتے تھے۔

لکھنے کا سامان

علامہ مغفور کوئی ناول شروع کرنے تو پہلے ایک کاپی بنوا لیتے تھے۔ بالعموم یہ بادامی رنگ کا کاغذ ہوتا جو چھ سات پیسے دستہ آتا تھا ۱۸×۲۲/۴ سائز کی کاپی بنتی اور والدہ مرحومہ بیچ میں دھاگے سے سیتیں۔ دفتر فرزن سے تعلق ہونے سے قبل بالعموم ایسے ہی کاغذ پر مضامین لکھے گئے تھے۔ عصمت جاری ہوا تو مضامین لکھنے کے لئے سفید کاغذ کے بلاک بننے لگے۔ اور ان کی کاپیاں ۵۰ یا ۱۰۰ صفحوں کی جن کی چوڑائی ۴ انچ ہوتی اور لمبائی ۸ یا ۹ انچ کی۔ کتابیں بھی اس سائز کے کاغذ پر لکھی گئیں۔ بزم آخر جو ۱۹۱۸ء کی تصنیف ہے اور اب تک غیر مطبوعہ ہے ۱۸×۲۲/۴ سائز کے بادامی کاغذ پر دونوں طرف سے لکھی گئی تھی۔ رول دار لکیریں پڑے ہوئے کاغذ پر شاید کبھی کچھ نہیں لکھا۔ بعض مضامین پنسل سے بھی لکھے مگر کالی سیاہی اور واسطین نبڑے سے کوئی افسانہ یا ناول نہیں لکھا وہ ہولڈر سے لکھتے تھے جو ڈنک بھی کہلاتا تھا۔ نب یعنی پتی زیادہ باریک نہ ہوتی۔ بچا ڈنک جو لکڑی کا ہوتا تھا تین چار پیسے کا آتا تھا۔ معمولی ڈبائی تین پیسے کا اور اُن کے بڑھاپے میں ڈبائی تین آنے کا۔ دوات دو تین پیسے کی آتی تھی بڑھاپے میں شیشے کی اچھی دوات آٹھ دس آنے کی۔ بلو بلیک سیاہی سے لکھتے تھے۔ دو چار سوا روپیہ کی بوتل دفتر کے لئے آتی تھی اس میں سے سیاہی ان کی دوات میں روز ڈالی جاتی۔ گنگا پور سٹی میں قیام ہوتا تو ایک پیسے کا نیلا رنگ منگا کر سیاہی کا کام لیتے یا ایک پیسے کی سیاہی کی دو ٹکیاں منگا لیتے۔ ہولڈر میں نب جمنے تو دیا سلائی جلا کر اس کی لو میں ذرا گرم کرکے پھر سیاہی میں ڈبوتے تو خوشگوار آواز آتی فرماتے اس طرح حروف اچھے آتے ہیں اور پتی زیادہ چلتی ہے۔

فاؤنٹن پن سے بھی اُنہوں نے بڑھاپے میں لکھا ہے سیاہی ختم ہو جاتی تو کسی دوسرے سے بھروا لیتے تھے۔

صحت

علامہ مغفور کی صحت بہت اچھی تھی۔ لڑکپن میں انہیں کسرت کی بڑی تھی۔ کرکٹ۔ کبڈی کھیلتے اور تیرنے کے لئے نہر پر جاتے تھے۔ نماز کی پابندی سے بھی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی۔ ملازمت کے زمانے میں ڈیڑھ دو میل دفتر پیدل آتے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں صبح خاصی دور تک اپنی شریک حیات کے ساتھ ٹہلتے تھے۔ میں جب سن شعور کو پہنچا تو ان کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور اس عمر تک شاید دو تین دفعہ ہی موسمی بخار دو ایک روز کے لئے آیا ہوگا میرے ہوش میں دو تین دفعہ دو تین دن کے لئے موسمی بخار آیا۔ بخار میں وہ بہکتے اور سب کو ہنسانے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ گردہ کی تکلیف ہوئی تھی۔ رحلت سے سات آٹھ سال قبل البتہ دوران سر اور اختلاج قلب کی شکایت ہو گئی تھی۔ دل دماغ۔ جگر گردے آنتوں یا عام کمزوری کا کبھی

کسی قسم کی معجون، خمیرہ، کشتہ یا کوئی پیٹنٹ ولایتی دوا انہوں نے کبھی استعمال نہیں کی۔ کھانسی نزلہ کا معمولی اثر ہوتا ہی نہ تھا اور اگر کبھی ہوا تو گرو سنتے ہی نہ تھے۔ اور دوا ایک دن دوا پیتے بھی تو مجبوراً۔ ان طیریا کے دنوں میں کونین کی گولیاں خود بھی کھاتے بیوی بچوں کو بھی کھلاتے تھے۔ ۷۰، ۸۰ سال کی عمر میں ہاتھ میں رعشہ ہو گیا تھا ۱۹۶۵ء میں ایک دن فرمایا "اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت کا شکر یہ ادا کروں۔ برابر دو ارض میں سب سے اچھی صحت میری رہی۔ میرے ساتھیوں میں زیادہ تر جا چکے جو دو تین باقی ہیں وہ جی کیا رہے ہیں رینجید رہے ہیں میرے قویٰ اب کمزور ہو رہے ہیں خدا چلتے ہاتھ پاؤں اٹھالے کسی کا محتاج نہ کرے اور بیماری آئے تو بس ایک دفعہ" اور پھر وہ ڈیڑھ پونے دو سال بعد بس اکٹھے ایک ہی دفعہ بیمار پڑے۔ دنیا سے رخصت ہونے کے لئے۔

مواعظ اور تقاریر علامہ مغفور کے وعظ کا دوسرا دور جب گنگا پرسٹی میں شروع ہوا تو میں اٹھارہ انیس سال کا تھا۔ اس دوسرے دور میں دلی میں کوئی وعظ نہیں کہا۔ دورے پر جب جاتے تو تقریریں کرتے لیکچر دیتے مگر وعظ دو تین ہی دفعہ کہا۔ وعظ میں سب سے پہلے خطبہ پڑھتے۔ الحمدُ للہ و نحمدہٗ و نستعینہٗ ..... خطبہ کے بعد کوئی رکوع تلاوت فرماتے مثلاً سورۂ بقر کا تیسرا رکوع۔ اس سورۃ کا آخری رکوع للّٰہِ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض ... علی القوم الکٰفرین یا سورۂ یوسف کا پہلا رکوع۔ سورہ کہف کا آخری رکوع افحسب الذین ..... احدا یا سورۂ فتح کا آخری رکوع لقد صدق اللّٰہ ..... اجراً عظیما۔ علامہ مغفور قاری نہ تھے۔ مگر خوش الحان تھے۔ آواز میں درد تھا سوز تھا۔ کچھ اس انداز سے خطبہ اور رکوع پڑھتے کہ لفظ لفظ دل میں گڑتا تھا۔ رکوع کے بعد یا تو اس رکوع کے چند الفاظ مثلاً سورۂ بقر رکوع تیسرے کے الفاظ کیف تکفرون باللّٰہ یا آخری رکوع واللّٰہ علیٰ کل شیءٍ قدیر یا لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا۔ یا سورہ کہف کے آخری رکوع سے قل انما انا بشر مثلکم یا سورۂ فتح کے آخری رکوع سے محمد رسول اللّٰہ والذین معہٗ کی تفسیر بیان فرماتے یا پھر فلسفیانہ انداز میں آغاز تقریر ہوتا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک حالات ضروریات زمانے جو تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ خلفائے راشدین کے دو چار واقعات بھی بیان کرتے اور موقع موقع سے مثنوی مولانا روم اور جامی سعدی اور حالی کے اشعار بھی ترنم سے پڑھتے تھے۔ وعظ گھڑی دیکھ کر ایک گھنٹہ کہتے تھے۔ وعظ کہنے جاتے تو ہمیشہ وضو کر لیتے تھے۔ حقوق نسواں یا فرائض نسواں اور تعلیم نسواں پر جو تقریریں کیں یا لیکچر دئے ان کا انداز وعظ سے مختلف ہوتا تھا۔ لکھی ہوئی تقریر انہوں نے کبھی نہیں پڑھی۔ جو کچھ کہا زبانی کہا۔ مگر تقریر کرنے کا انہیں شوق نہیں تھا اور وہ کوشش کرتے تھے کہ انہیں تقریر نہ کرنی پڑے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ "ضروری نہیں کہ لکھنے والا بولنے والا بھی ہو۔ میں مقرر نہیں ہوں" تاہم انہوں نے غیر منقسم ہند کے ہر صوبہ میں تقریریں کیں۔ عورتوں کے حقوق پر تعلیم اور فرائض پر کبھی کبھی ہنسی کی باتیں یا لطیفے بھی بیان کرتے تھے ورنہ بالعموم اُن کی تقریریں شروع سے آخر تک سنجیدگی اور متانت پر مبنی ہوتی تھیں اور اکثر بہت ہی مؤثر بلکہ مدعا انگیز ان کے وعظوں ہی میں نہیں لیکچروں اور تقریروں میں بھی سامعین کو روتے ہوئے دیکھا ہے۔ رات کو کھانے کے بعد اُنہوں نے کبھی وعظ یا تقریر نہیں کی۔ وعظ یا تقریر کے بعد گھر آکر کھانا کھاتے تھے۔

...علامہ مغفور نے ہمیشہ بہت اچھا کھایا۔ ددھیال
... مولانا عبد الستار صاحب، علامہ مغفور کے
...ی اور ننھیال میں کپتان حبیب الرحمٰن صاحب
...کے منجھلے بھائی)، دو بزرگ، ایسے دیکھے کہ بہتر خوا[ن]
...یا ہی معمولی ہوتا خدا کا شکر ادا کرکے کھاتے۔
...ے جو مزہ کھانے پر بھی ان بزرگوں نے ناک بھوں
...ائی۔ اُن کے برخلاف علامہ مغفور اگر کھانا
...نہ ہوتا تو ناپسندیدگی بلکہ خفگی کا اظہار فرماتے۔ والد
...ریتھا وہ پھر والدہ مرحومہ اُسی وقت دوسرا کھانا
...اپنے بچپن کے واقعات علامہ مغفور جب سُناتے
...رمایا کہ ہماری اماں میرے لئے الگ کھچڑی بہت
...ل پکاتیں یا دسترخوان پر سب کے ساتھ بیٹھتا تو
...کھچڑی کی طشتری میں گھی کا گڑھا رکھ دیتی تھیں بیتا پڑ
...ہ۔ میرٹھ میں بسلسلہ ملازمت کئی سال رہے۔
...تے اُس زمانے میں میں دو انڈے روز کھاتا تھا۔ میرٹھ
...گئے۔ والدہ مرحومہ بہت کم گئیں لیکن میر عبد العزیز صاحب
...علامہ مغفور کے بہنوئی کو اُن سے اتنی محبت تھی کہ ساتھ
...تے۔ اور جہاں تبادلہ ہوتا اُن کے ساتھ جاتے تھے
...کھانے کا بھی شوق تھا اور اچھا پکانے کا بھی۔
علامہ مغفور کا من بھاتا کھاجا تھا۔ ہفتہ میں دو دفعہ
...تی۔ ہماری باولی کے گھر میں اکھاڑہ تھا۔ وہیں
...مغفور نے لڑکپن میں کثرت اور ورزش کی تھی فرمایا
...تے کہ ایک ایک سانس میں پان پان سو ڈنڈ پیلے اور
...پر ڈیڑھ سیر دودھ اس طرح پیا کہ ڈکار تک نہ لی۔"
...زمانے میں وہ دلّی کے آڈٹ آفس میں ملازم تھے ان کا
...کا ناشتہ تین پیسہ کا ہوتا تھا۔ باسی دودھ خوب
...ی ملائی پڑی ہوئی دو پیسہ کا کٹورا آتا تھا اور پاؤ سیر تو...

تھا۔ اس کے اوپر منہ سلونا کرنے کے لئے ایک پیسہ کی
بھولی ہوتی تھی۔ جب وہ دفتر جاتے تو کھانے کی پوٹلیا
جیب میں رکھ لیتے تھے۔ اس میں دو معمولی روغنی روٹیاں
بھنا ہوا سالن یا پالک قیمہ یا دو تلے ہوئے انڈے ہوتے
کبھی دفتر میں بیچ کے وقت مٹھڑیاں۔ سموسے۔ دال سویا
دہی بڑے۔ کابلی چنے کبھی کبھی کوئی چیز کھاتے شام کو گھر آتے
تو موسم کے لحاظ سے بُھٹے یا مٹر تلے ہوئے یا شکرقند
آلو کیلے امرود کے کچالو یا دو اُبلے ہوئے انڈے سلے یا
گرم گرم جلیبیاں۔ دہی کے بتاشے، کبھی کبھی دہی کی پکوڑیاں
بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے مگر سونٹھ کے بتاشے نہیں۔
اِس سونٹھ کا پانی کبھی کبھی پیتے تھے۔ والدہ مرحومہ اور ہم بچے
مرچیں کم کھاتے تھے۔ اور ہمارے لئے وحیدن ماما پکاتی تھی
۔ علامہ مغفور جوانی میں بہت مرچیں کھاتے تھے پاؤ بھر گوشت
کی ہنڈیا جس میں ۲۰-۲۱ مرچیں پڑتی تھیں اُن کے لئے والدہ خود
الگ پکاتی تھیں اور علامہ مغفور کھانا ہمارے ساتھ نہیں الگ
کھاتے تھے۔ ہمارے ہاں دوپہر کو روٹی پکتی تھی اور شام کو کچھ
گرمیوں میں دوپہر کو خشکہ جس کے ساتھ بالعموم مسور کی دال
ہوتی تھی دو چمچوں سے یا ایک کانٹے ایک چمچہ سے علامہ مغفور
کھایا کرتے تھے۔ اور باقی قسم کے چاول ہاتھ سے۔ بریانی یا
پلاؤ میں دہی ڈالنے کو انتہائی بدمذاقی اور گنوارپن سے تعبیر
کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس طرح پلاؤ یا بریانی کا اصل
مزہ جاتا رہتا ہے۔"

سیم کے بیج۔ گوبھی۔ سویا پالک۔ ہرا دھنیا اور
اروی کے سالن (جس میں خوب نیبو نچوڑتے تھے) زیادہ
پسند تھے۔ بیسنی روٹی چٹنی کے ساتھ کچّے آم کے اچار
یا شلغم کے اچار کے ساتھ شوق سے کھاتے تھے اور شلغم
کے اچار کا پانی چمچہ سے بھی پیتے تھے۔ ۱۹۳۲ء کی سردیوں میں

میں جمعہ کے جمعہ صبح چھ بجے مدرسہ جایا کرتا تھا تو چائے بنتی تھی ورنہ اُس زمانہ میں چائے کا رواج دلّی میں نہ تھا۔ چائے ان دنوں میں اس طرح بنتی تھی کہ پانی چولہے پر رکھا جاتا اور پتیلی میں چائے کی پتیاں ڈال دی جاتیں پھر کھانڈ اور دودھ ڈال کر خوب اونٹنے دیتے تھے۔ دس سال بعد جب چائے کا رواج بڑھ گیا تو ۱۹۲۰ء میں صرف صبح علامہ مغفور چائے پیتے تھے۔ اور ۱۹۲۹ء سے سہ پہر کو بھی۔

مکھن زیادہ پسند تھا۔ البتہ دیسی اور ولایتی پنیر اکثر منگاتے تھے۔ ہفتہ میں کم سے کم دو دفعہ شامی کباب مچھلی مرغی یا پرندوں کا گوشت ہوتا تھا۔ گائے کا گوشت علامہ نے کبھی نہیں پکا۔ البتہ جاڑوں میں نہاری اکثر صبح آتی تھی۔ اور کبھی کبھی شام کو گولے کے کباب اسیخ پر بھونے چڑھے اور ڈورے سے لپٹے ہوئے (جو بعد میں داغ کئے جاتے تھے۔ گائے کا نمکین گوشت (سالٹ بیف جسے ہنٹر بھی کہتے ہیں) چھری سے کاٹ کر کبھی یوں ہی کبھی تلوا کر ہاتھ یا کانٹے سے کھاتے تھے۔ مٹھاس سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ تاہم جاڑوں میں گاجر کا حلوا۔ گاہے گاہے انڈوں کا حلوا بنتا تھا۔ وہ خود گھنٹے والے سے حلوہ سوہن پپڑی کا گری کا اور حبشی حلوہ سوہن بھی کبھی کبھار لاتے تھے۔ کبھی قلاقند اور بنگالی مٹھائی کی ہنڈیا بھی۔ گزک بھی پسند تھی۔

اُن کے لڑکپن اور جوانی میں بہت سے پھل دلّی میں صرف چاندنی چوک میں ملتے تھے۔ سردا اور انگور مریضوں کو ڈاکٹر حکیم بتلاتے تھے۔ عمدہ قسم کے رنگترے اور سیب بہت مہنگے ملتے تھے۔ نارنگیاں۔ گنڈیریاں۔ سنگھاڑے کسیرو۔ لوکاٹ سبھی آتے رہتے تھے۔ تربوز انہیں پسند تھا ہاں فصل میں ایک دو دفعہ مراحی خرید لاتے یا منگاتے تھے۔ خربوزے اور آم بہت پسند تھے اور فصل کے زمانے میں روز ہی آتے تھے۔ قلمی آم لنگڑے تخمول پیسے پیسے تھی آم دو تین پیسے سیر۔ میوے میں اخروٹ و چلغوزے پسند تھے۔ اور جاڑوں میں اکثر ان کے اُوور کوٹ کی جیبیں ان سے بھری ہوتی تھیں۔ مونگ پھلیاں بھی بھائی نہیں۔ جوانی میں مرچیں زیادہ کھانے کی وجہ سے وہ کھانا الگ کرتے تھے۔ قلمی دار سینی اُن کے پلنگ پر ہی آجاتی تھی۔ اگر اتفاق سے پھلی ہوتی یا اس پر کوئی داغ دھبہ ہوتا تو ناخوشی کا اظہار فرماتے۔ کبھی صدر دالان میں قالین پر گاؤ تکیہ لگے بیٹھے ہوتے تو وہیں سینی آجاتی۔ تکیہ سے ٹیک لگا کر کبھی کھانا نہیں کھایا۔ کھانے کا کمرہ الگ نہ تھا اُس زمانہ میں میز کرسی کا گھروں میں رواج نہ تھا کھانے کی میز دفتر میں مہمانوں کے لئے تھی۔ گھر میں تخت پر کھانا کھایا جاتا۔ آخر وقت تک والدہ مرحومہ اُن کے لئے سالن کی ہنڈیا خود پکاتیں اور اُن کے اور بچوں کے لئے ماما پکایا کرتی تھی۔ کھانا گرم کھاتے تھے۔ دیگ کا سالن علامہ مغفور کو بہت بھاتا تھا اور مہینہ میں ایک دو بار پکتا تھا زیادہ دن گذر جاتے تو باورچی خیر صلاح پوچھنے آیا کرتا تھا دیگ کا سالن رات کو بچ جاتا تو ٹھنڈا گھی جما ہوا بھی شوق سے صبح کھاتے تھے۔ رات کی باسی خمیری روٹی گھی لگی ہوئی گرم گرم بھی کھاتے تھے مگر باسی چاول نہ خود کھاتے نہ بچوں کو کھانے دیتے تھے۔ دہی سے رغبت نہ تھی۔

آخری دس بارہ سال میں جاڑوں میں احباب کی ایک دعوت نہاری کی ہوتی تھی اور مہمان ۲۰-۲۵۔ رمضان المبارک میں پچاس ساٹھ روزہ داروں کو افطاری کھانا اور سحری تقسیم کی جاتی تھی۔ کھانے ہی کا نہیں کھلانے کا بھی انہیں بہت شوق تھا۔ کھلاتے تھے اور خوش ہوتے تھے کھانا ایک دو آدمیوں کا ہمیشہ زیادہ پکتا۔ دو تین مہمان آجاتے تو

ہوتی تھی۔ [illegible]
[illegible] تھا کہ بغیر کچھ کھائے جائے۔
...وں میں برف کا پانی پیتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں
...پیسہ سیر تھی [illegible] روز برف کا خرچ تھا۔
...نے کے بعد برتن کو روٹی یا انگلیوں سے پونچھ
...صوں میں کم شوقین جھاڑ دینے کے
تھے۔ ہمارے ہاں پیالوں میں نہیں سالن طشتریوں
جاتا تھا۔ کھانے کے دوران میں اگر کوئی بچہ زبان
...ار جب ... کی آواز آتی یا پانی پیتے ہیں غٹ غٹ
...ناراضگی کا اظہار فرماتے۔ کھانے کے بعد کسی
...کا پینے انگلیاں چاٹنے یا خلال کرنے کو تہذیبی
...رہتے تھے۔ کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے
...دھونے اور کلی کرتے تھے۔

علامہ مغفور کو خود کوئی چیز پکانے سے متعلق
...تھی۔ انہوں نے شاید ابتدا کبھی نہیں کیا۔ مجھے
...باورچی خانے میں نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود ان
...روں مصالحات۔ منازل اساڑہ اور صحیح
...میں باورچی خانہ اور کھانے پکانے کے متعلق نہایت
...ہدایات اور معلومات ہیں۔ والدہ مرحومہ بتاتی جاتیں
...لکھتے جاتے تھے۔

...سگرٹ پان

حقہ کب اور کس طرح شروع کیا کچھ
نہیں معلوم۔ جب شادی ہوئی تو حقہ
...تھے۔ بیٹیوں سے انہوں نے کبھی حقہ نہیں بھروایا۔
...نوکر مائیں موجود تھیں لیکن حقہ ہمیشہ والدہ مرحومہ
...تی اور ہر دفعہ تازہ کرتی تھیں۔ ۱۹۱۱ء کے زمانہ میں
...بار تین پیسہ کا پاؤ سیر شاید ۴، ۵ گولے آتے تھے
...یا کرتے تھے۔ تانبہ کی کلی ہوتی اور ریشم وغیرہ لپٹی

ہوتی تھی سفید [illegible] تانبہ یا پیتل کی منال۔ چلم توے کا
حقہ پیا۔ سلفا یعنی بغیر توے کا سخت ناپسند تھا۔ گھر پر
حقہ باہر سگرٹ۔ ۱۹۱۲ء-۱۹۱۳ء کے زمانہ میں بازار میں ۴
سگرٹ بکتے تھے۔ ۱۰۰ کے پیکٹ قینچی چھ پیسے کا۔ پیڈو
تین پیسے کا۔ لالٹین (ہڈلیمپ) ایک پیسے کے ۱۰ اور کیلی
شاہ ایک پیسے کے دس۔ علامہ مغفور پیڈو سگرٹ پیتے
...دو سگرٹ کا پیکٹ دو دن کرتے تھے۔ ۱۹۱۵-۱۶ء کے قریب
قینچی مارکہ شروع کر دیا تھا۔ پائپ یا بیڑی کبھی نہیں پی۔ ۱۹۲۰-۲۲ء
کے قریب تمباکو کا ڈبہ منگا کر خود بھی سگرٹ بناتے تھے مگر
بنانا نہ آتا تھا۔ ہم ان کے لئے دو سگرٹ بناتا تو چار اپنے
لئے بھی چپکے سے بنا لیتے۔ خود خرید کر نہیں کسی کا پیش کیا ہوا
سگار بھی انہوں نے پیا ہے۔ گھر پر علامہ مغفور حقہ ہی پیتے
تھے۔ نے انہیں خود چلم بھرتے یا حقہ تازہ کرتے نہیں دیکھا۔
پان عمدہ قسم کے کھاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کرے
ایک پان کے چار ہی ہوتے مگر پان دیسی زرد بہترین قسم کا ہوتا
پانوں کی ڈبیہ والدہ مرحومہ اپنے ہاتھ سے صبح بنا کر بھر دیتی
تھیں اور یہ شام تک چلتے تھے۔ پان میں زردہ شاید ۱۹۱۸ء
۱۹۱۹ء سے شروع کیا تھا اس کے بعد کبھی کبھی قوام بھی پان میں
کھاتے۔ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں راولپنڈی گئے تو اچھے پان نہ
ملتے تھے۔ صدر جا کر آٹھ آنے کے پان خریدے اور تانگہ کا
کرایہ ڈیڑھ روپیہ دیا۔
...نے انہیں خود پان بناتے یا چھالیہ کترتے کبھی نہیں دیکھا

لباس

کھائے من بھاتا اور پہنے جگ بھاتا۔ اس
کہاوت کے دوسرے حصے کے علامہ مغفور کم از کم
اس زمانہ میں جو مجھے یاد ہے کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ انہوں نے
کھانا اچھا کھایا۔ لباس بہت قیمتی نہیں پہنا۔ گرمیوں میں
ہمیشہ ململ کا کرتہ اور لٹھے کا پاجامہ ہوتا تھا۔ بڑھاپے میں

بیوی اور بچوں کے اصرار پر کبھی کبھی حضرت اللہ چکن کے کُرتے بھی پہنے ورنہ بالعموم ۸-۹ آنے گز سے زیادہ قیمت کا کپڑا پہنے کے لئے نہیں دیتے تھے۔ نیا پاجامہ سلنے کے بعد دھوبی جاتا اس کا کلف دُور ہو جاتا پھر پہنتے تھے۔ دسمبر جنوری کی جاڑے کی سردی میں رُوئی کی صدری (نیم آستین کی) کُرتہ یا قمیص کے نیچے پہنتے تھے۔ آخری دس بارہ سال میں بازار کے خریدے ہوئے سوئٹر بھی پہنے تھے۔ کُرتے میں جیب ہوتی تھی۔ گرم قمیص درزی کی سلی ہوئی بڑھاپے میں پہنی مگر ٹھنڈی قمیص درزی کی سلی ہوئی نہیں پہنی۔ سخت سردی پڑتی تو نیچے کے پاجامے پر پتلون پہنتے تھے۔ گرم پجامے فلالین وغیرہ کے آخری ۷-۸ سال میں پہنے تھے۔ اس سے پہلے نہیں۔ نکٹائی اُنھوں نے کبھی نہیں لگائی اس لئے کُھلے کالر کا کوٹ بھی نہیں پہنا۔ ہمیشہ اچکن پہنی جو بعد میں شیروانی کہلانے لگی۔ جوانی میں انگرکھا بھی پہنا۔ جوانی میں اچکن کے نیچے گلے میں مفلر ہوتا تھا تاکہ کالر خراب نہ ہو۔ ان کی جو تصویر دسمبر ۱۹۳۸ء کے خزن میں چھپی تھی اس میں بھی گلے میں مفلر ہے۔ اچکن کی اُوپر کی ایک جیب میں گھڑی ہوتی اور دوسری جیب میں گھڑی کی زنجیر کا دُوسرا سِرا۔ گھڑی کی زنجیر دونوں جیبوں کے درمیان اُوپر نظر آتی تھی۔ یہ گھڑی ۱۹۳۰ء تک تھی۔ کلائی پر گھڑی کبھی نہیں باندھی۔ دفتر میں بڑا گھنٹہ لگا رہتا تھا۔ آخری زمانے میں گرم اچکن کے اُوپر زیادہ سردی ہوتی تو گلوبند بھی ڈال لیتے ایک سرا سینے پر ہوتا اور دُوسرا پُشت پر۔ جوانی میں اُن کے پاس دو بہت قیمتی اُوورکوٹ تھے۔ زیادہ رات گئے کہیں آتے جاتے تو پتلون اور اچکن کے اُوپر پہنتے تھے۔ ان کے بہنوئی میر عبدالعزیز صاحب ساتھ ہوتے تو دُوسرا اُوورکوٹ اُن کو پہناتے۔ آخر زمانہ میں بھی اُن کا اُوورکوٹ بہت شاندار تھا۔ اچکن گھٹنوں سے کافی نیچی ہمیشہ پہنی آخر زمانہ کی شیروانی جیسے وہ اچکن ہی فرمایا کرتے تھے۔ ٹخنوں سے ۷-۸ انچ اُونچی ہوتی تھی۔

علامہ مغفور کے لڑکپن میں شرفا سوزنی کی گول ٹوپی پہنتے تھے۔ علامہ مغفور نے بھی ۱۸۹۰ء یا ۱۸۹۱ء تک یہ پہنی مگر اُونچی باڑھ کی۔ گھر میں یہ ٹوپی لکڑی کے قالب پر چڑھی رہتی تھی۔ علامہ مغفور کے پھوپھی زاد بڑے بھائی مولوی اشرف حسین صاحب نے آخر وقت (۱۹۴۲ء) تک یہی ٹوپی پہنی۔ مگر علامہ مغفور نے ۱۸۹۱ء میں جو ترکی ٹوپی شروع کی تو پھر کوئی اور ٹوپی نہیں پہنی۔ اِن گرمیوں میں کبھی کبھی والدہ مرحومہ کے ہاتھ کی سلی ہوئی چکن کی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ ترکی ٹوپی شروع شروع میں سخت پہنتے تھے اس کے بعد نرم کر دی۔ عنابی رنگ کی پسند تھی۔ پہلے ۳-۴ کی اور آخر میں ۹-۱۰ روپیہ کی آتی تھی اُونچی باڑھ کی۔ صافہ صرف اُس وقت باندھتے جب وعظ کہنے جاتے۔ انہیں اچھا صافہ باندھنا آتا تھا بس لپیٹ لیتے تھے۔ ۱۸۹۰ء کے بعد پھر صافہ نہیں باندھا اگر وعظ اُس زمانہ کے دس سال بعد بھی کہا۔ اُس زمانے میں جب وعظ کہتے تو جُبّہ بھی پہنتے تھے۔

جُوتی جوانی میں اُنھوں نے سلیم شاہی ایک پھُول کی پہنی۔ جو ایک روپیہ دو آنے یا ایک روپیہ چار آنے کی آتی تھی۔ اور سیاہ یا کتھئی چمڑے کی ہوتی تھی کبھی کبھی شوز بھی پہنتے تھے۔ مگر جرابوں کے ساتھ۔ بغیر موزوں کے شوز پہننے کے خلاف تھے۔ گھر پر ان سلیپر پہنتے تھے جو ۱۹۲۵ء-۱۹۲۶ء میں گیارہ بارہ آنے کا اور ۱۹۳۲ء-۱۹۳۳ء میں چودہ پندرہ آنے کا آتا تھا۔ کبھی سلیپر ہی پہنے ہوئے اڈورڈ پارک، چوک اور نرابا بیرم خاں چلے جاتے تھے۔ اِس دور جانا ہوتا تو

آنا [illegible] دو آنے دیتے تھے سنہ کے قریب چار آنے اور سنہ کے لگ بھگ چھ آنے۔ وہ ناخن بھی کترتا تھا۔ ڈاڑھی ہمیشہ رکھی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ زیادہ بڑھ گئی تو والدہ مرحومہ سے کپڑے کترنے کی قینچی لے کر آئینہ سامنے رکھ کر خود بھی کتر کر چھوٹی کر لی۔ ایک مٹھی سے زیادہ نہیں رکھی۔ خضاب کبھی نہیں لگایا۔ ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال پچاس پچپن سال کی عمر ہی میں سفید بھبک ہو گئے تھے۔ مونچھیں کترتے تھے اور جھکی ہوئی رکھتے تھے۔ گرمیوں میں روزانہ صبح شام اور کبھی تیسرے پہر بھی نل کے نیچے کھڑے ہو کر نہایا کرتے تھے۔ اور جاڑوں میں بھی پانی گرم کروا کر دوسرے تیسرے دن۔ صابن غسل کرتے یا منہ دھوتے وقت بہت کم استعمال کرتے۔ عطر لگانے کا شوق نہ تھا ہاں پھول پسند تھے۔ موتیا۔ چنبیلی۔ گلاب کے پھول ان کے سرہانے بھی ہوتے۔ کبھی طشتری میں رکھے ہوتے دوات کاغذ کے پاس۔

کوئلے کے منجن سے علی الصبح روزانہ دانت مانجھتے تھے۔ جوانی میں مسواک بھی کرتے تھے۔ دانت پچاس سال کے بعد ٹوٹنے شروع ہوئے تھے۔

سودا سلف پھلوں میں آم خربوزے۔ مٹھائیوں میں حلوا سوہن۔ بنگالی مٹھائی۔ قلاقند۔ گھر کی آرائش کی چیزوں میں دری۔ جازم۔ حسن کا فرش۔ کرسیاں مونڈھے۔ چلمنیں یہ چیزیں لاتے ہوئے تو میں نے دیکھا ورنہ گھر کا سودا سلف کسی قسم کا بھی خریدتے اور لاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

سیر تفریح علامہ مغفور کو سیر تفریح کا ہمیشہ شوق رہا۔ سبزہ بہت پسند تھا اور ملازمت کے زمانے میں کسی کو روپیہ دو روپیہ دے کر اپنا کام دفتر کا کراتے اور خود قدسیہ باغ میں جا کر گھاس پر بیٹھ کر مضامین لکھتے۔ یہی نہیں جوانی میں وہ ہر اتوار کو گھوڑا گاڑی کرایہ پر کر کے او کھلے وغیرہ جاتے گھنٹوں دریا کے کنارے [illegible] میں دو تین ہفتے کے لئے قطب صاحب۔ بلکہ گنگا پر جب جایا کرتے تو وہاں بھی چپلی اور پرتھوں وغیرہ کے شکار کو اکثر تشریف لے جاتے۔ آخر عمر میں ابر آلود دن ہوتا تو وہ فرماتے "آج گھر میں رہنے کا دن نہیں ہے" اور کچھ نہیں تو دریائے جمنا کے کنارے یا دلی دروازے سے باہر کوٹلے کی سمت کو نکل جاتے اور وہاں کی ہوائی چڑھتی۔ انہیں درخت اور جنگل بھی پسند تھے۔ وہ پہلوٹی کے تھے اور عورتیں کہتی تھیں کہ بجلی پہلوٹی کے بچہ پر اور بھینس یا کالی چیز پر گرتی ہے جب بارش ہوتی اور بجلی چمکتی تو ان کی والدہ اور بیوی ان سے کہتیں کہ اندر کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھو مگر بجلی کی چمک اور بادلوں کی کڑک میں بھی انہیں لطف آتا تھا۔ وہ تو نہایت اندھیری سیاہ بھیانک رات کا بھی جب ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا اور سخت وحشت ہوتی لطف اٹھاتے تھے اور کبھی یہ بھی کہتے "گنہ گاروں کی قبر میں ایسا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کا اعمال نامہ ایسا ہی سیاہ ہوگا" کبھی فرماتے "انتہائی تاریکی میں بھی تو حسن ہے"

انہوں نے دنگل بھی دیکھا تھیٹر سرکس بھی سینما وہ بیوی بچوں کے ساتھ جاتے تھے۔ انگریزی سینما میں زنانہ درجہ الگ نہ ہوتا تھا اس لئے والدہ مرحومہ ان کے برابر ہی بیٹھتیں اور وہ انھیں کہانی سمجھاتے جاتے تھے۔ بولتی فلم ان کے سامنے آ گئی تھی۔ فلم دیکھنے کے بعد اس پر رائے زنی اور تبادلہ خیالات بھی کرتے۔

بانسری اکثر بجایا کرتے اور صادق میاں کو بھی سکھائی تھی۔ جوانی میں مشہور مغنیہ امیر جان پانی پت والی کا گانا بھی مولوی اشرف حسین صاحب اور قاری سرفراز حسین صاحب

ے سا ... سُنا تھا اور سلسلہ میں جب گراموفون خریدا تھا
و اس کے کئی ریکارڈ منگائے جو بہت پسند تھے اکثر سُنا
کرتے تھے۔
اور کبھی قطب کو ٹھے وغیرہ جاتے تو لڑکوں اور لڑکیوں
کی دوڑیں بھی کراتے اور جو سب سے آگے نکلتا اس کو انعام بھی دیا
کرتے۔ برسات میں لڑکیوں کے لئے جھولے ڈلواتے تھے
تقریبوں میں ڈومنیوں کا گانا بھی کرواتے تھے اور قوالی
بھی کبھی کبھار ہوتی تھی۔ کلن قوال کی قوالی ایک دفعہ مسلسل
چھ راتیں ہوئی۔
آخر زمانہ میں اکثر شام کو اڈورڈ پارک کرسیوں
میں چلے جاتے تھے جہاں ان کے ۴-۵ احباب بھی آ جایا
کرتے تھے۔

آخری دور کا میل جول | علامہ مغفور کا آخری ۱۰، ۱۰
سال میں جن عزیزوں سے
اور احباب سے زیادہ میل جول تھا وہ یہ تھے۔
علامہ مغفور کی بس ایک حقیقی بہن تھیں حاجیہ
زاہدہ بیگم صاحبہ اور پھوپی اماں کے ہاں وہ ہفتہ میں دو
بار تو ضرور ہی چوڑی والوں کے محلہ میں جایا کرتے اور
گھنٹہ پون گھنٹہ بیٹھا کرتے تھے۔ پھوپی اماں بھی ہفتہ میں
کم سے کم ایک دفعہ ضرور تشریف لایا کرتی تھیں۔
جمعہ کی نماز کے بعد آپ کے دو چچا زاد بھائی ڈاکٹر
عبدالجبار خیری۔ اور مولانا عبدالغفار صاحب (اور اُن کے
پھوپی زاد بھائی اور بہنوئی حافظ اسعد حسین صاحب
وحشی کہ تینوں عمر میں ۳، ۵ اور ۴ سال علی الترتیب چھوٹے
تھے۔ تشریف لایا کرتے اور دو ڈھائی گھنٹہ اور کبھی اس سے
بھی زیادہ ٹھہر کر مغرب کی نماز کے بعد جایا کرتے تھے۔ کبھی
پرانے قصے اور لڑکپن کی باتیں ہوتیں کبھی علمی گفتگو ہوتی
نکتے اور قرآن حدیث کی باتیں۔ کبھی چچا شبن (ڈاکٹر جبار صاحب)
اور چچا جبن (مولانا عبدالغفار صاحب) سے فرماتے "تم دونوں
ابوجہل کی اولاد ہو" اور وہ بہت آہستہ کہتے "بھائی تو کیا
آپ نہیں ہیں" تو بلند آواز سے علامہ مرحوم جواب دیتے
"ہم حضرت عکرمہؓ کی اولاد ہیں" کبھی سنجیدہ گفتگو ہوتی کبھی
ہنسی مذاق کی۔ جمعہ کے جمعہ آٹھ سال تک یہ سلسلہ
رہا اور یہ ڈھائی تین گھنٹے علامہ مغفور کے بہت ہی دلچسپ
گذرتے تھے۔ والدہ مرحومہ اپنے ان دیوروں کی خاطر
مدارات کرتیں اور تینوں اپنی بھابی کا بے حد احترام کرتے
تھے۔ جمعہ کو جب یہ تینوں چچا تشریف لاتے تو گھر کا ایک
ایک بچہ ان کے سلام کو حاضر ہوا کرتا۔ کسی کو آنے میں
دیر ہوتی تو خود علامہ مغفور بلوایا کرتے تھے۔ ان کے ایک
اور چچا زاد بھائی پروفیسر عبدالستار علی گڑھ سے دلی آتے
تو علامہ مغفور سے ملنے آتے انہیں دیکھ کر بہت خوش
ہوتے اور دیر تک بڑے ننھے بڑے ننھے کہہ کر ان سے باتیں
کیا کرتے تھے۔ جب ان کے چچا زاد بھائی آتے تو مجھے
بلوا لیا کرتے تھے۔
اُن کی ننھیال کے ایک رشتہ کے بھائی تھے ڈاکٹر
محمد عمر کبھی کبھی ان کے ہاں مٹیا محل جاتے اور وہ بھی اکثر
تشریف لایا کرتے تھے۔ والدہ مرحومہ کا وہی علاج کرتے۔
بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے اور والد مغفور ان کی باتوں
کا خوب لطف اُٹھاتے۔ اور کوئی ایسی بات چھیڑ دیتے۔
جس کے جواب میں ان کی زبان سے یا تو گالی نکلتی یا قسم
کھاتے۔ علامہ مغفور کہتے "تمہاری بھابی کا بخار ابھی تک
نہیں اُترا کیا فائدہ اس گولی کے دینے سے" اور وہ فرماتے
"قسم ہے قرآن کی آج رات تک اُتر جائے گا۔ یا اس
انجکشن کے آدھ گھنٹہ بعد اگر نہ اُترا (گالی) نہ جانے تو میرا

گھر سے آزاد بنا۔"

والدہ مرحومہ کے پانچ بھائیوں میں آخر میں تین رہ گئے تھے۔ کپتان مولوی حبیب الرحمٰن صاحب۔ مولوی سعید الرحمٰن صاحب اور مولوی امان الرحمٰن صاحب منجھلے ماموں جان مولوی سعید الرحمٰن صاحب تو گھر سے نکلتے ہی بہت کم تھے۔ مگر ان سے بڑے اور چھوٹے دونوں بھائی اکثر تشریف لایا کرتے اور روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن خود علامہ مغفور ان کے ہاں چکر لگا آتے تھے والدہ مرحومہ کی طرح ان کے منجھلے بھائی کوئی ہنسی کی بات ہوتی تو مسکرا دیتے مگر علامہ مغفور اور مولوی شاہ امان الرحمٰن صاحب خوب قہقہے لگایا کرتے تھے۔ کھانا تو خیر وہ کہیں کھاتے ہی نہ تھے۔ مگر پان کے علاوہ کچھ اور بھی بالعموم نہ کھاتے۔ والدہ مرحومہ کی بھاوجوں ہی سے نہیں ان کی بیٹیوں اور بہوؤں سے بھی ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور لڑکیوں کو لطیفے سُنا کر ہنسایا کرتے مگر اس کے ساتھ ہی کوئی ایسی بات بھی کہتے جو مستقبل میں اُن کے لئے مفید ہوتی۔

یوں تو وہ دُور پرے کے بھی ایک ایک رشتہ دار کی خبر رکھتے چاہے اپنا ہوتا یا والدہ مرحومہ کا مگر زیادہ میل جول آخر زمانہ میں انہیں بزرگوں اور عزیزوں سے تھا۔ بڑے ابا مولوی اشرف حسین صاحب کا انتقال شاید ۱۹۲۶ء میں ہوا تھا۔ اُن کے بعد کھاری باؤلی یعنی ددھیال جانا بہت کم ہوگیا تھا۔

احباب میں زیادہ ملنا جُلنا واحدی صاحب۔ خواجہ فضل احمد شیدا اور مولانا عارف ہسوی مرحوم سے تھا۔ واحدی صاحب کا گھر قریب ہی تھا اور روزانہ ہی ان کے ہاں چکر لگاتے۔ گرمیوں میں شام کو اکثر اڈورڈ پارک چلے جاتے تو یہ حضرات وہاں موجود ہوتے۔ واحدی صاحب کے ہاں خواجہ حسن نظامی مرحوم۔ بھتیا احسان الحق مرحوم سے بھی کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔ عارف صاحب اور شیدا صاحب سے بے تکلفی تھی۔ چھوٹوں میں ضیاء الدین احمد برنی۔ قاری عباس حسین۔ سید شوکت اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اپنے گھر کے سامنے یا دریا گنج کی سڑک پر اکثر ٹہلا کرتے تھے۔ یا اُردو بازار سے ہوتے ہوئے چوڑی والان اپنی بہن بی بی زاہدہ بیگم صاحبہ کے ہاں جایا کرتے تھے۔ سڑک پر جاتے ہوئے مرزا محمد سعید مرحوم مرزا بُلاقی مرحوم — نواب سراج الدین سائل مرحوم سید بے خود مرحوم۔ مفتی کفایت اللہ مرحوم۔ مولانا احمد سعید مرحوم۔ مولوی رضا اللہ انجینئر مرحوم — ڈپٹی فدا اللہ مرحوم۔ نواب صباح الدین خاں مرحوم ڈاکٹر سید احمد بریلوی مل جاتے تو ان سے دیر تک باتیں کرتے۔ آغا شاعر مرحوم اکثر تشریف لایا کرتے تھے اور ان سے بے تکلفی تھی۔ کبھی کبھی مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور سید آصف علی بیرسٹر مرحوم کے ہاں پہنچ جاتے۔ مرزا محمد سعید مرحوم اور سید آصف بیرسٹر سے انگریزی ادب پر بھی گفتگو ہوتی۔ قاری سرفراز حسین مرحوم تو ان کے بچپن کے دوست تھے اور بہت بے تکلف۔ کسی کے سامنے اُن سے کُھل کر گفتگو نہ کرتے۔ میں بھی جب وہ بے تکلف دوستوں سے ملنے جاتے تو چلا جاتا تھا۔ ان کے بے تکلف دوستوں میں خواجہ محمود حسین مرحوم اور پرنسپل مشتاق احمد زاہدی مرحوم بھی تھے۔ میر جالب مرحوم اڈیٹر ہمدم لکھنؤ۔ دلی آتے تو ان سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی کبھی وہ آجاتے کبھی علامہ مغفور میر صاحب کے ہاں چلے جاتے تھے۔ محلّے کے پان والے۔ دودھ والے۔ تانگے والے۔ کھی آنے والے سڑک پر مل جاتے تو چند منٹ ٹھیر کر اُن سے باتیں کیا کرتے تھے۔

باب سولھواں ——— سیرت

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

۱- انسانی حیثیتیں

مرحومہ دادی اماں کے انتقال کے وقت میری عمر دس
برس کی ہو چکی تھی۔ دادی اماں صحت مند تھیں دس روز پہلے
پرانے زمانے کی بزرگ تھیں اُن کا عقیدہ تھا کہ ڈاکٹری
دوائیں ناپاک ہوتی ہیں اس لئے کہ اس میں شراب کی آمیزش ہے۔
ایک روز جب بخار چڑھا تو ابا جان دفتر گئے ہوئے تھے ان کو
بھی نہ بتایا۔ دوسرے روز حسب معمول صبح تہجد سے
فارغ ہو کر باہر کے پلنگ پر بیٹھ گئیں اور ابا جان سے
چھپاتی رہیں اپنی تکلیف کے متعلق خبر نہ ہونے دی۔ دفتر کا
وقت قریب ہوا اور ابا جان مطمئن دفتر چلے گئے۔ اور دادی
اماں نے ہرو طی منگوا کر سینے پر ملوائی اور سکائی کر لی۔ دن
گزر گیا مگر تکلیف میں کمی نہ ہوئی۔ ابا جان کے آنے کا وقت
ہو گیا۔ دادی اماں نے سختی سے گھر میں تاکید کر دی کہ ابا میاں
جب آئیں تو اُن سے میرے بخار اور درد کا ذکر کوئی نہ کرے۔"
دادی اماں نے لاکھ کوشش کی کہ انہیں تکلیف کا علم نہ ہو
مگر ابا جان دفتر سے آتے ہی اپنی ماں کو لیٹا ہوا دیکھ کر پریشان
ہو گئے اور طبیعت کی کیفیت دریافت کی اور دادی اماں
نے اپنی تکلیف کا اظہار معمولی طور سے بیان کر دیا۔ اور
ابا جان ڈاکٹر کو لینے جانے لگے۔ دادی اماں ڈاکٹر کا نام
سن کر اٹھ بیٹھیں اور ناراض ہونے لگیں۔ آخر ابا جان حکیم
کو لانے دریافت کرنے سے معلوم ہوا حکیم اجمل خاں صاحب
باہر گئے ہوئے تھے حکیم علی احمد خاں صاحب جو دہلی کے
مشہور اور بڑے حکیموں میں سے تھے ان کو لائے دو روز ان کے
زیر علاج رہیں۔ کچھ فائدہ نظر نہ آیا تو پھر حکیم قاسم علی صاحب
کا دوا علاج کیا۔ چوتھے روز بعد ڈاکٹر ہیم چندر کو
لائے جو اُس وقت دہلی کے بہترین ڈاکٹر تھے۔ بہت مشکل
اور خوشامد سے دادی اماں کو رضامند کر لیا کہ وہ ڈاکٹر کو
دکھا دیں۔ ڈاکٹر نے نمونیہ تشخیص کیا۔ دونوں حکیموں تیسرے
ڈاکٹر تینوں کی متفق رائے نے ابا جان کے ہوش اڑا دیے
چھٹی کی درخواست تو ایک روز پہلے ہی دے دی تھی۔ وقت
کا لمحہ لمحہ اُن کی خدمت میں گذرنے لگا۔ دن کی بھوک رات
کی نیند اُڑ چکی تھی۔ دن کو پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھے رہتے۔
رات کو اپنا پلنگ اُن کے پاس بچھواتے اور ساری رات
بیٹھے رہتے۔ مجھکو اچھی طرح یاد ہے چھ سات روز تک
دادی اماں کے پلنگ کی پٹی نہ چھوڑی۔ بخار کے تیسرے
روز ابا جان سمجھے کوئلے ختم ہو گئے ہوں گے۔ صحن میں آکر
ملازم کو آواز دی اور ایک کوئلہ کی بوری منگوانے کو کہا۔
دادی اماں خاصی دور دالان میں تھیں۔ ابا جان کی آواز
سن کر بہت زور سے آواز دی۔

"ابی میاں اور کوئلے کیوں منگواتے ہو سات بوریاں
تھیں شاید ایک ختم ہو گئی ہو چھ ضرور ہوں گی۔ جب یہ

ختم ہو جائیں پھر منگوانا"

مرحومہ دادی اماں بہت کفایت شعار بزرگ تھیں۔ تمام گرمیوں کھانا پکنے کے بعد کوئلے بجھواتی تھیں۔ اور کئی کئی بوریاں بھروا کر رکھوا دیتی تھیں۔ ایک ایک پیسہ کا بھی سودا چُکا کر خریدتی تھیں۔ بھلا ایک بوری کوئلہ کی بغیر چُکائے خریدنے کی کس طرح اجازت دے سکتی تھیں۔ دادی اماں کا دماغ آخیر وقت تک صحیح رہا۔ جس صبح رُخصت ہونے والی تھیں رات کے تین بجے ابا جان سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں مجکو خواجہ باقی باللہ میں دفن کرنا میں جانتی ہوں وہاں کی زمین بہت مہنگی ہے۔ تم گھبرانا نہیں لو یہ کنجیاں کوٹھری میں سبز رنگ کا جو صندوق ہے اس میں ایک تھیلی چھالیہ کی ہے وہ تھیلی تم کو اتنا دے گی کہ تم کو اپنے پاس سے کچھ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی"

ابا جان نے کنجیاں لینے سے ہرچند انکار کیا مگر زبردستی ان کے کمر بند میں کنجیاں بندھوا دیں اور ابا جان دوسرے گھر میں جا کر رونے لگے۔ معلوم نہیں ابا جان کے رونے کی آواز سُنی یا خود ہی آواز دی۔

"ابی میاں"

ابا جان کو اُسی وقت بُلایا گیا۔ دادی اماں جھکی ہوئی بیٹھی تھیں فرمایا:۔

"مجکو پانی پلاؤ" اُن کے ہاتھ سے پانی پی کر ابا جان کو دُعا دی۔

"جس طرح تم نے مجھے خوش رکھا اسی طرح خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے"

ابا جان پوری طرح لٹا بھی نہ سکے تھے۔ اُن کے دونوں ہاتھوں میں سر تھا اور پُشت کا حصہ گھٹنے پر کر ابا جان کی عاشق زار ماں دُعائیں دیتی ہوئیں ابا جان کی گود میں دُنیا سے رُخصت ہو گئیں"

راشدہ بیگم عصمت جولائی ۳۶ء

بھائی

"میرے بھائی ایسے تھے کہ ان کی مثال آج تک دیکھی نہ سُنی۔ جس وقت میں بیمار ہوئی تو کہا کہ ہزار روپیہ اُٹھ جائیں۔ میری بہن کی جان بچ جائے۔ بچپن اور جوانی گذری بڑھاپا آگیا مجھ کو یاد نہیں کہ کبھی میرے بھائی نے میری دل شکنی کی ہو۔ ہم دونوں بھائی بہن دُنیا میں محبت کا نمونہ تھے۔ جس وقت میرے شوہر کا انتقال ہوا اُس وقت کی پریشانی اور صدمہ جو بھائی نے کیا کوئی بھائی ایسا نہ کرے گا۔ ان کی ذات میں ماں کی محبت باپ کی شفقت شوہر کی حمایت و حفاظت جمع تھی۔ آہ بھائی آپ نے میری ہر حالت میں خبر لی۔ آپ پر میں فخر کرتی تھی۔ آپ سے اگر کسی نے پوچھا کہ بہن کو کتنا چاہتے ہو تو آپ فرماتے "میں زہر بھی اپنی بہن کے بغیر نہیں کھا سکتا۔" ہائے یہ کہنے والا کوئی نہیں۔ مجھ بیوہ بہن کے غم گسار بھائی آپ کی محبت و شفقت کہاں سے لاؤں۔ آپ نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ نزع کے عالم میں میاں رازق کو بلا کر کہا میری بہن کو نہ بھولنا۔" مجھکو بھاوج صاحبہ اور بھتیجوں بھتیجیوں سے یہی اُمید ہے کہ ہر حال میں وہ میرا خیال کریں گے۔ میری بھاوج قابل فخر بھاوج ہیں۔ سسرال کا ہر فرد بشر ان کو عزیز رکھتا ان کی عزت کرتا ہے۔ آپ کی یاد ہوتی ہے۔ آپ کا تصور ہوتا ہے۔ مکان کا کونہ کونہ آپ کی داستان سُناتا ہے۔ آپ کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ آپ کی نگاہ محبت کہاں لاؤں ..... اپنی غریب بہن کا دل رکھنے والے بھائی اس چھوٹے سے مکان میں آکر بہن کا دل خوش کر دیتے تھے۔ آپ کی کس کس بات کو یاد کروں۔ دن تو جلد تلک جاتا ہے لیکن رات نہیں کٹتی آپ کی یاد ہے آپ کا خیال ہے۔

(حاجیہ زاہدہ بیگم مرحومہ) ۳۶ء

"ٹونک میں روزانہ صبح چار بجے بیدار ہو جاتے اور ممانی جان کو ساتھ لے کر لالٹین لئے ہوئے باہر ٹہلنے چلے جاتے تھے اور سورج نکلنے سے قبل واپس آجاتے تھے . . . .

ممانی جان سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ کا معمول ہے صبح ٹہلنے چلے جاتے ہیں دہلی میں دریا گنج کی سڑک پر مجھے لے جاتے ہیں مجھے عادت ہوگئی ہے"۔

میرے سونے کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ آپ کے سالے صاحب باہر بیٹھک میں سوئیں۔ ماموں جان برلاس صاحب ایک کمرے میں۔ رازق بھائی اور منیر میاں ایک کمرے میں اور ممانی جان ایک کمرے میں سوئیں۔ بستروں کا انتظام دیکھ کر فرمانے لگے دلہن کیا کر رہی ہو اپنی تجویز سنائی تو فرمایا" ہمیں بھی چھوٹا جوڑا سوئے گا۔ میں پرانے خیال کا نہیں ہوں"۔ میں نے گردن جھکا کر پیار سے کہا کہ ممانی جان سے عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ دونوں باتیں کریں گے۔ اس پر نہایت صفائی سے فرمایا" رات آرام کے لئے بنائی گئی ہے۔ باتیں کرنے کو دن پڑا ہے۔ قریب ہی پاندان کے پاس ممانی جان بیٹھی ہنس رہی تھیں۔

ممانی جان ماموں جان کی بڑی ثنا خواں ہیں ان کی محبت کی بڑی قدر کرتی ہیں۔ فرماتی تھیں میں کسی قابل نہیں ہوں خدا کی عنایت ہے کہ ابتدائے عمر سے میرے گرویدہ ہیں۔ اور ہر طرح آرام و آسائش کا خیال رکھتے ہیں" ٹونک کی ملنے والیوں سے جب میں نے دونوں کے حسن سلوک کا ذکر کیا تو رشک کرنے لگیں کہ اس ضعیفی میں یہ عشق ہے خدا ہم پر ان کا اثر ڈالے"۔

مسز برلاس ——————— ساقی راشد الخیری نمبر

" مولانا راشد الخیری صاحب کا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا تھا کہ کبھی اپنے سے جدا نہ کرتے تھے۔ چند روز کے سفر میں بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ بچوں سے اتنی محبت تھی کہ دونوں لڑکے جوان ہیں مگر گلے کے تعویذ کی طرح ساتھ رکھتے تھے۔ مرحوم بہو خاتون اکرم کو اکثر یاد کرتے تھے غرض شوہر، باپ، خسر، دادا ہر حیثیت سے وہ اپنا محبت بھرا سلوک یہ دکھا گئے کہ تم خوش گوار زندگی گذارنی چاہتے ہو تو اس طرح رہو۔ جب تک زندہ رہے دنیا کو سبق دیتے رہے، مرنے کے بعد بھی ان کے نایاب کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے"۔

صغرا ہمایوں مرزا حیدر آباد دکن ——— عصمت جولائی ۳۶ء

" مولانا کی خانگی زندگی نہایت درجہ کامیاب تھی۔ مولانا ایک اچھے خاوند تھے۔ اچھے باپ تھے۔ اچھے خسر اور اچھے دادا تھے۔ علامہ مرحوم کا برتاؤ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ویسا ہی تھا جیسا وہ اپنی تصانیف کے ذریعہ خاوندوں کے برتاؤ کے متمنی تھے . . . . . . میں ایک دو نہیں ہندوستان کے بہت بڑے بڑے آدمیوں کو جانتا ہوں جن کی خانگی زندگی ہرگز اس قدر درخشاں نہیں جیسی ان کی پبلک زندگی اور میرے نزدیک انسانی کیرکٹر کا یہ بہت بڑا سقم ہے۔ علامہ مرحوم اس سقم سے مبرا تھے۔ اور اس لئے اس اعتبار سے علامہ مرحوم کو کامیاب انسان تصور کرتا ہوں"

قاری عباس حسین (ایک عزیز دوست کے بیٹے) ——— عصمت ۳۶ء

" اکثر میں نے دعائیں سنی ہیں کہ تیری ایڑی دیکھ کر دوسری کا منہ دیکھے وہاں ہر دعا ختم تھی جس گھر میں بھابی کا قدم آیا گویا لکشمی آگئی۔ دولت میں شہرت میں غرض ہر بات میں بھائی نے قدم آگے بڑھانے شروع کئے مگر بھابی سے بے انتہا عشق تھا۔ جب تک زندہ رہے اُن کے پھول نام نہیں ہوتے ایک دن کو اپنے سے جدا نہ کرتے تھے۔ دشمنوں کو کھانا آیا آرام ہوا۔ ملانے کھلائے جا رہے ہیں۔ جس کسی کے ہاں جتنی دیر بیٹھے ہیں بھابی کا ذکر ہے اُن کا دل چاہتا تھا میری طرح سب

...بیوی سے محبت کریں۔ بھابی سے انہیں کتنا عشق تھا۔
...س کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بالعموم کسی کے
... جاتے تھے۔ جوانی کے زمانے میں رشتے لینے
... بچپن کے بے تکلف دوستوں میں اگر رات کے
... بج جاتے تو بجو کے رہتے مگر کھانا گھر آ کر کھاتے
... سب ہمارے ابا نے بھابی جیسی ساتھی ہوئیں۔ اُن کے
... سے چند روز پہلے میں اُن کو دیکھنے گئی تو کچھ شرافت
خاندان کا ذکر آیا خاص کر بچوں کی سعادت مندی کا، مجھ سے
... حامدہ میں کچھ نہیں سکتا مگر ایک مضمون عصمت کے
... سے مقصد و تاکہ دوسرے لوگوں کے بیٹے بھی اپنی ماں اپنے
... باپ کی خدمت کریں۔ میں نے کہا ضرور لکھوں گی۔ پھر مجھے
... مسلمان کیلئے شریف ماں باپ کے بچے کیا کیا کرتے ہیں۔
... لکھا۔

• شریف باپ نہیں شریف ماں کے بچے"
کئی مرتبہ کہا تو میں نے کہا "کیا ہم شریف نہیں ہیں"
فرمایا "نہیں۔ بتاؤ اسے نے باپ کی کیا خدمت کی؟
بھائی کی طرح بھابی صاحبہ میں بھی خوبیاں ہی خوبیاں
تھیں۔ بھابی صاحبہ اور بھائی کے تعلقات بے مثل تھے"

حامدہ بیگم خیری ——— (عصمت راشد الخیری نمبر)

• اپنی بیگم کے ساتھ ان کا برتاؤ ایسا شریفانہ تھا
کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ وہ
اپنی بیوی بچوں کو لے کر کبھی کبھی سیر و تفریح کے لئے قطب
صاحب جایا کرتے تھے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند تھی"

ضیاء الدین احمد برنی ——— (عظمتِ رفتہ)

• حضرت کو اپنی بیگم سے بہت محبت تھی۔ اور
ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ میں نے بہت کم اس طرح
سے ایک مسلمان مرد کو اپنی شریکِ حیات کے ساتھ اس
محبت اور عزت سے رہتے ہوئے دیکھا ہے۔ مرحومہ
حمیدہ اور میں دونوں بہت متاثر ہوئے تھے۔ کاش
سب مسلمان اپنی شریکِ حیات سے اس طرح محبت
اور اتنی ہی عزت کریں تو زندگی کیسی خوش گوار و سکھیا
ہو جاتی ہے"

مریم یوسف علی انسپکٹرس ——— عصمت راشد الخیری نمبر
سکولز دہلی ——— ۱۹۳۶ء

• ایسے شریف طبیعت نیک طینت اور سعادت مند لڑکے جیسے کہ وہ
دادا صاحب بہت کم نظر آئیں گے۔ انہوں نے اپنی ساس
یعنی میری والدہ مرحومہ کی مثل اپنی حقیقی ماں کے اطاعت
کی سچے دل سے خدمت کی ان کا اور اُن کے جذبات کا احترام
کیا اور ہمیشہ انہیں خوش رکھا"

کپتان حبیب الرحمٰن سی ای ای او بی ای ——— عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

نسبتی / برادر بھی

بھائی علامہ راشد الخیری مرحوم میری اکلوتی
بہن عزیزہ فاطمہ بیگم سلمہا کے شوہر اور میرے
برادر نسبتی تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی سچی محبت و
ہمدردی اور اس بے تکلفی کے باعث جو لڑکپن کے زمانہ
طالب علمی سے آپس میں چلی آتی تھی مثل میرے حقیقی بھائی
اور مخلص دوست کے تھے اور اسی حیثیت سے کنبے کے
اکثر معاملات میں اور بھائیوں کے ساتھ وہ بطور ایک رکن
خاندان کے شامل کئے جاتے تھے اور وہ بھی باوجود اس علم و
فضل اور اس بے مثل قابلیت اور بے نظیر قوتِ حافظہ
کے اور اس قدر و منزلت اور عزت و شہرت کے جو خدا نے
انہیں عطا فرمائی تھی، ہماری گھریلو صحبتوں میں اپنے ہی
گھر کی طرح نہایت سیدھے سادے اور بے تکلف شامل
ہوتے تھے اور اسی وجہ سے ہم پانچوں بھائی (جن میں سے
اب صرف تین زندہ رہ گئے ہیں اور ہم بھی چند روز کے

ملاتے ہیں، اُن کی دل سے قدر کرتے تھے۔ پھر بھائی علامؔ مرحوم کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس قدر اخلاص و بے تکلفی کے ساتھ ہی وہ پُرانی تہذیب و معاشرت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے۔ اور آپس کے حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھتے تھے، اور اس بارے میں اپنی طرف سے کبھی کسی بھائی کو شکایت کا موقعہ نہ دیتے تھے۔ حالانکہ عمروں کے لحاظ سے کچھ بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ بھائی علامہ کی اور اپنی جوانی کے وقت میں تو ان کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقعہ بہت ہی کم ملا تھا اس لئے کہ میں ملازمت کے سلسلہ میں جکڑا ہوا چھتیس سال تک گھر سے باہر دُور و نزدیک کی فوجی چھاؤنیوں میں رہا۔ آخر میں ایک عمر دراز تک شملہ پر مگر دس گیارہ برس سے پنشن لے کر بڑھاپے میں جب خانہ نشین ہوا تو مجھے خوش قسمتی سے ان کی صحبت تقریباً روزانہ ہی میسّر آجاتی تھی، اس لئے کہ میرا جانا ان کے یہاں ہو تا یا نہ ہوتا، مگر وہ اپنی مخلصانہ محبت و مہربانی سے کچھ وقت نکال کر ایک پھیرا صبح یا شام ہمارے ہاں کر ہی جاتے تھے۔ اور اگر سوء اتفاق سے ہم میں سے کسی بھائی کے ہاں کچھ عذر و علالت کی حالت ہوتی تو پھر بے قرار ہو کر دلی ہمدردی سے دن رات میں کئی کئی بار تکلیف اُٹھا کر آتے اور صرف معمولی طور پر پوچھ ہی نہیں جاتے بلکہ کسی بڑے طبیب یا ڈاکٹر کے پاس جانے یا مریض کو دکھانے کی ضرورت ہوتی تو باوجود اور عزیزوں کی موجودگی کے خود ہی کسی ملازم وغیرہ کو ساتھ لے کر اپنی کار میں خاموشی سے چپکے چلے جاتے اور پھر طبی معائنہ اور دوا کا انتظام تسلّی بخش ہو جانے کے بعد مریض کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری میں بھی اپنی خوش تدبیری سے مدد دے کر خود مریض اور اس کے متعلقین کو مسرور و مشکور کر جاتے تھے اسی طرح اگر کبھی ہم بھائیوں میں سے کسی کی طبیعت کچھ پریشان یا کسل مندسی دیکھ لیتے تو اپنی زندہ دلی اور خوش طبعی سے کسی نہ کسی طرح اسے بھی بالکل رفع نہ کر سکے تو ہلکا ضرور کر دیتے تھے"

کپتان حبیب الرحمٰن سی آئی ای وغیرہ عصمت راشد الخیری

باپ

"آج سے ۲۰ سال پہلے نکاح سے ایک روز قبل جو الفاظ فرمائے تھے خدا کا شکر ہے پورے ہوئے۔ وہ بیش بہا شفقتِ پدری جس نے مجھکو اپنی زندگی میں جُدا نہ ہونے دیا آہ اب کہاں! جتنی رووں کم ہے جس قدر تڑپوں تھوڑی، خدا آبا جان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کیسے باپ تھے بے مثل لاجواب جہاں تک اُن کی ذات کا تعلق تھا بچوں کو فکر سے دُور رکھنے کی کوشش کرتے اور یہی وجہ تھی تمام معاملات میں دخل تھا انتہا ہے محبت کی کہ جس وقت مجھکو دردِ زہ شروع ہوتا گھر میں کسی کو پتہ نہ چلتا۔ مگر آبا جان کی ایک نگاہ سب پتہ لگا لیتی اور وہ اماں جان کو اطلاع کرتے۔ اُسی وقت بغیر کہے لکڑی ہاتھ میں لئے سیدھے دائی کے گھر پہنچتے آگے آگے آپ پیچھے نرس۔ اُس سے خود ہی گفتگو کرتے۔ کیونکہ وہم تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں اندر کے کمرے میں زچہ خانہ ہو رہا ہے باہر کے دالان میں وہ تشریف فرما ہیں۔ عام طور پر زچہ خانہ میں خاصا مجمع ہوتا ہے مگر آبا جان اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ زچہ خانہ میں اماں جان یا دو ایک عزیز جو مفید ہوتے نرس اور دائی کے علاوہ اگر کوئی اندر جانا چاہتا تو پسند نہ کرتے تھے اور ہر بچے کے رونے کی آواز آبا جان سُنتے اُدھر اُن کی آواز میرے کان میں آتی "راشدہ" اگر میں جی کہدیتی تو اطمینان ہو جاتا ورنہ بے حد پریشان ہو جاتے تھے۔

میرا منجھلا بچہ امجن میاں آٹھ سال کا قدرت نے مجھ سے چھین لیا وہ بچہ مجھکو سب سے زیادہ عزیز تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتی میرے زخم پر مرہم کا پھایا آبا جان نے کس طرح رکھا۔ ان کا سمجھانا لہجہ میں نرمی۔ الفاظ میں درد۔ ہر بار فقرہ کلیجہ

کرتا تھا۔ فرماتے تھے "مجھکو اور اپنی اماں کو تو دیکھو ۔۔۔ ۸۰ سال کے ایک بچہ ۱۸ سال کا سپرد خاک کرچکا ۔۔۔ اپنا حال دے کر مجھکو تسلی دیتے تھے۔ بچہ کے جانے ۔۔۔ بعد آموں کا موسم آیا۔ پہلی دفعہ آم آئے میں نے نہیں ۔۔۔ دریافت کیا۔ "کیا تم نے آم نہیں کھائے" میں نے ۔۔۔ خاموش ہوگئے اور مجھ سمجھانے لگے۔ دوبارہ پھر ۔۔۔ نے نہیں کھائے پھر دریافت کیا "تم نے آج بھی نہیں کھائے" میں خاموش ہوگئی وہ بھی خاموش ہوگئے۔ دوسرے روز بازار گئے خود آم خرید کر لائے مجھکو دئے اور فرمایا "آم کاٹو" میں حکم کی تعمیل کرنے میں مصروف ہوگئی آپ باہر چلے گئے ۔۔۔ ہوں سات سات آٹھ آٹھ سال کے بچوں کو لینے ۔۔۔ چلے آرہے ہیں۔ سات آٹھ بچے تھے دس بارہ یتیم ۔۔۔ مدرسہ کی تھیں مجھ سے کہا "یہ آم جو تم نے کاٹے ہیں ان ۔۔۔ کو کھلا دو۔" بچے اور مدرسہ کی بچیاں آموں کر چلی گئیں جب کھانے کا وقت ہوا تو دسترخوان پر آم رکھے گئے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے سر جھکا تا ہے۔ دل پھٹا جاتا ہے آہ میری طرف دیکھ کر کس قدر محبت بھرے لہجہ سے فرمایا تھا۔

"ہمارا ایک کہا کرو گی"

میں نے عرض کیا "فرمائیے"

"آم چکھ لو"

میں جواب دینے بھی نہ پائی تھی فرمانے لگے۔

"تم جانتی ہو آم خربوزے کس قدر پسند کرتا ہوں۔ اگر تم نہ کھاؤ گی تو میں بھی نہ کھاؤں گا۔ تم کو باپ کا خیال نہیں ہے جو تمہاری آنکھ کے سامنے ہے"

..... جس طرح مالی محنت و مشقت کے بعد ایک قطعہ زمین درست کرکے بہت سی امیدوں کے ساتھ چمن تیار کرتا ہے اُس کی سرسبزی کو دیکھ دیکھ کر آنکھوں کو فرحت دماغ کو تقویت اور دل کو سکون پہنچاتا ہے اسی طرح اباجان بہت سی توقعات کے ساتھ امنگوں اور ارمانوں کو لئے ہوئے اس آخری چھوٹے پودے (صادق میاں) کی پرورش میں منہمک تھے اس لہلہاتے ہوئے پودے کے جب پھلنے اور بار آور ہونے کی توقع قائم ہوئی تو اباجان حسرت و ارمان لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اباجان نے گیارہ لڑکوں میں خدا رکھے ان کی بہاروں کو یہ دو چھوٹے ہیں۔ ان میں بھی ایک ہی کی بہار دیکھنی نصیب ہوئی۔ رازق میاں بچارے صادق میاں کو سنبھال رہے اور اباجان کی جدائی کے زخم پر اپنی محبت کا پھایا رکھ رہے ہیں"

راشدہ بیگم خیری (عصمت راشد الخیری نمبر)

"چار سال ہوئے کہ بھنبھور تشریف لے گئے تھے دلی میں تین دن بہت زور کی بارش ہوئی اور بہت سے مکانات گر گئے انہوں نے اخبار میں یہ پڑھا تو ایک ہی دن میں دو تار بھیج کر خیریت معلوم کی اور باوجود اس کے کہ میں نے ان کو ہر طرح مطمئن کر دیا تھا۔ وہ طبیعت سے مجبور ہوکر زیادہ عرصے قیام نہ کرسکے۔

پچھلے سال ہی گرمیوں کے دن تھے رات کے دو بجے ہوں گے۔ میرا بچہ بیماری کی وجہ سے زور سے رونے لگا میں نے اس خیال سے کہ اباجان تک اس کے رونے کی آواز نہ پہنچ جائے بچہ کو گود میں اٹھایا اور بنگلہ کے پچھلے حصے میں جاکر ٹہلنے لگی۔ چند لمحات ہی گزرے تھے۔ کہ اباجان کی آواز آئی۔ "واجدہ" میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ فرمانے لگے۔ "اکیلی تم کب تک یہاں ٹہلو گی لاؤ اسے مجھے دیدو۔ میں بہلانے کی کوشش کرتا ہوں"۔ اس وقت مجھے ندامت ہو رہی تھی کہ اباجان کو اب رات بھر جاگنے کی تکلیف ہوگی۔ کیونکہ سوتے میں اگر ایک دفعہ بھی ان کی آنکھ کھل جاتی تھی تو پھر نہ سوتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں میرا تین سال کا بچہ گردن توڑ بخار میں مبتلا ہو کر مجھے داغِ مفارقت دے گیا۔ اس وقت ابا جان دورے پر تشریف رکھتے تھے۔ میں نے ان کو اطلاع دہونے دی کیونکہ وہ معمولی سی بیماری کی خبر سے پریشان ہو جاتے تھے۔ اور کجا کہ بچہ کے انتقال کی خبر؟ میری نظروں میں دنیا اندھیر تھی۔ میرے شوہر یہ کہہ کہہ کر کاش ابا جان آج یہاں ہوتے! الگ سر پھوڑ رہے تھے۔ ہر مصیبت میں ابا جان ہی تمام خاندان کا غم غلط فرماتے تھے۔ لیکن اس وقت ان کے نہ ہونے سے ہم پر جو کوہِ الم ٹوٹ پڑا تھا وہ ہم دونوں میاں بیوی کو دگنا محسوس ہو رہا تھا۔ ابا جان تشریف لائے اور اس حادثہ کو سن کر انہیں جو صدمہ ہوا اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ایک رات کو میں نے انہیں اماں جان سے بچے کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اتفاقاً سنا لیکن میرے سامنے انہوں نے کبھی اس کا ذکر تک نہ کیا۔

ایک دفعہ آم منگوا کر جب سب کو تقسیم کروا چکے تو مجھے بلایا اور فرمایا۔

"آم کاٹ کر میرے ساتھ کھاؤ"

مجھے اپنا بچہ یاد آگیا۔ کیونکہ اس کے جانے کے بعد آموں کی پہلی فصل تھی۔ میں نے چپکے سے آنسو پونچھ کر عرض کیا: "ابا اس وقت تو دل نہیں چاہ رہا" فوراً سمجھ گئے اور مجھ کو پاس بٹھا کر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور محبت سے فرمانے لگے۔

"واجدہ بیٹی! سالم تمہارا بچہ ضرور تھا مگر وہ تمہارے پاس امانت تھی۔ یاد ہے حضرت ابراہیم ؑ نے اپنے ہاتھ سے خدا کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان کیا تھا۔ ایسے بھی خدا کے بندے تھے تمہاری رائے میں چونکہ وہ بچہ آم بہت کھاتا تھا۔ اس لئے تم نہ کھاؤ۔ یہ تو صحیح نہیں ہے۔ اگر تم نہ کھاؤ گی تو ظاہر ہے تمہارے بچے بھی نہیں کھائیں گے اور یہ ان بچوں پر بڑا ظلم ہو گا۔ اپنے رنج کی خاطر دوسرے بچوں کو ایک پھل سے محروم کرتی ہو۔ اگر تم کو واقعی اس بچے سے محبت تھی تو آم منگوا کر یتیم بچوں کو کھلاؤ خدا بھی خوش ہو گا اور تمہارے بچے کو بھی ثواب پہنچے گا"

اس طرح جان سے زیادہ پیارے ابا جان کی وجہ سے میں نے آہستہ آہستہ دنیا کے تمام دھندوں میں اور تفریحوں میں حصہ لینا شروع کر دیا"

واجدہ بیگم ———— (عصمت جون ۱۹۳۶ء)

"مرحوم اپنی اولاد سے بہت خوش تھے۔ اور اولاد بھی ایسی ہی لائق اور خدمت گذار ہے کہ وہ اس سے جس قدر بھی خوش ہوتے کم تھا۔ کیونکہ میں نے تو نئی روشنی کے لڑکوں میں ایسے سعادتمند لڑکے کہیں دیکھے نہیں جیسے مولانا مرحوم کے لڑکے ہیں"

حسن نظامی ———— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"پیغمبرِ اسلام کا قول ہے کہ اچھا آدمی وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اچھا ہو۔ مولانا اس اعتبار بھی بے مثل آدمی تھے۔ اُن کے بچوں نے مرتے وقت جیسی خدمت اُن کی کی کوئی باپ بھی آج کل اپنے بچوں کی نہیں کرتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا برتاؤ بچوں کے ساتھ کیسا تھا"

ملا محمد واحدی صاحب کی تقریر ———— ۵ رفروری ۱۹۳۶ء
آل انڈیا ریڈیو پر

"جو ہونا تھا ہو چکا اس خدمت اور صرف کا انجام خوش گوار نظر نہیں آتا۔ رازق اپنی محبت میں اندھا ہو رہا ہے ارے غضب ہے دوا پلانے اور غذا کھلانے کے لئے ڈاکٹر آرہے ہیں۔ روپیہ ٹھیکری کی طرح اُٹھ رہا ہے۔ تم منع نہیں کرتیں" میں نے کہا "ابا آپ فکر نہ کیجئے روپیہ آپ پر سے

ن سے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ روپیہ بہت سے قل و غش آمد
ے رازق میاں کو اس وجہ سے نہیں روکتی کہ کہیں جیسے
سے ان کی دل شکنی نہ ہو" "نہیں روکتیں تو منع کرو" ۔
... صادق ہو گئے ۔ پھر کمزوری کی وجہ سے غنودگی طاری
... زی دیر بعد آنکھ کھول کر دیکھا میرا ہاتھ اپنے
... اور سو خشک ہلتے ہوئے نظر آئے میں جھک گئی مگر
... سل ۔ میں نے پوچھا "ابا کیا کہہ رہے ہیں" "تم بچی
حق ... ہو ابا کیا کہہ رہے ہیں ۔ نہیں سنتیں تو نہ سنو" ۔
سنے عاجزانہ لہجہ میں کہا "آپ روپیہ کے صرف کا
... خیال نہ کیجئے آپ کی زبردست قوت سے رازق میاں
بہت سا پیدا کر لیں گے ۔ رازق میاں کس کے ہیں اور
... کس ... ہے آپ نے اچھا خیال کیا" "تم کیسی باتیں کرتی
... اس فکر نہ کروں گا تو کون کرے گا" یہ کہہ کر دونوں آنکھوں
... آنسو ڈھلکنے لگے"

... شدہ بیگم ــــــــــــ (عصمت جوالی ۱۹۳۶ء)

"اپنے دونوں صاحبزادوں مسٹر رازق الخیری اور
صادق الخیری کے سلسلے میں بھی میں نے مولانا کی جس شفقت
مطالعہ کیا ہے اس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آئی ۔ رازق
... الی جوانی کی منزل سے کچھ آگے بڑھ گئے ہیں ۔ شادی
... شدہ ہیں ۔ کئی بچوں کے باپ ہیں اور تمام کاروبار کو آج سے
... عرصے سے سنبھالے ہوئے ہیں کہ علامہ نے جو پودا لگایا
... وہ انہیں کی آبیاری سے پروان چڑھا ہے لیکن رازق الخیری
... عمر قابلیت اور معقولیت کے باوجود علامہ اُن کا اسی طرح
... خیال رکھتے تھے جس طرح چھوٹے بچے کا خیال رکھا جاتا ہے
... تو رازق الخیری صاحب انتہائی سعادت مندی کی بدولت
... وقت پر دلچسپ سے دلچسپ صحبت کو چھوڑ کر چلے آتے تھے
... لیکن اگر موٹر کی خرابی یا کسی اور وجہ سے اتفاقاً دیر ہو جاتی

تو بوڑھا اور شفیق باپ اندھیری رات میں مضطرب ہو کر
اِدھر اُدھر ٹہلتا نظر آتا تھا ۔ اور اس طرح رازق میاں کی
تلاش کی جاتی تھی ۔ جس طرح کسی کم سن بچے کے کھو جانے
کی کی جاتی ہے ۔ صادق میاں کی بیماری میں علامہ الخیری
کو میں نے اس طرح مضطرب اور بے چین دیکھا جیسی کہ
انتہائی محبت کرنے والی ماں بے چین ہوتی ہے ۔
بہن راشدہ بیگم اور واجدہ بیگم پر علامہ کے ماشاءاللہ
فدا تھے کیا مجال تھی کہ ان سے کوئی آنکھ بھی ملا سکے" ۔

قاری عباس حسین ــــــــــــ (عصمت جون ۱۹۳۶ء)

"ابا جان جس شفقت اور محبت سے میرے
ساتھ پیش آتے ہیں میرا منہ نہیں کہ اس کا
اعتراف کر سکوں اُن کی شفقت اور محبت نے مجھے
اُمید سے زیادہ مطمئن کیا ۔ ۔ ۔" عصمت ۱۹۳۶ء

خسر

خاتون اکرم ــــــــــــ (خط بنام واجدہ بیگم)

"ایک مرتبہ ایک قریبی عزیز کے یہاں شادی تھی ۔
میرے سر میں درد تھا ۔ اور میں شرکت کے لئے دل سے
تیار تھی ۔ لیکن سسرال کا معاملہ تھا انکار بھی نہیں کیا ۔
اور تیار ہو گئی ۔ کپڑے بدل کر نیچے آئی تو اماں جان انتظار
کر رہی تھیں ۔ چہرہ مضمحل سا تھا ابا جان فوراً سمجھ گئے ۔ مجھکو
بلایا چپکے سے پوچھا ۔
"تم جا رہی ہو بیٹی ؟"
میں نے عرض کیا "جی ہاں"
"طبیعت کیسی ہے ؟" "اچھی ہے"
"نہیں غلط کہہ رہی ہو"
"اچھی ہے ابا جان ۔ کوئی خاص شکایت نہیں
ہے ۔ سر میں معمولی سا درد ہے"
"کیا اس وقت تمہارا دل جانے کو نہیں چاہتا ؟"

"جی نہیں، آپا جان جا رہی ہوں"۔

"اچھا جاؤ کیونکہ تمہارے جانے سے تمہاری اماں جان بہت خوش ہوں گی"۔

ہم لوگ چلے گئے۔ اماں جان چونکہ رات کو جاگ نہیں سکتیں اس لئے شام کو ہی آ گئیں۔ تمام عزیز اقارب رات بھر کا انتظام کر کے آئے تھے ان میں، میں بھی تھی۔ جاڑا کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ ہاتھ نکالنے سے کپکپی بند ہی جاتی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ تانگہ کی آواز آئی۔ اور ابا جان اپنا اوور کوٹ پہنے ہوئے تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر عزیزوں سے (جو دوسرے کمرے میں تھے) باتیں کیں اور مجھ کو آواز دی فرمایا:۔

"میں نے بھائی صاحب سے تمہارے جانے کی اجازت لے لی ہے۔ تم بھی مل لو اور جلدی چلو۔ ڈرائیور گھر پر ملا نہیں۔ تانگہ بھی بہت مشکل سے ملا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ واپس ہو جائے"۔

میں مل ملا کر تانگہ میں بیٹھ گئی۔ آگے ابا جان تھے فرمانے لگے:۔

"کہو استاد اس وقت کیسا نکالا ہے۔ تم تو مایوس ہو چکی ہو گی"

گرمیوں میں نئی دہلی میں ہم بنگلہ لے لیتے تھے۔ پچھلے سال ہم سب لوگ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اسباب تانگہ میں روانہ کر دیا تھا۔ موٹر کھڑی تھی مجھ سے فرمایا۔

"کار کھڑی ہے تم کیوں نہیں بیٹھیں۔۔۔؟"

ابا جان ایک کار میں ماشاء اللہ سب لوگ کس طرح آ سکتے ہیں۔ آپ اور اماں جان تشریف لے جائیں واجد بیگم اور دو ایک بچوں کو لے لیجیے۔ میں تانگہ منگائے لیتی ہوں"۔

"بیٹی تم ایسے کمزور الفاظ زبان سے نکالتی ہو۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میری زندگی میں تمہارے احترام میں ذرہ برابر بھی فرق آ جائے۔ تمہارے اس کہنے سے کہ میں تانگہ میں چلی جاؤں گی مجھ کو کافی اذیت ہوئی۔ تم اپنی اماں جان کے ساتھ کار میں جاؤ۔۔۔ میں تانگہ میں آتا ہوں"

یہ تو دو ایک واقعے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کی بے مثل شفقت اور محبت نے مرحوم باپ کو بھلا دیا تھا۔

اگر کسی روز صبح سلام کے لئے حاضر ہونے میں دیر ہو جاتی تو بجائے ناراض ہونے کے کئی کئی آدمیوں کو بھیج کر پوچھواتے کہ کیسی طبیعت ہے"۔ میں دل ہی دل پریشان ہو کر فوراً جاتی۔ فرماتے:۔

"کچھ کام تو نہیں ہے بیٹی آج صبح سے تم کو دیکھا نہیں خیال ہوا کہ خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں ہے۔ آؤ بیٹھو بیٹی؟"

سسرال والوں کو ناسازی طبع سے واسطہ کیا وہاں تو اعتراضات کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ لیکن ابا جان کے برتاؤ نے سسرال کو بھی میکہ بنا دیا تھا"

آمنہ نازلی ——————— (عصمت اپریل ۱۹۳۶ء)

"ایام طفلی میں میرے والد ماجد شیخ غلام محمد صاحب رلیوے کنڈیکٹر کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ دل چھوٹا تھا اور حوصلہ بہت۔ مگر میرے خسر علامہ راشد الخیری کی شفقت اور محبت نے کچھ اس طرح دل کو موہ لیا تھا کہ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا کہ دنیا میں اُن سے زیادہ رفیق بزرگ پیدا ہی نہیں ہوا۔ میری والدہ جب کبھی دلّی آتیں تو وہ بڑی آؤ بھگت کرتے اور بڑی ہمدردی سے پیش آتے۔

ایک بار میں سخت بیمار پڑی۔ والدہ صاحبہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ جب میں تندرست ہوئی تو انہوں نے ابا جان (میرے خسر) سے کہا کہ وہ مجھے کچھ دن کے لئے اجمیر

...کرنا - یوں کہ چند مہینے پہلے میں اپنے میکے جا چکی تھی اس کے
...بھی ابا جان میری جدائی کو بہت محسوس
...تے - انہوں نے منع کر دیا کہ
"...نی اماں نہیں جا سکتیں - ابھی کچھ پہلے ہو کر
...آئی ہیں اور کمزور بھی اتنی ہیں کہ میں جانے نہیں دے سکتا"
...کہ دوسرے دن جب میری والدہ صاحبہ روانہ ہونے لگیں
...تو ابا جان خود میرے کمرے میں آ گئے اور انہوں نے
...ملازم سے کہا کہ تانگہ واپس کر دو - پھر میری والدہ سے
...مخاطب ہو کر کہا کہ :-
"آج نہیں کل جانا - دلہن بھی تمہارے ساتھ
جائیں گی"

والدہ صاحبہ تو مطمئن ہو گئیں مگر میں نے کہا اتنی جلدی
کیسے تیاری ہو سکتی ہے - فرمایا "کچھ بھی ہو تم زبیدہ بیگم کے
ساتھ جاؤ - وہ ماں ہیں ان کی دعائیں لو پھولو پھلو گی —
زبیدہ بیگم میرے گھر سے ناراض نہیں جا سکتیں - جاؤ
تیاری کرو"

شادی کے بعد ابا جان کی باتیں ان کی نصیحتیں
یہ سب ایک مشفق ماں سے کم نہ تھیں - وہ کئی کئی
گھنٹے تنہائی میں مجھ سے باتیں کرتے - میرے شوہر کے
گھر کے دوسرے لوگوں کے متعلق ایسی باتیں کرتے جو
شاید نہیں ایک فکر اندیش ماں ہی اپنی بیٹی کو بتا سکتی ہے
وہ فرماتے :-

"دیکھو اپنی اماں جان (خوشدامن) کے پاس بیٹھا کرو -
ان سے باتیں کیا کرو - ان سے پوچھا کرو اماں جان چاول کیا
بھاؤ آ رہے ہیں ؟ دالیں کس حساب سے ملتی ہیں - لال گیہوں
اچھے ہوتے ہیں یا سفید - لائیے آپ کی پٹاری مانجھ دوں - سر
میں تیل ڈال دوں - کوئی کپڑا رنگنا ہو تو رنگ دوں - لحاف کی
مغزی مجھے دے دیجئے ٹانک دوں گی وغیرہ وغیرہ -"

اور شوہر سے تعلقات استوار کرنے کے لئے بہت سی
باتیں بتاتے - مجھ سے فرماتے :-

"دیکھو جب رازق میاں آیا کریں تو تم سعد کو گود میں اٹھا
لیا کرو - اس کا منہ دھلا دیا کرو"

شاید وہ یہ سب باتیں اس لئے کرتے تھے کہ میں اپنی
فطری جھجک سے نقصان نہ اٹھاؤں - ان کی دوربین اور
دور رس نگاہیں میرے مستقبل پر تھیں - وہ مردم شناس
اور موقع شناس ہونے کے علاوہ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے -

محبت اور وابستگی کی اس شدت کے ساتھ ان کی نظریں
اپنے بچوں کے مستقبل پر گڑی رہتی تھیں - چھوٹی چھوٹی باتیں
بڑی اہمیت رکھتی ہیں - وہ ان باتوں کو نظر میں رکھتے تھے
اور موقع محل پر تنبیہ فرماتے تھے میری خوشدامن ہر مہینے مجھے
ماہانہ خرچ اپنے ہاتھ سے عطا فرماتی تھیں اور میری ہمت نہ
ہوتی تھی کہ میں اس کے علاوہ شوہر سے بھی کچھ لے لوں -
ابا جان دس پندرہ روز بعد رازق صاحب کے حساب کتاب کا
رجسٹر دیکھتے تھے اور آمدنی اور خرچ پر کڑی نظر رکھتے تھے -
حالانکہ رازق صاحب کا حساب کتاب انہوں نے بالکل الگ
کر دیا تھا - ایک بار جب سعد میاں نے حسب معمول اپنے ابا کا
رجسٹر ابا جان کو لا کر دیا تو اس میں ایک جگہ لکھا تھا "بیگم صاحبہ
۵۰ روپے" ابا جان مجھے بلا کر خاموشی سے دوسرے کمرے
میں لے گئے اور پوچھا "تم نے اپنے ماہانہ خرچ کے علاوہ جو
تمہاری اماں جان تمہیں دیتی ہیں رازق میاں سے پچاس روپے
مزید لئے تھے"

میں نے کہا "جی ہاں" "کیوں ؟"

"عید آخر مہینے میں آئی تھی مجھے بچوں کے کپڑوں کے لئے
ضرورت تھی"

" مگر تمہیں شروع سال سے خیال کیوں نہیں آیا کہ عید بھی آئے گی اور کپڑے بھی بنیں گے علاوہ اُس خرچ کے جو تمہاری اماں جان تمہیں دیتی ہیں تم نے رازق میاں سے ۲۰ روپے کیوں لئے؟ اُن کے پاس جو پیسہ ہے وہ میرا ہے۔ تم نے مجھ سے یا اپنی اماں جان سے اجازت لی؟" میں خاموش تھی۔

اور ایک بار جب اُنہیں معلوم ہوا کہ اجمیر سے دلی تک سیکنڈ کلاس کا ڈبہ ریزرو کروا کر رازق صاحب مجھے لائے ہیں تو اُنہوں نے مجھ سے فرمایا "غضب خدا کا ابھی سے یہ اسراف" لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس سلسلہ میں میرا کوئی دخل نہیں ہے تو وہ خاموش ہو گئے۔

ایمان داری دیانت داری اور خلوص اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ واجدہ بیگم کو سخت تاکید تھی کہ وہ اپنی ساس کا ماہانہ خرچ بھیجنے میں ایک دو دن کی بھی دیر نہ کریں۔ اگر کسی وجہ سے وہ ایک دن دیر ہو جاتی تو وہ بہت ناراض ہوتے کہ منی آرڈر اب تک کیوں نہیں گیا؟

میری شادی پر ابا جان نے جو مضمون لکھا تھا اس کا آخری فقرہ یہ تھا:۔

"جو پودا لگایا ہے خدا کرے رازق دُلہن کے ہاتھوں پھولے پھلے اور بار آور ہو"

مئی ۲۹ء میں میرے نام سے ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا "چین میں تعلیم نسواں کی کمی"

شادی کے چند روز بعد ایک دن ابا جان اوپر میرے کمرے میں تشریف لائے۔ قلم دوات اور کاغذ منگایا۔ مجھ سے لکھنے کو کہا وہ بولتے گئے میں لکھتی رہی۔ مضمون کے خاتمہ پر اُنہوں نے فرمایا "لکھو آمنہ رازق بیگم" میں نے تجسس سے اُن کی جانب دیکھا "لکھو" اُنہوں نے فرمایا جیسے گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔ میں نے بڑی ناگواری کے ساتھ اپنا نام لکھ دیا۔ اور بڑی

دیر تک سوچتی رہی کتنی بُری بات ہے۔ کتنی خراب بات ہے۔ مجھے اُس وقت اپنے سُسر کی یہ بات ذرا پسند نہیں آئی۔ اور میں نے پھر سوچا کہ یہ اتنے بڑے بزرگ آخر میرا نام لکھنے سے کیا فائدہ؟

کوششیں رائیگاں نہیں جاتیں۔ دماغ اور دل نے راہ ہموار کی۔ سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ اور قلم رک رک کر چلنے لگا۔ چھ سال بعد میرا پہلا خاکہ "دادی اور پوتی" جنوری ۳۵ء کے ہمایوں میں عصمت سے نقل کیا گیا تو میرا دل خوشی سے اُچھل گیا۔ مگر ابا جان بستر مرگ پر زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے........

اے محسن! میں نے رسالہ اپنے سینہ پر رکھ لیا۔ اور بے اختیار رو پڑی"

آمنہ نازلی ——————— ۷ اپریل ۶۳ء

" دامادوں کے ساتھ برتاؤ بیٹوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ اگر تھا تو یہ کہ ان کا خیال زیادہ کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ عبدالغفور صاحب اور سردار خاں صاحب بیٹوں سے زیادہ اُن کے عاشق تھے..

.... علامہ کے گھر میں بیوی اور بیٹیوں کا پورا اقتدار تھا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ بہو کے مرتبہ یا ان کے وقار میں کسی قسم کا فرق آتا ہو۔ رازق میاں کی پہلی بیوی خاتون اکرم مرحومہ کا ماتم مولوی صاحب نے مرتے دم تک کیا رازق میاں کی دلہن آمنہ نازلی صاحبہ مولانا کے دل کا نور اور آنکھوں کا سرور تھیں"

قاری محمد عباس حسین ——————— (عصمت مارچ ۳۶ء)

" ان جیسے خسر اس زمانہ میں کسے نصیب ہو سکتے ہیں۔ خاتون سے انہیں محبت نہیں عشق تھا۔ آمنہ کی خوشی کا ان سے زیادہ گھر بھر میں کسی کو خیال نہ تھا۔ آمنہ ایک مرت

گیارہ بجے ہاؤس ماسٹر صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ دریافت کیا ہاؤس پر کون ہے۔ بھرائی آواز سن کر بندے سے فرمایا۔

" اسے میری بیٹی! تو ہاؤس بعد میرے پاس آ "

وہ قریب پہنچیں تو سر پر ہاتھ رکھا پیار کیا اور فرمایا

" بیٹے صادق کی بیماری میں جو تیمارداری کی ہے وہ احسان ہے کبھی نہیں بھول سکتا بیٹی اب تم جا کر سوؤ "

علالت کے دنوں میں بھائی صاحب کی موجودگی میں ابا جان نے فرمایا آپ نے میرے تمام عیوب اُن کے سامنے بیان فرمائے۔ اور خیال نہ کیا کہ وہ داماد ہیں"

فرمایا "ہے داماد سمجھتا تو نہ کہتا۔ وہ تو میرا بیٹا ہے"

(وداع راشد)

دادا - نانا

" سعد میاں اب آٹھویں جماعت میں پڑھ رہے ہیں۔ ابا جان کا ارمان تھا کہ ان کے سامنے انٹرنس کر لیں۔ اُن کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے معاملہ میں ابا جان نے کبھی کسی کی پرواہ نہیں کی "

صادق الخیری ——— (عصمت اپریل ۳۶ء)

" مرحوم کو سعد الخیری سے اپنے بیٹے رازق الخیری صاحب سے زیادہ محبت تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی والدہ خاتون اکرم مرحومہ کے انتقال کے بعد اس بچہ کو دادا دادی اور پھوپھی نے پالا اور اس کی تربیت کی اس کے ایک پھانس بھی لگ جاتی تو علامہ مرحوم حد درجہ بے چین ہو جاتے تھے۔ سعد میاں کے علاوہ بڑی صاحبزادی کے لڑکے شاہ میاں سے بھی کافی انسیت تھی۔ علامہ اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں میں بیٹھ کر حد سے زیادہ خوش و خرم نظر آتے تھے۔ میرے نزدیک تو مولانا کی یہ خصوصیت سب سے زیادہ قابل ذکر ہے کہ ان کا برتاؤ عزیزوں اور چھوٹوں کے ساتھ کیسا تھا "

قاضی محمد عباس حسین ——— عصمت ۱۹۳۶ء

" میرے بڑے بچے شاہ میاں نے میٹرک کر لیا تو میرا اور شیخ صاحب کا ارادہ ہوا کہ اس کو علی گڑھ بھیجیں باوجود اس قدر محبت اور شفقت کے ابا جان کا رعب اس قدر تھا کہ اپنے بچوں کے متعلق کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی آخر داخلے کی تاریخ آ گئی اور شاہ میاں دہلی میں داخل ہو گئے ایک ہفتہ بعد شیخ صاحب سے فرمایا "میاں عبدالغفور میں سمجھ رہا تھا۔ راشدہ بیگم کی تجویز ہو گی کہ شاہ کو میٹرک کے بعد علی گڑھ بھیجوں کیوں نہ بھیجا کس نے منع کیا تھا" شیخ صاحب نے ہنس کر کہا "گفتگو ضرور ہوئی تھی بغیر آپ کی اجازت کے کیسے جا سکتا تھا۔ پھر فرمایا "میاں صادق جو خدا رکھے بی اے میں پہنچ گئے بہتیرے فرائے اور ترڑ پھڑائے کہ ایم اے علی گڑھ سے کروں مگر میں نے پسند نہ کیا جس قدر میرے سامنے تعلیم ضروری ہے اسی قدر بچوں کی نگرانی بھی بچوں کا اپنی آنکھ سے اوجھل ہونا میں پسند نہیں کرتا۔ جب صادق کو الگ نہ کیا تو شاہ کو کیسے کر سکتا ہوں" ایک موقعہ پر میں نے ابا جان سے کہا "آپ نے اپنی لڑکیوں کا فکر تو بہت جا۔ کیا مگر ان لڑکیوں کا فکر نہیں ہے" میں کہہ کر اور وہ سُن کر خاموش ہو گئے پانچ منٹ سکوت کے بعد فرمایا "ہاں کیا کہا تم نے پھر دہرانا" میں نے خاموشی سے نگاہ نیچی کر لی۔ فرمانے لگے "تمہارا فکر کرنا فطری تعلق ہے۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا مجھ کو فکر نہیں۔ میں تمہارے سامنے بچیوں کا ذکر کروں تو سمجھو گی ابا کو فکر ہے۔ اپنی بچیوں کا فکر کرنے والی صرف میری ذات تھی یہ بچیاں بھی بچی کی بچیاں ہیں ان کا فکر کرنے والے دو ہیں۔ میں اور تمہاری ماں ہم دونوں کی زندگی میں تمہارا فکر کرنا بے وقوفی ہے جس وقت میری سمجھ میں لڑکے آ جائیں گے معاملہ طے کر دوں گا اگر تم کو نا گوار ہو گی تو اطلاع دے دوں گا۔ میں تمہارے مشورہ کا بھی انتظار نہ کروں گا تمہارا انتخاب چونکہ پہلا تھا اس وجہ سے چار سال لگ گئے۔

ماہ صیام کے انتخاب میں مشکل سے ڈیڑھ سال لگا۔ اگر زندگی ہے تو ان کے انتخاب میں اتنا ہی وقت نہ لگے گا "

راشدہ بیگم ——————— (عصمت راشد الخیری نمبر)

" جب کبھی ہم کو زیادہ دن گنگا پور رہتے گزر جاتے تو آپ بجائے امی جان کے ہم بہنوں کے نام خط تحریر کرتے خط کو پڑھتے ہی ہمارا دل بلیوں خوشی سے اچھلتا ہماری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی اور ہم بہت جلد حاضر خدمت ہو جاتے۔ ابا جان آپ کی باتوں کو یاد کرکے آپ کی یاد سے کلیجہ پھٹتا دل مچلتا آنکھیں روتی ہیں۔ اور رو رہی ہیں۔ اور معلوم کب تک روئیں گی۔ ابا جان آپ نے ہمیں اتنا عیش کرا دیا۔ اتنی سیریں کرا دیں۔ تماشے دکھلائے تفریح کرا دی کہ طبیعت بھر گئی۔ خواہش نہیں کہ سیریں کریں تمنا نہیں کہ تماشے دیکھیں "

رفیعہ نازلی (منجھلی نواسی) ——— (عصمت مارچ ۳۶ء)

دوست

" مرحوم دوستوں سے میل جول میں مجسم خلاق تھے مگر دوستی کی وجہ سے اپنے کسی اصول یا اپنی رائے کو بدلتے نہ تھے "

سر عبدالقادر ——————— (عصمت جولائی ۳۶ء)

" دوستوں کی تکالیف اور آلام کا ان کو پورا احساس تھا اور جب ان میں سے کوئی کسی ناگوار حادثہ کی وجہ سے رنجیدہ نظر آتا تھا تو علامہ مرحوم اپنے وقت اور توجہ کو اس کی تسکین قلب کے لئے بے دریغ صرف کرتے تھے "

مرزا محمد سعید ——————— (عصمت اپریل ۳۶ء)

" مولانا کو دوستوں کی تعداد بڑھانے کا شوق نہ تھا۔ ایک طرف تو ان کی یہ حالت تھی کہ گنے چنے دو چار احباب کے درمیان بیٹھے ہیں یکایک کوئی اجنبی آگیا اور مولانا نے لیک کہی نہ دو اور اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ دوسری طرف دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا کہ رمضان کا مہینہ ہے جمعہ کی شام ہے سینکڑوں عورت مرد مولانا کے پاس سے کھانا لے جا رہے ہیں۔ ایک بڈھے کو مولانا نے اپنے ہاتھ سے کھانا لاکر دیا۔ اور پھر دور تک اس سے باتیں کرتے چلے گئے۔ یہ مولانا کے بچپن کے یار تھے۔ لنگوٹیے یار۔ بچپن میں انسان ہر درجہ اور ہر حیثیت کے بچوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے مگر بڑا ہو کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔

مولانا نے جوانی میں ورزش کی تھی۔ ایک پہلوان ان کے ہم عمر ابھی مرے ہیں۔ ان سے بس یہی دوستی تھی کہ آمنا سامنا ہوا اور مولانا کا چہرہ کھل گیا۔ آپ سینہ آگے ابھارے جاتے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں۔ قریب پہنچے اور پہلوان صاحب کو گلے لگا لیا۔ مزاج پرسی کی۔ بچوں کو پوچھا ایک آدھ ہنسی کی بات اور رخصت۔۔۔۔

بے پڑھے لکھے تین ہی دوستوں کا مجھے علم تھا۔ مولانا ان سے اس طرح ملتے تھے جیسے خود بھی بے پڑھے لکھے ہیں عبدالعزیز کے اس سوال سے کہ تم نے قرآن تو پڑھا ہوگا صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوست انہیں اپنے سے صرف روپیہ پیسے میں اونچا سمجھتے تھے اور یہ ایسا فرق تھا جسے مولانا چھپا نہ سکتے تھے۔ ورنہ مولانا نے کبھی ان پر اپنی اہمیت جتانے کی کوشش نہیں کی۔ بالکل اسی طرح ملا کئے جس طرح بچپن میں ملتے تھے۔

۔۔۔۔ ہم آپس میں ایک دوسرے سے روٹھ جاتے تھے۔ مگر مولانا روٹھنا جانتے ہی نہ تھے۔ ایک دفعہ میں کسی بات پر مولانا سے بگڑ گیا اور شاید مہینہ ڈیڑھ مہینہ مولانا کی اور میری بات چیت بند رہی۔ اس دوران میں میرے چھوٹے بھائی کی شادی ٹھہری۔ مولانا سے میں خفا تھا بھلا انہیں بلاوا کیوں دیتا۔ لیکن ٹھیک بارات کی روانگی کے وقت مولانا خود آگئے اور مجھے اس سادگی اور بے تکلفی سے

یانی پانی کر دیا۔"
(... صدو احمدی ———— رسالہ راشد الخیری نمبر)

... مولوی صاحب عجیب طبیعت لے کر دنیا میں آئے
تھے ... سوزی۔ ہمدردی۔ غمگساری ان کی گھٹی میں پڑی
ہوئی تھی ... میری لڑکی دلّی سے اجمیر پور میں آب سے وعدہ
ملیں ... گئی۔ اس کی علالت کی اطلاع بذریعہ تار مجھے ملی اور
... بعد مولوی صاحب کو بھی بچی کی علالت کی
اطلاع ہو گئی۔ فوراً آئے۔ حالات دریافت کئے۔ پوچھا
... جاؤ گے۔ میں نے کہا شام کی گاڑی سے جاؤں گا لیکن
رات کا وقت ہے۔ زنانی سواریاں ساتھ ہیں۔ راستہ میں
... مگر ریل بھی بدلنی پڑتی ہے۔ کیا رائے ہے صبح کی گاڑی
سے چلا جاؤں۔ بولے "میاں دیوانے ہوئے ہو۔ معلوم
... ہی خدا جانے کیا صورت ہو۔ بچی آپ لوگوں کا
راستہ تک رہی ہوگی۔ رات ہی کی گاڑی سے جاؤ۔" یہ کہہ کر
چلے گئے۔ مغرب کے وقت پھر دروازہ پر کھڑے ہوئے
ہیں۔ دیکھنے آئے تھے کہ جا رہے ہو یا نہیں۔ تھوڑی دیر
بعد تانگے آ گئے۔ زنانی سواریاں بیٹھ چکی ہیں اور کھڑے
ہوئے ہیں۔ جب میں تانگے میں بیٹھنے کے لئے سلام علیک
کر کے آگے بڑھا تو میرا ہاتھ پکڑ کر الگ لے گئے کہنے لگے
"جاتے ہی خیریت کا تار دینا" اور چپکے سے کہا "کچھ روپیہ پیسہ
کی ضرورت ہے؟" میں نے کہا "الحمد للہ نہیں ہے۔"

مولانا کے ان لفظوں سے دل باغ باغ ہو گیا
اب جب کبھی مولانا کی وہ بات یاد آتی ہے۔ تو دل کہتا
ہے۔ اب وہ لوگ کہاں۔ وہ خمیریں ختم ہو گئے جن سے
ویسی صورتیں بنا کرتی تھیں۔"

خواجہ فضل احمد رشید دہلوی ———— (عصمت نومبر ۱۹۳۶ء)

ب۔ عادات وخصائل

شریف النفسی "مولانا بزرگ بھی تھے۔ دوست بھی تھے
شفیق بھی تھے۔ غرض سب کچھ تھے۔
لیکن اس سب کچھ سے زیادہ جو کچھ تھے وہ میرے نزدیک یہ
کہ صدرجہ شریف النفس انسان تھے۔ مجھے پہلے وقتوں کا
حال معلوم نہیں۔ ہمارے زمانے کا حال تو یہی ہے کہ لوگ
قابل بھی ہوتے ہیں فاضل بھی ہوتے ہیں۔ شاید دوست
بھی ہوتے ہیں۔ ظاہری برتاؤ بہت اُجلا ہوتا ہے۔ الفاظ
بھی شاندار استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن اکثر اوقات
یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالی لفافہ ہے۔ اندر کچھ نہیں ہے زیادہ
ملنے جلنے سے تھوڑے ہی دنوں میں اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے
کہ چلتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ لیکن مولانا کی حالت ہی
بالکل مختلف تھی۔ دور کے ڈھول سہانے یہ ہماری مشہور
مثل ہے۔ قریب جائیے تو آواز کی کرختگی کانوں کے پردے
پھاڑنے لگتی ہے۔ لیکن میں نے علامہ کو بہت قریب سے دیکھا
جوں جوں ان سے تعلقات بڑھتے گئے۔ دل میں ان کی وقعت
بڑھتی گئی۔ میرے نزدیک کسی انسان کی عظمت کی دلیل یہی
ہے کہ اس کے جتنے قریب ہوتے جاؤ اس کی وقعت بڑھتی
جائے۔ اس معیار پر پرکھنے کے بعد میں کہتا ہوں کہ مولانا ایک
جلیل القدر انسان تھے مرحوم کی عظمت کی دوسری دلیل میرے
سامنے یہ ہے کہ مولانا کی خانگی زندگی نہایت درجہ کامیاب تھی"

قاری عباس حسین ———— عصمت ۱۹۳۶ء

"جن لوگوں کو قریب سے علامہ مرحوم کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انتہا درجہ خوش خلق بذلہ سنج ظفسند اور دلچسپ انسان تھے۔ وہ دوستوں کے حد درجہ دوست اوران کے لئے ہر قسم کے ایثار پر آمادہ چھوٹوں کے حد درجہ شفیق اور سرپرست تھے۔"

قاری عباس حسین ————— (عصمت ۱۹۳۶ء)

"برسوں کی رفاقت میں نے علامہ کے منہ سے کبھی کوئی رکیک یا نازیبا لفظ نہیں سُنا۔ اور نہ میں نے انہیں کبھی غصہ کی حالت میں دیکھا۔ درشتی یا تلخی انہیں چھو نہیں گئی تھی مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے انہیں بُرائی سے یاد کیا ہو۔ وہ اپنے دَور کے ایک شریف ترین انسان تھے۔"

ضیاالدین احمد برنی ————— (عظمت رفتہ)

نسخہ کیوں آئے مجموعہ جامعیت کا

کہ بہترین نمونہ تھا آدمیت کا

احسن مارہروی ————— (عصمت مارچ ۱۹۳۶ء)

آدمیت کا لفظ سُنتے تھے   اُس کا مفہوم تم بتا کے چلے

ڈاکٹر سعید بریلوی ————— (عصمت مارچ ۱۹۳۶ء)

ہمدردی

"تین یا پونے تین سال ہوئے ہوں گے میری بڑی نند کی دو بڑی بچیاں دلّی آئی ہوئی تھیں ایک دن شام کو انہوں نے مجھ سے سینما چلنے کی خواہش کی تو میں نے کہا: ابّا جان سے اجازت لے لو۔ انھوں نے جاکر اماں جان سے کہا۔ ابّا جان نے مجھے بلایا اور فرمایا "بچیوں کو سینما دکھا لاؤ" وقت تنگ تھا سب سے قریب مجھلی والوں کا بائسکوپ تھا وہیں چلے گئے۔ جب سینما ختم ہوگیا اور سب عورتیں چلی گئیں اور میں اُٹھنے لگی تو برابر کی کرسی پر ایک سونے کا کڑا پڑا ہوا دیکھا۔ خیال ہوا کہ جو عورت دروازے پر کھڑی ہوتی ہے اسے دے دوں گی۔ مگر پھر خیال ہوا کہ ممکن ہے منیجر کو نہ دے اور خود ہی رکھ لے۔ کڑا تو میں نے اُٹھا لیا مگر اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں کیونکہ کوئی بڑا آدمی بھی ساتھ نہ تھا۔ آخر یہ طے کیا کہ ابّا جان ہی اس مشکل کو حل کریں گے۔ اُنہیں واقعہ سُنایا تو وہ اُسی وقت اچکن پہن بائسکوپ کے منیجر سے ملے اور اس سے فرمایا۔ "کوئی شخص ڈھونڈتا آئے تو اسے لے کر فوراً میرے پاس آؤ" ساڑھے دس بجے کے قریب واپس آئے۔ اور بار بار یہی فرماتے رہے "خدا کرے اس بیچاری کا شوہر یا باپ آجائے نہ معلوم کس مصیبت سے کڑے بنوائے ہوں گے۔ بے چاری رو رہی ہو گی۔ ساس نندیں ہوں گی تو وہ طعنے دے رہی ہوں گی کہ اور جاؤ بائسکوپ میں" گیارہ بجے کے بعد بائسکوپ کا منیجر اور اس کے ساتھ دو اور شخص آئے تو فرمایا۔ "اگر کڑا ہے تو اس کے ساتھ کا دُوسرا کڑا لائیے" اسی وقت ایک شخص دوڑا ہوا گیا۔ تو دوسرے لالہ صاحب سے معلوم ہوا کہ ان کی بہو کا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس لڑکی کا شوہر کڑا لے کر آ گیا۔ دونوں کڑے ایک ساتھ کے تھے لڑکی کے شوہر سے فرمایا" اب گھر جاکر بیوی پر خفا مت ہونا اس کی ندامت اور غلطی کا احساس ہی کافی ہے" پھر بڑے لالہ صاحب کو کڑے دے کر رخصت کر دیا۔ اس وقت ان کی خوشی کی جو کیفیت تھی بیان کرنی مشکل ہے۔ صبح مجھ سے فرمایا" بیٹی تم نے بہت اچھا کام کیا۔ اب تم خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم سے ایسا اچھا کام لیا۔ اور پھر اسی دن ان کے حکم کے بموجب دس غریبوں کو کھانا کھلایا تو واقعی مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔"

"نومبر کے پہلے ہفتہ میں بیماری سے چھ سات دن پہلے صبح جو باہر گئے تو معلوم ہوا کہ ایک غریب بڑھے نائی کا جوان لڑکا رات ہی کو گزر گیا ہے۔ اور کفن کو ایک

...ک نہیں ہے۔ لوگ اُن کی خدا ترس طبیعت سے
...بے واقف تھے۔ جو تکلیف اور جو مصیبت پڑتی تھی
اُن سے رو رو کر بیان کرتے۔ تھوڑی سی دیر میں تمام
...بیزوں کا انتظام کر کے قیمت کو اٹھوا دیا۔ دو تین صاحبوں
نے کہا بھی کہ محلے سے چندہ کر کے دے دیا جائے۔ لیکن
ابا جان کے ضمیر نے اسے قبول نہ کیا۔ کسی چیز کے متعلق
...نائی نے اُن سے کہا تھا اس کے لئے وہ دوسروں
کو تکلیف دیتے"

"...... تانگے کے برابر اور تانگہ تھا جس میں ایک
برقعہ پوش خاتون اور ان کا تین سال کا بچہ بیٹھا تھا۔
سامنے سے دو تین موٹریں اور تانگے اور ایک
موٹر سائیکل آ رہی تھی جس پر ایک انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ وہ
شراب کے نشے میں چور ہو رہا تھا۔ موٹر سائیکل کی رفتار
تیز رکھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان خاتون کے تانگے سے بہت
زور سے ٹکر ہوئی اور ان کا بچہ جو برابر میں بیٹھا تھا جھٹکے
سے گرا۔ ماں نے سنبھل کر جلدی سے ہاتھ نکالے۔ لیکن
اس سے پہلے بچہ ابا جان کے مقدس ہاتھوں میں تھا۔
اور وہ خود سڑک پر گرے ہوئے تھے۔ ماں نے بچے کو لے
لیا ملازم نے جو ساتھ تھا لپک کر ابا جان کو اٹھایا۔ ہاتھ
میں بہت چوٹ آئی تھی۔ ان خاتون نے بہت شکریہ
ادا کیا اور کہا :-

" آپ میرے ساتھ ہسپتال چلئے ورنہ ڈاکٹر وغیرہ
کا جو کچھ خرچ ہو وہ قبول فرمائیے"
خرچ کے نام پر ابا جان مسکرائے
ملازم نے چپکے سے کہا" آپ جانتی نہیں یہ
مولانا راشد الخیری ہیں"
ابا جان کا نام سن کر وہ خاتون بہت نادم ہوئیں
کہنے لگیں :-

" آپ تو ہمارے محسن ہیں۔ اور آپ کے اس زبردست
احسان کو تو میں ساری عمر نہ بھولوں گی"

"تکلیف زیادہ ہو رہی تھی فوراً ہی ڈاکٹر کے یہاں
چلے گئے پہنچے کی ہڈی اتر گئی تھی۔ ڈاکٹر نے ہڈی چڑھا کر
پٹی باندھ دی۔ گھر آئے ہم لوگوں نے پوچھا تو فرمایا۔
" کچھ نہیں، پاؤں پھسل گیا تھا۔"

آمنہ نازلی ———— (عصمت اپریل سنہ)

" ایک دفعہ وہ ڈرنگ(?) سے واپس ہو رہے تھے۔
راستے میں ندی پار کرنی پڑتی تھی۔ جب وہ کنارے پر پہنچے
تو موسم بڑا خراب تھا۔ برسات کی پریشان کن رات تھی۔
بارش بھی ہو رہی تھی۔ اور رات بھی اندھیری ہو چلی تھی۔
ندی کو پار کرنے کے لئے جب وہ کرسی پر بیٹھنے والے تھے
تو انہوں نے کسی کے رونے کی آواز سنی تارچ جلا کر
دیکھا تو تھوڑی دور ایک لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی
کرسی پر سے اتر گئے اور اس کے پاس جا کر پیار سے رونے
کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا میں یہاں اپنی ماں کے پاس آئی
تھی۔ میری ساس اور میاں بڑا ظالم ہے۔ انہوں نے کہہ
دیا تھا کہ شام تک واپس آ جانا۔ اب میں آئی تو ندی چڑھاؤ
پر ہے اور بغیر کرسی کے میں کشتی تک نہیں جا سکتی لیکن میرے
پاس پیسے نہیں۔ ساس اب گھر میں نہیں گھسنے دیگی" ابا جان
نے فرمایا میں تجھے پار پہنچا دیتا ہوں۔ پھر تو چلی جائے گی"
تو اس نے کہا" ہاں مگر وہ مارے گا"
اس پر انہوں نے فرمایا" اگر میں گھر تک پہنچا
آؤں تب تو کچھ نہ کہے گا؟"
وہ چپ ہو رہی کیونکہ اسے اس کا یقین ہی
نہ آتا تھا۔ ابا جان نے ندی پار کر کے اسے اس کے

گھونٹ پہنچا دیا۔ اور اس کی ساس اور میاں کو سمجھا بجھا کر چلے آئے۔"

واجدہ بیگم خیری ———— (عصمت جولائی ۱۹۳۶ء)

"۲۴ نومبر کو جرات تھی۔ دوپہر کو ان کے چچا زاد بھائی مولانا عبدالغفار صاحب الخیری تشریف لائے۔ ان کے ایک بیٹے کے لئے کسی امتحان کے سلسلہ میں داخلے کے فارم پر مجسٹریٹ درجہ اوّل کی تصدیق کی ضرورت تھی اور فقط ایک دن باقی رہا تھا۔ سُنا اور فرمایا "اچھا" میں اس وقت کسی کام کو کار میں گیا ہوا تھا۔ اس لئے تانگہ ہی میں بھائی اور بھتیجے کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے جب دستخط کروا کر واپس ہوئے اور تانگے میں سے اُترنے لگے اور چچا صاحب نے مصافحہ کیا ہاتھ گرم تھا انہوں نے کہا "ارے بھائی آپ کو تو بخار ہے" فرمایا "مگر اس بچے کا کام زیادہ ضروری تھا"

یہ واقعہ ۵ فروری کو ان بزرگ نے رو رو کر بیان فرمایا۔" ———— (دوامِ راشدہ)

"میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھ بے کس بے وارث کے ساتھ کس قدر ہمدردی و محبت فرماتے تھے۔ ان ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ یہاں جے پور میں بھی مجھ بدنصیب کا ٹھکانہ ہو گیا دلّی میں میری داستان سُن کر خود مولوی صغیر حسن صاحب سے گفتگو کر کے ملازمت دلوائی تھی پریشانی میں مولانا صاحب کو لکھا کرتی تھی اور وقتاً فوقتاً جب موقعہ ملتا تھا تو حاضر خدمت ہوتی تھی۔"

ام۔ بیغم جے پور (عصمت مارچ ۱۹۳۶ء)

"میں اس واقعہ کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرا بچہ کنوئیں میں ڈوب کر مرا تو اس وقت سب سے پہلے علامہ موصوف ہی تھے جو میرے دل پر مرہم رکھنے کے لئے پہنچے اور انہوں نے ایک نوحہ لکھا جسے میری بیوی اب بھی اس وقت سے ہمیشہ پڑھتی ہیں جب انہیں بچہ یاد آتا ہے"

قاری عباس حسین ———— عصمت

"دوسروں کی تکلیف ان کے دل کا درد بن جاتی۔ بارہا انہیں دیکھا کہ کسی کی پریشانی یا دکھ بیماری کو [illegible] اور بے چین۔ اب اس وقت تک انہیں اطمینان نہ تھا جب تک بچشم خود اسے نہ دیکھ لیں اور حتی الامکان کام نہ کریں۔ دو سال پہلے کا ذکر ہے کہ مولانا کے ایک نسبتی کا پوتا بیمار پڑا۔ یہ صبح و شام اس بچے کی خبر خود جایا کرتے تھے۔ ایک دن میں ان کے ہاں پہنچا ہوں کہ مولانا صحن میں ٹہل رہے ہیں۔ اور میاں کو تاکید کر رہے ہیں کہ "جلدی جا کر نئی دہلی سے ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لاؤ" رات کے ۹ بج چکے تھے۔ کڑا جاڑا پڑ رہا تھا۔ مجھ سے کہا "یہ تو جا رہے ہیں تم تمہاری چچی موجود ہیں" میں نے کہا "میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا ہوں" فرمایا اگر جاتے ہو تو کمبل لیتے جاؤ سردی زیادہ ہے" تانگہ میں اپنے سامنے سوار کر کے روانہ کیا۔ واپسی گھنٹہ بھر بعد ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ مولانا گھر والوں کو طرح طرح سے سمجھا رہے ہیں۔ ان کی ڈھارس بندھا رہے ہیں۔ عورتوں کا رونا اور ہر دکھی آنکھ کا آنسو کسی طرح نہیں [illegible] ڈاکٹر کو دیکھ کر سب کو کچھ آس بندھی۔ چار سال کا بچہ رہا تھا۔ خناق اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بھالا منہ کھول کر صاف کیا دوا لگائی اور کہا بس ہو جائے گا۔ چلنے کو ہوا تو مولانا نے باہر آ کر کہا "فیس چاہیے" ڈاکٹر نے کہا "فیس کی ضرورت نہیں۔ ذرا دیر میں بچہ تو ختم ہو چکا" ابھی فقرہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ان کی [illegible] نے بچے کی موت کا اعلان کر دیا۔

مولانا جلدی سے اندر چلے گئے اور خدا جانے کب تک
بچے سب کو بھی تکلیف کا احساس رہے۔"

سلطان محمد دہلوی ——— رسالہ ساقی راشد الخیری نمبر

"شمس کو چیختے ہوئے دیکھنا جسے آرام تھا
[illegible] دوں کی آگ میں جل جانا۔ جس کا کام تھا۔"

[illegible] دہلوی ——— عصمت مارچ ۱۹۳۶ء

"بیویاں اور اُن کی بیٹی مولانا کی تربیت گاہ بنات
[illegible] تھے۔ بڑھیا بچیوں کو ان کے گھروں سے لانے کا
کام کرتی تھی اور بچے کے سپرد ڈیوڑھی والی تھے۔ بڑے ہونے
[illegible] تو بیگم راشد الخیری کو ساتھ لے کر اس کے تنگ و تاریک
مکان میں جا بیٹھے اور پوری رات مرنے والے کے سرہانے
[illegible] دوں میں کاٹ دی۔"

ملا واحدی ——— رسالہ ساقی راشد الخیری نمبر

"آج سے دو سال قبل جبکہ میں محمد الیاس دہلی حاضر ہوا
تھا۔ اور دو چار مرتبہ ملاقات سے سرفراز ہوا تھا۔ اور مولانا
نے میرے حال پر جو شفقت فرمائی تھی وہ کبھی فراموش نہیں
کر سکتا۔"

محمد عالم صدیقی مولوی فاضل ——— بنات اپریل ۱۹۳۶ء

"مولانا کے انتقال کا جس قدر صدمہ میرے قلب
فسردہ کو پہنچا ہے۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میرے اور ان کے
مراسم بہت دیرینہ تھے۔ ۱۹۳۳ء میں جب میں بیمار پڑا تو مولانا
اکثر میرے پاس تشریف لاتے رہے۔ اور میری دلجوئی
فرماتے رہے۔ ان کے خلوص اور سچی رفاقت کا اثر کبھی بھلایا
نہیں جا سکتا۔"

مرزا عبدالرحمٰن بیگ ایم اے ——— عصمت مارچ ۱۹۳۶ء

خوشامد اور نمود سے نفرت

"مولانا مرحوم سے میرے تعلقات کا زمانہ چوبیس پچیس سال ہے۔ اور میں بجا فخر کر سکتا ہوں کہ مولانا کو میرے ساتھ خصوصیت تھی۔ اس زمانے میں میرا قیام بمبئی میں تھا رابطہ و تعلق کی ابتدا مراسلت سے ہوئی۔ دو برس بعد محض شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے بمبئی سے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ اس ملاقات کا نقشہ اس وقت بھی میری نظروں میں ہے۔ اور اس کی یاد آج بھی میرے حافظے کا ابھرا ہوا نقش ہے۔ کیونکہ میرے عہد شعور میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے مشرقی شرافت اور اسلامی خلوص قلب کا اندازہ ہو سکا اس موقعے پر مجھے یہ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ اسی ملاقات نے میرے ذہن و دماغ کے مغربیت کی طرف رجوع ہونے کی اصلاح کی اور میرے قلب میں مشرقیت کی قدر کا سچا احساس پیدا کر دیا۔

مولانا سے میری خط و کتابت کی ابتدا ان کا افسانہ "شاہین و دُرّاج" تھا۔ اس فسانے کو شائع ہوئے اگرچہ کم و بیش تیس سال گذر چکے ہیں، لیکن باوجود اس کے کہ میں نسبتاً کچھ بہتر سمجھنے کے قابل ہوں اور باوجود اس کے کہ اُردو زبان کے بعض عمدہ عمدہ فسانے میری نظر سے گذر چکے ہیں، لیکن شاہین و دُرّاج کا جو ادبی مرتبہ میرے خیال میں اس وقت قائم ہوا تھا وہ اب بھی قائم ہے۔

خوش قسمتی سے میرے پاس مولانا کے چند خطوط محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان میں سے میں یہاں صرف دو باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مولانا کے علوئے اخلاق، احساس خودداری اور جذبۂ خدمت کا ثبوت اس سے بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔

پہلی بات ان کے افسانوں کے مجموعے کے انتساب کے ذیل میں ہے۔ لکھتے ہیں۔

"ڈیڈیکیشن کی کیفیت یہ ہے کہ میں اس کو مطلق پسند

نہیں کرتا - یہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک کوئی کتاب ڈیڈیکیٹ نہیں کی۔ میری زندگی کے واسطے کوشش بھی ہوئی کہ بیگم بھوپال کے نام معنون ہو - مگر مجھے گوارا نہ ہوا ۔ ایسی حالت میں اگر کسی دوست کے نام آپ تجویز کریں تو سرِ تسلیم لیکن اگر کسی بڑے آدمی کے نام آپ تجویز کریں تو مجھے تامل ہوگا -

غالباً "تہدیہ" سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر مَیں اس کی ضرورت سمجھوں - مجھے ضرورت نہیں ہے . . . "

ل احمد اکبر آبادی ——————— (عصمت جولائی ۱۹۳۶ء)

" مصورِ غم کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے نام و نمود کے اسٹیج پر آنے کی کبھی کوشش نہیں کی یہ دوسری بات ہے کہ پھول کی طرح ان کی شہرت ہر طرف پھیل گئی ۔ مگر شہرت میں ان کے ذاتی ارادہ کو دخل نہ تھا ۔ مصورِ غم کی شہرت غیر فانی نوعیت کی حامل ہے کیونکہ اسے شعور کی کرنوں اور ہوا کے جھونکوں نے اقصائے ہند میں منتشر کیا "

ماہر القادری ——————— (ساقی راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء)

امن و عافیت پسندی

" مرحوم اخباری جھگڑوں اور اخبار والوں کے اختلافات سے ہمیشہ الگ رہتے تھے ۔ جلسوں اور پارٹیوں میں بھی کبھی ان کی صورت نظر آتی تھی مگر وضع داری اور خلوص کا یہ عالم تھا کہ ۲۱ نومبر ۱۹۲۴ء کو وہ واحدی صاحب کے ہاں آئے اور مجھ سے پریشان ہو کر کہا کہ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ہمدرد میں آپ کے خلاف آج لکھنا شروع کر دیا ۔ میں نے ہنس کر کہا " مولانا آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں میں تو بمبئی جا رہا ہوں ۔ ۳۰ نومبر کو واپس آکر اس حملہ کا تدارک کر لوں گا " مولانا نے کہا کہ آپ مولانا محمد علی کے اثر اور رسوخ سے واقف نہیں معلوم ہوتے ۔ ان سے لڑنے میں آپ کو نقصان پہنچ جائے گا ۔ بمبئی میں تو ان لڑائی جھگڑوں کو برا سمجھتا ہوں ہو سکے تو صبر کرو اور جواب نہ دو ' میں نے کہا ہر شخص کی طبیعت جدا ہوتی ہے ۔ چنانچہ میری آپ کی طبیعت میں بھی یہی فرق ہے کہ آپ صبر و سکون کے حامی ہیں اور میں جنگ و حرکت و جہد و جہد و مقابلہ کا طرف دار ہوں . . . '

۳۰ نومبر سے میں نے روزنامہ غریبوں کے اخبار کے ذریعہ ہمدرد کا مقابلہ شروع کیا ۔ میرے سب رفیق اور دوست واحدی صاحب کے ہاں روزانہ صبح کے وقت جمع ہوتے تھے اور دس بجے تک اخبار کے مضامین سے مشورے کر کے تب چھپ کر پریس میں جاتے تھے ، اس وقت کبھی کبھی مولانا مرحوم بھی واحدی صاحب سے ملنے آجاتے اور ہم سب کو ترتیبِ مضامین کے مسئلہ پر بحث کرتا دیکھتے تو کھڑے کھڑے مسکراتے ۔ پھر واحدی صاحب سے کہتے :-

" میاں ہٹاؤ بھی کہاں کا جھگڑا نکالا ہے ، آخر یہ لڑائی ختم بھی ہوگی "

میں ہنسی سے کہتا " معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی ہمدرد کے ہمدرد ہیں ۔ آج آپ کے خلاف بھی ایک مضمون لکھا جا رہا ہے "

مولانا جواب دیتے " ایک نہیں ہزار مضمون لکھو میں کبھی جواب نہیں دوں گا "

یہ کہتے ہی چلے جاتے ۔ ہم سب ہر چند رو کتے مگر نہ رکتے

اس لڑائی کے زمانے میں ہمدرد کی بابت چند خطوط میرے قبضہ میں آئے اور مولانا مرحوم کو معلوم ہوا کہ میں ان خطوط کو غریبوں کے اخبار میں شائع کر دوں گا تو مجھ سے کہا ۔

" میں نے ایسا سنا ہے کہ آپ مولانا محمد علی کی نسبت کچھ خانگی خطوط شائع کرنے والے ہیں ایسا نہ کیجئے گا یہ بات شرافت کے خلاف ہے " میں نے مولانا محمد علی کے بھانجے محمد عثمان صاحب کو بلا کر وہ خطوط دے دیے ۔ یہ سُن کر

مرحوم نے بیوی بچے چھوڑ مارا اور غش کر گیا۔" بعد ہی
صبح تھی"

"مولانا کا مکان واحدی صاحب کے گھر کے راستے میں تھا اور مولانا اکثر اپنے مکان کے باہر آن کھڑے ہوتے تھے اور واحدی صاحب کے ان آنے جانے ان سے صاحب سلامت ہو جاتی تھی۔ میرے ساتھ کوئی باہر کا آدمی ہوتا تو میں مولانا کو ستانے کے لئے کہتا کہ ملئے علامہ راشد الخیری صاحب ہیں تو مولانا کا چہرہ غصے سے تمتما جاتا اور وہ اجنبی آدمی سے دل کے ساتھ مصافحہ کر کے بات چیت کئے بغیر گھر میں چلے جاتے۔ اور پھر کبھی اکیلے میں ملتے تو کہتے کہ مہربانی کر کے مجھ سے لوگوں کو ملانے کی کوشش نہ کیا کیجئے۔ آپ جانتے ہیں میں ہر اجنبی سے ملنے جلنے سے گھبراتا ہوں۔ میں کہتا میں گھبراہٹ کو دیکھنے کے لئے تو میں ملاقات کرایا کرتا ہوں"

خواجہ حسن نظامی ——— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم ملنے جلنے سے بہت گھبراتے تھے۔ اور شہرت طلبی سے کوسوں دور تھے۔ کسی سے ملنے کا تو ذکر کیا جو حضرات ان سے ملنے آتے۔ ان میں اکثر اور بیشتر سے صرف چند منٹ ضابطہ کی ملاقات ہوتی ممکن ہے کہ اس قسم کے ملاقاتی یہ اثر لے کر جاتے ہوں کہ مولانا مغرور ہیں۔ یا آدم بیزار ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ نہ تھا مولانا میں غرور کا شائبہ بھی نہ تھا اور نہ انسانوں سے بیزار تھے۔ ان کی فطرت عافیت پسند تھی۔ اور سکون طلب تھی وہ زیادہ ملنے جلنے سے بہت گھبراتے تھے۔ جلسوں پارٹیوں اور دعوتوں وغیرہ میں بھی مولانا شاید ہی کبھی دکھائی دیتے تھے"

قاری عباس حسین ——— (عصمت جون ۱۹۳۶ء)

"مولانا انتہا درجہ کے شفیق اور مہمان نواز بزرگ تھے۔ غریبوں اور مظلوموں کے لئے ان کے دل میں انتہائی تڑپ تھی۔ اور یہی تڑپ زندگی بھر ان کے اعمال و مشاغل میں نمایاں رہی۔ وہ مشرقی تہذیب و اخلاق کے پیکر تھے۔ عمر بھر انہوں نے کسی کی دل آزاری نہ کی۔ وہ سب کے خیر خواہ اور صلح پسند آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص ان کا دل سے احترام کرتا تھا۔"

مولانا عبد المجید سالک ——— (جنگ کراچی سنہ)

"علامہ اپنے احباب سے انتہا درجے کی بے تکلفی برتتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ جلدی کسی سے بے تکلف بھی نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ادھر آٹھ دس برس سے تو کچھ ایسی حالت ہو گئی تھی کہ نئے اور اجنبی لوگوں کی صحبت سے انتہائی وحشت ہوتی تھی اور اکثر یہ دیکھا جاتا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بذلہ سنجی ہو رہی ہے اور علامہ پورے طور پر اس ہنسی مذاق کا لطف اٹھا رہے ہیں کہ اتفاق سے کوئی نیا آدمی آ گیا۔ بس اب یہ ناممکن تھا کہ علامہ ٹھہر جائیں اسی وقت اٹھے سلام علیک کہا اور یہ جا وہ جا"

مولوی عبد الحمید خاں ——— رسالہ مولوی دہلی

"روا روی کے ملنے والے شاید انہیں خوش اخلاق نہ سمجھتے ہوں گے۔ لیکن ان کے اعلیٰ اخلاق کا افسانہ تک میرے پیش نظر ہے بے تکلف کا ملنا ان کے لئے ایسا تھا جیسے انہیں سولی پر چڑھا دیا۔ امراء، رؤسا اور حکام کے دربار سے دور بھاگتے تھے۔ اور اپنے دربار میں بھی انہیں دیکھنے کے خواہش مند نہ تھے۔ نیا آدمی ان کے لئے مصیبت ہوتا تھا ہم ان کے ساتھ یہ شرارت کیا کرتے تھے کہ جہاں کوئی ممتاز آدمی آیا اور ہم اسے لے کر مولانا کے دولت خانے پہنچے اور مولانا سے اس کا تعارف کرایا اور مولانا کی جان پر بن گئی

ہائے اب وہ جان ہی نہیں رہی! ان کے دروازے کے آگے سے روز گزرتا ہوں اور "مولوی صاحب" کہہ کر پکارنے کو جی چاہتا ہے۔ اور پھر دھیان آجاتا ہے کہ مولوی صاحب اب کہاں! ہمارا اور مولوی صاحب کا تو تعلق ہی کچھ اور تھا معمولی تعلق رکھنے والے بھی مولوی صاحب کی یاد میں بے چین ہیں جن سے تکلف نہیں کرنا پڑتا تھا ان سے وہ ایسی بے تکلفی سے ملتے تھے کہ گویا انہیں اپنے بلند مرتبہ کی خبر ہی نہیں ہے۔"

ملا محمد واحدی ——————— (عصمت راشد الخیری نمبر)

استقلال

عزم کیا اک پہاڑ تھا گویا | آستینیں جو تم چڑھا کے چلے
اٹھے طوفان برق بار نئے | تیز جھونکے بہت ہوا کے چلے
ڈگمگایا مگر کبھی نہ قدم | پاؤں کچھ اس طرح جما کے چلے

یہ اسی عزم کا نتیجہ ہے
سرخرو سامنے خدا کے چلے

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی ——————— (عصمت اپریل [illegible])

حق گوئی

حق جہاں کہنا ہو علامہ وہاں رکتا نہ تھا
سامنے گویا سلاطیں کے وہ سر جھکتا نہ تھا

آغا شاعر دہلوی ——————— (عصمت مارچ ۳۶ء)

جو ہوتا دل میں کہہ دیتے تھے بے خوف و خطر ہو کر
لگی لپٹی نہ رکھتے تھے کسی کی صاف گو ہو کر
تمنا جان و حشمت کی نہ کچھ پروا تھی مال و زر
بہت تھی بے نیاز اُن کی طبیعت کس طرح ہوے

ابوالا عجاز ازل ——————— (عصمت فروری [illegible])

حق گوئی اور حق کی حمایت سے کام تھا
مشغول شغل علم و ہنر میں مدام تھا

جہاں آرا چودھری ——————— (عصمت فروری [illegible])

مہمان نوازی

ایک خاص پُر لطف صحبت کا حال سنتا ہوں۔ کچھ دہلی کی نہاری کا تذکرہ تھا۔ ہمارے رام پور میں اس کو پائے کہتے ہیں اور خود ہمارے گھر کا یہ دعوی ہے کہ جیسے پائے ہمارے ہاں پکتے ہیں ویسے کہیں اور نہیں پکتے۔ دہلی کی نہاری ایک مرتبہ اور دوستوں نے کھلانی چاہی مگر میں نے اس کو سونگھ کر چھوڑ دیا تھا۔ کھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ باتوں باتوں میں اپنی گستاخانہ خواہش کا میں نے راشد الخیری صاحب کے سامنے اعادہ کیا۔ اور انہوں نے اپنے خاص اور متین انداز میں دعوت دی کہ میں اور بھائی (محمد علی مرحوم) اور دوسرے احباب کوچہ چیلان کے نکڑ پر جو لڑکیوں کا مدرسہ (تربیت گاہ و بنات) تھا وہاں آئیں اور ایک صبح ان کے ساتھ ناشتہ اور نہاری کھائیں۔ ہم روز مقررہ پر گئے اور نہاری بھی گرم تھی اور اس پر گرم گرم اچھا گھی ڈالا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ حلیم بھی تھی اور ہر چیز نہایت مزے دار تھی۔ خود ہمارے ساتھ کھانے میں وہ شریک نہ تھے مگر اپنے ہاتھوں سے ہر چیز نکال کر ہم کو کھلاتے تھے۔ اگر واقعی دہلی کی نہاری ایسی ہی ہوتی تھی جیسی کہ مرحوم نے کھلائی تو کیا کہنا۔ تفصیل تو مجھے یاد نہیں مگر اتنا زبان کا مزہ یاد ہے کہ ہر چیز بہت مزے دار تھی اور نہایت نفاست کے ساتھ کھلائی گئی تھی۔ مرحوم کی محبت اور اخلاص کا اس میں اضافہ ہو گیا تھا۔"

مولانا شوکت علی مرحوم ——————— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"مولانا سردی کے موسم میں ایک دفعہ دوستوں کو نہاری کھلایا کرتے تھے اور مجھے بھی بلاتے تھے اس وقت

... علامہ راشد الخیری

... دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں کہ بھلاتے تھے
... ہوتے تھے"

... مرحوم ———— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"رشتہ داروں میں یا غیروں میں، محلے میں یا پڑوس
میں کسی کو سن لیا کہ بیمار ہے تو دن میں دو دو
... جا کر پہنچتے اور یہ معلوم کر کے کہ تیمار داری
... کے ہاتھ سے کر جا رہا ہے۔ جب مریض کسی چیز
کی خواہش ... فوراً بازار کے لانے کی ہوتی تو بازار سے خرید کر
... دیتے اور اگر بچے کی کوئی چیز ہوتی تو ابا جان سے
... جا کر خود لے جاتے اور اس کو کھلاتے۔ اور
... تے تھے۔

رمضان المبارک کے آخری دن ابا جان خود فطرول
... کے اس حالت سے ہم دونوں بہنوں اور بھاوج
... سے ... باوجودیکہ مدرسہ میں کافی یتیم بچیاں ہوتیں
... میں پھرتے اور یتیم بچوں اور بچیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی
جو... منگواتے اور فرماتے دیکھو تمہاری عید کیسی اچھی ہے
... یہ بالکل ناامید تھا تم نے اس کی عید منوا دی"

گذشتہ عید سے پہلی شام کو فرمایا:-
"اب میرا تمہارے پاس کیا ہے؟"
میں نے جواب دیا "سب تو آپ نے تقسیم کر دیا اب
صرف چھ سات روپے پڑے ہیں"
یہ سن کر وہ ہنسے اور فرمایا:-
"تو کیا حرج ہے؟ اری بے وقوف! اس سے زیادہ
اور کیا خوشی کا موقع ہو گا کہ جو کچھ میرے پاس تھا سب
اس کے نام پر تقسیم کر چکا جس نے دیا تھا۔

اپنے کیسہ سے نہ ہم دام و درہم دیتے ہیں
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

واجدہ بیگم ———— (عصمت جون ...)

"اُن کے گھر میں غریبوں کے لئے ہر وقت کھانا تیار
رہتا تھا۔ رشتہ داروں کی بہی خواہی کی اُمنگ ہر وقت دل
میں تھی"

مولوی عبد الغفار خیری ———— (عصمت مارچ ...)

"ملازمین اور محلے کے جانے پہچانے غریبوں سے خاص طور سے
ان کا برتاؤ دیکھنے کے قابل تھا۔ بیماری کے زمانہ میں معمولاً
یہاں عیادت کے لئے جاتے تھے۔ اور اپنی بساط کے مطابق
ان کی دستگیری بھی کرتے تھے۔ ضرورت مندوں کی امداد اس
طرح سے کرتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ غریبوں
کی تکلیف دیکھ کر اُن کا حساس دل تڑپ اُٹھتا تھا"

ضیاء الدین احمد برنی ———— (عظمتِ رفتہ)

"بڑے آدمی ہیں مگر چھوٹے آدمیوں کی خدمت کر کے
انہیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ پاس پڑوس رشتہ کنبہ دوست
احباب میں گھوم پھر کر سب کی خیریت معلوم کرتے ہیں۔ کسی کی
تکلیف اُن سے دیکھی نہیں جاتی۔ دامے درمے قدمے
سخنے ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ حاجت مندوں کا ان کے
گھر میں تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان کی بیگم بھی انہیں کے مزاج
کی آدمی ہیں۔ کسی کو کچھ دیتے ہیں تو سیدھے ہاتھ کی خبر اُلٹے
ہاتھ کو نہیں ہوتی"

شاہد احمد دہلوی

"تیسرے روزے کی شام کو بخار کی شدت تھی میں
پائنتی بیٹھی پاؤں دبا رہی تھی آواز دی "کون ہے؟"
میں نے کہا "آپا جان میں ہوں فرمایئے؟"
"ارے میری بیٹی! دیکھ وہ مغل کی ساس (ایک غریب
بیوہ) اپنے بچے کو لئے کھڑی ہے یہ بھوکی ہے اس نے روزہ
بھی نہیں کھولا۔ ارے خدا کے لئے اس کو کھانا دو۔ دیکھو تو اس کا
معصوم یتیم رو رہا ہے۔ میرے بچے رازق صادق ان کے واسطے

باتا سے کھانا لادیں گے۔ ارے مسکا لو وہ بھوکی کھڑی ہے"
میں نے کہا "اباجان سب کو کھانا افطاری وغیرہ دے دی کوئی
بھوکا نہیں ہے آپ تو سحری تک کے لئے دے دیتے ہیں"
آمنہ نازلی ———— (عصمت اپریل ۳۶ء)

بیبیوں بیوائیں جن کے خوانِ نعمت کی شریک
وہ زدہ حالت مسلمان۔ موت تھی جن کو کہ بھیک
مُنہ چُھپائے آتے۔ کیا کیا حالتیں ہوتیں ریک
نوٹ کی گرمی سے راست۔ اُن کو کر دیتا تھا ٹھیک
کوئی بیٹے بھائی کی آ نا سفارش کے لئے
وہ خدا کا بندہ تھا موجود، کاوش کے لئے

آغا شاعر قزلباش دہلوی ———— (عصمت مارچ ۳۶ء)

بیواؤں کا رفیق غریبوں کا یار تھا
بے کس ستم زدوں کا تو وہ غم گسار تھا

آغا شاعر دہلوی ———— (عصمت جولائی ۳۶ء)

حجاب "مجھے مرحوم کی ایک ادا بڑی پسند تھی۔ مدرسبنات کی امداد کے سلسلے میں حیدرآباد کے سربرآوردہ اصحاب کے پاس (جن کے ہاں ان کا رسالہ عصمت جاتا تھا) مجھے ان کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے ہمیشہ دیکھا کہ اشارۃً یا کنایۃً بھی امداد مدرسہ سے متعلق گفتگو کرنے میں ایک خاص قسم کا حجاب محسوس فرماتے تھے اور جس وقت وہ تنہا ہوتے اور میں چھیڑتا کہ آپ بھی عجیب قسم کے انسان ہیں کہ اپنے مدرسہ کی امداد کے متعلق کچھ نہیں فرماتے تو مسکرا کر فرماتے "اے میاں لیاقت اللہ مجھے لوگوں سے امداد مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ حقوق نسواں کے متعلق چاہو مجھ سے تقریر کرا لو مگر چندہ مانگنے کے معاملہ میں میری زبان نہیں کھلتی"۔
نواب لیاقت جنگ حیدرآباد دکن ——(عصمت راشد الخیری نمبر)

مذہبیت "انتقال سے تین چار دن قبل مجھ سے فرمایا کہ میری ایک بات مانوگے میں نے کہا فرمائیے۔" مانی کا فرمایا کہ مجھ کو سورۂ یٰسین سُنا دو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی سُنتے رہے۔ اور آنکھ سے آنسو نکلا تھا کہ بعد ازاں نے رومال سے آنسو پونچھے تو فرمایا کہ تم کچھ نہ سمجھنا۔ میں چاہتا ہے تسکینِ قلب کے لئے سُنی ہے مجھ سے [illegible] رازق کیا کر رہا ہے۔ اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ"
مولوی عبد الغفار الخیری ———— (عصمت مارچ ۳۶ء)

"مولانا کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا ایک درد تھا۔ وہ مسلم عورت کے ارتداد سے کانپ اُٹھتے تھے"
مولوی عبد الغفار الخیری ———— (عصمت مارچ ۳۶ء)

عشقِ رسول "مرحوم سے میرے تعلقات ۲۰ سال سے تھے اور میرے دل میں ان کی اور ان کے علم و فضل کی ان کی ادبی اور قومی خدمات کی جو مرحوم نے زندگی بھر انجام دیں بے انتہا عزت تھی۔ مرحوم کو جو محبت اور عقیدت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی۔ اس سے میں ایک حد تک واقف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ صرف وہی ایک جذبہ ان کی نجات کا ذریعہ ہوگا۔
نواب مقصود یار جنگ ———— (عصمت ۳۶ء)

"اپنے مذہب میں پختہ اور پیغمبرِ اسلام کے سچے عاشق تھے"
سر شیخ عبد القادر ———— (عصمت راشد الخیری نمبر)

عشقِ رسول ہے تری تحریر سے عیاں

دانش دہلوی ———— (عصمت جون ۳۶ء)

تو سچا عاشقِ پیغمبرِ اسلام تھا
ہر نفس تیرا حقیقت آفریں پیغام تھا

خلیق برہان پوری ———— (عصمت فروری ۳۶ء)

انکساری "مولانا کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ

کبھی اپنے مخاطب کو یہ محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ مولانا
مرتبہ [illegible] میں اس سے اعلیٰ ہیں اور یہی اُن کی
[illegible] ہی ہے۔

[illegible] ت جگ بیتا الکی —— (عصمت راشد الخیری نمبر)

[illegible] دونی شخصوں سے اس طرح پیش آتے تھے
جیسے [illegible] کے برابر کے ہیں۔"

محمود [illegible] —— (عصمت اگست ۳۶ء)

"عبدالعزیز بولے میاں تمہیں رشک کیوں آتے
[illegible] مولوی صاحب تم نے قرآن تو پڑھا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ
[illegible] گالی دے کر، بندے اسلئے گناہ معاف
[illegible] ایک سے کہ ہزار گناہ کر کے آجا کوئی مضائقہ
[illegible] لیکن اگالی دے کر، تو نے شرک کیا تو بخشے گا رب
[illegible] گالی) بے پڑھے لکھے تین ہی دوستوں کا مجھے
علم تھا۔ مولانا اُن سے اس طرح ملتے تھے جیسے خود بھی بے
پڑھے لکھے ہیں۔ عبدالعزیز کے اس سوال سے کہ تم نے
قرآن تو پڑھا ہوگا صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوست
انہیں اپنے سے صرف روپے پیسے میں اونچا سمجھتے تھے اور
یہ ایسا فرق تھا کہ جسے مولانا چھپا سکتے تھے۔ ورنہ علمیا
مولانا نے کبھی ان پر اپنی اہمیت جتانے کی کوشش نہیں کی
بالکل اسی طرح ملا کئے جس طرح بچپن میں ملتے تھے اور
انہیں محسوس ہونے دیا کہ مولانا ستر اسی کتابوں کے
مصنف ہیں۔"

ملا محمد واحدی —— (ساقی راشد الخیری نمبر)

"لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے ایسی جدوجہد
کرچکے ہیں کہ کروڑوں آدمی اُن کے گرویدہ ہیں ملک کے مصلحوں
میں ان کا شمار ہے۔ مولانا حالی دوستوں کو کیا دھونس بٹھلاتے
خود اُن کو بھی اپنے مرتبہ کا احساس عمر میں دو چار بار ہوا ہو
تو ہوا ہو۔ مولانا جیسا بے نیاز انسان چشم فلک نے کم دیکھا
ہوگا۔ دُنیا اُن کی بابت کیا رائے رکھتی ہے۔ ایسے وہ سرے سے
بے نیاز تھے۔"

ملا محمد واحدی —— (ساقی راشد الخیری نمبر)

خودداری

"امراء، رؤسا اور حکام کے درباروں سے
دُور بھاگتے تھے۔ اور اپنے دربار میں کسی کو کبھی
دیکھنے کے خواہش مند نہ تھے۔"

ملا واحدی —— (عصمت اگست ۳۶ء)

سامنے تو یا سلاطین کے وہ سر جھکاتا نہ تھا"

آغا شاعر دہلوی —— (عصمت مارچ ۳۶ء)

خوش طبعی

"حضور علامہ راشد الخیری کی تصنیفات
پڑھنے کے بعد غالباً اس کا یقین مشکل سے
آسکتا ہے کہ مولانا خوش طبع بھی ہوں گے اور جنہیں کبھی
رواداری میں مولانا سے ایک آدھ مرتبہ ملاقات کا موقع
ملا ہے وہ تو انہیں خوش طبع کیا شاید خوش اخلاق ماننے
میں بھی تامل کریں گے۔ مولانا نے دو تین کتابیں مزاحیہ
لکھی ہیں۔ مگر ان کا امتیاز خصوصی حزن نویسی تھا۔ جس کی
ساری عمر اور دل کو رلانے میں گزری ہو وہ خود کیسے ہنس سکتا
ہے اور جو ملنے جلنے سے اتنا بیزار ہو کہ بڑے بڑے آدمیوں
کو اس کی صحبت میں دو منٹ بیٹھنے کی آرزو ہی رہے اُسے
مذاق کی کیا سوجھ سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا سے
زیادہ زندہ دل، مولانا سے زیادہ شگفتہ مزاج اور مولانا سے
زیادہ خوش طبع انسان کم از کم دہلی میں مجھے آج کوئی نظر
نہیں آتا۔

میں ایسے تین شخصوں کو جانتا ہوں جو مولانا کے لڑکپن
سے بڑھاپے تک دوست رہے۔ ایک مرزا محمد اشرف صاحب
گورگانی بی اے۔ دوسرے مولوی اشرف حسین صاحب بی اے

تیسرے قاری سرفراز حسین صاحب عزمی۔ تینوں مولانا کے سامنے ہی اللہ کے ہاں سدھار چکے۔ یہ ایک جماعت تھی جو علم و فضل اور ذہانت و طباعی کے اعتبار سے دہلی کی آخری شمع تھی اور زندہ دلی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ ان دوستوں میں کس حد تک مذاق ہوتا تھا اس کی دو درمیانی اور معتدل مثالیں سناتا ہوں۔

مولانا طرز تحریر میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب یعنی اپنے پھوپا کے پیرو تھے۔ میں نے ایک دفعہ مولانا کو "جانشین مولوی نذیر احمد صاحب" لکھ دیا۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے فرزند مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف تھے اور عمر میں مولانا سے بڑے تھے۔ انہیں کسی نے جا لگایا کہ بیٹے کے ہوتے بھتیجے کو جانشین بتایا جا رہا ہے مولوی بشیر الدین صاحب نے اس کی پروا نہیں کی۔ مگر قاری سرفراز حسین صاحب نے اس کا خاصا لطیفہ بنا دیا۔ کوئی شادی تھی جس میں ہم سب جمع تھے۔ مولانا نے ایک بہت ڈھیلی ڈھالی ٹخنوں سے ذرا اونچی پرانی سی اونی شیروانی پہن رکھی تھی۔ قاری صاحب مولوی بشیر الدین صاحب سے مخاطب ہو کر بولے" واحدی نے بالکل جانشین مولوی نذیر احمد غلط نہیں لکھا۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے مولوی نذیر احمد کے پاس یہ شیروانی دیکھی ہے۔ جو آج ماشاءاللہ کے جسم پر ہے۔"

ایک دفعہ اڈورڈ پارک میں یہی مجمع تھا کوئی بڈھا سفید ڈاڑھی۔ خمیدہ کمر۔ بھیک مانگتا اس مجمع کے اندر آ کھڑا ہوا۔ مولانا نے بے ساختہ کہا "آؤ میاں قاری برکت اللہ بڑی مدت میں دکھائی دیئے۔ تمہارے دیدار کو تو آنکھیں ترس گئیں۔" قاری برکت اللہ صاحب قاری سرفراز حسین صاحب کے والد کا نام تھا۔ اور یہ گفتگو ان کے انتقال کے پچاس برس بعد کی ہے۔

دو بھبتیاں بھی یاد آ گئیں۔ مولانا نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ آخر وقت میں سر ڈاڑھی اور بھویں بالکل بگلا تھیں۔ اور سر کے بال خوب بڑھے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے۔ ایک دن مولانا ننگے سر کھڑے تھے کہ قاری صاحب آ پہنچے۔ اور فرمایا "حضرت مولانا روئی کے بیچ میں کام شروع کر دیا؟" قاری صاحب خضاب استعمال کرتے تھے۔ ایک روز حمام سے آئے تھے۔ اور ڈاڑھی میں سے روئی زیادہ باہر نکل آئی تھی۔ مولانا نے کہا" واہ قاری صاحب صرف دُم کی کسر ہے" یعنی دُم لگا لو تو لنگور معلوم ہو گے۔

کبھی حضرت مولانا" اور قاری صاحب" سے خطاب ہوتا تھا اور کبھی ابے تبے پر اتر آتے تھے۔ اور کبھی گالیوں تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ کاش مجھ میں اتنی زندگی ہوتی کہ وہ ابے تبے اور بجلی کے دیپک یہاں میں جمع کر سکتا تو ایک ادبی تبرک سمجھے جانے کے قابل کتاب بن جاتی۔

اٹھارہ بیس سال سے مولانا کی اکثر میرے ہاں نشست رہتی تھی۔ اور مولانا کے آخری دور کے ہم تین ساتھی تھے میں خواجہ فضل احمد خاں صاحب شیدا اور مولانا عارف ہسوی۔ ہم چاروں قریباً روز ملتے تھے اور دن میں کئی کئی دفعہ ہم چاروں ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ ساتھ سیروں کو جاتے تھے۔ اور ہماری صحبت میں کوئی پانچواں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔

ان چاروں دوستوں کی جماعت میں میں نسبتاً مردہ دل تھا۔ اس واسطے بے تکلفی مولانا کی حقیقتاً خواجہ فضل احمد صاحب اور مولانا عارف سے تھی۔ خصوصاً خواجہ فضل احمد صاحب سے۔ لیکن مولانا چونکہ مجھ سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ مولانا عارف صاحب اور خواجہ فضل احمد صاحب کو تو کہتے تھے تم تک

لیے ہوں گے۔ پہلے [illegible] کی کرتا تھا کہ
شادی کی تھی کہ جب [illegible] مولانا مہینوں آرام بھی نہیں
— مولانا نے بے شمار کتابیں تیار کر ڈالیں۔ لیکن پھر
[illegible] قلم ہاتھ میں [illegible] کرتے تھے۔ اپنی طبیعت
[illegible] ہو جاتی [illegible] دوستوں کی خواہش سے ذہب
[illegible] طبیعت [illegible] دوستی ہونے سے اور لکھتے تھے
[illegible] سے گیا ہوں منٹ لکھنے پر صرف نہیں کرتے
[illegible] منٹ لکھا اور باہر آگئے۔ میرے ان تشریف لے
[illegible] کسی تانگے والے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ کسی دکاندار
سے باتیں کرنے لگے۔ اور پھر جا کر لکھنا شروع کر دیا اور
[illegible] منٹ بعد کرسی کاٹنے لگی۔ یہی سلسلہ تمام دن
جاری رہتا تھا۔ میں نے شام زندگی لکھنے کے فیصلہ میں جب
[illegible] نے دیکھا۔ تو ایک بہت چھوٹی سی کوٹھری میں میز کرسی
پھیلا دی جس میں لیٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ اور مولانا کی آمد کا انتظار
کرنے لگا اور مولانا جب آئے تو ان سے کہا کہ چلو اس
کوٹھری میں۔ ان کے کوٹھری میں گھستے ہی کنڈی لگا دی اور سنا
دیا کہ چاہے لکھو چاہے نہ لکھو۔ دو گھنٹے سے پہلے کنڈی
نہ کھلے گی۔ وہ کوٹھری اس وقت میرے سامنے ہے اور کیا
عرض کروں کہ میرا کیا حال ہے۔ میں نے مولانا کو کتنی تکلیف
دی تھی اور کتنا ستایا تھا۔ اس کا خیال کر کے مجھے دکھ ہوتا
ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ مولانا کی قبر پر جاؤں اور ان کی پائینتی
سر جھکا کر معافی مانگوں۔ لیکن میں نے تنہا نہیں ان کے
بے تکلف گر قدردان دوست مولانا عارف نے بھی سر
جھکایا نہیں تھا بلکہ سر قدموں میں رکھ دیا تھا۔ جب مولانا
دو گھنٹے لکھ کر پسینوں میں ڈوبے مسکراتے ہوئے کوٹھری
سے نکلے اور شام زندگی کے ابتدائی صفحات ان کی زبان سے
ہمارے کانوں میں پہنچے تو ایک صفِ ماتم بچھ گئی۔ مولانا عارف
فراقی پایہ کے ادیب تھے۔ مگر بے تکلفی اور اپنی بلندی وغیرہ
سب بھول گئے اور مولانا کے پاؤں میں لپٹنے لگے۔ بیس
دن میں شام زندگی ختم ہوئی تھی۔ بیس دن برابر میرے ہاں
یہی ڈرامہ ہوتا رہا۔

مولانا کے بڑے فرزند مسٹر رازق الخیری کی شادی تھی
اور آگرے جانا تھا۔ مولانا زیادہ خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے
مولانا نے نہایت دلچسپ طریقے سے ہمیں اور ہمارے پردہ
میں اور اکثر صاحبوں کو روک دیا۔ یہ صاحبان ایسے تھے کہ
مولانا کی اس حرکت کا انہوں نے لطف لیا۔ بگڑا کوئی نہیں
اس کارروائی میں مولانا کا فقط پندرہ روپے کا نقصان ہوا
مولانا نے ہم سے کہا کہ آپ لوگ ریل میں کیا چلیں گے۔ میں نے
ایک نہایت عمدہ لاری کا انتظام کر دیا ہے وہ دو بجے آجائیگی
اور یہ پندرہ روپے رکھئے۔ لاری والے کو پیشگی دے دیجئے گا۔
باقی میں ادا کر دوں گا۔ لاری والے پر آتی دو بجے اکٹھے ہو گئے
اور لاری بھی ٹھیک ٹھیک آئی۔ مگر وہ اینٹیں ڈھونے کی لاری
تھی۔ آدمی ڈھونے کی لاری نہیں تھی۔ خیر مولانا کا مذاق
ہماری سمجھ میں آگیا۔ اور وہ پندرہ روپے اسی وقت مال
مفت دل بے رحم کے مطابق بھر بھر کے اڑا دیئے گئے۔

مولانا کو کھانا پکوانے اور غربا کو کھلانے کا بے حد شوق
تھا۔ مہینے میں ایک دو بار دیگیں نہ کھنکتیں تو وہ پژمردہ ہو جاتے
تھے۔ مجھے بھی دیگ کا سالن بہت بھاتا ہے۔ لہٰذا جب دیگ
چڑھتی تھی مولانا کہہ دیتے کہ "ملا جی شام کو پیالہ بھیج دینا"
اور میں پیالہ بھیجتا تھا۔ ایک دن اس خاص کھانے کی اطلاع
کئے بغیر خواجہ فضل احمد صاحب کی مولانا نے دعوت کر دی۔
مغرب کی نماز کے بعد وہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں (خواجہ فضل احمد
صاحب کی زبان میں ہی عرض کر دوں) کہ "بیسیوں جیسی دلی
اور ملاتے۔ پٹھان۔ بنگالی اور بخاری کھڑے ہیں اور سب کے

ہاتھ میں پیالے ہیں۔ میرے آگ لگ گئی۔ لیکن مولانا نے مجھ کو ٹھنڈا کردیا کہ "فضلو تیرا پیالہ کہاں ہے۔ ارے بے پیالہ ہی کے آگیا۔ چل بھاگ یہاں سے میں سالن بھی دوں اور پیالہ بھی دوں" پھر قریب پہنچ کر ہاتھ پکڑا اور جھکا کر فرمایا :-

"نواب صاحب یہ کھانا انہیں لوگوں کے لئے پکوایا کرتا ہوں۔ آپ نے عقل سے کیوں کام نہیں لیا۔ میں حضور کی دعوت کرتا تو تنہا حضور کی نہ کرتا (اتنے میں عارف صاحب بھی آگئے۔ اُن کی طرف اشارہ کرکے کہا، اس مسخرے کی بھی نہ کرتا اور بھئی ان لوگوں کے ساتھ کھانا ہے تو کچھ ان میں سے اُڑ رہے کھارہے ہیں۔ جاؤ تم دونوں بھی کھالو۔"

ایک دفعہ مولانا نے اور خواجہ فضل احمد صاحب نے اور میں نے ایک ساتھ شملہ کا سفر کیا۔ میں اور مولانا ایک درجے میں تھے اور خواجہ فضل احمد صاحب دُوسرے درجے میں۔ مولانا کا بیٹھے بیٹھے چھیڑ کرنے کو جی چاہا۔ ہمارے درجے کے آگے سے ایک بہت معقول سے آدمی گذر رہے تھے مولانا نے ان سے کہا کہ :-

"حضرت معاف کیجئے گا ذرا زحمت تو ہوگی یہاں تیسرے سے چوتھا ڈبہ جو ہے اس میں ہمارا ملازم ہے۔ فضلو کہہ کر آواز دیجئے گا کہ مولوی صاحب بلا رہے ہیں" انہوں نے ایسا ہی کیا خیر انہیں تو "فضلو" کیا مل سکتے تھے۔ لیکن خواجہ فضل احمد صاحب نے تھوڑی دیر بعد آکر مولوی صاحب کو سیکڑوں صلواتیں سُنادیں۔

اسی سفر کا واقعہ ہے واپس دلی آرہے تھے کالکا اسٹیشن پر خواجہ فضل احمد صاحب اُترے "فضلو" والا تجربہ ہوجانے کے بعد خواجہ فضل احمد صاحب نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ ساتھ ایک درجہ میں بیٹھیں۔ خواجہ فضل احمد صاحب سودا بہت ہوشیاری سے خریدتے تھے وہ اسٹیشن پر اُترے اور کھانے پینے کی چیزیں خرید کر لانے لگے۔ ایک ایک چیز لے کر آتے ہیں اور درجہ میں رکھ جاتے ہیں اور مولانا اُسے بینچ میں رکھ لیتے ہیں اور میں بھی ان کی تقلید کر رہا ہوں۔ یہاں تک کہ اپنے خیال میں جب خواجہ فضل احمد صاحب تینوں کے لائق پورا کھانا جمع کرچکے تو اطمینان سے درجہ میں داخل ہوئے اور انجن نے بھی سیٹی دیدی۔ آپ جو دیکھتے ہیں تو کھانا وانا کچھ نہیں ہے۔ صرف پتے ہیں۔ مولانا مستقل کے دوکان والوں کے طرز میں صدا لگائی "پتّے کو بھی چاٹ" اور پھر کھڑکی سے مُنہ باہر کرلیا۔ اور دیر تک خواجہ فضل احمد صاحب کے بگڑنے کا مزا لیتے رہے۔

مزے کے لفظ سے ایک اور قصہ تازہ ہوگیا خواجہ فضل احمد صاحب کا حافظ غضب کا ہے۔ نثر کی عبارتیں انہیں طوطے کی طرح یاد ہیں لیکن شعر کبھی یاد نہیں رہتا۔ ایک مصرع غالب کا پڑھتے ہیں تو دُوسرا مصرع اسی بحر اور قافیہ ردیف کا داغ کا اس کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اور پھر اس میں اتنی اصلاح کرتے ہیں کہ نظم ونثر کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ مولانا عارف اور مولانا راشد اس بات سے مزا لیا کرتے تھے۔ مولانا راشد الخیری صاحب کا کلام تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ مولانا عارف بھی سخن فہمی اور شعر گوئی میں یگانہ تھے۔ خیر جس واقعہ کا میں ذکر کررہا ہوں اس کا تعلق مولانا راشد الخیری صاحب سے ہے۔ خواجہ فضل احمد صاحب نے داغ کا شعر پڑھا اور غلط صحیح پڑھا۔

خدا کی قسم اُس نے کھائی ہے آج
خدا کی قسم ہے مزا آگیا

مولانا نے فرمایا "ارے کم بخت "قسم ہے خدا کی" کہہ۔ داغ کی رُوح کو کیوں تڑپا رہا ہے۔" زبان کا بہت باریک فرق ہے۔ دلی والے بھی اب شاید اسے محسوس نہ

سوزِ غم [illegible] کر سکیں گے۔ مولانا [illegible] سے چند مصرعوں کو سن کر بہت لطف اندوز ہوئے۔ مگر قسم ہے خدا کی کی جگہ خدا [illegible] سننا ان سے برداشت نہ ہوسکا اور انہوں نے [illegible] کی۔ خواجہ فضل احمد صاحب بھی دلی کے [illegible] دلی کی پرانی باتیں۔ دلی کی پرانی [illegible] دلی کی پرانی زبان خوب جانتے ہیں۔ مولانا کے کہنے [illegible] صاحب [illegible] اور پھر مولانا بڑے لحن کے ساتھ مزہ لے لے کر یہ شعر دہراتے رہے۔

خدا کی قسم اس نے کھائی ہے آج
قسم ہے خدا کی مزا آگیا

[illegible] مزا آگیا - مزا آگیا - مزا آگیا جی مزا آگیا۔ [illegible] ہے خدا کی مزا آگیا۔

یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا
سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو
یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا

مولانا کے گلے میں ستر سال کی عمر تک کڑاکا تھا مثنوی میر حسن ایسے موثر اور دردناک لہجہ میں پڑھتے تھے کہ ہمارے دل سوز و گداز سے بھر جاتے تھے۔ آج بھی ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور میں یہ شعر سن رہا ہوں۔

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو نہیں پہچانتے تھے اور ادنےٰ ادنےٰ شخصیتوں سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے ان کے برابر کے ہیں۔ چلتے چلتے ایک بات اور کہہ دوں مولانا کو صحت سے سخت پریشانی میں ہم نے ہشاش بشاش پایا۔ حتیٰ کہ جب سانس اکھڑ گیا اور دنیا سے رخصت ہونے کا یقین ہوگیا۔ اس وقت بھی مولانا نے خواجہ فضل احمد صاحب سے مذاق کیا۔ آخری وقت میں کسی نے کہا کہ حارث اب اچھے ہیں تو مولانا نے فرمایا۔

"کیوں مجھے بناتے ہو وہ بھلا چنگا ہو تا تو وہ جاچکا لیکن وہ ایک آدھ کو ساتھ لے کر ضرور جائے گا اکیلے اس کا دل ضرور ہی تنگ سکتا ہے"

انتقال سے چار روز پہلے شہنشاہ حاسح کی رحلت کا ذکر کوئی صاحب کر رہے تھے ایک بزرگ بولے کہیں جی اب بادشاہ کا بیٹا تخت پر بیٹھے گا۔ مولانا کی نقاہت کی وجہ سے آنکھیں بند تھیں۔ یہ دلچسپ سوال سن کر بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور زبان پر برجستہ یہ فقرہ آیا:-

"نہیں جناب کے لئے وصیت کر گئے ہیں"

ملا محمد واحدی ———— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"ایک دفعہ مبلغ اسلام قاری سرفراز حسین صاحب کے مکان پر ادبی نشست تھی جس میں خود قاری صاحب نے تصوف پر اپنے مخصوص دلچسپ انداز میں تقریر کی تھی۔ تقریر کے دوران میں ایک بڑھا خضر صورت فقیر دروازہ پر نمودار رہا۔ علامہ نے چپکے سے اشارہ کر کے اسے بھی اندر بلا لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر بدستور تقریر سننے میں مشغول ہوگئے۔ تقریر میں قاری صاحب نے فرمایا تھا کہ سچا صوفی وہ ہے جو تحمل اور بردباری کا پیکر ہو۔ جو دوسروں کا خدمت گذار ہو۔ جو تلخ بات کا جواب خاموشی سے دے۔ جو اپنا پتہ مار کر اپنے نفس پر قابو حاصل کرے۔ وغیرہ وغیرہ"

تقریر بہت پسند کی گئی۔ جب وہ ختم ہوگئی تو علامہ نے نہایت سنجیدگی سے یہ کہہ کر حاضرین سے اس فقیر کا تعارف کرایا کہ :-

"ان سے ملئے یہ قاری صاحب کے والد ہوتے ہیں"
یہ سنتے ہی قاری صاحب بگڑ گئے اور علامہ کو بہت سخت سُست کہا اس پر علامہ نے صرف اتنا فرمایا۔
"آپ حضرات نے دیکھ لیا کہ اس شخص پر تصوّف کا کس قدر گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے"
یہ فقرہ سنتے ہی حاضرین ہنس پڑے اور قاری بھی کھل کھلا کر رہ گئے۔ مگر علامہ کی متانت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ خود نہیں ہنستے تھے۔ دُوسروں کو ہنسایا کرتے تھے"

ضیاء الدین احمد برنی ———— (عظمت رفتہ)

"مخزن کے نامہ نگار اکثر و بیشتر شیخ عبد القادر صاحب کے یار غار تھے۔ ان کے سال بھر میں ایک دو اجتماع شیخ صاحب کی دعوت پر دلی میں ہوا کرتے تھے۔ برسات کی بہاروں میں آم کی رُت میں ایک اجتماع ضرور ہوتا تھا۔ ان صحبتوں میں مولانا کی شرکت سونے پر سہاگہ تھی۔ وہ بزم کی جان تھے۔ بہار افشانیاں اُن کے لطیفوں اور چٹکلوں پر پھُول برسایا کرتی تھیں۔ دُنیا انھیں مصوّرِ غم کہتی تھی۔ لیکن رنج والم کو ان سے دُور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ وہ ہر حال میں شاداں و فرحاں تھے۔ رنج دلگران کے پاس پھٹکنے نہ پاتا تھا۔ . . . . انتقال سے دو روز قبل تک اپنی نقاہت بھری آواز میں پھُلجھڑی کی طرح پھُول برساتے رہے"

خواجہ فضل احمد شیدا دہلوی ———— (فروری ۱۹۵۳ء)

"جب آتے تھے کوئی نیا لطیفہ کوئی نئی بات لے کر آتے تھے۔ کہنے لگے میاں سُناؤ آج ہم فلاں گورکند سے ملے۔ یہیں ترائے میں رہتا ہے۔ بھئی مجھے اس سے باتیں کرنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ وہ قصائی کے ہاں کھڑا گوشت بنوا رہا تھا۔ میں جو اُدھر سے گزرا تو سلام علیک کرکے اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور پُوچھنے لگا کہو بھیا آج کل کیا حال ہے وہ بولا "مولانا کیا پُوچھتے ہو بُرا حال ہے۔ غریب مر رہے ہیں اور وہ بھی کسی دن ایک بھی دو تین دن میں ایک میّت آگئی۔ نہ کوئی موٹی آسامی آتی ہے۔ اور نہ میتیں ہی زیادہ آتی ہیں۔ مگر مولانا پھر اللہ میاں کے سہارے ہیں۔ الٰہی بھیج الٰہی بھیج کہتے رہتے ہیں فرمانے لگے کہ ذرا دیکھو کیا دُنیا کا رنگ ہے۔ اللہ میاں کا سہارا بھی ڈھونڈا تو کس سے کہ میتیں بھیج مگر بھئی بڑے مزے کا آدمی ہے۔ ایسی بات کہتا ہے کہ دوسرے سے بن نہ آئے" پھر اس گورکند کے لطیفے سُنا رہے ہیں"

آصف علی بیرسٹر ———— (عصمت ۱۹۳۶ء)

"ہم دونوں بہنیں تعجب کرتی تھیں کہ ہمارے وہ مہمان اعظم اس قدر خوش طبع اور لطیفہ گو ہیں اور اس طرح ہم سے باتیں کرتے ہیں۔ جیسے ہم آپس میں ہنستے بولتے ہیں"

مریم یوسف علی انسپکٹرس ———— عصمت یا فخر الخیری بہ
سکولز میسور ———— ۱۹۳۶ء

بیرونی دنیا اُن کی دردناک کہانیوں کو پڑھ کر روتی تھی۔ لیکن ان کے احباب کی مختصر جماعت ان کی دلچسپ و ظریفانہ باتیں سُن کر ہنستی تھی۔ یہ خوش مزاجی ان کا شاید سب سے بڑا انسانی وصف تھا"

"دنیوی تکالیف سے مامون نہ تھے — لیکن آخر وقت تک حرف شکایت ان کی زبان پر بہت کم آتا تھا۔ جب کسی دوست سے ملتے تھے۔ اس مقصد سے ملتے تھے کہ اس کا اور اپنا دل خوش کریں۔ لیکن یہ خوش طبعی مخلصانہ ہمدردی کی منافی نہ تھی"

مرزا محمد سعید ایم اے آئی ای ایس ———— (عصمت اپریل ۱۹۳۶ء)

"اُن کی تصانیف میں غم ناک کہانیاں اس قدر ہیں اور اکثر ایسی رقّت آمیز طرز میں لکھی ہوئی ہیں کہ وہ ادبی دنیا

ے کے بہت مشہور بزرگان کے ملنے والے
ر گو وہ عمر کی تصویر کھینچنے میں بہت مشاق تھے
خصوصیت تھے۔ اُن کا چہرہ بشاش تھا۔ کسی
ور سے دیکھئے تو اُن کے چہرے پہ ایک مسکراہٹ
جو سوخول آسیہ کی ایک خوش آمدید تھی"
۔ القادر ——— (عصمت راشد الخیری نمبر)
ے ہی دم سے شگفتہ تھا چمن احباب کا
۔ گرنو ہی چراغ انجمن احباب کا
سی تیری وہ تیری شادمانی یاد ہے
تیری پیرانہ سالی میں جوانی یاد ہے

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حضرت علامہ باوجود
مہ ہونے کے اس قدر خوش رہتے اور خوش
تے کہ اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے"
رحسن بقائی اڈیٹر پیشوا ——— پیشوا دہلی
۱۹۰۳ء میں علامہ مرحوم اور میں دونوں آمنے سامنے
ایک میز پر بیٹھ کر کام کیا کرتے تھے۔ اس وقت
ہنسی مذاق کی باتیں اور رُوح کو شگفتہ کر دینے
چٹکلے اور لطیفے آج یاد آ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کل
ہے"
باس حسین ظریف دہلی ——— (عصمت اپریل ۱۹۳۶ء)
" علامہ راشد الخیری بوڑھوں میں بوڑھے۔ جوانوں
ان اور بچوں میں بچے تھے۔ جس صحبت میں بیٹھ گئے
کے مطابق ڈھل گئے۔ اُنہوں نے زندگی کا مفہوم
طرح سمجھا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ جب تک زندہ رہے
معنوں میں زندہ رہے۔ دُنیائے ادب اور دُنیائے علم نے
نی کو مصورِ غم کا خطاب دیا تھا۔ اور جن کی تحریروں نے

لاکھوں انسانوں کے دلوں کو گداز کر کے آنکھوں سے آنسو جاری
کر دئے ہیں ان کے متعلق آپ یہ معلوم کر کے حیرت میں رہ
جائیں گے کہ وہ خود بہت زندہ دل۔ خندہ رو اور خندہ مزاج
بزرگ تھے"
مولوی عبد الحمید خاں ——— (عصمت مارچ ۱۹۳۶ء)
" یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بجائی علامہ
جن کے دل میں ملک وملت کا اور خاص کر طبقۂ نسواں کا اصل قدر
درد بھرا ہوا تھا کہ اپنے درد انگیز بیان اور طرزِ تحریر سے دم بھر
میں ہنستوں کو آٹھ آٹھ آنسو رُلا دینے اور تڑپا دینے میں کمال
رکھتے تھے۔ وہ اپنی گھریلو زندگی میں نہ صرف پرانی وضع کے
ایک صابر وشاکر اور مرنجان مرنج خیال کے بزرگ تھے بلکہ
دُوسروں کے دُکھ درد میں دل سے شریک رہنے کے علاوہ
خود اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کی طرح زندہ دل اور خندہ رو
رہ کر اپنی نیک نیتی اور خوش طبعی سے بہت سے افسردہ دلوں
اور روتوں کو باتوں ہی باتوں میں خوش کر کے ہنسا بھی دیتے
تھے اور اس طرح سے وہ اپنی حیات میں نہ صرف معلمانہ تقریر
وتحریر سے ہی دُوسروں کی خانگی زندگیاں سنوارنے کی سعی
مشکور کرتے رہے۔ بلکہ وہ عملاً خود اپنی گھریلو زندگی بھی ایسے
ہی پاک جذبات کے ساتھ گذار گئے جن کی وہ دُوسروں
کو تلقین کرتے تھے"
کپتان مولوی حبیب الرحمن سی آئی اے ——— (عصمت راشد الخیری نمبر)
(ٹونک میں) ماموں جان اپنے سالے صاحب (مولوی
شاہ محمد لسان الرحمن صاحب) سے بڑا مذاق کرتے تھے ان کو چھیڑا
کرتے تھے۔ فرماتے تھے مولوی صاحب نواب آپ کو کہتا ہے
انگریز کا جاسوس آیا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں ایک آدھ روز
تو وہ اسے صحیح سمجھے اور لگے اپنی برأت میں شہادتیں پیش
کرنے۔ اس پر فرماتے تھے گھر کی ماما اور چپراسی سے پوچھ

بچے شہر بھر میں یہ بات مشہور ہوگئی ہے۔ اب جلدی یہاں سے بستر بوریہ باندھیے وہ بہت گھبراتے تھے۔ وہ ایک روز یہی حال رہا پھر سمجھ گئے مجھ سے مذاق کیا جا رہا ہے۔"

مسز رلاس ——————— (ساقی راشد الخیری نمبر)

خوش اخلاقی

شاید جون کا مہینہ تھا اور دلّی ریلوے اسٹیشن سہ پہر کی تمازت آفتاب سے جھلس رہا تھا ایک روایتی مشرقی بزرگ آنے والی ٹرین سے اترے ان کی پیشانی اور شیروانی کی پشت پسینے سے شرابور تھی۔ وہ پسینے میں نہا رہے تھے۔ ایک چھوٹی بچی نے پہچان لیا کہ یہ علامہ راشد الخیری ہیں۔ اپنے والدین کو تپتی ہوئی چھت کے نیچے چھوڑ کر وہ آگے بڑھی اور مصور غم کے پاس پہنچ کر اس نے شکایت کی کہ عصمت کے پچھلے پرچے میں ایک کھانے کی ترکیب غلط چھپی اور اس کی جیب خرچ کے پیسے ضائع ہوئے۔ علامہ راشد الخیری دیر تک صبر و سکون سے اس جلتی جھلستی گرمی میں لڑکی کی باتیں سنتے رہے پھر انہوں نے جیب سے ایک پرچہ نکال کر اس کا نام پتہ اور شکایت کی تفصیل لکھی اور اس وقت تک جنبش نہ کی جب تک لڑکی کو یقین نہ ہوگیا کہ انہوں نے پوری توجہ اور دھیان سے اس کی باتیں سن لیں۔ پھر علامہ نے شفقت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور چند کتابیں اور رسالے اس لڑکی کو دئے۔ اقبال اور راشد الخیری دونوں مبلغین اسلام تھے۔

قدرت اللہ شہاب ——— سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے انگریزی مضمون سے ——— ۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء

"راشد الخیری کا نام بچے استاد سے پہلے ماؤں کے منہ سے سیکھتے ہیں اس لئے کہ عورتوں میں بیداری اور تعلیم و تربیت کا احساس موصوف ہی نے کرایا ہے۔ . . . ہم نے اپنے بزرگوں سے دلّی والوں کی وضع داری خوش اخلاقی اور منکسر المزاجی سن رکھی تھی۔ اس کا نمونہ حضرت علامہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ . . . مجھے ملاقات کا شرف ۱۹۳۵ء میں ہوا جبکہ میرے ایک دوست کو اردو میں ایم اے کی سند حاصل کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی نے میر تقی میر کے متعلق ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے کچھ وظیفہ دیا تھا. . . .

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے ساتھ ہم مصور غم کے کاشانۂ ادب پر (واقعہ کوچہ چیلان) پہنچے ۴ بجے شام کا وقت تھا۔ لوؤں کے ہلکے ہلکے تھپیڑوں سے ہمارا چہرہ سرخ ہو رہا تھا. . . . مصور غم کی رہائش زیادہ تر مکان کے زیریں حصے میں تھی مگر گرمی کی وجہ سے اور مہمانوں کی خاطر بالاخانے پر تشریف لے آئے اور ہمیں یاد فرمایا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں ایک ایسے شخص کے سامنے جا رہا ہوں جو مصور غم اور علامہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اردو نے اس کے گھر میں جنم لیا ہے۔ . . . ایک معمر بزرگ مقدس صورت ہماری طرف مسکراتے ہوئے بڑھے۔ اور کیفی صاحب سے (جن سے شاید ان کے بے تکلف مراسم تھے) فرمایا۔

"آئیے کیفی صاحب تشریف رکھیے"

اور کیفی صاحب سے ہاتھ ملایا۔ اب جناب مصور غم ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ کیفی صاحب نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ میری طرف ایک طرف مخصوص اور دل فریب نظر سے دیکھا اور مسکرا کر فرمایا:۔

"اچھا تو آپ وِکٹوریہ کالج میں پڑھاتے ہیں صادق میاں نے مجھ سے ذکر کیا تھا اسی لئے تو آپ کو دیکھتے ہی آئے اور اطلاع کی۔"

میں نے پہلے ہی سن رکھا تھا کہ موصوف اجنبی لوگوں سے ذرا دیر میں کھلتے ہیں مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ ہمارا مقصد تحقیق ادب ہے تو ہمارے ساتھ اس قدر اخلاق

ہی سے پیش آتے کہ ہم تمام عمر نہیں بھول سکتے
تو میرا خیال تھا کہ اتنا بڑا شخص زیادہ نہیں تو
تکبر اپنی گفتگو میں ضرور ظاہر کرے گا اور
بھی ہوتا مگر میری حیرت کی حد دیکھ کر کوئی انتہا
ہمارے موضوع پر اس بے تکلفی سے گفتگو کر رہے
میں اپنے شبہ کا احساس بھی نہیں۔
ن کے بعد ہی رازق الخیری صاحب تشریف لائے
نے ہم لوگوں سے یہ کہہ کر ملوایا یہ رازق میاں
راب ضعیف ہو گیا ہوں۔ جو کچھ میں کیا کرتا تھا اب
ہا۔

ہارے دوست سبھی جین تھے کہ میر تقی میر کے
ن کی زبان سے کچھ سنیں۔ چنانچہ کیفی صاحب نے
ذکر چھیڑ دیا اس سلسلہ میں جو کچھ گفتگو ہوئی اس میں
نہ سے بھرے ہوئے فقرے علامہ مرحوم کی زبان
تھے۔ میں خاموش اور حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ
کو لوگ مصور غم کہتے ہیں وہ ایسی ہنسنے ہنسانے
ں بھی کرسکتا ہے۔ دوران گفتگو میں شربت لایا
مرحوم کے شدید اصرار پر ہم سب نے شربت پیا۔ اس
کے بعد ان کے انتہائی اخلاق کے نقوش ہمارے
اب تک باقی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔
دوسرے روز حسب وعدہ ہم لوگ علامہ مرحوم
ت میں حاضر ہوئے۔ وہ ہمارے منتظر تھے۔ اور
پہنچتے ہی فوراً ہمارے ہمراہ حضرت ناصر نذیر فراق
کے ہاں آئے۔۔۔۔ جب میر تقی میر کے مکان کے
بحث چھڑی تو حضرت علامہ راشد الخیری ― اور
فراق دونوں نے متفقہ طور پر کہا کہ "میر تقی کا مکان
قلعہ کے قریب کمپنی باغ کے پورب میں تھا۔"

کچھ عرصہ بعد ایک روز شام کو میں ٹہلتا ہوا لکھنؤ پارک
میں پہنچا۔ دیکھا کہ چند سفید پوش بزرگ بیٹھے ہیں اور
دوران گفتگو میں وہ ہنس بھی رہے ہیں۔ میں نے غور سے
دیکھا ان میں علامہ راشد الخیری مرحوم بھی ہیں۔ تھوڑے
ہی فاصلہ پر میں دو ایک احباب کے ہمراہ بیٹھ گیا۔ میرے
کان علامہ مرحوم کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ مجھ کو حیرت تھی
کہ جس گروہ میں مصور غم ہوں وہاں لوگ اتنا ہنس کیوں رہے
ہیں۔ کیا مصور غم ایسی باتیں بھی کرتے ہیں جن سے لوگوں
کو ہنسی آئے۔۔۔۔ مرحوم نے اپنی تصانیف میں اگرچہ زیادہ تر
غم ہی کے جذبات کی ترجمانی کی مگر وہ جذبات مسرت کو بھی نہایت
بین طریقہ سے شاندار انداز سے کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی اس
خوش طبعی کو دیکھ کر میں نے ایک دن عزیزی صادق الخیری سے
آخر کہہ ہی دیا کہ میں آپ کے ابا جان یعنی حضرت مصور غم
کی خوش طبعی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تعجب ہے کہ غم و اندوہ
کی داستانیں لکھنے والا شخص اتنا خوش مذاق اور
ظریف الطبع ہو سکتا ہے۔"

پروفیسر منظور حسین موسوی ―――― ساقی راشد الخیری نمبر

"چند سال پیشتر جس وقت الہ آباد سے
ہندی رسالہ چاند نے اپنا اردو ایڈیشن نکالنا شروع کیا
تھا اور اس کی ادارت کی باگ ڈور جناب منشی کنہیا لال صاحب
کے ہاتھ میں تھی تو مجھے ارشاد ہوا تھا کہ جناب مولانا صاحب
مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے قلم کے چند جواہر ریزے
حاصل کرنے کے لئے ان سے درخواست کروں۔ اس وقت
جناب علامہ کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لئے میں مضمون
حاصل نہ کرسکا۔۔۔۔ مگر آپ کی شفقت آمیز گفتگو کا
مجھ پر بہت اثر ہوا"

لالہ جگ جیون لال بسنت گرایجوایٹ عصمت راشد الخیری نمبر

علمی آدمی "مولانا کو طبقۂ نسواں کی بہتری کا خیال ہمیشہ سے تھا اور وہی ان کی اکثر تصانیف کا محرک ہوا مگر رسالہ عصمت اور صبح زندگی کی مقبولیت نے اس خیال کو اس قدر تقویت دی کہ مولانا نے خدمتِ نسواں کو اوڑھنا بچھونا سب کچھ بنا لیا۔ گویا یہ ان کا مقصدِ زندگی تھا "صبح زندگی" کے بعد "شام زندگی" لکھی اور کئی تصانیف میں نسوانی زندگی کے سب مراحل طے ہوئے۔ جو ہر وقت کے لئے مناسب ہدایات دلچسپ پیرائے اور دلکش زبان میں لکھی گئیں اور اس پر اکتفا نہیں۔ عملی طور پر مفلس اور نادار لڑکیوں کی تربیت کا کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا۔ اور بڑی عمدگی سے نباہا"

سر عبدالقادر از لندن ——— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"مجھے یاد ہے ۱۹۲۳ء میں مغرب سے ذرا پہلے کا وقت تھا کہ علامہ مولوی سمیع اللہ خاں وکیل کے ساتھ تشریف لائے علامہ موصوف سے تقریباً دو گھنٹہ باتیں رہیں ان کی گفتگو سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے دل میں ملک اور قوم کا صحیح جذبہ موجود ہے اور ان کی عین خواہش ہے ہماری معاشرت کی حقیقی بنیاد یعنی صنف نازک کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ملک اور قوم کی ترقی ہو۔ دوسری اور تیسری مرتبہ اس وقت ملاقات ہوئی جب ۱۹۳۰ء میں علامہ موصوف حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ پہلی مرتبہ وہ میرے محب نواب ناظر یار جنگ بہادر کے یہاں ملے۔ اور تقریباً ایک یا ڈیڑھ گھنٹے تک اپنے چہیتے ادارے تربیت گاہ بنات کے انتظامات کی تشریح فرماتے رہے اس کے بعد میں نے اپنے یہاں تشریف لانے کی انہیں تکلیف دی اور اس مرتبہ بھی مسئلہ زیر بحث مسلمان بیبیوں کی معاشرتی سطح کو بلند کرنے کے ذرائع کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو نہ تھا۔

علامہ موصوف ان نادر ہستیوں میں سے تھے جو محض زبانی جمع خرچ کی بجائے کر کے دکھا دیتے تھے۔

پروفیسر ہارون خاں شیروانی ——— (عصمت راشد الخیری نمبر)

سیر و تفریح "بھائی علامہ کا بزرگانہ و مخلصانہ حسن سلوک صرف ہم بھائیوں ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ وہ اپنی بھاوجوں کو بھی عزیزہ زاہدہ بیگم سلمہا کی طرح اپنی حقیقی بہنیں تصور کر کے ان کا بھی ہر طرح سے پاس و لحاظ رکھتے تھے اور بھتیجوں اور ان کی دلہنوں اور بھتیجیوں اور ان کے شوہروں کو بھی اپنے ہی بچوں کی طرح سمجھ کر بزرگانہ شفقت سے ان کے مزاج و مذاق اور طبیعت کے موافق اپنے لطائف و ظرائف سے خوش کرتے تھے اور اس حسن عمل کا صرف زبانی ہی جمع خرچ نہ تھا بلکہ وہ بڑی فیاضی سے بیا روپیہ اور بیش قیمت وقت بھی صرف کرتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ جب بھائی علامہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سیر تماشے کو گئے تو دلی خواہش اور اصرار سے اور عزیزوں کو بھی شرکت دعوت دی اور اپنی خوش طبعی سے سب کو ہنسا کھلا کر خود بھی لطف اندوز ہوتے۔ ان کی ایسی بے انداز شفقتوں پر نازاں ہو کر ہمارے کنبہ کے لڑکے لڑکیاں اور بچے بچیاں اُن کے گرویدہ تھے۔ اور جب کبھی وہ خود کہیں باہر سیر و تفریح کرنا چاہتے تو سب سے پہلے اپنے انہیں بزرگ مگر جوان ہمت زندہ دل پھوپا جان کو جو ہم بڈھوں میں بڈھے جوانوں میں جوان اور بچوں میں بچے تھے، آگے رکھ لینے کی کوشش کرتے اور وہ بھی اگر کوئی مجبوری نہ ہوتی تو بڑی خوشی اور شفقت سے مع اپنے اہل و عیال کے ان کے ساتھ ہو کر بوڑھے بھائیوں اور بھاوجوں کو بھی طرح طرح کے حیلوں اور لطیفوں سے آمادہ کر لینے کی کوشش کر لیتے تھے۔ اور پھر جو جو اُن کے ساتھ جا سکتے تھے ان سب کو اپنی

[illegible] ہم بھی دریا اور نہر کی سیر کے لئے اوکھلے جا پہنچے اور وہاں [illegible] کے شکار، کباب اور فصلی میوہ جات کے لطف کے [illegible] بچوں کا کھیل کود بھی دیکھا اور بڑوں کو اپنے شعر و کلام [illegible] اپنی تذکروں اور رسالوں سے محظوظ کیا اور کبھی [illegible] صاحب کی والدہ پاکسی اور خوش منظر مقام مقبرہ وغیرہ [illegible] سبزہ زار کی طرف جا نکلے اور وہیں جنگل میں منگل منا لیا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کنبے کے کئی لڑکوں نے اپنی فرصت [illegible] خوشگوار موسم کو غنیمت سمجھ کر سیر و تفریح کے لئے باہر چلنے کی ٹھان لی اور ساتھ لے جانے کے لئے ناشتہ وغیرہ کا بھی چپکے چپکے انتظام کر لیا اور مجھ سے پاکسی اور بھائی سے پہلے ذکر کرنے کی جرأت ان کو اس لئے نہیں ہوئی کہ شاید نہیں ان کے اس طرح جانے میں تامل ہو۔ مگر وہ آپس میں مشورہ کر کے سیدھے اپنے ناز بردار الٰہی حضرت "پھوپا جان" کے پاس پہنچے۔ انہیں ان کی دلجوئی کا ہر حالت میں خیال رہتا تھا۔ کیفیت کیا ہوں کہ بھائی علامہ جھومتے جھامتے اور مسکراتے چلے آتے ہیں۔ سلام علیکم کے بعد فرمانے لگے۔

"بھائی صاحب آج کا دن تو گھر میں لیٹے بیٹھے رہنے کا نہیں ہے چلئے کہیں آس پاس کچھ سیر و تفریح کر آئیں اور لڑکیاں اور بچے بھی کھیل کود کر خوش ہو لیں۔" اسی طرح اور بھائیوں سے بھی اپنی خوش طبعی کے انداز میں کچھ جا کر کہا غرضیکہ جو جو اعزا اس وقت جا سکتے تھے وہ فوراً تیار ہو کر بھائی علامہ کے اہل و عیال کے ساتھ جن میں ان کی تربیت گاہ کی کئی کمسن یتیم بچیاں بھی تھیں۔ پہلے سے منصور کے مقبرہ کو روانہ ہو گئے اور باقی کو وہ خود اپنے ساتھ لے کر بعد میں چلے۔ اتنے میں وہاں بچوں کے کھیل کود اور کھانے پینے کا سامان اور رہنے کے آرام دہ کمرے کا سب انتظام ہو گیا۔ اور پھر کئی گھنٹے صاف آب و ہوا میں بڑے لطف کے ساتھ گذارنے کے بعد سب چھوٹے بڑے ماشاء اللہ خوب تازہ دم اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔"

کپتان مولوی حبیب الرحمن خان بہادر
سی آئی ای۔ ڈی لٹ ——— (عصمت جولائی)

"بھائی کا دن ہنسنے ہنسانے میں گذرتا تھا۔ روزانہ شب محفل جمتی تھی۔ گانا بجانا۔ گیت لطیفے، مذاق، چہل کرنے، بیڈمنٹن۔ چھوڑ دی کر دوا ہی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہ چہل پہل یہ رونق جن کے دم سے تھی ہائے وہ رخصت ہو گئے۔ ہر تہوار کا دن ہوتا یا گرمیوں کی چاندنی [illegible] گھر پر ٹھہرنا کٹتا دیکھتے تھے سیر و تفریح میں عزیزوں اور رشتہ داروں کی شرکت مقدم تھی۔ اُن کا ڈھنگ نرالا تھا اُن کا طریقہ عجیب خواہ گھر میں محفل ہو یا گھر سے باہر سیر و تفریح، سب کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ مگر بیٹھے سب سے الگ۔ صرف اماں جان اُن کے پاس بیٹھی تھیں دور سے بیٹھے بیٹھے لطف اٹھاتے تھے۔"

راشدہ بیگم ——— (عصمت جولائی)

وضعداری

"میری مولانا سے ۱۹۰۹ء میں ملاقات ہوئی جبکہ وہ زینت محل کے کمرے کی ایک اسلامی انجمن میں کبھی کبھی تقریر کرنے جایا کرتے تھے اس وقت وہ ڈاکخانے کے محکمہ حساب میں نوکر تھے۔ اس کے بعد سر شیخ عبد القادر اور شیخ محمد اکرام کے دفتر رسالہ مخزن میں ان سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ اس وقت تک ان کی ادبی شہرت زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ مگر ان کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۰۹ء سے لے کر رحلت کے وقت تک ان کی ملت یکساں رہی کبھی اس میں جھول نہیں پڑا۔ ورنہ آجکل کے زمانہ میں جب کسی کا کوئی کام پڑتا ہے تو تعلق بڑھایا جاتا ہے اور جب کام ختم ہو جاتا ہے تو تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔"

خواجہ حسن نظامی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"وہ ہندوستان کی تہذیب قدیم کا ایک نہایت

سچا اور صحیح نمونہ تھے۔ کسر نفسی۔ وضع داری اور شرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جس سے ان کے بچے تعلقات ہو گئے وہ آخر دم تک قائم رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام دوست ان کے لئے آج آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم دہلی کی مٹتی ہوئی تہذیب کی بس آخری شمع تھے۔

وہ خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ "دہلی کی تہذیب کی دو چار نشانیاں باقی رہ گئی ہیں۔ اب چند روز بعد یہ بھی نہ رہیں گی۔ اور خاص دلّی میں چراغ لے کر ڈھونڈو گے تو دلّی کا آدمی نہ ملے گا"

منشی عبدالمجید اڈیٹر مولوی ——— (عصمت ۱۹۳۶ء)

"اُف وہ ان کی وضعداری اُف وہ اُن کی سادگی
اور ہر لحظہ وہ خدمت کے لئے آمادگی"

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی ——— عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

"مولانا کو دوستوں کی تعداد بڑھانے کا شوق نہ تھا ایک طرف تو اُن کی یہ حالت تھی کہ گنے چنے دو چار احباب کے درمیان میں بیٹھے ہیں۔ یکایک کوئی اجنبی آ گیا اور مولانا ایک کبھی خود کبھی، اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خاص مولانا سے ہی ملنے کی کسی نے زحمت گوارا کی ہے اور مولانا اس سے ملتے ہوئے گھبرا رہے ہیں۔ بائیس تیئیس برس کی بات ہے، مولانا جامع مسجد کے نیچے سے چلے آتے تھے دہلی کے مشہور شاعر ..... مرحوم نے مولانا کو آواز دی علامہ.... امام اُن کے ساتھ تھے۔

..... صاحب نے کہا کر مولانا ..... صاحب آپ کی زیارت کے مشتاق تھے۔ مولانا دو سکنڈ رُکے اور فرمایا اچھا اور روانہ ہو گئے۔ سو ایک طرف تو ان کی یہ حالت تھی دوسری طرف جیسیوں دیکھنے والوں نے دیکھا ہو گا کہ رمضان کا مہینہ ہے۔ جمعہ کی شام۔ سیکڑوں عورتیں ..... ان سے کھانا لئے جا رہے ہیں ایک بڑھیا کو مولانا ہاتھ سے کھانا لا کر دیا اور پھر فوراً نکل کر اُس سے دور چلے گئے۔ یہ مولانا کے بچپن کے یار تھے۔ لیکن بچپن میں انسان ہر درجہ اور ہر حیثیت کے بچوں میں بیٹھتا ہے۔ مگر بڑا ہو کر سب کو بھول جاتا ہے۔

مولانا نے جوانی میں ملازمت کی تھی ایک اُن کے ہم عمر ابھی مرے ہیں اُن سے بس یہی دو سامنا ہوا اور مولانا کا چہرہ کھل گیا اور بغلیں کھول اب سینے آگے اُبھارے جاتے ہیں۔ اور بڑھتے ہیں۔ قریب پہنچے اور پہلوان صاحب کو گلے لگا پُرسی کی بچوں کو پوچھا ایک آدھ ہنسی کی بات کی اور ...

بھائی فضل احمد بیان کرتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۶ء جب میں اسی دفتر میں ذکر ہوا تو سب سے پہلے جس سے میری ملاقات ہوئی وہ مولانا مرحوم تھے۔ اُس وقت سے لے کر مرتے دم تک تیس سال کا زمانہ ہوتا ہے اس میں مولانا سے کبھی میرے تعلقات کدر نہیں ہوئے نوکری سے نکل کر اعلیٰ درجے کے انشا پرداز بنے ساٹھ ستر کتابوں کے مصنف ہوئے اور خدا جانے سلسلے میں کہاں سے کہاں پہنچے۔ مگر اُن کی جو وضع ساتھ اُس وقت تھی اُس میں آخر تک فرق نہ آیا مجھ سے ہمیشہ اس طرح ملا کئے جس طرح کہ ابتدا میں تھے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں خواجہ فضل احمد صاحب کی لڑکی وقت سیکر میں تھی باپ سے دور سخت بیمار ہوئی اور بیماری کی اطلاع بذریعہ تار خواجہ فضل احمد صاحب جس کی وجہ سے خواجہ فضل احمد صاحب فرماتے ہیں بہت متردد تھا۔ اس کی خبر پا کر مولانا دن میں دو

تین تین بار میرے پاس آتے اور معلومات کرتے کہ کوئی تازہ
تحریر کوئی غلطی یا کوئی کام کیا ہو تو ہر طرح تسلی اور تشفی دیتے۔
خواجہ فضل احمد صاحب کا بیان ہے کہ جس دن میں سیکنڈ
... ہوا۔ اس دن بہت دیر تک مولانا میرے پاس
رہے تو ترتیب آرگن میں کہا کہ روپے کی ضرورت
ہو تو ... میں نے جواب دیا نہیں الحمد للہ۔ لیکن ان کی
دل سوزی کی ادا سے دل باغ باغ ہوگیا اور قدیم دستور
کے جو تذکرے اگلے بزرگوں سے سنے تھے ان کی تصویر آنکھوں
کے سامنے پھر گئی۔

ملا واحدی ———— (ساقی راشد الخیری نمبر)

"خواجہ فضل احمد صاحب اور مجھ سے بھی مولانا عارف
کی دوستی تھی۔ لیکن ہم آپس میں ایک دوسرے سے روٹھ
جاتے تھے مگر مولانا رُوٹھنا جانتے ہی نہ تھے۔ ایک دفعہ میں
مولانا سے کسی بات پر بگڑ گیا۔ اور شاید مہینہ ڈیڑھ مہینہ مولانا
کی اور میری بات چیت بند رہی۔ اتفاق سے اسی دوران
میں میرے چھوٹے بھائی کی شادی ٹھیر گئی۔ مولانا سے
میں خفا تھا بھلا انہیں بلاوا کیوں دیتا لیکن ٹھیک بارات
روانگی کے وقت مولانا خود آ گئے اور مجھے اپنی اس سادگی
بے تکلفی اور یگانگت سے پانی پانی کر دیا۔"

ملا واحدی ———— (ساقی راشد الخیری نمبر)

"اب مولانا نے قصے کہانیاں مضامین عصمت
کے پردے کے باہر آ کر بھی لکھنے شروع کر دیے۔ یہ زمانہ تھا
کہ میری ان سے ملاقات ہوئی۔ شاید ۱۹۱۲ء میں یا ایک
دو سال بعد ملے اور محبت سے ملے خلوص سے ملے مہر کا لی
وضعداری کا نمونہ بن کر ملے۔ غرض اُس دن سے مرتے دم
تک مرحوم نے ملنے کا جو انداز اور بے تکلفی کی جو وضع تھی
قائم رکھی۔ میں ان کا مداح بھی تھا اور ان کا ادب اور احترام
بھی ان کی ادیب ہونے کی شان کے مطابق کرتا تھا۔ اوّل
اوّل جب ہم ملا کرتے وقت کافی تھا علمی اور ادبی مشغلوں
کی فرصت تھی۔ راشد صاحب سے گھنٹوں ادب پر ملی باتیں
رہتی تھیں۔ ادھر انہوں نے کچھ لکھا اور آئے اور کچھ حصہ سنا
گئے۔ یوں تو جو واحدی صاحب کے اور ان کے مراسم تھے
اور جو عارف مرحوم اور ایک دو اور دوستوں سے ان کے
تعلقات تھے ان کا تو پوچھنا کیا مگر ان حضرات کو چھوڑ کر
جو عنایت وہ مجھ پر کرتے تھے وہ اپنی جگہ بالکل مخصوص تھی
کبھی کبھی مشورہ بھی کرتے تھے مگر اکثر اُردو کے شاعروں اور
شاعروں اور کبھی کبھی انگریزی کے تذکرے۔ آصف علی

سخن فہمی

"کسی دن آئے اور یوں کلام شروع کیا۔
"سلام علیکم" کہو میاں روٹی کھالی؟ (ابھی
کھانا نہیں کھایا)
"جی نہیں حضرت! ابھی کہاں آٹھ ہی تو بجے ہیں!
کہو کچہری جا رہے ہو؟"
"ہاں جانا تو ہے"
"بس تو ہم جاتے ہیں"
"اے واہ آتے دیر نہیں ہوئی اور ابھی سے چلتے
ہیں۔ میرے کچہری جانے کا خیال نہ کیجیے"
"اچھا چلو ایک پان کھا کر چلے جائیں گے۔ بھئی آج
رہ رہ کے مجھے میر حسن کے اس شعر پر وجد آ رہا ہے ؎

اسے میں نے چڑھنے کو گھوڑا دیا
کہ اس نال زادی کو جوڑا دیا

کیا جوڑا کہا ہے۔ بھلا کس کا مقدور ہے کہ یہ زبان نبھا سکے۔
صاحب میر حسن ہیں۔ کوئی ہنسی کھیل ہے اور وہ مصرعہ
"کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی"
مگر مولانا اس میں کیا بات نکلی یہ تو ایک معمولی بات ہے۔

"بھئی واہ غضب کرتے ہو۔ ارے میاں یہی تو کمال ہے کیا وہ جھانجن سے جھانجن بجاتی ہوئی نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر بھلا لونڈیاں باندیاں جھانجن پہنتی ہیں؟ کڑے ہی اُن کے پاؤں میں ہوتے تھے۔ اور اب تو لونڈیوں باندیوں کا دفتر ہی اُٹھ گیا۔ اور پھر فدا اس اٹکھیلی کو دیکھو خوشی کا موقعہ ہے لوڈی اِترائی ہوئی جا رہی ہے۔ شاید گنگناتی ہوئی بھی چل رہی ہو۔ اور کڑے سے کڑے کو بجا کر تال دیتی جاتی ہو۔ بھئی نہیں خدا کی قسم ذرا نقشہ تو کھینچو۔ کیا چلبلا پن ہے۔ کیا اندازِ سخن ہے۔ بھلا کوئی آج تو یہ کہہ کر دکھا دے"

آصف علی بیرسٹر ایٹ لاء ـــــــ (عصمت ۳۶ء)

"مثنوی گلزارِ نسیم کا ایک مشہور شعر ہے کہ ؎

سنبل میرا تازیانہ لانا
شمشاد سے سولی پر چڑھانا

کہتے ہیں کہ کسی نے داد حاصل کرنے کے لئے۔ مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے سامنے یہ شعر پڑھا۔ مولانا نے سن کر کہا "بہت خوب ہے" اور خاموش ہو گئے۔ ان صاحب نے اس شعر کی بہت تعریف کی اور فرمایا "علامہ صاحب ذرا توجہ فرمائیے کہ نسیم نے اس شعر میں وہ بات پیدا کی ہے جو کسی مثنوی میرحسن میں نہیں۔ جب تعریف مبالغہ سے بھی آگے بڑھ گئی تو مصورِ غم نے کہا:۔

"پھر فرمائیے کون سا شعر ہے"

ان صاحب نے کہا یہی حضرت

سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد سے سولی پر چڑھانا

علامہ نے برجستہ کہا بھئی واہ سبحان اللہ پھول پنکھڑیوں سے کیا لاٹھی پونگے کی خدمت لی ہے جو طبع سلیم پر بارگراں ہے۔" (رسالہ تخلیق پنجاب ...)

محمود سلطانہ ـــــــ (انجام کراچی ...)

"ایک صاحب کو مطالعہ کتب کا بہت شوق ... اپنی تنخواہ میں سے ۱۲½ فیصدی کی کتابیں خ... روزانہ کئی گھنٹے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ... دورہ میں علامہ مغفور کے ساتھ تھے۔ وہ بعض ... تلفظ غلط کرتے۔ چنانچہ دورانِ گفتگو میں انہوں ... میں اس سے بھینچ بھینچ (بروزن کھینچ کھینچ) کر ... وقت ہم ایک ڈاک بنگلہ میں ٹھیرے ہوئے تھے ... کو بھینچ کہنے کا علامہ مغفور نے خوب لطف ... کیا کس طرح لے۔ انہوں نے کہا بھینچ بھینچ کر ... ایک شعر لکھ لو ؎

جو پودوں کو پانی دیا سینچ سینچ
لگے پھول لگنے لگے بینچ بینچ

اور پھر بار بار ان سے یہ شعر پڑھوایا اور واہ واہ کہہ کہہ کر داد دی۔

شاید منٹگمری کا واقعہ ہے ایم اے کے ای... ساتھ ہو لئے۔ دریا پار کرنا تھا۔ پل سے یا کشتی ... ایک جھولے میں جو تاروں میں لٹکا ہوا تھا ایک ... سے دوسرے کنارے دریا پار کر کے جو ہم پہنچے تو ... بھونک رہے تھے۔ ان صاحب نے کہا "یہ ان لوگ... عادت ہے کہ پیچھے چلتے ہیں" علامہ مغفور کتوں ... "لوگوں" کا لفظ سن کر پھڑک اٹھے۔ اور دو چار ... کہے جن کے جواب میں وہ صاحب کتوں کو لوگوں ... جس طرح کسی اچھے شعر پر پھڑک اٹھتے ... طرح برمحل گالی بھی ان کے لئے لطیفہ ہوتی تھی۔ ... بے بندی غلط محاورہ یا تلفظ یا غلط لفظ کے ...

نفس اور طبیعت کا بھی لطف اٹھاتے تھے۔ مرتضیٰ بیگ والا
[illegible] بہادر شاہ ظفر کا کلام غلط سلط پڑھتا تھا۔ دلی
[illegible] کے اجڑنا گمر پہنچ ہی اس سے زمانے" ایک
[illegible] بادشاہ کی کوئی چیز سناؤ" وہ گا نا شروع کر دیتا
[illegible] ایک مصرعہ اس نے ہمیشہ غلط پڑھا۔
"[illegible] چمن سے اجڑ گیا ہمیں اسی کی فصل بہار ہے"
[illegible] کی بجائے جو خزاں چمن سے وہ کتنا نوجہاں ایک
[illegible] مصرعہ کی درد انگیزی سے وہ متاثر ہوتے تو دوسری
طرف اس کے غلط پڑھنے کا لطف اٹھاتے اور بار بار وہ
[illegible] دوہراتا: جو خزاں چمن سے اجڑ گیا"

رازق الخیری

نہیں اپنا دنیا میں پائے گا کس کو
کلام اپنا سائل سنائے گا کس کو
[illegible] بھاتا تھا بھائے گا کس کو
مزہ جو وہ لیتا تھا آئے گا کس کو
سخن فہم ایسا میسر کہاں ہے
سخن آشنا گو کہ دنیا جہاں ہے

[illegible] سراج الدین احمد خاں سائل —— (عصمت اپریل ۳۶ء)

وہ سخن گو ہو نہ ہو لیکن سخن فہموں کا شاہ
[illegible] کسوں کو داد دینا جانتا تھا وہ گناہ
شعر کو ایسا سمجھتا تھا کہ نکلے دل سے آہ
اس کے مرنے سے ہوئی بزم سخن گستر تباہ
علم کا وہ دیوتا تھا۔ فضل کی وہ جان تھا
سچ یہ ہے اس عہد کا سب سے بڑا انسان تھا

آغا شاعر قزلباش دہلوی —— (عصمت ۳۶ء)

سادگی کس قدر بھولی ادا تھی۔ کس قدر سادہ مزاج
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے ہیں ایسے لوگ آج

تاثیر کا نپوری —— (عصمت فروری ۳۶ء)

"میں نے مولانا سے بڑھ کر بے نفس، کم سخن، ملنسار
سادہ مزاج اتنے بڑے آدمیوں میں جن کو مولانا تھے۔
کسی کو نہیں پایا"

ملا واحدی صاحب کی تقریر ریڈیو پر —— ۵ فروری ۳۶ء

"یہ جو ایک بڑی نورانی شکل کے بڑے میاں خیر خیر
کرتے چلے آ رہے ہیں علامہ راشد الخیری ہیں۔ انہوں نے اپنی
ساری عمر اس قلندرانہ وضع میں گزار دی۔ . . . انہوں نے
اپنی زندگی اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے وقف کر رکھی
ہے۔ سادگی ان کا خاصہ بھی ہے۔ بڑے آدمی ہیں۔ مگر
چھوٹے آدمیوں کی خدمت کر کے انہیں خوشی حاصل
ہوتی ہے"

شاہد احمد دہلوی —— ساقی

قدر افزائی "آپ کو میرے ہاتھ کی کتری چھالیہ پسند
تھی۔ مامی جان کو دکھا کر فرماتے تھے
کہ باجرہ کے دانے سے مقابلہ کیجئے"

مسز برلاس —— ساقی راشد الخیری نمبر

قناعت اگر ان کے پاس روپیہ وافر ہے تب بھی ٹھیک ہے
اگر روپیہ کی کمی ہے تو اس کا بھی غم نہیں۔ خوش حال نیکو
بہرحال خوش اند کے وہ پورے مصداق تھے"

انہیں بے جا خوشامد سے ہمیشہ سخت نفرت تھی۔ کوئی
عہدہ ملے اس کی نہ خواہش تھی نہ حاجت تھی"

خواجہ فضل احمد رشید دہلوی —— (عصمت فروری ۳۶ء)

وہ مالا مال جس دولت سے رہتے تھے قناعت تھی
قناعت کی بدولت جو تھی عزت کس طرح بھولے

ابو الاعجاز ازل —— (عصمت فروری ۳۶ء)

وقت کی قدر وقت کی قدر دانی کی ایک مثال لکھتی ہوں
صادق میاں کے نکاح کے بعد مولانا

نے اُن سے کہا کہ :۔

" تمہارا کام ختم ہو گیا تم کالج جاؤ "

چنانچہ وہ چلے گئے عورتوں کو دُولھا دلہن دیکھنے کی خوشی ہوتی ہے ۔ چاروں طرف سے دُولھا کی پکار پڑی مگر دولھا کا پتہ نہیں ۔ آخر معلوم ہوا کہ ان کو پڑھنے بھیج دیا گیا ہے "۔

مسز برلاس ———— (عصمت جولائی [illegible])

واجدہ بیگم کے نکاح پر وقت کی پابندی کا واقعہ تفصیل کے ساتھ [illegible] کے واقعات میں آچکا ہے ۔

روشن خیالی " ایک روز میں دولت خانہ پر حاضر ہوئی ۔ گرمی کا زمانہ تھا چھوٹے مکان کے اندر کمرے میں ننگے بدن ایک تہہ بند باندھے گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے تھے ۔ معلوم ہوتا تھا کچھ لکھ رہے ہیں ۔ مجھے دیکھتے ہی قلم رکھ دیا ۔ ملازمہ فرشی پنکھا کھینچ رہی تھی ۔ فرمانے لگے " پنکھے کے نیچے آن بیٹھو ۔ غضب کی گرمی پڑ رہی ہے ۔ اوسان خطا ہوئے جاتے ہیں "

بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ شام کے کھانے پر برلاس صاحب بھی بلائے گئے تھے ۔ بڑے مکان کی چھت اُس وقت کھلی ہوئی تھی ۔ بغلی کمرہ بعد میں پڑا ہے مازق بھائی اس کوٹھے پر رہتے تھے ۔ فرمانے لگے :۔

" نیچے گرمی ہے ۔ رازق کے کوٹھے پر ہی سب بیٹھیں گے اور وہیں کھائے پئیں گے "۔

" مانی جان نے کھانے کا وہیں انتظام کیا ۔ کھانے سے فراغت ہونے کے بعد میں نے گھر واپس جانے کی اجازت چاہی فرمانے لگے :۔

" رات کا وقت ہے ۔ ڈولی ڈنڈے کی ضرورت نہیں یونہی چلی جاؤ ۔ ورزش بھی ہو جائے گی ہوا بھی کھاؤ گی "

میں نے برقعہ نہ ہونے کا عذر کیا ۔ فرمانے لگے اپنی

[illegible]

مانی کا لے لو اور صادق کو ساتھ لے جاؤ وہ لا تھے آئیں گے " مجھے کچھ تامل ہوا ۔ مگر انہوں نے اصرار کیا ۔ اور برلاس صاحب کے ساتھ پیدل [illegible] ۔ دراصل عورتوں کی تکلیف اور حبس بجائے علامہ مرحوم کو بڑی تکلیف ہوتی تھی "۔

مسز برلاس ———— (عصمت جولائی [illegible])

(ٹونک میں) ایک شب برلاس صاحب مازق بھائی قیصر میاں اور میں بیٹھے برج کھیل رہے تھے آپ باہر تشریف لائے سینے اپنے تاش پیچھے چھپا لئے کھڑے دیکھتے رہے آخر فرمانے لگے :۔

" رُک کیوں گئیں ۔ میں ایسی منحوس طبیعت کا آدمی نہیں ہوں کہ بہو بیٹیوں کو تاش کھیلتے دیکھ کر بُرا مانوں میرے گھر میں خود واجدہ ۔ رازق دُولھن ہر قسم کے کھیل تاش شطرنج پچیسی پنگ پانگ کھیلتی ہیں اور میں اپنے سامنے کھلواتا ہوں ۔ یہ کہہ کر وہیں مسہری پر لیٹ گئے اور سامنے کھلواتے رہے "

مسز برلاس ساقی [illegible]

حافظہ " [illegible] میں جب میں بھوپال میں ملازم تھا ایک روز جس وقت میں دفتر پہونچا تو مسٹر محمود صدیقی بی اے مدیر ظلِ السلطان " کے بھائی ایوب رضا میری میز پر آئے اور کہنے لگے : صدیقی صاحب علامہ راشد الخیری تشریف لائے ہیں ۔ رازق میاں بھی ساتھ ہیں ۔ . . میرا یہ حال کہ اشتیاقِ ملاقات میں دن کاٹنا محال ہو گیا ۔ جوں ہی دفتر کے دروازے میں قدم رکھا ۔ میری نظر ایک بزرگ پر پڑی ۔ طویل قامت ۔ سفید ریش ۔ پُر وقار ۔ گر متبسم چہرہ بھویں کسی قدر گھنی ۔ رعب دار اور نہایت روشن آنکھیں مضبوط کاٹھی ۔ پیشانی سے مذہبیت کا نور برس رہا تھا

باب سترھواں ——— بیوی اور بچے

۱۔ بیگم راشد الخیری مرحومہ

علامہ مغفور کی رفیقۂ حیات جنہیں سسرال سے "مبارک زمانی" خطاب ملا تھا، صحیح معنوں میں شوہر کے لئے مبارک ثابت ہوئیں۔ وہ ہنرمند، سلیقہ شعار، کفایت شعار، جفاکش اور امن پسند نہ ہوتیں، اُن کا مزاج، اُن کی طبیعت اُن کی فطرت کچھ اور ہوتی، برخلاف اور برعکس۔ تو علامہ مغفور کی خانگی زندگی دیکھنے والوں کے لئے قابلِ رشک ہوتی نہ اُن کے ابتدائی معاشرتی ناولوں اور افسانوں کے وہ حصے جو خانہ داری سے متعلق ہیں اس قدر کامیاب۔ اوّل تو علامہ مغفور خود ہی کچے کانوں کے نہ تھے پھر نہ ماں نے بہو کے خلاف بیٹے کو کبھی کچھ لگایا بجھایا، نہ بیوی نے ساس کے خلاف کبھی شوہر کے کان بھرے۔ بچوں میں لڑائیاں ہوتیں نند بھاوج میں کبھی اس وجہ سے گرم گفتگو بھی ہو جاتی مگر کانوں کان علامہ مغفور کو خبر نہ ہوتی۔ فرحت افزا اور راحت بخش ماحول تھا اور خوشگوار فضا۔ انہیں اپنے گھر ہی میں سکونِ قلب میسر نہ ہوتا تو وہ حقوقِ نسواں اور اصلاحِ نسواں کے لئے مسلسل جہاد جاری نہ رکھ سکتے تھے۔

"ساس کلیجہ کی پھانس اور نند بجلی بسنت! مگر بیگم راشد الخیری صاحبہ کی خدمت اور محبت نے دونوں کو اپنا حقیقی رفیق اور سچا دوست بنا لیا تھا۔ ساس نے بارہا بھری محفلوں میں کہا "الٰہی جیسی نیک بہو تو نے مجھے دی ہے سارے جہان کو دے" اور نند جب تک زندہ رہیں بھاوج کا کلمہ پڑھتی رہیں۔ انتقال سے دو روز پہلے دادی اماں نے اماں کو اس قدر دعائیں دیں کہ خاندان کے بعض بزرگوں کا بیان ہے کہ کوئی ماں بھی اپنی بیٹی کو زیادہ سے زیادہ اتنی دعائیں دیتی ہوگی۔ ساس اور نند ہی نہیں ساری سسرال کی عزت ان کے محبت بھرے دل میں تھی۔ ابا جان کا کوئی حقیقی بھائی نہ تھا مگر اُن کے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ اماں جان کا سلوک کیسا تھا اس کا اندازہ مولوی عبدالغفار صاحب الخیری کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے دس بارہ عزیزوں کے سامنے فرمائے تھے:

"بھابی کا برتاؤ ہمارے ساتھ ایسا ہے کہ حقیقی بھاوج کا بھی نہیں ہے"

اور اُن کے بڑے بھائی ڈاکٹر جبار خیری مرحوم جب پچیس سال یورپ میں گذار کر وطن واپس آئے تو ایک موقعہ پر کہا:

"بھابی نے ایسی محبت سے کھانا کھلایا کہ اماں یاد آگئیں" اور جب والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا تو ابا جان کی چچا زاد بہن حامد بیگم صاحبہ خیری نے دو ڈھائی سو بیبیوں کے سامنے زار و قطار روتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے:

"ایسی بہو آج تک ہمارے خاندان میں نہیں آئی اور نہ آئندہ آئے گی"

ابا جان کو اپنے بعض عزیزوں کی طبیعت پسند نہ تھی۔ اُن میں سے کوئی آتا تو چند منٹ بعد ہی وہ اٹھ کر باہر چلے جاتے مگر آنے والے گھنٹوں اماں جان کے پاس بیٹھے اور وہ زیادہ سے زیادہ خاطر مدارات کرتیں۔ ابا جان کو یہ

ابا جان کا چھوٹے سے چھوٹا کام وہ ہمیشہ اپنے
ہاتھ سے کرنا چاہتی تھیں۔ گھر میں ملازمین بھی تھیں ملازم لڑکے
بھی مگر ان کا حقہ خود تازہ کرتیں۔ چلم اپنے ہاتھ سے بھرتیں
پان خود بنا کر ڈبیہ میں رکھتیں۔ ان کا بچھونا خود بچھاتیں خود
اٹھاتیں۔ ابا جان خفا بھی ہوتے کہ یہ نوکروں کی فوج
کیوں پال رکھی ہے۔ جب یہ میرا بچھونا بھی نہیں کر سکتے"
وہ سن کر خاموش ہو جاتیں۔ سارے گھر کا کھانا ماما پکاتی
مگر ابا جان کے لئے ہانڈی بھر گوشت کی ہنڈیا بڑھاپے میں
بھی وہ اپنے ہاتھ سے بھونتیں۔

کسی سے ملنے جاتیں تو گھڑی ڈولی واپس آ جاتیں کہ
شوہر کو کسی قسم کی تکلیف ان کی عدم موجودگی میں نہ ہو۔
جب نوکری کے زمانے میں ابا جان دلی سے باہر جاتے اور وہ
نہ جا سکتیں تو روزانہ خط آتا جاتا تھا۔ جب تک دادی اماں
زندہ رہیں تنخواہ ابا جان نے لا کر دادی اماں کو دی اور انہوں
نے اپنے ہاتھ سے بہو کو۔ دادی اماں کے بعد ابا جان نے ملازمت
چھوڑ دی تو جو آمدنی ہوتی اماں جان کو دینے کے بعد پھر خرچ
سے کسی قسم کا سروکار نہ رکھتے۔ ان کی زندگی میں ایسا دور
بھی آیا ہے جب یہ آمدنی گھر کی ضرورتوں کو کافی نہ ہوتی اور
انہیں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی وہ تنگی ترشی سے گزارہ
کرتیں۔ مگر ابا جان سے شکایت نہ کرتیں کہ وہ کس طرح جفا
کشی کر کے گھر چلا رہی ہیں۔ کئی دفعہ ان کا زیور عصمت اور
پریس کی نذر ہوا۔ ابا جان کو زیادہ کہنے کی نوبت نہ آتی۔
اور وہ خود ہی کوئی نہ کوئی زیور دے دیتیں۔ خدا جانے کتنی
دفعہ انہوں نے خاموشی سے بنوائے اور کتنی دفعہ عصمت
تمدن کی نذر ہوئے۔ صبر و ضبط ان میں انتہا درجہ کا تھا
حرف شکایت تو کبھی ان کی زبان پر آیا ہی نہیں۔ ان کا
۵، ۶ ہزار کا جہیز چوری گیا۔ عصمت کے دفتر میں دو دفعہ
آگ لگی۔ ۲۰، ۲۰ ہزار کا سرمایہ تھا تو محض مالی نقصانات
ہی نہیں روحانی صدمات بھی بہت اٹھائے۔ آٹھ نو
بچوں کی موت دیکھی۔ ڈیڑھ ماہ ابا جان بیمار رہے۔ ایک
منٹ کے لئے ان کی پٹی نہ چھوڑی۔ مسلسل کئی کئی راتیں
ان کی خدمت میں گزریں۔ مگر مجال ہے کہ ان کے ضبط و
استقامت میں فرق آ جاتا۔

سرشت میں نیکی، فطرت میں محبت، طبیعت میں
ظرافت دونوں کی تھی۔ لیکن مزاج میں اختلاف تھا۔
ابا جان بذلہ سنج اور خوش طبع تھے۔ وہ اپنی ملازمہ اور ماما
تک سے مذاق کرتے تھے۔ مگر اماں جان سنجیدہ اور بردبار
خاتون تھیں۔ ابا جان اماں جان سے کوئی مذاق کی بات کہتے
میں اور آپا بیٹھے ہوتے اور حاشیہ آرائی کرتے اماں جان
کچھ دیر تو سنتیں اس کے بعد ہم پر خفا ہونے لگتیں اور ابا جان
ہنستے ہوئے اٹھ کر باہر چلے جاتے ان کی خفگی کا شعلہ ٹھنڈا
رات کو زیادہ دیر تک جاگنے کی وجہ سے کبھی آنکھ لگ جاتی
قصائی کالونی کا آتا اس سے فرماتے :۔

"تجھ سے کتنی دفعہ کہا ہے۔ ذرا اونچا سنتی ہیں
پاس جا کر پوچھ"

(حالانکہ وہ اونچا نہ سنتی تھیں) وہ کان کے قریب
منہ لے جا کر کہتا :۔

"بیگم صاحب کتنا گوشت آئے گا"

وہ اٹھ کر اس پر خفا ہونے لگتیں اور ابا جان دوسری
طرف منہ کر کے ہنسنے لگتے۔

"آہ اماں جان" ——— عصمت اپریل سنہ ۴۴ء

سسرال کے ایک ایک زندہ فرد کا یہی خیال رکھتی تھیں
انہیں بھی یاد رکھتی تھیں جنہیں دنیا سے اٹھے مدت گزر چکی
تھی۔ مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم یعنی علامہ مغفور کے

فرمایا "ہر وقت تمہارے پاس آدمی آتے رہتے ہیں
ایسے خراب پہننے سے تمہاری منافی ہوگی۔ لباس اور زیبائش
کی چیزوں سے آدمی پہچانا جاتا ہے۔ اچھا جاؤ اپنا کام کرو
مجھے قرآن شریف پڑھنا ہے" (عصمت اپریل [illegible])

علامہ مغفور نے تربیت گاہ قائم کی اور وہ ان کے
ساتھ دورے پر جاتیں تو لڑکیاں انہیں کی وجہ سے بورڈنگ میں
آتی تھیں۔ کسی کی آنکھیں دکھنے آجاتیں تو اپنے ہاتھ سے
فالودے بنا بنا کر کھلاتیں۔ کسی کو بخار ہوتا تو اپنے پاس سلاتیں
ایک بچی کو رات کے دس بجے ڈاکٹر نے نمونیہ تجویز کیا تو
تین گھنٹہ میں روئی کی نئی کرتی سی کر پہنا دی۔

ایک موقع پر صبح عید تھی۔ دو یتیم بچیوں کے پاس
نئے کرتے نہ تھے۔ دو بجے رات تک اُن کے لئے کرتے سیتی رہیں۔

علامہ مغفور اور ان کی رفیقۂ حیات ہمیشہ علی الصبح
نماز کے وقت اُٹھتے تھے۔ پہلے اماں جان کی آنکھ کھلتی تھی۔
نوکرانیاں سب سوتے ہوتے وہ خود پانی گرم کرتیں۔ پھر
ابا جان کے لئے حقہ تازہ کرکے چلم بھرتیں ادھر وہ بیدار
ہوتے ادھر اماں جان نماز سے فارغ ہو جاتیں۔ والد مرحوم
کے آخری دس بارہ سال میں یہ معمول ہو گیا تھا کہ نماز پڑھ چکے تو اندھیرے میں
ہی دونوں چہل قدمی کے لئے دلی دروازے کی طرف جاتے
اور آدھے پونے گھنٹے چہل قدمی کرکے واپس آتے تو بچے سلام کو
آنے شروع ہو جاتے۔ ابا جان آدھ پون گھنٹہ اُن سے
ہنستے بولتے۔ دو ایک عزیزوں کے ہاں ایک پھیرا کرکے آتے
تو اماں جان ناشتہ آگے رکھتیں۔ ناشتہ کے بعد مضمون
لکھنے بیٹھ جاتے۔ برابر کی چارپائی پر اماں جان ترکاری
بناتیں یا گھر کا کوئی اور کام کرتیں۔ ابا جان اُن سے باتیں
کرتے جاتے اور مضمون لکھتے جاتے۔ جوانی میں مضمون لکھنے
کے لئے انہیں تنہائی کی ضرورت تھی مگر آخری زمانے میں جو کچھ
لکھا اس طرح کہ اماں جان [illegible] ہیں اور اُن کا
قلم چل رہا ہے۔

"بھابی متواضع ایسی ہیں کہ جاتے پھرتے ہم یا کوئی
جائے کبھی بغیر ناشتہ کرائے نہیں جانے دیتیں میں نے
کبھی بھابی کو گرم آواز سے بولتے نہیں سنا۔ قہقہہ مارنے
یا قہقہے لگاتے دیکھا جب بھائی کو سکتہ ہوا اور تیسرے
پہر کھانا گھر میں آیا تو جھٹ کھڑی ہو گئیں۔ بہو بیٹیوں نے
منع کیا بھاوجوں نے منع کیا کہ ہم کھلا دیں گے۔ چپکے سے
کہا "نہیں میں اپنی سسرال والوں کو آپ کھلاؤں گی۔ پھر
کسی کا اعتبار نہیں ہے" اللہ اللہ کیسی قابل قدر ہستی
ہیں۔ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بے شک جوڑا بچھڑ گیا
پھر بھی سسرال والوں کا اتنا خیال.... بھابی صاحبہ
اور بھائی صاحب کے تعلقات بے مثل تھے۔

حامدہ بیگم خیری ——— (عصمت جولائی [illegible])

ابا جان کے بعد وہ روزانہ آدھا سیپارہ پڑھ کر روح
پاک کو بخشتی تھیں۔ ان کی بیوگی کی ہو بہو تصویر اپنی رحلت
سے ۱۴ سال پہلے ہی علامہ مغفور نے اپنے ایک مضمون
"مشرقی بیوی" میں کھینچ کر رکھ دی تھی:۔

"شوہر کی موت اس سے کیا کیا لے گئی۔ اس کی
چوڑیاں کہاں گئیں۔ رنگین کپڑا ختم ہوا۔ سرمہ کاجل
کدھر گیا۔ یہ سب صرف ایک دم سے تھا۔ اس کی
مسکراہٹ پر نہ جاؤ۔ اس کا دل رو رہا ہے۔ اس کو
خاموش نہ سمجھو اس کے کلیجے میں آگ لگ رہی ہے
یہ عورت نہیں اس کی نسوانیت ختم ہو گئی۔ یہ بیوی
نہیں ہے اس کی قسمت بگڑ گئی۔ جب یہ سہاگن
تھی۔ سب کچھ تھی۔ آج یہ رانڈ ہے بیوہ ہے
کچھ نہیں ہے۔

بنفس نہیں ہے۔ دولت رہی کے پاس عزیز
اس کے ساتھ بیٹے بھی ہیں اور بیٹیاں بھی۔ پوتا
بہت سی نعمتوں کی مالک اور بھرے گھر پر حکومت
رہی ہے۔ مگر چمنستان زندگی کا وہ پھول جو اس کا
باغ معطر کیا تھا مرجھا گیا اور وہ آنکھیں
ان محبوب سے سیراب اور وہ دل جو محبت کی
مت سے مالامال تھا آج اُن میں آنسوؤں کی قطار
اور داغوں کی بہار ہے۔"

جب امائیں کھانا پکا چکتی ہیں سب کو کھانا کھا
چکے ہیں اور گھر کی دُنیا ضروریات میں مصروف
ہو جاتی ہے تو یہ آنسو بھری آنکھوں سے باورچی خانہ
میں جاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھتی ہے روٹی
پکاتی ہے اور ایک آدمی کا کھانا تیار کر کے خاموشی سے
...من میں آتی ہے کہ اس کے کانوں میں یہ آواز گونجتی
"مسجد کے طالب علم کو روٹی دے دیجیے"
یہ چونک پڑتی ہے۔ آسمان کی طرف دیکھ کر گڑگڑاتی
ہے اور کہتی ہے :-

"اس کا ثواب اُن کی رُوح کو"

علامہ مغفور کے ۸ سال بعد ۲۰ مارچ ۱۹۳۲ء کو اُن کا
انتقال بھی ۶۸ سال کی عمر میں ہوا اور پیر ہی کے دن
ان کا بابرکت سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا تو عصمت اپریل
میں میں نے جو مضمون "آہ اماں جان" کے عنوان سے لکھا
تھا اس میں ان کی زندگی کے بہت سے واقعات قلمبند
کئے تھے۔ علامہ مغفور کے مزار سے ملی ہوئی دائیں طرف
اُن کی رفیقۂ حیات کی قبر دلّی دروازہ سے باہر کوٹلہ فیروز شاہ
کے قریب جدید قبرستان میں ہے۔

(ب) اولاد

علامہ مغفور نے اپنے بعد چار بچے چھوڑے

۱۔ راشدہ بیگم صاحبہ

والد مرحوم کی باتیں اپنے چاروں بچوں میں سب سے زیادہ
اِن سے ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی شادی ہوئی۔
بھائی عبدالغفور مرحوم غیر معمولی خوبیوں کے انسان تھے
مئی ۱۹۳۰ء میں ۶۱ سال کی عمر میں دُنیا سے رخصت ہو گئے
آپ ملنسار۔ اور مہمان نواز ہیں۔ پُرانے قصے ایسے
مزے سے بیان کرتی ہیں کہ جی چاہتا ہے بس سُنے جایئے
لباس سے گفتگو سے وضع قطع سے نشست برخاست سے
لگ معلوم ہو جاتا ہے کہ "اصلی دلّی والی" ہیں۔ حالانکہ
بھائی صاحب مرحوم کی ملازمت اور گنگا پور میں طویل قیام
کی وجہ سے کہلائیں "گنگا پور والی بیگم" مزے مزے کے
کھانے پکانے اور کھلانے کا شوق ہے۔ کنوارپنے میں چند
مضامین بھی لکھے تھے۔ روزانہ تلاوت کلام پاک کرتی،
تاریخی مذہبی کتابیں دیکھتی۔ اور اخبارات کا مطالعہ
کرتی ہیں۔ گیارہ بارہ سال ہوئے فالج کا حملہ ہوا تھا اُس
وقت سے صحت اچھی نہیں رہتی۔ باپ دادا کی طرح طبیعت
کی فیاض ہیں اور غریب رشتہ داروں کی خاموشی سے مدد
کرتی رہتی ہیں۔

ان کی چار لڑکیاں ہیں اور چار لڑکے نازلی عطیہ
امتہ الغفور ماں کی طرح دلچسپ گفتگو کرتی بلکہ چٹکلے
چھوڑتی اور کسی واقعہ کو بیان کرنے میں رنگ آمیزی سے
بہت دلآویز بنا دیتی ہیں۔ ادیب فاضل ہیں۔ مضمون نگاری
بھی اُنہوں نے کی ہے۔ کھانے بہت خوش مزہ پکاتی ہیں
ان کے شوہر غلام علی خاں صاحب حبیب بینک میں افسر ہیں

نازلی رفیعہ امتہ الغفور بہت شگفتہ مزاج ہیں پہلے ہنستی ہیں بعد میں بات کرتی ہیں۔ وضع وضع کی دستکاریاں جانتی ہیں۔

نازلی صفیہ امتہ الغفور ادیب عالم ہیں اور نازلی حمیدہ چھوٹی بیٹی بی اے بی ٹی ہیں اور کسی گرلز اسکول میں پڑھاتی ہیں۔

آپا کی چاروں لڑکیاں نماز روزہ کی سخت پابند اور اُمور خانہ داری میں ماہر ہیں۔ انہوں نے ماحول کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا اور مغربیت کو پسند نہیں کرتیں۔

شاہد الغفور اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں سعادت مند۔ خدمت گذار بیٹے اور شفیق بھائی۔ بڑے پیمانے پر کاروبار کرتے ہیں۔ ناظم آباد میں ان کا ذاتی مکان ہے۔ سنہ میں شادی ہوئی۔ چار بچے ہیں یعنی معظم الغفور مُہیمنہ اعظم۔ مجھن آپا کے منجھلے بیٹے جن کا نام راشد الغفور ہے بی کام تک کراچی میں پڑھنے کے بعد لندن چلے گئے۔ اور چھ سال وہاں پڑھ کر اسی سال آئے ہیں۔ اور میاں شاہد کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ بچپن میں انہیں گانے کا شوق تھا اور نانا کو گانا سُنایا کرتے تھے۔

اس وقت بھی میری آنکھوں میں وہ سماں پھر رہا ہے کہ علامہ مغفور چارپائی پر آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں اور میاں مجھن گا رہے ہیں ؎

خیال آپ کا جب ذرا آگیا ترٹپنے کا دل کو مزا آگیا

خالد الغفور نے کراچی یونیورسٹی سے بی اے کیا ہے اور حبیب بنک میں ملازم ہیں۔

علامہ مغفور نے ان سب بچوں کو دیکھا تھا سب سے چھوٹے ساجد الغفور کو نہیں دیکھا جو بی اے میں پڑھتے اور میاں شاہد کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ انہیں کھیل کے شکار کا شوق ہے۔

۲۔ رازق الخیری

۴۴ سال [illegible] دفتر کا کام سنبھالے اور عصمت کو مرتب کرتے ہوئے بھی ۴۱ سال ہو گئے۔ اردو کی تاریخ صحافت میں شاید کوئی اڈیٹر ایسا ہو گا جس نے میری طرح ملازمت ایک دن بھی نہیں کی اور کسی ایک رسالہ کی اڈیٹری کے فرائض اتنی طویل مدت تک انجام دئے ہوں عصمت کی اشاعت کا یہ چھپنواں سال ہے اور بچیوں کا رسالہ بنات بھی ۴۹ سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ عصمت و بنات کے ذریعہ یوں ممتاز اہل قلم پیدا کئے۔ سنہ میں زنانہ دستکاری کا رسالہ جوہر نسواں جاری کیا۔ ناشر کی حیثیت سے علامہ مغفور کی تصانیف کے علاوہ ممتاز ادیبوں کی سو کے قریب کتابیں شائع کیں جو کئی کئی بار چھپیں۔ خود بھی ۸۰، ۹۰ کتابیں لکھیں جن کے کئی کئی اڈیشن نکلے۔ رسالے تو اب بھی پابندی وقت سے شائع کر رہا ہوں مگر بحیثیت ناشر آئندہ کتابوں کی اشاعت میں باقاعدگی میرے اختیار اور قابو سے باہر ہوگئی ایسے سخت وقت میں علامہ مغفور کے انتخاب کی قدر ہوئی۔ مرحومہ خاتون اکرم کے بھتیجے ڈاکٹر معین احسن جذبی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مرحومہ اور آمنہ نازلی کے بارے میں جولائی سنہ میں مجھے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"دونوں میں اگر فرق ہے تو صرف شکل و شباہت کا ہے۔ خلوص و محبت، صبر و ضبط، ایثار و قربانی، اور دل کی بھلائی کا جہاں تک تعلق ہے، دونوں میں امتیاز ناممکن ہے۔ آمنہ پھوپی سے میری قربت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن کی ذات میں مجھے اپنی پھوپی جان نظر آتی تھیں"

قناعت، صبر، نفس کشی، سیر چشمی، اعلیٰ ظرفی، خدا ترسی، درگذر یہ صفات آمنہ نازلی میں نہ ہوتیں تو بہت کے

صائمہ - زائرہ سے پورے ایک سال چھوٹی ہیں تُروں
کی تاریخ پیدائش دسمبر کی ۵ ہے۔ ان کی بہت سی عادتیں
سعدمیاں میں ملتی ہیں سو ذہانت اور ذکاوت میں سب بہنوں
سے بڑھی ہوئی ہیں۔ اسکول اور کالج کے سب امتحان بہت
اچھے نمبروں سے پاس کئے۔ اب نفسیات کے ام اے فائنل
میں ہیں۔ میل جول محدود ہے۔

صفورہ - صائمہ کی طرح یہ بھی کبھی فیل نہیں ہوئیں
بی۔اے میں ہیں۔ بعض کھانے اچھے پکاتی ہیں مگر سلائی
وغیرہ میں زائرہ سے پیچھے ہیں۔ کہانیاں لکھنے کا شوق ہے
تصویریں بنانے کا بھی اور باتیں بنانے کا بھی۔ والد مرحوم
نے انہیں نہیں دیکھا۔

۳ - واجدہ بیگم علامہ مغفور کی چھوٹی بیٹی ہیں۔ ان
کی طرح کم آمیز اور کم گو۔ بچپن سے
بہت محنتی ہیں ان کی تعلیم بھی گھر پر ہی ہوئی۔ ادیب فاضل
ہیں۔ چند مضامین بھی لکھے تھے۔ تقریر خاصی کر لیتی تھیں
مولود شریف کبھی کبھی پڑھتی تھیں۔ علامہ مغفور کا حساب
کتاب سب یہی لکھتی اور روپیہ پیسہ یہی رکھتی تھیں۔ اور
انہیں ہدایت تھی کہ جو کچھ دیں پہلے لکھ لیں فرمایا کرتے
تھے کہ حساب کی کاپی کہتی ہے۔

پہلے لکھ - پیچھے دے   بھول پڑے تو مجھ سے لے

تربیت گاہ کے سلسلہ میں ان سے بہت مدد ملی
تھی۔ انہوں نے خاندان کے کئی بزرگوں اور عزیزوں کی [illegible]
دل سے خدمت کی ہے۔ ان کے شوہر سردار محمد خاں خلیق
وسیع القلب۔ خوش مزاج مگر اپنی بیوی کی طرح کم سخن
ہیں اور ان کے ملنے جلنے والے بھی گنتی کے چند ہیں۔
سرکاری ملازموں کی ہاؤسنگ سوسائٹی میں انہوں
نے اپنا بنگلہ بنا لیا ہے۔ افسوس ہے انہیں دو بچوں کا داغ
اُٹھانا پڑا۔ سالم ۱۰ سال کا تھا اور عالم ۱۱ سال کا۔ اب
تین بچے ہیں۔
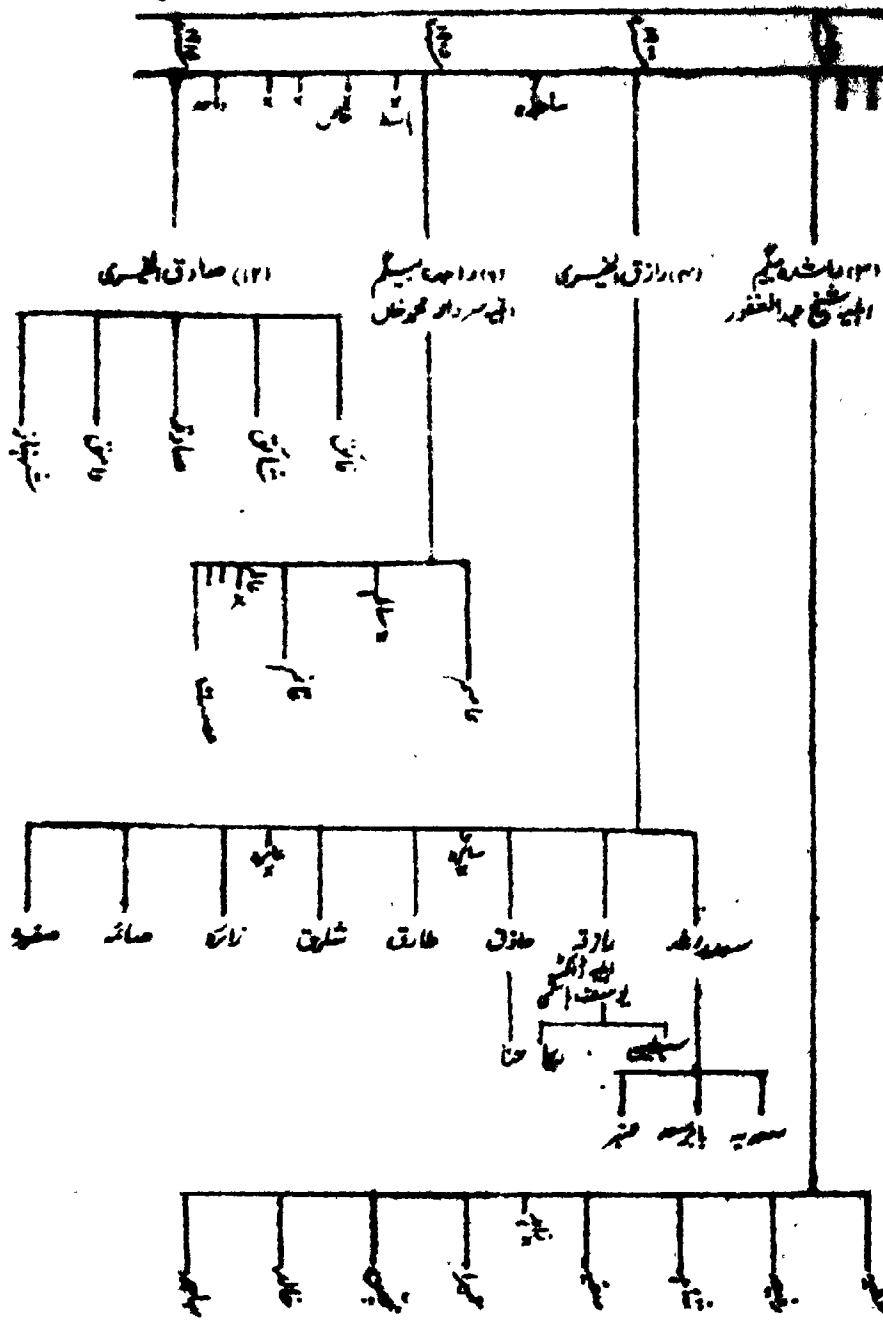
عاصم سردار محمد خاں - انگریزی میں ام اے کرنے
کے بعد ڈیڑھ دو سال کسی کالج میں پڑھایا۔ پھر ولایت چلے
گئے۔ اور دو بڑی ڈگریاں لیں۔ اور اب کسی ولایتی انشورنس
کمپنی میں مستقل تنخواہ پر منیجر ہیں۔ انہوں نے ولایت رہ
کر پیسہ برباد نہیں کیا۔ اور نماز روزہ کی پابندی کی۔

غانم سردار محمد خاں - ام اے بھی ہیں ام کام
بھی اور بڑی بات یہ کہ کبھی فیل نہیں ہوئے۔ کسی وظیفہ
پر جرمنی گئے وہاں سے لندن چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا کورس
پورا کرکے اُمید ہے اسی سال کامیابی سے واپس آئیں گے۔

عصمت سردار - ام اس سی کر چکی ہیں [illegible]
سے بھی دلچسپی ہے۔ علامہ مغفور کے بعد پیدا ہوئیں مگر ان کا
نام نانا نے پہلے ہی تجویز کر دیا تھا۔

۴ - صادق الخیری مجھ سے چودہ سال چھوٹے
ہیں۔ میرا ذہن معمولی ہے۔
مگر یہ ذہین ہیں۔ اس لئے بچپن میں شرارت بھی مجھ سے
زیادہ کی ہے۔ [illegible] میں فلسفہ میں ام اے کیا اور کسی سال
فیل نہیں ہوئے۔ والد مرحوم کے سامنے ہی بنات مرتب کرتے
تھے۔ "ترقی پسند" ادیبوں کی صف اوّل میں صادق الخیری
نے ممتاز جگہ حاصل کر لی تھی۔ نہ صرف دلچسپ مختصر افسانے
لکھتے بلکہ تنقیدی مضامین بھی ان کے ترجمے بھی کامیاب
ہوتے تھے۔

دلّی ہی میں ۲۰ ، ۱۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ [illegible]
میں شادی ہوئی۔ [illegible] میں سرکاری ملازمت کی تو ادبی
مشاغل چھوٹ گئے۔ نوکری کے سلسلہ میں سال بھر کے قریب
بمبئی میں بھی رہے۔ [illegible] میں ملازمت چھوڑ [illegible]

پانچ سال پہلے کہانیاں وغیرہ لکھنے کا شوق تھا اب انگریزی میں تقریر کرنے کا شوق ہے۔

صادقہ بیگم بی اے میں پڑھتی ہیں۔ اور شہناز جو کراچی میں پیدا ہوئیں میٹرک میں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ خانہ داری کے کاموں میں بھی یہ بچیاں دلچسپی لیتی ہیں۔

واثق الخیری بی شہناز سے بڑے ہیں اور انٹر میں پڑھتے ہیں۔ انہیں فوٹو گرافی اور موٹر چلانے کا شوق ہے۔ والدہ مرحومہ نے ان دونوں بچوں کو نہیں دیکھا۔

علامہ مغفور کے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کی موجودہ تعداد یہ ہے:-

پوتے	۷	جن میں سے	۲	کو دیکھا
پوتیاں	۴	"	۱	"
نواسے	۶	"	۵	"
نواسیاں	۵	"	۴	"
کل	۲۲	"	۱۲	"

باب اٹھارہواں ـــــــــ بعد رحلت

۱۔ علامہ مغفور کی یادگاریں

علامہ راشد الخیری علیہ الرحمتہ کی وفات پر صرف ۱۹۳۶ء ہی میں جس قدر مضامین نثر۔ نوحے۔ مرثیے۔ تعزیت نامے ماتمی جلسوں کی کارروائیاں۔ قطعات تاریخ وغیرہ شائع ہوئے۔ اس سے پہلے اُردو کے کسی مصنف یا قوم کے کسی مصلح کی وفات پر شائع نہیں ہوئے۔ ان مضامین اور خطوط وغیرہ میں علامہ مغفور کے کام جاری رکھنے یادگاریں قائم کرنے کے سلسلہ میں جو تجویزیں شائع ہوئیں تھیں وہ یہ تھیں:-

(۱) علامہ مغفور کے دونوں رسالوں عصمت و بنات اور اُن کے ساتھ جوہر نسواں کو ترقی دی جائے اور اشاعت بڑھائی جائے۔

(۲) ہر سال ۳ فروری کو طبقۂ نسواں کے محسن اعظم اور اُردو کے عظیم المرتبت مصنف کی برسی منائی جائے اور ان کی یاد میں مضامین شائع کئے جائیں۔

(۳) مصور غم کی تصانیف کی طباعت کا سلسلہ جاری رہے۔

(۴) متفرق مضامین جو مختلف رسالوں اخباروں میں شائع ہوئے تھے اور کتابی صورت میں نہیں چھپے اُن کے مجموعے موضوعوں کے لحاظ سے شائع کئے جائیں۔

(۵) بڑے بڑے شہروں میں علامہ مرحوم کے نام پر زنانہ کتب خانے کھولے جائیں اور لائبریریوں اور کالجوں میں محسن نسواں کی تصویر آویزاں کی جائے۔

(۶) لڑکیوں کا نصاب مکمل کر کے شائع کیا جائے۔

(۷) مکتب بنات کو ہائی اسکول بنایا جائے۔

(۸) راشد الخیری اکیڈیمی قائم کی جائے۔

(۹) سوانح عمری شائع کی جائے۔ [illegible]

ں دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی تھیں ایک وہ
ری ذات سے متعلق تھیں۔ دوسری وہ جو
ہ قوم سے متعلق تھیں۔
۔ ۰ سال میں ان تجاویز پر ایک نظر ڈالی جاتی
عصمت بنات و جوہر نسواں تینوں رسالے
رہے نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے
۱۹۴۷ء تک تینوں رسالے دلی سے شائع ہوئے
ستمبر میں انتہائی بے سروسامانی کی حالت تھی اور
شائع ہوتا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ نومبر ۱۹۴۷ء سے
تینوں رسالوں کی اشاعت میں نام کو بھی ایک دن کی
ہوئی۔ وقت کی اس پابندی کی اردو رسائل کی
نظیر نہ ملے گی۔ سخت ناموافق حالت میں
رسالوں کا اپنی روایات قائم رکھنا معمولی بات نہیں ہے
ہو کے بعد بھی تینوں رسالوں کی اشاعت میں ترقی
البتہ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں جب کاغذ کی سخت
ت چھپنے میں تو ظاہری حسن میں فرق آگیا تھا۔ اور اشاعت
کم ہو گئی تھی مگر جنگ کے بعد جب کاغذ وغیرہ کی مشکلات
ہیں۔ پھر ترقی ہونے لگی۔ ۱۹۴۷ء کی پہلی ششماہی میں
رسالوں کی اشاعت ۱۹۳۹ء سے زیادہ تھی۔ اس کے
دور جو کراچی آکر شروع ہوا۔ اس میں سراسر مالی نقصان
بعض انفرادی خریداروں کے بل بوتہ پر کسی اخبار یا رسالہ
کا رہنا بہت مشکل ہے۔ اور اگر کسی طرح ممکن بھی ہوتا
رت کے چھ ماہ بعد بھی ۷۰ اور ۸۰ فیصدی خریدار بھارت
تھے جن سے ستمبر ۱۹۴۹ء کے بعد وی پی یا منی آرڈر کے
چندہ وصول ہونا ممکن نہ رہا۔ اس اعتبار سے تینوں رسالوں
سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ مگر چونکہ علامہ مغفور کی
ار ہیں اس لئے اپنی تمام روایات قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ

اسی پابندی وقت سے نکل رہے ہیں جس طرح ۴۰ سال
قبل علامہ مغفور کی حیات میں نکل رہے تھے۔ میں نے ان
رسالوں کے ذریعہ علامہ مغفور کے مشن کو زندہ رکھنے کی
اس وقت تک وہ کوشش کی ہے جو ایک انسان سے کسی
طرح بھی ممکن ہو سکتی تھی۔

(۲) کئی سال ۳ فروری کو آل انڈیا ریڈیو اور
اس کے بعد پاکستان ریڈیو پر علامہ مغفور کی برسی منائی
گئی۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں پاکستانی اخبارات کی ۳، ۴
فروری کی اشاعتوں میں کئی کئی مضامین اور قصائد
شائع ہوئیں۔ بعض مقامات پر جلسے بھی ہوئے۔ فروری
کے عصمت میں ہر سال علامہ مرحوم کی یاد میں مضامین
اور نظمیں اور تصانیف پر مقالات شائع ہوتے ہیں۔
۳ فروری کو عصمتی بناتی اور جوہری بہنیں اور بچیاں تلاوت
کلام پاک سے علامہ مغفور کی روح کو ثواب پہنچاتی ہیں۔

(۳) شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے اپنے
تعزیت نامہ میں تحریر فرمایا تھا کہ "مجھے امید ہے کہ مولانا
کی تصانیف کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا۔" اور بہت
سے بزرگوں نے خاص طور پر یہ بات تحریر فرمائی تھی۔
علامہ مغفور کی مطبوعہ تحریریں ۳ قسم کی تھیں ایک وہ
جن کے حقوق اشاعت میرے پاس تھے۔ دوسرے وہ
جن کے حقوق دوسروں کے پاس تھے۔ تیسرے وہ جو
متفرق مطبوعہ مضامین کی صورت میں بکھری ہوئی تھیں۔
میں نے زر کثیر خرچ کر کے دوسرے ناشرین سے حقوق
اشاعت بھی واپس لئے اور بکھرے ہوئے مضامین بھی
مختلف مجموعوں کی صورت میں مئی ۱۹۳۸ء تک شائع
کر دئے۔ علامہ مغفور کی رحلت کے بعد ان کی تصانیف
کی مقبولیت میں فرق نہ آیا تھا۔ یہ کتابیں کس قدر مقبول

اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے۔

"کاغذ کی نایابی کی وجہ سے نئی مطبوعات بہت کم شائع کی گئیں۔ لیکن پرانی کتابوں کی مانگ بہت تھی اور ہر سال ۴۰، ۵۰ پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن شائع ہوتے تھے۔ ۴۳ء میں جب سلاسے تین تھنے پونڈ کا کاغذ (سفید چکنا) ایک روپیہ بارہ آنے پونڈ تک فروخت ہوا۔ حضرت علامہ مغفور کی تیس تصانیف کے جدید اڈیشن شائع ہوئے ان تصانیف کے نام عصمت فروری ۴۳ء صفحہ ۸۸ پر شائع کئے گئے تھے"

(عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر ۵۶ء)

مگر ہجرت نے پنج کر رکھ دیا۔ سارے کس بل نکال دئے۔ اور کاروبار کو ایسا زبردست دھچکا لگا کہ آج سولہ سال سے اوپر ہوگئے کتنے ہی جتن کئے نہ پنپ سکا۔ یہاں کامیابی کے لئے جن باتوں کی ضرورت تھی مجھ میں ان کی کمی تھی۔ دلی سے کراچی آیا تو اسّی نوّے ہزار کی مطبوعات کا اسٹاک یہاں نہ آسکا۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ آیا تو مئی ۵۸ء میں کتابوں کے گودام (واقع عقب الاکوبا ہاؤس) میں آگ لگی۔ اس آتش زدگی کی خبر مقامی اخبارات ڈان وغیرہ میں بھی شائع ہوئی تھی نصف صدی میں یہ تیسری آتش زدگی تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ میں علامہ مغفور کی تصانیف میں سے ۳۰، ۳۵ کے جدید اڈیشن ایک ایک سال میں شائع کر رہا تھا۔ ایک دور یہ ہے کہ علامہ مغفور کی آدھی سے زیادہ تصانیف ختم ہوئے کئی کئی سال گذر گئے اور میں سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے جدید اڈیشن شائع نہ کرسکا۔

بھارت میں بغیر میری اجازت دھڑا دھڑ مطبوعات عصمت چھپ رہی ہیں اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔ دس بیس

پچاسی غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودے جن کا معاوضہ کئی ہزاروں روپیہ نقد ادا کیا تھا۔ [illegible] ضائع ہوئے پاکیزہ کتابیں شائع کرنے والے سب سے بڑے مہاجر ادارہ کا یہ حشر تو کبھی خواب و خیال میں بھی نہ تھا!!

بہرحال اپنی سی کوشش اب بھی کر رہا ہوں کہ تصانیف مصور غم کی طباعت کا سلسلہ جاری رہے۔

(۴) علامہ مغفور کی رحلت کے بعد ایک طرف میں نے یہ کوشش کی کہ تصانیف کے حقوق جلد سے جلد واپس لوں تو دوسری طرف ان مضامین کو مختلف مجموعوں کی صورت میں شائع کرنا شروع کر دیا جو عصمت تمدن حریم سہیلی خطیب نظام المشائخ وغیرہ میں شائع ہوتے تھے ۳۶ء میں ۹ اور ۳۷ء میں ۱۲ پھر ۳۸ء میں ۸۔ اس طرح ۲۹ مجموعے ڈھائی برس میں شائع ہوگئے۔ اور ان میں سے کوئی مجموعہ ایسا نہیں ہے جو کم سے کم چار دفعہ شائع نہ ہوا ہو۔

(۵) کئی کالجوں میں علامہ مغفور کی تصویریں آویزاں کرنے اور کئی شہروں میں ان کے نام کے کتب خانے کھلنے کی جو اطلاعیں مجھے موصول ہوئیں وہ عصمت میں شائع کر دی گئیں تھیں۔ دلی کے ویمک کالج میں تصویر کی نقاب کشائی کے وقت میں بھی موجود تھا۔ اب ۶۳ء میں کہاں کہاں راشد الخیری لائبریری ہے مجھے نہیں معلوم۔

(۶) میں نے دلی سے کراچی ہجرت اردو کے مسئلہ پر کی تھی اور بیوی بچوں کو لے کر ۲۸ اگست کو کراچی پہنچا تھا مکان کا انتظام کر کے ایک ہفتہ بعد دلی واپسی کا قصد تھا مگر دلی کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ میں پھر واپس نہ جاسکا۔ مورخ اسلام آغا رفیق مرحوم خریداروں کے رجسٹر اور چند ضروری کاغذات ہوائی جہاز سے لائے تو رسالے نکلنے لگے۔ پچاسی غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودے ایک

[illegible] کر ملی سے روانہ ہوا تو
[illegible] اس سے [illegible] بنا گیا
اب کی [illegible] کتابوں کے مسودے بھی تھے جنکا
مادہ بھی۔ جو مضامین بنات میں شائع
رب نصاب کا مکمل کرواتا اور شائع کرنا میرے
نہیں ہے۔ اور شاید اب اس کی ضرورت بھی

مکتب بنات جسے علامہ مغفور کی رحلت کے بعد
عصمت بنات جوہر نسواں تین تین رسالے اڈ
یک ڈپو۔ ایک ادارہ اور صد بیمار میں اکیلا کیا کیا
مجبوراً اعلان کرنا پڑا کہ اپنی بہنوں کی جو خدمت
رہا ہوں وہی ہوتی رہے تو بڑی بات ہے مکتب
نہ داری لینے سے فی الحال بالکل مجبور ہوں اور
ملال کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ یکم مارچ سے
ت بند کر دیا جائے گا۔ اس پر اٹھارہ سو روپے کے
ض ہے جو میں اس ششماہی میں ادا کر دوں گا۔ یتیم
ر بیواؤں اور محتاجوں کی جو خدمت والدہ ماجدہ
ی زندگی میں خصوصیت سے رمضان المبارک
تھیں یہ سلسلہ اگر خدا نے چاہا تو جاری رہے گا۔"
(عصمت مارچ سنہ ۳۶ء صفحہ ۲۷۵-۲۷۶)

مدرسہ کے متعلق علامہ مغفور نے مجھ سے کوئی
زبانی تھی۔ میں نے اپنی دفتر کی مصروفیات اور خانگی
ریاں ایک دم بڑھ جانے کی وجہ سے بند کرنے کو تو
بند کر دیا تھا لیکن یہ نہ بھولا تھا کہ علامہ مغفور لڑکیوں
سکول قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب اگست سنہ ۴۷ء
نے ہجرت کا فیصلہ کیا تو میرے پروگرام میں لڑکیوں
اسکول بھی تھا۔ اور میں نے اپنی ہجرت کی کہانی مطبوعہ عصمت

فروری سنہ [illegible] میں اس کے متعلق لکھا بھی تھا۔
"یہ خیال کتنی بار پاؤں میں زنجیر بنا کہ اس عمر میں
پردیس میں مٹی خوار نہ ہو۔ چالیس سال کا جما جمایا کام ہے
ایک لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کی کتابوں کا سٹاک ہے
گھر کا سامان بھی کافی ہے۔ ان سب چیزوں کی اکھاڑ پچھاڑ
معمولی بات تو ہے نہیں۔ مگر دل کہتا تھا کہ خدمت کا جذبہ
لے کر پاکستان چلو۔ یہاں سے بہتر وہاں خدمت ہو سکے گی
حالات ایسے تھے کہ آپا جان کا مکتب بنات مجبوراً بند کرنا
پڑا تھا۔ اب آزاد اسلامی مملکت میں بڑے پیمانہ پر ان کی
اسکول کی صورت میں تربیت گاہ کھولی جا سکے گی۔ گھریلو
دستکاریوں کا ادارہ قائم ہو سکے گا۔ عورتوں کا ایک اور
رسالہ اور ایک روزنامہ جاری کرنا بھی مشکل نہ ہوگا۔ ساٹھ ستر
ہزار روپیہ نقد ہاتھ میں ہوں گے۔ سوا لاکھ روپیہ کی مالیت
کا کتابوں کا سٹاک ہوگا۔ تینوں رسالوں کا نو دس ہزار
مستقل خریداروں کا حلقہ ہے۔ اپنی حیثیت اور حالات کے
مطابق قوم کی خدمت بہت کچھ کی جا سکے گی۔ کام کرنے کا وقت
تو اب آیا ہے۔ چلو پاکستان چلو اور خدمت کا جذبہ لے کر"
(عصمت فروری سنہ ۴۸ء)

مگر پاکستان آ کر حالات ہی کچھ سے کچھ ہو گئے۔

(۸) راشد الخیری اکیڈمی کی تجویز اخبارات و رسالوں
میں شائع ہو کر رہ گئی۔ اگر یہ اکیڈمی قائم ہو جاتی تو زیادہ
سے زیادہ اتنا ہی کام کرتی جتنا میں اکیلا سنہ ۳۶ء سے سنہ ۴۷ء تک
کام کر رہا تھا۔ ہاں پاکستان میں ممکن ہے وہ مفید ثابت ہوتی۔

(۹) سوانح عمری شائع کرنے کا اصرار متعدد خطوط
میں تھا۔ اس کی اشاعت میں کیوں تاخیر ہوئی، میں شروع
میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔ بہرحال خدا کا شکر ہے میرے
ذمہ جو صرف یہ ایک کام رہ گیا تھا وہ بھی انجام پا گیا۔

سنہ ... کے بعد بھی علامہ مغفور کی یادگاروں کے متعلق
مضمونوں میں اظہار خیال کیا گیا اور تجاویز بھی پیش کی گئیں
اور پاکستان بننے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ
لاہور پشاور کراچی کے ۵ پرچوں کے اداریے نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ "مولانا راشد الخیری نے مسلمان عورتوں
کے حالات سنوارنے اور انہیں صحیح معنوں میں دخترانِ
اسلام بنانے میں جو کوششیں فرمائی ہیں اُن سے انکار
ممکن نہیں۔ جب تک وہ زندہ رہے شب و روز اصلاحی جہاد
میں مصروف رہے۔ اب وہ اپنے مولا کے پیارے ہو چکے
لیکن ان کا مشن بدستور کام کئے جا رہا ہے۔ ان کی تصانیف
مسلمان عورتوں کو سنوارنے میں اپنا کام کر رہی ہیں۔ اُن کے
ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا عصمت اب بھی مسلمان گھروں
میں پہنچتا ہے اور ایک مبلغ کی طرح تبلیغ کا فرض انجام
دیتا ہے۔ علامہ مرحوم کی یادگار ابھی تک تو صرف ان کی تصانیف
اور عصمت ہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کی خواتین
اپنے محسن کی یاد میں ایک اعلیٰ درجہ کی درس گاہ قائم کریں
جہاں اسلامی تعلیم کا بہترین انتظام ہو اور اس طرح علامہ
مرحوم کے مشن کو ایک عملی صورت دی جائے۔ زندہ قومیں
اپنے بزرگوں کی یادگار قائم کر کے اُن کو بقائے دوام بخشتی
ہیں۔ یہ زندگی کا ثبوت ہوتا ہے۔"

ہفتہ وار قندیل لاہور ———— ۳ فروری سنہ ۵۱ء

۲۔ "شبلی نعمانی، خواجہ حالی، نذیر احمد، سرسید
اور مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ ساتھ علامہ راشد الخیری
بھی بانیان اُردو کے نورتن میں سے ایک بڑے رتن تھے۔
جنہوں نے تاریخ اور معاشرت میں حزنیہ یعنی ٹریجیڈی کی
اہم بنیاد رکھی اور جنہوں نے اُردو ادب میں حقوقِ نسواں
کے تحفظ اور اُن کی معاشرتی ترقی کی ترجمانی میں ایک تہائی
صدی کے اندر اہم ترین خدمات انجام دی ہیں۔ بلکہ اس
اہم ترین صنف ادب میں تو سرے سے اُردو ادب میں کوئی
اُن کا ہم پلہ نہیں کہا جا سکتا ..... وہ ایک بلند مرتبہ
سوشل ریفارمر اور مصلح تھے جنہوں نے اپنی بے شمار تصانیف
میں ہمیشہ کسی نہ کسی معاشرتی مقصد اور مفید اصلاح کو پیش کیا۔
..... افسوس ہے آج تک ہندو پاکستان میں مصور غم
علامہ مرحوم کی کوئی شایانِ شان یادگار قائم نہیں کی گئی
.... ہمارے خیال میں مردوں سے زیادہ یہ فرض ملک
کی خواتین کا ہے کہ وہ علامہ مرحوم کی ایک زندہ یادگار کے
قیام کی کوشش کریں۔ اس مقصد کے لئے سب سے موزوں
جماعت انجمن خواتین پاکستان (APWA) ہے جس کو ایسے
ذرائع بھی حاصل ہیں کہ وہ اپنے حقوق کے سب سے بڑے علمبردار
کی یادگار زندہ رکھنے کے لئے کوئی مستحکم یادگار قائم کرے۔"

شہباز پشاور ———— ۴ فروری سنہ ۵۰ء

۳۔ "پاکستان میں مولانا راشد الخیری کی کتابوں کی
زیادہ ضرورت ہے کیونکہ آزادی کے بعد حالات اس امر
کے متقاضی ہیں کہ ہمارا مستقبل ان اصولوں پر تعمیر ہو جن کی
تبلیغ مولانا راشد الخیری فرماتے رہے ہیں۔"

آفاق لاہور ———— ۴ فروری سنہ ۵۱ء

۴۔ "مولانا مرحوم نے عصمت میں مضامین لکھ لکھ کر
عورتوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کیا اور ان کی
بدولت ایسی ایسی لکھنے والی عورتیں پیدا کیں جن میں سے
بیشتر آج اُردو زبان کی بہترین مصنفات ہیں ....
تکالیف اور آزمائش کے زمانہ میں عورتوں کو مردوں کی حقیقی
"رفیقۂ حیات" ثابت کر دکھانے کے لئے عصمت نے کوئی
دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا راشد الخیری نے جو خدمات
انجام دی ہیں ان کی سب سے بڑی یادگار یہ عصمت ہوگی کہ

کی سماجت اور ثقافتی زندگی کا جائزہ"

[illegible] لاہور ——— ۳ فروری [illegible]

"آج مملکت پاکستان اُس یکتائے روزگار محسن ادب کا یوم وفات منا رہی ہے جسے مصور غم کہا جاتا تھا جس کے حزنیہ انداز بیان نے کبھی وہ جادو جگایا کہ ملت مسلمہ پر غفلت کی نیند سو نہ سکی۔ ۔ ۔ ۔ علامہ نے ناول کو سرتاسر مقصدی اور اخلاقی بنایا اور پھر کیسے مقصد بلند، جستجو اور لگن مکارم اخلاق کی ترویج و ترجمانی کی۔ اللہ اللہ - ایک دریائے فصاحت تھا جس میں ارتعاش آ گیا۔ ان اخلاقیات پر پڑھنے والے اپنی حالت زار پر آنسو بہاتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ قیام پاکستان اس نصب العین کا ایک پہلو ہے - جو مصور غم نے اپنی بے شمار تصانیف میں پیش کیا تھا۔ دوسرا پہلو یعنی خالص اسلامی معاشرہ کا احیاء بھی شاید اب دور کی بات نہیں - اس لحاظ سے اہل پاکستان کا مصور غم کی یاد تازہ کرنا ایک مخلص کے حضور خراج عقیدت پیش کرنے کے مترادف ہے - یہ نہ ہو تو بڑی ناسپاس گزاری ہوگی - ہماری تجویز ہے کہ مصور غم کی ۸۰ تصانیف جن میں ہماری تاریخ و معاشرہ کی مکمل دنیا مرکوز ہے اور جو شل گلشن سدا بہار کے ہیں - سرمایۂ قومی قرار دے کر محفوظ کر دی جائیں - یعنی ان کی بار بار اشاعت اور مقبولیت پر خصوصی توجہ صرف کی جائے اور ان کے یادگار رسالہ عصمت کی جو کراچی سے شائع ہوتا ہے مزید مقبولیت اور ان کے عزیز ترین ادارہ تربیت گاہ بنات کی نشاۃ ثانیہ کے لئے بھی مناسب اقدام ان ارباب اقتدار کی جانب سے ہو جو اس کے مکلف ہیں اور قوم کے احساسات حق کے پاسبان۔"

ڈان اُردو کراچی کا اداریہ ——— امروز ۳ فروری [illegible]

ب - برسی پر

مضامین نثر

دوسری برسی	ایڈیٹر
مولانائے مرحوم	ل - احمد اکبر آبادی

عصمت فروری ۳۸ء

تیسری برسی	ایڈیٹر
علامہ مغفور کا مکتوب	نواب زادی تاجور جہاں طاہرہ
مولانا راشد الخیری کی انشا	مولانا نیاز فتحپوری
وجود دیار کی آخری صدا	مولوی شاہد احمد ایڈیٹر ساقی
علامہ راشد الخیری	جناب ہوبار صاحب پنڈت بھیم دت شاستری
اور ۔ تاریخ	محمد احسن وکیل
بھائی راشد الخیری کی خدمات	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی
مولانا راشد الخیری کے مضامین کے مجموعے	ل - احمد اکبر آبادی
موت میں زندگی	مولانا عبدالماجد دریابادی
نذر عقیدت	ڈاکٹر محی الدین زور قادری

عصمت فروری ۳۹ء

چوتھی برسی	ایڈیٹر
اُردو کا عظیم المرتبت ادیب و مصلح	ضیاء الدین احمد برنی
علامہ مغفور نے عورتوں کے لئے کیا کیا	عندلیب فاطمہ
ادیب اعظم کس طرح لکھتے تھے	سیدہ اخترت
علامہ راشد الخیری مرحوم	سید ذاکر حسین مشہدی

عصمت فروری ۴۰ء

پانچویں برسی	ایڈیٹر

علامہ راشد الخیری کی انشاپردازی	وقار عظیم ایم اے
حضرت علامہ مغفور کی ادبی خدمات	جمیلہ بیگم
علامہ راشد الخیری کی چند کتابیں	ڈاکٹر محی الدین زور قادری
مولانا راشد الخیری	سردار محمد حسین
علامہ راشد الخیری	سیدہ افضل افسار بیگم

عصمت فروری سنہ ۴۱ء

چھٹی برسی	اڈیٹر
علامہ راشد الخیری	پنڈت کیفی دہلوی

عصمت فروری سنہ ۴۲ء

ساتویں برسی	اڈیٹر
علامہ راشد الخیری اور اردو ادب	بصیر صدیقی بدایونی
ایک دفعہ مولانا کے ساتھ	شیر علی سرخوش
علامہ مرحوم سے ایک ملاقات	عبدالحکیم بی-اے
علامہ راشد الخیری بحیثیت محسن قوم	عبدالباری خاں سبحانی

عصمت فروری سنہ ۴۳ء

آٹھویں برسی	اڈیٹر
علامہ راشد الخیری	عبادت بریلوی ایم اے
علامہ راشد الخیری کے ادبی شاہکار	نفیس فاطمہ بدایونی

عصمت فروری سنہ ۴۴ء

نویں برسی	اڈیٹر
علامہ راشد الخیری اور صنف نازک	عبادت بریلوی ایم اے
محسن کی یاد	و-ا بلقیس بیگم
مولانا راشد الخیری اصلاحی ناول نگار کی حیثیت سے	کشور جہاں حمیدی
علامہ راشد الخیری کا آرٹ	محمد مرغوب صدیقی ایم اے
کیا راشد الخیری قدامت پسند تھے	مشیر فاطمہ بدایونی
علامہ راشد الخیری	دیا کشن مخمور

عصمت فروری سنہ ۴۵ء

دسویں برسی	اڈیٹر
علامہ راشد الخیری بحیثیت ناول نگار	مرغوب صدیقی ایم اے
علامہ راشد الخیری کی ظرافت و مزاح نگاری	پروفیسر وقار عظیم
عورتوں کے لیڈر کی یاد	صغرا ہمایوں مرزا
علامہ راشد الخیری کے ترقی پسند نظریات	مشیر فاطمہ حمیدی
کچھ علامہ مرحوم کے بارے میں	نفیس فاطمہ
علامہ راشد الخیری مرحوم	جمیلہ بیگم کلکتہ
جوہر قدامت	حمیرا بنت ثاقب کانپوری

عصمت فروری سنہ ۴۶ء

گیارہویں برسی	اڈیٹر
عورتوں کا محسن اعظم	جمیلہ بیگم صاحبہ
علامہ مصلح قوم کی حیثیت سے	سید عزیز حیدر بی اے
علامہ مغفور کا طرز تحریر	نفیس فاطمہ
علامہ مرحوم کے ناول	جابر رضوی بی اے
ہمارے سچے رہنما	سلطانہ خورشید زہرا

عصمت فروری سنہ ۴۷ء

بارہویں برسی	اڈیٹر
عورت اور سماج علامہ کی نظر میں	مسز مشتاق

عصمت فروری سنہ ۴۸ء

تیرہویں برسی	اڈیٹر
کیا علامہ راشد الخیری کا مقصد کامیاب ہوا	نظورہ مرغوب
محسن نسواں کی یاد	محمد احمد سبزواری ایم اے
مصور غم کی یاد	جمیلہ بیگم کلکتہ

عصمت فروری سنہ ۴۹ء

بائیسویں برسی — اڈیٹر

علامہ راشد الخیری کی کتابیں — مہر لقا

علامہ مغفور کے افسانے اور ناول — نفیس فاطمہ صدیقی

مصور غم — رازق خیری ایم اے

عصمت فروری سنہ ۵۸ء

تئیسویں برسی — اڈیٹر

علامہ راشد الخیری کی یاد میں — جمیلہ بیگم

علامہ مغفور اور طبقہ نسواں — نفیس فاطمہ صدیقی

مصور غم کی عقیدت — بیگم غیاث الدین

عصمت فروری سنہ ۵۹ء

چوبیسویں برسی — اڈیٹر

محسن اعظم — نفیس فاطمہ صدیقی

مشرق کا چارلس ڈکنز — جمیلہ بیگم کلکتہ

عصمت فروری سنہ ۶۰ء

پچیسویں برسی — اڈیٹر

مصور غم — نفیس فاطمہ صدیقی

عظیم الشان انسان — ایس کے صغرا سبزواریہ

۳ فروری — زینت کلثوم سروری

عصمت فروری سنہ ۶۱ء

چھبیسویں برسی — اڈیٹر

محسن اعظم کی یاد میں — نفیس فاطمہ صدیقی

مصور غم کی یاد — مسز صوفی ایم اے

عصمت فروری سنہ ۶۲ء

ستائیسویں برسی — اڈیٹر

محسن اعظم — نفیس فاطمہ صدیقی

عظیم شخصیت کی یاد — مسز صوفی ایم اے

محسن اعظم کی یاد — و۔ا۔ بلقیس بیگم

مولانا راشد الخیری — جمیلہ بیگم کلکتہ

عصمت فروری سنہ ۶۳ء

اعتراف احسان — بنی فاطمہ

افسانہ نہیں حقیقت — محمودہ حق بی اے

سوانح عمری کے چند اوراق — رازق الخیری

سچا رہنما — نفیس فاطمہ صدیقی

عصمت فروری سنہ ۶۴ء

نظمیں

علامہ راشد الخیری کی یاد میں — ڈاکٹر مسعید بریلوی

علامہ راشد الخیری کا پیغام — گوہر اقبال نور

اے بادشاہ نثر — آغا شاعر دہلوی

اشکِ حسرت — خورشید اقبال حیا

عصمت فروری سنہ ۵۸ء

اپنے محسن اعظم کی یاد میں — ام زہرا ہاشمی بدایونی

یاد حضرت علامہ راشد الخیری — حکیم آزاد انصاری

میر کارواں — حرماں خیر آبادی

فراق راشد الخیری میں — اختر شیرانی

مصور غم کی یاد میں — محمد امان الرحمن قتیا

یاد راشد — ابو العلا نازل

حضرت علامہ راشد الخیری — ذمردجہت خرا

آہ علامہ راشد الخیری — ضیا احمد بدایونی

عصمت فروری سنہ ۵۹ء

عنوان	مصنف
مولانا راشد الخیری	خلیق برہان پوری

عصمت فروری ۱۹۴۶ء

عنوان	مصنف
علامہ مرحوم کی برسی پر	قیصر جہاں
علامہ راشد الخیری	ظفر محمود دانش
علامہ راشد الخیری کی یاد میں	صادق اندوری
ذکر راشد	ابوالاعجاز ازل
علامہ راشد الخیری	کوکب شادانی
محسن نسواں کی یاد میں	عفت آرا۔ بجیت ازا سری نگر

عصمت فروری ۱۹۴۷ء

عنوان	مصنف
پردیسی کو بیتا کی یاد	قیصر جہاں قیصر
علامہ راشد الخیری یاد میں	شکیلہ بانو

عصمت فروری ۱۹۴۸ء

عنوان	مصنف
علامہ کی برسی	قیصر جہاں
مصور غم مرحوم	قمر ہاشمی

عصمت فروری ۱۹۴۹ء

عنوان	مصنف
یاد راشد	ازل لاہوری
مصور غم	صادق اندوری
علامہ راشد الخیری	ابوالکمال ماہر دہلوی

عصمت فروری ۱۹۵۰ء

عنوان	مصنف
مصور غم کی یاد	شاکر سعید اختر

عصمت فروری ۱۹۵۱ء

عنوان	مصنف
علامہ راشد الخیری	حضرت ازل
راشد الخیری	آغا شورش کاشمیری
مصور غم	ظفر محمود دانش
بیاد علامہ مرحوم	قیصر جہاں

عصمت فروری ۱۹۵۲ء

عنوان	مصنف
السلام اے طبقہ مظلوم کے حامی	خلیق قریشی

عصمت فروری ۱۹۵۳ء

عنوان	مصنف
علامہ راشد الخیری کی یاد میں	آغا صادق حسین
مصور غم	فیاض قادری

عصمت فروری ۱۹۵۴ء

عنوان	مصنف
مصور غم	مسز الطاف حسین

عصمت فروری ۱۹۵۵ء

عنوان	مصنف
علامہ راشد الخیری	پرنسپل علاؤ الدین صاحب (پونہ)
مصور غم	خلیق برہان پوری
رہبر نسواں	مسز الطاف حسین

عصمت فروری ۱۹۵۶ء

عنوان	مصنف
علامہ راشد الخیری کی یاد میں	آغا صادق
مصور غم کے افسانوں کا ماحول	شفیق احمد
خراج عقیدت	رضیہ انور

عصمت فروری ۱۹۵۷ء

عنوان	مصنف
محسن اعظم کی یاد میں	جہاں آرا چودھری
اپنے محسن کے حضور	رضیہ انور امروہوی
علامہ راشد الخیری	حاجی جوہر جالندھری

عصمت فروری ۱۹۵۸ء

عنوان	مصنف
محسن اعظم کی یاد	جہاں آرا چودھری

عصمت فروری ۱۹۵۹ء

عنوان	مصنف
علامہ راشد الخیری	اسد ملتانی
ہمدرد نسواں	جہاں آرا چودھری
علامہ راشد الخیری	مختلف شعرا

عصمت فروری ۱۹۶۰ء

عنوان	مصنف
علامہ راشد الخیری	جہاں آرا چودھری

عصمت فروری ۱۹۶۱ء

عنوان	مصنف
اے راشد جادو بیاں	جہاں آرا چودھری

عصمت فروری ۱۹۶۲ء

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری باتصویر اڈیٹوریل
۱۳- ملت گجراتی روزنامہ کراچی
علامہ راشد الخیری باتصویر اڈیٹر
۱۴- اسٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان
بڑی تصویر ٹائیٹل پر
پائنیر آف وومنز ایمنسی پیشن جلال الدین احمد
۱۵- امروز لاہور ۵ فروری
مولانا راشد الخیری خواجہ حسن نظامی
۱۶- امروز لاہور ۳ فروری
علامہ راشد الخیری کا فن (باتصویر) احمد ندیم قاسمی
علامہ راشد الخیری کی زندگی پر ایک نظر انتظار حسین
بنام خاتونِ اکرم عکس مکتوب
علامہ مغفور تصویر اپنے صاحبزادوں کے ساتھ
چند اشعار علامہ مغفور
۱۷- زمیندار لاہور ۶ فروری
راشد الخیری اڈیشن ۴ بڑی تصویریں
علامہ راشد الخیری اڈیٹر
سماجی افسانے پریم چند
راشد الخیری کی سیرت کا ایک ورق خان اصغر حسین خاں لودیانوی
اشکِ حسرت (نظم) نوشابہ خاتون
راشد الخیری کا فن پنڈت کیفی دہلوی
مصورِ غم کے سفرنامے نصیر الدین ہاشمی
غمِ راشد سرعبدالقادر
آہ راشد الخیری مولانا شوکت علی
علامہ راشد کے مزار پر (نظم) شفیق قاضی۔

بے زبانوں کی زبان جوش
قطعہ تاریخ رحلت جمیل مرحوم
۱۸- خیبر میل انگریزی - پشاور
علامہ راشد الخیری اڈیٹوریل
علامہ مرحوم ضیاء الدین احمد برنی
۱۹- ایسٹرن ٹائمز لاہور
علامہ راشد الخیری اڈیٹوریل
۲۰- قندیل لاہور ۱۱ فروری
علامہ راشد الخیری باتصویر نوٹ ادارہ
راشد الخیری باتصویر اڈیٹر
بے زبانوں کی زبان جوش
اوصاف حمیدہ باتصویر سرعبدالقادر
مصورِ غم کی خوش طبعی ملا واحدی
تعمیر راولپنڈی ۳ فروری
برِعظیم میں حریت نسواں کا علمبردار اڈیٹر
افسانہ نگاری اعظم کریوی
بے زبانوں کی زبان جوش
۲۲- چٹان - لاہور
علامہ راشد الخیری تصویر ٹائیٹل پر
علامہ راشد الخیری اداریہ
اردو میں راشد الخیری کا مقام عبدالمجید سالک
مصورِ غم علی سفیان آفاقی
راشد الخیری (نظم) شورش کاشمیری
علامہ راشد الخیری کو اہلِ قلم کا خراج ریحانہ قمر
اس نمبر میں چار تصویریں بھی ہیں
۲۳- امروز لاہور ۳ فروری

۱۹۔ سندھ آبزرور۔ کراچی
ان میموریم — اڈیٹر

۲۰۔ پیغام مشرق۔ کراچی
برسی — ادارہ

۲۱۔ ماستہ گجراتی۔ کراچی
علامہ راشد الخیری — باتصویر مضمون

ریڈیو پر یوم راشد الخیری

۳ فروری ۱۹۳۸ء کو چند رھویں برسی پر ریڈیو پاکستان نے یوم راشد الخیری منایا تھا اور یہ پروگرام عصمت میں بھی شائع ہوا تھا۔

۱۔ کراچی اسٹیشن سے دن کے ۹ بجے
مصور غم کے حالات — رازق الخیری

۲۔ لاہور اسٹیشن سے — رات کے ۸ بجے
خواتین کی بیداری میں راشد الخیری کا حصہ — اے۔ آر خاتون

صبح زندگی پر — فیچر

۳۔ پشاور اسٹیشن سے رات کے ½ ۱ بجے خاص پروگرام
۴ فروری دن کے ایک بجے خواتین کا پروگرام

۴۔ ڈھاکہ اسٹیشن سے ۸ بج کر ۱۰ منٹ رات
مصور غم کے کارناموں پر تقریر

۵۔ راولپنڈی اسٹیشن سے ½ ۷ بجے شام
مصور غم — اردو میں تقریر

(د) مزار

نہ ہو کیوں کر زیارت گاہِ اہلِ دل مزار اُس کا
کہ سایہ بن رہی ہے۔ رحمتِ پروردگار اس کا
فرشتے عظمتوں کے، فاتحہ پڑھنے کو آتے ہیں

اختر شیرانی ———— عصمت فروری ۳۹ء

قدم آہستہ رکھ بادِ صبا۔ جائے ادب ہے یہ
نہیں معلوم تجھ کو مدفنِ علم و ادب ہے یہ
یہاں کی خاک کو اہلِ ادب سُرمہ بناتے ہیں
یہاں پر قدر دانِ علم اپنا سر جُھکاتے ہیں

انور جہاں اظہر علی اورنگ آباد دکن ———— عصمت فروری ۳۸ء

فصل گُل آئی ہے پھر، اور لائی ہے پھولوں کے ہار
راشد الخیری کی تربت پر چڑھانے کے لئے
اے سحابِ فرودیں! آ تو بھی آ اور جھوم کے آ
اس مقدس خاک پر موتی لٹانے کے لئے

تلوک چند محروم ———— عصمت فروری ۳۲ء

بنا گہوارۂ رحمت، خدایا اس شبستاں کو
جہاں پر سو رہا ہے وہ لپیٹے روئے تاباں کو
صبا اُس خوابگاہِ ناز کی جانب کبھی جانا
سلامِ دانشِ محزوں ادب سے عرض کر دینا

ظفر محمودہ بیگم دانش ———— فروری ۳۸ء

راشد الخیری کی تُربت پر ہو رحمت کا نزول
حشر تک سایہ کرے آکر وہاں ابرِ کرم

رضیہ انور امروہوی ———— عصمت فروری ۳۵ء

جس کے احسانات ہیں بے انتہا اے رب مرے
اس کی لحدِ پاک کو پُر نور کر صدقے ترے

جہاں آرا چودھری ڈھاکہ ———— عصمت فروری ۶۱ء

الٰہی تُربتِ علامہ عنبریں کر دے
کہ اب دُعا کے لئے جاں نثار بیٹھے ہیں

خان احمد حسین خاں لاہور ———— عصمت راشد الخیری نمبر

اس میں راز کی کیا بات ہے؟
مناسب دیکھ بھال کی جائے تو جلد کی تازگی اور ملائمت برقرار رہتی ہے۔
اپنے چہرے کی آب و تاب قائم رکھنے کیلئے ہمیشہ تبت سنو
استعمال کیجئے ۔ اس سے رنگ روپ میں نکھار اور حسن میں
دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔
Tibet
تبت سنو ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ ۔ کراچی ۔ ڈھاکہ
united

اور اب ! چین

پی آئی اے کی نئی عظیم منزل

PIA

اب شنگھائی اور کینٹن کے لئے پی آئی اے کی نئی
ہفتہ وار سروس شروع ہو گئی ہے اس سروس میں بوئنگ ۷۲۰ بی
طیارے چلائے جا رہے ہیں اور یہ ہوائی سروس کی تاریخ میں
اپنی قسم کی پہلی سروس ہے۔ پی آئی اے کو بجا طور پر یہ فخر
حاصل ہے کہ وہ جنوبی راستے سے چین کے لئے بڑی ٹرنک سروس
شروع کرنے والی پہلی ائر لائن ہے اور اس میدان میں بھی
پی آئی اے کو اولیت کا مقام حاصل ہوا ہے یہی وہ خصوصیات
ہیں جن کی بدولت پی آئی اے کو باکمال لوگ
اور اس کی پرواز کو لاجواب پرواز کہا جاتا ہے۔

پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائنز

باکمال لوگ لاجواب پرواز

ڈیو
ٹائلٹ صابن
حسن و رعنائی کا سرچشمہ
DEW
TOILET SOAP
فیروز سنز
لیباریٹریز لمیٹڈ
نوشہرہ، مغربی پاکستان

پڑھے شروع سے آخر تک پڑھی اور اگر مجھے یقین نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ صالحات میری لکھی ہوئی ہے اور مسودہ چوری گیا"۔ اُس زمانہ کے سب سے بڑے ادیب کا نہایت وقیع خراج تحسین ہے۔ جس سے علامہ راشد الخیری کی اُٹھان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

احمد ندیم قاسمی ——— امروز لاہور ۳ فروری ۱۹۶۳ء)

صالحہ کی سوتیلی ماں جاہل مفلس ضدی جابر اور سنگدل عورت تھی۔ بن ماں کے بچوں پر وہ مظالم ڈھائے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ وہی صالحہ جس کے ذرا سے روٹھ جانے پر سارا گھر خوشامد کرتا جب منتی غسل صحت پر سیکڑوں روپیہ کا کپڑا گھر کے بچہ بچہ کے لئے آیا اور دھوم دھام سے جشن منایا گیا اس کی اب یہ حالت تھی کہ:

"جنوری کا مہینہ تھا اور مہاوٹ کا زمانہ۔ رات کے نو دس بجے ہوں گے۔ مینہ برس رہا تھا۔ رینگ کی پھٹی ہوئی اوڑھنی کو چاروں طرف سے سمیٹتی اُٹھتی بیٹھتی ہوئی چلی اور کانپتی ہوئی آئی۔ خوف کھاتی ہوئی کمرے میں گھسی اور سہمی ہوئی باپ کے سامنے کھڑی ہو گئی"

(۱۹۳۷ء آٹھواں ایڈیشن)

باپ کی بیماری میں صالحہ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ وہ دن رات باپ کی خدمت میں مصروف رہتی ہے کام وہ کرتی ہے مگر نام ہوتا ہے سوتیلی ماں کا جو شوہر کی زندگی کی طرف سے نا امید ہو کر سب مال اسباب سمیت اپنے میکہ بھجوا دیتی ہے۔ اور صالحہ پر چوری کا الزام رکھ کر اُسے بدنام کرتی ہے۔ اس ابھی دنیا بھر کے کیڑے ڈالنے کے بعد ایک بدمعاش آوارہ مزاج شرابی بدچلن جاہل

[illegible] سے عیاری اور مکاری سے نکاح کروا دیتی ہے اور وہ ایک دن نشہ کی حالت میں روئی کے گالے کی طرح دُھن ڈالتا ہے یہاں تک کہ صالحہ ختم ہو جاتی ہے۔

ملک کے مشہور نقاد مولوی محمد ظفر مرحوم نے جن کے ۴۰ سال تک عصمت اور اردو کے مشہور رسالوں میں مضامین شائع ہوئے اور لکھنؤ کے رسالہ "الناظر" میں جن کی تنقید ۲۰-۲۰ اور ۳۰، ۳۰ صفحے کی شائع ہوتی تھیں صالحات پر عصمت جون ۱۹۳۰ء میں تبصرہ کیا تھا جو کتابی صورت میں ۴۴ صفحوں سے کم کا نہ ہوگا۔

"انگریزی ناولوں میں سے جین آسٹن کے ناول پرائڈ اینڈ پرجوڈس (غرور بدگمانی) کو ایسا پایا ہے کہ بار بار اس کے پڑھنے سے دل نہیں اکتاتا۔ خود سر والٹر سکاٹ نے اس ناول کی اپنی ڈائری میں تعریف لکھی ہے کہ آج میں نے اس ناول کو تیسری مرتبہ پڑھا اور نیا ہی لطف اُٹھایا (ناول صالحات جین آسٹن کے ناول سے محض دلچسپی کے لحاظ سے ہی نہیں ملتا بلکہ (مولانا راشد الخیری نے کیرکٹر (سیرت) قائم کرنے میں وہی کمال دکھایا ہے۔ جس کا جین آسٹن نے اپنے ناولوں میں اظہار کیا ہے۔ اور جس کے لئے وہ چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ سیرت نگاری میں مولانا نے کمال کر دیا

...... آمنہ ایک نیک اور صالح بی بی کی مثال پیش کرتی ہے جب صالحہ کے غسل صحت کے لئے جوڑے تیار کئے جاتے ہیں تو آمنہ اپنی بڑی نند ساجدہ کے متعلق کہتی ہے۔

"اچھا تو تم پہلے آپا ہی کے کپڑے لکھو۔ یہ سب سے بڑی ہیں ان ہی سے شروع کرو"

کپڑے لکھوانے کا یہ حساب مسلمانوں کی خانگی معاشرت کا ایک سچا نظارہ ہے۔ گفتگو کا ایک ایک لفظ قدرتی ہے اور تصنع سے مبرا۔ کپڑے خریدنے کا ذکر کیا ہی برجستہ ہے۔

سوانح عمری علامہ راشد الخیری

... معاملات کا ایک ایک ہو بہو خانگی زندگی کی سچی اور اصل صحیح تصویر ہے ...... مولانا نذیر احمد نے صالحہ اور اس کے میں جامعیت پر خود سید کاظم کے باقول تو واسطے ان کی اس جملے دکھا سکتے ہیں کہ پتھر کا کلیجہ چاہیئے اس کتاب کی جان صالحہ ہے۔ کتاب پڑھنے والے اس کی خوشی سے وقت اور اس کے غموں سے غمگین ہوتے ہیں وہ خود قصہ کا جزو بن جاتا ہے ..... آدمی پڑھتا ہے اور آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے میں لڑکپن میں بھی روتا رہا ہوں۔ اور اب دنیا کے معاملات میں سمجھنے کے بعد بھی رونے لگتا ہوں مولانا سید بحری کا یہ پہلا زور قلم ہے اور قیامت ہے یہ صور غم کا خطاب انہیں بہت بعد میں ملا۔ یہ کتاب ان کا ماسٹر پیس ہے۔ پہلی ہی کتاب میں انھوں نے قلم توڑ دیا ہے۔ کتاب کیا قیامت ہے۔ اس قابل ہے کہ اس کی ہزارہا جلدیں ملک میں یونہی چھپ جائیں۔ اور یونیورسٹیوں میں بڑی جماعتوں کا کورس مقرر کر دیا جائے اور مولانا اس کتاب کی بدولت سر بنا دیئے جائیں۔ کتاب کا سارا پلاٹ بالکل ممکن الوقوع ہے ہیں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا صفحہ صفحہ تیر و نشتر کا کام کرتا ہے"

مولوی محمد ظفر ام اے مرحوم (صفحات ۴۳۳ تا ۴۴۰)

۲۔ منازل السائرہ ۱۸۹۵ء کے لگ بھگ شروع کی گئی اور غالباً ۱۹۰۲ء میں پہلی مرتبہ علی گڈھ سے محمد احسن صاحب وکیل کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے دوسرا اڈیشن شائع کیا۔ اور عصمت اکتوبر ۱۹۰۸ء میں اعلان کیا۔

"منازل السائرہ جناب مولوی عبدالراشد الخیری دہلوی کی مقبول کتاب جس کا پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا تھا اور جس کی دوبارہ اشاعت کے متواتر تقاضے آتے تھے اب مخزن پریس میں نہایت خوبی کے ساتھ دوبارہ چھپ رہی ہے اور جلد شائع ہونے والی ہے۔ اس میں سائرہ کی زندگی کی مختلف منازل کے حالات نہایت دلچسپ اور نصیحت آمیز طریق سے بیان کئے گئے ہیں۔ مولوی صاحب کی مشہور طرز تحریر کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اخبارات نے نہایت اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ مستورات ہی کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اور اس کا مطالعہ ان کے لئے بہت دلچسپ اور مفید ہوگا۔ قیمت علاوہ محصول عہ درخواستیں بہ تیزی جمع ہو رہی ہیں شائقین آرڈر بھیجنے میں جلدی کریں۔ جو آرڈر پہلے آئیں گے کتاب تیار ہونے پر سب سے پہلے ان کی تعمیل ہوگی۔ کتاب کی ضخامت دو سو صفحوں سے زیادہ ہے"

جنوری ۱۹۰۹ء کے عصمت میں اشتہار تھا کہ

"مولوی صاحب کی یہ مقبول تصنیف جس کے لئے شائقین مدت سے منتظر تھے چھپ کر تیار ہے۔ اصل کتاب کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ملک نے پہلے ہی اڈیشن پر تسلیم کر لیا تھا کہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کی کتب کے بعد منازل السائرہ ہی ان کے ڈھنگ پر ایسی کتاب لکھی گئی ہے جس کا مطالعہ خاص مستورات کے لئے مفید ہوگا مستورات اس کتاب کو خود پڑھیں۔ اپنے گھروں میں پڑھکر سنائیں۔ اور اپنے عزیزوں اور سہیلیوں کو تحفہ کے طور پر بھیجیں ضخامت کتاب کی تین سو صفحوں کے قریب ہے۔ نفیس کاغذ پر نہایت عمدہ چھپی ہے۔ سرورق بہت خوشنما ہے"

یہ چند سطروں کا اشتہار پورے صفحہ پر چھپا تھا۔ اس کے سامنے کے صفحہ پر مخزن پریس کی چار مشہور کتابوں کا اشتہار تھا۔

اخبارات نے جو ریویو کئے تھے وہ میری نظر سے

نہیں گذرے۔ ممکن ہے مخزن میں شائع کئے گئے ہوں۔

[illegible] سنہ میں ملا محمد راشد صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ نے شیخ صاحب مرحوم سے حقوق اشاعت خریدے تو مصنف سے نظر ثانی کروا کر دونوں حصے الگ الگ شائع کئے اور کئی کئی مرتبہ۔ میرا خیال ہے کہ پہلے اور دوسرے اڈیشن میں جو مقدمہ یا دیباچہ تھا وہ مصنف نے نظر ثانی کرتے وقت نکال دیا تھا۔ [illegible] سنہ میں بیٹے حقوق اشاعت واپس لے لئے اور پھر دونوں حصے اکٹھے شائع ہونے لگے۔ ۱۹۶[illegible] سنہ میں حکومت پاکستان کے ترقی اردو بورڈ نے جس کا میں غیر سرکاری ممبر ہوں۔ میری اجازت سے منازل السائرہ شائع کی تو مجھ سے اس کا دیباچہ اور فرہنگ لکھوائی۔ اس اڈیشن کے صفحے مع فرہنگ ۳۲۷ ہیں ۲۲ × ۱۸ / ۸ کی تقطیع کے۔

حیات صالحہ میں ایک نیک اور سگھڑ مگر مظلوم لڑکی کی زندگی دکھائی گئی ہے اس کے برخلاف منازل السائرہ میں دکھایا گیا ہے کہ تعلیم سے محروم ہونے تربیت نہ ہونے اور بری صحبت سے سائرہ میں دنیا بھر کے عیوب کس طرح اکٹھے ہو گئے۔ " افتاد پڑی بری۔ اصلاح ہوئی نہیں۔ جو جی میں آتا کہتی اور جو دل چاہتا کرتی۔ روکنے ٹوکنے کی کسی میں ہمت نہ کہنے سننے کی ضرورت بے جا لاڈ پیار نے ستیاناس کر دیا۔ دادا دادی حیران۔ ماں باپ پریشان کنبہ رشتہ والے نالاں نوکر فریادی۔ ماماتیں شاکی جس کو چاہا پیٹ ڈالا جسے چاہا منہ بھر کر کوسنے دے دیئے۔ کسی پر تھوکا کسی کو مارا۔ کبھی ماما کی پیٹھ میں کاٹا کبھی سقے کے رسکو ادھیڑ ڈالا۔ بھائی کی شادی ختنہ پر وہ آگ لگائی کہ کنبہ بھر کو پریشان اور سامول کو بھی وہ مزہ چکھایا کہ ساری عمر یاد رکھے۔ کبھی وہ چھوٹے بھائی کے منہ پر کٹورا کھینچ مارتی تو کبھی بڑھیا ماما کے سفید بالوں میں دیا سلائی لگا دیتی ہے

بدمزاجی بدتمیزی کی یہ کیفیت کہ جو وہ سال کی عمر ہے۔

" ذرا سا پیسہ ملنے میں دیر ہوئی اور شیشہ کا گلاس پھینک دے مارا چینی کی طشتری کا تڑاسے زمین پر۔ رکابی چکراتی ہوئی یہ آئی اور ٹوٹا لڑھکتا ہوا وہ گیا! پتیلی خالی بھری یا بھری چولھے سے موری پر۔ پیالی تانبے کی ہو یا چینی کی دسترخوان سے چوکھٹ پر"

۲۱، ۲۲ سال کی عمر ہو جاتی ہے اور وہ آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ باورچی خانہ میں کبھی جا کر پھٹکتی نہیں۔ اس کی شرارتیں بے ہودگیاں اور نامعقول حرکتیں الامان الحفیظ ایک دن اس کی ماں محفل میلاد میں جانے والی تھی۔ تین سکہ کا نیا ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ جس پر کیکری کٹاؤ کا کام نہایت محنت سے کیا گیا تھا آنکھ بچا خود پہن کیچڑ میں اس طرح لت پت کر دیتی ہے کہ:

" تاکا جوڑی کے بخیہ پر کیچڑ کی افشاں اس خوبصورتی سے ہوئی ہے کہ چھیپی سے تین دن میں بھی نہ ہوتی"

کبھی وہ باپ کی کتابیں قینچی سے کاٹ ڈالتی ہے اور ماں باپ کی لڑائی کا لطف اٹھاتی ہے۔ اور جب اس کا نام آتا ہے تو سانپ کی طرح سر دھننے لگتی ہے۔ گھر میں مولود شریف ہوتا ہے تو جو مٹھائی مہمانوں میں تقسیم کی جاتی ہے پہلے ہی محلہ کی لڑکیوں میں ختم کر دیتی ہے۔ کبھی وہ افیم کھاتی ہے۔ اور کبھی بڑھیا کا چمن کو مارتی ہے۔ شادی ہو جاتی ہے لیکن اس کی عادات قبیحہ میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ ساس نیاز دلواتی ہیں تو چاول گوڑے پانی کے مٹکے میں گھول دیتی ہے تاکہ میاں ساس کو دشمن سمجھیں ([illegible]) بدمزاجی پن کا یہ عالم ہے کہ میاں کے دوست کی دعوت ہوتی ہے ساس کو بخار چڑھا ہوا ہے اس لئے سائرہ باورچی خانہ میں پہنچ کر گھر کھانا کیسا ہوتا ہے۔

عملی تصویریں پیش کی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی چابک دست مصور اپنے مُو قلم سے یہی تصویریں بنانے بیٹھتا تو اتنا کامیاب نہ ہوتا جتنا کہ مولانا کامیاب نظر آتے ہیں.... چمنستانِ شباب کی سیر کچھ اس طرح پہ ہے کہ اس پر مفتوں ہونے کی بجائے جی ڈرنے لگتا ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یا یوں سمجھئے ایک ناصح مشفق کی طرح مولانا کے ساتھ ساتھ اس خوشنما گلزار میں سے گذر رہے ہیں اور اس کی ہر خوبصورت چیز جو دھوکا دینے والی ہے اُس سے آپ کو آگاہ کرتے جاتے ہیں.... جوانی ڈھل گئی اور زندگی کا پچھلا پہر آپہونچا کاروانِ حیات آخری منزل طے کرنے لگا۔ اس منظر کو مولانا کی نظر سے دیکھئے "چمنستانِ شباب کے اس کنارے پر حیات آباد سے ملا ہوا دریائے انحطاط لہریں لے رہا تھا۔ ضعیفی کی کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر لوگ پار اُترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موجوں کے تھپیڑے۔ پانی کے گرداب۔ پہاڑوں کی چٹانیں۔ بادِ مخالف کے جھونکے دہارے کے سامنے مشکل سے آنے دیتے تھے۔ غفلت اور لاپرواہی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا ہوتا ہاتھ پیر رکھ کر بیٹھ جاتے مسافروں کی آنکھوں میں ایسے غفلت کے پردے پڑے تھے کہ ساتھ کی کشتیاں برابر ڈوبتی چلی جاتی تھیں اور اپنی بربادی کا خیال بھول کر نہ آتا تھا"

معیشت آباد میں مولانا نے ایک محلہ مسرایل پر لکھایا اس میں دو گلیاں ہیں۔ مظلوموں کی گلی اور زبان درازوں کوچہ مظلوموں کی گلی کی تھوڑی سی کیفیت سُن لیجئے ان میں

سب کی سب بیچاریاں دُکھیاریاں آفت کی ماریاں

.... رحم کی آنکھیں ان کی حالت پر آنسو بہاتی تھیں اور اُن کا کلیجہ انسانی داستانِ مصیبت پر پاش پاش ہوتا تھا۔ یاس شدہ دل نے ان کے کلیجے چھلنی کر ڈالے ناامیدی نے ان کی عمروں کا خاتمہ کر دیا"

اڈیسن نے "مرزا کا خواب" اس طرح لکھا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دُنیا کی بے ثباتی آنکھوں کے آگے آجاتی ہے۔ اس خواب سے کچھ ملتا جلتا سفرِ حیات ڈاکٹر جانسن نے بھی لکھا ہے جس میں زندگی کو ایک دریا سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مگر علامہ راشد الخیری نے ان دونوں مغربی انشاپردازوں سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے..... زندگی کی تمام منزلوں کو انہوں نے شاعر کی نگاہ سے دیکھا اور مصور غم کے قلم سے رنگا ہے۔

ساقی راشد الخیری نمبر

منازل السائرہ کا صفحات ۹۸ و ۹۹ پر بھی ذکر آچکا ہے۔

منازل السائرہ علامہ مغفور کی حیات میں کئی سال پنجاب یونیورسٹی کے اُردو کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں رہی ہے۔

۳۔ قطراتِ اشک مصنف کے تقریباً ایک درجن افسانوں کا مجموعہ ہے۔ چند مضامین بھی ہیں۔

ایک مظلوم بیوی کا خط۔ ۱۹۰۸ء کے مخزن میں "کثرت ازدواج" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ خط کے پیرایہ میں ہے۔ اور اس میں دکھایا گیا ہے کہ مرد دوسرا نکاح کرکے پہلی بیوی کی طرف سے کس سنگدلی اور بے دردی سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

"ایک کا یہ سہاگ کہ روپیہ پیسہ عیش عشرت۔ کپڑا لتہ۔ گہنا پاتا۔ سب موجود۔ دُوسری کو یہ آگ لگی کہ کس کا چین اور کہاں کا آرام۔ کیسا گہنا اور کس کا کپڑا۔ تین تین وقت کے فاقے! ایک کے صندوقچہ میں بھری ہوئی

تھا۔ جُھن جُھن جھنکارتی تھی اور ڈگمگا رہا تھا۔ تھپکا، تھپکا رہا۔ بہلایا پھسلایا۔ بجلی کلیجے سے لگایا سب کچھ کیا مگر اس کی چیخم دھاڑ بند تھی۔ اسے ماں تاش پر بھری جان پر زبان تھی اس پھول کے رونے میں سب کچھ بھول گئی"

روٹھی ہوئے مقصود۔ مخزن سنہ مصور غم کا یہ پہلا افسانہ تھا جس میں غم نگاری کے ساتھ ظرافت کی ہلکی سی چاشنی ہے اور یہ پہلا افسانہ تھا جس میں ایک مغرب زدہ شخص کی زندگی کے بعض پہلو مضحکہ خیز دکھلائے گئے ہیں۔ اس افسانہ کے مطالعہ سے ہی بعض ناقدین اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ "علامہ مرحوم کے ناولوں اور افسانوں میں ڈرامائی عنصر غالب ہے"

سارس کی تارک الوطنی (مخزن سنہ ۹) پہلا افسانہ ہے ان افسانوں میں جن میں جانوروں کی زبانی انسانی مظالم کی کہانیاں سُنائی ہیں۔ اس افسانہ میں پہلی کہانی ہے ایک دغاباز مکار عیار شہزادہ کی جو اپنی بیوی پر فریفتہ ہے مگر کچھ عرصہ بعد بے قصور بیوی پر جھوٹے الزامات رکھ کر قتل کر دیتا ہے۔ دُوسری کہانی ہے ایک سنگدل عورت کی جو ماں ہو کر بھی ماں تا کو نہیں سمجھتی۔ تیسری کہانی ایک بھائی کی ہے جو چھوٹے بھائی کو اپنی محبت کا یقین دلا کر جھوٹی دستاویز پر دستخط کروا تا اور گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیتا ہے۔

نند کا خط بھاوج کے نام عصمت کے سب سے پہلے پرچے جون سنہ میں شائع ہوا تھا۔ ایک دُکھیاری مصیبت ماری ماں جس بیٹے کو اللہ آمین کر کے پالتی خود فاقے کر کے اُسے تعلیم دلاتی ہے وہ آخر وقت میں بیٹے کو دیکھ لینے کی حسرت لئے دُنیا سے رخصت ہو جاتی ہے بہت

درد انگیز خط اور بڑا پُرجوش افسانہ ہے۔

ساون کی چڑیاں۔ (عصمت سنہ) بیگم شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر کا بیان ہے کہ علامہ مغفور کسی شادی پر شریک تھے کہ طبیعت متاثر ہوئی اور دفتر میں آ کر دو اس زمانے میں ٹھیا محل میں تھا یہ مضمون شروع کیا۔ موضوع یہ ہے کہ لڑکیاں میکے میں ساون کی چڑیوں کی طرح ہیں۔ رخصتی کے وقت لڑکی ماں سے کہہ رہی ہے۔

جس حال میں رکھا ہے ۔۔۔ ہم نے نہ کی زنہار اُف
رکھی ہو آد ہی بات گر منہ پر ۔۔۔ ترک جائے زباں
جو آ گیا وہ لے لیا ۔۔۔ جو دے دیا وہ کھا لیا
جب نیند آئی پڑ رہے ۔۔۔ ہم نے جگہ پائی جہاں
اب ہم کو دُنیا ہے نئی ۔۔۔ دانا نیا پانی نیا
جانا ہے ایسے دیس میں ۔۔۔ پردیس سے ہے جو سوا
چلنا ہزاروں کوس ہے ۔۔۔ رستہ کٹھن منزل کڑی
چاروں طرف سنسان ہے ۔۔۔ اور سر پہ بادل چھائے
دم بھر میں طعنوں سے کریں ۔۔۔ چھلنی کلیجہ گود کر

پتھر سے بدتر جن کے دل
اُن سے ہمیں پالا پڑا

اس مضمون کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ درجنوں رسالوں میں نقل کیا گیا تھا اور نظم کے اشعار آج بھی بہت سوں کو حفظ ہیں۔

مظلوم کی فریاد۔ (عصمت سنہ) لڑکیوں اور بیویوں کی حمایت میں ہے۔ جس میں کرموں جلی نصیبوں پیٹی عورتوں کی زدہ حالت دکھائی گئی ہے جو بے دردار بے رحم شوہروں کے ہاتھوں جن کی مٹی خراب ہے۔

ماہ جبیں اندرا (تمدن سنہ) جارج پنجم کا دلی میں دربار ہوا تھا۔ اس موقع پر لکھا گیا تھا اس میں دلی کی

کہانی ہے۔ بیٹے اور [illegible] کی

دیور بھاوج کی [illegible] (عصمت ۱۹۱۰ء)

[illegible] جب [illegible] حقوق نسواں پر [illegible]

چاندنی چوک کا جنازہ۔ (کہکشاں ۱۹۱۰ء) دلی

[illegible] کا المیہ۔ ان [illegible] کی یاد ہے کبھی کبھی رلاتی ہیں۔

غدر کی مصیبت قیامت سے کم نہ تھی ان کے سامنے

والدین کو چلے جاتے دیکھا۔ بھائی و شوہر سے جدا ہوئیں

عورتوں میں تڑپتے دیکھا۔ بھائیوں کی لاشیں دیکھیں

جوان بیٹوں کو قبر میں رکھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ ان آنکھوں

سے چاندنی چوک کا جنازہ دیکھنا پڑے گا"

(صفحہ ۶ چھٹی بار)

یہ مضمون کہکشاں کے چار صفحوں کا تھا اور اس کا معاوضہ

سو روپیہ لیا تھا

جھولے کی یاد۔ (تہذیب نسواں ۱۹۱۲ء) دو بڑھیا

سہیلیاں جوانی کا زمانہ یاد کرتی ہیں۔ ان کی زبانی بتایا

گیا ہے کہ دلی والیاں آج سے نصف صدی قبل برسات

کس طرح مناتی تھیں۔

قطرات اشک کے مضامین کے حقوق غالباً ۱۹۱۲ء

میں مشہور ادیب جناب ل۔ احمد نے خرید لئے تھے ان سے

دارالاشاعت پنجاب نے خریدے اور ۱۹۱۳ء میں پہلی مرتبہ

بصورت کتاب شائع ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں یہ حقوق واپس

لے لئے۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء تک ہزاروں کی تعداد میں سات دفعہ

شائع ہوئی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۹۲ صفحے ہیں۔

• قطرات اشک کا ایک مضمون "ساون کی چڑیاں"

خاص کر قابل ذکر ہے اس میں اس حقیقت کو بڑے اثر انداز میں

بیان کیا گیا ہے کہ ہمارے گھروں میں اکثر تعلیم و تربیت اور

پرورش کے سلسلے میں لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

اس مضمون میں علامہ مرحوم نے مردوں سے زیادہ عورتوں

پر الزام لگایا ہے اور اس کے پڑھنے سے یہ بات واضح

ہو جاتی ہے کہ وہ عورتوں کو مردوں سے بدظن کرنے کی جگہ

ہمیشہ اس امر کا لحاظ رکھتے تھے کہ خود عورتیں اپنی کمزوریوں

اور خامیوں سے واقف ہو جائیں"

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ——— مصحف فروری ۱۹۵۱ء

۴۔ شاہین و دراج | علامہ مغفور کے قلم سے حسن و وفا اور عشق ناکام کا پہلا افسانہ ہے

جو ۱۹۰۶ء کے مخزن میں مکمل شائع ہوا اس کی مقبولیت

کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تیسری

قسط کا شائع ہونا تھا کہ مخزن کے خریداروں میں ۳۰۰

کا اضافہ ہو گیا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب اردو کے ادبی

رسائل کی سرکولیشن دو ہزار تھی۔ شاہین و دراج

سے قبل علامہ مغفور کے جو درد انگیز افسانے اور مضامین

شائع ہوئے تھے ان میں طبقہ نسواں کی بے چارگی اور

مظلومیت دکھائی گئی تھی۔ مگر اس افسانہ کا رنگ جدا ہوا

تھا۔ موضوع وہی تھا جس پر متعدد ناول اردو میں شائع

ہو چکے تھے۔ لیکن پلاٹ کی دلکشی۔ طرز تحریر کی دلآویزی

لطف زبان اور زور بیان نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی

واقعہ نگاری۔ منظر کشی۔ مکالمہ نویسی۔ تمثیل نگاری اور عبارت

پردازی کے اچھے اچھے نمونوں سے یہ گلدستہ آراستہ ہے۔ مثلاً

"آبنوس و شیشم کے تختے۔ زمرد و جواہر کی پچی کاری رنگا

رنگ کے پردے۔ انواع و اقسام کی گل کاری۔ بیچ

رومی و کاشانی مخمل اور ایرانی اور نابلستانی قالین

جواہر نگار کرسیاں پیکوں کے ہار پڑے ہوئے [illegible]

کانوں میں الماس۔ گلے میں لعل۔ صورت کی افضل۔

سیرت کی اعلیٰ۔ ہاتھوں میں ہیرے۔ پاؤں میں لال۔

[illegible] سی ہیں مست - جوانی میں چور
[illegible] شاہین کی گود کی دولت تھی"

"[illegible] گھاسے زمین کی پھاند سے جیسے [illegible] رہی ہیں
پھولوں کے جو [illegible] ہیں - اور بار آور ڈالیاں
جھوم جھوم کر ان کا منہ چوم رہی ہیں - طائران خوش الحان
چہک چہک کر چہک رہے ہیں - اور گل شبو کی پنکھڑیاں
[illegible] نثار ہو رہی ہیں"

"مایوسی کے پھندے صاف نظر آرہے ہیں - مگر امید کے
پھندے ایسے پھندے ہیں کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا" ص ۳۲

"بیٹا - بیٹھا - اٹھا - پھرا - زینہ کھول اوپر گیا - دروازہ
کھول باہر آیا - چھت پر بیٹھ تارے گنے - کمرے میں چھپ
کر بیٹھ گئیں - تڑپا - لوٹا - چیخا - چیتا - مسجد میں جاکر موذن
کو جگاتا تھا - کھانچے میں آکر مرغ کو گھورا - جو کرتا تھا
[illegible] اور جو کیا تھا وہ کر ڈالا - مگر صبح نہ ہونی تھی اور
نہ ہوئی" ص ۳۲

"جہاں ہر طرح طرح کے جانور اور بن بن کے پکھیرو
بسیرے دربار میں بولیاں بول رہے ہیں - وہاں ایک
دراج بھی سبحان تیری قدرت کے نعرے لگا رہا ہے"

"راتیں پھریں - موسم پلٹے - زمانہ بدلا - کلیاں پھول ہو ہو
کر مرجھائیں - پھول کھل کھل کر کمھلائے - ہری بھری
شاخیں سرسبز شاداب پودے دیکھتے ہی دیکھتے
[illegible] اور سوکھی کھرکھک ڈالیاں آناً فاناً میووں
سے لد گئیں" ص [illegible]

"میں ہی منہ سے کہہ کر کیا نہال ہو جاؤں گا - میری شرکت
سوال ہے - میں نے دکھا میری حالت نے کہہ دیا"
"وزیر اعظم یہ بچوں میں ایک بچی تھی جو آپ کے
ہاتھوں آج ہمیشہ کے واسطے جدا ہوتی ہے" ص ۹

[illegible]

مشہور افسانہ نگار جناب ل۔ احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:-
"شاہین و دراج کو شائع ہوئے کم و بیش [illegible] سال
گزر چکے ہیں - لیکن باوجود اس کے کہ میں [illegible] بہتر
سمجھنے کے قابل ہوں - اور باوجود اس کے کہ اردو زبان
کے بعض عمدہ عمدہ فسانے میری نظر سے گزر چکے ہیں لیکن
شاہین و دراج کا جو اولین مرتبہ میرے خیال میں اس وقت
قائم ہوا تھا - وہ ابھی تک قائم ہے"

(عصمت [illegible] نمبر)

پروفیسر وقار عظیم [illegible] کے عصمت میں لکھتے ہیں :-
"ملکہ شاہین کی سواری جشن نوروز منانے کے لئے
بڑے تزک و احتشام سے چلی - ہر طرف فوجیں - مسلح سپاہی
باجے گاجے - خوشیاں کسی باغی نے ملکہ پر گولی چلادی
ایک دہقان سامنے آگیا - ملکہ کو آڑ میں لے لیا - ہر طرف
سناٹا چھا گیا - باغی پکڑا گیا - لیکن ملکہ پر دہقانی نے
اپنا وار کر لیا - اس کے دل کی حالت یہ تھی کہ :-
"بجائے اس کے کہ وہ نہال نہال ہوتی - بالکل افسردہ
تھی - چپ چاپ چلی اور گم سم آئی - اتری تو مغموم -
کھڑی ہوئی تو افسردہ - بیٹھی تو محزون اور لیٹی تو مردہ"
ادھر دہقان و دراج کا یہ حال کہ گھر میں بے سدھ پڑے
پڑے ٹہل رہا ہے [illegible] - خیال میں شاہین لب
پر دعا دل میں آمین"

انشا پردازی کا اعجاز ہے کہ وہ جذبات کی کیفیت
دو جملوں میں بیان کر سکتی ہے"

اور اسی پرچہ میں ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری
لکھتے ہیں :-
"شاہین ایک با اقتدار عورت تھی اور دراج اس کا
غریب پرستار اور اسی لئے مصنف نے شاہین کے ہاتھوں

بالغ چھ سال کی بچی باپ کے سلام کو جاتی ہے تو اس بات پر ڈانٹ پڑتی ہے کہ :۔

"چھم چھم کرتے باپ کے آگے جانا تم کو شرم نہیں آتی"

وہ چھانجھن چوڑیاں اُتار پلنگ پر ڈال کر چلی گئی سبکتی پھر اس کے کان میں یہ الفاظ پہنچتے ہیں۔

"خدا ایسی بے ڈھنگی بیٹی ہو کہ کسی چیز کا ٹھیک ٹھور ہی نہیں۔ جہاں جی چاہا اُتار پھینکی" (صفحہ ۔)

وہ چیز رکھنے کو ٹھری میں جاتی ہے کہ پھر تنبیہہ ہوتی ہے :۔

"کے دفعہ بتا چکی ہوں کہ اوڑھنی کا کونا بغل سیدھی طرف نکالا کرو ...... بے شرم باپ کے سامنے جا رہی اور سارا بازو کھلا ہوا ہے"

ماں کے سر میں درد ہے چھوٹا بھائی روتے روتے جان ہلکان کر لیتا اور کسی طرح نہیں بہلتا۔ ماں کہتی ہے :۔

"نسیمہ میری تو جان نکلی جارہی ہے اسے ذرا بہلا لے"

اور وہ جواب دیتی ہے کہ :۔

"میرے تو سبق کا وقت ہے ذرا قرآن شریف پڑھ لوں پھر لوں گی"

تو سجیدہ ناراض ہو جاتی ہے۔ نسیمہ بچہ کو بہلا بھی لیتی ہے ماں کا سر بھی دباتی ہے مگر سجیدہ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا کہ اس نے ماں کو ٹکا سا جواب کیوں دیا جب تک نسیمہ ماں سے قصور معاف نہیں کرواتی۔ سجیدہ اس سے ناراض رہتی ہے۔

نسیمہ بارہ سال کی ہے اور اس عمر میں۔ صفائی ستھرائی۔ شرم حیا۔ ملنساری۔ خوف خدا غرض وہ سب صفتیں جو لڑکیوں کا سچ مچ کا زیور ہیں۔ کنوارپتے میں پیدا ہو گئیں کھانا پکانا سینا پرونا۔ کیا کام تھا جو اسے نہ آتا ہو۔ ادب لحاظ۔ سلیقہ۔ اطاعت۔ کون سی خوبی تھی جو اس میں نہ ہو۔

مگر ایک دن نسیمہ کی ہندوستانی جوتی پر جو سجیدہ کی نظر پڑی اور دیکھا کہ دایاں بایاں دونوں پیر الگ الگ اور ٹیڑھے۔ تو سختی کے ساتھ ٹوکتی ہے (صفحہ ۹۰-۹۱)

تو اس کی لاپرواہی سے خفا ہو جاتی ہے۔ نسیمہ گھبرا کر اٹھتی ہے اور ڈھیلے پائنچوں کے پاجامہ میں پاؤں الجھ کر گر پڑتی ہے تو سجیدہ اس بے اوسانی کو آڑے ہاتھوں لیتی ہے۔ (صفحہ ۹۸)

دھوبن کے ہاں سے کپڑے دُھل کر آئے ہیں نسیمہ اس احتیاط سے ہر کپڑے کو اندر سے کھول کر دیکھ لیتی تھی کہ کوئی دھبہ تو نہیں رہ گیا۔ دو تین کپڑے کم تھے۔ نسیمہ کہتی تھی میں نے بھیجے تھے اور دھوبن قسمیں کھاتی تھی کہ مجھے نہیں ملے تو سجیدہ نسیمہ کی اچھی طرح خبر لیتی اور پھر بتاتی ہے کہ میلے کپڑے کس طرح رکھنے دھوبن کو کس طرح دینے اور لینے چاہئیں۔ (صفحہ ۱۰۰-۱۰۱)

واقعات کے اعتبار سے صبح زندگی بہت ہی دلچسپ ناول ہے۔ لیکن ہر واقعہ نسیمہ کی تربیت سے تعلق رکھتا ہے ہر قصے میں اخلاقی سبق ہیں جو نسیمہ کے ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔ نسیمہ کے سامنے سجیدہ بھاوج سے کنواری لڑکیوں کی حمایت میں گفتگو کرتی ہے۔ اور تنہائی میں نسیمہ کو منظوم کہانی سُنا کر ماں کے معنی بتاتی ہے۔ گیارھویں باب میں بتاتی ہے کہ بہن بھائی کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ تیرھویں باب میں سنجھلی کا ایک اور واقعہ ہے کہ وہ بڑھیا کا چھن سے زبردستی سودا زیادہ لیتی اور اُسے ستاتی اور اس سے بدزبانی کرتی ہے۔ ماں سمجھاتی ہے تو اس کی جان کو آ جاتی ہے اور ماں سے بدلہ اس طرح لیتی ہے کہ وہ کسی ضرورت سے میکے جاتی ہے تو باپ کو لگاتی ہے کہ ہمارے دشمن کے ہاں

اتی ہیں۔ اس جھوٹ کی وجہ سے ماں باپ میں لڑائی ہوتی ہے
تو سمجھ نسیمہ کے سامنے جھوٹ کی برائیاں اس طرح بیان
کی گئی ہیں کہ ایک لفظ غلط ہو جانے سے نجل اور اس کی سہیلیاں
بچوں ڈرتی ہیں۔ اب جملہ نسیمہ کی عادت بن جاتی ہے تو نجل
سے الگ ہو جاتی ہے۔ نسیمہ نجل اور اس کی سہیلیوں میں کچھ دیر
بیٹھ جاتی ہے مگر نسیمہ بھاگ جاتی ہے۔

جو ردہ لو، بچ کر جو وہ رنگ بکھرے۔ آدمی کو دیکھ کر
آدمی ڈھنگ بکھرے۔ تم کو ان کی بے ہودہ حرکتیں
دیکھ کر ان سے بچنا اور پرہیز کرنا چاہیے۔ وہ کہ ان کی
نیک بن کر ان کی مجلس بیٹھو۔ فعال اگر جھنکار
ہوئی۔ کیا خبر بری تھی یا خالی" (ص...)

نسیمہ کے چھوٹے بھائی کی تقریب ختنہ پر نسیمہ
کی ماں سے زاد بہن ماں سے لڑائی کرتی ہے۔ وہ غلط
فہمی میں مبتلا ہو کر اپنے گھر واپس جانے کے لئے ڈولی
منگاتی ہے۔ خاصہ معرکہ گرم ہو جاتا ہے۔ آخر میں نسیمہ
کے سامنے یہ بتایا جاتا ہے کہ غلط فہمیوں کے کیسے برے
نتائج ہوتے ہیں۔ اکیسویں باب کے آخری حصہ میں فرض
کی برائیاں ایک دردناک کہانی کی صورت میں بتائی گئی
ہیں۔ پانچ سال کی نسیمہ باپ کے سلام کو جاتی ہے تو
"دبے پاؤں جھک جھکائی اور پھر سلام کر چکی تو الگ کھڑی
ہو گئی۔ باپ کو دیکھا تو پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ پنکھا ہاتھ
میں لے بیٹھ کے پیچھے جھلنے لگی۔ باپ نے دعا دی پانی
مانگا نسیمہ نے قلعی دار کٹورا لے جا کر پہلے خوب دھلوایا
پھر صراحی میں سے پانی الٹ کر آدھ سیر نیچے ہاتھ رکھ سامنے
لا کھڑی ہو گئی۔ بیٹی کی تمیز داری دیکھ کر باپ کا دل
خوش ہوا۔ (ص ۱۶-۱۷)"

نسیمہ کتابیں پڑھتی ہے تو ایسی جن میں تمیز کی باتیں
ہوتی ہیں۔

• کسی بزرگ کے سامنے جانے کا اتفاق ہو یا کسی ضرورت
سے نکل آئے اس سے دو چار ہو کر اپنی اوڑھنی سنبھال
کر اوڑھو تکلف ٹھیک طرح لگاؤ۔ یہ نہیں کہ بازو کھلا
سر ننگا۔ لڑکیوں کا سب سے بڑا جوہر شرم وحیا ہے....
بے تمیزی سے پان کھانا سخت عیب ہے..... یہ بھی
عیب کی بات ہے کہ وہیں گھس گئے۔ وہ بلائے تو پاس۔
سوال کرے تو جواب دو۔ بغیر بلائے سر پر سوار ہو اور
گھس کر بیٹھنا بڑی بے ہودہ بات ہے..... بزرگوں
کا ادب عین شرافت کی نشانی ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر ترواق پرواق باتیں کرنی بھی عیب میں داخل ہے
اور ایک بہت بڑا عیب لڑکیوں میں تترے پن کا دیکھا
گیا..... خدا بھلے مانسوں کی بیٹیوں کو اس سے بچائے
..... آواز سے چپڑ چپڑ کر کے کھانا بڑے سرے کی
بد تمیزی ہے..... یہ نہیں کہ منہ میں نوالہ لینے کے واسطے
زبان آدھ گز باہر آجائے..... تمیز کے معنی یہ ہیں کہ اپنے
آگے سے کھاؤ۔"

استانی جی کی تقریریں نسیمہ کے سامنے ہوتی ہیں
تو ایسی:۔

• جس چیز کے واسطے جو جگہ مقرر ہے اسی جگہ رکھ دی
تاکہ ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو..... بیٹی کا پہلا کام
ہے کہ گھر چمن بن جائے۔ ایک سوئی بھی گر پڑے
تو الگ دکھائی دے..... دالان یا کمرے میں
بلا ضرورت کوئی چیز نہ ہو..... کوئی چیز ٹیڑھی ترچھی
نظر نہ آئے (ص ۴۲)

• تولیے کے سوا کسی اور کپڑے اوڑھنی کے آنچل یا کرتے
کے دامن سے ہاتھ پونچھنا بڑی بد تمیزی کی بات ہے....

"..... دیوار پر کسی قسم کا داغ دھبہ کوئلے کی لکیریں پان کی پیک وغیرہ نہایت پھوہڑپن ہے۔ اگر کسی گھر کی خراب حالت دیکھو اور یہ بھی کہ وہاں ہوشیار لڑکی ہے تو یقین کرلو کہ بہت ہی بدسلیقہ اور بے ڈھنگی ہے۔" (ص ۳۳)

غرض یہ کہ چھوٹی سی عمر میں یہ صبح زندگی کی نسیمہ آداب مجلس سے باخبر ہو جاتی ہے (ص ۲۵، ص ۳۳) اور تمیز کی موٹی موٹی باتیں ہی نہیں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اسے معلوم ہو جاتی ہیں (ص ۳۵) پھوہڑ لڑکی کے ہاتھوں ایک گھر کی کیسی مٹی پلید ہوتی ہے (باب ۵) پھر سگھڑاپے پر تقریر۔ لڑکیوں کے فرائض۔ خانہ داری کے کام کاج کے متعلق ہدایات۔ برتنوں کی دیکھ بھال، باورچی خانہ کی صفائی ستھرائی (ص ۴۸، ص ۵۳) پانی کی صفائی کے زریں اصول (ص ۵۰) یہ سب خشک مضامین ہیں۔ مگر ایسے دلآویز پیرایہ اور دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ طبیعت پر ذرا بار نہیں ہوتا — پھر خانہ داری ہی کے سلسلہ میں وہ آزمودہ بے بہا نسخے بتلائے ہیں جو باسانی گھر پر تیار کر کے ڈاکٹروں کے ہاں بھاگ دوڑ اور آئے دن کی پریشانی سے نجات مل سکتی (ص ۳۹، ص ۱۰۶)

جس طرح نسیمہ کے ہر کام پر سنجیدہ کی کڑی نظر تھی اسی طرح وہ زمانہ آتا ہے کہ نسیمہ نواسی کے ہر کام کو نظر میں رکھتی ہے اور اس طرح اس کی سلیقہ شعاری کے جوہر کھلتے ہیں۔

نواسی نے:—

"آٹا گوندھا تو ایسا کہ گٹھلیاں پڑی ہوئی۔ کھیری پھٹی ہوئی۔ نسیمہ دور سے بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ ہنستی ہوئی پاس آئی اور کہا یہ آٹا گوندھا ہے۔ ذرا چوڑیاں تو دیکھو اور گرایا کیوں ہے۔ بنو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے کونڈے کو دھو دھلا صاف کیا۔ پھر آٹا ڈال کر گوندھا۔ ذرا جان مار ہاتھوں سے مکی دی۔ ٹھیرنے پر آگیا ہتھیلی ی

نہیں تو کھیری پھٹ جائے گی۔ تم نے جتنی تو دی نہیں برابر لگی دیتی رہیں" (ص ۵۴)

نسیمہ آٹا گوندھنا ہی نہیں بتاتی۔ بلکہ پیڑے بنانا روٹی ڈالنا۔ پراٹھے بنانا۔ مصالحہ پیسنا اور بھوننا۔ ... کی ترکیب۔ پھل کا کانٹا گلدستے کی ترکیب (صفحہ ... تا ...) اسی طرح سمجھاتی ہے پھریان اور پٹاری (ص ۹۳) گھر کے ملبے (ص ۱۲۳ تا ص ۱۲۴) ایک ایک چیز کو اس طرح سمجھاتی اور اس پھرتی اور عقلمندی سے حساب کرتی ہے کہ خانہ داری کا وسیع تجربہ رکھنے والی معمر خواتین بھی حیران رہ جائیں —

اٹھائیسواں باب کپڑے لتے کے متعلق ہے پھر اس میں یہ بھی ہے کہ مہمان آجائیں تو کون کون سی چیزیں کتنے وزن کی تیار کی جائیں۔

ہندوستان کے مشہور فلسفی ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:—

"صبح زندگی کے ہر ہر صفحہ سے زندگی ہی کی کرنیں طلوع ہو رہی ہیں اور بڑے سے لے کر چھوٹا کوئی مرحلہ نسوانی زندگی کا چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ کہیں بچی کو گود میں لئے کھلا رہے ہیں اور کہیں انگلی پکڑے اسے ٹہلا رہے ہیں۔ کہیں برسات میں جھولا جھلا رہے ہیں۔ کہیں اس کی توتلی زبان میں اس سے کہانی کہہ رہے ہیں اسی مکتب میں اسے حساب کے پہاڑے یاد کرا رہے ہیں۔ اور کبھی جانماز پر بیٹھے اسے مناجات سکھا رہے ہیں۔ کہیں انگنائی اور دالان میں جھاڑو دلا رہے ہیں۔ کہیں باورچی خانہ میں سالن بگھارنے اور حلوہ پکانے کی ترکیبیں دکھا رہے ہیں۔ ابھی بنیوں سے مول تول۔ بازار کے سودا سلف کی گفتگو ہو رہی تھی۔ ابھی سوئی پھنکنی لئے ہوئے سلائی کترائی کٹائی بخیہ کے بخیے کھولے بیٹھے ہیں۔ غرض ہر طرف زندگی ہی زندگی کی

۔۔۔ دور جدید کی غلطی ہے" (ص ۔۔۔)

ہوشیار لڑکی کے باہر نکلنے کے سلسلہ میں استانی جی کی گفتگو (ص ۔۔۔ ص ۔۔۔) نسیمہ کے لئے بر کے انتخاب کے وقت سنجیدہ کے خیالات (ص ۱۵۳ ۔ ص ۱۵۴) اور جہیز کے سلسلہ میں خود نسیمہ کی رائے (ص ۔۔۔) یہ سب ایسے ٹکڑے ہیں جو ہر طبقہ اور ہر خیال کے افراد کے لئے نتیجہ خیز کہے جا سکتے ہیں۔

مکالمے صبح زندگی میں کچھ زیادہ نہیں مگر جہاں جہاں ہیں انگوٹھی کے نگینہ کی طرح چمک رہے ہیں۔ لڑکے کی ماں نکاح کا پیام دیتی ہے۔ گفتگو ہے نسیمہ جیسی بیٹی کی۔ سنجیدہ کے انکسار پر آنسو نکل آتے ہیں:-

"کیوں زربفت میں گاڑھے کا پیوند لگاتی ہو۔ کس بل پر ہاں کر لوں۔ روپیہ پیسہ۔ ہنر سلیقہ۔ شکل صورت کچھ بھی تو نہیں"

تفصیلات کے بیان کرنے میں علامہ مغفور کو خاص ملکہ تھا صفحہ ۹۴ سے صفحہ ۱۰۱ تک ۸ صفحوں میں دکھایا ہے کہ ایک پھوہڑ بد سلیقہ لڑکی کے ہاتھوں گھر کی کیا گت بنی ہوئی ہے۔ کپڑوں کی کٹائی سلائی چھپائی کڑھائی وغیرہ کی تفصیل ہے تو کونسی چیز ہے اور ہو سکتی تھی جو رہ گئی ہے۔ کھانے پکانے کے متعلق کون سی ضروری بات ہے جو بیان نہیں کی گئی۔ خانہ داری کے سلسلہ میں جس جس چیز کو لیا ہے ہر ہر پہلو سے سب کچھ بتلا دیا ہے۔

منظر نگاری کی بھی صبح زندگی میں کئی مثالیں ہیں مثلاً ڈولی ڈھونے کی بارش (ص ۱۳۲ ص ۱۳۳ ص ۱۳۵)

صبح زندگی ہند و پاکستان کے اصلاحی ناولوں میں چوٹی کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

صبح زندگی اٹھائیسویں بار ۲۰×۳۰/۱۶ تقطیع کے ۔۔۔ ۲۴۰ صفحوں پر ۔۔۔ میں شائع ہوئی تھی۔

"صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی اُردو ادب کے انمول رتن ہیں"

ڈان گجراتی ——— ۳ فروری ۱۹۶۲ء

"صبح زندگی میں سینے پرونے کے بارے میں اس انداز سے لکھا ہے کہ صرف ماہر درزی یا اس فن سے خوب اچھی طرح واقف عورتیں ہی بیان کر سکتی ہیں۔ ایسے موقع پر اپنے فن کے ماہر ادیب بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں ۔۔۔۔ عورتوں کی ہنرمندی اور رسموں کہاوتوں وغیرہ کا اس قدر پُرمعنی مطالعہ کیا اور اس قدر کامیاب ہوئے کہ آج بھی ماہر عورتیں بھی ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کر سکتی نہیں"

گجراتی روزنامہ ملت کراچی ——— ۲ فروری ۱۹۶۲ء

۹۔ **سوکن کا جلاپا** | علامہ مغفور کے ایک دوست تھے جنہوں نے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کر لی تھی۔ پہلی بیوی غریب جاہل اور دقیانوسی خیالات کی تھی۔ اور دوسری بیوی امیر تعلیم یافتہ اور روشن خیال۔

اکتوبر ۱۹۰۸ء کی کوئی سی تاریخ تھی اور جھٹ پٹے کا وقت اُن دوست کے ساتھ اُن کی گھوڑا گاڑی میں علامہ مغفور بھاٹی خوری سے واپس آ رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے دوست کی بیٹی پہلی بیوی کی لڑکی، دس گیارہ سال کی عمر، پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے پہنے، لونڈیوں کا جوڑا، مُردوں کی سی صورت، بوتل ہاتھ میں لئے دوکان پر کھڑی مٹی کا تیل خرید رہی ہے۔ دیوان خانہ پندرہ بیس قدم آگے تھا جہاں گاڑی ٹھیرتی تھی۔ لیکن علامہ مغفور اسی وقت گاڑی رکوا نیچے اُترے۔ سیدھے اپنے گھر پہنچے اور طبیعت پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ رات کو دس گیارہ بجے تک ٹہلتے رہے دوسرے دن اس دردناک افسانہ کی تمہید لکھی جو سوکن کے جلاپے کے عنوان سے چھ سات قسطوں میں نومبر ۱۹۰۸ء

سوانح عمری [illegible]
تا ہنوز ۱۹۳۱ء سے عصمت میں شائع ہوا۔
۱۹۳۱ء میں علامہ مرحوم کے برادر نسبتی کپتان
مولوی حبیب الرحمٰن خان بہادر سی آئی ای او بی آئی اور
جج ... مولوی محمد عبدالغفار صاحب الخیری تشریف
رکھتے تھے اور وہ چار دوست اور بھی تھے۔ انہیں دوست
کا ذکر آگیا کہ انہوں نے دنیاوی اعتبار سے ترقی اور اعزاز
کے کافی مدارج طے کئے۔ اپنے کئی دوستوں کو فائدہ پہنچا کر
حق دوستی ادا کیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی گفتگو ہوئی تھی کہ
علامہ مرحوم نے ان سے ملنا جلنا بند کر دیا حالانکہ وہ علامہ
مرحوم کی تحریروں کے بڑے مداح تھے اگر علامہ مرحوم چاہتے
تو ان کی شخصیت سے بہت کچھ دنیاوی فائدہ
پہنچ سکتے ہیں۔ علامہ مرحوم نے اس گفتگو میں کوئی دلچسپی
نہ لی مگر جب سب لوگ چلے گئے اور میں نے یہی ذکر چھیڑا
تو مندرجہ بالا واقعہ سنایا اور یہ بھی فرمایا۔
"اچھا رہے جو اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اچھا
ہے۔" علامہ مغفور کو اپنے دوستوں سے بہت محبت تھی
مگر ایمان کی صدا کے مقابلہ میں وہ تعلقات کی پرواہ نہ
کرتے تھے۔

چنانچہ ان کے ایک اور دوست سر شیخ عبدالقادر
سابق مدیر مخزن و سابق چیف جسٹس ریاست بہاولپور
عصمت کے راشد الخیری نمبر میں لکھتے ہیں:۔

"مرحوم دوستوں سے میل جول میں مجسم اخلاق تھے
مگر دوستی کی وجہ سے اپنے کسی اصول یا اپنی رائے کو بدلتے
نہ تھے۔"

سوکن کا جلاپا بعض ناقدین کی رائے میں علامہ
مغفور کی تمام تصانیف میں بلحاظ درد و اثر بہت ممتاز ہے
عصمت کے راشد الخیری نمبر صفحہ ۸۸ پر مولوی عبدالحی عباسی
"یہ زندگی کو پیام مسرت قرار دیتے ہوئے سوکن کے جلاپے
کے متعلق لکھتے ہیں: یہ مختصر سبق آموز تصنیف
اس قابل ہے کہ اسے معاشرتی اصلاح کے اداروں کی طرف
سے تقسیم کرایا جائے۔"

بنات اگست ۱۹۳۶ء میں کلکتہ سے محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ
فرزند لکھتی ہیں کہ:۔

"علامہ مرحوم نے سوکن کا جلاپا بھی خوب لکھا ہے
بس وہ پر اثر زور دار تحریریں ہیں کہ آج ہندوستانی والدین
کو سوکن پر بیٹی دینے سے باز رکھنے میں ایک حد تک کامیاب
ہو چکی ہے۔"

افسانہ ان سطروں سے شروع ہوتا ہے۔

"میاں ذاکر کا دوسرا نکاح! پیشہ! روشن دل! اخلاق!
نئی دلہن کا سہاگ، آنکھ سکھ، کلیجہ ٹھنڈک، واسطہ
غرض۔ آس پاس تہہ اعتراض کرنے والے کون؟ ذمہ دار
ہیں تو میر شریف اور گنہگار ہیں تو بی گمانی سگے ماموں
مانی، اور یہ اندھیر کہ بھانجی بدنصیب پر سوکن بٹھائی
اور پھر بھی پیٹ نہ بھرا..... مگر صد آفرین محمودہ کو
میاں چھنا، بچہ چھنا، گھر گیا، بار گیا، لیکن بچوں کی شرم
باپ دادا کی لاج ایسی رکھی کہ کنبہ بھر میں نام کر گئی۔
اسی سہاگن کا دل تھا کہ جس بیکس پر ستمی تک بیٹھتا گوارا
نہیں وہ آناً فاناً بالکل برباد ہو جائے مگر کیا مجال کہ لب
سے اُف تک کی ہو!"

کتابی صورت میں سوکن کا جلاپا ۱۹۱۳ء میں دارالاشاعت
پنجاب سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا نام شہید بیداد
تھا ۱۹۲۲ء تک ۴۰ صفحے ہیں ۹ دفعہ شائع ہوا ہے۔

۷۔ گوہر مقصود | یہ دو افسانے ہیں پہلا افسانہ "لال
کی تلاش" جون اور پھر جولائی ۱۹۱۰ء

کے عصمت میں شائع ہوا تھا۔ شروع اس طرح ہوتا ہے :۔

"شگفتہ جبیں مٹ رات کے بوجھیں گھنٹوں میں ایک گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے کہ ادھر دعا مانگی اُدھر قبول ہوئی۔ کیا عجب وہ قبولیت ہی کی گھڑی ہو۔ جب فرزند جانماز سے اٹھ، انگنائی میں آ، گود پھیلا اس طرح گڑگڑائی۔ آدھی رات کا سماں سوتا سنسار جاگتا پاک پروردگار! الٰہی اگر میں نے سانس سے لگایا ہو سیر اناس اور نہیں تو جیسا جھوٹا الزام شعبانہ نے مجھ پر رکھا اس کے دیسے گھنٹوں۔ گود بیٹے اور کوک بانگ کے آگئے؟"

یہ مختصر افسانہ ایک مصیبت ماری ماں کا ہے جس کے کئی بچے ضائع ہونے کے بعد ایک لڑکا رہا تھا۔ ایک دن وہ بھی ایک شادی میں کھو گیا۔ گم شدہ بچہ کی تلاش میں بیچاری ماں شہر کی ایک ایک گلی اور چپہ چپہ کونہ کونہ چھان مارتی اور جنگلوں کی خاک اڑاتی پھرتی ہے۔ ایک دن ایک دہشتناک جنگل میں پہاڑ کی چوٹی پر وہ آٹھ آٹھ آنسو رو رہی اور گا رہی ہے۔

اس دل کی لگی نے کیا جوگن — گھر بار چھٹا تیرے کارن
نیناں ترسیں دکھلا درشن — چھتیاں لگ جا۔ آجا اسن

ایک اور شعر ہے :۔

چلتی ہے ہوا پھولوں میں بسی — کہسار میں جب دن ہوتا ہے
آتی نہیں بو تیری کہیں — دل خون کے آنسو روتا ہے

ایک دن نا امید ہو کر پہاڑ کی چوٹی سے گر کر ختم ہونا چاہتی تھی کہ ایک جوگی آ نکلا اور اسے گھسیٹتا ہوا بڑ کی جھینٹ چڑھانے لے چلا۔ اور جب اسے اپنی زندگی کی بھی کوئی امید نہ رہی تو برسوں کا بچھڑا ہوا بچہ جس کے فراق نے ماں کو حال سے بے حال کر دیا تھا اس کے کلیجے سے چمٹتا ہے اور پڑھنے والے کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب مصنف نے اس افسانہ کا پہلا حصہ اپنی والدہ مرحومہ کو سنایا تھا۔ گھر کے سب بڑے چھوٹے موجود تھے اور کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اس وقت تک افسانہ یہاں تک لکھا گیا تھا کہ شعبانہ اپنے لال کی تلاش میں رات کے دو بجے سر پہ چادر ڈال کر نکلتی ہے۔ میرے کان میں آج بھی مصنف کی اور مرحومہ کے یہ الفاظ گونج رہے ہیں خدا کرے بیچاری کا بچہ مل جائے۔ اور مصنف کا یہ جواب بھی کہ اماں کوئی عمدہ سی چیز کھلوائیں پھر ملے گا۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ دوسرے دن دادی اماں نے ہرے دھنیے کا سالن پکایا تھا جو بہت ہی مزے دار تھا۔ اور مجھے یہ بھی خیال ہے کہ دادی اماں نے دوسرے یا تیسرے دن اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ اچھے میاں تم یہ لکھنا کہ بچہ زیور پہنے ہوئے تھا اس لئے فقیر اسے لے کر چلا گیا اور جنگل میں چھوڑ دیا۔

اگست ۳۲ء میں حضرت مصور غم میسور تشریف لے گئے تھے۔ میں میسور ریلوے کے ایجنٹ خان بہادر عبدالعزیز خاں مرحوم سے ملنے گیا جس وقت انہوں نے سنا کہ علامہ راشد الخیری میسور تشریف لائے ہیں اور کسی دوسری جگہ ٹھیرے ہوئے ہیں تو سب کام کاج چھوڑ وہ اس وقت کھڑے ہو گئے اور سیدھے علامہ مغفور کی خدمت میں پہنچ کر دست بستہ عرض کیا۔

"میں نے آپ کا نام مدرسے سے پہلے ماں کی گود میں سنا تھا آپ کی کتابیں پڑھ کر ہم انسان بنے ہیں۔ آپ میری موجودگی میں دوسری جگہ قیام نہیں فرما سکتے۔ آپ کا ایک افسانہ "لال کی تلاش" پڑھ کر میں کتنی ہی دفعہ رویا ہوں اور انہوں نے اس افسانہ کی نظم "اس دل کی لگی نے کیا جوگن" لفظ بلفظ سنا دی۔

گوہر مقصود کا دوسرا افسانہ "خیالستان کی پری" ۱۹۱۲ء کے عصمت میں چھپا تھا۔ اس افسانے میں مصنف نے خیالستان کی پری کو کسی عورت میں سمویا ہے اور تصور یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں ان کی حقیقی مسرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور تصور معاشرت ہونے کی شرط لگائی جاتی ہے کہ کوئی بہتر قصہ پیش کرے۔ پہلا قصہ اس شخص کا ہے جس کے دل میں قوم کی بھی محبت تھی جب اس قوم میں ایک بوڑھا شخص وہ عورتوں کو پردے میں رکھنے کے خلاف ہے، منسوب کیا جاتا ہے۔ دوسرا قصہ ایک مظلوم بیوی کا ہے جسے شوہر اپنی دولت دے دی جاتی ہے۔ تیسرا قصہ ایک ضعیف ماں کا ہے جس نے اکلوتے لڑکے کو جو بے گناہ تھا دشمنوں کی شرارت سے جلا وطن ہوتا پڑا اور ۲۰ سال بعد جب وہ واپس آیا تو ماں میں صرف سانس کی حرکت باقی تھی اس کے بعد چوتھا قصہ شرم و حیا کی ایک پتلی کا ہے۔ اس کے بعد کے قصہ میں بتایا ہے کہ بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹی کی کیسی مٹی پلید ہے اور بیٹیوں کی پیدائش پر افسوس۔ آخری قصہ دو بیاہی بیوی کا ہے جو انقلاب زمانہ کی بدترین تصویر ہے۔ یہ سب قصے دلچسپ ہی نہیں سبق آموز اور نصیحت خیز ہیں۔

گوہر مقصود پہلی دفعہ بصورت کتاب دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور علامہ مغفور کے سامنے اس کے ۲ اڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں پھر اس کے حقوق اشاعت واپس لئے۔ $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ کے ۸۴ صفحے ہیں۔

۸۔ لڑکیوں کی انشا ۱۹۱۰ء میں کلاں محل والے مکان میں شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر ایٹ لا اڈیٹر مخزن کی تحریک پر لکھی گئی تھی۔ زنانہ خط و کتابت کی اس سے قبل اُردو میں دو ایک کتابیں اور شائع ہو چکی تھیں لیکن لڑکیوں کی انشا بقول شیخ صاحب موصوف:۔

"مخصوص زبان اور دلچسپی کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کوئی خط بے کار نہیں ہے بلکہ اس کا مطالعہ خط و کتابت کے قواعد کے ساتھ ان کو یہ بتلانے کا کہ کس طرح زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیئے اور سسرال میں جا کر کیا کرنا ہے"

عصمت فروری ۱۹۳۳ء

یہ خطوط مختلف رشتہ داروں اور عزیزوں کے نام ہیں اور برجستگی بے تکلفی بے ساختگی کی جان ہیں دلّی کی ٹکسالی زبان۔ قلعہ معلّٰی کے بیگماتی محاورے اور عورتوں کی بول چال سطر سطر میں ہے۔

"خط نہیں حیات انسانی کے وہ راز ہیں جن کو پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ الفاظ کو اُٹھا کر آنکھوں پر رکھ لیجئے۔ ایک دریائے معلومات ہے کہ بہہ رہا ہے ایک سطر بے نظیر ہے کہ درس دے رہا ہے"

ملا محمد واحدی دہلوی ———— خطیب ۱۹۱۰ء

"لڑکیوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔ اس سے ایک طرف تو معلومات میں اضافہ ہوگا دوسری طرف شائستہ خط لکھنے کے اہم راز بھی معلوم ہو جائیں گے اس کتاب میں علامہ راشد الخیری نے القاب و آداب کا جدید ترین معیار پیش کیا ہے۔ اور خطوط کے بہانے بعض ایسے کام کی باتیں درج کی گئی ہیں جو بہت کم مذہبی کتابوں میں نظر سے گزرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں خطوط نمبر ۔۹۔۴۔۲۔۳ خاص کر قابل ذکر ہیں"

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ——۔ (عصمت فروری ۱۹۳۳ء)

لڑکیوں کی انشا کے خطوط کس قسم کے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل ٹکڑے سے ہو سکتا ہے جو بارہویں خط میں سے ہے۔ (بچی کا خط بھتیجی کو):۔

"نور جہاں بیگم! کہو گی تو سہی کہ چاہے سر سے کنواں

... میاں کے بھائی نہیں ہی نہیں۔ مگر بیٹی کے کا
... جس کا جی چاہے ... آنکھوں کا کیا بگڑتا ہے۔
تمہارے منہ پر آ کے تمہاری سی کہی۔ دوسری جگہ پہنچ
اُن کی سی۔ جہاں دیکھا توا پرات وہیں گزاری ساری
رات۔ انہیں تو اپنے مطلب سے مطلب ہے۔ بیٹی مجھے
تمہارے پھوہڑ ڈھنگ، ایک آنکھ نہ بھائے۔ آدمی جتنی
چادر دیکھے اتنے ہی پاؤں پسارے۔ مجھے تمہارے یہ
سلیقے پسند نہیں۔ سو روپیہ کی آمدنی ڈھائی سو
کا خرچ۔ آخر یہ قرضہ کہاں سے اُترے گا۔ ایسی ناسمجھ
تو نہیں ہو۔ خرچ کم ہونے سے رہے۔ آمدنی چھپّر
پھاڑ کر ہوگی نہیں۔ چند روز میں ہاتھ گلا اور میرا بیٹا دبے
میاں کی پگڑی۔ اس کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا
میاں اس وقت نہیں بولتا تو کبھی تو آنکھ کھلے ہی گی
آخر مرے ہے رنگ لائے ہو رہ رہے"

لڑکیوں کی انشا پہلی تصنیف تھی جسے مصنف نے
خود دفتر عصمت سے شائع کیا تھا۔ [illegible]ء میں لاہور سے
مولوی سید ممتاز علی صاحب دلّی تشریف لائے تو انہوں
نے اس کے حقوق اور جس قدر کتابیں باقی تھیں ان سب کا
اسٹاک خرید لیا تھا۔ یہ کتاب لاہور سے ۷، ۷ دفعہ شائع
ہوئی۔ [illegible] میں بیٹے اس کے حقوق واپس لے لئے
۲۲ [illegible] تقطیع ہے ۹۰ صفحات ہیں۔

۹۔ شام زندگی

فروری ۱۹۱۷ء میں جب محترمہ بیگم راشد الخیری مرحوم گنگا پور ستی اپنی بڑی بیٹی کے
پاس گئی ہوئی تھیں اور دلّی میں حضرت والد مغفور میری
وجہ سے ٹھیرے ہوئے تھے کیونکہ اُس زمانے میں میں آٹھویں
جماعت کا امتحان دے رہا تھا۔ چند ماہ کے لئے ہم بیبا محل
کے جامن والے گھر میں اُٹھ آئے تھے۔ انہیں دنوں میں علامہ مغفور

(جیسا کہ صفحہ [illegible] پر بیان کیا گیا ہے) [illegible] عصمت کے لئے
مضامین لکھواتے۔ اور شیخ واحدی صاحب کے ہاں
تشریف لے جاتے اور وہیں شام زندگی لکھی (جیسا کہ صفحہ [illegible]
پر ذکر آچکا ہے) شام زندگی واحدی صاحب کی بڑی
بیٹی خاتون کے جہیز کے لئے لکھی گئی تھی۔ کس طرح لکھی گئی اور
کیوں لکھی گئی۔ یہ داستان واحدی صاحب کی زبانی
[illegible]ء کے واقعات میں اور صفحہ ۲۹۳ پر آ چکی ہے۔ اس
سلسلہ میں خواجہ فضل احمد خاں صاحب شیدا دہلوی
لکھتے ہیں:۔

"انہی دنوں میں جبکہ چوکڑی کا جماؤ واحدی صاحب کے
ہاں ہوتا تھا واحدی صاحب کو خیال آیا کہ کوئی کام کی بات
بھی کریں "صبح زندگی" دو دفعہ شائع ہو چکی تھی۔ اب شام زندگی
لکھنے پر مولانا کو گھیر گھونٹ کر آمادہ کر لیا۔ گھیر گھونٹ کا
لفظ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ مولانا روپے کے میت نہ
تھے۔ جلب منافع کی طرف ان کی توجہ بہت کم رہتی۔ وہ صرف
ضرورتوں کے لائق روپیہ کمانے پر کفایت کرتے۔ حصول مال
کی تگ و دو سے وہ قطعی بیزار تھے۔ نام و نمود وجاہ
کی طلب کا ان کو خیال ہی نہ آتا تھا۔ اس لئے جب ان کو
کمائی کا کوئی راستہ بتایا جاتا تو بہلا جاتے۔ کمانے کا خیال
یا تو ضرورتوں کے مجبور کرنے پر آتا یا پھر کوئی شخص ایسا
ہو جس کا انہیں پاس و لحاظ ہو۔ شام زندگی بظاہر ان کے
مفاد کا ذریعہ تھی۔ لیکن وہ کب ہر وقت بیٹھے فائدے کو
تکا کرتے۔ اب ایک چیز واحدی صاحب کا تعلق تھا جو
واقعی ان کو عزیز تھا۔ وہ تعلق ہی اُن کو طبیعت کے خلاف
کام کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا دوستوں میں
بات طے پائی کہ مولانا روز ایک گھنٹہ واحدی صاحب کے
ہاں بیٹھ کر شام زندگی لکھا کریں سب جانتے تھے کہ اگر اس

قمر کی پرورش نہ کی گئی تو شام زندگی کیسے ہو گی۔ کل مولانا
نے [illegible] کے بعد اس مشورہ کو منظور کر لیا۔ دن لکھنے
[illegible] واحدی صاحب کے ہاں بیٹھتے تھے ان کے لئے واحدی
[illegible] اس مطلب کے لئے مختصر سا کمرہ اپنے مکان
[illegible] مخصوص کر دیا تھا۔ وہ آتے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اور لکھنے
بیٹھ گئے۔ ہم ذرا سا اس کمرے کی باہر سے کنڈی لگا دی جاتی
[illegible] وہ [illegible] کام سے فارغ ہو کر باہر آنا چاہتے اور
کنڈی نہ پاتے تو بہت صلواتیں سناتے۔ کنڈی کھلتی
پھر آتے تو دوست مذاق اڑاتے۔ اس پر خود بھی بہت ہنستے
[illegible] ان سے کہا جاتا کہ شام کو آئیے گا۔ کہتے میں
[illegible] آؤں گا۔ لیکن کل سے شام زندگی لکھنے نہ آؤں گا
[illegible] کچھ نہیں۔ آپ کے اچھوں کو آنا پڑے گا
[illegible] رہنا بھول جاؤ گے۔ فرماتے۔
" اب میں کسی سے کمزور تھوڑی ہوں۔ ایک ایک
سے بھگت لوں گا۔ سب ایک ایک ہاتھ کے ہو"
[illegible] کہتے ہوئے اور ہنستے ہوئے چلے جاتے۔ شام
کو پھر موجود۔ القصہ شام زندگی اس طرح کوئی ایک مہینے
میں تمام ہوئی۔ اور خاطر خواہ ہوئی۔ شام زندگی کے خاتمہ
پر واحدی صاحب نے ایک دعوت سب دوستوں کو
دو کھلے کی سیرگاہ میں دی۔" (عصمت فروری ۱۹۳۶ء)

شام زندگی کا پہلا ایڈیشن ایک مہینے کے اندر
ختم ہو گیا تھا اور صرف ۹ مہینے میں ہاتھوں ہاتھ تین ایڈیشن
نکل گئے تھے۔ اس سے پہلے اردو کی کسی کتاب کو یہ مقبولیت
حاصل نہ ہوئی تھی۔ واحدی صاحب نے یہ کتاب بعض اخبارات
کو ریویو کے لئے بھیجی تھی۔ علامہ مغفور کے بعد بھی اہل قلم نے
اپنے مضامین میں شام زندگی کا ذکر کیا ہے۔

• شام زندگی، صبح زندگی سے بھی بڑھ گئی۔ مولانا
راشد الخیری نے اس خوبی اور لیاقت سے اس کتاب کو
لکھا کہ عورتوں کو لڑکیوں کو مریضوں کو لڑکوں کو سب کو یکساں
مفید ہو گی...... اب کوئی شخص اس مفید اور سراپا پُرقیمت
کتاب کو نہ پڑھے اور اپنی مستورات اور بچوں کو اس کی دید سے
محروم رکھے تو اس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں۔
شام زندگی باعتبار علم ادب اردو زبان کا
بہترین تحفہ ہے اور باعتبار ضروریات خانہ داری کے کوئی
لازمی ضرورت مصنف کے قلم سے باقی نہیں رہی جس کو
قصہ کے اندر نہ شامل کیا ہو اور باعتبار مضمون ہر شخص تسلیم
کرے گا کہ مولانا راشد الخیری کی تحریر مستورات کے معاملہ
میں ہمیشہ دل کے پار ہو جاتی ہے۔"

خواجہ حسن نظامی مرحوم ـــــ (اخبار صداقت کلکتہ اپریل [illegible])

• شام زندگی مولانا راشد الخیری کی تازہ تصنیف
ہے۔ گویا اس ورق یا تصویر کا دوسرا رخ ہے جو آپ اس سے
پہلے صبح زندگی میں دکھا چکے ہیں۔ عورت کو بچپن سے
لے کر بڑھاپے تک میکے اور سسرال میں بیٹی بہن بیوی ماں
ہونے کی حیثیت سے جتنی عمرانی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔
سب کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویریں ناظرین کے سامنے
آجاتی ہیں۔ زبان ایسی صاف اور شستہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے
ابھی کوثر میں غسل کرایا ہے۔ کسی دوسری جگہ ہم نے یتیموں
کی آہ کے عنوان سے شام زندگی کا ایک پُردرد مقام
نقل کیا ہے جس کے بعض حصے دل کو تڑپا دینے والے ہیں

مولانا ظفر علی خان مرحوم ـــــ ستارۂ صبح کرم آباد (جلد ۱)

" مولانا کی تحریر دیکھ کر سنگدل سے سنگدل شخص
بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ اردو زبان میں
ٹریجڈی کے بادشاہ ہیں..... شام زندگی ادبی حیثیت سے
بے مثل کتاب ہونے کے علاوہ لڑکیوں اور عورتوں کے لئے

دلچسپ معلومات اور نصائح کا مجموعہ ہے۔ کتاب کی تعریف کرنے کی بجائے ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کا ایک حصہ تمدن میں نقل کردیں"

تمدن لکھنو

"ملک کے تمام مصنفوں میں مولانا راشد الخیری کا طرز بیان جداگانہ اور حد درجہ دلآویز ہے۔ سادہ مؤثر اور دلنشیں پیرائے میں دہلی کا خاص روزمرہ اور بیگمات کی پُرلطف شیریں زبان لکھنا اور معاشرت کا صحیح فوٹو اتارنا ان کا طغرائے امتیاز ہے۔ ۔ ۔ اگر مراۃ العروس اور بنات النعش کا جواب نہیں تو منازل السائرہ اور صبح زندگی بھی بے نظیر چیزیں ہیں۔ صبح زندگی کے بعد اس کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اگرچہ قابل مصنف نے موقعہ بموقعہ مذہبی احساسات پیدا کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ لیکن ہم بافسوس یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس طرف کم توجہ کی گئی ہے بہرحال یہ کتاب بہت مفید اور سبق آموز ہے"

(اخبار تہذیب نسواں۔ لاہور)

"مولانا راشد الخیری دہلوی کے طرز کلام میں یہ ایک خاص بات ہے کہ لفظ لفظ دل میں کھبتا چلا جاتا ہے اور اس قدر مؤثر ہوتا ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ہر عورت کو شادی سے پہلے اور شادی کے بعد شام زندگی اپنے ساتھ ضرور رکھنی چاہیئے۔ اس میں وہ تمام واقعات وحالات مؤثر پیرایہ میں مع نتیجہ جمع کردئے گئے ہیں۔ جو ایک بیاہی لڑکی کو پیش آتے ہیں۔ عبارت نہایت سادہ اور سلیس اور دلی کی صاف ستھری زبان اور محاورے میں ہے"

آگرہ اخبار۔ آگرہ

"شام زندگی درد و غم کی داستان ہے مگر صنف نازک کی تربیت و تعلیم میں ایک بڑی معلمہ کا کام دیتی ہے جن عورتوں کو نالائق یا گمراہ شوہروں سے سابقہ پڑ جائے اگر وہ اس کتاب کو پڑھیں اور اس پر عمل کریں تو ان کے خاوند سنبھل جائیں گے اور ان کا گھر بربادی سے بچ جائیگا ۔ ۔ ۔ ۔ قصہ دلچسپ اور بیان پُرلطف ہے۔ بیان میں روانی اور داستان میں درد و غم کی طغیانی ایسی ہے کہ ہم کو دیر تک اس قصہ نے اشکبار رکھا"

اخبار مشرق۔ گورکھپور

"شام زندگی میں دکھایا گیا ہے کہ لڑکیاں اسلامی طریقے کے بموجب تعلیم و تربیت پا کر کس طرح اپنی عمر راحت و آرام کے ساتھ گذار سکتی اور اپنے خاندان کے لئے رحمت ثابت ہوسکتی ہیں" (انسٹیٹیوٹ گزٹ علی گڑھ)

"یہ نئی کتاب مولانا نے دہلی کی ٹکسالی زبان میں نہایت لاجواب لکھی ہے۔ ایک لڑکی کو شادی کے بعد سے آخر عمر تک جن جن حالتوں کا سامنا پڑتا ہے وہ سب اس میں درج ہیں" (رسالہ پردہ نشین آگرہ)

"شام زندگی کا کیا پوچھنا تھا۔ اُدھر ماجدی صاحب جیسا شام زندگی کا روشناس کرنے والا۔ اِدھر علامہ راشد الخیری جیسے لکھنے والے غالباً اکثر نقادوں کی نگاہ میں شام زندگی ان کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کے بعد تو مرحوم کے قلم اور دماغ کی تگ و تاز کا ٹھکانہ نہ رہا۔ قدرتی بات تھی شام زندگی کی جو دُھوم دھام ہوئی اور جو مقبولیت اُسے حاصل ہوئی اس کا یہی تقاضہ تھا۔

مصنف کی جولانی اس کی تصنیف کی مقبولیت پر منحصر ہوتی ہے۔ مقبولیت کا اثر سرور صہبا سے کم نہیں ہوتا۔ ۱۹۱۰ء تک تو مرحوم نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا اور اب وہ چھوٹے چھوٹے قصے کہانیوں کا دور ختم ہوگیا تھا۔ اس زمانہ میں دوسرے تیسرے ضرور ملاقات ہوجاتی تھی"

مرحوم آصف علی دہلوی بیرسٹرایٹ لاء ـــــ راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

[illegible] علامہ نے گذشتہ صدی کے [illegible] نظر آتے ہیں
[illegible] جاہلانہ عقیدوں اور اوہام باطلہ کی گت بنا
[illegible] اور جو شدت قوم کی اس طرح کی ہے وہ
[illegible] مصلح عظیم کا خطاب دلانے کو کافی ہے صبح زندگی
[illegible] جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ تعلیم ہی نہیں بلکہ
[illegible] سے بھی بہت کارآمد ہیں۔ مثلاً شام زندگی میں
[illegible] وجہ بتا کر اس خیال کی تردید کی ہے کہ زمین گانے
[illegible] ہے ہٹ پایا" کو سمجھانے میں جس عمیق اور
[illegible] کا مظاہرہ علامہ نے کیا ہے وہ بڑے ڈاکٹروں
[illegible] حاصل کر سکتا ہے۔ شام زندگی میں لکھتے ہیں:۔

"ایک انگریز کی لڑکی اس مرض میں گرفتار ہوئی اور [illegible] میں جب بے ہوش تھی اس نے قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ بھلا خیال کرو ولایت میں ایک انگریز کی [illegible] کھلا قرآن شریف پڑھنا کیسے تعجب کی بات تھی [illegible] توجن کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا [illegible] ڈاکٹروں نے جب خوب تحقیقات کی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ لڑکی کا باپ مصر میں فوج کا کرنل تھا اس وقت اس بچی کی عمر چار برس تھی اور صبح ہی خانساماں کے ہاں کھیلنے چلی جایا کرتی تھی۔ وہ اس وقت قرآن شریف پڑھتا تھا اور یہ گھنٹے دو گھنٹے وہیں کھیلتی رہا کرتی تھی۔ وہی الفاظ اس کے دماغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جو اب بے ہوشی کی حالت میں حافظے نے دماغ سے نکل کر زبان سے ادا کروا دیئے"

ملتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— عصمت راشد الخیری نمبر [illegible]

"انہوں نے اپنی تصانیف صبح زندگی، شام زندگی اور شب زندگی میں متعدد نسوانی کردار کی مکمل مرقع کشی کی ہے اور ان کے ذریعہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شوہر اور بیوی کے تعلقات اچھے ہیں تو گھر جنت ہے۔ اور اگر تعلقات برے ہیں تو گھر جہنم ہے۔ عورت کو نہ صرف اپنی زندگی کی تعمیر و تخریب کا اختیار ہے بلکہ اس کے قابو میں اس کے شوہر اور اس کے بچوں کی زندگی بھی ہے۔ یعنی اگر عورت چاہے تو مرد کی زندگی قابل رشک بن سکتی ہے۔ اور اس کی اولاد مستقبل کے لئے نیک نہاد اور کارآمد بن سکتی ہے۔ لیکن اگر عورت ہی میں برائیاں ہیں تو پھر گھر کو تباہی کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں"

پروفیسر علی عباس حسینی لکھنؤ ——— عصمت راشد الخیری

"ایک نقاد کا خیال ہے کہ ہر تصنیف مصنف کی زندگی کا پرتو ہے۔ مولانا راشد الخیری کے ساتھ اس مقولہ کا اطلاق جس نذر صداقت کے ساتھ ہوتا ہے اس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔ ان کی تمام زندگی معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جذبہ کی بڑھی ہوئی شکل تھی یعنی اصلاح نسواں، لیکن یہ اصلاح مغرب پرستی کی دوسری شکل نہ تھی بلکہ اس کی بنیاد انہوں نے یکسر اسلام اور مشرقی روایات پر قائم کی تھی۔ وہ بیدار مغز بیویاں اور مائیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عورت کو صرف مدبرہ اور صرف شاعرہ بننے کی تلقین کبھی نہیں کی۔ قوم کی ترقی کا راز عورت کی متمدن اور ترقی یافتہ ہونے میں مضمر ہے۔ مولانا اس نکتہ سے باخبر تھے اور انہوں نے ان خیالات کی ترویج ہر ممکن طریقہ سے کی۔ عصمت، بنات، جوہر نسواں، تربیت گاہ بنات ان کی تحریریں اور تقریریں سب میں اسی جذبہ حمایت نسواں کی کارفرمائی تھی . . . . . مولانا مرحوم نے نسیمہ کو ایک آئیڈیل عورت اور ایک قابل تقلید نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنے حسن سلیقہ کے باعث ہر جگہ فتح یاب ہوتی ہے۔ مولانا اس کامیابی کا یقین بہت سی مثالیں دے کر پیش کرتے ہیں۔ اور یہ مثالیں ایسی ہیں جو آئے دن ہم گھروں

بھیجتے رہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ شام زندگی میں مولانا نے گن گن کر وہ تمام باتیں بیان کردی ہیں جن سے ایک لڑکی شادی ہوتے کے بعد دوچار ہوسکتی ہے ۔ ہر ایک کا معقول حل بھی پیش کردیا ہے ۔ نسیمہ مصنف کا آئیڈیل کردار ہے اور وہ ہر ایک کو ایسا ہی بننے کے لئے دعوت دیتے ہیں ۔ خواب اور چھوٹے چھوٹے قصّوں کے ذریعہ مطالب کو حل کیا ہے ۔ بچپن کا نقش کبھی نہیں مٹا کرتا ۔ اسی لئے نسیمہ کی ابتدائی مذہبی تعلیم ہر مصیبت میں اس کے کام آتی ہے اس قصے میں اسراف بیجا اور فضول مراسم کے خلاف بھی اچھی خاصی جدوجہد ہے ۔ اس طرح ہمارے گھروں کی حالت آئینہ کی طرح پیش کردی گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کردار نگاری خاص ہے بلکہ بعض جگہ تو تھوڑی سی جگہ میں بہت مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے ۔ نسیمہ کی ساس قسیم وغیرہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور نسیمہ کی تو ہر ہر معاملے میں ہماری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوتی ہیں“

س ۔ ف (بمبئی اوّل) ـــــــ بنات اگست و ستمبر ۱۹۳۶ء

• عصمت کے علاوہ مولانا راشد الخیری کی تصانیف بھی عورتوں و لڑکیوں کے لئے درسِ عمل ہیں شادی کے بعد نئے ماحول اور نئی زندگی میں قدم قدم پر ہر لڑکی کو مشکلات اور صبر آزما واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اور اس وقت ایک ایسے راہبر کی ضرورت ہوتی ہے جو صحیح راستے پر ڈال سکے ۔ اس موقع پر میں نے علامہ راشد الخیری کی تصانیف کو اپنا رہبر بنایا اور خطوط کے ذریعہ بھی اکثر ان سے مشورے لے لیا کرتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چشم بینا کے لئے ان میں بہت کچھ ہے اور یہی وہ چیز ہے جو بگڑتی ہوئی زندگی اور اجڑتے ہوئے گھر کو بناتی اور سنوارتی ہے سب کو چھوڑ کر صرف شام زندگی ہی کو اپنا رہبر بنا لیجئے تو سمجھئے کہ آپ کا بیڑا پار ہے کیا چیز ہے جو شام زندگی میں نہیں ہے ساس نند اور دیورانی جٹھانی کے تعلقات کا حل ۔ ایام عروسی سے لے کر ضعیفی تک زن و شو کے تعلقات انتظام خانہ داری اور بچوں کا رکھ رکھاؤ عزیزوں اور پڑوسیوں سے سلوک ازدواجی تعلقات کا وہ مرحلہ جہاں میاں بیوی کے تعلقات بال سے زیادہ باریک ہوجاتے ہیں ۔ ان سب کا علاج اگر ہے تو ” شام زندگی “ میں “

مسز الطاف حسین ـــــــ عصمت فروری ۱۹۵۳ء

• شام زندگی میں پلاٹ کی ترتیب نہایت دلچسپ باقاعدہ اور منظم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے کو اصل کا دھوکا ہوتا ہے ۔ کیونکہ واقعات واضح اور فطری ہیں ۔ اور اشخاص قصہ کے افعال اور اقوال بھی اسی ماحول کے مطابق ہیں جن میں وہ نشو و نما پاتے ہیں اور واضح طور پر نظر آتے ہیں ۔

ان کے اشخاص قصہ فطرتِ انسانی کے خاص مرقعے ہیں ۔ اور یہ ان کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے ۔ اپنے ناول میں جا بجا طرزِ معاشرت کا نقشہ صداقت کے ساتھ کھینچا ہے جن میں ہر قسم کے کیرکٹر نشو و نما پاتے ہیں ۔ نسیمہ اور قسیم کے خیالات میں بُعد المشرقین تھا ۔ نسیمہ نماز کی ایسی پابند کہ موقع ملے تو تہجد اور اشراق تک نہ چھوڑے قسیم اس نام سے ایسا بیزار کہ بس چلے تو عید اور بقر عید کی بھی صاف اڑا جائے ۔ اور نسیمہ ناتجربہ کار ، کم عمر ، بھولی سیدھی ہے ۔ اور پہلو میں ایسا دل جس میں ہمدردی کا دریا ہر وقت لہریں لے رہا ہے ۔ قسیم خود بھی پڑھا لکھا آدمی ہے ۔ لیکن موجودہ زمانہ کی غلط تعلیم نے اس پر کافی اثر ڈالا ہے ۔ نسیمہ پڑھی لکھی اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے ۔ اس لئے اپنے اپنے فرائض سے بھی کما حقہٗ واقف تھی اور جانتی تھی کہ بیبیوں کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ شوہر کو

تھیں۔ تیرا باپ ابھی تک منہ کھولے مجھے نگلنے کو موجود تھی۔ تم سب عزیزوں نے مجھے نہلا دھلا کر رخصت کیا اور میری تکمیل عصمت کر دی۔ بہنوں نے سپرد زمین کیا اور اپنا منہ موڑا۔ بڑا نازک وقت تھا۔ میں تھی اور عمر گزشتہ کے ہر فعل کی جوابدہی۔ ہر عمل کی باز پرس۔ ہر کام کی ذمہ داری۔ ہر قول کی جانچ پڑتال۔ تدبیریں دکھاوے کی تھیں۔ اکارت گئیں۔ روزے زبردستی کے تھے بے کار نکلے۔ ہاں اس آڑے وقت میں جب کوئی یار و مددگار نہ تھا کچھ یتیم لڑکے کچھ معصوم بچے تھوڑی سی رانڈیں چند مصیبت زدہ بعض محتاج جن کو دنیا آج حقارت سے دیکھتی اور نفرت سے رکھتی ہے۔ میری مدد کو دوڑے۔ یہ پاک روحیں عالم بالا میں راج کر رہی تھیں۔ ملک عدم میں ان کا سکہ چل رہا تھا۔ اور اس جہان کی بادشاہی ان کے قبضہ میں تھی۔ انھوں نے میرے سلوک کا معاوضہ اور میرے رحم کا بدلہ دیا۔ دوزخ ان کے اشارے سے خاک اور شعلے ان کے اشارے سے ٹھنڈے ہوئے۔ قبر میرے واسطے گلزار بنی اور میری گنہگار روح جنت الفردوس میں جا پہنچی۔ آج مجھے حکم ہوا تھا کہ میں اس نابکار دنیا کی کیفیت دیکھوں اور اپنے پیارے ساجد کی روح کے استقبال کو آؤں۔ میں نے جو کیفیت دیکھی بیان نہیں کر سکتی۔ آج تیرے بچے کی شادی ہے اور تو بیگم بنی بیٹھی ہے۔ نوکر تیری ٹہل پر حاضر۔ مامائیں تیرے اشارے پر موجود اور شوہر تیرے ارشاد پر تیار ہے۔ لیکن بے وقوف بیگم خدا کی ایک مخلوق، ایک بھولا بھالا بچہ۔ بن ماں کا لال بے وارث معصوم اور تجھ جیسی با اختیار عورت کا مظلوم۔ تیرے جیتے جی، باپ کے ہاتھوں جنگل بیابان میں دم توڑ چکا۔ کیوں بیگم حقیقی باپ اور سگی خالہ پرورش کرے اور ساجد آدھی رات کے وقت سنسان جنگل میں اس قیامت خیز بارش میں اکیلا چھوڑ کر الوداع کہے۔ تیرا بچہ اکیلا دالان سے باہر نکلے اور میرا بچہ تیرے ہاتھوں زندگی کی آخری رات اس طرح بسر کرے۔ تیرے دولہا کے واسطے سیکڑوں آدمی موجود ہوں اور ساجد کے مردہ پر کوئی دو آنسو گرانے والا بھی نہ ہو"

اقتباس یقیناً طویل ہو گیا۔ لیکن دل ہے کہ برابر بھرا چلا آرہا ہے۔ اور کون دل والا ہے جو اکتا کر ایسی طوالت کو ختم کرنا چاہے گا اللہ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں اس انشا پرداز کے قلم پر جس نے یوں گدگدا گدگدا کر رلایا اور رلا رلا کر گدگدایا۔ کتنے بگڑے ہوئے گھرانے انہیں تحریروں سے سدھرے ہوں گے۔ اور ظلمت کدوں میں انسانیت اور خدا ترسی کی شعاعیں انہیں روزنوں سے پہنچی ہوں گی اور افسانہ نویس کے اجر بے حساب اور مزد بے اندازہ کا اندازہ کون کر سکتا ہے"۔

مولانا عبدالماجد دریابادی ——— عصمت فروری ۳۹ء

"علامہ راشد الخیری مرحوم کی ساری کتابیں ہماری زندگی بنانے والی ہیں۔ مگر شام زندگی کے مطالعہ نے تو میری کایا پلٹ دی . . . . وہی لڑکی شام زندگی پڑھ کر دوسری نسیمہ بن گئی۔ ماموں صاحبان جب کبھی تشریف لاتے میری ہر بات سے خوش ہوتے اور آپس میں یہ باتیں ہوتیں کہ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ ایسی بدل جائے گی انہیں یہ پتہ نہ تھا یہ "شام زندگی" کا اعجاز ہے"

مسز الطاف حسین ——— عصمت اپریل ۴۶ء

شام زندگی مصنف کے سامنے سترہ دفعہ شائع ہوئی تھی۔ اب تک ستائیس بار چھپ چکی ہے ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۶۰ صفحے ہیں۔

الزہرا | بنت رسول، خاتون جنت حضرت بی بی فاطمۃ الزہرا کے سوانح حیات جیسا کہ عصمت

معلوم ہوتا ہے [illegible] کے عصمت سے سیدۃ النساء کے عنوان سے ڈیڑھ سال تک حضرت علامہ مغفور لکھتے رہے بعض عصمت و تمدن کی مصروفیات کے سبب نامکمل رہے تمام ہونے کے بعد اپریل [illegible] میں یہ کتاب ختم کر دی دوسرا ایڈیشن بھی اسی سال شائع ہوا۔ کتاب با وضو لکھی گئی تھی۔ شیعہ اور سنی دونوں طبقوں میں مقبول ہوئی۔ الزہرا کی اشاعت کے بعد خاتون جنت کے حالات میں کئی کتابیں اردو میں شائع ہوئیں ان میں بعض بہت ضخیم ہیں اور یہ ضخامت غیر ضروری اور غیر متعلق روایات اور نظموں وغیرہ سے بڑھائی گئی ہے۔ لیکن باوجود مختصر صرف ڈیڑھ سو صفحوں کی کتاب ہونے کے درد و اثر اور لطف بیان کے اعتبار سے الزہرا کی ادبی شان کچھ اور ہی ہے۔ علامہ مغفور کی حیات میں واحدی صاحب نے اس کے آٹھ ایڈیشن شائع کئے تھے اور اس کا اشتہار یہ لکھا تھا۔

"لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل جو کتابیں اس وقت موجود ہیں ان میں یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ بنت الرسول سیدۃ النساء کے کارناموں سے زنانہ لٹریچر قطعاً محروم ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ واقعات اس بلبل خوش الحان کے نغموں میں ادا ہوں جس کا قلم تمام ہندوستان کو مسخر کر چکا ہے یعنی علامہ راشد الخیری مدظلہٗ بحمد اللہ کہ مولانا کے عزم نے اس ضرورت کو اس حیرت خیز طریقے سے پورا کیا کہ دنیائے نسواں دنگ رہ گئی۔

مولانا کا قلم اور بنت رسول کی داستان نہیں کہا جاسکتا کہ کتاب کس پایہ کی ہے۔ تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ کے ساتھ الزہرا بتلائے گی کہ میاں بیوی کس طرح رہتے ہیں۔ اپنے بچوں کو کس طرح پالتے ہیں۔۔۔ الزہرا افسانہ نہیں بنت رسول کے حالات و سوانح ہیں اور یہ واقعات ایسے درد انگیز ہیں کہ پڑھتے پڑھتے ہچکی بندھ جاتی ہے۔ خاتمہ پر ایک مفصل بحث شہادت اہلبیت پر ہے۔ اور میدان کربلا کے واقعات جس طرح لکھے گئے ہیں اس کی بابت صرف اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ محرم کا بیان اور مولانا کی زبان" ——— خطیب اپریل [illegible]

"علامہ کی تصانیف ادبی لحاظ سے کوئی سی ہوں یا لٹریچر بھی ہماری عورتوں کی کامیاب عملی زندگی کے لئے مشعل ہدایت کا کام کرتی ہیں۔ اس صنف کی کتابوں میں مولانا کی تصنیف الزہرا ایک بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتی ہے"

میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"الزہرا۔ آمنہ کا لال آپ کی مذہبی لٹریچر میں بیش بہا تصانیف ہیں۔ ان کے سحر آفریں الفاظ سخن کی سادہ عام فہم زبان نے بلاشبہ ان کو مفید ترین اور دلچسپ سے دلچسپ ترین بنا دیں زبان خالص دہلوی صاف شفاف و پاکیزہ۔ الفاظ درد و اثر میں ڈوبے ہوئے ایسے کہ تحریر میں سحر بھر دیا ہے"

فہمیدہ بنت شیخ عبدالاحد ——— بنات راشد الخیری نمبر

الزہرا کا چودھواں ایڈیشن مئی ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ کے ۱۴۴ صفحات ہیں۔

۱۱۔ سات روحوں کے اعمالنامے | ایک طویل افسانے میں سات مختصر افسانے ہیں یہ رسالہ خطیب کے لئے لکھا گیا تھا اور اس قدر مقبول ہوا کہ رسالہ میں ختم ہونے کے فوراً ہی بعد بصورت کتاب جولائی [illegible] میں شائع کیا گیا علامہ مغفور

کے سامنے ہو فوراً شائع ہوا تھا۔

" مرقان رب الاعظم کے دربار کی ایک دھتکاری ہوئی رُوح ہے جو ایک آدمی کی شکل میں اس زمین پر بھٹکتی پھرتی ہے۔ مرقان "رب الاعظم" کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دُنیا کے بہترین تحفے پیش کرتا ہے "

مولانا حامد علی خاں ———— ساقی ناولٹ انگریزی نمبر

مرقان ایک شیطان یکے بعد دیگرے دُنیا کی سات بہترین رُوحیں پیش کرتا ہے۔

" پہلی دو رُوحیں بتا رہی ہیں کہ خوف خدا سے لرزنے والے گنہگار شقی القلب گندم نما جو فروش ریاکار مردوں سے بہتر ہیں۔ تیسری اور چوتھی رُوحیں سبق دے رہی ہیں کہ تعلیم کے نقص نے قدرت کی ایک سی مخلوق میں کیسا فرق کر دیا۔ ناقص اور ادھوری تعلیم جو برائے نام تھی بالآخر حسینہ کی بربادی کا باعث ہو گئی۔ چونکہ دُنیا کے نشیب و فراز سے واقف نہ تھی مکاروں کے جال میں آ گئی۔ اگر تعلیم کا پورا انتظام ممکن تھا تو اس کا بھونرے کے جال میں پھنسنا ٹھیک تھا۔ اُس کے مقابلہ میں منیرہ یا وجود یکہ خود فریفتہ تھی مگر دُنیا سے اچھی طرح باخبر اور نتیجہ سے پوری طرح آشنا۔ جذبات کو دبا گئی اور ثابت کر دیا کہ اگر تعلیم اور صحبت خیالات کو درست کر دیں تو عورت اس طرح اپنی خواہشوں کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ پانچویں رُوح نارضامندی کی شادی کا کھلا ہوا نتیجہ ہے۔ اور عبرت ہے اُن والدین کے واسطے جو یہ سمجھ کر کہ لڑکی یہاں خوش نہیں زبردستی دھکیل دیتے ہیں۔

چھٹی رُوح کے کارنامے کا ہر حرف پتہ دے رہا ہے کہ کسی مذموم فعل کے ارتکاب کے بعد خود انسان کا اپنا نفس اس پر ہمیشہ ملامت کرتا ہے اور دُنیا کی کوئی خوشی اُس جرم کی تلافی نہیں کر سکتی۔

ساتویں وہ رُوح ہے جس کے بسلسلے کے جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تمہارا قصور معاف ہو جائے اس پاک رُوح کو جس کے تصدق میں تمہاری مغفرت ہوئی اس باغیچہ میں چھوڑ دو جس کے دروازے پر لکھا ہوا ہے صلحت نیک بیبیاں "

سات رُوحوں کے اعمالنامے

" اُردو ادب میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب افسانہ ہے اس میں مزاح و ظرافت بھی ہے اور آہیں اور آنسو بھی۔ اور ساتویں رُوح جس کے طفیل مرقان کی مغفرت ہوتی ہے کیا ہے؟

" قیصر ایک شریف سیدانی ماہ کمال کی بھانجی اپنے جہیز میں ایک محلسرا اور چار سو روپیہ کی آمدنی کی جائداد کے علاوہ بہت کچھ لائی تھی ۲۸ سال کی عمر میں چار بچے ہو جانے اور نزلہ کی وجہ سے نہ خوبصورت رہی تھی نہ بناؤ سنگار میں اپنا وقت لگا سکتی تھی۔ ایک بچہ پیٹ میں تھا احمد جو اڑتالیس سال کے قریب تھا۔ اس سے متنفر ہو کر اپنی نفسانی خواہش کا غلام ایک ۲۰ سالہ قحبہ کو گھر میں لے آیا۔ قیصر اس قحبہ کے سامنے کنیز کی طرح کام کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ایک دن اس کے ایما سے احمد نے قیصر کو محلسرائے سے نکال صدر کے گھر میں بھیج دیا جہاں قیصر کو زیور بیچ کر بچوں کا پیٹ بھرنا پڑا۔ قحبہ کو پھر بھی صبر نہ آیا۔ سات برس کے بڑے بچے کو حلوہ میں زہر دیا۔ اور قیصر پر الزام رکھا جس نے کچھ روز قید میں گزارے لیکن خاوند کے خلاف ایک لفظ مُنہ سے نہ نکلا۔ جج نے چھوڑ دیا تو گھر جا کر دوسرے بچے کو مرا پایا۔ . . . . ایک روز گھبرا کر گھر سے باہر نکل اور اپنے

مولانا کا خط نہایت بری قسم کا شکستہ تھا، اور مولانا
کو خود بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ آپ نے مجھے لکھا کہ
آپ اس کتاب "طوفانِ حیات" کی کتابت دہلی میں کرائیے
کیونکہ لاہور کے کاتبوں کو میرا لکھا ہوا پڑھنے میں بہت
دقت ہوگی۔ اور دہلی کے بعض کاتب آسانی سے پڑھ
لیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے کتابت کے روپے بھیج دیے اور
مولانا نے نہایت احتیاط سے کتابت کرا کر خود ہی کاپیاں
پڑھیں۔ اور میرے پاس بھیج دیں تاکہ میں لاہور میں کتاب
چھپوالوں۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ڈیڑھ ہزار چھپا اور کوئی
چھ سات مہینے کے اندر نکل گیا۔ حالانکہ میرے پاس اعلان
و اشتہار کے ذرائع مفقود تھے۔ بات یہ تھی کہ مولانا کی
تحریریں ملک میں بے حد مقبول ہو رہی تھیں اور تاجرانِ
کتب ہاتھوں ہاتھ سو دو سو نسخے خرید کر لے جاتے تھے۔
میں نے اپنے گھر کی حالت پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا عجب
بے سر و سامانی کا عالم ہے۔ گھر کی استعمالی چیزوں کی حالت
خراب۔ پہننے کے لئے کسی کے پاس ڈھنگ کا کپڑا نہیں۔
بستر پھٹ چکے ہیں۔ سال بھر آمد بند رہی اور خرچ جاری
رہا۔۔۔۔۔ اگرچہ قومی فنڈ اب بھی معمور تھے لیکن میں
دفتر "زمیندار" کے سوا اور کسی ادارے سے ایک پیسہ لینا
بھی جائز نہ سمجھتا تھا۔۔۔۔۔ اس سے قبل میں نے مولانا
راشد الخیری کی کتاب "طوفانِ حیات" کا حقِ اشاعت
حاصل کر کے اس کا ایک اڈیشن چھاپا تھا جو ختم ہو چکا تھا
اب جو ضروریات نے تنگ کیا تو معاً خیال آیا کہ اس کا
دوسرا اڈیشن چھاپ کر فروخت کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔۔
طوفانِ حیات کا دوسرا اڈیشن چھپا اور بہت جلد فروخت
ہوگیا۔ اس زمانے میں مولانا راشد الخیری کی کتابیں بہت
زیادہ مقبول تھیں۔ یہاں تک کہ ملا محمد الواحدی مدیر

مطابع عزیزی علاسو[illegible]
نظام المشائخ نے مولانا کی کتاب شام زندگی کے کئی
اڈیشن سال بھر میں چھاپ لئے۔ خود طوفانِ حیات
نے گھر کی حالت درست کر دی اور اس طرف سے
بے فکری ہوئی"
مولانا عبدالمجید سالک مرحوم ——— احمد لاہور ۱۲۰ [illegible]
"شرک سب سے بڑا گناہ ہے جس کی بخشش نہیں [illegible]
دیکھتے ہیں کہ مسلمان بھی اس میں زیادہ مبتلا ہیں [illegible]
نے توحید بہترین صورت میں پیش کی۔ مخالف [illegible]
قائل ہیں مگر ہم اپنی مذہبی تعلیم سے بیگانہ ہونے کی وجہ
مشرکوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ
تربیت ہے۔ جن گودوں میں ہم پلتے ہیں وہاں پہلا
سبق اسی کا ملتا ہے۔ طوفانِ حیات میں مستقبل میں ہونے
والی ماں کی کیا صورت ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:
"آثار حمل کے نمودار ہوتے ہی دونوں وقت مسجدوں
میں گھی کے چراغ جلنے لگے ایک مہینہ اسی طرح جوں کا
توں کٹا دوسرے مہینے کا شروع ہونا تھا کہ نہ گلے میں
ہنسلی رہی نہ پاؤں میں کڑی سارے بدن پر تعویذوں
کی حمائل پڑی تھی جدھر دیکھو نقش اور جس طرف
نظر ڈالو تعویذ اسم پر ستم پڑھا ہوا کاجل مقامات میں
تین تین مرتبہ لگتا اور چار چار دفعہ چھٹتا۔۔۔
آنکھوں میں ڈھیر سا کاجل ماتھے پر نظر کا ٹیکہ سُرخ
قمیص سیاہ تعویذ کرتے میں خریطے سلے رہتے تھے"
رسوم کی مذمت اور ان کے علاج کے متعلق آپ
"طوفانِ حیات" پڑھ جائیں آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے
کہ ایک اصل مبلغ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس قصے کے
ممدوح انعام کی تباہی شرک اور رسوم کی بدولت ہوئی
اس کی لڑکی ناصرہ جس کا نام مولانا نے خدا جانے کیوں

کردیا۔ اس قصّہ کی تاریکی میں ایک روشنی ہے۔
یت کا ذریعہ ہے۔ قصّہ کا انجام اچھا ہے اور غرض
یت باحسن الوجوہ مکمل ہے۔۔۔۔۔ جس گھر میں موت
آتی ہے اس پر ایک تو اس غم کا پہاڑ ہی ٹوٹتا ہے اور پھر
عزیز قریب لڑ لڑ کر اس پر جا ٹوٹتے ہیں اور اُسے اپنے
کے ساتھ ساتھ ان کی خاطر تواضع کی مصیبت جھیلنی
ہے۔ مولانا نے طوفانِ حیات میں اس طرف نہایت
زور دار طریقہ سے توجہ دی ہے۔ (صفحہ ۹۵ تا ۱۰۸)
بڑے میاں کا بیگھر جو انہوں نے نامرو کردیا" اور
طوفانِ حیات کے صفحہ ۹۰ سے ۲۰۲ تک پھیلا ہوا ہے اس
کتاب کی جان ہے۔ کس کس طرح انہوں نے اسے شرک
سے بچنے اور رسوم سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی ہے پتھر بھی
ہو تو اُس پر نقش ہو جائے۔ ایک بیوی کا ذکر ہے جس کا
میاں عین نکاح کے وقت مر جاتا ہے۔ وہ صبر و شکر کرتی
ہے پھر شوہر بھی بیمار ہو کے قریب المرگ ہوتا ہے۔ بیبیاں
بوالیاں اسے راہ راست سے ڈگمگانا چاہتی ہیں۔ مگر وہ
ہر ایک رسم سے ہر ایسے تعویذ ٹوٹکے سے بچتی رہی جس سے
شرک کا شبہ تک اُس پر نہ آ پڑے"۔
مولوی محمد ظفر امام اسے ــــــــــ عصمت راشد الخیری نمبر
"مصورِ غم علامہ راشد الخیری نے تباہ کن اور فضول
رسوم کی زبردست مخالفت کی۔ وہ ذلیل اور کریہہ رسمیں
جن کی بدولت مسلمانوں کے اخلاق اور اطوار پستی کی طرف
گر رہے تھے اور جو گھن بن کر قوم کو اندر ہی اندر کھا رہے
تھے ان پر مولانا نے سختی سے مطعون کیا مہنت کے کھانے
پر عزیز اقارب کے چک چک لقمے اڑانے پر انہوں نے
اظہارِ ملامت کیا اور اس طرح انہوں نے نہ صرف
عورت بلکہ بنی نوع انسان کی بڑی ٹھوس خدمات انجام
دیں۔ طوفانِ حیات میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔
"ایک بچہ مرتا ہے۔ ماں باپ پر مصیبت کا پہاڑ
ٹوٹ پڑا۔ ماں کی گود اجڑ گئی باپ کا گھر تاریک ہو گیا ہو گا
حسرتیں دل ہی دل میں آ رہی تھیں چشم زدن میں منتقل ہو گئیں۔
ان موقعوں پر ان بدنصیبوں پر ان مصیبت کے ماروں
پر آپ کی ہمدردی کیا ہے؟ بریانی کھلانا ہے۔ متنجن ڈالنے
تورمے اڑانے ہیں۔ فرنی کھلانی ہے۔ مرحوم علامہ راشد الخیری
کا اندوہ میں ڈوبا ہوا طرزِ تحریر بڑا جامع دل دوز اور
حقیقت سے بھرا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے مقصد کیلئے
جو پیرایہ اختیار کیا اُس میں اُنہیں زبردست کامیابی
ہوتی اور اس پیرایہ بیان اور دَرد انگیزی کی وجہ سے
قوم نے انہیں "مصورِ غم" کا خطاب دیا"
آمنہ نازلی ــــــــــ (اخبار انجام کراچی ۲ فروری ۱۹۶۳ء)
"پیر صاحب رنگے سیار تھے غضب کے مفسد اور
حرام خور۔ مریدوں کی سہل اعتقادی کے مزے لوٹا کرتے
تھے۔ پارسائی کا ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ سیدھے
سادے ضعیف اعتقاد والے اس میں پھنسے رہتے تھے
آخر انعام کو معلوم ہوتا ہے کہ اس ملا نے اُس کے شوہر کو
کو زہر دیا ہے۔ ملا ٹھوکریں مار کر نکال دیا جاتا ہے۔ اس فسانے
میں انعام اور ہاجرہ خاص افراد ہیں دونوں میں واقعیت کا
کمال موجود ہے۔ انعام یا ہاجرہ کے کیرکٹر میں کہیں بھی ایسا موقعہ
نہیں آتا کہ دل میں کوئی شبہ پیدا ہو۔ حقیقت کا رنگ
اوّل سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ اگرچہ مصنف نے ہاجرہ
اور انعام دونوں ہی کی تخلیق ایک خاص منشا سے کی ہے
ان سے وہی حرکات سرزد کرائی ہیں جو اُن کی منشا کو پورا
کریں۔ ان کے منہ سے وہ الفاظ نکلوائے ہیں جو انہیں
افسانے کے مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری معلوم ہوئے۔

لیکن کہیں افسانے کا گمان نہیں ہوتا"

منشی پریم چند ———— عصمت اگست ۱۹۳۶ء

پشاور ریڈیو سے پروفیسر ام۔ اے لطیف کی
تقریر کا اقتباس :-

• جہاں تک انسانی رنج و غم کا تعلق ہے تو اس کی
ترجمانی میں مولانا راشد الخیری کا ہم پلہ اردو زبان میں کوئی نہیں
مصیبت کا کون سا پہلو ہے جسے آپ نے انداز جاں گداز
میں پیش نہ کیا ہو۔ اور غم کی کون سی صورت ہے جو آپ نے
ہمارے لئے نہ کھینچی ہو ایک معصوم بچے کی موت یتیم کی
گریہ وزاری۔ فاقہ کشی کی ایذا۔ غربت اور ناداری کا دکھ
عزیز کا درد مفارقت۔ مظلوم کی جفاکشی۔ بیوہ کی فریاد
الغرض رنج و الم کی درازنی شکل کا ہر خد و خال اپنے
بے نظیر ناولوں میں منقوش کر دیا اور ان میں ایک ایسا سماں
پیدا کیا جس پر افسردگی کی گھنگھور گھٹائیں چاروں طرف
چھائی ہیں۔ ایک صاحب دل شخص ہی دوسرے کے دکھ
کو سمجھ سکتا ہے۔ مولانا کے دل میں عالمگیر ہمدردی خلائق
تھی اور اسی ایک بات میں آپ کے کمال کا بھید چھپا ہوا ہے"

.... طوفانِ حیات ایک ایسا ناول ہے جس میں علامہ
مرحوم کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ زبان نہ صرف بامحاورہ
اور سلیس ہے بلکہ اس میں خاص شوخی اور زور پایا جاتا
ہے جس کی وجہ سے ہر نقش زیادہ گہرا معلوم ہوتا ہے یہ ناول ہماری
خانگی اور معاشرتی زندگی کا ایک صحیح مگر عبرت انگیز مرقع ہے
اس میں ایک شریف اسلامی خاندان کی حسرت ناک تباہی
اور اس کی قسمت کے بدلتے ہوئے رنگوں کا منظر پیش کیا
گیا ہے۔ انعام اس خاندان کا روشن چراغ ہے اس کا مسلک
اسلامی اور اس کی طرز رہائش سیدھی سادی ہی مگر اسے
خدا نے ایسی بیوی عطا کی جو توہمات میں سر سے پاؤں تک
ڈوبی ہوئی تھی۔ رسم و رواج کی
پہلے درجے کی پیر پرست تھی جہاں
نزدیک خدا کا فرمان تھا اس پر غضب
اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ان رسوم پر
کیا تھا جو زر و دولت تھی گھر میں تھی
اور ختنے کے موقع پر سب ہی جو نذر نیاز
بھینٹ چڑھتی حتی کہ انعام کی ملازمت
قرض خواہوں کے خوف سے پریشان
اختیار کرنی پڑی مگر اس کی بیوی بھی
تھی۔ جو باوجود پیروں کے دھوکوں
سے باز نہ آئی۔ مصیبت پر مصیبت
مگر کیا مجال جو وہ اپنے شرک اور رسم
اسے یہ دن دکھائے چھوڑ دے۔ انعام
ارادے کا کچا تھا اس میں اتنی طاقت
اور اس کی تباہ کاریوں کو روک سکے ...
کے بعد مشرکہ ایسے لوگوں کے ہاتھ پڑی جو بڑ
اور جن کی تمام دولت پیر صاحب کی نذر ہو
حالت کو کب گوارہ کر سکتی تھی اس نے پیر
سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی
لئے تلخ ہو گئی اس پر ہر طرح کے ظلم کئے
سے جدا کی گئی اور اس بیٹے کو یہ نہ دکھایا گ
کون ہے بچہ چودہ برس کا ہوا پیر صاحب
ہونے کے خوف سے اس کے دودھ میں ز
بیٹے کا آخری دیدار میسر ہوا اور جب
تھوڑا افاقہ ہوا تو پیر صاحب کی شرارت
دکھڑے ہوئے وہ بالا لے مگر مشرکہ یعنی نا
قدر درد انگیز ہے کہ اگرچہ اس کا انجام نیک

[illegible] کی مناظی کا گہرا اثر پیدا کرتی ہے۔ اس اصلاحی ناول کی غرض و غایت مولانا راشد الخیری کے اس جذبے کا اظہار ہے مسلمانوں پر تباہی کیوں آئی اور مستورات رحمت کی طرح جس کو دیمک اندر ہی اندر غارت کرتی ہے رسوم کی پابندی نے ان کو کھوکھلا کر دیا۔"

بعض ناقدین کی رائے میں طوفانِ حیات حضرت علامہ مغفور کا بہترین اصلاحی ناول ہے۔ سالک صاحب مرحوم اخباری مصروفیات کی وجہ سے طوفانِ حیات کی اشاعت کے لئے وقت نہ نکال سکے۔ اور پہلا اڈیشن ختم ہونے کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا کئی کئی سال تک نہ چھپ سکا۔ [illegible] میں ہم نے اس کا حقِ اشاعت واپس لے کر اور حضرت مصنف سے نظرثانی کرنے کے بعد خاص اہتمام سے شائع کیا۔ منازل السائرہ صبحِ زندگی، شامِ زندگی کی طرح یہ ناول بھی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل رہا۔ چودہ مرتبہ چھپا ہے [illegible] کے ۱۳۰ صفحے ہیں۔

۱۳۔ سنجوگ [illegible] میں مولوی سید ممتاز علی صاحب مرحوم نے اخبار تہذیب نسواں لاہور کے لئے یہ افسانہ لکھوایا تھا اور کتابی صورت میں [illegible] میں چھپا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں اس کے ۷ اڈیشن مصنف کے سامنے شائع ہو گئے تھے۔

"سنجوگ ایک ایسی لڑکی کی داستانِ غم ہے جس کا نکاح والدین نے سوچ سمجھ کر نہ کیا اور فریقین کی طبیعتوں کا اندازہ نہ لگایا بلکہ روپیہ پر پیاری بیٹی قربان کر دی۔ مولانا مرحوم کی ہر تصنیف حقیقتِ حال اور ہماری ملکی اور معاشرتی نقائص کی آئینہ دار ہے۔ جو کچھ مولانا مرحوم نے اپنی کتب میں دکھایا اور جن مناظر کا نقشہ کھینچا وہ اکثر مشرقی عورت شرم و حیا کی دیوی اور چار دیواری میں معلوم ہونے والی ایک نہیں اکثروں کے ساتھ پیش آ رہا ہے ...... دیکھئے کثرتِ ازدواج کے شائق نفس پرست ظالم مرد کو جاہل بے گناہ بیوی اور بچوں کے حقوق کی طرف زائرہ کی زبانی متوجہ کرتے ہوئے ایک عیال دار شخص کو دو بچوں والی بیوی کی موجودگی پر بیٹی دینے والوں کی مذمت کی ہے۔

"احسان کا اتنا کہنا تھا کہ زائرہ کا چہرہ غصے سے لال سرخ ہو گیا۔ بگڑ گئی۔ وہ بچہ سنبھال کر اٹھ بیٹھی اور کہنے لگی: آپ نے ان بھولی بھالی عورتوں کو اپنی بدی سے متعلق کر لیا اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ میں بھی آپ کی ہاں میں ہاں ملاؤں تو یقیناً غلط ہے۔ آپ کی محبت جھوٹی آپ کا دعویٰ غلط۔ آپ کے خیال یا آپ کے جذبے آپ کی رائے بھاڑ میں کا چھینٹا۔ آپ کہہ کیا رہے ہیں آپ نے ایک جیتی جاگتی ایک زندہ روح قبر میں پہنچا دی۔ آپ نے قدسیہ جیسی بچی کو اس لڑکی کو جو کنبہ بھر کا مول ہے برباد کر دیا۔ آپ نے ان معصوم بچوں کو جو وہ اپنے گھر سے نہ لائی تھی۔ اس کی پالکی میں نہ تھے محض اپنی نفس پروری اور خود غرضی پر قربان کر دیا۔ آپ کو کیا اس لئے کہ آپ مرد ہیں اور ہر قسم کا حق حاصل ہے یہی زیبا تھا کہ ایک کنواری بچی کو دھوکہ دے کر جہنم واصل کر دیں یہ بچہ جو اس وقت میری گود میں ہے لاکھ نادان اور بے خبر سہی مگر آپ کے مظالم اس کی معصوم آنکھیں آپ کی بے اعتنائی اس کا ننھا سا دل فراموش نہیں کر سکتا۔ اگر آج ہم آنکھوں کے اندھے اور پیسے کے پورے نہ ہوتے تو یہ بچی تو تم کو قیامت تک نہ ملتی اور تم کو معلوم ہو جاتا کہ بیوی پر ظلم کرنے کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ چار دن میں پھٹے سر سے

دُو لھا بن گئے ..... کیا ایسے ہی مردوں کو اسلام نے چار نکاحوں کی اجازت دی "

مولانا مغفور نے نسوانی دنیا پر سے ظلم و بے انصافی کی گھٹا دُور کرنے کی صدا بلند کر کے ظالم مردوں کو چونکا دیا چونکا ہی نہیں دیا بلکہ بھولے ہوئے اور پس پشت ڈالے ہوئے فرائض یاد کرا کے آمادۂ عمل بنا دیا "

گ. ن بنت ڈاکٹر میر افضل کپورتھلہ ——— بنات مئی سنہ

" روپیہ کے لالچ میں جو شادیاں کی جاتی ہیں اُن کے بُرے نتائج کا مرقع راشد الخیری کا ناول سمرنا ہے "

بنگال میں اُردو زبان کی تاریخ

از ڈاکٹر ہیرن چندر پال ——— ترجمہ خالدہ فہمی

۲۰ × ۲۷ / ۱۶ کے ۹۶ صفحے ہیں دس مرتبہ شائع ہوا ہے۔ کالے خاں کی مسجد والی گلی میں دفتر کے مکان میں یہ افسانہ لکھا تھا۔

۱۴ - ماہِ عجم علامہ مغفور کا سب سے پہلا تاریخی ناول ہے جو مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم اڈیٹر تہذیب نسواں کے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ تاج صاحب نے درخواست کی تھی کہ شاہین و دُرّاج کی طرح حُسن و عشق کا ناول تحریر فرما دیں اور مصنف نے جواب دیا تھا کہ وہ جوانی کی بات تھی اور شیخ عبد القادر نے لکھوایا تھا اب اس عمر میں اس طرز کا ناول لکھنا مناسب نہیں۔ پھر بہت اصرار کیا گیا تو حضرت علامہ نے تاریخ اسلام ناول کے پیرایہ میں لکھنے کا خیال ظاہر فرمایا تھا۔ بہرحال سنہ ۱۸ء میں یہ تاریخی ناول لکھا۔ اس کے تین باب ہیں پہلا باب جس دن ختم کیا اُس روز پبلشر کو بھیج دیا گیا اس طرح دُوسرا اور پھر اُسی طرح تیسرا۔ کتاب جب ختم ہوئی تو پہلے دو باب لاہور میں پبلشر کے پاس تھے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا حضرت مصور غم پبلشر کو مسودہ بھیجنے سے قبل نظر ثانی نہ فرماتے تھے۔ ماہِ عجم میں فاروق اعظم کے عہد مبارک میں تسخیر ایران کے لئے مسلمانوں کی جانبازیاں اور جرأت و شجاعت کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عشق کا پُراثر اور بڑا ہی درد انگیز افسانہ ہے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ مشرق میں اس پایہ کی ٹریجڈی نہیں لکھی گئی۔ علامہ مغفور کے تمام تاریخی ناولوں میں یہ بہت ممتاز ہے۔ بہادر یار جنگ مرحوم سے سنہ ء میں میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا تھا " ماہِ عجم ۱۸ دفعہ پڑھ چکا ہوں "

" صد آفریں ملکِ ایران صد آفریں! پرستش کے قابل تھی تیری مبارک سرزمین! جس سے ابیلا جیسے لال اُگلے۔ اقبال جس کا غلام۔ نصرت جس کی چیری۔ حُسن جس پر مفتوں۔ ملاحت جس کی کنیز۔ ناز و انداز کی سرتاج دریائے نزاکت کی دُرِ شہوار۔ شجاعت کی جان جرأت کی کان ہمت جس کی خُو۔ مروت جس کی بُو۔ صورت میں کنعانی سیرت میں لاثانی۔ مالکِ حکومت، مالکِ سلطنت۔ انصاف جس کا کام۔ ابیلا جس کا نام ..... خدا کی شان ایک دُنیا جس کی طالب ایک عالم جس کا خواہاں، دولت عزت والے، سلطنت حکومت والے جس شمع کے پروانے، جاہ و ثروت والے۔ شان و شوکت والے جس صورت کے دیوانے اُس کی آنکھیں ایک مفلس چور کی۔ ایک گمنام بیراگی پر خون کے آنسو گرا رہی ہیں " (ماہِ عجم)

" علامہ مرحوم نے ماہِ عجم میں کردار نگاری بڑی کامیابی سے کی ہے اور مناظر کی مصوری بھی اچھے انداز میں۔ قصے کی دلکشی بھی کہیں کم نہیں ہونے پاتی۔ پلاٹ

...روانی بھی ہے اور تسلسل بھی اور شستگی لفظ نظر سے
وہ دوسرے کسی سے کم نہیں۔ لیکن ان میں سے ہر چیز
نا پیدا ہی غالب ہے۔ ابیلا کا کردار قابلِ فخر ہے۔
عورت کو ابیلا کی طرح بہادر اپنے ارادوں کا پکا
حوصلوں کا مضبوط ہونا چاہئے۔ خدا کرے دنیا کی ہر عورت
دل میں اسی جوش سے جو ابیلا کو محبت میں تھی۔ لیکن
آپ بھی دیکھئے کہ جب ایک انشا پرداز حقیقتوں کو
ظاہر کرتا ہے تو اس کے نوکِ قلم کی نگینیاں کس طرح
حقیقتوں میں نور بھرتی ہیں۔ ان میں کس طرح چمک پیدا
کرتی ہیں۔

ابیلا کے دل پر نفیر کی بہادری نے محبت کا
سکہ بٹھا دیا۔ شان ناز تھی اس لئے اس کے سامنے
حوصلے سے کام لیا۔ لیکن محل میں آکر اس کی جو حالت تھی اس کی
تصویر انشا پرداز نے یوں کھینچی ہے :-

"کیسی قیامت کی رات ہے۔ شمع کی بتی جل چکی۔ گلدستوں
کے پتے خشک ہوئے۔ سیج کے پھول مرجھا گئے۔ مگر
رات کی تاریکی پرسنور دنیا ڈھک گئی۔ جہاں ساکت
گھنٹہ خموش۔ بلبل چپ لیکن نہ تھکی تو یہ کم بخت ملت"
"مگر ہاں جوگی کس کے میت۔ پریت کی توقع ہی غلط
پردیسی تھا۔ ہاتھ میں ہاتھ دے کر بات کی لاج نہ رکھی"

ایک دوسرا منظر ہے جب فیلوکس ابیلا کے بھائی
اور باپ دونوں کو قتل کر چکا ہے۔ ابیلا سیستان کے قلعہ
میں قید ہے۔ یادِ محبوب میں اسے قید کی سختیاں بھی سیجوں
کے پھول ہیں۔ فیلوکس اسے قیدخانے سے نکالتا ہے۔
حرفِ تمنا زبان پر لاتا ہے۔ ملکہ کی شانِ خودداری اسے
ٹھکرا دیتی ہے۔ تو بادشاہ اسے قتل کی دھمکی دیتا ہے اس
وقت انشا پردازی کا قلم ابیلا کی زبان سے کیا کہلواتا ہے

"موت یاعثِ عزت اور قتل ریاضِ محبت کا معمولی
صلہ ہے۔ تیری معمولی نگاہوں میں قتل ہو جاؤں گی
مگر یہ قتل فیلوکس میرے سر پر وہ چمکتا تاج رکھے
گا جس کو کبھی فنا نہیں تاریخ میرا نام روشن کرے گی۔ اور
مملکتِ حسن میری حکومت سے سبق لے گی بس خاموش
ہو اور قتل کا حکم دے"

"اس کردار کو زیادہ فطری زیادہ دلکش بنانے
کے لئے رنگینیٔ قلم نے خوب جوہر دکھائے ہیں۔

اس محبت کی دیوی کے کردار کا آخری پہلو وہ ہے
جو ہمیں ناول کے آخر میں نظر آتا ہے۔ ملکہ مسعود کے
انتظار میں سڑک کے کنارے بیٹھی ہے۔ اس کا خیال ہے
کہ مسعود کی فوج کے سپاہی اس طرف سے گذریں گے۔
خود کو اس قابل تو نہیں سمجھتی کہ مسعود سے ملنے کی تمنا کرسکے
اس لئے صرف یہ کہہ رہی تھی :-

"ہوا مجھ بدنصیب کا اتنا کام کردے کہ مسعود کے گھوڑے
کی گرد میری آنکھوں تک لے آ" فوج نکل گئی۔ ٹاپوں
کی آوازیں بلکی ہونے لگیں۔ گرد زمین سے اونچی اٹھ کر
آسمان کی طرف جانے لگی۔ ابیلا کی آخری آس بھی ٹوٹ
گئی۔ اور اس نے کہا :-

"آج تک کچھ تھوڑی سی امید باقی تھی۔ اب وہ بھی ختم
ہو گئی۔ مسعود چلا گیا۔ وہ بے وفا نہیں ہے۔ میں ہی
اس قابل نہ رہی اب جی کر کیا کروں گی۔ حکم الحاکمین
.... دنیا سے اٹھا لے"

یہ تھی ابیلا۔ محبت نے اسے کیا سے کیا بنا دیا

وقار عظیم ایم۔اے ——— عصمت فروری ۱۹۳۶ء

"ماہ عجم میں بھی عورت کو وہی مرتبہ دیا ہے جو کہ
درِ شہوار میں۔ ابیلا یعنی اس کی ہیروئن بھی اس دنیا میں

اپنے ارادوں میں اٹل ہے۔ تمام تکلیفیں سہیں عزیزوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھا خود بھی اندھی ہوئی مگر سوائے مسعود کے زبان پر دوسرا نام نہیں آیا۔ پریشانیاں تباہ کاریاں اور موت سب کچھ برداشت کیا۔ دم توڑا تو اسی کے سامنے جو مسعود کے نام سے پکارا جاتا تھا جو قربان ہونے والی ابیلا سے درمیان میں منحرف ہوگیا تھا مگر ابیلا کے استقلال اور خیالات میں مطلق فرق نہ آیا۔ اسی طرح ان کے اور تاریخی ناولوں میں بھی ہم کو عورت کے بلند کردار ملتے ہیں۔ مگر ان سے بھی عورتوں کو ایک سبق ملتا ہے اور ہر شخص ان کے ناولوں کو پڑھ کر اخذ کرسکتا ہے۔

مولانا نے اپنے بعض ناولوں مثلاً ماہ عجم میں ایک فرد کی بجائے ایک جماعت کو لیا ہے۔ اور بحیثیت مجموعی اس کے کردار کو پیش کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

مولانا کے کردار جس ماحول کے ہوتے ہیں۔ اسی کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ یہ وہی ابیلا تھی جب کہ وہ کسی کی بات بھی نہیں سنتی تھی۔ جرات میں شجاعت اور فخر ٹپکتا تھا "اقبال اس کا غلام اور رفعت اس کی لونڈی تھی" آج وہی ابیلا ہم کو ایک فقیر کی محتاج نظر آرہی ہے اور گڑگڑا کر اس سے باتیں کررہی ہے۔ اس کے رحم و کرم کی منتظر نظر آتی ہے اور قدم قدم پر اس کا شکریہ ادا کرتی ہے"

ادیبِ احمد ادیب ———— ساقی ستمبر ۳۶ء

۱۹۴۲ء میں بیٹے اس کے حقوق اشاعت واپس لئے۔ اب تک دس مرتبہ شائع ہوچکی ہے ۱۳۰۲ھ کے ۱۹۲ صفحات ہیں۔ یہ ناول بھی کالے خاں کی مسجد کی گلی میں دفتر میں لکھا تھا۔

۱۵۔ سراب مغرب | جنوری ۱۸ء کی تصنیف ہے۔ فروری ۱۸ء میں پہلی دفعہ اور مصنف مرحوم کے سامنے ۸ دفعہ شائع ہوئی تھی۔

اس طویل افسانہ میں دکھایا گیا ہے کہ غیر مسلم مدارس میں لڑکیوں کو پڑھانے اور اپنی خوبیاں گنوا کر اندھا دھند مغربی تقلید کے نتائج کس قدر ہولناک دل خراش اور عبرت انگیز ہوسکتے ہیں۔ سراب مغرب پہلی مستقل تصنیف ہے جس میں مغربی تہذیب کے مقابلہ میں مشرقی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

"سراب مغرب میں اسی طرح ساون کی خوشیوں کی تصویر دکھائی ہے۔ لڑکی سسرال میں ہے۔ ساون آیا ہے اور وہ گاتی ہے۔

نیم کی نبولی پکی' ساون بھی کبھی آوے گا
جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا

جذبات کی نزاکت و مسرت کو دیکھئے۔ پردیسن بیٹی ساون کی آمد پر خوش ہے۔ کیونکہ یہ رسم ہے کہ اس موقع پر بھائی بہن کو لینے آتے ہیں۔ دیکھئے تو کس خوبی سے رسم کے پردے میں اس ضرورت کو پورا کرایا ہے۔ نہ سسرال والے کچھ کہتے ہیں نہ شوہر کو ناگوار گذرتا ہے۔ اور لڑکی میکے پہنچ جاتی ہے۔ اور ذرا ان لوگوں کی انسانی فطرت سے واقفیت تو دیکھئے لڑکی کے بلانے کا کون سا وقت مقرر کیا ہے ساون، جب کہ کھیل کود کا موقع ہے۔ تاکہ میکے میں آزادی سے جل پھر کر اپنا دل خوش کرسکے۔

ماں باپ کے بعد ڈر ہے کہ بھائی بہنوں کی خبر نہ لے اس لئے یہ رسم کردی ہے کہ جب بھائی کے گھر بال بچہ ہو بہن کی شرکت ضروری اور لازمی ہے۔

"بھائی کھاتا پیتا ہے۔ جس کو خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ بہن بدقسمتی سے غریب ہے مفلس ہے اور مشکل سے زندگی بسر کررہی ہے مگر رشتے کا اعتبار

ورثۂ عصری ... شاعری

دونوں برابر ہیں۔ ایک باپ کی اولاد۔ ایک ماں کے
پیٹ میں پانی ... سکے۔ دولت کا امتیاز اور تفریق کی
محبت رشتہ مساوات میں حارج نہیں ہے۔ وہ اپنی
دولت میں خوش ہے تو یہ اپنی مفلسی میں مگن۔ بھائی کے
ہاں بیٹا ہوا تو اس وقت کا تمدن اس طرح شروع ہوتا ہے
کہ ملحوظ رہے کہ بہن پچاس برس کی اور بھائی پلنگ پر
بہنیں دونوں برابر ہیں۔ بہن خوشی کے مارے اچھل پڑی
جاتی کی کمائی سے نیگ جوگ کے بہانے کچھ لے گا۔
لڑا ایسا ہو کہ اس کی مفلسی بھاوج کی نگاہ میں رہ ذلت
ہو جائے اس لئے پہل اس کی طرف سے ہوتی ہے
سب سے پہلے وہی بھتیجے کا کرتا ٹوپی تیار کرتی ہے اور
خوشے کر بھائی کے یہاں پہنچتی ہے ذرا اس وقت کی
زچہ گیری کو دیکھنا بہن کیا کہہ رہی ہے۔

میں تو ہو کر سنکر آئی۔ بیرن بھیا۔ میں تیری ماں کی جائی

واللہ اللہ کیا موثر وقت ہے۔ بھائی بھاوج خدا کی
اس نعمت پر باغ باغ ہیں۔ چاروں طرف سے مبارک
بادیں مل رہی ہیں۔ ہر شخص اپنا حق طلب کرتا ہے کہ
دفعتاً عورتوں کی جھوٹی بہن کی صدا اس بہانے کان
میں آتی ہے وہ بھیک نہیں مانگتی اپنا حق نہیں جتاتی
پہلے آنے کی وجہ بیان کرتی ہے۔ اور کہتی ہے میں تو ہو کر
سن کر آئی بیرن بھیا۔ میں تیری ماں جائی کی جائی اس وجہ
کو بیان کرنے کے بعد بے ساختہ اس کی نگاہ بچہ پر پڑتی
ہے۔ دل بھر آتا ہے۔ بھائی کی محبت جوش کرتی ہے۔
دل سے یہ دعا نکلتی ہے

باغوں میں جیسے آم پھلے رہے ایسا پھلے میرا بھائی
بیرن بھیا! میں تیری ماں کی جائی

اب اس کو اپنی غربت اور بھائی سے تمول کا خیال آتا ہے
اور سوچتی ہے کہ بھائی تو غیر اپنا ہے۔ کہیں بھاوج
مجھ کو غریب سمجھ کر حقارت سے نہ دیکھے یہ خیال آتے
ہی وہ بھاوج سے کہتی ہے

جئے میری بھاوج بچے پالو لالا نند کھلانے آئی

بھاوج کو دعا دیتی ہے۔ درازی عمر کی خواہش کرتی ہے
اور دبی زبان سے اپنا مطلب بھی کہہ دیتی ہے کہ خالی
نہیں آئی ہوں۔

تمہارے لالہ کو نسل دے کر دے، تجھ کو میوہ لائی
بیرن بھیا میں تیری ماں کی جائی

اب اتنا کہہ چکی تو اپنا حق جتاتی ہے اور کس ناز
سے کہتی ہے کہ لونگی اور لے کر جاؤں گی۔

شوکے چڑھن گھوڑا لوں گی اپنے بچن کو جوڑا

ڈاکٹر شائستہ سہروردی ——— عصمت اللہ الخیری پر

"سراب مغرب" دراصل سیلاب مغرب کے خلاف
ایک زبردست احتجاج ہے۔ "سیلاب مغرب" مولانا کے
خیال میں ایک بہت وسیع لفظ تھا۔ اس میں مغربی تہذیب
و تمدن کے علاوہ ہندوستان میں مشنریوں کے کام بھی آجاتے
ہیں۔ موجودہ ترقی کے سلسلہ میں بتلاتے ہیں مغربیت لوگ
ترقی کرنے کی آڑ لے کر کس طرح قوم کا روپیہ برباد کر رہے ہیں
لکھتے ہیں :-

"دعوت کیا تھی ایک مصیبت تھی۔ بیسیوں قسم کی مٹھائیاں
اور سینکڑوں وضع کی ترکاریاں میں کہتی آخر کچھ نہیں تو
سو روپے سے کم نہ اٹھے ہوں گے۔ اس پر چیخ و پکار
ہے کہ قوم مر رہی ہے۔ بیٹا اگر قوم مر رہی ہے تو یہ روپیہ
قوم ہی کو دیا ہوتا۔ یتیم بچے ہیں۔ ماشاء اللہ بھائی بابا
فقیر ہیں ان کو دیتے تو دین اور دنیا دونوں میں اچھے۔
اتنا کچھ ڈکار گئیں حاصل دین نہ حاصل دنیا"

ممکن ہے بعض اصحاب مولانا کے اس نظریہ پر چیں بجبیں ہوں۔ مگر مولانا نے جو کچھ دیکھا وہ لکھا۔ کیا درحقیقت ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ ایک ذرا سی بات ہوئی تو پارٹی وسے بیٹھے " بھائی کیا ہو رہا ہے ؟ قوم کی اصلاح کے لئے مختلف ذرائع تلاش کئے جا رہے ہیں "

مولانا کے ناولوں کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ان واقعات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ جو ہماری سوسائٹی کو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ کوئی اخبار ایسا نہیں ہوتا جس میں یہ نہ دیا جاتا ہو کہ فلاں شہر فلاں رئیس کی نوجوان اور تعلیم یافتہ لڑکی گم ہو گئی۔ انگریزوں کے یہاں کورٹ شپ کوئی عیب نہیں۔ اس کو بھی مولانا نے سراب مغرب میں پیش کیا ہے۔ مگر اس اندھا دھند مغربی نقالی کا انجام کیا ہوا۔ بہت ہی دردناک اور عبرت انگیز ہے ..... سراب مغرب میں اس کی ہیروئن کا انجام دیکھنے کے بعد اسی تصویر کا دوسرا رخ ایک دوسرے کردار میں ملاحظہ فرمائیے۔ جو بہنوں کی عاشق بھائیوں کی شیدائی۔ ماں باپ کی فرماں بردار ہے۔ جو شوہر کی ہر خواہش کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہے۔ جو اس کو ذرا سی تکلیف ہونے پر اپنا آرام اور اپنا چین بھول جاتی ہے۔ جو بوڑھی عورتوں کا سہارا رانڈوں کی والی اور اپاہجوں کی سچی ہمدرد ہے۔ ایک بیوہ ہونے پر بھی اپنی وضعداری اور خاندانی شرافت کو ترک نہیں کرتی مصیبت میں اپنا پیٹ بھیک مانگ کر نہیں بھرتی بلکہ زنانہ اسکول کھولتی ہے۔ لڑکیوں کو پڑھاتی ہے۔ اور اپنا پیٹ بھرتی ہے۔ وہ شریف لڑکی " رضیہ " ہے جو بھائی کی ایسی حرکتوں کے باوجود کہ اس کا بچہ مر گیا مگر اس نے ایک پیسہ نہ دیا۔ اس کی تمناؤں کو خاک میں ملا دیا۔ مدرسہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اور اس کا گھر تباہ و برباد کر دیا۔ اُف تک نہیں کرتی۔ بلکہ جب

بڑی بہن کہتی ہے کہ خدا نہ کرے بھائی کو اس کا بدلہ ملے تو اس کا دل بھر آتا ہے۔ اور وہ کہتی ہے۔

" رضیہ اسے سب آپا ! خدا کے لئے یوں نہ کہو۔ اس نے جو کچھ کیا مگر خدا اس کو خوش رکھے۔ یہ تو میری بات کوئی سمجھ سکا۔ مگر رضیہ یہ نہیں چاہتی کہ بھائی کسی تکلیف میں گرفتار ہو "

اُنھوں نے جس قدر بھی جدید اقدار پر تنقید کی اور ان کے کرداروں کے ذریعہ سے پیش کیا۔ اس کی مثال متعدد ایسے کردار پیش کئے ہیں اور ایسی باتیں بیان کی ہیں جو اُن برائیوں کو اور زیادہ ذہن نشین کر دیتی ہیں۔ برائیوں کو ظاہر کرنے اور ان کو دور کرنے کے لئے خوبیوں کو بھی پیش کر دیا ہے۔ اور یہ خامی نہیں خوبی ہے جس سے ان کے ناولوں میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

ادریس احمد ادیب ——————— ساقی راشد الخیری نمبر

سراب مغرب ۱۲ دفعہ چھپی ہے ۳۰۴ صفحے ہیں۔

۱۶ - بنت الوقت

یہ ناولٹ اپریل ۱۹۳۰ء تک صرف ۲ روز میں لکھا گیا تھا یہ تصنیف ضخامت میں سراب مغرب کے برابر ہے۔ اس کا اشتہار اس طرح دیا گیا تھا۔

" دورِ جدید کے کرشمے۔ مغربی لیڈیز کی حیرت خیز تبلیغ۔ مغربی تہذیب کی دلدادہ مس فرخندہ کی شرمناک داستان وحید کا اپنے بڑے بھائی حمید کو محروم الارث بنا کر جائداد کے حاصل کرنے کے لئے باغیوں میں گرفتار کرانا یہ کہانی اور پھر مولانا کی زبانی۔ بنت الوقت بتلائے گی کہ یورپ کی کورانہ تقلید اور نئے تمدن کی اندھا دھند پیروی کس طرح گھروں کو تباہ کرتی ہے "

"سب گراں قدر سب سے قیمتی سب سے افضل ترین ہیں وہ
...ن کے آنسو وہ اشکِ حسرت وہ ماتم کے آنسو
...موں نے مغربی عورت کی مشرقیت کی بربادی پر گرائے
ہیں۔ مشرق کی عورت کیا تھی؟ اس کا دستور العمل کیا تھا؟
...ر کا بیان کتنا تھا۔ سنو مولانا کی کوثر کی دھلی ہوئی زبان
میں دلی کی نکھری اردو میں سنو دورِ گذشتہ کی ایک جھلک
دکھاتے ہیں دیکھو فرماتے ہیں :-

"ہوشیار! مجلس فانی قریب آ گئی دل بھر کے دیکھ لو
چاند مدھم ہوا چاندنی پھیکی پڑی، تارے جھلملا گئے۔
چراغ ٹمٹماتے ہیں رات گذر گئی اور یہ پھول جو ساری
رات مہکے اب مرجھاتے ہیں اُن کی سادگی پر نہ جاؤ اُن کی
باتوں پر نہ ہنسو دنیائے نسواں کی وہ مورتیں جن کے منہ
سے باتوں میں پھول جھڑتے ہیں اور جن کی صورتوں پر
ادائیگیِ فرائض کا مینہ برس رہا ہے ان کے سفید بالوں
میں خلوص کی کنگھی ہے ان کے پاک ہاتھوں میں محبت
کے گلدستے۔ مرغ کی اذان نے ان کو بستر استراحت سے
بیدار کیا رات اُن کی زندگی پر مرجھا گئی ہوئی رخصت
ہوئی اور صبح صادق نے جانماز پہ ان کا استقبال کیا
میرے دوستو ادب سے ہاتھ اٹھا کر ان بزرگ اماں
کے سلام کو جھک جاؤ جنھوں نے شوہروں کے آرام
پر اپنی راحتیں قربان کیں اور اپنے ہاتھ سے پکانا فخر
سمجھا۔ بچوں کو بہتر کھلایا اور اچھے سے اچھا پہنایا بچی
بچائی کمائی اور پرانا اُدھڑا پہنا۔ مگر کام کے وقت اور
ضرورت کے موقع پر جب مایوسی نے کمر ہمت توڑ دی
تو ان نیک لوگ کی بیٹیوں اور شریف بیبیوں نے
اشرفیاں نکال کر آگے رکھ دیں، آسمانی فرشتوں نے
اُن کی خدمات پر آفریں کہی اور بزرگوں کی پاک روحیں
اُن کی زندگی پر فخر کرنے لگیں اُن کی خاموشی اور سنجیدگی
پر نہ جاؤ یہ گھروں کی با اختیار شہزادیاں شوہروں
کی لونڈیاں ہیں۔ یہ طرارہ ہوں ان میں چمک مٹک
نہ سہی مگر ان کی پیشانیاں دیکھو نسوانیت کے جوہر
جگمگا رہے ہیں ترقی اُن کی جہالت پر قربان ہوگی اور
تصنع اُن کی سادگی کی بلائیں لے گا ان کی کتاب حیات
میں بڑے بڑے کارنامے ہیں ان کے باغیچۂ زندگی میں
سدا بہار پھول ہیں ان کی خشکی کی تہ میں ممتاز راز
ہیں یہ یتیموں کی مائیں عزیزوں کی عاشق ہیں۔ یہ
رشتوں کی وارث ہیں یہ خدا کے نام پر قربان ہونے
والی نور کی پتلیاں اور شوہر کی پرستش کرنے والی
خدا کی بندیاں ہیں۔ یہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ نہ ہو
اوپر کی شان شان نہ سہی مگر ان گھروں میں سب
کچھ ہے۔ یہاں زندگی کی بہاریں ہیں جینے کا لطف
اور رہنے کا مزا ہے ان گھروں میں برکت اور گھر
والیوں میں خدا کی رحمت ہے"

شائستہ اختر بانو سہروردی ——— راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

"اگر آپ کو اپنے زمانے اور وقت کی باتیں تلاش
کرنی ہیں۔ تو بنت الوقت دیکھئے جس میں ہماری سوسائٹی
کا صحیح نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ قدیم اور جدید تہذیب کا قدم
قدم پر تصادم ہے۔ ایک ہندوستانی لڑکی جس نے ہندوستان
میں پرورش پائی تہذیب مغربی کی حامل نظر آتی ہے وہ
دھاڑے جلسوں میں گاتی ہے کھلے خزانے گاڑیوں میں
پھرتی ہے۔ خلق خدا کی خدمت کا سودا اس کے سر میں
بھرا ہوا ہے۔ نام و نمود کی ہوس دل میں گھر کئے ہوئے ہے
کنواری لڑکی تن تنہا ہر گھر میں آتی جاتی ہے۔ شادی
ہوتے ہی فرخندہ مسز نعیم ہو جاتی ہے۔ وہی آزادی اور

[illegible] اس کی رگ رگ میں بھرا ہوا ہے۔ شوہر کی خدمت اطاعت اور دل جوئی کی اسے فرصت نہیں ہوتی۔ شوہر بیمار پڑا ہے۔ مگر جلسے کی شرکت ملتوی نہیں کر سکتی۔ کسی انسان کو انسان نہیں سمجھتی خواہ وہ کوئی نوکر ہو یا محلّے والا۔ درحقیقت یہ تمام باتیں تہذیب زدہ لڑکیوں میں روز بروز ترقی پا رہی ہیں۔ مولانا نے مسز نصیر کا بُرا انجام دکھا کر اس بات کی پیش بندی کر دی ہے۔ ایک دن وہ آئے گا کہ جب ہندوستان میں رہ کر ہر تہذیب زدہ لڑکی کو فرخندہ کی حالت سے گزرنا ہوگا۔ اور خون کے آنسو بہانے ہوں گے۔

بعض تنگ نظر حضرات کہہ اٹھیں گے کہ مولانا کا خیال صحیح نہ تھا۔ ہر لڑکی ایسی نہیں ہو سکتی اور نہ ہوتی ہے ان حضرات کے سامنے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ ذرا کسی یونیورسٹی اور کالج کی حالت کو ملاحظہ فرماویں۔ جہاں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو مشترکہ تعلیم دی جاتی ہے۔ مولانا تعلیم کے خلاف ہرگز نہیں ہیں۔ بلکہ وہ قدم قدم پر تعلیم کا سبق دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہماری قوم کی حالت اس وقت درست نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہندوستانی خواتین تعلیم حاصل نہ کریں گی مگر تعلیم کے معنی بے حیائی اختیار کرنا نہیں۔ بلکہ تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ علم و ہنر کے ساتھ ساتھ آداب مجلس و اخلاق اور اپنے فرائض سے آگاہ ہوں۔ وہ تہذیب جدید کے خلاف اس وجہ سے ہیں کہ اس کو حاصل کر کے لڑکیاں اور لڑکے ملک اور قوم کو فائدہ نہیں پہنچاتے بلکہ فرعون بے سامان بن کر ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو حیا سوز و مخرب اخلاق اور وحشیوں کی پامال حرکتوں سے بھی زیادہ بدتر ہوتی ہیں۔ اس کی مثال فرخندہ یا بنت الوقت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے مکالموں کی یہ بھی خوبی ہے کہ وہ کردار کی حیثیت کے مطابق ہوتے ہیں یعنی جس حیثیت کا جو ہوتا ہے ویسی ہی گفتگو کرتا ہے

تہذیب یافتہ مغرب زدہ گھروالی فرخندہ مسز نصیر الدین [illegible] خانساماں کی گفتگو بنت الوقت میں دیکھئے

اویس احمد ادیب ——— ساقی [illegible]

"بنت الوقت میں قدیم و جدید تہذیب کا [illegible] خوش مذاقی کے ساتھ دکھایا گیا ہے اور ایک [illegible] میراثنوں کی نقل بہترین عنوان سے کی گئی ہے [illegible] مرحوم نے اشیاء اور مناظر کی مرقع کشی کی طرح [illegible] کے حلیے بھی خوب ہی بیان کئے ہیں۔ بنت الوقت [illegible] بوڑھے مغل کا حلیہ دیکھئے:-

"سنتے تو بڈھے اور بڈھے بھی پھونس مگر مرزائی [illegible] موجود تھا۔ داڑھی چڑھی ہوئی۔ مونچھیں [illegible] خضاب لگا ہوا۔ کمر پٹا بندھا ہوا۔ اس کینڈے کے انسان اور بگڑے دل آدمی تھے کہ [illegible] چھوڑ کر باوجودیکہ بدن میں رعشہ اور کمر جھک گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں سے بھی دھید جیسے دو کو بہت تھے [illegible] سے خون ٹپک رہا تھا"

پروفیسر علی عباس حسینی ——— عصمت راشد الخیری نمبر [illegible]

"موجودہ معاشرہ کا ایک سطحی اور سستے قسم کا [illegible] پہلو مصلح بننے کی کوشش ہے۔ اس بات کو انہوں نے [illegible] کئی کرداروں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ سراب مغرب میں اکرم اور بنت الوقت میں فرخندہ ایسے ہی کردار ہیں۔ اکرم زبانی جمع خرچ کی ماہر ہے۔ اور سماجی لکچر بگھارتی ہے۔ مگر ادھر کوئی ضرورت مند آیا اور ادھر انہوں نے فرمایا "[illegible] یہ بھکاری ہمارے سماج کا ایک بوجھ ہیں۔ ہم ہمت نہیں کرتے" بنت الوقت کی فرخندہ جاہلوں کو تعلیم دینے کے خبط میں مبتلا ہیں اور عالم یہ ہے کہ میاں بیمار ہے بخار میں مبتلا۔ پلنگ سے لگ گیا ہے بیگم صاحبہ قوم کے درد میں تڑپتی

...ی بکھر رہنے چلی جاتی ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں کہ دوسروں
کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح ضروری ہے۔"

...ادب کی تاریخ بنگالی — مترجم
...ڈاکٹر ہیرندر چندر پال ——— خالدہ فہمی

اِس دفعہ شائع ہوئی ہے ۱۹۸۳ء کے ۹۳
صفحے ہیں۔

۱۷۔ آفتابِ دمشق | ماہِ عجم کے بعد یہ دوسرا تاریخی ناول ہے اور یہ بھی ۱۹۱۸ء ہی کی

تصنیف ہے۔ کوچہ چیلان میں جو گلی مسجد کالے خاں ہے اُس میں رازق کے مکان کے باہر کے کمرے میں ۱۹۱۸ء کی سب ... تحریر کی گئی تھیں۔ ایک بڑی آرام کرسی بچھی ہوتی تھی۔ اس کے ہتھے پر کاغذ رکھ کر تحریر فرماتے اور تھک جاتے تو اسی آرام کرسی پر کچھ دیر کمر ٹکا لیتے تھے۔

ماہِ عجم میں خلیفۂ دوم کے زمانہ کی لڑائیاں فتح ایران کی دکھائی ہیں اور آفتابِ دمشق میں خلیفہ اوّل کے عہد کی لڑائیاں تسخیر شام کی ہیں۔ ہلال و صلیب کے مقابلے کے واقعات بہت دلچسپ ہیں۔ اور ماہِ عجم کی طرح اس میں بھی ایک افسانہ حُسن و عشق کا ہے اور نہایت جگر دوز اور دردناک۔

"مولانا نے اپنے ناولوں کی زبان اپنے موضوع کے مطابق استعمال کی ہے۔ تاریخی ناولوں میں بھی زبان دہلی ہی کی لکھی گئی ہے۔ مگر وہ بیگماتی زبان یا دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں ادبی شان پیدا ہو گئی ہے۔"

اویس احمد ادیب ——— ساقی راشد الخیری نمبر

آفتابِ دمشق کے حقوق سب سے پہلے مرحوم ظہور الدین صاحب منیجر مخزن لاہور نے حاصل کئے تھے اُن کی رحلت کے بعد کئی سال تک ناول شائع نہ ہو سکا۔ ان سے سیّد مبارک علی شاہ صاحب گیلانی نے حقوق حاصل کئے مگر اُنہوں نے جو آخری اڈیشن شائع کیا تھا اُس میں اپنی طرف سے مولانا شرر کے ایک ناول کے کچھ حصہ کا اضافہ کر دیا تھا اور ناول کی آخری سطروں میں بھی کچھ ترمیم کر دی تھی۔ جب اس کے حقوق واپس لئے تو جو ترمیم اُنہوں نے کی تھی وہ نکال دی۔ گجراتی زبان میں آفتابِ دمشق کے کئی ترجمے شائع ہوئے ۱۹۳۵ء میں اس کا گجراتی ترجمہ نوساری کے ایک صاحب نے حضرت مصنف کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ آفتابِ دمشق دس دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ ۴/۵ سال سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان ادیب فاضل کے کورس میں ہے ۱۹۸۴ء کے ۱۷۰ صفحے ہیں۔

۱۸۔ محبوبۂ خداوند | ۱۹۱۹ء میں بھیا احسان الحق مرحوم اڈیٹر اسوۂ حسنہ و دین و دنیا

میرٹھ کی فرمائش پر یہ تیسرا تاریخی ناول تحریر کیا گیا تھا۔ بھیا احسان الحق وہی بزرگ تھے جنہوں نے مصنف کے نام کے ساتھ علامہ سے پہلے "مصورِ غم" لکھا تھا۔ بھیا احسان مرحوم نے کچھ مدت بعد کتابوں کی اشاعت کا کام بند کر دیا تو محبوبۂ خداوند کا دوسرا اڈیشن کئی سال تک نہیں چھپا۔ جب اُنہوں نے کتابوں رسالوں کی اشاعت کی ذمہ داری جناب انوار ہاشمی اور جناب شوکت فہمی کے سپرد کی تو محبوبۂ خداوند کے اُنہوں نے دو اڈیشن شائع کئے۔ پھر ہم نے اُن سے حقوقِ اشاعت واپس لے لئے۔

"یہ عہدِ عثمانی کا تاریخی ناول ہے جس میں قرونِ اولیٰ کے پاک باز اور نیک نفس مسلمانوں کی جانبازیوں کی تصویر دکھائی ہے۔ طرابلس کا مصنوعی مقدس خداوند

کا رقیب ہے شمالی افریقہ کی حسینہ سفیرہ کو قابو میں کرنے کے لئے انتہائی جد و جہد سے کام لیتا ہے۔ طرابلس کا سی گوری حاکم بھی سفیرہ کا دیوانہ ہو کر اسے اپنا بنانا چاہتا ہے مگر یہ سچائی کی پرستار اور اخلاق و مروت کی پتلی دولت حشمت اور جان و مال پر لات مار کر اسلام کی لونڈی اور ایک غریب مسلمان قیدی کی سیرت کی پرستار بن جاتی ہے۔ مسلمان عیسائیوں پر حملہ کرتے ہیں۔ طرابلس کا فرعون ثانی اور اس کی فوج مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ہزار جتن کرتے ہیں مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے آخر مسلمان طرابلس کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ اور سفیرہ کا نکاح اس مسلمان قیدی سے ہو جاتا ہے۔

یہ جواب ہے اُن گمراہ مبصرین کے اعتراض کا جو کہتے ہیں کہ مولانا راشد الخیری صرف حزنیہ افسانے لکھتے ہیں۔ منظر نگاری پر مولانا نے جہاں قلم اُٹھایا ہے کمال کر دیا ہے نہایت مختصر الفاظ میں مناظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم اسے نہ صرف اپنے تصور میں دیکھنے لگتے بلکہ محسوس بھی کرنے لگتے ہیں۔ محبوبۂ خداوند میں صحرائے افریقہ کی قیامت خیز گرمی کا نقشہ اس قدر صحیح اور عُمدہ کھینچا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے:۔

"صبح کا نکلا ہوا آفتاب نصف منزل طے کرنے کے بعد منزل مقصود کی طرف ڈھلنا شروع ہو چکا تھا قیامت خیز گرمی نے ہر جاندار کی جان پر بنا دی تھی۔ شجر حجر۔ گھاس پھوس۔ کائنات کی ہر شے آگ میں جُھلس رہی تھی۔۔۔۔ زمین آگ اُگل رہی تھی آسمان انگارے برسا رہا تھا"

سید محمود مورخ بی اے ——— عصمت اگست ۱۹۳۶ء (?)

نو دفعہ چھپی ہے [illegible] کے ۱۴۴ صفحے ہیں۔

۱۹ - جوہر قدامت

۱۹۱۰ء (?) میں دو مہینہ میں لکھی گئی اور تین قسطوں میں [illegible]

بہاؤ الدین گجرات پنجاب ملک محمد دین صاحب اڈیٹر صوفی کو بھیجی گئی تھی۔ جب مینے اس کے حقوق اشاعت واپس لے لئے تو جنوری ۱۹۳۳ء (?) میں حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے نظر ثانی فرمائی اور تینوں ابواب میں معمولی سی کمی بیشی کی اور اُسی سال اس کا پانچواں اڈیشن شائع ہوا۔ جوہر قدامت مصور غم کے ضخیم اصلاحی ناولوں میں سے ہے اور تقسیم ہند سے قبل مدراس وغیرہ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل تھی۔

جوہر قدامت میں مفصل زندگی دکھائی ہے۔ دو حقیقی بہنوں کی جن میں ایک زاہدہ قدامت کی دلدادہ ہے اور دُوسری شاہدہ جدت پرست ہے۔

جوہر قدامت کے مرکزی خیال کو سامنے رکھ کر کئی فلمیں بنائی گئیں مگر جوہر قدامت کی دلآویزی اور تاثر کو نہ پہنچ سکیں۔

" جوہر قدامت میں بہن کے کرتہ ٹوپی لانے اور بھاوج کے دُودھ پلانے کی رسم کی حمایت میں ساجدہ کی زبانی کتنی پُرزور تقریر فرمائی ہے کہ اس رسم کا اصل فلسفہ ذہن نشین ہو جاتا ہے اور بزرگوں کی اس رسم میں جو مصلحتیں تھیں وہ اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

اسی طرح ہر کتاب اور ہر موقع پر مولانا مرحوم نے مغربی تہذیب پر مٹی ہوئی اور غیروں کا کلمہ پڑھنے والی بدنصیب قوم کو بتایا ہے کہ اس کی اپنی تہذیب بھی کچھ ایسی گئی گذری اور اس کی تمام رسوم ایسی لغو بے معنی اور فضول نہ تھیں۔ تہذیب مشرقی میں کتنی روحانیت ہے مشرقی فطرت کتنی درد آشنا مشرقی نقطہ نگاہ کتنا لکھنو [illegible]

اس کو ہماری مغرب زدہ قوم پر کس خوبی اور کمال کے ساتھ
سمجھایا اور کس طریقے سے مشرق کے معیارِ اخلاق، فلسفہ
...ب کا مغربی زیادہ بلند و قیمتی ہونا ثابت کیا ہے۔ مشرق کا قانون
...لاق خوفِ خدا اور خدمتِ خلق پر مبنی ہے۔ مشرق کی فطرت میں
...گداز ہے اپنے پرائے کا درد ہے۔ مشرق کے بسنے والے
غریبوں کی آہ سے ڈرتے ہیں اور محتاجوں کی دل آزاری کا نپ
اٹھتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ

خریدا کر ملیں جتنی دعائیں ناتوانوں کی

مولانا کی کوئی سی کتاب اٹھائیے اس میں مشرق کی
اس قابلِ تقلید اور لائقِ تحسین معاشرت کی خوبیاں
سمجھائی گئی ہیں اور اتنے پرزور الفاظ میں کہ دل میں
اتر جائیں اور جی میں گھر کریں قدامت کے کیا کیا جوہر
تھے۔ وہ "جوہرِ قدامت" پڑھ کر آپ دیکھیں جس کے
ہر صفحہ پر اس تہذیب کا جو ہماری بدقسمتی سے مٹ گئی
اور اس تمدن کا جو کہ اجڑ گیا اس نہال کا جو کہ آنکھوں سے
اوجھل ہو گیا ایسی تصویریں ملیں گی جو دل کو تڑپا دیں گی
جو آنکھوں کو رلوا دیں گی اور جن کو پڑھ کر ہر دل دفعتاً
اور ہر دل بیدار ہو جائے گا۔ مشرق کی تہذیب کی
یہ ایک تصویر ہے۔ جس وضع کو ترک کر دیا ذرا اس کی
شان ملاحظہ ہو :-

امیر بیگم اپنے کوٹھے سے غریب ہمسائی کی مصیبت
کا حال دیکھتی ہے اور فوراً وہاں جانے کے لئے تیار
ہوتی ہے۔ میاں بیوی کی گفتگو مشرقی و مغربی تہذیب
کا آئینہ ہے۔

"بیوی۔ میں ذرا آنٹہ گھر سے تک جانا چاہتی ہوں
ہو آؤں؟

میاں۔ کیوں خیریت وہاں جانے کی کیا ضرورت ہوئی

بیوی۔ نیم والی بڑھی بی کے یہاں جاؤں گی۔
میاں۔ وہ فقیرنی ٹکڑ گدی مغرور اتنی کہ بھوکی
رہے اور یہاں آ کر بھاگے تک نہیں۔ وہاں تمہارا
جانا ہرگز تمہاری شان کے لائق نہیں"

مشرقی بیگم کس ادب سے غریب پڑوسن کے یہاں
جاتی ہے کس عجز سے اس کی اعانت و امداد کرتی ہے کتنا
فرق ہے۔ کتنی مدعائیت ہے مشرق کے اس طریقہ
خیرات میں اور مغرب کے اس رویہ میں کہ فقیروں کی
صورت دیکھی تو دل جل گیا۔ لنگڑے لولے سامنے
آئے تو گھن آنے لگی۔ خیرات کہو زکوٰۃ کہو تو دعوتوں کا نزول
اور جلسوں میں چندے دینا ہے۔ ماناکہ کمیٹیوں کے
ذریعے اور اسکولوں کی معرفت غریبوں ہی کی اصلاح
ہوتی ہے۔ لیکن ان میں چندہ دینا اور بات ہے اور
محلہ کے غریبوں اور بے مانگنے والے محتاجوں کی خود جا کر
مدد کرنا اور بات ہے۔ آج کتنی عورتیں ہیں جو ایک محتاج عورت
کے گھر جائیں گی اس کی ہمدردی کریں گی۔ اس کے دکھ درد
کو سنیں گی۔ آج کل تو سب کا وہ خیال ہے جس کا اظہار
ساجدہ کے شوہر نے کیا کہ غریب کا فرض ہے کہ امیر کی
چوکھٹ پر جبیں فرسائی کرے۔ غریبوں کی عزت مشرقی
تہذیب میں ہے۔ مغربی تہذیب میں نہیں۔ مشرق کی
خدا پرستی اور خوفِ خدا کے مقابلے میں مغرب کی یاد دوسرے
لفظوں میں آج کل کے لوگوں کی سنگ دلی و خود غرضی
و بے دردی کے نمونے بھی مولانا نے جگہ جگہ دئے ہیں۔
تاکہ لعلوں کے مقابلے میں ان ٹھیکروں کی قیمت معلوم ہو جائے
"جوہرِ قدامت" ہی میں شاہدہ کا سلوک زینتا
کے ساتھ اور آگے چل کر ان کا سنگ دلانہ برتاؤ اس کے
بچہ کی اتالیقی کے ساتھ صرف نمونے ہیں اس رویہ کی مثال

رہے ہیں جب ان کی موت ضروری ہوتی ہے وہ اپنے
کردار کا گلا زبردستی نہیں گھونٹتے۔ وہ فن سے کبھی
بھی بے تکا زور اختیار نہیں کرتے۔ فن سے مطابقت
رکھتے ہوئے جہاں وہ اپنے کرداروں کو مارتے ہیں وہاں
وہ اپنے کرداروں کو بستر مرگ سے بھی واپس کھینچ لاتے ہیں
جوہر قدامت میں احسان کا زندہ رہنا مثال کے طور پر پیش
کیا جا سکتا ہے۔ مجتبیٰ صاحب غور کریں تو غالباً اس حقیقت
کو سمجھ لیں گے اور اعتراف کریں گے کہ ہماری سماجی زندگی
کی خرابیاں مصور غم کے المناک ناولوں کا پس منظر تیار
کرتی ہیں۔ وہ حزن نگاری کے دوسرے لوازم بھی سمجھتے
ہیں اور اکثر "شوہر کے طلاق گھریلو زندگی کی تلخیوں غربت
و افلاس وغیرہ سے ایسی غمناک فضا تیار کرتے ہیں جہاں
ہماری سانس گھٹنے لگتی ہے۔ راشد الخیری مصور غم ہیں
ان کا غم پائندہ گہرا اور ہمہ گیر ہے۔ جوہر قدامت، شام
زندگی، شب زندگی وغیرہ ان کے وہ آنسو ہیں جو ہمارے
ادب میں ہمیشہ موتی کی طرح چمکتے رہیں گے"

حیرا ثاقب کان پوری ——— عصمت فروری ۳۶ء

"جوہر قدامت میں دو بہنوں کے کردار کے تضاد
کو راشد الخیری نے نہایت سلیقہ سے ابھارا ہے۔
جس کے اسباب تعلیم اور ماحول میں مضمر ہیں۔ زاہدہ
اپنی ماں کی دین داری اور پرانی مشرقی قدروں کی نمائندہ
ہے۔ شاہدہ اپنے باپ کی مغربیت اور جدید عناصر کی
ترجمان ہے۔ زاہدہ میں کردار کی عظمت ہے۔ مگر زندگی
کے جدید رجحانات اور مغربی فیشن سے دوری کی وجہ سے
اس کی شادی غریب گھرانے میں ہوئی۔ لیکن اپنی عظمت
صبر اور شیرینی کی وجہ سے زاہدہ نے گھر کا نقشہ بدل دیا
شاہدہ جدت اور ترقی پسند تھی۔ وہ کردار کی عظمت
کی امین نہ تھی۔ اس میں چمک دمک تھی اور بڑے گھر
میں اس کی شادی ہوئی جہاں وہ سال ٹھاٹ سے گزرے
مگر اپنی خود غرضی، درد مندی کی کمی اور بے صبری کی وجہ سے
وہ خوش نہ رہی اور نہ دوسروں کو خوش رکھ سکی۔ جب تک
دولت کی ریل پیل رہی زندگی ایک گنگناتا گاتا چشمہ تھی
لیکن غربت زندگی کے بھیانک مسائل لے کر آئی اور
شاہدہ مقابلہ نہ کر سکی۔ اور اپنے شوہر حسن کو چھوڑ کر
چلی گئی۔ وہ دولت کے سراب کے پیچھے دوڑتی رہی اور
تشنہ کام رہی۔ اپنی تشنگی اور زہرناکی سے اس نے دوسروں
کی زندگی کو بھی مردہ بنا دیا ۔۔۔ بیگم اکرام اللہ نے ٹھیک
لکھا ہے کہ شاہدہ راشد الخیری کا سب سے فطری
اور کامیاب کردار ہے"

بنگال میں اردو ادب کی تاریخ — مترجمہ
از ڈاکٹر ہیرندر چندر پال ——— خالدہ لبنیٰ

جوہر قدامت کے ۲۰۰ صفحے ۱۸×۲۲ کے ہیں
اور ۸ دفعہ شائع ہوئی ہے۔

۲۰۔ عروس کربلا | مصور غم کا چوتھا تاریخی ناول ہے اور ۱۹۱۰ء کی تصنیف ہے ۱۹۳۳ء
میں جب بیٹے اس کے حقوق اشاعت واپس لے لئے
تو اس پر نظر ثانی فرمائی اور کہیں کہیں لفظی ترمیم بھی کی
تھی۔ یہ بھی مدارس وغیرہ کی یونیورسٹیوں کے نصاب
میں داخل تھی۔

تاریخی ناولوں کی ترتیب اس طرح ہے کہ ایک
باب میں مستند تاریخی واقعات ہیں دوسرے باب میں
اس زمانہ کا افسانہ حسن و عشق پھر تیسرے باب میں تاریخ
تو چوتھے باب میں افسانہ اس طرح ناول اختتام کو
پہنچتا ہے۔

" تاریخ اسلام کے متعلق یہ مولانا کا بہت مشہور ناول ہے۔ گرچہ یاسمین شام اور عروس کربلا کی طرح اس کا انجام بھی شادمانی اور مسرت پر ہوتا ہے۔ لیکن دردو اثر کے لحاظ سے یہ مولانا کے تمام تاریخی ناولوں میں ممتاز ہے۔ مولانا کے اس ناول کی مقبولیت کو دیکھ کر کئی صاحبوں نے اس طرز پر ناول لکھے مگر عروس کربلا کے سامنے سب ہیچ ہیں۔ مولانا نے مصر کے عیسائی مصنف جرجی زیدان کے ان حملوں کا بھی جو اس نے دبی زبان سے اسلام پر کئے بڑی قابلیت سے عروس کربلا میں جواب دیا ہے۔ جرجی زیدان کے ناول پلاٹ کی دلچسپی۔ اور بیان کے تسلسل کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے ہیں مگر علامہ راشد الخیری کا یہ ناول بیان کی دلآویزی اور پلاٹ کی دلچسپی کے اعتبار سے بھی جرجی زیدان کے ان ناولوں پر فوقیت رکھتا ہے جو تاریخ اسلام کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ اسلامی تاریخ اس ناول میں حضرت علی شیر خدا کی شہادت سے شروع ہوتی ہے اور حادثہ کربلا کے بعد تک کے حالات غم و الم سے لبریز ہیں اور اس قدر دردانگیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں کہ ہر واقعہ دل کے پار ہو کر ذہن نشین ہو جاتا ہے جو قصہ تاریخی واقعات کے ساتھ عروس کربلا میں تصنیف کیا گیا ہے وہ حد درجہ دلآویز ہے۔ اس کی ہیروئن کلثوم کا کیرکٹر بعض اعتبار سے سفیرہ اور بلقیس سے بھی بڑھ گیا ہے "

سید محمود مورخ بی اے ـــــــ عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

• علامہ مرحوم کی انشا پردازی کے محاسن میں آپ کا زور بیان خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ آپ کی تصانیف میں خطیبانہ انداز بالعموم پایا جاتا ہے خاص کر جب آپ کسی کردار کی زبانی کوئی تقریر قلمبند کرتے ہیں تو اس کے لعد کی انتہا نہیں رہتی۔ ذیل میں اوراق سے اسی قبیل کی ایک تقریر ایک راسخ العقیدہ خاتون کی زبانی نقل کی جاتی ہے۔

موقع وہ ہے جب مس روز اکلشو... مفروضہ عیسائی والدین ترک مذہب نہ کرنے پر طرح طرح کی عقوبتیں دے کر ایک برسیدہ اور پرانے برج میں بند کرتے ہیں۔

" میں جس طرح پہلے فرماں بردار تھی اسی طرح اب بھی ہوں اور جس طرح آج ہوں مدۃ العمر رہوں گی۔ صداقت ایک جوہر ہے جس کے سامنے دنیا کا ہر دکھ سکھ ... ہر معصیت راحت ہے۔ اگر یہ نیند واقعی مجھ سے چھینی گئی ہے تو یہاں بھی میرا ایمان مجھے تسکین دے گا جس پر راحت کیا سلطنت بھی قربان ہے۔ یہ مصیبت میرے لئے باعث فخر ہو گی۔ اور یہ اذیت موجب عشرت، برج کا اندھیرا فضول۔ اژدھوں کی پھنکار لغو۔ سانپوں کا اندیشہ بیکار۔ اور تنہائی کا خوف پوچ میرے ساتھ ایمان کی وہ شمع۔ اطمینان کی سپر اور خلوص کے ہتھیار رہیں گے اور میرا ایمان ہے کہ میں یہاں کے ہر دشمن پر غالب آؤں گی۔ راستی کے قدم کو دنیا کی کوئی طاقت ڈگمگا نہیں سکتی۔ خلوص کے سا... کو زندگی کا کوئی طوفان بند نہیں کر سکتا۔ میں نے جو کچھ کہا وہ اٹل اور جو کہتی ہوں وہ پہاڑ۔ آپ قید کیجئے مغرور سے۔ مار ڈالئے خوشی سے۔ لیکن یہ توقع نہ رکھئے کہ آبائی مذہب چھوڑ کر آپ کا طریقہ اختیار کروں میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر کبھی میری زبان میرے ساتھ میرے پاؤں میرے قول میرے فعل سے آپکے کان

کو نسیمہ کی پاک رُوح جس وقت تن سے علیحدہ ہوتو نسیم
جس کی صورت کو ترستی اور آواز کو پھڑکتی ماں دنیا سے
رخصت ہوئی ہے کیوں سے چھٹ جائے"

"قصر نسیمہ میں داخل ہوتے ہی پاک رُوح نے ان
لاتعداد رُوحوں کا مطالعہ کیا جو اپنے اعمال کی سزا
بھگت اور افعال کا انعام پا رہی تھیں .... کامیاب
رُوحوں کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو رہا تھا کہ
ایک کونے سے رونے کی آواز آئی"

اس عورت کی مفصل داستانِ حیات سُننے کے
بعد دوزخ میں ایک عورت کو ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس کی
کہانی بھی کچھ کم سبق آموز نہیں اس کے بعد ایک ایسی
عورت سے ملی جس کے اعمال نسیمہ سے بھی بہتر تھے۔ یہ
افسانے تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ نسیمہ کے اس
مطالعہ کے ساتھ ساتھ اُس کی بہو وسیم وَدلھن کے واقعات
ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی بہو جسے ہزار برس
کی نیو سمجھ کر لایا جاتا ہے اگر جاہل خود سر ضدی بدفطرت
ہو تو کس طرح خاندان کی عزت خاک میں ملتی اور باپ
دادا کی ناک کٹتی ہے۔ اصلاحِ نسواں کے سلسلہ میں
یہ واقعات کتنے ہی دلآویز کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں
بے حد نتیجہ خیز اور بڑے ہی مؤثر ہیں۔

"نسیمہ کے جسم و رُوح پر جو کچھ گذری اس کا اصل
حال تو اللہ جانے یا اُس کے فرشتے باقی شاعر کی طرح
افسانہ نگار کو بھی کبھی کبھی الہامِ ربانی ہوتا رہتا ہے اور
عجب نہیں کہ ایک مومنہ کی وفات کی منظر نگاری کے
وقت مومن راشد پر بھی الہامی لمحوں کی بارش
ہو رہی ہو"

"نسیمہ پر جس وقت مرض الموت کی بے ہوشی طاری
ہوئی اور دماغ نے یاد وسیم کے سوا تمام تعلقات کو
خیرباد کہا اور خیال کی تمام قوتیں اس لال کی طرف
ڈھل گئیں جس کی تصویر کھاتے پیتے آٹھوں پہر دن
اور رات آنکھ کے سامنے رہتی تو کانوں نے شوہر کے
آخری الفاظ سُنے اور زبان نے یہ جواب دے کر کہ میرے
لال کی رُوح میرے استقبال کو آئی" جس نیکی
کے واسطے کو جو بالآخر فنا ہونے والا تھا ختم کر دیا۔
ایک حُور سامنے آئی اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور رضائے
کا ایک بے بہا جھومر اس کے ماتھے پر لگا الٹے قدموں
پلٹ گئی۔ اب فرشتہ موت جگمگاتی رُوح کو لے کر دوسرے
مقام پر پہنچا یہاں حُوروں کی صفیں قطار در قطار
استقبال کو موجود تھیں ..... ایک ممتاز حُور سامنے
آئی اور سر سے پاؤں تک ہیرے اور جواہرات کے زیور
پہنانے شروع کئے۔ وہ پہناتے وقت آواز بلند کہتی
تھی کہ یہ جڑاؤ گلوبند شوہر کی رضامندی کا صلہ ہے
اور ہیرے کے کنگن اس لئے ان ہاتھوں میں پہنائے
جاتے ہیں کہ یہ اپنے جسم سے زیادہ مخلوق کے کام آئے
والدین کی فرماں برداری اور بزرگوں کی تعظیم کا انعام
یہ موتیوں کی مالا ہے" (شب زندگی حصہ اول ۲۲ تا ۳۴)

"نسیمہ کے پیکر خیال پر جو نوازشیں ہوئیں انہیں
مصور غم کی نگاہ کشفی نے دیکھ لیا لیکن خود اس
مبصر الم کی جو کچھ سرفرازیاں اس دربار میں ہو رہی ہوں گی
جہاں نہ کسی کی مخالفانہ تنقید کا اثر پہنچ سکتا ہے اور نہ
کسی کی معاندانہ تنقیص کا ان کا احاطہ کس بندۂ خاکی
کا تصور۔ کس بشر کا تخیل کر سکتا ہے"؟

مولانا عبدالماجد دریابادی ——— (عصمت فروری ۱۹۳۹ء)

"ان چند اشارات میں علامہ کے مختلف رنگوں

...جا نگر کرنے کے لئے اقتباسات پیش نہیں کئے جا سکتے۔
...ب ایک اقتباس اس یقین کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے
...س میں مولانا کے فن کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔
...ر کی ترجمانی، دُکھ کی تصویر۔ عورت کے جذبات جنا میں
...ھلی ہوئی صاف سلیس اور سادہ زبان اور ان سب کا
...ہنر اور ان کے طرزِ ادا کی پاکیزگی۔ شبِ زندگی حصہ اوّل میں
...یک نوجوان ماں اپنے بچے کو رو رہی ہے۔

"پھر بی جان کیا کروں۔ انسان ہوں۔ اتنا سا جان
...بسا دی ہے۔ کرتی کچھ ہوں ہوتا کچھ ہے۔ کہتی کچھ
ہوں نکلتا کچھ ہے۔ صبر کی کوشش جہاں تک ممکن ہے
کرتی ہوں۔ مگر دل نے پریشان کر دیا۔ تین برس کی
جان بچہ نہیں چھلاوہ تھا۔ میری صورت کا عاشق تھا
نام کا دیوانہ مرتے مرتے میری گردن سے ہاتھ نہ نکالے
جانتی ہوں کہ آرزوئے موت جائز نہیں مگر کہتی ہوں کہ
نسیم جیسا لال جنگل میں جا سوئے اور ماں زندہ رہے
بھلاتی ہوں نہیں بھولتا۔ کس طرح بھولوں۔ ننھی سی
جوتی۔ ڈلا سی ٹوپی۔ اتنی سی لکڑی۔ یہ چیزیں رہ
گئیں اور چیزوں والا نہ رہا۔ گھر کا کونہ کونہ اس کی
یاد اور خیال زندہ کر رہا ہے۔ کہتی ہوں ادھر سے نکلا
ادھر سے آواز آئی۔ آئے گا۔ چھپے گا۔ روئے گا۔
مچلے گا۔ اندر جاتی ہوں باہر آتی ہوں مگر وہ صورت
نظر نہیں آتی"

احمد ندیم قاسمی ــــ روزنامہ امروز ۳ فروری ۱۹۵۲ء

"میری ایک عزیز دوست نے جو عمر میں مجھ سے
کئی سال بڑی تھیں مجھے لکھا کہ میری ازدواجی زندگی ان
دنوں بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ ساس نندوں سے
اختلافات کا خطرناک نتیجہ برآمد ہوا ہے اور شوہر صاحب بھی
برہم ہو رہے ہیں۔ کئی کئی روز گذر جاتے ہیں مجھ سے بات
بھی نہیں کرتے۔ . . . . معاملات اس درجہ نازک ہو چکے
ہیں کہ میں بالکل بے دست و پا ہو رہی ہوں۔
خط پڑھنے کے بعد میں متفکر ہو گئی۔ کوئی بات
میرے ذہن میں نہ آتی تھی۔ سوچتے سوچتے بہترین طریقہ
یہی نظر آیا کہ شبِ زندگی شامِ زندگی ان کو بھجوا دیں۔
. . . . تیسرے مہینے ان کا خط آیا۔ بہت خوش میری بیحد
مداح لکھا تھا۔

"ان کتابوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے
بہترین راستہ اپنے لئے منتخب کر لیا اور اس شمع ہدایت
کی رہبری نے میرے ظلمات کو پھر منور کر دیا ہے۔ میں نے
اپنے تمام معاملات درست کر لئے ہیں۔ ساری گتھیاں سلجھ
گئی ہیں۔ میں نے اپنی غلطیاں خود پکڑ لیں۔ اپنا چھوٹا آپ
گرفتار کر لیا۔ تمہاری بہت احسان مند ہوں اور ان
کتابوں کے مصنف کے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔
خدا نے پھر اپنی رحمت نازل کر دی"

انیس فاطمہ بنت مبوق مرحوم
مصنفہ چار رُخ ــــ بنات ستمبر ۱۹۶۰ء

۲۲ - نوحۂ زندگی | جون ۱۹۱۹ء میں دو ہفتہ میں لکھی گئی تھی اور اگست ۱۹۱۹ء میں
پہلی مرتبہ اور مصنف کے سامنے ۸ مرتبہ شائع ہوئی۔ جسے
۱۹۳۵ء میں شائع کی تو مصنف نے نظر ثانی فرمانے کے
علاوہ دیباچہ کا جدید اضافہ کیا تھا۔ علامہ مغفور کے
لڑکپن کے بے تکلف دوست قاری سرفراز حسین صاحب
عزمی مرحوم مصنف شاہد رعنا۔ مبلغ اسلام کے خلف
اکبر قاری محمد عباس حسین صاحب کی فرمائش پر جن کو رسالہ
تمدن ۱۹۱۰ء میں دے دیا تھا یہ ناول لکھا گیا تھا نوحۂ زندگی

شام زندگی شب زندگی کے سلسلہ کی یہ کتاب نہیں ہے۔ مگر ان کتابوں کی مقبولیت دیکھ کر بہت سے مصنفین نے اپنی کتابوں کے نام زندگی پر رکھے۔ چنانچہ "ضیا باؤ" کے تین ناولٹ انجام زندگی۔ سراب زندگی۔ فریب زندگی اسی زمانہ میں شائع ہوئے۔ اور حضرت سیماب کے ناول آفتاب زندگی۔ شباب زندگی بھی۔ اور کچھ مدت بعد دلّی ہی سے افسانوں کے مجموعے "طوفانِ زندگی" عروجِ زندگی وغیرہ شائع ہوئے۔ قاری صاحب نے بھی اصرار کیا کہ کتاب کا نام زندگی پر بھی ہو۔ یہ ناول ایک طرح واقعی زندگی کا نوحہ کتاب ختم ہونے سے پہلے ہے اس سے قبل بیوہ کے نکاح ثانی پر مصنف کے خسر شاہ مولوی عبدالرحیم صاحب نے رانڈوں کی شادی اور مصنف کے پھوپا ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے "ایامیٰ" لکھی تھی۔ زمانہ کانپور اور نقیب بدایوں اس زمانہ میں اُردو کے موقر رسالے تھے اور ان کے ایڈیٹر علامہ مغفور سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ ان پرچوں کے لئے کوئی مضمون لکھیں۔ وہ پرچے میں نہیں لکھتے تھے اس لئے ان رسالوں کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ نوحۂ زندگی اور ایک اور تصنیف جس کا نام ذہن میں نہیں ریویو کی غرض سے ناشرین نے ان رسالوں کو بھیجی تو دونوں کتابوں پر کچھ اعتراض بھی کئے گئے تھے۔ اُن دنوں میں مرادآباد سے رسالہ دلکش یا تصویر شائع ہوتا تھا اور کسی صاحب نے اس میں مضمون لکھا تھا کہ ہمارے ناقدین اُدب بہت غیر ذمہ دارانہ تبصرے کرتے ہیں اس مضمون میں نوحۂ زندگی اور دُوسری تصنیف پر جو اعتراضات تھے انہیں نہایت مہمل اور بے حقیقت بتایا گیا تھا۔

"مصورِ غم نے سوسائٹی کے لرزہ خیز مظالم اور کمزوریوں کو نہایت مؤثر انداز میں دل نشین کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کے دل و دماغ کو عورت کی طرفداری کے لئے وقف کر دیا تھا بیوہ عورت کی جو دُرگت ہمارے سماج نے کر رکھی ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں۔ مجال ہے کہ وہ ناشدنی کسی کو اپنی شکل بھی دکھا سکے یا کسی مبارک اور سعید تقریب میں اس کا سایہ بھی پڑ جائے۔ مصورِ غم بیوہ عورت کی کس مپرسی اور زبوں حالی پر ایسے دھاڑیں مار مار کر روئے کہ اچھے اچھوں کے دل دہلا دئے۔ نوحۂ زندگی میں بدنصیب بیوہ کی حالتِ زار پر اس طرح نوحہ خواں ہیں :-

"پہنے دو مہینے کی بیاہیاں دُنیا کی راحت و نعمت کو ترستی بھرکتی بڑھیاں ہوگئیں۔ لیکن ان کا دل نہ پسیجا۔ زخم پر کچوکے دیتے تھے کہ پہننا اوڑھنا۔ سرمہ کاجل۔ مہندی مسّی۔ ہر چیز حرام تھی۔ ایسی کا شد ضرورت ہو اور سر چکٹنے لگے تو دُھوئی کی کا تیل وہ بھی چپکے سے ڈال کر گوندھ لو۔ ورنہ بُرے حال بدتر احوال ماماؤں لونڈیوں کی طرح میلے چکٹ کپڑے۔ ہاتھ ہیکڑا نہ پاؤں پیکڑا۔ زندگی کے دن پورے کرو"

آمنہ نازلی ——— روزنامہ انجام کراچی ۴ فروری ۱۹۵۵ء

" موت ایک دفعہ آتی اور جان ایک روز جانی ہے لیکن خوش نصیب ہے وہ عورت جو شوہر کی آنکھوں کے سامنے زندگی کو رخصت اور دُنیا کو وداع کرے۔ میرا اصرار ماں کی محبت اور میری شفقت کا اظہار تھا ورنہ میں جانتا ہوں۔ مجھے علم ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ سسرال کے پتھر میکہ کے پھولوں سے، شوہر کی نفرت باپ کے پیار سے اور اپنے گھر کے چنے ماں کے گھر کے قورمے سے ہزار درجہ افضل اور بہترین ہیں گو زندگی خدا باپ کا ہے بیاہی ہوئی بیٹی کے تمام شوہر صاحب

دوسرا نکاح کر چکے ہیں، اور یہ حقیقت دل و دماغ کے سخت
عذاب اور جسم کے شدید آزار میں مبتلا ہے۔ اپنے کو بھی
کی قسمت پھوٹ جانے کی اطلاع پہنچتی ہے۔ اور لخت جگر
ہے۔ اور اپنے دل کے ٹکڑوں کو غم کے خون میں یوں دفن
نہیں کرتا ہے۔

"ہم تو آج کیا اس دن سے تم کو رو چکے جب تم ہمارے
گھر سے رخصت ہو کر سسرال گئیں۔ تقدیر اچھی ہوتی
تو خوش رہتیں، آباد رہتیں، مقدر درست نہ تھا۔
پھولوں بھری سیج کانٹوں سے اور موتی بھرا تھال
کنکروں سے پٹ گیا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ سوچنا
یہ ہے کہ اب کیا کرتیں، زندگی بھلی یا بُری جیسی گذرنی تھی گزر
گئی۔ اب موت ایک اور زندگی شروع کرے گی۔
ضرورت ہے کہ وہ زندگی خوش گوار ہو۔ اور وہ شوہر
جس کی دلہن بننے والی ہو۔ اور جس کی سیج جنگل بیابان
کی قبر ہوگی تم سے خوش رہے۔ سسرال کے لوگ
فرشتے اور حوریں، تمہاری ہستی سر آنکھوں پر رکھیں
اور تم آئندہ نسلوں کے واسطے ایسا سبق چھوڑے
جاؤ کہ دنیا تمہارے نام پر فخر کرے اور بیویاں تمہارے
قدموں کی خاک کا سُرمہ بنائیں ..... آزمائش کا
موقع اور امتحان کا وقت یہی ہے۔ سینے پر آرے
کلیجہ پر چھُریاں اور زخموں پر تیر چلیں۔ مگر زہر کا ہر
گھونٹ شہد اور تلخی کا ہر قطرہ شربت ہو"

لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ اُردو افسانوں میں
بجز بے حیائی کے رکیک جذبات کے اور رکھا کیا ہے
لیکن کہنے والے دیکھیں کہ ان میں استثنا بھی کس پایہ کا
ہے۔ جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ اُردو میں افسانہ اگر اسی کا
نام ہے۔ تو کاش ہمارا سارا سرمایہ ادب افسانہ ہی ہوتا

..... شادی ایک مسلمان گھرانے میں ایک لڑکی کی ہو رہی
ہے۔ والدین ماشاء اللہ عبادتوں کے لحاظ سے اچھے خاصے
دین دار۔ لیکن رسم و رواج کی زنجیروں میں گرفتار۔ ابھی
کے دن لگی بیوہ پھر بھی شامت کی ماری وہاں آ نکلیں،
جہاں سات سہاگنیں دلہن کو چڑھاوا چڑھا رہی تھیں۔ عین
شگون کے وقت ایسی بدشگونی! بیوہ ہو کر سہاگنوں میں
آ ملی۔ اور یہ بھی وہاں جہاں رسم و رواج کی شریعت اس کے
سایہ کے بھی پہنچنے کی روادار نہ تھی۔ بس کچھ نہ پوچھئے کیا
غضب برپا ہو کر رہا۔ بھرے مجمع میں برادری کے جھگڑے
میں بیاہ اور بھائی اور تنہا یہ دونوں کیوں، یہ کہئے
کہ ساری مشکل مل کر اس گنہگارنی پر بھیر پڑی .....

شعر و شاعری کو اسلام نے سخت ناپسند کیا ہے اور
خود رسول اللہ صلعم نے اسلام کے ہجو گویوں کے جواب
میں حسان رضؓ سے نظمیں کہلائی ہیں۔ اس سے معلوم یہ
ہوا کہ شاعری بھی بعض حالات میں جائز ہو تا کیا عین
عبادت بن جاتی ہے۔ اور جب یہ اصل مسلم ہو چکی تو کون
کہہ سکتا ہے کہ اُردو میں راشد الخیری کی افسانہ نویسی بھی
اپنی جگہ پر ایک عبادت و موعظت نہیں .....

مولانا عبدالماجد دریابادی ——— عصمت فروری ۳۹ء

"نوحۂ زندگی میں آپ نے عقد بیوگان کی پُرزور
تائید کی ہے۔ جاہل شریف مسلمانوں کو اس معاملۂ خاص
میں جو ذہنی کیفیت ہوتی ہے اس کی وضاحت فرمائی ہے
اور آخر میں عقد بیوگان کا نتیجہ اتنا خوش گوار دکھایا ہے
کہ پڑھنے والا بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ خدا کرے عصمت
کی طرح ساری نوجوان بیواؤں کے دن پھریں"

پروفیسر علی عباس حسینی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"اس زمانہ میں جب کہ بیوہ کے لئے دوسرا نکاح جرم

تھا سالی چھ مہینے کی بیاہیاں اب بھائی کے ساتھ زندگی
کے دن ایسی ذلت سے پورے کرتی تھیں کہ خدا دشمن کو
بھی وہ وقت نہ دکھائے ذکر جا کر بلا رنڈی بلکہ پاؤں کی
جوتی تک مخالف تھی مسلمان بیوہ عورت کی جو ذلت
اور خواری تھی اس سے بہتر تو یہی رسم تھی کہ ہندو ستی
کر دیتے تھے ساری عمر رنج و رنج کر جوتے پیزار کھانے
سے ایک دن کا مرنا بہتر تھا۔ "نوحۂ زندگی" میں چند دن کی
بیاہی جہاں آرا مدہوں کو لے کر بیوہ ہوئی اور تقدیر نے
بھائی بھاوج کے قدموں میں لا ڈالا۔ بھتیجی کی شادی
کے وقت جب چڑھاوا آتا ہے اپنی بیوگی کو بھول کر اس
مجمع میں پہنچ گئی جہاں سات سہاگنیں دلہن کو چڑھاوا
چڑھا رہی تھیں اس واقعہ کو علامہ نے اس طرح لکھا ہے:۔

"دفعتاً فیروزہ کی نظر بیوہ نند پر پڑی اور وہ صورت
دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ جہاں آرا
صرف اس لئے اس جلسہ میں شریک ہوئی کہ زیور کو ہاتھ
لگا کر حشمت کو بھی بیوہ کر دوں کلہاڑی یوں کی طرح اُٹھی
اور مُردوں کی طرح کفن پھاڑ کر بولی "منحوس! کیا غضب تھا
کا کیا ستم ڈھایا۔ ایسی بھاوج سے دشمنی اور بھتیجی
سے عداوت تھی تو زہر دے دیا ہوتا۔ ہٹو یہاں سے
خبردار جو زیور کو ہاتھ لگایا اور کپڑوں کو چھوا"

بھرے مجمع میں ایسی ذلت بھاوج نے کی اور
ساری بیبیاں جو گرد جمع ہو کر ہاں میں ہاں ملانے لگیں اُس
وقت جہاں آرا کیا کیسی ہی دل گردہ کی عورت ہوتی کیسے
برداشت کر لیتی اور آخر جہاں آرا نے ایک ایسا لرزہ خیز
قدم اُٹھایا کہ زمین اور آسمان کانپ گئے ...... بھتیجی
کی محبت دمِ مرگ بھی پھوپی کے دل میں تھی ...... بھائی
کو جو خط تحریر کیا تھا اس کی چند سطریں یہ ہیں:۔

"حشمت خدا اس کی عمر دراز کرے اور تیرا گھر شاد رہے
[illegible] ہے اور جو قصور وہ ناشاد پھوپی اور
نامراد بھائیوں کو روئے گی۔ یہ خط اس کو دکھا دینا اور
کہہ دینا کہ مرنے والی جہاں آرا داماد کا حق دے گئی بالی
کے کنگن انگوٹھی میں رہ گئے آئے تو اس کے ہاتھ میں
ڈال دینا۔ قدیر میاں بہن رخصت ہوتی ہے اور اپنی
غلطی پر نادم ہے"

رازقہ خیری ایم۔اے کی تقریر
ریڈیو پاکستان کراچی سے ____ عصمت نومبر [illegible]

نوحۂ زندگی علامہ راشد الخیری مرحوم و مغفور کی
وہ نایاب اور بے مثل کتاب ہے جو ایک طرف قلوب انسانی
کو حزن و ملال کا آماجگاہ بنا دیتی ہے تو بیوہ عورت کو اس
طرح پیامِ مسرت سُناتی ہے کہ مردوں کو سنت خیر البشر
حضرت محمدؐ پر عامل ہونے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ عقد
بیوگان کی طرف علامہ مرحوم نے دُنیا کو خاص کر مسلمانوں کو
اس انوکھے انداز سے بلایا ہے کہ غریب بیوہ کا احترام قلوب
انسانی میں پیدا ہو گیا ہے۔ ... مولانا مرحوم کی مختصر مگر
سبق آموز تصنیف سوکن کا جلاپا اس قابل ہے کہ اسے
معاشرتی اصلاح کے اداکاروں کی طرف سے تقسیم کرایا
جائے۔ مگر نوحۂ زندگی ......

فیض آباد کے نواب ولاور حسین جو چھوٹے میاں
کہلاتے تھے لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور اکثر
مجھ سے دار المطالعہ میں ملاقات ہوتی تھی اور اُردو ادب
کا ذکر آتا۔ میں نے علامہ راشد الخیری کی کتابوں کا ذکر کیا تو
فرمانے لگے "بھائی یہ مصنف تو جادوگر ہے فطرت انسانی
کا اس نے ایسا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ اس کی تصانیف میں
ایک کشش ہے جو قلوب انسانی کو مسخر کر لیتی ہے۔ ایک

کتاب زندہ زندگی لکھی ہے جو چھپ کر ۹ بار چھپ چکا
ہے مگر طبیعت سیر نہیں ہوئی ہے۔ جناب عباسی صاحب
نے اپنی جگہ طے کر لیا ہے کہ کسی بیوہ خاتون ہی سے
شادی کریں گے۔ وہ تعلیم کا زمانہ ختم کر کے وطن آئے۔ شادی کا
چرچا شروع ہوا۔ سب ہی نے سمجھایا مگر انہوں نے کہہ دیا
کہ شادی تو بیوہ ہی سے کروں گا۔ قدرت کو علامہ مرحوم
کی تعلیمات کا عملی مظاہرہ کرانا تھا۔ ماں نے بیٹے کی اس
خواہش کو پسند فرمایا۔ الہی دنیا کا رنگ دیکھتے دیکھتے بدل
گیا ہے۔ بڑے بڑے رئیس گھرانوں سے بیوہ بیگمات
کے پیغامات آنے لگے۔ ... بیگم صاحب کی نظر انتخاب
ایک بیوہ پر پڑی اور چھوٹے میاں کا عقد ہو گیا۔ یہ لڑکی
نواب صاحب کے گھر میں پہنچ کر "نواب دلہن" کے نام سے
مشہور ہوئی۔ اپنے حسن انتظام اور اخلاق حمیدہ سے
سارے خاندان کا دل موہ لیا۔ خدا کے فضل سے یہ خاندان آج
ترقی پر ہے۔ علامہ مرحوم کی ایک معمولی تصنیف کا یہ زندہ
اعجاز ہے"

مولوی عبدالحی عباسی وکیل ——— عصمت راشد الخیری نمبر[36]

بارہ دفعہ شائع ہوئی ہے ۲۲×۱۸ کے ۸۸
صفحے ہیں۔

۲۳۔ موؤدہ

سنہ ۱۹[illegible]ء میں یہ ناولٹ صرف ایک ہفتہ میں لکھا گیا تھا۔ "علامہ افسانہ نگار کے
بارے میں معلم قوم تھے۔ وہ لڑکیوں پر ظلم و ستم کیسے دیکھ
سکتے تھے۔ چنانچہ اسی موضوع پر انہوں نے ایک درد
انگیز افسانہ "موؤدہ" لکھا جس کے متعلق میرا دعویٰ ہے
کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی ظالم مرد کی نظر سے یہ افسانہ گزر
جائے تو اس کا دل موم ہو جائے گا۔ اور وہ لڑکیوں پر
کبھی ظلم نہ کرے گا۔ اگر اس افسانے کو پڑھنے کے بعد بھی کوئی
مرد اپنی لڑکی کو محروم وراثت رکھے تو وہ انسان ہرگز نہیں
کہا جا سکتا۔ "موؤدہ" میں ایک ایسے ہی ظالم باپ کا
بیان ہے۔ جب اس کو پتہ چلا کہ اس کے گھر میں لڑکی پیدا
ہوئی ہے تو اس کا یہ عالم ہوا:۔

"مودود کو جب پتہ چلا کہ اس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی
ہے تو یہ یقیناً ایک بلا تھی ایک مصیبت تھی ایک آفت
تھی۔ غصہ کے مارے چہرہ سرخ۔ آنکھیں لال۔ بدن
میں لرزہ اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ منہ سے کف
اور آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ ٹہلتا اور سانپ کی
طرح سر دھنتا رہا۔ کئی دفعہ قصد کیا کہ لڑکی کو اٹھا کر
زمین پر دے پٹکے یا گلا گھونٹ دے۔ مگر جانتا تھا کہ
خبر چھپنے والی اور بات دبنے والی نہیں۔ سنسنی خیز
نتیجہ ظاہر"

معصوم موؤدہ ظلم و ستم سہتی ہوئی کس تندرست
و زندہ رہی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسری مصیبت یہ
تھی کہ:۔

"اس کی (باپ) نفرت سے زیادہ موؤدہ کی رغبت باپ
کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہر چند ماں احتیاط کرتی تھی کہ سامنے
نہ جائے مگر اس فتنی کا یہ حال تھا کہ جہاں باپ نے گھر
میں قدم رکھا اور اس نے ابا ابا کہہ کر چیخنا شروع کیا۔
مجبور محسنہ (موؤدہ کی ماں) کو یہ انتظام کرنا پڑا کہ باپ کے
داخل ہوتے ہی ایک ماما اس کو روتا دھوتا زبردستی گود
میں لے سامنے سے ہٹ جاتی"

ظالم باپ کے لئے مصور غم۔ خالق جذبات کا
یہ فقرہ کہ "مگر اس فتنی کا یہ عالم تھا کہ جہاں باپ نے گھر میں
قدم رکھا اور اس نے ابا ابا کہہ کر چیخنا شروع کیا"
بذات خود ایک مکمل افسانہ ہے جس کی تشریح نہیں

کی جا سکتی۔ مولانا نے بچی کی معصومیت اور محبت کی ایسی دلکش تصویر کھینچی ہے کہ مستحق از داد ہے کتنی بچی کتنی پیاری اور کتنی ساری تصویر ہے ایسی تصویر کھینچنا کسی معمولی مصور کا کام نہیں ہے . . . . . آہ مصور غم خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آپ نے جذبات نگاری کی حد کر دی۔ ظالم سے ظالم باپ بھی ہو گا تو آپ کا یہ افسانہ پڑھ کر خون کے آنسو بہائے گا۔ مظلوم بیٹی کی معصومیت اور محبت کا ایسا پُر اثر منظر دکھانا مصور غم ہی کا حصہ تھا۔

باپ کو جب کچھ صحت ہوئی تو بجائے اس کے کہ موؤدہ پر نظر رحم کرتا اس کی نفرت میں کوئی فرق نہ آیا کوئی یہ نہ سمجھے کہ ماں بھی ظالم باپ کے ہم خیال تھی نہیں ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو علامہ کی افسانہ نگاری پر حرف آتا۔ ماں غریب بیٹی کے رنج و غم میں ہی یہ کہتی ہوئی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

"مسلمان بچی مسلمان باپ کے مال میں ایک پیسہ کی حقدار نہیں"

موؤدہ کا کیا حشر ہوا اور آخر میں جب باپ اور بھائی جیل جانے والے تھے اس نے کس طرح رہائی دلائی۔ یہ پورا افسانہ پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ افسانہ ہر مسلمان باپ کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ مولانا کی افسانہ نگاری کا رنگ اس میں خاص طور سے نمایاں ہے"

ڈاکٹر اعظم کریوی ——————— عصمت راشد الخیری نمبر

موؤدہ میں علامہ نے ایک بدنصیب ماں اور کرموں جلی بیٹی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ا۔

" ایک رات کا ذکر ہے کہ عصمت بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی اس نے دیکھا کہ موؤدہ بھی روٹی کھا رہی ہے جب موؤدہ کو ہوش آیا اور معلوم ہوا کہ باپ مجھے کس حال میں رکھنا چاہتا ہے اس نے اس چوکھٹ سے آگے ایک قدم نہیں بڑھایا۔ محمد متولی اسامی نے کمزور بیٹی کے پاس آئی اور کہا موؤدہ یہ کھا لے۔ موؤدہ نے ماں کی صورت دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگی جو اس نے تقدیر میں لکھ دیا کھا رہی ہوں ابا جان نے جو مقرر کر دیا آپ نے دلوا دیا میرا حق وہی ہے"

وان دہیز جو ایک لعنت بن کر رہ گیا تھا اس کے خلاف ترکہ پدری سے محروم کرنے کی مخالفت میں مولانا نے مستقل جہاد کیا اور واقعات کو ایسے رُوح فرسا رنگ میں سپرد قلم فرمایا کہ کلیجہ کانپ اُٹھا۔ موؤدہ جیسی نصیب لڑکی جو باپ کے گھر میں کوڑا تھی اور دربدر پیٹ پیٹ کر کے نکالی گئی۔ شوہر کو خوش کرنے کے لئے جہیز کہاں سے لاتی۔ جبکہ ترکہ پدری سے محروم کر دی گئی۔ اور ماں باپ کی دس بارہ لاکھ کی جائداد میں ایک دمڑی کی بھی حق نہ تھی احمد جو لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے خواب دیکھ رہا تھا تنگی پوری کرنے کر کیا کرتا۔ اور جب تین طلاقوں کی جانگداز نے اس رشتہ کو ختم کر دیا تو بدنصیب موؤدہ سات مہینے کا بچہ پیٹ میں لئے ہوئے روتی دھوتی شوہر کے گھر سے رخصت ہو گئی"

آمنہ نازلی ——————— روز نامہ انجام کراچی ۳ فروری سنہ[۳۶]

"علامہ کے پلاٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ ٹریجڈی لکھ رہے ہوں یا کومیڈی اپنے پلاٹ کو رنج و غم سے اس قدر لبریز کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والے پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ جی بھر آتا ہے اور بے ساختہ آنسو نکل آتے ہیں" موؤدہ کے پلاٹ کو لیجئے یہ ایک

…کو سیدھی"… ہے جس کے ۱۷ باب ہیں ان میں سے
…رہے ہیں کہ جو ایک مسلم گھر میں معصوم بچی کی
…پر ناخوش گوار فضا کی تصویر کھنچ کر نہ صرف ماں کے
لڑکی کی صحیح پرورش سے تغافل، باپ کی ناخوشی
…اور اپنی لخت جگر کو وبال سمجھنے کی نفرت انگیز
کہانی لڑکی کو اپنے مال و متاع سے محروم کر دینے کے لئے
…عیاری کے شرمناک اور دل ہلا دینے والے کرشمے
اور شادی کے بعد وراثت سے محروم عورت بیچارہ
کی زیادتی، صبر و ظلم جس کی نوبت طلاق تک پہنچی، ایک
…چند لاکھ کی جائداد کی آمدنی کھانے والے باپ کی لڑکی
…وراثت سے محروم ہونے کی وجہ سے یہ حالت کہ جب
خاوند بھی اس کے ذریعہ پیسہ حاصل نہ کر سکا تو موؤدہ
سات مہینے کا بچہ پیٹ میں لئے شوہر کے گھر سے طلاق
کے بعد رخصت ہوئی" یہ مظلوم موؤدہ ماری ماری
پھرتی ہے اور ایک شام جب :-

"موؤدہ اپنے مُردہ بچہ کو گود میں لئے قبرستان کے
اندر داخل ہوئی، اس نے ایک بڈھے شخص سے جو
جھونپڑی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہا -
"اس بچہ کو دفن کر دیجئے"
بڈھا - اور ہمارا کام ہی کیا ہے"
موؤدہ : آپ مجھے زمین کھودنے کے اوزار دیدیجئے
میں خود دفن کر دوں"
بڈھا - کدال پھاوڑے کا کرایہ زمین کی قیمت
دینی ہوگی، نہیں تو چل یہاں سے"
اب شام ہو چکی تھی نماز کا وقت تھا۔ بچہ کی لاش
ایک طرف رکھ کر موؤدہ نے وضو کیا، نماز پڑھی اور
مُردے کو لے کر چلی، چاندنی رات تھی، دریا سامنے لہریں
لے رہا تھا، کنارے پر پہنچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر
کہا "کیا کروں کوئی دفن نہیں کرتا" اتنا کہہ کر موؤدہ
نے بچہ کا منہ کھول کر پیار کیا، دریا میں پھینک دیا اور
آواز بلند "اللہ اکبر" کہہ کر آگے بڑھی"

کیا یہ سین کسی بچہ والی کی نظر کے سامنے پیش ہو سکے
پر وہ ضبط کر کے اپنے آنسو روک سکے گی، اس قسم کی
مصوری، اس دردناک داستان، اس دل ہلا دینے
والے سین اور عورت کی مظلومیت و ناچاری کا فوٹو
کھینچنے کے بعد علامہ موؤدہ کو ایک جج کی مطمئن بیوی کا
رتبہ دیتے ہیں کہ جس کے قبضہ میں اپنے پہلے ظالم شوہر کی عزت
و ذلت ہوتی ہے۔ اور جو اپنے باپ اور بھائیوں کے ظلم
کے بدلے میں اچھے سلوک اور سعادت مندی کو اپنا
فرض سمجھتی ہے۔ علامہ کے پلاٹ کی یہ نمایاں خصوصیت اس
شان سے صاف نمایاں ہے۔ ایک کو سیڑھی کے پلاٹ
میں یہی ٹریجڈی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے ۔۔۔۔۔۔
بچہ کی لاش گود میں ہے، بیکسی و بے بسی کا عالم ہے، دو گز
کفن اور ایک گز زمین لخت جگر کے لئے میسر نہیں مگر شام
ہوتی ہے، وقت نماز آتا ہے اور موؤدہ اپنے وارث برحق
کے سامنے سر بسجود ہو جاتی ہے۔ کیا کوئی واعظ، کوئی مولوی،
کوئی ملا فریضہ نماز کی وقت پر ادائیگی کی تعلیم اس سے بہتر
اور مؤثر پیرائے میں پیش کر سکتا ہے ۔؟ ۔۔۔۔۔۔
موؤدہ ان ہی باپ اور بھائیوں کے خلاف مقدمہ دائر
کرنا انسانیت اور حقوقِ فرزندی کے خلاف سمجھ کر طلاق
کی مصیبت اٹھاتی ہے۔ کیا سعادت مندی کا اس سے
بڑھ کر کوئی اور سبق سکھایا جا سکتا ہے؟ یہی موؤدہ
محنت و جفاکشی کرتی ہے۔ اپنی عصمت کی حفاظت کرتی اور
اپنے باپ دادا کی طرح رکھتی ہوئی ایک دن اپنے خلوص

دوبالی کا فقرہ باقی ہے۔ ایک ٹریجڈی کومیڈی ہو جاتی ہے۔ اور لڑکیوں کو حق کی فتح اور بھلائی کے بدلے بھلائی کا مکمل سبق دے جاتی ہے۔ کیا پلاٹ کی یہ خصوصیات مصورِ غم کو مشرقی عورت کا رہبر کامل نہیں ثابت کر رہی ہیں؟

میجر ڈاکٹر نعیم الدین احمد ـــــــ راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

"موؤدہ" کا مطالعہ بھی جبر و تشدد کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں رحم و کرم کی لہریں پیدا کرے گا اور سنگدل انسانوں میں اس خیال کو چٹان کی مانند مستحکم کر دے گا کہ وہ اپنی لڑکیوں پر ظلم نہ کریں اور انہیں وراثت سے محروم نہ رکھیں۔ موؤدہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"ظالم باپ نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ لڑکی کو صرف اتنا کھانے کو دیا جائے کہ وہ اپنا پیٹ بھر سکے۔ دھوتر کا کرتہ اور گاڑھے کا پجامہ پہنا کر زمین پر بیٹھ رہو کر کسی طرح گھر اس مصیبت سے محفوظ اور خاندان اس آفت سے پناہ میں رہے . . . . .

"جس دن سے باپ بیمار ہوا موؤدہ ہر نماز کے بعد بلبلا بلبلا کر اس کی تندرستی کی دعائیں مانگتی۔ اس نے باپ کی بہار تو کیا پیار بھی نہ دیکھا تھا مگر ذاتی جوش تھا کہ پردے کے پاس کھڑی دور سے بلائیں لیتی اور نثار ہوتی . . . . . موؤدہ ڈرتے ڈرتے باپ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ روشنی دھیمی کی اور تیل کی شیشی اٹھا کر آہستہ سے اس کی پائینتی آ کر بیٹھی ۔ اس خیال سے کہ صورت دیکھ کر باپ کو اذیت نہ ہو۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے اپنی گردن گھٹنوں میں دے کر منہ چھپا لیا اور مالش شروع کی . . . . .
تیمار داری کی رات کا باقی حصہ مریض کی طرح آنکھوں میں کٹا۔ یہاں تک کہ نماز فجر کی اذان کان میں آئی۔ نواب نے دیکھا کہ بچی نے گڑگڑا کر باپ کی صحت کے واسطے ہاتھ اٹھائے۔ آنسو جاری تھے اس کے قدموں پر آنکھیں ملیں۔ اور الٹی ٹانگ کو جو بے حس تھی بوسے دے کر کھڑی ہوئی اور اس خیال سے کہ کہیں باپ کی آنکھ نہ کھل جائے اور وہ میری صورت نہ دیکھ لے ہولے ہولے آگے بڑھی اور باہر نکل گئی . . . . .

مصورِ غم نے افسانہ نہیں لکھا ہے بلکہ اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو کاغذ پر رکھ دیا ہے جو داستان ایک سنگدل انسان کو بھی رلائے بغیر نہیں رہے گی۔ اور اس کے دل سے ناخوشی ناراضگی اور اپنی لختِ جگر سے نفرت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گی . . . . . "

حارث نثار بی اے آنرز ـــــــ عصمت زری ۱۹۳۶ء

"موؤدہ میں بچی کی پیدائش سے لے کر شادی کے بعد تک کے واقعات ایسے دردناک الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں کہ کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔ بچی کی پیدائش پر شوہر کا اظہار ناراضگی جیسے بیوی بڑی بھاری مجرم ہے۔ بختے میاں کو ان الفاظ میں سمجھاتی ہے :۔

"یہ میرے اختیار کی بات تو نہ تھی کہ میں نے بیٹے کو بیٹی بنا دیا۔ اگر میرے بس کا کام ہوتا تو میں ایسا کیوں کرتی"

موؤدہ غصہ میں بپھر کر بیوی پر برس پڑتا ہے۔ اور اس کو اپنی جائداد کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ حقِ وراثت میں کہیں لڑکی کو نہ دینا پڑے کہتا ہے :۔

"یہ کم بخت اپنے ساتھ ایسی مصیبت لائی جس کا کوئی چارہ نہیں جائداد اس کی ہستی سے برباد علاقہ اس کے ظہور سے ناس اور عزت اس کی پیدائش سے ذلت میں تبدیل ہو جائے گی"

... مولودہ بیٹی کو حق وراثت سے محروم کر دیتا ہے لیکن ... اس لالچ میں کہ جائداد کا پورا پورا حصہ ملے گا ... محروم ہو جاتا ہے کہ بیٹی نہیں خالی ہوئی مولے ... بیوی کو اس حال میں گھر سے نکال دیتا ہے کہ ... پیدائش میں صرف چند روز رہ جاتے ہیں۔ کھنڈروں ... جنگلوں میں بچہ کی پیدائش ہوتی ہے اور مولودہ جنگل ... میں مُردہ بچہ کی لاش ہاتھ پر لئے دفن کرنے جاتی ہے۔ کہ زمین کی بھی تو قیمت ہے۔ اس واقعہ کو علامہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

چاندنی رات تھی۔ دریا سامنے لہریں مار رہا تھا۔ کنارے پر پہنچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کیا کروں ... کوئی دفن نہیں کرتا۔ بچہ کا منہ کھولا پیار کیا اور ... دریا میں بہا دیا "

... یوسف ایم اے منشور ریڈیو پاکستان کراچی مندرجہ عصمت ۱۹۵۶ء

" ان کے افسانہ مولودہ میں ان کی جادو بیانی اور ... کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ اس افسانہ میں راشد الخیری نے تضاد کے فن سے بھی کام لیا ہے محض سفید یا سیاہ ... اچھا یا بُرا نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر سفید کے بعد سیاہی یا سیاہی کے بعد سفیدی موجود ہو تو ان دونوں کا فرق اور تضاد تصویر کو زیادہ نمایاں مکمل اور مؤثر کر دیتا ہے اس افسانے میں مولودہ کے ساتھ محض لڑکی ہونے کے جرم میں اس کے باپ نے جو مظالم روا رکھے تھے ان کا اندازہ ان چند لائنوں سے ہو سکتا ہے۔

" مولودہ کا بھائی جو محض لڑکا ہونے کی وجہ سے باپ کی بے اندازہ عنایتوں اور محبتوں کا مرکز تھا سامنے آتا ہے اس کا سلوک باپ کے ساتھ انتہائی ناروا اور نازیبا ہے۔ یہاں تک کہ جب ایک مرتبہ باپ پر فالج کا حملہ ہوتا ہے۔ اور باپ کی حالت اس قدر نازک ہو جاتی ہے کہ وہ بات بھی اس قدر مشکل سے کر سکتا ہے۔ لڑکے پر کوئی اثر نہیں ہوتا شام کے وقت صاحبزادے منہ ہاتھ دھو کپڑے بدل کر ہوا خوری کو جاتے وقت کھڑے کھڑے باپ کو دیکھنے آتے ہیں۔ باپ اشارے سے کہتا ہے کہ تیل کی مالش کی ضرورت ہے۔ لیکن صاحبزادے کو اتنی فرصت نہیں جو اپنی تفریح سے منہ موڑ کر بے چارے باپ کی خدمت کر سکے۔ ایک طرف تو لڑکے کی یہ تصویر ہے اور دوسری طرف اس مظلوم اور مجبور مولودہ کی تصویر سامنے آتی ہے۔ بیٹی کی محبت ظالم باپ کے ساتھ کتنی دردانگیز انداز میں بیان کی ہے ... ..

" جس دن سے باپ بیمار ہوا۔ مولودہ ہر نماز کے بعد بلبلا بلبلا کر اس کی تندرستی کی دعائیں مانگتی۔ اس نے باپ کی بیماری کو پہلا بھی نہ دیکھا تھا مگر ذاتی جوش تھا کہ پردے کے پاس کھڑی دور سے بلائیں لیتی اور نثار ہوتی۔ یہ وہ وقت تھا کہ گھر کے تمام آدمی نیند کی لپیٹ میں بے ہوش تھے۔ اور صرف ایک بدنصیب ہستی مولودہ اپنی جان کے دشمن حقیقی باپ کی خدمت میں مصروف تھی۔ گرمی سخت تھی۔ اس کے موٹے کھدّی کے کپڑے پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ اور جس باپ کی لونڈیاں تک ٹھل اور پنکھے سے گھبرا رہی تھیں۔ وہ کانٹے جیسی خاموش تھی۔ پٹھوں اور رگوں میں گرم تیل کی حرارت پہونچی تو مولودہ (باپ) کی آنکھ کھلی پہلے سمجھا محسنہ (بیوی) ہے مگر گُرگی کے کوسنے نے اس خیال کو بدل کر اس کی محبت کا پتہ دیا جس کی جان کا دشمن تھا۔ تیمار دار کی رات کا باقی حصہ مریض کی طرح آنکھوں میں کٹا۔ یہاں تک کہ نماز فجر کی اذان کان میں آئی تو باپ نے دیکھا کہ بچی نے گڑگڑا کر باپ کی صحت کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ آنسو جاری

اس کے قدموں پر آنکھیں ملیں۔ اور اُلٹی ٹانگ کو جو جس
تئی بوسوسے کر کھڑی ہوئی۔ اس احساس خیال سے کہ
کہیں باپ کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اور وہ میری صورت
نہ دیکھ لے ہولے ہولے آگے بڑھی اور باہر چلی گئی۔"

یہ ہے تضاد کا فن جس میں راشد الخیری کو یدطولیٰ
حاصل ہے۔ آپ نے دیکھا کہ لڑکی کا کردار صرف لڑکے کے
تضاد میں آکر کتنا نمایاں اور بلند ہوگیا۔ راشد الخیری کی زبان
کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ہے۔ دلّی کی وہ ٹھیٹ زبان کہ
جس کے بولنے والے آج اہلِ دہلی میں بھی کمیاب ہیں....
نُور ہاشمی ـــــــ جنگ کراچی مورخہ ۴ فروری سنہ ۳۲ء

• موءودہ اتنا دردناک ہے کہ کسی ظالم مرد کی نظر سے
یہ افسانہ گذر جائے تو اس کا دل موم ہو جائے گا۔ اس
مرد کی ذہنیت اور عورت کا مقام مولانا نے جس طرح عورتوں
کا رُتبہ بلند کرنے کا طریق اختیار کیا ہے اور مصورِ غم
بن کر عورتوں کی ہمدردی کے لئے مردوں کو اُکسایا ہے انہیں
کا حصّہ ہے۔

نسیم اختر ـــــــ آفاق لاہور ۲ فروری سنہ ۵۱ء

موءودہ تین چار دفعہ صوفی پبلشنگ ہاؤس گجرات
پنجاب نے شائع کی تھی۔ پھر میں نے حقوقِ اشاعت واپس
لے لئے۔ آٹھ دفعہ چھپی ہے اور ۲۲ × ۱۸ / ۸ کے ۵۶
صفحے ہیں۔

۲۴ ۔ رُودادِ قفس

یہ مجموعہ تھا ان چند نظموں کا جو سنہ ۱۸ء تک علیحدہ یا بعض مضمونوں اور افسانوں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ ستمبر سنہ ۱۸ء میں
جب میں نے پہلی دفعہ یہ مجموعہ شائع کیا تو ضخامت صرف
۳۲ صفحے تھے۔ لیکن سنہ ۲۷ء میں جب چوتھی مرتبہ شائع
ہوا تو اس میں اور نظموں کا اضافہ کیا گیا اور ضخامت ۷۲
صفحے ہوگئی۔ عصمت اسمبلی میں حضرت علامہ مغفور نے
کئی نظمیں اپنے نام سے شائع نہیں کی تھیں کیونکہ
فرماتے تھے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور ان نظموں میں
شاعری کی غلطیاں ہوں گی۔ "سرخاب کا توم وا ..."
صفحہ کی مثنوی گنگا پور سٹی میں شیشم کے درخت کے نیچے
ایک چارپائی پر لیٹ کر جس طرح لکھوائی تھی اس کا ذکر
صفحہ ۲۲۵ پر کر چکا ہوں۔ اور یہ بھی کہ وہ بولتے جاتے
اور میں لکھتا جاتا تھا۔ رُودادِ قفس کا چھٹا اڈیشن جب
پریس سے آیا اور کتاب اُن کی خدمت میں پیش کی
تو فرمایا "بھئی یہ مقبولیت تو خدا کی دین ہے۔ میں تو شاعر
نہیں ہوں"

ہجرت کے بعد عصمت بک ڈپو کے حالات بدل
گئے اور علامہ مغفور کی جہاں اور کئی تصانیف کے جدید
اڈیشن شائع نہ ہو سکے وہاں رُودادِ قفس بھی کئی سال
ہوئے ختم ہو چکی اور نیا اڈیشن نہ معلوم کب شائع
کر سکوں گا۔

آں زبانے بے زباناں شُد خموش
نوحہ خوانِ خستہ جاناں شُد خموش
بر زباں آورد "رُودادِ قفس"
نالۂ مُرغانِ ناشادِ قفس

تلوک چند محروم ـــــــ عصمت مارچ سنہ ۳۶ء

"علامہ راشد الخیری شاعر بھی تھے۔ اُنہوں نے
جذبات و احساسات سے مملو نظمیں کہیں۔ اور اس سلسلہ
میں بحروں کا اتنا اچھا انتخاب کیا کہ تحت اللفظ پڑھنے
سے بھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نظم آپ ہی آپ ترنم
سے پڑھی جا رہی ہے۔"

احمد ندیم قاسمی ـــــــ امروز لاہور ۳ فروری سنہ ۵۳ء

پھڑک پھڑک گئی دستوں میں غیرت آزاد
پڑا ہے رنگ میں چھیڑی سے روئیدادِ قفس

ـــــــــ عصمت فروری سنہ

۲۸ - انگوٹھی کا راز | حضرت علامہ مغفور نے شہرت کی کبھی پرواہ کی ہی نہیں، مسودے صاف ہونے میں اور کتابت میں بے شمار غلطیاں رہ جاتیں ... ان پر نظرِ ثانی کرنے کی بھی ضرورت ہوتی مگر وہ اس بات کی پرواہ نہ کرتے تھے - انہیں احساس ہی نہ تھا کہ وہ کتنے بڑے مصنف ہیں اور کسی کتاب میں کوئی کمزوری رہ جانے سے ان کی شہرت پر کیا اثر پڑے گا - یہ افسانہ جس کا ابتدائی ایک تہائی حصہ مارچ سنہ کے عصمت میں شائع ہوا تھا اس کا باقی دو تہائی حصہ پورا کرنے کے لئے مجھے حکم دیا تھا اُس وقت میں نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا ایک نویں جماعت کا طالب علم جس طرح کتاب مکمل کر سکتا تھا جو کچھ مجھے سوجھا لکھ کر حکم کی تعمیل کر دی اس وقت دلّی میں تشریف بھی نہ رکھتے تھے کہ مسودہ ہی ملاحظہ فرما لیتے - ان کے حکم کی تعمیل میں اسی طرح پبلشر کو مسودہ دے دیا گیا - دس سال بعد میں نے اس افسانہ کا حقِ تصنیف واپس لیا اور نظرِ ثانی کی التجا کی تو اس کا غیر ضروری حصہ خارج کر کے ترمیم و اصلاح کے بعد بعض حصے از سرِ نو لکھ کر دئے - اور اس جدید اضافہ کے ساتھ تیسری دفعہ سنہ میں شائع کیا۔

ضخامت ۲۲x۱۸/۱۶ کے ۸۴ صفحے ہیں - یہ تصنیف سنہ تک ۸ دفعہ شائع ہوئی تھی -

۲۹ - جوہرِ عصمت | تین مطبوعہ مختصر افسانوں کا مجموعہ میں نے جنوری سنہ میں شائع کیا تھا - ضخامت صرف ۸۴ صفحے تھی - سنہ میں اور ۱۰ مختصر افسانے اس میں شامل کر دئے تو صفحات کچھ کم دو سو صفحے ہو گئی - اس مجموعے کے افسانے عصمت و تمدن میں شائع ہوئے تھے - علامہ مغفور کے سامنے دو دفعہ یہ کتاب چھپی اور دو دفعہ ان کے بعد سنہ سے قبل - اس کی ضخامت تھی ۱۹۶ صفحے -

ان ۱۳ افسانوں میں کئی افسانے بڑے معرکتہ الآرا ہیں -

" آپ کا شاید ہی کوئی افسانہ ایسا ہو جس میں کسی نہ کسی پہلو سے طبقۂ نسواں کی وکالت نہ کی گئی ہو - اور ان کے حالِ زار پر آنسو نہ بہایا ہو - چنانچہ آپ کی افسانہ نگاری نے طبقۂ نسواں پر جو احسان کیا وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا - خواتین اپنے محسنِ اعظم کو کبھی نہیں بھول سکتیں - لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علامہ کے افسانے یکساں مفید ہیں - ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ علامہ کے افسانے زنانہ اور مردانہ اسکولوں کے نصاب میں داخل کئے جائیں - عورت محبت چاہتی ہے یا دولت اس کا پتہ چلانا ہو تو مولانا کے افسانوں کا مجموعہ "جوہرِ عصمت" ملاحظہ کیجئے ..... علامہ ہمدردِ نسواں تھے - نسوانی دُنیا کے سچے خیر خواہ وکیل تھے آپ نے ان افسانوں میں جا بجا عورت کی سچی محبت کے جلوے اور مردوں کی اس حماقت کا جو عورتوں کو دولت کا غلام سمجھتے ہیں جا بجا مضحکہ اُڑایا ہے - جوہرِ عصمت کا ایک سین ملاحظہ کیجئے :-

سرزمین اکبر آباد اور ایک کچی دیواروں کا ٹوٹا سا گھر - دو ماں بیٹیاں اپنے اپنے کام دھندوں میں لگی ہوئی ہیں :-

" لڑکی کے کپڑے میلے چکٹ ہیں - کُرتے میں پیوند

مونچھ میں کھونپ - ہاتھ میں سوئی۔ گھٹنوں پر کپڑا بے خبر بیٹھی سی دری کا ہے۔ چشم بینا غور و تامل کی اعانت سے اس ظاہری کثافت کی تہ میں نفاست کے خزانے پوشیدہ دیکھ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ناک کان عارضی زیور سے لدے ہوئے نہ ہوں۔ مگر اس کا ایمان لازوال دولت سے مالا مال ہے۔ عفت و عصمت کا بیش بہا زیور اس کے چہرے کو جگمگا رہا ہے ۔ اور گو عسرت و افلاس کی انتہا ہے لیکن جوہر شرافت پر بیش بہا جواہرات قربان ہیں" (عدل جہانگیری جوہر عصمت)

نیچرل افسانہ نگاری اس کو کہتے ہیں کہ جس کا ذکر کیا جائے اُس کی ہو بہو تصویر کھنچ جائے۔ مصورِ غم کے لئے یہ ایک معمولی بات تھی۔ ان کے افسانوں میں قدرتی مناظر کی نہایت دلکش تصویریں ہیں۔ غربت و افلاس کی تصویر دکھا کر مولانا ایک اور منظر دکھلاتے ہیں۔ سعد اللہ خاں کوتوال شہر کی طرف سے ہزاروں اشرفیوں کے تحفے لے کر ایک دلالہ اس غربت و افلاس کے گھر میں پہنچ کر کوتوال کی دولت و حکومت کا ذکر کر کے لڑکی کو شادی کا پیام دیتی ہے۔ شادی کا پیام سُنتے ہی :-

"لڑکی کے تیور بدل گئے۔ ناتجربہ کاری نے آتشِ غیرت بھڑکا دی۔ اس سنگین عمارت کی بنیاد جو قصرِ عصمت سے تعبیر تھا ایسے معمار کے ہاتھوں سے نہ چُنی گئی تھی کہ زر و دولت کی جھڑیاں متزلزل کر دیتیں۔ ننھیال افغانی خون اور سادات کے گارے سے پیوستہ تھی تھرا اٹھی"

دلالہ کو ماں بیٹیوں نے دھتکار دیا لیکن پھر دوبارہ پہنچی :-

"سیٹھانی کو تاب نہ رہی۔ بید کی مانند تھر تھر کانپنے لگی

...... جھک کے قدموں سے سلطان آئی اور دور اندیشی کی زبان سے کہا :-

بی بی ہم غریب ہیں۔ فقیر ہیں۔ ہم کو نہ ستاؤ۔ کوتوال صاحب کو دولت مبارک ہو۔ ہم سوکھے ٹکڑوں پر خوش اور فاقوں میں رہنے والے لوگ اس زر و جواہر کی قدر کیا جانیں۔ ہماری تقدیر ایسی نہیں ہے ہم کو تو یہ میلے کچیلے کپڑے لہسن کی چٹنی اور پیاز کی گٹھلی زربفت و کمخواب ہیں۔ خدا کا واسطہ ہم پر رحم کرو۔ اور کوتوال صاحب سے کہہ دو کہ رعیت کی بہو بیٹیاں اپنی ہی بہو بیٹیاں ہوتی ہیں" (عدل جہانگیری جوہر عصمت)

عصمت و پاکیزگی دولت و افلاس، خودداری اور شان کی کتنی مکمل مصوری کی گئی ہے...... مولانا کے افسانوں کا ایک ایک فقرہ خود مکمل افسانہ ہے اور اس قابل ہے کہ اس پر صفحے کے صفحے لکھے جائیں پھر بھی مکمل خوبیاں نہیں پیش کی جا سکتیں۔ مصورِ غم ایک خاص رنگ ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ ان کا رنگ ان کے ساتھ گیا اب تو آج کل بدقسمتی سے بزبان مولانا

"ادب کے قابلِ قدر جواہر۔ حُسن فروشوں کے زر خیز سے لبریز ہیں۔ کہیں انگلیوں کی تھر تھراہٹ ہے کہیں کلائی کی کپکپاہٹ۔ کوئی گردن کی مٹک پر فریفتہ ہے کوئی کمر کی لچک پر" (جوہر عصمت)

ڈاکٹر اعظم کریوی —————— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"جوہرِ عصمت یا عصمت کی تعریف پر علامہ راشد الخیری کی تحریر نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ آپ نے اپنی جادو بیانی سے ایسی چیز کو جو پہلے ہی قدر کرنے والی تھی دوگنی قدر کرنے والی قیمتی یعنی عصمت کے جگمگاتے ہیرے کو لعل اور چاند کو سورج کی طرح دمکتا ہوا دکھایا ہے

ن مظلوم بیوی کا جذبہ - ایک عورت مامون الرشید
ہیں وغیرہ۔ یہ شمارا فسانے قابل ستائش
...نیز نے دلوں کو مصنف کا گرویدہ کر لیا ہے۔"
بت شیخ عبدالواحد ——— بنات اگست ۱۹۳۱
دو ہی عصمت میں یہ ۱۳ افسانے ہیں :-
(۱) مظلوم بیوی کا پاک جذبہ (۲) بھنور کی
(۳) نسانۂ تنویر (۴) مامون الرشید کا دربار (۵)
... (۶) جہانگیری عدل (۷) ملکہ شہرزاد (۸)
شہادت (۹) بے گناہ کا قتل (۱۰) برقع کی تحق
...ج کا کینہ (۱۲) غلط فہمی (۱۳) خاتمہ بالخیر۔

اندلس کی شہزادی

کوئی صاحب تھے ممتاز ابھی انہوں نے پہلا اڈیشن
... سنہ ... میں تائید غیبی کے نام سے شائع کیا
ان سے منشی عبدالحمید صاحب اڈیٹر مولوی نے
...خریدے - صرف ۵ روز میں یہ ناولٹ لکھا گیا
۲۱ × ۱۸ کے ۲۷ صفحات ہیں - میں اس کے حقوق
...سانے سکا۔ دس بارہ دفعہ شائع ہوا ہے -
یہ مختصر ناول اس خاکِ اندلس سے متعلق ہے -

جہاں سے مسلمانوں میں ہزاروں اور لاکھوں صورتیں
پیدا ہوئیں - ملکوں پر حکومت کرنے والے آئے -
دُنیا میں زندگی کا جائز حق رکھنے والے پیدا ہوئے -
دیکھنے دکھانے کے لائق سپوت اس ماں کی گود میں
کھیلے اور تاریخ کو جگمگا دینے والے چاند اسی آسمان سے
نمودار ہوئے - یہ اس زمانے کی داستان ہے کہ اسلامی
سلطنت کا چراغ سرزمین اندلس میں ٹمٹما رہا تھا "

ابوالحسن نے سلطنت کی خاطر اپنے عاشق زار
اب ابو عبداللہ کو قتل کیا مگر وہ بھی پھل نہ کھا سکا۔

فرڈیننڈ نے مکاری سے ابوالحسن کو شکست دے کر
سلطنت اسلامی کا خاتمہ کر دیا - اس کے بعد ملکہ الفینا
تخت نشین ہوئی - وہ بہت حسین اور دانش مند تھی -
لیکن اسے تخت پر بیٹھے کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا تھا
کہ سانپ نے کاٹ کھایا وہ بظاہر مردہ معلوم ہونے لگی
اور اسی حالت میں اسے دفن کر دیا گیا ..... اس ناول
میں مولانا نے دکھایا ہے کہ :-

" مسلمان خواہش کے بندے اور نفس کے غلام نہیں
بات کے دھنی اور دل کے غنی ہیں - محبت کی زنجیر
ان کے قدموں میں تاجِ شاہی کو ٹھکرانے والی اور
خلوص کا دریا ان کے سینے میں نفسانی سمندر کو تہ و بالا
کرنے والا ہے - ملکہ الفینا نے مسلمانوں کے ان اطوار
پسندیدہ و اخلاقِ حمیدہ کی قدر کرتے ہوئے اس جرار
کے ساتھ نکاح کر لیا۔ جس کے پاس نہ بیٹ کو ٹکڑا نہ تن
کو کپڑا - سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں لیترا میسر تھا اور اس نے
دریائے محبت میں ہر قدم ایسا اُٹھایا کہ تاجِ شاہی اُن
اور تختِ سلطنت کو تصدق کر دیا "

" مولانا راشد الخیری کے تاریخی ناول دو وجوہ
سے غیر فانی ہو گئے ہیں ایک تو ان کا اسلوب بیان دوسرے
افسانے کے پلاٹ کی تعمیر جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے
وہ اس فن کے بلاشبہ بادشاہ ہیں - پلاٹ کا تو اسی ایک
ناول سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تاریخ کے ان کرداروں
سے جنہیں فروگذاشت کیا جا چکا ہے وہ ایسے بے نظیر پلاٹ
تعمیر کرتے ہیں کہ تاریخ کے یہ اوراقِ پارینہ ہماری آنکھوں
کے سامنے جیتی جاگتی تصویروں کی طرح حرکت کرتے
نظر آتے ہیں - اندلس کی شہزادی پڑھتے وقت یہ خیال
نہیں رہتا کہ ہم صرف ایک ناول پڑھ رہے ہیں - اس

تاریخی ناول میں موصوف نے دو تین مزاحیہ سین بھی دکھائے ہیں جو موقع کے لحاظ سے نہایت کامیاب ہیں خاص طور پر اس لئے کہ موصوف نے اپنے پُر لطف مکالموں کے ذریعہ سے نہایت نیچرل اور لطیف مزاح پیدا کیا ہے۔

سید محمود مورخ بی اے ——— عصمت راشد الخیری نمبر

۲۸ - فسانۂ سعید پہلا اڈیشن سنہ میں شائع ہوا تھا اور جو تھا سنہ میں اس کے بعد بیٹے اس کے حقوق واپس لے لئے تھے۔ سات دفعہ چھپا ہے۔ ۲۲×۱۸/۸ کے ۶۴ صفحے ہیں۔ نوعۂ زندگی عقد بیوگان کی حمایت میں لکھی گئی مگر فسانۂ سعید میں سعید جیسی بیوہ کا جو کئی بچوں کی ماں ہے۔ جس طرح جس شخص سے نکاح ثانی کیا گیا اس کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔

"مگر یہاں تو ظالم باپ نے اپنے نکاح کے واسطے پھندا اُتارا تھا۔ اس کو سب سے پہلے یہ سمجھا اور غور کرنا تھا کہ اس کے ساتھ جو تین بچے ہیں۔ ان کی پرورش کا کیا سامان ہوگا۔ زمانہ اتنا نازک اور وقت ایسا ٹیڑھا ہے کہ انسانیت اور ہمدردی مسلمانوں میں بالکل ہی گم ہوگئی۔ اور ایسا شخص جو پرائے بچوں کو اپنے بچوں کے برابر سمجھے آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ اگر نکاح کرتا تو پہلے بچوں کی پرورش کا سامان کرتا۔ یہ صحیح کہ مرنے والا باپ اتنا دُور اندیش نہ تھا کہ معصوم بچوں کے واسطے کچھ اثاثہ چھوڑتا لیکن اب جو حالات تھے نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے ..... سعید کا دُوسرا نکاح' نکاح ہی نہ تھا باپ کے نکاح کا تتمہ تھا اور یہ نکاح جس نام سے سعید کا نپ رہی تھی نکاح نہیں۔ نکاح بالجبر تھا"

دلچسپ تو خیر علامہ مغفور کا ہر افسانہ ہر ناول ہر مضمون ہر تحریر ہے مگر فسانۂ سعید بہت ہی دردناک اور عبرت انگیز افسانہ ہے۔ اس ناولٹ کا اشتہار "مظلومہ" کے نام سے بھی دیا جاتا تھا۔

۲۹ - درِ شہوار سنہ میں یہ تاریخی افسانہ تین روز میں لکھا گیا تھا۔ اور اس کے ۵ اڈیشن مصنف کے سامنے شائع ہوئے تھے ۲۲×۱۸/۸ کے ۲۰ صفحات ہیں۔

اس میں ایران مازندران سیستان کی ہولناک لڑائیوں کا حال ہے اور ساتھ ہی محبت کا دلکش افسانہ

"درِ شہوار میں سیطورا ایک حکمراں کی حیثیت سے نظر آتی ہے ملک کی قحط سالی کو وہ خوش حالی سے تبدیل کردیتی ہے بوڑھا بچہ جوان مرد و عورت سب اس کے گن گاتے ہیں۔ اس کے انصاف کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بج رہا ہے۔ مقدمات کے فیصلوں میں وہ انصاف کا اس قدر لحاظ رکھتی ہے کہ دربارِ عام میں ہر فریادی بلا روک ٹوک حاضر ہو سکتا ہے ..... ایمان کی پختہ ارادوں میں اٹل غریب کی داد فریاد سننے کو ہر وقت تیار رہتی ہے اور بڑے بڑے امرار کی مطلق پرواہ نہیں۔ جنگ کے موقعوں پر خود گھوڑے پر سوار دشمنوں سے لڑتی ہے۔ سب کہتے ہیں صلح کر لیجئے اور نیلوس سے شادی کر کے ایک وسیع سلطنت حاصل کر لیجئے مگر وہ دشمنوں کی پرواہ نہیں کرتی۔

اویس احمد ادیب ——— ساقی راشد الخیری نمبر

مولانا نے تاریخی ناولوں میں اسلامی تاریخ کے ان واقعات کو بیان کیا ہے جو گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ مولانا نے ان واقعات سے بے نظیر پلاٹ تیار کئے ان کے ناولوں کے پلاٹ بہت سوچ سمجھ کر قائم کئے

ان میں پہلی یا پہلا ترتیب کا کہیں پتہ نہیں ۔ اکثر

دلوں شتاہ ماہ محرم اور دُر شہوار میں پلاٹ واقعات

... ہیروئن کے کیرکٹر کے ساتھ ساتھ ترقی پاتے

...

بنات گشت

... شہوار پہلی دفعہ قاری سرفراز حسین مرحوم کے
... بیٹے نے شائع کیا تھا اور دوسرا ایڈیشن جو تھا
... صاحب کے خلف اکبر بھائی عباس حسین صاحب
... ان سے حقوق اشاعت واپس لے کر کتابت
... غلطیاں دور کر کے علامہ مغفور کے سامنے ہی
... تھا ۔ حیدر آباد دکن کے ایک ماہنامہ نے اس پر
... اعتراضات بھی کئے تھے مگر وہ پرچہ افسوس ہے
... نہیں ۔

یاسمینِ شام

یہ تاریخی ناول پونے دوسو صفحے ۲۲×۱۸/۸ تقطیع پر ہے
... میں بمقام گنگا پور ستی جہاں حضرت مصنف
... بڑی صاحبزادی کے پاس مقیم تھے صرف ایک ہفتہ
... لکھا گیا تھا ۔ کراچی ہجرت سے قبل ساتویں دفعہ
... شائع ہوا تھا ۔

یاسمین شام حضرت عمر خلیفہ ثانی کے زمانہ کا
... تاریخی ناول ہے ۔ اس میں مولانا نے تاریخ اسلام اور
... داستان پہلو بہ پہلو بیان کی ہیں ۔ اس ناول سے اگر
... تاریخی واقعات کو حذف کر دیا جائے تو ناول کے پلاٹ
... پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ آخر میں دونوں حصوں میں پیوند
... لگانے کی کامیاب سعی کی گئی ہے ۔ ایک حصہ تمام تر تاریخی
... حقائق پر مبنی ہے ۔ داستان میں بلقیسیا کا کردار تخلیقی معلوم
ہوتا ہے ۔ مولانا نے بلقیسیا کے کردار کو ایک کامیاب اور

قابلِ تقلید کردار بنانے کی انتہائی کوشش کی ہے ۔ مسلم
خواتین کے سامنے اس سے بہتر کردار پیش کرنا محال ہے ۔۔۔
یاسمین شام کا پلاٹ دو مخالف قوتوں کے تصادم سے پیدا
ہوا ہے ۔ ایک طرف مسلمان ہیں جو نورِ ایمان کی مدد اور
اپنے اخلاقِ پسندیدہ کی وساطت سے اپنی مخالف جماعت
کو نیچا دکھا دیتے ہیں دوسری طرف مغرور اور خود سر
عیسائیوں کی جماعت ہے جو معصیت اور جنگ و جدل
میں گھرے ہونے کے باوجود اپنی سفاکی اور بے رحمی
سے باز رہنے کے لئے آمادہ نہیں ۔۔۔۔ بلقیسیا کے
تخیلی نسائی کردار میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی
ایک کامیاب ادبی کردار سے توقع ہو سکتی ہے ۔ اس کی
دردبھری داستان گو ناگوں مصائب کا حال سن کر ہم اس
طرح متاثر ہوتے ہیں گویا کسی زندہ انسان کی بپتا ہم
اس کی زبان سے سن رہے ہیں ۔ ناول ختم ہونے کے
بعد بھی اس کے مصائب کی درد بھری داستان اور اس
بخیر انجام کا مسرت آمیز اثر ہمارے دل و دماغ پر کافی مدت
طاری و ساری رہتا ہے ۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ
مولانا نے اس ناول میں ایک شریف اور نیک طینت
عورت کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ نہ صرف قابلِ تقلید ہے
بلکہ اردو ناولوں اور افسانوں میں اس کی مثال ملنی محال ہے
سید محمود مورخ ——— ساقی راشد الخیری نمبر

۱۳ ۔ شبِ زندگی حصہ دوم

جنوری فروری ۱۹۳۳ء میں حضرت علامہ
مغفور نے اپنی بہو محترمہ خاتون اکرم کی رہنمائی کے لئے
۵ مہینوں میں لکھی تھی اور نصف کے قریب ہو گئی تھی کہ
کتابت بھی شروع کرادی تھی اور ۱۹۳۳ء ہی میں اس کے
تین ایڈیشن نکل گئے تھے ۔ علامہ مغفور نے سوائے اس

کتاب کے کوئی تصنیف کسی کے نام "ڈیڈی کیٹ" نہیں کی جناب سیل احمد اکبر آبادی نے ان کے مطبوعہ افسانوں کے حقوق خرید کر جب کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اُن کے خط کا جواب علامہ مغفور نے دیا تھا۔ اُنہوں نے "دہلی مرحوم" کے عنوان سے اپنے مضمون میں اس کا ذکر کیا تھا۔ جواب یہ تھا:۔

"ڈیڈی کیشن کی یہ کیفیت ہے کہ میں اس کو مطلق پسند نہیں کرتا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک کوئی کتاب ڈیڈی کیٹ نہیں کی۔ صبح زندگی کے واسطے کوشش بھی ہوئی کہ بیگم بھوپال کے نام معنون ہو۔ مگر مجھے گوارا نہ ہوا۔ ایسی حالت میں اگر کسی دوست کے نام آپ تجویز کریں تو بسر و چشم لیکن کسی بڑے آدمی کا نام آپ تجویز کریں تو مجھے تامل ہوگا۔

غالبًا تمہید سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں اس کی ضرورت سمجھوں۔ مجھے ضرورت نہیں ہے"

لیکن شب زندگی حصہ دوم وہ تصنیف ہے جو علامہ مغفور نے اپنی بڑی بہو خاتون اکرم مرحومہ کو "تحفۂ عروس" لکھ کر رونمائی میں دی تھی۔

"میں تو ڈیڈی کیشن کو بھی چودھویں صدی کی بدعت ہی سے تعبیر کرتا ہوں کہ مصنف صاحب جس پر مہربان ہوئے یا کچھ توقع ہوئی اٹھایا اور کتاب ڈیڈی کیٹ کر مفت کا احسان سر پر رکھ دیا۔ الحمدللہ میں اس بدعت سے آج تک محفوظ ہوں اور اس وقت جو کچھ کر رہا ہوں وہ یہ ایک جذبۂ محبت ہے متاثر ہو کر اپنے بڑے بچے میاں رازق کی دلہن کو یہ کتاب رونمائی میں دیتا ہوں"

حصہ اوّل میں وسیم دلہن کا قصہ ادھورا تھا حصہ دوم میں وہ پورا ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی اس

کتاب میں فاطمہ کا بڑا زبردست کردار پیش کیا گیا ہے۔ "یہ تصنیف کو بیڈی ہے۔ لیکن آپ اس کو شروع سے آخر تک پڑھیئے۔ کیا ممکن ہے آپ کی آنکھیں تر ہو جائیں"۔ فاطمہ ایک مالدار باپ کی بچی اپنی ماں کی جہالت کا شکار۔ فضول خرچیوں اور جہالت کی بدولت باپ کے مرنے کے بعد غربت نے آگھیرا۔ احسان چچا زاد بھائی جس سے فاطمہ کا نکاح ہو چکا تھا۔ ظالم و سفاک اور اپنی سخت دل ماں کے اشاروں پر چلنے والا بیمار ہوا۔ ڈاکٹروں نے انسانی خون علاج میں بتایا، کوئی خون نہ دیتا تھا۔ موت سر پر تھی فاطمہ جس کا بھول کر بھی احسان نام نہ لیتا تھا اور جس کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کرنا چاہتا تھا خفیہ طور پر رات کو آئی اور اپنا خون گردن کی رگ سے نکال کر رکھ گئی۔ فاطمہ کے زہر چڑھا اور وہ بیمار ہو گئی۔ احسان اچھا ہو گیا۔ احسان اور فاطمہ کی دوسری چچی بلقیس نے فاطمہ کو خون دیتے وقت دیکھ لیا تھا۔ احسان نے اچھا ہو کر بھی فاطمہ کا کچھ خیال نہ کیا بلکہ طلاق دیدی اور ثریا سے نکاح کر لیا۔ ثریا نے جو فاطمہ کی بظاہر گہری دوست تھی دھوکہ سے فاطمہ کے نکاح کی نشانی یعنی ہار چرا کر احسان کو دے دیا اور اس طرح احسان کو موقع مل گیا کہ وہ فاطمہ کو بے وفا دغا باز کہے اور طلاق دیدے۔ فاطمہ نے بلقیس کی مدد سے صحت پائی اور اپنی دستکاری کے ذریعہ مالدار ہو گئی۔ بلقیس نے اپنے بیٹے سے فاطمہ کی شادی کر دی۔ احسان پھر بیمار ہوا پھر خون کی ضرورت ہوئی اس کی بیوی ثریا نے خون دینے سے انکار کر دیا۔ ثریا اپنے گھر چلی گئی اور وہاں جا کر فاطمہ کی متعدی بیماری میں مبتلا ہو گئی، احسان نے اپنی ماں کو مرتے دم فاطمہ سے قصور معاف کرانے بھیجا۔ فاطمہ نے قصور ہی معاف نہیں کیا بلکہ اپنے خاوند کی اجازت سے

اپنے خون کا [illegible] عالم ہے — صبا اور فریا کے متعلق مرض
کی [illegible] فارس کا [illegible] گندہ طلاق کے بعد
دوسرا [illegible] کی مثال کا یہ قصہ
ایک اعلیٰ نمونہ ہے ادبی لحاظ سے تصنیف "کومیڈی"
ہے۔ لیکن اس کے ہر ہر صفحہ کو پڑھنے والا غم کی اعلیٰ مصوّری
کی ایسی مثالیں دیکھتا ہے کہ علامہ کو مصورِ غم کہنے پر مجبور
ہو جاتا ہے۔ اس مثال سے آپ پر یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ
ٹریجڈی لکھنے والے اور مصورِ غم میں کیا فرق ہے جو
نقاد اس نکتہ کو نہ سمجھے گا اس کو علامہ کی تصانیف پر علمی
تنقید کرتے وقت بڑا زبردست مغالطہ ہوگا۔

ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"صبح زندگی۔ شامِ زندگی۔ شب زندگی میں زندگی
کی تصویریں بھی ہیں اور یہ تصور بھی کہ زندگی کیسی ہونی چاہیئے"

بنگال میں تاریخ زبانِ اُردو — مترجمہ
از ڈاکٹر سیندر چندر پال ——— خالدہ فہمی

شب زندگی حصہ دوم میں جب وسیم دُلہن پر اپنی
طویل معصیت خیز زندگی کے بعد شدتِ ندامت سے
سکرات کا عالم طاری ہوتا ہے اور نواح کی عورتیں اسے
ولی اللہ سمجھ کر پوجنے لگتی ہیں تو نسترن اس بدعت کو روکتی
ہے . . . . راشد الخیری کے ناولوں کا ماحول تو واقعیاتی
ہے لیکن کرداروں کو کچھ نصب العینی IDEALISTIC
بھی ہیں۔ ان سب کے پس پشت سماجی اصلاح کا مقصد ہے
. . . . . وسیم دُلہن پر نازل ہونے والے قہر اور فاطمہ پر ٹوٹنے
والے آلام اور مصیبتوں کی تاثیر سے اس امر کا موازنہ ہوتا
ہے کہ المیہ ہماری رُوح کو پاکیزہ بنانے میں بڑی حد تک معاون
ثابت ہو سکتا ہے۔ وسیم دُلہن کی مصیبتیں فاطمہ سے کہیں
زیادہ ہیں لیکن اُن کے مطالعہ سے ہمدردی کا جذبہ نہیں پیدا

ہوتا بلکہ خوف سا طاری ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ان مصیبتوں
کے باوجود سرکش رہتی ہے۔ اس کے برعکس فاطمہ کے غم
و آلام ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے کردار
میں شروع سے آخر تک غم و مصیبت کے بہت شکن سلسلے
کے باوجود پُر سکوت رضامندی کی رُوح کارفرما ہے....
اس شدت سے غم و اندوہ کی تصویر کشی کا باعث
علامہ راشد الخیری کا وہ اعلیٰ اخلاقی اصول ہے جو صرف
جرمنی کے اخلاقی فلسفہ دان کانٹ کے غیر مشروط نقادرے
نظریہ پر پورا اُتر سکتا ہے۔ یعنی نیک کام نیکی ہی کی خاطر
کرنا۔ چنانچہ جب بلقیس یہ دیکھ کر کہ فاطمہ کی المناک قربانی
کی دُنیا نے کوئی قدر نہیں کی افسوس کا اظہار کرتی ہے تو
فاطمہ کہتی ہے کہ اس نے جو کچھ کیا کسی توقع پر نہیں بلکہ
اس کا فرض تھا . . . . زلیخا اپنی کوتاہ اندیشی تند مزاجی
اور غرور کے باعث تباہی کی آخری حدود تک پہنچ جاتی ہے
لیکن اس کے ساتھ نہایت پیاری اور نیک مزاج فاطمہ
بھی عبرتناک اور حد سے زیادہ صبر آزما مصیبتیں جھیلتی
ہے . . . . . شکسپیر کے ڈرامہ "اوتھیلو" میں کارڈیلیا کا
اس طرح ناکردہ مشر ہوتا ہے۔ شاید یہ نیک کرداری
عظمت اور شان میں اضافہ کے لئے المیہ میں ضروری
سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ فاطمہ نے نسیمہ کے
مقابلہ میں دسویں حصہ بھی نیک کام نہیں کئے لیکن پھر
بھی اپنی بے پناہ مصیبتوں اور ان کو صبر و شکر کے ساتھ
برداشت کرنے کے باعث فاطمہ کا کردار نسیمہ کے مقابلہ
میں زیادہ درخشاں نظر آتا ہے . . . ."

محمد مرغوب صدیقی ——— عصمت زیدی [illegible]

علامہ مغفور کے سامنے یہ کتاب ۱۱ دفعہ چھپی تھی -
اب تک دونوں حصے الگ الگ شائع ہوتے تھے -

کے ۳۰ صفحے ۔

"علامہ راشد الخیری نفسیات سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ بھولی اور معاصر تقلید کرنے والے نئی روشنی کے دلدادہ خشک وعظ سننے کو ہرگز تیار نہ ہوں گے ۔ چنانچہ انہوں نے خشک سے خشک موضوع کو اپنے افسانوں کے رنگ میں دلچسپ بنا دیا منازل ترقی میں ایک مقام پر علامہ ایک ننگ اسلام جج حضوری نالائق اور ظالم مجسٹریٹ پر تنبیہ کرتے ہیں ۔ مجسٹریٹ کی خدا ترس نیک دل ماں اپنے ظالم بیٹے سے کہتی ہے :۔

"تجھے خبر ہے کہ آج ایک بے گناہ بے وارث اور بے مددگار عورت کا گھر تیرے حکم سے زبردستی چھینا جاتا ہے ۔ مجھے علم ہے کہ ظلم سے ان یتیم بچوں پر ستم توڑ دیا جن کا وارث خدا کے سوا کوئی نہیں ۔ میں واقف ہوں کہ زندگی کے کالی چادر نے تیری آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں ۔ ترقی کی جھوٹی اُمید نے تیرا ایمان غارت کر دیا ۔ شیطان تیرے سر پر دُنیا تیرے دل اور نفس تیرے وجود پر سوار ہے لیکن ذرا اس انجام سے ۔ لرز اس نتیجے سے اور کانپ اس وقت سے جو آنکھیں دیکھیں گی ۔ دل اُٹھائے گا اور جسم بھگتے گا ..... او بد نصیب توبہ کر اور غافل نہ ہو اُس وقت سے جس کا نام موت ہے ۔ تو نے سُنا اور میں نے سُنایا کہ ایک مظلوم عورت ایک بیوہ عورت ایک بد نصیب عورت نے تیری آنکھوں کے سامنے تیرے کان کے اندر تیری دہلیز کے اوپر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیا ۔ وہ نام ہے جس کے اشارے پر تجھ جیسے نابکار کا بیڑا پار ہو جاتا ۔ اسے ذلیل انسان کس بوتے پر تیا پانی ۔ مسلمان ہو کر اسلام کی یہ وقعت !"

[illegible] راشد الخیری

میں سچ کہتا ہوں کہ علامہ کے [illegible] طرز بیان کو ہندوستان کا شاید ہی کوئی افسانہ نگار پہنچا ہو ۔ آپ کے افسانے اپنی انتہائی لطافت اور زور کی وجہ سے بھی دُنیائے افسانہ کے بہترین کارنامے ہیں آپ کے افسانے کے ٹکڑے اپنی انتہائی نفاست کی وجہ سے بہت زبان زد ہو جاتے ہیں"

ڈاکٹر اعظم کریوی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

۳۷ ۔ بچہ کا کرتہ | یہ بھی مختصر افسانہ ہے جو اگست [illegible] کا عصمت پہلا پرچہ تھا جو میری ادارت میں شائع ہوا ۔ یہ دردناک عبرت انگیز افسانہ اس میں شائع ہوا تھا ۔ اس کے بعد کتابی صورت میں پہلی دفعہ [illegible] میں شائع ہوا ۔ اور [illegible] میں آخری دفعہ ۔

" راشد الخیری ہماری معاشرت کے خانگی مسائل کو بڑی چابک دستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں (بچے کے کرتے کی) فیروزہ ایک بیوہ ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے حارث کی پرورش کرتی اور اُمید رکھتی ہے کہ بڑا ہو کر اس کے مرتے ہوئے وقت کام آئے گا گھر میں بہو کے قدم آئیں گے ۔ وہ پوتے پوتیاں کھلائے گی لیکن حارث نے جب اپنی دلہن کا گھونگھٹ اُٹھا تو اس کے رخ روشن پر ایسا فریفتہ ہوا کہ بڑھیا ماں کو بھول گیا ..... بیوی کے بہکانے میں ماں سے نفرت ہوگیا .... مستقبل میں گھریلو زندگی کا ڈھانچہ بدل جائے گا ہر آنے والا نظام ہر بالغ مرد اور عورت کو اس کی محنت کا معاوضہ دے گا لیکن راشد الخیری کی فیروزہ اس وقت بھی زندہ رہے گی ۔ کیونکہ ماں کی ممتا کبھی فنا نہیں ہو سکتی اسی لئے راشد الخیری کے کرداروں کو بقائے دوام حاصل ہے .... حکومتیں بدلیں گی قدریں بدلتی رہیں گی لیکن راشد الخیری کی کتابوں میں ہمیشہ چمک دمک قائم رہے گی ۔ کیونکہ راشد الخیری

تا ہو تی آج کی نسل کو درپیش نئے دلائل کو پرکھ کر معلوم
سکے گا کہ پہلے کیا تھا اب کیا ہے۔"

الحسن نجمی ——— امروز کراچی ۲ فروری سنہ

۳۸ - امین کا دم واپسیں

فروری سنہ کے خطیب میں مختصر تاریخی افسانہ شائع ہوا تھا اور طبع ہو صورت کتاب مارچ سنہ میں چھپ چکا ہے ۳۲ صفحے ہیں۔ سنہ میں دلی سے ہجرت کی تو دلی یونیورسٹی کے کسی امتحان کے کورس میں شامل تھا۔

یہ افسانہ خاندان عباسیہ کے مشہور عالم تاجدار خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹوں امین و مامون کی باہمی جنگ اور امین کے حسرت ناک انجام کی پُر درد داستان ہے۔ امین مامون کا باہمی نزاع ہارون کی حیات میں شروع ہو گیا تھا قابلیت اور علم کے لحاظ سے بھی دونوں میں کسی ایک کو فضیلت دینا مشکل تھا۔ مگر امین عیش و آرام کی طرف زیادہ مائل تھا۔ ہارون مامون کو ولی عہدی کا مستحق اس لئے بھی سمجھتا تھا کہ اس کی طبیعت میں نیکی تھی مگر زبیدہ کی موجودگی میں مجال نہ تھی کہ امین کی مخالفت میں زبان ہلاتا۔ ۔ ۔ ۔ مامون بھی بچہ نہ تھا کہ بن لڑے جھگڑے اپنے حقوق غصب ہوتے دیکھ کر خاموش رہتا۔ چنانچہ جنگ کا فیصلہ ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امین قید ہو کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور وہیں قاتلوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ مولانا وقت کے انقلاب پر اپنے حکیمانہ انداز میں لکھتے ہیں:۔

"زمانہ کا نشیب و فراز چشم بینا کے واسطے صداقت کا راز اور قدرت کی آزمائش ہے۔ آنکھیں وہ منظر فراموش نہیں کر سکتیں۔ جب ہارون کا تاج شاہی اقبال زبیدہ کو وابستہ رہا تھا۔ اور خلافت عباسیہ کا ہر ذرہ اس کے جاہ و حشم کا مرکز اور دولت و حکومت کا گھر تھا۔ انقلاب سلطنت کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا ہے اور سلطنت پر حکومت کرنے والی بیگم کی آنکھوں سے زار و قطار آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاریخ سے بہت زیادہ کتاب زمانہ کے اوراق انقلاب سے بھرے ہیں۔ بڑے بڑے تاجدار خاک میں رل مل کر آغوش زمین میں سوتے ہیں۔ لیکن دنیائے حیات کو جگا دینے والے جواہرات اس کی گود میں دیکھتے ہی دیکھتے ایسے پھیکے پڑے کہ گویا ان کے چہرے سے اور سپیدی سیاہی سے بدل گئی"

سید محمود مورخ بی اے ——— عصمت راشد الخیری نمبر

۳۹ - ویڈیا کی سرگذشت

سنہ میں "گم کردہ موتی تو وہاں بھی نہ تھا" کے عنوان سے رسالہ خطیب میں شائع ہوا تھا۔ کتابی صورت میں پہلی دفعہ اکتوبر سنہ میں شائع ہوا اور ساتویں دفعہ ستمبر سنہ میں۔ چھوٹے سائز کے ۳۲ صفحے ہیں۔

یہ ایک مغربی عورت کی سرگذشت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ ہے مگر ترجمہ نہیں طبع زاد افسانہ ہے اور ان سطروں پر ختم ہوتا ہے۔

"یہ مضمون اگر سرزمین ہندوستان پر پہنچے جہاں عورتیں ہمارے مردوں کی طرح مجبور و لاچار ہیں تو مناسب ہے کہ ناظرین دونوں کو الٹ کر مرد کو مرد اور عورت کو عورت سمجھے اس کے بعد اس کو معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان تک ہزاروں ستم رسیدہ عورتیں بھی بے درد مرد کا شکار ہو کر قبروں میں آرام کر رہی ہیں"

۴۰ - گلدستہ عید

یہ عید اور رمضان کے متعلق ان مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے جو سنہ سے عصمت میں شائع ہوئے تھے

بہلی دفعہ خوبصورت کتاب یہ مضامین ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئے
اور پانچویں دفعہ ۱۹۶۰ء میں ۱۸×۲۲ سائز کے ۹۶ صفحات
ہیں۔ عید کی خوشی (عصمت ۱۹۱۱ء)
خرید کر لیں۔ جنتی دعائیں ناتوانوں کی ۱۹۲۵ء
اور تاریخی افسانہ ام جعفر کی عید ۱۹۱۲ء۔ یہ تین تو کچھ
بڑے ہیں ورنہ دو دو تین تین صفحوں کے ۱۶، ۱۷ مضامین ہیں
اور ایک درد انگیز نظم ہے "عید کا کرتہ"۔ اس مجموعے کے ایک
مضمون سے چند سطریں:۔

"افطاری تیار ہوئی۔ کھانا پک گیا تو گھر سے علیٰ قدر
حیثیت مساجد میں پہنچ گیا۔ افطار سے آدھ گھنٹہ قبل
محلہ کی ماماتیں اور یتیم بچے مسجدوں میں آ جمع ہوئے۔ ایک
طرف برقع والیوں کی قطار ہے۔ دوسری طرف بچوں کی۔
مسجد کے متولی ہر عورت اور ہر بچے سے باخبر ہیں اور یہ
بھی جانتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں در در ہاتھ پھیلانے
والی نہیں۔ افطاری اور کھانا سب کو تقسیم کر دیا صرف
بچوں کے واسطے ایک چیز رکھ لی۔ ادھر افطار کا وقت
ہوا ادھر وہ بھی حوالے کی۔ بچے اذان کی آواز سے بھاگے
اور یہ کہتے ہوئے دوڑے:۔

"روزے والیوں روزہ کھولو"

محلہ بھر میں افطاری بھی پہنچ گئی اور کھانا بھی۔ دینے والے
کا احسان نہ لینے والے کو عار۔ آج افطار کے وقت گولہ
چھٹتا ہے اور وہ نظام فنا ہو گیا۔ لیکن جس وقت میری
آنکھیں افطار کے وقت کسی برقع والی کو سبیل کے
پانی سے روزہ کھولتی دیکھتی ہوں گی تو مجھ پر کیا گزرتی
ہوگی خدا بہتر جانتا ہے"

جس نظم اور مضمونوں افسانوں کے اوپر عنوان لکھے
گئے ہیں ان کے علاوہ یہ مضامین اور افسانے بھی اس مجموعہ
میں ہیں۔ عید کا کھانا۔ مسلمان خواتین اہل خاتون کی ڈائری
۔ عید کا چاند میرے گھر میں۔ رسول اللہ کی عید۔ کنواری
بیٹی کو عید کی مبارک باد۔ سہاگن کی عید۔ بچوں
کی عید۔ ترکن ماما۔ دوگانی عید مہمان عزیز۔ روزے
عیدی۔ گھر کی ملکہ اور عید۔ رمضان اور خیرات۔
یتیموں کی عید۔ بچوں کی عید۔

۴۱۔ نانی عشو — عصمت سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء سے شروع ہو کر تین چار قسطیں رسالہ میں شائع
ہوئی تھیں کہ عصمتی بہنوں نے اصرار کیا کہ کتابی صورت
میں شائع کر دیا جائے۔ یہ مزاحیہ قصہ ہے اس کے ساتھ
تین اور قصے جن میں کئی موقعوں پر مزاحیہ سین ہیں
یہ مجموعہ پہلی دفعہ جنوری ۱۹۳۳ء میں شائع کیا گیا۔ دوسرا
قصہ ہے رفاعی۔ تیسرا سجدۂ ندامت اور چوتھا
نانی عشو علامہ مغفور کے مزاحیہ افسانوں میں بہت ممتاز ہے
ریڈیو سے فیچر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کالجوں اسکولوں میں
بھی نقل دکھائی جاتی۔ دس مرتبہ چھپی ہے ۱۸×۲۲ کے
۵۶ صفحے ہیں۔

"راشد الخیری کی ساری ظرافت اور مزاح نگاری
کا مرکز چند خاص قسم کے کردار ہیں۔ ان کرداروں کو انہوں نے
ساری عجیب و غریب خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے
جیتا جاگتا لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ان کی صورت و سیرت نے
ہمیں ہنسایا ہے اور فطرت و اتفاق کی اس ستم ظریفی نے
بھی جو ان کے چند کرداروں کے لئے مخصوص سی ہو گئی ہے۔
سب سے پہلے مختصر لفظوں میں اس کردار کا تعارف
ہم سے کرایا جاتا ہے۔ اور اس مختصر سے تعارف کے بعد ہی
سے ہم آنے والے دلچسپ موقعوں کا بے قراری سے انتظار
کرنے لگتے ہیں۔ سنئے علامہ نانی عشو کا تعارف ہم سے اس طرح

کرتے ہیں :-

"بی عشو کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی مگر سن تو پچاس
ہی کا ہو چلا تھا۔ مسّی کی دھڑی - پاندان کا لگا -
پور پور مہندی - افشاں و چٹیل - اوس پہ نہال دار کا جل لگا
ارمان! اس پہ چھاجن اور پازیب کی جھنکار اُن کی رفتار
کا ڈھنڈورا! پڑھنے لکھنے کو تو شاید اس کی سات
پشت میں کسی نے الف کے نام پہ بے نہ سُنی ہوگی۔ مگر عشو
اپنا رعب بٹھانے کو اُن کا الف حلق سے نکال علم
کر دیتی تھی؟

یہ بی عشو جو شہر بھر میں دُور دُور تک نانی عشو کے نام
سے مشہور ہیں - زمانہ بھر کی عیار - مکار - فتنہ پرداز ہیں -
آسمان میں تھگلی لگانے والی زمین کو تگنی کا ناچ نچانے
والی - انھوں نے عورت مرد کو اپنے تعویز گنڈوں اور
دوا درمن کے چکر میں پھنسا رکھا ہے - لیکن اتفاق کی ستم
ظریفی اور تخیل کی گل کاری سے نہیں جن جن مصیبتوں میں
مبتلا گیا ہے - وہ ان کے لئے تو مصیبت ضرور تھیں لیکن
سُننے والوں کے سامنے جب یہ تصویریں آتی ہیں تو آدمی
ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے - ایک دن نانی عشو وعظ
فرما رہی تھیں کہ ایک عورت آئی اور کہا چار دن سے میرے
بچے کا بخار نہیں اُترا میرے ساتھ چلو - نانی عشو ساتھ ہو لیں
پہلے تو ربڑی پراٹھے کھائے پھر کمرے میں جا کر پڑ رہیں -
جب اچھی طرح نیند بھر لی تو تین بدھنیاں ایک بغل میں
تین دوسری میں، کوٹھری میں سے باہر نکلیں - اتنے میں
ڈاکٹرنی آ گئی - یہ اُس سے گلے ملنے کو آگے بڑھیں اب
ہاتھ آگے بڑھایا تو ایک بغل کی بدھنیاں دھڑ سے نیچے -
مس صاحبہ آگے بڑھیں اور عشو پیچھے لپکیں - خربوزے
کے چھلکے پڑے تھے پاؤں جو رپٹا تو چاروں خانے چت - مگر
گرتے ہی مس صاحبہ کا سایہ پکڑا اور وہ بھی دن سے نیچے
برآمدے میں طوطے کا پنجرہ تھا - اس کی تیلیاں ٹوٹیں مس صاحبہ
کا ہاتھ اس میں گھسا - طوطے نے سمجھا بلی آئی - ٹیں کرکے
کٹا بھرا تو مس صاحبہ کی پوری اُنگلی اُڑا دی - دس بارہ منٹ
میں ایسی دل لگی رہی کہ مریض بھی ہنس پڑا -

مس صاحبہ کو معلوم ہوا کہ نانی عشو ہیں تو انہیں ایک
جلسے میں شریک ہونے کی دعوت دے گئیں چھاؤنی جانا
تھا - تانگہ پر گئیں - پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا - تانگہ میں
روشنی نہیں تھی اس لئے مس نے نانی عشو کو بستی کے باہر
ہی اُتار دیا - اندھیرا گھُپ تھا - نانی آگے بڑھیں تو ہوش
اُڑ گئے مجاور ایک قبر کھود کفن چُرا رہا تھا -

اتفاق سے ایک سپاہی شہر کا رہنے والا تھا نانی
کو پہچان گیا اور اُن سے حال پوچھا تو مجاور کی زیادتی کا
پتہ چلا - آخر سزا تجویز ہوئی کہ مجاور کا منہ کالا کرکے نانی
کو اس کی پیٹھ پر چڑھایا - اور جیل خانہ والے ڈھول بجاتے
مس صاحبہ کے یہاں چلے - اس شان سے نانی میم صاحبہ
کے یہاں پہنچیں - اُنھوں نے عورتوں سے ان کا
تعارف کرانا چاہا - اتنے میں نانی کو چھینک آئی تو پان کا
چھینٹوں سے مس صاحبہ کے مُنہ پر چھینٹوں نے افشاں کر دی
اس کے بعد اور بھی بہت کچھ ہو ..... یہاں تک کہ نانی
نے اپنی عیاری، مکاری سے مجاور کو اپنے ساتھ شادی
کرنے پر راضی کیا اور نکاح ہو گیا تو ایک عورت نے کہا:-

" نانی نکاح ہو گیا ہو" یہ سُننا تھا کہ نانی ہاتھ میں
جوتی لے کر کہنے والی کے پیچھے لپکیں - چڑیلو، نانی،
نانی کہہ کر میرا گھر کھواؤ گی"

نانی عشو اُن بہت سے کرداروں میں سے ایک
ہیں جن کے گرد راشد الخیری نے تبسم اور قہقہہ کی تعمیر کی ہے

"[illegible] ہیں جو پیرس پہنچ کر بھی لکھنؤ اور دہلی کو نہیں بھولے۔ اور اس بیسویں صدی میں بھی قیس و فرہاد کی یاد تازہ کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ پھر ایک گلشن تعبیں کہ اگر کوئی ان کے پاس بیٹھ کر کلمہ پڑھ رہا ہو۔ اگر کوئی راکھ کسی نے پاس رکھ دیا ہو تو انگشتانی سے بھی پرے دروازے پر جا کھڑی ہو کہیں کہ کر راکھ ٹھا نہ نکالو" یہ ترکفن کے کام میں آتا ہے"۔

پروفیسر وقار عظیم ——— "علامہ راشد الخیری"

" نانی عشو ایک مستقل ظریفانہ افسانہ ہے اور آجکل کے ظرافت نگار اس کے پاکیزہ معیار سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں"

پروفیسر علی عباس حسینی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

" نانی عشو میں علامہ نے نہایت شگفتہ انداز میں مولویوں کے اسلام پر تیز و تند طنز کئے ہیں"

احمد ندیم قاسمی ——— امروز لاہور ۳ فروری ۱۹۵۱ء

۴۲ - سیلاب اشک — ان سات درد انگیز افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء کے عصمت میں شائع ہوئے تھے ہر افسانہ کے ساتھ ہاف ٹون بلاک کی تصاویر تھیں یہ مجموعہ پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اور کراچی ہجرت سے قبل ۵ دفعہ چھپ۔ یہ ۷ افسانے ہیں:-

(۱) پیغام محبت (۲) بلوچن کے تین رنگ۔
(۳) طلاقن کا سفید بال (۴) حج اکبر (۵) مدل گل بدن۔
(۶) بے قصور بچی (۷) ثریا کا تخیل۔

" یہ بات نہیں کہ علامہ قطعی اندھا دھند طریقے پر ماضی کی پیروی کرتے ہیں۔ بکثر ملاؤں پر وہ جگہ جگہ برسے ہیں سیلاب اشک میں لکھتے ہیں:-

" اگر اسلام [illegible] کا نام [illegible] اسلام نے میرے سامنے پیش کیا تو میرا اس اسلام کو دور ہی سے سلام مگر نہیں ہیں مسلمان جاہل اور خود غرض عالم سے ہزار درجہ بہتر"

احمد ندیم قاسمی ——— امروز لاہور ۳ فروری ۱۹۵۱ء

" سیلاب اشک میں حج اکبر پڑھئے اور انسانی ہمدردی اور ایثار و بے لوث معاونت کی تعلیم کی داد دیجئے "طلاقن کا سفید بال" بھولے بھالے زمانہ سے نا واقف اور اقتدار کے سامنے سر جھکا دینے والے علماء کے ناکارہ فتوے کے بُرے نتائج اور ایک چار بچے والی لڑکی اور اس نیک دل خاوند کی عاقبت اندیشی کا سبق آموز افسانہ ہے۔ چار بچوں والی عظمی ساس سے اجازت لے کر میکے جاتی ہے۔ ساس جو بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہے وقت پر انکار کرتی ہے کہ اجازت نہیں دی تھی۔ میکے میں عورت بھائی کے ہمراہ سرکس چلی جاتی ہے سان دو باتوں پر خسر صاحب جو خود مولوی ہیں اپنے دوست عالموں سے فتوے لیتے ہیں "نکاح ٹوٹ گیا۔ طلاق جائز ہے" کا فتویٰ ملتا ہے عظمیٰ کہتی ہے اسے طلاق نہ دی جائے وہ میکے چلی جائے گی اور عمر بھر شکل نہ دکھائے گی وہ دوسرے نکاح کی بخوشی اجازت دیتی ہے۔ لیکن جواب ملتا ہے "بیٹے سب کچھ سن لیا" علماء کا فتویٰ میرے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ میں اپنے والدین کی رضامندی مقدم سمجھتا ہوں" طلاق ہو جاتی ہے لیکن مرد کا ضمیر مردہ نہ تھا اور ایمان موجود اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے رجوع کیا . . . . مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کی مظلوم و بے کس عورت کی حمایت میں یہ ایسی سعی کوشش ہے کہ جس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے"

میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"میں نے پہاڑ کی چوٹی پر گوشہ نشین ہو کر کائنات کا مطالعہ کیا... یہاں تک کہ وہ پوشیدہ گھر دیکھا جہاں دو میاں بیوی اطمینان سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے..... یہ دنیا کی بڑی جنت تھی"

(قلب حزیں)

اچھے افسانے کے لئے جن خوبیوں کی ضرورت ہے وہ سب اس مختصر ترین افسانہ میں موجود ہیں۔ یہ دنیا کا افسانہ ہے۔ دیکھنے میں مختصر لیکن ہر لحاظ سے مکمل اور شاہکار۔ جس بات کو سمجھانے کے لئے ضخیم کتابیں ناکام ثابت ہوتی ہیں اسی بات کو علامہ نے چند لفظوں میں سمجھا دیا یہی افسانہ نگاری کا کمال ہے کہ دنیا کو جنت بنانے کا کوئی راز بتا دے۔ اس مختصر افسانہ میں مصور غم نے رنج و خوشی کا فلسفہ بھی بتایا اور اس کے ساتھ ہی وہ طریقہ بھی بتا دیا کہ ہم اپنی زندگی کو کس طرح سے بسر کر کے دنیا کو جنت بنا سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر اعظم کریوی ـــــــ (عصمت راشد الخیری نمبر)

"علامہ کی ہر کتاب موضوع کے لحاظ سے شاہکار ہے مختصر افسانہ نگاری سے علامہ کا مقصد عورتوں کی ترقی و اصلاح تھا ورنہ اس لحاظ سے نہ کردار نگاری میں مشرق میں نہ مغرب میں کوئی بھی ان سے بازی نہ لے جا سکا۔ اور ضخیم سے ضخیم کتابوں میں وہ بات پیدا نہ کر سکا جو علامہ کی چند سطور میں ہوتی تھی۔ "دنیا کی بڑی جنت" میں علامہ نے لکھا ہے:-

"میں نے پہاڑ کی چوٹی پر..... یہ دنیا کی بڑی جنت ہے"

مندرجہ بالا ایک مکمل کہانی ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو کہانی میں ہونی چاہئیں۔ یہ تو دنیا کی کہانی ہے۔ مختصر لیکن مستند اور جامع اور اس قدر جامع کہ ضخیم سے ضخیم کتاب بھی یہ مقصد پیش نہیں کر سکتی کہ اس

سوانح عمری علامہ راشد الخیری

دنیا میں جنت کیوں کر بنائی جا سکتی ہے

اشارت حسین سے کی گفتگو ـــــــ سنہ ۱۹۳۶ء بزم ادب کراچی

مضمون کا ترجمہ ـــــــ ۳ فروری سنہ ۱۹۶۱ء

"...... جہاں تک تاثر اور تاثیر کا تعلق ہے وہاں سے کہا جا سکتا ہے کہ راشد الخیری کی نثر کے بعض منتخب ٹکڑے بھی اس مجموعہ نظم و شعر کی بہ نسبت زیادہ اثر رکھتے ہیں۔ آدمی پڑھتا ہے۔ سر دھنتا ہے۔ جھومتا ہے روتا ہے۔ رلاتا ہے۔ ہماری نوجوان پود میں انشا نگار کی جو خامیاں ہیں اگر وہ فی الواقعہ انہیں رفع کرنے کی فکر میں ہیں تو ان کے لئے لازم ہے کہ وہ ان انشائیہ ادب کا مطالعہ رکھیں جو آج بھی بار سے لئے روشنی کا مینار، عظمت کا دروازہ ہے اور ان میں راشد الخیری سر فہرست ہیں"

چٹان لاہور ـــــــ ۵ فروری سنہ ۱۹۶۱ء

۴۴ - وداع ظفر یعنی نوبت پنج روزہ

سنہ ۱۹۲۳ء میں بمقام

گنگا پور ستی چند صفحات لکھے تھے کہ پھر تین سال تک آگے کچھ تحریر نہ فرمایا سنہ ۱۹۲۸ء میں دو ماہ میں کتاب پوری کر دی۔ وداع ظفر کا مفصل ذکر صفحات ۲۷۳ ہو چکا ہے۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ ضخامت ۱۸×۲۲ کے ۱۲۸ صفحے تھے علاوہ تصاویر۔ علامہ مغفور کو اپنی تصانیف میں یہ کتاب بہت عزیز تھی۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کے بعد میرے حالات ایسے بدلے کہ اس کا جدید ایڈیشن کراچی سے شائع نہ کر سکا۔ اب سنہ ۱۹۶۴ء میں دسواں ایڈیشن ۲۰×۳۰ کی تقطیع پر شائع ہوگا ضخامت ۱۹۲ صفحے ہے۔

دکھانت (TRAGEDY) لکھنے میں آپ مشرق میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کہیں کہیں آپ نے

ناول شکسپیر کے ڈراموں سے ٹکر لیتے ہیں۔ خاص کر دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا حال تو پڑھنے والوں کو آٹھ آٹھ آنسو رُلا دیتا ہے، آپ کے قلم میں وہ جادو تھا کہ پتھر کے کلیجے کو بھی پگھلا کر موم کر دیتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں ایسے ایسے بلند خیالات ہیں کہ جن سے انسان انگشت بدنداں ہو جاتا ہے۔"

مسز سوشیلا دیوی کھرا

ایم اے - بی ٹی ——— عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

"نوبت پنج روزہ مرحوم کی آخری تصنیفوں میں ہے - اس میں ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ کی روداد درج ہے - اس کا ہر صفحہ بزم آخر سے کچھ بڑھ کر ہی دلچسپ ہے - قلم کا زور اسلوب کی چستی اور شگفتگی بیان کی روانی اور برجستگی ان کی پہلی یا کسی کتاب سے کم نہیں - واقعات ہیں کہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ڈھلتے چلے آرہے ہیں موضوع اگرچہ دل خراش مگر تاریخی تھا - دلی کے آخری تاجدار سے عقیدت واقعہ نگاری کی سدِ راہ نہیں ہوئی - اصلی واقعات جن کا علم بقاعدہ کم وکاست سپرد قلم کر دیئے - ان کی طبیعت اور قلم بڑھاپے میں بھی جوان تھے۔"

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (عصمت راشد الخیری نمبر)

"علامہ راشد الخیری کی طرزِ نوحہ خوانی قابلِ اعتراض نہیں ہے - علامہ نے وداعِ ظفر یا نوبت پنج روزہ میں شاہ ظفر کی زبانی جو نوحہ خوانی کی ہے وہ پروفیسر بوسن کے نظریہ کے مطابق ٹریجڈی کی ان مستثنیات سے تعلق رکھتی ہے کہ جو واقعہ کے لحاظ سے کہیں بھی مبالغہ آمیز نہیں ہو سکتی، شاہ ظفر جن کی سلطنت غارت ہوئی - گھر لٹ گیا - ایک قیدی کی حیثیت میں ہوں اور ان کو اپنے نوجوان لڑکوں اور پوتے کے بے گناہ قتل کی خبر ہے تو وہ اگر دیواروں سے سر نہ پھوڑیں تو اور کیا کریں - اس ایک محبوس بادشاہ یوں نوحہ خوانی کرے :-

"زینت محل میرے پہلو میں دل ہے پتھر نہیں پہلو میں انسان ہے جانور نہیں - مجھ کو سنبھالو - میرا دل چلا میری جان چلی - اچھا - اچھا پیارے بچھڑ جاؤ - بڑھا مظلوم باپ جس کی تقدیر میں تمہارا صدمہ دیکھنا تھا مجبور ہے"

تو کیا اس کو بزدلی کی تعلیم یا بے صبری کا سبق کہا جا سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں - پروفیسر بوسن کہتا ہے کہ کسی ٹریجڈی کو پڑھنے کے دوسرے دن سوچو کہ جس بات یا واقعہ حقیقت نے تمہارے جذبات الم وخوف کو ابھارا تھا وہ واقعہ اس درجہ قابل تھا کہ جس درجہ تمہارے جذبات ابھرے تھے یا نہیں ؟ اگر واقعہ اور جذبات کے ابھار میں تناسب معلوم ہو تو وہ اصل ٹریجڈی ہے اگر نہیں تو وہ ناکارہ مبالغہ آمیزی ہے اور ایسی تصنیف ردی کی ڈگری کے قابل ۔ وداعِ ظفر میں جس سانحہ کا ذکر ہے اس کی اہمیت کو دیکھئے شاہ ظفر کی زبانی علامہ راشد الخیری کے ماتم ونوحہ خوانی کا اندازہ کیجئے - آپ کو نوبت پنج روزہ یا وداعِ ظفر میں مکمل ٹریجڈی نظر آئے گی - ٹریجڈی کی تمام ادبی خصوصیات نوبت پنج روزہ میں موجود ہیں - ٹریجڈی کے کردار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی تباہی وبربادی کا خود ذمہ دار نہ ہو - بلکہ معصوم ہوتے پر تختۂ مشق ہو جائے - بہادر شاہ کی تباہی وبربادی دوسروں کے لئے تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے - علامہ راشد الخیری نے ثابت کیا ہے کہ شاہ ظفر بے قصور تھے معصوم تھے - لیکن جوانوں کے لئے انہوں نے غداری کر کے ان کو ملک بدر کرا دیا - اور ان کے اہل وعیال پر ظلم وستم توڑوا دئے علامہ ایک

سوشل ریفارمر اور مصلح اعظم تھے۔ ٹریجڈی کے غلام نہ تھے
ٹریجڈی کے کمال کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی
تباہی و بربادی کا خود ذمہ دار نہ ہو بلکہ معصوم ہونے
پر تختۂ مشق ہو جائے۔

بہادر شاہ کی تباہی و بربادی دوسروں
کے ذمہ تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے۔

. . . .

ٹریجڈی کا یہ بھی کمال مانا جاتا ہے کہ جو ظلم و ستم
کا بانی ہو وہ مظلوم کا دشمن نہ ہو۔ بلکہ مظلوم کسی دوسرے کی
زیادتی کا خمیازہ بھگتے۔ نوبت پنج روزہ میں علامہ نے یہ
ثابت کر دیا ہے کہ انگریز بہادر شاہ کے ذاتی دشمن نہ تھے
بلکہ مخبروں کی غلط خبروں اور کسی خاص سیاسی پالیسی کی وجہ سے
ظفر کے بچوں کو موت کے گھاٹ اترنا پڑا اور شاہ ظفر سے
دہلی چھوٹی اور رنگون میں اس مصیبت زدہ بادشاہ کو بے یار و
مددگار بقید فرنگ رہنا پڑا۔ ٹریجڈی کی تمام علمی ادبی خصوصیات
کو یکجا کر کے نوبت پنج روزہ پر تنقید کرنے والا شخص بآسانی
اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ گو علامہ راشد الخیری نے نوبت
پنج روزہ ایک تاریخی مجموعہ کے طور پر لکھا ہے لیکن اس کو
ایک مکمل ٹریجڈی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے"

میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ———— عصمت راشد الخیری نمبر

"جس روز نوبت پنج روزہ ختم کر چکے تو آئے اور
کہنے لگے "میاں اب کے تم خوش ہو جاؤ گے بجھتے ہوئے
چراغ کی لَو ذرا ابھار دی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ تتلانے
والے بھی نہ رہیں گے۔ جس دن تمہاری نانی اماں اور والدہ کی
خدانخواستہ آنکھیں بند ہو گئیں تو وہ زبان بولنے والے
بھی نہ رہیں گے جو میں لکھ رہا ہوں" اور یہ بھی کہا جس دن
ہم مر گئے اس دن اس زبان کو سمجھنے اور اس کا مزہ لینے
والے بھی کم ہو جائیں گے" کہنے لگے۔
"آصف میاں یہ باتیں کہنے تو تمہارے پاس
آجاتا ہوں"

سیما آصف علی بیرسٹر ———— عصمت راشد الخیری نمبر

"مولانا کا یہ احسان کبھی نہیں بھلایا جا سکتا کہ انہوں
اپنے تاثرات کو "وداع ظفر" کی صورت میں قلم بند کر دیا
یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم اور
طرز بیان کے اعتبار سے نہایت شاعرانہ چیز ہے۔ اس کا
ایک ایک لفظ موتی اور ایک ایک سطر سلک مروارید
ہے ..... اپنی قسمت کا فیصلہ سننے سے پہلے آخری
تاجدار دہلی نے جو تقریر کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے
سیاہی سے نہیں بلکہ آنسوؤں سے لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر
دل خون ہوتا ہے اور کلیجہ کٹتا ہے۔

"میں وہ شخص ہوں جس کی بدنصیبی پر تقدیر بھی رونے
کا حق رکھتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا کوئی لمحہ اطمینان سے
نہیں گزرا۔ جوانی اور بڑھاپا دونوں دکھ سہتے سہتے اور
رنج سہتے سہتے بسر ہوئے۔ چند روز باقی ہیں وہ بھی نہ
معلوم کیا کیا دکھائیں گے۔ جن آنکھوں کی ایک گردش
دنیا کو مالا مال کرتی وہ عمر بھر روئیں اور اتنا روئیں کہ آنسو
خشک ہو گئے۔ جن ہاتھوں امور سلطنت کو ایک اشارہ میں
زیر و زبر کر دیتے انہوں نے جوان جوان بیٹوں کے جنازے
ڈھوئے اور اتنے ڈھوئے کہ اب سکت باقی نہ رہی۔ خاندان
شاہی کی ناموس میری آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہوئی
مجھ پر اور میرے بچوں پر کربلا کے سے فاقے گزرے۔ کلیجے
کے ٹکڑے میرے سامنے خون میں نہلائے گئے اس کے بعد
بھی میں کسی سزا کا مستحق ہوں تو خدا کی مرضی مقدم ہے
اور میں اس کے واسطے تیار ہوں"

ایڈیٹر ساقی ———— عصمت راشد الخیری نمبر

"نوبت پنج روزہ میں بہادر شاہ ظفر کی پانچ نوبتیں حد درجہ دردناک پیرایہ میں لکھی ہیں۔ یہ داستان کی نہایت خود لیا کہ کم درد انگیز ہے اس پر مصور غم کا قلم دنیا کے حزنیہ ناولوں میں ایک بہترین چیز بن گیا ہے۔ ناممکن ہے کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت دل انسان اسے پڑھ کر آنسو نہ بہائے ..... اس ناول میں متعدد مقامات پر اس قدر دردناک پیرایہ بیان ہے کہ بے اختیار خون کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ اس قدر المناک ناول کے لئے مصور غم کے علاوہ ہر قلم عاجز ہے۔"

سید محمود مورخ ـــــــــ عصمت راشد الخیری نمبر

۷ نومبر سنہ ۱۹۶۳ء کو دیوان عام لال قلعہ دلی میں یوم ظفر منایا گیا تھا۔ بزم ظفر کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نائب صدر جمہوریہ بھارت کی تقریر کا ایک ٹکڑا:۔

" اگر آپ اس موہنی کا جو شہستان مغلیہ کی اس آخری شمع میں تھی اصل راز جاننا چاہتے ہیں تو ان کے حالات میں ان دلداریوں اور وضع داریوں کے واقعات پڑھیے جن کی ایک مثال راشد الخیری نے لکھی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے آبا و اجداد میں ایک اور بدنصیب بادشاہ عالمگیر ثانی گزرا ہے جسے اس کے نمک حرام وزیر نے قتل کر کے اس کی لاش جمنا کے کنارے جنگل میں پھنکوا دی تھی اتفاق سے ایک برہمن عورت رام کور نے لاش کو دیکھ کر پہچانا .. .. عالمگیر کے بیٹے شاہ عالم نے رام کور کو اپنی منہ بولی بہن بنا لیا۔ اور وہ ہر سال سلونوں کے دن بادشاہ کے راکھی باندھنے لگی ..... بہادر شاہ کے ذکر میں راشد الخیری نے اس تقریب کا سماں ان الفاظ میں باندھا ہے:۔

" ادھر بادشاہ نماز سے فارغ ہو کر باہر آبیٹھے۔ برہمنوں نے آسیس دی۔ سواریوں نے زمانے کے نعرے بلند کئے اور قلعہ اس صدا سے گونج گیا۔ عالی جاہ ظل اللہ سلامت۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ قلعی باغ میں آموں کے جھنڈ جھلے ہوئے ہیں۔ جامنوں کے گچھے ہوا میں جھوم رہے ہیں۔ زمین پر گلگوندوں کی بہار ..... آسمان پر بگلوں کی قطاریں دل کے پار ہوتی جا رہی ہیں۔ پپیہا الاپ رہا ہے۔ کوئل کوک رہی ہے۔ نقارے پر چوٹ پڑی نفیری بجی اور جھولے میں جھولنے والیاں گئیں پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ جھونٹے مل رہے ہیں۔ دوپہر تک جھولے اور پکوان ہوتے رہے۔ کھانا کھایا اور بادشاہ سلامت نے اپنے ہاتھ سے زمردیں جوڑیاں ایک ہاتھ میں پانچ ایک میں تین اپنی ہندو بہن کے باندھیں اور ساتھ والیوں کو جوڑے عطا ہوئے۔ نقد روپے ہوئے گئے۔ مٹھائیوں کھجوریوں پوریوں کے تھال ساتھ ہوئے اس طرح بہن بھائی کے انعام اکرام سے مالا مال رخصت ہو گئی"

۴۵ ـ طوفانِ اشک

یہ مجموعہ ان افسانوں کا جو سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۲۶ء کے زمانہ میں رسالہ عصمت میں شائع ہوئے تھے پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۹ء میں چھپا تھا۔ مصنف کے سامنے ۳ دفعہ شائع ہوا اس میں یہ ۱۲ افسانے ہیں:۔

(۱) محروم وراثت (۲) کلنک کا ٹیکہ (۳) بیوی کی صحنک پر بیوہ لڑکی (۴) رواج کی بھینٹ (۵) سوتیلی ماں کا آخر وقت (۶) اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے (۷) شہید معاشرت (۸) توصیف کا خواب (۹) تغیر عبادت (۱۰) نئی دلہن۔ (۱۱) میں نے کیا دیکھا (۱۲) دولہن دونوں کی۔

آخری ایڈیشن کی ضخامت ۱۲۰ صفحے ۲۲×۱۸ تقطیع کے تھے۔

"طوفانِ اشک اور سیلابِ اشک کے ہر دو فسانے کے ذریعے دونوں اصلاحی کام کیا گیا ہے کہ قوم علّامہ کا جس قدر بھی احسان مانے کم ہے۔ محروم وراثت (طوفانِ اشک) میں ایک باپ اپنی لڑکی کو اپنے مال سے محروم کر کے لڑکے کو دے دیتا ہے۔ فالج کا دورہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بجلی کا علاج بتاتے ہیں جس کا تخمینہ چار ہزار روپیہ ہوتا ہے۔ لڑکے کو بلایا جاتا ہے۔ صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ حال سن کر لا جواب دئے چلا جاتا ہے۔ ماں پیچھے جاتی ہے کہ جواب ملتا ہے:۔

"تمہاری نوعقل جاتی رہی ہے۔ اوّل تو روپیہ ہے ہی نہیں۔ اور اگر ہوتا بھی تو علاج فضول ہے۔ میں نے معلوم کر لیا ہے کہ موت یقینی ہے۔ اگر کچھ روز بچ گئے تو سو ہاتھ مدح ہوں گے۔"

اب لڑکی کو خبر ہوتی ہے وہ خط لکھتی ہے:۔

"ڈپٹی صاحب کچہری میں ہیں۔ جس طرح ہوگا آج ہی رات کو یا کل فجر حاضر ہوں گی۔ میرے آنے کا ذکر نہ کیجئے خفا ہوں گے۔ سلطنت جاؤں گی۔ ترس رہی ہے شکل دیکھ لوں گی۔ اچھی ماں جان! علاج میں کمی نہ کرنا۔"

لڑکی صبح آتی ہے۔ روپیہ کی سن کر الٹے پاؤں جاتی ہے۔ رات کو دس بجے روپیہ ماں کو لا کر دیتی ہے۔ ماں خوشی خوشی باپ سے کہتی ہے۔

"رضیہ یہ چار ہزار روپیہ لائی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے جو پانچ ہزار روپیہ اس کو نقد دئے تھے اس میں سے یہ لیجئے اور علاج کیجئے۔"

"رواج کی بھینٹ" میں "زچگی کی خرابیوں کا نتیجہ اس طرح دکھایا گیا ہے:۔

"صورت شکل ہنر سلیقہ، عطیہ ہر اعتبار سے بے مثل لا جواب نہیں تو سو دو سو میں ایک لڑکی تھی، خوش قسمتی سے شوہر بھی ایسا ملا کہ ذرا اس کے سر میں درد ہوتا تو مچھلی کی طرح تڑپ جاتا اور گھنٹوں بے چین رہتا"

ایک سال بعد:۔

"افسوس پہلونٹی کا بچہ پیدا ہوتے ہی دنیا چھوڑ کے اور اس اور امراض کے ساتھ ہی شوہر کی بے التفاتی شروع ہوگئی ایک کٹر اور ظالم سوکن آ پہنچی:۔

"اور مطالبۂ حقوقِ نسواں کو لغو اور فتنہ قرار دینے سے مسلمانوں میں سے ایک دو بیویوں پر اسلامات قائم رکھنے کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ کڑکڑاتے جاڑوں میں بیمار عطیہ دودھ پیتے بچے کو کلیجے سے لگائے میاں اور سوکن کے لئے چائے بنانے اور انڈے تلنے" اور جب اس خلافِ فرض کو ادا کرنے میں ہوا کے جھونکے تیر کی طرح کلیجہ میں لگ رہے تھے گلے میں پرانی روئی کی کرتی سر پر معمولی چادر۔ پورا ہوا نے ہڈیوں میں اولے بچھا دئے۔ اس غضب کا درد اٹھا کہ بے قرار ہوگئی"

اور جب اس درد کی وجہ سے تڑپ رہی تھی:۔

"دولہا دلہن اٹھے۔ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ دونوں آگ بگولا ہوگئے اور نئی دلہن نے کہا تم نے اپنے ساتھ میری بھی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ بھلا یہ وقت ناشتہ کا ہے ابھی آگ بھی نہ سلگی...... ان کو تو چکر آ رہے ہوں گے"

وہ حسن جو عطیہ کے سر میں اگر درد ہو جاتا تو مچھلی کی طرح تڑپ جاتا۔ عطیہ کو یہ کہتے ہوئے مارنے چلا:۔

"اٹھ کھڑی ہو مکار۔ ابھی آگ سلگا۔ نہیں تو مارے تھپڑوں کے منہ پھیر دوں گا"

وقت پر عطیہ کا باپ جو شہر کا مشہور وکیل تھا آ پہنچا "حسن بیوی پر شیر تھا لیکن خسر کے سامنے بھیگی بلی۔ عطیہ نے باپ کو آتا دیکھ کر دوپٹے سے آنسو پونچھے سنبھل کر

بیٹھی۔ سلام کیا۔ مزاج باپ نے پوچھا مگر اس نے یہی کہا "خدا کا شکر ہے اچھی ہوں"

حسن عطیہ کو باپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ لیکن بچے کو رکھ لیتا ہے۔

"بچہ اپنی پھوپی کے پاس گاؤں میں ہے لیکن تم ابھی لحاظ اگر فوراً نہ آئیں تو صبح ہی زوجیت کا دعویٰ کردوں گا۔ اور عدالت کا حکم لے کر چوٹی پکڑ کر گھر میں گھسیٹتا لاؤں گا"

عطیہ کا باپ اپنی اور بیمار بیٹی کی عزت رکھنے کیلئے کہتا ہے:

"جاؤ خدا کے سپرد" لیکن عطیہ سخت بیمار تھی۔ بچے کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ بچہ کسی گاؤں میں تھا جس کے گھر جا کر بھی بچے کو نہ دیکھ سکی تھی۔ مایوسی خوف اور شدت مرض کی تاب نہ لاکر "ہائے میرا بچہ" کہہ کر دم توڑ دیتی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ وہ پُر اثر حربے جو علامہ نے عورتوں کی حمایت اور بے جا رسوم کے توڑنے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے پیش کر دوں"

میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— (عصمت راشد الخیری نمبر)

۴۶ تمغۂ شیطانی

یہ افسانہ جنوری ۱۹۲۸ء کے عصمت سے شروع ہو کر ستمبر ۱۹۲۹ء کے پرچہ میں ختم ہوا تھا اور اسی سال بصورت کتاب شائع ہوا۔

۲۲×۱۸/۸ کے ۸۰ صفحے ہیں۔ ہجرت سے قبل ۶ دفعہ یہ تصنیف شائع ہوئی۔

افسانہ کا لب لباب یہ ہے کہ شیطانی دربار میں وزیر سلطنت سجدہ کے بعد عرض کرتا ہے:۔

"میں اس وقت شیطنت حضور کے روبرو سات انسانوں کی تصویریں پیش کرتا ہوں جنہوں نے خدا کے قدیمی نمک خوار ہونے کے باوجود حقیقت کو پہچان لیا اور باغی ہو کر شیطنت حضور کی امت میں داخل ہو گئے"

ہر تصویر کا افسانہ بے حد دلآویز ہے اور سب کچھ سننے کے بعد کتاب کے آخر میں شیطنت حضور خداوند عزازیل کے تبصرہ کا خلاصہ یہ ہے۔

پہلی تصویر نماز روزہ کے سخت پابند ایک مفتی کی ہے۔ ایک بڑھیا اپنی لڑکی کی شادی کا معاملہ ان کے سپرد کرتی ہے اور وہ ذات شریف معاملہ کو اُڑا اپنے بھتیجے سے اس کی شادی کر دیتے ہیں۔

دُوسری تصویر خاں صاحب کی ہے جو اپنی زندگی شیخ چلی کی حیثیت سے بسر کر رہے ہیں ان کی بیوی سوتیلے بیٹے سے انسانیت سوز سلوک کرتی ہے۔

تیسری تصویر ایک مکار عیار عورت کی ہے اور چوتھی تصویر ایک نہایت ظالم شخص کی ہے اس کا سرا اُس کی چار سال بچی دبا رہی تھی کہ سانپ نکلتا ہے اور چاہتا ہے کہ شخص کو ڈسے کہ بچی پکڑ لیتی ہے اور باپ کو بچاتی ہے سانپ بچی کے کاٹتا ہے۔ بچی کے مر جانے سے وہ شخص اس لئے خوش ہوتا ہے کہ باپ بننے کی ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کا خواہش مند تھا۔ پانچویں تصویر کے سلسلہ میں حقوق نسواں پر بحث ہے۔ خداوند عزازیل کے تبصرے کے الفاظ ہیں:۔

"ہماری کوششوں سے مسلمانوں پر نفس اتنا غالب ہو چکا ہے کہ شاید ۱۰ فیصدی عورتوں کو بھی بمشکل وہ حقوق حاصل ہوں گے۔ جو ان کے خدا نے مرحمت کئے۔ اور اس وقت نوے فی صدی ہماری امت میں شامل ہیں ہماری شیطنت کو اس مسلمان کی قدر کرنی چاہئیے جس نے منصف کی حیثیت سے قرآن و حدیث کو روندا اور خلع

کو جو خدائی فیصلہ تھا اپنے قلم سے کاٹ کر ہماری اُمت میں داخل ہوا"

چھٹی تصویر ایک نہایت جاہل مشرک عورت کی ہے۔ اور ساتویں تصویر جس پر شیطان کا تمغہ دیا جاتا ہے اس شخص کی ہے جس نے اپنی بیٹی کو ترکہ سے محروم کیا۔

تمغۂ شیطانی میں کئی مناظر مزاحیہ بھی ہیں۔

"نثر میں شاعری ..... انہیں مقامات پر نثر نظم کی ہم پلّہ نظر آتی ہے۔ مولانائے مرحوم کے اس کمال کی مثالیں ان کی تصانیف میں اتنی زیادہ ہیں کہ دل نہیں چاہتا کہ ایک ہی مثال پر اکتفا کی جائے۔ پھر بھی ایک مثال ملاحظہ ہو مصنف مرحوم تمغۂ شیطانی میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"جس وقت افواج خداوندی کا سپہ سالار میکائیل یہ واقعات بیان کر رہا تھا تو اس کی آنکھ سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اور جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں سے آگ کی چنگاریاں نہ نکل رہی ہوں۔ ملاءِ اعلیٰ کی ہر شے اس وقت ساکت تھی حتیٰ کہ دودھ اور شہد کی نہریں بھی خاموشی سے اس کا منہ تک رہی تھیں۔ طیور اپنی راگنیاں بھول چکے تھے ہَوا اپنی موسیقی ختم کر چکی تھی اور فلک چہارم سے کہ جہاں یہ جلسہ منعقد ہوا تھا عرش معلیٰ تک سناٹا طاری تھا۔ صرف ایک مرتبہ جب میکائیل جلال عزازیلی کی تصویر الفاظ میں اُتار رہا تھا حوروں کے ایک دستے نے لعنت لعنت کے نعرے بلند کئے۔"

"..... علامہ مرحوم کی یہ تصنیف "تمغۂ شیطانی" تمام تر اور بجنسٖہٖ اور اُردو ادب میں بالکل اچھوتی چیز ہے۔ اس کتاب میں تخیل کی وسعت، بیان کی دلآویزی اور محاکات پر قدرت بوجہ اتم موجود ہے۔ اس فسانہ میں نہایت چھوٹے عنوان سے آسمانی فرشتوں میں شیطانی کارپردازوں کی رپورٹ پیش کی گئی ہے اور آخر میں شیطان کی زبانی ہر قصہ کا تجزیہ بھی خوب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اور غالباً مولانا کی سب سے بہتر تصنیف ہے"

پروفیسر علی عباس حسینی ———— عصمت راشد الخیری نمبر

۴۷۔ شہیدِ مغرب

اس مجموعہ میں کچھ تو وہ مضامین اور افسانے ہیں جو جنگِ طرابلس جنگِ بلقان وغیرہ سے متاثر ہو کر ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء عصمت و تمدن میں لکھے تھے اور کچھ مضامین مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور حکیم اجمل خاں مرحوم مولانا عارف ہسوی مرحوم اور ملا واحدی صاحب کے اصرار پر ہندو مسلم فسادات پر ہمدرد دلی تنظیم امرتسر۔ اور انقلاب دہلی میں لکھے تھے۔ بعض مضامین مسلمانوں کے تنزل پر خون کے آنسو ہیں۔ یہ مضامین بصورت کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئے تھے اور ۱۹۳۶ء میں مصنف کے سامنے تیسرا ایڈیشن چھپا تھا۔ ۲۲×۱۸ کے ۱۲۰ صفحے تھے۔ مجموعہ میں یہ ۱۰ افسانے اور مضامین ہیں:۔

(۱) شہیدِ مغرب (۲) دو آسمانی ساز (۳) شہید طرابلس (۴) طرابلس سے ایک صدا (۵) ایک عرب سیدانی (۶) سیاہ داغ جس کا ذکر صفحات ۳۶۷ کیا جا چکا ہے۔ (۷) افراط و تفریط (۸) صدائے دل گداز (۹) کلو خیاں (۱۰) میمونہ۔

"میری آنکھوں میں وہ نظارہ اب تک ہے جب عصمت کے دورِ اوّل میں علامہ راشد الخیری کا مضمون "روضۂ مطہر پر ایک عرب سیدانی" شائع ہو کر میرے ہاتھ میں پہنچا تھا اور میں نے اپنے ۵۵ بڑے اور چھوٹوں سے بھرے

گھر میں پلتا تھا تو یہ پڑھا ہو عصمت کوئی ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ رو دیا ہو۔ کیا زور قلم کا اثر تھا؟ کیا انشاء کی بندش رُلا رہی تھی؟ کیا دہلی کے ایک ادیب کی قابلیت لکھتی تھی۔ ہرگز نہیں وہ تو اس حساس دل کے درد کی آواز تھی جو عورتوں کی مصیبت کے علم ہی سے نہیں خیال تک سے تڑپ جاتا تھا۔　(عصمت ارچ ۱۹۳۶ء)

. . . اگر یہ دیکھنا ہے کہ اخوتِ اسلامی کی تعلیم کس طرح دی جاتی ہے اور یہ احساس کہ تمام دُنیا کے مسلمان بھائی بھائی ہیں کس طرح پیدا کیا جاتا ہے۔ اور اگر مغرب میں ایک مسلمان کے کانٹا چبھے تو مشرق میں ہر مسلمان کے کیوں کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ شہیدِ مغرب کے افسانے بالخصوص طرابلس سے ایک صدا" ایک عرب سیدانی شہید طرابلس" پڑھیے۔ اگر آپ اپنے آنسوؤں کو روک سکیں۔ اگر آپ دنیا کے ہر مسلم مرد اور عورت کو اپنے بھائی بہن سے زیادہ عزیز نہ شمار کرنے لگیں تو میرا ذمہ۔

"مسلمان بہنو! تمہارے لال تم کو مبارک، تمہارا سہاگ رہتی دُنیا تک۔ عید کی خوشیاں تمہیں نصیب اور دُنیا کی بہاریں تمہارے لئے سلامت، مگر جس وقت اپنے بچوں کو کلیجے سے لگاؤ، گود میں لو اور تمہاری محبت بھری نظریں ان پر پڑیں اس وقت ان ماتا کی ماری ماؤں کو بھی یاد کر لینا جو اپنے چلتے پلائے لال لُٹا چکیں اور خود زخمی ہو کر ایک ایک دانہ کو محتاج ہو گئیں۔"

(روضۂ اطہر پر ایک عرب سیدانی)

آج کوئی آئے اور مجھے بتائے کہ اس دل گداز طرز اور اس مؤثر اندازِ تحریر کا کیا کوئی جواب دے سکتا ہے انیس کی نظم اور علامہ راشد الخیری کی نثر ادبِ اُردو کے وہ جواہر پارے ہیں جن پر ہم مشرقی جس قدر ناز کریں کم ہے

. . . علامہ نے جہاں اخوتِ اسلامی کی بے بہا تعلیم دی ہے وہاں ہندوستان کی سیاسی حالت اور ہندو مسلم نفاق کی اصل وجہ اور اتحاد کی کوشش پر بھی بڑے مؤثر پیرایہ میں ایسے ایسے مضامین لکھے ہیں جو ہندو مسلم دونوں فریقوں سے خراجِ تحسین ادا کر چکے ہیں۔

"یہ ذلیل کیسے ہیں؟ ایک اپنی اصلیت کو بھول کر آج ہمدردی کے سامنے تن کر کے بھو نکتے ہیں (یعنی ہندوستان کی آزادی طلب کرتے ہیں) اچھا ان سے کچھ ملتے جلتے سیاہ داغ لگا دو۔ یہ وہی ہیں جو کل تک ڈاکوؤں لٹیروں کا شکار تھے جن کی گذر کل تک جنگل کی بناسپتی تھی یہ وہی ہیں جو کل تک اُٹھتے جوتی بیٹھتے لات تھی آج ہماری قید میں آکر ان کے پنجروں کی تیلیاں فینسی ہیں اور انواع و اقسام کے لذیذ و مرغن کھانے ان کی غذا . . . . اس کا معاوضہ ایسا ذلیل . . . . ایک بڈھا وزیر اُٹھتا ہے اور جواب میں کہتا ہے "کچھ شک نہیں کہ حکومت کی طاقت زبردست ہے مگر مظالم حد سے گذر جانے کے بعد یہ سکوت سے زیادہ طاقتور ہیں"

ایک بیوہ کا جوان لڑکا جس کی شادی کی بہت سی رسمیں ادا ہو چکی تھیں حکومت کی گولی کی نذر ہوتا ہے تو موت کی خبر سُن کر بیوہ ماں کی زبان سے علامہ کہلواتے ہیں :-

"خوش نصیب ہے وہ ماں جس کی محنت اس طرح ٹھکانے لگی"

علامہ نے جہاں مشرقی تہذیب کی خرابیاں بیان کی ہیں وہاں خوبیاں کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ مغربی تہذیب کو بے عیب سمجھنے والے حضرات کے لئے شہیدِ مغرب میں مغربی تہذیب کی اصلیت کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ دل ہل جاتا ہے اور تہذیب جدید اور مقتل انسانیت کے مدعیوں پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے"

میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——————— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"علامہ نے اپنے افسانوں کے پلاٹ اپنے کرداروں کے اعمال ان کی نقل و حرکت اور افسانے کی ترکیب میں نفسیاتی پہلو کو بے حد ضروری سمجھتے تھے۔ نفسیات کا دوسرا نام فطرت سے مطابقت ہے۔ چنانچہ مصور غم نے اپنے ہر افسانے میں خاص طور سے قوم کی ذہنی بے حسی کو دور کرنے کی تلقین کی ہے اور لطف یہ ہے کہ پھر افسانے کی دلچسپی اور کیفیت میں کہیں کمی نہیں آتی جنگ طرابلس میں اٹلی نے مسلمانوں پر جو ظلم کئے اس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے بھلا علامہ کے درد بھرے دل پر اس کا اثر کیوں نہ ہوتا۔ ان کا تو اصول ہی تھا۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آپ نے ہندی مسلمانوں کو مصیبت زدہ مظلوم طرابلسی مسلمانوں کے حال زار پر اپنے افسانوں کے ذریعے سے توجہ دلائی۔ بقر عید کو علی الصباح ایک بدنصیب مسلمان عورت طرابلس کی ایک پہاڑی پر کھڑی ہے صورت مجسم مصائب کی تصویر ہے جاڑے کا موسم برف کے تودے چاروں طرف جمع ہیں مگر یہ بدنصیب جس کے پاس صرف پھٹا ہوا چیتھڑا بدن کے ڈھانکنے کے واسطے ہے سکڑی کھڑی ہے اور فریاد کر رہی ہے۔ مولانا اس کے جذبات کی ترجمانی یوں فرماتے ہیں:۔

"ہندوستانی مسلمانو! اس سے اور صرف اس لئے کہ میں بھی تمہارے کلمہ کی شریک ہوں اگر تمہارے لحاف اور توشکیں اجازت دیں تو میری حالت زار دیکھو۔ بھائیو! برس کے برس دن ایک دکھیا قسمت کی ماری بہن کی مبارکباد قبول کرو اس بہن کی جس کی چھاتی سے خون اور دوسری سے دودھ کا دریا بہہ رہا ہے۔ دودھ ان بچوں کی یادگار ہے جو مہینوں اور برسوں میرے سینے پر لیٹے اور چھاتی پر رہے اور خون ان بہادروں کا جو طرابلس میں میرے جگر کے ٹکڑے قوم و ملت کی حفاظت میں میری آنکھوں کے سامنے شہید ہوگئے۔ اپنے بچوں کو کلیجہ سے لگانے والی ماؤ اور شفقت پدری کے جوش میں اپنے بچوں کو کلیجہ سے لپٹانے والے ابو۔ میرے کلیجے کے ناسوروں پر بھی نظر ڈالو۔ چار بچے خون میں نہا کر تمہارے سامنے آن پہنچے زخمی چھاتی انہیں کلیجے کے ٹکڑوں پر فدا ہے جن کے دم سے زندگی کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اولاد والے بہن بھائیوں تمہارے بچے زندہ اور تمہاری آنتیں ٹھنڈی رہیں۔ میرے پھول بھی تمہاری طرح نو مہینے میرے پیٹ میں رہے ہیں۔ میں نے بھی خون جگر پلا کر بڑا کیا تھا۔ عمر کی کمائی یہی چار لال تھے جو بے گور و کفن پڑے ہوئے ہیں"

"ظالموں نے مرتی دفعہ مجھے کہلا کے بھیجا ہے کہ دیکھنے نہ دیجئے۔"

(شہید مغرب)

ڈاکٹر اعظم کریوی ——————— (عصمت جولائی ۳۶ء)

۸۴ تفسیر عصمت

۱۹۳۰ء میں عصمت کے نقرئی جوبلی نمبر میں شائع ہوا تھا بصورت کتاب ۱۹۳۹ء میں چھپا ۶ دفعہ شائع ہو چکا ہے ۲۲×۱۸ کے ۴۰ صفحے ہیں۔ ضخامت کے اعتبار سے بہت موثر مختصر افسانہ ہے درد انگیز غم ناک۔ دل خراش مگر اس میں دو تین جگہ مزاحیہ بھی ہیں۔

اس افسانہ کی چند سطریں یہ ہیں:۔

"عصمت تجھ کو یاد ہو گر یہ سبق تجھ کو پڑھایا ہے جب شہنشاہ جہانگیر نے اپنا تاج شاہی بھرے دربار میں یہ کہہ کر بڑھیا کے قدموں میں ڈالا "تیری عصمت کی بھیک اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے"

[illegible]

اور دسویں باب کی آخری سطریں یہ ہیں :-

"میں چاہتی ہوں کہ مسلمان بھائیوں کو یہ پیغام پہنچا دوں، چاہتا ہوں کہ عورت کو اتنا ذلیل و حقیر نہ سمجھیں جتنا مولویوں اور اکثر مسلمانوں نے سمجھ رکھا ہے۔ وہ اسی عزت اور احترام کی مستحق ہے جو مذہب مقدس یعنی اسلام نے اس کو عطا فرمایا۔ خلع اس کا جائز حق ہے اور ہم کو اسے چھیننے کا اختیار نہیں۔"

٤٩ - ولایتی ننھی | یہ مزاحیہ افسانہ بھی نانی عشو کی طرح قسطوار عصمت میں چھپنا شروع ہوا تھا۔ ناظرین عصمت کے اصرار پر عصمت میں ختم ہونے سے پہلے ہی نومبر ۲۹ء میں بصورت کتاب شائع ہوا۔ جنوری [illegible] میں ساتویں مرتبہ چھپا۔

"مصور غم کے پیش نظر ہمیشہ عورت رہی۔ حزن نگاری میں تو اس معاملہ میں دنیا کے بہت کم مصنف اس پائے کو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ظرافت نگاری میں بھی عورت کو جس طرح انہوں نے ہمیشہ سامنے رکھا کم از کم اردو میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی ...... سب سے بڑی بات یہ کہ مصور غم کی مزاح نگاری خالی خولی باتیں ہی نہیں۔ سطح ذہن پر نقش دوام ہے کیونکہ اس کا پہلو اصلاحی ہوتا ہے۔ "ولایتی ننھی" قطعی سنجیدہ بن کر پڑھنی ناممکن ہے۔ آپ خوش ہوتے ہیں یا ہنستے ہیں لیکن جب مندرجہ بالا الفاظ پر نظر پڑتی ہے تو ایک ساعت کے لئے ذہن ظرافت سے ہٹ کر عورت کی جہالت پر غور کرنے لگتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ جن بھوتوں کا اثر عورتوں پر جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے .. .. ولایتی ننھی کے خاتمہ کے قریب بی ننھی نے جن کی عمر پچیس سال ہو گی لیکن اپنے آپ کو نو عمر سمجھا کرتی تھیں۔ اور جنہوں نے صمد نامی ایک اچھے خاصے جوان کو اپنے سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا نکاح کے بعد تقریر میں کہتی ہیں :-

"مجھے آپ سب کے یہاں تشریف لانے سے سخت صدمہ ہوا کہ دو دو چھواروں کو آپ لوگ ترس رہے ہیں۔ بھائی مولویو! آپ کی عزت ہر مسلمان پر فرض ہے مگر لعنت خدا کی تم سب پر کہ تم نے بہکا بہکا کر مسلمانوں کا یہ حشر کر دیا اور سوا اس کے کہ تم کو قورمے کھلا دیں جیبیں بھر دیں اور کسی کام کے نہ رہے جنت و دوزخ کی تمام عمر وہ چکی ہوئی کر خاصے بھلے چنگے کام کے بندوں کو ہڈ حرام اور کام چور بنا دیا۔ لعنت مردوں پر، لعنت عورتوں پر۔ جاہلوں پر، قلندروں پر۔ ہم سب پر! بدنصیبوں تھوک دو ان کے چہروں پر جو تم کو قسمت کا رنگ دیں قسمت سے یاں فضول زندگی کی کوئی چیز نہیں"

بظاہر یہ باتیں ہر شخص کو ہنساتی ہیں ننھی خانم کے عیارانہ طرز عمل سے لطف اٹھاتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو اس مسکراہٹ کے پیچھے اور اس مذاق میں طنز اور ظرافت میں سبق اخلاق پوشیدہ ہے۔

صادق الخیری ایم اے ———— (عصمت راشد الخیری نمبر)

"بہتیروں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مولانا کے بہار آفریں قلم نے سات روحوں کے اعمال نامے۔ ولایتی ننھی اور نانی عشو میں ظرافت و تفنن کے بھی وہ پھول بکھیرے ہیں کہ ان کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ ایسی بزرگ ہستی کے رشحات خامہ ہیں جنہیں دنیا مصور غم کے لقب سے یاد کرتی ہے"

مولانا عبدالمجید سالک ———— چٹان فروری [illegible]

٥٠ - شہنشاہ کا فیصلہ | [illegible]ء کے رسالہ خطیب

میں شائع ہوا تھا۔ کتابی صورت میں سنہ میں چھ بار سات
مرتبہ شائع ہوا ہے۔ ضخامت ۲۰×۳۰ کے ۳۲ صفحے۔
یہ دردناک داستان خود مصور غم کے پر تاثیر
الفاظ میں اُس وقت کی ہے جب:۔
"خلفائے عباسیہ کا چراغ جاہ و جلال زمانہ کے ہاتھوں
ٹمٹما کر بجھ چکا۔ بغداد جو مدتوں بوسہ گاہ ملوک رہا
اُس کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے۔ معتصم باللہ
کے عہد کے ساتھ ہی سلطنت عباسیہ کا خاتمہ ہو چکا ہے
ہلاکو خاں کا لشکر جرار سرزمین بغداد پر خون کے
پرنالے بہا چکا ہے۔ ہلاکو بھی فنا کے گھاٹ اُتر چکا ہے
اور اب بغداد پر اباقہ خاں کا سکہ چل رہا ہے۔"
اس زمانے میں ایک یہودی تاجر نے اپنے آخری
سانس کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کا نکاح اپنے لالچی
اور بد نیت بھتیجے ابونواس سے کر دیا۔ اور اس کے ہاں
ایک لڑکا بھی پیدا ہو گیا ...... مگر ابونواس علاقہ کی حسین
ملکہ عورات کی طرف مائل ہے ...... ابونواس اپنی بیوی
کا نکاح اور ایک اور شخص سے کرتا ہے ...... اور بچہ کو
مار ڈالنے کے درپے ...... اباقہ خاں وہاں پہنچ کر بچہ کو
بچاتا ہے ...... یہ بہت ہی پُر درد داستان ہے۔
بہت ہی مختصر ناول مگر بار بار پڑھنے کے لائق، علامہ
کا قلم پڑھنے والے کے قلب پر جادو کا اثر کرتا ہے بعض
مواقع پر ڈرامائی عنصر غالب آجاتا ہے ...... طرز تحریر
اس قدر دلآویز اور موثر ہے کہ قاری عبارت کے
تخیل میں گم ہو جاتا ہے"
سید محمود مورخ بی اے ———— عصمت راشد الخیری نمبر

۵۱۔ وداع خاتون

مصنف نے اپنی بہو محترمہ خاتون اکرم کی جواں مرگی پر

سنہ اور سنہ میں جو مضامین تحریر فرمائے تھے۔
جہاں دلہن۔ فہرست آپ بیتی۔ ذکر صفات
۱۹۲ و ۱۹۳ پر آچکا ہے۔
یہ مجموعہ پہلی دفعہ سنہ میں چھپا۔
اس کے بعد ۵ مرتبہ اور ... کے ۴۴ صفحے۔
یہ مضامین بہت دردناک ہیں اور بہو بیٹی والی
اور بہو بن چکنے والی لڑکیوں کے لئے بے حد ...
ان مضامین کا ایک ایک حرف درد میں ڈوبا ہوا ہے
کیونکہ یہ آپ بیتی ہے۔
"مولانا کو اپنی بہو خاتون اکرم کی موت سے
صدمہ ہوا تھا ان کے متعلق نثر میں جو مرثیہ مولانا نے لکھا
ہے وہ سنگ دل سے سنگ دل انسان کو بھی رلائے
نہیں رہ سکتا مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب
مولانا نے خود اپنے چند احباب کے سامنے جن میں مولوی
عبدالماجد دریا بادی۔ خواجہ حسن نظامی۔ پروفیسر سید ...
مولانا عارف ہسوی اور ملا واحدی وغیرہ تھے پڑھا
اور قریب قریب سب ہی رنج و الم میں ڈوب کر غمناک
ہو گئے تھے"
ضیاء الدین احمد برنی ———— ترجمان ڈپٹی بمبئی کرانیکل
"یہ مضمون کیا تھا اچھا خاصا مرثیہ تھا جب مضمون
پڑھا جا رہا تھا اس وقت بعض حضرات کی آنکھیں پُرنم تھیں
اور بعض کی اشکبار۔ اور باقی اشخاص مجسم غم بنے بیٹھے تھے
اس پر مستزاد ان کا لہجہ تھا جو انتہائی دردناک تھا"
ضیاء الدین برنی ———— (عظمت رفتہ)
"مولانا کا قلم گوناگوں قوتوں کا مالک ہے کبھی وہ
سادے سادے لفظوں میں حقائق و واقعات کی مرقع
کشی کرتے ہیں تو کبھی ان حقائق و واقعات کو ایک شاعر

کی طرح رنگین بیانی کا ساحر بنا دیتے ہیں۔ وہ رنگین بیانی اپنے اندر وہ اثر رکھتی ہے کہ اس کے مطالعہ سے ناظر پر بالکل ویسی ہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو کسی بہترین شعر کے سننے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ "وداعِ خاتون" کے چند پیراگراف ملاحظہ ہوں:-

"اغیان کی بڑھتی ہوئی توقعات کے سایہ میں ننھا سا پودا لہلہا لہلہا کر پروان چڑھ رہا تھا۔ سبز پتیاں دن بھر تمازتِ آفتاب کی آغوش میں سوتیں، اور رات کو جب متحرک ذرات خاموش ہو جاتے تو پودہ سرسرا سرسرا کر ہوا سے اٹکھیلیاں کرتا۔ شبنم کے آبدار موتی اس کا منہ چوم کر محبت کے ہاتھ گلے میں ڈالتے اور خاتمہ شب پر صبا ٹھنڈے جھونکوں کا غسل دیتی"

"پودا بڑھ رہا تھا۔ سرسرا سرسرا کر لہلہا لہلہا کر کس کو خبر تھی کہ یہ پودہ کیسے کیسے گل کھلائے گا۔ اس کا پہلا پھول بہارِ حسن کو معطر کرے گا، درشہ رگیں نگہ عروس اس کی خوشبو سے ہمکنار ہوتی ہوئی بلند ہوں گی اس کی نازک پنکھڑیاں شبِ عروس کی گود میں کھیلیں گی اور سرخ آویزے ان کی بہار پر قربان ہوں گے۔
پودا پروان چڑھ رہا تھا پھول پھول کر اور جھوم جھوم کر"

پروفیسر علی عباس حسینی —— (عصمت راشد الخیری نمبر)

۵۲۔ منظرِ طرابلس

سنہ ۱۲ء کے رسالہ خطیب میں شائع ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ بصورتِ کتاب سنہ ۲۰ء میں چھپا اور اس کے بعد ۵ مرتبہ اور ۲۲×۱۸/۸ کے ۴۰ صفحے ہیں۔

صحابیٔ رسول حضرت زبیر بن عوام کی سرداری میں تسخیرِ طرابلس کے لیے مسلمانوں کے جوشِ ایمانی کا تذکرہ ہے اور عصمت کے آتش کدہ میں بے گناہ لڑکی کی قربانی اور حقیقی بہن کے ہاتھوں بھائی کے قتل کی کہانی ہے۔

یہ تاریخی افسانہ شروع اس طرح ہوتا ہے۔

"سر پر بٹھاؤں۔ پلکوں سے اٹھاؤں، سرمہ بناؤں، آنکھوں سے لگاؤں۔ بحیرۂ روم کی ان لہروں کو جو اس وقت پیش نظر ہیں اور سرزمین طرابلس کی اس خاک کو جو آنکھ کے روبرو ہے۔ صبا سلام پہنچا شہدائے طرابلس کی ان مقدس روحوں کو جن کی موت حیاتِ ابدی اور جن کی حیات برکاتِ اسلام کا مخزن تھی۔ اچنبا ہے اور حیرت ہے تعجب ہے اور کمال کہ یہ قوم جو آج ہر سمت در در کی بھیک مانگ رہی ہے کبھی اس قابل تھی کہ ہر قوم اور گروہ ہر ملک اور ہر سلطنت نے اس کے آگے ناکیں رگڑیں۔ خلق و مروت فلسفہ و حکمت، جرأت و شجاعت، خلوص و دیانت، سلطنت و حکومت صداقت و روحانیت کو معراجِ کمال پر پہنچانے والے اپنی گزشتہ عظمت اور جوہرِ انسانیت سے اتنے بیگانہ اور اس قدر دور ہو جائیں کہ حقیقت فسانہ اور واقعیت دھوکہ معلوم ہو"

۵۳۔ آمنہ کا لال

مولود شریف کی اصلاح کی طرف علامہ مغفور مسلمانوں کو عرصہ دراز تک متوجہ فرمانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر جب مسلمانوں نے اس کی کچھ زیادہ ضرورت نہ سمجھی تو حضرت علامہ مغفور نے خود ہی یہ مولود شریف لکھا۔ تصنیف نمبر ۴ یعنی وداعِ ظفر کے بعد سے نمبر ۲۵ یعنی منظر طرابلس تک جس قدر کتابیں شائع ہوئی تھیں وہ قریب قریب سب مطبوعہ مضامین اور افسانے تھے۔ سنہ ۲۸ء میں وداعِ ظفر ختم کرنے کے بعد سنہ ۲۹ء میں مولود شریف کی یہ کتاب شروع کی۔ اور دسمبر سنہ ۳۰ء میں پہلی دفعہ اور مصنف کے سامنے ہزارہا کی تعداد میں ۶ دفعہ

شائع ہوئی۔ یہ کتاب کیوں کر اور کس طرح لکھی گئی یہ ذکر صفحات ۲۶۶ و ۲۶۷ پر آچکا ہے۔ اور محترمہ ولایتیں بیگم صاحبہ کا بیان صفحہ ـــــ پر اور کتاب کے چند اقتباسات صفحات ۲۶۶ و ۲۶۷ پر ہیں۔

"یہ کتاب بھی مولانا کی اصلاحی کوششوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مولود کی مجلسیں جن میں مسلمان مرد وزن مذہبی عقیدت کے ساتھ شامل ہوتے ہیں موضوع روایتوں اور مہمل افسانوں سے غلط خیالات دلوں میں پیدا کرنے کے باعث ہوتی ہیں تو ان میں پڑھنے کے لئے یہ کتاب لکھی۔ اس میں شروع سے آخر تک ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے یقین کرنے میں کسی کو تامل ہوسکے۔ اور یہ نہ صرف مسلمانوں کو مطمئن کر سکتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے بلا خوف اپنے رسول کو غیر مسلموں کے سامنے بھی وہ پیش کرسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نہایت کامیاب اور مولانا کی ادبی قابلیت کی خصوصیات کے ساتھ شاہد ہے ..... واقعات کو ایسے مؤثر پیرایہ سے بیان کیا ہے جو ممکن نہیں کہ دلوں پر اثر نہ کریں"

مولانا محمد اسلم جیراجپوری ـــــ بنات اگست ۱۹۳۶ء

"آمنہ کے لال میں عقیدت کے پردے سے اصلیت کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ پیدائش رسول کریم سے لے کر ہجرت تک کے واقعات اس طریقہ سے لکھے ہیں کہ ہر واقعہ کی تصویر آنکھ کے سامنے آجاتی ہے۔ اس کتاب میں رسول خدا کی تعریف ان لوگوں سے کروائی ہے جو برائیاں تلاش کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے..... ہر واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ہر موقع پر مولانا منظر کشی میں کامیاب ہوئے جواب سوال کر کے اس کتاب میں ڈرامہ کی شان پیدا کر دی ہے.....

آمنہ کے لال میں نہ دوسری کتابوں کی پیروی نہیں کی گئی۔ آمنہ کے لال میں بھی جابجا نظمیں ہیں مگر قاطبۃً قدر فرق اتنا ہے جتنا اس میں اور اوروں کی نثر میں۔ اگر نثر کا بیان بیچ میں چھوڑ کر اس کے بعد کی نظم پڑھ کر تک پڑھنے لگیں تو سلسلہ کلام نہیں ٹوٹتا اس سے بھی کتاب میں ایک طرح کی خوبصورتی ہو گئی۔ ادب کی خوبی اور زبان کی سلاست تو مولانا مرحوم کے قلم میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ خوبی بھی اس کتاب میں درجہ کمال تک پہنچ گئی ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اس طرح بیان کو ادا کیا ہے کہ خود نثر زبان سے بول اٹھی ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ کوئی بات صرف خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں لکھی گئی جب تک اس میں اصلیت ثابت نہ ہوئی اور اس اصلیت کو اس طرح ظاہر کیا گیا کہ واقعہ سمجھ میں آگیا۔ مثلاً جبریل کو فرشتہ مان کر اس کو ایک جسم دینا ممکن تھا کہ غیر جانب دار حضرات کی نظر میں کھٹکتا۔ مگر یہاں مولانا مرحوم نے "نورانی فرشتہ" کہہ کر اعتراضات کو ختم کر دیا۔ اس سے جہاں مولانا کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عقیدت سچائی کو ہمراہ لئے ہوئے ہے۔ انسانی جذبات اور قدرت کی منظر کشی میں تو مولانا کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ حضرت حلیمہ کی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"مایوس نظریں تھک کر گریں اور ناامیدی نے دل کو بے چین کر دیا"

ایسی ایسی تمثیلوں نے اس کتاب کے اندر روح پھونک دی ہے۔ نئی نئی تشبیہیں لاکر اس کتاب کو ادبی دنیا میں ایک مخصوص جگہ دلوائی۔ وقت کی تیزی کو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

"معصومیت کا خاموش طائر اپنے پروں سے شباب کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا اور وقت کی مدجبین حسینہ اپنی

پوری رفتار سے آگے کو قدم بڑھا رہی تھی۔"

آمنہ کا لال مصنف کی بہترین کتابوں میں اور میلاد شریف کی تمام کتابوں میں اپنے ایک مخصوص درجہ رکھتی ہے۔ مصنف نے یہ کتاب لکھ کر علم و ادب اور اردو پر ہی نہیں مسلمانانِ ہند پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔"

سلطانہ بیگم ـــــــــــ عصمت راشد الخیری نمبر

"آمنہ کا لال مولود شریف کی کتاب ہے اور اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں آنے پائی جسے غیر مذہب والے سن کر یہ کہیں کہ واہ کہیں اب بھی رسالت ہے۔ عام طور سے میلاد شریف کی مجلسوں میں ایسی ایسی خلافِ عقل اور اہانت آمیز باتیں کہی جاتی ہیں جنہیں سنجیدہ طبیعتیں ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں۔ غلط روایات جھوٹی اور لغو باتیں، زمین آسمان کے قلابے ملا، جو منہ میں آیا بے تکے پن سے کہدیا آج کل کے مولود خوانوں کی بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ ذرا مولانا کے الفاظ میں ان لوگوں کا حلیہ بھی سُن لیجئے:-

"جیب میں دیاسلائی، ہاتھ میں بیڑی، منہ میں زردہ کیا خدا کا رسول جس پر کتاب اللہ فخر کر رہی ہے اس لائق ہے کہ بیٹھے کچھلے ذاکر کی گندی زبان بار بار اس کا نام دوہرائے؟......"

آخر کار خود مولانا ہی نے اس پاک موضوع پر قلم اُٹھایا اور وہ گل کھلائے کہ پڑھنے والے کا مشامِ جاں معطر ہو جاتا ہے۔ مولانا عاشقِ رسول تھے اور یہ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا نے یہ مولود نامہ خاص اہتمام سے لکھا ہے۔ روزانہ صبح کی نماز کے بعد خوشبو لگا کر بتیاں جلا کر پھول قریب رکھ کر مصلے پر بیٹھتے تھے۔ روزانہ اس کتاب کا کچھ نہ کچھ حصہ لکھتے تھے۔ یہ معمول ان کا سال بھر تک رہا اور جب کتاب ختم ہوئی تو بہت خوش ہوئے کہ ان کے اقول اتنی بڑی خدمت بحُسن و خوبی انجام پائی۔ مولانا اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے کہ بیٹے اپنی سب کتابیں تمہارے لئے لکھی ہیں۔ مگر آمنہ کا لال بیٹے اپنے لئے لکھی ہے اور میں سمجھتا ہوں یہی کتاب اُن کے لئے توشۂ آخرت اور اُن کی بخشش کا وسیلہ بنی ہوگی۔"

اڈیٹر ساقی ـــــــــــ (عصمت راشد الخیری نمبر)

یہ تصنیف ۱۹ دفعہ چھپی ہے ۱۲۸ صفحے ۲۰×۳۰/۱۶ کے ہیں اور مجلد ہے۔

۵۴۔ گرفتارِ قفس

یہ نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے جو مصنف کی حیات میں ۱۹۲۸ء میں چھپا تھا۔ اور مصنف کے سامنے ۳ دفعہ۔ اس میں زیادہ تر وہ دردناک نظمیں ہیں جو تربیت گاہ بنات کے لئے لکھی گئی تھیں اور جنہیں پڑھ کر دل پر سخت چوٹ لگتی ہے۔ زیادہ تر منظوم کہانیاں ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:-

درود و سلام۔ عید کا کرتہ۔ بڑا ایمان ہے لوٹے ہوئے دل شاد کر لینا۔ ہماری عید۔ ہلال عید کے بعد یتیم بچی کا تخیل۔ بن ماں باپ کے بچے کی شادی۔ درود و سلام کے چند اشعار یہ ہیں:-

تیرے دیدار کو ہیں کنیزیں کھڑی
رحم فرما کہ یہ ہے مدد کی گھڑی
ہم پہ نازل ہو فضل و کرم کی جھڑی
تیری بخشش وسیع تیری رحمت بڑی
تجھ پہ لاکھوں درود و ہزاروں سلام

ایک اور نظم کے چند اشعار:-

جو فرصت ہو تو یہ اجڑا نشیمن دیکھتے جاؤ
ترا اپنا قصرِ عالی شان پھر آباد کر لینا

تمہارا شغل ہنسنا بولنا دُنیا سے خوش ہونا
ہمارا کام رونا چیخنا فریاد کر لینا
عظیم الشان نیکی ہے، مدد مظلوم کو دینی
بڑا احسان ہے ٹوٹے ہوئے دل شاد کر لینا

آخر میں تاریخ اسلام کی پہیلیاں ہیں جو عصمت میں ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھیں ایک یہ ہے:-

مسلمانوں میں ہیں وہ کون سے دو باپ اور بیٹی
جگہ اسلام نے جن کو بہت ممتاز و اعلیٰ دی
امیر ہے کونسا دُنیا میں جو افضل بشر ٹھیرا
ہماری کون سی ماں ہے جو دُنیا میں بنی بچی
سلام اُس باپ پر بھیجا سلام اللہ نے جس کو
سلام اس ماں پہ جس کی گواہی خود خدا نے دی
اگر انعام لینا ہے لکھو سطریں کم از کم دس
کہ جن میں پانچ ابا کی ہوں اور ہوں پانچ بیٹی کی

جواب حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عائشہ صدیقہ

۵۵ - نسوانی زندگی

چار مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ ہے - پہلی دفعہ ۱۹۳۱ء میں چھپا تھا - پہلے افسانہ میں عورت ماں کی حیثیت سے دوسرے میں بیوی تیسرے میں بیٹی اور چوتھے میں بہن کی حیثیت سے دکھائی ہے - چاروں افسانے بہت موثر اور درد انگیز ہیں - ان کے عنوانات یہ ہیں :-

(۱) ممتا (۲) فرشتہ بیوی (۳) اشک ندامت اور (۴) بہن کی محبت - ہجرت سے قبل چار دفعہ کتاب شائع ہوئی تھی ضخامت ۲۳×۱۸ / ۸ کے ۵۴ صفحے ہیں -

اس مجموعہ کے پہلے افسانہ کی چند سطریں :-

" بڑھا اب پھر ٹھٹکا اور سوچنے لگا کہ دس روپیہ بڑے [؟] لیاں رکھی تھیں - اب میں تو دس برس میں بھی دس روپے کا مالک نہیں ہو سکتا - کیا خدا کی شان ہے میری مصیبت پر [illegible] سامان تو کھڑے ہو گئے - مگر رونے والی آنکھ ایک مدنی جوتی موٹ بھی تو کسی نے میری بچا دی - اب میں بھیک مانگنے سے رہا - مگر اسے کیا کروں تو بہت ہو رہا ہے جاؤں ہلدی چونا لگواؤں - مگر ہلدی کہاں - اور چونا کدھر - زردہ کھانے والی بیوی تین تین دن خالی زردہ کھاتی ہے - پان نہ چھالیہ اور کتھا نہ چونا -

تکلیف لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی اور اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ تقی ہائے ہائے کرتا گھر پہنچا -

آفتاب غروب ہو چکا تھا اور افروز شام ہوتے ہی باپ کی راہ دیکھنے بیٹھ گئی تھی - باپ کی ہائے کی آواز کان میں پہنچنے سے قبل اس کی صورت دیکھ کر اس نے جس حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا :-

" اے سلیم ابا جان آ گئے "

اس کا ادا کرنا مشکل ہے یہ سلیم کا مدد کر رہا ابا آگئے ابا آگئے - ابا جان آ گئے کہہ کر پاؤں میں لپٹ جانا جو معنی رکھتا ہے اس کو صرف بچوں والے باپ سمجھ سکتے ہیں "

۵۶ - سودائے نقد

رسالہ خطیب میں ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا اور کتابی صورت میں ۱۹۳۲ء میں مصنف سے نظر ثانی کرانے کے بعد اس میں کچھ اضافہ بھی کیا گیا تھا - اس افسانے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کا نکاح ثانی اور اسلام میں عورت کی کیا حیثیت ہے - یہ افسانہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جوان بیٹی کی شادی نہ کرنا سوسائٹی کا کیسا زبردست گناہ ہے - حقیقی ماں کے ہاتھوں جوان بیٹے کے قتل کا واقعہ بڑا ہی عبرت انگیز ہے - ہجرت سے قبل اس کے چار ایڈیشن

نکلے نے صفحات ... کے ۳۶ صفحے اضافہ کی آخری

سطریں یہ ہیں :-

"جوان بچی کا کنواپن ایک ناگ ہے جو ہر وقت ڈس رہا ہے۔ ایک آگ ہے جس کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ایک مصیبت ہے جو ہر گھر پہ نازل ہے۔ ایک آفت ہے جو قدرت نے ڈھا دی ہے۔ ایک قیامت ہے جو ہر لمحہ برپا ہے۔

اس ناگ کو کچلو۔ اس آگ کو بجھاؤ۔ اس مصیبت کو ٹالو۔ اس آفت کو دفع کرو۔ اس قیامت کو ختم کرو"

۷ ۵ - سیدہ کا لال

یہ مکمل تاریخ شہادت ہے اور ۱۳۳۱ھ میں ڈھائی ماہ میں لکھی گئی تھی۔ کہاں کیوں اور کس طرح لکھی گئی یہ ذکر صفحات ۲۷۲ پر آ چکا ہے۔ اور چند اقتباسات بھی صفحہ ۲۸۰ - ۲۸۱ پر دیے گئے ہیں۔ پہلی دفعہ جولائی ۱۹۳۱ء میں اور بچویں بار ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اب تک ۱۶ دفعہ چھپ چکی ہے۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۸۸ صفحے ہیں اور مجلد ہے۔

" سیدہ کے لال میں حضرت علامہ نے ایسا کوئی لفظ نہ چھوڑا جو درد و الم نہ بتلاتا ہو۔ مذہبی رائے کو چھوڑ کر جہاں تک واقعات کربلا بیان کئے ہیں آنسوؤں کا فرات بہا دیا ہے ..... کتاب کا حرف حرف معلوم ہوتا ہے سیاہی کی جگہ خونِ دل سے لکھا ہے ..... تیرہ سو برس کی مسافت بعیدہ پیچھے ہی معلوم ہوتا ہے کہ خود میدان کربلا میں موجود رہ کر یہ واقعات لکھے ہیں ..... کیا تصور غم اس سے بہتر کھینچ سکتی ہے۔ اس صدی میں ممکن نہیں اور آئندہ کی خبر نہیں ..... ہے کوئی دل جو پڑھے اور نہ روئے۔ ہے کوئی آنکھ جو دیکھے اور آنسو نہ بہائے پتھر دل اور لوہے کی آنکھیں اگر رکھتا ہو متاثر نہ ہوگا ورنہ جگر لیس، دل کا درد، آنکھوں کے آنسو چین نہ لینے دیں گے۔"

فصیح اعظم پروفیسر مولوی سید محمد علی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

" سیدہ کے لال میں وہ جادو پیدا کیا کہ آج تک محرم میں لوگ اسے پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ کم از کم اردو میں نثر میں اس سے زیادہ پُر تاثیر شہادت نامہ آج تک نہیں لکھا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انیس کے مرثیے اور راشد الخیری کا سیدہ کا لال پڑھتے ہوئے جس کے آنسو نہیں نکلتے اور دل میں ہیجان پیدا نہیں ہوتا اسے ضرور کوئی روحانی روگ لگ گیا ہوگا"

انتظار حسین ——— امروز لاہور ۲۶ فروری ۱۹۵۹ء

" غرض کوئی ایسی جامع تصنیف اردو میں موجود نہیں جو ان سب پہلوؤں پر حاوی ہو اس غمناک داستان کو لکھنے کے لئے مولانا کی علم دوست طبیعت سے زیادہ اور کسی کو مناسبت نہیں ہو سکتی تھی۔ مولانا کا بے پناہ قلم اپنی پوری زہرہ گدازی کے ساتھ چلا ہے اور اس طرح کہ ذکر شہادت کی ہر سطر آنسوؤں کی ایک لڑی معلوم ہوتی ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی اسے پڑھے اور اپنے آنسو ضبط کر سکے۔

مولوی شاہد احمد اڈیٹر ساقی ——— ساقی ۱۹۳۶ء

" سیدہ کا لال" لکھ کر مولانا مرحوم نے نہ محض ایک مخصوص فرقہ بلکہ ساری مسلمان قوم پر احسان عظیم کیا ہے۔ اس میں جتنی روایات ہیں بالکل مستند اور صحیح اگرچہ پوری کتاب مولانا نے اپنے ہی مخصوص رنگ میں تحریر فرمائی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ اپنی جگہ پر کسی طرح بھی غلط نہیں کہا جا سکتا۔ افسوس کہ علامہ کو اس سلسلہ کی دوسری تصنیف بنت زہرا یعنی حضرت زینب کربلا کی ...

سکے کی موت نے قطعی مہلت نہ دی۔ آخر بار دوران سفر کلکتہ میں ایک بار مجھ سے اور اکثر پروفیسر صاحب سے اکثر موقعوں پر فرمایا کرتے کہ :-

• حضرت زینب نے جس ہمت دلیری اور صبر و سکون سے امام حسین کی شہادت کے بعد عزیز و اقارب عورتوں اور بچوں کو سنبھالا ہے اور کوفہ و شام ہوتی ہوئی مدینہ طیبہ تک سب کو لے کر تشریف لائی ہیں وہ ان ہی کا کام تھا۔ زینب کی زندگی کا ہر لمحہ بتا رہا ہے کہ وہ علی جیسے شجاع صابر سخی اور عابد کی بیٹی ہے۔ اگر زمانہ نے مہلت دی تو ان کارناموں سے بھی دنیا کو جلد روشناس کراؤں گا"

افسوس مولانا کی اس تصنیف سے ہم محروم رہ گئے۔ اب اس نا قابلِ قدر کتاب سیدہ کے لال سے چند مثالیں پیش کرتی ہوں جن میں جذباتِ انسانی کی سچی مصوری کی گئی ہے ...... اللہ اللہ کیا جادو بیانی تھی کیا سحر طرازی اب نعت سے کہیے ان جملوں سے ناظرین کے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔ ایک طرف تو بی بی کے جذبات کا کیسا صحیح نقشہ کھینچا اور دوسری طرف کتنی بڑی مثال کیسی نصیحت ہے کہ عورتیں ان الفاظ کو پڑھنے کے بعد لمحوں کے لئے اپنی شخصیت کو بھول جائیں گی کہ جب رسول زادی کی نظر میں شوہر کی یہ وقعت ہو تو ہماری کیا ہستی ہے"

اس کے صغرا سبز واری ——— ساقی راشد الخیری نمبر

۵۸ - بیلہ میں میلہ | یا غدر کی ماری شہزادیاں

مئی ۱۹۲۹ء کے عصمت میں شروع ہو کر جنوری ۱۹۳۲ء میں یہ افسانے ختم ہوئے اور اسی سال کتابی صورت میں چھپے۔ علامہ مغفور کے سامنے تین بار یہ تصنیف شائع ہوئی $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ کے ۸۸ صفحے ہیں۔

"دل رو رہا تھا مگر آنکھ خاموش تھی۔ کائنات سو رہی تھی لیکن چاند مصروف کار تھا۔ چند پہاڑیاں جن کے آس پاس کوسوں زندہ انسان کا نشان نہیں دلی کا شہر خموشاں ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز کا مقتدر خاندان اسی سرزمین میں محو خواب ہے ...... میں دلی کا رہنے والا ہوں۔ جوانی کی سیاہی اس سرزمین پر بڑھاپے کی سفیدی سے بدلی۔ بارہا میتوں کے ساتھ بھی اور فاتحہ خوانی کی غرض سے بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر آج تک اس چبوترے پر چڑھنے کی ہمت نہیں پڑی تاریخ جس وقت مملکتِ علوم کے ان تاجداروں اور مذہب اسلام کے ان خدمت گزاروں کی حکومت اور خدمت سامنے لاتی ہے تو جسم کانپ جاتا ہے۔ اور اقلیم سخن کے ان شہنشاہوں کا جلال پاؤں میں زنجیر بن جاتا ہے"

(بیلہ میں میلہ)

مصورِ غم کے افسانوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی آنکھیں ان قدیم قصوں کو اپنی نظروں کے سامنے چلتے پھرتے دیکھیں عبرت حاصل کریں اور آنسوؤں کے عقیدت بھرے موتی ان پر نثار کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کے زریں کارنامے کچھ ایسے درد بھرے لفظوں میں لکھے ہیں کہ آنکھیں تو کیا دل بھی رونے لگتا ہے۔ ایک موقع پر مصور کا قلم یوں اشک بار ہے :-

"میری وہ راتیں جو بیلے میں بسر ہوئیں زندگی کی بہترین راتیں تھیں۔ شہزادیاں بھی قلعہ اور بادشاہ کو اتنا نہ روئی ہوں گی جتنا میں دلی اور دلی والوں کو رو رہا ہوں ...... ستم پر ستم یہ ہے کہ وہ رونے والے بھی نہ رہے اور میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے اٹھ گئے میں ان راتوں میں رونے والوں کا ہمنوا تھا آج تنہا ہوں اور کوئی اتنا نہیں جو میرے آنسوؤں کی ہاں میں ہاں ملا دے"

ب ۔ بعد رحلت

حضرت علامہ مغفور کے بعد پینے ڈھائی سال تک دن رات ایک کر کے اُن کے مطبوعہ افسانوں اور مضمونوں کے ۴۹ جدید مجموعے شائع کئے۔ یہ افسانے اور مضامین اُن کے رسالوں عصمت تمدن سہیلی اور بنات کے علاوہ مخزن خطیب نظام المشائخ تہذیب نسواں وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔ میرے پاس اُن سب رسائل کے فائل موجود نہ تھے۔ لیکن ذہن میں بہت سے افسانوں اور مضامین کے عنوانات تھے۔ اور یہ بھی کہ کس پرچے میں شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں ایک مضمون "شہید مغرب" رسالہ طبیب دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اور شاید ۱۹۱۵ء میں خطیب میں سلطان جی کی سترھویں پر ایک افسانہ جس میں دلّی کے کرخندار کی زبان بھی لکھی گئی تھی۔ یہ دو مضمون نہیں ملے۔ باقی سب مضامین مجموعوں کی صورت میں خدا کا شکر ہے محفوظ ہوگئے۔ جس ترتیب سے یہ مجموعے شائع ہوئے اُسی ترتیب سے اُن کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تصانیف جن کا اضافہ ۱۹۳۶ء میں ہوا

۶۰ ۔ عروسِ مشرق "حضرت علامہ مغفور مشرقی تہذیب کے پرستار تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مغرب کی ہر چیز کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے متعدد مرتبہ مستقل تصانیف اور متفرق مضامین میں اس پر زور دیا ہے کہ مغرب کی خوبیاں ضرور لو۔ لیکن اپنی خوبیوں کو نہ گنواؤ۔ مغرب کی اندھی تقلید کو روکنے اور مشرقی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لئے بیسویں صدی کے اس مصلح اعظم نے اگر مسلسل کوشش نہ کی ہوتی تو خدا جانے آج ہندوستانی مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا۔

آج ہمارے گھروں میں اس مشرقی معاشرت کی کچھ جھلک پھر نظر آنے لگی ہے۔ تو یہ مصورِ غم کی تحریروں ہی کی برکت ہے"

میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— عصمت مارچ ۱۹۳۶ء

"ایسی حالت میں جب ایک ایک کر کے مشرقی خوبیاں فنا ہو رہی تھیں صرف ایک قلم نے اس اجڑتے ہوئے چمن کی بہار کے گیت گائے۔ ایک ہستی نے مشرقی چراغ کے گل ہو جانے کا ماتم کیا۔ ایک انشاپرداز نے اس دور کے سے اپنے سحر نگار قلم سے کھینچ کر ایسے باندھے کہ ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مشرقی تہذیب کے تابوت پر حضرت علامہ راشد الخیری رح کے آنسو اُردو ادب کے خزانے کے وہ انمول موتی ہیں جن کی قدر جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ مولانا مرحوم کے قلم نے مشرقی تہذیب کے جو سمے دکھائے ہیں وہ آنے والی نسلوں کو بتاتے رہیں گے کہ ان گدڑیوں میں کیا کیا لعل تھے۔ ہماری زندگی کا فلسفہ کتنا بلند اور ہماری روح کے جذبات کتنے پاکیزہ تھے"

ڈاکٹر شائستہ سہروردی ——— عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

اس مجموعہ میں کہیں اگلی برساتوں کی جھلک دکھائی گئی ہے اور کہیں شادی بیاہ کی رسوم کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ دو مضمونوں میں پرانے زمانے کے گیت

جو ہماری معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں درج کر کے ان کے مطالب ایسی خوبی سے سمجھائے گئے ہیں کہ ایک ایک لفظ کلیجے کے پار ہو جاتا ہے۔

کئی مضمونوں میں دَورِ گذشتہ اور عہدِ حاضر کی خواتین کی زندگی کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ پہلے زمانہ کی جاہل بیویوں کی کامیاب زندگی کا کیا راز تھا۔ اور آج کی تعلیم یافتہ خواتین کی ناکام زندگی کے کیا اسباب ہیں۔ اس مجموعے کے مضامین کے عنوانات یہ ہیں :-

میاں مٹھو کی بکواس۔ وفا کا تاج۔ مشرقی دلہنیں۔ ستی بیوی کا ایک دن۔ اگلی پرسانوں کی ایک جھلک۔ پہلی بیویاں۔ جاہل بیویوں کی جھلک۔ عورتوں کی تعلیم و جہالت۔ اگلے لوگ۔ عروسِ مشرق۔ قطب صاحب کے جواہر ریزے۔ اگلی اور اب کی بیویاں۔ عورتوں کی رزش رسوم۔ لڑکیوں کی تربیت۔ ۵۰ نہیں ۱۴۰ سو سال پیچھے۔ ۲۲×۱۸ کے ۷۶ صفحات ہیں۔ کتاب ۵ دفعہ شائع ہوئی ہے۔

"عروسِ مشرق کے صفحات میں آپ کو مشرقیت دلہن بی کی طرح سجی سجائی نظر آئے گی۔ مغربیت کے دور میں مشرقیت کا یہ زور زبان و مغز دونوں کے اعتبار قابل دید ہے۔ اور قابل داد بھی۔ مختلف مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مرحوم کی ساری عمر حمایت نسواں کی وکالت میں بسر ہوئی لیکن ذیل کا اقتباس پڑھ کر اندازہ کیجیے کہ ان کے سطحِ نظر کو تجدد نوازوں کے سطحِ نظر سے کیا مناسبت تھی :-

"فروری ۱۹۳۶ء کے عصمت میں میں نے حافظ علیۃ النساء مرحومہ مغفورہ کے حالات لکھے تھے۔ انہوں نے اسّی برس کے قریب عمر پائی۔ ان کی تعلیم و تربیت غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے کچھ بعد کی تھی۔ . . . . ان کے جنازے کے ساتھ ان کے اپنے حافظ شاگردوں کی تعداد اس قدر کثیر تھی کہ ہونہوں کو کندھا دینے کی نوبت بمشکل میسر آئی کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ دورِ حاضرہ کی کسی تعلیم یافتہ خاتون کا جنازہ اس دھوم دھام سے ہندوستان کے کسی شہر میں اٹھا ہے؟ . . . . مرتے دم تک ان کا دس دن کا وعظ جس میں دلی کے بڑے گھرانوں بالخصوص پنجابیوں کی اکثر خواتین شریک ہوتی تھیں ناغہ نہیں ہوا۔ آج کتنی انجمنیں، کس قدر سوسائٹیز ہندوستان میں ایسی موجود ہیں جن میں بلا ناغہ اور بلا معاوضہ کوئی تعلیم یافتہ خاتون اپنے لیکچر دا بیجا سے اس قوم کا فائدہ پہنچا رہی ہیں"

مرحوم ترقی نسواں کے یقیناً پُرجوش وکیل تھے۔ لیکن کس کے ؟ مسلمان عورت کی۔ مشرقی لڑکی کی"

مولانا عبدالماجد دریابادی ——— صدق جدید لکھنو جولائی ۱۹۵۲ء

۶۱ - **بزمِ رفتگاں** — بچھڑی ہوئی صورتوں کی یاد میں یہ مضامین عصمت تمدن ساقی میں شائع ہوئے تھے۔

عمِ مغفور (استاد مرحوم) مولوی نذیر احمد کی وفات پر) بزمِ شعراء اور مرحوم آزاد۔ حارجیہ قاریہ ام عطیۃ النساء مرحومہ (مصنف کی پھوپی) کتبہ تربت مرحومہ خاتون اکرم (مصنف کی بہو) خجستہ اختر بانو سہروردیہ مرحومہ (عصمت کے دورِ اوّل کی مشہور مضمون نگار) مرحومہ ز۔ ع۔ ش (عصمت کی مشہور شاعرہ) جان بہار سید۔ جانِ بازیگا مرحومہ بیگم صاحبہ بھوپال۔ مولوی بشیر الدین احمد مرحوم۔ مرزا غالب پردہ آشو۔ میر جالب مرحوم۔ جہاں آباد کا گوہر درخشندہ

(میر ناصر علی مرحوم، صغرا بیگم کی یاد۔ ملکۂ محبت۔ در لکھنو قاری بھی بچھڑ گیا۔ شاہ جہاں آباد کے عناصر اربع) مصنف مرحوم کے لڑکپن کے تین دوستوں مولوی اشرف حسین مرحوم قاری سرفراز حسین مرحوم۔ مرزا محمد اشرف گورگانی مرحوم کی یادیں) ۲۲×۱۸ کے ۱۰۴ صفحوں کی یہ باتصویر کتاب ہے تین دفعہ شائع ہوئی ہے۔

" جو ابھی کل تک بزم رفتگاں کی یاد منا رہا تھا آج خود اس بزم میں پہنچ گیا۔ لیکن اپنے جانشین سعید چھوڑ گیا ہے جو اس کی یاد کو کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں اور اس کے چراغ سے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ دہلی کے مشہور ادیب و درد نگار راشد الخیری مرحوم کی وفات کو دو ڈھائی سال کا عرصہ گذر چکا اب ان کے قلم سے نکلی ہوئی یہ چیز ان کے صاحبزادے نے شائع کی ہے۔

بزم رفتگاں نام خود ظاہر کر رہا ہے۔ مرحوم کے خاص مذاق کی چیز تھی۔ یہ مجموعہ مرحوم کے کوئی ۱۹ مختصر مضمونوں کا ہے جو بزرگوں۔ دوستوں عزیزوں کی وفات پر عصمت وغیرہ رسالوں میں تحریر کئے گئے تھے یا پھر ان کی تربیت کے کتبے ہیں۔ مرحوم کا قلم یوں ہی درد رقم تھا، سوز وگداز ہر موضوع میں پیدا کر دیتے تھے۔ پھر جب موضوع خود ہی دعوت درد دے رہا ہو تو درد انگیزی حزن آفرینی کا پوچھنا ہی کیا "

مولانا عبد الماجد دریابادی ——— صدق لکھنؤ ۱۱ جولائی ۱۹۳۸ء

۶۲ - قرآنی قصے

۱۹۲۸ء میں جب مصور غم علیہ الرحمۃ نے مسلمان بچیوں کے لئے رسالہ بنات جاری کیا تھا تو علاوہ چند اور عنوانات کے قرآن مجید کے قصے ایک مستقل عنوان مقرر فرمایا تھا۔ جس کے تحت خدا کے سچے نبیوں کے جن کا ذکر باری تعالےٰ اپنے کلام پاک میں فرمارہا ہے۔ مقدس حالات ماہوار شائع ہوتے تھے۔

ان سب میں جذبات کی ترجمانی تخیل کی بلند پروازی منظر کشی۔ کردار نگاری۔ مکالمہ نویسی۔ انشا پردازی وغیرہ کا کمال جو مصور غم کے سوز وگداز اور درد وتڑپ میں ڈوبے ہوئے المناک افسانوں کی خصوصیات ہیں کچھ زیادہ نمایاں نہ ہوں اور وہ اس وجہ سے کہ یہ قصے کم عمر لڑکیوں کے لئے انہیں کی سمجھ انہیں کی زبان انہیں کی قابلیت کے مطابق لکھے گئے تھے۔ تاہم طرز بیان کی دلکشی اور اثر اور دلی کی ٹکسالی زبان کی شیرینی اور کیف کے لحاظ سے مذہب وادب میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں "

کتاب کے شروع میں میں نے جو نوٹ لکھا تھا اس کی یہ چند سطریں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت یوسف کے حالات کسی قدر تفصیل سے ہیں باقی اور انبیا کے مختصر حالات ہیں۔

یہ کتاب ۲۰×۳۰/۱۶ تقطیع کے ۱۴۴ صفحوں پر ہے اور ۳ دفعہ چھپ چکی ہے۔

۶۳ - بے فکری کا آخری دن

مضامین کے عنوانات یہ ہیں:

بے فکری کا آخری دن۔ آہ کنوار پتہ۔ میکے کے بیچ سسرال میں۔ کنواری بیٹیاں مہمان ہیں۔ ایام گذشتہ وہ دلہن کی رخصت وہ رونے کا وقت۔ کنواری لڑکیاں غور کریں۔ شادی نہیں امتحان ہے۔ کنوار پتہ — مینا کا بچہ۔ ایک مضمون "ایام گذشتہ" کے متعلق ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی تحریر فرماتے ہیں :-

" یہ ایک خوبصورت ادب پارہ ہونے کے ساتھ اس نفسیاتی حقیقت کا حامل ہے کہ اضطرار کی حالت میں ہم ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں جس پر غصہ رفع ہو جانے کے

بعد اکثر و بیشتر مذاق عام افسوس کا احساس ہوتا ہے جنہیں
موقع حاصل ہوتا ہے کہ اس کی تلافی کر لیں اور جن طبیعتوں
میں صلاحیت ہوتی ہے وہ کر بھی لیتے ہیں لیکن بعض
صورتوں میں موقع ہاتھ سے نکل چکتا ہے اور اس غلطی کی
یاد اکثر ہیں تڑپاتی رہتی ہے۔ اس کیفیت کو لفظوں میں لکھنا
دشوار ہے۔ مولانا نے اس نکتہ کو جس ماحول کے ساتھ
پیش کیا ہے حق یہ ہے کہ انہیں کا حق تھا"
عصمت فروری ۱۹۳۹ء

یہ چھوٹے چھوٹے مضامین جیسا کہ نام سے ظاہر ہے
کنواری لڑکیوں کے لئے ۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۲ء کے زمانہ میں
لکھے گئے تھے اور عصمت، سہیلی میں شائع ہوئے تھے اور
کئی پرچوں میں بھی نقل کئے گئے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار
شائع ہو چکا ہے۔

۶۴۔ نالۂ زار | لڑکیوں اور عورتوں کی حمایت میں خواتین کے محسنِ اعظم کے معرکۃ الآرا مضامین

کا مجموعہ ہے۔ جن کے عنوانات یہ ہیں:۔
چراغ سحری۔ ساسوں کی فریاد۔ بڑوں کا ادب
غریب رشتہ دار۔ ہماری بیٹیاں۔ جہیز و تجہیز۔ لڑکی میکے
میں۔ نارضامندی کی شادی۔ کنواری بچی کے تین دور۔
میری ایک رات۔ بدنصیب لڑکی۔ ہزار برس کی نیو۔ بہوؤں
کو ہدایتیں۔ منحوس دُلہن۔ عالم ارواح سے عورتوں
کی صدا۔ واعظین اسلام سے۔ عورت کی سرگذشت
محبت میں عداوت۔ یہ مضامین عصمت و تمدن میں ۱۹۰۸ء
تا ۱۹۱۸ء کے زمانے میں شائع ہوئے تھے۔ اور ان میں
کئی مضامین بعض زنانہ پرچوں اور ادبی ماہناموں میں
بھی نقل کئے گئے تھے۔ "چراغ سحری" (عصمت ۱۹۱۰ء)
ماں باپ کیسی نعمت بے بہا ہیں۔ اس موضوع پر بہت مؤثر
مضمون ہے۔
"یہ چراغ ٹمٹما گئے اور عمر کی بتی جھلملا چکی، تمہارا ان کا
سامنا ہے۔ بس اتنی دیر کا کہ نسیم کا جھونکا انہیں ٹھنڈا
کر دے پھر یہ کہاں اور تم کہاں داستان ان کے ساتھ ختم
ہو گئی اور دُعا کے دروازے ان کے ساتھ بند تمہارے
داغ کلیجے پر لے جائیں گے اور پھر تمہارے کان ان کی
آواز بھی نہ سن سکیں گے"
مضمون کے آخر میں نظم ہے جس کے چند اشعار
یہ ہیں:۔

"طاقت پہ پھولنا مت　　وہ وقت بھولنا مت
کچھ زور تھا نہ طاقت　　تھی گود ماں کی جنت
زر مال سے شیر ہو کر　　اب تم دلیر ہو کر
غرّا کے ان پہ آؤ　　آنکھیں نہیں دکھاؤ
دشمن بناؤ ان کو　　جھوٹا بتاؤ ان کو
صورت سے ان کی نفرت　　باتوں سے ان کی وحشت
سب مال و زر لٹا کر　　خونِ جگر پلا کر
جو بیج تھا لگایا　　اب اس سے پھل یہ پایا
حسرت نصیب ہیں یہ　　کیا بدنصیب ہیں یہ"

ساسوں کی فریاد (عصمت ۱۹۱۰ء) مشہور ادیب
ل احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں۔
"اس پامال موضوع کو مولانا نے اس دل دوز
صورت میں پیش کیا ہے کہ اس کا بے اثر رہنا ناممکن ہے
مجھے یقین ہے کہ جنہوں نے یہ مضمون پڑھا ہوگا اپنی ساسوں
کے ساتھ اس رویّہ میں تبدیلی آگئی ہوگی (عصمت فروری ۱۹۳۹ء)
بڑوں کا ادب (عصمت ۱۹۱۰ء) غریب رشتہ دار (عصمت ۱۹۱۰ء)
بہوؤں کو ہدایتیں (۱۹۱۱ء) وغیرہ کے موضوعات عنوانوں
سے ظاہر ہیں۔ ہماری بیٹیاں (۱۹۱۱ء) کنواری لڑکیوں

کی حمایت میں ہے۔

"ان کی بے غیرتی کہو مجبوری سمجھو مگر یہ تو دیکھو کہ مار بھی پٹی کوسنے بھی پڑے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہی ایک کی ایک ان کا کوئی اور ٹھکانا نہیں کہ چلی جائیں کوئی سازش نہیں کہ حمایت سے ایک مار کیا ہزار مار پڑے ایک فضیحتی کیا لاکھ فضیحتیاں کرو مگر ان کو تو اپنا وقت وہ وقت اب آنکھ بند کر کے گذرا تمہاری ہی دہلیز پر پورا کرنا ہے اس سے زیادہ بے قدری کرو مر بھی جائیں گی تو تمہارے ہی گھر پر اور کفن یا جہیز جو کچھ بھی ملیں گی تمہارے ہی ہاتھ سے۔ قصور کریں تو ان کو سزا دو مگر جو کچھ کرو خود ہی کرو۔

یہ اس آفت میں اور ایسے گھر میں جانے والی ہیں جہاں اگر ان کے ٹکڑے بھی اڑ جائیں گے تو کوئی آہ نہ کرنے گا"

"جہیز و تجہیز" (عصمت ۱۹۰۸ء) یہ فلسفیانہ مضمون مذہبی رنگ میں درد و اثر سے لبریز ہے۔ بیٹی کی وداع کے بعد

"غمزدہ ماں دو تین رات کی جاگی چار پانچ دن کی تھکی ماری بیٹھی ہوئی آواز چڑھی ہوئی آنکھیں ہاتھ پاؤں شل کر پٹڑا پٹاری پر سر رکھ لیٹ گئی۔ پکا ہوا پھوڑا مواد موجود۔ بھرا ہوا دل لگے ہوئے چرکے پلنے کی دیر تھی بیٹی کی تصویر آنکھ کے سامنے ممتا کی ماری سوچنے لگی بیٹی بیگم تم تو سچ مچ ہی ہماری مہمان نکلیں۔ افسوس ماں سے مہمان داری کا حق ادا نہ ہوا۔ ذرا ذرا سی بات پر منہ بھر کر کوسنے دیئے باپ کی گھڑکیاں بھائیوں کی ماریں میری فضیحتیاں ! اے بچی ہم نے کچھ قدر نہ کی لڑکے جو سرا کے رہنے سہنے والے تھے ان کو اچھے اچھے کپڑے اور جو مسافر کی طرح

چند روز رہ کر سدھاری۔ وہ ماں کے گھر بیٹی کو دلہن بنا کر بیاہ کھاتا ہے پہلے چھپکے کپڑے لگے ہیں برس کی تو ہے چھو بیٹے نے کیسا کٹورا کھینچ کر مارا ہے کہ کنپٹی سے خون کی تلی بہنے لگی۔ چپکی منہ دیکھ کر رہ گئی۔ لیو ... ہے جب دھیان کرتی ہوں کیسی صبر کی پتلی تھی اس کی ... اُف کیا مجال جو ہاتھ اٹھا کر دے دیا سر جھکا کر لے لیا۔

بیٹیوں کا باپ کونسا سنگ دل مرد ہے جو ان سطروں کو پڑھے اور کلیجہ پکڑ کر نہ رہ جائے۔ لڑکیوں اور عورتوں کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی اور ان کے حقوق کی حمایت جیسی مصور غم نے کی ہے اُن کے عشر عشیر کا بھی تو کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔

لڑکی میکے میں (عصمت ۱۹۰۸ء) اور کوار ... کے تین دور (تمدن ۱۹۱۲ء) یہ مضامین بھی لڑکیوں کی حمایت میں ہیں۔ ناراضا مندی کی شادی (عصمت ۱۹۱۱ء) اس مضمون میں مفصل بحث کر کے بتایا ہے کہ شادی کے وقت لڑکیوں کی رضا مندی کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے

"ہزار برس کی بہو" اور "منحوس دلہن" یہ دونوں مضمون بہوؤں کی حمایت میں ہیں اور عصمت کے دورِ اوّل میں شائع ہوئے تھے۔ عالم ارواح سے عورتوں کی صدا غالباً ۱۹۱۳ء کے تمدن میں شائع ہو کر متعدد پرچوں میں نقل ہوا تھا۔ اس دردانگیز مضمون میں دکھایا ہے کہ پیدائش سے موت تک عورت کو کیسی مصیبت کی زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ اور اس کی خدمات کا صلہ مردوں کی طرف سے کس سنگ دلی اور بیدردی سے دیا جاتا ہے:۔

"قدرت کے انعام ہمارے واسطے مصیبتیں ہو گئیں اور یہ دنیا جو تمہیں نصیب اس کی دلچسپیاں ہمارے واسطے آفتیں۔ چہار دیواری کی حکومت پر راج کرنے والے

• "بہو بیگم کی ندامت" سہیلی (۱۹۳۵ء) فضیحی ناعاقبت اندیش لڑکی کی کہانی جس نے ساس کی شفقت کی قدر نہ کی اور بعد میں پچھتائی۔

• "موئی مٹی کی نشانی" عصمت (۱۹۳۵ء) بڑی بہن کے انتقال کے بعد جو اپنی یادگار ایک بچہ چھوڑتی ہے ایک لڑکی کی شادی بہنوئی سے ہوتی ہے اور بھانجہ کے ساتھ جو اب اس کا سوتیلا بیٹا ہے اس کا سلوک اچھا نہیں۔ اپنے بچے کا دودھ چھٹنے کی تقریب پر کئی من کھانا پکا مگر بن ماں کا بچہ اس سے محروم رہا۔ رات کو خواب میں یہ عورت مری ہوئی بہن کو دیکھتی ہے جو اسے سمجھاتی ہے کہ دنیا بے ثبات زندگی ناپائیدار عمر بے وفا خوشیاں عارضی اور حکومت فانی چیزیں ہیں۔ یہ ساری سرگذشت خود عورت کی زبانی ہے۔ دوسرے دن وہ بن ماں کے بچہ کو کلیجے سے بھینچ کر خوب روتی اور عہد کرتی ہے کہ اپنے بچہ اور بہن کے بچے میں کوئی فرق نہ کرے گی۔

• "دو دن سلطان بیگم کے پاس" (۱۹۳۵ء) ایک عورت اپنی سہیلی سے ملنے جاتی ہے اس کا سلیقہ اور بچوں کی تمیز و تربیت دیکھ کر اس قدر خوش ہوتی ہے کہ اس سبق آموز واقعہ کو دوسری عورتوں کے لئے قلم بند کرتی ہے۔

• "ایسی بیاہی سے کنواری بھلی" اس درد انگیز افسانے کے متعلق اڈیٹر ساقی لکھتے ہیں:۔

"یہ ایک دردناک کہانی ہے جس میں ایک نوجوان لڑکی کی شادی ایک بڈھے تحصیلدار سے کر دیتی ہے اور اس کے غمناک نتائج کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ نقشہ لڑکی ہی کی زبانی کہلوایا گیا ہے۔ اس کی ابتدائی سطور اس درجہ موثر ہیں کہ دل کانپ جاتا ہے۔

"میکہ کی سہیلوں پر شادی کا جو خواب (ان حسان) نے دکھایا اس کی تعبیر تو ری کا ہوئی اور تیرہ (برس) جینے کے بعد تحصیلدار صاحب رخصت ہوئے (اب) عمر کس طرح گذرے گی۔ اور یہ زندگی جس میں تین (بچوں) کو پال پوس کر جوان کرنا اور بیاہ دینا ہے (کس طرح) بسر ہو گی کون بتا سکتا ہے"

اس افسانہ کا ایک اور سین دیکھئے مولانا نے سچا نقشہ کھینچا ہے کہ بہت کم اور کہیں دیکھنے میں (آئے گا)۔

"شادی کو مشکل سے پچیس روز ہوئے ہوں گے کہ انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ بیگم دو چار سفید بال چن دو۔ طوعاً وکرہاً اٹھی اور حکم کی تعمیل کی۔ (شادی) کو تیسرا سال تھا کہ تحصیلدار صاحب نے خضاب شروع کیا۔ گھر میں دو دو مامائیں تھیں۔ پانچ (چھ) نوکر تھے۔ تیسرے چوتھے دن نائی بھی آتا تھا (مگر) فن خطاب کی ماہر بیگم ہی تھی۔ ہر اتوار کو ملنگ (سے) سکتے ہی گوشت ترکاری کے ساتھ انڈے بھی منگوانے فرض تھے"

"بی انجم" (۱۹۳۵ء) بہت پر لطف خاکہ ہے۔ "بی انجم عقلمند تو سماں کی تھیں ایک دن بیٹھے بیٹھے جی میں کہا آئی کہ چلو گیتی آرا بیگم سے مل آئیں ...... البتہ ذرا ناوقت ہے۔ تو جان پہچان میں وقت ناوقت کیسا۔ جب وقت فرصت ملی اور موقع ہوا وہی وقت ہے۔

"مئی کا مہینہ قیامت کی گرمی۔ سنسان سڑک بی انجم ڈولی میں بیٹھ پیچھے پیچھے بڑھیا ماشیش محل پہنچیں۔ شہر میں دبا۔ گیتی آرا کا شوہر ڈاکٹر کا حکم کہ مریض بھی آئے تو تالا دوسرے دروازہ بند تھا اور

دراں سونا تھا۔ کہلا بھیج رہے تھے۔ بی انجم ڈولی
میں گئے گھنٹے بے اوسان ہوگئیں تو بڑھیا پر برس
پڑیں۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھلا۔ بی انجم اندر پہنچیں
رکھنی آپا بیگم کا شوہر پردے پر جارہا تھا اور وہ
اسباب وغیرہ ٹھیک کر رہی تھیں۔ بی انجم نے دہلیز پر
قدم رکھتے ہی لڑنا شروع کر دیا۔

واہ بوا واہ۔ خدا نہ کرے کہ کوئی تمہارے گھر سے
بھی مٹی پلید کی۔ دو گھنٹے سے ڈولی بیچی پڑی ہے
اور کوئی پوچھتا تک نہیں۔"

بیگی آپا نے غصہ کا جواب اخلاق سے دیا اور بتایا
قلعہ آنا خراب ہے۔ اور یہ عرض کیا کہ پہلے سے
اطلاع دیدی جاتی تو پریشانی نہ اٹھانی پڑتی اور
یہ ڈاکٹر کے اسباب کی درستی میں مصروف تھیں
تو کہتی ہیں:۔

"مجھے کیا خبر تھی آپ کو فرصت نہ ہوگی۔ نہیں تو
آنے ہی کا ارادہ نہ کرتی۔ اب آگے کو کان پکڑا"

ان کے علاوہ ۱۴ کہانیاں اور ہیں جن کے
عنوانات یہ ہیں:۔

کائنات کا مطالعہ۔ ضمیر کی آواز۔ شوہر کا استقبال
نند کا شکار۔ امینہ بنت اظہر۔ عالم بالا کی ایک روح۔
بیوی مسلمان شوہر کی نگاہ میں۔ شادی کی ندامت۔
بسیمہ۔ انتظار۔ کیا لڑکیوں کی پیدائش ماں کا قصور ہے
سلطانہ کے وعدہ کا انتظار۔ دو معصوم آنسو۔

علامہ مغفور نے طویل مختصر افسانے کئی کئی دن
میں لکھے تھے۔ گرداب حیات کے یہ افسانے بہت چھوٹے
چھوٹے ہیں۔ اور زیادہ تر ایک ایک نشست میں لکھے
گئے تھے۔ بعض کہانیاں دس دس پندرہ پندرہ منٹ میں
لکھوائی گئی تھیں۔ یہ کہانیاں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۳ء تک
کے عصمت و سہیلی میں شائع ہوئی تھیں $\frac{22 \times 18}{8}$
کے ۱۴۲ صفحے ہیں۔ تین اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

۶۶۔ سیاحت ہند

حضرت علامہ مغفور نے تربیت گاہ بنات اور
حقوق نسواں کے سلسلہ میں فرشتہ ہند کے جو دورے ۱۹۲۳ء
سے ۱۹۲۵ء تک کے زمانہ میں کئے تھے اس کے حالات قلمبند
فرمائے تھے جو عصمت بنات۔ رہبر دکن تنظیم وغیرہ میں
شائع ہوئے تھے۔ یہ جمع کرکے کتابی صورت میں بعنوان
"سیاحت ہند" اگست ۱۹۳۵ء میں میں نے شائع کردئے اور
جون تک تین دفعہ یہ کتاب شائع کر چکا ہوں۔ ضخامت
$\frac{20 \times 18}{8}$ کے ۲۰۸ صفحات ہیں۔

عصمت اشاعت نمبر میں حیدر آباد دکن کے
مشہور ادیب جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی کا مضمون
"مصور غم کے سفرنامے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا
جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اردو زبان میں ہندوستان کے متعلق بہت
کم سفرنامے ہیں۔ اس لئے جو سفرنامے دستیاب ہوں
وہ ضرور قابل قدر ہیں۔ اس لحاظ سے مصور غم کی سیاحت
بھی قابل قدر ہے۔ مصور غم کے ان سفرناموں سے
جو امور اخذ کئے جاسکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ان سفرناموں سے ان کا دردِ دل اور
نسوانی طبقہ کی سدھار کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔
اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح عورتوں کی تعلیم و تربیت
ان کے دردِ دل کے شریک اور ان کے حقوق کے حامی تھے۔

(۲) ان سفرناموں سے ہندوستان کی علمی دنیا
کی آگاہی ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی اطلاع اور ہر

شہر کے علم دوست اور ارباب ذوق کا تذکرہ ملتا ہے۔

(۳) ہر شہر کی تعلیم یافتہ خواتین کے مختصر حالات اور ان کی علمی دلچسپی قومی خدمات کی اطلاع ہوتی ہے۔

(۴) قومی درد رکھنے والے اور ایثار کرنے والے طبقہ کا علم ہوتا ہے۔

(۵) ہندوستان کے مختلف حصوں کے تمدن معاشرت، اخلاق و عادات کی توضیح ہوتی ہے

(۶) ان سفرناموں سے خود مولانا کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے خانگی زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

(۷) زبان کی شیرینی سادگی اور صفائی جو لطف دے جاتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے مضمون میں (۴) اقتباسات دیے ہیں۔ ان میں سے تین درج ذیل ہیں:-

"آج سے قریباً بیس سال قبل جب حجاز ریلوے تیار ہو چکی تھی اور ایک مشہور ادیب نے جو اس وقت تاج برطانیہ کا معزز عہدہ دار ہے اپنے سفرنامہ میں یہ فقرہ لکھا تھا "میل ٹرین کو ایک لڑکی لڑبی لے جاتی تھی" آج ٹکٹ لیتے وقت ہتے یہ الفاظ سنے "نہیں چاہیے - حالی روپیہ دو"

"ہم دلّی کی گرمی سے اکتائے ہوئے تھے۔ بھوپال پہنچ کر جان میں جان آگئی۔ دھوپ بہت کم تھی اور اگر تھی بھی تو تمازت بالکل نہ تھی۔ اکثر ترشح ہوتا رہتا۔ شیخ عبدالغفور صاحب کی چھوٹی بچی خیرالنساء کی عمر چھ سال ہوگی وہ بیگم راشد الخیری صاحبہ سے بہت ہی مانوس ہے عجیب تماشے کرتی۔ وہ کبھی تو ہیر لین کی شیشی لاکر ان کے منہ پر ملتی کبھی سر میں ڈال کر کنگھی کرتی اور کبھی پھول لاکر سر پر لگاتی"

"ایک روز جب ہم روٹی کے قریب [illegible] معلوم ہوا کہ سید صاحب کے سوا اب تک کسی نے [illegible] نہیں کھایا۔ مجھے بیگم صاحبہ کی اس غیر معمولی [illegible] بہت تکلیف ہوئی۔ بچے ضرور اپنے دل میں کہیں [illegible] اماں جان کے مولوی صاحب آئے تو [illegible] بہت پڑا۔ ابا جان کے مولوی صاحب کہیں جاتے تو شاید رات کو بھی کھانا نصیب نہ ہو"

۷۰۔ دادا لال بجھکڑ | منصور مرحوم علیہ الرحمہ [illegible] افسانوں کا مجموعہ [illegible]

جو نوٹ اس کتاب کے شروع میں دیا تھا اس میں لکھا تھا کہ:-

"دادا لال بجھکڑ" اپریل ۱۹۲۸ء کے عصمت سے چھپنا شروع ہوا تھا اور اس مجموعہ کے صفحہ ۲۵ سے [illegible] ۱۳، مہینے شائع ہوتا رہا پھر کئی ماہ اس کے [illegible] نہیں لکھا۔ عصمتی بہنوں کے اصرار اور تقاضوں پر [illegible] میں ایک قسط (صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۱۳۱) اور لکھی [illegible] "میلہ میں میلہ" قسط وار عصمت میں چھپ رہا تھا [illegible] تکمیل مقدم سمجھی گئی ...... یہ پر لطف افسانہ گو نامکمل لیکن حضرت منصور مرحوم کی ظرافت نگاری کی خصوصیات اس میں موجود ہیں ..... اس کے ساتھ چار افسانے اور بھی ہیں جو حضرت علامہ مغفور نے اپنے بہت سے مضامین اور نظموں کی طرح اپنے نام سے شائع نہیں کیے لیکن اردو ظرافت میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں"

ان چار افسانوں کے عنوانات یہ ہیں:-

مولوی صاحب کا وعظ - شام رہ جاں - بھائی ظفر

ہزاروں بگڑے ہوئے گھران مضامین کی بدولت سدھر گئے یہ مضامین ساٹھ سے اوپر ہیں۔ بعض کے عنوانات یہ ہیں :۔
مرد کی کمائی عورت کا سلیقہ۔ گھر کی جھاڑو بہورڑ کا بچہ۔ عورت کی زندگی کا مقصد۔ عورت کی عارضی خوشی۔ خانہ داری میں لاپروائی۔ خانہ داری کا بجٹ۔ بے قاعدہ خرچ۔ ہر بات کا ایک وقت ہر کام کی ایک جا۔ فرضِ اولیٰ بیوی۔ ماماؤں کا کال۔ تقسیم اوقات۔ باورچی خانہ۔ پانی کے مٹکے۔ کاٹ کباڑ۔ غسل خانہ۔ مکان کی زینت کپڑوں کی رنگائی۔ دانت۔ آنکھیں جسم کی صفائی۔ زچگی۔ لیڈی ڈاکٹر۔ ماں بننے والی لڑکی کو ہدایتیں۔ بچہ کا پہلا سال۔ بچوں کی پرورش میں احتیاط۔ بچوں کی صحبت وغیرہ۔
یہ مجموعہ ۵ دفعہ چھپا ہے ۲۲×۱۸ تقطیع کے ۱۹۰ صفحے ہیں۔

"گدڑی میں لعل۔ عروسِ مشرق وغیرہ ایسے مضامین کے مجموعے ہیں جن کے اندر عورت کی زندگی کے ہر دور کی تصویر ملتی ہیں۔ اور موضوعِ کلام وہ حالات ہیں جن کے بننے بگڑنے سے زندگیاں بنتی ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے مضامین کے اندر مولانا نے اپنے مخصوص دلنشیں اندازِ بیان میں جو اور جتنی باتیں لکھی ہیں وہ ایسی اور اتنی ہیں کہ ان مجموعوں کو عورت کی زندگی کی ایک انسائیکلو پیڈیا کہنا نامناسب نہ ہوگا"
ل احمد اکبر آبادی ________ عصمت فروری ۱۹۳۹ء

"محاورات کا استعمال جس خوبی سے علامہ مرحوم نے اپنی تصانیف میں کیا ہے اور جیسی پیاری زبان لکھ گئے ہیں اس کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ گدڑی میں لعل میں دیکھئے :۔
"ہنر سلیقہ تیرے نہیں۔ لینا دینا میرے نہیں۔ میٹھی جیب چلائیو۔ روٹی کھائیو"
دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔
"بالغرض آج مانگے تانگے کا زیور گوٹے لچکے۔ کپڑوں سے کسی غیر محفل اور اجنبی آدمیوں میں شریک ہو گئیں تو کل کیا؟ اور کوئی بیوی اپنے گھر آ نکلیں گھر میں کتے لوٹ رہے ہیں۔ مٹی میں مل گیا گہنا کوڑی کی ہو گئی عزت۔ خوان بڑا خوان پوش کھول کے دیکھا تو ادھا بڑا۔"

اس موضوع پر سیر حاصل تبصرے ہر مضمون پر ہیں۔ خانگی نسخے ہیں۔ خانہ داری کے اہم امور سگھڑاپا۔ سلیقہ۔ صفائی غرض کتاب کیا ہے ایسی چیز ہے جو ہر لڑکی ہر عورت کے لئے رہبر ہے"
رئیس طلعت پشاوری ________ (عصمت فروری سنہ

۱۹۳۷ء میں جن کا اضافہ ہوا

۶۹ - بساطِ حیات | یہ مجموعہ ہے ۹ سبق آموز افسانوں کا جن میں جانوروں کی زبانی حیاتِ انسانی کے مشاہدات بیان کئے گئے ہیں۔
پہلا افسانہ "بے زبانوں کا صبر" (عصمت ۱۹۰۹ء) میں دکھایا ہے کہ انسان اپنا دل خوش کرنے کے لئے ان بے زبانوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھاتا ہے اور قدرت کس طرح کمزوروں کی حمایت میں طاقتوروں سے انتقام لیتی ہے۔
" حیاتِ انسانی پرندوں کی بحث " (تمدن ۱۹۱۲ء) میں مادہ کی رائے انسان کے متعلق بہت سخت ہے۔ نر کی رائے میں انسان ارذل ترین مخلوق۔ آخر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ "آؤ انسانی دنیا کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ حیوان کی یہ جنس جو اشرف و اعلیٰ ہونے کی مدعی ہے کس رنگ میں

بلو کرے "پیران کا مطالعہ دو دردناک کہانیاں ہیں۔
تیسرا افسانہ "داستانِ بلبلِ اسیر" (عصمت ۱۹۱۶ء)
میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنے گھر کی ملکہ تھی۔
... اس کا غلام تھا۔ مگر وہ نخوت میں چور اور انسانیت
سے کوسوں دور تھی۔

چوتھا افسانہ "جانور کون ہے؟" (نظام المشائخ
۱۹۲۲ء) میں کئی عبرت ناک کہانیاں ہیں۔ جانوروں کی پارلیمنٹ
میں کبوتر۔ چڑیا۔ چیونٹی وغیرہ اپنے اپنے مشاہدات و تاثرات
انسان کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ پہلی کہانی ایک مسلمان
اور اس کی بیوی کی ہے۔ جو ایک غریب لڑکے کو اپنی اور اپنے
بچوں کی خدمت کے لئے زبردستی رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری
کہانی دو بیٹوں کی ہے جو ایک دوسرے کی جان کے
دشمن تھے۔

قوم بے چاری پریشان ہو گئی کہ کس کی سنے اور
کس کی نہ سنے بالآخر مصالحت کا ایک جلسہ ہوا۔ دور
دور کے عالم و فاضل لیڈر اور کامل جمع ہوئے یعنی
مظہر اشرف المخلوقات۔ کی صحبت یا ایھا الذین
آمنو سے شروع ہوئی اور ماں کی گالی پر ختم ہوئی۔"

تیسری کہانی اس چوتھے افسانہ میں ایک سخت دل
ڈاکٹر کی ہے اور چوتھی کہانی ایک مسلمان شوہر کی ہے جس کی
دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کے ساتھ ظالم شوہر جانوروں
کا سا سلوک روا رکھتا تھا۔ اس کی دوسری بیوی سوکن
کے بچے کو قتل کر کے سوکن کو پھنسوا دیتی ہے اور ایک
بے گناہ عورت کو قاتل ثابت کرنے میں ۲۱ انسان ساعی تھے۔
یہ مجموعہ تین دفعہ شائع ہوا ہے $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ کے ۸۴ صفحے ہیں۔

۷۰۔ نشیب و فراز | یہ ۸ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اور
گرداب حیات کی طرح اس میں بھی

وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں جو علامہ مغفور نے لڑکیوں
میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے فرضی ناموں
ناموں سے لکھی تھیں۔ یہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء کے زمانہ میں
رسالہ عصمت میں شائع ہوئی تھیں۔ کہانیوں کے
عنوان یہ ہیں۔

نعیمہ بیگم کی لوری اور بیس۔ مغز قیمہ ی۔ روزہ دار
ا۔ بیس بیس۔ فضول خرچی کا انجام۔ بے تکلف ان جان
نے غلطی کی۔ سوکن کی نصیحت۔ ایک کنواری لڑکی کے
چند گھنٹے۔

یہ مجموعہ تین بار شائع ہوا ہے۔ ۳۲ صفحات
$\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ کے ہیں۔

۷۱۔ مسلی ہوئی پتیاں | علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ اُردو میں مختصر افسانہ
نگاری کے بانی ہیں۔ ان کے مختصر افسانے ۱۹۰۳ء سے
مخزن لاہور میں چھپنے شروع ہوئے تھے۔ "نصیر اور
خدیجہ" خط کے پیرایہ میں دردانگیز افسانہ ہے جس میں بھائی
کی لاپروائی کی بے حسی سنگ دلی اور بہنوں کی بے لوث
محبت دکھائی گئی ہے۔ شیخ (بعد میں سر) عبدالقادر مرحوم
نے جو مخزن کے اڈیٹر تھے اس افسانے کے ساتھ جو نوٹ
دیا تھا اس میں لکھا تھا:۔

"اس مضمون میں بڑی بہن (خدیجہ) اپنے بھائی
(نصیر) کو خط لکھتی ہے اور دوسری مری ہوئی بہن کے
بچوں کی خراب حالت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ خط اس
بے ساختہ پن سے لکھا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو
جی چاہتا ہے۔"

سر شیخ عبدالقادر کا مکمل نوٹ اور نصیر و خدیجہ
کے اقتباسات صفحہ ۱۰۷ پر آچکے ہیں۔

"مسلی ہوئی پتیاں" مجموعہ ہے علامہ مغفور کے گیارہ خطوط کا جن میں "نصیر اور خدیجہ" کے علاوہ دس افسانے بصورت خطوط اور ہیں۔ اور یہ خطوط ماؤں کی طرف سے بیٹیوں کے بہنوں کی طرف سے بھائیوں کے بیوی طرف سے شوہر کے نام ہیں۔ اور دیور بھاوج کی خط و کتابت بھی کہ زنانہ خطوط کی ایک کتاب لڑکیوں کی انشا سنہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس مجموعہ میں بھی زنانہ خطوط ہیں۔ ہر خط میں انسانی زندگی کا کوئی دردناک پہلو رکھا گیا اور حقوقِ نسواں کی پامالی پر آنسو گرائے ہیں۔ ان خطوط میں مظلوم بیویوں اور ستم رسیدہ بہنوں کی دل ہلا دینے والی داستانیں ہیں۔

اس مجموعہ کے آخری خط سے :۔

"اکرم میرے لال بڑی مصیبت کے بیٹے ہوئے ہیں۔ نو برس کی بیاہی مانند بے کی اور آج سر کا وارث اٹھے تیرہ برس ہو گئے۔ یہ رنڈاپا سارا نند کے سامنے اس چوکھٹ پر بسر کر دیا۔ روکھی سوکھی جو میسر آئی کھلا دی اور کھائی۔ حلف رکھ دو سارے محلے کے ہاتھ پر جو کسی نے آواز تک سنی ہو۔ خدا دیکھتا سلائیاں کیں، بھوکی سوئی۔ پیوند لگائے۔ مگر مرے ہوئے باپ دادا کی آن میں فرق نہ آنے دیا۔ کیوں بھائی تمہاری کمائی میں دکھیا بہن کا اتنا حق نہ رہا کہ ہیچ نیواں کو تو یاد کرو۔ ماشاء اللہ صاحب اولاد ہو۔ دل پر ہاتھ رکھو کیا گزرتی ہوگی مجھ ماں کے دل پر۔ آج برس کے برس دن کے کا مزدور دنوں پہلے بچوں کے کپڑے تیار کرتا ہے مگر اللہ تحصیلدار کی بیٹی اور ڈپٹی کی بہن کے بچوں کو دھوبی کے دھلے کپڑے بھی نصیب نہیں۔"

یہ خطوط ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک کے زمانہ میں لکھے گئے اور تمدن، عصمت، تمدن میں شائع ہوتے تھے۔ اس مجموعہ کے چار اڈیشن نکل چکے ہیں جن کے ۸۰ صفحے ہیں۔

۷۲۔ تلیلِ بیمار | لڑکیوں کی تعلیم پر حضرت علامہ مغفور کے ۱۹ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۰۸ء سے

زمانہ میں عصمت خطیب وغیرہ میں شائع ہوئے۔ چند عنوانات یہ ہیں :۔

منزلِ مقصود۔ کام کا وقت۔ عورتوں کے حقوق۔ تعلیمِ نسواں۔ تربیت تعلیم سے زیادہ۔ تین سوال۔ نصاب مروجہ کی ایک جھلک۔ دنیا مل گئی۔ پردہ اور تعلیم۔ بہار کا پردہ۔ تعلیمِ نسواں۔ جہاں آباد کے طائرانِ خوش الحان کی :

۳ بار یہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کے ۸۰ صفحے ہیں۔

۷۳۔ احکامِ نسواں | نومبر ۱۹۰۹ء کے عصمت میں حضرت علامہ مغفور

تحریر فرمایا تھا۔

"ارادہ ہے کہ وہ احکام جو عورتوں کے متعلق ہیں عصمت کے ذریعہ بالتفصیل بیان کئے جائیں"

اور وہ احکام مختلف مضمونوں کی صورت میں بیان ہوتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں جب سالنامہ جاری فرمایا تو پرچہ کی ضخامت کے پیش نظر ایک ڈیڑھ ڈیڑھ صفحے کے تین چار مستقل عنوانات تھے جن میں ایک احکامِ نسواں تھا۔ اور اس کے تحت قرآن کے وہ احکام جو عورتوں سے متعلق ہیں مع ترجمہ و تفسیر شائع ہوتے رہے۔ مگر ۱۹۲۹ء میں جب آمد کا لال لکھنے

سلسلہ بند ہو گیا ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں پھر
روع کیا ... یہ کہ صحت گرنی شروع ہوئی - اور یہ
مضامین ...
... ہو گیا -

... مغفور کی رحلت کے بعد ۱۹۳۶ء ہی میں
... کے مجموعے شائع ہو گئے - ان کے بعد جب
... مرتب کر رہا تھا تو قرآن مجید کے احکام جمع کر کے
... شائع نہیں کی گئی تھی ان کی وضاحت بڑا
... تھا - عم مکرم مولانا عبد الغفار صاحب الخیری کی
... اعانت سے خدا کا شکر ہے یہ کام بھی میں نے انجام
... - اور احکام نسواں ۱۹۳۸ء میں بصورت کتاب
... گئے - اب تک یہ کتاب ۳ دفعہ شائع ہو چکی ہے
... ۱۸×۲۲ کے ہیں -

... اصلاً مستقلاً عورت کے متعلق احکام قرآنی
... کی تفسیر ہیں - آخر میں بطور ضمیمہ عبادت روزہ
... پر بھی گفتگو ہے - عنوانات بہت مفصل ہیں -
نکاح - عدل - نفقہ - مہر - طلاق - عدت - خلع
میراث وغیرہ ہر ہر عنوان کے ماتحت آیات متعلقہ مع
ترجمہ درج ہیں - پھر ان کی تشریح اور مصنف کا کمال
ہے کہ جو مسائل بن بیاہی لڑکیوں کے سامنے کھل کر
... جانے مشکل ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ پردے کے
الفاظ اور اشاروں میں ادا کیا ہے "
مولانا عبد الماجد دریا بادی ——— (صدق جدید لکھنؤ جولائی ۱۹۵۲ء)

۷۴ - دعائیں

مارچ ۱۹۳۶ء میں یعنی رحلت سے کچھ کم دو سال پہلے علامہ مغفور نے لڑکیوں کے لئے کچھ دعائیں نثر و نظم میں تحریر فرمائی تھیں اور فوراً ہی اس لئے کتاب شائع نہیں کی گئی کہ حضرت علامہ مغفور کا ارادہ کچھ اور دعائیں لکھنے کا تھا
مگر دوسری مصروفیات اور صحت درست نہ رہنے کی وجہ سے جتنی دعائیں لکھی گئی تھیں ان سے آگے تحریر نہ ہو سکے - پھر ۱۹۳۷ء میں برکے انتخاب کے متعلق ایک مستقل تصنیف شروع کی اور ان دعاؤں میں اضافہ کا موقع نہ مل سکا - صفحہ ۱۸۰ پر اس کتاب کا ذکر آ چکا ہے رحلت کے دوسرے سال جتنی دعائیں حضور نے تحریر فرمائی تھیں شائع کر دی گئیں اور ان کی مشہور تصنیف سے چند دعائیں لے کر بطور ضمیمہ کتاب میں شامل کر دی گئیں - اس طرح یہ ۲۴ صفحوں کی چھوٹی سی کتاب تیار ہو گئی - تین دفعہ چھپ چکی ہے - نظم و نثر کی چند دعائیں صفحات ۲۸۰، ۲۸۲ پر نقل کی گئی ہیں -

۷۵ - چمنستانِ مغرب

علامہ مغفور اوریجنل رائٹر تھے لیکن ان کے ہزاروں طبع زاد مضامین کے علاوہ چند ترجمے بھی ہیں - جب وہ دلی کے ایک اسکول میں میٹرک میں پڑھتے تھے تو ان کی انگریزی اپنی جماعت میں سب سے اچھی تھی - جوانی میں انہوں نے نہ صرف مشرقی بلکہ مغربی علوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا - ان کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ جو کتاب ایک دفعہ پڑھ لیتے پھر نہ بھولتے تھے - مولانا روم، سعدی، حافظ، جامی، شیکسپیر، ملٹن - بائرن وغیرہ کے اشعار جو چالیس پچاس سال قبل پڑھے تھے - آخر عمر میں کبھی کبھی زبانی پڑھا کرتے تھے - ترجمہ میں انہیں خاص مہارت تھی ۱۹۰۳ء کے رسالہ مخزن لاہور میں ان کا پہلا مضمون " خدیجہ اور نصیر " شائع ہوا تھا تو ایڈیٹوریل نوٹ میں ان کے نام کے ساتھ " مترجم عدالت ہندوستان " لکھا ہوا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ان کی ملازمت کا کام ترجمہ کرنا تھا ۱۹۰۳ء میں رسالہ مخزن میں جو فلسفیانہ مضمون " دار الغرور " کے

عنوان سے شائع ہوا تھا اور قطرات اشک میں شامل ہے
اس میں مغربی اور مشرقی مصنفین اور شعرا کا حوالہ دے کر
اُن کے خیالات پر جو تنقید کی ہے۔ وہ ظاہر کر رہا ہے کہ
اُن کا دُوسری زبانوں کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ رسالہ
عصمت کے ابتدائی تین چار سال کے زمانہ میں اُنہوں نے
متعدد انگریزی مضمونوں کے ترجمے کئے تھے۔ پھر ۱۹۲۳ء
میں ہفتہ وار رسالہ سہیلی جاری کیا تھا تو ایک مستقل
عنوان "چمنستانِ مغرب" بھی قائم کیا جس کے تحت اس
نوٹ کے ساتھ ایک ترجمہ شائع ہوا:۔

" خذ ما صفا دع ما کدر اسلام ہی کی رائے
نہیں ہر معقول آدمی کا خیال ہے کہ اچھی چیزیں لو
اور بُری چیزیں چھوڑ دو۔ مغربی چمن میں جو پھول
خوش رنگ اور خوشبودار ملے گا ہم اپنا دامن اُس سے
بھریں گے اور اپنا گلدستہ اُس سے سجائیں گے
یہ عنوان کسی خاص قوم یا طبقہ سے متعلق نہیں اس کے
تحت تمدن معاشرت تاریخ خانہ داری غرض ہر وہ
مضمون درج ہوگا جو خواتین کے واسطے مفید ہو"

اس نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ مغفور
کس قسم کے مضامین کے ترجمے کرتے تھے۔ علامہ مغفور
کسی رسالہ میں اڈیٹر کے نام کا بار بار آنا یا ایک ہی اشاعت
میں کسی مضمون نگار کے ایک سے زیادہ مضامین ناپسند
کرتے تھے۔ نام و نمود سے اُنہیں سخت چڑ تھی۔ پھر وہ
لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق بھی پیدا کرنا چاہتے
تھے۔ ان وجوہ سے یہ ترجمے وہ اپنے نام سے شائع نہ
کرتے تھے۔ لیکن ان کا رنگ ان ترجموں میں صاف
جھلک رہا ہے۔ وہ لفظی ترجمے کے قائل نہ تھے بے ربط
بے جوڑ ترکیبیں غیر مانوس الفاظ وہ ناجائز سمجھتے تھے۔
ان کی رائے میں ترجمے کے معنی ہیں دُوسری زبان کے
مضمون کا مفہوم اس طرح ادا کرنا کہ ترجمہ نہ معلوم ہو
اور یہی خوبی علامہ مغفور کے ترجموں میں ہے۔

" پیاری بچی ایسا گھر بنا جس کے در و دیوار جس سے
چپّہ چپّہ اور کونے کونے سے خوشی ٹپک رہی ہو
جس میں شوہر بشاش ہو اور بچے چونچال اور مطمئن
ہوں اور بزرگ فارغ البال اور بے فکر ہوں پیاری
بچی یہی گھر تیری دنیا ہے۔ تو اس کی ملکہ ہے اور
تیری ذمہ داری حکومت کے بادشاہ اور سلطنت
کی ملکہ سے بڑھی ہوئی ہے"

خزاں کے موسم میں جب بڑے بڑے درخت مُرجھا
رہے تھے اور پتّے اپنی شاخوں سے جُدا ہو کر زمین
کی آغوش میں پہنچ رہے تھے۔ اس پتّے کی طرح جس کو
ہوا کے تیز جھونکوں نے گرایا اور زمین نے گود میں
لیا۔ موت کے فرشتے نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس بچہ کو گود میں
جنت میں لے گیا"

" ایک روز اس کے باپ کا کوئی دوست آیا اور لڑکے
سے کہنے لگا "جناب میں تو فقط کپتان ہوں مگر سُنتا
ہوں کہ آپ امیر البحر ہیں" لڑکے نے نہایت سنجیدگی سے مگر
تیوری پر بل ڈال کر کہا ہاں یہ درست ہے مگر جب تم
کپتان ہو تو تم کو پہلے مجھے باقاعدہ سلام کرنا چاہیے
تھا۔ کپتان یہ سُن کر اُٹھا اور نہایت ادب سے سلام کیا"

اس سلسلہ میں ہم علامہ مغفور کے ایک خط کا
کچھ حصہ نقل کرتے ہیں جو مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم ایڈیٹر
تہذیب نسواں کے صاحبزادے سید امتیاز علی صاحب
کو سنہ ۔۔۔ میں لکھا گیا تھا۔

" کچھ شک نہیں لارڈ لٹن کی بیلی یہ حق رکھتی ہے

علاوہ اس کا ترجمہ اُردو میں کریں۔ اور وہ یقیناً اس
پایہ کی کتاب ہے کہ اُردو لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ
رہے گی۔ لیکن میرے خیال میں وہ بہت مشکل کام ہے
ہے۔ ترجمے کے بعد اس خیال سے کہ راشد کا ترجمہ ہے
ممکن ہے کچھ لوگ دیکھنا پسند کریں لیکن ہندوستان
کے مسلمان اس سلئے کہ لٹن کی لکھی ہوئی ہے اور اُن کی
ستم زاد کا مرثیہ ہے ۔ مجھے تو اُمید نہیں کہ اس کی
طرف متوجہ ہوں۔ مجھے خیال ہے کہ سب سے پہلے سید محمود
نے اس کی طرف توجہ کی اور غالباً معارف میں اس کا
ترجمہ بھی کچھ شائع ہوا۔ لیکن تین چار مرتبہ۔ اس کے
بعد اگر میرا خیال غلط نہ ہو تو عنایت اللہ نے شروع کیا
اور شاید سرسید کی تحریک پر مگر وہ بھی مکمل نہ ہوا۔
اب مولوی صاحب کا خیال ہے تو نہایت قابل وقعت
لیکن یہ انتخاب کہ میں ترجمہ کروں میں نہیں کہہ سکتا کہ
کہاں تک درست ہے یہ ضروری نہیں کہ اور [illegible] اثر
کا ترجمہ بھی کتاب کی طرح کامیاب ہو۔ علاوہ ازیں جتنی
دیر میں ایک صفحہ خود لکھوں گا اتنی دیر میں مشکل سے
نصف صفحہ کا ترجمہ کروں گا اور پھر پورا وقت اس کو
اپنے رنگ میں لانے کے واسطے صرف کرونگا ایسی
حالت میں کتاب پر اس قدر صرف آکر پڑے گا کہ مجھے
اُمید نہیں تہذیب برداشت کرسکے۔ ہاں یہ ممکن ہے
کہ اس کا ترجمہ مجھ کو مل جائے۔ تو میں اس پلاٹ پر
دوسری کتاب لکھ دوں۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ جہاں میرا
نام آجاتا ہے وہاں میں ایک حرف بھی اپنے رنگ سے
علیحدہ جائز نہیں سمجھتا۔ یہی کتاب جو تم نے بھیجی اور
جو میں لکھ رہا ہوں باوجودیکہ ایک مشہور شخص کی لکھی
ہوئی اور مولوی صاحب کی اصلاح شدہ ہے مگر میں نے
ایک سطر ایک فقرہ ایک لفظ بھی اس کا اپنے پاس
نہ رکھا۔ ایسی حالت میں تم مولوی صاحب سے خود
کرکے جو مناسب ہو وہ فیصلہ کرو"

ان ترجموں کا مجموعہ "چمنستانِ مغرب" مترجم کی وفات
کے سال بھر بعد ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ چند عنوانات
یہ ہیں :-

ازدواجی زندگی۔ میاں بیوی کے تعلقات۔ وہ عورت
جو دنیا کی مقروض مری۔ تعارف۔ آرام۔ آدابِ ملاقات
مہمانداری۔ گھر کی صفائی۔ باورچی خانہ۔ خوبصورتی
کا نسخہ۔ عورت چالیس کی عمر میں۔ بچہ کا پہلا سال۔
زینۂ تربیت کی پہلی سیڑھی۔ وقت کی پابندی۔ خانہ داری
کے اصول۔ ترکاریاں۔ ماں اور ڈاکٹر۔ عورت کی قومی
خدمات وغیرہ ۔ یہ مضامین ۵۰ کے قریب ہیں۔ فنِ ترجمہ
کے لحاظ اور ادبی اقتباسات اُردو لٹریچر میں چمنستانِ مغرب
تراجم کی بہترین اور زنانہ لٹریچر میں نہایت مفید کتابوں
میں سے ہے۔ ۴ بار شائع ہو چکی ہے ضخامت سوا سو صفحے۔

۷۶ - محسنِ حقیقی یہ اُن ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہے جو
سرورِ کائنات رسول اکرم صلعم کے
پاک زندگی سے متعلق ہیں یہ مضامین حضور اکرم کی تکالیف
کا ایک دور۔ "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" اور "عَبَسَ وَتَوَلّٰی"
اور شبِ عید یادِ محبوب میں [illegible] [illegible] کے زمانہ
میں رسالہ نظام المشائخ میں شائع ہوئے تھے اور
۶، ۶، ۷، ۷ صفحوں کے ہیں۔ باقی مضامین عصمت و
بنات میں شائع ہوئے تھے۔ اور دو دو تین تین صفحوں
کے ہیں۔ ان کے عنوانات یہ ہیں :-

خلقِ محمدی۔ سردارِ دو جہاں کا اخلاق۔ مجلسِ میلاد
عید میلاد۔ مولود شریف میں اصلاح کی ضرورت۔

۱؎ بزم آخر (رازق الخیری)

شانِ رسالت ۔ مولود شریف کی کتاب ۔ معراج نبوی
اور رسول اللہ کے ساتھ ۔

آخری مضمون بنات نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع
ہوا تھا ۔ یعنی بیمار پڑنے سے دو تین دن قبل قلمبند فرمایا
تھا ۔ یہ مجموعہ ۳ دفعہ شائع ہو چکا ہے ضخامت ۱۸×۲۲/۸
کے ۲۰۵ صفحے ۔

۷۷ ۔ حُور اور انسان

۱۰ افسانوں کا مجموعہ ہے "حور اور انسان" (عصمت ۱۹۱۵ء) اس ایک افسانہ میں کئی قصے ہیں ۔

ملکہ خیابان اور اس کا شوہر" دس برس تک ساتھ رہے ۔ ملکہ بادشاہ پر پروانہ تھی ۔ اور شب و روز اس کی اطاعت میں مصروف ۔ ملکہ نے دس سال تک اپنی زندگی کا فرض یہی سمجھا کہ بادشاہ کی آنکھ کسی طرح میلی نہ ہو ۔ وہ اس کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ایک دن بادشاہ کا پاؤں پھسلا اور سخت چوٹ آئی ۔ ۔ بادشاہ کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی ۔ ملکہ نے اس نے اس کے لئے دعا کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اس کا تمام چہرہ آنسوؤں سے تر تھا ۔ ۔ ۔ ۔ بادشاہ جس دن بالکل تندرست ہوا ملکہ اس جہان سے رخصت ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے اعمال کا جائزہ شروع ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی اچھی بیوی بھی شوہر کے حقوق میں پوری نہ نکلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سخت عذاب میں بھی جو دوزخ کے فرشتے اس پر دن رات کرتے تھے اس کو اگر کبھی ہوش آتا تو بادشاہ کے سوا کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکلتا تھا ۔ ملکہ نے دوزخ کے فرشتے سے درخواست کی کہ مجھے ایک دفعہ بادشاہ کی صورت دکھا دو ۔ یہ خواہش اس شرط پر منظور کی گئی کہ ملکہ کو سات گنا عذاب اٹھانا پڑے گا ۔ ملکہ بادشاہ کے محل میں پہنچی تو بادشاہ کو دوسری ملکہ سے مصروف گفتگو پایا ۔ بادشاہ اس کے متعلق اس دوسری ملکہ سے کہہ رہا تھا ۔
" میں نے اس کو کبھی منہ نہ لگایا ۔ وہ اس وقت ہوتی تو میں تیری لونڈی بنا کر رکھتا ۔"

دوسرے قصہ میں ایک اور بیوی کی علاوہ اور اس کے شوہر کی بدمزاجی اور سنگدلی دکھا ... حور کا تیسرا مشابہہ ایک ہندو عورت کا ہے ۔ جو اپنے شوہر کے ساتھ زندہ جلائی گئی تھی ۔

تیسرا قصہ ایک مسلمان خاندان کا ہے جہاں بیوہ کا نکاح ثانی گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا ۔ دلہن چودہ سال کی تھی اور تین دن کی بیاہی رانڈ ہوئی تھی ۔ ماں نے ... اس کا نکاح ٹھیرا دیا تھا ۔ اور برات آچکی تھی کہ ... دونوں چچا اور ایک بھائی غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں داخل ہوئے غضب ناک ہو کر برات کو حکم دیا کہ فوراً گھر سے نکل جائیں ورنہ ایک آدھ کا خون ہو جائے گا ۔ برات اٹھ گئی اور خدا اور اس کے حکم کو ٹھکرانے والوں کی ناک کٹنے سے محفوظ رہ گئی ۔ مگر لڑکی جسے اجازت نہ تھی کہ کبھی سر گوندھے اور حکم نہ تھا کہ اچھے کپڑے پہنے جس کے دل پر ہر وقت تفکرات کی گھٹا چھائی رہی بیمار رہنے لگی ۔ اور بالآخر مر گئی ۔ یہ افسانہ نامکمل ہے ۔ اپنی اپنی جگہ سب قصے مکمل ہیں ۔ اور نہایت ہی موثر اور نتیجہ خیز ہیں ۔

۲ ۔ ضمیمہ (تمدن ۱۹۱۱ء) تمدن کی پہلی ششماہی میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا ۔ لڑکیوں کی مرضی کے خلاف اُن کی شادی کرنے کا دردناک نتیجہ اس افسانہ میں دکھایا گیا ہے ۔ باپ اس بیٹی کو اس کی مرضی کے خلاف نکاح کر کے دودھ کی مکھی کی طرح نکال رہا ہے جس کا کنوارپنہ ماں کے مرنے کے بعد بالکل اجڑ گیا ۔

وہ بیٹی نازاں نہیں جس نے اُف نہ کی۔ تیوری پر بل
نہ ڈالی۔ نگاہ اونچی نہ کی۔ اور ایک نہ دو سات بلکہ
آٹھ سال اس گھر میں بسر کر دئے جہاں زندگی کا ہر لمحہ
مصیبت تھا۔ جہاں تن ڈھکنے کو چیتھڑا اور پیٹ بھرنے
کو روٹی نصیب نہ ہو۔ مصیبتیں جھیلیں۔ دُکھ بھگتے۔
بیداد سہیں اور آفتیں اُٹھائیں۔ سگے چچا کے گھر
میں جیٹھ جیسا کہ کے رونے نون کی کنکری سے کھوئے
مگر اُس آسمان جس کے نیچے بیٹھی ہوں اس کا خالق شاہد
ہے اس بات کا کہ اس کو سی رُوکھی سُوکھی جو میسر آئی
شکر کیا اور کھالی"

۳۔ شرع کا خون: علامہ مغفور ملک تہذیب کا تہذیب حقائق رکھ کے
سامنے مظلوم کی حمایت لینا شغف دے کر کمزور کو بیٹھوانا ہے
عصمت زنانہ پرچہ ہے اس لئے اس میں مضامین اور افسانے
زیادہ تر فرائض نسواں پر لکھا کرتے تھے۔ مگر جب تمدن
بیدار ہو گیا تو اس میں آزادی کے ساتھ حقوق نسواں
کی حفاظت اور حمایت میں لکھنے لگے۔ چنانچہ تمدن میں ان کے
جو افسانے شائع ہوئے وہ قریب قریب سب عورت
کی مظلومیت اور مرد کے مظالم کی داستانیں ہیں۔ کلام اللہ
مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اور قرآن پاک میں باپ کے مال
میں سے لڑکی کو لڑکے سے نصف حصہ تقسیم کرنے کی تاکید
ہے۔ مگر ہندوستان کے بعض حصوں میں لڑکیوں کو ترکہ
پدری نہیں دیا جاتا۔ اور قرآنی فیصلہ کی کھلم کھلا اور علانیہ
تضحیک کر کے رواج کی پابندی کی جاتی ہے۔
علامہ مغفور کی تمثیل نگاری کی چند سطریں
اس افسانہ میں سے یہ ہیں:۔
"حیات مستعار کی اُس بستی میں جو اقلیم ناپائیدار سے
تعبیر کی جاتی ہے" غضب" اک دریائے ناپیدا کنار

لہریں لے رہا ہے۔ بار آور درختوں کے جھنڈ چھائے
ہوئے ہیں۔ اور میووں سے لدی ہوئی ڈالیاں
جھوم جھوم کر زمین کو چوم رہی ہیں"
مظلوم طبقہ نسواں کی حمایت میں لکھتے ہیں:۔
"جو بیج تم نے کل ڈالے تھے وہ آج پھل لے آئے
مظلومیت اور قنوطیت کا بڑا حصہ مر مر کر اور پیٹ پیٹا کر
زندگی بسر کر رہا ہے اور یہ بھولی بھالی صورتیں یہ حسن کی
دیویاں اور عصمت کی مورتیں تڑپ تڑپ کر راتیں اور
دن گذار رہی ہیں۔ تم ختم ہو چکے مگر تمہارے ظلم ختم نہیں
ہوئے۔ تمہاری آتش فشاں طبیعتوں سے وہ چشمے
پھوٹے ہیں جو قیامت تک خلق خدا کو کھولاتے
رہیں گے۔
جس دل میں بھی تڑپ ہو، درد ہو سوز و گداز ہو
صرف اُس دل سے یہ الفاظ نکل سکتے ہیں۔
"خالق حقیقی! ہماری ان پیاری بچیوں کا تیرے سوا
کوئی وارث نہیں۔ دُنیا ان پر بھاری ہے اور زندگی
ان پر سخت۔ ان کی حالتوں پر رحم کر اور اپنی شفقت
کا ہاتھ ان کی حمایت کو بڑھا۔ ان کی شکایت سن اور
کرم فرما"

۴۔ "پریوں کی محفل": پریوں نے انسانی عورت
کی ہمدردی میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں ملکہ نورنگ
بارہ سال انسانی دُنیا میں زندگی بسر کرنے کا بیڑا اُٹھاتی
ہے تاکہ وہ معلوم کرے کہ مرد عورت کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے
سب سے پہلے وہ ایک مغربی عورت کا مطالعہ کرتی ہے جس کے
دو شخص خواستگار تھے۔ دونوں کو اس نے شادی کا
یقین دلا دیا تھا مگر ان دونوں کو دھوکا دے کر وہ تیسرے
شخص سے شادی کر لیتی ہے اور کچھ روز بعد ان کی علیحدگی

ہو جاتی ہے۔ ملکہ کو بہت غصہ آیا اور وہ اپنے ملک واپس چلی گئی۔ اس نے :-

" ایک لڑکی کو دیکھا جو نشہ جوانی میں چور تھی۔ مگر بیوگی نے اس کی تمام مسرتوں کا خاتمہ کر دیا تھا.... اس کو اتنی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے ہنس بول سکے۔ اس کو اتنا حکم نہ تھا کہ دنیا کی کسی بہار کا لطف اٹھا سکے...... اسے ہر طرف سے کم بخت اور منحوس کے خطاب ملتے تھے۔ اس کو دنیا سے صرف اس قدر تعلق رہ گیا تھا کہ دونوں وقت پیٹ بھر لے"

ملکہ اس بیوہ کا گہرا مطالعہ کرتی اور پھر اس کے لئے پیغام نکاح بھیجتی ہے تو لڑکی کے ورثا اور اقربا ایسے شخص کی ریتا برائی کرنے کے لئے شور و غل مچاتے۔ پتھر اچھالتے آجاتے ہیں۔ لڑکی کا انجام حسرت ناک ہوتا ہے اب پھر ملکہ کو دنیا کی عورت کے ساتھ ہمدردی ہو جاتی ہے اور وہ شب و روز مرد و عورت کے مطالعہ کے لئے ماری ماری پھرتی ہے کہ ایک دن اس کا گذر اورنگ محل پر ہوا۔ پھولوں میں تلنے والی ملکہ انقلاب زمانہ کی مجسم تصویر تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کے شوہر کا وہ خط تھا جس میں لکھا تھا :-

" میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس قدر جلد تمہارا رنگ و روپ برباد ہو جائے گا۔ اور پانچ چھ بچوں کے بعد تم اس قابل ہو جاؤ گی کہ تمہاری صورت دیکھنے کو جی نہ چاہے...... نسرین تمہاری لونڈی اب تمہارے سر تاج کی مالک ہے۔ وہ نکاح پر راضی ہو گئی۔ مگر اس شرط پر کہ تم کو طلاق دے دوں" وہ خط پڑھ رہی تھی کہ نابکار نا ہنجار شوہر چند عزیزوں کے ساتھ محل میں گھسا اور مظلوم بیوی کو طلاق دے دی" ملکہ کی طبیعت اس واقعہ سے بگڑ گئی وہ پرستان واپس پہنچی اور اس نے جو تقریر کی اس کی چند سطریں یہ ہیں۔

" مسلمان مذہب سے کوسوں دور ہیں صرف خود غرضی ان کا مذہب ہے۔ خواہش نفسانی ان کا دین طلاق کا استعمال نہایت بیجا نامناسب ہے خلع جو طلاق کے مقابلہ میں عورت کا حق تھا وہ غصب کر لیا گیا اور بیوہ کا نکاح مذموم ہے۔ مشرقی مسلمان عورت کی حالت ایسی قابل رحم ہے کہ اگر تمام پرستان ان پر آنسو بہائے تو ان کی تکلیف کم نہیں ہو سکتی"

۵:- انتہائے حمیت" (سنہ ۱۹۳۵ء) یوسفی اور عابدہ دولت مند باپ کی چہیتی اور لاڈلی بیٹیاں تھیں تو باپ کی جوان مرگی کے بعد دادا کے نت نئے مظالم کا شکار بنیں۔ ساٹھ برس کے بڈھے نے بیوی کے مرنے کے بعد پندرہ برس کی لڑکی سے شادی کی اور ان یتیم معصوم بچیوں کے مال و جائداد پر قبضہ کرکے نئی دلہن کے نام سب کچھ لکھ دیا۔

" جو ستم ان دونوں میاں بیوی نے معصوم لڑکیوں پر کیا اور جیسے ظلم توڑے ان کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جن بچیوں کا تین سو سے اوپر نقد کرایہ آئے وہ معصوم و مظلوم بچا کچا یا ٹکڑا پیٹ میں ڈال لیں۔ کلیجہ پھٹنے والا وقت وہ تھا جب ان بے وارثوں کا زیور توڑ کر شقی ازلی دادا نے بیوی کی مالا بنوائی"

اس کے بعد کے واقعات بہت درد انگیز ہیں اور بتا رہے ہیں کہ دولت کے کارن انسان ایمان تک گنوا دیتا اور اپنے پیاروں کے پیاروں کی بوٹیاں چبا لیتا ہے۔

۶:- رابعہ نازلی کا دم واپسیں" (سنہ ۱۹۳۶ء) ایک امیر

...ورت ...تے وقت اپنی زندگی کے واقعات پر غور کرتی ہو کہ اس نے خلق خدا کو فائدہ پہنچایا یا اللہ کے بندوں کا ... اور ان پر مظالم توڑے۔

... ایک رُوح کی سرگزشت (۱۹۱۳ء) یہ کہانی اس ...ت کی ہے جس کے شوہر نے اس سے آنکھیں پھیر لیں اور کسی معقول وجہ کے دوسری شادی کرلی وہ شوہر ... عاشق زار تھی۔ اس صدمہ نے اسے قبر میں پہنچا دیا ... میں میاں کے نکاح ثانی ... سنے کے بعد ... نکلا۔ اس کے شوہر نے ... اور ایک اٹھارہ برس کی لڑکی کو بیوہ بنا کر دُنیا سے ... ہوگیا۔

۳۲×۲۰/۱۸ کے ۹۶ صفحے ہیں۔ تین دفعہ یہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔

۷۸ - یادگار تمدن حقوق نسواں کی حمایت میں علامہ مغفور نے جو مردانہ رسالہ تمدن ۱۹۱۱ء میں جاری کیا تھا اس میں اس رسالہ کے متعلق اڈیٹر کی حیثیت سے جو مضامین تحریر فرمائے تھے ان کا سبق آموز اور نتیجہ خیز مجموعہ ہے۔ بظاہر یہ مضامین رسالے کے متعلق ہیں مگر ہر مضمون میں عورت کی بے چارگی اور مظلومیت پر آنسو ہیں۔ باعتبار ادب بھی یہ مضامین علامہ مغفور کی انشاپردازی کا معمولی کرشمہ ہیں اور تحریر کی وہی شان ہے جو اُردو ادب میں بے مثل تھی۔ یہ مجموعہ بھی تین بار چھپا ہے ضخامت ۸۰ صفحے۔

۷۹ - دلّی کی آخری بہار دلّی مرحوم کیا تھی - مرد عورتیں بوڑھے بچے کس طرح بے فکری اور سادگی کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھاتے تھے میلے ٹھیلے کس طرح مناتے تھے اور سیر و تفریح کس طرح کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں محبت تعلقات اور وضعداری کی کیا کیفیت تھی یہ داستان دلّی کی بربادی کے ان جگر خراش افسانوں میں ہے۔ ان میں علامہ مغفور کی انشاپردازی کا کمال ہی نہیں قلعہ معلّٰی کی کوثر سے دُھلی ہوئی زبان ہی نہیں ہے بلکہ فسانۂ شب ستاکر مصور غم نے دردمند دلوں کو تڑپا دیا ہے۔

" مولانا نے ایام گذشتہ کی تفریحوں کی ایسی تر تصویریں کھینچی ہیں کہ بار بار پڑھو اور دل نہ بھرے پڑھو اور حسرت آئے کہ ہائے کیا صورتیں تھیں۔ کیا زمانہ تھا کیا چہل پہل تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ کسی نے قطب صاحب جانے کی ٹھیرادی۔ آج کل کا خاندان تو تھا نہیں کہ دو بیوی ایک آدھ بچے موٹر میں بیٹھ چل دئے۔ پورا کنبہ ساتھ ہوتا ہے۔ کھانے پینے کا سامان لیا جاتا ہے پھر قطب کے آگے سب اُترتے ہیں۔ جھولے ڈالے جاتے ہیں لڑکی بالیاں لہک لہک کر گا رہی ہیں۔ بڑی بوڑھیاں پاندان کھولے بیٹھی ہیں۔ کڑاہیاں چڑھ رہی ہیں۔ پکوان اُتر رہے ہیں ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ اس سے کو مولانا نے ان الفاظ میں باندھا ہے :-

" ساون کا مہینہ تھا اور دو دن پہلے سے قطب صاحب کے اندھیری باغ میں جھولے پڑگئے تھے۔ اندھیری باغ تھا تو بہی مگر اس وقت کا باغ سیج مچ کا باغ تھا جس رستہ چلیتوں کے سر پر چھپا اور مولسری کے پھول مہکتے تھے۔ آموں کے جھنڈ اور اودی اودی جامنوں پر سبز طوطے اور ان کے لال لال کنٹھے۔ ایسا گنگا جمنی سماں اب کیا خاک دیکھنے میں آئے گا صبح چار ہی بجے سے سب پہنچ گئے۔ اللہ کی رحمت بھی ایسی ہوئی کہ سبحان اللہ - یا تو تین دن سے آسمان

تانتا ہو رہا تھا۔ یا آدھی رات سے جو سہاگن گھٹائیں کالی کالی اور بھوری بھوری اُٹھنی شروع ہوئیں ہیں تو دن بھر میں جل تھل کر دیا۔ دوپہر ذرا ہلکا ہوا اور پھوار پڑی تو شرابور لڑکیوں بالیوں نے کڑاہیاں چڑھائیں"

ساٹھ برس پہلے کی ایک برسات کی تفریح دکھائی ہے:۔

"کیا اچھا وقت تھا مینہ دھائیں دھائیں پڑ رہا ہے اور عورتیں کھانے پینے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ کوئی آم باندھ رہی ہے۔ کوئی میٹھی روٹی پکا رہی ہے کوئی سرکہ پیاز کی چٹنی تیار کر رہی ہے۔ اور کوئی اپنے دودھ پیتے بچہ کو گھڑک رہی ہے۔ جو اتفاق سے جاگ اُٹھا ہے۔ سواریاں بیٹھنی شروع ہوئیں ایک بھارکس آٹھ دس سواریاں۔ دس بارہ بجے ایک اوپر ایک جب سب بیٹھ گئے تو بھارکس روانہ ہوئی شہر کی فصیل سے نکل کر تین چار بیویاں اُتر پڑیں کچھ دُور پیدل چلیں پھر بیٹھ گئیں اور دوسری اُتریں۔ نیچے اُترنے والیاں جن کے ساتھ محلّہ کے بھی غریب غربا ہیں برسات کے گیت گا رہی ہیں۔ مولوی صاحب اور ماموں مغل پیچھے ہیں۔ سڑک والی عورتیں لہک رہی ہیں اور گاڑی والیاں ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ آگیا۔ ماموں مغل نے جھولا پہلے ہی ڈلوا دیا تھا۔ پانچ چار جھولے کو بیٹیں انہوں نے کڑاہی چڑھائی۔ پانگ۔ قلمی بڑے۔ سہال پھلکیاں گرم گرم اُتر رہی ہیں اور جھولے والیاں زور شور سے لہک کر ملہار گا رہی ہیں سبحان اللہ کیسا پُر لطف سماں ہے۔ جھولوں میں لال سبز پڑلے پڑی ہیں۔ اور میری پھوپی زاد بھاوج پندرہ روز کی دُلہن ہلکا سا گھونگھٹ نکالے جھولا جھلا رہی ہیں اور مقابل کے جھولے میں نند بیٹھی ہوئی ہے۔ نند بھاوجیں جھول رہی ہیں اور بی جی اس طرح جھلا رہی ہیں۔

سکھی آئے بدروا جھوم کے
میرے سنگ کی سہیلیاں پہنچیاں
اللہ میں بھی تو پہنچوں لاج سے

ڈاکٹر شائستہ سہروردی ——— (عصمت جولائی ۱۹۳۶ء)

"علامہ راشد الخیری جب دلی کا مرثیہ لکھتے ہیں اور پڑھنے والے صرف دلی کا مرثیہ کہہ کر رو دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ جلال و عظمت اور قدیم شان و شوکت کا مرثیہ ہے۔ اس پُر شکوہ ماضی کا مرثیہ جسے علامہ پھر سے واپس لانا چاہتے ہیں"

احمد ندیم قاسمی ——— (امروز لاہور ۳ فروری ۱۹۵۱ء)

اس مجموعہ میں ۲۵ مضامین ہیں اور ان کے عنوانات یہ ہیں:۔

شاہ جہاں آباد کے سدا بہار پھول (تمدن ۱۹۱۱ء) بھکارن شہزادی (۱۹۲۶ء)، گلہری والی شہزادی (۱۹۲۶ء) مچھیرن شہزادی (۱۹۳۲ء) جھولے کی یاد (تہذیب نسواں ۱۹۲۸ء) بہادر شاہ کی بھانجی نند کے قدموں پر (۱۹۳۳ء) تیرا کن اماں (۱۹۳۳ء) اگلے لوگوں کی وضع داری (ادبی دنیا ۱۹۳۲ء) صحبتِ شب کی آخری گھڑیاں (نظام المشائخ ۱۹۱۶ء) اگلے لوگوں کی ایک جھلک (۱۹۳۳ء) اگلے لوگوں کی باتیں (۱۹۳۴ء) انقلاب تمدن (تمدن ۱۹۱۱ء) دلی کے بچھڑے لکھنؤ میں (۱۹۱۲ء) فسانۂ شب (بارانِ قدیم ۱۹۲۴ء) دلی کے روزے اور عیدیں (۱۹۲۰ء) کارزارِ حیات (۱۹۲۴ء)

کرلیا۔ اور وہ یونانی جو لشکر غفلت میں چور اس امید پر نکلے تھے کہ قسطنطنیہ پر ہمارا پھریرا اُڑے گا قسطنطنیہ کی گلیوں میں ابراہیم کی نذر کر گئے "

" وقت کا تقاضا بلند مطالبہ ہے کہ حسرت اپنے سلت کروڑ بھائیوں کی طرح حکومت کے روبرو سر تسلیم خم کر دے۔ حسرت کا ایمان بآنگ دہل جواب دیتا ہے کہ حکومت کی طاقت سر آنکھوں پر مگر مادر وطن کے حقوق فراموش نہ ہوں گے ..... ملک کہتا ہے کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ چیونٹی کا مقابلہ ہاتھی سے پتنگ کا شیر سے۔ دھاگے کا رسی سے صریح غلطی اور کھلی نادانی مگر حسرت کا ایمان کہتا ہے کہ صداقت کی مصیبت راحت اور خلوص کی کلفت عشرت ہے ..... حسرت کی فنا ہونے والی ہستی جیل خانہ پہنچی ہے۔ ٹاٹ کے کپڑے اور گاڑھے کا کنٹوپ پہن رکھا ہے۔ عزیز اس سے بھاگتے ہیں ایسی حالت میں حسرت دلہن جیل خانہ جاتی ہے اور یہ منظر دیکھ کر کہتی ہے حسرت پھولوں کے سہرے اور ریشمی کپڑوں میں صرف میرا دولہا تھا اور آج ملک کا دولہا ہے۔ جوگی وہی پلاؤ کی رکابی سے۔ نیلے ڈوروں کو جھومر جھلنیوں سے بہتر سمجھوں گی۔ اور اس قید پر فخر کروں گی "

۱۸×۲۲ کے ۸۸ صفحے ہیں۔ یہ مجموعہ ۴ دفعہ چھپا ہے۔

سنہ ۳۸ء میں

۸۱۔ ساجن موہنی | "تسخیر شوہر یعنی شوہر کا دل فتح کر لینا عورت کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اور قابل صد مبارکباد ہیں وہ بیویاں جن کے شوہر اُن سے حقیقی معنوں میں خوش ہیں۔ شوہروں کو کس طرح رضامند رکھا جا سکتا ہے اس موضوع پر مصور غم نے ایک دو نہیں متعدد ناولوں اور مختصر افسانوں میں نہایت مؤثر اور دل نشین بحث فرمائی ہے اور دکھایا ہے کہ سمجھدار نیک دل بیویاں کس طرح شوہر کا دل فتح کر کے گھر جنت کا نمونہ اور اپنی زندگی قابل رشک بنا لیتی ہیں۔ یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس میں کھانے پکانے۔ تندرستی خوبصورتی خوش انتظامی لباس بچوں کی تربیت وغیرہ پر مفصل بحث کی ضرورت ہے لیکن ان عنوانات پر علامہ مغفور کے گزشتہ مجموعوں میں کافی مضامین آ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں علامہ مغفور کی متعدد تصانیف میں ان موضوعوں پر مفصل بحث ہے لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے فرضی زنانہ ناموں سے حضرت علامہ مغفور نے عصمت کے ابتدائی دس بارہ سال میں جو چھوٹے چھوٹے مضامین نہایت ہی سیدھے سادے اور عام فہم پیرایہ میں تحریر فرمائے تھے ان میں سے جو مضامین شوہر کو رضامند رکھنے کے سلسلہ میں ہیں انہیں علیحدہ کر کے یہ مختصر مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے جس کا مطالعہ نہ صرف اُن عورتوں کے لئے مفید ہو گا جو شادی شدہ ہیں بلکہ ان لڑکیوں کی رہنمائی بھی کرے گا جن کی شادی ہونے والی ہے "

یہ نوٹ بیٹے اس مجموعہ کے شروع میں دیا تھا جب پہلا ایڈیشن سنہ ۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب تک یہ کتاب ۳ دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ مضامین کے عنوانات یہ ہیں :۔

شوہر کیوں کر بگڑتے ہیں۔ بے وقوف بیوی۔ بیوی کا پہلا فرض۔ شوہر کے دل میں محبت کیوں کر

...ہر۔ ساجن موہنی۔ محبت کا تعویذ۔ بیوی کو کیا کرنا
چاہیے۔ اچھی بیوی۔ ساس نندیں۔ اسلام میں شوہر کا
...۔ شوہر کی رضامندی۔ حریت نسواں۔ حسن سلوک کی
...ایڈیٹر ساقی مولوی شاہد احمد دہلوی عصمت فروری [illegible]
میں لکھتے ہیں:۔

"اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ مسلمان بیویوں کے لئے نہایت ضروری اور ازبس مفید ہوگا۔ اس میں وہ باتیں بتائی گئی ہیں جن پر عمل کرنے سے بیویاں اپنے شوہروں کے دل مسخر کر سکتی ہیں۔ جادو تعویذ۔ ٹونے ٹوٹکے یہ سب جاہل عورتوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ ہماری بعض پڑھی لکھی بہنیں بھی ان فضول باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ عقل سلیم کے ہوتے ہوئے ان ٹوٹکوں کی اثر انگیزی کو کون تسلیم کر سکتا ہے۔ اصل چیز کچھ اور ہی ہے جس سے شوہر کا دل فتح کیا جا سکتا اور گھر کو جنت کا نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔"

اس کتاب کے دو طویل اقتباسات دینے کے بعد فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے:۔

"اس چھوٹی سی کتاب میں بڑے کام کی باتیں مولانا نے تحریر فرمائی ہیں۔ جی چاہتا ہے اس میں سے اور اقتباسات پیش کروں لیکن حیران ہوں کہ کونسا حصہ نقل کروں۔ ساری کتاب نصیحتوں سے لبریز ہے۔ اس طرح سے ساری کتاب ہی نقل کرنی پڑے گی۔"

۸۲۔ زیور اسلام

"کوئی شخص مذہب سے الگ ہو کر مشکل سے ترقی کر سکتا ہے اور صرف مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو بُرے کاموں سے روک سکتا ہے مذہب کی بے پرواہی بڑھتے بڑھتے اس کو اس قابل کر دیتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کے ادا کرنے میں غفلت سے کام لیتا ہے۔ غرض کوئی لڑکی ایسی زندگی اس وقت تک اچھی طرح نہیں گذار سکتی جب تک مذہب کے احکام کی پابند نہ ہو"

زیور اسلام صفحہ ۶۳

ان سطروں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ مغفور مذہب کو کس قدر ضروری چیز سمجھتے تھے۔ اُن کی کوئی سی تصنیف کوئی سا مضمون کوئی سا افسانہ اُٹھا کر دیکھا جائے دو باتیں ملیں گی۔ ادبیت اور مذہبیت خاص مذہبی مسائل میں بھی ادبی شان اور ادبی جواہر پاروں میں بھی مذہبی رنگ۔ لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے عصمت کے ابتدائی چھ سات سال میں علامہ مغفور نے زنانہ ناموں یا س۔ ش۔ ع وغیرہ ناموں سے جو مضامین لکھے تھے ان میں مذہبی مضامین بھی ہیں۔ ان مضمونوں کی زبان بھی بہت آسان ہے اور مذہبی احکام عام فہم مگر دل نشین پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے شرک اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"اسلام نے سوائے خدا کے کسی اور کو معبود کا درجہ نہیں دیا۔ مسلمان ہیں کہ ہر قبر ان کا معبود اور ہر پیر ان کا خدا۔ تعویذ گنڈوں نے مسلمانوں کے عقائد جس قدر کمزور کر دیئے ہیں ان کا جتنا ماتم کیا جائے کم ہے"

"ہم مسلمان ہو کر ایک معمولی کاغذ کے پرزے کو خدا کا فرمان سمجھیں اور خدا کے حکم کو بھول جائیں"

خیرات زکوٰۃ پر دو تین مضمونوں میں بحث ہے ایک مضمون کی دو سطریں یہ ہیں:۔

مسلمانوں نے خیرات کا طریقہ اس قدر برا اختیار کیا ہے کہ انہوں نے قوم کی حالت بگاڑ دی اور اپنے خلف تو انا تندرست اس پر گذارہ کرتے ہیں"
مسلمانوں کی بربادی اور تباہی کا ایک سبب تقدیر کا چکر بھی ہے۔ تقدیر اور تدبیر کے مسئلہ کو اس طرح حل کیا ہے :۔
" کوشش میں کمی نہ ہو۔ کوشش اور تدبیر کا نتیجہ تقدیر یا قسمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے"
علم (ص ۹)، پیکار شتہ (ص ۱۲)، سچا زیور (ص ۲۲) وہ کیا ہے جس کو فنا نہیں۔ (ص ۲۵) حقیقی مراد میں (ص ۲۸)، بہتان (ص ۳۵)، عورت کی زندگی کا ایک مقصد اور بھی ہے (ص ۴۱) متعلقین کی محبت عبادت ہے (ص ۴۴)، ضمیر (ص ۶۶)، عشرہ محرم (ص ۷۲) اور نماز روزہ کے متعلق مضامین یہ سب مل کر چالیس کے قریب ہیں۔
یہ کتاب ۴ دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ ضخامت ۲۲×۱۸ کے ۱۰۸ صفحے۔

۸۳ - عالم نسواں یہ مجموعہ ہے اُن مضامین کا جو حریت نسواں کی کوشش پر تبصرہ کہا جا سکتا ہے اور چند مختلف زنانہ کانفرنسوں کی تجاویز پر نتیجہ خیز بحث۔ تحریک نسواں سے جنہیں تھوڑا بہت لگاؤ ہے ان مضامین کے مطالعہ سے ان کی معلومات میں دلچسپ اضافہ ہوگا۔ عنوانات یہ ہیں :۔
کیا مسلم خواتین ترقی کر رہی ہیں۔ کفر کے فتوے اور عالم نسواں۔ عالم نسواں اور زنانہ کانفرنسیں۔ لاہور کی لٹریری لیگ میں عورت پر بحث۔ عالم نسواں ۱۹۲۸ء میں خواتین ہند کی کانفرنس۔ دختران اسلام۔ لیڈیز کانفرنس مسلم لیڈیز کانفرنس۔

اس مجموعہ کی ضخامت ۲۲×۱۸ کے ۹۴ صفحے ہیں اور تین دفعہ شائع ہو چکا ہے۔

۸۴ - فریب ہستی مولوی شاہد احمد اڈیٹر ساقی نے جس مضمون کا ذکر ساقی جون میں کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں :۔
" مولانا عورتوں کی آزادی اور ترقی کے ایڈوکیٹ تھے۔ لیکن صرف اتنی ہی آزادی اور ترقی کے جتنی کہ اسلام نے اجازت دی ہے۔ مغربی تہذیب کا اثر ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا ہے۔ چنانچہ ہماری خواتین بھی اس سے متاثر ہوئی ہیں۔ یہ تہذیب اپنے ساتھ کچھ بھلائیاں بھی لائی کچھ برائیاں بھی۔ شارع اسلام نے ہمیں سکھایا ہے کہ جو اچھی باتیں ہیں انہیں اختیار کرو اور جو بری ہیں انہیں چھوڑ دو۔ مولانا مرحوم نے قدیم وجدید تہذیب میں اسی معیار کو پیش نظر رکھ کر ایک خط امتیاز کھینچا ہے۔ ..... ہماری مروجہ رسوم میں اکثر ایسی ہیں جو اسراف میں داخل ہیں بلکہ بعض ایسی ہیں جو مذہب کے خلاف کہی جا سکتی ہیں۔ مولانا کی کتاب " فریب ہستی" ایسے ہی اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے۔ شادی بیاہ کی فضول رسموں کے علاوہ مسلمانوں میں کسی کے مرنے پر بھی ایک طویل سلسلہ رسموں کا رائج ہے یہ رسمیں ایسی ہیں کہ ان سے پسماندگان کو روحانی اذیت اور مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ..... بقول چالیسواں ایسی ہی رسوم قبیح ہیں۔ مولانا نے ان رسوم پر بار بار لکھا ہے یہاں صرف ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے :۔
" ..... جو قوم ایسے شخص سے جس پر ظالم موت نے ہاتھ ڈال کر عمر بھر کے لئے تباہ کر دیا ہو خراج

رسول کرے جو قوم ماتم دیدی یتیم بچوں مصیبت زدہ شوہرا ور دکھیاری ماں سے موت کے بعد بریانی متنجن کی توقع کرے اور حصے بخرے پر جھگڑے والے ۔ کیا وہ خدا کے رحم کی مستحق ہے؟ مسلمانو کس دل سے تمہارے حلق سے وہ قورمے اور شیرمال اُترے ہوں گے جو تم ایک ایسی ماں سے پکواتے ہو جس کی عمر بھر کی کمائی لٹ گئی ۔ ان بچوں سے لیتے ہو جس سے ان کی ماں ہمیشہ کو چھٹ گئی۔"

ان مضامین کے بعض عنوانات یہ ہیں :-

موت کے بعد ۔ پھولوں کی رسم ۔ مُردے سے نفع تعلق ۔ میت کا چالیسواں اور پھول ۔ رسوم کی آہنی زنجیریں ۔ ناک ۔ جہالت کے کرشمے ۔ لترائین وغیرہ ۔

ضخامت ۲۲×۱۸/۸ کے ۸۰ صفحے ۔ ۳ بار یہ مجموعہ شائع ہوا ہے ۔

۸۵ - خدائی راج

علامہ مغفور اُردو کے پہلے مختصر افسانہ نگار تھے اور یہ مجموعہ اُن کے آخری سات افسانوں کا ہے ۔ خدا فراموش نظام المشائخ میں سنہ ۱۸ء میں شائع ہوا تھا اور باقی چھ افسانے عصمت میں اس صراحت کے ساتھ چھپے ۔ ان کا جھولا (سنہ ۳۳ء) باسٹھ برس کے تین دن (سنہ ۲۹ء) تین بہنیں (سنہ ۳۲ء) خاتمہ بالخیر (سنہ ۳۴ء) اس مسکراہٹ کی قیمت (سنہ ۳۳ء) اور خدائی راج جو علامہ مغفور کا آخری افسانہ تھا ۔ نومبر سنہ ۳۵ء میں شائع ہوا تھا ۔

ضخامت ۲۲×۱۸/۸ کے ۱۳۲ صفحے ۔ یہ مجموعہ تین بار شائع ہوا ہے ۔

" مولانا کے ۱۷۰ افسانوں کا آخری مجموعہ جو خدائی راج کے نام سے شائع ہوا ہے وہ ہر چند ان کی افسانہ نگاری کے ارتقا کے لحاظ سے کوئی آخری کڑی نہیں ہے ۔ کیوں کہ مولانا کی تحریر کی جس خصوصیت نے انھیں مشہور کیا وہ اُن کے تمام افسانوں میں یکساں پائی جاتی ہے لیکن اس حیثیت سے آخر مولانا کے اس رنگ نے کتنی پختگی اختیار کر لی تھی دیکھنے کے قابل ہے "

مولانا نیاز فتح پوری ———— عصمت فروری سنہ ۳۹ء

" خدائی راج اور دیگر افسانے ' مولانا کے آخری سات افسانوں کا مجموعہ ہے ان میں مولانا کی افسانہ نگاری کا کمال نظر آتا ہے ۔ اُردو میں افسانہ نگاری کا آغاز علامہ مرحوم ہی کے بابرکت ہاتھوں ہوا ۔ مختصر افسانہ نگاری ایک جداگانہ فنی حیثیت رکھتا ہے ۔ . . . . اُردو کے پہلے مختصر افسانہ نگار علامہ مرحوم ہیں ان کے افسانوں کے بے شمار مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ اس وقت جو مجموعہ پیشِ نظر ہے وہ اور سب مجموعوں سے ممتاز ہے اور سب پر فوقیت رکھتا ہے ۔ کیونکہ جس قدر آرٹ کی پختگی ان افسانوں میں نظر آتی ہے ان سے پہلے کے افسانوں میں نظر نہیں آتی ۔ مولانا اپنے افسانوں کے پلاٹ ہندوستان (بھارت اور پاکستان) گھرانوں کے واقعات سے ہی مرتب کرتے تھے ۔ وہی واقعات جو ہم سب کی نظروں کے سامنے رونما ہوتے ہیں ۔ اور ہم کبھی گمان بھی نہیں کر سکتے کہ یہ واقعات کسی عمدہ افسانے کا موضوع بن سکتے ہیں لیکن مولانا انہیں روزمرہ کے واقعات کو اس طرح افسانے کے قالب میں ڈھالتے ہیں کہ ایک بالکل نئی چیز بن جاتے لکھنے کا انداز اس درجہ دلنشین اور مؤثر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا افسانہ نگار سے کہیں اختلاف نہیں کرتا ۔ بلکہ اس کے قلم کی روانی کے ساتھ پڑھنے والے کے خیالات بھی بہ جاتے ہیں ۔ سٹائل یعنی اسلوب بیان کے

معاملہ میں مولانا منفرد ہیں۔ اور رنگین بیانی کے اعتبار سے اُردو کا کوئی مصنف ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ پلاٹ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو مولانا اپنے طرزِ بیان سے اتنی دلکشی پیدا کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا افسانہ شروع کرنے کے بعد اسے ختم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مولانا ایک اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے اور انسانی نفسیات کا مطالعہ اور مشاہدہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے دورانِ مطالعہ میں طبیعت کہیں نہیں اُکھڑتی۔ افسانہ کا آغاز ایک نہایت اہم اور دُشوار فن ہے۔ فن میں اس لئے کہتا ہوں کہ اس پر افسانہ کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ اگر چند ابتدائی سطور ہی میں افسانہ نگار نے پڑھنے والے کو متوجہ نہیں کیا تو باقی افسانہ خواہ کتنا ہی عُمدہ کیوں نہ لکھا ہوا ہو بیکار ہے۔ کیونکہ اس کے پڑھنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ مثلاً "خدا فراموش" کا یوں آغاز ہوتا ہے:۔

"دو چار یا دس بیس روز کا معاملہ نہ تھا۔ پورے دو سال بات اٹکی رہی۔ ایک دو نہیں بیسیوں اُلجھے ہوئے معاملات سُلجھ گئے مگر خدا معلوم دلّی والوں کی وضعداری یا مرزا جی کی طبیعت کہ صبح آٹھ بجے کی آئی برات کو تین بج گئے۔ اور الجھیڑے طے نہیں ہوئے۔ کبھی مہر کا جھگڑا کبھی اقرار نامہ کا۔ کبھی پاندان کی تکرار تھی کبھی نان نفقے کی۔ مرزا کی بڑھیا ماں سو برس کے پیٹے میں تھیں۔ مُنہ لقوے میں گرفتار اور ہاتھ فالج کا شکار۔ جب بیٹے کسی طرح نہ جھکے اور برات اُٹھنے کی خبر گرم ہوئی تو بڑی بی درماندے ہو گئیں اور بیٹے کو بُلا کر کہا "بھائی یہ تو میں جانتی ہوں کہ دُنیا ترقی کر رہی ہے نئے نئے رنگ اور انوکھے انوکھے ڈھنگ پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر خدا کی مار تمہاری ترقی کو۔ ذرا غیرت سے کام لو۔ برات کا اُٹھنا تو شریفوں کے واسطے مر جانے کی جگہ ہے۔ مُنہ پر ہاتھ پھیر کر دیکھو ناک رہی یا کٹی۔ سمجھو تو سب کچھ۔ نہ سمجھو تو کچھ بھی نہیں۔ آسمان کی لڑکی تو کیا کسے کا کوئی۔ بیٹا بیٹی زبان ہی سے پرائے ہوتے ہیں۔ جب ایک دفعہ ہاں کر لی تو بیٹی ان کی ہو گئی"

ان سطور کو پڑھنے کے بعد کون ہے جو کتاب بند کر کے کسی اور کام میں لگ جائے یا "جوہا ساٹھ برس کے تین دن" کی یہ چند سطریں پڑھنے کے بعد کون ہے جو باقی ماندہ پڑھنے کے لئے بے قرار نہ ہو جائے:۔

"بچپن کی شاداب کیاریوں کی بہار دیکھنے کے بعد جہاں کوسوں تک خزاں کا نام و نشان نہ تھا نوشہ عروسِ شباب کی مجلس میں داخل ہوا۔ احباب کی صحبتیں دیکھتے ہی دیکھتے فنا ہوئیں۔ پھولوں کی سیجیں طلوعِ آفتاب سے پہلے مُرجھا گئیں۔ آبِ زلال کے چشمے زہر ہلاہل نکلے اور چودھویں رات کا چاند گھڑیوں کا مہمان ثابت ہوا"

مولانا کا سلیقہ بھی انہیں اور انشا پردازوں سے ممتاز کرتا ہے کہ جیسا موضوع ہے اس کے لئے ویسے ہی الفاظ مہیا کرتے ہیں۔ موضوع اور عبارت ہم آہنگ ہو کر عجیب فضا پیدا کرتے ہیں۔ صحیح موقعہ پر صحیح الفاظ کا استعمال ایسا ہی خوشنما ہوتا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا جائے۔ اس فن کے مولانا اُستاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اثر آفرینی کی قوت زیادہ ہے۔ ویرانی کا نقشہ کھینچتے ہیں تو لفظ لفظ سے ویرانی ٹپکنے لگتی ہے۔ اس مسکراہٹ کی قیمت میں افلاس

زدہ عورتوں کی تصویر دیکھئے ..... افسانہ نگاری میں نفسیاتی تخیل کا جزو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ علامہ مرحوم صرف مصور غم ہی نہ تھے۔ بلکہ جملہ جذبات اور احساسات کی تصویریں ان کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ پیش نظر مجموعے میں مولانا کی ژرف نگاہی کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں سے یہاں پیش کرتا ہوں۔ تصویر غم پیش نہیں کروں گا۔ چونکہ مولانا اس کے مسلم استاد ہیں۔ مایوسی اور اس کے ساتھ جو احساسات وابستہ ہوتے ہیں ان کی تفصیل مولانا سے سنیئے (باب ۱ صفحہ ۲۲۔ ۱۲۵ کلثوم بی اس وقت زندگی ہے ..... اور نظر غائر سے دیکھئے) دوسرا اقتباس علامہ مرحوم کی مزاح نگاری کا دلچسپ نمونہ ہے ملاحظہ فرمایئے۔ آنسوؤں کے بادشاہ نے ظرافت کے کیسے پھول کھلائے ہیں ..

..... حیرت کی بات ہے کہ ان کے اس قدر وسیع سرمایۂ ادب میں ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ملتا جو شائستگی پر بار گزرے۔ مولانا نے نصف صدی تک ادب کے انقلابات دیکھے مگر جو روش انہوں نے روز اول اختیار کی تھی اس میں دم آخر تک فرق نہ آنے دیا۔ آج کل کے ادب لطیف کو بھلا وہ کیا گردانتے "

شاہد احمد دہلوی اڈیٹر ساقی ——————— (عصمت فروری ۱۹۳۶ء)

۸۶۔ مسلمان عورت کے حقوق

حقوق نسواں کی حمایت میں یہ بھی جگر خراش مضامین کا مجموعہ ہے۔ اسے مرتب کرکے میں نے یہ نوٹ لکھا تھا۔

" ہندوستان (بھارت اور پاکستان) کے مسلمانوں نے جب احکام اسلام ٹھکرا کر اس عورت کو جسے مذہب مقدس نے مرد کے قریب قریب برابر درجہ دیا تھا۔ گھر کی ملکہ سے لونڈی بنا دیا۔ اور اس کے شرعی حقوق بے دردی بے ایمانی اور ہٹ دھرمی سے غصب کرکے اس پر نت نئے مظالم توڑے تو حضرت علامہ راشد الخیری کو (خدا انہیں ابدی سکون عطا فرمائے) قوم بدنصیب کی اصلاح کے لئے اللہ تعالے نے بھیجا۔ مسلمان عورت کی بے کسی بے بسی لاچارگی اور مظلومیت اور مسلمان مرد کی نفس پرستی خود غرضی شرع اسلام کی خلاف ورزی پر نصف صدی تک حضرت علامہ مغفور خون کے آنسو گراتے رہے۔ تحریر سے تقریر سے عمل سے عورت کے شرعی حقوق کی حفاظت و حمایت میں ساری عمر گذار دی اور بصد عجز و منت مسلمان مردوں سے التجا کرتے رہے کہ اپنی عورتوں سے شرافت اور انسانیت کا سلوک کرو۔ جو تمہارے رسول نے کیا اور جس کی تمہیں تاکید فرمائی ہے اور ان کے وہ حقوق واپس کردو جو خدا نے انہیں دیئے ہیں۔

لڑکیوں کے ساتھ لڑکوں کے برابر سلوک ترکہ پدری۔ خلع۔ کثرت ازدواج۔ مہر۔ بیوہ کا نکاح شادی کی رضامندی پردہ کی سختی۔ لڑکیوں کی تعلیم۔ بیوی کا درجہ عورت کی شخصیت حریت نسواں کون سا مسئلہ ہے جس پر خواتین ہند کے محسن اعظم نے مسلمانوں کو بار بار متوجہ نہ فرمایا۔ حقوق نسواں کے سلسلے میں بہت سے مضامین متفرق مجموعوں میں آچکے ہیں۔ باقی مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا جاتا ہے

کاش مسلمان ٹھنڈے دل سے اس کا مطالعہ فرمائیں اور اپنی عورتوں کو وہ حقوق دیدیں جس کی وہ خدائی فیصلے کے بموجب مستحق ہیں اور ان سے وہ سلوک کریں جس کی اسلام ان سے توقع رکھتا ہے اور جس کے بغیر ان کی حالت کا درست ہونا بہت مشکل ہے "

اس مجموعہ میں ۲۹ مضامین ہیں ان میں سے چند عنوانات یہ ہیں اور ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب میں کیا ہے :-

لڑکیوں کا ترکہ - لڑکیوں پر ظلم - بدنصیب لڑکیوں کا آریہ ہونا - خلع اور ارتداد - خلع کی ضرورت - تنسیخ نکاح پھر وہی خلع کا رونا - بیوہ کا نکاح - قیدی لڑکیاں عورت کی انتہائی تحقیر - مسلمان عورت کی کشتی - مسلمان عورت کا سوراج - مہر -

اس مجموعہ کی ضخامت $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ کے ۱۰۴ صفحے ہیں تین دفعہ چھپا ہے -

• مسلمان عورت کے حقوق میں ایک مضمون ہے • مسلمان عورت کی کشتی • جسے پڑھکر میں دیر تک روتی رہی - علامہ مرحوم کسی شادی کی محفل میں تشریف رکھتے تھے - آپ نے نکاح ہونے کے بعد لڑکی کے والد کو مبارکباد نہیں دی - بلکہ یہ سوال کیا کہ "کیوں صاحب جس لڑکی کی شادی ہونے سے آپ اتنے خوش ہیں اس بدنصیب لڑکی کو ترکۂ پدری ملنے کے متعلق بھی کچھ سوچا" ظاہر ہے اس کا جواب کیا ملا ہو گا "ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ" کیونکہ ان لوگوں میں لڑکیوں کو ترکۂ پدری نہیں ملا کرتا تھا - علامہ مرحوم یہ رنگ دیکھ کر وہاں سے بددل ہو کر اٹھ گئے اور مکان تشریف لے گئے - یہ مضمون پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے - یا اللہ اس بزرگ ہستی کو عورتوں کی پست حالت کا کس قدر خیال تھا - صرف ترکۂ پدری کے متعلق ہی نہیں بلکہ ہر موضوع پر تحریر و تقریر سے علامہ مرحوم نے مظلوم فرقہ کی طرف مردوں کو توجہ دلائی - آپ نے خلع پر جو تحریریں کیں اس سے بڑے بڑے سرکش ظالم مردوں کے پتّے پانی ہو گئے"

مہرآرا بیگم شیخ ——— (عصمت فروری [illegible])

۸۷ - شادی کا انتخاب

اس مجموعے کے ساتھ میرا یہ نوٹ شائع ہوا تھا

"ہندوستانی (یعنی پاکستانی اور بھارتی) مسلمانوں میں اس وقت لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ کسی اہم مسئلہ سے کم نہیں ہے - بہت کم خاندان ہوں گے جہاں والدین پریشان نہ ہوں کہ جوان لڑکیاں بیٹھی ہیں - اور بَر نہیں جڑتا - لڑکیاں اس معاملہ میں تو مجبور ہیں اور والدین بھی حالات کے تحت میں کڑھنے پر مجبور - لڑکیاں شادی کے وقت کیا کریں - مذہب اسلام نے ان کو کیا حق دیا ہے دنیا کی ضرورتیں اور سوسائٹی ان کو کس قدر اختیارات دے رہی ہے - یہ سب باتیں انہیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے - بَر کے انتخاب میں لڑکے کی مالی حالت اور حسب نسب کا تو خیال رکھا جاتا ہے - مگر لڑکے کی ذاتی شرافت اس کی عادات و خصائل اس کے طور طریقے اس کے خیالات اور توقعات - اس کی عمر اور صحت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جاتی - اسے اپنی ذمہ داریوں کا کس حد تک احساس ہے اسلام نے بیوی کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں ان سے وہ کہاں تک باخبر ہے - ان امور کی طرف بہت کم دھیان جاتا ہے - اس طرح دُلہن کے انتخاب میں حسن دولت اعلیٰ تعلیم کی تلاش ہوتی ہے - مگر اس کی چھان بین نہیں کی جاتی کہ لڑکی خانہ داری کی ذمہ داریوں کو کس حد تک اٹھا سکتی ہے - وہ سلیقہ مند سگھڑ - ہنرمند - منتظم کفایت شعار بھی ہے یا نہیں لڑکے کے اور اس کے خیالات مذاق اور عمروں میں اور لڑکے والوں اور لڑکی والوں کی معاشرتی حیثیت میں کچھ زیادہ فرق نہیں - یہ تمام امور ایسے ہیں کہ ان پر مفصل بحث کی سخت ضرورت ہے - خواتین ہند کے محسن اعظم نے اگرچہ مختلف تصانیف میں ضمناً ان پر بحث کی ہے - لیکن علیحدہ ایک

...ستقل کتاب اس موضوع پر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں نئی دہلی
...بنگلہ میں شروع فرمائی تھی۔ مگر ابھی ابتدائی حصہ ہی لکھا
...تھا کہ بیمار پڑ گئے اور موت نے تکمیل کی مہلت نہ دی۔
اب ایک ہی صورت تھی کہ جس قدر مضمون لکھے
...چکے تھے ان کے ساتھ عصمت کے تیس سال کے فائل
...تلاش کر کے اس موضوع پر علامہ مغفور کے زیادہ سے
...زیادہ مضامین جمع کر کے شائع کئے جائیں چنانچہ یہ
...مجموعہ مرتب کیا گیا ہے۔ پہلا مضمون "اسلام میں بیوی
...کا درجہ" مصنف کے ذہن میں جو کتاب تھی اس کی نامکمل
...تمہید ہے جو گویا اس مجموعہ کی تمہید کا بھی کام کر رہی ہے۔
اس پہلے مضمون کی ابتدا میں تحریر فرمایا ہے:۔
"بعد نکاح جو حقوق اسلام نے بیوی کو دئے تھے
...اُس سے چھین لئے گئے اور جس کو نطفہ نکاح نے
...گھر کی ملکہ بنایا تھا وہ مرد کی کنیز ہو گئی۔ اس مشاہدہ کے
...بعد اگر وہ نکاح سے گریز کرے تو قابل الزام نہیں۔
...امر حق یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری عام مسلمانوں پر کم
...اور ان علمائے عظام پر بہت زیادہ ہو گی جنہوں نے
عورت یعنی اس شے کو جو ارشادِ نبوی کے موافق
دُنیا کی بہترین اشیاء میں تھی ذلیل کرتے کرتے جانور
سے بدتر بنا دیا اور اس کی زنجیر حراست اتنی سنگین
کردی کہ دنیا کا ہر جائز لطف اس کے واسطے حرام
ہو گیا۔ نفس پروری اور بے دردی کا اس سے بڑھ کر
اور کیا ثبوت ہو گا کہ خدا فرمائے "سیروا فی الارض"
زمین کی سیر کرو۔ اور مسلمان فرمائیں کہ اپنی آواز تک
غیر مرد کو نہ سُنائے اور پردے میں گھٹ گھٹ کر
مر جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلم مستورات کی عفت و
عصمت ان کی نگہداشت اور ان کا احترام رسول

زادیوں سے کس طرح زیادہ ہو گیا۔ جناب سیدہ نے
قضیۂ فدک میں اپنا مطالبہ حضرات شیخین سے کس
طرح کیا۔ کیا کوئی اسٹامپ لگا کر درخواست کی تھی
ام المومنین عائشہ صدیقہ نے مسلمانوں سے کس
طرح خطاب فرمایا تھا؟ کیا کوئی لاؤڈ سپیکر میدانِ
جنگ میں تشریف فرما تھا ..... نکاح کے مقاصد
میں ایک زبردست ضرورت یہ بھی شامل ہے کہ
والدین اپنے بعد لڑکی کا ایک ایسا ہمدرد پیدا کر دیں
جو اس کی زندگی میں برابر کا شریک ہو۔ اس کا
والی وارث ہو۔ اور اس کی راحت و اذیت میں
اس درجہ شامل ہو کہ ایک جان دو قالب ہو جائے
یہ مطلب بغیر نکاح کے پُورا نہیں ہو سکتا"
مضمون کے اس مضمون کے ساتھ عصمت
سے لے کر جو مضامین کتاب میں درج کئے گئے ہیں ان کے
عنوانات یہ ہیں:۔
حُسنِ صورت کی بھول چوک (۲۱ء) دُلہن خوبصورت
ہو (۲۳ء) دولھا میاں بھی اپنا اندازہ کریں (۲۵ء)
شادی یا بربادی (۲۳ء) غلط توقع (۲۴ء) شادی
کی رضامندی (۱۸ء) ایجاب و قبول (۱۲ء) ولی
کے فرائض (۱۸ء) کورٹ شپ (۱۸ء) جہیز کی تشہیر
اور رُونمائی (۱۵ء) یہ کرنا پڑے گا (۲۰ء) دُلہنوں کی
نماز (۲۰ء) رازق میاں کا نکاح (۲۹ء) ایسا بیاہ
سے کنواری بھلی (۱۸ء)
ان والدین کے لئے جن کے سامنے بچوں کی
شادی کا مسئلہ ہے ان مضامین کا مطالعہ بہت مفید
ہو سکتا ہے۔ اور خود ان لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے
جن کی شادی مستقبل قریب میں ہونے والی ہے اس

کتاب کے مضامین بہترین راہ نما اور راہ بر ثابت ہوں گے۔

۔ مغرور سے اور ریحشیں نہایت ہی دلچسپ پیرایہ میں درج کئے گئے ہیں اور بہت سے پیچیدہ مسائل کو دلآویز اور لطیف انداز میں سلجھایا گیا ہے۔ آخر میں شادی سے متعلق ایک مضمون ڈاکٹر شائستہ سہروردی پی ایچ ڈی کا بھی درج کیا گیا ہے۔

۲۲ × ۱۸ کے ۱۰۰ صفحات ہیں۔ تین دفعہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

۸۸ ۔ بکھری ہوئی پتیاں | مندرجہ بالا ۲۸ مجموعے مرتب کرنے کے بعد

کچھ اور مضامین عصمت خطیب نظام المشائخ میں سے دستیاب ہوئے تھے جنہیں یکجا کر کے جولائی ۱۹۳۸ء ہی میں تیسرے سٹ کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ اس مجموعہ میں چند ایسے مضامین اور نظمیں بھی ہیں جو چونکہ بالا رسائل کے کچھ پرچے موجود نہ ہونے کی وجہ سے گزشتہ مجموعوں مثلاً گدڑی میں لعل۔ بزم رفتگاں۔ گلدستہ عید۔ رودادِ قفس۔ قلبِ حزیں وغیرہ میں شامل نہ کئے جا سکے۔ بعض مضامین اور نظمیں غیر مطبوعہ بھی تھیں۔ صفحہ ۱ سے صفحہ ۱۷۶ تک حصہ دوم میں یہ سب درج کی گئی تھیں اور جن جن کتابوں میں آ سکتی تھیں۔ ان کے جدید ایڈیشنوں میں شامل کر دی گئیں۔ صفحہ ۸۰ تک کے مضامین آئندہ بھی کتاب کے اس عنوان سے شائع ہوتے رہیں گے۔ پہلے چار مضامین بڑے معرکۃ الآرا ہیں اور ادبی لحاظ سے بہت بلند ان کے عنوانات ہیں۔

اُردو کی بربادی اور جذبات کا تغیر (خطیب ۱۹۱۰ء)

ابھر کی ابرپارے (عصمت ۱۹۲۸ء) زبان کی بربادی ۔ (ادھم پاشا ۱۹۱۰ء) زنانہ لٹریچر میں گیت (عصمت ۱۹۳۳ء

" اُردو کی بربادی اور جذبات کا تغیر " جو انقلاب متعلقین ادب کو سرستھ کے دوالفاظ یاد دلاتا ہے جو اُنہوں نے ایک مشہور مصنف کے واسطے کہے اور فرمایا کہ اُردو کے گلے پر چھری پھیرنے والا یہ پہلا انسان ہے۔ حاشا وکلا اگر ہمارا اشارہ کسی خاص شخص کی طرف ہو مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں ایسے پرچوں کا وجود روز بروز ترقی کر رہا ہے جن کے مدیر خود ہی اُردو کی لطافت سے واقف نہیں اور وہ مجبور ہیں کہ اس لایعنی مواد کو عمدہ سمجھیں " (ص۴)

" ۔ ۔ ۔ ۔ یہی وجہ تھی کہ جتنا لایعنی ذخیرہ آج ہم اپنے آپ میں نظر آ رہا ہے اُس وقت اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا مجھے تعجب ہے کہ جو مفہوم سادہ الفاظ بآسانی ادا کر سکتے ہیں ان کو ہیر پھیر کر ایک معمولی فقرہ کی جگہ دو سطروں میں بیان کرنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے " (ص۶)

" اُردوئے معلّٰی کو دیکھ کر اور اُن موتیوں پر نظر ڈال کر جو مرزا نے کاغذ پر بکھیرے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ان خطوں کا لکھنے والا اور اس دیوان کا لکھنے والا ایک ہی شخص ہے " ص۸

ہم جب اپنے دَورِ حاضرہ کے اَدب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو صاف نظر آ رہا ہے کہ معاشرت ہمارے ادب سے روز بروز کم ہو رہی ہے اور رفتار اس قدر ترقی پر ہے کہ احتمال نہیں یقین کامل ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں شاید معاشرت کو زندگی کا جزو ضروری ہی خیال نہ کریں۔ یا معاشرت کے معنی صرف میاں بیوی کے تعلقات اور عاشق و محبوب کی محبت سمجھیں۔

[illegible] اُردو کے مشہور اہلِ قلم جو اس صدی میں ہندوستان (بھارت اور پاکستان) کی خاک سے اُٹھے باوجود اپنی خاص فن کے ہر بڑے نمونہ رکھتے تھے کہ نیز اس سے محروم نہ ہے۔ میر حسن کی مثنوی کی عام شہرت کا سبب عشق ہے لیکن اس مثنوی میں بہت سی ایسی شاخیں موجود ہیں جن کا عشق سے تعلق نہیں ... مثنوی ہی کو لو شاہزادہ ایک عرصہ دراز کے بعد کامیاب ہو کر اپنی محبوبہ دل نواز کے ساتھ وطن پہنچتا ہے۔ ماں باپ جو روتے روتے آنکھیں کھو بیٹھے ہیں خبر سن کر بے تابانہ باہر نکل پڑتے ہیں۔ ادھر سے شاہزادہ بدرمنیر کو لئے داخل ہوتا ہے۔ اس موقع پر باکمال شاعر نے صرف ایک مصرعہ میں ستم ڈھا دیا ہے۔ اس قدر طویل مدت کے بعد شہزادہ کی مراجعت اور اس پر کامیابی دل کی کیا کیفیت ہو گی۔ نہال نہال چلا جا رہا تھا۔

کہ رستے میں آگے نظر جو پڑی
تو دیکھا کہ رستہ میں ہے ماں کھڑی

کہنے کو تو معمولی بات ہے مگر کس کی مجال ہے کہ اس کیفیت کو الفاظ میں ادا کر سکے" (ص[illegible])

"زبان کی بربادی" سے :۔

"یہ جدّت کا وقت ہے۔ وہ گلشن نذرِ خزاں ہوا اب نئے نئے رنگ اور مختلف نغمے ہیں۔ اس محفل میں جہاں بجلی کے قمقمے روشن ہیں۔ مٹی کے دیوؤں کو کون آنکھ اٹھا کر دیکھے گا۔ گاڑھے گزی والی ڈاڑھیاں ختم ہوئیں اب دریا اور حریر کی ساڑھیاں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ یہ "لائٹ لٹریچر" کا وقت ہے جس کے معنی ہیں سائنڈے کا تیل۔ ۔ ۔ ۔

یہاں تو اُس جتھا کی فہرست ہے جس کی خبر ہی نہ ہو۔ اور اس محبوب کی جس کے پاؤں مر تعلق ہوں اور سر منڈا ہوا" (ص[illegible])

اس مجموعے اور مضامین کے عنوانات یہ ہیں:۔

جذبۂ وطن ([illegible])، اپنا روپ اپنا وطن ([illegible])، سوتیلی اولاد بھی سوکن ہے ([illegible])، کیا دوسری بیوی کی اولاد نا جائز ہے۔ ([illegible])، جہانگیر شاہجہاں ([illegible])، ساس بہو کے تعلقات ([illegible])، بجٹ ([illegible])، ہماری یونیورسٹی ([illegible])، حور ([illegible])، آئینۂ عبرت ([illegible])، رہنمائے قلعہ دہلی ([illegible])، قریب ویران ([illegible])، اقبال دلہن ([illegible])، کتاب النکاح ([illegible])، محمود کی قربانی ([illegible])، کرشن نمبر ([illegible])، جابیر سوامی۔ (نظام المشائخ)

۲۹ مجموعے یہ ہیں علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کے مضامین کے ۲۹ مجموعے جو بعد رحلت ڈھائی سال کے اندر شائع کئے گئے۔ اور ۱۹۴۹ء سال میں ان میں سے ہر مجموعے کے کئی کئی اڈیشن نکل گئے تھے۔ پچھلے سولہ سال کی طویل مدت میں جدید اڈیشن سوائے ۳، ۴ کے ان مجموعوں کے شائع نہ کر سکا۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے اڈیٹر ساقی نے لکھا تھا:۔

" مولانا کا لٹریچر ایک ناپیدا کنار سمندر کی طرح لہریں لے رہا ہے جس میں سے اُن میں سے صرف چند موتی نکال کر پیش کئے ہیں۔ ان کے علاوہ رازق الخیری صاحب کی جگر کاوی کی داد کون دے سکتا ہے کہ اُنہوں نے خدا جانے کس طرح اس تمام لٹریچر کو جمع کیا جو گذشتہ چالیس سال میں مولانا کے قلم سے مختلف رسائل کے صفحات پر پھیلتا رہا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ امدادِ غیبی اُن کے شاملِ

حل تھی یا اُن کی بے مثل سعادت مندی اور محبت تھی کہ بکھرائے منتشر ۳ سٹوں (۲۹ مجموعوں) کی صورت میں یکجا ہوگئے یا یوں سمجھئے کہ آبدار موتیوں کی ۳ خوبصورت لڑیوں کا اضافہ ہمارے ادب میں رازق الخیری صاحب کے ہاتھوں ہوا۔

۳ اور کتابیں بزم آخر سنہ [illegible] کا غیر مطبوعہ معاشرتی ناول جس کا صفحہ ۲۸۳ پر ذکر کیا گیا ہے۔ اُمید ہے سنہ ۶۳ء کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ تربیت گاہ بنات کے متعلق بارہ تیرہ سال میں جو مضامین تحریر فرمائے تھے ان میں بعض تو بعض قیمتی تھے۔ ان کے علاوہ متعدد مضامین اور بعض مضامین کے مختلف ٹکڑے بلند مرتبہ ادبی شان رکھتے ہیں ان سے بھی ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ علامہ مغفور کے خطوط اور آٹوگراف بھی بیٹے کچھ جمع کرلئے تھے دلی سے ہجرت کی تو وہ ضائع ہوگئے۔ اُمید فرزیبا شاید کچھ خطوط جمع کئے جاسکیں۔

اگر کامیابی ہوگئی تو علامہ راشد الخیری کی تصانیف میں اس کا بھی اضافہ ہوسکے گا۔

تصانیف باعتبار موضوع

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری کی مندرجہ بالا تصانیف کو موضوعات کے لحاظ سے اس طرح تقسیم کیا جائے گا:۔

تاریخ وسیرت

آمنہ کا لال
وداعِ خاتون
سیدہ کا لال
امین کا دم واپسیں
الزہرا
دلّی کی آخری بہار
نوبت پنج روزہ یا وداعِ ظفر
بزم رفتگاں
داستانِ پارینہ

مذہبی مضامین

احکامِ نسواں
قرآنی قصے
محسنِ حقیقی
زیورِ اسلام
دُعائیں

نظموں کے مجموعے

روداد قفس
گرفتارِ قفس

سیاسی صحافی سیاحی مضامین

شہیدِ مغرب
عالمِ نسواں
یادگارِ تمدن
سیاحتِ ہند

اصلاحی معاشرتی ناول

حیاتِ صالحہ
شبِ زندگی ۲ حصے
منازل السائرہ
نوحۂ زندگی
صبح زندگی
طوفانِ حیات
شام زندگی
جوہرِ قدامت

تربیتِ نسواں — بزمِ آخر

اسلامی تاریخ بطرز ناول

آفتابِ دمشق — تیغِ کمال
درِ شہوار(؟) — شہنشاہ کا فیصلہ
عروسِ کربلا — منظرِ طرابلس
یاسمینِ شام — شاہینِ دُرّاج
محبوبہ خداوند — دُرِّ شہوار

مزاحیہ افسانے

نانی عشو — دادا لال بجھکڑ
ولایتی نخمی

مختصر افسانوں کے مجموعے

جوہرِ عصمت — گلدستۂ عید
سیلابِ اشک — گوہرِ مقصود
طوفانِ اشک — گردابِ حیات
نغماتِ اشک — بساطِ حیات
خدائی راج (آخری افسانے) — حور اور انسان
نسوانی زندگی — نشیب و فراز

مضامین کے متفرق مجموعے

عروسِ مشرق — شادی کا انتخاب
گدڑی میں لعل — زیبِ ہستی
مسلمان عورت کے حقوق — بے فکری کا آخری وقت
نالۂ زار — چمنستانِ مغرب
بلبلِ بیمار — بکھری ہوئی پتیاں
ساجن مورے

اصلاحی معاشرتی افسانے

بنت الوقت — سنجوگ
سرابِ مغرب — سوکن کا جلاپا
فسانۂ سعید — موودہ
سودائے نقد — تفسیرِ عصمت
تمغۂ شیطانی — انگوٹھی کا راز
ست روحوں کے اعمالنامے — منازلِ ترقی
غدر کی ماری شہزادیاں! — بچہ کا کرتہ
(میلہ میں میلہ) — ویٹا کی سرگزشت
ستونتی — چار عالم

ادبِ لطیف و انشا

قلبِ حزیں — لڑکیوں کی انشا — مسلی ہوئی پتیاں

تصانیفِ مصورِ غم کی مقبولیت

حکومت کی طرف سے قدر افزائی کہ خطابات اور انعامات تعلیمی محکموں کی سرپرستی کہ سرکاری طور پر کسی تصنیف کی ہزارہا جلدوں کی خریداری، یہ دو باتیں تو بے شک نہ تھیں اور علامہ مغفور کی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ ہو سکتی ہی نہ تھیں ورنہ جہاں تک قبولیت عامہ کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ علامہ راشد الخیری نے جو مقبولیت اپنی تصانیف کی بدولت حاصل کی شاید اردو کے کسی مصنف نے نہیں دیکھی۔ وہ اپنی تصانیف کی فروخت سے خود کوئی مالی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ لیکن پانچ

پانچ دس دس پندرہ پندرہ بیس بیس اڈیشن ان کے سلنے ان کی ایک ایک تصنیف کے نکل گئے۔ زبان کی لطافت اور طرزِ بیان کے بے پناہ زور اور روانی کے علاوہ ان کی تصانیف میں کشش اس وجہ سے بھی ہے کہ اُن میں زندگی کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ اور گہرے مشاہدات اور سچے تجربات پر مبنی ان کی تصانیف میں حقیقت نگاری ہے، اور احساسات و جذبات میں ایک انتہائی درد مند دل کے جو لبریز تھا خلوص اور صداقت سے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بعد بھی ان کی تصانیف کی مقبولیت میں فرق نہ آیا ان کی رحلت کے تین سال بعد دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو اس کے دوران میں سامانِ طباعت کی گرانی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ۱۹۴۲ء میں ساڑھے تین آنے پونڈ کا سفید چکنا کاغذ پونے دو روپے پونڈ تک بک گیا۔ کاغذ کے اس قحط کے زمانہ میں بھی تصانیف علامہ راشد الخیری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دو نہ چار مندرجہ ذیل ۳۰ تصانیف کے جدید اڈیشن ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئے۔

(۱) حیاتِ صالحہ (۲) نانی عشو (۳) دعائیں (۴) قلبِ حزیں (۵) خدائی راج (۶) ولایتی نشی (۷) بچہ کا کرتہ (۸) ویڈیا کی سرگذشت (۹) سوکن کا جلاپا (۱۰) سودائے نقد (۱۱) بساطِ حیات (۱۲) سیدہ کا لال (۱۳) الزہرا (۱۴) داستانِ پارینہ (۱۵) وداعِ خاتون (۱۶) نشیب و فراز (۱۷) امین کا دم واپسیں (۱۸) طوفانِ اشک (۱۹) بنت الوقت (۲۰) انگوٹھی کا راز (۲۱) جوہرِ عصمت (۲۲) شہنشاہ کا فیصلہ (۲۳) سیلابِ اشک (۲۴) مسلمان عورت کے حقوق (۲۵) تفسیرِ عصمت (۲۶) منازلِ ترقی (۲۷) محبوبۂ خداوند (۲۸) ساجن موہنی (۲۹) عروسِ مشرق (۳۰) ماہ مجسم

(عصمت نومبر ۱۹۴۳ء ص ...)

اس تفصیل سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تصانیفِ مصورِ غم کی مقبولیت کی کیا کیفیت تھی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مصنف کی مقبولیت میں تو فرق نہیں آیا ہاں ناشر کے حالات بدل گئے۔ اور ۴۹ سال کا جما جمایا کام ایسا اکھڑا کہ پھر حالات درست ہونے تھے اور نہ ہوئے۔ مطبوعہ کتابوں کے سٹاک کا ایک حصہ دلی میں ضائع ہوا۔ پچاسی غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودے امرتسر کے ریلوے سٹیشن پہلے چھینے گئے۔ قیمتی کاغذات کے تین بکس دلی سے کراچی ٹرین میں آتے ہوئے جلائے گئے۔ تینوں رسالوں کے دس بارہ ہزار خریداروں کا حلقہ سمٹ سمٹا کر نصف رہ گیا۔ دفتر کے علاوہ گودام میں ہزارہا روپیہ کے مالکوں کی چوری اور پھر ۱۹۴۸ء میں گودام میں زبردست آتش زدگی! نقصانات کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

تصانیف علامہ مغفور کی مانگ بدستور تھی مگر اپنے حالات کا کیا کیا جائے ع

نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

سر عبدالقادر

مولوی سید ممتاز علی

شیخ محمد اکرام
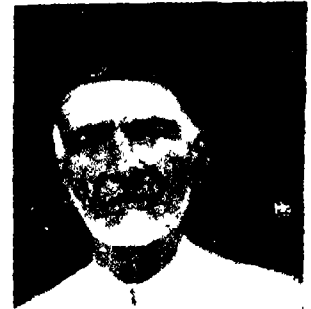
خواجہ فضل احمد شیدا دہلوی

مُلّا واحدی۔ سیّد آصف علی اور خواجہ حسن نظامی
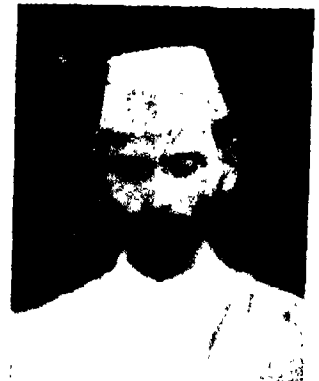
مولانا عارف ہسوی

منشی پریم چند

پرنسپل مشتاق احمد زاہدی

علامہ مغفور ۔ سعد میاں ۔
بیگم راشدالخیری مرحومہ ستمبر ۱۹۳۱ء

بستر علالت پر ۸ [illegible]

مرحومہ بیگم راشدالخیری
دونوں بیٹوں نواسہ پوتے کے ساتھ دسمبر ۱۹۳۶ء
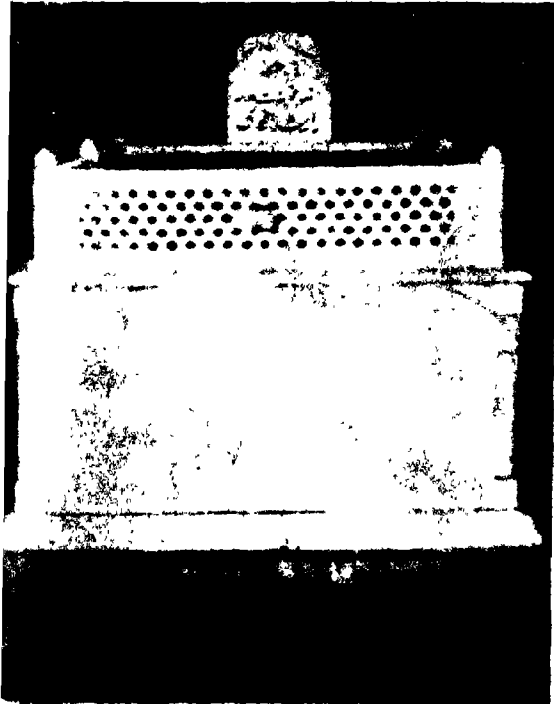
دہلی میں مزار علامہ راشدالخیری

ہر خوش پیکر
کی پسند
سیما

ماہ پاروں کا جمال افروز صابن

ساختہ، کریسنٹ پاک

KHAIRI

اچھی گرفت
اچھی قسمت .... اچھی محبت
اچھی دلکشی .... اور
اچھے دل پسند دوستوں کیلئے .. اچھا
کالا کولا
em'Art

باب بیسواں ——— مصورِ غم کا فن

(۱) خصوصیاتِ تحریر

۱۔ اسلوبِ تحریر

اردو میں بہت کم مصنفین ہیں جن کا اندازِ بیان
(اسلوب نگارش یا طرزِ تحریر (Style) انفرادی
شان رکھتا ہے۔ اُن چھوٹے چھوٹے مضامین کو چھوڑ کر
جو عورتوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے
خانہ داری بچوں کی پرورش وغیرہ پر عصمت سہیلی اور
... میں لکھے گئے تھے علامہ راشد الخیری کی تحریر کی
چند سطریں پڑھنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ طرزِ بیان
مصورِ غم کا ہے۔ چند مثالیں زیادہ معروف تصانیف
سے نہیں چند مختلف مضامین سے پیش کی جاتی ہیں:-

"بات پتہ کی ہے اور تشبیہ سچی! غور سے دیکھو تو بیٹی
کی وداع اور مُردے کی رُخصت کچھ ایک ہی سی باتیں
ہیں۔ جس طرح دُلہن کی رُخصت پر عزیز و اقارب
پیچھے کھڑے منہ تکتے ہیں اسی طرح مرنے والے کے
وارث در و دیوار سے سر پھوڑتے ہیں۔ مگر نہ وہ کچھ
کر سکتے ہیں نہ یہ وہ مجبور یہ لاچار۔ بیٹی کا آخری
دان پلنگ پیڑھی پٹاری پاندان۔ مُردے کی آخری
خدمت دو چادریں ایک کفنی۔ گلاب کیوڑا عطر
... بیاہی اپنے گھر سے نکل ایک نئے مکان میں
گئی۔ مُردہ اپنا گھر چھوڑ چھاڑ قبرستان پہنچا جنگل
بیابان آدمی نہ آدم زاد! اندھیرا گھپ اور قبر
کی تنہائی! اپنا ہے نہ ماں باپ ہے نہ مددگار بہن
ہے نہ بھائی! مونس ہے نہ غمخوار کوئی اتنا بھی
نہیں کہ ذرا سی دیر بیٹھ کر فاتحہ ہی پڑھ لے۔
ماں چراگاہوں سے بیٹی ہوئی گائیں بھینسیں اپنے
گھر ان غفلت کی نیند سونے والوں کے سینے پر
رگڑتی چلی جائیں گی اور شاید گوالا ان ہی کے
ڈھیروں پر بیٹھ کر ایک چلم پی جائے تو پی جائے"
نالۂ زار ——— (جہیز و تجہیز عصمت ۱۹۱۶ء)

"پہلے گھوڑے کو ایک چابک اور پہلے آدمی کو ایک
بات! مانا کہ سلطنت ہاتھ سے جا کر لٹا سا
مکان اور وہ بھی محدود حکومت کھو کر پانچ چھ سار
انسان اور وہ بھی کمزور رہ گئے مگر مردہ رگوں میں
ہاشمی خون اب تک دوڑ رہا ہے۔ اور اگر اس ڈھانچ
میں جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے جوش آگیا تو اچھے
اچھے پہلوانوں کے ہوش کھو دے گا۔ لیکن خدا کی
شان ڈیلی کرانیکل کا نامہ نگار۔ مذہب سے غیر۔
قوم سے غیر۔ ملک سے غیر۔ شکل و صورت سے جدا
کھلے بندوں بھرے ہندوستان میں علی الاعلان
یہ کہہ کر جائے کہ اس سرے سے اُس سرے تک
کیا ہندو اور کیا مسلمان تمام ہندوستان میں اگر

عورت وقعت کی چیز ہے تو مرتے کا نے ورنہ جوان ہو یا بڑھیا کھانے کی گڑیا اور دل لگی کی پُتلی ہے۔ جس کے چہرے پر جب تک چار چلّو خون ہے مرد کا دل بہلائے اور روٹی کھائے۔ اور ہم خون کے سے گھونٹ پی کر چپکے ہو جائیں مگر اپنی ٹانگ کھولیں اور آپ لاجوں مریں"

جوہر عصمت ـــــــــــــ افسانہ تنویر ۱۹۳۸ء

"نوعارد ستیاں جس خاک کو روند رہا ہے ۔ وہ مبارک ہستیاں ہیں جو اسلام کے چراغ روشن کر گئیں ۔ یہ مسلم خواتین کے اس طبقہ کی آرام گاہ ہے جس کے نام پر خلوص قربان ہوا۔ جس کے قدموں پر ایثار نے سجدے کئے ۔ ان کی زندگی نے وہ کام کئے ہیں کہ دیکھنے والی آنکھیں ان کی جدائی پر خون کے آنسو گرائیں گی"

جنتی بیوی کا ایک دن ـــــــــــــ (۱۹۲۲ء)

"یہ چراغ ٹمٹما گئے اور عمر کی بتی جھلملا چکی تمہارا ان کا آمنا سامنا ہے تو بس اتنی دیر کا کہ نسیم کا جھونکا انہیں ٹھنڈا کر دے ۔ پھر یہ کہاں اور تم کہاں داستان ان کے ساتھ ختم ہو گئی اور دعا کے دروازے ان کے ساتھ بند، تمہارے داغ کلیجے پر لے جائیں گے اور پھر تمہارے کان ان کی آوازیں نہ سنیں گے"

چراغ سحری ـــــــــــــ (۱۹۳۸ء)

"خاندانی عزت کی لاج شخصی عزت سے بہت زیادہ ضروری ہے ۔ غریب رشتہ دار امیر ملاقاتیوں سے زیادہ عزت کے مستحق ہیں ۔ خدا برکت دے گا اس بہو کے گھر میں جو بجائے ڈیڑھ روپیہ گز کا کپڑا پہننے کے آٹھ آنہ گز کا آپ پہنے گی اور آٹھ آنے گز کا

بوہ نند اور غریب دیورانی کو بٹھا کر چار بیویوں میں بیٹھے گی اور سچے زیور سے آراستہ ہوگی"

غریب رشتہ دار ـــــــــــــ [illegible]

علامہ راشد الخیری کے اسلوب نگارش کا یہ معمولی کرشمہ ہے کہ ان کی کوئی سی تحریر شروع کر جائیے اس کی دلکشی اور جاذبیت مضمون ختم کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔ ضخیم ناولوں اور مختلف موضوعوں کے مضامین سے قطع نظر ہم صرف چند مختصر افسانوں سے مثالیں پیش کرتے ہیں کہ جن سے معلوم ہوگا کہ آغاز کس قدر دلکش اور دلآویز ہوتا ہے :۔

"اے بلبل ہزار داستان کیسا سنسان وقت ہے آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر ۔ سوتا سنسار جاگتا پاک پروردگار کائنات کا ہر ذرہ عالم خواب میں دیکھا ننھی منی کلکاریاں مارتی ہوئی، پیارا سنسان باپ کو یاد کرتا ہوا ۔ دونوں ڈھیر ہو گئے"

مظلوم بیوی کا پانسہ ـــــــــــــ

"گرمی کی مختصر راتیں آ اور جا رہی تھیں ۔ چاند چمک چمک کر چھپتا تھا اور تارے دمک دمک کر ڈوبتے تھے"

پرستار محبت ـــــــــــــ

"جون کے مہینے میں شہنشاہ فلک تیرہ ساڑھے تیرہ گھنٹے تک غضب ناک گولہ باری کرنے کے بعد ذرا ٹھنڈا ہوا تھا کہ انتظام علی اٹھا اپنے کمرے سے باہر نکل برآمدہ میں ٹہلنے لگا"

بے قصور بچی ـــــــــــــ

"سادات محمد پور کی لڑکیاں کچھ شک نہیں آن پر جان دینے والی نکلیں ۔ انہوں نے خاندان کی لاج اور باپ دادا کی عزت مرتے دم تک رکھی دونوں کی

...زمی ملا صدر اشد الخیری

...یا جہاں کو گھٹ گھٹ کر مرنا ہوتا ہے"

بیوی کی مہک ______

...دو چار یا دس بیس روز کا معاملہ نہ تھا پورے دو ...ال بات انکی سمجھ اور ایک وہ نہیں بیسیوں الجھے ...ئے معاملات سلجھ گئے مگر خدا معلوم دلی والوں کی ...ضع داری تھی یا مرزا جی کی طبیعت کہ صبح آٹھ بجے کی ...آن بات کو تین بج گئے اور الجھے سے سلجھ ہوئے"

خدا فراموش ______

"نعوذ باللہ اٹھایا خدا کا قہر مگر میرے واسطے وہ ساعت قیامت سے کم نہ تھی جب میری بچی مینا ...جس کی بھولی بھالی باتیں دل پر بجلیاں گراتی تھیں ہمیشہ کو چھوٹ گئی"

سلطانہ کے وعدہ کا انتظار ______

ہٹ دھرمی اور بات کی پچ کا تو علاج نہیں — افضل علی خاں جو چاہے سو کہہ لے اُس کی بدنصیبی قابل رحم، اُس کی مصیبت قابل ہمدردی، اُس کا رونا درست اُس کی شکایت بجا۔ مگر ایمان کسی کے واسطے نگلا نہیں جاتا اور منہ پر آئی رُکتی نہیں"

سنجوگ ______

"بڑے بوڑھوں، پرانے گھرانوں، دقیانوسی قسم کی تعویذوں گنڈے بازو اور سلم ڈاڑھی والوں کی تضحیک افضال کی صحبت کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا"

ستونتی ______

"نتیجہ نکل تو یہی سکتا ہے کہ بچپن ضمیرہ اور حسن دونوں کے واسطے سم قاتل ہوا" ضمیرہ

"میاں ذاکر کا دوسرا نکاح چشم ما روشن دل ما شاد نئی بیوی کا سہاگ آنکھ کی ٹھنڈک کلیجے کی ٹھنڈک"

سوکن کا جلاپا ______

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم گھنٹے اور دن نہیں ہفتے اور سال صرف اسی فکر میں بسر ہو گئے مگر آج تک قیاس کام نہ کر سکا کہ فریدہ کی اس حیثیت کی نوعیت تھی کیا؟"

بچہ کا کرتہ ______

"بچے تین دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک گھڑی ویسی بھی آتی ہے کہ ادھر دُعا مانگی اُدھر قبول کیا تھا وہ قبولیت ہی کی گھڑی ہو جب نیر ورنہ جانماز سے اٹھ انگنائی میں آ گود پھیلا اس طرح گڑگڑائی"

لال کی تلاش ______

پھر ابتدائی سطروں ہی میں غضب کی جاذبیت نہیں دل کشی شروع سے آخر تک برابر قائم رہتی ہے۔ اور مضمون ختم ہوتا ہے تو دیر تک، بہت دیر تک وقت دراز تک طبیعت پر اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ چند مختصر افسانوں کی آخری سطریں:-

"شعبانہ تو خیر امتا کی ماری تھی، مگر احسن مُردوں سے بدتر تھا۔ بہتیرا سوچتا تھا۔ نہ شہر یاد آتا تھا نہ رستہ ایک اس ماں کی صورت البتہ یاد تھی جس کی گود میں چار پانچ برس پلا اور بڑھا۔"

لال کی تلاش ______

"اب میرا طیش ہوتا ہے اگر بتاؤں کہ کیا تھا وہ کیا ہو گیا۔ سنو وہ صاحب خانہ جس نے مہمان کی مدارات کی اور رو کر اس کی خدمت کی جعفر برمکی ہارون الرشید کا وزیر تھا اور یہ زردہ سال بڑھیا اس کی ماں"

ام جعفر کی عید ______

اس وقت ارشاد کی تاب نہ رہی۔ رحمٰن کے قدموں میں گر پڑی اور کہا "میں لونڈی ہوں" رحمٰن نے اٹھایا

اہلِ قلم کی نظر میں

دورِ سرسید کے بعد جن حضرات نے مسلمانوں کے معاشرتی اصلاح اور ادبی خدمت کا بیڑا اٹھایا اُن میں مولانا راشد الخیری کا نام سب سے بلند ہے۔ معاصرین کے صاحب طرز انشا پردازوں میں اپنی مثال آپ تھے بعض حضرات ان کو اُن کے پھوپھا مولانا نذیر احمد کا مقلد قرار دیتے ہیں بلکہ خاص معاملہ ہے۔ بلاشبہ حیاتِ صالحہ، منازل السائرہ میں نذیر احمد کے اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے لیکن یہ مولانا راشد الخیری کی ابتدائی کوششیں تھیں جن کے بعد انہوں نے کم و بیش ستر کتابیں لکھیں اور وہ عدیم المثال اسلوب تحریر اختیار کیا جو اُن سے قبل اور اُن کے بعد کسی انشاپرداز میں نظر نہیں آتا۔ انہوں نے خود ہی اپنا اسلوب ایجاد کیا اور خود ہی اسے معراج الکمال تک پہنچا دیا۔ ان کے اسلوب میں تکلف نہیں اشکال نہیں ابہام اور پیچیدگی نہیں ایک دریا ہے کہ بہتا چلا جا رہا ہے۔ میں نے بڑے بڑے صاحب طرز انشاپردازوں کی دستی تحریریں دیکھی ہیں جن میں مولانا محمد حسین آزاد جیسا جلیل القدر استاد بھی شامل ہے۔ یہ لوگ اپنے اسلوب کی خصوصیات قائم رکھنے کے لئے اپنی تحریروں میں بے حد کانٹ چھانٹ کرتے تھے اور مولانا آزاد کی تحریر میں تو بعض جگہ آٹھ آٹھ دس دس چیپیاں اوپر تلے لگی ہوئی دیکھی ہیں لیکن مولانا راشد الخیری کی تحریر میں بہت ہی کم الفاظ یا فقرے کٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس لئے ان کا اسلوب تحریر بالکل طبعی و فطری تھا وہ دہلی کی زبان پر پوری طرح حاوی تھے وہ جس طرح سوچتے تھے اسی طرح لکھتے تھے۔ اُن کی تحریر کا بانکپن اُن کے غور و فکر کے بانکپن کا عکس ہے۔ انشاپردازی کا کمال یہ ہے کہ انشاپرداز پڑھنے/سننے والے پر جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہے بے تکلف پیدا کرے جو انشا موثر نہیں وہ انشا کہلانے کی مستحق نہیں۔ اس اعتبار سے بھی مولانا راشد الخیری اُردو لکھنے والوں میں مثال نہیں رکھتے۔

مولانا عبدالمجید سالک ——— (اخبار جنگ کراچی فروری ۱۹۳۶ء)

"راشد الخیری اُردو میں ایک اسلوبِ خاص کے بانی تھے۔ جو اُن کے ساتھ ہی موت کی گود میں سو گیا"

ابوالکلام آزاد ——— چٹان لاہور

"راشد الخیری اُن مصلحین قلم میں سے تھے جن کا نام ابد تک کے لئے زندہ ہے"

ظفر علی خاں ——— چٹان لاہور

"راشد الخیری ائمہ اَدب کے گروہ میں اپنے طرزِ خاص کے امام مجتہد اور سالک تھے"

پروفیسر محمد طاہر رضوی ایم اے ——— چٹان لاہور

"تحریر کی روانی اُن کا خاص جوہر تھا۔ ان کی کسی کتاب کو اس سرے سے لگا کر اُس سرے تک پڑھ جاؤ۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ انہوں نے کسی جگہ قلم روکا ہے یا کسی خاص لفظ کی تلاش کی ہے"

مرزا فرحت اللہ بیگ ——— (عصمت اگست ۱۹۳۶ء)

"علامہ کا اسلوب بیان اُردو ادب میں جداگانہ مقام رکھتا ہے۔ ان کی تحریریں زورِ بیان میں منفرد ہیں"

گجراتی روزنامہ ملت کراچی ——— (۲۰ فروری ۱۹۵۱ء)

"ادیب کے لئے حساس دل۔ حُسنِ بیان اور جدتِ طبع لوازمات میں سے ہیں۔ ان اسباب میں ایک بھی کم ہو جائے تو ادیب کا رتبہ گر جاتا ہے۔ کتنا ہی حُسنِ بیان ہو لیکن ادیب کے دل میں درد نہیں ہے تو اس کے کلام میں تاثیر ممکن نہیں۔ شاید حُسنِ بیان بھی درد کی ہی ایک

صورت ہے حالانکہ لہجہ اکمال ہی دیکھے گئے ہیں ان کے
طرزِ بیان میں ساری خوبیاں موجود ہیں مگر درد نہیں۔ ایسے
ادیبوں کی بندشوں کی اور ترکیبوں کی داد تو دی جاسکتی ہے
مگر پڑھنے والا اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ مولانا راشد الخیری
مرحوم میں یہ تینوں اوصاف موجود تھے۔ اور یہی ان کی
ادبی کامیابی کا راز ہے۔ اُنھوں نے نہایت درد مند دل
پایا تھا۔ اور اس کے ہی حق پرور بھی۔ وہ متوسط طبقے
میں پیدا ہوئے اور اس طبقہ کی معاشرت کے ہر ایک پہلو
سے واقف تھے۔ اور اس کی خوبیاں اور برائیاں دونوں
ہی اُن کے پیشِ نظر تھیں۔"

منشی پریم چند ———— عصمت راشد الخیری نمبر
"مشائل یعنی اسلوب بیان کے معاملہ میں وہ نا
منفرد ہیں۔ اور رنگین بیانی کے اعتبار سے اُردو کا کوئی
مصنف ان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔"

شاہد احمد دہلوی ———— (عصمت نومبر ۱۹۳۹ء)
"عرصہ ہوا جب لکھنؤ میں میں زیرِ تعلیم تھی تو میری
ایک اُستانی نے جن کا نام مس شہید افغانی تھا۔ دورانِ
گفتگو میں ایک ایسا جملہ علامہ راشد الخیری کے لئے
کہا تھا جو مجھے آج تک یاد ہے اور جس کی صرف میں
ہی نہیں بلکہ ایک عالم تعریف کرتا ہے۔ اُنھوں نے
انگریزی میں کہا تھا کہ:۔

"THE LOVELY AND PATHETICAL
COMPOSITION OF RASHID-UL-
KHAIRI HAUNTED ME."

رؤف النساء خاتون ———— (عصمت فروری ۱۹۴۰ء)
"زبان نہایت شستہ و رواں ہے۔ خشک سے

خشک اور کڑوے سے کڑوے مضمون کو بھی ایسے
دلچسپ طریقے سے لکھا ہے کہ اگر کسی کے خلاف طبیعت
ہو بھی تو وہ اس کا پڑھنا چھوڑ نہیں سکتا۔۔۔۔ تحریر
کی سحر طرازی کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والا ایسا محو ہو جاتا ہے کہ
خود اس دُنیا میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔"

فہمیدہ واحد لاہور ———— بنات اگست ۱۹۳۶ء
اَدب میں آج بھی یکتا ہے رنگ لاجواب اُس کا
نہ ہوگا محفلِ اُردو میں پھر پیدا جواب اُس کا
زبانیں لڑکھڑاتی ہیں قلم سجدے لٹاتے ہیں

اختر شیرانی ———— (عصمت فروری ۱۹۳۹ء)
لے گیا طرزِ ادا اپنی مگر وہ ساتھ ہی
اُس سا لکھ سکتا نہیں کوشش کرے کوئی ہزار

انَل لاہوری ———— (عصمت فروری ۱۹۳۹ء)
دی ہے عمر اپنی تیرے قلم نے اس کو
ادبِ مشرقِ اقصیٰ پہ ہے احسان تیرا

سیماب اکبرآبادی ———— (عصمت فروری ۱۹۴۲ء)
پھر اس پہ روزمرہ صاف ستھرا بندشیں اعلیٰ
نرالا سب سے اندازِ بیانِ راشد الخیری

ابوالاعجاز ازل ———— عصمت فروری ۱۹۴۳ء
الفاظ چُست۔ رنگ نیا۔ بندشیں عجیب
یہ ساری باتیں ہوتی ہیں کس کو بھلا نصیب
ابتک نہ جس کے پایہ کا دیکھا کوئی ادیب
وہ کون تھا؟ وہ راشدِ عالی وقار تھا

ابوالاعجاز ازل ———— (عصمت فروری ۱۹۴۵ء)
غالب کی سرزمیں میں ادیبوں کی آمد
شیراز و اصفہاں کی بلاغت لئے ہوئے

آغا شورش کاشمیری ———— (چٹان فروری ۱۹۵۱ء)

تیرے اسلوب بیاں پر خود زباں کو ناز تھا
تجھ پہ دلی کو نہیں، ہندوستاں کو ناز تھا
نسیم بسمل بنگلور ——————— عصمت جولائی [illegible]

تاب اس کا سرائے دہر فانی دے نہیں سکتی
مشیت اور سب دے اس کا ثانی دے نہیں سکتی
اختر شیرانی ——————— (عصمت [illegible])

۲- زبان

علامہ مغفور کی ددھیال، ننھیال، سسرال تینوں دلی کی تھیں۔ اور پھر ان کی قریب قریب ساری عمر دلی میں گذری۔ دلی والے مصنفین اردو میں یہ خصوصیت حضرت علامہ مغفور کی تھیں۔ یہ وجہ بھی ہے کہ قلعۂ معلی کی کوٹھ سے دھلی ہوئی بیگماتی زبان وہ ایسی لکھ گئے کہ ان کے بعد تو کیا لکھی جاتی کہ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ان سے پہلے بھی کسی مصنف کی کتابوں میں عورتوں کی کہاوتیں، مثلیں، محاورے اتنے نکل ہی نہیں سکتے۔ ان کی ساری تصانیف کو کھنگالنا وقت طلب ہے۔ ایک اکیلی "لڑکیوں کی انشا" کو اٹھا کر دیکھ لیا جائے کہ کہاوتوں اور محاوروں کا کتنا زبردست ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ اور پھر یہ کہ کوئی محاورہ ٹھونسا نہیں گیا بلکہ انگوٹھی کے نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے سادہ روانی کا ایک دریا ہے کہ زور شور سے بہہ رہا ہے۔ تاریخی ناولوں یا سیرت کی تصانیف میں اس زبان کی توقع انتہائی غلطی ہے کہ ان کے لئے یہ زبان موزوں نہ ہو سکتی تھی۔ ہاں اصلاحی معاشرتی ناولوں اور افسانوں میں چونکہ گھریلو زندگی دکھائی گئی ہے۔ اس لئے زبان بھی روزمرہ ہے۔

"بیوی ہوئی گردان ہوئی نکوڑی۔ بیٹی جب میکے سے رخصت ہوئی تو اس کو سسرال آباد کرنی ہے۔ وہیں رہنا اور وہیں بسنا۔ ایک تم انوکھی بیٹی نہیں ہو۔ دنیا جہان کی بیٹیاں جاتی ہیں۔ امیروں کی بھی اور غریبوں کی بھی۔ بڑی بڑی سونے جھونے والیاں پھٹے پرانے پہنتی ہیں اور اف نہیں کرتیں تم نے کیا سنا نہ ہوگا۔ ہائے سمجھوں کی بیٹیاں جو رکھیں بچوں کی طرح"

بچہ کا کرتہ ——————— [illegible]

"اچھے سے اچھے کپڑے، قیمتی سے قیمتی زیور، بہتر سے بہتر کھانا۔ غرض دنیا کی جتنی خوبیاں ہیں بظاہر سب موجود۔ لیکن صورت ظاہری سے ذرا آگے بڑھ کر دیکھو تو اللہ کا نام۔ گھر کی خاک اڑ رہی ہے تو بلا سے۔ بیٹھنے کو جھگی نہیں تو نہ ہو۔ قرض داروں نے ناک میں دم کر دیا تو صدقے۔ بیوی کے سر پر تو کارچوبی دوشالہ عزت سے زیادہ اور حیثیت سے بڑھ کر ہو گیا۔"

گدڑی میں لال ——————— (سنہ [illegible])

"سلمیٰ بڑی بڑی ہڑدنگیوں کے چہرے پر جو سارے سارے دن اور آدھی آدھی رات تمسخاک اڑاتی پھرتی تھیں کچھ ایسا نور برسنے لگا تھا کہ چہروں کو دیکھ کر دل خوش ہو۔ خوشبو کی یہ کیفیت تھی کہ جدھر دلہن نکل گئی گھر بھر مہک گیا۔ اب تو وہ شہاب اور کسوم سب غارت ہو گئے۔ بہت کیا انگریزی شیشی کھولی اور چھڑک لی۔ تمہارے اپنے جہیز کا کوئی پھٹا پھٹایا ادھڑا ادھڑایا کپڑا پڑا ہو تو سونگھ کر دیکھو۔ پچیس تیس برس کے بعد بھی اتنا چڑھے

رہا ہو گا کہ جیسے کسی دُلہن کے زیب تن ہونے کا فخر رہا ہے۔"

مشرق گورکھپور ———— دسمبر ۱۹۳۶ء

اہلِ قلم کی نظر میں

"دہلی کی پاکیزہ زبان خصوصاً نسوانی روزمرہ لکھنے اور ہماری معاشرت کا صحیح ترین چربہ اتارنے میں مولانا راشد الخیری کو جو کمال حاصل تھا اس کی مثال ہندوستان بھر میں موجود نہیں ہے۔"

اخبار انقلاب لاہور ———— ۱۱ فروری ۱۹۳۶ء

"افسوس اب دلّی کی ٹھیٹ زبان لکھنے والا کوئی نہیں رہا۔"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ———— عصمت راشد الخیری نمبر

"مخزن میں ان کا مضمون دیکھا۔ دلّی کی وہ زبان جو سلیقے کے گھروں کی بڑی بوڑھیوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی پہلی دفعہ نظروں سے گذری۔ ہماری اور ہمارے دوستوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ پہلی دفعہ وہ زبان جو ہم بولتے تھے لکھی ہوئی ملی۔ ورنہ لکھنے والے یا تو کتابی اردو لکھتے یا کتابی اردو۔ مگر یہ زبان کہاں۔ اس دن سے ہر رسالہ میں راشد الخیری کی تلاش رہتی تھی۔"

سید آصف علی بیرسٹر ———— عصمت اگست ۱۹۳۶ء

"دہلی کی زبان لکھنؤ کے وینا کے بعد بھی ٹکسالی ہی رہی۔ علامہ اس گروہ کے آخری شخص تھے جس پر دہلی کی زبان ناز کرتی رہے گی۔ جو زبان وہ لکھتے تھے آج اس کا لکھنے والا دنیا میں کوئی بھی باقی نہیں ..... اگر زبان کوئی چیز ہے اور اس کا لطف کچھ معنی رکھتا ہے تو آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ علامہ کے قبضہ میں کیسی قوت موجود تھی۔"

میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ———— عصمت راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

سوانح عمری علامہ راشد الخیری

"راشد الخیری کی کتابوں کی ایک نمایاں صفت ان کی پاکیزہ زبان ہے۔ بیسویں صدی کے انگریزی دان مصنفین کا طرزِ بیان بڑی حد تک زبان سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ان کی زبان کو انگریزی ترکیبیں اور محاورے چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور وہ انہیں اُردو کے الفاظ میں ادا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنی زبان کی ساخت سے ناواقف اس کی روح سے نا آشنا ہیں اور ان کا الفاظ کا ذخیرہ بھی بہت محدود ہے اس لئے اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لئے انوکھی ترکیبیں تراشتے ہیں جو اُردو میں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں۔ راشد الخیری بھی انگریزی داں تھے۔ مگر ان کے ذہن نے دلّی کی اُردو کے آغوش میں پرورش پائی تھی اور اپنی خداداد قابلیت کی بدولت اس تربیت سے پورا فائدہ اٹھایا اس دور کے ناول نویسوں میں راشد الخیری کے سوا کوئی اُردو پر پوری قدرت نہیں رکھتا اور سے اہلِ زبان کی طرح نہیں برت سکتا۔"

ڈاکٹر سید عابد حسین ———— ساقی ستمبر ۱۹۳۹ء

"مولانا راشد الخیری کے انتقال سے سچ تو یہ ہے کہ دہلی کی نتھری ہوئی زبان اور آب کوثر میں دُھلا ہوا روزمرہ ختم ہو گیا۔"

مولانا عبدالمجید سالک ———— جنگ کراچی ۲۰ فروری ۱۹۵۰ء

"راشد الخیری کے اکثر ناول خصوصاً دہلی کے محاورات اور روزمرہ کے انمول خزانے ہیں۔ ان کا مطالعہ ہم کو دلّی کے شریف گھرانوں کی زبان سے روشناس کرا دیتا ہے۔"

صہبا لکھنوی / نقاد سروری ———— دنیائے ادب ۱۹۶۰ء

"زبان! اسے تو یہ جانتے ہیں کہ امرت کی چھائیں

[illegible] سچ اور نفیس اُردو سیکھنی ہو وہ راشد الخیری مرحوم کے ناول پڑھے۔ [illegible] ایسے ہیں جو اُن کی کتابوں سے اُستانی کی خدمت اور [illegible] زبان کی مشقت کے بغیر گھر بیٹھے سیکھ سکتے ہیں۔ زبان ان کی ٹکسالی مگر رسم پرستی سے آزاد۔ بیان ان کا بلیغ مگر مشکل اور دقت پسندی سے مبرا۔ اسلوب ان کا نہایت دل پذیر اور شگفتہ لیکن بلند آہنگی اور ادبِ لطیف کے چونچلوں سے معصوم۔ ہر قصہ رواں دواں اور ہر واردات اپنے ماسبق سے منطقی وابستگی رکھنے والی فضا برداری کوئی ان سے سیکھے"

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ——— (عصمت جولائی ۱۹۳۶ء)

"دہلی میں مولانا راشد الخیری مرحوم سے بہتر اُردو لکھنے والا نہ اب کوئی ہے اور نہ مدت تک پیدا ہوگا۔ ان کی اُردو دہلی کے شرفا کی اصلی زبان ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ ایسا بیٹھتا ہے جس طرح انگوٹھی میں نگینہ۔ محاورہ اور خاص کر عورتوں کے محاوروں کے استعمال میں انہیں خاص ملکہ تھا۔ محاوروں کی ٹھونس ٹھانس سے انہیں نفرت تھی۔ محاوروں کی تلاش سے دور بھاگتے تھے اور موقع و محل سے وہی محاورے استعمال کرتے تھے جو بات چیت میں بلا ارادہ زبان پر آجاتے ہیں اور بارِ خاطر نہیں ہوتے"

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی ——— عصمت اگست ۱۹۳۶ء

"اُس زمانہ سے جب وہ علی گڑھ کی کلکٹری میں تھے ان کی تصانیف دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ وہ زیادہ تر لٹریچر کو ترقی دینے کی طرف مائل رہے۔ دہلی کی مستورات کی زبان جو اس درجہ میٹھی اور سلیس زبان سمجھی جاتی ہے مولانا مرحوم کو اس کے خوش نما چربے اتارنے میں یدِطولیٰ حاصل تھا"

خان بہادر شیخ عبداللہ علی گڑھ ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"مولانا راشد الخیری کی زبان خالص ہندستانی ہے۔ کیونکہ اُردو ہندی دونوں رسم الخط میں بلا تکلف لکھی جا سکتی ہے۔ ان کی زبان چونکہ سیدھی سادی اور دلکش ہے، اس لئے کبھی نہیں مٹ سکتی"

پنڈت رام چندر شرما، اڈیٹر بھارتی ——— (بنات اپریل ۱۹۳۶ء)

"علامہ راشد الخیری کا سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ انہوں نے اُردو زبان کو تکلفات کی آلودگیوں سے پاک کیا۔ اور ہمیں ایک ایسی زبان دی جس سے ہم آج بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے علامہ کی وفات پر سچ کہا تھا کہ:-

"علامہ راشد الخیری کے بعد دلی کی زبان ختم ہوگئی"

دلی کی خالص بیگماتی زبان کی پاکیزگی اور بے تکلفی مسلّم ہے۔ لیکن اس کے استعمال کا بھی ایک ڈھب ہوتا ہے یہ نہیں کہ محاوروں پر محاورے ٹھونسے جا رہے ہیں اور روزمرہ پر روزمرہ سوار ہے۔ کچھ ایسے کہ دلی سے باہر کے لوگ پڑھیں تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ علامہ کی زبان ان نقائص سے آلودہ نہیں۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ مگر ان مثالوں میں زبان کے علاوہ علامہ کے مشاہدے کی گہرائی جذبات نگاری اور تحریر کی روانی بھی دیکھتے جائیے:-

"سستا سماں۔ بے فکری کے دن۔ من بھر کے گیہوں چار پیسے سیر کا دودھ، دودھ بھی کیسا ملائی کے گھونٹ آدھ سیر دودھ میں آدھ پاؤ سے زیادہ روٹی ملائی دو گھونٹوں میں جی خوش ہوگیا۔ یہ تھیں وہ غذائیں جو آدمی کو آدمی بناتی ہیں۔ آج کے دلی والوں کو دیکھتا ہوں سوکھے چیپٹے۔ دھان پان آنکھوں میں حلقے۔ کلّوں میں گڑھے۔ رزق کے مارے

خوراک کے محتاج۔ دودھ کو ترستے۔ گھی کو پھر شکتے۔"

"یہ پھلواسے لال جب بلبل بلبل کرتے ہوں گے تو
ماں کا کیا کہتی ہو گی۔"

"اندھیرا گھپ۔ صورت بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ سانس
سُنا تو وہ بھی ٹھیک نہ تھا۔ مختصر یہ کر گھبرانے لگا"

احمد ندیم قاسمی ——— امروز لاہور ۲۴ فروری ۱۹۵۱ء

"علامہ راشد الخیری کی زبان کوثر و سلسبیل میں دُھلی ہوئی ہے۔ سادگی میں بھی ایک حسن ہے۔ ایک پُرکاری ہے حالی کی طرح ان کی نثر سے بھی اُن کی شخصیت ظاہر ہوتی ہے محاوروں کا استعمال وہ بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ طرز ادا میں وہ بے تکلفی ہے جو مولانا ہی کا حصہ ہے۔ روزمرہ اور محاورے کے حسین امتزاج کے لئے عروس کربلا کی چند سطور ملاحظہ کیجئے۔"

عقیل دانش ——— انجام کراچی ۵ فروری ۱۹۶۳ء

"عصمت کے ذریعہ ہندوستان کے دُور دراز گوشوں میں ٹکسالی اُردو کا مذاق پیدا کر کے مولانا نے ناقابل انداز خدمت کی ہے۔ مولانا راشد الخیری کا عصمت دراصل ایک ادبی ادارہ ہے اور اس ادارہ کی تربیت یافتہ بیبیاں اس تعلیم کو نسلوں کے اندر منتقل کر رہی ہیں"

ل احمد اکبر آبادی ——— عصمت اگست ۱۹۳۶ء

"علامہ کا زبان پر کتنا زبردست قابو تھا۔ وہ ان کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتی تھی اور پڑھنے والے سکوت میں آجاتے تھے، بیسیوں کتابیں انہوں نے ایسی لکھی ہیں کہ آنے والے زمانے میں ادیب ان کی ریسرچ کیا کریں گے۔ بنا سنوار کر لکھی ہوئی زبان وقت گزرنے پر پُرانی ہو جاتی ہے مگر قدرتی رو میں بہتی ہوئی تحریر چشمے جھرنے کے پانی کی طرح صاف شفاف، پاکیزہ بنی رہتی ہے۔ اور اس کا میٹھا میٹھا لوری دینے والا راگ زندگی میں تھکے ہوئے مسافر کو آرام اور طاقت بخشتا ہے۔ آج جبکہ فضا اُردو ہندی کے جھگڑے سے مکدر ہو رہی ہے علامہ مرحوم کی خاص ضرورت تھی۔ کیونکہ ان کی زبان میں یہ قصہ اُٹھتا ہی نہیں۔ وہ اتنی سادہ زندہ اور روزمرہ کے استعمال کی چیز ہے کہ اس میں اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ آج کل کے ادیب عربی فارسی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ گھڑ گھڑ کر معمولی آدمی کو گھبرا دیتے ہیں مگر علامہ اپنی گھریلو زبان کے سادہ محاورے کو اس طرح پرو دیتے تھے کہ اُن کے ہاتھ چومنے کو جی کرتا ہے زبان کی خوبصورتی اس کی سادگی روانی اور عام فہمی میں ہے نہ کہ سخت سمجھ میں نہ آنے والے الفاظ کی بندش ترتیب میں"

پنڈت رام چندر شرما بی اے
اڈیٹر بھارتی (ہندی ہفتہ وار) ——— ساقی راشد الخیری نمبر

"غم ہے تو بے انتہا۔ تاثر ہے تو بے کراں۔ زبان کی جانب توجہ کیجئے تو دانتوں میں انگلی دبانی پڑ جاتی ہے اسلوب پر نظر ڈالیں تو بے اختیار آہ نکلتی ہے! الفاظ کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے، نگینے ہیں کہ جڑے ہوئے ہیں۔ جنہیں اب ان کی جگہ سے تبدیل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ تسلسل اور روانی ہے۔ بے پناہ شیرینی اور روزمرہ کے محاوروں کا استعمال بلا تکلف اور غضب کا! تحریر کا بہاؤ دیکھئے تو انشاء اللہ! ایک آبشار ہے کہ بہتا چلا آتا ہے، ایک چشمہ ہے کہ اُبلتا، سر پٹختا، بل کھاتا بہا جا رہا ہے الفاظ و اسلوب کی نزاکت و شیرینی پر نظر ڈالئے تو جھرنوں کے مترنم نغمے مانند ہیں۔ لب و لہجہ کے گداز کے آگے نرم رو ندیاں آپ آپ ہیں۔ مولانا کی تحریر کے متعلق کچھ کہنا

[...]سوانح عمری علامہ راشد الخیری

[...]ہی فضول ہے کہ کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں بقول

مولوی عبدالحق :-

"انہوں نے روزمرہ کے محاوروں کہاوتوں اور
[...]ھڑ ں کو گھروں کے کونوں کے کھنڈروں سے نکالا
[...]جھاڑ پونچھ کر اپنی تحریروں میں الماس کی طرح جڑ دیا"

[...]ن آفاقی ———— چٹان لاہور ۵ فروری [...]

تحریر کیا تھی سحر تھا - جادو زبان میں
سعدی تھا - اپنے وقت کا ہندوستان میں

آغا [...] دہلوی ———— عصمت جولائی [...]

شمع راتوں کو بہاتی تھی جو آنسو اٹھ گئی
[...]ہر سے وہ کیا اٹھا - دہلی سے اردو اٹھ گئی

[...]ش ملیح آبادی ———— عصمت جولائی [...]

وہ سحر آگیں زباں اس کی جسے سحر رواں کہیے
حسین الفاظ کو پھولوں کا رنگین کارواں کہیے
قلم اس کا کہ انشا و ادب بھی سر جھکاتے ہیں

اختر شیرانی ———— عصمت فروری [...]

نظم وہ تاثیر کی روحِ رواں جس کو کہیں
نثر وہ پاکیزہ - دلی کی زباں جس کو کہیں

نہال سیوہاروی ———— عصمت فروری [...]

بڑھی اہل قلم میں جس سے شانِ راشد الخیری
وہ تھی دہلی کی پاکیزہ زبانِ راشد الخیری

ابوالاعجاز ازل ———— عصمت فروری [...]

ہاں زباں تیری زبان داغ کی ہم عصر تھی
بلبل ہندوستاں کی نظم - تیری نثر تھی

ابوالکمال آہر دہلوی ———— عصمت فروری [...]

دہلی کے گل کدوں کی لطافت لئے ہوئے
اردو کے خمکدوں کی نفاست لئے ہوئے
غالب کی سرزمیں میں ادیبوں کی آبرو
شیراز و اصفہاں کی بلاغت لئے ہوئے

شورش کاشمیری ———— (چٹان ۵ فروری [...])

۳ - جذبات نگاری

مختلف حالات مختلف حیثیات اور مختلف عمروں کے مردوں عورتوں اور بچوں کے جذبات کا ہو بہو نقشہ کھینچنے میں مصور غم کو خاص ملکہ تھا۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا جاتا کہ مصور غم مصور جذبات تھے۔ ان کا کوئی ناول افسانوں کا کوئی سا مجموعہ۔ کوئی منظوم افسانہ ایسا نہیں جس میں جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کی گئی۔ جذبات نگاری تو ان کے اکثر و بیشتر مضامین کے مختلف مجموعوں میں بھی جگہ جگہ ہے۔ منظوم افسانوں میں جذبات کی مصوری کے نمونے تصنیف نمبر ۴۲ روداد قفس کے تذکرہ میں دئے گئے ہیں اور نثر میں ٹکڑے کے ٹکڑے مختلف مقامات پر ہر کتاب میں ملیں گے۔

مبصرین کی رائے

"مولانا کی نظم و نثر کی خوبیاں میر انیس سے ملتی جلتی ہیں جس طرح اپنے مرثیوں میں میر انیس نے ہر ایک کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اسی طرح مولانا نے اپنی ہر نظم میں ہر نثر میں ہر قسم کے مرد و عورت کے جذبات کی صحیح ترجمانی فرمائی ہے"

اس کے صغرا سبزواری کلکتہ ———— (ساقی ستمبر [...])

"جذبات کی ترجمانی میں علامہ مرحوم کے سحر آفریں قلم نے کمالات کے دریا بہادئے ہیں .... جذبات کی ترجمانی ملاحظہ ہو۔ لفظ لفظ پر قربان ہوئے

بی جاتا ہے۔۔۔۔"

ادیب عثمانی ـــــــــ بنات اگست [illegible]

" ظالم باپ کے لئے مصورِ غم خالقِ جذبات کا یہ فقرہ:۔

" مگر اس فتنی کا یہ عالم تھا کہ جہاں باپ نے گھر میں قدم رکھا اور اس نے ابا ابا کہہ کر چیخنا شروع کیا"

جذبات خود ایک مکمل افسانہ ہے جس کی تشریح نہیں کی جا سکتی ۔۔۔۔ اے مصورِ غم خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آپ نے جذبات نگاری کی حد کر دی۔ ظالم سے ظالم باپ بھی ہوگا تو آپ کا یہ افسانہ پڑھ کر خون کے آنسو بہائیگا"

ڈاکٹر اعظم کریوی ـــــــــ (عصمت جولائی ۳۶ء)

" راشد الخیری ایک مخلص سماجی مصلح تھے انہوں نے سماجی توہمات اور غلط عقائد کے خلاف اپنے قلم کو مؤثر طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے خلوص کی وجہ سے اس میدان میں کامیاب رہے۔۔۔۔ انہوں نے انسانی جذبات میں جس طرح تموج پیدا کیا اور جیسی حقیقی تصویریں پیش کیں اس کی بنا پر انہیں مصورِ غم کہا گیا"

ڈاکٹر ہیرندر چندر پال کی بنگالی کتاب مترجمہ
تاریخ زبان اردو سے ترجمہ ـــــــــ خالدہ فہمی

" راشد الخیری کی جولانیٔ فکر نذیر احمد ہی کے فیضان کا نتیجہ تھی لیکن وہ ناول نگار کی حیثیت میں نذیر احمد صاحب سے بہت زیادہ کامیاب ہوئے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نذیر احمد اپنے قصہ کی تکمیل کرداروں کی تخلیق و تعمیر اور مکالموں کی یورش و یلغار میں بے پناہ منطق سے کام لیتے ہیں۔ مگر راشد الخیری کی پیش قدمی سراسر جذباتی ہوتی ہے۔ وہ اس راز کو مولوی صاحب مرحوم کی زندگی بلکہ ان کے عروج کے زمانے ہی میں سمجھ چکے تھے کہ اگر قبول عام حاصل کرنا ہے۔ تو ان کی تصانیف کو زیادہ سے زیادہ جذبات انگیز ہونا چاہیئے۔

راشد الخیری کی مقبولیت کا دوسرا سبب ان کی حقیقی یا غیر حقیقی مظلومیت ہے۔ جس سے انہوں نے اپنے ناول کے اعلیٰ نسوانی کرداروں کی تزئین کی ہے۔ شام زندگی ان کا شاہکار ہے۔ ان کی نکھری ہوئی تحریر اور اس کے جذبات آفریں جذبات پرور اور جذبات انگیز قلم کاری کے بہت سے حسین و جمیل نمونے اس میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں"

صلاح الدین احمد ـــــــــ (آفاق لاہور [illegible] فروری [illegible])

۴۔ حقیقت نگاری

" مولانا کی جن باتوں کو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ محض جذبات انگیزی کی نیت سے کہی گئیں ورنہ عموماً بہت سے وہ یکسر معرا ہیں۔ ان پر اس اعتراض کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مولانا نے عورتوں کی جو حالت اپنے قصوں میں بیان کی ہے وہ عام نہ تھی بلکہ ہندوستان کی عورت عام طور پر عیش و نشاط کی فضاؤں میں شاد آباد تھی۔ اور لاکھوں کروڑوں میں سے کسی ایک آدھ مصیبت کی ماری پر ممکن ہے کہ اس قسم کی بپتا پڑی ہو تو جزو ناقابل ذکر ہوتا ہے۔ گفتگو کل پر ہوا کرتی ہے۔ لیکن ایسا خیال عدم واقفیت اور لاعلمی اور بہت محدود مشاہدہ کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اور اناپ شناپ باتیں ہیں۔ کہنے والے اگر بے خبر ہوتے اور ساتھ ہی بے لاگ تو یہ ڈھکی چھپی حقیقت نہ تھی کہ ہندوستان میں عورت کا [illegible] کتے سے بد تر تھا۔ سوسائٹی میں اس کی کوئی وقعت اور حیثیت نہ تھی وہ پاؤں کی جوتی تھی۔ ایک کو

سارا دوسری کو چڑھالیا۔ کیا ظلم تھا اور کیا دردناک منظر
کہ عورت اپنے مردہ شوہر کے ساتھ زندہ جل جائے۔ تو
عورت کی یہ تحقیر اور تذلیل اس سے کہیں زیادہ ہے
جو حضرت راشد الخیری نے شام زندگی میں بیان کی۔ پھر
ایک بار میں مرنا اور مر کر تمام جھنجھٹوں سے چھٹ جانا بہتر
معلوم ہوتا تھا۔ بمقابلہ ان مصیبتوں کے جو جیتے جی صورت
میں بیوہ عورت کو جھیلنی پڑتی تھیں۔ اس کے سر کے بال
کاٹ دیے جاتے تھے۔ اس کو اچھی غذا نہ دی جاتی تھی
موٹا جھوٹا لباس گاڑھے گزی کا اس کو پہننا پڑتا تھا
آج بھی بنگال کے دیہات میں اس وضع قطع کی عورتیں
نظر آسکتی ہیں۔ جو دیکھنے میں بچی معلوم ہوتی ہیں......
جب سارا گھر سو جاتا تو بہوئیں جاکر بند دلہنوں کی طرح
اپنے بستروں پر مرتیں۔ نچلے طبقے کا تو کیا ذکر۔ متوسط درجے
کے گھرانوں تک میں دوپہر کی غرغر بہوؤں کے ذمہ تھی
کہ چاہے پانی چاہے دیوروں کو نہلا دھلا رہی ہیں ان کے
کپڑے دھلوا رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ساس زبان اور
نندیں کی گانٹھ راضی رہیں۔ مشترکہ خاندانوں کا رواج
تھا۔ ماں باپ بیٹے بہوئیں سب ایک گھر میں رہتے۔
آج بھی اس پرانے ٹائپ کی زبان ساسیں ڈھونڈو گے
تو ہزاروں پاؤ گے۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی
عورت کا کیا وقر تھا...... قصہ کوتاہ جو حالت ہندو
عورت کی تھی۔ تقریباً یہی حال مسلم عورت کا تھا۔ اب
بھی ہندوستان کے بعض حصوں میں (ہندوستان سے
مراد انگریزوں کے انڈیا سے ہے جس کا اطلاق کشمیر
سے راس کماری تک کے خطہ پر ہوتا تھا) ہندو معاشرت کی
تقلید میں لڑکیوں کو والدین کے ترکہ میں سے کوئی حصہ
نہیں ملتا۔ اگرچہ بارہا اس کے متعلق غوغا آرائیاں ہو چکی
ہیں۔ علامہ راشد الخیری نے آج سے اسی نوے برس پہلے
دنیا میں قدم رکھا۔ ان کی آنکھوں نے مسلم عورت کی
مظلومیت کے خدا جانے کتنے واقعات دیکھے ہوں گے
قدرت نے انہیں احساس قلب عطا کیا تھا جس کی چند
مثالیں سطور بالا میں مرقوم کر چکا ہوں۔ یہی وجہ تھی انہوں نے
اس کی اصلاح کے لئے کمر ہمت باندھ لی۔ اپنے ناولوں
افسانوں اور مضمونوں میں مولانا راشد الخیری نے عورت
کی جو مظلومیت بیان کی ہے۔ اس پر اعتراض کرنے سے
پہلے کہ جذبات کو متاثر کرنے کی غرض سے غیر معمولی مبالغہ
آرائی کی گئی یا ان کے افسانوں میں واقعیت سے دور کا
بھی لگاؤ نہیں۔ کاش معترضین ذرا ہندی عورت کی
محکومیت اور مظلومیت کی داستان امیر خسرو کی زبان
سے سن لیتے۔ جس سے معلوم ہو جاتا کہ جو ذلت ہندی
معاشرت نے ہندو عورت پر طاری کر رکھی تھی اس کی
چنگاریاں مسلمان عورت کو بھی خاکستر کر رہی تھیں۔

مسلمانوں کے شریف گھرانوں میں بھی ہندوؤں
کی طرح عقد بیوگان معیوب اور متروک تھا۔ ورنہ عقد
بیوگان کی تو اسلام میں تاکید ہے۔ ہاں تو حضرت امیر خسرو
کی بھی ذرا سنیئے ممکن ہے ان کے بیان میں بھی بے محابا
غیر واقعیت محسوس ہو۔ لیکن ان کے سامنے مولانا
راشد الخیری کی طرح مولانا نذیر احمد کی قبیل کا آدمی کہاں
تھا اور نہ ان دنوں کتب فروشی کا کوئی خاص دستور تھا کہ
زیادہ سے زیادہ نغمہ ہائے غم کو چھیڑ کر دنیا کو اپنی طرف
متوجہ کرتے۔

سنیئے فرماتے ہیں بیٹی باپ سے کیا کہہ رہی ہے:۔

(۱) سونا بھی دینا روپا بھی دینا۔ دینا جڑت جڑاؤ رے
ایک دسر کو رے کنگھی تیرے ساس نند بسے بول رے

(۲) آم تلے سے ڈولہ جو نکسا۔ کوئیلہ کوک سنا رے
تمرے نہ اپنی بابل زہر کی گھٹی اب کیا من بچھاوئے
(۳) ننگے پاؤں بابل جو دوڑا سمدھی۔ ڈولہ تھام رے
میری تو بیٹی تیرے محلوں کی رانی ہم لونڈی غلام رے

مطلب (۱) ابا جان آپ نے سونا چونا، چاندی روپا اور جڑاؤ زیور عنایت کئے۔ مگر صرف ایک کنگھی نہ دینے سے ساس نندیں طعنے دے رہی ہیں کہ کیا خاک دیا ایک ذرا سی کنگھی بھی نہ دی جو بیٹی سر میں کرتی۔

(۲) ابا جان جب میرا ڈولہ سسرال کی طرف جا رہا تھا۔ اور میں آپ کے ہاں سے رخصت ہو کر جا رہی تھی تو آموں کے درختوں پہ بیٹھی کوئل عجیب پُر درد آواز میں کوک رہی تھی۔

ابا آپ نے پیدا ہوتے ہی مجھے زہر کی گھٹی پلا دی ہوتی اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔

(۳) لڑکی جب وداع ہو کر اور ڈولے میں سوار ہو کر چلنے لگی تو بیٹی کا باپ ننگے پاؤں دوڑا اور سمدھی سے (لڑکے کے باپ سے) کہنے لگا میری لڑکی آپ کے محلوں کی خادمہ ہے۔ اور ہم (اس کے ماں باپ) آپ کے لونڈی غلام ہیں۔

کہدیجے کہ جو صورتِ حال اوپر مذکور ہوئی ہے عمومیت سے یکسر معرّا ہے۔ اور جذبات انگیزی کی ایک مثال ہے۔ کہتے کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ خیر اس کو مولانا کا کمال سمجھئے یا اقبال کہ ان کی تصانیف اصلاح کی پوٹ ہونے کے باوجود کامیاب ہوئیں۔ اور اتنی کامیاب اور اس قدر کامیاب کہ آج تک اردو کے کسی مصنف نے اپنی کتابوں کی ایسی کامیابی نہیں دیکھی اور معترض کو بھی ان کی کامیابی کا اقرار اور یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ راشد الخیری نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سماج میں عورت کے درجہ کو واقعی بلند کیا۔ اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ مقصد حاصل ہوا۔"

خواجہ فضل احمد شیدا دہلوی ——— ایشان لاہور مئی ۱۹۳۶ء

"علامہ راشد الخیری نے ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں بالکل نیچرل واقعات بیان کئے ہیں، کوئی بات دور از عقل اور اصلیت کے خلاف نہیں۔ عام دنیا کے حالات جس میں ہم مرد، عورت، بچے، بوڑھے، جوان اپنی اپنی زندگیوں کے پارٹ ادا کرتے ہوئے اس دنیا میں روزمرہ دیکھتے ہیں ہو بہو ان کی وہی جدوجہد آپ کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔"

فہمیدہ واحد ——— بنات ستمبر ۱۹۳۶ء

"مصورِ غم کے افسانوں میں نہ تو مرمریں کلائیاں تھیں اور نہ مرتعش ہونٹ"، "کے غیر اخلاقی الہامات" بلکہ علامہ نے ہمیشہ سیدھے سادے الفاظ میں انسانیت اور حقیقت کی ترجمانی کی۔ الفاظ و فقروں کی بجائے انہوں نے واقعات اور حالات کی ترتیب پر زور دیا۔۔۔۔ ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں جو عین فطرت یا قرینِ قیاس و عقیدہ نہ ہو"

ڈاکٹر اعظم کریوی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"راشد الخیری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی تحریریں اُن کے زمانہ اور ماحول کا آئینہ ہوتی ہیں۔ وہ تخیلی کردار پیش نہیں کرتے بلکہ اُن کے کردار وہی ہوتے ہیں جو اکثر ہندوستانی گھروں میں اپنی زندگیاں بُری یا بھلی جس طرح بھی بن پڑے گذارتے ہیں۔ راشد الخیری اپنے ہیرو یا اپنی ہیروئن کی تلاش میں محلوں اور محلسراؤں کے خواب نہیں دیکھتے۔ وہ اپنے اطراف و اکناف کی

گلیوں اور بازاروں میں سے ہیرو اور ہیروئن تلاش کرلیتے
[تھے] ان کا یہ خاص کمال ہے ..... وہ بڑے
[فطر]ت شناس اور حقیقت پسند ادیب تھے۔ ان کا نام
[...] ترقی پسند ادیبوں کے سرفہرست لکھا جائے گا
وہ باکمال ادیب تھے۔ انھوں نے ادب کو زندگی کا
[ترج]مان بنایا اور زندگی بھی بالعموم ایسے طبقے کی جس کی
[جا]نب ان سے پہلے کے بہت کم ادیبوں نے توجہ
کی تھی"

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ——— عصمت فروری ۳۹ء

۵۔ مشرقیت

"اچھی چیزیں لو اور بری چیزیں چھوڑ دو مغربی
چمن میں جو پھول خوشبودار ہے اس سے اپنا
اس بجو ادا اپنا گلدستہ سجاؤ" (چمستانِ مغرب)

بس اس حد تک علامہ مغفور جدت پسندی کے
قائل تھے۔ اس نازک دور میں جب مفتوح قوم احساسِ
کمتری میں مبتلا ہو کر فاتح اور حکمراں قوم کی تہذیب و
تمدن سے مرعوب تھی اور مغرب کی کورانہ تقلید میں اپنی
خوبیاں گنوا رہی تھی علامہ مغفور نے مغرب کی بعض خوبیوں
کے اعتراف کے ساتھ ساتھ قوم کو اندھی نقالی کے دردناک
نتائج دکھا دکھا کر آنے والے خطرات سے باخبر کردیا تھا۔
وہ مشرقی تہذیب کی خوبیاں مغرب کی بھینٹ چڑھا دینے کے
خلاف تھے۔ مشرقیت کے گلہائے رنگ برنگ سے
ان کی تصانیف کا چمن مہک رہا اور دہک رہا ہے۔

"مولانا مشرقی تہذیب کے عاشق تھے اور وہ
اس نئے دور میں بھی اس کے لئے تڑپا کرتے تھے۔ وہ
دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی عورت نے اپنے سفر
کا رخ بدل دیا ہے اور بے تاب تھے کہ کیوں کر اس کا دامن
پکڑ کر اس راہ سے اسے ہٹا دیں جس میں خطرہ ہی خطرہ ہے
چنانچہ مرحوم نے اپنی زندگی اس کوشش میں تمام کردی
اور یہ کہنا حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ وہ اپنے مشن میں
بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ رسالہ عصمت کی برادری
جس میں ہندوستان کی ہزاروں شریف خواتین شامل
ہیں اس کی بہترین شاہد ہے اور مولانا کی تصانیف
کی مقبولیت اس کی کھلی ہوئی دلیل"

مولانا نیاز فتح پوری ——— عصمت فروری ۳۹ء

"عورت کی زندگی کا جو نصب العین راشد الخیری
کی نظر میں ہے وہ خالص مشرقی اور اسلامی نصب العین
ہے۔ مغرب کی تقلید میں تعلیم نسواں اور آزادی نسواں
کی مخالفت جن اصولوں پر مبنی ہے وہ ضرور قابلِ غور
ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ عورتوں کو ان کی ضرورتوں کی مناسبت
سے تعلیم اور آزادی حاصل ہو اور مغرب کی تقلید نہ کریں
غرض ان کا اصل اصول یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کے
مستقبل کی تعمیر ان کے ماضی کی بنیاد پر ہو"

ڈاکٹر سید عابد حسین اڈیٹر جامعہ ——— (ساقی نمبر ۳۶ء)

"مولانا راشد کی قدامت پرستی دورِ جدید سے
خائف ہونے کے بدلے اس کا خیر مقدم کرتی تھی مگر اس
حد تک کہ اس کے مضر اثرات سوسائٹی میں نہ پھیلنے پائیں
ان کے موضوعات فلسفہ یا نفسیاتی مسائل پر مبنی نہ ہوتے
تھے۔ زندگی کے نقشے اس طرح کھینچنا کہ معاشرت کی
موجودہ خرابیاں دور ہوں یہی ان کا مقصد تھا۔ اور
اس میں وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئے"

منشی پریم چند ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"مرحوم نے پرانا زمانہ بھی دیکھا تھا اور نیا بھی۔

اُنھوں نے پرانی صحبتوں کا بھی لطف اٹھایا تھا اور نئے رنگ ڈھنگ بھی دیکھے اور برتے تھے۔ ان دونوں کی اونچ نیچ ان کی نظر میں تھی۔ اب ایسی جامعیت کا شخص ہمیں کہاں نصیب ہوگا"

ڈاکٹر مسرور عبدالحق ——————— عصمت راشدالخیری نمبر

"ایسی حالت میں جب ایک ایک کر کے مشرقی شمعیں فنا ہو رہی تھیں ایک قلم نے اس اجڑے ہوئے باغ کی بہار کے گیت گائے۔ ایک ہستی نے مشرقی چراغ کے بجھ جانے کا ماتم کیا۔ اس صرف ایک شخص نے اس دَور کے سمے اپنے سحر نگار قلم سے کھینچ کر ایسے باندھے کہ ہماری آنکھیں کھل کی کھل رہ گئیں۔ مغربی معاشرت کی حمایت میں لکھنے والے جدید طرز کو سراہنے والے تو بہت نکلیں گے۔ لیکن صرف ایک آواز نے مشرق کی تہذیب کے مٹنے پر نالہ و زاری کی۔ مشرقی تہذیب کے گہوارے پر حضرت علامہ راشدالخیریؒ کے آنسو اُردو ادب کے خزانے کے وہ انمول موتی ہیں۔ جن کی قدر جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ کیونکہ ہمارے ہی دَور میں پُرانے وقتوں کی باتیں دیکھے ہوئے لوگ تو کیا اس زمانے کے قصّے سُنے ہوئے لوگ بھی اب بہت ہی کم دکھائی دیتے ہیں اور چند سال بعد تو اُس دَور کے نام لیوا چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملیں گے۔ لیکن مولانا مرحوم کے قلم نے مشرقی تہذیب کے جو سمے دکھائے ہیں وہ آنے والی نسلوں کو بتاتے رہیں گے کہ ان گدڑیوں میں کیا کیا لعل تھے۔ ہماری تہذیب بھی کیا چیز تھی۔ ہماری زندگی کا فلسفہ کتنا بلند اور ہماری عورتوں کے جذبات کتنے پاکیزہ تھے۔ جن رسموں پر ہم آج ہنستے ہیں جو رواج ہمیں بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ اُن میں محبت و مروّت کے کیا کیا دفتر پنہاں تھے۔ رسموں کے پردے میں غریبوں کی کتنی دلجوئی اور محتاجوں کی کتنی مدد ہوتی تھی۔ رسموں کے بہانے سے کس طرح غیرت دار غریبوں کے جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر ان کی مدد ہو سکتی تھی۔ مولانا پُرانے وقتوں کے باکمال تھے۔ مشرقی تہذیب ان کی واقفیت بہت گہری تھی۔ ادنیٰ رسم کی معنویت انہیں معلوم تھی۔ دیکھئے ان کے سحر نگار قلم نے شادی کے وقت بہن کا بھائی کے سر پر آنچل ڈال کر لانا جیسی معمولی رسم کو کیسا پیارا کیسا محبت انگیز کتنا مصلحتوں سے بھرا ہوا دکھایا ہے فرماتے ہیں :-

"ماں باپ کو اس سے زیادہ عمر میں کون سی خوشی ہوگی کہ بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہے کیا یہ ضروری نہیں ہے۔ وہ اس خوشی میں بیٹی داماد کو بھی شریک کریں۔ کیونکہ شرکت وہ کس طرح لازمی و ضروری تو کر ہی نہ سکتے تھے ہاں یہ رسم مقرر کر دی کہ بہن بھائی کے سر پر آنچل ڈالے اور بہنوئی دُولہا بنائے تاکہ داماد اس شرکت کو معمولی بات نہ سمجھے۔ کچھ دور رسموں کا بھی بڑے اب اگر داماد کا اس شرکت میں کچھ خرچ ہوا ہے۔ وہ دُور سے آیا ہے تو اس کا نیگ بھی مقرر کر دیا کہ ماں باپ دیکھ کر بیٹی داماد کا کیا اُٹھا اس رقم کو نہ صرف اُدا کریں۔ بلکہ موقع ہو اس بہانہ سے سلوک کریں۔ دُوسری بات اور سوچو کہ دُولہا گھر میں آیا۔ وہ دولہا کی حیثیت سے تمہاری رائے میں ہشاش بشاش ہوگا۔ مگر ہماری مانے میں اس کی حیثیت میں شرم و حیا بھی ہے کہ بڑی بوڑھیوں کے سامنے دندناتا ہوا داخل ہو گیا وہ اگر تنہا ہوگا۔ تو اس کا حجاب اور ترقی کرے گا۔ اس لئے دروازے ہی پر ہمارے کی کئی بہنیں اس کی شرم میں شریک ہو کر اس کے حجاب کو دفع کریں ایک تیسری بات اور ہے۔ دولہا اس سے

پہلے گھر میں نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دولہا بے ضرورت ہے کہ اس کا استقبال بھی کیا جائے۔ گھر کا رستہ بھی بتایا جائے۔ دلہن والیاں اس وقت سامنے آ نہیں سکتیں۔ کیا معقول تدبیر نہیں کہ خود بہنیں ہی اس سلسلہ میں اس کام کو انجام دے رہی ہیں۔ یہ کیسی تھی بات جو ہے کچھ ضرور تھیں ایسی آنکھ کہ چھپکے سے کہتی ہیں اکیلے ہر اینٹیں کرتی ہیں۔ کیا اس وقت کا نا پھوسی کرنی بدتہذیبی نہیں۔ آنچل کے بہانے سے یہ ضرورت پوری ہو گئی۔

عصمت میں میاں عمر کی بکماس تک کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں پرانے زمانے کے ایک گیت کی تشریح بیان فرمائی ہے یہ گیت شادی کا ہے۔ اور یوں شروع ہوتا ہے:-

" بنا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیا ری بیلی ات دولہا کے داخل ہوتے ہی جو اس کے کان میں پڑتی ہے۔ وہ کس قدر خوشگوار ہے۔

"بنا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیا ری بنا"

دل کو عمر بھر ان الفاظ کی لاج رکھنی ہے۔ ماں کے قدموں میں گرا۔ باپ کی چھاتی سے لگا بہنوں کے آنچل تلے کھیلتا آیا ری بنا خدا نے جو یہ خوشی کی گھڑی دکھائی کہ وہ گوشت کا لوتھڑا جو مکھی اڑانے کے قابل بھی نہ تھا آج اس لائق ہوا کہ دولہا بنے اور جوان ہو کر سب سے پہلے ان قدموں میں گرتا ہے جو جنت ہیں اس کے بعد باپ کی چھاتی سے لگتا ہے"

" کیا اس تخیل کی جس میں حفظ مراتب کا اس قدر اچھا لحاظ رکھا گیا داد نہ دو گے؟"

بہن بھائیوں کے جوشِ محبت کو قرار دینے کے علاوہ دورِ جہالت کی اس رسم میں خاص مصلحت یہ تھی کہ سخت گرمی کا موسم ہے دولہا گھٹنوں سے کپڑے پہنے جکڑا بیٹھا ہے۔ بہنوں کے آنچل چھتری کا کام دیں گے اور دھوپ کی زحمت سے محفوظ رہے گا۔"

ڈاکٹر شائستہ سہروردی ________ عصمت جولائی [illegible]

" مولانا مشرقیت اور اسلامیت کے علمبردار تھے وہ مغرب کے علوم حاصل کرنے کے حامی تھے۔ لیکن مغربی تمدن و معاشرت کو مسلمان عورتوں کے لئے مہلک خیال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں مشرقیت و مغربیت کے درمیان تفاوت کو جا بجا روشن کیا ہے۔ وہ مشرقی اخلاق و شرافت، حفظِ مراتب، پابندی دین، شرم و حیا غریب پروری اور عفو و کرم کے معلم تھے۔ آج کل کے مشرقیوں کی ضعیف الاعتقادی، اوہام پرستی، جہالت بے باک آزادی اور رنگین گی کے سخت دشمن تھے۔ انہوں نے نہ صرف عورت کو جہالت و مظلومی سے نجات دلانے کی کوشش کی بلکہ نہایت شدت کے ساتھ مردوں کو بھی وہ فرائض یاد دلائے جو مشرقیت و اسلامیت کی رو سے ان پر عائد ہوتے تھے"

مولانا عبدالمجید سالک ________ چٹان لاہور [illegible]

" جذبات نگاری، منظر کشی، لطافت زبان اور زورِ بیان، الفاظ کم، معانی زیادہ، سوسائٹی کی کمزوریاں اور عورت پر مظالم گنانے میں کسی جگہ نفسیاتی حقائق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ لیکن عورت کی یہ وکالت اس لئے نہیں ہے کہ وہ آزاد اور بے قید ہو جائے۔ بلکہ انہوں نے ان میں حوصلہ، عزم، جفاکشی ضبط و تحمل علم و عمل، اطاعت اور پابندی مذہب کی

مخالفت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشرقی تہذیب کے
مقابلے میں مغربی تہذیب کو کبھی نہیں سراہا۔ عورتوں کی
تعلیم کے ساتھ صحیح تربیت پر خاص زور دیتے رہے اور
اس کو کبھی پسند نہیں کیا کہ مسلمان عورتیں میم صاحب
بن جائیں۔"

روزنامہ احسان کراچی ——— ۴ فروری ۱۹۵۱ء

"میرا خیال ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے
مغربیت کا جو سیل ہندوستانی سماج پر سے گزرا ہے
اگر مولانا راشد الخیری ہمیں نہ بتاتے تو اس سیل کی تباہی
میں ہم اپنے پچاس برس پہلے تک کی سماج کی تصویر یعنی
اپنی تہذیب و تمدن کے روشن پہلوؤں کو یکسر بھلا
بیٹھتے۔ علامہ نے ہمیں اپنا ادبی آئینہ دے کر یہ سامان
مہیا کر دیا ہے کہ کبھی کبھی اپنی "دولت از دست رفتہ"
کا ماتم کر لیا کریں۔"

ل احمد اکبرآبادی ——— عصمت فروری ۱۹۳۸ء

"جوہر قدامت میں لکھتے ہیں:-
"اور وقت کی پوری رَو۔ حکومت کا زبردست اثر،
مغربیت ہر ذی روح اور غیر ذی روح، شخص اور
شے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ حد یہ کہ زمین کی پیداوار اور
ہَوا کا کرہ بھی اسی رنگ میں شرابور تھا۔ اس ہلاہل
کا اثر اتنا ترقی کر گیا تھا کہ زمین میں سے پھول اُگتا
تھا تو خوشبو سے محروم اور ہَوا میں طائر چہکتا تھا
تو نغمے سے پاک۔"

آخری فقرے کے الفاظ اور ان کے مفہوم پر غور کیجیے
"پھول اُگتا تو خوشبو سے محروم اور ہَوا میں طائر چہکتا
تو نغمے سے پاک" کس اعجاز بیان سے مغربی تہذیب کی
جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کا خاکہ اڑایا ہے۔"

مولانا حامد علی خاں ——— ساقی راشد الخیری نمبر

"مولانا اگرچہ عورتوں کی آزادی اور بہتری کے
طالب تھے۔ مگر ان کو یہ کسی طرح پسند نہ تھا کہ ہندوستانی
خصوصاً مسلمان عورتیں مغربی رنگ میں رنگ جائیں۔
بایں ہمہ وہ یورپین تہذیب و تمدن کی خوبیوں اور اچھی
باتوں کے اختیار کرنے کے خلاف نہیں تھے۔ وہ خلاف
تھے۔ عورت و مرد کے ایسے اختلاط کے جن میں دیکھنے والا
ان دونوں میں تمیز نہ کر سکے۔ وہ خلاف تھے ضرورت سے
زیادہ مصنوعی تزئین جمال کے۔ وہ خلاف تھے عورتوں
کی برہنگی کی حد تک پہنچنے والے نیم عریاں لباس اور اس
قسم کی دوسری چیزوں کے۔ انہوں نے تعلیم نسواں پر
بے حد زور دیا اور مسلمان عورت کو پردے کی قید اور
دیگر غیر شرعی پابندیوں سے آزاد کرنے کی عملی امکانی
جدوجہد کی۔ انہوں نے غیر اسلامی رواج و روایات
کے خلاف بھی صدا بلند کی جو مسلمانوں کے لیے مضر
ثابت ہو رہی ہے۔ وہ جھوٹے پیروں اور مولویوں
کے بھی سخت خلاف تھے۔"

ضیاء الدین احمد برنی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"علامہ نے ایک اور چیز جس کے خلاف جہاد کیا
وہ جدید فیشن یا مغرب پرستی کی اندھا دھند تقلید تھی۔
جس طرح اکبر نے مغربیت کا مذاق اڑا کر مغربی سیلاب
کو مردوں میں تیزی سے پھیلنے سے روکا اسی طرح علامہ
مرحوم نے عورتوں کو اس مسموم اور گندی ہوا سے
دور رہنے کی ترغیب دی۔"

محمد احمد سبزواری ایم اے ——— عصمت فروری ۱۹۳۹ء

"راشد الخیری پر تنقید کرنے سے پہلے ہمیں لازم ہے
کہ ہم ان کے زمانے کو پیش نظر رکھیں۔ اُن کے زمانے
میں جو آئیڈیل عورت ہو سکتی تھی اسے انہوں نے اپنے

ناولوں میں پیش کر دیا۔ لیکن تہذیبی قدریں کوئی جامد
نہیں۔ ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں ...... راشد الخیری
معاشرت میں اصلاح چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے
تھے کہ قدیم معاشرت کی اچھی چیزیں ختم ہو جائیں۔ وہ
یہ بات سمجھتے تھے کہ نہ ہر قدیم طریقہ اچھا ہے اور نہ ہر
جدید بُری ہے"

ابو الحسن نغمی ———— امروز کراچی ۱۴ فروری ۱۹۶۳ء

"مغربیت کا سیلاب بہت تیزی سے بڑھتا
آرہا تھا جس کے زیر اثر عورتوں میں فیشن پرستی اور
اس طرح گمراہ کن باتیں گھر کرنے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ
جو فیشن پرستی مغربیت سکھاتی ہے اس کو ہمارا سماجی
نظام برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے ہماری
تہذیب اخلاق اور معاشرت کی بنیادیں ہل جانیکا
اندیشہ ہے۔ چنانچہ علامہ مغربیت اور فیشن پرستی کے
مخالف تھے اور خواتین کے لئے ان کو بے حد مضر اور
نقصان دہ خیال کرتے تھے۔ انہیں خیالات کے پیش
نظر انہوں نے خواتین کے دامن کو ان تحریکوں سے بچانے
کی کوشش کی .... وہ ہندوستان کی ہر مسلمان عورت
کو اسلام کی صحیح سپرٹ سے واقف کرانا اور اس کے
زریں اصولوں پر عمل کرانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر
کوئی عورت بھی زندگی میں صحیح راستہ نہیں چل سکتی....
اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قدامت پرست اور تنگ نظر
ہیں ان کے نزدیک جدت پسندی بھی بری چیز نہیں لیکن
صنف نازک کے لئے ایسی جدت پسندی جو ان کی روایات
کا خون کر دے اور ان کے نظام حیات کے شیرازے کو
بکھیر دے اُن کو نہیں بھاتی ..... لیکن اگر حالات
بدلیں زندگی کوئی نئی کروٹ لے اور کوئی ایسی ہی بات
آن پڑے تو وہ زندگی کی کشمکش میں صنف نازک کو مردوں
کے دوش بدوش بھی لاکر کھڑا کر سکتے ہیں۔

علامہ راشد الخیری نے صنفِ نازک کا جو تصور
پیش کیا ہے وہ اپنے ماحول کے اعتبار سے بے حد شائستہ
اور صحت مند ہے۔ اس میں انتہا پسندی کو دخل ہے نہ
قدامت پرستی کو۔ ان کا راستہ اعتدال کا راستہ ہے
نہ وہ بہت زیادہ ترقی پسند ہیں نہ زیادہ رجعت پسند
بلکہ اعتدال کے راستے پر چل کر وہ صنف نازک کو سماج
کے لئے زیادہ مفید اور انسانی زندگی کے لئے زیادہ اہم
ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی زبوں حالی پر کڑھتے
بھی ہیں اس کی پامالی اور کس مپرسی پر خون کے آنسو
بھی بہاتے ہیں"

ڈاکٹر عبادت بریلوی ———— عصمت نومبر ۱۹۶۲ء

"انہوں نے پرانی تہذیب کے مٹنے پر
اظہار افسوس کرنے اور قدیم رسوم کے جوہر پنہاں پر روشنی
ڈالنے کے ساتھ ساتھ نئے دور کی خوبیوں کو ہمیشہ بنظر
توصیف دیکھا اور بیسویں صدی کے آغاز میں تعلیم نسواں
کا جو غلغلہ بلند ہوا اس کو انہوں نے صدائے مستحسن قرار
دیا۔ چنانچہ جوہر قدامت میں لکھتے ہیں:۔

"تعلیم نسواں کا غلغلہ ہر دربار سے بلند ہوا۔ اور
مشرقی قوم کی صدائیں ذرے ذرے سے اونچی ہوئیں
کوشش معقول اور صدا مستحسن تھی۔ کاش دائرہ مذہب
کے اندر اور اصول تعلیم سے وابستہ ہوتی"

صاف ظاہر ہے ان کی جدوجہد نئی تہذیب کے خلاف
نہیں بلکہ اس کے تخریبی اثرات کے خلاف تھی۔ اقبال
کی طرح ان کے نزدیک بھی مسلمانوں کی پستی کا سبب انکا مذہب سے انحراف تھا۔

مشیر فاطمہ عبیدی بدایونی ———— عصمت فروری ۱۹۶۳ء

سلطانِ غوری علامہ راشد الخیری

"عنانِ اقتدار سنبھالنے والے فرنگیوں کی تہذیب
کی تقلید کو ہندوستانیوں نے اپنے لئے باعثِ فخر سمجھا
قوم کے چند دانش وروں نے اس طوفان کا مقابلہ چٹان
بن کر کیا۔ چٹان جو سمندروں کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ اور
زمین کی قسمت بدل دیتی ہے۔ علامہ راشد الخیری
دانش وروں میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ اُنہوں نے
اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اپنی تحریر کے ذریعہ ہندوستانیوں
خصوصاً مسلمانانِ ہند کو فرنگی تہذیب کی تقلید سے
باز رکھنے کی کوشش کی"

عقیل دانش ——— انجام کراچی ۵ فروری ۱۹۶۳ء

"جناب مولانا راشد الخیری ہندوستانی تہذیب
کی عمارت کی وہ مضبوط اینٹ تھے جس کے نکل جانے
سے تمام منزل کے گر جانے کا احتمال ہو رہا ہے۔ پرانی
وضعداری اور مشرقی رنگ کے علاوہ۔ ہندوستانی
تمدن کے پرستار اور خوددار بزرگ تھے۔ وہ جانتے تھے
کہ مغربی تمدن کا سیلاب کچھ عرصہ بعد ہندوستانی تہذیب
کو تہ و بالا کر دے گا۔ لیکن وہ اپنی زندگی کو آخری گھڑی
تک ایک نہایت مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ
قائم رہے"

لالہ جگ جیون لال بھٹناگر ——— عصمت اگست ۱۹۳۶ء

۶ - دردانگیزی

علامہ مغفور کی تحریر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے
کہ دردوغم ان کی اکثر و بیشتر تصانیف میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے
اردو نثر میں غم نگاری کے وہ بانی ہیں۔ اس خصوصیت پر ان کی
ادبی حیثیتوں میں مفصل بحث ہے۔

(ب) ادبی حیثیتیں

حضرت علامہ راشد الخیری پاکستان اور بھارت کی خواتین کے محسنِ اعظم اور اُردو زبان کے جامع حیثیات
باکمال ادیب تھے۔ آزاد کی انشاء پردازی، شبلی کی سیرۃ نویسی، انیس کی جذبات نگاری، حالی کی قومی
شاعری یہ سب صفات ان کی تحریر میں موجود ہیں۔ اُن کا قلم نذیر احمد کا قلم اور ان کا دماغ سرسید
کا دماغ تھا۔ ان کی زبان قلعہ معلیٰ کی زبان اور ان کا دل رسولِ عربی کے مبارک نام پر قربان ہونے والے
ایک سچے مسلمان کا دل تھا۔

اُن کا ادب محض دل بہلانے کے لئے نہیں ہے۔ ان کا ادب مقصدی ادب ہے۔ اور بڑا مقصد
ہے اصلاحِ معاشرت اور درستی اخلاق۔ اور اس کے لئے وہ کبھی غم نگار ہیں۔ کبھی سنجیدہ ظرافت
نگار۔ کبھی مورخ ہیں کبھی سیرۃ نویس۔ کبھی انشاء پرداز کبھی شاعر۔ کبھی مبلغِ اسلام ہیں، تو
کبھی اڈیٹر۔

۱ - غم نگار

اصلاحِ معاشرت کے دو طریقے ہیں۔ طعن آمیز جیسا کہ برنارڈ شاہ کا سٹائل ہے۔ اور دردانگیز جیسا
کہ ماسور غم کا اسلوب بیان۔

قوم نے انہیں مصورِ غم کا خطاب دیا تھا اُردو نثر کے وہ پہلے غم نگار ہیں۔ وہ الفاظ میں رنج و غم کی تصویر کھینچنے میں کمال رکھتے تھے۔ اگر پروفیسر ہڈسن کی تعریف کے مطابق ٹریجڈی خوفناک احساسات کا مرقع ہے تو مصورِ غم کے تمام غم انجام ناول اور افسانے مشرقی لٹریچر میں بے مثال ہیں۔ اگر ٹریجڈی کی خصوصیت یہ ہے کہ جبر و تشدد ظلم و ستم سے پڑھنے والے کو نفرت ہو جائے اور ہمدردی کی پاکیزہ جذبہ اُبھرے تو علامہ مغفور کی ٹریجڈی غیر فانی ہے۔ ان کے غم انگیز اور غم انجام مضامین اور افسانے انسانی جذبات کی اس قدر صحیح ترجمانی کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کی آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری ہو جاتا ہے۔ شیکسپیر کے مشہور ڈراموں ہیملٹ اور میکبتھ میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں کہ دل بھر آتا ہے۔ کنگ لیئر میں جس وقت بدنصیب بادشاہ ناہنجار بیٹی سے کہتا ہے، کورڈیلیا کورڈیلیا STAY a LITTLE تو یہ حسرت بھرے الفاظ دل کے پار ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے بے شمار فقرے مصورِ غم کی تصانیف میں ملیں گے جو دل میں تیر کی طرح اُتر جاتے اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

صبح زندگی کے صفحہ ۲۷ پر ناشاد و نامراد ماں کا یہ فقرہ :۔

"ہائے آپا اُٹھو! میری بیگم کو جنگل میں سُلا دو"

صفحہ ۱۶۱ پر بیٹی کے یہ الفاظ :۔

"ابا جان لونڈی سے کچھ خدمت نہ ہو سکی"

شام زندگی صفحہ ۱۱ پر

"چچی جان بیٹے تو نہیں مارا"

نسیمہ کا شوہر سے یہ کہنا :۔

"میری زندگی کی تمام بہاریں تمہارے دم سے ہیں"

شب زندگی حصہ دوم آخری باب میں فاطمہ کے باپ کے یہ الفاظ :۔

"تو نے تو آج تک احسان کو مرد ذہن میں نہ سُلایا اور میری بچی ڈھونڈ ڈھونڈ کر گھر سے تنہا سوئی"

طوفانِ حیات میں مظلوم بچی کی منت سماجت

"ابھی میری بالیاں نہ لو"

سیلابِ اشک میں بے قصور بچی کا جو دوپہر کو سوتیلی ماں کی شرارت سے ظالم باپ کے ہاتھوں پٹ چکی ہے آدھی رات گئے آنکھ پر انگلی رکھ کر باپ کے سوال کے جواب میں رونے کا سبب اس طرح بتانا :۔

"ابا جان یاں ندر کا درد ہو رہا ہے"

خدائی راج کے افسانہ "خدا فراموش" کی آخری سطریں کہ مجن کے پھٹے ہوئے کرتے میں بازو کا نیل پک گیا تھا یہ دیکھ کر سلیمان بلبلا کر آگے بڑھا تو مجن کا یہ کہہ کر بھاگنا

"ابھی نہیں۔ میں ڈولی نہیں چڑھوں گا"

الفاظ نہیں تیر ہیں جو کلیجہ کے پار ہو جاتے ہیں!

وہ قوم کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھتے اور جگ بیتی کو آپ بیتی تصور فرماتے تھے۔ ان کے آنسوؤں کی تحریر میں جذب ہو کر پڑھنے والوں کو تڑپا دیتے تھے۔ قلبِ حزیں میں مشرقی بیوی کے متعلق جس کا سہاگ اُجڑ چکا تحریر فرماتے ہیں :۔

"مغربی نغمہ کی گونج ابھی تمہارے کان میں ہوگی کہ مرگیا سو مرگیا۔ مشرقی بیوی کا کہرام دیکھو شوہر کی موت اس سے کیا کیا لے گئی۔ نازک ہاتھ سونے سے رہ گئے۔ ان کی چوڑیاں کہاں گئیں؟ رنگین کپڑا ختم ہوا۔ سُرمہ کاجل کدھر گیا؟ یہ سب صرف ایک دم سے تھا

اس کی مسکراہٹ پر نہ جاؤ۔ اس کا دل رو رہا ہے۔ اس کی
خاموشی نہ سمجھو۔ اس کے کلیجے میں آگ سُلگ رہی ہے
یہ عورت نہیں ہے اس کی نسوانیت ختم ہو گئی۔ یہ بیوی
نہیں ہے اس کی قسمت بگڑ گئی۔ یہ جب دُلہن تھی سہاگن
تھی۔ سب کچھ تھی مگر آج رانڈ بیوہ ہے۔ کچھ نہیں ہے"
"یہ وہی آنکھیں ہیں جن میں کاجل ہوتا تھا۔ یہ وہی دل
ہے جس میں محبت رہتی تھی۔ اس وقت قصرِ حیات کے
دونوں ستون اُجڑ گئے۔ آنکھیں ناکامی کی تسبیح
پڑھتی ہیں۔ اور دل ہائے ہائے کے نعرے لگاتا ہے"

"سیدہ کا لال" تاریخ شہادت جذبات نگاری
اور حزنیہ ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ میدانِ کربلا میں حضرت
زینب بنت علی کے جگر پارے رَن کی اجازت لیتے ہیں:۔

"جس وقت دونوں بچے خیمے کے دروازے پر پہنچ کر ماں کے
آخری سلام کو جھکے تو دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ مگر
ضبط سے کام لے کر ان کے سر پر ہاتھ رکھا گلے سے لگا کر
پیار کیا اور کہا "دنیا کی مائیں بچوں کو پردیس سدھارتے
وقت دعا دیتی ہیں کہ جس طرح پیٹھ دکھائی اسی طرح مُنہ
دکھاؤ۔ مگر عون و محمد کی ماں یہ کہتی ہے کہ جاؤ۔ زندہ
جاؤ اور شہید ہو کر آؤ۔ سر لے کر جاؤ اور سر کٹا کر آؤ"

حضرت علی اکبر کی روانگی کا وقت ہے۔ پھوپی
یعنی بی بی زینب جنہوں نے ان کی پرورش کی تھی بھاوج
سے کہتی ہیں:۔

"لو بیوی یہ اپنے بچے کے بتیس [۳۲] کے بتیس [۳۲] معدودہ کے
دانت گن لو ان موتیوں کو روز آنکھوں سے لگاتی تھی
جب سے اللہ رکھے سیانا ہوا پیار کرتے شرم آتی تھی
تنہائی میں ان دانتوں کو آنکھوں سے لگا لیتی تھی"

نوبت پنج روزہ میں سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار
بہادر شاہ ظفر کے پانچ جشن دکھاتے ہیں۔ آخری نوبت
یعنی شاہجہاں آباد سے بادشاہ کی وداع درد انگیزی
اور غم نگاری کے اعتبار سے ہمارے ادب میں نہایت
بلند درجہ رکھتی ہے۔ ہجوم افکار پیہم مصائب، متواتر
صدمات ضعیف العمر بادشاہ کو جیتے جی موت کا مزہ
چکھا دیتے ہیں۔ اِدھر گرفتاری اُدھر بچوں کی موت کی
خبریں۔ بلبلا کر بادشاہ بیگم سے کہتے ہیں:۔

"اے بیگم میرے چاند سے ٹکڑے بے گور و کفن پڑے
جنگل میں سو رہے ہیں۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا نہیں
کہ ان کا مُنہ دُھلا کر کپڑے بدل دے۔ بالشت بھر
کے لوتھڑوں کو ان ہاتھوں میں اسی دن کو جوان کیا
تھا کہ ان کی موت پر کوئی آنسو تک گرانے والا نہ ہو۔
چیل کوّے پھول سے لالوں کو نوچیں۔ کتے ان کو
بھنبھوڑیں۔ میں سنوں اور زندہ رہوں دیکھوں اور
اُف نہ کر سکوں۔ آسمان ٹوٹ پڑتا یا زمین پھٹ جاتی۔
اس سے پہلے کہ میرے چاند گہناتے میرے پھول
مرجھاتے اور میرے بچے دُنیا سے رُخصت ہوتے۔
وہی دُنیا جو کل تک میری تھی اس وقت میری دشمن
ہے جنہوں نے تمام عمر نمک کھایا۔ آج اُنہوں نے میرے
لال پھانسی پر لٹکوائے۔ زینت محل میں زندہ ہوں
اور میرے پیاروں کی لاشیں پھانسی پر لٹک رہی ہیں
بڑے دادا جان نے شاہجہاں آباد اسی دن کو آباد کیا
تھا کہ میری اولاد بھوکی پیاسی اس سرزمین پر
دم توڑے"

شیکسپیر کے ڈراموں۔ ہارڈی کے ناولوں، کیٹس
اور شیلی کی نظموں پر اور چیخوف اور بالزک کے افسانوں
پر ہماری آنکھیں نمناک ہو جائیں مگر مصور غم ہمارے

...ن گرد و پیش کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے
...لا کر نہیں تڑپا تڑپا کر رلاتے اور دل کی دُنیا میں ایک
...طوفان برپا کر دیتے ہیں۔

ان کی بعض کتابوں میں آٹھ آٹھ دس دس مقامات ایسے
...ہیں کہ کوئی سنگدل سے سنگدل انسان بھی آب
...دیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور عورتوں کو تو بینے
...مولانا کی کتابیں پڑھ کر بے اختیار چیخیں مار مار کر رونے
...دیکھا ہے۔ وہ حقیقتاً مصور غم ہیں۔ اور اس کی وجہ
...یہ ہے ان کی طبعی و خلقی درد مندی ادب کی تخلیق میں ہر
...وقت ان کے شامل حال رہتی ہے۔ اور زبان اردو
ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ پھر جب انداز فکر اور اسلوب
بیان دونوں میں خلوص بھی ہو اور کمال بھی تو اثر و
تاثیر اس امتزاج کا طبعی نتیجہ ہے"

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم ———— اخبار جنگ کراچی فروری ۵۵ء

" مولانا راشد مرحوم ہر چند ڈراما نویس نہ تھے
لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے ادیبوں میں وہ تنہا
حزنیہ نگار تھے اور فنی اعتبار سے حزنیہ نگاری ان کی
برترین ادبی خصوصیت ہے۔ میرے بعض دوستوں کا
خیال ہے مولانا کی انشا میں مبالغہ بہت ہے اس لئے
وہ حقیقت اور واقعیت سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ ظاہر
ہے یہ معترض حزنیہ کے مقصود کو نہیں سمجھے ہیں اور
میں چاہتا تھا کہ حزنیہ نگاری کے جو اصول ارسطو نے
مقرر کئے ہیں ان کے معیار پر مولانا کی حزنیہ نگاری کو
جانچوں۔ لیکن اس وقت میرے سامنے مولانا کا وہ
ادب نہیں ہے۔ بہر حال میں ان حضرات کی خدمت میں عرض
کرنا چاہتا ہوں کہ حزنیہ کے لئے مبالغہ لازمی ہے ورنہ
اس کا مقصد پورا نہ ہو سکے گا اور ان کا یہ اعتراض فنی
حیثیت سے کوئی وزن نہیں رکھتا"

ل احمد اکبر آبادی ———— عصمت فروری ۳۶ء

" مولانا راشد الخیری مرحوم کی اس وقت سات
کتابیں میرے سامنے ہیں۔ اور اگر مجھ سے پوچھا جائے
کہ ان میں سے کس کتاب کو میں سب سے بہتر سمجھتا ہوں تو میں اس کا
کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ مولانا مرحوم کا وہ درد و سوز
جو عورت کی دُنیا کے لئے وقف تھا ان کی ہر تصنیف
میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ اور اس طبقہ کی اصلاح
کے لئے جن آنسوؤں سے وہ روئے ہیں ان سے
ان کی کوئی کتاب خالی نہیں"

مولانا نیاز فتح پوری ———— عصمت فروری ۳۹ء

" علامہ راشد الخیری کے دل میں قوم کا درد کوٹ
کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس درد میں اُن کا وہ خلوص
بھی شریک ہو گیا جو ایک سچے فن کار کی عظمت کا
نشان ہے اور ان دونوں عناصر نے مل کر ان کی تحریر میں
بلا کا درد پیدا کر دیا۔ اُن کے انداز میں اندوہ اس طرح
پیدا ہو گیا کہ علامہ مصور غم کہلائے۔ لیکن ان کا یہ
غم ہمیں قنوطیت کی طرف نہیں لے جاتا۔ بلکہ عزم و
ہمت کی راہ کا چراغ بن جاتا ہے"

عقیل دانش ———— (انجام کراچی ۵ فروری ۵۲ء)

" انسانی درد و مصیبت کا مرقع کھینچ کر سنگدل
سے سنگدل پڑھنے والے کو بھی بے اختیار اشکبار کر دینے
کا جو سلیقہ قدرت نے اس شیوہ بیان اور بے مثال
انشا پرداز کو ودیعت کیا تھا اس کی مثال اردو زبان
کی تاریخ میں مفقود ہے"

اخبار انقلاب لاہور ———— ۷ فروری ۳۶ء

" مولانا راشد الخیری کا غم انگیز طرزِ تحریر پتھر کو بھی پانی کر دیتا تھا "

مدینہ بجنور ——— ۵ فروری ۱۹۳۶ء

" مصورِ غم علامہ راشد الخیری بلند پایہ انشا پرداز تھے جنہوں نے عورت کی قابلِ رحم حالت کے نہایت پُردرد نقشے کھینچے ہیں۔ ان کا طرزِ بیان اتنا دردناک ہے کہ دل قابو سے نکل جاتا ہے اور ان کے الفاظ ایسے پُر اثر ہیں کہ آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں"

سندھی اخبار ہلال پاکستان

حیدر آباد سندھ ——— ۴ فروری ۱۹۵۱ء

" مولانا راشد الخیری نے جو اہم خدمت انجام دینے کی ذمہ داری قبول کی تھی اس میں کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ ایک مخصوص طرز استعمال کرتے اور اس کے لئے حزنیہ تحریر سے بہتر اور کون سی تحریر ہو سکتی ہے۔ حامد اللہ افسر میرٹھی اور اسی قماش کے بعض دیگر معترین نے اپنے ہی قلم سے اپنی تعریف کرتے ہوئے (دیکھئے دیباچہ ڈالی کا جوگ) مولانا کے طرز تحریر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہر جگہ حزن نگار بننے کے لئے صد درجہ غلو سے کام لیا ہے'' مگر قصۂ غم کے مقابلہ میں مزاحیہ تحریر کا اثر دیرپا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مولانا کی حزنیہ داستانوں نے ایسا کامیاب اثر کیا ہے کہ خواتین اسلام خوابِ غفلت سے چونک پڑیں ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ کیا ہیں اور ان کے ساتھ شرعاً کیسا سلوک ہونا چاہیئے اور روا جاً کیسا سلوک ہو رہا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ نے بالکل سچ کہا ہے کہ "غم کی آگ بہت جلد سُلگتی ہے۔ اور بہت دیر تک جلتی ہے۔ اس کے برخلاف خوش مزاقی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ہے کہ آیا اور نکل گیا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غم کا احساس ہونے کے بعد انسان غم پیدا کرنے والے اسباب کو قلع قمع کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔ مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر کے ان کے سدِّباب کرنے کی جدوجہد کرتا ہے اسی وجہ سے مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں کی بنیاد غم پر رکھی تھی تاکہ عورتوں کو غم کا احساس ہو۔ وہ اپنے حقوق کو پامال ہوتا دیکھ کر خاموش نہ بیٹھی رہیں۔ بلکہ مصیبتوں اور ظلموں کا مقابلہ کر کے ان کا سدِّباب کرنے کے لئے ہاتھ پیر ماریں "

سید محمود مورخ بی اے ——— ساقی راشد الخیری نمبر

" جب زندگی خود ایک المیہ ہو تو صحیح مصوری یہ ہے کہ اسے اسی رنگ میں پیش کیا جائے۔ پھر جب عورت کے معاملے میں مرد اپنے تفوق و برتری کے پندار میں ظلم کی حد تک بے حس بھی ہو تو عورت کی وکالت کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ تصویرِ غم پیش کی جائے۔ اس صنعت میں اُنہوں نے وہ کمال حاصل کیا ہے کہ کوئی دوسرا ہمسری نہ کر سکا۔ وہ مصورِ غم تھے لیکن حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی پوری معاشرت کو اُردو ادب میں سمو دیا ہے۔ ان کی تحریریں آئینہ ہیں جس میں اچھائیاں برائیاں اور غم و مسرت سب اپنی جگہ صاف نمایاں ہیں"

روزنامہ احسان کراچی ——— ۳ فروری ۱۹۵۱ء

" علامہ مرحوم اپنے طرزِ تحریر کے آپ موجد ہیں۔ آپ حزن نگاری کے امام مانے جاتے ہیں۔ اُن کا ہر شہ المیہ ہے جو ہر دور میں یکساں مقبول رہے گا۔ اگر طرز بیان ناصحانہ بھی ہے مگر واعظانہ خشکی نہیں۔ بلکہ اتنا موثر اور دلچسپ انداز ہے کہ قاری کی طبیعت پر ذرا

نہیں ہوتا - یہاں تک کہ ناول ہمیشہ کے لئے
دل و دماغ پر خوش گوار اثرات چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔"
...ل صدیقی بدایونی ——— عصمت فروری ۳۶ء

...کی تحریر صفحے ہیں سراپا جس قلم اکثر
...جس سے زمیں علم و ادب کی آسماں یکسر
...فصاحت جس کے انداز نگارش پر
وہ راشد جس کی نوک کلک برچھی سی چبھوتی تھی
وہ راشد جس کی کلک رو زباں پر خون دل تھی
...دنیا پڑھ کے ہر اک سطر کو بے تاب ہوتی تھی
...موی صدیقی لکھنوی ——— عصمت اگست ۳۶ء

راشد الخیری - تری تحریر میں وہ درد ہے
آج تک دنیا کے لب پر ایک آہ سرد ہے
راشد الخیری مصور غم کا ہے تو لاکھی
تیری تحریروں سے آجاتی ہے آنکھوں میں نمی
راشد الخیری تری تحریر کو پڑھ کر سدا
دیکھنے والے کا آنسو آنکھ میں کب تھم سکا
...نی احمد بریلوی ——— ساقی راشد الخیری نمبر

تھا مصور غم کا تھا - اللہ رے زور قلم
کوئی سا مضموں اٹھا لو چشم ہو جائے گی نم
نغمۂ خون ناب کی اک چھیڑ تھی وہ دم بدم
دل کے ٹکڑے رکھ گیا - کاغذ پہ اس کا زیر و بم
آغا شاعر دہلوی ——— عصمت مارچ ۳۶ء

عظمت ماضی کا جب نوحہ سنا دیتا تھا تو
سننے والوں کو یہ دیکھا ہے، رلا دیتا تھا تو
نہال سیوہاروی ——— عصمت فروری ۳۶ء

خون رو رو کر رلایا سنگ دل افراد کو
تیری آہوں نے تپایا ہے دل فولاد کو
بشیر النسا بیگم حیدر آباد ——— عصمت فروری ۳۶ء

حدیث غم کا مفسر وہ راشد الخیری
بڑائی درد کی دھن جس نے ہر ترانے میں
اک اضطراب سے جس نے دلوں کو گرمایا
نہ چھوڑی کوئی کمی غم کی توڑ جانے میں
رگوں میں نشتر احساس کا دیا چرکا
جگائی غیرت اسلام پھر زمانے میں
جبریل صدیقی ——— انجام کراچی

۲ - سنجیدہ مزاح نگار

مصور غم نفسیات کے ماہر تھے - غم کے جذبات اور تاثرات بیان کرنے کا انہیں جس قدر ملکہ تھا اسی طرح جذبات مسرت کا - وہ خوش طبع بذلہ سنج لطیفہ گو اور زندہ دل انسان تھے - اور طبیعت کی شگفتگی نے چمن ادب میں سنجیدہ ظرافت کے بہترین پھول کھلائے ہیں - نانی عشو - ولایتی کنگھی اور دادا لال بجھکڑ مستقل مزاحیہ افسانے ہیں - منازل السائرہ طرز بیان کی شگفتگی اور واقعات کی دلچسپی کے اعتبار سے اردو کے بہترین معاشرتی ناولوں میں سے ہے - سائرہ کی زندگی کے مختلف واقعات مثلاً افیم کا واقعہ - کاچھن سے لڑائی - مولود شریف کی مٹھائی کا حشر - چھالیہ کی تقسیم - سنجیدہ ظرافت کے بہترین نمونے ہیں - طوفان حیات - سات روحوں کے اعمالنامے - ستونتی - نغمۂ شیطانی - بیلہ میں میلہ - تفسیر عصمت - انگوٹھی کا راز - منازل ترقی - جنت و دوزخ - سراب مغرب - اندلس کی شہزادی وغیرہ ناولوں اور

طویل افسانوں کے علاوہ متعدد مختصر افسانوں مثلاً خدائی راج پھیری کا جھولا - بی انجمن - رویائے مقصود میں کئی مواقع ملتے ہیں کہ مصورِ غم کی سنجیدہ ظرافت نگاری کے کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ پھکڑپن اور تہذیب و وقار سے گری ہوئی رکیک اور بے ہودہ بے نتیجہ بھونڈی قسم کی ظرافت اُردو ادب میں نہایت کثرت سے ہے جو اعلیٰ ظرف اور متین طبائع پر بار گزرتی ہے۔ مصورِ غم کی مزاحیہ نگاری بازاری لوگوں کے ناقابلِ برداشت قہقہے نہیں۔ سنجیدہ مسکراہٹ ہے اور کوئی نہ کوئی مقصد اور نتیجہ لئے ہوئے اصلاحی پہلو رکھتی ہے - وہ بظاہر ہلا دل بہلاتے اور ہنساتے ہیں مگر حقیقتاً ہماری جہالت اور مذہب مقدس سے ناواقفیت اور اخلاقی کمزوریوں کی نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ اسلام کو سب سے زیادہ نقصان جاہل مولویوں اور دغاباز پیروں سے پہنچا ہے - اور اس گروہ کو علامہ مغفور نے مزاحیہ افسانوں میں خصوصیت کے ساتھ بے نقاب کیا اور ان مقدس حضرات کی قابلیت کا بھانڈا پھوڑا ہے - دادا لال بجھکڑ کے کیرکٹر کا ایک پہلو اس گفتگو سے معلوم ہوسکتا ہے۔

برقع والی - "دادا آپ کے چوٹ زیادہ آئی ہے؟"

دادا :- ہائے مرا - لاحول ولا سارے بیٹی میری چوٹ کی پرواہ نہ کر - میں تو پیدا ہی قوم کے لئے ہوا ہوں - اسی سے صبح کو نہیں گیا - لاحول ولا - دیکھو آج نماز بھی ایک وقت کی نہیں ہوئی - لاحول ولا بیگم کہاں گئیں - خیر شاید پڑھ رہی ہوں گی - بیٹی میرے کوٹ کی جیب میں سے تسبیح دے دو - ہاتھ لیٹے کچھ اللہ اللہ کر لوں"

برقع والی - "عجیب دیکھو کی جناب اس جیب میں تو تسبیح ہے نہیں - تاش کی گڈی پڑی ہے اور چوسر کی گٹیاں ہیں"

دادا :- ہائیں ہائیں کیا کہا! تاش اور گٹیاں! لاحول ولا - یہ کسی دشمن کا کام ہے" میں اور تاش! لاحول ولا ہائیں میں اور گٹیاں! دشمن اری بیٹی سارا محلہ دشمن ہے - ایسی ذلیل تقدیر ہے جس کا کام کرتا ہوں وہی دشمن ہو جاتا ہے - بیگم صاحب ایک ٹکڑا پان تو دیدو"

نانی :- بیٹے شام سے نہیں کھایا - خالی زردہ پھانک رہی ہوں کوئی لانے والا ہی نہیں"

دادا :- ہائیں ہائیں - لاحول ولا - عید رشید دو بقر عید - بید وچاروں غائب"

اسی کتاب میں حماقت بیگ جو مولوی لیاقت اللہ کہلاتے ہیں - جاہل عورتوں میں وعظ فرما رہے ہیں:-

" باری تالا فرماتے ہیں بیچ کلام پاک اپنے کے اے مسلمان عورتوں جو ایمان لائیں اُوپر ہمارے اور رسول ہمارے کے یاد رکھو موت کو اور وہ اُوپر تمام ہمارے کے اور بڑے پیر کے - پھر اسے اٹھے تر بتر - رہڑی پکے مار اور قورمہ بھنا ہوا - پلاؤ ساتھ شامی کباب کے اور زردہ ساتھ بالائی کے اور دو اُن کو نقدی ساتھ خوشی کے - مرد گروہ عورتوں ساتھ محبت کے - یہ عاشق ہیں بڑے پیر کے رکھلائو انہیں لقمے کھیر کے - بھائی ہیں رسول کے - دوان کو گنڈے پھول کے - نہ بھولو حشر کو کہ ہم نکالیں گے قبر ان میں سے ننگا مردوں اور عورتوں، جوانوں اور حافظوں اور کیڑوں مکوڑوں کو ساتھ غصہ اور قہر کے اور آفت کے - اس روز تم دیکھو گے کچھ عورتیں ساتھ لباس کے اور پوچھو گے اس کے سبب تو ایک فرشتہ جس کا قد ہے ستر ہزار گز کا - پکارے گا بلند آواز کے ساتھ

...ہیں وہ عورتیں جنہوں نے کپڑے بنائے ہیں ...
...سی کے ساتھ عقیدت کے اور خدمت کی سچائی کو
...محبت کے اور نذریں دی ہیں ان کو ساتھ الفت
...ستھری ہنسے ایسے ابھی کچھ نہیں گیا۔ وقت باقی ہے
...ان کچھوؤں سے جن میں سے ہر ایک کے ستر ہزار
...ہیں۔ اور جو ایک ڈنک سے ستر ہزار انسانوں کا
...سر سکتے ہیں۔ وہ تمہارے لئے تیار ہیں۔ وہی آیت
...ہیں فرماتے ہیں کہ اے مولوی لیاقت اللہ خوش خبری
...سنا معلانی آغا اور مرزا صاحب کو جنت کی"

نانی عشو فرما رہی ہیں:۔

"قیامت کے دن اللہ پاک جنت دوزخ کا انتظام کیوں
...کے سپرد کرے گا ایک آدمی اللہ بیچارہ اتنی بڑی دُنیا
کا حساب کتاب اکیلا کیوں کر کر سکتا ہے۔ وہاں کا سارا
کام کاج ہم ہی لوگ کریں گے۔ گیارھویں والے داروغہ
...ہوں گے۔ اجمیری بڑے ابا ہوں گے۔ دلی والے نانا
ہوں گے خالہ رابعہ ہوں گی۔ میں ہوں گی۔ ہم ہی سب
...مل کر تیا پانچا کر دیں گے۔ مگر تم جوتی خوریوں
کی ایسی آنکھیں پھوٹی ہیں کہ کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا
تم سب کو معلوم ہے کہ اللہ پاک آم کے اتنے عاشق
ہیں کہ آم کا سیپارہ تک بنا دیا ہے۔ لیکن تم نامرادو
...خود آم کھاتی ہو۔ بچوں کو کھلاتی ہو۔ مگر میرے
لئے ایک دن بھی نصیب نہیں ہوئے کہ اللہ کو
پہنچ جاتے۔ مردیوں جب قبر میں بیٹھ پھوڑے گا
دوزخ کی دیسی نہریں بہیں گی کہ ابابیلیں تیریں گی
تمہیں کیا شناسا ہو گا کہ تیری ماں بیلا۔ پھر کیوں
اللہ سے نرٹ ہوتی ہو"

اہل قلم کی نظر میں انہیں "مصورِ غم" کا لقب

محض اس لئے دیا گیا کہ ان کی اکثر تصانیف میں عورتوں
کی مظلومی کے زہرہ گداز حالات بیان کئے گئے ہیں۔
لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ صرف غم کے مضمون
ہی لکھتے ہیں۔ اگر صبحِ زندگی، شامِ زندگی، طوفانِ حیات
سودہ، جوہرِ قدامت، طوفانِ اشک، سیلابِ اشک
وغیرہ میں غم کی مصوری کے نقوش اجاگر ہیں تو اندلس
کی شہزادی، یاسمینِ شام، شہنشاہ کا فیصلہ، منظورِ ابلیس،
محبوبۂ خداوند اور تیغِ کمال میں۔ شوکت و عظمت جاہ
و جلال اور تاریخِ اسلام کے محاسن کا تذکرہ بھی موجود
ہے۔ سیدہ کا لال آمنہ کا لال، اور الزہرا خالص مذہبی
رنگ میں شرابور ہیں۔ اور ...... بے خبروں کو
غالباً یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ مولانا کے بہار آفریں قلم
نے سات رُوحوں کے اعمالنامے، ولایتی تمی، اور نانی
عشو میں ظرافت و تفنن کے وہ پھول بکھیرے ہیں کہ
ان کو پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ اسی بزرگ کے کرشمات
خامہ ہیں جنہیں دُنیا مصورِ غم کے لقب سے یاد کرتی ہے"
مولانا عبد المجید سالک مرحوم ——— اخبار چٹان لاہور نومبر ۱۹۵۳ء

" سات رُوحوں کے اعمالنامے میں مرقان اور
جوتے والے کی گفتگو مزاحیہ نگاری میں مولانا کی
قدرتِ حُسن کی شاہد عادل ہے" مرقان "رب الایتھر
کے دربار کی ایک دھتکاری ہوئی رُوح آدمی کی شکل میں
دنیا کے بہترین تحفہ کی تلاش میں ہے۔ ایک عورت
کی رُوح قبض کرنے کے لئے اسے سنکھیا خریدنے کا
مشورہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ دُنیا کے حالات کی ناواقفیت
سنکھیا خریدنے کے لئے اُسے ایک جوتے والے کی دکان
پر لے جاتی ہے۔ جہاں وہ چھوٹتے ہی سوال
کرتا ہے:۔

"آپ کے ہاں سنکھیا ہے؟"
جوتے والا :- کیا چیز جناب؟
مرقان :- "سنکھیا"
جوتے والا :- منوں۔ کتنی لیجئے گا؟
مرقان :- ایک روح کے قابل"
دوکان دار مرقان کو پولیس کے حوالہ کر دیتا ہے۔
وہاں تھانہ دار نے نام دریافت کیا تو سٹ پٹائے کہ کیا کہیں۔ ملک الموت کی رفاقت کے صدقے میں انہیں چند بیماریوں کے نام معلوم تھے۔ بولے
"میرا نام بخار ہے"
تھانہ دار :- بخار۔ بغیر پیٹے باز نہ آئے گا۔ ٹھیک نام بتا"
اتنے میں دفعدار نے تھانہ دار کے ایما سے صحیح نام دریافت کرنے کے لئے مرقان کے گال پر تڑکے سے ایک تھپڑ دیا اور دو گھونسے لگا کر کہا "اپنا نام بتا"
مرقان ..... کھانسی لکھ لیجئے"
اب تھانہ دار آپے سے باہر ہو گیا اور سارے ہنٹروں کے مرقان کی کھال ادھیڑ دی۔
مرقان :- اوہ - آہ - ہے - ہو - میرا نام سنکھیا۔ ایتھر۔ دوزخ آدمی"
تھانہ دار نے تھک کر اسے پھر حوالات میں بند کر دیا۔
مزاح نگاری کی ایک اس سے بہتر مثال حیات صالحہ میں بیوی کی موت کے بعد سید کاظم اور ان کی بہن کی گفتگو میں ملتے ہیں :-
" بھئی اب جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ آخر گھر کا بھی کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گا یا نہیں۔ بغیر بیوی کے کام نہ چلیگا میری تو صلاح ہے نکاح کر لو"

سید کاظم جلے بھن صالحہ کی دھن میں ایسا باؤلا ہو رہا تھا کہ اس کو دنیا وما فیہا کا ہوش نہ تھا۔ بہن کا سمجھانا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا یا تو چلنے کو اٹھ کھڑا ہوا تھا یا جھٹ بیٹھ گیا"
بہن کی گفتگو اور اس "جھٹ بیٹھ گیا" کے فقرے میں مولانا کی نفسیاتی دقت نظر ملاحظہ فرمایئے اس کے بعد اس نقطۂ خیال سے سید کاظم کا جواب :-
" کیا کروں میرا دل برداشت نہیں کر سکتا کہ صالحہ کی ماں مر جائے اور میں دوسرا نکاح کر کے ان بچوں کو ایک غیر عورت کا دست نگر بنا دوں۔ یہ سچ ہے کہ مجھ کو آرام پہنچے گا۔ میرے کھانے کا۔ پینے کا۔ کپڑے کا لتے کا۔ آنے کا جانے کا۔ حساب کا کتاب کا لینے کا دینے کا ٹھیک ہو جائے گا مگر اب گھر میرا نہیں ان بچوں کا ہے"
ذرا ملاحظہ فرمایئے کاظم صاحب نکاح سے بظاہر انکار فرما رہے ہیں لیکن " یہ کھانے کا۔ آنے کا۔ جانے کا حساب کا کتاب کا اور معلوم نہیں کیا کیا کا" کی پڑی ہوئی ان کی زیر شعور نفسیاتی کیفیت کا بھانڈا کس بھونڈے پن سے پھوڑ رہی ہے۔
مولانا اگرچہ مصور غم اور عورتوں کے دردِ دل کے ترجمان تھے لیکن وہ کوئی مرگ فروش قنوطی نہ تھے۔ ان کی تحریروں میں جا بجا بذلہ سنجی خوش طبعی اور زندہ دلی کے غنچے چٹکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں"
مولانا حامد علی خاں ——— ساقی ستمبر ۳۶ء
" علامہ راشد الخیری کی ظرافت نگاری اور مزاح نگاری کا مرکز چند خاص قسم کے کردار ہیں۔ ان کرداروں کو انہوں نے اپنی ساری عجیب و غریب خصوصیات

کے ساتھ ہمارے سامنے جیتا جاگتا لاکر کھڑا کر دیا ہے۔
ان کی صورت و سیرت نے ہمیں ہنسایا ہے اور فطرت
اور اتفاق کی اس ستم ظریفی نے بھی جو ان چند کرداروں
سے مخصوص سی ہو گئی ہے۔

سب سے پہلے مختصر سے لفظوں میں اس کردار
سے تعارف ہم سے کرایا جاتا ہے اور اس مختصر سے تعارف
کے بعد ہی ہم آنے والے دلچسپ موقعوں کا بے قراری سے
انتظار کرنے لگتے ہیں۔ سنیئے علامہ نانی عشو کا تعارف
ہم سے اس طرح کراتے ہیں:۔

"نانی عشو کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی۔ مگر سُرخ
لباس ان کا جوڑ و بدن تھا مستی کی دھڑی۔ پانوں کا
لاکھا۔ پور پور مہندی۔ الغارے تیل۔ اور دنبالہ
دار کاجل۔ اُن کا ایمان۔ اس پر چھاجن اور پازیب
کی جھنکار۔ اُن کی رفتار کا ڈھنڈورا۔ پڑھنے لکھنے
پر تو شاید اس کی سات پشت میں بھی کسی نے "الف"
کے نام "ب" نہ سُنی ہو گی۔ مگر عشو اپنا رعب بٹھانے کو
اللہ کا الف حلق سے نکال کر "علہ" کردیتی تھی"

یہ بی عشو جو شہر بھر میں 'دُور دُور' نانی عشو کے
نام سے مشہور ہیں زمانہ بھر کی عیّار۔ مکّار۔ فتنہ پرور
ہیں ..... لیکن اتفاقات کی ستم ظریفی اور تخیّل
کی گل کاری نے انہیں جن جن مصیبتوں میں مبتلا کیا
ہے وہ اُن کے لئے تو مصیبت ضرور ہیں لیکن سننے
والوں کے سامنے جب یہ تصویریں آتی ہیں تو آدمی
ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے ..... نانی عشو
اُن بہت سے کرداروں میں سے ایک ہیں جن کے گرد
علامہ راشد الخیری نے تبسم اور قہقہے کی تعمیر کی ہے۔ رضا ہی
ہیں جو پیرس پہنچ کر بھی لکھنؤ اور دہلی کو نہیں بھولے
اور اس بیسویں صدی میں بھی قیس و فرہاد کی یاد تازہ کرنے
کی ٹھان رکھی ہے۔ پھر ایک گلشن تھیں کہ اگر کوئی ان کے
پاس بیٹھ کر کلمہ پڑھ دے تو چیخ مار کر کھڑی ہو جائیں کہ
کیا میں مر رہی ہوں جو کلمہ پڑھ رہے ہو۔ اگر کورا لٹھا کسی
نے ان کے پاس رکھ دیا تو انگنائی سے بھی پرے دروازے
پر جا کھڑی ہوئی کہ کورا لٹھا نہ نکالو یہ کفن میں آتا ہے"
ان سب سے بڑھ کر کردار "دادا لال بجھکڑ" جن کے۔

"گلے میں گھنڈی دار ٹینے کا کرتہ۔ ٹانگوں میں نیلا
تہمد۔ جاڑوں میں کنٹوپ۔ گرمیوں میں بورئے کی ٹوپی
ہاتھ میں موٹی سی لمبی لکڑی۔ آنکھوں پر کمانی ٹوٹی
ڈورے سے بندھی عینک کرتے کی ایک جیب میں
تسبیح دوسری میں تاش۔ آنکھیں چھوٹی مگر سُرمے سے
بھرپور۔ داڑھی لمبی۔ لیکن لال۔ دہانہ بڑا۔ اور پان
میں سُرخ۔ دادا کا حلیہ انسان کا تھا پر مزاج میں
تانا شاہ سے دو گز آگے۔ بات کا بتنگڑ اور سیل
کا بیل کرنا اس کی خصوصیت تھی"

غرض ایک دو نہیں بیسیوں ایسے کردار ہیں جنہیں
راشد الخیری زندگی کی گہما گہمی میں سے نکال کر ہمارے
سامنے لائے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ وہ احمق ہو کر بھی اپنے
آپ کو احمق نہیں جانتا۔ دوسرا وہ ہے کہ مکاری عیاری
اور فتنہ پردازی میں آپ اپنا جواب ہے کوئی بلا ٹوٹے
کوئی مصیبت نازل ہو۔ اپنی بات نہ جائے۔ پھر کچھ ایسے
بھی کردار ہیں جو اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں لیکن واقعات
اور اتفاقات ہمیشہ ان کی کاٹ کی گھات میں لگے
رہتے ہیں لیکن یہ ہیں کہ جان پر کھیلتے ہیں۔ اور ان اتفاقی
حادثات کے آگے سینہ سپر ہو کر کھڑے رہتے ہیں۔ ان
کرداروں کا حلیہ۔ ان کا لباس۔ ان کی گفتگو، عادات

اظہار۔ ایک خاص طرح کی ذہنی سرشت۔ چال کی ہتیاری
سلمہ لوحی۔ حماقت طرح طرح کی اخلاقی کمزوریاں، لالچ
عزت اور شہرت کی ہوس۔ اپنے متعلق طرح طرح کی
غلط فہمیاں یہ سب کچھ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سو
ہنسی کی ایک ہنسی بڑھایا . . . . . علامہ نے ان مختلف
کرداروں کی ظاہری اور باطنی خصوصیتوں سے قدم قدم پر
فائدہ اُٹھایا ہے اور ان کے تعارف میں مزاح کے بڑے
لطیف پہلو پیدا کئے ہیں۔ اس مزاح میں ہر جگہ شوخی
بھی ہے لیکن اس شوخی کے ساتھ گہری طنز بھی۔ تفریح
کا سامان بھی اور عبرت کا مرقع بھی . . . . . راشد الخیری کی
بے پناہ ظرافت کا اندازہ انہیں مختلف مواقع کی تصویروں
کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ جس طرح ان کی کہانیوں میں ہنسانے
والے انسانوں کی کمی نہیں اسی طرح ہنسانے والے
موقعوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ جہاں ان کا جی چاہتا ہے
یا جہاں کردار کی مخصوص فطرت اور فضا کی مجموعی حیثیت
اجازت دیتی ہے ان کا تخیل قدم قدم پر ایسے مواقع
نکالتا ہے کہ آدمی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائے"
پروفیسر وقار عظیم ——— "علامہ راشد الخیری"

"یہ صحیح ہے کہ قنوطیت ان کے لٹریچر پر غالب ہے
مگر رجائیت سے وہ بالکل نا آشنا نہیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف
کا یہ خیال سراسر غلط ہے کہ علامہ راشد الخیری کے ہاں
یہ ظرافت کا عنصر بالکل مفقود نظر آتا ہے۔ یہ تصویر دیکھ کر
ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ان صاحب نے حضرت
علامہ کا لٹریچر اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا بلکہ ان کے
چند ناول پڑھے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مصور غم نے
کوئی عظیم مزاحیہ ناول نہیں لکھا لیکن کئی ناولوں میں
رجائی کردار موجود ہیں اور وہ ان کی مدد سے نہایت
خوش کن فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ بے شک وہ اپنے
ناولوں میں غم نگاری کرتے ہیں مگر ان کا کامل تشبیہاً
ستونتی۔ تفسیر عصمت۔ اندلس کی شہزادی۔ سات
روحوں کے اعمالنامے وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت
نگار بھی ہیں۔ ان افسانوں "نانی عشو" اور "دلاتی تمی"
سے ڈاکٹر عبداللطیف کی تردید اور تکذیب ہوتی ہے۔ واقعہ
یہ ہے کہ اس قسم کی تنقید جو نا مکمل مطالعہ پر مبنی ہو ادب
ادب کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے"

". . . . . علامہ راشد الخیری کی کوشش تفنن محض
ہی نہیں بلکہ وہ آپ کو کہیں کہیں لمحہ فکریہ بھی دینا
چاہتے ہیں کہ جہاں ظرافت سے آپ شگفتگی حاصل کریں
وہاں ذہن بھی تفکر کا عادی بنے۔ ظرافت نگاری میں
بھی عورت کو جس طرح انہوں نے ہمیشہ سامنے رکھا اس کا
مثال مشکل سے ملے گی۔ مصور غم کی مزاح نگاری خالی خولی
باتیں نہیں اس کا پہلو اصلاحی ہے۔ ان کی ظرافت سے
ان کا اعلیٰ درجہ کا مزاح نگار ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ
ان کا معلم اخلاق اور مصلح ہونا بھی مستند پایا جاتا ہے"
صادق الخیری ایم اے ——— ساقی راشد الخیری نمبر

۳۔ ناول نگار

ناول انسانی زندگی کے مختلف واقعات کا ایسا مرقع
ہے جس میں واردات قلب کی دونوں کیفیتوں خوشی و غم
کے اندرونی اور بیرونی تاثرات کی ترجمانی دل آویز الفاظ
میں کی جائے۔ علامہ مغفور سوسائٹی کی اصلاح چاہتے
تھے۔ جس کا ایک ذریعہ ناول نگاری ہے۔ مغربی معیار
پر مشرقی ناولوں کو دیکھنا سخت غلطی ہے۔ کیونکہ ہر
قوم کے عادات اور حالات علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علامہ مغفور

کے مقصد کو سمجھنے کے بعد جب ہم ان کے ناول فنی حیثیت
سے دیکھتے ہیں تو ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ انہیں اوّل درجہ
کے ناول نگاروں میں بہت ممتاز جگہ دیں۔ درمیانی طبقہ
کی معاشرتی اصلاح اور سوسائٹی کی اندرونی خرابیاں
بیان کرنے میں ان کا مرتبہ چارلس ڈکنز سے بھی بلند ہے
الفاظ میں ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ جارج رینالڈ
کا ہم ان کا ہم پایہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کے ناول جذبات
نگاری اور مکالمہ نویسی کے اعتبار سے شیکسپیئر کے ڈراموں
سے ٹکراتے ہیں۔ اور ان کی منظر نگاری پر ہم انگشت
بدنداں رہ جاتے ہیں۔

کردار نگاری ناول کی سب سے بڑی خصوصیت
ہے جس کی بہترین مثالیں ہمیں ان کے ناولوں میں ملتی
ہیں۔ بنگالی ادب میں شاعر کی حیثیت سے ٹیگور کا پایہ
بہت بلند ہے لیکن ناول نگار کی حیثیت سے ادنا کام
ہے۔ کیونکہ اس نے کردار سے زیادہ اپنے کو نمایاں کیا ہے
علامہ مغفور نے اپنی شخصیت کو کسی ناول میں نمایاں نہیں
کیا بلکہ کرداروں کے ذریعہ کام لیا ہے۔ وہی اپنے یا
دوسروں کے تاثرات و کیفیات ظاہر کرتے ہیں۔ شیکسپیئر
کا مشہور مگر خاموش کردار انتونیو۔ وینس کا سوداگر،
نہایت شریف پاک طینت اور رحم دل انسان ہے۔
اس کی تعریف اس کا ایک دوست اس طرح کرتا ہے:۔

"HE IS ONE IN WHOM THE ROMAN HONOUR MORE APPEARS THAN ANY THAT DRAWS BREATH IN ITALY."

علامہ مغفور کے ہاں اس قسم کی بے شمار مثالیں
ملتی ہیں۔

معاملات کی ہیروئن سلیقہ شعار ہنرمند لڑکی دکھائی
گئی ہے۔ ایک رئیس کی بیگم اس کی تعریف اس طرح
کرتی ہیں:۔

"بیوی لڑکی تو ماشاء اللہ دسوں انگلیاں دسوں
چراغ ہے۔ بڑا نصیب اس ساس کا جس کی بہو ایسی
ہے اور اچھے بھاگ اس میاں کے جس کی بیوی ایسی
ہو۔ میں نے بھی آج تک سینکڑوں لڑکیاں دیکھیں امیر
بھی غریب بھی۔ مگر خدا کی قسم جو تمہاری بیٹی کی برابری
کرتی ہوں۔ ایک ہماری یہ اتنی بڑی لونڈیا ہو گئی ہے
چار دن میں مائیوں بیٹھیں گی یہ بھی نہیں معلوم کہ سی
کسے کہتے ہیں۔ بخیہ توڑی چیز ہے"

مصنف نے واقعات سے صالحہ کو نہایت
سعادت مند بیٹی دکھایا ہے۔ جب اس کی ماں مر جاتی ہے
باپ دوسرا نکاح کر لیتا ہے۔ اور اس کی ماں کا زیور
دوسری بیوی کے لئے نکلواتا ہے تو اس موقع پر بھی مصنف
نے کردار نگاری سے اپنی ہیروئن کی سعادت مندی دکھائی ہے۔

"صبح زندگی" کی نسیمہ کے اقوال و افعال بتا رہے
ہیں کہ وہ کس قدر معاملہ فہم اور دور اندیش اور متین عورت
ہے۔ ایک موقع پر بھاوج سے کہتی ہے:۔

"ہمارے حضرت نے فرمایا ہے علم ہر مسلمان مرد اور
عورت پر فرض ہے"

بھاوج: "حضرت کے زمانے کی تو مجھے خبر نہیں
مگر میرے ابا اللہ بخشے اتنے بڑے مولوی تھے لیکن
ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ لڑکیوں کا پڑھانا بہت ہی بُری بات ہے"

سنجیدہ: "میں تمہارے والد کی شان میں تو کچھ نہیں کہتی
مگر جن بزرگوں کا یہ خیال تھا وہ غلطی پر تھے"

بھاوج کی بات کا یہ جواب بھی ہو سکتا تھا۔

"تو کیا تمہارے ابا حضرت سے بھی بڑے ہوئے تھے" لیکن مصنف کو کردار کی گفتگو سے دکھانا ہے کہ وہ کس قدر بردبار اور سمجھدار ہے۔

معاشرتی ناول میں "صالحات" کی آمنہ ہو یا صالحہ تمیزن ہو یا سید کاظم "منازل السائرہ" کی شاکرہ ہو یا سائرہ اور عابد ہو یا ڈاکٹر صاحب۔ "صبح زندگی" کے سلسلے میں سنجیدہ ہو یا منجھلی، نسیمہ ہو یا قسیم، "شب زندگی" میں وسیم دلہن ہو یا نسترن۔ فاطمہ ہو یا توقیر۔ "طوفان حیات" میں ہاجرہ ہو یا مشترکہ اور انعام ہو یا عوام، "نوحۂ زندگی" میں قدیر ہو یا حشمت۔ "جوہر قدامت" میں زاہدہ ہو یا شاہدہ "ستونتی" میں منور ہو یا اس کی سوکن "بنت الوقت" میں فرخندہ ہو یا نصرت۔ "موؤدہ" میں ودود ہو یا موؤدہ "فسانۂ سعید" میں سعید ہو یا کارخانہ دار: "تربیت نسواں" میں شمس ہو یا قمر، پھر تاریخی ناولوں میں "ماہ عجم" کی ایلا ہو یا مسعود۔ "عروس کربلا" کی روز اور عبید ہوں "یاسمین شام" کی بلقیسیا اور اسد۔ یا "منظر طرابلس" کی علقیمہ اور شہزادی۔ کرداروں نے اپنے یا دوسروں کے تاثرات عادات و خصائل قول سے یا فعل سے ظاہر کئے ہیں۔

علامہ مغفور نے مرکزی اور وقتی کرداروں کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ اور افراد کی ہی نہیں جماعت کی بھی کردار نگاری کی ہے۔

اصلاحی معاشرتی ناولوں میں صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی کے سلسلہ میں نسیمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایسی عورت شاید ہی کہیں نظر آئے۔ بہت مبالغہ کیا گیا ہے۔ لیکن مبالغہ قصہ کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی اور بلاغت کی جان ہے۔ بشرطیکہ خلاف فطرت اور مافوق العادات نہ ہو۔ شیکسپیر اپنے مشہور کردار شائیلاک کو نہایت کٹر سنگدل بے رحم متعصب دکھایا ہے۔ اس کی کنجوسی کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی بیٹی بھاگ جاتی ہے۔ تو اسے اس کا ملال نہیں ہوتا کہ وہ فرار ہو گئی بلکہ اس لئے غل شور مچاتا ہے کہ روپیہ لے کر ایک عیسائی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شیکسپیر ہمارے دل میں یہودی کے لئے نفرت اور حقارت اور غصے کے جذبات پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے لیکن وہی شائلاک جس وقت عیسائیوں سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے کہ تم ہمیں دیکھتے ہو تو تھوکتے ہو۔ ہماری تضحیک تذلیل کرتے ہو۔ تمہاری طرح ہمارا بھی جسم ہے کوئی چبھتی ہے تو خون نکلتا ہے۔ چوٹ لگتی ہے تو تکلیف ہوتی ہے۔ ہم بھی آخر تمہاری طرح انسان ہیں۔ تو باوجود بدترین عیوب کا پتلا دیکھنے کے اس کے ساتھ ہمیں ہمدردی ہو جاتی ہے۔ اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ وہ مافوق الفطرت ہستی نہیں ہے۔ شیطانی خصائل اس میں ہیں مگر وہ خود شیطان نہیں ہے۔ شادی کے بعد جیتک نسیمہ نسوانی خوبیوں کی پتلی نظر آتی ہے لیکن وہ تپ کر کندن بنی ہے کنوار پنے میں اس سے بار بار غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ صبح زندگی کا آغاز ہی اس طرح ہوتا ہے:۔

"سنجیدہ نے کھلایا سونے کا نوالہ، نگر دیکھا شیر کی نظر"

سنجیدہ کی زندگی کا سب سے پہلا واقعہ ہے کہ کہیں سے حصہ آتا ہے تو وہ مچلتی ہے۔ لیکن سنجیدہ اسے ایک بھورا بھی اس وقت نہیں دیتی۔ منجھلی سید ہی طرح نہیں لگاتی تو سنجیدہ کا غصہ آپ کے سلام کو جاتی ہے تو ڈانٹ کر:۔

"بے شرم بازو کھلا ہوا ہے"

بھائی رو رہا ہے ماں کہتی ہے:۔

• نسیمہ ذرا ...

اور وہ جواب دیتی ہے ...

"میرے تو سونے کا وقت ہے"

نسیمہ خفا ہو جاتی ہے۔ اٹھ کر نہیں چھوڑ دیتی

جب نسیمہ بہت گڑ بڑ کرتی ہے تو جواب کیا ملتا ہے:

"ایسی کڑ بیٹی خدا دشمن کو بھی نہ دے"

نسیمہ کی تربیت ہو چکی ہے اور وہ خاندان کے لئے ایک مثال ہے۔ لیکن ایک دن جوتی پہننے میں غلطی ہو جاتی ہے تو لتاڑ پڑتی ہے۔ "صبح زندگی" میں نسیمہ کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ غلطیاں بھی دکھائی گئی ہیں جو عام طور پر لڑکیوں سے سرزد ہوتی ہیں اور جن کی اصلاح نہایت ضروری تھی۔ گرشام زندگی میں نسیمہ کا کیرکٹر مثالی ہے۔ اور مصنف نے سوسائٹی کی اصلاح کے لئے نسوانیت کا ایک بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نسیم کی موت کے بعد نسیمہ سے خانہ داری اور شوہر کی خدمت میں کچھ غفلت ہو جاتی ہے لیکن یہ انسانی فطرت ہے اور فطرت انسانی ہی مصورِ غم کے ہر افسانے اور ہر ناول میں ملے گی۔

معترضین کے ارشادات

(۱) مولانا راشد الخیری نے مولانا نذیر احمد کی تمثیلوں کو ناول مان کر ان کی طرز پر ناولیں لکھیں۔ جن کی درسِ اخلاق اپنا مقصد رکھا اور غیر فطری ناولوں میں اکثر جگہ تمثیلی شخصیں اکثر جگہ حقیقی افراد بن کر ناولیں مکمل کر لیں ان کے عمدہ طرز نگارش کے نمونے ہوتے ہیں۔ ان کے کردار بے اثر اور اکثر مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں جیسے صبح زندگی میں نانی عشو کے سے افراد زندہ ہو جاتے ہیں اور اپنا گہرا تاثر ناظر کے ذہن پر قائم کر جاتے ہیں۔ مگر ان کو کردار کہنا اتنا ہی غلط ہے جتنا مرزا ظاہر دار بیگ کو۔ مولانا عورتوں کے سر پیٹے کہے جاتے ہیں اور ان کی تصانیف میں بیویوں کی طرف بہت توجہ دی جاتی ہے۔ مگر یہ سب دکھنے افراد ایک ایسے سانچے پر اترے ہوئے نظر آتے ہیں کہ انہیں زندگی سے وابستہ کرنا اور کردار کا نام دینا جہالت ہی معلوم ہوتا ہے"

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ——— اردو ناول کی تنقیدی تاریخ

ڈاکٹر صاحب محترم نے اپنی یہ کتاب شائع کرنے سے قبل علامہ مغفور کے دو چار ناول مطالعہ بھی فرمائے یا نہیں۔ اور ان کی یہ رائے کس حد تک صحیح ہو سکتی ہے اس کا جواب خود یہ دلچسپ جملہ ہے "صبح زندگی میں نانی عشو کے سے افراد" "صبح زندگی" [illegible] کی تصنیف ہے اور "نانی عشو" الگ ایک افسانہ [illegible] میں لکھا گیا۔ نانی عشو کا صبح زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ صبح زندگی اصلاحی ناولوں میں سے ہے اور نانی عشو مزاحیہ افسانہ کہ "کے سے" بھی سو فیصدی غلط ہے کہ صبح زندگی میں کوئی مزاحیہ کردار سرے سے ہے ہی نہیں۔

"زندہ ہو جاتے ہیں" کس قدر مضحکہ خیز جملہ ہے! ناول صبح زندگی سے پہلے اگر افسانہ نانی عشو لکھا گیا ہوتا تو اس جملے کے کچھ معنی ہو بھی سکتے تھے مگر فاضل نقاد کو یہ بھی نہیں معلوم کہ صبح زندگی کے بیس سال بعد یہ مزاحیہ افسانہ لکھا گیا تھا۔

(۲) "مولانا راشد الخیری نے طبقۂ نسواں کی حالتِ زار اور کس مپرسی کو دیکھتے ہوئے اپنے ناولوں میں حمایت نسواں کی آواز بلند کی۔ مسلمان عورتوں کے حقوق اور مرد کی زیادتیاں ان کے ناولوں کا موضوع ہیں۔ خانگی

پیچیدگیاں اور زن و شوہر کے تعلقات۔ انہوں نے
حق اور سچ نہایت خوبی سے پیش کئے۔ تعلیم نسواں پر
زور دیا۔ عورتوں کی توہم پرستیاں۔ کینہ پروری۔ مہمل
رسوم کے خلاف جہاد ان کا مقصد حیات تھا۔ اس
ہمدردی نے ان کو محسن نسواں کا خطاب دلوایا۔ انہیں
مصور غم کہا جاتا ہے اس واسطے کہ ان کے ناولوں کا
انجام عموماً الم انگیز ہوتا ہے" (۵)

ٹریجڈی اگر انسانوں کو مار ڈالنے ہی کا نام ہو
تو یقیناً وہ اردو کے بہت بڑے حزن نگار ہیں۔ لیکن
اگر ٹریجڈی کے تقاضے کچھ بھی ہیں تو ہمیں ان کے
ناول پڑھ کر مایوسی ہوتی ہے" (ب)

ان کے حزن میں گہرائی، آفاقیت اور نکھارپن
نہیں پایا جاتا ...... ان کے غم میں خلوص ہے مگر
گہرائی اور لطافت نہیں" (ج)

مجتبیٰ حسین ——————— ادب و آگہی

۱۔ علامہ مغفور کے ۹ اصلاحی معاشرتی ناولوں
میں کیا صبح زندگی۔ شب زندگی حصہ اول۔ شب زندگی
حصہ دوم۔ ثمرۂ زندگی۔ طوفانِ حیات کے انجام کو الم
انگیز کہیں گے؟ تاریخی ناول ۱۰ ہیں۔ ان میں یاسمین شام
عروس کربلا۔ منظر طرابلس۔ محبوبۂ خداوند۔ درشہوار کا
انجام ہوتا ہے ہیرو اور ہیروئن کی شادی۔ کیا یہ انجام
الم انگیز کہا جائے گا؟ الم انگیز انجام تو تیغِ کمال اور
شہنشاہ کے فیصلہ کا بھی نہیں۔ تو جس صورت میں کہ یہ
ناولوں کا انجام الم انگیز نہ ہو ان کی بابت یہ کہنا کہ انجام
عموماً الم انگیز ہوتا ہے "حقیقت سے دور محض ایک غلط
بلکہ گمراہ کن رائے ہے۔ غیر ذمہ دارانہ سراسر غلط

(ب) تاریخ تذکرہ تصانیف مصور غم میں تصنیف ۱۹

جو بہ قدامت پر بحث کرتے ہوئے ایک نقاد نے اس
نہایت کمزور اور غلط اعتراض کا مفصل جواب ۔۔۔
پر دیا ہے (ج)، اس کا جواب متعدد مبصرین کی تنقید میں
(۳) مولانا کی نمایاں خصوصیت عورتوں کی ہمدردی
ہے۔ مولانا نذیر احمد نے صرف شریف گھرانوں کی معاشرت
کے نقشے کھینچے ہیں اور عورتوں کی بول چال لکھی لیکن مولانا
راشد الخیری نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور وہ
صرف عورتوں کی مظلومیت کے ترجمان بن گئے ...
اور اس طرح قولاً و عملاً حقوق نسواں کی حمایت کرتے ہے
وہ ہندوستان کی عورتوں کو نہایت مظلوم سمجھتے
وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے اور ہماری معاشرت کی قبیح
مذموم رسوم اور بدعتوں پر نکتہ چینی بھی کرتے تھے
اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے عورتوں کی مظلومیت
کے نہایت دردناک نقشے الم ناک زبان میں پیش کے
ہیں اور اردو ادب میں الیہ کا آغاز ان ہی سے ہوتا ہے
لیکن اس میں وہ حد سے تجاوز بھی کر گئے ہیں۔ لیکن ایک
طرف تو دائرۂ عمل محدود ہونے کے باعث ان کے ناولوں
اور خاص طور پر کرداروں میں یک رنگی و یکسانی کا عنصر
آگیا ہے۔ اور دوسری جانب ان کی یہ حد سے بڑھی ہوئی
غم انگیزی مصنوعی بھی معلوم ہونے لگی ہے۔ ایک غیر
صنف کی وکالت پر حمایت میں اس قدر انہماک اور شغف
کو جنسی کا یا پلٹ (SEX RERVERSION) کہا
جا سکتا ہے۔ عورت کا دل اور مرد کا دماغ ایک کی زبان
اور دوسرے کا قلم ایسی صورت میں خلوص کی توقع ہی بیکار
ہے۔ مولانا نے عورت کو حور کا تصور تو بخشا لیکن شریک
حیات بننے کا افتخار چھین لیا ......

نذیر احمد اور راشد الخیری کے یہاں میاں بیوی

سوانح عمری علامہ راشد الخیری

کے تعلقات میں بھی جنسیات نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ کچھ اور رہی ہو۔ اس خیال سے اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ جنسی تصورات ان کے دل و دماغ پر اچھی طرح مستولی ہو دوسرے ناول نگار شاید اسے بھول ہی جائیں لیکن یہ نہیں بھول سکتے۔ ایک لوکے لئے بھی اس سے غافل نہ ہو سکتے۔ جنسی اور جنسیات ان کے نزدیک عفریت ہیں جس کے محض ذکر سے بھی انہیں خوف آتا ہے۔ وہ اس کی طرف کبھی اشارہ بھی نہیں کرتے۔ اس وجہ سے ان کے ناول میں فطری پن باقی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انہوں نے عورتوں کی مظلومیت کا وہ دکھڑا رویا ہے کہ ان کی کسی بات پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی مبالغہ آمیزی نے حقیقت کو چھپا لیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر اگر ریختی اس وجہ سے ریاکاری کا نمونہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں عورت کی زبان مرد کا قلم بن کر بولتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ راشد الخیری کے ناول بھی اس ریاکاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اسے بھی محض ایک اتفاق سمجھئے کہ اُردو ناول کی ابتدا دہلی سے ہوئی ورنہ سچ تو یہ ہے کہ دلی والوں کو ناول نویسی کبھی آئی ہی نہیں۔ نذیر احمد۔ راشد الخیری اور قاری سرفراز حسین عزمی تینوں دہلوی ہیں۔ مولوی ہیں خطیب ہیں مصلح ہیں معلّم ہیں مبلّغ ہیں غرض سب کچھ ہیں اور نہیں ہیں تو ناول نویس۔ ان کے ذہن میں کرداروں کا خاکہ چونکہ پیشتر سے موجود رہتا ہے اس لئے پلاٹ پر کم توجہ ہوتی ہے۔ مکالمے میں اس قدر جوش اور سنور ہوتا ہے کہ وہ غیر فطری ہو جاتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی مولانا نذیر احمد اور شرر کی طرح لمبے چوڑے پند نامے ہیں وہ وعظ و نصیحت کے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مولانا نذیر احمد اور شرر کی طرح وہ بھی اپنے تبلیغی مقصد کو کبھی نہیں بھولتے اس لئے ان کے تمام ناول تبلیغی رومان ہیں جن میں حقیقت نگاری کو بہت حصہ دیا گیا ہے۔"

سہیل بخاری ـــــــــــــــ اُردو ناول نگاری

فاضل نقاد کو سب سے زیادہ جھنجلاہٹ اس بات کی ہے کہ ایک غیر صنف کی وکالت اور حمایت شفقت کے ساتھ کی گئی اس لئے خلوص کی توقع بیکار ہے اور عورت کی مظلومیت کا جو دکھڑا رویا گیا وہ صد درجہ مبالغہ آمیز ہے پھر غصہ اس بات پر ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات میں بھی جنسیات نظر نہیں آتی۔ اس لئے ناولوں میں فطری پن نہیں رہا۔ پھر یہ اتفاق ہوا ہی کیوں کہ اُردو میں ناول نگاری کی ابتدا دلی سے ہوئی۔ کیونکہ دلی والوں کو ناول نویسی آتی ہی نہیں۔ ان میں ہر اعتراض بذات خود بہت دلچسپ ہے۔ نہ صرف ان اعتراضات کا جواب بلکہ کردار نگاری۔ پلاٹ مکالمہ۔ حقیقت نگاری کے متعلق بھی درجنوں ادیبوں کی رائیں اس باب کے مختلف عنوانوں کے تحت دی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک تنقیدی مضمون کی چند سطریں یہ بھی ہیں:۔

"بیسویں صدی کے مصلح اعظم علامہ راشد الخیری نے عورت کو عورت بن کر دیکھا۔ وہ اپنے قلم کے ذریعہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں عورتوں کے دلوں میں اُترے اُن کو عورت کے مختلف اوراقِ زندگی کا علم تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کے قلم نے کبھی لغزش نہیں کی وہ جو کچھ لکھتے تھے حقیقت پر مبنی تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علامہ مرحوم نہ صرف طبقۂ نسواں کے مصلح اعظم تھے بلکہ دائرہ ذکور بھی بڑی حد تک علامہ مرحوم کا گرویدۂ احسان ہے کیونکہ مرد کا کیرکٹر عورت ہی بناتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انہوں نے عورت کے لئے وہ کام کیا جو انیسویں صدی کے سالار اعظم سرسید احمد خاں

نے موڑ کے رکھ دیا"

احسان اصغر لودھی — عصمت

بی اے لاہور ——— راشد الخیری نمبر [illegible]

ناول نقاد نے ایک بہت دلچسپ خیال یہ بھی ظاہر فرمایا ہے کہ علامہ منصور سب کچھ ہیں اور نہیں ہیں تو ناول نویس انگریزی روزنامہ سندھ آبزرور کراچی کی اشاعت مورخہ ۳ فروری [illegible] میں جناب اشارت حسین صاحب کا ایک طویل مضمون جو انگریزی کے ۳۰ پرچوں میں بھی نقل کیا گیا تھا شائع ہوا تھا۔ جس کی ایک سطر کا ترجمہ یہ ہے:-

"ناول نگار کی حیثیت سے علامہ راشد الخیری دنیا کے عظیم ناول نگاروں میں سے ہیں"

مبصرین کی رائیں

"مسلمان عورتوں کی یہ افسوسناک حالت راشد الخیری کے پیش نظر تھی انہوں نے دیکھا کہ ہماری عورتیں اپنی جہالت اور تنگ نظری اور مردوں کی خود غرضی اور غفلت کی وجہ سے جانوروں سے بدتر زندگی بسر کر رہی ہیں۔ غیرت اور حمیت نے انہیں ان بدنصیبوں کی حمایت میں قلمی جہاد کرنے پر آمادہ کر دیا۔ ان کا حساس قلب اس دل روز منظر سے اس قدر متاثر تھا کہ ان کی تحریر درد و غم کے رنگ میں ڈوب گئی۔ مگر راشد الخیری کی الم نگاری ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد نہیں۔ بلکہ اصلاح کے جوش میں بھرے ہوئے ارادے کی للکار ہے۔ جس میں رقت کم اور غصہ زیادہ ہے مصلحانہ اور مجاہدانہ جذبے کے زور میں وہ اکثر فن ناول نویسی کے اصولوں کی زنجیریں توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اگرچہ بخلاف اپنے ہم عصروں کے وہ اپنے زمانہ کی زندگی اور معاشرت سے پوری واقفیت رکھتے اور اس کا سچا مرقع دکھلاتے ہیں لیکن عورتوں کی زندگی کی دردناک تصویروں میں انہوں نے اصلی رنگوں سے زیادہ گہرے رنگ بھرے ہوئے ہیں تاکہ دیکھنے والوں کی نظروں میں [illegible] ہو جائیں۔ ان کے ناولوں کے اختتام [illegible] نہیں پہنچنے پاتے اور انجام ہیں۔۔۔۔ حقیقت نگاری سے اس حد تک [illegible] جہاں تک ان کے مصلحانہ مقصد میں مدد ملے۔۔۔ ناول نویسی راشد الخیری کے لئے ایک ذریعہ ہے اصل مقصد نہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیں نفس کے بندوں کو للکار کر ڈرائیں بے حمیتوں کے دل میں جوش پیدا کریں بے حسوں کے سینوں میں احساس کی آگ بھڑکا دیں"۔۔۔۔۔۔ ناول کی جان قصہ کی دلآویزی ہے اور یہ ان کی کتابوں میں بدرجہ کمال موجود ہے۔ عورتوں کی زندگی کی گوناگوں تصویریں اصل قصے کا تسلسل ضمنی واقعات کا تنوع، پڑھنے والے کی دلچسپی کو اول سے آخر تک قائم رکھتا ہے۔ اور یہی ناول نگاری کی سب سے بڑی کامیابی ہے"

ڈاکٹر سید عابد حسین ——— ساقی راشد الخیری نمبر

"راشد الخیری نے اپنے ناولوں کے ذریعے ہمارے سماج میں عورت کے درجے کو واقعی بلند کیا۔ مرد کے دل میں اس کی جذباتی زندگی سے ہمدردی پیدا کی اور اسے مرد کی تفریح یا خدمت کے ادنیٰ منصب پر فائز رکھتے ہوئے ایک دل نواز ذاتی حیثیت بھی عطا کی۔ اردو ادب اور اس ادب سے متاثر ہونے والی سوسائٹی پر راشد الخیری کا یہ احسان رہتی دنیا تک باقی رہے گا"

مولانا صلاح الدین احمد ——— آفاق لاہور ۲۴ فروری [illegible]

"سرشار، شرر، نذیر احمد کے بعد زیادہ تر ناول نگاروں نے انہیں کی پیروی کی۔ اُن کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں ہے البتہ اس باب میں صرف راشد الخیری کی ذات استثنا کا

[illegible] راشد الخیری

[illegible] رکھتا ہے۔ آپ [illegible] کے بانی ہیں
[illegible] پر چلنا شروع کیا۔ [illegible] انفرادیت اور تخلیقی شان
[illegible] راشد [illegible] اور فن میں بکانی اقدار
[illegible] ہیں۔ ان کی تحریروں [illegible] اور جدت بھی ہ
[illegible] ادب میں [illegible] کی اُنھوں نے متنا بنا
[illegible] میں سب سے زیادہ ناول اور افسانے لکھے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔
نذیر احمد اور راشد الخیری میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں
اپنے عہد کے مسلمان سماج کے مصوّر ہیں۔ دونوں کے
[illegible] نسوانی کردار بہتر اور زیادہ مکمل ہیں۔ دونوں کی زبان بڑی
[illegible] خاص اور امتیازی اسلوب کی نمائندہ ہے۔ مگر
راشد الخیری کا اسلوب زیادہ پُر اثر ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

بنگالی میں امیر چندر کی اُردو ——— مترجمہ
ادب کی تاریخ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۶۰ء ——— خالدہ فہمی

" مولانا راشد الخیری اپنے مقصد میں نہایت کامیاب
ہوئے۔ ان کے ناول نہایت دلچسپ سبق آموز ہوتے
ہیں۔ گو ایک نقاد کا یہ کہنا بھی شاید درست ہو کہ
ان کی نظر میں مردوں کی حیات مجسّم جور و ستم اور حیات نسوانی
شامِ زندگی اور نوحۂ غم ہے۔ لیکن ہم اتنا عرض کرنا ضروری
سمجھتے ہیں کہ ایک ادیب بھی وہی ہے جو حقیقت، اور
صداقت کو راہ نما بنائے اور اس سے کسی کو انکار نہیں کہ
اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ حقیقت اور صداقت پر مبنی تھا
۔ ۔ ۔ ۔ ان کے کسی ایک ناول کو پڑھنا شروع کیجئے تو آپ کو
اس قدر دلچسپی معلوم ہوگی کہ کتاب چھوڑنے کو طبیعت
نہ چاہے گی۔ یہ جملہ آپ نے مجھ سے نہیں بلکہ ہر اُس مرد و
عورت سے سُنے گا جس نے علامہ کے ناول یا افسانوں
کا مطالعہ کیا ہوگا اور شاید یہی ایک اعلیٰ ناول کی خصوصیت
بھی ہے کہ وہ دلچسپی کو تمام و کمال جذب کرے اُنھوں نے

اعلیٰ و ادنیٰ امیر و غریب، بیوہ و یتیم اور شوہر بیوی غرض
سب کے بے مثل مرقعے اپنی کتابوں میں کھینچ دئے ہیں جو
آج بھی اتنے سال گذر جانے کے باوجود تر و تازہ ہیں
۔ ۔ ۔ ۔ بعض نقادانِ ادب کا اعتراض ہے کہ علامہ نے
کہیں کہیں مبالغہ اور غلو سے کام لیا ہے۔ اس کا جواب
یہ ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو یہ بھی یقین کیجئے کہ مصورِ غم اپنے
اس مقصد میں نہایت کامیاب ہوئے جس کو وہ لے کر
اُٹھے تھے، اس لئے کہ ایسا ممکن ہے کہ اس قسم کے واقعا
بھی جن کو آج درست نہیں [illegible] جاتا رونما ہوتے ہوں
جن سے علامہ متاثر ہوئے۔ کیا یہ درست نہیں کہ جہاں شریف
رُوحیں رہتی ہیں وہاں بدترین ہستیاں بھی موجود ہوں؟
چونکہ آج ہماری سوسائٹی اور ماحول میں انقلابات
واقع ہو چکے ہیں اس لئے اگر آج وہ ہستیاں نظر نہیں آتیں
تو یہ مصورِ غم کا قصور نہیں بلکہ وہ تو اپنے مقصد میں
نہایت کامیاب ہوئے اور ان کے ناولوں میں آہوں
اور آنسوؤں کا یہ اثر ہے کہ ایسی ہستیاں آہستہ آہستہ ناپید
ہوتی جا رہی ہیں"

جرّار رضوی ——— عصمت فروری ۱۹۵۰ء

" ناول نویسی میں نذیر احمد کے صحیح جانشین سمجھے
جاتے ہیں۔ ان کی توجہ زیادہ تر عورتوں کی تعلیم و ترقی اور
ان کے مصائبِ زندگی پر مبذول ہے۔ چونکہ عبارت نہایت
درد انگیز اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے۔ لہٰذا مصورِ غم کے
لقب سے مشہور ہیں۔"

سکینہ ——— انگریزی میں تاریخ ادب اُردو

" بابائے نسواں محسنِ اعظم علامہ راشد الخیری کو ناول
نویسی میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ ناول نویسی ایک اعلیٰ
فن ہے جس کی بنیاد سائنسی اُصولوں اور نفسیاتی حقائق

پر قائم ہے۔ ناول ہی انسانی فطرت کی واقفیت میں ہمارا معاون ہو کر خوشی و غم کے تنوعات کی ترجمانی کرتا ہے۔ بذلہ سنجی۔ جودت و جدت۔ لطافت و فطانت کے شاہکار کو فصیح اور دل پسند و دل پذیر زبان میں ناول کے ذریعہ ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ تمام خوبیاں مولانا کے ناولوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مولانا کا خطاب مصور غم بلا شبہ ان کی تصانیف کے درد و سوز بھری تحریر پر صادق ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے ناول چونکہ زندگی سے قریب ہیں اس لئے ان میں جہاں نوحۂ غم ہے۔ وہیں نغمۂ شادی بھی آپ نے لوگوں کے دل بہلانے کے سامان پیدا کرنے کے لئے ناول نہیں لکھے۔ وقت کی اہم ضرورتوں پر لکھے ہیں۔ اور اصلاح معاشرت کو مدّ نظر رکھ کر۔ وہ صرف مصور غم ہی نہ تھے۔ لطافت کے علم بردار بھی تھے۔ ان کے قلم میں تحریک نسواں کا عنصر بھی تھا۔ ان کے تمام ناول تنقید کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے ناولوں کو کردار نگاری پر جانچیں تو ان میں نام کو بھی کمزوری نہ ملے گی۔ واقعات زندگی کے قریب تر ہوتے ہیں۔ پلاٹ کا سلجھاؤ اور ان کے ارکان کی ہم آہنگی آپ کے ناولوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اپنے ناولوں میں آپ قاری کے جذبات و احساسات پر مکمل تسلط جما لیتے ہیں۔ اور یہ آپ کی ناول نگاری کا کمال ہے۔"

عائشہ صدیقہ ———— عصمت فروری ۱۹۶۳ء

" مولانا کی ناول نگاری کی چند خصوصیات ہیں۔ وہ ایک مسلم الثبوت انشا پرداز ہیں۔ ان کو دہلی کی بیگماتی زبان پر کامل عبور حاصل ہے۔ ان کی عبارت میں تشبیہ و استعارے کے ساتھ ساتھ غضب کی رنگینی پائی جاتی کہ بعض اوقات یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ نثر میں شاعری کر رہے ہیں۔ مولانا نذیر احمد نے بھی عورتوں کی زبان لکھی ہے اور اس باب میں انہیں کمال حاصل ہے لیکن جو سکہ یہاں مولانا راشد الخیری کی سحر رنگینی اور جزئیات نگاری ان میں نہیں ملتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راشد الخیری نے اپنے پھوپا مولوی نذیر احمد سے بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن واقعات کی تفصیلات بیان کرنے کی جو صلاحیت ان میں ہے یا جزئیات نگاری سے مرقع کشی میں جو کمال انہوں نے پیدا کیا اسی کے باعث وہ مولانا نذیر احمد سے کہیں آگے نکل گئے۔ کوئی قدرتی منظر ہو سماں ہو حلیہ ہو یا واقعات و حقائق مولانا کا قلم ان کی ایسی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویریں کھینچ دیتا ہے کہ پڑھنے والے پر بلا کا اثر پڑ جاتا ہے۔ ان کی تحریر میں بلا کا درد اور کسک ہے ان کا ہر ناول بجائے خود ایک مرثیہ ہے"

سہیل بخاری ———— اردو ناول نگاری

کردار نگاری پر تبصرے

" راشد الخیری کے ناول اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ راشد الخیری کا کوئی کردار بہت گرا ہوا اور ذلیل نہیں ہے۔ بروں کے سینوں میں بھی اچھائی کی قندیل روشن ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کرداروں میں وہ جرأت اور ہمت نہیں کہ وہ سماجی برائیوں کے خلاف بہادری سے سر اٹھائیں۔ اس لئے راشد الخیری کی بیشتر کہانیاں المیہ ہیں۔ موؤدہ میں محسن کے باپ مودود اور نوحۂ زندگی میں صوفیہ کے باپ اور ساتِ روحوں کے اعمالنامے میں احمد کے کردار مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ راشد الخیری کے عہد کا معاشرہ ایسا تھا کہ ان کے نسوانی کرداروں کو بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ بیکر دار تو سماج کی قربان گاہ پر اپنی زندگی کی بھینٹ بھی چڑھا دیتے ہیں۔

...ہوگ ہیں قدسیہ اور اجالا ناسوں میں قیصر اور گوہر مقصود

ہیں صالحہ۔

بنگال میں اُردو ادب کی تاریخ　　مترجمہ

از ... نیرندر چندر پال ———— خالدہ فہیم

مولانا راشد کے افراد وہ ہیں جنہیں انہوں نے
... گئے دیکھا ہے ان کے متعلق انہیں کسی قسم کا شبہ
نہیں وہ مخصوص حالات میں وہی برتاؤ کریں گے جس کی
ان سے اُمید کی جاتی ہے ...... آپ کے کیرکٹروں میں
ارتقا کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے وہ اتنا فطری اور
ماحول سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ فوری تغیرات بھی ہیں
اُلجھن میں نہیں ڈالتے۔ "حیاتِ صالحہ" میں صالحہ کے
کردار میں جو تغیر ہوتا ہے وہ اتنی خوبصورتی سے پیش
کیا گیا ہے کہ ہمیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔"

منشی پریم چند ———— (عصمت جولائی ۱۹۳۶ء)

" علامہ کے ناولوں اور افسانوں کے کردار بے جان
اور فرضی نہیں ہیں وہ ہماری عام معاشرتی زندگی کا ہو بہو
نقشہ کھینچتے ہیں۔ اور ان کے کردار ہمیں زندہ اور جیتے
پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آتا ہے
جب قاری خود کو ان کرداروں ہی میں گھلا ملا محسوس
کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ چلتا پھرتا
ہے۔ ہنستا ہے۔ روتا ہے۔ کبھی بے ساختہ ہنس دیتا ہے
کبھی بے اختیار رونے لگتا ہے۔ اس وقت ان کے
کرداروں کا غم و خوشی، کرداروں اور پڑھنے والوں میں مشترک
ہو جاتا ہے۔ ان کا ہر کردار ہماری روزمرہ کی زندگی کا جیتا
جاگتا کردار اور ان کا ہر غم ہمارا اپنا غم ہوتا ہے۔ وہ پڑھنے
والوں کی عام معاشرت کے نقاش ہیں۔ اور اس
نقشہ کو اس خوبی سے ہمارے سامنے کھینچ دیتے ہیں
کہ ہم خود حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ معمولی روزمرہ کی باتیں
جن پر ہم نے کبھی توجہ نہیں دی تھی اب ہمیں ان میں زندگی
بکھرتی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات
تو پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ یہ میرے دل کی
بات لکھنے والے پر کس طرح آشکار ہو گئی۔"

علی سفیان آفاقی ———— چٹان لاہور ۵ فروری ۱۹۶۴ء

" راشد الخیری فطرت کی طرف سے ایک دردمند دل اور
گداز طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے
ہندوستان کی مسلمان عورتوں کے مصائب اور مظالم
کو ایک مصلح کی نظر سے دیکھا ایک فلسفی کے ذہن سے
سوچا۔ اور انشا پرداز کے قلم سے ادا کیا۔ راشد الخیری
اور نذیر احمد میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ نذیر احمد نے
اپنا سارا وقت صرف عورتوں کی اصلاح اور تعلیم پر ہی
صرف نہیں کیا بلکہ انہوں نے ادب کے مختلف شعبوں اور
زندگی کے دوسرے مسئلوں پر بھی قلم اُٹھایا ہے ضمنی
طور پر اس طبقۂ مظلوم کی حمایت اور اصلاح کا کام بھی
ہو گیا۔ لیکن راشد الخیری نے اپنی زندگی کا واحد مقصد
عورتوں کی تعلیم تربیت تہذیب اصلاح اور حمایت قرار
دیا تھا۔ زندگی بھر انہوں نے جو کچھ دیکھا۔ کہا یا سوچا۔
وہ صرف اسی دائرے میں رہ کر کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے
ہیں کہ راشد الخیری کا کینوس محدود سہی۔ لیکن ان کی
تصویریں بڑی مکمل اور جاندار ہوتی ہیں۔ ان کے
کردار انسانی زندگی کے بے حس و حرکت سائے نہیں۔
بلکہ زندگی کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔
ان کے کرداروں کی تصویر کشی میں انہوں نے جن رنگوں
کا انتخاب کیا ہے اور ان میں جس چابک دستی سے
باہمی امتزاج پیدا کیا ہے وہ ان کی قوت مشاہدہ اور

ذہن کی پوری پوری پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے رنگوں کی آمیزش بڑی صحیح اور اس کے عکس بڑے گہرے ہیں۔"

نور ہاشمی ——— سہ روزہ نامہ جنگ کراچی ۴ فروری ۱۹۶۵ء

• کردار نگاری میں علامہ کو کمال حاصل تھا۔ ان کے کردار ہمارے معاشرے کے چلتے پھرتے کردار ہیں۔ محبت کرتے نفرت کرتے۔ سلیقہ مند پھوہڑ۔ نیک و بد۔ دوسروں سے متاثر۔ دوسروں پر اثر انداز۔ اور پھر مولانا ان کی نفسیات ذہن میں رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کا کہانی میں جنم ہوتا ہے اور حالات و اطوار کے لحاظ سے ارتقا کی منازل طے کرتے ہیں اور مناسب انجام کو بہت خوبصورتی سے پہنچتے ہیں۔"

عقیل دانش ——— انجام کراچی ۹ فروری ۱۹۶۵ء

• علامہ راشد الخیری کا کردار نگاری میں بھی بہت بڑا مرتبہ ہے۔ مولانا کے یہاں کردار نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ مولانا کے سماجی اور تاریخی ناولوں کے اشخاص قصہ جب ہمارے روبرو پیش ہوتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے چند تو ایسے ہیں جو کہ خود بخود بولتے ہیں اور ہم کو اپنے حالات بتلاتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو ہمارے سامنے آتے تو ہیں مگر خاموشی کے ساتھ۔ تیسرے وہ ہیں جن کا ذکر ہم غائبانہ طور پر سنتے ہیں۔ مگر وہ نہ تو بولتے ہیں اور نہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مولانا کے ناولوں میں کردار بھی ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ غیر ملکی نام ہونے کی وجہ سے ہم کو کچھ ہی کردار زیادہ معلوم ہوں۔ مولانا نے کردار نگاری میں لباس کو بھی بہت کافی اہمیت دی ہے ان کے کردار کو اکثر اوقات لباس تبدیل کر کے نمودار ہوتے رہتے ہیں کبھی تو وہ زرق برق پوشاک میں ہوتے ہیں اور کبھی معمولی کپڑوں میں۔ کہیں ان کے بدن پر پھٹے ہوئے کپڑے ہوتے ہیں۔ اور کبھی ٹھیک کوئی عورت دوپٹہ اوڑھتی ہے تو کوئی ایرانی لباس پہنتا ہے۔ جس طرح ہماری عملی زندگی میں لباس کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اسی قدر ناول نگاری میں بھی لباس کو اہمیت ہوتی ہے مولانا راشد الخیری نے لباس کی اہمیت کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کرداروں کو طرح طرح کے لباس پہنے ہوئے دکھلایا ہے۔ زخشندہ کو دیکھئے کہ کہیں پر تو تمام زیور اور ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ زیب تن کرتا اور دوپٹہ پہنے ہوئے نظر آتی ہے۔ اور کہیں پر ایک میم کے لباس میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ حال صرف اسی کردار کا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے کردار بھی اسی طرح لباسات پہنتے اور بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

اویس احمد ادیب ——— ساقی راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

جزئیات کی تفصیل

ناول نگار میں جزئیات کی تفصیل بیان کرنے کی قدرت بھی ہونی چاہیئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کا مشاہدہ نہایت وسیع اور تیز ہو اور حافظہ غیر معمولی۔ شیکسپیئر نے مختلف قسم کی شراب کا ذکر کیا ہے۔ تو اس زمانہ کی کوئی شراب نظر انداز نہیں کی۔ کتوں کی قسمیں گنواری ہیں تو کوئی قسم نہ چھوڑی۔ ہم نے اپنے کانوں سے مشہور داستان گو میر باقر علی دہلوی کی داستان سنی ہے کہ مختلف قسم کی دالوں کے نام لینے شروع کئے تو ایک سانس میں درجنوں نام لے دیئے ہتھیاروں کا ذکر آیا تو ایک ایک ہتھیار کا نام ایک سانس میں بتادیا۔ میر حسن اپنی مشہور مثنوی سحر البیان میں جہاں اور جس موقع پر تفصیل میں گئے ہیں انسانی شاعری کی انتہا کردی۔ مصور غم کے ناول اس اعتبار سے بھی بلند

درجہ رکھتے ہیں۔ سچ زندگی میں ایک پھوہڑ عورت کے گھر کا
نقشہ دیکھا ہے۔ تو ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے:
"سو گھڑے پانی میں شامل کرے تو الگ اٹھالو۔ اب جو میں
جہاں کی سہیلیوں اور ماماؤں کے بچوں نے کنوئیں
کھود کر گڑھے ڈال دیئے۔ مرغیوں نے بڑے
بڑے ذروں سے گھر کی حیثیت دو کوڑی کی کر دی۔ کہیں
پڑے رہے کہیں خاک کے تودے یہاں چولہے وہاں
کوڑیوں دونوں کے بیچ کوڑا کرکٹ صحن کیا دنیا بھر کا
جوہڑ تھا۔ پھکنی دستِ پناہ۔ اس بھی دانے کی کنڈلیاں
پانی کے کونڈے مرغیوں کی بیٹ کبوتروں کے پر بودے
سے سڑے کپڑوں کے چیتھڑے چاروں طرف وہ جھاڑ
جھنکاڑ آیا ہوا کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہ چاہے کہنے کو
ماشاء اللہ ایک چھوڑ دو دو مامائیں۔ مگر ان بیچاریوں
کا کیا قصور کام لینے والا ہوتا تو وہ کام کرتیں۔ گھر والی
کی یہ کیفیت کہ اگر کبھی بھولے بسرے دنیا جاتی دیکھ کر
کسی ماما نے چاہا بھی کہ جھاڑو ہاتھ میں لے دو جھٹکے
دے دوں تو اس کو جھٹ دوسرا کام بتا دیا۔ پل بھر کو
دیر ہوئی تو سیکڑوں کوسنے پڑ گئے۔ بستم یہ کہ جو کام بتایا
وہ الٹا اور چوپٹ کی وہ ٹیڑھی۔ ماماؤں کا کیا بگڑتا
تھا جس نے چھوڑا الا پڑ گئیں۔ دن بھر بیٹھی مرغیوں کے
دڑبے پر ٹھو بیتیں اور کبوتروں کی کابکیں جھاڑتیں۔
چکنی مٹی کے بورے۔ کچی اینٹوں کے ڈھیر تغارے
بھرے پانی پڑا ہوا۔ پختہ سنگین گھر چار دن میں
غارت ہو گیا۔ دیواروں پر نظر ڈالو تو اینٹیں گری ہوئی
چونا جھڑا ہوا کوٹھے پر جا کر دیکھو تو گھاس اگی ہوئی۔
ملبا پڑا ہوا۔ موری بند۔ پرنالے ٹوٹے۔ جھلنگے کھرے
ٹھاٹھ پڑے۔ خدا کی شان نواب چھٹن کی محلسرا اور
دیکھ کر جی متلاتا۔ دالان کی وہ کیفیت کہ حلوائی کی
دکان بھی اچھی ہو گی۔ چاروں طرف مکھیاں بھنک
رہی ہیں۔ بڑی بی کے زمانے کا بنا ہوا گھر راکھ کا خاک
میں مل گیا تھا۔ دری چاندنی۔ چادر غالیچے موجود سب
چیزیں تھیں۔ لیکن وہی چیزیں جو کسی وقت مکان کی
زینت اور آرائش کا سامان تھیں آج دیکھنے والے کو
بھی لاج لگتی ہے۔ چونے کے دھبے کتھے کے چھینٹے۔
سیروں چھلکے۔ ٹوکروں کوڑا۔ ڈھیروں راکھ۔ منوں
خاک بڑی بڑی زرد دریاں مٹی میں اٹی ہوئی چھپی
ہوئی جاجمیں۔ جنگی جنگی چاندنیاں زمین سے بدتر
مرزاپور کا مہین غالیچہ۔ دیکھنے دکھانے کے لائق اور
اس کی یہ قدر کہ انگنائی لگی اور خاک اڑنی شروع ہوئی
چبوترے کی چوکیاں جیسے بیساکھ میں ہوئیں خاک سے
گرد آلود اوپر سے پڑا مینہ۔ شیشم اور ساگوان سب گل کر
آدھا ہو گیا سامان کا حال یہ کچھ تریڑے اور ڈھنگ وہ کچھ
کہ خدا کی پناہ اگالدان اوندھا ہوا پٹاری کا پھٹکی ہوئی
کتھا گرا ہوا۔ چونا لپا ہوا۔ نواڑ کے پلنگ۔ ان کی ہر طرح
پائے دو دو رنگے۔ چینیوں میں کان کھجوروں پر قینچیاں
پلنگوں پر رکابیں۔ چاندنی پر آبخورے غالیچے پر کٹورے۔
کہیں پانی گرا ہوا۔ کہیں رنگ پڑا ہوا۔ کونڈے رڑکے
ہوئے سرکا بیاں پھیلی ہوئی۔ گھر کیا ایک طوفان بدتمیزی
تھا۔ لیٹو تو مصیبت۔ بیٹھو تو آفت۔ جھاڑو نہ بہارو
صفائی نہ ستھرائی"

صالحہ کے غسلِ صحت کی تقریب پر کپڑوں کی تفصیل
گوٹے ٹھپے کی تشریح۔ صبح زندگی میں نسیم باپ کے سلام
کو جاتی ہے اس کے لباس اور زیور کی وضاحت صبح زندگی
ہی میں آٹا گوندھنے روٹی پکانے کی تفصیلات کے سلسلے میں

کٹھلیاں - کھری - سوندھا - جان دار گلی جتھیل دینا - لگڑ بگیر - لال چھتی - پسلے ہاتھ - بلدار - مرنڈی وغیرہ چھلساتی گھٹنوں کی کشائی - سلائی کی اصطلاحیں - تیپچی - بخیہ - ترپن - سنجھ - ادھ ما - کیکری - کٹاؤ پھر ان کی ضاعت شاہِ زندگی میں لیسے کے سکھر - نوبت پنج روزہ میں بادشاہ کے دسترخوان کی تفصیل اور ایک ایک چیز کا نام - ولایتی نمی میں پی نمی کا ٹکیہ - جزئیات کا کس قدر حیرت انگیز شاہد ہے -

"جزئیات کے مشاہدہ کا کمال دیکھئے - عام طور پر مرد جن باتوں کو سرسری نظر سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق غور کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے ان کے متعلق علامہ مرحوم کی گہری نگاہ کہاں تک معلومات حاصل کر چکی تھی - کوئی عورت بھی اس سے بہتر انداز میں بکل نکالنے کا طریقہ نہیں بتا سکتی - آج کل جو لوگ کسی فن کے متعلق سرسری معلومات حاصل کر کے مضامین لکھنے لگے ہیں ان کے لئے علامہ مرحوم کا طریقہ کار چراغِ راہ ہونا چاہیئے - عورتوں کے متعلق کتابیں لکھنا جب انہوں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تو ان کے جذبات و خیالات ان کے عادات و رسوم روز مرہ کے کاموں، ان کی تفریحات اُن کی کشیدہ کاری اور ان کے سینے پرونے کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کی زبان و محاورات اور خاص اصطلاحات کے متعلق وہ معلومات بہم پہونچائیں کہ اچھے سے اچھے گھرانے کی عورتیں بھی اس بات میں ان کی برتری کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتیں -"

مولانا حامد علی خاں لاہور ———— ساقی ستمبر ۱۹۳۶ء

"ہماری معاشرت اور خاص کر گھروں کی روز مرہ زندگی سے جیسے انہیں آگاہی تھی شاید ہی کسی دوسرے کو ہو - بچوں ماؤں بڑی بوڑھیوں ماؤں اناؤں کھلائیوں کی بول چال - نشست برخاست مانوس و توہمات جذبات و خیالات غرض کہ رتی رتی حال سے واقف تھے -"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ———— عصمت راشد الخیری نمبر

"عورتوں کے مختلف مشاغل اور مصروفیتوں کی جزئیات اور تفاصیل پر انہیں اتنا عبور حاصل ہے کہ ان کی مہارت اور ریاضت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - تیپچی کی ترکیبیں اور بکل نکالنے کے ڈھنگ تک اتنی پیاری اور سلیس زبان میں اور ایسے شگفتہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ کوئی عورت بھی اس سے زیادہ کیا لکھتی - اور پھر انداز دلی کی خاص بیگماتی زبان ایسے حسن و خوبی سے استعمال کی ہے کہ بعد کے ادیبوں میں اس کی مثال نہیں ملتی -"

احمد ندیم قاسمی ———— امروز ۳ فروری ۱۹۵۲ء

"علامہ راشد الخیری کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی نظر سے چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی نہیں بچتی - وہ جزئیات کی تفصیل میں کمال رکھتے ہیں - اور اسی میں تو درد و اثر کا راز پنہاں ہے - جس سے اُن کا کلام نثر ہو یا نظم لبریز ہے"

ڈاکٹر سید احمد بریلوی ———— عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

"راشد الخیری اپنی کہانیوں میں ہمیں مسلمانوں کے متوسط گھرانوں سے متعارف کراتے ہیں - انھوں نے اس فضا کا نقشہ اس قدر تفصیل کے ساتھ کھینچا ہے کہ اس دور کی معاشرتی زندگی کی تاریخ لکھنے میں ان تفصیلات سے بڑی مدد مل سکتی ہے ان کی کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ متوسط الحال مسلمانوں کے مکان کتنی کوٹھڑیوں صحنچیوں - دالانوں وغیرہ کے ہوتے تھے - اثاث البیت کیا اور کس قسم کا ہوتا تھا - لباس کیا اور کیا استعمال کیا جاتا تھا - کھانے اور پکانے کے برتنوں

کی ہوتیں۔ راشد الخیری کی کہانیوں سے مرتب کی جا سکتی ہیں۔ گرمیوں سردیوں اور برسات میں گھر کا کیا نقشہ ہوتا تھا اور ان مکانات میں رہنے والوں کی روزانہ مصروفیات اور مشاغل کیا تھے۔ غرضیکہ راشد الخیری نے ذرا ذرا سی بات اپنی تفصیل اور چابک دستی سے بیان کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ انہوں نے غضب کی ذہانت اور قوت مشاہدہ پائی تھی۔ ان کی کہانیوں میں دہلی مرحوم کی گھریلو زندگی کے مناظر زندہ جاوید ہو گئے ہیں۔"

مسلم معاشرے پر مصور غم کا احسان
شجاع احمد خاں ——— امروز کراچی ۲ فروری سنہ ۶۳ء

ناولوں کے پلاٹ

مصور غم کے ناولوں کے پلاٹ اصلاح معاشرت اور درستی اخلاق یا تاریخی واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ جدت، ندرت، تنوع اور واقعات کی دلآویزی ان کے ناولوں کے پلاٹ کی خصوصیات ہیں۔ بعض بعض ناولوں کے پلاٹ میں یک رنگی بھی ہے۔ لیکن اُن کی اوریجنلٹی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ واقعات اور اُن کی تفصیلات موقع اور محل کے اعتبار سے ہیں۔ ایک بیان دوسرے بیان کی تردید نہیں کرتا مناظر کشی کے اعلیٰ نمونے ہر ناول میں ہیں۔

مبصرین کی رائے

"مولانا نے لوگوں کے دل بہلاوے یا دل لگی کے سامان پیدا کرنے کے لئے ناول نہیں لکھے تھے۔ بلکہ انہیں معاشرت کی اصلاح مدنظر تھی۔ اگرچہ ان کا مصور غم ہونا ناگزیر تھا۔ لیکن ان کے قلم میں تحریک خنداں کا عنصر بھی تھا۔ پھر ناول تنقید کی کسوٹی پر بھی پورے اترتے ہیں ناولوں کی فضا بالکل قدرتی یا واقعی ہوتی ہے۔ کردار نگاری کا یہ حال ہے کہ ان کے کسی ناول کو جانچیں تو اس میں کمزوری نہ ملے گی۔ واقعات زندگی سے قریب تر ہیں کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پلاٹ کا سلجھاؤ اور ان کے ارکان کی ہم آہنگی ان کے ناولوں کا امتیازی وصف ہے۔ اپنے ناولوں میں مولانا مرحوم قاری کے جذبات اور احساسات پر مکمل تسلط جما لیتے ہیں۔ اور قاری کی شخصیت شعوری طور پر ان کی افسانوی تخلیق کا ایک جز بن جاتی ہے۔ اور وہ بے ساختہ قصہ کی رَو میں کود پڑتا ہے۔ افسانے کا یہ مقناطیسی اثر مولانا کے ناولوں میں اکثر اور بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور یہی ان کی ناول نگاری کا کمال ہے۔"

ہفت روزہ قندیل لاہور ——— ۱۱ فروری سنہ ۵۱ء

"واقعات کے تمثیلی DRAMATIC پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں مولانا مرحوم اُردو ناول نویسوں میں جس قدر کامیاب ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور یہی مولانا کا مخصوص طریقہ کار ہے۔ وہ اپنے ناول میں اپنی حیثیت کو پس پشت رکھتے ہیں اور اپنے کرداروں کو بغیر کسی ترجمان کے اپنے اثرات و کیفیات خود ظاہر کرنے دیتے ہیں...... ناول کی جان پلاٹ ہوتا ہے۔ اس ربط و تسلسل کا لحاظ ضرور بالضرور ہے۔ واقعات و حالات کے نشیب و فراز میں پڑ کر سلسلہ اکثر چھوٹ جاتا ہے۔ اور ربط کا خون ہو جاتا ہے مولانا کے ناول اس سقم سے پاک ہیں۔ مولانا ایک پیغام اوب تھے۔ اور اس لحاظ سے پیغام پہنچانا ذرا مشکل تھا لیکن جس خوبی سے مرحوم نے اس مشکل کو حل کیا ہے صرف انہیں کا حصہ تھا۔

شہر بانو مظفر پور بہار ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"ناول نگار کی حیثیت سے علامہ راشد الخیری دنیا کے عظیم ناول نگاروں میں سے ہیں"

اشاعت حسین - انگریزی روزنامہ
سندھ آبزرور کراچی ——— ۳ فروری سنہ ۵۱ء

"ناول ذہن کی بڑی سے بڑی طاقتوں کا مظہر ہے جس کے ذریعہ انسان کی مکمل واقفیت اس کے بیم و رجا اور سرشاری و غم کے تنوعات کی ترجمانی کی جائے۔ اور بذلہ سنجی اور جودت و فطانت کے شاہکار فصیح اور دل پذیر زبان میں دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں ۔ سے تعریف تسلیم کیا جائے یا ایک معیار۔ مصور غم کے ناول اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے ہاں منتہا صرف ایک ہوتا ہے فضا بالکل قدرتی یا واقعی ہوتی ہے۔ پشتانہ یا پس منظر جہاں کہیں ہے بجا تھا اور پیش منظر پر چھایا ہوا نہیں۔ کردار نگاری کا یہ حال ہے کہ ان کے کسی ناول کو اٹھا لو اور اپنے سے اچھے ذوق والے سے ملا لو۔ اس بارے میں پیچھا نہیں رہے گا۔ واقعات وہ آتے ہیں جن کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پلاٹ کا سلجھاؤ اور اس کے امکان میں حشو و زوائد سے پرہیز ان کے ناولوں کا امتیازی وصف ہے"

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ——— عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

۴ - افسانہ نگار

ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار تھے اور علامہ راشد الخیری اردو کے پہلے مختصر افسانہ نگار — بزلی گزٹ میں ان کا جو ناول یا افسانہ "حسن و میمونہ" ۱۸۹۳ء یا ۱۸۹۴ء کے قریب نامکمل شائع ہوا وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے بعد جو مضامین یا افسانے اس اخبار یا کسی اور پرچے میں شائع ہوئے (جیسا کہ مولوی محمد احسن وکیل کا بیان پر جو پہلے درج کیا جا چکا ہے) وہ بھی محفوظ نہیں لیکن ۱۹۰۳ء میں جو افسانہ نصیر و خدیجہ کے عنوان سے رسالہ مخزن لاہور میں شائع ہوا تھا وہ کتاب مسلی ہوئی پتیاں میں محفوظ ہے اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ ہم علامہ مغفور کو اردو کا پہلا مختصر افسانہ نگار کہتے ہیں۔ ان سے پہلے دل بہلانے کے لئے داستانیں تھیں حکایتیں ... لکھی گئیں جو فطرت انسانی، تعلیمات اور مشاہدات کے خلاف غیر ممکن الوقوع باتوں سے بھری ہوئی تھیں علامہ مغفور نے اصلاحی مقصد کے پیش نظر صحیفہ نگاری اور جذبات نویسی سے کام لیا۔ اور ... غم نگاری کے پیرایہ میں مختصر افسانہ کی بنیاد ڈالی ... زندگی کے کسی پہلو کا جو تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ ... جس میں مقتضائے حال کے مطابق خوشی و ... کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو۔ دلآویز الفاظ میں ایسا ... ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے مختصر افسانہ کہا جاتا ہے۔ کامیاب افسانہ وہی ہے جس کا ہمارے دل پر کوئی ... پڑے جس سے زندگی کی گتھیاں دور ہونے میں ... مصور غم کے افسانے ہماری ہی طرح چلتے پھرتے والے ... اور ہمارے ہی زمانے اور ہمارے ہی ماحول کے انسانوں کے واقعات ہیں۔ مصور غم کے افسانوں کا موضوع ... وعشق یا سراغ رسانی اور جاسوسی یا ہیبت ناکی نہیں ہماری معاشرت کی اصلاح اور ہمارے اخلاق کی درستی ہے۔ جوہر عصمت۔ سیلاب اشک۔ طوفان اشک۔ خدائی راج۔ نسوانی زندگی۔ گلدستہ عید۔ گرداب حیات۔ بساط حیات۔ بیلہ میں میل۔ سات روحوں کے اعمالنامے۔ حور اور انسان۔ نشیب و فراز غرضکہ مختصر افسانوں کے کسی مجموعہ کو لے لیا جائے۔ پلاٹ۔ زبان اور بیان۔ منظر نگاری۔ مکالمہ۔ کردار نگاری کسی چیز کی کمی نہیں۔

مکالمے — علامہ مغفور کے مختصر افسانوں کے مختلف مجموعوں کے چند چھوٹے چھوٹے مکالمے

ان موقعوں پر پیش کئے جاتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ علامہ مغفور کے افسانوں میں ڈرامائی عنصر کس قدر کامیاب تھا۔

گنواری: "سرکار! تمھاری لونڈی کے مرا ہوا بچہ ہوا۔ کا جیور دیدو تو دو درمن ہوجائے۔ پیسہ پیسے نہیں۔ حالت خراب ہو رہی ہے۔ جیور دا کی ماں کا ہے یا رخت نہیں تو کب کام آوے گا"

بیگم: "تجھ کو اندر آنے کی اجازت دربان نے کیوں دی۔ یہ وقت مرنے جینے کا ہے۔ دیوانی بھاگ جا۔ کل آیو۔ دیکھی جائے گی"

گنواری: "اجی سرکار کل تو وہ مرجائے گی جیور نہیں تو دو چار روپیہ ہی دے دو یا مخنسہ دیکھو۔ دوائی لانی ہے"　　　(چہار عالم)

انجم: "بڑھیا تیری عقل تو نہیں جاتی رہی اندر جاکر کیوں نہیں کہتی کہ داروغہ جی کی صاحبزادی آئی ہیں"

بڑھیا: "بیوی واہ! کہوں کس سے اور جاؤں کیوں کر دیوار پھاندوں سے کہوں یا کواڑوں سے۔ دروازہ بھڑا ہوا۔ کنڈی لگی ہوئی۔ آدمی کا نام نہیں۔ چیخنے کو چیخے جائں۔ یہ بھی کسی کے ہاں آنے کا وقت ہے"

انجم: "تو میری دادی ہے یا نانی۔ وقت کی ٹوکنے والی تو کون؟ مردار کنڈی کیوں نہیں کھٹکھٹاتی؟"

بڑی بی: "بھلا بیوی اس خواہ مخواہ کے غصہ سے حاصل کیا۔ کمہار پر بس نہ چلا گدھیا کے کان امیٹھے قصور اپنا غلطی اپنی سر ہوگئیں میرے"

انجم: "بڑھیا کم بخت۔ نمک حرام۔ بے وقوف چڑیل اتنی جوتیاں ماروں گی کہ بھیجا نکل پڑے گا۔ جا نکل یہاں سے خبردار جو صورت دکھائی ہو گی۔ کہاروں تم کنڈی کھٹکھٹاؤ"

کہار: "سرکار اتی دیر سے جنجیر کھٹکھٹا رہے ہیں۔ کوئی سُنے ہی نہیں تو ہم کا کرے"

انجم: "ارے تو بے ایمانوں کسی سے پوچھو تو سہی کہ ڈاکٹر صاحب کا گھر یہی ہے"　　　(اگر داب حیات)

جوگی: "مہارانی ہم جنگل کے باسی اس سونے روپیہ کو کیا جانیں۔ تیرا دھن دولت تجھ کو مبارک ہو"

رانی: "مہاراج میں دُکھیاری ہوں۔ میرا یتیم مجھ سے چھوٹ گیا۔ مجھ پر دیا کرو۔ اور اپنی بپتا سُنادو"　　　(جوہر عصمت)

ماں: "میرے چاندا بھی روٹی پکاتی ہوں تو اٹھو پانی لاؤ۔ آٹا گوندھوں"

بچہ: "آٹا کہاں ہے! ہنڈیا خالی پڑی ہے۔ پیسے لاؤ مُرلی سے آٹا لے آؤں"

ماں: "چندا میرے پاس پیسے نہیں ہیں یہ پیک لے جاؤ صرّاف کو دینا وہ جتنے پیسے دے اُس کا آٹا لے آنا"

بچہ: "اماں بیگم! میں اتنی دُور جاؤں"

ماں: "میں دروازے پر کھڑی ہوں جاؤ بھاگ کرکے آؤ شاباش شاباش"　　　(بساط حیات)

احسن: ...... اصل بات یہ ہے کہ میرا فیر آج تک خالی ہی نہیں گیا۔

میر صاحب: "اے سرکار آپ کی بات آپ کے ساتھ ہے۔ حضور کا تو ارادہ ہی شکار کے واسطے ملک الموت ہے۔ ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں دو شخص ہیں ایک تو نظام حیدرآباد اور ایک حضور جن کا نشانہ خطا ہی نہیں ہوتا۔"

احسن: "مجھے تو انگریزوں پر تعجب ہے کہ وہ بھی تیرے نشانہ کی تعریف کرتے ہیں۔"

میر صاحب: "جی ہاں کلکٹر کے خانساماں نے مجھ سے خود کہا کہ صاحب تعریف کرتے تھے۔"

احسن: "یہ لوگ اصل میں بٹیرے کے قدردان ہیں پچھلے موقعہ پر صاحب کے ساتھ میں نے بھی کئی فیر کئے۔ یہ اتفاق تھا کہ سب کے سب خالی گئے۔ مگر صاحب نے بٹیرا بہت پسند کیا۔"

میر صاحب: "حضور یہ تو حکومت ہی بٹیرے کی کرتے ہیں۔ جو دن رات قواعد اور پریڈ ہوتی ہے یہ ہے کیا؟ بس بٹیرا" (جوہر عصمت)

ما: "سلطان چندا جی کیسا ہے؟"

بچہ: "اُنہہ۔ اُنہہ۔ ام۔ ما"

ما: "بیٹے کیسا جی ہے؟"

بچہ: "اما دلد ہوتا ہے۔ ناگلے میں" (نسوانی زندگی)

تھانہ دار: "اگر ہم تجھ کو ایسی ترکیب بتا دیں کہ تیری تمام تکلیفیں رفع ہو جائیں تو بھی مزے کرے اور تیرے بچے بھی تو کیا دلوائے گا"

عبداللہ: "بھلا سرکار میں کس قابل ہوں حضور کی کمائی ہم غریبوں کا سا جھا ہے حضور کے نمک

ہم پل رہے ہیں۔ میں کیا دوں گا۔ معصوم بچے غرم اور میری زبان ہمیشہ دعا دے گی۔"

تھانہ دار: "سُن اس وقت یہاں میرے اور تیرے سوا کوئی نہیں۔ یہ بر قند از بھی غیر نہیں دیکھ تو نے سُنا ہوگا قلعہ معلّٰی میں قتل ہوا ہے۔ تو تو اس کے قتل کا اقرار کر لے۔ یہ دیکھ مسجد کی طرف منہ کر کے کہتا ہوں جو تیرا بال بھی بیکا ہو جائے۔ پیسے دس روپیہ لے جا۔ باقی۔ ہم اور دوں گا" (نسوانی زندگی)

"ستو اور گڑ تھیلی میں بھر دئے تھے۔ بیس دن چل ہی جائیں گے۔ دریا بھی تو تین تین رکھے ہیں۔ اللہ کرے پاٹ زیادہ نہ ہو۔ کہتے تھے اگر ہوا چڑھاؤ پر نہ ہوا تو اللہ چاہے اکیسویں یا بائیسویں روز پہنچ جاؤں گا۔ فقط آٹھ دن وہاں ٹھیرنا ہے۔ لوٹتے ہی پاؤں آؤں گا۔"

ماں: "اری بیٹی بنگالہ کیا یہاں رکھا ہے۔ کالے کوسوں جانا اور آنا اور پھر سفر کا معاملہ کہنے کو دن ہیں۔ دکھ بیماری۔ چوٹ چپیٹ ہزاروں باتیں ہیں۔ اللہ امی جی سے گھر لے آئے تو جانوں کہ آگئے"

بیٹی: "ہاں یہ تو ٹھیک ہے آج تک کبھی ایسی نوکری نہ لگی تھی۔ دو دو تین تین دن کو تو چلے جاتے۔ مگر یہ مہینوں کی مصیبت کبھی نہیں آئی"

ماں: "تنخواہ کو کہہ گئے تھے کہ تم جا کر کوتوال صاحب سے لے آنا۔ میں گاڑی والے سے کہہ چلا ہوں۔ آج دن بھر یہی سوچتی رہی مگر میری تو بیٹی ہمت نہیں پڑتی۔ پھر خیال آتا ہے کہ نہ جاؤں گی تو کھاویں گے کیا۔ آٹا تو صبح تک کا اور ہے دال بھی ختم ہو گئی۔

لاؤ کل چلی جاؤں"
بیٹی: "جانا ہے تو پھر آج ہی ہو آؤ۔ ابھی عصر کی اذان
بھی نہیں ہوئی، جاؤ گاڑی والے کو دیکھو تو ہے بھی یا
نہیں گیا ہوا ہے۔ اگر آپ چلا جیسے خیر نہیں تو اس سے
پوچھو لو کہ کب لے جائے گا۔ وہ بھی کوئی نوکر تو ہے نہیں
اپنے پیٹ کے دھندوں سے چھٹکارا ہو گا تو تمہارا
کام بھی کر دے گا"

بیوی سلام: "سلام تو کیا اب کیسے آئیں؟
مشاطہ: لیجئے یہ کشتیاں اتروائیے، چار ہیں ایک
اشرفیوں سے لبریز ہے۔ ہزار اشرفیاں فقط منہ دکھائی
کی ہیں ایک میں زربفت و کمخواب کا کارچوبی جوڑا ہے
ایک میں صرف سونے کا زیور اور ایک میں نقد روپیہ
خدا کی شان دیکھو سارا اکبر آباد تو کوتوال کی مٹھی میں
لوگ صبح سے شام تک اس انتظار میں کہ کوئی حکم ملے
تو تعمیل کریں رئیس اور نواب اور امیر اور جاگیر دار
بیٹیاں دینے کو حاضر اور کوتوال کا دل آیا تو کہاں،
وہی بات ہے راجہ کے گھر آئی رانی کہلائی۔ لو بیوی خدا
تم کو مبارک کرے نہا دھو کر جوڑا بدلو یہ زیور پہنو اور
تھوڑی دیر کے واسطے چلی چلو، کیا تقدیر جاگی ہے۔
واہ واہ اسے کہتے ہیں مقدر کہ بلدی لگے نہ پھٹکری گھر
بیٹھے خدا یوں چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ایسی ایسی
لڑکیاں سعد اللہ خاں کے دربار میں سینکڑوں آئی ہیں
مگر وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ایک اس
جوڑے اور گہنے پاتے ہی پر کیا وہ تو مالا مال کر دیگا
دولت پھاوڑوں کا سے کٹے ہی گی نہیں۔ دھکے
دو گی اور نہ نکلے گی، اور میاں کیا نرا سپاہی ہے گا

ارے بی اس کو تو سمجھ لو کہ تھا نہ دار ہو گیا۔ اور یہ دیکھو
سعد اللہ خاں فرشتہ آدمی ہے فقط صورت کا بھوکا
اسے اور کچھ نہیں چاہیئے بس دور سے سلام کر کے بیٹھیں
میں بیٹھو اپنے گھر آ جاؤ" (جہانگیری محل)

"اری محمدی کیا ہوا اماں کیسی ہے؟
محمدی: "بیوی وہ تو اللہ کے ہاں گئیں"
بیوی: انا للہ و انا الیہ راجعون پھر اب
گھر میں کون کون ہے"
محمدی: "کوئی نہیں میں ہی ہوں۔ خبر نہیں کیا کیا
کرتے ہیں"
بیوی: "ہائے کیا جنتی بیوی تھی۔ تیس برس میں کبھی
ایک چیتھڑا تک ادھر سے ادھر نہ کیا۔ ٹھہر جا بیٹی میں
چلتی ہوں۔ جا ڈولی لے آ"
بڑے لڑکے کو ساتھ لے وہاں گئیں۔ اپنے ہاتھ سے
نہلایا دھلایا۔ اپنے پاس سے گور و کفن کیا اور مغرب سے
پہلے اپنے گھر چلی آئیں۔ عشا کی نماز سے فارغ ہو کر
میاں بیوی میں یہ باتیں ہوئیں:-
میاں: "شادی کی تاریخ تو اب قریب آ گئی۔ یہ
سات سو روپے موجود ہیں۔ اس میں سب کام کرنے
ہوں گے"
بیوی: "(ہنس کر) تم اپنا جی نہ کڑھاؤ۔ جس وقت صالحہ
پیدا ہوئی تھی اسی دن سے آج کا دن میرے سامنے
تھا۔ جو کچھ ہو سکا جوڑ جاڑ کر رکھا ہے۔ کپڑے کا تو
زیادہ فکر نہیں چودہ جوڑے تیار ہیں۔ فقط ایک
پر معاملہ نہیں ہے اس میں سے پانسو کا زیور کر دو
دو سو اوپر کے لئے رکھ لو۔ سوا چار سو میرے پاس اور ہیں
(عروس مغرب)

"یہ مکالمے مختلف طبیعتوں، مختلف حیثیتوں، مختلف عمروں اور مختلف ماحول کے افراد کے ہیں اور واقعیت و اصلیت پر کس قدر مبنی اور کس قدر نیچرل کہ اس کے آگے انشا کا نام کر [illegible] جس طبیعت اور جس حیثیت جس عمر اور جس ماحول کے جس شخص کی گفتگو دکھائی ہے۔ ہو بہو نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے جہاں شک و شبہ کی گنجائش کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ کمال فن اس کے آگے عاجز و مجبور ہے۔ علامہ مغفور کے کمال مکالمہ نویسی کے اس اعتراف کے ساتھ ساتھ ہم اُن کے ناولوں اور افسانوں میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کہیں کہیں مکالمہ طویل ہو گیا ہے اور فنی قیدیں توڑ دی گئی ہیں۔ لیکن کسی مقصد کے تحت فن کو توڑ دینا بذاتِ خود ایک بڑا فن ہے۔ ان افسانوں کا مقصد محض ہمارا دل بہلانا نہیں سوسائٹی کی اصلاح۔ ہماری معاشرت۔ ہمارے اخلاق ہمارے خیالات کی درستی ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کرداروں سے کہلواتے ہیں۔ اُن کی حزنیہ نگاری میں جو شدت ہے اس کے ساتھ جب ان کی مکالمہ نویسی کی قابلیت و کمال سامنے آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ڈراما نویس کیوں نہ ہوئے۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو ان کی قوم ان سے ڈراما ہی لکھواتی۔ ہمارا ملک اگر ناقدرشناس نہ ہوتا اور مولانا نے ڈراما کی طرف توجہ کی ہوتی تو وہ ہندوستان کے اوریجنل اور پہلے ڈراما نویس ہی نہ ہوتے بلکہ انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے ڈرامہ نگاروں کی صف میں جگہ پائی ہوتی۔ ڈرامہ کے لئے جو عناصر ضروری ہیں وہ مولانا کی تحریر میں جمع تھے"

[illegible] اکبر آبادی ـــــــــــ عصمت اگست ۳۶ء

"حال ہی میں ایک انگریزی پرچے نے علامہ راشد الخیری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان کے مکالمے زیادہ مؤثر نہیں ہوتے اور نہ وہ مکالمے کو اس کی صحیح صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ایسی تحریریں پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بعض ناقدین بغیر سوچے سمجھے بغیر کتاب پڑھے [illegible] ہوئی باتوں کو ہو بہو نقل کر دیتے ہیں۔ مولانا [illegible] مکالمے اس قدر نیچرل اور مؤثر لکھتے ہیں کہ [illegible] سخت دل کے بھی آنسو نکل آتے ہیں اور یہ [illegible] مکالمے کی خوبی ہے"

سید محمود مورخ بی اے ـــــــــــ ساقی ستمبر [illegible]

"مولانا کو مکالمہ نگاری اور ڈرامائی انداز بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ مثال کے طور پر [illegible] سے حسن اور شاہدہ کا مکالمہ ملاحظہ فرمائیں"

مولانا حامد علی خاں ـــــــــــ ساقی راشد الخیری [illegible]

"اس کو میں مولانا راشد الخیری کی خوبی سمجھتا ہوں وہ مکالمہ طویل دینے کے لئے اس طرح لاتے ہیں کہ قاری کو ناگوار نہیں ہوتا .... علامہ راشد الخیری کے مکالمے حسب موقع آتے ہیں اور وہ قصہ میں بالکل پیوست ہو جاتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ان سے واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور کہیں کہیں وہ کردار کی خوبیوں کو اور نمایاں کرتے ہیں"

اویس احمد ادیب ـــــــــــ (ساقی ستمبر [illegible])

منظر نگاری

قدرتی مناظر کی مصوری میں مصور غم کو خاص ملکہ تھا۔ ان کا شاید ہی کوئی ناول یا افسانوں کا مجموعہ ہو جس میں مناظر کشی کے بہترین نمونے نہ ہوں۔ ذیل میں ہم علامہ مغفور کے مختصر افسانوں سے چند اقتباسات دیتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا کہ مناظر کشی میں انہیں کس قدر کمال تھا۔

[ا]نسان کی گود میں محبت شب کے مدہم مدہم ہونے کا
[اعل]ان کر رہی تھیں۔ رات ختم کے قریب تھی۔ مؤذن صلوٰۃ
[ش]ب کی تیاری میں مصروف تھا۔ پرندے گھونسلوں
میں اور ننھے ننھے بچے اپنے بستروں پر کلبلا رہے تھے
نسیم صبح اپنے زلفوں کی آرائش کے بعد ٹہلتی اور مسکراتی
اس دریچہ میں داخل ہوئی جہاں انسان کی صورت
میں آسمانی حور اور عورت کی ہیئت میں قدرت کا
بہترین تحفہ حمیرا اپنے شوہر کے قدموں پر منہ رکھے
چپ چپ آنسو گرا رہی تھی۔ نسیم صبح کے پہلے جھونکے نے
آگے بڑھ کر شوہر کے پاؤں چومنے والی لڑکی کے منہ
کو بوسہ دیا۔ اور ان لاتعداد پھولوں کی خوشبو جن میں
وہ بسا ہوا تھا اس کے نازک لبوں پر قربان کر دی"

—— (خدائی راج ص۱۱)

"یعنی فلکی جو شام کے وقت سرخ لباس میں ملبوس
ہو رہا تھا دنیا کی آنکھوں سے رخصت ہو چکا اب
کائنات رات کی سیاہ چادر میں چھپی ہوئی ہے اور
آج صبح سے حمیرہ کا مریض بھی عالم بقا کی تیاریاں کر رہا
ہے"

—— (خدائی راج ص۹)

"گرمی کی مختصر راتیں آ اور جا رہی تھیں۔ چاند چمک چمک
کر چھپتا اور تارے دمک دمک کر ڈوبتے تھے۔ شام
کا دھانی جوڑا رات کو غوانی ہوتا تھا جس کو باد سحر
نورانی چادر اڑھا کر سفید براق بنا دیتی تھی۔ گوشہ کائنات
کا ہر ذرہ نشو و نما کی منزل پر کلیلیں کرتا انحطاط کی طرف
جا رہا تھا۔ گنگا کی طغیانی اور سر بفلک لہریں پیش
خیمہ تھیں۔ خاموشی اور خشکی کا غضب سیاہ نتیجہ تھی۔
صبح صادق کا اور بہار چمن دیباچہ خزاں کا چنبیلی کے
نازک پھولوں پر بجلی رات رات بھر کوندی اور دن
بھر چمکی۔ آتشبازی بجلی پر بادل گھنٹوں گرجا۔ رعد
دہل کر رہ گیا۔ ہوا کے سرد قہقہے فضا کے عالم میں مدہوش
شب گیسو نچے مگر جوانان چمن کی رفتار میں فرق نہ تھا۔
بلبل شاخ گل پر گھنگھور گھٹاؤں میں چہکی اور گلاب
کا کلیوں کے روبرو موسلادھار بارش میں مہکا۔
لیکن مستقبل کا ہر لمحہ چمنستان حیات کے بسنے والوں
سے کوسوں دور تھا"

—— (سیلاب اشک چوتھا ایڈیشن ص۶)

کائنات کا مطالعہ علامہ مرحوم نے نہایت گہری
نظر سے کیا تھا۔ جس کا ثبوت ہمیں ان کے متعدد ناولوں
اور افسانوں میں ملتا ہے۔ قدرتی مناظر کی مصوری ان کے
افسانوں کا بہت اہم جزو ہے۔ لیکن انسانی کیفیتوں
کے نقشے بھی ایسے ایسے کھینچے ہیں کہ زبان سے واہ
نکلتی ہے اور دل سے آہ:-

"عورت جس کی گود میں سال بھر کا بچہ تھا اور جس کے
برابر ایک تین سال کا بچہ انگلی پکڑے ادھر ادھر دیکھ
رہا تھا۔ خاموش کھڑی تھی۔ مختلف قسم کے جذبات
رہ رہ کر اس کے چہرے کا سرورق بتاتا تھا کہ وہ
واقعہ کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے واسطے تیار ہے۔
کبھی نسوانیت کی خاموش ادائیں اور مستقبل کا خوفناک
منظر قلب اور دماغ دونوں کو کپکپا دیتا تھا اور ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ مقابلے کے ہتھیار علیحدہ رکھ کر اس نے
دشمن کے سامنے اپنی گردن جھکا دی ہے"

—— (سیلاب اشک چوتھا ایڈیشن ص۲)

"اب ایک نسوانی کمزوری اس کے چہرے پر نمودار
ہوئی۔ منت سماجت کی لہریں اس کے رخساروں پر
خاموشی کے ساتھ دوڑنے لگیں۔ اس کا بدن کانپنے لگا

اور آنسوؤں کے چند قطرے آنکھوں سے نکل کر
دونوں رخساروں پر آگئے۔ اس نے رومال سے نہیں
اپنے میلے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔ شاما کا غم
بلند تھا۔ جس کے آخری دو ٹکڑوں نے اس کے جسم
میں ایک عجیب روح پھونک دی۔ اس نے آنسو پونچھ
کر اپنی نگاہ بلند کی اس شوہر کی طرف جس کے وہ
لفظ محبت کے تعلق نکاح کے رشتے اور بارہ سال
کے واسطہ کو ختم کرنے والے تھے"

(سیلاب اشک)

ناقدینِ ادب کی رائیں

"مولانا مرحوم کی تصانیف میں تقریباً تمام محاسن بیان پائے جاتے ہیں۔ منظر نگاری کو لیجئے مرحوم نے اپنی تصانیف میں ایسے گوناگوں مناظر قلمبند فرمائے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر چشم تماشا متحیر رہ جاتی ہے بنت الوقت میں طوفان کا سماں ملاحظہ ہو:-

"پانی کی یہ آفت تھی کہ گھروں میں اور سڑکوں پر ٹخنے ٹخنے اور کمر کمر پانی ہی پانی تھا۔ ہماری آنکھیں وہ جھڑیاں جن کو اب آنکھیں ترستی ہیں پندرہ پندرہ روز تک پانی کو جل تھل دیکھ چکی ہیں۔ مگر یہ دھواں دھار پانی ایسا پڑا کہ خلقت چیخ اٹھی۔ عصر کے وقت خاصا اچھا صاف آسمان تھا۔ ایکا ایکی نہ معلوم کہاں سے قبلہ کی طرف گھٹا اٹھی۔ دن بے شک برسات کے تھے۔ آدھا ساڑھ اور آدھے سے زیادہ ساون اس طرح نکل گیا کہ پانی کی بوند تک نہ پڑی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھٹا کی صورت دیکھنا جائز ہو گئی۔ مسجدوں میں نمازی۔ دکانوں پر کاروباری سڑکوں پر راستہ چلتے۔ دفتروں میں مرد گھروں میں عورتیں اور انگنائی میں بچے ابر کو دیکھتے ہی اچھل پڑے۔

[illegible]

مغرب کے وقت بارش شروع ہوئی۔ رات بھر مینہ پڑتا رہا۔ دوسرا دن۔ چوتھا دن اور پانچواں دن دس روز وہ لگاتار مینہ پڑا کہ خدا کی پناہ۔ [illegible] اوسط درجہ کا شہر تھا۔ دلی جیسی عمارتیں کچی بھی، مٹی اور چونے کی بھی۔ کاغذی محل تھے نہ سنگین قلعے۔ مینہ کا یہ حال کہ ذرا تھمنے کو ہوا کہ پھر ذرا ہلکا پڑا۔ ابھی بس نہ تھا کہ پھر اندھیرا ہو کر آیا۔ اور دھائیں دھائیں پڑنے لگا۔ مینہ سے زیادہ ہوا تھی۔ کہ کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ وہ جھکڑ تھے کہ الامان الحفیظ ساتویں روز آدھی رات کے وقت اس زور کا پانی پڑا سب کو دیکھا نہ سنا۔ مکان بول اٹھے اور خلقت چیخ اٹھی ہر طرف سے دھڑاں دھڑاں کی آوازیں آرہی تھی۔ یا اب جان کے لالے پڑ گئے۔ تو جس کے جہاں سینگ سمائے گھس گیا کہ کسی طرح جان تو بچے۔ تین دن اور تین رات یہی لت ہی ہوا اس حساب سے چوتھے روز اس حساب سے کہیں گیا دسویں روز جاکر مطلع صاف ہوا تو لوگوں کی جان میں جان آئی مگر کوئی گلی کوئی جگہ کوئی کوچہ اور کوئی بازار ایسا نہ تھا جہاں اینٹوں کے انبار اور مٹیوں کے پہاڑ نہ کھنچے ہوئے ہوں۔ قحط نے پہلے ہی مصیبت ڈھا رکھی تھی۔ طوفان نے اور بھی رہا سہا خاتمہ کر دیا۔ مرمت یا ازسر نو تعمیر تو درکنار اتنا تک پاس نہ تھا کہ ملبہ اٹھوا کر رستے صاف کر دیتے"

مولانا مرحوم نے اشیاء اور مناظر کی مرقع کشی کی طرح انسانوں کے حلیے بھی خوب ہی بیان کئے ہیں۔ بنت الوقت میں ایک بوڑھے مغل کا حلیہ لکھتے ہیں:

"تھے تو بوڑھے اور بڑے ہی پھونس مگر مردانی

کسی بل موجود تھا۔ داڑھی چڑھی ہوئی، مونچھیں
مُڑی ہوئی۔ خضاب لگا ہوا۔ کمر پٹکا بندھا ہوا۔
... اس کیفیت کے انسان اور بگڑے دل آدمی
کر تقریباً اور گفتگو کو چھوڑ کر یا وجود دیکھ جان تمام رعشہ
اور کمر جھک گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں سے بھی وحید جیسے
دکھ بہت تھے۔ آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا"
ایک بڑے میاں کے تیور آپ دیکھ چکے اب نانی
عشو میں ایک بڑی بی کی ہیئت کو ملاحظہ فرمایئے:-
"بی عشو کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی۔ مگر سُرخ
لباس ان کا جزو بدن تھا۔ مسّی کی دھڑی۔ پانوں کا
لاکھا۔ پور پور مہندی۔ الغا روغن تیل اور دُنبالہ دار
کاجل اُن کا ایمان۔ اس پر جھانجن اور پازیب کی
جھنکار ان کی رفتار کا ڈھنڈورا تھی"

پروفیسر علی عباس حسینی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

عصمت

علامہ مرحوم کی افسانہ نگاری پر رائیں | تعمیم

ہند سے پہلے تمام ہندوستان کا نہایت کثیر الاشاعت
اور محبوب و مقبول پرچہ تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ
عصمت ایک ایسا ہتھیار تھا جس نے مردوں عورتوں
کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ لیکن محض یہ کافی نہ تھا
علامہ نے تابڑ توڑ ایک کتاب کے بعد دُوسری کتاب اور
ایک مختصر افسانے کے بعد دُوسرا مختصر افسانہ لکھا۔ یہ کتابیں
اور مختصر افسانے محض معمولی قصّے کہانیاں نہیں بلکہ
ان میں سے ہر کتاب میں مختصر افسانہ موضوع کے لحاظ سے
شاہکار تھا۔ مختصر افسانہ نگاری سے مصور غم کا مقصد
تھا عورتوں کی ترقی اور اصلاح اور نہ اس لحاظ سے
اور نہ کردار نگاری کے، مشرق میں اور نہ مغرب میں

کوئی بھی اُن سے بازی نہ لے جا سکا۔ اور ضخیم سے ضخیم
کتابوں میں وہ بات پیدا کر سکا۔ جو علامہ مرحوم کی
چند سطروں میں ہوتی تھی۔

"دُنیا کی بڑی جنت" میں علامہ نے کہا ہے:-
"میں نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر کائنات کا
مطالعہ کیا۔ میری نظر آبادی میں پہونچی۔ میں نے
دُنیا کے گوناگوں رنگ دیکھے۔ کہیں جنازے قبرستان
جا رہے تھے۔ اور کہیں بماتیں ہشاش بشاش نکل
رہی تھیں۔ میں نے عالی شان محل دیکھے۔ رنج
دیکھا اضطراب دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ پوشیدہ گھر
دیکھا جہاں دو میاں بیوی اطمینان سے بیٹھے
باتیں کر رہے تھے"

"یہ دنیا کی بڑی جنت تھی"

یہ ایک مکمل کہانی ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں
موجود ہیں جو ایک کہانی میں ہونی چاہئیں یہ تو دُنیا کی
کہانی ہے مختصر لیکن مستند اور جامع اور اس قدر جامع
کہ ضخیم سے ضخیم کتاب بھی یہ مقصد پیش نہیں کر سکتی۔ کہ
اس دُنیا میں جنت کیونکر بنائی جا سکتی ہے۔

ترجمہ انگریزی مضمون معنونہ مطبوعہ سنمے آبزرور

از اشارت حسین ——— کراچی ۳ فروری ۱۹۵۱ء

"مولانا راشد الخیری کے افسانوں میں صداقت
ہے۔ درد ہے۔ غصّہ ہے۔ بیچارگی ہے۔ جھنجلاہٹ ہے
جیسے وہ سماج کی بے اثری۔ بے حسی۔ بے دردی سے
نالاں ہیں ...... ان کے جتنے سوشل ناول اور افسانے
ہیں ان میں بھی جوشِ اصلاح لبریز ہے۔ وہ استدلال سے
بھی کام لیتے ہیں۔ نصیحتوں سے بھی حُسنِ بیان سے بھی
اور اسلام کی تاریخ اور روایات اور شرعی احکام سے بھی"

منشی پریم چند ——— (عصمت جولائی ۱۹۳۶ء)

* مولانا کے افسانوں کا ایک ایک فقرہ خود مکمل افسانہ ہے اور اس قابل ہے کہ اس پر صفحے کے صفحے لکھے جائیں پھر بھی مکمل تو بیان پیش نہیں کی جا سکتیں۔ مصورِ غم ایک خاص رنگ ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ ان کا رنگ ان کے ساتھ گیا آج کل تو بدقسمتی سے بزبانِ مولانا:۔

"ادب کے قابل قدر جرائد حُسن فروشوں کے ذکر خیر سے لبریز ہیں۔ کہیں اُنگلیوں کی تھرتھراہٹ ہے کہیں کلائی کی کپکپاہٹ۔ کوئی گردن کی مٹک پر فریفتہ ہے کوئی کمر کی لچک پر"

مصورِ غم کے افسانوں کا دامن مخربِ اخلاق مضامین سے ہمیشہ پاک رہا۔ علامہ کے افسانوں کا ایک قابلِ تعریف پہلو یہ ہے کہ عورت کے ظاہری و مادّی نہیں بلکہ اس کے روحانی حُسن کو سراہا گیا ہے"

ڈاکٹر افضل ...... کریوی ______ عصمت راشد الخیری نمبر

* شعر و شاعری کو اسلام نے سخت ناپسند کیا ہے نصوص قرآنی ہی میں آخر استثنا موجود ہے۔ اور خود رسول اللہ صلعم نے اسلام کی ہجو گوئیوں کے جواب میں حسان سے نظمیں کہلوائی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا شاعری بھی بعض حالات میں جائز ہو نا کیا عبادت بن جاتی ہے اور جب یہ اصل مسلّم ہو چکی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو میں راشد الخیری کی افسانہ نویسی بھی اپنی جگہ پر ایک عبادت دینی خدمت نہیں؟"

مولانا عبدالماجد دریابادی ______ (عصمت فروری ۱۹۳۶ء)

" اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں میں جتنے مقبول مولانا راشد الخیری کے افسانے ہوئے ہیں اتنے اور کسی اہلِ قلم مصنف کے نہیں ہوئے تو مبالغہ نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگر یہ کہا جائے کہ مولانا راشد الخیری مرحوم سوشل ریفارمر تھے تو عین درست ہوگا۔ مرحوم کے قلم سے نکلے ہوئے دردناک الفاظ ہر دردمند مسلمان استریل اور نمک و شریف مسلمان مردعل کے دلوں پر نقش ہو جانے سے بہت سے نتائج مرتب ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوؤں کو مولانا کے انتقال کا اس وجہ سے بھی رنج ہے کہ دلّی کی ٹکسالی اُردو کا ایک باکمال اُٹھ گیا۔"

ٹھاکر جے آر رائے لاہور ______ (ملاپ ... ۱۹۳۶ء)

" اُنہوں نے اُردو زبان کی صنفِ افسانہ نویسی کو ایسے طرزِ جدید کا اضافہ کیا جو ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اُنھوں نے فسانہ کے رنگ میں جو اصلاحی خدمات کی ہیں وہ رہتی دُنیا تک ان کے نام کو زندہ رکھنے کو کافی ہے۔"

الجمعیۃ دہلی ______ ۹ فروری ۱۹۳۶ء

* وہ اکثر افسانوں میں قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہاں (بوسۂ ندامت تمدن ۱۹۱۵ء) مصنف کہیں بیان نہیں کرتا کہ ضمیر نے اپنا صور پھونکا۔ لیکن مواقع ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ پڑھنے والا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بیوی کو دیکھ کر صحبتِ دیرینہ یاد آ جاتی ہے۔ اور دل میں ہنگامی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ضمیر پہلے واقعات سناتا ہے۔ اور طنز کے نشتر سے چھیڑتا ہے۔ ان کے بعض افسانے اس افسانہ کی طرح "سکون" پر آ کر ختم ہوتے ہیں اور بعض منتہا (CLIMAX) پر جہاں طبیعت پر اس کا اثر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔ ان کے پلاٹ کا جزوِ اعظم یہ ہے کہ آخر تک یہ پتا نا مشکل ہوتا ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "ہمارے افسانے کے مصنف کا مطالعہ معلوم ہوتا ہے چند رسائل تک محدود ہے۔ جتنی فن کی نزاکتیں اور بلندیاں علامہ راشد الخیری کے افسانوں میں پائی جاتی ہیں گنتی کے چند اور افسانہ نگاروں میں ہیں۔

حضرت علامہ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر افسانہ لکھتے ہیں۔ اور جہاں مناسب موقع ہوتا اس کا اظہار کر دیتے ہیں مگر اس طرح کہ افسانے کی تعمیری شان CONSTRUCTION VALUE دوبالا ہو جاتی ہے۔"

صادق الخیری ——— ساقی راشد الخیری نمبر

"اُردو میں افسانہ نگاری کا آغاز علامہ مرحوم ہی کے بابرکت ہاتھوں میں ہوا۔ مختصر افسانہ ایک جُداگانہ فنی حیثیت رکھتا ہے۔ قصے کہانیوں کا رواج تو غالباً ابتدا آفرینش ہی سے چلا آتا ہے۔ داستان گوئی داستان سرائی کا رواج بھی قدیم ہے۔ لیکن مختصر افسانہ کو اس صدی کی ایجاد کہنا چاہیئے۔ اُردو کے پہلے افسانہ نگار علامہ راشد الخیری مرحوم ہیں۔ ان کے افسانوں کے بے شمار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "غدائی راج" ان سب مجموعوں سے ممتاز ہے۔ اور سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ جس قدر آرٹ کی پختگی ان افسانوں میں نظر آتی ہے ان سے پہلے کے افسانوں میں نظر نہیں آتی۔ مولانا اپنے افسانوں کے پلاٹ ملکی گھرانوں کے واقعات ہی سے مرتب کرتے تھے۔ وہی واقعات ہیں جو ہم سب کی نظروں کے سامنے رونما ہوتے ہیں۔ اور ہم کبھی گمان بھی نہیں کر سکتے کہ یہ واقعات کسی عمدہ افسانہ کا موضوع بن سکتے ہیں۔ لیکن مولانا انہیں روزمرہ کے واقعات کو اس طرح افسانے کے قالب میں ڈھالتے ہیں کہ بالکل ایک نئی چیز بن جاتے ہیں، لکھنے کا انداز اس درجہ دلنشین اور موثر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا فسانہ نگار سے کہیں اختلاف نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے علم کی روانی کے ساتھ پڑھنے والے کے خیالات بھی بہہ جاتے ہیں۔ سٹائل یعنی اسلوب بیان کے معاملہ میں مولانا منفرد ہیں۔ اور رنگین بیانی کے اعتبار سے اُردو کا کوئی مصنف ان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پلاٹ خواہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو مولانا اپنے طرز بیان سے اتنی دلکشی پیدا کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا افسانہ شروع کرنے کے بعد اس کو ختم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مولانا ایک اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے اور انسانی نفسیات کا مطالعہ اور مشاہدہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے دَوران مطالعہ میں طبیعت نہیں اُکھڑتی۔ . . . . . "خدا فراموش" کا آغاز دیکھئے . . . . . ان سطور کو پڑھنے کے بعد کون ہے جو کتاب بند کر کے کسی اور کام میں لگ جائے۔ یا "باسٹھ برس کے تین دن" کی یہ چند سطریں پڑھنے کے بعد کون ہے جو باقی افسانہ پڑھنے کے لئے بے قرار نہ رہے . . . . . افسانہ نگاری میں نفسیاتی تحلیل کا جزو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ علامہ موصوف صرف مصورِ غم ہی نہ تھے بلکہ جملہ جذبات و احساسات کی تصویریں ان کے افسانوں میں نظر آتی ہیں"

مولوی شاہ احمد ایڈیٹر ساقی ——— عصمت فروری ۳۹ء

"مصورِ غم کے افسانہ کا عنوان نہایت ہی دلکش ہوتا ہے۔ جیسے "بلوچن کے تین رنگ"، "طاقن کا سفید بال"، "اس مسکراہٹ کی قیمت" وغیرہ افسانہ کی ابتدا ڈرامائی ہوتی ہے۔ مصورِ غم شروع ہی میں افسانہ کی ہیروئن سے تعارف کرا دیتے ہیں اور پڑھنے والا اس کے اور واقعات زندگی جلدی سے پڑھ لینا چاہتا ہے۔ نیز افسانہ ختم کئے اسے چین ملتا ہی نہیں۔ علامہ کا افسانہ غمناک اور المیہ اور سبق آموز ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والا افسانہ پڑھنے کے بعد بھی اپنے کو افسانے کے ماحول سے جلد جُدا نہیں کر سکتا۔ اور افسانہ کی نصیحت دل پر اثر کر جاتی ہے مصورِ غم کے افسانہ میں کوئی نہ کوئی پیغام ہوتا ہے۔"

اپنے افسانوں کے ذریعہ حقوقِ نسواں کی ترجمانی، سوسائٹی کی خامیاں اور قبیح رسم و رواج کے نقصانات دکھاتے ہیں افسانہ کی زبان کا کیا کہنا۔ چھوٹے چھوٹے مقفیٰ لیکن فصیح سے پاک جملے افسانہ کو اور بھی دلکش بنا دیتے ہیں۔"

سید عزیز حیدر بلیا ــــــــ (عصمت اکتوبر ۱۹۳۵ء)

"..... لیکن راشد الخیری کی عظمت کی حقیقی بنیادیں ان کے سماجی ناول اور مختصر افسانے ہیں...... انہوں نے اُردو افسانے کی جو خدمت کی اس کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ ان کے افسانوں کے اظہار تاثرات اور موضوعات میں ان کے ناولوں کی ساری صفات (خوبیاں اور کمزوریاں) موجود ہیں۔ ان کی اوّلین کہانیاں جوہرِ عصمت اور قطراتِ اشک میں یکجا کی گئی ہیں۔ اور آخری دَور کے افسانے سیلابِ اشک۔ عروسِ مشرق میں جمع کئے گئے ہیں۔"

بنگال میں اُردو ادب کی تاریخ
از ڈاکٹر امیر یندر چندر پال
مطبوعہ کلکتہ ۱۹۶۰ء ــــــــ
مترجمہ
خالدہ فہمی

پہلے افسانہ کی چند سطریں

"غدر سے پہلے اس مکان پر ہاتھی جھولتا تھا۔ آج جا کر دیکھو ہے کنڈی کا ایک کواڑ چڑھا ہوا ہے اور چکنی مٹی کی ایک دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ بڑے نواب کی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ گھر بھر میں جھاڑو پھر گئی۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے مسعود کے بیاہ میں صادقہ کی ساس کو گنگا جمنی پنکھے جھلے جا رہے تھے۔ لونڈیاں اور مامائیں گوندنی کی طرح زیور میں لدی ہوئی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسا زمانہ پلٹا کہ آج پانی پینے کا

کٹورہ بھی در رہا۔ مٹکے میں ہاتھ برکت۔ بچی بیں کہ بس اللہ کا نام۔ دن میں طاقت نہیں۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں۔ چلنے پھرنے سے مجبور، سوجھنے سے معذور۔ آنکھیں نہیں تو ایک آدھ کرتہ ٹوپی سِل کر کما لیتی تھی۔ اب اتنی بھی نہیں"

نصیر اور خدیجہ
مطبوعہ مخزن ۱۹۰۳ء ــــــــ اصلی ہوئی بیاں

۵۔ ناول کی طرز پر تاریخ نویس

یاسمین شام۔ عروس کربلا۔ ماہ عجم۔ آفتابِ دمشق۔ تیغ کمال۔ شہنشاہ کا فیصلہ۔ محبوبۂ خداوند۔ منظورہ۔ (اس) کوئی سا تاریخی ناول اٹھا لو۔ نوبت پنج روزہ۔ ایام کا رزر وا پسیں۔ دلی کی آخری بہار۔ داستان پارینہ۔ کوئی سی کتاب دیکھ لو طرز بیان کی دلآویزی کتاب ختم کرنے پر مجبور کرے گی۔ تاریخ خشک مضمون کہا جاتا ہے مگر علامہ مغفور نے تاریخ کو افسانہ سے زیادہ دلچسپ بنا دیا۔ تاریخی ناولوں میں مسلمانوں کو اُن کی بھولی ہوئی تاریخ سے اس طرح واقف کر دیا ہے کہ دَورِ اوّلین اور دَورِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے زرّیں کارناموں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ ان میں ہلال و صلیب کی لڑائیوں۔ اسلام اور نصرانیت کے معرکوں مسلمان خواتین کی ناموسِ اسلام پر قربانیوں اور مسلمان مردوں کی ولولہ خیز جاں بازیوں کے دل ہلا دینے والے مناظر دکھاتے ہیں۔ نوبت پنج روزہ اور دلی کی آخری بہار میں فسانۂ شب ستار درد مند دلوں کو تڑپا دیا ہے۔ مورخ واقعات کا پابند ہے مگر افسانہ نگار آزاد۔ وہاں حقیقت ہے یہاں تخیل۔ علامہ مغفور نے تاریخ میں افسانہ کا رنگ پیدا کر کے واقعات کی سرزمین

تخیل کے جو پھول کھلائے وہ چمن ادب میں سدا بہار ہیں۔ لیکن ان کی تاریخی افسانوں تاریخ کی حیثیت سے جس قدر مشہور ہے اس سے زیادہ شہرت اُس کے دلآویز طرز تحریر کی ہے۔ اس اعتبار سے علامہ مغفور کے تاریخی شہ پارے معدن ادب کے بیش بہا جواہر ریزے ہیں۔

دن ختم ہوا مسلمان زلیخہ مغرب ادا کرچکے فاروق اعظم مسجد نبوی میں خاموش بیٹھے ہیں۔ چاروں طرف لوگ حلقہ کئے بیٹھے جنگ کے واسطے بیتاب ہیں کہ دفعتہً قاصد نے اندر داخل ہو کر سلام علیک کی صدا بلند کی خلقت پروانوں کی طرح شمع دمشق پر گری۔ اور ہر طرف سے تقاضہ ہوا کہ نتیجۂ جنگ جلد بتلا۔ آنکہ قاصد کے الفاظ صلح اور پیام سپہ سالار امیرالمومنین کی خدمت میں پیش ہوئے۔ سب سے پہلے مسلمانوں نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد امیرالمومنین نے خالد بن ولید کا خط پڑھا اور کہا:۔

"ابو عبیدہ کی زبان سے جو معاہدہ بحیثیت ایک مسلمان کے ہوا۔ اس کی پابندی فرض ہے۔ گرجا کے جس قدر حصے میں خالد بن ولید تلوار کے زور سے داخل ہوئے وہ مسلمانوں کا مفتوحہ ہے۔ مسجد بنا دیں مگر جس قدر حصے میں ابو عبیدہ صلح کے بعد پہنچے وہ عیسائیوں کی ملکیت ہے۔ ان کو مبارک رہے۔ اس حصہ کی رتی بھر زمین مسجد میں نہیں مل سکتی۔"

"عمرؓ تو نہیں مگر تیرا فیصلہ موجود! اسلام تو ختم ہوا مگر تیرے کارنامے زندہ ہیں۔ دنیا چودہ سو برس سے اوپر منزلیں طے کرچکی۔ اقبال قومیں ایمان دار بادشاہ اپنے اپنے رنگ دکھا کر فنا ہوئے مگر جامع اُمیّہ کی محرابیں باآواز بلند کہہ رہی ہیں کہ عدل فاروقی کا ادنےٰ نمونہ ہماری ہستی ہے۔ یہ وہ فیصلہ ہے کہ چودہ سو سال نہیں چودہ ہزار صدیوں میں بھی انسانی دنیا اس کا جواب نہیں دے سکتی۔"

(آفتاب دمشق)

"دولت کے انبار تھے۔ اشیاء کے پہاڑ تھے۔ کیانیوں کے عہد سے اس وقت تک کے وہ بیش قیمت تحفے جو روئے زمین پر اپنا جواب نہ رکھتے تھے سامنے آئے۔ ایک اونٹنی تھی جس کی جھول سونے کی اور مہار جواہرات سے مرصع اور یاقوت کی لڑیاں مسلسل۔ ناقہ سوار جس کے ہاتھ میں مہار تھی از سرتا پا جواہرات میں خود۔ زرہ اور تلواریں۔ نعمان بن منذر۔ بہرام چوبیں اور سیاوش کی وہ یادگاریں تھیں جن پر ایران نے ہمیشہ فخر کیا۔ اور جن کا شہرہ عرب تک پہنچ چکا تھا کسریٰ۔ ہرمز اور کیقباد کے خنجر بھی ملے جو جنگ کے موقع پر کام آتے تھے۔ نوشیرواں کا تاج شاہی جو سونے اور جواہرات کا تھا ایک گھوڑا بھی جس پر لعل و یاقوت کا زین کسا ہوا تھا۔ اور جس کے سینے پر یاقوت و زمرد جڑے ہوئے تھے پیش کیا گیا ان چیزوں کے علاوہ ایک فرش بھی ملا جس کا نام بہار تھا۔ اور یہ وہ تھا جس پر بیٹھ کر شراب پی جاتی تھی اس میں بہار کے تمام سامان موجود تھے اور صفت یہ تھی کہ موسم خزاں میں بھی بہار کا لطف دیتا تھا وسط میں چمن سبزہ زار تھا۔ چوگرد سبز پکھراج و نیلم کا حاشیہ۔ سونے چاندی کے درخت۔ دیبا کی ٹہنیاں اور حریر کے پتے اور جواہرات کے پھل۔ جس وقت یہ تمام سامان رتی رتی سعد کے حوالہ کیا گیا تو فوج کی دیانت پر بے ساختہ ان کی زبان سے

رہا تھا۔ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ امیرالمومنین کی خدمت میں بھیج دیا گیا جس کے لادنے کے لئے نوسو اُونٹ خچر کافی ہوئے۔ باقی فوج میں تقسیم ہوا اور ہر شخص کے حصے میں بارہ بارہ سو درہم کا مال آیا۔" (ماہ عجم)

سفیریہ ۔ ایسی بات کیوں کہتے ہو جو قیاس میں نہ آسکے چالیس ہزار دو تین لاکھ آدمیوں کا مقابلہ کس طرح کرسکتے ہیں۔ لاکھ بہادر اور مردِ میدان ہوں مگر ایک کی دو دو دو کی چار"

یوسف ؒ: اس سے پہلے بھی بعض معرکوں میں ایسا اتفاق ہوا ہے۔ میری عزیز محسنہ جب خدا کی اعانت شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ جو مسلمانوں کا خیال ہے تو قلت کثرت پر غالب آجاتی ہے ایسے موقع آئے ہیں کہ دیکھنے والی آنکھوں کے سوا کوئی یقین نہیں کرسکتا۔ کان سُن کر حیرت میں رہ جائیں گے کہ جو بچ گئے آدمیوں پر جہاں عقل قیاس سب متحیر ہیں کس طرح مسلمانوں نے فتح پائی۔

خلافتِ دوم میں تمام عراق و عرب ایک طرف تھا ایران کا بچہ بچہ مسلمانوں کے نام کا دشمن تھا سینکڑوں کے مقابلہ میں ہزاروں اور ہزاروں کے مقابلہ میں لاکھوں میدان میں آئے مگر اس سرے سے اُس سرے تک خدا نے فتح کا سہرا ان کے سر پر باندھ دیا"

سفیریہ ؒ: سُنا تو میں نے بھی یہی ہے اور لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔ مگر میں ایسی خوش اعتقاد نہیں ہوں کہ خدا کی اس اعانت پر ایمان لے آؤں جس نے مارغنے کار تھیسٹ جیسے خداوند کو دھتکار دیا مسلمانوں کے ایسے دعووں پر خواہ مخواہ ایمان نہیں لاسکتا۔"

یوسف ۔ میں خود نہیں چاہتا کہ زبانی لن ترانیوں سے اپنے مذہبِ مقدس کی فضیلت ثابت کروں لیکن جو کچھ ہوگا وہ ہر آنکھ دیکھے گی۔ فتح و شکست خدا کے اختیار میں ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہوگا۔ لیکن جو لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں قدرت یقیناً ان کی مدد کرتی ہے۔ مسلمان رہنے کی اور طرابلسی فنا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں خدا دونوں کی کوششوں میں متفق ہوگا" (محبوبۂ طرابلس)

مبصرین کی رائیں

علامہ نے بہت سے تاریخی ناول بھی لکھے۔ اگرچہ ان کا اصل میدان اصلاحی اور معاشرتی تھا۔ مگر وہ تاریخ کی طرف بھی اس لئے متوجہ ہوئے کہ وہ اصلاحِ معاشرت کا نسخہ ماضی سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی سے ... کی تاریخ کو ناولوں کی صورت میں منتقل کر دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے شعوری طور پر التزاماً اسلام کی ساری تاریخ کے مختلف ادوار کو ادبی صورت دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ کا دورِ حکومت (یاسمین شام اور ماہِ عجم) حضرتِ عثمانؓ کا دورِ خلافت (محبوبۂ خدا) کربلا اور اُس کے نتائج (عروسِ کربلا) خلافتِ عباسیہ کا عہد (امین کا دم واپسیں) خاندان عباسیہ کی تباہی۔ ہلاکو کے حملے اور اباقو خاں کی حکمرانی (شہنشاہ کا فیصلہ) اسپین میں اسلامی حکومت کا زوال (اندلس کی شہزادی) اور سلطنتِ مغلیہ کی تباہی اور غدر ۱۸۵۷ء (نوبت پنج روزہ) غرض تمام بڑے بڑے واقعات و ادوار پر انہوں نے کتابیں لکھیں۔ ان کے علاوہ بہت سے مختصر افسانے اور مضامین ہیں جن میں مسلمان بادشاہوں سے عقیدت کا اظہار ہے عیسائی عالموں مثلاً جرجی زیدان کے حملوں کا جواب ہے ۔۔۔ اور

...نح عمری علامہ راشد الخیری

...سلمان عورتوں کی بے پناہ قربانیاں ہیں۔ ان ناولوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ...سلامی تاریخ پر حاوی تھے"

...مد ندیم قاسمی ———— امروز لاہور ۳ فروری ۱۹۶۰ء

"مولانا کے تاریخی ناول ایک اور اہمیت رکھتے ...یں۔ ان میں تاریخی کرداروں کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ ...یخی شخصیتوں کے تعلقات خاندانی اور معاشرتی مارج ...بنہ اور مذہب سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اسلام سے ...پہلے کی حالت پیش کی گئی ہے۔ طلوع اسلام کے وقت ...ور اسلام پھیلنے کے بعد تک مختلف اقوام کی روایات اور ...سم کا بھی ذکر ہے۔ ان میں بعض رسوم تو ایسی ہیں جو اس ...قت تک ہندوستانی (پاکستانی و بھارتی) گھروں میں پائی ...جاتی ہیں۔ رسم گل اور مایوں بیٹھنے کی رسم کو بتلایا ہے ...وہ ایران سے لی گئی۔ پہلے ان کی کیا صورت تھی اور اب انہوں نے کیا صورت اختیار کر لی"

...ادریس صدادیب ———— ساقی ستمبر ۱۹۳۶ء

"تاریخی ناول لکھتے ہوئے بھی انہوں نے عورت کو ان صفات سے آراستہ کیا اور اس وقت کے حالات اور مقتضیات کے مدنظر یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ یہ مبالغہ اوّل تو ردِ عمل کا نتیجہ ہے دوسرے علامہ ایک مقصد کے تحت لکھتے تھے۔ فن ان کے نزدیک ذریعہ تھا مقصد کی نشر و اشاعت کا۔ اور مقصد کے لئے مبالغہ کہاں نہیں ہوتا۔ انہوں نے ایک ماہر مصور کی طرح اپنی تصویروں میں بہت گہرے رنگ بھرے ہیں اس لئے کہ اس وقت ہلکے رنگوں پر نظریں جمنے نہیں پاتی تھیں"

احمد ندیم قاسمی ———— امروز لاہور ۳ فروری ۱۹۶۲ء

"مولانا کے تاریخی ناول خاص مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ان میں عورتوں کا کیرکٹر بہت نمایاں ہے۔ مولانا نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ایسی خواتین پیش کی جائیں جو اخلاق عادات اور اطوار میں ان کی خواتین کے لئے قابلِ تقلید ہوں .... دوسرا مقصد ہے کہ مسلمانوں کو تاریخ اسلام سے آشنا کرایا جائے۔ پھر اس عمدہ دلچسپ طریقہ سے کہ تفریح طبع بھی ہو جائے اور تاریخ اسلام کے متعلق مفید باتیں بھی معلوم ہو جائیں ..... تیسرا مقصد ہے تاریخ اسلام کے متعلق ان غلط فہمیوں کو دور کرنا جو متعصب پادریوں اور عیسائی مورخوں کی گمراہ کن تبلیغ کی بدولت غیر مسلموں میں پھیل گئی ہیں ......

تاریخی ناولوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر کردار تاریخی ہی ہو۔ ضرورت قصے کے مطابق افسانہ نویس کردار تخلیق کر سکتا ہے۔ مثلاً یاسمین شام میں بلقیسیا کا اور عروس کربلا میں رود کا کردار مولانا کا تخلیق کردہ ہے۔ اور ان دونوں سے مولانا نے کردار نگاری کی ان دعاؤں میں جو مضبوطی دکھائی ہے۔ اس سے اُردو کے بہت سے ناول خالی ہیں ....

مولانا راشد الخیری کے تاریخی ناول دو وجوہ سے غیر فانی ہیں۔ اسلوب بیان اور افسانے کے پلاٹ کی تعمیر"

سید محمد مورخ بی اے ———— عصمت اخترالخیری نمبر

۶۔ سیرت نگار

ایک طبع زاد معاشرتی اخلاقی یا جاسوسی یا جنسی افسانہ کے مقابلہ میں ایک کامیاب تاریخی افسانہ سلیقہ کے ساتھ اس طرح لکھنا کہ دلچسپی میں ذرا فرق نہ آئے مشکل کام ہے لیکن سیرۃ نگاری اس سے بھی زیادہ

مشکل فن ہے۔ یہاں خالی خولی انشاپردازی سے کام چلتا ہے نہ مؤرخ کی طرح واقعات قلم بند کر دینے سے۔ آمنہ کا لال۔ سیدہ کا لال۔ الزہرا وغیرہ تاریخی تصانیف ہوں یا معاشرتی اصلاحی تاریخی ناول اور افسانے علامہ مغفور کا درجہ سیرت نگار کی حیثیت سے بھی بلند ہے۔

• آج اُس دربار کی حاضری ہے جس کے بوریہ نشین شہنشاہ نے فقیروں کو بادشاہ بنا دیا۔ جس کی مبارک زندگی انسانیت کی تفسیر کر گئی۔ جس کی چشم کرم اپنے سائلوں کو مالا مال کر رہی تھی۔ جس کا دستِ شفقت یتیموں کا وارثی اور بے کسوں کا سہارا تھا۔ اور جو دردمندوں کا مداوا اور اپاہجوں کی تسکین تھا۔

دُنیا کے بہترین انسان! تاریخ تیری پاک زندگی کو سجدہ کر رہی ہے۔ آسمان کا ہر گوشہ تیرے احسانات گنوا رہا ہے اور زمین کا ہر ذرّہ تیری انسانیت کے گیت گانے میں منہمک ہے۔ کائنات تیرے نام کی تسبیح پڑھ رہی ہے (درود تجھ پر اور تیری آل پر)

اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر دُوسروں کا پیٹ بھرنے والے مولا! کلیجے کے ٹکڑوں کو بھوکا رکھ کر غیروں کو کھلا دینے والے آقا! دُشمنوں سے محبت اور غیروں سے شفقت کرنے والے مالک! تکلیف میں صبر اور اذیت میں شکر کرنے والے انسان! دُکھ کو سُکھ اور مصیبت کو راحت سمجھنے والے رسول! خاطی کی خطا سے درگذر اور گنہ گار کو بخش دینے والے پیغمبر! مطلب کے پوتے آمنہ کے لال۔ اور گیتی جس کا ثانی پیدا نہ کر سکی جس کی نظیر چشم فلک نہ دیکھ سکا کارخانہ حیات میں، دنیا کے گورکھ دھندے میں بے مثل تھا اور بے نظیر تھا۔

(آمنہ کا لال)

• شام کو نکاح کی خبر خاندان بھر میں اور صبح کو جب حضور نے اُونٹ ذبح فرما کر ولیمہ کیا تو تشہیر اچھی طرح ہو گئی۔ بی بی خدیجہ کی عمر اُس وقت چالیس سال سے کچھ اُوپر ہی تھی۔ اُن کے دو شوہر اُن کی آنکھوں کے سامنے اُن کے گھر سے رُخصت ہو چکے تھے۔ سرورِ کائنات کا سِن اُس وقت پچیس سال کا تھا اور یہ وہ وقت تھا جس کی کیفیت سے ہر بوڑھا اور جوان واقف ہے۔ طائرانِ شباب کی نغمہ سنجیاں زندگی کے کانوں میں ایسی بھرتی ہیں کہ دسیلی تانوں کی یاد بڑھاپے میں بھی حواس باختہ کر دیتی ہے۔ اور صحبتِ شب کے جلسوں کا خیال آغوشِ موت میں بھی کلیجے کے ٹکڑے اُڑا دیتا ہے۔ مکہ کی سرزمین اُس وقت بے شرمی و بے حیائی کے فوارے اگل رہی تھی۔ جب آسمان عرب سے ظلم و ستم کی دُھواں دھار گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر برس رہی تھیں۔ جب نفس کی خدائی کا برسرِ قلب پر دَور دَورہ تھا جب چوری اور ڈاکہ ماں کا دُودھ بنے ہوئے تھے، جب عیاشی اور بدمعاشی انسانیت کا جوہر تھے۔ اُس وقت ایک ایسے انسان کو جس کی بھرپور جوانی نے آنکھ کھولتے ہی دُنیا بھر کے سامانِ تعیش سے دوچار ہوتی؟ صحبت ملتی ہے تو اُن لوگوں کی جن کی نگاہیں ہر عیب کو ہنر اور ہر عذاب کو ثواب سمجھ چکی ہیں اور واسطہ پڑتا ہے تو اُن لوگوں سے جو شرک و بُت پرستی کے گہوارہ میں جھُول جھُول کر جوان اور عیاری و مکاری کا دودھ پی پی کر ہوشیار ہوئے ہیں۔ کنبہ اور خاندان سے الگ۔ موجود اقارب سے جُدا۔

شہر اور ملک سے مختلف۔ معاشرت کو فنا صحبت
کی غارت اور نفس کو کچل ڈالنا ایک ایسے سمندر
جس کا کنارہ تک نظر نہ آسکے۔ ایک ایسی آگ ہے
جس کے شعلے زمین و آسمان کو خاک سیاہ کر رہے
ہیں صحیح و سالم اور پاک و صاف نکلنا اور بال بال
بچنا بظاہر حیرت۔ تعجب اور اچنبھا ہے۔ اور حقیقتاً
ثبوت رسالت اور صداقت ہے (آمنہ کا لال)

" حضرت عمرؓ آگے بڑھے کہ اس کی گستاخی کا جواب
دیں۔ آنحضرتؐ نے منع فرمایا اور اس سے کہا:۔
" میں خدا کا بندہ ہوں اور اس کا پیغام پہنچانے
والا۔ اے بھائی عذاب آخرت سے ڈر۔ اور دوزخ
کی آگ کا خوف کر۔ پرستش کر اس خدا کی جس کا کوئی
شریک نہیں"

اس گفتگو کا ایسا اثر ہوا کہ اعرابی ایمان لے آیا اور
مسلمان ہو گیا۔ رسالت مآبؐ نے اس وقت اصحاب
سے کہا کہ " اس کو کچھ آیتیں قرآن کی سکھا دو" جب
وہ سیکھ چکا تو آپ نے فرمایا:۔

تیرے پاس کس قدر مال ہے؟

اس نے کہا" قسم ہے اس پاک ذات کی جس نے تجھ کو
پیغمبر بنا کر بھیجا کہ ہم چار ہزار آدمی قبیلہ سلیم میں ہیں
لیکن مجھ سے زیادہ فقیر کوئی نہیں"

آپ نے اصحاب کی طرف دیکھا اور فرمایا:۔
" تم میں سے کون ہے جو اس کو ایک اونٹ خرید دے
میں ضامن ہوتا ہوں کہ خدا اس سے بہتر بدلہ دیگا"

سعد بن عبادہ اُٹھے اور کہا:۔
" اے خدا کے سچے رسول! میرے پاس اونٹنی
ہے جو میں اس کو دے دیتا ہوں"

اس کے بعد سرور کائناتؐ نے فرمایا:۔
" اب تم میں سے کون ہے کہ اس کا سر ڈھانک دے اور
خدا کو راضی کرے"

حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا:۔
" میرے ماں باپ فدا، تعمیل میں کروں گا"

اپنا عمامہ اُتار کر اعرابی کے سر پر رکھ دیا۔ آپ نے
فرمایا" کون ہے جو اس کو خوراک وغیرہ کا سامان دے"
سلمان اُٹھے اور اعرابی کو ساتھ لے کر نکلے سب گھروں
پر گئے۔ کوئی چیز موجود نہ تھی حالت یاس میں نگاہ
حضرت سیدۃ النساء کے حجرے پر پڑی اور دروازہ
کھٹکھٹایا۔ سیدہؓ نے دریافت کیا:۔

" کون ہے؟"

جواب دیا" میں ہوں سلمان فارسی"

پوچھا" کیوں آئے ہو"

سلمان نے پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ:۔
" اعرابی کے واسطے کھانے پینے کا سامان جمع کرنے
نکلا ہوں۔ سب گھروں پر ہو آیا۔ کوئی چیز موجود نہیں"

طاہرہ۔ زاکیہ۔ راضیہ۔ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا
یہ سن کر لائیں اور فرمایا:۔
" سلمان قسم ہے اس خدا کی جس نے میرے باپ کو
پیغمبر کیا آج تیسرا روز ہے ہم سب فاقے سے ہیں
دونوں بچے حسن اور حسین پریشان پھر رہے ہیں۔
ابھی بھوکے سوئے ہیں۔ لیکن سائل دروازے پر
آگیا رد نہیں کر سکتی تھی۔ اے سلمان یہ ایک چادر
موجود ہے لے اور شمعون یہودی کے پاس لے جا
اور کہہ کہ فاطمہؓ محمدؐ کی بیٹی کی یہ چادر رکھ لے اور
تھوڑی سی جنس قرض دے دے"

"سلمان اعرابی کو لے کر شمعون کے پاس آئے اور مفصل کیفیت بیان کی۔ یہودی کچھ دیر چپ اور دیکھتا رہا۔ دفعتاً اُس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور کہنے لگا :-

"اے سلمان! یہ وہ لوگ ہیں جن کی خبر ہمارے پیغمبر موسیٰؑ نے توریت میں دی ہے۔ میں فاطمہؑ کے باپ پر ایمان لایا اور سچے دل سے مسلمان ہوتا ہوں"

اس کے بعد اناج سلمان کو دیا اور وہ لے کر حضرت سیدۃ النساءؑ کے پاس آئے آپ نے اپنے ہاتھ سے پیسا روٹی پکائی اور سلمان کو دی، سلمان نے کہا "تھوڑی سی روٹی بچوں کے لئے رکھ لیجئے۔

فرمایا "سلمان خدا کی راہ پر دے چکی اب بچوں کے لئے لینا مناسب نہیں۔"

سلمان وہ روٹی لے کر سرورِ کائناتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام کیفیت بیان کی۔ رسالت مآبؐ نے وہ روٹی اعرابی کو دی اور سیدۃ النساءؑ کے پاس تشریف لائے چہرہ اُداس دیکھا دریافت کیا معلوم ہوا کھانا کھائے تیسرا روز ہے۔ حضرت نے سیدۃ النساءؑ کو اپنے پاس بٹھایا آسمان کی طرف دیکھا اور دُعا کی :-

" الٰہی فاطمہ تیری لونڈی ہے اس سے راضی رہیو"

(الزھرا چودھواں ایڈیشن صفحہ ۴ تا ۵)

"جس گھر میں خدا کا کلام جمع ہوا تھا، جس سرزمین پر کلام اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں اُسی گھر میں اور اُسی سرزمین پر اسی شخص کا خون گرا ہے جو قرآن جمع کر رہا تھا۔ جمعہ کا دن تھا آفتاب کی حرارت کم ہو چکی ہے۔ عصر سے فراغت پانے والے مسلمانوں نے جو یہ کیفیت دیکھی تو اُس نے دل ہلا دئے مسلمانوں کا تیسرا خلیفہ عثمان غنیؓ روزہ کی حالت میں شہید پڑا ہے۔ اس کے برابر خدا کی کتاب رکھی ہوئی ہے اور ورق خون میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ ایک طرف خلیفہ کی بیوی نائلہ بے ہوش پڑی ہیں۔ مسلمانوں کی زبان اور میرے قلم سے اپنی داستان سُنو اور جیتا پڑھو۔ ابھی آفتاب غروب نہ ہوا تھا کہ بی بی نائلہ نے اپنی آنکھ کھولی کٹی ہوئی اُنگلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ برابر میں کلام الٰہی رکھا ہوا تھا۔ اُٹھیں تو ایک خونخوار شخص ننگی تلوار ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ کلام الٰہی کو بوسہ دے کر اُوپر رکھا تو روزہ دار شوہر کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش پر نظر پڑی بیتاب ہو کر منہ پر ہاتھ پھیرا۔ تو بانی کی آواز کان میں آئی:-

ہٹ جا عثمان کی لاش سے بدلہ لے کر دل ٹھنڈا کروں تو کون ہے اور تیری اُنگلیاں کہاں گئیں؟ بی بی نائلہ شوہر کی لاش پر جھک گئیں اور کہا:-

" امیرالمومنین کی بیوی ہوں۔ تو مسلمان ہے رحم کر اور مُردے کو اذیت نہ دے۔"

بے گناہ امیرالمومنین کو شہید کر چکے اور جس وقت مفسدوں کا گروہ تلوار لے کر ٹوٹا ہے اُس وقت میرے پاس سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ تلواروں کے وار اپنے ہاتھوں پر روکوں۔ میں نے ہرچند ان سے کہا۔ منت خوشامد کی مگر ان کے سر پر شیطان سوار تھا باز نہ آئے تو غور کر کے دیکھ یہ روزہ دار لاش اسی کی ہے جس کے احسانات کا میرے اور تیرے مولا نے اقرار کیا ہے۔ تو نے دیکھا یا سُنا ہوگا مسجد نبوی میں جماعت کے لئے جگہ تنگ ہوئی تو رحمۃ اللعالمین نے آواز بلند فرمایا:-

"وہ کون خدا کا بندہ ہے جو اس مسجد کو وسیع کر دے"
اس وقت جس شخص نے زمین خرید کر وقف کی اور
نمازیوں کے لئے مسجد بنوادی وہ یہی امیر المومنین عثمانؓ
آج افطار کے وقت مسلمانوں کے ہاتھ سے بے گناہ
شہید ہوا میرے کان آشنا ہوں گے یا آنکھوں نے
دیکھا ہو گا کہ جب حضور اکرم یہاں تشریف لائے تو
صرف ایک کنواں بیرومہ یہودیوں کی ملکیت تھا جس سے
مسلمان پانی پیتے تھے جب وہ کنواں یہودیوں نے
مسلمانوں کے واسطے بند کر دیا تو مسجد نبوی کی دیواریں
صدائے رحمۃ اللعالمین کی شاہد ہیں جب حضورؐ کی
آواز اس فضا میں گونجی کہ "کون ہے جو بیرومہ مسلمانوں
کے واسطے وقف کر دے اور صبح سے پیاسے مسلمانوں
کو پانی سے سیراب کر دے" تو ارشاد نبویؐ کی تعمیل
جس شخص نے کی اور کنواں خرید کر مسلمانوں کے حوالے
کیا وہ یہی امیر المومنین تھا۔ جس کی لاش کو تیری خون
آلود آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ جس کی پنڈلی کبھی
فرشتوں نے بھی نہ دیکھی وہ آج بے گور و کفن ننگا
دھڑنگا اس گھر میں پڑا ہوا ہے"
(سیدہ کا لال سولھواں اڈیشن صفحہ ۲۰۳ تا ۲۰۵)

"کربلا کے میدان میں راتیں شب و روز آئیں اور گئیں
آئیں گی اور جائیں گی مگر محرم ۶۱ھ کی وہ نویں رات
جب ابن زیاد کے حکم سے عمرو سعد نے چمنستان زہرا
کی سرسبز و شاداب کونپلیں توڑیں، پہاڑوں سے
سر پھوڑتی آئی۔ کربلا کے ذرات نے واویلا شروع
کی اور فرات کی لہریں سینہ کوبی میں مصروف ہوئیں
یزید کے لشکر نے شب ماہ کا لطف اٹھانے میں کسر
نہ چھوڑی اور رات کا بڑا حصہ گھوڑوں میں اڑا دیا۔ مگر
سید الشہداء عشاء کے بعد ہی سے راز و نیاز میں مصروف
ہو گئے جب آدھی کے قریب رات گذر چکی تھی اور چاند
روتا ہوا رخصت ہو رہا تھا اس اندھیرے میں جہاں
اولاد رسول کو جلانے کا تیل بھی میسر نہ تھا سید کا
لال سجدہ میں گرا عرض کیا:-
"یہ تھوڑی سی جمعیت جو اپنی خوشی سے میرے ساتھ
آئی ہے میں اس کی امانت کا محتاج نہیں ہوں نتیجہ جو
کچھ ہو گا مجھے معلوم ہے مگر تجھے معلوم ہے کہ میرے
اصرار پر بھی یہ میرا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ چند بچے میرے
ہیں اور بھائی کے تیری راہ میں قربان ہیں تو نے خلیل
کی قربانی پہاڑ کی چوٹی پر قبول کی، یوسف کا نالہ قید
میں سُنا۔ اور یعقوب کی التجا جنگل بیابان میں۔ آج
کربلا کے ریتلے میدان میں میری سُن"
"احکم الحاکمین! یہ میری ناچیز قربانی قبول کر۔ تجھ کو
معلوم ہے کہ حسین کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں۔ التجا
صرف اس قدر ہے کہ بچوں کی محبت مقصد میں حائل نہ
ہو میرے حوصلے بلند کر میرا دل شیر کر اور توفیق بخش کہ
دشمنوں کے سامنے ہنس ہنس کر گلا کٹاؤں اور بچوں
کی لاشیں کھیل کھیل کر ڈھوؤں عزیزوں کے جنازے
اٹھاؤں مگر زبان پر شکر اور لب پر صبر کے سوا کچھ نہ ہو"
(سیدہ کا لال۔ سولھواں اڈیشن صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲)

"رجب ۱۶ھ کی ساتویں تاریخ ہے اور وہ اولوالعزم خلیفہ
جس نے بڑی بڑی سلطنتوں کو چشم زدن میں خارج
کر دیا۔ سیدھے سادے کپڑے پہنے ایک سرخ اونٹ
پر سوار بیت المقدس کی طرف روانہ ہوا۔ جلو میں کوئی
لشکر ہے نہ فوج۔ ہمراہی میں کوئی دستہ ہے نہ جمیعت اونٹ
کے دونوں طرف جھولیں ہیں۔ ایک میں پانی کی مشک ہے

دُوسری میں کھجوریں۔ اور بُھنی ہوئی جنس۔ رات کو ایک
چٹائی پر جنگل بیابان میں سوتے اور صبح کی نماز سے
فراغت پا پھر روانہ ہو جاتے۔ جوق جوق خلقت تماشہ
دیکھنے آتی اور دیکھ کر دنگ رہ جاتی کہ وہ فاروق جن کے
نام سے دُنیا کانپ رہی ہے اس طرح سفر کر رہا ہے۔
فریادیوں نے رستے بھر اپنی درخواستیں پیش کیں اور
امیر المومنین نے ان کا انتظام کیا۔ جس وقت جابیہ
قریب آ گیا تو اس لئے کہ یزید بن ابی سفیان اور خالد بن ولید
کو اطلاع دے دی گئی تھی دونوں نے باہر نکل کر استقبال
کیا۔ دونوں کے جسم پر دیبا کی قبائیں تھیں۔ یہ کیفیت
دیکھ کر حضرت عمر کو سخت غصہ آیا اور اونٹ سے
نیچے اُتر کر فرمایا:۔
"تم نے اتنی جلدی اپنے جوہر گنوا کر عجمی طریقہ اختیار کر لیا"
دونوں نے اپنی قبائیں اُتار کر دکھایا کہ ہتھیار لگے
ہوئے ہیں اور عرض کیا کہ اصل مقصد جو ہماری زندگی
کا ہے وہ موجود ہے۔ آپ خاموش ہو گئے"

———— (یاسین شام)

"انشا پردازی کے جوہر بہت کچھ خداداد ہوتے
ہیں۔ انسانوں میں جس طرح کچھ لوگ فطری شاعر ہوتے ہیں
اسی طرح فطری انشا پرداز بھی ہوتے ہیں۔ ان کی عبارت
کے گوناگوں محاسن ان کی فطری صلاحیتوں کے نتائج ہوتے
ہیں اور ایک فطری انشا پرداز عام اس سے کہ اس کی علمی
حیثیت کچھ بھی ہو اُسے مطالعہ کتب مشاہدہ فطرت کے مواقع
کتنے ہی کم ملے ہوں جب کچھ لکھے گا تو اس کی تحریر میں ایک
امتیازی شان ضرور نمایاں ہو گی۔ لیکن سیرت نگاری کے لئے
انشا پرداز کی نظروں میں وسعت احساس کے مشاہدات
کا کثیر ہونا ضروری ہے۔ جب تک کسی ادیب میں عمیق نظر
ذوقِ تجسس اور صلاحیت فکر موجود نہ ہو گی۔ وہ اچھا
سیرت نگار نہیں ہو سکتا۔ مولانا راشد الخیری کی تصانیف
یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ ایک صاحب نظر ادیب تھے۔
اور انہوں نے سیرت نگاری کے دشوار کام میں بھی
کامیابی حاصل کی "فردوس کربلا" "سیدہ کی سیرت" "سیدہ کا
زندگی" میں سیدہ کی سیرت اور "حیات صالحہ" کا کردار
سیرۃ نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اور "بنت الوقت" میں
نفسیاتی حیثیت سے فرخندہ کی سیرت پر وحید کی سیرت کا
اثر خوب دکھایا ہے"
پروفیسر علی عباس حسینی ———— عصمت راشد الخیری

۷۔ انشا پرداز

یہ ضروری نہیں کہ ایک کامیاب افسانہ نگار صف
طراز انشا پرداز ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو ادیب انشا
پردازی میں خاص ملکہ رکھتا ہے اس کے افسانے بھی اتنے
ہی اچھے ہوں۔ مگر علامہ مغفور جس طرح بے مثل افسانہ نگار
تھے اسی طرح باکمال انشا پرداز۔ وہ کسی انسانی کیفیت کو
بیان فرماتے۔ کسی جذبے کی ترجمانی کرتے۔ کسی موقع اور
وقت کا نقشہ کھینچتے کسی قدرتی منظر کی مصوری فرماتے
تو ان کی قوت بیان اس قدر زبردست تھی اور ان کے
پاس الفاظ کا اتنا وافر ذخیرہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے جملے
خوشگوار بندشیں، عام فہم ترکیبیں، لطیف استعارے، حسین
تشبیہیں پڑھنے والے کو تڑپا دیتی تھیں۔ ان کے طرز تحریر
کی شان دُوسرے مصنفین اُردو سے جدا گانہ ہے نہ انگریزی
عربی الفاظ کی بھرمار ہے نہ غیر مانوس ناقابل فہم ترکیبیں ہیں
روانی جوش بے اختیاری۔ بے ساختگی۔ سادگی۔ ان کے
اسلوب بیان کی خصوصیات ہیں۔ قلم معنی کی کوثر سے

ڈھلی ہوئی ٹکسالی زبان اور مصورِ غم کا پیرایہ بیان فقرے
کے فقرے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ جس طرح کسی اچھے
شعر پر مذاقِ سخن خراجِ تحسین پیش کرتا ہے اسی طرح مصورِ غم
کے فقرے کے فقرے اور سطریں کی سطریں بار بار پڑھنے پر
ذوقِ ادب مجبور کرتا ہے۔ قدرت نے انہیں شاعرانہ دماغ
عطا فرمایا تھا۔ انھوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ اور سب
رسالوں کو چھوڑو ایک قلبِ حزیں ہی کو لو کون سے مضمون
کی کون سی سطر ہے جو ترنم اور موسیقی سے لبریز نہیں کونسا
فقرہ ہے جس پر ذوقِ ادب سر نہیں دھنتا۔ آج کل کی نظم
نثر جو نام ہے بے ربط۔ بے جوڑ۔ بے معنی۔ مہمل غلط
سلط۔ الٹی سیدھی عبارت کا جس کے چند لفظوں کے
بعد نقطے اور لکیریں آتی ہیں جس کا مطلب ہے عریانی اور
فحش نویسی۔ جس کا مقصد ہے جذبات کو اشتعال دینا"
جس کا نتیجہ ہے نوجوانوں کا آوارگی کی طرف مائل ہونا۔ یہ
چیز البتہ مشرقی تہذیب کے پرستار انشاپرداز کی کسی تحریر
میں نہ ملے گی۔ چنانچہ وہ خود افسانوں کے ایک مشہور مجموعے
جوہرِ عصمت میں فرماتے ہیں:۔

"وہ بھی مسلمانوں کا ایک دور تھا۔ اور آج بھی ایک دور
ہے کہ ادب کے قابل جرائد حسن و عشق کے ذکرِ خیر سے
لبریز ہیں۔ کہیں انگلیوں کی تھرتھراہٹ ہے کہیں کلائی
کی کپکپاہٹ۔ کوئی گردن کی مٹک پر فریفتہ ہے کوئی
کمر کی لچک پر۔ یہ مضامین بجائے خود عیاشی کا معقول
اشتہار ہیں۔ مغرب نے عورت کی آوارگی کی پیٹ بھر کر
اور جی کھول کر داد دی۔ لیکن مشرق نے اس کی عفت
کو سر پر رکھا۔ اور آنکھوں سے لگایا۔ ضیا پاش نظروں
پر بے تاب ہونے اور ارتعاش پر سر دھننے والے اتنا
ملحوظ رکھیں کہ وہ مسلمان ہیں اور ہندوستانی۔ اور
آنے والی نسلوں کے لئے کچھ چھوڑ رہے ہیں"

بکھری ہوئی پتیوں میں ایک موقع پر مشرقی تہذیب
اور زبان کی بربادی پر اس طرح نوحہ خوانی فرماتے ہیں:۔

"گاڑھے گزی والی ڈاڑھیاں ختم ہوئیں اب دیبا
و حریر کی ساڑھیاں اپنی بہار دکھا رہی ہیں — یہ
لائٹ لٹریچر کا وقت ہے۔ یہاں تو اس مبتذل کی
ضرورت ہے جس کی خبر نہ ہو۔ اور اس محبوب کی
جس کے پاؤں مرتعش ہوں اور سر منڈا ہوا"

ان کی مذہبی اور اصلاحی کتابیں پاکستان و ہند کی
شریف بیبیوں کے لئے ہیں۔ ان کتابوں میں بہت سے
نازک موقعے ایسے ہیں جب انتہائی احتیاط سے کام لینے
کے باوجود بے احتیاطی ہو جانی ممکن تھی۔ لیکن انھوں نے کچھ
اس خوبی کے ساتھ رمز و کنایہ میں مطلب بیان فرمایا ہے
کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔

مصورِ غم کے مضامین کے عنوانات شاعرانہ
ہیں اور تحریروں کا آغاز ایک خاص ادبی شان رکھتا ہے
ستونتی کی پہلی دو سطریں:۔

"بڑے ٹھڈے پرانے دھرانے، دقیانوسی۔
قل اعوذیوں گئے بازوں۔ ملاڈھبیوں کی تعریف
افضال کی صحبت کا دلچسپ مشغلہ تھا"

طوفانِ حیات کا ایک فقرہ:۔

"مہان کھائی۔ انہاں غنیاں۔ ٹھونس ٹھانس۔
پیر مرید ننگ ننگا چلتے ہوئے"

صبحِ زندگی میں استانی جی فرماتی ہیں:۔

"بیٹی بنو میری باتیں تو تم کو زہر لگ رہی ہوں گی۔
اور دل میں کہہ رہی ہو گی بس چلے تو استانی نامراد
کا منہ نوچ لوں۔ گھر چڑھ کر لڑنے آئی۔ اور ڈولی

پڑھ کر باتیں بنا گئی۔ مگر بیٹی یہ تو سوچ سمجھ کے رکھت کا ڈھب لا گھر بگڑا تو تمہارا نقصان ہوا تو تمہارا۔ گھر بیٹھی تو تم۔ میں بے چاری لینے میں نہ دینے میں جلتی جلاتی۔ پھرتی پھراتی آ گئی۔ گھڑی بھر بیٹھ گئی جی جلا سفر کیسا چل؟

شام زندگی میں ایک امیر مگر جاہل بیگم صاحبہ فرماتی ہیں:۔

"ہاں مگر جلدی چلئے۔ میری دونوں صاحبزادیاں راہ دیکھ رہی ہوں گی"

"کیوں بی صاحبزادی یہ ڈھنگ بہو بیٹیوں کے ہیں جو تم نے اختیار کر رکھے ہیں۔ تمہارے تو دیدے کا پانی ڈھل گیا۔ غضب خدا کا جوان عورت اور ڈاکٹر کے سامنے ہو تم نے کنبے بھر کی ناک کاٹ دی یہ بھی اسی دن کو آتی ہیں کہ کنبہ بھر کی عزت دھڑی دھڑی کر کے لٹائیں۔ خدا نہ کرے کہ عورت ذات کا دیدہ ایسا ہو جیسا تمہارا۔ میں نے خود منع کیا۔ بڑے چچا نے روکا جوان بھائی نے ٹوکا۔ مگر تمہارے کان پر جوں نہ چلی تم نے تو وہی مثل کر دی کہ چکنا گھڑا بوند پڑی پھسل گئی۔ بڑوں کا ادب تم پر نہیں۔ چھوٹوں کا لحاظ تم کو نہیں۔ ریل پر آئیں تو حقاقہ وقاقہ منہ کھولے ننگے سر کشتی ہوئی آستینیں پھنسا ہوا کرتہ یہ شریف زادیوں کے ڈھنگ ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ (خدائی راج)

نالۂ زار سے چند سطریں:۔

"غم زدہ ماں دو تین رات کی جاگی۔ چار پانچ دن کی تھکی ہاری بیٹھی ہوئی آواز چڑھی ہوئی آنکھیں۔ ہاتھ پاؤں شل۔ کمر پھٹرا۔ پٹاری پر سر رکھ لیٹ گئی پکا ہوا پھوڑا۔ مواد موجود۔ بھرا ہوا دل لگے ہوئے چرکے اٹھنے کی دیر تھی۔ بیٹی کی تصویر آنکھ کے سامنے ماں کی ماری سسکنے لگی۔ بیٹی بیگم تم تو بیچ بیچ ہی ہماری مہمان نکلیں۔ افسوس ماں سے جہان داری کا حق ادا نہ ہوا۔ آج ہی کے دن کو خدمت کی تھی برے دن سکھ بری راتیں کٹیں۔ پالا پوسا مصیبتیں جھیلیں۔ دکھ سہے۔ آنکھوں کی پتلی کلیجے کی ٹھنڈک دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اللہ تیرا نگہبان۔ اور خدا تیرا حافظ! الٰہی دنیا کی خوبیاں جہان کے عیش۔

علامہ مغفور رتی کے پرستار تھے انہوں نے نوبت پنج روزہ میں خلق کے آنسو رلایا ہے۔ "تلاش" "آخری بہار" "عصمت گزشتہ کے جگر دوز افسانے ہیں" جیتا جیتا میلہ" دکھ بھرے دلوں کی درد بھری بنتا ہے۔

اہل قلم کی نظر میں

مولانا راشد الخیری کا بہ حیثیت ایک مخصوص رنگ کے انشا پرداز ہونے کے) جو مرتبہ تھا اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ وہ اس طرز کے تنہا مالک تھے۔ اور انہیں کے ساتھ وہ ختم بھی ہو گیا۔ ہم آپ لاکھ ماتم کریں کوئی دوسرا قیس اب اس وادی سے اٹھنے کا نہیں۔ . . . . لوگوں نے ان کی تحریروں کو صرف پڑھا ہوگا۔ میں نے تو ان پر سر دھنا ہے"

مولانا نیاز فتح پوری ——— ساقی ستمبر ۳۶ء

کوئی لکھ سکتا نہیں اب ایسی انشائے لطیف
جس قدر اس فن میں کامل راشد الخیری ہوئے

حامد حسن قادری ——— عصمت مارچ ۳۶ء

"مولانا راشد الخیری کے کمال انشا پردازی نے مخالفوں کے دلوں کو بھی مسخر کر لیا۔ اور انہیں افسانوں

...یا میں مسلمان عورت کا حال زار دکھا کر اصلاح
...را لفہ سمجھا کر رفتہ رفتہ اپنا ہم خیال بنا لیا "

...اکٹر ذاکر حسین خاں ——— (عصمت اپریل ۱۹۳۶ء)

" مولانا راشد الخیری کا اسلوب تحریر بالکل طبعی
...طری تھا ..... انشا پردازی کا کمال یہ ہے کہ انشا پرداز
...ڑھنے اور سننے والے پر جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہے بے تکلف
...یدا کرے۔ جو انشا موثر نہیں وہ انشا کہلانے کی مستحق نہیں
...س اعتبار سے بھی مولانا راشد الخیری اردو لکھنے والوں
...یں مثال نہیں رکھتے "

...مولانا عبدالمجید سالک مرحوم ——— جنگ کراچی ۹ فروری ۱۹۵۹ء

" حقیقت یہ ہے کہ راشد الخیری جیسے باعظمت
انشا پرداز کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں، آفتاب کی ہزار ہا
گردشیں آب و گل میں رعنائی پیدا کرتی ہیں۔ اور پھر کہیں
ایک دیدہ ور چمن میں رونما ہوتا ہے۔ راشد الخیری کے
اسلوب انشا کا حد کمال یہ ہے کہ وہ سامع و قاری کو حسن
و عظمت اور نغمہ و رنگ کے ایک ایسے ادبی جزیرے میں
لے جاتے ہیں کہ کبھی تو ملائکہ کی مقدس مسکراہٹیں الفاظ
کے آئینے میں جھلکتی نظر آتی ہیں اور کبھی حوروں کے
قہقہوں سے لبریز شہاب ثاقب تحریر میں ڈھلا ہوا
دکھائی دیتا ہے۔ ایک انشا پرداز شاعر ادیب اور
مصور کی انتہائی خوبی یہ ہے کہ وہ مخاطبین کو اپنے ہمراہ
بہا کر لے جائے۔ اس کے الفاظ میں سحر ہو۔ اس کے
خیالات میں اتنی تاثیر ہو جیسے دراز پلکوں کے نشیلے
سائے وارفتگان عشق کو سکون بخشتے ہیں ———
راشد الخیری کا مقام و مرتبہ یقیناً اس سے مختلف نہیں
وہ اتنے بڑے ادیب تھے کہ ان کے بعد مرحوم دھلی
سے کوئی باکمال ادیب نہیں اٹھا۔ اور اب تو وہ
دہلی ہی فنا ہو چکی ہے "

شورش کاشمیری ——— (چٹان لاہور ۸ فروری ۱۹۵۹ء)

" علامہ مرحوم ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے ان کی
تحریر کا ایک ایک لفظ ان کی انفرادی شخصیت کے رنگ میں
ڈوبا ہوا ہے۔ قدرت نے انہیں ایک دردمند دل عطا کیا
تھا۔ انہوں نے عورت کے حقوق کی حفاظت کے لئے
بے شمار مضامین اور کتابیں لکھیں۔ عورتوں کی زبان لکھنے
میں وہ کمال پیدا کیا کہ کوئی دوسرا شخص اس فن میں آسانی
ان کا ہم پایہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علامہ مرحوم کی تحریروں
میں وسعت اور تنوع کا وہ عالم ہے کہیں ایک بات دہرائی
نہیں گئی وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے اس کے متعلق
الفاظ و اصطلاحات کا ایک خزانہ بے تکلف لٹا دیتے
تھے۔ سادگی۔ روانی جوش ان کی تحریروں کا طغرائے
امتیاز ہے ..... ان کی ہر کتاب کا آغاز نہایت برجستہ
اور دلکش ہے۔ جزئیات کے مشاہدہ کا کمال تھا۔ مزاح
نگاری کی بہترین مثالیں ان کی تصانیف میں ہیں ....
ملؤں سے پوچھئے وہ آپ کو سنائیں گی کہ راشد الخیری
کی حیرت انگیز قابلیت سے اُن کے دل کی گہرائیوں کی
کی خبر لائے ہیں۔ سہل ممتنع سی سرحد سے گذر کر ان سادہ
الفاظ کے ڈانڈے اعجاز کی سرحد سے جا ملے ہیں .....
ان اقتباسات سے جہاں مولانا کی وقائع نگارانہ قابلیت
کا اظہار ہوتا ہے وہاں درد و سوز کے اُن سوتوں کا سراغ
بھی مل جاتا ہے۔ جن سے اُن کو عمر بھر رونے کے لئے
آنسوؤں کا اتنا بڑا خزانہ مل گیا تھا ...... اس اقتباس
کے پہلے ہی فقرہ پر نظر ڈالئے :۔

" بہادر شاہ کی موت کو نہ معلوم کون سی موت
کھا گئی تھی کہ دنیا مر رہی تھی لیکن اس کو موت نہ آتی تھی "

شدتِ غم کی تصویر کھینچنے کے لئے اس سے زیادہ بلیغ الفاظ نہیں مل سکتے۔ . . . الفاظ کے ذریعہ حرکت کی صوتی تصویر ملاحظہ ہو۔

" وہ عجیب لمحہ تھا۔ آمنہ کا کلیجہ دُھکڑ دُھکڑ کر رہا تھا اور کان جواب کے واسطے تڑپ رہے تھے " (آمنہ کا لال)

معصومیت کی تصویر دیکھئے :۔

" قُربان اُن پیاری پیاری نظروں کے جو مُڑ مُڑ ماں کا مُنہ دیکھ رہی تھیں "

محاورہ بندی اور سلاست بیان کا نمونہ :۔

" کہاں پندرہ بیس روپیہ ماہوار کی مُفلانی اور کہاں چار پانچ لاکھ روپیہ کا تعلقہ۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا، وہ بڑھ بڑھ کر بولتی اور چڑھ چڑھ کر کہتی کہ سُننے والے دنگ رہ جاتے "

ذیل کے فقروں میں عبارت کی روانی اور لذتِ احساس کی ترجمانی قابلِ غور ہے۔

" سستا سماں ہے بے فکری کے دن۔ من بھر کے گیہوں چار پیسے سیر دُودھ، اور دُودھ بھی کیسا ملائی کے گھونٹ۔ دن بھر کا اونٹا ہوا آدھ سیر دُودھ میں آدھ پاؤ سے زیادہ روٹی ملائی۔ دو گھونٹوں میں جی خوش ہو گیا۔ یہ تھیں وہ غذائیں جو آدمی کو آدمی بناتی تھیں۔ آج کے دلّی والوں کو دیکھتا ہوں سُوکھے چپیٹی دھان پان۔ آنکھوں میں حلقے۔ گالوں میں گڑھے رزق کے مارے۔ خوراک کو محتاج۔ دُودھ کو ترستے گھی کو پھڑکتے "

دُودھ کیسا ملائی کے گھونٹ۔ دو گھونٹوں میں جی خوش ہو گیا ذرا دیکھئے تو حسِ ذائقہ کی ترجمانی کس چابک دستی سے کی ہے "

مولانا حامد علی خاں ——— ساقی راشد الخیری نمبر

ازجہاں فخرِ جہاں آباد رفت
یادگارِ حالی و آزاد رفت

تلوک چند محروم ——— عصمت [illegible]

" مولانا راشد الخیری کی انشا کا سوز [illegible] جس سے ان کی کوئی تصنیف خالی نہیں ایک [illegible] ہے جو براہ راست دل میں جاکر پیوست ہو [illegible] اور اس کے ساتھ چونکہ محاکات بھی ان [illegible] ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے الفاظ سے ایک ایسی [illegible] فضا پیدا کر دیتے ہیں جس میں پڑھنے والا [illegible]

مولانا نیاز فتح پوری ——— عصمت [illegible]

" علامہ مرحوم مصورِ غم ہیں اور مصورِ فطرت بھی ایک کامیاب ناولسٹ ہیں۔ اور اچھے افسانہ نگار [illegible] وہ کہانیاں بھی پیاری لکھتے ہیں اور خیالی [illegible] بھی۔ ان کی زبان میں لوچ ہے۔ شیرینی ہے۔ [illegible] فقروں میں درد ہے اثر ہے۔ ان کے لفظوں کا [illegible] موزوں، ترکیبوں کی چُستی دلکش تشبیہوں کی [illegible] ان کا تخیل سمندر کی تہ سے دُرِ شہوار کی چمک اور [illegible] افلاک سے ماہ و انجم کی درخشانی حاصل کرتا ہے [illegible] سمند فکر زندگی کی تاریک اور روشن دونوں وادیوں کی سیر کرتا ہے۔ ان کے قلم میں روانی ہے سخن میں [illegible] اور فکر میں لطافت یہ سب کچھ ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ لیکن میرے نزدیک مصورِ غم ادب کے میدان میں سب سے پہلے انشا پرداز ہیں اور بعد میں کچھ اور۔ ان کے ناول ان کے افسانے ان کی پیاری کہانیاں اور داستانیں ان کے تخیلی مضمون ان کے خط، اپنی جگہ سب کچھ ہیں اور سب کچھ ہونے سے پہلے انشا پردازی کے بے حد شیریں چشمے ہیں۔ . . . . . کردار نگاری ناول کا ایک بے حد

ضروری جزو ہے۔ جو کامیاب کردار نہیں پیش کر سکتا وہ اچھا ناول بھی نہیں لکھ سکتا۔ علامہ راشد الخیری اچھے کردار پیش کرتے ہیں اور اس لئے اچھے ناول بھی لکھتے ہیں۔ لیکن ان کے اچھے کردار اور اچھے ناول کی جان ان کی انشا پردازی ہے۔ علامہ مرحوم بے حد کامیاب انشا پرداز ہیں ۔۔۔۔

مولانا کی انشا پردازی کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی وہ قدرت ہے جو انہیں الفاظ کے استعمال پر حاصل ہے۔ فقروں اور جملوں سے فضا پیدا کر دینا، لفظوں کے تضاد سے دلوں کے جذبات میں طوفان برپا کرنا، محاوروں اور کہاوتوں کے موزوں استعمال سے نثر کو ایک رنگین تصویر بنا دینا۔ ایجاز سے تفصیل اور تشبیہ سے تسخیر قلوب کرنا مولانا کی انشا پردازی کی خصوصیات ہیں لفظوں کے ترنم فقروں کی وسعت مفہوم۔ جملوں کا ایجاز تشبیہوں کی لطافت اور ان سب کا اثر دیکھنا ہو تو آیئے مولانا کی کتابوں کی سیر کریں۔ قطراتِ اشک سے :-

"دلّی دیکھی - دلّی والے دیکھے۔ گورے دیکھے کالے دیکھے۔ بستی بستی کی رونق۔ بستی والوں کے کارنامے جو کچھ دیکھا دل کھول کر دیکھا۔ مگر کیا دیکھا ایک قصبہ دیکھا جس کے مرغ زار۔ ایک گھر دیکھا جس کے در و دیوار عبرت کی داستانیں آنکھوں آنکھوں آنسو رلاتے تھے سربفلک عمارتیں دیکھیں۔ زمین دوز بارگاہیں دیکھیں۔ دیسی دیکھے بدیسی دیکھے۔ مگر کیا دیکھا؟ وہ مکان دیکھا جس کے مکین وہ آسمان دیکھا جس کی زمین اپنی کہانی سننے والوں کے دل ہلا رہی تھی"

یہ ہیں چھوٹے چھوٹے جملے اور ان کا دردانگیز اثر

"جنت کی حور راجہ کے روبرو پہنچی - چرن لئے - ڈنڈوت کی اور یہ اشیر باد دی - مہاراج کا راج پاٹ رہتے سنسار تک - ہے مہاراج میری بنتی پر دھیان کیجے - اور اس وشواش کو من سے دور کیجے - راجوں کے راجہ شری مہاراج - میں آپ کی چیری ہوں مویا کیجئے اور میری لاج رکھ لیجئے - ہے مہاراج رو انش نہیں تھا - رام چندر کا اوتار تھا - سپنے میں درشن دیئے اور من موہ لیا - مہارانی یہ سیس تیرے چرن پر ہے"

———— (قطراتِ اشک)

یہ ہے لفظوں کی نرمی اور مٹھاس اور یہ ہے الفاظ کے استعمال پر قدرت۔

"ان کا زمانہ برسات کا چھینٹا تھا" ———— (ماہ عجم)

"مگر پسینے کے قطرے ان پھولوں کی طرح جو سلوٹ میں مسل جاتے ہیں پیشانی کے بل میں آ رہے تھے" (ماہ عجم)

"جہاں ساون ختم ہوا - اناج کٹنے کی نوبت آئی اور چڑیاں پھر پھر اڑنی شروع ہوئیں - یہی حال ہماری لڑکیوں کا ہے کہ ساون کی طرح کنوارپنے کے دن میکے میں بسر کر رہی ہیں" ———— (قطراتِ اشک)

"حکم شاہی سوئی نہ تھا کہ چھپ جاتا" (شاہین و دراج)

تشبیہوں کی ندرت کی یہی کیفیت ہے جس سے مولانا کی انشا پردازی پر چار چاند لگتے ہیں۔ تشبیہوں سے فضا پیدا کرنا مولانا کی انشا پردازی کی ایک خصوصیت ہے

.... مولانا کی انشا پردازی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی لفظوں کے تضاد سے اور متضاد کیفیتوں کے ذکر سے اپنے خیال کو موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پڑھنے والا متضاد کیفیتوں میں ڈوب کر انشا پرداز کے خیال اور جذبہ کا ہمنوا ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات اس میں درد اور تڑپ کا لطف آتا ہے۔ قطراتِ اشک کے افسانہ عصمت و حسن سے :-

"ماں باپ بھائی بہن - دیور جیٹھ ساس نند - کچھ مرکر چھوٹے - کچھ جیتے جی چھوٹے"

"اماں آپا جان کا نکاح ہو رہا ہے - قصہ مختصر اماں یوں گئیں آپا یوں گئے"

"اِدھر اسلم حسرت سے ماں کو دیکھ کر دم توڑ رہا تھا اُدھر نزاکت اشرفیاں اور روپے تقسیم کر رہی تھی"

مولانا کی انشا اوروں سے مختلف ہے محاورہ یا کہاوت عبارت کا جزو خاص معلوم ہونے لگتی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہاوت شاید اسی جملہ یا عبارت میں استعمال ہونے کے لئے وضع ہوئی تھی - اب سُنیئے قطراتِ اشک سے :-

"مغربی خواتین کی مثال نہ لو - بڑے آدمی بڑے لوگ - کجا گنگو تیلی کجا راجہ بھوج - انہیں روپے کی کیا کمی - ملکوں کا حکومت ان کی - عزت ان کی دولت ان کی جو چاہیں کریں جہاں چاہیں پھریں - یہاں نہ چولہے آگ نہ گھڑے پانی - پیٹ میں پڑتی ہے تو سب سوجھتی ہے"

"آپ کیوں غریبوں کو شرمندہ کرتی ہیں - کجا کمخواب کجا ٹاٹ - جنم نہ دیکھا بوریہ - سپنے آئی کھاٹ"

پروفیسر وقار عظیم ———— عصمت فروری ۱۹۳۶ء

"لیکن مولانا راشد الخیری صاحب میں قابلیت تصنیف کے لحاظ سے جو ایک خاص جوہر قدرتاً ودیعت رکھا گیا تھا - وہ یہ تھا کہ اُردو نثر کے ہر ایک نمونہ کو پیش کرنے کے ہر طرح قابل تھے اور یہ بات ادب اُردو کے سابق نثر نگاروں میں بہت کم پائی جاتی ہے - مثلاً سرسید مرحوم کسی خاص طرز تحریر کے مالک تھے - شرر بہت زود نویس تھے - مگر شروع شروع میں جو رنگینی ان کی عبارتوں میں خاص طور پر پائی جاتی تھی - وہ رفتہ رفتہ مفقود ہو گئی - اسی طرح مولانا سجاد حسین مرحوم صرف سرشار کی طرح ظرافتیہ مضامین لکھنے پر تمام عمر قادر رہے - اور مولانا راشد الخیری کی طرز کی کوئی ایک اور مثال بھی نہیں پائی جاتی - ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم نے جو افسانوں میں عورتوں کے حالات لکھے ہیں - وہ بھی محض ... ہیں - اور اس قدر دردناک نہیں جیسا کہ مولانا راشد الخیری کے افسانوں کی بہت نمایاں خصوصیت ہے - موصوف جہاں اپنے قلم سے بہت کچھ رلا چکے ہیں اُنہوں نے نانی عشو وغیرہ کے قصے لکھ کر خوب ہنسایا ... مولانا مرحوم بہت جلد لکھنے والے تھے چنانچہ میں جب ... ہمراہ شریک سیاحت تھا تو اُنہوں نے صرف ایک ... میں ایک افسانہ کا خاکہ اپنے ذہن میں قائم کر لیا ... پھر صبح اُٹھتے ہی اس کو لکھوا کر مکمل کر دیا تھا - اور وہ ... شائع ہو گیا تھا - گویا وہ اور اُردو مصنفین کی طرح ... مسودے میں بار بار کاٹتے چھانٹتے کے عادی نہ تھے"

شیر علی خاں سرخوش ———— (عصمت فروری ۱۹۳۶ء)

۸ - مبلغ اسلام

علامہ مغفور انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مذہبی شخص تھے - اُن کے دادا - چھوٹے دادا ... سکڑدادا نے ان کی دادی اور پھوپھیوں نے ان ... خسر نے تدریس اور مواعظِ حسنہ کے ذریعہ مذہب مقدس کی خدمت کی تو علامہ مغفور نے تصانیف اور صحافت کے ذریعہ - ان کا کوئی ناول کوئی افسانہ کوئی مضمون کوئی کتاب غرض کوئی تحریر ایسی نہیں جو مذہب سے علیحدہ ہو - مصنفین اُردو میں یہ خصوصیت صرف علامہ مغفور کی ہے کہ ان کے ادب میں مذہب ہے - اور مذہبی کتابوں میں ...

منہ پر اپنی جاہلانہ روش سے جھک رہے ہیں۔ وہ ہر مسلمان کو
بعد میں کچھ اور لیکن سب سے پہلے سچا مسلمان دیکھنا چاہتے
تھے۔ وہ اپنی تصانیف سے خوب اچھی طرح ذہن نشین ملی
شین اور وہ نشین کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے مذہب کے سایہ
ہیں ترقی کی اور مذہب سے علیحدہ ہو کر ذلیل و خوار ہو گئے
اور اب پھر وہ ترقی کر سکتے ہیں تو مذہب مقدس کی روشنی
میں۔ اسلام کو سینے سے لگا کر جو دنیا دار مولویوں، جاہل
ملاؤں، دغا باز مکار پیروں اور نیچے نیچے چغوں والے
اونچے اونچے عماموں والے۔ لمبی لمبی زلفوں والے نام نہاد
مذہبی پیشواؤں یا پیر مغربیت زدہ نقالوں کا نہیں پیغمبر اسلام
صلعم کا پیش کیا ہوا ہے۔ انہوں نے جہاں مسلمان مردوں
کو سرور کائنات کے یہ الفاظ بار بار یاد دلا کر کہ:-

"عورتوں کی عزت وہی کرتے ہیں جو شریف ہیں اور
توہین وہ کرتے ہیں جو پاجی ہیں"

عورتوں سے شریفانہ برتاؤ کرنے کی تلقین فرمائی
نیز یہ کہ انہیں اپنے تمام شرعی حقوق سے پورا پورا فائدہ
اٹھانے دیں جو شرع اسلام نے انہیں عطا فرمائے ہیں
وہاں مسلمان عورتوں کو یہ ہدایت فرماتے تھے کہ قرون اولیٰ
کی مسلمان بیبیوں کے پاک نمونے سامنے رکھ کر رسم و رواج
اور جہالت کے اندھیرے گڑھوں سے نکل کر اپنے فرائض
کی ادائیگی میں جو مذہب کی حیثیتوں سے ان پر عائد ہوتے ہیں
منہمک رہیں۔ اقتباس کس تصنیف سے دیا جائے سب
ہی تصانیف پر اسلام چھایا ہوا ہے۔

• علامہ راشد الخیری کی مذہبی خدمات کچھ کم نہیں ہے۔
مذہب کا رنگ ان کی طبیعت پر بہت گہرا تھا غالباً اس کی
وجہ یہ ہے کہ مولانا ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو
اپنی اسلامی خدمات کی وجہ سے دلی میں نہایت وقعت کی
نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود علامہ راشد الخیری ابتدا
ایک واعظ خوش بیان تھے اور آخر وقت تک خطیب
شیریں مقال رہے۔ ان کے اکثر افسانوں اور مضامین میں
مذہبی پہلو نمایاں ہے۔ قرآن فقہ اور حدیث کے اچھے عالم
تھے اور اسلامی تاریخ پر انہیں پورا پورا عبور حاصل تھا۔

ادیٹر ساقی —————— عصمت راشد الخیری نمبر

• مولانا نے خاموش تبلیغ کی۔ انھوں نے یہ نہیں کیا
کہ کام کچھ نہ کریں اور بانگ دہل خود اپنی خوبیاں گنوائیں اپنی
خدا رسی کے دعوے کریں۔ انہوں نے کبھی اپنی نسل اپنے
خاندان پر فخر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ ہی عین اسلام ہے انہوں نے
قصے لکھے اور بڑے نتیجہ خیز مضمون پیدا کئے۔ جو مذہبی
کام کرتے ہیں وہ عدم نمود کا پسند نہیں کرتے وہ مولانا کی
کتابیں پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مرحبا مولانا نے
نہایت عمدہ کام کیا۔ انجمنیں واعظوں کے گروہ اور سیلونوں
کے دستے وہ کام اس زمانے میں بھی کر کے نہ دکھا سکے
جبکہ ارتداد کا زور شور تھا جو مولانا نے گھر کے ایک کونے
میں بیٹھ کر انجام دیا۔

شرک سب سے بڑا گناہ ہے جس کی بخشش نہیں اور
ہم دیکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہی اس میں سب سے زیادہ مبتلا
ہیں۔ مستقبل میں ہونے والی ماں کی کیا صورت ہوتی
ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

" آثار حمل کے نمودار ہوتے ہی دونوں وقت مسجد میں
گھی کے چراغ جلنے لگے۔ ایک مہینہ اس طرح جوں
توں کٹا۔ دوسرے مہینے کا شروع ہوتا تھا کہ گلے میں
ہنسلی رہی نہ پائل میں کل۔ سارے بدن پر تعویذوں کی
حمائل پڑی تھی۔ جدھر دیکھو نقش اور جس طرف نظر
ڈالو تعویذ۔ اس پر ستم پڑھا ہوا کاجل تھا۔ دن میں

تین تین مرتبہ اور چار چار دفعہ تھپتا ۔۔۔۔ آنکھوں
میں ڈھیر سا کاجل ۔ ماتھے پر نظر کا ٹیکہ ۔ سرخ قمیص
سیاہ تعویذ ۔ کروٹ میں خربطے سامنے فیلتے"

------------ (طوفان حیات ص۶)

اولاد کے لئے مائیں کیا کچھ کرتی ہیں ۔ مولانا کی
زبان سے سنیئے :۔

"نعوذ باللہ مسلمان ہوکر ایسا خیال کرنا ۔ کیسی شرم کی
بات ہے ۔۔۔۔ جہاں بچہ بیمار ہوا اور پیر جی کی سوجھی
نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آدھ سپید مرغ دو ایک بکرے
کچھ نقدان کی نذر کرنا پڑا ۔۔۔ ایک نام تم نے مرت
بیا ہی سُنا ہوگا ۔ یہ اس کم بخت بچے کو کہتے ہیں جس کے
اوپر کے چار پانچ بچے مر چکے ہوں گویا اس کی ضد اس لئے
ہوتی ہے کہ پوری نہ ہو تو لوٹتا ہوا مر جائے اس لئے
اس کی ناز برداری بہت کی جاتی ہے ۔ اور ایسا پاپ
ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ ۔ بے وقوفی کے علاوہ اس قسم
کا عقیدہ کیسا زبردست شرک ہے ۔ گویا ایسے بچے
کو بچانے کی خدا میں کوئی قدرت نہیں ۔ اسی کو مارنے
جلانے والا مرت مسان ہے ۔۔۔۔ اس ماتا
کے کارن بیسیوں بے وقوف مائیں سب کچھ کرتی ہیں چولہے
پر کلیجیاں اور سسریاں تک رکھ کر پوری شرک بن
جاتی ہیں"

(شام زندگی صفحہ ۴۳، ۴۴)

مولانا نے مسلمانوں کی تباہی کا باعث یہ قرار دیا :۔

"اس تتنا اور درخت کی طرح جس کو دیمک اندر ہی اندر
غارت کرتی ہے رسوم کی پابندی نے ان کو کھوکھلا
کردیا"

------------ (طوفان حیات ص۳)

رسوم کی مذمت اور ان کے علاج کے متعلق
آپ طوفان حیات پڑھ جائیں بخوبی اندازہ کر سکیں گے
کہ ایک اصلی مبلغ کیا کچھ کر سکتا ہے ۔

غریب ہمسایہ کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے

"خدا کے حاجت مندوں کی خدمت خدا کی ۔۔۔
ہے ۔۔۔۔ مسافر بھولی بھالی جان کو ۔ ۔۔۔
سے لگائے پڑی ہیں ۔ چیتھڑے چہرے ۔۔۔
کو ترس رہے ہیں ۔ اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں ۔۔۔
شاباش ہے اس محلہ پر کہ مسلمان پڑوسی ۔۔۔
گذر جائے اور خبر تک نہ ہو ۔ مسٹنڈے بھٹ ۔۔۔
پیر فقیر نقدیاں اڑائیں اور معصوم فاقے ۔۔۔
کریں"

------------ (طوفان حیات ۔۔۔)

مردوں کی جو مذہبی حالت ہے تعلیم نے ۔۔۔
اصلاح نہیں کی ۔ حالت بد سے بدتر ہی ۔۔۔
کی حالت یہ کتابیں پڑھنے سے بہت کچھ سنبھ۔۔۔
مولانا راشد الخیری مرحوم نے مذہبی پہلو کو ۔۔۔
میں نہیں چھوڑا ۔ خود انگریزی داں تھے اور ۔۔۔
انگریزی دانوں سے کہیں زیادہ قابل تھے ۔ مگر ۔۔۔
مسلمان دل تھا ۔ اس کی چمک دمک ان کی ہر کتاب ۔۔۔
اور ہر تقریر میں موجود ہے"

مولوی محمد ظفر الملک مرحوم ------------ عصمت راشد الخیری

"اقتباس یقیناً طویل ہوگیا ۔ لیکن دل ۔۔۔
برابر بھرا چلا آرہا ہے ۔ اور کون دل والا ہے جو ۔۔۔
طوالت کو ختم کرنا چاہے گا ۔ اللہ کی بے شمار رحمتیں ۔۔۔
اس انشا پرداز کے قلم پر جس نے یوں گدگدا کر رلایا اور
رلا رلا کر گدگدایا ۔ کتنے بگڑے ہوئے گھرانہیں تحریر ۔۔۔
سے سدھر گئے ہوں گے ۔ اور ظلمت کدوں میں انسانیت
اور خدا ترسی کی شعاعیں انہیں روزنوں سے پہنچی
ہوں گی اور افسانہ نویس کے اثر بے حساب اور مزید ۔۔۔

اندازہ کون کرسکتا ہے۔ . . . دائرہ انتخاب
اندازہ کا اندازہ کے سوال اگر یہ کیا جائے کہ زندگی کی منظر نگاری
کی مصوری اور آخرت کی عکاسی کس نے سب
سے ... تو جواب کئی نہیں ہوں گے صرف ایک ہوگا —
... متعدد نہیں صرف ایک راشد الخیری کا آگے
موت کے کیسے کیسے نقشے اس عبرت نگار قلم نے
... دکھائے؟ نہیں یہ وصف غلط بیان ہوا۔ کہنا
چاہیئے ... موت میں کس کس طرح زندگی پیدا کر دکھائی۔
... جو موضوع تمام تر خشک اور بے مزہ سمجھا جاتا تھا اس میں
... لذت درد وچاشنی غم کوٹ کوٹ کر بھر دی۔
... رونے رونے سسکیاں بندھ جائیں اور عبرت کتاب تھی رکھ
دی جائے اور ورق نہ الٹا جائے ... اسے اگر بندہ کا اعجاز
... مولا کا انفصال نہیں تو اور کیا کہیے؟

... عبدالماجد دریا بادی ——— ... عصمت فروری ۱۹۳۶ء

۹۔ سیاسی رہنما

مولانا محمد علی جوہر مرحوم حکیم اجمل خاں شہید مرحوم مولانا عارف مرحوم جیسے مخلص دوستوں نے مصور غم مرحوم کو سیاست کے میدان میں لانے کی کافی کوششیں کی تھیں۔ مگر وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے سامنے صرف مسلمان عورت ہے۔ میری ساری عمر حقوق نسواں اور تعلیم نسواں پر بسر ہوئی ہے۔ جو تھوڑے دن زندگی کے رہ گئے ہیں وہ بھی اس خبط میں گذر جانے دو۔ میں قومی جلسوں کی شرکت اور ملکی معاملات میں رائے زنی کرنے کا اہل نہیں" لیکن اس کے باوجود خدا غریق رحمت کرے علامہ مغفور نے سیاست میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ لیکن غل غپاڑہ اور زور شور سے پلیٹ فارم پر نہیں۔ اخبارات میں لمبے چوڑے اعلانات سے نہیں بلکہ نہایت خاموشی کے ساتھ درد انگیز مضامین اور موثر افسانوں کے ذریعہ۔ اب سے ۵۰ سال قبل جب طرابلس میں اٹلی کے وحشی درندوں نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں۔ روس نے ایران پر مظالم توڑے اور اس کے بعد عرب اور ترک خواتین کی ناموس لوٹنے کے لئے مہذب یورپ کے خونخوار وحشیوں نے حملہ کیا اور قوموں کے خلاف بھڑکا کر مقامات مقدسہ مسلمانوں سے چھینے گئے۔ اس کے بعد جب سمرنا۔ ریف وغیرہ میں بھیڑ بکریوں کی طرح رسول عربی کا کلمہ پڑھنے والوں کا قتل عام کیا گیا۔ اور ادھر ہندوستان میں جلیانوالہ باغ میں بے گناہوں پر گولیاں چلائی گئیں اور تبلیغ اور شدھی کی قیامت خیز آگ بھڑکی اور ہندو مسلم فسادات نے ملک کی فضا زہر آلود کر کے عجیب عجیب گل کھلائے تو مصور غم نے درد انگیز مضمونوں اور افسانوں میں خون کے آنسو بہا کر غیرت مند خوددار شریف انسانوں کو جو ہدایت فرمائیں ان سے زیادہ ساری عمر سیاست میں گذارنے کے بعد بھی ہمارے بہت سے لیڈر کچھ نہ کہہ سکے۔ کچھ کرنے کا تو ذکر ہی کیا!

تبصرے — "غم کی مصوری کے بہترین شاہکاروں کے ساتھ ساتھ اگر یہ دیکھنا ہے کہ اخوت اسلامی کی تعلیم کس طرح دی جاتی ہے۔ یہ احساس کیسے تمام دنیا کے مسلمان بھائی بھائی ہیں کس طرح پیدا کیا جاتا ہے اور اگر مغرب میں ایک مسلمان کے کانٹا چبھے تو مشرق میں ہر مسلمان کے کیوں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے اور کس طرح اس کی تکلیف کا احساس پیدا کرا کے اس کی مدد کے لئے تمام مسلمانوں کو تیار کیا جا سکتا ہے تو "شہید مغرب" کے افسانے اور خصوصاً "طرابلس سے ایک صدا" "ایک

عرب سیدانی "، "شہید طرابلس" اور "شہید مغرب" پڑھیے اگر آپ اپنے آنسوؤں کو روک سکیں۔ اگر آپ دنیا کے ہر مسلم مرد و عورت کو اپنے بھائی اور بہن سے زیادہ عزیز نہ شمار کرنے لگ جائیں تو میرا ذمہ۔ سنئے "شہید مغرب" میں ایک یہودن ایک مسلم ترک سے شادی کر لیتی ہے۔ جنگ طرابلس کی ہولناک خبر پہنچتی ہے۔ نو مسلم "مریم" اپنے خاوند سے طرابلس کے مسلمانوں کی امداد کی درخواست کرتی ہے۔ مریم کی ماں اس کو واپس لے جانا چاہتی ہے ترک اپنی بیوی کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اس لئے طرابلس نہیں جاتا۔ ایک دن مریم گھر سے غائب ہو جاتی ہے۔ ترک رو پیٹ کر طرابلس کی جنگ پر چلا جاتا ہے۔ مریم مردانہ بھیس میں نائب کمانڈر ہو جاتی ہے، اس کا خاوند ادھر اس ہی کی فوج کا سپاہی زخمی ہو جاتا ہے۔ تب مریم اپنا راز افشا کر دیتی ہے۔ اور خود بھی زخمی ہو کر اپنے دیور کو خط لکھتی ہے۔

"کاظم آفندی! تم لوگ سمجھ رہے ہوگے کہ مکار بھاوج دغا دے گئی۔ آخر یہودن تھی، دھوکہ باز نکلی۔ مگر تمہیں تعجب ہوگا یہ سن کر کہ بھاوج اس نمک کا حق ادا کر رہی ہے جو کلمۂ توحید نے اس پر اس وقت مقرر کیا جب وہ خلد کی فضا میں اسلام لائی احمد کی موت کانوں سے سنی اور محمود آنکھوں کے سامنے شہید ہوئے۔ کاظم آفندی ایک یہودن کے دودھ سے پلنے والی عورت جس نے تمہارے اسلام پر اپنے لال نثار کئے۔ شوہر کی قربانی چڑھائی با آواز بلند کہتی ہے کہ تمہارا کھانا تم کو حرام ہے۔ جب تک تم اپنے دسترخوان سے ایک روٹی اٹھا کر ان خانماں بربادوں تک نہ پہنچا دو جو اپنے کلیجوں کے ٹکڑے کے بھائی بڑے ماں باپ گنوا کر صرف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کی حفاظت کر رہے ہیں"

"طرابلس سے ایک صدا کی ایک دل ہلا دینے والی آواز سنیے:۔ اپنے بچوں کو کلیجے سے لگانے والی ماؤ اور شفقت پدری کے جوش میں اپنے بچوں کو کلیجے سے لپٹانے والے باپو میرے کلیجے کے ناسوروں پر بھی نظر ڈالو۔ چار بچے خون میں نہلا کر تمہارے سامنے آئی ہوں۔ ...... اس دل میں جو اتنا سے تڑپ رہا ہے وہ خون بھی جوش کھا رہا ہے جو چار کیا ہزار بچے ہوتے تو وطن اور مذہب پر نثار کر دیتا۔ میری محنت ٹھکانے لگی میرے ارمان پورے ہوئے میں خوش نصیب ہوں کہ میری کمائی میرے پاک مذہب اور میرے وطن کے کام آئی قریب آگیا ہے وہ وقت کہ میں بھی ان ہی بچوں کے پہلو اور اس سر تاج کے پائنتی جا سوؤں۔ مگر میری موت وہ موت ہو گی کہ تمہاری ہزار ہا زندگیاں اس پر قربان مسلمان میرے نام پر جان دیں گے۔ اور میرے نام پر فخر کریں گے"

مضمون "روضۂ اطہر پر ایک عرب سیدانی" جس نے مجھے اور میرے عزیز و اقارب کو سنہ ۱۹۱۱ء میں زار و قطار رُلا دیا تھا۔ اب بھی اتنا ہی مؤثر ہے جتنا اس وقت تھا چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں ایک عرب سیدانی جو زخمی ہو کر جنگ سے واپس آئی ہے مدینہ منورہ میں عید کا چاند دیکھنے کو کوٹھے پر چڑھی ہے، روضۂ اقدس سامنے ہے، دوسرے بچے کی شہادت کی خبر ملتی ہے اور وہ اس طرح روضۂ اطہر کی طرف ہاتھ اٹھا کر التجا کرتی ہے:۔

"گنبد خضریٰ میں آرام کرنے والے عرش نشین مجھ دکھیاری کی التجا قبول کر..... میری بپتا پر غور کر..... کشتی اسلام کے ناخدا! عیسائیوں کی متفقہ طاقت اسلام پر آمادہ ہو

اور ترک اس لئے کہ رحمۃ للعالمین کے مانند ہیں اپنی جانیں
فدا رہے ہیں اسے وہ مقدس رسول جس نے اخلاق عیال
کی تلقین ڈنکے کی چوٹ کی۔ اسے پاک رسول۔ جس نے
بھرے مجمع میں حاتم طائی کی لڑکی کو چادر اڑھا کر نامحرم
نظروں سے بچایا!
آج تیری امت کی بیاہی عورتیں اور کنواری لڑکیاں برہنہ
کی جاتی ہیں . . . . ترک و عرب اسلام کا حق ادا کر چکے
جگر دینے لال خون میں نہلائے اور اف نہ کی . . . .
سر کے وارث تڑپ کر آنکھیں پھیر گئے۔ بنے بنائے گھر
پل مارنے میں تاراج ہوئے۔ اور جن خاندانوں میں کوٹھیوں
اور درجنوں انسان رہتے تھے آج سنسان پڑے ہوئے
ہیں۔ فخر امم! امتِ مرحومہ کی ایک نامراد و ناشاد خاتون
ہوں۔ جو خاکِ طیبہ سے اٹھی اور حفاظتِ اسلام کی
خاطر میدانِ جنگ میں پہنچی۔ ادھ موئی برحق زندہ آئی ہے۔ مگر
زخمی آئی ہے۔ اکیلی آئی ہے مگر دو قربانیاں چڑھا کر"

انیس کی نظم اور علامہ راشد الخیری کی نثر ادبِ
اردو کے وہ جواہر پارے ہیں کہ جن پر ہم مشرقی جس قدر
بھی ناز کریں کم ہے۔

علامہ نے جہاں اخوتِ اسلامی کی بے بہا تعلیم
دی ہے وہاں ہندوستان کی سیاسی حالت اور ہندو مسلم
نفاق کی اصل وجہ اور اتحاد کی کوشش پر بھی بڑے موثر
پیرائے میں ایسے ایسے مضامین لکھے ہیں کہ جو ہندو اور
مسلم دونوں فرقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

"یہ ذلیل کمینے ناپاک اپنی اصلیت کو بھول کر آج مابدولت
کے سامنے منہ کر کے بھونکتے ہیں (یعنی ہندوستان کی آزادی
طلب کرتے ہیں) اچھا ان سب کے ماتھے پر ایک سیاہ داغ
لگا دو . . . . یہ وہی ہیں جو کل تک ڈاکوؤں لٹیروں کا
شکار تھے۔ یہ وہی ہیں جن کی گزر کل تک جنگل کی پتی
تھی۔ یہ وہی ہیں جن کو کل تک ستھنے جوتی اور میٹھے لات
ملتی آج ہماری قید ہٹا کر ان کے پنجروں کی تیلیاں نکلی
ہیں اور انواع و اقسام کے لذیذ مرغن کھانے ان کی غذا
بے فکر و آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کا بدلہ یہ اس کا
معاوضہ ایسا ذلیل . . . . ایک بڑھا وزیر اٹھتا ہے اور
اس کے جواب میں کہتا ہے "کچھ شک نہیں کہ حکومت کی
طاقت بہت زبردست ہے مگر حد سے گذر جانے
کے بعد یہ حکومت سے زیادہ طاقتور ہیں . . . . زیادہ
زمانہ نہیں گذرا جب دشمن نے تیرے حواس باختہ کر دئے
. . اس وقت یہی جانثار تیرے کام آئے اور اپنے
کلیجے کے ٹکڑے تک تیرے لئے قربان کئے . . . جنہوں نے
ملتے بھگتے اور قربانیاں چڑھا کر تجھ کو یہ دن دکھایا وہ
اس سلوک کے مستحق نہیں"

وہ بچے بائیکاٹ کی ترغیب دیتے ہوئے گرفتار ہوتے
ہیں۔ ان کی رہائی کے لئے شہر میں جلوس ہوتا ہے اور ایک
بیوہ کا جوان لڑکا جس کی شادی کی بہت سی رسمیں ادا
ہو چکی تھیں۔ حکومت کی گولی کی نذر ہوتا ہے۔ تو موت کی
خبر سن کر بیوہ ماں کی زبان سے علامہ کہلواتے ہیں:-
"خوش نصیب ہے وہ ماں جس کی محنت اس طرح ٹھکانے لگی"

قوم و ملک کے لئے عورت کو قربانی کی تعلیم صرف
مسلم عورت ہی کو نہیں دی گئی ہے بلکہ علامہ اپنے نوکِ قلم
سے ہندوستانی ماں کو ملک و قوم پر اپنے بچے نثار کر کے
فخر کرنے کی تعلیم دیتے ہیں جب بھی ہندو مسلمان میں جو
نئی طرز کی شدھی اور تبلیغ کی تحریکوں میں اپنی بھلائی سمجھتے
ہیں۔ لیکن علامہ راشد الخیری نے ان تحریکوں کی اصلیت
کو سمجھ کر اپنے مضمون "افراط و تفریط" میں مسلمان ہو کر موجودہ

طرز کی تبلیغ کے خلاف کہ کر حبِ وطنی اور حق پرستی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"پنڈت جی بھرے جلسہ میں مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے اور ملکانے مسلمانوں کے شُدھی کرنے کا اعلان کرتے ہیں یہ مسلمان اور ہندوؤں میں فساد برپا کر دیتا ہے جس جو مسلمان ہے ہندوؤں کو ایذا پہنچانے کا یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ اپنی گائے "رگھو" ہندوؤں کے سامنے ذبح کر دیتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ گائے کی ہتیا کی ذمہ داری ہندوؤں پر ہے۔ اور مسجد کی توہین کا بار مسلمانوں پر کیونکہ نہ وہ ایک دوسرے کی دل آزاری کا قصد کرتے اور نہ یہ فسادات ہوتے۔ لکھتے ہیں:۔

"مسجد کی توہین اور الطاف کی موت کا بار مسلمانوں پر کس قدر ہے۔ ہم جانتے ہیں مگر کیا کوئی اللہ کا بندہ ہندو دھرم کا پجاری ہمارے اس سوال کا جواب دے سکتا ہے کہ رگھو گائے کے ذبح ہونے کی ذمہ داری ہندو دل پر کس قدر ہے"

اسی طرح علامہ نے اپنے مضمون "کلو متیاں" میں شُدھی اور تبلیغ کو مادرِ ہند کی دو ایسی ناہنجار لڑکیوں کے لباس میں پیش کیا ہے کہ ان دونوں تحریکوں کی اصلیت نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

علامہ نے ہماری سیاسی پستی کی وجہ ہندو مسلم نفاق اور اس کی تشخیص موجودہ شُدھی اور تبلیغ کے نتائج اور اُن تحریکوں کے معاونین کو غدار اور مادرِ ہند کا دشمن ثابت کر دکھایا ہے۔ حق گوئی، حق پرستی اور محبتِ وطن کی یہ ایسی مثال ہے کہ علامہ کی ذات پر ہندوستانی بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں"

میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"دسمبر ۱۸ء میں جب میں دہلی گیا تو حضرت مولانا راشد الخیری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انہوں نے جو نصیحتیں مجھے کی تھیں وہ حب وطنی سے بھری ہوئی تھیں۔ مولانا مرحوم نے کانگریس کے مختلف پہلو اور جو خیالات دس سال پہلے ظاہر کئے تھے وہ آج ... جا رہے ہیں۔ ملک کی سچی خدمت کا جو کچھ درد میرے دل میں ہے وہ صرف مولانا راشد الخیری کی وجہ سے ہے ۱۹۳۰ء میں جب میں ڈپٹی انسپکٹر سکولز تھا اس وقت مولانا نے جو نصیحت بھرا خط لکھا تھا اس میں قوم کی خدمت کی ہدایت کی تھی۔ کئی دفعہ خط پڑھا اور دوستوں نے بھی دیکھا اسے ہندی پرچہ کرم ویر نے ... میں چھاپا تھا"

سید قاسم علی شاستری ——— بنات
نرسنگھ پور ——— راشد الخیری نمبر

"مولانا مرحوم کی تصانیف کی ایک خصوصیت حب الوطنی ہے۔ دہلی سے آپ کو معمولی محبت نہیں بلکہ عشق تھا۔ قدم قدم پر آپ نے اس کی عظمتِ رفتہ داستان کو رو رو کر بیان کیا ہے۔ بیلہ میں میدنت خاص طور سے مولانا مرحوم کی وہ محبت وطن ظاہر ہوتی ہے جو آپ کے مصورِ غم کہلائے جانے کا باعث ہے"

پروفیسر علی عباس حسینی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

۱۰۔ شاعر

والٹر سکاٹ کا "آئی وان ہو" اور گولڈ اسمتھ کا "وکار آف ویکفیلڈ" انگریزی ادب کے ایسے ناز ہیں۔ لیکن یہی ناول نگار "لیڈی آف دی لیک" اور "ڈیزرٹڈ ویلج" جیسی غیر فانی نظموں سے انگریزی کے بہترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی

کئی نثر نگار ہیں جو نثر کے ساتھ ساتھ نظم پر بھی پوری قدرت
رکھتے تھے جیسے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم۔ مولوی محمد حسین آزاد
مرحوم۔ مولانا شبلی مرحوم۔ مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم۔
طبع موزوں سے جو کچھ نکلے وہ شعر ہے۔ نظم و نثر کی
قید نہیں۔ ردیف اور قافیہ سے شعر کی خوبی ضرور بڑھ
جاتی ہے۔ لیکن اگر اس میں اثر نہ ہو تو شعر نہیں۔ شعر سے
مطلب یہ ہے کہ کہنے والے کے قلب کی جو کیفیت ہے
سننے والوں پر بھی وہ طاری ہو جائے۔ مصور غم کی نثر
میں شاعرانہ عنصر غالب ہے۔ اُن کی نظموں میں بھی نثر
کی طرح درد و تڑپ اور سوز و گداز ہے مگر انہوں نے
کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ شعر بھی کہتے تھے۔

"میں شعر کہنے کا مدعی نہیں ہوں۔ میرے خیالات
اتفاق سے اس نظم کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔
کوئی صاحب مہربانی فرما کر انہیں شاعری کی کسوٹی
پر نہ پرکھیں"

صدائے راشد ———— سنہ ۱۸ء

"اس خط کو ہم کچھ اس غرض سے درج نہیں کرتے کہ
اس میں شاعری کا کمال ہے۔ بلکہ ایک بدنصیب
لڑکی کے جذبات اور اس کی حالتِ زار کی تصویر ہے"

اسلم کا خط شوہر کے نام ———— سنہ ۱۵ء

عصمت اور سہیلی میں ان کی اکثر و بیشتر نظمیں
اُن کے نام سے نہیں چھپیں۔ مگر جب میں نے جمع کر کے
کتابی صورت میں شائع کیں۔ تو ان کی دوسری تصنیفات
کی طرح نظموں کے مجموعہ کو بھی قوم نے سر اور آنکھوں
پر رکھا۔ وہ پیدائشی شاعر تھے۔ انسانی جذبات اور واردات
قلب کی نثر و نظم دونوں میں ایسے موثر اور درد بھرے
الفاظ میں تصویر کھینچی ہے کہ انسان بے اختیار ہو کر
بلبلا اٹھتا۔ اور پتھر سے پتھر دل بھی اشکبار ہو جاتا۔
جذبات نگاری اور مناظر کشی کا انہیں خداداد ملکہ تھا
اور مملکت تخیل کے وہ فرماں روا تھے۔ درس سبق۔
نتیجہ مقصد۔ درد تاثیر سے نثر کی طرح ان کی کوئی نظم
خالی نہیں۔ پاکستان اور بھارت کی خواتین کے لئے جس
طرح نثر میں ان سے زیادہ کسی نے نہیں لکھا اس طرح
نظم میں بھی۔ "روداد قفس" اُن کی درد انگیز نظموں کا پہلا
مجموعہ ان کے سامنے ہی کئی دفعہ شائع ہوا تھا۔ اس کی
اکثر نظمیں بڑی دردناک ہیں۔ جن کے اشعار تیر و نشتر
کی طرح کلیجے کے پار ہو جاتے ہیں۔ اور پتھر سے پتھر دل
پسیج کر آنسوؤں کا خراج مصور غم کے حضور میں پیش
کرتا ہے۔ اور یہیں ہم انہیں حقیقی شاعر تسلیم کرنے پر
مجبور ہو جاتے ہیں۔ منظر کشی مرقع نگاری کے چند نمونے:۔

"برسات کی یہ رات اور پچھلا پہر، سر پہ گھٹا
(۱) ہے کس قیامت کا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا
ٹھنڈی ہوا برسات کی اور سائیں سائیں رات کی
قانونِ قدرت کا ہے ہر ہستی پہ جادو چل رہا
اس عالمِ سنسان میں جھونکے ہوا کے کان میں
انگنائی میں دالان میں لاتے ہیں یہ کیسی صدا

(۵) جاڑے میں ٹھٹھی سے، گرمی میں پسینے جل بھنا
شوہر کو اور بچوں کو جب تم نے دیا کھانا چلا
اس وقت بیٹھیں آپ تم، سالن کو دیکھا تو وہ کم
کھائی پتیلی پونچھ کر، اس طرح پیٹ اپنا بھرا

(۶) گرمی کے سخت ایام میں، برکھا کی صبح شام میں
چولہے سے فارغ ہو کے تم اٹھتی تھیں جب روٹی پکا
میلے کچیلے چیتھڑے، گیلے پسینے میں بھرے
تھا ایک بچہ گود میں کندھے سے اک چمٹا ہوا

صدائے راشد ———— سنہ ء

وہاں شرب میں شامِ غربت، سرِ حسینؑ پر آرہی تھی
نہ تھا جو ہلکا سا تھا ترشح، فلک پہ بدلی سی چھارہی تھی
ہوا کے جھونکوں سے کپکپاتی، قدم بڑھائے چلی ہے بیبی
کہ پہنچوں منزل پہ جلد جاکر کروں سوامی کے اپنے درشن

مظلوم حسینؑ ________ سنہ ۱۹

یہ موسم تھا جیٹھ اور بیساکھ کا
برستا تھا مینہ ریت اور خاک کا
وہ لوؤں کا جھکڑ جو چلنے لگا
تو پانی بھی دیدے بدلنے لگا
کنارے پہ دریا کے یہ حال تھا
کہ کیچڑ تھی خشکی تھی یا ریت تھا
ترقی میں گرمی برابر رہی
نہ پانی رہا اور نہ کیچڑ رہی
بہم پتھر چٹیل سا میداں بنا
ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا
کنارے پہ گھونگے نہ دریا میں جل
مگر مچھلیاں باہر آئیں نکل
نہ پانی رہا اور نہ دانہ رہا
فقط زندگی اک بہانہ رہا
(۴) نظر ایک جا آئے چاول پڑے
گرا تول کر پر کرلے کر اُڑے
مگر واں شکاری تھا اک تاک میں
بچھا دانہ بیٹھا تھا وہ خاک میں
لیا کھینچ بل اور دئے نوچ پر
مقید کیا جال میں ڈال کر
(۶) غضب کا اندھیرا تھا چھایا ہوا
نہ تھا ہاتھ کو ہاتھ تک سوجھتا

قیامت کا پانی غضب کی کڑک
دہل جائے دل جس سے ایسی چمک
نہ کچھ نیند تھی اور نہ کچھ بھوک تھی
سوامی کے درشن کی اک ہوک تھی
(۵) بچھونوں میں مخلوق سوئی ہوئی
کوئی مطمئن کوئی روئی ہوئی
پرندے آشیانوں میں دبکے ہوئے
وہ سوکھے ہوئے یا کہ بھیگے ہوئے
غرض ہر طرف عالمِ خواب تھا
اور ایک نیند کا جال بچھا ہوا
گھڑی وہ کہ سنسار بے ہوش ہے
سماں وہ کہ جو شے ہے خاموش ہے

سرخاب کا دَم واپسیں ________ سنہ ۲۴

"ہوا جنگل کی ٹھنڈی تھی اندھیرا خوب تھا چھایا
اُجالا تھا نہ تارے تھے کہ بادل گھر کر آیا تھا
کڑک تھی اس قیامت کی کہ پار ہوتی تھی کانوں کے
چمک نے ایک آفت کر رکھی تھی ہر طرف برپا
فلک پر تھیں مسلمانوں کی نظریں آج وہ دن تھا
ہلالِ عید کا مژدہ فضا میں دفعتاً گونجا
لگیں آنے صدائیں راحت و شادی کی گھر گھر سے
مسلمانوں کے در و دیوار پر خوشیوں کا مینہ برسا
مگن شوہر تھا دولت میں، تو بیوی شاد بچوں میں
ادھر بشاش تھی لڑکی، اُدھر بشاش تھا لڑکا
مجھے اس راحت و فرحت میں یاد رفتگاں آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے سیدھا گھر سے قبرستان جا پہنچا
کڑک کا شور ویسا ہی چمک کر زور کچھ بڑھ کر
نہ آدم تھا نہ آدم زاد - کھڑکا تھا نہ کھٹکا تھا

حقیقت تو یہ ہے کہ راحت ہے یہ
جو آفت بھی آئے تو نعمت ہے یہ
اگر بال بھی اس کا بیکا ہوا
تو پھر زندگی کا رہا کیا مزا
تجھے قتل یوں جس کا مرغوب ہے
ارے سنگدل میرا محبوب ہے
میں بسمل ہوں ظالم دعا میری لے
بچا ہوگی کے مجھے داغ سے

سرخاب کا دم واپسیں ———— ۱۹۲۶ء

ابھی پچھلے برس جب میرے ماں اور باپ زندہ تھے
مری جوتی نئی آئی بنا کرتہ تھا جھم جھم کا
خریدی تھی مری امی نے اطلس ایک کرتہ کی
رکھی ہے میری بقچی میں ارے ہاں خوب یاد آیا
مگر پیسے کہاں ہیں - کون سیئے گا - غرض کس کو
چلوں شاید نکل آئے - کوئی اللہ کا بندہ

عید کا کرتہ ———— ۱۹۲۷ء

کہا بیٹی یہ جنگل یہ اندھیرا اور یہ تنہائی
کھڑک میں اور چلک میں کیوں کر آئیں کون ہے لایا
لگی کہنے " مری اما کو جب یاں مردلائے تھے
چلی آئی تھی میں بھی ساتھ - مجھ کو یاد ہے رستہ
کہا تھا مجھ سے یہ سب نے کہ تھوڑے دن میں آئیں گی
مگر دن ہو گئے اتنے نہ خود آئیں نہ خط آیا
کھڑی ہوں دیر سے اتنی - کھلاتی ہیں نہ کھاتی ہیں
خفا مجھ سے ہوئیں شاید اسی کا سب ہے یہ غصہ
یہ حصہ میری اماں جان کو اب تم ہی پہنچا دو
یہ کہہ دینا سلیمہ نے ہے کھانا آپ کا بھیجا
یہ کہنا منتیں کی ہیں بہت ہی ہاتھ جوڑے ہیں
وہ جب سے لیں تو اس کے بعد اتنا اور کہہ دینا

ارے بی عید ہوگی کل - رہو گی کب تلک روتی
بجائے شام ہی کو مسجدوں میں جانے کا سہرا
حبیبہ اور صفیہ کی نئی ہیں جوتیاں آئی
جھما جھم جھم شنک رہا ہے بی بی کی جبا [illegible]
یہ میرے ہاتھ سونا سے نہ چوڑی ہے نہ مہندی
یہ میرا جسم ننگا ہے نہ پاجامہ ہے نہ کرتہ
نہ جوتی پاؤں میں میرے نہ سر پر اوڑھنی ہے
یہ دیکھو خون بہتا ہے - چبھا ہے پاؤں میں کانٹا

ہماری عید منوا دو ———— ۱۹۲۸ء

علامہ مغفور کی شاعری کے متعلق ہم دو ادیبوں
کی کہانی میں دو ادیبوں کے اقتباسات دے چکے ہیں
چند اور درج ذیل ہیں :-

• علامہ مرحوم کے دل میں قوم کے درد کا ایسا ہی
سا کھٹکا رہتا تھا - وہ بیکس اور مظلوم فرقہ نسواں پر
نگاہ کرتے تھے اور دل سے بے ساختہ آہ نکلتی تھی
شخص درد و غم کی اتنی اچھی تصویر کھینچ سکتا ہو کہ لوگ
پکڑ کر رہ جائیں اور اسے مصور غم کا خطاب دے دیں وہ
یقیناً دنیائے شاعری میں بھی اسی قدر نام آور ہو سکتا
تھا - اُس کے جادو بھرے الفاظ ہی تو تھے جن سے صحیح
موقعوں پر کام لے کر وہ غم کی تصویر کھینچا کرتا تھا - شعر
میں بھی الفاظ کے سوا اور کیا ہوتا ہے ؟ وزن اور قافیہ
کی پابندی اس سے علامہ مرحوم عاری نہ تھے - یہ ایک حقیقت
ہے کہ علامہ راشد الخیری مرحوم اگر شعر و سخن کی جانب توجہ
کرتے تو آج اُن کا نام متاخرین شعرا کی فہرست میں سب سے
زیادہ نمایاں ہوتا . . . . . .

شعر و شاعری کی دنیا سے اس قدر الگ تھلگ رہنے
کے باوجود علامہ مرحوم نے شاعری کی ہے - سچ پوچھا جائے

ان کی نثر ہی تمام تر اعلیٰ درجے کی شاعری ہے۔ لیکن
اس سے قطع نظر انہوں نے بالکل باقاعدہ شاعری بھی کی
ہے کچھ نظمیں ہیں جنہیں میں نے باقاعدہ شاعری کے
نام سے یاد کیا ہے۔ ہماری جہالت احکام مذہب سے ناواقفیت
اور تنگدستی وافلاس نے ہمارے طبقہ نسواں کو جس ذلیل
اور پست حالت کو پہونچا دیا ہے اور ہمارے بہت سے
گھروں پر جیسے جیسے ناگفتہ بہ مظالم اس بے کس اور مظلوم
نسوانی آبادی پر توڑے جاتے ہیں ان سے مولانا مرحوم
خوب اچھی طرح واقف تھے۔ اور وہ یہ بھی اچھی طرح
سمجھ گئے تھے کہ ہمارے گھروں کے اندر ہماری عورتوں
کی حالت کسی طرح بھی ان ننھے ننھے بے زرد بے طاقت
پرندوں سے بہتر نہیں ہے۔ جنہیں انسان محض اپنی تفریح
طبع کی خاطر کھلا ہوا آزادانہ پرواز اور ہوا نوشی وطن سے
محروم کر کے ایک پنجرے کے اندر بند کر دیتا ہے جہاں
ان کا مقصد حیات بس صرف یہ رہ جاتا ہے کہ قفس کی
تیلیوں سے رات دن سر مارا کریں۔ وہ بجا طور پر فرقہ
نسواں کو اسیران قفس سمجھا کرتے تھے اور اس رعایت سے
ان کی نظموں کے مجموعہ کے لئے یہ نام پسند کئے گئے۔
بولیت عامہ جو علامہ کے کلام کو نصیب ہوئی وہ بالکل
بجا تھی اور یہ کلام درحقیقت قبول عام کا اس حد تک
مستحق تھا۔۔۔۔

بچپن کی کھیلی صادقہ — میری سہیلی صادقہ
پیاری بھیلی صادقہ — خط کا تمہارے شکریہ
میں دُور تھی مجبور تھی — رنجوں میں چکنا چور تھی
ورنہ بگڑتیں لاکھ تم — میں آپ ہی لیتی منا
تاروں بھری راتیں گئیں — طاقوں بھری گڑیا چھٹیں
دن کھیل کے رخصت ہوئے — اب وقت ہے کچھ کام کا

"طاقوں بھری گڑیاں چھٹیں" صرف علامہ راشد الخیری
کا حصہ ہے!

"پیپل کی چھاؤں یاد ہے دن ڈھیر ہوتا تھا جہاں
مدت ہوئی دیکھا نہیں واں گھونسلا تھا چیل کا"

کس قدر عمیق مطالعہ فطرت ہے۔ بلبل کے آشیانے کا
ذکر تو آپ کو ہر دیوان کے صفحے پر ایک سے زیادہ اشعار
میں مل جائے گا۔ لیکن چیل کے گھونسلے پر اسی شاعر کی
نگاہ جا سکتی ہے۔ جو قدرت سے باریک بین اور دقیقہ
رس نگاہ لے کر آیا ہے۔۔۔۔

بیٹا بیٹی اللہ کی دین۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر
ہو کہ جس میں ایک بھی بیٹی نہ ہو۔ ان بیٹیوں کی ہمارے
گھروں میں جو دُرگت بنتی ہے۔ وہ علامہ راشد الخیری
کی زبان سے سُن لیجئے:۔

"کچھ عرض کرنے ماؤں سے آئی ہیں یہ دُکھیاریاں
صورت سے ظاہر بے کسی چہرے سے حسرت ہے عیاں
جو مل گیا وہ لے لیا۔ جو دے دیا وہ کھا لیا
جب نیند آئی پڑ رہے ہم نے جگہ پائی جہاں
شرم و حیا عادت رہی، صبر و رضا شیوہ رہا
مُنہ تک کے چُپکے ہوگئے بے وجہ کھائیں گھڑکیاں"

"مُنہ تک کے چُپکے ہوگئے" کس قیامت کا ٹکڑا ہے
اتنے سے جملے میں کس قدر معنی پنہاں ہیں۔

"کُنبے کی طاعت ہم نے کی گھر بھر کی خدمت ہم نے کی
تم چین سے سوتیں اور ہم بہنوں کو دیتے لوریاں
بیٹے مبارک ہوں نہیں! ہم ان کو رُخصت کرو
لو وقت آخر ہوچکا اب ہم کہاں اور تم کہاں"

اُف کس قدر درد بھرے جملے ہیں۔ سنگدل سے سنگدل
شخص بھی ضبط نہیں کر سکتا: "بیٹے مبارک ہوں" کا طنز

کس قدر لطیف مگر دل خراش ہے۔ مُسے کچھ دری والدین خوب سمجھ سکتے ہیں جو بیٹیوں پر بیٹوں کو ترجیح دینے کے عادی ہیں . . . . . .

"ماں کا پیام" علامہ کی ایک اور پُر درد نظم ہے جس میں ایک ایسی ماں کے دل کے جذبات کا اظہار کیا ہے جس کا بچہ اس سے جُدا ہو گیا ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے :۔

اس دل کی لگی نے کیا جوگن — گھربار چھٹا تیرے کارن
نیناں ترسیں دکھلا درشن — چھتیں لگ جا آجا آ جن
دن رات ہوئے عمریں بیتیں — کھِل کھِل کر پھول ہوئی کلیاں
پر دل کی کلی میری نہ کھِلی — جنگل دیکھے ڈھونڈیں گلیاں
جلتی ہے تمہا پھولوں بن بسی — کہسار میں جب من ہوتا ہے
آتی نہیں بُو تیری لیکن — دل خون کے آنسو روتا ہے

ایک دُکھیاری ماں کے دل کے کیسے سچے جذبات ہیں۔ شاعرانہ خوبیاں اگر اس میں زیادہ نہیں تو نہ ہوں دل کے سچے جذبات تو اس طرح بیان کر دیے ہیں گویا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے ۔

قدرت نے علامہ مرحوم کو شاعر بنایا تھا وہ ایک شاعر کا دل لے کر پیدا ہوئے تھے ۔ اور یہ بالکل یقینی ہے اگر وہ اپنے اس استعداد کو اچھی طرح کام میں لاتے تو ایک نہایت کامیاب شاعر ہوتے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شاعر بن کر کیا وہ اس سے زیادہ کچھ کام کر سکتے تھے جو ایک نثار کی حیثیت سے انھوں نے کیا ہے! کیا ان کی نثر شاعری کا ایک لازوال دفتر نہیں ہے ۔ اور کیا اس نثر پر سینکڑوں اور ہزاروں دیوان جس میں عشقیہ غزلیں اور مداحیہ قصیدے بھرے پڑے ہوں خوشی سے قربان نہیں کیے جا سکتے ۔

ڈاکٹر سید احمد بریلوی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"نذیر احمد اور راشد الخیری دونوں نے نثر لکھی لیکن راشد الخیری فطرتاً شاعر بھی اور اصلاحی پسند تھے یہاں بھی وہ اپنے ناولوں کی طرح نہایت مؤثر اور دل کے ساتھ مسلمان عورت کے دُکھوں اور تکالیف کو صفحۂ قرطاس پر ظاہر کرتے ہیں ۔ ان کی نظمیں ... کا خطاب دولت مند خواتین سے" "... خطاب ..." "التجائے قیصر" "اسلم کا خط شوہر کے نام" ... وغیرہ نہایت پُر تاثیر درد انگیز اور لسانی نقطۂ نظر سے بہت بلند پایہ ہیں۔ "لال کی تلاش" میں انھوں نے ... اشعار میں نہایت خوبصورت بھاشا لکھی جیسی صدیوں پہلے حضرت امیر خسرو نے لکھی تھی ۔۔

ضیاء الدین احمد برنی ——— ڈیلی نیوز ...

"حمد باری میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"باقی ہے بس وہی رب — فانی ہے ماسوا سب
کافی ہے وہ اکیلا — باقی ہے سب جھمیلا
حاکم ہے بحر و بر کا — مالک ہے خشک و تر کا"

سبحان اللہ طبیعت میں کس قدر روانی ہے۔ ہر ایک شعر "آمد آمد" پکار رہا ہے

"ہر جا ظہور اس کا — ہر شے پہ نور اس کا
ہر چیز میں نہاں ہے — ہر چیز سے عیاں ہے"

لحاظِ قافیہ اور حُسنِ قافیہ ملاحظہ ہو :۔

سب سے قریب تر ہے — سب سے عجیب تر ہے

غضب یہ ہے کہ تخیل کی رَو میں مضمون کو ذرا ... نہیں ہونے دیا۔ صفت لا محدود بیان کرتے ہیں ... قابلِ غور ہے ۔

خورشید میں نہ آئے — پر ذرّہ میں سما ئے

چھوٹے چھوٹے الفاظ میں کس قدر عظیم الشان مطا...

[illegible] علامہ راشد [illegible]
[illegible] کرتے ہیں۔ [illegible] شر میں ایک محاورہ
[illegible] ہے لیکن اس [illegible] زبان کے ساتھ کہ کمال
[illegible] کی انتہا نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مذکورہ جیلۂ ذات
چھوٹا سا منہ بڑی بات"

خالدہ بنت ولید "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سرگودھا
[illegible] کے موقع پر پڑھی تھی۔ لکھتے ہیں:۔

"الا اے قوم بد قسمت بہ حالت اور بہ صورت
ہوئے اعلیٰ سے ادنیٰ تم بنے شاہوں سے زندانی
خدا کی شان اب وہ دوسروں کو درسِ عبرت ہوں
دیا کرتے تھے جو کل تک شہنشاہی جہاں بانی
رگڑ دی قیصر و کسریٰ کی گردن یہ شجاعت تھی
گرے قدموں پہ اک اندھے کے یہ تھا جوشِ ایمانی"

مندرجہ بالا اشعار میں کیسے مؤثر اور زور دار الفاظ میں اسلاف کی صفات کا ذکر کیا ہے کہ شجاعت کے لحاظ سے وہ قیصر و کسریٰ پر حکومت کرتے تھے لیکن جوشِ ایمانی (مراد خوفِ خدا اور رحم دلی) کے اعتبار سے اس قدر نرم مزاج تھے کہ اندھے کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرتے تھے۔ (یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عمر کا پاؤں اندھیرے کی وجہ سے ایک اندھے فقیر کے پاؤں پر جا پڑا اور آپ نے معافی چاہی تھی) آگے چل کر آپ کے خامۂ معجز رقم نے ہلکی سی جھلک واقعہ نگاری کی دکھائی ہے:۔

لٹا کرنے کو دینِ احمدی کے قادسیہ میں
ہوئے آمادۂ پیکار جب رومی و نصرانی

قادر الکلامی ملاحظہ ہو سبحان اللہ

مگر میدان میں جس وقت تیغِ خالدی چمکی
تو عالم دنگ تھا حیرت میں تھے رومی و نصرانی

نہ تھی تلوار بجلی تھی۔ قیامت تھی کہ آفت تھی
کہ دو گھنٹے میں پتہ دشمنوں کا ہو گیا پانی

منظر نگاری جہاں بھی کی ہے عین اصول قدرت کے مطابق۔ مظلوم حسینہ کے سفر کا نقشہ کتنے خوبصورت الفاظ میں باندھا ہے۔

ابتدائی اشعار سے ہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایک زندہ دل اور تمناؤں کی تصویر اور مصیبت و نامرادی کا مجسمہ ہے جو مصورِ غم کے موقلم کی جنبشِ لطیف کا خرمندِ احسان ہے۔ "زندگی کی یہ وہ تھی شکوہ کی خواہش نہ فکر سر تھا نہ ہوش جاں تھا لگی تھی دل میں لگن لگی کی۔ زبان پہ نام شہ زماں تھا" لگی تھی دل میں لگن لگی کی" دوسرا لفظ لگی بمعنی محبت یعنی دل میں محبت کی لگن تھی۔ تکرار نے کیا شیرینی پیدا کی ہے۔ جذبات کی ترجمانی میں علامہ مرحوم کے سحر آفریں قلم نے کمالات کے دریا بہا دئے ہیں۔ ہر موضوع پر سند رنگ سے طبع آزمائی کی ہے۔ مختصر الفاظ اور کس قدر سچ کہ کوزہ میں دریا بند کر دیا "حسنِ سیرت" میں "مکالمہ" پر نگاہ رکھیے روزمرہ اور نیچرل محسوسات کو قلم بند کیا ہے۔ "لال کی تلاش" میں بھاشا زبان کے پیارے الفاظ پڑھ کر امیر خسرو یاد آجاتے ہیں۔ کلیاں اور گلیاں کے قوافی قادر الکلامی نہیں تو کیا ہے۔ اسلم کا خط شوہر کے نام کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کروں گا جن سے معلوم ہوگا کہ علامہ کس قدر حساس طبع اور ماہر نفسیات تھے۔ التجائے قیصر بھی دل تھام کے پڑھنے والی چیز ہے۔ ... واقعات کو کس قدر غم انگیز بنا دیا ہے ہر لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ ... ... سرخاب کے دم واپسیں میں جب تڑپ گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی ملکہ بڑی بے قرار ہونے لگی ان اشعار میں مضمون کی بلندی اور بیان کی سلاست سونے پر سہاگہ ہے۔ ... جذبات کی ترجمانی ملاحظہ ہو لفظ لفظ پر قربان

ہونے کو جی چاہتا ہے . . . . یوں تو آپ کی تمام نظمیں درس آموز ہیں لیکن بعض نظمیں اسی لحاظ سے خصوصیت رکھتی ہیں۔

ماخوذ از اسے ادیب عثمانی ——————— بنات اگست ۱۹۳۶ء

"نظم و نثر میں علامہ راشد الخیری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کسی عظیم شاعر ہی کے احساسات و جذبات ہو سکتے ہیں۔"

گجراتی روزنامہ ملت کراچی ——————— ۲ فروری ۱۹۵۱ء

"مولانا بلا شبہ ایک شاعرانہ دل و دماغ کے مالک تھے۔ وہ اکثر ایسے اوصاف سے متصف تھے جو شعرا کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ طبع موزوں بھی رکھتے تھے۔ اور ذہن خداداد بھی۔ اُنہوں نے فکر رسا اور دلِ درد آشنا پایا تھا۔ چنانچہ ان کی نثر میں ان کی شاعرانہ شخصیت کے یہ سارے عناصر موجود ہیں۔ فصاحت و بلاغت انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے لیکن طبیعت وسعت پسند تھی۔ ردیف قافیہ کی قید پسند خاطر تھی اسی لئے اُنھوں نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے نثر کا انتخاب کیا۔ پھر بھی ان کی شاعرانہ طبیعت نے نثر میں گلہائے رنگین بکھیرے اور شاعرانہ عناصر پیدا کرنے کے علاوہ انہیں قافیہ و ردیف کی پابندی پر بھی مجبور کیا ہے . . . . . جب وہ نسیمہ کو توحید کا سبق دینا چاہتے ہیں تو وہ خدا کی صفات نظم میں بیان کرتے ہیں کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ نسیمہ اسے زبانی یاد کرے۔ اور معصوم بچی ملکاتی اور گنگناتی پھرے ؎

"از ماہ تا بماہی   ہے اس کی بادشاہی
شہنشاہِ جہاں ہے   معبود انس و جاں ہے
حاکم ہے دو جہاں کا   مالک ہے ایں و آں کا

چھوٹی بچیوں کو کس سادگی سے خدا کی حاکمیت ربوبیت اور و[illegible] ہونے کا تصور دلاتے ہیں۔ اور کس بے ساختگی سے پکار اٹھتے ہیں۔

"کالی ہے وہ اکیلا   باقی ہے سب جھمیلا"

وہ اپنی نسیمہ کو منظوم قصے بھی سُناتے ہیں۔ ان قصوں میں بھی روانی تسلسل بیان قائم رہتا ہے۔ ماں اور بچے کی محبت کا قصہ سُنا کر کہتے ہیں:۔

کس کو ہے ماں کی محبت میں کلام
بس میاں راشد کرو قصہ تمام

وہ بچیوں کو ساون کی چڑیاں سمجھتے ہیں جو برسات کے دنوں میں اِدھر اُدھر ملکاتی پھرتی ہیں اور جوں ہی ساون ختم ہو جاتا ہے۔ پھڑ پھڑانا شروع کر دیتی ہیں۔ ساون سے مراد میکہ ہے ملاحظہ ہو نظم کا عنوان ہے "جہیز کی تیاری"

"سُکھ چین کے دن ہو چکے بے فکر نیندیں سو چکے
دن عیش کا شام ہو گیا آنے لگے تارے نظر
نکلا لڑکپن بے وفا میکا فقط تھی اک سرا
آخر جرس بجنے لگا اور آگیا وقتِ سفر
آ پہنچی دَر پر پالکی محنت ہے سولہ سال کی
مل کر گلے رُخصت کرو ہونے لگی ہے دوپہر"

اسی نظم میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"بیٹے مبارک ہوں تمہیں مہمان کو رُخصت کرو
وقتِ آخر ہو چکا اب ہم کہاں اور تم کہاں"

اس آخری شعر میں کیا لطیف طنز کیا ہے یہ علامہ ہی کا حصہ ہے۔ مولانا جزئیات کی تفصیل میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کی قوتِ مشاہدہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی سے متعلق چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہونے پاتیں۔ ان کا یہ وصف ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہے . . . . . "بچپن کی یاد میں" ان کی قوتِ مشاہدہ

ملاحظہ فرمائیے! کہیں چیل کے گھونسلے میں ماس کہیں پیپل کی چھاؤں۔ تو یاد کر رہے ہیں۔ انہیں "تاروں بھری راتیں" بھی یاد ہیں اور "طاقوں بھری گڑیاں" بھی۔ ان کے حافظے میں محفوظ گھاٹ کے کنگرے اور مٹی کے ڈلے" بھی ان کی نظروں کے سامنے ہیں۔ دھم دھم مٹی میں لوٹتے پوتنے کا زمانہ اور جھولے کا ... انہیں ابھی تک نہیں بھولا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا ایک اچھے طنز نگار بھی ہیں اور نثر میں ان کا رتبہ بحیثیت ایک طنز نگار بہت بلند ہے۔ یہاں بھی اس سے خاطر خواہ کام لیتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔ وہ عصر حاضر کی تہذیب کی کس طرح چٹکیاں لیتے ہیں :۔

بسکٹ پرانے لیمنڈے۔ چھوڑو بیری چیتھڑے
گاؤن بھی ہو اور بوٹ بھی ہے وقت کا یہ اقتضا

ایک مصرعہ ہے :۔

"چولھے میں اب برقعے رکھو۔ پردے کو دو ٹوکا لگا"

فرماتے ہیں :۔

"مہر و وفا کی جائیاں شرم و حیا کھونے لگیں
اور بیبیاں ستونتیاں کلموہیاں ہونے لگیں

مولانا میں موزونیٔ طبع کے ساتھ وہ سوز بھی تھا جس نے حالی سے مسدس لکھوایا اور جذبہ مزاح و اصلاح بھی جس نے اکبر الہ آبادی کو شاعری کے ایک خاص مقام پر پہنچایا۔

مولانا اپنی نثر کی طرح شاعری میں بھی محاورہ اور روزمرہ کے استعمال کا خاص التزام کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے خوبصورت محاورے ان کے مصرعوں میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے ہوں۔ "دن پھیر کرنا" "خیریں منانا" "بیلیں بڑھانا" "تارے نظر آنا" "دھم دھم کودنا" وغیرہ کو کس سلیقہ اور کس قرینے سے اپنے اشعار میں استعمال کر گئے ہیں کہ شعر کے حسن میں ایک چمک اور دمک پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا نے اپنے اشعار میں نہایت نرم اور ملائم الفاظ استعمال کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ انہیں ایسے الفاظ پسند ہیں جن میں ترنم ہو جو موسیقیت اور غنائیت کے حامل ہوں۔ ان کی بحریں بھی نہایت مترنم قسم کی ہیں۔

"یہ کیوں چونچال ہیں چہرے۔ یہ کیوں بشاش ہے دنیا
میں جانوں ہیں وہی آئی۔ انہیں کی سب یہ خوشیاں ہیں
وہی اماں کل آئیں گی۔ اہو ہو ہو ا ! ! ! !

تیسرا مصرعہ ٹیپ کا ہے۔ اور اس کی تکرار سے ایک خاص قسم کی غنائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات رقص کر رہی ہے۔ "سرخاب کا دم واپسیں" مثنوی ہے جس میں ایک المناک واقعہ دکھایا گیا ہے۔ اس مثنوی پر مثنوی میر حسن کا جو انہیں بہت مرغوب تھی کافی اثر معلوم ہوتا ہے۔ سرخاب اپنی مادہ کی تعریف کرتا ہے۔

رسیلی یہ آنکھیں چمک دار سر
یہ نازک کمر اور رنگین پر
زمرد و پکھراج و نیلم ہے تو
نشیمن کی ملکہ ہے بیگم ہے تو

سرخاب اپنی مادہ اور بچوں سے جدا ہو کر خوراک کی تلاش میں نکلتا ہے۔ واپسی میں دیر ہو جاتی ہے۔ مادہ کا اضطراب ملاحظہ ہو :۔

"لگی کہنے مولا مجھے کیا ہوا
یہ سینے میں دل کیوں دھڑکنے لگا
مرا یا کہ زندہ پھنسا جال میں
یقیناً ہے کالا کچھ دال میں
یہ دھوتال پانی کڑک کا یہ زور
یہ بجلی یہ بادل ہوا کا یہ شور

یہ پڑھنے کو اسے بھی ستے آج کیا
سوالی نگہبان تیرا خدا"
عشق کی شیدائی حقیقت کس عمدگی سے بیان کرتے ہیں

"محبت کی منزل میں ہر ہر قدم
ستم مصیبت ہو یا بیش و کم
حقیقت تو یہ ہے کہ راحت ہے یہ
جو آفت بھی آئے تو نعمت ہے یہ
اگر بال بھی اس کا بیکا ہوا
تو پھر زندگی کا رہا کیا مزا
اذیت بھی اس راہ میں ہے بھلی
اگر موت آئے تو ہے زندگی

وہ جب دیکھتی ہے کہ صیاد سرخاب کو ذبح کرنے لگا تو کس درد سے کہہ اٹھتی ہے۔

تجھے قتل یوں جس کا مرغوب ہے
اسے سنگ دل میرا محبوب ہے

مولانا اگر شاعری کی طرف توجہ فرماتے تو بیسویں صدی کے شاعروں میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لیتے۔

اصغر علی بی اے بی ٹی ________ عصمت فروری [illegible]

علامہ مغفور کے اشعار نے کس طرح جادو کا کام کیا ہے ایک واقعہ کاٹھیاواڑ کی محترمہ زینب گلشن مولوی نے بیان کیا ہے جو اصلاح نسواں کے سلسلہ میں درج کیا گیا ہے۔

۱۱- مُدیر

مستقل تصانیف کے علاوہ علامہ راشد الخیری مرحوم نے رسالوں کی اڈیٹری سے بھی طبقۂ نسواں اور اردو ادب و زبان کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ سب سے پہلے [illegible] دو سال رسالہ مخزن کو ایڈٹ کیا جب وہ دلی سے شائع ہوتا تھا۔ عصمت کی مسلسل ادارت و چھپناں سال ختم ہو چکے۔ اور بنات کا چھٹا سال ہے۔ عصمت کے ابتدائی ۲۰، ۲۵ سال کے پرچے مرحوم علامہ مغفور نے خود مرتب فرمائے بلکہ اکثر و بیشتر مضامین بھی انہیں کے ہوتے تھے۔ اس طرح بنات کے شروع کے ۲۰، ۲۵ سال میں انہیں کے مضامین زیادہ ہوتے۔ [illegible] میں پھر دوبارہ [illegible] میں لڑکیوں کے لئے ہفتہ وار سہیلی جاری کیا تھا۔ جو دونوں دفعہ مالی نقصانات کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ [illegible] میں تمدن جاری کیا تھا جو حقوق نسواں کی حمایت میں اردو کا پہلا اور آخری ماہنامہ تھا۔ اس رسالے کے متعلق اڈیٹر کی حیثیت سے جو مضامین لکھے وہ "یادگار تمدن" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ [illegible] سے [illegible] تک کا زمانہ وہ ہے جب ان کی حیثیت اڈیٹر کی بھی تھی۔ [illegible] کے بعد بھی عصمت کے وہی نگران رہے۔ اس ساری مدت میں اصولی بحثوں کے علاوہ انہوں نے کبھی کسی مذہب یا کسی فرقہ کسی گروہ کسی جماعت کے خلاف قلم نہیں اٹھایا یا کسی فرد کی ذات پر اشارۃً یا کنایۃً حملہ نہیں کیا۔

انہوں نے قومی و ملکی معاملات پر جو زیادہ تر خواتین سے متعلق ہوتی تھیں اصولی بحثیں کی ہیں۔ جو آج بھی وہی اہمیت رکھتی ہیں جو اس وقت رکھتی تھیں اور جو پہلی دفعہ عصمت وغیرہ میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ مضامین "عالم نسواں" میں جمع کئے جا چکے ہیں۔

اردو ادب اور زبان کے متعلق بھی ان کے کئی مضامین شائع ہوئے جن میں کسی کی ذات سے انہوں نے بحث نہیں کی۔ یہ مضامین بھی کئی مجموعوں میں موجود ہیں۔

ان کی [illegible] ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ مضمون نگاروں کی قلمی اعانت کے کبھی محتاج نہ رہے روزانہ رسالہ ہوتا یا ڈیلی اور ہفتہ وار ہوتا یا ماہوار ضرورت کے وقت ہر قسم کے مضامین رسالہ کے لئے وہ خود لکھتے تھے۔ افسانہ۔ نظم۔ خانہ داری معاشرتی مضامین تاریخ مذہب۔ جغرافیہ۔ سائنس۔ انگریزی سے ترجمے غرض رسالہ کی ضروریات کے لئے سب طرح کے مضامین وہ خود لکھتے تھے۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء اس کے بعد ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء پھر ۱۹۲۱ء میں رسالہ کا بڑا حصہ انہیں کا لکھا ہوا شائع ہوا۔

لیکن ایک ہی پرچے میں ان کے دس پندرہ مضامین ہوتے تو وہ ایک یا دو اپنے نام سے شائع کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو کبھی نمایاں کرتے ہی نہ تھے۔ انہوں نے بار بار اپنا نام دے کر اپنی ذات کا اشتہار کبھی اور کہیں نہیں دیا۔

علامہ مغفور نے لڑکیوں کو لکھنے کی ترغیب دینے اور ان میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے جو کوششیں کیں وہ یقیناً کبھی فراموش نہ کی جا سکیں گی۔ ماہوار عصمت اور ہفتہ وار سہیلی میں چھوٹے چھوٹے مضامین بہت آسان زبان میں مسلسل کئی سال تک فرضی زنانہ ناموں سے صرف اس لئے لکھے کہ انہیں پڑھ پڑھ کر لڑکیاں لکھنے کی کوشش کریں گدڑی میں لال۔ زیور اسلام۔ بے فکری کا آخری دن۔ گرداب حیات۔ نشیب و فراز۔ شادی کا انتخاب زینہ ہستی۔ عروس مشرق۔ ساجن موتی۔ ان مجموعوں کے مضامین نے ملک میں سیکڑوں لکھنے والیاں پیدا کر دیں۔ آج پاکستان اور بھارت کے قریب قریب ہر صوبہ میں ماشاءاللہ اردو کی اہل قلم خواتین موجود ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر نے یہ مبالغہ نہیں ناقابل تردید حقیقت ہے کہ علامہ مغفور کے رسالوں اور کتابوں اور مضامین کی بدولت لکھنا سیکھا قریب قریب تمام عصمت سہیلی کے نامہ نگار مختلف صوبوں اور شہروں کے ہوتے تھے اور علامہ مغفور زبان کی صحت کا خاص طور پر بہت خیال رکھتے تھے۔

علامہ مغفور نے دوران ادارت میں عصمت و تمدن میں چند کتابوں پر تبصرے بھی کئے۔ تبصرہ سے ان کا مطلب تقریظ ہوتا نہ تنقیص۔ طبعاً وہ بہت ہی شریف النفس انسان تھے۔ اور کسی کی دل شکنی گوارا نہ کرتے تھے۔ ہاں اصولی غلطیوں پر ٹوک دیتے تھے۔ اور کتاب کی خوبیوں کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ بکھری ہوئی فائلوں میں کئی مضامین اور کتابوں پر ان کے تبصرے ہیں۔

چند اور حیثیتیں

ان بڑی بڑی گیارہ ادبی حیثیتوں کے علاوہ علامہ مغفور کی دو تین حیثیتیں اور بھی ہیں۔

مترجم علامہ راشد الخیری اردو کے اوریجنل رائٹر تھے وہ انگریزی بھی جانتے تھے۔ لیکن اپنے زمانے کے دوسرے مصنفین کی طرح انہوں نے اپنے ناولوں افسانوں مضامین میں انگریزی الفاظ یا انگریزی ترکیبیں استعمال نہیں کیں۔ انہوں نے رسالہ عصمت کے دور اول میں اور ہفتہ وار سہیلی کے دوسرے دور میں انگریزی زبان کے متعدد مضامین کے ترجمے بھی کئے تھے۔ ۱۹۰۳ء کے مخزن میں شیخ عبدالقادر مرحوم نے ان کا مضمون نصیر اور خدیجہ رسالہ مخزن میں شائع کیا تھا تو ان کے نام کے ساتھ مترجم

عدالت بندوبست" لکھا تھا اس سے یہ ظاہر ہے کہ علامہ مغفور رسالہ عصمت جاری ہونے سے ۵ سال پہلے بھی ترجمہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ملازمت میں ان کے انگریز افسران نے جو چٹھیاں دی تھیں ان میں لکھا تھا کہ وہ ڈرافٹ اچھا لکھتے اور ترجمہ خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ یہ کاغذات میرے پاس محفوظ تھے افسوس ہے ۱۹۴۷ء کی ہجرت میں ضائع ہوگئے۔ مگر ان کے ایک مضمون کے ایک ٹکڑے سے ثابت ہو رہا ہے کہ ان کے پھوپا ڈپٹی نذیر احمد صاحب کو ان کے انگریزی ترجمہ پر اعتماد تھا اور مولوی اشرف حسین مرحوم علامہ مغفور کی دوسری پھوپی کے بیٹے کو جو عمر میں علامہ مرحوم سے ۵ سال بڑے تھے۔ ترجمہ دکھانے کی ہدایت غالباً اس لئے کی گئی تھی کہ وہ گریجویٹ تھے اور ان کی انگریزی شاید علامہ مغفور سے بہتر تھی۔ ۱۹۳۳ء کے عصمت میں "جہاں آباد کے طائران خوش الحان کی نغمہ سنجی" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا تھا وہ بعد رحلت ایک مجموعۂ مضامین "بلبل بیمار" میں شامل کیا گیا۔ کتاب کے صفحہ ۵۷ پر اس مضمون کا ایک پیراگراف یہ ہے:۔

"چالیس سال سے کم نہ ہوئے ہوں گے۔ کلارک صاحب دہلی کے کمشنر تھے انہوں نے یا اُن کی میم صاحب نے عمائدین شہر کی بیگمات کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ ایک زنانہ مدرسہ قائم کرنے کی تجویز تھی۔ میری بڑی پھوپی یعنی شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی بیوی کا بھی رقعہ آیا تھا۔ اتفاق سے میں اس وقت موجود تھا۔ مولانا محترم نے مجھ سے فرمایا اس کا جواب لکھواتا ہوں۔ کاغذ اور پنسل لاؤ۔ لکھ چکو تو ترجمہ کر کے اشرف حسین کو دکھا دو۔

علامہ راشد الخیری مکھی پر مکھی مارنے یعنی لفظی ترجمہ کے قائل نہ تھے۔ ان کی رائے میں ترجمہ کا مطلب ہے اپنے الفاظ میں انتقال مفہوم۔ تاریخ و تذکرہ تصانیف مصور غم میں نمبر ۷ "چمنستان مغرب" علامہ مغفور کے ترجموں کا مجموعہ ہے جو غیر مانوس ترکیبوں۔ اجنبیت اور اُلجھاؤ سے قطعی پاک ہے اور یہ مضامین ترجمے نہیں طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ اور ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ نمونے صفحات ۵۴۵ تا ۵۴۷ پر دیئے گئے ہیں۔

سیاح علامہ مغفور نے پاکستان اور بھارت کے مختلف شہروں اور حصوں کی تربیت گاہ بنات اور حقوقِ نسواں و تعلیم نسواں کے سلسلہ میں سیاحت فرمائی تھی۔ "سیاحتِ ہند" ان کا سفرنامہ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ جس میں معلومات بھی ہیں اور ادب بھی اور بقول مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی جنت ارنی "جس سے نہ صرف مختلف صوبوں کی معاشرت رسم و رواج سے واقفیت اور تعلیم یافتہ دردمند عورتوں مردوں کا غائبانہ تعارف ہوتا ہے۔ بلکہ حضرت مصور غم کی طبیعت و عادات و خصائل بھی معلوم ہوتے ہیں"۔ تصنیف نمبر ۱۰ "سیاحت ہند" کے تذکرے میں نمونے کے چند ٹکڑے نقل کئے گئے ہیں۔

خطیب علامہ مغفور کی مندرجہ بالا ادبی حیثیتوں کے علاوہ ایک اور حیثیت ہے خطیباً ان کی انکساری اور عاجزی کی یہ کیفیت تھی کہ وہ دل کے ٹکڑے اُڑا دینے والی نظمیں لکھتے تھے مگر کبھی اپنے تئیں شاعر نہ سمجھا۔ مزاحیہ نگاری کی اور لٹریچر کو مالا مال کر دیا۔ مگر مزاح نگاری کا دعویٰ کبھی نہ کیا۔ سیاست میں مفید مشورے دیئے مگر اپنے کو کبھی اس کا اہل نہ سمجھا۔ اسی طرح وہ ہمیشہ تقریر کرنے سے گریز کرتے

...اور اصرار کرنے والوں سے فرماتے تھے کہ " یہ ضروری نہیں کہ لکھنے والا بولنے والا بھی ہو" مگر جب تقریر ... سننے والے دم بخود رہ جاتے تھے۔ حقیقت تو یہ ... کہ تحریر کی طرح آپ کی تقریر میں بھی خدا نے کچھ ایسا اثر ... دل کی طرح آواز میں کچھ ایسا درد عطا فرمایا تھا کہ ... لوگ زار و قطار رُلا دیتے تھے۔ سنہ سے سنہ تک ... پانچ سال ایسے گذرے تھے جب وہ اپنے دادا مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم اور ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالرب صاحب مرحوم کی طرح وعظ فرمایا کرتے تھے۔

شروع شروع کچھ دنوں وعظ کہنا شروع کیا تھا اور بہت اچھا ڈھنگ ڈھالا تھا۔ بہت لوگ آپ کی طرف جھک پڑے تھے۔ کیونکہ تقریر آپ کی تحریر سے بھی زیادہ دلآویز تھی۔ اور عجیب نہیں کہ اگر یہ مشغلہ جاری رہتا تو جناب عبدالرب صاحب دہلی کے مشہور واعظ کے قائم مقام ہو جاتے"

مولوی بشیر الدین احمد ———— (دارالحکومت دہلی)

دُوسرا دَور ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۲ء تک کا ہے جب گنگا پور سٹی جہاں وہ اپنی بڑی بیٹی کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔ دوسرے تیسرے روز وعظ فرمانے پر مجبور ہو جاتے تھے اور وہاں کے مسلمان کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ تیسرا دَور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک کا رہا ہے جب آپ نے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دَورہ کیا اور مختلف مقامات پر عورتوں کے حقوق، فرائض، تعلیم وغیرہ پر تقریریں کیں۔

• مجھے حضرت مولانا کی تقریر سُننے کا بے حد شوق تھا . . . حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں خوب دل بھر کر تقریر سُنی۔ اور اس مبارک ہستی کو جی بھر کر دیکھا تقریر کیا تھی ایک دل سوز نغمہ تھا۔ تمام حاضرین کی آنکھوں سے سیلاب اشک بہہ رہا تھا۔ عورتوں کی خاص طور بے دھڑک رو رہی تھیں۔ ان کے لفظوں کی گونج اب تک میرے کانوں میں موجود ہے"

والدہ خالدہ لاہور ———— عصمت ۳۶ء

" مولانا کا وعظ سن کر میرے بڑے بھائی اور خوشحال جب نے گھر آ کر کہا کہ بہ ایک مرد و زن جس نے آپ کو سُنا ہے رطب اللسان ہے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ علامہ راشد الخیری جیسے لکھنے میں الم نگاری فرماتے ہیں ویسا ہی انہیں بولنے کا کمال حاصل ہے۔ اس قدر مؤثر پیرایہ میں رقت انگیز وعظ فرمایا کہ لوگ مبہوت بنے سن رہے تھے۔ سب کی آنکھیں بھر آئیں"

گ۔ ن بنت ڈاکٹر

ابو الفضل کپور تھلہ ———— عصمت ۳۶ء

" . . . . . . موضوع تقریر عورتوں کے شرعی حقوق پردہ اور تعلیم تھا۔ علامہ مرحوم کے الفاظ دَرد سے بھرے ہوئے تھے۔ سُننے والوں کے آنسو نکل آئے۔ عورتوں کے حقوق کے لئے وہ بہت بلند آواز سے لڑ رہے تھے خلع، نکاح بیوگان، ترکۂ پدری اور تعلیم اناث پر مردوں کو متوجہ فرما رہے تھے۔ ان کے یہ الفاظ کبھی نہیں بھلائے جا سکتے کہ:-

" یہ بیگمیں جنہیں تم نے لونڈیاں بنا رکھا ہے
تمہارے گھر کی زینت ہیں۔ لڑکیوں کو تعلیم دو
آپس میں اتفاق و اتحاد سے کام لو

عورت کو ہادیٔ برحق نے اس کی خدمت کے معاوضہ میں جو حقوق عطا فرمائے ہیں۔ ہندوستانی رسم و رواج

اور یورپ کی ہٹ دھرمی نے غصب کر دیئے اور طبقہ اناث کے جذبات فنا کر دیئے اور ان کو بُت بنا کر بے جان کر دیا"

بیگم اور لیکچر خواتین کے لئے بھی ہوا اس میں عورتوں کے فرائض پر تقریر کی۔

غریب اور جاہل عورتیں بھی موجود تھیں جو اپنے شرعی حقوق سے بے خبر تھیں۔ ان کو بتایا کہ کامیابی کے ساتھ کس طرح زندگی گزار سکتی ہیں۔ تعلیم کی طرف رغبت دلائی۔ اور خاص کر اسلامی تعلیم کی طرف اور فرمایا "تمہاری ہی گود میں قوم تربیت پائے گی۔ قوم کی ترقی کا راز عورت ہی کی ترقی میں ہے۔ ترقی کرنا ہر ایک کا حق ہے اور بڑی حد تک ترقی کی ذمہ داری عورتوں ہی کے ہاتھ میں ہے"۔ پھر فرمایا "ہمارے ہادی برحق نے عورتوں کو پستی سے نکال کے بلندی تک پہنچایا" پھر جائز پردے پر تقریر دیر تک ہوتی رہی۔ ایسا پردہ جس سے دین و دنیا کا فائدہ ہو۔ ناجائز پردہ پر کچھ دیر تک بحث کی اور کہا۔

"افراط و تفریط بُری چیز ہے۔ پردہ شرعی حد میں رکھئے۔ یورپ کو شمع ہدایت نہ بناؤ۔ بلکہ دین سے ہدایت حاصل کرو۔"

مغربی خرابیوں سے خواتین کو چوکنا کیا۔ علامہ مرحوم مغفور حقیقتاً دل سے عورتوں کے ہمدرد تھے اور ان کو اچھی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکچر نہایت ہی مؤثر تھا اور بہت روز تک عورتوں میں اس کا چرچا رہا۔

مریم یوسف علی بی اے ——— عصمت راشد الخیری نمبر ۱۹۳۷ء

"علامہ مرحوم نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں جو تقریر فرمائی تھی۔ اس میں عورتوں کے حقوق کے متعلق ایسے پُر اثر الفاظ میں بیان کیا کہ اکثر حاضرین جلسہ اشکبار ہو گئے تھے" (خواتین دہلی کے ماتمی جلسہ میں صدر جلسہ بیگم میاں محمد رفیع کی تقریر)

باب اکیسواں — علامہ راشد الخیری اور حقوقِ نسواں

آج جو عورتوں کی عزت ہے
راشد الخیری کی بدولت ہے

شاہ جہاں آباد دلی کے جید علما کے ایک مقتدر اور معزز خاندان میں انیسویں صدی عیسوی کے مصلحِ اعظم علامہ راشد الخیری کو اللہ تعالیٰ نے اُس زمانہ میں پیدا کیا جب برصغیر بھارت و پاکستان میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت ختم ہوئے چوتھائی صدی بھی نہ گذری تھی اور اُن کا وہی حشر ہو رہا تھا جو ایک مفتوح قوم کا ہوا کرتا ہے تمدنی خرابیاں جڑ پکڑ چکی تھیں اور معاشرت تہ و بالا ہو رہی تھی۔ وہ عورت اسلام نے جس کی شخصیت اور انفرادیت تسلیم کی ہے اُن حقوق سے بڑی حد تک محروم کی جا چکی تھی جو مذہب مقدس نے اُسے عطا فرمائے ہیں۔ بیٹی کی وقعت اُس زمانہ میں یہ تھی کہ پیدا ہوتے ہی گھر بھر میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ جہاں لڑکے کی پیدائش پر شادیانے بجتے اور جشن منتے وہاں بیٹی کا نام سُن کر بڑے اور چھوٹے سب کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔ بیٹے کی پیدائش پر دائی کو پانچ روپیہ دیے جاتے تھے تو بیٹی کی پیدائش پر ڈھائی روپے۔ میونسپلٹی کو اطلاع دینے کے لیے بھنگن کو سوا روپیہ بیٹے کی پیدائش پر تو دس آنے بیٹی کی پیدائش پر ملتے تھے۔ بیٹے چمکتے ہوئے لال تھے اور بیٹیاں گھر کا گوڑا اور بھاری پتھر۔ لڑکے بہتر سے بہتر کھاتے اور پہنتے اور لڑکیاں باسی کوسی بچا کھچا کھا کر بھی دبکی سکڑی رہتی تھیں۔ بیٹے کی شادی زندگی کا سب سے بڑا ارمان ہوتا اور بیٹی کی شادی ایک فرض کی ادائیگی۔ اسلام میں نکاح کی پہلی شرط ہے فریقین کی رضامندی جس کے معنی ہیں لڑکے کی طرح لڑکی کی بھی ہنسی خوشی مرضی مگر باپ بھائی کو اختیار تھا کہ جس کے پلے چاہتے باندھ دیتے جہاں چاہتے جھونک دیتے اور بیٹی کی مجال نہ تھی کہ اُف بھی کر سکے۔ تقدیر سے شریعت مل جاتا تو ششم ہشتم گذر جاتی ورنہ اُٹھتے جوتی ہوتی اور بیٹھتے لات صبح شام گھرکیاں اور جھڑکیاں اور دن رات لعنت اور پھٹکار۔ بیویاں یہ سب کچھ انگیزتیں مگر منہ سے بھاپ نہ نکالتیں۔ ساس کی پھانسیں اُن کے کلیجے میں چبھتیں۔ نندوں کے تیر اُن کے جگر چھلنی کرتے۔ سوکنیں اُن کی چھاتی پر مونگ دلتیں بتیس دانتوں میں ایک زبان ہوتیں کہ سسرال بھر کے طعنے اور تشنے۔ ناراضگی اور فضیحتیاں۔ اُن کا ذکر ماما لونڈی سے زیادہ نہ تھا۔ وارث والی بے وارثیاں ہر ہر خاندان میں تھیں۔ رانڈیں ہوتیں تو مجسمے تھیں نحوست اور نیستی کے گھنا پاپتا جرم۔ آسائش زیبائش حرام۔ ہنسنا بولنا ممنوع۔ خلع کا کیا ذکر کہ یہ لفظ بھی مسلمان بھول چکے تھے طلاق ذلت اور انتہائی حقارت سے دیکھی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ اُس دور کے تمدن میں حالانکہ مذہبیت کا دور دورہ تھا عورت ناقص العقل تھی اور اُس کی وہ عزت و حرمت وہ وقعت اور حیثیت نہ رہی تھی جو اسلام نے اُس کو دی تھی"

حضرت علامہ راشد الخیری بڑا ہی درد مند دل

لگ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سراسر خلاف، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے قطعی برعکس، عورت کی یہ گت دیکھ کر آن کا جگر پاش پاش ہو گیا۔ اس کی مظلومیت اور بے چارگی نے ان کے دل کے ٹکڑے اڑا دئے اور انھوں نے حقوقِ نسواں کی حفاظت اور حمایت میں قلم سے جہاد شروع کر دیا۔ اُن پر فقرے کسے گئے۔ پھبتیاں اُڑائی گئیں۔ ڈانٹا گیا۔ ڈرایا گیا۔ مار ڈالنے تک کی دھمکیاں دی گئیں لیکن اُن کے پائے استقامت میں ہلکی سی بھی لغزش نہ آئی۔ طعن و طنز کی بجلیاں چمکیں۔ دل آزاری کے طوفان اُٹھے۔ مخالفت کی آندھیاں چلیں مگر وہ پہاڑ کی طرح اٹل اپنی جگہ پر کھڑے خلوص سے بھری درد میں ڈوبی آواز سے مسلمانوں کو اُس راستہ پر بلاتے رہے جو پیغمبر اسلام صلعم کا بتایا ہوا ہے۔ جس وقت سے کہ پہلی تصنیف شائع ہوئی۔ اُس وقت تک کہ دماغ کام کرتا رہا اور تن خاکی میں سانس موجود رہا اُن کا دل حقوقِ نسواں کی پامالی پر خون کے آنسو بہاتا رہا!

"مجھے معلوم ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ ہر مذہبی حکم کو عقل کی ترازو اور فلسفہ کی کسوٹی پر تولتے اور پرکھتے ہیں اس لئے مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ حقوقِ نسواں کے سلسلہ میں میری زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے مذہب سے علیحدہ ہوکر بھی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے عقل سلیم متفق نہ ہو"

(انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں تقریر) جون ۱۹۲۶ء

"میں چاہتا ہوں کہ جو حقوق شرع اسلام نے عورتوں کو عطا فرمائے ہیں وہ مسلمان نہایت فراخ دلی سے اپنی عورتوں کو دے دیں۔ جن گھروں میں بیویاں واقعی گھر کی ملکہ ہیں خدا ان کے شوہروں پر رحمت و برکت نازل کرے گا۔ مگر میں چونکہ خود بدترین مخلوق ہوں اس لئے میری نظر سے وہی بیچاریاں گذرتی ہیں جو حلقہ اسلام سے خارج کر دی گئی ہیں۔ اس لئے میری غرض ہے کہ جب تک زندہ ہوں ان کے حقوق کی فریاد مردوں کے کانوں تک پہنچاؤں۔ اس سلسلہ میں اخباروں سے رسالوں سے کتابوں سے غرض جس طرح بھی ہوگا جب تک دماغ کام کر رہا ہے یہ صدا بلند کرتا رہوں گا"

جاہل بیویوں کی ایک جھلک ——— عصمت ۱۹۲۰ء

"مسلمانوں نے خلافت کانگریس لیگ عدم تعاون المختصر ضروری اور غیر ضروری ہر کام میں اپنی بیداری کا ثبوت دیا مگر حقوقِ نسواں کے معاملہ میں اُن کے دلوں اور کانوں پر کچھ ایسی مہر لگی ہے جو کسی طرح نہیں ٹوٹتی"

خلع کی ضرورت ——— تنظیم امرتسر۔ زمیندار لاہور ۱۹۲۵ء

"بساط حیات پر مرد اور عورت دونوں برابر کے مہرے ہیں۔ مرد کے فرائض جدا اور عورت کے جدا۔ جس طرح بیوی کو یہ حق نہیں کہ شوہر پر حکومت کر سکے اس طرح مرد بھی مجاز نہیں کہ بیوی کو محکوم سمجھے"

(مسلم اخبارات) ——— دسمبر ۱۹۲۷ء

"مسلمانوں کو سیاست معاشرت مذہب غرض کہ عہدِ رسالت کا کوئی میدان نظر نہ آئے گا جہاں عورت مرد کے دوش بدوش نہ کھڑی ہو"

"آج اُس پر ایسی کیا بپتا پڑی کہ وہ اسلام سے ہزار کوس پرے بھاگ رہی ہے۔ اس کا جواب صرف یہ ہوگا کہ وہ گھر کی ملکہ تھی مگر آج کنبہ کی لونڈی ہے"

ارتداد کا سبب ——— عصمت ۱۹۲۵ء

دسمبر ۱۹۳۸ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں جب ساٹھ ستر ہزار مسلمانوں کا اجتماع تھا، جب میں لڑکیوں کے ترکۂ پدری سے محروم ہونے پر تقریر کر رہی تھی کہ مجمع زار و قطار رو رہا تھا۔ تقریر شروع اس طرح ہوئی تھی:۔

"گذشتہ چالیس سال کے عرصہ میں جب کائنات بدلتے قانون قدرت کے تحت ترقی و تنزل سے متغیر ہوئی، ننھے ننھے بیج سرسبز و شاداب پودوں کا لباس پہن کر دنیا کو اپنی بہار دکھا کر بہت سے دماغوں کو معطر کرنے کے بعد فنا ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے پودے تناور بار آور درخت بنے اور وہ سرزمین جہاں ہُو کا عالم اور سنسان میدان تھا گلزار ہو گئی۔ خود میرے سیاہ بھنورا بال بگلا ہوئے مگر حقوق نسواں کے سلسلہ میں میرے وہ آنسو جو آج سے قریباً تہائی صدی پیشتر صالحہ اور سائرہ کے داماں پر گرے تھے آج بھی بدستور بہہ رہے ہیں۔ میرے اعضائے جسمانی روبہ انحطاط ہوئے۔ جوانی بڑھاپے سے بدل گئی۔ جوش اور امنگیں ختم ہوئیں۔ مگر یہ آنسو ختم نہ ہوئے۔ ختم ہونا تو درکنار کم بھی نہ ہوئے۔ کم ہونا کس کا دریں اور رستے بڑھے کہ بڑھتے بڑھتے ناسور ہو گئے"

اور یہ ناسور رستے ہوئے ناسور جن کی ٹیس د... تک نے جن کی آہ و کراہ نے مضطرب و بے چین رکھا۔ اور ۴۰ سال تک حقوق نسواں کی پامالی پر جو آنسو مسلسل بہتے رہے ان کی دردناک داستان کلیجہ توڑ دیتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ:۔

لڑکیوں کی پیدائش

"یہ تو پیدا ہوتے ہی تمہارے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو گئیں ان کا آنا تھا کہ گھر بھر پر سناٹا چھا گیا۔ دلوں کے ارمان دلوں میں رہ گئے۔ چھٹی کی دھوم دھام، بہنوں کی چہلیں، بیبیوں کی تالیاں ہوئی تھیں پانی پھر گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ قدرت نے ایک ایسا رفیق دیا جو تمہارے پھانس لگنے سے بے چین ہوگا۔ جو تمہاری تکلیفوں میں تمہارے ہاتھ بٹائے گا اور خود دکھ اٹھا کر تم کو سکھ دے گا"

ہماری بیٹیاں ———— سنہ

بیٹی کی پیدائش کی اطلاع ملنے پر شوہر بیوی کو خط لکھتا ہے۔

"میری رائے میں لڑکی کی ولادت ایک ناگہانی مصیبت ہے اور سو جھگڑوں کا جھگڑا صرف عورت کی ذات۔ اس لئے میری دلی آرزو ہے کہ گو شبانہ کی پیدائش نے تمام آرزوؤں پر پانی پھیر دیا پھر بھی میں اس کو بسا غنیمت سمجھوں گا کہ خدا اس کا پردہ ڈھانک لے"

شرع کا خون ———— سنہ ۹ء

"مجھے وہ گھڑی بھی یاد ہے جب تیری پیدائش سے گھر بھر میں سناٹا چھا گیا۔ امیدوں بھرے دل افسردہ اور شگفتہ ہونے والے چہرے پژمردہ ہو گئے۔ چھٹی اور عقیقہ کی گرما گرم خبریں پھیکی پڑیں اور کرتے ٹوپیوں کی دھوم دھام سرد ہوئی۔ مامتا نے دودھ پلوایا قدرت نے پرورش کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے پیاری بچی تو جو تیغ کے نام سے مشہور تھی راستہ چلتوں کے دل موہ لیتی"

کنواری بچی کے سودور ———— سنہ ۲۵ء

"کیا کوئی مسلمان باپ ایمان سے کہہ سکتا ہے کہ بیٹی کی خبر پیدائش نے اس کی خوشی کو رنج سے نہیں بدلا؟ اگر ایسے موجود ہوں گے بھی تو گنتی کے ورنہ زیادہ تر تو بچی ابا جان کی توقعات کا خاتمہ ہی کر دیتی ہے"

لڑکی میکے میں ———— سنہ ۱۹ء

"لڑکی کی پیدائش پر جو مصیبت گھر بھر میں چھا جاتی ہے اور خاص اپنے چہرے سست پڑ جاتے ہیں اس کی وجہ

ہماری مہمان ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم سے مہمانداری کا حق ادا نہ
ہوا۔ ذرا ذرا سی بات پہ کھسنے بھر کو ترسے دئے۔ باپ کی
گھڑکیاں بھائیوں کی ماریں، بہنوں کی خفگیاں ان سے بھی جی
بھر قدر نہ کی۔ لڑکے جو جلدی کے بہنوا لے تھے۔ ان کو
بچے کھانے … مسافر کی طرح چند روز رہ کر
سدھاری وہ ماں کے گھر بیٹی گور ڈ لپیٹی! بچا کھچا کھاتا …
بچے کپڑے۔ جانے لگی تو برسات کی تو بات ہے۔ چھوٹے نے
ایسا کٹورا کھینچ کر مارا ہے کہ کنپٹی سے خون کی تلی بہنے لگی۔
چپکی منہ دیکھ کر رہ گئی۔ کلیجہ کٹتا ہے جب دھیان کرتی ہوں
کیسی صبر کی پتلی تھی۔ باسی روکھی۔ آبالی۔ جھٹی۔ جو
ہاتھ اٹھا کر دے دیا سر جھکا کر لے لیا"

جہیز و تطہیر ———— [illegible]

"جن خاندانوں میں تہذیب اور علم کے بڑے بڑے
دعوے ہیں ان میں بھی میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ لڑکیوں
کو لڑکوں کے مقابلہ میں کوئی نہیں پوچھتا۔ روز مرہ کی زندگی
میں جیسی خاطر مدارات بیٹوں کی ہوتی ہے بیٹیوں کی نہیں
ہوتی۔ جس قدر صرف لڑکے پر ہوتا ہے۔ لڑکی پر نہیں ہوتا
اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی کوئی اچھی چیز موجود
ہوئی تو ماں نے بیٹوں کو دے دی اور بیٹیوں کو یہ کہہ کر
سمجھا دیا کہ تمہیں کچھ اور دے دیں گے۔ اور یہ مظلوم معصوم
بچیاں دل مار کر بیٹھ گئیں۔

… یہ تمہارے پاس سدا رہنے والی نہیں۔ اور چند روز
کی مہمان ہیں۔ یہ ایسی جائیں گی کہ ان کی صورتوں کو ترسو گے
یہ تم سے سینکڑوں کوس دور ہوں گی ….. بیٹے تمہیں
مبارک۔ بیویں لائی نصیب۔ تمہارا ان کا عمر بھر کا ساتھ ہے
گھر ان کا تمہارا ساتھ کچھ روز کا ہے …… یہ ایسے
پنجرے میں قید ہوں گی جہاں ان کا حامی کوئی نہ ہوگا۔ یہ
بے فکری کی نیند اس وقت تک ہے جب تک تمہارے گھر پر
ہیں۔ یہ اطمینان یہ کھیل کود تمہارے ہی در پہ چھوٹ جائے گی
….. پہلی بے انصافی تو لڑکیوں کے ساتھ یہ ہوئی کہ پیدا
ہوتے ہی گھر بھر میں سناٹا چھا گیا۔ انہوں نے اپنی میٹھی
اور بھولی بھالی باتوں سے دل میں گھر کیا۔ سیانی ہوئیں اور
سہم چڑھا کر یہ اپنی خدمت اور اطاعت سے ساتھ ہی لگی
بیٹھی رہیں۔ تم ان کو پرائے گھر کا کوڑا کہو اور یہ تمہارے سر
میں درد سُن لیں تو سو کام چھوڑ چھاڑ تمہارا سر دبانے آ بیٹھیں
….. تم سو کر اٹھو یہ گھر کو چندن کر کے رکھ دیں …..
باپ کی خدمت کو یہ حاضر ماں کی مدد کو یہ موجود تمہاری آنکھ
میلی ہو ان کی آنکھ میں آنسو آ جائیں۔ تم ان سے بیزار یہ
تم پر پروانہ۔ تم ان سے بھاگو یہ تم سے لپٹیں"

ساون کی چڑیاں ———— [illegible]

"ماں کے گھر بیٹی گور ڈ لپیٹی" "کنواری کھائے روٹیاں
بیاہی کھائے بوٹیاں" "بھاری پتھر" "لڑکی کی بیل اور
ککڑی کی بیل" یہ مثلیں بتا رہی ہیں کہ اس تمدن میں بچی
کی ہستی کیا پایہ رکھتی تھی"

سودائے نقد ———— [illegible]

"ماں باپ بھائی، نوکر مامائیں سب دیکھ رہے تھے کہ
ایک مظلوم لڑکی صرف اس لئے کہ وہ لڑکی کیوں ہے ایک
مکان کے صحن میں بے ہوش پڑی تھی مگر اتنا کوئی نہ تھا کہ
عطر نہیں تو اس کو مٹی ہی سنگھا دیتا"

مردہ ———— [illegible]

"جن جوتوں کو چمکتا ہوا لال سمجھا وہ غرض کے بندے
نکلے اور تو جس کو بھاری پتھر خیال کیا سچی غمگسار ثابت ہوئی
آج تیری وداع پر ماں باپ ایک ایسے شخص سے جدا ہوتے
ہیں جو تمہارا رفیق اور پورا شفیق تھا جس کو خدمت سے عذر نہ تھا

.... ہمارا [illegible] مسلمان عورتیں
ے مذہب کو اگر ترقی کی تو مسلمان اس پر فخر کریں مگر اسلام
س کو رخصت کر دیں گے"

کام کا وقت ——— عصمت [illegible]

مغربیت [illegible] مسلمان مرد اور عورت دونوں یکساں ہیں
دراں ادنیٰ کی خواہش مردوں سے زیادہ علم کی نہ صرف خالق [illegible]
بلکہ اس میدان میں وہ مردوں کے دوش بدوش پہنچیں۔ مگر
اس طرح کہ جو نظام ہادیٔ برحق اور قانون فطرت نے اُن کے واسطے
مقرر کر دیا اس سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں . . . . .
.. تعلیم ایسے مہیا کریں جن کا واسطہ کا اور جزواً اسلام اور
مسلمانوں سے ہو۔ نصاب ایسا مقرر کیا جائے جس میں پہلے
دین ہو اور اس کے بعد دنیا ہو"

پردہ و تعلیم ——— خطیب [illegible]

"تعلیم حکم عام ہے اسلام میں کچھ شک نہیں
لاریب اس میں امتیاز ہرگز نہیں ہے مرد کا
لیکن یہ لغزش ہوگئی۔ بے شک ہوئی بے شک ہوئی
تعلیم نسواں میں مسلمانوں نے مذہب تج دیا

صدائے راشد (نظم) ——— [illegible]

"میاں.... اگر تعلیم کا انجام یہ ہے تو یقیناً تعلیم حرام"
بیوی "یہ تعلیم کا نتیجہ ہرگز یہ نہیں ہو سکتا۔ یوں کہو کہ طریقہ
تعلیم مستحسن نہیں۔ جس طرح تعلیم دینی چاہیے اُس طرح نہیں
ملتی اور جو ڈھنگ زہر ہیں انہیں سے کام لیا جا رہا ہے نتیجہ تو یہ ہونا ہے"

جوہر قدامت ——— [illegible]

"میں یقیناً تعلیم نسواں کا حامی ہوں اور عصمت
اسی مقصد کے لئے آج قریب قریب دس سال سے جاری ہے
لیکن حاشا وکلا میں اس کی تعلیم کا حامی نہیں جو آجکل تعلیم
سمجھی جا رہی ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان لڑکیاں
تعلیم کے واسطے غیر مسلموں کے سپرد کر دی جائیں۔ میں اس خاص
معاملہ میں یہاں تک متعصب ہوں کہ میں یہ بھی روا نہ رکھوں گا
کہ لڑکیاں ایک لمحہ کے واسطے بھی والدین یا سرپرستوں کی
آنکھ سے اوجھل ہوں..... یہ ناقص تعلیم جس قدر قابل
اعتراض ہو سکتی ہے اس سے زیادہ وہ ذرائع قابل اعتراض ہیں
جو تعلیم کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ موجودہ تعلیم چونکہ
مذہب سے علیحدہ ہے۔ اس لئے اس کا پرچھاواں بھی مسلمان
عورتوں کے واسطے سم قاتل ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ ان کو جو کچھ
پڑھایا لکھایا جائے وہ سب دائرہ مذہب کے اندر ہو"

جاہل بیویوں کی ایک جھلک　　　عصمت [illegible]

"مسلمانوں کی ترقی کا تمام انحصار صرف لڑکیوں کی تعلیم
تربیت پر ہے اور جب تک وہ مذہب سے پوری طرح باخبر
اور زمانہ کی رفتار سے اچھی طرح واقف نہ ہوں گی نہ مسلمان
وہ ترقی کر سکتے ہیں جو حقیقی ترقی ہو نہ ان کے گھر نمونۂ جنت بن سکتے ہیں

مسلم اخبارات سے ——— دسمبر [illegible]

"تیس بلکہ پینتیس سال سے میری یہ ناچیز صدا مسلمانوں
میں گونج رہی ہے کہ اگر ان کو دنیا میں عزت و آبرو سے زندہ رہنا
ہے تو وہ اپنی لڑکیوں کو اتنا مسلمان بنا دیں کہ ان کی گود میں
پلنے والے بچے اسلام کے معنی سمجھ سکیں۔ یہ اوپر کی قلعی جو اس وقت
ہو رہی ہے پائدار نہیں۔ ایک دو چھینٹوں کی محتاج ہے۔ ضرورت
ہے بنیادوں کے مستحکم کرنے کی۔ ان پر جو عمارتیں چُنی جائیں گی
وہ ایسی ہوں گی کہ چھینٹے لگاتار اور بارش موسلادھار بھی ان کو
جنبش نہیں دے سکتے۔ تاریخ اسلام اس دعویٰ کا ثبوت ہے۔
سچی مسلمان ماؤں کے تو ایسے ایسے سپوت پیدا ہوئے جن کی روشنی
نے دنیا کو جگمگا دیا........ میں جو شروع سے کہہ رہا ہوں
وہی آج بھی کہتا ہوں کہ منزل مقصود مسلمانوں کے سامنے ہے۔
وہ اگر سچے معنوں میں کامیابی کے خواستگار ہیں تو لڑکیوں کی

تعلیم کی صورت تو یہ کریں اس کو اسلامی بنائیں اور پھر دیکھیں کہ لڑکے کیسے مسلمان بن کر نکلتے ہیں ......
...... مگر شرط یہ ہے کہ مسلمان ایثار کے واسطے تیار ہو جائیں اور جو حق اسلام نے اس کو دیا ہے وہ اس کو خوشی سے عطا فرما دیں۔"

منزل مقصود ——— ۲۵ء

"خدا غریق رحمت کرے سر سید کو جس وقت گھر میں جانے کی ضرورت ہوتی تھی تو کہلا کر اطلاع دے دیتا تھا کہ تشریف لا رہے ہیں۔ ایک موقع پر ایک شخص نے کہہ ہی دیا کہ یہ تو آپ کا اپنا گھر ہے فرمانے لگے کہ ہاں مگر ممکن ہے کہ کوئی پردہ والی جہاں ملنے آئی ہوں یا لڑکی بالیاں ننگے سر بیٹھی لیٹی ہوں۔ مختصر یہ وہ دور تھا کہ جوان لڑکیاں بزرگوں کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنا سخت عیب خیال کرتی تھیں لیکن اب وقت کی حالت اس قدر بدل گئی کہ شہر کے ایک مشہور اہل قلم جن کی بیٹی ایک نامور مدرسہ میں پڑھتی تھیں مجھ سے فرمانے لگے کہ میری بیٹی دو ڈھائی سال بعد مجھ سے ملی تھیں دروازہ کے صحن میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں ان کا لباس انگریزی تھا۔ جس کو میں معیوب نہیں سمجھتا مگر دوران گفتگو میں ایک موقع پر ہنسنے کی ضرورت ہوئی تو اس نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر سینہ اٹھا کر کمر نیچے کر کے زور سے قہقہہ مارا۔ یہ لڑکی اٹھارہ انیس سال کی کنواری تھی مگر میں اس کو اس واسطے معذور سمجھتا ہوں کہ وہ جہاں تعلیم پاتی ہے وہاں کی معاشرت ہی یہ ہے۔"

دنیا بدل گئی ——— ۲۶ء

نوجوان مسلمانوں میں مذہب کی جس قدر کمزوری ہے اس کی بڑی وجہ اس کا نصاب ہے۔ جب میں اس نصاب کو لڑکوں کے واسطے مفید نہیں سمجھتا تو

مولانا راشد الخیری

لڑکیوں کے [illegible]

[illegible] ——— مئی ۲۰ء

اگر کسی بدنصیب لڑکی کا نالائق باپ اپنی لڑکی کو اس وقت کی تعلیم سے محروم رکھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ قطعی فیصلہ کر چکا ہے کہ ایسی لڑکی کی حالت عمر بھر شاد رہے اور اس کی یتیمی باپ کی موت کے بعد دوسرا شخص لڑکی کے ساتھ جو سلوک کرے خاطر جمع اندیشی باپ اس کو جائز روا رکھے کیونکہ وقت کی رفتار تو واضح طور پر اعلان کر چکی ہے کہ تعلیم نسواں کی مخالفت حقیقتاً نکاح نسواں کی مخالفت ہے

دوسرے معنی یہ ہیں کہ جس بازار میں بجلی کے لیمپ جھاڑ فانوس جگمگا رہے ہیں وہاں حضرت بھی ایک مٹی کا دیا ہاتھ میں لے کر کھڑے ہیں ظاہر ہے کہ کسی پھک سنی بڑھیا کی نظر آپ پر پڑ جائے ورنہ اس جگمگاتے بازار میں جناب کو کوئی نہ پوچھے گا۔"

تقریر امرتسر ——— جون ۳۵ء

"ایسے مدارس کی تعلیم جہاں استانیاں غیر مسلم ہوں مسلمان لڑکیوں کے واسطے بجائے مفید ہونے کے مضر ہے اور اس کا انجام روشن ہے کہ دل اسلامی عظمت خیرباد کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔"

تین سوال ——— عصمت ۳۶ء

"تعلیم علیحدہ چیز ہے اور تربیت علیحدہ پہلے زمانہ میں تعلیم کتابوں کی ہوتی تھی اور تربیت گھر کی بڑی بوڑھیاں کرتی تھیں۔ آج وہ چیز نہیں ہے۔ اور تربیت کی مسلمانوں کو ضرورت نہیں رہی۔ صحبت جو میسر آ رہی ہے وہ ناقص ہے نتیجہ یہ ہے کہ اسلام جو اصل چیز تھی فنا ہو رہی ہے اور اس کا ذمہ دار موجودہ نصاب ہے۔

مسلمانوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ نصاب مروجہ نے

لڑکیوں کو سچے مذہب میں مسلمان شریک تھا اور اس کا ثبوت بڑے
بڑے شہروں کی وہ عالی شان مسجدیں ہیں جن کے پیچھے مغرب
کی نماز کے وقت سینکڑوں تعلیم یافتہ مسلمان دنیا دی
دھندوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

اس تجربے کے بعد اگر یہی تعلیم لڑکیوں کو بھی دی گئی
تو جو تھوڑا بہت اسلام کا چرچا مسلمان گھروں میں صرف
عورتوں کے دم سے موجود ہے وہ بھی ختم ہوگا"

لڑکیوں کی تربیت ——— ۱۹۲۶ء

"یہ لڑکیوں کی تعلیم کا وقت ہے اور لڑکوں کی تعلیم
کی جو قیمت مسلمانوں نے دی لڑکیوں کی تعلیم اگر یہ ہی
نصاب اور یہ ہی مدارس ہیں تو اس سے زیادہ گراں
ہوگی۔ تعلیم نسواں کا حامی مجھ سے زیادہ کوئی مسلمان مشکل
سے ہوگا۔ میں نے صرف اس مسئلہ پر اپنی تمام عمر صرف کی ہے
مگر میں نے جو پیشین گوئی کی تھی حرف بحرف پوری ہوئی اور
مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ ان کی لڑکیاں تعلیم یافتہ ہونے کے
بعد اپنے ان ہاتھوں سے جو خالق الموجودات کے حضور
میں شکریہ ادا کرتے مصنف کی حیثیت سے اسلام میں
آگ لگا کر کس طرح "انگارے" برسا سکتی ہیں۔ . . .
. . . اگر مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کے مدارس اور کالج
قائم نہ کئے۔ ان کو مشنری عورتوں کی صحبت سے نہ بچایا اور
ان کو موجودہ نصاب سے مستغنی نہ کیا تو ابھی تو "انگارے"
ہی برسے ہیں آگے چل کر ان کے دین پر ایسی بجلیاں
گریں گی کہ تباہ و تاراج ہو جائیں گے۔

ایک کرم فرما سردار بہادر اور میرے بعض خیالات
کے قدردان اور بعض کے مخالف اپنے ایک گرامی نامہ میں
فرماتے ہیں۔ انگاروں نے آپ کے قلب کو جلایا یا نہیں۔
حضرت جلنے کے واسطے تو مسلمان ہیں۔ آپ تو عکس ہیں

مچھلی ڈال کر الگ ہو لئے کیا اب بھی آپ کو اس رائے سے اتفاق
نہیں کہ یہ دیا سلائی آپ ہی کی رکھی ہوئی ہے اگر آپ حقوق
نسواں کا یہ شور و غوغا نہ مچاتے اور ان نادانوں کی حوصلہ افزائی
اس طرح نہ ہوتی تو ہم کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا مولانا ہمارے
بڑوں نے جو کچھ کیا تھا وہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ تعلیم نسواں
کے اسی واسطے خلاف تھے۔ اب آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا
نتیجہ ہم سب نے دیکھ لیا اور جو کچھ آپ دکھائیں دیکھنا پڑے گا۔"

جہاں آباد کے طائران خوش الحال کی نغمہ سنجی ——— ۱۹۳۳ء

"اگر میرے اختیار میں ہو تو ہر شہر میں لڑکوں کے مدرسے
توڑ کر لڑکیوں کے بنا دوں"

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۵ء ——— عصمت فروری ۱۹۳۶ء

"اس سے بڑھ کر خوشی کا وقت اور اس سے زیادہ
شکر کا موقع کیا ہوگا کہ وہی لوگ جو آج سے بیس پچیس
برس پہلے تعلیم نسواں کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے
لڑکیوں کے پڑھانے لکھانے کی طرف روز بروز متوجہ ہوتے
جاتے ہیں اور جس فرقہ کو چار دیواری کے باہر قدم رکھنا
بھی قریب قریب گناہ تھا اب اس کے لئے انجمنیں، سوسائٹیاں
مدرسے، کلب غرض جو جو سامان ممکن تھے سب ہی موجود
ہو گئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ غور سے دیکھو تو وہ صدی
ایک نعمت تھی جس نے برسوں کے جمے ہوئے زنگ
دلوں سے چھڑا دئے اور نیند کے متوالوں کو یہ بتا دیا کہ عزت
سے بسر کرنی ہے تو عورتوں کی عزت کرو۔ مرنا ہے
تو ان کی حق تلفی نہ کرو اور رہنا ہے تو کنواری بیٹیوں کو
مستقبل کی تعلیم یافتہ مائیں بنا دو"

بڑوں کا ادب ——— ۱۹۱۰ء

آیت کے پہلے حصہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی آنکھوں کو نیچا رکھیں اور نیک رہیں یعنی اپنی	پردہ

عورت ہوتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر [illegible] آڑ میں مسلمانوں نے
عورتوں پر [illegible] کر رہے ہیں مگر [illegible] سمجھ کر
اب بھی نہیں [illegible] ایک ظالم رسم پر ایک [illegible] کر رہے
پر ایک [illegible] جس وقت
مظلوم و کمزور اور لاچار [illegible] طاقت اور اختیار
سب [illegible] جائیں گے

نہ دانی [illegible] بچوں عاجز شود
برآرد بہ چنگال چشم پلنگ

ہندوستانی مسلمان عورت کا یہی حشر ہوا اگر اس کے ساتھ
یہ زیادتی روا نہ رکھتے تو مسلمان عورتیں بے پردہ ہو کر نہ دکھائی دیتیں
اور خبر ارتقا دان کا کلیہ نہ سمجھتی۔ پردہ کا حکم شرعی ہے اس میں
مصلحت اور دور اندیشی کو دخل نہیں مگر پچھلے دنوں جب مجھے
صوبہ بہار جانے کا اتفاق ہوا تو تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی غضب
خدا کا آٹھ برس کی بچی کو یہ حکم نہیں کہ کسی غیر عورت کے بھی
سامنے جا سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیگم راشد الخیری کھانے کے بعد
ایک موٹر میں بیٹھیں ان کے ساتھ دو تین بیگمات تھیں انہوں
نے چاہا کہ پردہ اونچا کر دیں کہ ہوا کا کچھ گذر ہو دوسری بیگمات
ہاتھ جوڑنے لگیں کہ ایسا غضب نہ کیجئے ہمارے مرد آفت توڑ
دیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر ان مسلمانوں کو اس ظلم کا کیا حق حاصل ہے"

بہار کا پردہ ________ عصمت ۲۶ء

"گویا بہار وہ جگہ ہے جہاں پرانی تہذیب اکثر گھرانوں
میں موجود ہے مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بعض خاندانوں
میں پردہ کی رواجی سختی اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ غیر عورتوں
سے ملنا ناممکن ہے"

سیاحت ۲۹ء ________ صفحہ ۰

"میں نے ۲۹ء میں جب بہار کا دورہ کیا اور عورت
کے حقوق پر صدا بلند کی تو نہ صرف کثرت سے میری مخالفت پر
کمربستہ ہوئے بلکہ قریب قریب تمام بہار نے مجھ سے نفرت کی
لیکن جو بیج میں نے بوئے وہ رنگ لائے اور ایک سال ہی بھر
کے عرصہ میں نہ صرف بہاری لڑکیاں اپنے حقوق کی طالب ہوگئیں
بلکہ جن مردوں نے میری مخالفت کی وہی میرے مداح ہوئے"

عالم نسواں ________ ۳۰ء

"میں ایک عرصہ سے مسلمانوں کو ان مظالم پر
متوجہ کر رہا ہوں جو وہ مذہب کی آڑ میں عورتوں پر توڑ رہے ہیں
ان ہی میں پردہ بھی ہے جس کو شرعی لباس پہنا کر انہوں نے
عورت کو قید کیا اور اپنے سوا دنیا کے کسی اور کام کا نہ رکھا ۔
۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں علی الاعلان کہہ رہا ہوں کہ مسلمان پیٹ بھر کر
عورت کو کچل لیں اور مذہب مقدس کو بدنام کر لیں مگر قدرت
کے قوانین تک ان کا ہاتھ نہ پہنچے گا جس وقت وہ ایکشن
شروع ہوگا مسلمان عورت شیر کی طرح بپھرے گی اور یہ وہ نازک
وقت ہوگا کہ عورت محض مرد کے مظالم کی بدولت ناموس
اسلام کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر مسلمان اس سختی سے کام نہ
لیتے اور محض اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے عورت کے حقوق
پامال نہ کرتے پردہ شرعی کو اپنے مطلب کا نہ بناتے اس کو نقاب
ڈال کر باہر نکلنے دیتے تو ان کے کان یہ نہ سنتے کہ ہندوستانی
خواتین کی کانفرنس نے پردہ کو رسوم قبیحہ میں شامل کیا اور
ان کی آنکھیں یہ نہ دیکھتیں کہ مسلم خواتین بغیر برقع و نقاب
کے دندناتی چلی جا رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمان یہ میری پیشین گوئی
لکھ رکھیں کہ اب بھی اگر ان کی آنکھیں نہ کھلیں اور انہوں نے
عورت کو اس کا حق نہ دیا تو کیسا پردہ اور کس کا حجاب وہ
اسلام ہی کو سلام کر دے گی"

عالم نسواں ________ ۳۰ء

"ایجاب و قبول کے وقت جو عورت دولہن بنی وہ بیگانہ
رہ جن تھی۔ جس کو سوسائٹی کے دیکھنے نہ صورت دکھانے کی

یہاں عورت کی حیثیت ... ذرا نازک۔ وہ جاہل و بدبخت قوم جو انسانی
زندگیوں کے فیصلے محض بلکہ گھٹ کی ... پر کر ...
قصائیوں سے کم نہیں جو بھیڑوں اور بکریوں کے سودے گوشت
سے اور اپنی ضرورت کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ اس سلسلہ
کی وہ کڑی ... فرعون کی خدائی ہے جس کو علماء اسلام
شرم و حیا کے لباس میں، جوہر نسوانیت سے تعبیر فرما کر جزو
ایمان قرار دیتے ہیں۔"

تحفۂ سلیمانی —————— ۳۰ء

"۱۸۷۱ء میں جس کو آج پینتیس سال کے قریب
ہوگئے مسلمانوں کے ہاں پردہ کی رسم سختی سے جاری تھی۔
اس وقت کی عورت کا خواب بھی بعض گھروں میں جہاں
تعلیم جدید کی روشنی نہیں پہنچی نظر آ رہا ہے۔ اس زمانہ کے
نکاح کے معنی عام طور پر اور آج کے کہیں کہیں اچھی خاصی
آزاد لڑکی کو عورت کی سند دے کر شادی کے لال سبز
کپڑوں کے لالچ اور گہنے پاتے کی چمک میں ماں باپ کی
طرف سے شوہر کی خدمت میں ایک کنیز پیش کرنے یا اپنی
کی محکومیت پر مہر تصدیق لگا دینے کے سمجھنے چاہئیں۔"

خدائی راج —————— ۳۵ء

"آپ فرماتے ہیں عورت کا گھر سے نکلنا گناہ ہے۔
عورت کا باہر نکلنا ممنوع ہے۔ مولانا نے محترم کیا عہد رسالت
میں بھی عورت آپ کی لغویت میں جکڑی ہوئی تھی۔ یقین
کیجئے اگر اس وقت عورت کے وہم و گمان میں بھی یہ چیز پیدا
ہو جاتی کہ اسلام ایسا دھوکہ باز مذہب ہے تو ایک عورت
بھی اسلام قبول نہ کرتی۔ کیا امہات المومنین حضور اکرم کے
ساتھ سفر میں نہیں رہیں؟ کیا وہ خود اور خاندان رسالت کی
محترمات میدان جنگ میں مردوں کے دوش بدوش نہیں کھڑی
ہوئیں؟ آپ کا ارشاد ہے کہ عورت کی آواز کا غیر مرد کو سننا
ممنوع ہے۔ مولانا بتلایئے کیا ام المومنین حضرت عائشہ
صدیقہ نے کبھی حضور اکرم کے بعد مجمع کے سامنے وعظ،
تقریریں نہیں فرمائیں؟ کیا ... دو بدو گفتگو
ہوئی؟ کیا جناب سیدہ نے اپنے حقوق کا مطالبہ فدک
کے سلسلہ میں خلیفہ اول ... بالمشافہ نہیں کیا؟
یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات میں حقوق نسواں کو پامال
کرنے والے گروہ نیچے جھکا لیتے اور تاویلوں کے سوا کچھ نہیں بنتے
میرے ایک آخری سوال کا جواب دے دیجئے اور وہ یہ ہے کہ
سیر و تفریح کا وہ کونسا موقع تھا جس سے آقائے نامدار نے
عملی طور پر عورت کو محروم رکھا؟ تاچ رنگ سیر تماشے وہ
کونسی چیز تھی جو آپ نے نہ دیکھنے دی۔"

خاتم بالخیر —————— ۳۳ء

"بعد نکاح جو حقوق اسلام نے عورت کو دئیے تھے وہ
اس سے چھین لئے گئے اور جس کو خطبۂ نکاح نے گھر کی ملکہ بنایا
تھا وہ مرد کی کنیز ہوگئی۔ اس مشاہدے کے بعد وہ اگر نکاح سے
گریز کرے تو قابل الزام نہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری
عام مسلمانوں پر کم اور ان علمائے عظام پر بہت زیادہ ہوگی
جنہوں نے عورت یعنی اس شے کو جو ارشاد نبوی کے موافق دنیا کی
بہترین اشیاء میں تھی ذلیل کرتے کرتے جانور سے بدتر بنا دیا
اور اس کی زنجیر حراست اتنی سنگین کر دی کہ دنیا کا ہر لطف
اس کے واسطے حرام ہوگیا۔ نفس پروری اور بے دردی کا
اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ خدا فرمائے کہ

سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ۔ زمین کی سیر کرو

اور مسلمان فرمائیں کہ اپنی آواز تک غیر مرد کو نہ سنائے اور
پردے میں گھٹ گھٹ کر مر جائے ......

جناب سیدہ نے قضیۂ فدک میں اپنا مطالبہ حضرات
شیخین سے کس طرح کیا؟ کیا کوئی اسٹامپ لگا کر دعویٰ ...

[ا]کر درخواست کی تھی؟ ام المومنین عائشہ صدیقہ نے
[مسلم]انوں سے کس طرح خطاب فرمایا؟ کیا کوئی لاؤڈ اسپیکر
[میدا]ن جنگ میں تشریف فرما تھا؟"

[ش]ادی کا انتخاب ———————— ۳۵ء

[ج]وان لڑکی کا کنوار پتہ

"کنواری اور سیانی بچی کے ماں باپ روٹی نہیں
[ک]ھانے تھے روٹی اُن کو کھاتی تھی۔ اس تکلیف کا علاج اس
[م]رض کی دوا اس مصیبت کا انسداد انھوں نے یہ کیا کہ
کنبہ اور خاندان ہی میں لڑکے منتخب کر لیتے تھے حتی الوسع
[ب]یٹیوں کو باہر نہ جانے دیتے تھے اس کا مطلب اس کے سوا
[ک]چھ نہ تھا کہ بیروں کے ملنے میں دقتیں پیدا نہ ہوں"

[ت]وائے نقد ———————— ۱۸ء

"اب فرزانہ کو معلوم ہو گیا کہ قدرت کا مقابلہ انسان
[ک]ے اختیار سے باہر ہے اور جوان بیٹی کے نکاح سے غفلت
[ک]رنا ایسا جرم ہے جس کی تلافی ممکن نہیں . . . .
جوان بچی کا کنوار پتہ ایک ناگ ہے جو ہر وقت کھیل رہا
ہے ایک آگ ہے جس کے شعلے ہر لحہ بھڑک رہے ہیں۔ ایک
مصیبت ہے جو گھر پر نازل ہے۔ ایک آفت ہے جو قدرت
نے ڈھادی ہے۔ ایک قیامت ہے جو ہر لحہ بپا ہے۔ اس
ناگ کو کچلو۔ اس آگ کو بجھاؤ۔ اس مصیبت کو ٹالو اس
آفت کو دور کرو اور اس قیامت کو ختم کردو"

[ت]وائے نقد ———————— ۱۸ء

"ایک مسلمان لڑکی کی جوانی سیکڑوں قسم کی دقتیں
سامنے لا رہی ہے۔ آپ حضرات درندوں کی طرح اس کے
بھاڑ کھانے کو چاروں طرف پھر رہے ہیں اور اس کے واسطے
پناہ کی کوئی جگہ نہیں آپ کی ناپاک خواہشیں، ذلیل امنگیں
پیچھے پیچھے سنگین حملے کر رہی ہیں۔ مذہب مقدس نے

آپ کو ہمارا محافظ بنایا تھا مگر کس قدر افسوسناک ہے یہ
حالت کہ خود آپ ہی لوگ حفاظت کرنے کی بجائے قصائی
بن گئے اور حفاظت کے بدلے ہماری آبروریزی آپ کا شیوہ
ہو گئی . . . . آپ حضرات کب تک عورت پر یہ ستم ڈھاتے
رہیں گے۔ آپ کی بیٹیاں بہنیں آخر کس قصور میں ان سزاؤں
کی مستوجب ہیں کہ وہ ادھر حدود شباب میں داخل ہوئیں
اور اُدھر آپ کی نفسانیت کی بلا کلچھیں بن کر ان کے سر پر
نازل ہو گئی"

بجھیرن کا جھونا ———————— ۳۳ء

شادی

"کیسی شادی۔ کس کا بیاہ۔ ایک بیچاری کی آئندہ تقدیر کا فیصلہ ہے نئے لوگوں سے واسطہ
اجنبیوں سے سابقہ۔ دیکھیے کیا پڑے اور کیسی گذرے۔ کوئی
بھلا مانس ہوا عزت آبرو سے گذر گئی۔ کسی بدذات سے پالا پڑا
اُٹھتے جوتی بیٹھتے لات"

جہیز و تجہیز ———————— عصمت ۱۹۶۳ء

نکاح کے معاملہ میں سرورِ کائنات نے جناب سیدہ
کی مرضی حاصل کی ہے مگر اس کا کیا علاج کہ وہ علماء جو مسلمانوں
کے اختیارات بڑھا کر ان کو خوش کرنا چاہتے ہیں نکاح کے تمام
اختیارات ماں باپ ہی کو عطا فرما رہے ہیں مگر یہ قطعی اسلام کا
منشا نہیں ہے کہ زبردستی ایک باپ دو انسانوں کو دولہا دلہن
یا میاں بیوی کی حیثیت میں جکڑ دے اور بچے کسان کی آئندہ
زندگی کا اسلام نے مجھے ہی مالک قرار دیا ہے"

احکام نسواں ———————— صفحہ ۹۵

• عورت کے بغیر ہاں کئے نکاح نہیں ہوتا اور اس کا
اقرار لازمی ہے چنانچہ شادی کے موقع پر وکیل اور گواہ لڑکی
سے جب دریافت کرتے ہیں اور اس کی اجازت حاصل
کر لیتے ہیں اس وقت جاکر قاضی کے سامنے گواہی دیتے ہیں

[illegible] مسلمانوں کا قابل اعتراض ہے اس کی [illegible] مسلمانوں کا مذہب ہے اس کا کوئی شخص نہیں۔ عورت کے واسطے دیکھنے کی اجازت ہے اور اس کی رضامندی فرض ہے۔"

احکام نسواں ____________

"اسلام کا فیصلہ نکاح کے معاملہ میں یہ ہے کہ قبل از نکاح مرد عورت کو دیکھ لے چنانچہ ارشاد نبوی ہے۔

فَاِذَا اَرَادَ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّتَزَوَّجَ مِنْهُنَّ فَلْیَنْظُرْ اِلَیْهِنَّ

اور جب تم ان سے نکاح کرنا چاہو تو پہلے ان کو دیکھ لو

اس سلسلہ میں اعمش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ نکاح جو بغیر دیکھے ہوتا ہے اس کا رنج و افسوس ہی ہوتا ہے۔

رسول اکرم کا ارشاد ہے اور یہ روایت ابن ماجہ کی محمد بن سلمہ سے ہے۔ نکاح سے پہلے چاہئے کہ دیکھ لو کیونکہ فریقین کے لئے یہ بہتر ہے"

شادی کا انتخاب ____________ ۳۵ء

"نکاح سے پہلے لڑکی اور اس کے ورثا کے سامنے کیسی ناکیں رگڑتے ہیں اور وعدے وعید کرتے ہیں۔ کہیں مہر کے اقرار کرتے ہیں کہیں حسن سلوک کے مگر بعد نکاح خدا اور رسول کے مقدس الفاظ کو غلط اور جھوٹے سچے معنی پہنا کر عورت کے بادشاہ بن جاتے ہیں اس زیادتی کے واسطے ارشاد ہوتا ہے۔

"واخذن منکم میثاقاً غلیظاً" اور تمہاری بیویاں تم سے گاڑھے یعنی سخت قول قرار لے چکی ہیں"

شادی کا انتخاب ____________ ۳۵ء

"طلاق و نفاق کے مقدمات و معاملات جس قدر انگریزوں میں ہوتے ہیں ہمارے ملک میں نہیں۔ کورٹ شپ نے شادی کو خوشگوار بنانے میں کچھ زیادہ مدد

دی . . . . . بلکہ [illegible] عصمت کا تھا ہوتا ان لوگوں کی نگاہ میں جو کنواری لڑکی کی عصمت زندگی کی بہترین عزت و توقیر یقین کرتے ہیں کسی طرح مناسب نہیں۔ اس کا نتیجہ اکثر سننے میں آتے ہیں اس لئے اس طریقہ کا [illegible] ہر طرح ناپسندیدہ ہے"

شادی کی رضامندی ____________ ۲۵ء

"سوئمبر یا کورٹ شپ دونوں کو اچھی طرح غور کر اس کی خوبیاں اسلام نے لیں اور اس کے نقائص کو چھانٹ کر الگ کر دیا اور صاف طور پر یہ اجازت دی کہ شوہر اور بیوی پہلے ایک دوسرے کو دیکھ لیں پھر رضامند ہوں"

ولی کے فرائض ____________ ۲۱ء

"خاندان کی عورتوں کے چال چلن کا پتہ مردوں کی عادات و خصائل سے لگ سکتا ہے جن کی صحبت میں کی تربیت جن کی نگرانی میں لڑکی پل پلا کر جوان ہوئی اس لئے یہ دولہا یا دولہا والوں کا کام ہے کہ وہ لڑکی کے حالات کا ان ذرائع سے اندازہ کریں . . . . . یہ تجویز کہ لڑکی والے لڑکے کو چند روز بلا کر اپنے پاس رکھیں درست ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور بعض جگہ ایسا ہوتا ہے"

کورٹ شپ ____________ ۱۵ء

"بعض لڑکیاں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس کے بڈھوں سے بیاہی جا رہی ہیں اور ماں باپ خوش ہیں کہ فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اس ناعاقبت اندیشی کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ لڑکی ماں باپ پر وبال تھی اور وہ اس کے کنوارے پنے سے اس قدر بیزار ہو گئے کہ سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی کے واسطے جس نے ابھی دنیا میں پوری طرح قدم بھی نہ رکھا تھا ساٹھ برس کے بڈھے کو جو اپنی دنیا ختم کر چکا تھا قسمت سمجھا اور سر منڈھ دیا۔ اس شادی کا انجام ظاہر ہے۔ دو چار سال بعد بیوگی۔ اور

عقلمند ماں باپ [illegible] کا تمنا ایک آدھ بچہ اس کی گود
میں اس عرصہ میں [illegible] ماں باپ بھی مرجائیں گے اب [illegible] اس
لڑکی آئندہ زندگی بسر کرنے کا کیا سلسلہ رہے گا؟

والدین کا فرض لڑکی کی شادی کر دینا ہے یا یہ بھی ہے
کہ شادی ایسی جگہ کی جائے کہ آئندہ زندگی خوش گوار گذار
اٹھارہ بیس سال کی لڑکی کو ساٹھ برس کے بڈھے سے بیاہ دینا
ظاہر ہے کہ فرض ہی ادا کر دینا ہے۔ زندگی جیسی خوشگوار
گذرے گی ظاہر ہے۔

شادی یا بربادی ——— سنہ[illegible]

"اور وہ کھلم کھلا کہتے تھے دوزخ کا پہلا طبقہ ان سنگدل
والدین سے لبریز ہوگا جو اولاد کے نکاح میں عادات و اطوار کا
لحاظ نہیں کرتے اور بے انتخاب مخالف مزاج کی وجہ سے زندگی
عذاب کر دیتے ہیں" ——— شب زندگی۔

"ناراضامندی کی شادی میں اگر ماں یا باپ اس علم
پر بھی کہ اس کا لڑکا یا لڑکی اس شادی سے خوش نہیں محض
اپنی بات کی پچ پر دو زندگیاں قربان کر دے اور صرف
اپنی خواہش پوری کرنے کے واسطے دونوں کو چولھے میں جھونک
دے تو وہ چاہے ہندو ہو یا مسلمان ہمارے خیال میں
انسان ہی نہیں"

ناراضامندی کی شادی ——— سنہ[illegible]

"جو والدین یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ لڑکی کی آئندہ زندگی
صرف ہمارے ہاتھ میں ہے اور خدا نے ہم کو ایک بیٹی نہیں
ایک ایسی لونڈی عطا کی ہے جس کی موت و زیست دونوں
کے ہم مجاز ہیں۔ ہم اگر اس کو حکم دیں تو یہ آنکھیں بند کر کے
کنوئیں میں کود پڑے تو اس کا فرض ہوگا کہ اس کی تعمیل
کرے اور بلا چون و چرا اگر پڑے ان کو مناسب ہے کہ کنوئیں
کے سوا کسی کھائی یا خندق کی صورت بھی نہ دیکھنے دیں
کہ اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جو نتیجہ کنوئیں میں کودنے
سے ہوگا وہی کھائی میں گر کر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ جن والدین
کی یہ رائے ہے کہ ماں باپ بیٹی کے نکاح کے مجاز قطعی ہیں۔
ان کو مناسب ہے کہ لڑکی کو بھونرے میں پالیں اور اس کو
کسی غیر لڑکے کو دیکھنے کا موقع نہ دیں کہ وہ مقابلہ کر سکے"

بدنصیب لڑکی ——— سنہ۲۴ء

"میں ان تعلیم یافتہ افراد سے جن کی بچیاں شادی
کے قابل ہیں یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی بچیوں کے
واسطے نہیں خدا اور اس کے رسول کے واسطے اسلام کے واسطے
ان کے واسطے جو ہادی برحق تھا اپنی لڑکیوں کی شادی کے
وقت ان کے شوہروں سے تحریری اقرار لیں کہ لڑکی کو شرع
اسلام کے موافق خلع کا حق حاصل ہوگا"

میری دوسری پیشینگوئی ——— سنہ۳۱ء

"چند ہی روز ہوئے میں نے ایک مضمون میں مسلمان
خواتین سے کہا تھا کہ وہ بیٹیوں کی شادی کے وقت اگر حالات
اجازت دیں تو ان کے شوہروں سے حقوق کی تفصیل طے فرما
لیا کریں .... اگرچہ نکاح بھی ایسے ہوتے ہیں جن میں
شوہروں نے اس رواج کو مٹا کر جو کمزور عورت کی گردن پر
طاقتور مرد کی چھری ہے اس کا وہ حق عطا فرمایا جس کی
وہ شرعی مالک ہے تو دامن اسلام سے ایک ایسا داغ دور
ہو جائے گا جس پر اغیار ہنس رہے ہیں اور جوان نفس پروروں
کی زیادتی ہے جو اسلام کے جانی دشمن ہیں ....
مجھے امید ہے کہ وہ دولہا جو زرق برق لباس سے جگمگا کر دلہن
کے گھر پر نکاح کے واسطے آتا ہے قبل از نکاح اس پر بھی
غور کرے گا کہ نکاح ایک معاہدہ ہے نہ کہ عورت کے
واسطے زنجیر غلامی"

مسلمان عورت کی کشتی ——— سنہ۳۲ء

بیوی بڑھیا اور جوان

اس میں شک نہیں کہ بیوی مرد کی سب سے زیادہ رفیق ہونی چاہئے اور بڑھاپے میں بیوی سے زیادہ شوہر کا مددگار اور کوئی نہیں ہوسکتا مگر رفیق اور شفیق وہی بیوی ہو سکتی ہے جو جوانی میں شوہر کے ساتھ رہ کر تمام خوبیاں دیکھ چکی ہو۔ خود بھی اگر بڑھیا نہ ہو تو بڑھاپے کے قریب آگئی ہو۔ یہ فطرت انسانی ہے اور خلاف فطرت توقع قطعاً ناجائز ہے۔ ایک جوان لڑکی سے یہ امید رکھنی کہ وہ بڈھے پھونس شوہر کے جنازہ پر رات بھر آنسو گرائے یا اس کے مرض الموت میں مہینوں رات رات بھر جاگتی رہے اور تیوری پر بل نہ لائے درست نہیں"

ایسی بیاہی سے کنواری بھلی ———— ۱۹۲۵ء

"بیوی مرد کی سب سے زیادہ رفیق ہونی چاہئے اور بڑھاپے میں بیوی سے زیادہ شوہر کا مددگار اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ مگر رفیق اور شفیق وہی بیوی ہو سکتی ہے جو جوانی میں شوہر کے ساتھ رہ کر تمام خوبیاں دیکھ چکی ہو۔ خود بھی اگر بڑھیا نہ ہو تو بڑھاپے کے قریب آگئی ہو"

ایسی بیاہی سے ———— ۱۹۲۵ء

"لڑکی کا نکاح اس حد تک کیوں فرض سمجھ لیا گیا ہے کہ بڈھا پھونس ہی کیوں نہ ہو مگر نکاح کر دیا جائے۔ آخر مائیں اپنی عمر کیونکر بسر کر دیتی ہیں۔ حالانکہ شادی کے نتائج سے باخبر ہوتی ہیں۔ پھر کنواری لڑکی جو شادی سے قطعاً ناآشنا ہے کس واسطے کنوئیں میں دھکیلی جاتی ہیں۔

ایسی بیاہی سے ———— ۱۹۲۵ء

"بڑھاپے میں بیوی کے فرائض وہی بیوی ادا کر سکتی ہے جو جوانی میں دکھ سکھ کی شریک رہی ہو۔ جہاں میاں بیوی کے سیاہ بال عمر کی مساوی رفتار سے رنگ بدل رہے ہوں۔ اسی واسطے عورت کی عمر شادی کے وقت مرد سے کم دیکھی جاتی ہے مگر وہ چار پانچ سات برس۔ عمر کا ایک حصہ ... افزونا بھی بجا ہے۔ ہم دنیا کو بہت کچھ دیکھ چکے مگر ... ہے کہ ابھی دنیا کو دیکھے۔ جب ضعیفی کا دیو مہیب ... ہوگا وہ اس وقت جوانی میں بھر پور ہوگیا۔ ایک بڈھے ... مفلوج شوہر کی یہ توقع جائز ہے کہ ایک جوان لڑکی ... اوڑھنے کے دن میں دونوں وقت دنیا کے سب کام ... اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا کر اس کو کھلائے"———— ...

"محبت کی ابتدائی صورت کا نام اُنس ہے ... فریفتگی ...... اور یہ اُسی وقت حاصل ہوتی ہے جب ... بھری آنکھوں کے سامنے سرخ و سپید چہروں پر جھریاں ... اور سیاہ بال سفیدی سے بدل جائیں۔

جوانی حق رکھتی ہے کہ اس فیصلے کو ٹھکرا دے مگر ... اس اصول پر لبیک کہے گا اور بتا دے گا کہ پھول کی خوشبو اس قلب کو زیادہ معطر کرے گی جس میں کانٹا چبھ چکا ہو شکر کی گھڑیاں وہاں زیادہ وزنی ہوں گی جہاں دکھ ... پڑ چکے ہوں اور راحت کا وجود صرف ان ہی دلوں کے ... ہے جو مصیبت سے آشنا ہو چکے ہیں"

باسٹھ برس کے تین دن ———— ۱۹۲۹ء

جہیز

دو بنگال کے جگر خراش واقعات اور اس جہیز ... بدولت لڑکیوں کی ستی ہونے سے بھی ہم بے ... نہیں لیکن مسلمانوں میں جہیز رسم میں داخل نہیں اسوۂ ... ہے خواہ وہ ایک تنکا ہی تھا مگر حضور اکرم نے جناب سیدہ ... جہیز دیا۔ ... لہذا جہیز قطعاً اڑا دینا یقیناً معصوم بچیوں ... کے ساتھ ایک قسم کی زیادتی ہوگی اور ہماری رائے میں کو ... مسلمان حیثیت ضرورت مصلحت کسی طرح بھی مجبور ہو کر ... کو ننگا بُچا و دام کرنے کا مجاز ...... والدین اصلاح ... کی آڑ میں ایک پھوٹی کوڑی بیٹی کو نہ دیں تو یہ بھی ممکن ...

کہ وہ سنت نبوی کے بموجب شرعاً محمدی مہر پر مصر ہوں۔
ان حالات میں اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا جو ادھر سے بھی گئی۔
اور ادھر سے بھی۔ جہیز اس طرح گیا۔ مہر اس طرح۔ ترکہ
پدری پر لیٹرا قابض ہی ہے!"

بدنصیب بچیوں کا یہ حق بھی گیا ——— ۱۹۲۰ء

مرد لڑکی کی شادی کے بعد چونکہ وہ پرائے گھر کی ہوجاتی ہے اور والدین کی زندگی میں ان کی دولت سے بوجہ بعد ہونے کے اسے زیادہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا یا پہنچتا اس لئے اس کو جہیز کی صورت میں کچھ دلوایا تاکہ وہ کمی اس نسبت سے پوری ہو جائے اور یہ طریقہ جہیز چونکہ خود حضور اکرم نے روا فرمایا ہے یعنی سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا کو جہیز دیا ہے اس لئے ہر مسلمان لڑکی کی شادی کے وقت اس طریقہ کو مسنون سمجھ کر پیروی کرتا ہے۔ اگر زیادہ میسر نہ ہو تو اپنی حیثیت کے موافق خواہ ایک آدھ ہی چیز کیوں نہ ہو لڑکی میکے سے لے کر رخصت ہوتی ہے"۔

——— احکام نسواں

حسنِ سلوک

امام غزالی فرماتے ہیں کہ عورتوں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کو معاف کردو۔ ان کی نیکیوں کی قدر کرو۔ دیکھو قرآن مجید میں یہ حکم خداوندی ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت برتو۔ یہ عورتیں وہی تو ہیں جو تم سے گہرے وعدے لے چکی ہیں۔ ایک انصاف پسند مسلمان کے لئے سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ سب سے آخری وصیت جو بانی اسلام نے فرمائی تھی وہ یہی تھی کہ نماز کبھی نہ چھوڑنا۔ اپنی لونڈی باندیوں کو تکلیف نہ پہنچانا اور عورتوں کے حق میں اللہ سے ڈرنا وہ تمہاری قید میں ہیں۔

——— زیور اسلام

" مسلمان اگر حقیقتاً ترقی کے خواہش مند ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہے کہ قرون اولیٰ کی طرح عورت کو اپنے ساتھ شامل کریں ورنہ یاد رکھیں وہ اگر متفقہ طاقت سے کام نہ کریں گے اور عورت کے احترام کو اسی طرح پامال کریں گے جس طرح کر رکھا ہے تو ان کی کامیابی یقیناً محال"

تنظیم اگست ۱۹۲۳ء ——— شہید مغرب صفحہ ۴۹

بخاری اور مسلم ابن مسعود اور سعد بن ابی وقاص کے حوالہ سے آقائے دوجہاں کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

"مرد مستحق ثواب ہے کھانے کے اس لقمہ میں جو اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دے"۔ کیا محبت کی اس سے بہتر مثال دنیا پیش کرسکتی ہے؟

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جب ایک موقع پر مصروف جہاد تھے تو فرمایا "مسلمانوں تم کو وہ عمل معلوم ہے جو ہمارے اس جہاد سے بھی افضل ہے"۔ لوگ متعجب ہوئے اور عرض کیا وہ کون سا کام ہے جو اس پر بھی سبقت لے گیا۔ آپ نے فرمایا کہ

" عیالدار اگر رات کو اپنے بیوی بچوں کو کھلا دیکھے اور اٹھ کر ڈھانک دے تو اس کا یہ عمل ہمارے جہاد سے افضل ہے"۔

شادی کا انتخاب ——— ۱۹۳۵ء

"جو لوگ کلام الٰہی کو دور حاضرہ کے علماء سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے۔ جو کلام رسول کے دریا بہارہے تھے ذرا ان کی طبیعت ملاحظہ کیجئے بشر رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ اور عالم جید سے اُن کے معتقدوں اور مریدوں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ آپ نے ایک سنت ترک فرمادی یعنی ارشاد نبوی کی موجودگی میں نکاح نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا اس خدائی فیصلہ نے

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ

(جیسے مردوں کا حق عورتوں پر ہے ویسے ہی دستور کے موافق عورتوں کا حق مردوں پر ہے) مجھ کو نکاح سے روک دیا کہ عورتوں کے بھی حق ہیں۔ نہ معلوم عورت کا کونسا حق مجھ سے ادا نہ ہو اور ارشاد کی موجودگی میں گنہگار ہو جاؤں"

شادی کا انتخاب ——— ۱۹۳۵ء

"ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے (ابن ماجہ نے اُمّ سلمہ سے روایت کیا ہے۔ نسائی وا کری) کہ وہ مرد جو بیوی کی بدخلقی پر صبر کرے ایسا ہے جیسے حضرت ایوب کہ ان کا صبر ضرب المثل اور بے نظیر ہے "بی بی کا صبر" یہ معنی نہیں رکھتا کہ برداشت کرے بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس کے جواب میں خندہ پیشانی سے پیش آئے"

شادی کا انتخاب ——— ۱۹۳۵ء

"اسلام نے بیوی کی ہر اس کوشش کو جو شوہر کا دل مسخر کرنے کے واسطے کی جائے قریب قریب جائز قرار دیا ہے۔ موسیقی کا شمار بھی اسی سلسلہ میں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز اگر اس مقصد سے کی جائے تو قابل اعتراض نہیں۔ چنانچہ جید سے جید علماء گھر کی بیویوں کے گانے کو جائز قرار دے چکے ہیں۔ خود میرے والد کے حقیقی پھوپھا شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی موجودگی میں میری آنکھوں کے سامنے گھر کی عورتوں نے شادی بیاہ کے موقعہ پر سہاگ گھوڑیوں کے گیت گائے ہیں اور اس کی سند حدیث سے لی گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ناچنا اور اپنی اداؤں سے غیر مردوں کے دل مسخر کرنا ہر ملک میں ہر دور میں معیوب سمجھا گیا ہے۔ آج بھی یورپ میں شاہی خاندان کے افراد کو یہ اجازت نہیں کہ وہ کسی ایکٹرس سے شادی کر سکیں۔ اور ہمارے ہاں تو یہ فن اس قدر مبتذل سمجھا گیا ہے کہ قطعی طور پر ... کے واسطے مخصوص ہے"

عالم نسواں ———

"اسلام نے عورت کو محبوب ... بنایا۔ اس کے ثبوت میں یہ الفاظ کافی ہیں کہ ... جیسی چیزوں میں رسالت مآب نے اس کا شمار ... کی کسی آیت نے اس کی خدمتگذاری کی توقع ... اس سے محبت کی امید اور شریک ... ہے۔ شوہر کو بیوی کی اور بیوی کو شوہر کی محبت میں ... ایک بنا دیا ہے جو آج بگڑ تگڑا کر (بیٹر ہاف) ... کے فضول لقب سے نمودار ہو رہا ہے"

عالم نسواں ———

عورت کی مظلومیت

"مظلوموں کی گلی ... کی سب ...

آفت کی ماریاں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں اکثر ایسی تھیں ... ناز و نعم سے پلیں۔ لاڈ پیار سے بڑھیں چاؤ ارمان سے بیاہی گئیں مگر تقدیر کی خوبی نے دنیا کی بہار ... ہی پر ختم کر دی۔ ایسے شریر النفس آدمیوں کے پھندے میں جا کر پھنسیں کہ زندگی دوبھر ہو گئی۔ رحم کی آنکھیں ان کی حالت پر آنسو بہاتی ہیں اور ہمدردی کا کلیجہ ان کی داستان مصیبت پر پاش پاش ہوتا تھا۔ ساس نندوں نے ان کے کلیجے چھلنی کر ڈالے ناامیدی نے ان کی عمروں کا خاتمہ کر دیا۔ شریفوں کی بیٹیاں تھیں طاعت و فرماں برداری کا جوہر چمک رہا تھا صبر و شکر کی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ ان کے کم بخت خاوند ظلم کا پیشہ کرتے تھے قزاقی کی دوکان کھولے ہوئے تھے۔ دل آزاری ان کا طرز عمل تھا۔ لوٹ مار ان کا اصول...... اے اللہ وہ کس قسم کے خاوند تھے کہ ان مظلوم بے زبانوں کو اُلٹی چھری سے حلال کرتے تھے"

——— منازل السائرہ

"منصف مزاج خاوندو!... ہماری تکلیفوں پر بھی
نظر ڈالو۔ قدرت نے ہم کو جو کچھ عطا کیا تھا وہ ہم تم پر سے
لٹا بیٹھے۔ اور نہ صرف یہی نہیں اپنی خوشی اور مسرت بھی برضا۔
گھر لانے کی لاج رکھو اور وہ وقت یاد کرو جب ہمارے ماں باپ
نے تم اپنے قبضہ میں لائے اور آج جبکہ ہمارا ڈھانچ رہ گیا
ہم سے طوطے کی طرح دیدے نہ بدلو۔ دن بھر کی محنت مشقت
کے بعد تمہیں رات کو چین مل جاتا ہے لیکن ہماری تقدیر میں
وہ بھی نہیں۔ آنکھیں دکھتے بچے۔ بخار چڑھے بچے رات
رات بھر ٹہلاتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ تمہاری
آنکھ نہ کھل جائے ہماری ساری ساری رات اور پورے پورے
دن کندھے لگائے ٹہلنا بہت بڑے رحم کا مستحق ہے۔ ہم نے
تمہارے بچوں کے پالنے میں اپنی جوان جان قربان کردی۔
جب آج یہ پھلواری بچے اچھلتے کودتے دکھائی دے رہے ہیں
سارا جوبن گیا تو۔ جب ایک لالہ پالو جن مشکلوں کا ہمیں سامنا
ہوا جو جو آفتیں ہم نے جھیلیں اور جیسی جیسی مصیبتیں ہم نے
جھیلیں ان پر غور کرو پھر انصاف سے دیکھو کہ ہم کس سلوک
کے مستحق ہیں۔ ..... ہمیں بخار ہو ہمارے سر میں درد ہو
مگر ہم تمہارا آرام مقدم سمجھیں۔ تم سے پہلے کھانا قسم۔ تم سے
پہلے سونا گناہ۔ تم سے بہتر کھانا حرام۔ آخر ہم بھی انسان
ہیں۔ ماں باپوں کی بیٹیاں بھائیوں کی بہنیں ہم بھی ہیں
نازو نعم سے پلے۔ ہاتھوں چھاؤں بڑھے۔ ہم وہی ہیں
جن کو اندھیری کوٹھڑی میں جاتے ڈر لگتا تھا اور آج ڈھنڈھار
گھر میں جب بچہ بچہ پڑا سوتا ہوتا ہے آدھی آدھی رات تک
تمہارے واسطے کھانا لئے بیٹھے رہتے ہیں"

حریت نسواں ———— ۱۹۰۹ء

"ہم ازلی بدنصیب تھے۔ نامراد رہے اور ناشاد
اٹھے۔ قدرت کے انعام ہمارے واسطے مصیبتیں ہوئیں
اور یہ دنیا جو تمہیں نصیب اس کی دلچسپیاں ہمارے لئے
آفتیں۔ چار دیواری کی حکومت پر راج کرنے والے بادشاہو
باد بہاری کے ٹھنڈے جھونکے، جنھوں نے جنگلوں میں
پھول اور باغوں میں کلیاں کھلائیں ہمارے کلیجوں پر
نشتر بن کر چبھے اور سینہ ہو کر برسے۔ چاند مدتوں سر پہ
چمکا۔ تارے برسوں سامنے دمکے مگر حسرت نصیب دل
کی کلی قبر تک نہ کھلی۔ تمہارے سازگار مگر ہمارے لئے وبال
جان تھی وہ دنیائے ناپائیدار جس کے ارمانوں نے تادم
واپسیں ساتھ نہ چھوڑا۔ عمریں اسی طرح بیتیں سانس
نکل گئی مگر آرزوؤں کے کانٹے جیتے جی پہلوؤں سے نہ نکلے
ہم انسان تھے مگر کیسے انسان کہ کبھی اطمینان کی مسکراہٹ
ہمارے ہونٹوں پر نہ کھلی۔ رنج و آلام کی گھٹائیں جھوم جھوم کر
آئیں اور کھل کھل کر ہمارے دلوں پر برسیں۔ مگر اس کی بوچھاڑ
زبان تک نہ آئی۔ یہاں تک کہ دکھ بھری دنیا نے ہمیشہ ہمیشہ کو رخصت کردیا"

عورتوں کی صدا عالم ارواح سے ————

"جو ہاتھ اس امید پہ پکڑے تھے کہ ساتھ دیں گے
وہ بے وفا نکلے تڑپ تڑپ کر عمریں کاٹیں اور جل جل کر
دن پورے ہوگئے وہ چار دیواری جس میں ٹھنڈی اور
میٹھی ہوا کے جھونکے بھول کر بھی نہ جھانکتے ہمارا مسکن ہوئی
اور وہ دو تین معصوم جو ابتدائی محبت کی یادگار تھے
ہمارے رفیق۔ میکہ کا زمانہ ایک خواب تھا سسرال
اس کی تعبیر اور نکاح بلائے ناگہانی۔ قدرت کا منشا جو
کچھ ہو مگر تمہاری غرض ہم پر حکومت کرنی تھی تم نے ظلم
توڑے اور طرح طرح کی مصیبتیں ڈھائیں۔ دنیا کی دلچسپیاں
قدرت کے انعام ہم پر حرام ہوئے اور ہمارے فرائض تمہاری
خدمت ٹھہرے، اور ما حصل زندگی تمہاری اطاعت۔
ہم نے تمہارے اشارے پر آنکھیں بچھائیں تمہارے

وبال ہوگئی ۔ بیکار بیٹھی بیٹھی پھولو ۔ جھاڑو بہارو ۔ لیپو پوتو ۔ غرض گھل گھل کر خاک اور جل جل کر کوئلہ ہو جاؤ مگر کسی کے بھاؤ میں بھی نہیں ۔ آنے جانے والے پھوہڑ بتائیں ۔ ملنے جلنے والے کیڑے نکالیں ۔ زبان دراز وہ ۔ کام چور وہ ۔ جل جوگنی وہ ۔ بے سلیقگی وہ ۔ ناقص العقل اس کا خطاب ۔ بے وقوف اس کا لقب ۔ مختصر یہ کہ کتے کی زندگی اس سے بہتر"

مظلوم کی فریاد ———— سنہ ۱۱ء

بد شکل بد سلیقہ کہلائی ہوں   پنچوں کی لاج آئی ہوں
نائیں رگڑ رگڑ کر لائے تھے   پونچا پکڑ کر لائے تھے
کچھ شرم رکھتے ماتھا کی   کچھ لاج رکھتے بات کی
بے شرم کیوں شادی نہ تھی   کیا شکل دکھلادی نہ تھی؟
اچھی بُری جیسی بھی تھی   کالی سیہ کیسی بھی تھی
دم دم کے پھر پھیرے تھے کیوں   ابا کو سب گھیرے تھے کیوں
اس وقت تھے بہرے جو کہے   ہیں آج کیا کیڑے پڑے

اسلم کا خط ————

گودڑ کی لپٹی بیٹیاں   رتی کی ہوں لاکھ ہیٹیاں
کرتے لیری ان کے ہوں   شلوار چیری ان کے ہوں
فاقے میں ہو ان کی بسر   رہنے کے ٹھکانہ ہو نہ ڈر
سر پر دوپٹہ ہو پھٹا   لیکن یہ تصویر وفا
مانا کہ اب محتاج ہیں   لیکن بڑوں کی لاج ہیں
گھل گھل کے دیدیں جان یہ   ہوں لاج پر قربان یہ
کنبہ کی عزت ان سے ہے   دنیا عبارت ان سے ہے

(روداد قفس) ———— اسلم کا خط سنہ ۱۸ء

"اگر ہم اپنے ہی ملک پر نظر ڈالیں تو ہم کو یہ دکھائی دے گا کہ مرد عورت کا خدا ہے ۔ وہ اس کی پرستش کرتی ہے اس کی صحت کے واسطے روزے رکھتی ہے اس کے پاؤں کو پوجتی ہے اور حد ہے کہ اس کی زندگی پر قربان ہوتی ہے اس کا بدلہ یہ ملتا ہے کہ ترکہ نہ ورثہ، حصہ نہ بخرہ ۔ جب تک چہرہ پر چار چلو خون ہے ٹہل کرے اور ٹکڑا کھائے"

سودائے نقد ———— سنہ ۱۸ء

"زندگی ان کو مصیبت اور دنیا ان کے واسطے دوزخ ظالم شوہروں نے اٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات سے ان کو کائنات کی بدترین ہستی بنا دیا ۔ للہ ایمان سے کام لو اور بتاؤ اگر ہم نے حکم طلاق کے آگے کبھی اُف کی ہو ۔ تم نے بے گناہ بے قصور طلاقیں دیں اور ہم نے گردنیں جھکا دیں مگر اسی رسول اور اسی مذہب نے ہم کو خلع کا حق دیا تھا مگر ہے کوئی مسلمان جو آج کہہ سکے کہ اس نے ایک بدنصیب بیوی کو خلع دلوا کر ظالم شوہروں سے چھٹکارا دلوا دیا ہو؟

ہم نے خاک عرب سے اٹھنے والے رسول کے احکام سر اور آنکھوں پر رکھے ہیں اور اسلام کی لاج رکھی ہے مگر تم نے اس پاک ہستی اور مکمل انسان کا ارشاد ٹھکرا کر بے شمار ماں کی جائیاں مصیبت پیٹتی اور آفت بھگتی قبروں میں پہنچا دیں اور خلع نہ ہونے دیا"

رواج کی بھینٹ ———— سنہ ۱۹ء

عطیہ کا دم واپسیں

"کثرت ازدواج کے علاوہ مسلمان عورت پر اس زمانہ میں اور مصیبتیں کیا کم ہیں؟ مذہب نے اس کو گھر کی ملکہ بنایا ۔ مسلمانوں نے اس کو شوہر کی لونڈی کر دیا ۔ اسلام کا فیصلہ یہ کہ عورتوں کی عزت کرو وہ تمہارے بس میں ہیں لیکن مسلمانوں کا مقولہ یہ کہ عورت کو سر پر ہی نہ چڑھاؤ کہ وہ اُف کر سکے"

عورتوں کی حالت زار ———— سنہ ۱۸ء

"طلاق اور خلع دونوں قریب قریب برابر کے اختیارات اسلام نے مرد اور عورت کو دئے ۔ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ

بتاتی ہے کہ اگر طلاق سے مرد تو خلع سے عورت کس حد تک مستفید ہوئی۔ . . . . ایک خلع ہی پر کیا منحصر ہے۔ عصمت کی شی تو موجودہ مسلمانوں میں ایسی پلید ہوئی کہ اس کو دیکھ کر اور سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ شوہر کی حکومت ساس نندوں کی زیادتی۔ عزیز اقارب کے طعن تشنیع غرض کس کس کو روئیں۔ مسلمان عورت کا نکاح معنی ہی یہ رکھتا ہے کہ وہ تمام آفات کے واسطے سینہ سپر ہو۔ . . . . ایک اچھی ماما کے خرچ کا اوسط تیس روپیہ کے قریب ہے (یہ ۱۹۲۲ء کا مضمون ہے آج ۴۲ سال بعد تیس روپیہ نہیں سو روپیہ سمجھنے چاہئیں مرتب) اگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج سیکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں گھروں میں بیوی کا خرچ بھی اس سے زیادہ نہیں میاں سے بیوی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ آج تم آٹھ بجے کی بجائے دس بجے جانا مگر بیوی کا یہ فرض ہے کہ اگر شوہر رات کو ایک دو بجے تھیٹر یا ناچ مجلس محفل سے آئے تو اس کے استقبال کو جاگتی رہے . . . . . دس فیصدی مسلمان عورتیں بھی مشکل سے یہ حق رکھتی ہیں کہ شوہر کی آمدنی سے تو درکنار اپنی آمدنی سے بھی جو ان کو میکے سے ملی ہو بلا شوہر کی اجازت کچھ صرف کر سکیں . . . . . . حیات انسانی کے بر نقص پر مسلمان متوجہ ہیں اور رفع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رسالے ہیں۔ اخبار ہیں۔ جلسے ہیں۔ کتابیں ہیں۔ غرض سب کچھ ہے مگر حقوق نسواں کی حمایت میں کیا ہے۔ صرف ایک آدھ آواز ع ۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

۱۹۲۲ء

مسلمان جنھوں نے عورت کے حقوق تاراج کرنے میں کسر نہ چھوڑی اس کے آرزو مند ہیں کہ جب ایک انسانی ہستی کو گھونٹ گھونٹ کر اور کچوکے دے دے کر مار ڈالیں تو اس کی ہڈیاں بھی ان کے قبضے سے باہر نہ نکلیں اور . . . کے اس قصور کی سزا ہے کہ وہ مسلمان کے گھر کیوں پیدا . . .

ارتداد کا علاج ——— انقلاب . . .

"رسم و رواج کے پابند مسلمان اور عورتوں . . . کو شیر مادر بجھ کر ذکار لینے والے مرد عورت سے پوچھتے ہیں اور . . . کر انھوں نے اس عورت کو جو قریب قریب مردہ کے برابر تھی اس عورت کو جو گھر کی ملکہ تھی۔ اس عورت . . . ماں باپ کے ہاں چند روز کی مہمان تھی اس عورت کو جو . . . کی برادری میں اس سے کم نہ تھی۔ اس عورت کو جس کی حمایت میں دونوں جہاں کا سردار آخر وقت تک . . . رہا کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ اور مرد اپنی اس سختی اور ظلم . . . کہاں تک حق بجانب ہے؟

قیدی لڑکیاں ——— ۱۹۲۲ء

"عورت جب بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ہو اس وقت جب اس کے منہ سے کف جاری ہوں۔ چہرہ غصے سے سرخ اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں اپنی شرم و حیا اور . . . کا احترام کھو کے اپنا حق مانگ رہی ہے۔ اس وقت اس کے وجود میں اس کی رگ رگ میں مرد کے مظالم خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ مرد کی جھوٹی طاقت نے عورت کا یہ پڑھا تو کر دیا اب نہ معلوم وہ اس کو کس رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے"

قیدی لڑکیاں ——— ۱۹۲۳ء

تعدد ازدواج

"تعلقات زن و شو سے فطرت کا مقصد صرف بقائے نسل ہے تاکہ دنیا کی آبادی میں کسی قسم کا رخنہ نہ پڑے۔ اس واسطے کلام اللہ نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ نساؤکم حرث لکم تمہاری بیبیاں گویا تمہاری کھیتیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ کھیتی سے صرف پیداوار مقصود ہے اور اس طرح فطرت کی غرض اس تشبیہ سے بدیہی

تقاضا یہی ہے اس کو سب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ عورت کے ساتھ بہت سے عوارض ایسے لگے ہوئے ہیں۔ حمل۔ وضع حمل۔ رضاع وغیرہ وغیرہ کہ روز نکاح سے دم واپسیں تک اس کی عمر کا تہائی حصہ اس طرح گزرتا ہے کہ وہ فطرت کی اس غرض کو باحسن وجوہ پورا نہیں کر سکتی"

سودائے نقد ———— سنہ ۱۸ء

شوہر کے نام خط:۔

"تمھاری بیوی تم کو مبارک ہیں اپنی فقیری میں بھی خوش ہوں۔ تم کو خدا نے نئی دولت دی۔ نئی بیوی دی۔ مال دیا۔ جائداد دی۔ ماما نوکر چاکر بگھی گھوڑا: تم جتنا اچھلو سب تھوڑا۔ فقیرنی بھک منگی۔ جتنا اترائے سب ٹھیک سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا اُبل پڑی۔ سدا کئے فاقے ہمیشہ مانگی بھیک۔ عمر بھر کی مزدوری۔ رات دن میں صدریاں۔ خیرات پر گزر۔ زکواۃ پہ گھر۔ لیتڑا جوتی چیتھڑا موزہ۔ آگیا تو روزی نہیں تو روزہ۔ پہنتی رہی لیریاں۔ سیتی رہی ٹاٹ۔ جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ۔ گھر بھر فقیر۔ کنبہ بھر محتاج۔ آج بی صنوبر کو یہ دن لگے ہاتھوں میں ٹھوس کڑے۔ ماتھے پہ جھومر۔ گھر میں مامائیں ڈیوڑھی پر نوکر"

ایک مظلوم بیوی کا خط ———— سنہ ء

"حیات انسانی کے مقررہ اصولوں کی طرح مسلمان مرد کے نکاح ثانی کی مقررہ وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ موجودہ بیوی پھوہڑ ہے۔ جاہل ہے یا مریض ہے"

غلط فہمی ———— سنہ ۲۴ء

"رہا پھوہڑپن یہ الزام جہالت سے بھی زیادہ لغو ہے۔ اس نے کونسا فرض ادا کرنے میں کمی کی؟ کیا نہیں کیا۔ جھاڑو بہارو۔ سلیقہ صفائی جو عورت کا ہنر اور گھر والی کے کام ہیں کئے اور جتنے کرنے چاہئیں اس سے زیادہ کئے۔ آپ کی اطاعت میں کونسی کسر کی؟ رات رات بھر کھانے لئے بیٹھی۔ دن دن بھر چولھے پر توا رکھا۔ ہاں یہ الزام سچا اور شکایت برحق کہ بچوں کی پرورش کرتی ہے مگر خود ہی غور کیجیے کہ یہ الزام کہاں تک درست اور سچا ہے اور ایک شوہر کو اس لئے کہ بیوی بچوں والی ہوگئی اس سے نفرت کہاں تک حق بجانب ہے۔ کیا ایسے ہی مردوں کو اسی وجہ سے اسلام نے چار نکاحوں کی اجازت دی ہے؟"

سنجوگ ———— سنہ ء

"میں آپ سے صرف اس قدر کہتی ہوں کہ تعدد ازدواج کا مسئلہ قانون فطرت ہے مجھے اس سے انکار نہیں کہ موجودہ مسلمانوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھاکر اس مسئلہ کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ خود مسلمان اس کے برخلاف چیخ اُٹھے۔ لیکن ان مسلمانوں کی خود غرضی کا ذمہ دار اسلام ہرگز نہیں ہے۔ . . . . . . ہاں نتیجہ نکاح چونکہ احکام خداوندی کے خلاف تھا اس لئے ان کی ذات قابل ملامت ہے"

سودائے نقد ———— سنہ ۱۸ء

"نکاح اور چیز ہے۔ نتیجہ نکاح اور چیز مسلمان خواتین نکاح کی نہیں۔ نتیجہ نکاح کی مخالفت کریں۔ نکاح کا فیصلہ انسانی نہیں۔ خدائی فیصلہ ہے۔ اور اس کے برخلاف لب کشائی مسلمان کے واسطے جائز نہیں"

اسلامی پردہ پر اعتراض ———— سنہ ۱۹ء

"دوسروں کی دیکھا دیکھی۔ کچھ صحبت کا اثر۔ کچھ زمانہ کی ہوا مسلم خواتین کا یہ فریق اپنے مطالبہ میں حدود مذہب سے تجاوز کر گیا اور مسلمانوں کو مخالفت کرنی پڑی"

اس کے ذمہ دار مرد بھی ہیں ———— سنہ ۱۸ء

"چند خاص گھروں کو چھوڑ کر عورت کی عزت مسلمانوں

میں وہ نہیں ہے جو اسلام نے اس کو عطا کی۔ اس کا نتیجہ آج یہ ہوا کہ عورتوں کو اپنے حقوق کے مطالبے میں جائز و ناجائز کا امتیاز نہ رہا۔ اگر مرد جائز حق عطا کرتے تو عورتیں ناجائز مطالبہ نہ کرتیں"

اس کے ذمہ دار مرد ہیں ———— [illegible]

"آپ کو شرع اسلام نے اجازت دی تھی کہ آپ عورت کو قبل از نکاح ملاحظہ فرما لیتے۔ اس کے حالات سے باخبر ہوتے۔ اب اگر وہ جاہل یا نا اہل ثابت ہوئی تو فرمائیے اس کی ذمہ داری مرد پر کس قدر ہوگی اور عورت پر کس قدر؟"

عصمت مارچ ۲۹ء

"ماں نہیں باپ۔ جو مجاز شرعی نکاح کا ہے ایسے موقع پر جب بیٹی کسی ایسے شخص کے نکاح میں جا رہی ہو جس کی پہلی بیوی موجود ہے واقعات پر اچھی طرح نظر ڈالے اور دیکھے کہ نکاح کرنے والے کے جو عذر ہیں وہ کس حد تک معقول ہیں۔ اگر عذر معقول ہیں تو خیر ورنہ .... اپنی لڑکی کو کوئیں میں دھکیلنا ہے بلکہ ایک دوسرے کی زندگی برباد کرنی ہے ...... نصیر جس وقت میرے پاس آکر باتیں بناتا ہے تو آگ لگ جاتی ہے کپڑا ایسا اعلیٰ جو بڑے بڑے امیروں کو میسر نہیں۔ بوٹ اتنا قیمتی کہ گویا ہزار روپیہ مہینہ کما رہا ہے مگر گھر میں جا کر دیکھو تو بیوی کے بدن پر ثابت کرتہ نہیں۔ اور بچی کی ٹانگوں میں ڈھنگ کا پاجامہ نہیں۔ ماموں جان اپنی قبر میں انگارے بھر رہے ہیں۔ ...... کیا اس کی بیوی پڑھی لکھی نہیں؟ سینا پرونا نہیں جانتی؟ کھانا پکانا نہیں آتا؟ بچوں والی نہیں؟ شریف نہیں؟ فرماں بردار نہیں؟ کیا نہیں؟ بتاؤ اس میں کیا نقص ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خوب صورت نہیں! ہائے کیسے صدمہ کا وقت ہے کہ مسلمان شریف زادیوں پر بدصورتی کا الزام لگا دیں حسن صورت کے واسطے ملتے ... بازار بھرے پڑے ہیں شریف زادیوں کی صورت [illegible] ہیں کہ تموّل اور افلاس دونوں میں یکساں ہیں"

تربیت نسواں ———— [illegible]

"تم نے عورت کی مٹی پلید کی اور اس کے [illegible] کیا جس کے خیال سے انسانیت لرزتی ہے۔ تمہارا ایمان [illegible] کہ جھوٹے وعدوں اور غلط امیدوں سے ایک معصوم [illegible] کو نکاح میں لاؤ اور جب تمہاری بدولت تمہارے [illegible] طفیل وہ تمہارے بچے بچوں کو دودھ پلا کر یا افکار میں گھل [illegible] صورت سے بے صورت ہو جائے تو تم اس کو ادھر [illegible] دوسری عصمت کو تاکو اور اسلام کی آڑ میں عزے [illegible] مجھے معلوم ہے کہ خود آنجناب کی تین بیویاں موجود ہیں۔ آپ [illegible] حق نہیں کہ کسی معقول آدمی سے اس قسم کی [illegible] خواہش کریں۔ افسوس یہ ہے کہ آپ کے ان افعال پر آپ کی [illegible] یا برادری۔ آپ کا کنبہ یا قوم خوش ہے اور اس لئے وہ [illegible] آپ سے کم سنگدل نہیں۔ ضرورت تھی کہ مسلمان آپ کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے اور اگر ان میں ایمان ہوتا [illegible] آپ کی صورت نہ دیکھتے ..... نص کے خلاف میں کیا کوئی مسلمان نہیں جا سکتا مگر فروعات میں ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہر ضرورت خواہ وہ کسی عنوان کے تحت ہو حالات کے اعتبار سے مکمل ہونی چاہئے ..... نص کی مخالفت کفر ہے لیکن نص کو دھوکا دینا کفر سے بھی زیادہ ہے۔ قرون اولیٰ کی ضرورتیں اور تھیں۔ اس وقت کے حالات اور تھے۔ میں نے آپ حضرات کو اور بالخصوص آنجناب کو کبھی سر منڈاتے ہوئے تہمد باندھے ہوئے کھجوروں سے پیٹ بھرتے ہوئے اور تھپڑ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا ہاں آپ کے نکاحوں کی خبریں میرے کانوں میں برابر پہنچتی رہیں"

(بجنور کی دلہن) ———— [illegible]

"جہاں نکاح کے بعد تھوڑی سی مدت بھی اسی طرح
گزر گئی کہ بیوی کے ہاں بچہ پیدا نہیں ہوا یا دوسرے لفظوں
میں یوں کہئے کہ اس بیوی سے نیت بھر گئی تو بچہ کی آڑ میں
دوسرے نکاح کا اعلان فرما دیا مگر اول تو یہ سمجھ میں نہیں
آیا کہ نکاح کا مقصود بچہ کی پیدائش کیونکر ہو گیا۔ کیا
نکاح کے وقت ایجاب وقبول میں اس قسم کی شرط موجود
ہے؟ (لفظ شرط ملحوظ رہے) کیا بچہ ہونے کی تمام ذمہ داری
صرف عورت پر آسکتی ہے؟"

...... اگر عورت کے ہاں بچہ نہیں ہوا تو وہ
بانجھ ہے اور یہ چیز یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ صبح اٹھ کر
اس کا منہ دیکھنا بھی درست نہیں۔

..... اگر کوئی شخص بدصورت ہے تو کیا وہ اپنی
بدصورتی کا ذمہ دار خود ہے؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ
بچے کے پیدا نہ ہونے میں قصور عورت کا ہے اور وہ اس
قصور کی سزا اتنی سنگین ہو سکتی ہے کہ اس کی عمر غارت کر دی
جائے تو یہ مرد کا کام تھا کہ وہ قبل از نکاح اطمینان کرتا۔
لیڈی ڈاکٹر کو دکھاتا یا اور کوئی ذریعہ اختیار کرتا اور
بدبخت عورت کو بتا دیتا کہ اس نکاح کا مقصد بچہ اور صرف
بچہ ہے۔

...... بچے کے نہ پیدا ہونے کی آڑ میں دوسرا
نکاح کرنا نہ صرف عورت کی انتہائی تحقیر بلکہ حقیقتاً سخت ظلم ہے"

عورت کی انتہائی تحقیر ——— ۱۹۲۶ء

"مجھے اس وقت بھی گنگا کی روانی اور جمنا کے بہاؤ
میں اُن بدبخت عورتوں کی تصویر نظر آرہی ہے جو مردوں
کے مظالم سے زندہ درگور ہوئیں۔ اگرچہ تاج محل تمہاری
نگاہ میں محبت کا ایک لازوال خزانہ ہے اور ایسے جواہرات
سے جگمگا رہا ہے جن کی روشنی کائنات کو مزین کر رہی ہے
مگر میری نگاہ میں دریا کی ان لہروں کے آئینہ میں جو ہر روز
بلکہ ہر لمحہ تاج محل کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہیں۔ بادشاہ
کی اُن بیویوں کی صورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں جو محبت کے
شاہی انعام سے محروم رہیں"

تفسیر عصمت ——— ۱۹۳۵ء

"کثرت ازدواج کے مسئلہ پر میں چالیس سال سے
اور عصمت چھبیس سال سے واویلا کر رہا ہے اور مسلمانوں
کو بتا رہا ہے کہ وہ خاص حالات تھے جن میں مخصوص شرائط
کے ساتھ اسلام نے اس کی اجازت دی اور یہ قریب قریب
نہ دینے کے برابر ہے مگر جب کہ مسلمان ایک ہی بیوی اور اس کے
بچوں کا پیٹ مشکل سے پال سکتے ہیں تو ایک کی موجودگی
میں دوسرا نکاح ایک قسم کی خودکشی ہے"

کیا مسلم خواتین ترقی کر رہی ہیں ——— عالم نسواں ۱۹۳۵ء

"مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تعدد
ازدواج کا ہمیشہ مخالف رہا اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ
دور حاضرہ کا وہ مسلمان جو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسرا
نکاح کرتا ہے خلوص ومحبت کے قریب ہو کر نہیں گذرا۔

..... جس طرح بعض چھوٹی قوم قصوروار کا حقہ پانی
بند کر دیتی ہیں اسی طرح ایسے نفس پرست سے سوسائٹی
کا ملنا جلنا تو درکنار واسطہ تک نہ رکھے سلام تک نہ کرے
لیکن میں اس کے سننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ فیصلہ
قرآنی کے خلاف مسلم خواتین غیر مسلموں کی اعانت طلب
کریں۔ یہ اجازت صرف مسلمانوں کو ہے .... پس اگر
مطالبہ ہو سکتا ہے تو مسلم خواتین کی طرف سے اور مضحکہ
ہو سکتا ہے تو غیر مسلم خواتین کی طرف سے ..... وہ لڑکی
جو نکاح کے وقت سوکن کا علم ہونے پر ہاں کر لیتی ہے مرد
سے کم ذمہ دار نہیں۔ اگر وہ والدین سے مجبور ہے

تو اس کی ماں پیار دلا جائے۔ المختصر اگر مرد ساتھ نہ دیں تو خود عورتیں اس کا انتظام کر سکتی ہیں"

"یہ ان مردوں کو جو بیوی کی موجودگی میں دوسرے نکاح کی خواہش کرتے ہیں اور ان شیروں سے جن کا ابھی ذکر کیا کچھ کم نہیں سمجھتی۔ وہ کھلے ہوئے ڈاکو ہیں یہ چھپے ہوئے۔ وہ دنیوی بدمعاش ہیں یہ شرعی۔ ایک دو نہیں سینکڑوں اور ہزاروں مظلوم لڑکیاں ان دینی مکاروں کی جانوں کو رو رہی ہیں جنھوں نے شرع کے لاسہ سرپان کو پُر قینچ کردیا ...... قرآن نے مرد اور عورت کے تعلقات میں مرد کے ایمان پر شبہ کیا۔ کھلم کھلا اعلان کیا اور بتایا کہ میثاقاً غلیظاً کو یاد رکھو جس کے صرف معنی یہ ہیں کہ نکاح سے پہلے جو گاڑھے اقرار کرتے ہو اور نکاح کے بعد جو مٹی پلید کرتے ہو اس سے باز آؤ۔ مرد کی بے ایمانی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا؟ مشاہدہ بتا رہا ہے کہ میثاقاً غلیظاً کی تلوار سے مرد کس طرح عورت کو ذبح کر رہا ہے"

تین بہنیں ———— ۱۹۳۲ء

سوتیلا باپ

سوتیلی ماں کے مظالم سے کتابیں اخبار رسالے بھرے پڑے ہیں۔ بعض سنگدل مائیں نہایت بے دردی سے سوتیلے بچوں پر ستم توڑتی ہیں اور ایسے عظیم گناہ کی مرتکب ہوتی ہیں جس کی سزا ان کو یقیناً ملے گی وہ آدمی نہیں جانور ہیں۔ اور ہرگز یہ حق نہیں رکھتیں کہ سوسائٹی ان کو وقعت کی نظر سے دیکھے لیکن کیا اس کے ذمہ دار وہ باپ مطلق نہیں ہیں جو بیوی کی محبت میں اندھے ہو کر اپنے بچے، ایک ظالم عورت کے سپرد کردیں اور اس کو اتنا با اختیار کردیں کہ وہ جو جی چاہے کر سکے؟

علاوہ ازیں قابل مصنف اور لائق مضمون نگار

سوانح عمری علامہ راشد الخیری

جو آئے دن سوتیلی ماؤں کا رونا روتے ہیں کبھی ... کی طرف بھی توجہ فرماتے ہیں؟ وہ عورت کی ... پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کرنے کو موجود ہیں لیکن ... نقائص ان کو نہیں دکھائی دیتے"

بن باپ کا بچہ ———— عصمت ...

"آپ نے سوتیلی ماں کی داستانیں تو خوب ... اور عورت کے مظالم کی پیٹ بھر کر خاک اڑائی مگر کبھی ... طرف بھی توجہ فرمائی کہ سوتیلے باپ کا سلوک کیا ہوتا ہے ... آپ نکاح کی تاکید ثواب سمجھتے ہیں مگر کیا آپ فرما سکتے ہیں ... کہ ان میں سے دس فیصدی بھی ایسے ہوئے ہیں جہاں ... شوہر کی اولاد کا مستقبل درست ہوگیا ہو"

پھیرن کا جھولا ———— ...

کہنی کی چوٹ

"وہی خاوند جو بیوی کے مرنے ... اپنی موت بہتر سمجھتا تھا دوسری بیوی کی تلاش کرنے لگا ...... شام کو یہ ذکر سید کاظم کے سامنے کیا گیا۔ وہ نکاح پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا فوراً راضی ہوگیا۔ بلا تامل ہاں کرلی شاہدہ سے کہہ دیا کہ جو ... جانے کو کہہ رہی ہو۔ کل ہی چلی جاؤ اور اپنے سامنے پکی کراؤ

(صالحات) ———— ۱۸۹۶ء

صالحہ کے حالات سن کر جہاں دل بے قرار ہوتا ہے وہاں بے اختیار یہ دعا بھی دل سے نکلتی ہے کہ اے ارحم الراحمین دشمن کے بچوں کو بھی بے ماں کا نہ کیجو۔ وہی باپ جو بیٹی پر جان نثار کرتا تھا۔ بیوی کے پھندے میں ایسا گرفتار ہوا کہ پھر بھول کر بھی نام نہ لیا۔ وہی سید کاظم جو بچوں کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا بیوی کے بعد ایسا بے رحم ہوگیا کہ آدھی آدھی رات کو سوتے بچوں کی کھال اُدھیڑ دی۔

صالحات ———— ۱۸۹۶ء

مرنے والی بیوی کے بچوں کی بربادی کا ذمہ دار زیادہ تر مرد ہے۔ سوتیلی ماں کا دامن الزام سے صاف تو نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس کی زیادتی ثابت ہو جائے تو بھی یہ وہ زیادتی ہوگی کہ اگر باپ لاپرواہی نہ کرتا تو سوتیلی ماں یہ زیادتی نہ کر سکتی تھی اور اس کا تدارک باپ کے اختیار سے باہر نہ تھا۔"

دیباچہ آٹھواں اڈیشن نوحۂ زندگی

طلاق آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ بیوی کو طلاق دی اور جھٹ رجوع کر لیا۔ . . . ایک صورت یہ بھی درپیش ہے کہ عورت کو اس غرض سے روک لیا کہ وہ ماما کی حیثیت سے کام کرے۔ طلاق تو دیدی پھر خیال آیا کہ ماما کو جو تنخواہ دار ملازمہ ہے کیا ضرورت ہے کہ اپنا گھر بار تعلقات چھوڑ دن رات ہمارے ہاں پڑی رہے گی۔ یہ نکاح میں رہے گی تو مفت کی نوکر ہوگی۔ پھٹا پرانا کپڑا دیدیا۔ روکھی سوکھی روٹی دیدی اور مفت کی خدمت لی۔ دوسرا نکاح کیا تو بیوی کے واسطے ایک بے تنخواہ کی نوکر موجود ہے۔ بچے ہو گئے تو ان کے پالنے اور بہلانے کو ایک خدمت گار۔ اور خدمت گار بھی کیسا جو سخت سے سخت اذیت میں بھی نوکری چھوڑنے کا نام نہیں لے سکتا ہر لمحہ حاضر ہے۔ ان مظالم کی روک تھام کے واسطے یہ ارشاد باری ہے "ان کو نقصان پہنچانے کا خیال نہ ہو بلکہ ان کے حال کی اصلاح ہو"

. . . . . . تین طلاقوں کے بعد رجوع نہیں ہو سکتا اور ان تین طلاقوں کی مدت بھی مقرر کر دی تاکہ عورت مرد کی قید سے آزاد ہو کر جہاں پسند کرے اور جس سے چاہے نکاح کرے یہ نہ ہو کہ طلاق بھی دیدی اور چھوڑتے بھی نہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ مرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ نکاح کر لیا جوڑا بھی چڑھا دیا۔ زیور بھی دیا اور چند روز رکھ کر اپنا مال چھین طلاق دے نکال باہر کیا بلکہ ان کو جو کچھ دیدیا وہ ان کی ملکیت ہے اور مہر کی بھی وہ مالک ہیں البتہ ایک صورت جس میں عورت مہر کی مالک نہیں رہتی بلکہ مہر کے علاوہ اپنے پاس سے دیتی ہے وہ خلع ہے"

احکام نسواں

خلع خلع کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح مرد عورت کو طلاق دیتا ہے اسی طرح عورت اپنے شوہر سے خوش نہیں ہے تو وہ اس سے قطع تعلق کر سکتی ہے اور اگر وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتی تو فوراً قاضی کے پاس جا کر خلع کی درخواست دے اور قاضی یہ حق رکھتا ہے کہ مرد عورت کا خلع کرا دے۔

یہ خیال کہ مرد عورت کی رضامندی سے خلع ہو سکتا ہے بالکل غلط ہے۔ مرد تو خلع پر کبھی رضامند ہی نہ ہوگا۔ اس کا کیا بگڑتا ہے عورت گھر میں پڑی ہے۔ پڑی رہے۔ اس لئے اسلام نے جس طرح مرد کے حقوق کا لحاظ کیا اسی طرح عورت کے اور اس کو خلع کی اجازت دی اور چونکہ مرد کو طلاق دیتے وقت عورت کا مال دینے کا حکم ہے اس لئے عورت کو یہ بھی حکم ہے کہ جو کچھ مرد سے لیا ہے وہ واپس کرے اور خود بھی کچھ دے سکتی ہے تو دے کر قصہ ختم کرے۔

ایک عورت جس کا نام جمیلہ بنت عبداللہ تھا اپنے شوہر ثابت بن قیس سے خوش نہ تھی وہ جمیلہ سے بہت محبت کرتا تھا مگر جمیلہ اس سے بیزار تھی۔ اور امید نہ تھی کہ دونوں زندگیاں اچھی طرح گذر سکیں۔ ایک روز جمیلہ حضور اکرم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا حضور مجھے اندیشہ ہے کہ میں اپنے حقوق کی ادائیگی میں پوری نہ اتروں اور اس طرح خدا کے ہاں گناہ میں پکڑی جاؤں

آپ میرا خلع کرا دیجئے [illegible] مجھ کو میرے شوہر ثابت بن قیس
سے جدا کر دیجئے۔ حضور کو جب یہ معلوم ہوا کہ ثابت اس سے
محبت کرتا ہے تو آپ نے جمیلہ کو سمجھایا مگر وہ خلع پر اڑی
رہی۔ ثابت نے کہا میں نے اس کو باغ دیا ہے۔ جمیلہ نے
کہا تو وہ باغ بھی دیدو اس کے ساتھ اور بھی کچھ لو مگر خدا
کے واسطے مجھ کو چھوڑ دو۔ حضور اکرم نے فرمایا تمہیں کچھ
اور دینے کی ضرورت نہیں ان کا باغ واپس کر دو۔ چنانچہ
اس عورت نے اس کا باغ واپس کر دیا اور خلع ہو گیا۔
اسلام میں یہ پہلا خلع ہے جس میں عورت نے بیوی کی
حیثیت سے مرد سے قطع تعلق کر لیا"

احکام نسواں ————

"مگر ان کا طرز عمل بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہ
مذہب کے اصول سے دور ہیں اور صرف خود غرضی ان کا
مذہب ہے اور خواہش نفس ان کا ایمان۔ طلاق کا
استعمال نہایت بیجا اور نامناسب ہے خلع جو طلاق کے
مقابلہ میں عورت کا حق تھا وہ غصب کر لیا گیا ہے۔
بیوہ کا نکاح مذموم ہے۔ المختصر مشرقی مسلمان عورت کی
حالت ایسی قابل رحم ہے کہ اگر تمام ہندوستان ان پر
آنسو بہائے تو ان کی تکلیف کم نہیں ہو سکتی"

پریوں کی محفل ———— تمدن [illegible]

خلع جو اسلامی زندگی کا صریح حکم اور عورت کا سب
سے بڑا محافظ تھا مسلمان اس کو مسلمان ہو کر اور مسلمان
بن کر صاف ہضم کر گئے۔ اور محض اپنی نفس پروری کے
بہنوں کے بھائی اور بیٹیوں کے باپ بیوی کو رعیت بنا چکے
.... اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا اور فقط میری کون
سن لے گا مزا یہ ہے کہ مسلمان دنیا بھر کے رواجوں کو پیٹتے
ہیں اور یہ نہیں بتاتے کہ طلاق کے مقابلہ میں خلع نے

عورت کا جائز حق تھا کتنی بیویوں کو شوہر کے مظالم سے آزاد کیا؟

سبزک ———— [illegible]

"پٹھان مذہب سمجھ رہا تھا کہ دنیا بھر کے مسلمان [illegible]
ہیں اور شرع اسلام کے ماتحت [illegible] طلاق [illegible]
[illegible] طلاق دے [illegible] کیا۔ مرد [illegible] بدمعاش ہوا [illegible]
[illegible] چھوڑا یا اس کے ظلم [illegible] تھا ہندوستان۔
.... یہاں کے کروڑوں مسلمان ترقی کی صدائیں [illegible]
رہے ہیں مگر کیسے ایماندار لوگ ہیں کہ عورت کا حق خلع جو
مذہب نے اس کو عطا کیا ایسا [illegible] اس طرح ہضم اور [illegible]
کیا کہ اس کا نام لینا بھی گناہ خیال کیا جاتا ہے اور ایک
نہیں ہزاروں زندگیاں تباہ و برباد ہو گئیں"

جہاں عالم ———— [illegible]

"طلاق اور خلع دونوں برابر کے حق تھے۔ طلاق مرد
کا حق تھا۔ خلع عورت کا۔ آج کہ مسلمان عورت کا حق غصب
کر چکے اور تمام ہندوستان میں خلع کا نام تک نہیں مرد
کو اس سے فائدہ اٹھانے کا کہاں تک حق حاصل ہے [illegible]
چھوڑ کر بھی میرے دماغ نے طلاق کی جو وجوہ قائم کیں۔
ان میں ایک بھی ایسی نہیں جو مجھ میں ہیں یا میں نے کبھی
اس کا ارتکاب کیا ہو"

سیلاب اشک ———— عصمت [illegible]

"مسلمان عورت کی آزادی اگر نکاح سے سلب ہوتی
تو اس کا جرم اس کے سوا کوئی نہیں کہ وہ مسلمان ماں
باپ کے ہاں پیدا ہوئی ..... لیکن مسلمان عورت کا نکاح
اس کو قید کرتا ہے اور وہ شوہر کی محکوم ہو کر اپنی آزادی
اور حقوق کا خاتمہ کر لی ہے ...... آپ میرا [illegible]
خلع کو جو میرا مذہبی حق ہے اور جس نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت
کو اسلام نے قید نہیں کیا اگر نامنظور کرتے ہیں تو میرے

س اس کے سوا چارہ نہیں کہ میں اسلام کو چھوڑ کر یہودی
ہو گئی اور احکام اسلام کے موافق میرا نکاح فسخ ہو چکا"

تفسیر عصمت ——————— ۲۵ء

"اتنا ہے کہ ہندوستانی کمرۂ نکاح میں دو دلھن کو لے کر
ولی اور وقت آیا کہ ایک مسلمان لڑکی حقوق نسواں کے
غاصب مردوں کی بدولت آغوش اسلام سے نکل کر یہودی
کی نکاح میں جائے"

تفسیر عصمت ——————— ۲۵ء

"مسلمان عورت کو اتنا ذلیل و حقیر نہ سمجھیں جتنا
مولویوں اور اکثر مسلمانوں نے ان کو سمجھا ہے بلکہ وہ اس
عزت و احترام کی مستحق ہے جو مذہب مقدس یعنی اسلام نے
اس کو عطا فرمایا ہے۔ خلع اس کا جائز حق ہے اور ہم کو اس کے
روکنے کا اختیار نہیں"

تفسیر عصمت ——————— ۲۸ء

"مسلمان جس طرح آج اپنا تمام رنگ و روپ کھو کر
بے بال و پر نظر آتے ہیں اس طرح عورت کے معاملہ میں
نہایت ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں خلع عورت کا شرعی
حق تھا اور قرون اولیٰ میں عورت کا اس سے علی الاعلان
متمتع ہونے کا واقعہ سرور کائنات سے اس کا مکالمہ۔
عورت کی آزادی اور حق خلع کا زندہ ثبوت ہے لیکن آج
اہل قرآن۔ اہل حدیث حنفی مالکی شافعی سنی شیعہ
وغیرہ مسلمانوں کا کونسا گروہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے
ہندوستان میں عورت کو اس جائز حق سے محروم نہیں کیا۔
. . . . . . شوہر کے مظالم سے تنگ ہو کر
جب بیوی کو شرعی پناہ یعنی خلع میسر نہ ہوا تو
اس نے فسخ نکاح کی طرف رجوع کیا اور شوہر کے
پنجے سے رہائی پانے کے واسطے ارتداد کے سوا کوئی اور

صورت نظر نہ آئی"

خلع اور ارتداد ——————— تنظیم امرتسر ۲۳ء

"داماد صاحب مہینہ بھر کے قریب میرے ہاں مہمان
رہے۔ میں نے ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا
مگر اللہ کے بندے کی سمجھ میں کوئی خدمت نہ آئی اور جب
بولا تو یہی بولا کہ شرع میں عورت مرد کی لونڈی اور جب
شادی ہو گئی تو ماں باپ لڑکی کے بالکل غیر ہیں"

خلع کی ضرورت ——————— مدینہ ۲۲ء

"مہر کی تو مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ کون مانگتا ہے اور
کون دیتا ہے۔ طلاق دیتے ہیں گدھے۔ عورت ناپسند
ہوئی صورت نہ دیکھی۔ ادھر میں لٹکتی رہی"

خلع کی ضرورت ——————— ۲۴ء

"خلع کی تائید میں ہر ممکن کوشش سے کام لیا گیا
مگر ہمارے سب جج صاحب متوجہ نہ ہوئے۔ جب وہ
رات آئی جس کی صبح قیصر کے مستقبل کا فیصلہ کرتی تو اس کے
باپ کی درخواست پر دلی کا وہ گنہگار جو حقوق نسواں کی
حمایت میں کافر بن چکا ہے۔ جج صاحب کی خدمت میں
حاضر ہوا اور عرض کیا "میں اور آپ زمانہ طالب علمی میں
برسوں ساتھ رہے مگر مفتی ہونے کے بعد میں نے آپ سے
تعلقات قائم رکھنے ضروری نہ سمجھے۔ آج گیارہ سال بعد
آپ سے گفتگو کر رہا ہوں اور بصد ادب عرض کرتا ہوں کہ اگر
قیصر کو آپ نے اس کے جائز حق سے محروم کیا اور وہ چیز
جو اسلام نے مرحمت فرمائی آپ نے غصب کی تو نتیجہ کی
ذمہ داری آپ پر ہوگی"

اس مفتی نے مسکرا کر کہا "مولانا آپ کا فرمانا
درست مگر اتنا تو سمجھئے آج اگر میں خلع کو جائز کر دوں تو
ہندوستان میں آگ لگ جائے گی۔ عورتیں قبضہ میں

شدہ ہی کی۔ ہزاروں دوسے عائد ہوں گے اور مسلمانوں کا
اطمینان بے اطمینانی سے بدل جائے گا۔

اس زمانہ کا مشہور اخبار کرزن گزٹ تھا۔ جو دلی
سے شائع ہوتا تھا دس بجے سے پہلے اس کی ایک غیر معمولی
اشاعت نے قیصر کے ارتداد کا اعلان کیا اور مس قلب
کی تصدیق ارتداد سے نج صاحب کی اس زبان کو۔ جو
زوجیت کی ڈگری کرنے والی تھی خاموش کر دیا۔
ارتداد فرض تھا چند روز بعد قیصر کی شادی
ایک نہایت مشہور علمی شخص سے ہوئی۔ آج قیصر۔
حکیم۔ نج سب قبروں میں ہیں مگر قیصر کا بڑا لڑکا۔ جو
بی اے ایل ایل بی ہے اس سفتی کو دعائیں دیتا ہے کیونکہ
اس کے آنسو کسی طرح بھی ماں کے دھبے کو نہیں دھو سکتے"

تمدن شیطانی ـــــــــــــــ ۳۵ء

"کئی سال کا ذکر ہے۔ ایک خاندان پر ایسی ہی
مصیبت نازل ہوئی۔ شوہر کی طرف سے زوجیت کا اور
بیوی کی طرف سے خلع کا دعوی دائر ہوا۔ نج انگریز تھا۔
اس نے اس خیال سے کہ ایسے بڑے خاندان کا شرعی
مقدمہ مسلمان کا فیصلہ بہتر ہوگا۔ مقدمہ ایک مسلمان
جج کے سپرد کیا۔ یہ مسلمان نج میرے ہم جماعت تھے میں نے
اُن سے اس معاملہ میں گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا۔ خلع
کا رواج دور اندیشی سے بعید ہے"
اس مقدمہ کا نتیجہ ابتدائی نہایت دلخراش ہوا
یعنی لڑکی کو کچھ روز کے واسطے اسلام چھوڑنا پڑا"

خلع کی ضرورت ـــــــــــــــ مدینہ ۱۹۳۲ء

"انسداد ارتداد کی صدا سرزمین پنجاب سے بلند
ہوئی ہے یعنی وہ سرزمین جہاں مردنے عورت کا حق وراثت
اور خدائی فیصلہ ٹھکرا کر رواج کو غالب قرار دیا۔ وہ

حضرات جو اس وقت مرتدہ کے فسخ نکاح پر داویلا مچا
رہے ہیں کیا اس سے پہلے ان مقدمات کے دیکھنے سے
بھی متاثر ہوئے ہیں جن میں اس کے ترکہ پدری کو خاک
میں ملا کر رواجی قانون نے احکام الٰہی کی توہین کی

انسداد ارتداد ـــــــــــــــ انقلاب ۱۹۳۲ء

"مسلمان عورت کو ارتداد کے دروازہ تک مرد
اور صرف مرد نے پہونچایا۔ اگر اس کے حقوق پامال نہ
ہوتے اگر اس کو خلع جو اسلام نے عطا فرمایا تھا غصب
نہ ہوتا۔ تو یقیناً مسلمان مرد کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اور
اب بھی مسلمان مرد عورت کے مشورہ بغیر محض اپنی طاقت
سے اس کو روک سکا تو خاکم بدہن اس کوشش میں
کامیاب ہونے والا مرد زیادہ نہیں ایک نصف صدی میں
یہ دن دیکھے گا کہ نکاح معاشرت اسلامی سے رخصت
ہوا اور جس طرح ارتداد کی ذمہ داری مسلمان مرد پر ہے
اسی طرح انسداد ارتداد کی ہر تجویز جو بغیر عورت کے مشورہ
کے کامیاب سمجھی جائے گی حقیقتاً نکاح کے فنا ہونے کا
پیش خیمہ ہوگی"

انسداد ارتداد ـــــــــــــــ ۳۴ء

دلی کے ایک نہایت معزز شریف خاندان کی
سیدانی بیوہ ہوتی ہے۔ سال گذشتہ میں ایک
صاحب دھوکہ دے کر نکاح کر لیتے ہیں اُس کا اور اس کی
یتیم چھ سالہ بچی کا زیور کھا جاتے ہیں اور اس کے مکان
پر جو اس کا ذاتی ہے پانسو روپیہ قرض لیتے ہیں۔ اور
مجبور کرتے ہیں کہ اور دلوا۔ مارتے ہیں پیٹتے ہیں اور ایک
عیسائی عورت ارتداد کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ واقعہ چند
روز کا ہے۔ میں خاندان کا نام لوں گا تو آپ تھرا
اُٹھیں گے کہ دلی کے کس خاندان پر کیا بجلی گرنے والی

عورت عیسائیوں سے آریوں کے پھندے میں پہنچی آج چوتھا
روز ہے کہ مجھے اطلاع ملی آپ یا اور مسلمان مجھے جو چاہے
سمجھیں مگر میں اپنے دل سے مجبور ہوں مجھکو سو مردوں
کے ارتداد کا اتنا صدمہ نہیں ہوتا جس قدر ایک مسلمان
عورت کے ارتداد کا۔ اصغری بیگم بدبخت نے مجھکو دیوانہ
کر دیا تھا۔ میں اس عورت کو جس کے خاندان کا نام لینا
اس جلیل القدر خاندان کی توہین ہے مناسب نہیں سمجھتا
انشاء اللہ کل اس کے متعلق اخبارات کو لکھوں گا۔ المختصر
کسی نہ کسی طرح اس کو تربیت گاہ میں لایا اور اس وقت
وہ یہاں موجود ہے اس مردود سے حاملہ ہے صبح و شام
وضع حمل کا وقت ہے۔ اب فرمائیے اگر میں خلع کا مطالبہ
کرتا ہوں تو کیا غلط ہے؟ کیا شرع اسلام نے اس کو
پناہ نہ دی تھی ضرور دی تھی مگر ہم نے اس کی پناہ چھین لی!
(عصمت مارچ ۲۹ء صفحہ ۱۵۹-۱۶۰)

"مسلم لیگ جگر اؤں کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ
مذہب مقدس نے اس کو خلع کا حق بھی عطا فرمایا تھا۔
لیکن آج ہندوستان کی کس قدر مظلوم و بے بس
عورتیں اس حق سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ جب مسلمان
اس حق کو غصب کر گئے تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ
ارتداد کی پناہ میں جائے اور پیچھا چھڑائے"

ارتداد کا علاج ——— انقلاب ۲۸ء

"ایک مسلمان عورت کے ارتداد کا صدمہ مجھکو
ہزار مسلمان مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ . . . . .
مسلمان اگر ارتداد کا واقعی علاج کرنا چاہتے ہیں تو ان کا
پہلا فرض یہ ہے کہ عورت کے اس حق کو جو شارع علیہ
اسلام نے عطا فرمایا تھا تسلیم کریں اور محض اپنی
خود غرضی سے سیکڑوں ہزاروں مسلمان لڑکیوں کو
جو ظالم شوہروں کی بدولت تباہ و برباد ہو گئی ہیں موت
کے گھاٹ نہ اتاریں"

ارتداد کا علاج ——— انقلاب ۲۸ء

"مسلمان عورت کے ارتداد سے اگر حقیقتاً مسلمان
متاثر ہوئے ہیں اور اس کا ارتداد ان پر بجلی بن کر گرتا ہے
تو وہ خلع جو حق غصب شدہ ہے واپس کریں۔ . . . .
. . . میں ممبران اسمبلی سے التجا کرتا ہوں کہ وہ بجائے
تضیع اوقات کے اس قانون کی طرف بھی توجہ فرمائیں
جس نے خدائی احکام کے خلاف مسلمان لڑکی کو ترکہ
پدری سے محروم کیا اور رواج کو ایمان سمجھا۔
ہے کوئی اللہ کا بندہ جو اس التجا پر متوجہ ہو"

پھر وہی خلع کا رونا ——— ۳۳ء

". . . . عورت نے اپنے بچے اسلام پر قربان کئے تھے
اور اپنی راحت و آسائش مٹا کر مرد کے دوش بدوش میدان
جنگ کو اپنی خدمات سے کامیاب بنایا تھا۔ لیکن کیا
مسلمان اس کا جواب عطا فرمائیں گے کہ انھوں نے
اپنی تمام عمر کتنی مسلمان عورتوں کو خلع کے حق سے متمتع
ہوتے دیکھا؟ ان کے صوبوں میں کتنے مردوں نے
طلاقیں دیں اور کتنی عورتیں خلع حاصل کر سکیں؟"

میری دوسری پیشینگوئی ——— عصمت ۳۱ء

"میں نے آج سے قریب قریب پینتس سال قبل
یہ پیشینگوئی کی تھی کہ مسلمان مذہب کی آڑ میں اگر اس طرح
عورت کو پر تینچ بنا کر گھونٹے رکھیں گے اور اس کے
حقوق نہ دیں گے تو وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ گو ان کی مقابل
ایک کمزور ہستی ہے مگر حقیقتاً وہ مقابلہ اس کا کر رہے ہیں
جو عرب کی سنگلاخ زمین کو گلزار بنا دیا. . . . وہ اس
لچکدار کمانی کو آج پاؤں سے دبالیں مگر جس وقت یہ

کر فقط ذلیل ہوگی تو یہ کمانی آسمان اور زمین میں گھسے گی۔
منہ پر آ سکے گی اور کلا جبڑا سب توڑ دے گی . . . . . .

میں نے ہمیشہ قول سے زیادہ عمل کی کوشش کی ہے اور
اور محض لفاظی سے کام نہیں لیا ہے۔ اس مصیبت کا
علاج میں نے ساتھ ہی ساتھ بتا دیا اور یہ منت مسلمانوں
سے التجا کی تھی کہ وہ خدارا لڑکیوں کے نصاب میں مذہب
کو داخل کر دیں اور جس قدر زیادہ ممکن ہوں ایسے مدارس
قائم کریں جہاں دنیوی تعلیم کے ساتھ دین بھی ہو۔ . .

. . . . . آج میں علی الاعلان دوسری پیشینگوئی کرتا ہوں
اور کہہ دیتا ہوں کہ زیادہ نہیں نصف صدی کے بعد
جو زندہ ہوگا وہ دیکھ لے گا کہ یہ الفاظ کس طرح پورے
ہوتے ہیں۔

اگر مسلمان عورت کو خلع نہ دیا گیا اور جو چیز مرد
اس سے چھین چکا واپس نہ کی گئی تو مسلمان عورت نکاح
اسلامی کو قید سمجھے گی اور اس کا یقین یہ ہوگا کہ نکاح نہ
صرف اس کی آزادی کا خاتمہ ہے بلکہ ان جرائم کی سزا
ہے جو اس نے کنوارپنے میں کئے اور وہ شرع اسلام کے
مطابق گھر کی ملکہ بننے کو نہیں ایک مرد کی لونڈی بننے
کو جا رہی ہے"

میری دوسری پیشینگوئی ——— عصمت ۱۹۳۱ء

"عورت جب یہ دیکھتی ہے کہ اس کے پاؤں میں
اس کے مذہب نے غلامی کی زنجیریں ڈال دیں تو مذہب
ایک خوفناک صورت میں اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے
اس پر جب وہ سنتی ہے اور پڑھتی ہے کہ اسلام نے سب
سے زیادہ عورت کی حمایت لی تو اس کے زخم پر نمک سے
لگتے ہیں اور وہ اصغری بیگم کی صورت میں سشن جج
کے سامنے یہ کہنے پر مجبور ہوتی ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب

ہے جس نے عورت کو مطلق پناہ نہ دی اور اب مجھے اسلام
چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

. . . . مسلمان اگر ارتداد کو روکنا چاہتے ہیں
ان کا پہلا کام یہ ہے کہ اس وقت جبکہ مسلمانوں [illegible]
اور مرد کے حقوق کو اچھی طرح سمجھنے والی عورتیں پیدا ہوئی
ہیں ان کو مشوروں میں شریک کریں اور اس مصیبت
کا علاج جہاں خود سوچیں وہاں اُن سے بھی پوچھیں
کیا کرنا چاہیے"

انسداد ارتداد ——— انقلاب ۱۹۳۲ء

"مسلمان عورت پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے
وہ مسلمان مرد کی ہر اعتبار سے شرع اسلام کے [illegible]
خلاف محکوم رہی اور اس کی زندگی کا مقصد [illegible]
صرف شوہر کی اطاعت رہا۔ لیکن یہ دور ختم ہو چکا [illegible]
مسلمان عورت اتنے غوطے کھا کر ابھری ہے کہ اب مرد
اُس کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایک
مسلمان عورت کی زندگی محض اس لئے تاراج ہوتی
ہے کہ وہ اسلامی نکاح کی زنجیروں میں جکڑ دی جاتی ہے
اور اس کے واسطے کوئی پناہ نہیں ہے۔ اس کا کام [illegible]
کہ اس نے نکاح کی غلطی کی ہے یہ رہ جاتا ہے کہ نکاح
نے جس شخص کو اس کا خدا بنا دیا ہے اس کی قیدی
بن جائے۔ اور ظلم سہتے سہتے مر جائے کیا عقل سلیم اس
ظلم کو تسلیم کرے گی کہ وہ اپنے فطری حقوق کے تحفظ کی
کوئی صورت اختیار کرے تو اس حفاظت کے خلاف جو
کوشش کی جائے صحیح ہے — جو لوگ مرتدہ کے
تنسیخ نکاح سے متاثر ہوتے ہیں اور قوانین و مسودات
تیار فرمانے کی کوشش کرتے ہیں وہ کیوں نہیں ٹھنڈے
دل سے اس کا وہ عقدہ حل کرتے جو شرع اسلام

اس کو عطا کر چکی ہے یعنی خلع"

فسخ نکاح ——————— عصمت ۱۹۳۲ء

"مسلمان بیوی جس طرح پچاس سال پہلے ظالم شوہر کے پنجہ میں پھنسی ہوئی تھی اسی طرح آج بھی گرفتار ہے۔ یہ خیال کہ وہ اپنے حقوق سے متمتع ہو رہی ہے قطعاً غلط ہے۔ بیوی کو ساتھ لے کر سینما چلے جانا اور برابر بٹھا کر ہوا خوری کو نکل جانا مرد کی نفسانیت کا ثبوت ہے نہ کہ عورت کی ترقی کا۔

اس بدبخت ہستی کی دردانگیز داستانیں اب بھی بدستور کانوں میں پہنچ رہی ہیں اسلام نے اس کے حقوق کی تقسیم کے بعد نااتفاقی کا علاج خلع رکھا تھا مگر مرد نے طلاق کو قائم رکھ کر خلع کو اڑا دیا اور اب بھی اسی پر مصر ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ان بدبختوں کا ایک پورا گروہ سفاک مردوں کی جان کو بیٹھا رو رہا ہے۔ اس کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا اور ہو رہا ہے کہ عورت بدرجہ مجبوری ارتداد کی طرف رخ کرتی ہے لیکن اس سے بھی ظالم مرد کی آنکھ نہیں کھلتی۔ اصغری کا ارتداد اگر مرد حقیقتاً مسلمان ہوتا اس کے واسطے ایک تازیانہ تھا"

عالم نسواں ——————— ۱۹۳۴ء

"آجکل مسلمانوں کے کم پرچے ہوں گے جو عورت کے ارتداد پر واویلا نہ فرما رہے ہوں جو کچھ میں نے شروع میں یعنی پینتیس سال پہلے بصد ادب عرض کیا تھا کہ اس کا علاج خلع کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب اس پر عمل درآمد کی تجویز ہو رہی ہے کیا اچھا ہوتا کہ مسلمان اس سے پہلے متوجہ ہوتے۔ میں نے اس سلسلہ میں پنجاب یوپی اور سی پی کی دربدر خاک چھانی بعض ممبران کونسل اور اسمبلی سے بہ منت التجا کی مگر ایک اللہ کے بندے نے میری التجا قبول نہ کی اور بالآخر مجھ کو علی الاعلان کہہ دینا پڑا کہ مسلمانوں کو خلع کا حق دینا پڑے گا مگر انتہائی ذلت و رسوائی کے بعد۔ وہ بھی دینا نہیں پڑیگا بلکہ عورت اپنے طاقت کے زور سے لے گی اور سرنگوں مرد کو اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ وہ فرمان خداوندی اور عطیہ رسالت کے سامنے گردن جھکا دے ...... ارتداد کی مصیبت عورت کے سر پر مرد کی لائی ہوئی ہے۔ اگر وہ ارشاد خداوندی کے موجب "میثاقاً غلیظاً" پر قائم رہتا اور گھر کی ملکہ سمجھ کر اس کے حقوق ادا کرتا اور اس کی وہ شخصیت جو مذہب مقدس نے عطا فرمائی تسلیم کرتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی"

مسلمان مرد کی خود غرضی ——————— عصمت ۱۹۳۳ء

مہر "مہر بھی اس واسطے مقرر کیا گیا ہے کہ روپیہ صرف کیا جائے ...... اس آیت میں صاف موجود ہے اَن تَبتَغُوا بِاَموَالِکُم یعنی اپنے مال صرف کر کے ان کو حاصل کرو ...... شادی حیثیت کے موافق جو میسر ہو دولھن کو زیور کپڑا وغیرہ دولہا دیتا ہے۔ لیکن مسلمان ان چیزوں کو "رسم" قرار دے کر یہ چاہتے ہیں چھوہاروں پہ نکاح ہو کر معاملہ ختم ہو جائے حالانکہ ان مبارک آیتوں میں خود خدا نے عورت کے احترام کی تاکید کر دی اور فقط زبانی عزت کی نہیں بلکہ مال صرف کرنے کا حکم دے رہا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان احکام کی موجودگی میں روپیہ صرف کرنے کی ممانعت عورت کی عزت کو کم کرنا اور خدا کے حکم کو جھٹلانا ہے۔ اگر روپیہ نہ ہو تو قرض دام کر کے اٹھانا بے شک غلطی ہے لیکن جو آسانی سے صرف کر سکتے ہیں ان کو ہرگز لاپرواہی نہ کرنی چاہیے اور خدا کے اس حکم کے موافق لڑکی کی پوری توقیر کرنی چاہیے اور جوڑا چڑھاوا جو کچھ بلا دقت ممکن ہو دولہا کو دولھن کے واسطے پیش کرنا چاہیے۔

ایک سب سے بڑی بات اس تحفہ میں یہ ہے کہ تمام برادری اور جماعت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس

نکاح میں دولہا کی خواہش کس قدر ہے۔ بیچاری لڑکی کے نہیں پوچھی محض دولہا کی خواہش اور ا[illegible] پر نکاح ہوا ہے۔ اس طرح برادری میں دولھن کی عزت اور احترام قائم ہوگا اور تمام کنبہ اور خاندان اُس کی عزت کرے گا اس کی اولاد باپ کے مال کی حقیقی وارث ہوگی اور یہ ہو کو جو ہزار برس کی غو کہلاتی ہے کہ اس بنیاد پر خاندان کی عمارت تیار ہوگی کنبہ کی طرف سے پوری وقعت حاصل ہوجائے۔

ولیمہ کی دعوت بھی حضور اکرمؐ نے اسی واسطے مقرر فرمائی ہے کہ سارے کنبہ کو علم ہوجائے اور عورت کی عزت میں کسی قسم کی کسر باقی نہ رہے۔۔۔۔ ایجاب و قبول کا بھی یہی مطلب ہے کہ لوگ نکاح کے گواہ بن جائیں تاکہ مرد جس وقت طوطے کی طرح دیدے بدلے تو گواہ اس کا منہ توڑ سکیں اور نکاح کے ساتھ مہر کی گواہی دے سکیں"

——— احکام نسواں

"مہر کے متعلق حکم ہے" ان کے مہر ادا کردو۔ جو واجبی دینا ہے"

افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں میں مہر بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور شاید ۱۵-۲۰ فیصدی مرد بھی ایسے نہ ہوں گے جو مہر ادا کرتے ہیں۔ اعلیٰ تو معافی کا مسئلہ ان کے پاس موجود ہے اگر بیوی مرگئی تو فرما دیا" مہر معاف کرگئی ہے" اس معاملہ میں ایک یہ چیز پیدا ہوگئی ہے کہ مردوں نے جن میں بعض مولوی بھی شامل ہیں عورتوں کو یہ یقین دلایا ہے کہ معاف کرنے والی کو دنیا بھر کا ثواب ملے گا اور شاید دوزخ کی آگ بھی اس پر حرام ہے ۔۔۔۔ مہر کا کہیں نام بھی آتا ہے تو لڑائی جھگڑوں میں ورنہ میاں بیوی نے بڑی بھلی زندگی بسر کی اور دو چار بچے چھوڑ چھلا میاں چلتے ہوئے۔ اب بیوی [illegible] کس سے لیں۔ شوہر نے جو کچھ چھوڑا اس کے [illegible] ہیں۔ بچوں سے کیا لیں۔ غرض وہ مہر جس کا [illegible] یہ کچھ طومار بندھ رہا تھا اور جھگڑے ہو رہے تھے [illegible] ہی ختم ہوگیا۔ اب کون دے اور کون لے

مسلمانوں میں بی بی فاطمہ کا مہر بھی داخل ثواب [illegible] کاش یہ اللہ کے بندے اتنا بھی سمجھ لیں کہ مہر حیثیت سے زیادہ باندھنا ایک دھوکہ ہے۔ مہر ہمیشہ اتنا ہو [illegible] جو آدمی آسانی سے ادا کرسکے۔ بی بی فاطمہ کے نکاح کے وقت حضرت علیؓ کی مالی حالت کیا تھی۔ پانی [illegible] ایک کھجور فی ڈول تو اُجرت لیتے تھے۔ اور یہی [illegible] ہے۔ اس پر مہر کی زیادتی نہ وہ خود جائز سمجھتے تھے نہ حضور اکرمؐ اس کو پسند فرماتے تھے۔ اب اس کو ثواب سمجھنا یقیناً غلطی ہے اور اس واقعہ کے خلاف ہوجاتا ہے [illegible] جب حضرت عمرؓ اپنے خطبہ میں زیادہ مہر باندھنے کے خلاف فرما رہے تھے تو ایک بڑھیا نے ٹوک دیا کہ جو حق خدا [illegible] ہم کو دے چکا تجھے اس کے چھیننے کا کیا حق ہے!

اسلام کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر مہر ادا کرنے کی نیت نہ ہو تو نکاح مذبذب ہے۔ اب خدا معلوم یہ جس قدر نکاح ہو رہے ہیں اس میں کتنے شوہر مہر ادا کرنے کی نیت رکھتے ہیں اور اگر نہیں رکھتے تو ان کے متعلق کیا کہا جائے گا"

مہر ——— ۱۹۲۹ء

"مہر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ معاف ہوگیا۔ نکاح کے بعد عورت کا درجہ جو مذہب نے دیا تھا مسلمانوں میں باقی نہیں رہتا اور اس کی حیثیت "شوہر کی محکومی" پر ختم ہوجاتی ہے حالانکہ یہ غلط، سرتاسر غلط اور قطعی غلط ہے۔

——— احکام نسواں

"مسئلہ تعدد ازدواج کو اگر ہم تسلیم کر لیا جائے ... طور پر دوسری بیوی کا مہر پہلی بیوی سے زیادہ ... تا ہے لیکن جو کتاب مسلمان کی رائے ہم ان کے ... ارم ثانی کی آزادی کو کافی ہے وہ مساوات کا بھی حکم دے ... ہے اور مساوات کے حکم سے میدان صاف تو زیادتی ... کر دیا اور ثابت کر دیا کہ قرآن نے جو میثاقاً غلیظاً ... سے اقرار کا حکم دیا تھا اور جو اس بہت سے بھی کے ... لئے جس پر آج سوکن آ رہی ہے پورے نہیں ہوا ہے

مسئلہ کے اس پہلو پر اگر غور کیا جائے۔

کہ مہر عورت کے احترام کا اعتراف یا اس کی عزت کا معاوضہ ہے تو پہلی بیوی کے واسطے یہ خیال کس قدر روح فرسا اور جگر فراش ہے کہ میری عزت اس قدر کم قیمت تھی۔

..... اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جب تک پہلی بیوی کا مہر ادا نہ کیا جائے شرع کے موافق دوسری بیوی کا مہر ادا کرنا یا ادا کرنے کے ذرائع پیدا کرنا یا کسی ایسی شے کا مخصوص کر دینا جو مہر ثانی میں مکفول ہو نہ صرف پہلی بیوی کی تذلیل بلکہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

مہر کی دو قسمیں ہیں۔ معجل اور موجل مرد پر اس وقت واجب ہوتا ہے جب فریقین میں افتراق ہو خواہ بذریعہ موت یا طلاق۔ اور جب تک یہ وقت نہ آئے اس وقت تک شوہر بیوی کا ایسا مقروض ہے جس قرضہ کی ادائگی کا وقت پورا نہیں ہوا۔ مگر اس کی ذات اس کی ذمہ دار ہے جو ایک جائداد کی حیثیت سے بیوی کے پاس مکفول ہے۔ اب اس جائداد پر اس وقت تک جب تک پہلا قرض ادا نہ ہو دوسرا قرض قانوناً اخلاقاً شرعاً کسی طرح جائز نہیں میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں جس طرح مسلمان مردوں

نے عورت کے تمام حقوق تباہ کر ڈالے اس طرح دور حاضر کی معاشرت اسلامی نے مہر کا بھی خاتمہ کر دیا"

مہر ——— ۱۹۲۹ء

بیوہ ۵

"دفعتہً زنانہ مکان سے شور وغل کی آواز آئی۔ اندر جا کر دیکھتی ہوں تو عورتوں کا مجمع ہے اور دو مرد صحن میں لال پیلے کھڑے ہیں۔ دولھن ایک چودہ برس کی لڑکی تھی جو تین دن کی بیاہی رانڈ ہوئی پہاڑ سی زندگی کا کاٹنا اس بچی کے واسطے قیامت تھا ماں نے اس کا نکاح ایک جگہ ٹھہرا وقت نکاح کا مقرر کر دیا۔ بھائی شہر میں موجود نہ تھا۔ دونوں چچا اور ایک بھائی اس کا نکاح اپنی ناک کٹ سمجھتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ یہ لڑکی صرف اس لئے کہ اس کا خاوند مر گیا اب تمام عمر رنڈاپے کی زندگی بسر کرے اور اس کی عمر کا کوئی لمحہ خوشی کا نہ گذرے۔ انھوں نے نکاح سے پہلے بڑے بھائی کو بلوا لیا اور اس نے آتے ہی حکم دیدیا کہ اگر میں اس لڑکی کے نکاح کا نام بھی سنوں گا تو دونوں ماں بیٹیوں کو جان سے مار ڈالوں گا۔ ہمارے خاندان میں بہت سی عورتیں اور لڑکیاں بیوہ ہوئیں مگر انھوں نے یہ بے غیرتی اختیار نہیں کی کہ دوسرے نکاح کا نام لیکر سات پشت کی عزت خاک میں ملا دیں۔ کیا اس نکاح کے بعد میرا منہ اس قابل رہے گا کہ میں برادری میں دکھا سکوں؟"

حور اور انسان ——— [illegible] ——— [illegible]ء

[illegible] الایالی

شمسہ۔ کلام پاک میں صر[illegible] منکم۔ تم اپنی بیوہ عورتوں [illegible] ... آپ کلام اللہ کی مخالفت کر رہے [illegible] ... گھر جس میں ایک جوان لڑکی رنڈاپے کی زندگی بسر کر رہی ہے اور

اس کو دوسرے نکاح کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمانوں کا کہا جا سکتا ہے؟"

بیوہ کا نکاح ——————— ۱۶ء

"چودہ برس کی لڑکی بچہ نہ تھی کہ جانتی نہ ہو۔ سمجھتی بھی جانتی تھی دیکھتی تھی پہچانتی تھی کہ اب بقیہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ رنڈاپا ان ہی آنکھوں میں بسر کرنا اور عمر اس دہلیز پر بسر کرنی ہے مگر کہتی کس سے اور کرتی کیا۔ حکم نہ تھا کہ علی الصباح وہ منحوس کسی بڈھے پھونس کو بھی اپنی صورت دکھا سکے۔ اجازت نہ تھی کسی بیاہ برات میں وہ کسی دولھن کو ہاتھ لگائے۔ پھول پھیل عطر اور رنگ اس کے واسطے حرام۔ مہینوں سر گوندھنا قسم۔ برسوں کاجل سرمہ گناہ!"

طوفان اشک ——————— بیوی کی صحنک پر ۱۵ء

"بلقیس کی پھوپی زاد بہن افروز، بہن کی صورت دیکھتے ہی تڑپ گئی۔ روشن خیال۔ پڑھی لکھی۔ چھوت چھوڑ، رسم توڑ بہن سے جا لپٹی۔ جہاں بیوہ کا سہاگن کو ہاتھ لگانا گناہ اور جلسہ میں شرکت حرام تھی وہاں اتنی بڑی بدعت ایک آسمانی آفت تھی جس کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے .... اب افروز بہن کو لے کر صحنک پر آئی۔ بلقیس کے بیٹھتے ہی کسی نے ناک سکیڑی۔ کسی نے بھوں۔ کوئی ادھر دبی کوئی ادھر کسی نے ہاتھ سکیڑا۔ کسی نے پاؤں ... بلقیس نے ہاتھ بھی نہ ڈالا تھا ... فروز سے کہا۔

... یاد فرما رہے ہیں۔ افروز ادھر گئی ... بلقیس سے آکر کہا کہ تم کو نہیں معلوم ... داخل نہیں ہو سکتی بیوی کی صحنک میں منحوس کا کیا کام۔ اٹھو۔ اپنے گھر جاؤ"

طوفان اشک ——————— بیوی کی صحنک پر ۱۵ء

"ہمارے خاندان میں آج تک بیوہ نے ... کیا تھا۔ تو نے نکاح نہیں کیا مُردوں کی ناک جڑ سے ... دی۔ باپ دادا کی عزت پر پانی پھیرا اور بھائیوں ... برباد کی اور جو کام کبھی نہ ہوا تھا وہ تجھ کم بخت ... ہو گیا۔ یہ کلنک کا ٹیکا ہماری پیشانیوں سے جب ... ہم زندہ ہیں خاندان کے دامن سے جب تک دو ... مردوں کی ڈاڑھیوں اور عورتوں کی چوٹیوں ... تک وہ رہیں گی چھوٹ نہیں سکتا۔ تجھ کم بخت کو رے استرے سے عورتوں کی چوٹیاں اور مردوں ... ڈاڑھی مونڈ ڈالی۔ اگر ایسی ہی نکاح کی ضرورت ... جاتی تھی تو زہر کھا لیتی مر جاتی اور دوسرا نکاح نہ ... اب شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جب تک زندہ ہے اپنی صورت نہ دکھا"

سنجوگ ——————— ۲۲ء

بیوہ کے جذبات۔ (حشمت دل ہی دل میں کہہ رہی ہے)۔

"میں آئینہ دیکھتی ہوں تو میری صورت بدستور ... رنگ و روغن وہی۔ چہرے پر جھری نہیں۔ بڑھاپے کے آثار نہیں .... بالکل لڑکی پڑی ہوں۔ خدا کا غضب بڑھیا ماں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں ان کو سب کچھ چاہئے۔ بغیر ۶ ماشہ عطر نہانا گناہ۔ سوا موتیا کے تیل کے اور تیل ڈالنا قسم۔ ہفتہ میں چار مرتبہ کپڑے بدلیں۔ گرمی میں ایک دن اور جاڑے میں جمعہ کے جمعہ مہندی لگائیں۔ سرمہ ہو۔ کاجل ہو۔ کنگھی چوٹی ہو، جاڑا گرمی برسات پھولوں کی بالیاں ناغہ ہوں

دات ملنے لگے گرستی کی دھڑی نہیں چھوٹتی مگر میں جب کے کھانے پینے کے دن۔ پہننے اوڑھنے کا وقت ایک۔ ایک چیز کو ترسوں۔ ایک ایک شے کو پھڑکوں۔ بناؤ کے قریب جاؤں۔ سنگھار کے قریب نہ پھٹکوں۔ اس روز صرف سر گوندھنے پر قیامت ٹوٹی توبہ توبہ" ——— نوحۂ زندگی

مردوں کی نفسانیت اور خود غرضی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ خود تو بیوی کے مرتے ہی دوسرا نکاح کریں بلکہ ساٹھ برس کی عمر ہو تو پندرہ برس کی دولھن لائیں اور وہاں بیوی کے بعد کیوں، بیوی کی زندگی ہی میں، اور دوسری کیسی تیسری اور چوتھی بھی اور عورت غریب کو چاہے وہ چند مہینوں کی بیاہی رانڈ ہو جائے دوسرے نکاح کی اجازت نہ دیں شرع اسلام کی تعمیل پر ادھر اتنے پکے اُدھر اتنے کچے . . . . . .

بے موجود بیوی زندہ مگر کوئی نہ کوئی عیب نکال کر جھٹ دوسرا نکاح کر لیں لیکن لڑکی بیچاری بیوہ ہو گئی تو تمام عمر دنیا کے ہر لطف سے محروم! اس صریح ظلم پر ہمارا دعوئ اسلام کس قدر افسوس کی بات ہے . . . . .

قیدیوں کو جیل خانہ میں پرندوں کو پنجرے میں بکریوں کو کھیلے میں جو اذیت ہوتی ہے قریب قریب وہی حالت ایک بیوہ کی شوہر کے بعد ہوتی ہے۔ اچھا کپڑا اس کے واسطے گناہ۔ بناؤ سنگھار اس کے واسطے مذموم کہیں جانے کی اجازت اُسے نہیں، کسی سے ملنے کا حکم اس کو نہیں زندگی وبال اور جینا عذاب۔ ——— نوحۂ زندگی

"تھانیدار کی زندگی میں حشمت ہمیشہ چوتھی کی دولھن تھی۔ سر سے پاؤں تک گوندنی کی طرح زیور میں لدی پھولوں میں بسی عطر میں ڈوبی۔ لیکن اب (بیوہ ہونے کے بعد) کیفیت یہ تھی کہ کپڑے میلے چکٹ سر کھُولا ہوا۔ بدن پر چیتھڑا ہوا۔ ہاتھ میں چوڑی نہ پاؤں میں لچھا" ——— نوحۂ زندگی

بچّوں والی بیوہ

"لڑکی کا پہلا نکاح جس قدر اہمیت رکھتا تھا دوسرا بھی اس سے کم نہ تھا جس طرح اس میں تمام عمر کا انحصار اس تعلق پر تھا اسی طرح اس میں بقیہ عمر کا۔ ضرورت تھی کہ جس غور و خوض سے جس فکر و کوشش سے جس تگ و دو سے پہلا نکاح کیا اسی توجہ لو فوقیت سے دوسرا بھی ہوتا مگر یہاں ظالم سب اپنے نکاح کے واسطے پھندا لگا رہا تھا اس کو سب سے پہلے یہ سمجھنا اور غور کرنا تھا کہ اس کے ساتھ جو تین بچے ہیں اُن کی پرورش کا کیا سامان ہوگا۔ زمانہ اتنا نازک اور وقت اتنا ٹیڑھا ہے کہ انسانیت اور ہمدردی مسلمانوں میں بالکل ہی کم ہو گئی اور ایسا شخص جو پرائے بچوں کو اپنے برابر سمجھے آدمی نہیں فرشتہ ہے . . . مگر سب سے پہلی شرط سب سے پہلا اقرار سب سے ضروری معاہدہ ہونا لازم تھا کہ بیوہ تین بچوں کی ماں ہے اور اس نکاح کا منشا ان بچوں کی پرورش ہے۔

فسانہ سعید ——— افسانہ سعید

اب مسلمانوں کا تمدن ان کے طریقے ان کی عادتیں ہر چیز ترقی کر رہی ہے پردہ اُٹھ رہا ہے بیوہ عورت کے واسطے آزادی کے مواقع میسر آنے سم قاتل ہیں اور ضرورت ہے کہ احکام الٰہی کی تعمیل بھی پوری کی جائے۔ مگر ضرورت ہے کہ سب سے پہلے بیوہ کی عمر پر نظر ڈالی جائے۔

اگر عمر نکاح ثانی کی مُتقاضی ہو تو جس طرح نکاح اول میں مشورہ مقدم تھا اسی طرح نکاح ثانی میں اس کے خیالات کا اندازہ . . . . . . اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ بیوہ کتنے بچوں کی ماں ہے۔ اور اگر

اس معاہدہ پر کوئی شخص رضامند ہو کہ وہ نکاح کے بعد نہ صرف بیوہ کی ضروریات کا کفیل ہوگا بلکہ بالغ ہونے تک یتیم بچوں کی بھی پرداخت پرورش کرے گا تو اس سے نکاح کرنا چاہئے۔ ——— فسانہ سعید

بیوہ کے نکاح کا جب وقت آئے تو وہ خود یا اس کے متعلقین چند ضروری باتوں کو پیش نظر رکھیں۔

(۱) اگر وہ بچوں والی ہے تو بچوں کی پرورش تعلیم و تربیت کا قابل اطمینان انتظام ہو جائے ان کی جائداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ سوتیلے باپ کی دستبرد سے محفوظ رہے۔

(۲) ماں کی ولایت دوسرے نکاح کے بعد برائے نام بھی باقی نہ رہے۔ یعنی جو کچھ بچوں کے باپ نے چھوڑا ہے اس کا ماں سے واسطہ نہ رہے۔

(۳) بیوہ کا مہر بجائے فرضی دس بیس ہزار روپیہ کے اس کے بچوں کی پرورش و تعلیم قرار دیا جائے یہ نہ ہو یتیم بچے جب اپنا مال سمجھنے اور دیکھنے کے قابل ہوں تو وہ سنیں کہ ان کے سوتیلے باپ نے ان کی پرورش میں صرف کر دیا۔

——— دیباچہ آٹھواں اڈیشن نوحۂ زندگی

" خالد صاحب کے فعل کو آپ اسلام میں داخل کریں گے کہ بیوہ کے نکاح کی تاکید قرآن میں موجود ہے۔ مسلمانوں للہ مذہب کو اپنے نفس کی آڑ نہ بناؤ۔ بیوہ کا نکاح اگر وہ صاحب اولاد ہے اس کے بچوں کی تباہی ہے "

چھیرن کا جھولا ——— ۱۹۳۳ء

شرع اسلام کسی مسلمان کو وہ مرد ہو یا عورت اس کی خواہش کے خلاف کسی فعل پر مجبور نہیں کرتی۔ جس طرح ایک مرد نکاح ثانی میں دنیا بھر کی تاویلیں کرتا ہے اور نفس کا نام تک نہیں لیتا۔ اس طرح ایک عورت بھی دوسری ضرورتوں کی آڑ پکڑ کر نفس کو بچاتی ہے مگر مرد کی طرح وہ بھی دنیا کو دھوکہ دیتی ہے۔ اور بالخصوص بچوں والی بیوہ جو خطبہ نکاح کے ساتھ بچوں کو ذبح کرتی ہے بد ڈائن ماں ہے۔ وہ پڑھا اور لکھا پڑھ جائیے اس وقت ... کو افزائش نسل کی اتنی سخت ضرورت تھی کہ ... قربانی جائز سمجھ رہے تھے مگر آج . . . .

خدائی راج ——— ۱۹۳۰ء

" ایک عورت جس پر دو تین بچوں کی پرورش ذمہ ہے اگر بیوہ ہو گئی تو ہرگز ہرگز اپنی خواہش و مرضی کے خلاف مسلمانوں کے خدا اور رسول کے حکم ثانی کے واسطے مجبور نہیں ہو سکتی۔ لیکن مولوی صاحب جو خود خواہش مند ہیں یا اس شخص کی ترغیب سے جو محض اس مقصد کے لئے پیسہ روپیہ دے کر مولوی صاحب سے وعظ کہلوا رہا ہے جھوم جھوم کر غلط آیتوں کی جھوٹی سے جھوٹی تاویلیں فرماتے ہیں کبھی موتیوں کے محل پیش کرتے ہیں کبھی دوزخ سے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھاتے ہیں اور غریب کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک وہ ہاں نہ کرے کیا ہمارے محترم واعظ مسئلے کو اس پہلو پر بھی غور فرمائیں گے کہ یہ عورت جو دو تین بچوں کی ماں بھی ہے اور ان کی پرورش شرعاً اور اخلاقاً اس کا فرض ہے یہ بھی اور اس کے بچے بھی تباہ و برباد ہو جائیں گے اگر وہ نکاح کی خواہش مند ہے تو مسلمانوں کا اور ان کے علماء کا کام یہ ہے کہ اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہوں دور کریں۔

میں نے خود سوتیلی ماں کے مظالم کے متعلق دل کھول کر اور پیٹ بھر کر لکھا ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ موت سے پہلے میں نے یہ محسوس کر لیا کہ سوتیلے باپ کی سختیاں سوتیلی ماں سے بھی کچھ بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لئے بیوہ عورت کا عقد رنڈوے مرد کے عقد سے کم وزن نہیں رکھتا۔ بیوہ

عورت کو ثواب کا لالچ دے کر نکاح پر آمادہ کرنا ایسی حالت میں کہ اس کے پاس پرورش کے لئے بچے موجود ہیں یقیناً ایسا ظلم ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی"

نشرہ باطنیر ــــــ ۱۹۳۲ء

ترکہ

" اس آیت میں خداوند کریم نے ماں باپ کے مال میں ایک حصہ لڑکی کا اور دو حصے لڑکے کے قرار دئے ہیں۔ اس فیصلہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی میں خود قدرت ہی نے فرق رکھا ہے اور لڑکے کو زیادہ دے کر اس کا حق افضل کیا ہے مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ لڑکی کو ماں باپ کے ہاں اس لئے ایک حصہ دیا ہے کہ اس کا حق مہر شوہر پر مقرر کیا ہے اور اس طرح کمی کو پورا کیا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی کو اس کے شوہر کی کمائی میں بھی حصہ دلوا دیا ہے۔

ــــــ احکام نسواں

اس حکم کی موجودگی میں کہ ماں باپ کی میراث میں بھائی کے مقابلہ میں بہن نصف حصہ کی مالک ہے کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا صریح اور صاف حکم ہے کہ کوئی تاویل ہو سکتی ہے نہ عذر ہو سکتا ہے۔

. . . . پنجاب اور دوسرے صوبوں میں اس حکم کی کھلم کھلا مخالفت ہو رہی ہے اور لڑکیاں دھڑلے سے محروم کی جا رہی ہیں۔

. . . . ایک عذر یہ بھی کیا جاتا ہے کہ شادی کے موقعہ پر ہم لڑکی کو اس قدر کافی دے دیتے ہیں جو ترکہ کے برابر ہو جاتا ہے یہ بھی عذر لنگ ہے اول تو اس وقت جو کچھ دیا جاتا ہے وہ زیادہ نام و نمود ہوتی ہے اس کے علاوہ طریقہ مسنون ہے۔ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ترکہ پدری دیا جاتا ہے تو شاید دنیا میں اس شخص سے کوئی زیادہ بے وقوف نہ ہوگا جو مال بھی دے اور بدنام بھی ہو۔ جب یہ ترکہ پدری ہے تو بیٹی کی شادی کے وقت نہ دیجئے۔ ترکہ اس طرح دیجئے جس طرح خدا نے فیصلہ کیا ہے۔ شادی کے موقعہ پر دعوتیں اور برادری کے کھانے والدین پر فرض نہیں ہیں۔ یہ اس سے بھی زیادہ بے ایمانی ہے کہ اپنے نام آوری کو دعوت تو دیں برادری کو زردہ بریانی کھلائیں اڑوس پڑوس کو اور نام ہو بیٹی کے ترکہ کا۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

. . . . . رواج یہ ہے کہ لڑکیوں کو ترکہ نہ ملے اور باپ جس قدر جائداد وغیرہ چھوڑے اس کے مالک صرف لڑکے ہیں۔ جس طرح اور بہت سے معاملات میں مسلمان اسلام سے ہزاروں کوس دور ہیں اور ان کے طرز عمل کا اسلام ذمہ دار نہیں ہے بیوی یا بیٹی کا شرعی حصہ نہ ملنے کی بھی ذمہ داری اسلام پر نہیں آتی"

ــــــ احکام نسواں

"تم گھر کی بیٹھنے والی عورت تمھیں کیا معلوم یہ فتنی کیا کیا غضب ڈھائے گی۔ میں تو بھگت چکا ہوں آپا جان کو ترکہ سے محروم کرنا میری ہی ہمت تھی ورنہ وہ تہائی ریاست ہی بٹوا چکی تھیں۔ تمھیں کیا معلوم نہیں عدالت ابتدائی نے شرع کے موافق ڈگری کر ہی دی تھی وہ تو خدا مفتی صاحب کا بھلا کرے اگر وہ رواج کے مطابق فتویٰ نہ دیتے تو دریا پار کے آٹھوں موضع شرع کی رو سے ہاتھ سے نکل چکے تھے . . . .

میں اکثر قرآن کے کسی فیصلہ کو (نعوذ باللہ) نامناسب سمجھتا ہوں تو صرف لڑکیوں کے ورثہ کو۔ ان کا وجود ہی غیرت اور حمیت کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ گالیاں کھاؤ اور سہالیاں دو"

شرع کا خون ــــــ مخزن ۱۹۰۵ء

مفدا اُٹھے اس باپ سے جو بیٹی کے حق میں یہ
کانٹے بو گیا کہ وصیت نامہ میں بیٹی کا نکاح اُس خالہ
زاد بھائی سے تجویز کیا جو دو دو دانوں کا محتاج تھا کہنے
کو تو جو چاہے کہو مگر علت غائی بیٹی کا سر کچلنا اور
بہن کو زندگی بھر بھائی کا دست نگر رکھنا تھا"
شرع کا خون ـــــــــ مخزن ۱۹۱۵ء

دو بجے کے قریب مقدمہ پیش ہوا تو مفتی صاحب
نے فرمایا۔

میری عمر اسی سال کی ہے۔ اس نواح کے قریب
قریب تمام تنازعات اس خاکسار کی تجویز پر فیصل
ہوتے ہیں مدعیہ کا یہ دعویٰ کہ وہ شرع اسلام کے بموجب
ریاست سردارپور میں ایک تہائی کی حصہ دار ہے باطل
ہے۔ ہمارے ہاں عام دستور ہے کہ لڑکیاں ترکہ پدری
سے حصہ نہیں پاتیں اور یہ رواج قریب قریب سو سال
سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ میری رائے میں مدعیہ ترکہ کی
مستحق نہیں اور اس کا دعویٰ خارج کیا جائے۔
مسٹر سٹویٹ "آپ احکام قرآنی کے پابند ہیں؟"
مفتی صاحب "بشرطیکہ رواج کی پابندی اس
حکم سے متناقض نہ ہو"۔۔۔

پادری جیکب نے جو مذہب عیسوی کی اس
نواح میں اشاعت کرتے پھرتے تھے۔ یہ الفاظ سُنکر
ہیئر ہیئر کے نعرے لگائے اور مدعیہ کا دعویٰ خارج ہو گیا۔
شرع کا خون ـــــــــ مخزن ۱۹۰۹ء

"محمد پور والے گورے ہوں یا کالے سید تھے
یا پٹھان مگر اس معاملہ میں بے ایمان تھے وہ اپنے ستم
پر جس قدر ناز کریں کم۔ انھوں نے دنیا بھر کے مزے
اُڑائے۔ دن دہاڑے رنڈیاں نچائیں۔ کھلم کھلا سوتنیں

لائے۔ سنت نبوی کا ادا کرنا فرض۔ ایک چھوڑ چار چار
نکاح مگر فرض کا ادا کرنا گناہ۔ ظالم انسانی صورت میں
حیوان تھے۔ اپنی زندگی دن عیدیں رات شب برات
بہن بیٹیوں کی مٹی وہ پلید کی کہ الٰہی توبہ
ترکے سے محروم ہو گئیں۔ چاند سے چہرے
آنکھوں میں ماند ہوئے مگر ان سنگدلوں کا دل
بیوی کی صحنک ـــــــــ عصمت ۱۹۱۰ء

"ایک بہت مشہور خاندان میں جوان
کواری بیٹھی ہے اور عمر بھی کم نہیں خاصی ہو گئی ہے مگر
والد صاحب اس لئے کہ بہت بڑی جائداد
ہیں اُس کا نکاح اول تو کرنا ہی نہیں چاہتے
دوسروں کے کہنے سننے سے چاہتے بھی ہیں تو کسی
شخص کے ساتھ جو ان کی زندگی میں بھی اور
بعد بھی ترکہ کا نام زبان سے نہ نکالے"
بدنصیب لڑکی ـــــــــ ۲۴

"یہ بہن نہیں، تمھاری جان کی دشمن ہے۔
کیا تم اس وقت کے واسطے زندہ رہ سکتے ہو۔ جب
ایک شخص تمھاری بہن کا شوہر اس کا مالک ہو گا
اور وہ اس تعلقہ اور جائداد میں اسلامی حصہ کا
دعویدار؟ ۔ میں نے آج اس وجہ سے کہ زندگی کا کوئی
اعتبار نہیں تمام علاقہ تم تینوں کے نام کر دیا کہ کسی غیر
کے قبضہ میں نہ جائے" ـــــــــ موؤدہ

"گرمی سخت تھی اس کے موٹے کھدری کپڑے۔
پسینے میں شور بشور تھے اور جس باپ کی لونڈیاں تک
ململ اور لٹھے سے گھبرا رہی تھیں وہ گاڑھے میں خاموش
ماں بیٹے سے کہتی ہے:۔
کون یقین کرے گا کہ جس ماں کے ہاتھوں

سینکڑوں روپیہ ماہوار صرف ہوں اس کی زندگی کو موٹے جھوٹے کپڑے اور مٹی کشتی اناج کے سوا دنیا کی ہر چیز حرام ہے۔

مودودہ سب سے بڑا اندیشہ ترکہ کا ہے۔ یہ اس وقت منہ بنائی بنی بیٹھی ہے بعد میں رنگ لائے گی کہ ترکہ کی وارث ہوں۔ یہ بچہ تو ہے نہیں۔ ہبہ نامہ پر اس کے دستخط موجود ہیں اگر ایک دستاویز پر یہ اور دستخط کر دے کہ میں ترکہ کا دعویٰ نہ کروں گی تو ہم اس کا نکاح کر دیں گے"

مودودہ ———— [illegible]

"اسلام نے کھلے ہوئے الفاظ میں حکم دیا ہے کہ والدین کے مال میں لڑکیوں کو لڑکوں سے نصف حصہ دو۔ مگر پنجاب میں اس حکم کی تعمیل نہیں بلکہ رواج پر فیصلہ ہوتا ہے اور رواج یہ ہے کہ والدین کے بعد لڑکی حصے سے محروم کر دی جائے"

لڑکیوں کا ترکہ ———— [illegible]

"بڑودہ میں مجھے ایک آغا خانی ویرجی صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دہرا آشرم کے سکریٹری ہیں۔ دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ ان کے ہاں لڑکی کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ سورت میں بوہرہ جماعت کا نظام اکثر اعتبار سے نہایت معقول دیکھا ان کا احساس قومی انہماک مذہب سی تعلیم لاریب قابل ستائش ہے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہوا حقوق نسواں کی طرف اس جماعت کی بھی توجہ نہیں"

خلع کی فروخت ———— [illegible]

"اس احتمال سے کہ موروثی جائداد رضیہ کی وساطت سے پرلئے قبضہ میں نہ جائے احسن نے اس کے نکاح سے قبل قریب قریب تمام جائداد وقف علی الاولاد کی آڑ میں محسن کے حوالہ کی اور رضیہ کو محروم کر دیا۔ . . . . . .

مطالبۂ حقوقِ نسواں کو لغو اور فتنہ قرار دینے والے مسلمان جو کچھ فرمائیں ہمارے سر آنکھوں پر مگر خدارا وہ بتائیں کہ اس موقعہ پر جب احسن نے ہر طرف سے ناکام ہو کر فیصلہ کیا کہ وہ رضیہ کے نکاح ہی کا خاتمہ کر دے اور تمام عمر بیٹی کو وداع نہ کرے تو صفیہ رجوی کیا کرتی اس فیصلہ نے صفیہ کی گردن شوہر کے سامنے جھکوا دی . . . . اور اب جائداد اور جائداد کی تقسیم تو الگ رہی اس کو نکاح ہی کے لالے پڑ گئے۔ اور یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے غریب بچی کی عمر تباہ و برباد ہوتی ہے اس نے کاغذ پر دستخط کر دئے اور اس طرح رضیہ ماں باپ کی جائداد سے محروم و داع ہو کر سسرال پہنچی"

طوفانِ اشک ———— محروم وراثت [illegible]

"اس میں شک نہیں پنجاب ہر شعبہ میں بہت کچھ ترقی کر رہا ہے مگر لڑکیوں کو ترکہ پدری سے محروم کرنے میں جو کلنک کا ٹیکا پنجاب کے ماتھے پر لگا ہوا ہے وہ کسی طرح دور نہیں ہو سکتا اور اشد ضرورت ہے کہ پنجاب اس طرف توجہ کرے"

تقریر لاہور جلسہ انجمن حمایت الاسلام ———— [illegible]

"پچھلے ہی ہفتہ کا ذکر ہے کہ کونسل کے ایک ممبر صاحب سے میں نے التجا کی کہ وہ خدارا ترکۂ پدری کے معاملہ میں قانونی رواج کو مٹا کر قانون الٰہی کو رائج کریں تو انھوں نے تحریر فرمایا کہ میں مطلب نہیں سمجھا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ زہر دے اس پر یہ تاکید پینا ہوگا۔ مسلمان لڑکیوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کریں اور یہ تک نہ سمجھ سکیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کے گھروں پر کیا ہو رہا ہے۔

ارتداد کا علاج ———— انقلاب [illegible]

"کیا مسلمانوں کو اور ان کے علماء کو اس کا علم نہیں
کہ پنجاب نے تقسیم وراثت کے معاملہ میں کلام اللہ کو نعوذ
باللہ ٹھکرا کر اپنا ایک نیا قانون جو ۱۹۳۸ء کا ایکٹ کہلاتا
ہے مرتب کر لیا۔ جس کی رو سے مسلمان لڑکیاں ترکہ پدری
سے محروم ہیں؟

کیا خدائی فیصلہ کے خلاف اپنے فیصلہ کو ترجیح
دینے والے اور احکام خداوندی کو ذلیل کرنے والے مسلمان
(نعوذ باللہ) صرف اس لئے مسلمان کہلائے جا سکتے ہیں
کہ وہ خان بہادر ہیں۔ آنریبل ہیں۔ سی آئی ای ہیں....
کیا اس قانون کو ترتیب دینے والے جو قانون الٰہی کا مقابلہ
کریں اور اس کی تائید کرنے والے اور اس پر عمل کرنے
والے نظر انداز ہو سکتے ہیں؟"

میری دوسری پیشینگوئی ———— عصمت ۱۹۳۲ء

میں نے خانصاحب یعنی دولھن کے باپ سے
عرض کیا کہ حضرت مبارکباد تو بعد میں دوں گا یہ تو فرمائیے آپ
نے اس بچی کے حقوق کا کیا تحفظ کیا یا سوسائٹی پر ایک
بھینٹ اور چڑھا دی۔ اس کا جواب اُن کے چہرہ پر
تو مسکراہٹ تھی لیکن ایک اور صاحب نے فرمایا خانصاحب
کے ہاں لڑکیوں کو ترکۂ پدری ہی نہیں دیا جاتا تحفظ حقوق
اس کے بعد ہے...... میں گھر چلا آیا اور سوچتا رہا کہ
کہ کولھو کے بیل کی طرح قریب قریب چالیس سال حقوق
نسواں کے گرد چکر لگائے مگر اب بھی جہاں سے چلا تھا وہیں
ہوں.... کس قدر مستحق آفرین ہے وہ قوم جو اپنے
سیاسی حقوق کے مطالبات میں دنیا بھر کے جتن کر ڈالے
اور چیختے چیختے اپنا گلا اور دوسروں کے کان پھاڑ دے۔
مگر خود غصب شدہ مال دینے کا وقت آئے تو اس کان سنے
اور اُس کان اُڑا دے۔

مسلمان عورت کی کشتی ———— ۱۹۳۲ء

"مجھے شک نہیں کہ پنجاب قرآن وحدیث کے خلاف
حقوق نسواں کے پامال کرتے ہیں
پدری سے لڑکیوں کے محروم کرتے ہیں
کی بلکہ اپنا ایک علیحدہ قانون بنالیا
اس قانون کے توڑنے میں اور حق خلع کو
میں۔ میں نے انتہائی کوشش کی۔ کونسل
ممبروں سے بھی ملا۔ انجمن حمایت اسلام
سے ۱۹۳۸ء میں لکھ بھی دیا"

تنسیخ نکاح ———— عصمت

اصفہان نے بیوی سے کہا "میرا آخر وقت
میرا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو شیراز کے لئے
نہ چھوڑ جاؤں۔ اگر شیرازی کی شادی غیر کفو
تمہاری جائداد برباد ہوگی اور داماد حشر کی حصہ کا
ہوگا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم اپنے ہاتھ سے
تاراج کر جائیں۔ ممتاز ہمارا عزیز ہے اور میں نے اس
اور اس کے باپ سے پٹہ کر لیا ہے۔ وہ خود اس
شریک ہے کہ لڑکیوں کو ترکہ پدری نہ ملے اور وہ
محروم رہیں۔ ان حالات میں تم کنبہ کا اگر اور کوئی لڑکا
تجویز کرو تو مجھے انکار نہیں مگر شرط یہ ہی ہے کہ غیر کفو
جو ترکہ کا طالب ہو"

"اصفہان نے ترکہ کی خدائی تقسیم کرنے میں جو کوتاہیاں
کیں وہ ہر شیطان کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہیں۔
اس نے کفو وغیرہ کی شرطیں لگا کر جو تجویزیں کیں۔ ہماری
شیطنت اس سے بیحد خوش ہوئی۔ اس نے محض اپنی برادری
کو خوش کرنے کے لئے... اپنی جائداد کو اپنے بچہ کے خاطر
محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں جس طرح شیرازی کو قربان کیا
اس کی نظیر کم ملے گی.... اس نے خدا کو ٹھکرایا یا رسول کو

[illegible]لایا اور ایک زندہ رسم کو جو بیٹی کی حیثیت میں اس کے
پاس امانت تھی اپنے خاندانی رواج پر قربان کر دیا۔
[illegible]صفہان تمغۂ شیطانی کا مستحق ہے۔

تمغۂ شیطانی ——— ۲۹ء

عورت کی شخصیت

مرد اپنی کمائی کا خود حقدار اور عورت اپنی کمائی کی [illegible] نہ مرد کو یہ اختیار ہے کہ عورت کی کمائی کا زبردستی [illegible]رث ہو جائے نہ عورت کو یہ حق ہے کہ بغیر دئے مرد کے مال کی وارث ہو جائے۔ بلکہ دونوں اپنے اپنے مال کے مالک ہیں۔ ——— احکام نسواں

عورت کو ترکہ دے کر اسلام نے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں موجود نہیں ہے یہاں تک کہ شوہر کے مال سے جو حصہ اس کو ملا ہے۔ اس کی وہ پوری مختار ہے اگر اس شوہر کی طرف سے کوئی جائداد ہے تو وہ حق رکھتی ہے کہ جب چاہے اور جس طرح چاہے بیچے۔ یا دوسرے کو دیدے۔ یہ نہیں کہ وہ نام کی مالک ہو اور اختیار رکھتے ہو۔ بیوی کے مال میں سے اگر شوہر کو چوتھائی حصہ دیا گیا ہے تو شوہر کے مال میں سے اس کو مہر اور آٹھواں دیا گیا ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ عورت کے حقوق کی اسلام نے سب سے زیادہ احتیاط کی۔ ——— احکام نسواں

ہوشیار اے مرد ناداں ہوشیار

"مسلمان اگر اب تک نہیں سمجھے تو اب سمجھ لیں کہ آج کی عورت ۱۸۰۰ء کی عورت نہیں وہ ۱۹۳۳ء کی عورت ہے اور آگے چل کر وہ سولھویں اور سترھویں صدی کی عورت نہ ہوگی بلکہ اکیسویں اور بائیسویں صدی کی عورت ہوگی۔ اگر اس وقت بھی مسلمانوں نے ٹھنڈے دل سے اس کے وہ حقوق واپس نہ کئے جو اسلام اس کو دے چکا ہے تو ارتداد کیسا وہ اسلام ہی سے کنارہ کش ہو جائے گی۔ . . . . کہاں کا ارتداد اور کیسی عدالت العالیہ کے فیصلے مسلمان عورت نصف صدی بعد نکاح ہی کو خیرباد کہے گی اور اس کی ذمہ داری اس پر اور یقیناً اس پر نہ ہوگی بلکہ اس کا بار مسلمانوں پر عموماً اور ان کے علماء پر بہت زیادہ ہوگا"

پکار، یہی خلع کا رونا ——— ۳۴ء

"اسلام کے اگر یہ معنی ہیں کہ عورت کی آزادی کا خاتمہ ہو اور وہ ان تمام حقوق سے محروم کر دی جائے جو فطرت نے اس کو عطا کئے تو اس مذہب کو میرا دور ہی سے سلام ہے"

پیام ستار محبت ——— ۲۵ء

"مسلمان عورت زیادہ سے زیادہ جو کچھ طلب کرے گی وہ اس کا جائز حق ہوگا جو اس کو پہلے ہی مل چکا ہے اور مرد نے غصب کیا۔ اس لئے وہ حق کی واپسی ہوگی۔ اگر اس وقت مرد نے بخل سے کام لیا تو اس کا حشر اس سے بھی بدتر ہوگا۔ اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ عورت جو حقوق حاصل کر چکی ہے اب کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتے اور جو مرتبہ اسلام نے اس کو عطا فرمایا اب کسی کی مجال نہیں کہ اس کو کم کر سکے۔"

——— عالم نسواں

ہندو سماج اور "مکتی داتا"

عصمت کے راشد الخیری نمبر میں "علامہ راشد الخیری کے سوشل افسانوں" کے عنوان سے آنجہانی منشی پریم چند نے جو مضمون تحریر فرمایا تھا اس کے آخر میں لکھا تھا کہ "غیر مسلموں کو اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو وہ

یہ کہ آپ نے جو کچھ لکھا مسلمانوں کے لئے لکھا۔

"مہابیر سوامی" (نظام المشائخ ۱۹۰۸ء بکھری ہوئی پتیاں) "جسودھا کی قربانی" (تیج کرشن نمبر ۱۹۱۳ء بکھری ہوئی پتیاں) "جودھا بائی" (عصمت۔ داستان پارینہ) "پاربتی" (عصمت ۱۹۲۳ء داستان پارینہ) پھر شہید مغرب کے افسانے: گلو تیتیاں: "سیاہ داغ"، "افراط و تفریط" اور "لوبت پنج روزہ کی ایک نوبت" "سلونو" —— یہ سب ہندوؤں ہی سے تو متعلق ہیں۔ منشی پریم چند کی نظر سے یہ مضامین گزرتے تو انھیں اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑتی۔

یہ کہنا صحیح ہے کہ علامہ مغفور نے غیر مسلموں کے لئے خاص طور پر کوئی کتاب نہیں لکھی مگر حقوقِ نسواں کی پامالی پر مردوں کو جو متوجہ کیا گیا ہے حقیقتاً وہ خون کے آنسو ہیں مظلومیت پر عورت ذات کی۔ مظلوم بہر حال مظلوم ہے بلا تخصیص اس کے کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم۔ اگر کسی عورت کا سابقہ پڑتا ہے ایک نہایت نامعقول شوہر سے اور وہ اس پر آئے دن ظلم و ستم توڑتا ہے تو مظلوم بیوی سے مسلم اور غیر مسلم سب ہی کو ہمدردی ہوگی لڑکیوں کی پرورش۔ تربیت۔ تعلیم بے جوڑ شادی بچپن کی شادی بچپن والے کی شادی۔ دولت یا حیثیت سے شادی۔ سوتیلا باپ۔ سوتیلی ماں۔ ساس اور بہو۔ نند اور بھاوج مغرب کی اندھا دھند تقلید۔ جدت پرستی۔ والدین پر بچوں کے حقوق۔ والدین کا بڑھاپا وغیرہ وغیرہ کیا ان موضوعوں پر علامہ مغفور کی تحریریں صرف مسلمانوں ہی کے لئے مفید ہیں غیر مسلموں کے لئے نہیں! جو واقعات علامہ مغفور نے اپنے مضامین افسانوں ناولوں نظموں میں لکھے ہیں کیا وہ مسلمانوں ہی تک محدود ہیں غیر مسلموں

سوانح عمری علامہ راشد الخیری

میں نہیں ہوتے؟ یقیناً ہوتے ہیں۔ پاکستانی اور بھارتی گھرانوں میں بغیر اس تخصیص کے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم یہ واقعات ہوتے رہتے ہیں چنانچہ آنجہانی پنڈت رگھو دیال ترپاٹھی علامہ مغفور کے ناولوں پر بحث کرتے لکھتے ہیں کہ "ایسے واقعات ہماری معاشرت میں بلا تخصیص مذہب و ملت آئے دن پیش آتے رہتے ہیں"۔ حقوقِ نسواں پر معتور قلم کے مضامین نے ہندو سماج میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور غیر مسلموں میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ ہماری دیویاں بھی انسان ہیں اور انسانوں کی سی زندگی گزارنے کا حق رکھتی ہیں۔ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں بڑودہ سورت وغیرہ کا جب علامہ مغفور نے دورہ کیا تھا تو ایک گجراتی اخبار نے جس کا [illegible] سا چلڈ پر تھا علامہ مغفور کو "مکتی داتا" یعنی عورتوں کا نجات دہندہ لکھا تھا۔ ۲۹ سال بعد کراچی کے روزنامہ ملت گجراتی نے ایک ایک طویل مضمون میں علامہ مغفور کی سولھویں برسی پر جو خراج عقیدت پیش کیا تھا اس میں بھی لکھا تھا۔ "وہ عورتوں کے "مکتی داتا" کہلاتے تھے۔ ۱۹۲۳ء ہی میں جب انھوں نے گجرات کا دورہ کیا تھا تو تاریخی شہر بروچ کے مقام پر پارسی گرلز سکول میں ان کا لکچر ہوا تھا جس میں ان کی خدمات کو غیر مسلموں نے خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اسی جلسہ میں پارسیوں نے عصمت کا گجراتی ایڈیشن شائع کرنے کی خواہش کی تھی۔ علامہ مغفور حقوقِ نسواں کے لئے جو جہاد کر رہے تھے اس نے ہندو دیویوں میں بھی بیداری کے آثار پیدا کر دیئے اور انھیں معلوم ہو گیا کہ اردو ہی میں ہماری حمایت میں ایک بزرگ مردوں سے جنگ کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے چند سطریں پہلے لکھا ہے غیر مسلموں

کے لئے خاص طور پہ ان کی کوئی تصنیف نہیں، لیکن ان کا کوئی اصلاحی تمدنی معاشرتی ناول یا ناولٹ یا افسانہ ایسا نہیں جو غیر مسلموں کے لئے بھی مفید نہ ہو چنانچہ خود انہوں نے اپنے پہلے اصلاحی ناول حیات صالحہ یا ظلمت کے دیباچہ میں لکھا تھا۔

”گو یہ قصہ تمثیلاً ایک مسلمان خاندان کا ہے مگر ہر قوم اور ہر فرقہ کے لئے جس میں پہلی بیوی کے بعد دوسری شادی جائز ہے مفید ہو سکتا ہے“

غیر مسلموں کا اعتراف

”آج چار ماہ سے تمام ملک کی بیبیاں اور بچیاں ماتم کر رہی ہیں اور ان کا رنج اُن کے دلوں کو پھوڑ کر آنکھوں کے راستے باہر آ رہا ہے کہ ان کا سب سے بڑا سرپرست ان کا زبردست حامی ان کے حقوق کے لئے مردوں سے لڑنے والا فرشتہ صفت انسان اس دنیا سے ملک عدم کو کوچ کر گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ عورتوں کے روحانی باپ تھے۔ آپ غریبوں محتاجوں یتیموں کے سرپرست اور گم شدوں کو صحیح راستہ بتانے والے رہنمائے اعظم تھے۔ آپ کا برتاؤ ہندو مسلمانوں سب کے ساتھ یکساں تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے عورتوں کی بھلائی کے لئے ہزاروں مضامین سینکڑوں افسانے اور بیسیوں کتابیں لکھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کی عام زندگی ملک کی بہتری خاص کر عورتوں کی بھلائی میں صرف ہوئی ہے۔ اس وجہ سے آپ کے انتقال کر جانے سے کسی قوم کا ہی نہیں بلکہ سارے ملک کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے“

عصمت ــــــ مسز سوشیلا دیوی ام اے بی ٹی دہلی

صنف نازک کے لئے کیسے اٹھائے صدمے
رات دن ایک کئے۔ کیا کیا مضامین لکھے
غم نسواں کے وہ حضرت نے مرقعے کھینچے
اب دکھیں گے نہ دیکھیں گے کبھی ہم مر گئے
کس طرح بھولیں گے احسان تمہارے خیری
اب کسے کہہ کے پکاریں گے ”ہمارے خیری“

عصمت ــــــ شریمتی لیلاونتی دیوی اُملہ لاہور

”مولانا راشد الخیری کی وفات ہندوستانی عورتوں کو شدید نقصان پہنچا گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عورتوں کی بہبودی اور ترقی کے لئے قریب قریب نصف صدی تک اپنی کوششوں کو جاری رکھنا مولانا مرحوم کا ایسا زبردست کارنامہ ہے جس کی مثال کم سے کم ہندوستان میں نہیں ملتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عورتوں کی اصلاح اور عورتوں کی تعلیم کے لئے نیز عورتوں کی شادی شدہ زندگی کامیاب اور خوشگوار بنانے کے لئے اتنا زبردست کام مولانا صاحب نے کیا ہے کہ ہندوستان کی عورتیں مدتوں ان کے احسانات یاد رکھیں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی کتابوں اور مضامین میں انہوں نے ہندوستانی عورتوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ تم ہندوستانی بن کر ہی ترقی کر سکتی ہو اگر تم نے بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی لیکن تمہاری خانگی زندگی ناخوشگوار اور ناکام رہی تو قوم اور ملک کو تم پر فخر نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں ہندوستان کے کسی مصنف نے عورتوں کے واسطے اتنی کتابیں نہیں لکھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس طرح مولانا صاحب کی کتابوں سے مسلمان عورتوں کے علاوہ غیر مسلم عورتیں بھی فائدہ اٹھاتی ہیں اسی طرح عصمت سے اردو جاننے والی ہندوستانی عورتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے“

مسز نائک بی اے بی ٹی پرنسپل سُندر نگی
عصمت ــــــ گرلز ہائی اسکول

"علامہ راشد الخیری نیک سیرت انسانوں میں سے تھے۔ اس مہا پُرش کا سارا جیون ہندوستان کی ماتاؤں بہنوں اور معصوم بچیوں کی بھلائی کے خیال میں گذرا۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی عورت ذات کو اونچا اٹھانا تھا . . . . . . وہ بہت اونچے درجے کے لکھیک تھے . . . . . . انھوں نے عورتوں کے لیے لکھ کر بیحد احسان کیا۔ ان کی بھاشا کی خاص خوبی اس کی سادگی اور بے میل پن ہے اس وجہ سے وہ عورتوں پر اتنا اثر ڈال سکے"

عصمت ——— کماری شکنتلا دیوی بنارس یونیورسٹی

"مولانا صاحب نے ہندوستانی عورت کو اس کی اصلی جگہ دلوائی۔ مردوں کو بتایا کہ ان کا سلوک عورتوں کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے اور انھیں عورت کی عزت کرنا سکھایا۔ مولانا صاحب کے لیکھوں اور لیکچروں میں جادو بھرا تھا۔ پتھر کے دل بھی پگھل جاتے تھے یہ مولانا ہی کا دم تھا کہ اتنے عرصہ میں ہندوستانی عورت کو اپنی غلامی کا خیال پیدا ہوگیا . . . . وہ ہندوستانی عورت کو گھر کی لکشمی دیکھنا چاہتے تھے۔ یعنی اس میں گھر والی کے گن ہوں ان کے رسالہ عصمت نے بھی عورتوں کو تعلیم کا شوق دلانے میں بہت مدد کی ہے۔ مولانا صاحب نے گھریلو زبان کو خاص ستھان دیا اور اس کی خوب صورتی کا سکہ اردو کے بڑے بڑے لکھنے والوں پر جما دیا۔ ہندوستان کی عورتیں مولانا صاحب کی یاد میں جتنا روئیں تھوڑا ہے"

شریمتی چندر دیوی سابق پرنسپل

عصمت ——— ام بی ودیالہ کلکتہ

راشد الخیری عزیز ایں و آں
وا دریغ از چشم عالم شد نہاں

محسن و غم خوار نسوانِ وطن
چارہ جوئے کار نسوانِ وطن
آں زبان بے زباناں شد خموش
نوحہ خوانِ خستہ حالاں شد خموش

تلوک چند محروم ——— عصمت مارچ ۱۹۳۷ء

"میں علامہ راشد الخیری کے کمال کا ہمیشہ . . . رہا ہوں انھوں نے اہل ہند کی خدمت میں اپنی تمام . . . صرف کر دی تھی۔ وہ اُردو کے باکمال ادیب تھے مستورات کی ترقی تعلیم اور حفاظت حقوق کے بارے میں ان کی مساعی جمیلہ بہت کامیاب ثابت ہوئیں . . . . . . علامہ مرحوم کو عورتوں کی اصلاح اور بہتری کی ہر زمانہ میں ذہن تھی"

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

". . . . علامہ راشد الخیری ہندو نہیں تھے مسلمان نہیں تھے وہ انسان تھے ایسی سد جیں ہندو مسلمان نہیں ہوا کرتیں انھیں مذہب کی جھوٹی قید میں باندھنا خود غرضی ہے اور ان کی ذات کی پاکیزگی کو کلنک لگانا ہے علامہ مرحوم کی کڑکتی ہوئی آواز اگر آج نہیں ہے تو ان کی دل گداز تحریر تو ہمیں بار بار بتا رہی ہے کہ خدمت کرنے سے ہی انسان کی زندگی کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور وہ بھی خاص کر ماں کی . . . . محکمہ تعلیم کو چاہئے کہ علامہ مرحوم کی کتابیں درس میں رکھیں کہ ہمارے بچے سچے ہندوستانی بن سکیں رازق صاحب کو ہم صلاح دیں گے کہ وہ علامہ کی تصانیف کو ہندی میں بھی شائع کرنے کا اہتمام کریں یہ محض زبان ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ہندو مسلم تہذیب کو یکجا کرنے کا اہم مسئلہ ہے"

رام چندر شرما اڈیٹر مہارتھی ہندی ——— ساقی ۱۹۳۶ء

"علامہ راشد الخیری نے عورتوں کے لئے جو لٹریچر
مہیا کیا ہے وہ زندہ جاوید ہے"
منشی پریم چند ——— عصمت ۱۹۳۶ء

دردمند دلوں کا اعتراف

"علامہ مغفور کی میسور میں تشریف آوری
کی خبر سُنکر لوگوں نے جو آنا شروع کیا تو جب تک ہم
دونوں بہنیں حاضر ہیں برابر آتے ہی رہے۔ لوگوں کے
اصرار پر مردانہ لکچر کا بڑے پیمانہ پر انتظام ہوا۔ ہال تعلیم
یافتہ افراد سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ موضوع تقریر عورتوں
کے شرعی حقوق، پردہ اور تعلیم تھا۔ علامہ مرحوم کے الفاظ
درد سے بھرے ہوئے تھے۔ سُننے والوں کے آنسو نکل آئے
عورتوں کے حقوق کے لئے وہ بہت بلند آواز سے مردوں
سے لڑ رہے تھے۔ خلع، نکاح، بیوگان، ترکہ پدری۔ اور
تعلیم اناث پر وہ مردوں کو متوجہ فرما رہے تھے ان کے یہ
الفاظ کبھی نہیں بھولے جا سکتے کہ

"یہ بیگمیں جنھیں تم نے لونڈیاں بنا رکھا ہے تمہارے
گھر کی زینت ہیں۔ لڑکیوں کو تعلیم دو۔ آپس میں اتفاق
اور اتحاد سے کام لو۔ عورت کو ہادی برحق نے اس کی خدمات
کے معاوضہ میں جو حقوق عطا فرمائے۔ ملکی رسم و رواج اور
مردوں کی ہٹ دھرمی نے غصب کر لئے اور طبقہ اناث کے
جذبات فنا کر دئے اور ان کو بت بنا کر بے جان کر دیا"
مریم یوسف علی بی اے انسپکٹر سکولز میسور۔ عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

"علامہ کی تقریباً تمام تصانیف عورت کی حمایت
میں ہیں "بچہ کا کرتہ" ماں کے حقوق کی حفاظت میں۔
"سات روحوں کی اعمالنامے" میں بلا رضامندی کی شادی
کے بُرے نتائج ہیں "بے قصور بچی" بے ماں کی بچی
کی حمایت میں ہے اور پھر طوفان اشک میں "کلنک
کا ٹیکہ" عورت کو حق وراثت دلانے کی کوشش میں "طلاق
کا سفید بال" بھولے بھالے زمانے ناواقف امامت و قضا
کے سامنے سر جھکا دینے والے علماء کے ناکارہ اور دستبستہ فتوے
کے بُرے نتیجے اور ایک چار بچوں والی کی طلاق اور اس کے
نیک دل خاوند کی عاقبت اندیشی کا سبق آموز افسانہ ہے
. . . . مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کی مظلوم وبے کس
عورت کی حمایت میں یہ ایسی سعی کوشش ہے کہ جس کی
مثال ملنا بہت مشکل ہے"
میجر ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے طبقہ نسواں پر طرح طرح
کی پابندیاں عاید کی گئیں۔ پنجاب و صوبہ اودھ میں رواج
کو شرع محمدی پر ترجیح دے کر لڑکیوں کو ترکہ سے محروم کر دیا
گیا۔ خلع کے شرعی قانون کو نظر انداز کر کے ظالم شوہروں
کے ہاتھوں ہی عورت پر ستم نہیں ڈھائے گئے بلکہ سوکن
کو گھر میں بٹھا کر سینہ پر کودوا یا گیا . . . . نئی حکومت
اور وہ بھی غیر اسلامی کے قیام سے مردوں نے ناجائز
فائدہ اٹھا کر عورتوں کے جملہ حقوق غصب کرنے اور مثل
قیدیوں کے بجائے لوہے کے سونے و چاندی کے طوق
وزنجیر پونچی وکڑے (بجائے ہتھکڑیوں کے) اور بیڑیوں
میں توڑے ڈال کر اور خوشی خوشی پہنا کر اور سامان زینت
رکھ کر مکانات کی چہار دیواری کے اندر مقید کر دیا۔ چونکہ
غدر ۱۸۵۷ء میں مظالم کی حد دہلی پہنچ کر ہوئی تھی لہذا خاک
پاک دہلی ہی سے رسم و رواج کے قیدیوں کو نجات دلانے
والا منظر شہود پر ظاہر ہوا"
مولوی عبدالحئی عباسی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"حقوق نسواں جس میں عورتوں کو حدود شرع کی
مقررہ آزادی۔ ترکہ پدری۔ حق مہر خلع وغیرہ قرآن کی تعلیم کے

بموجب [illegible] گئے تھے داستان ماضی ہو چکے تھے۔ آپ
کے درد مند دل نے عورتوں کی حق تلفی کا نہ صرف احساس
ہی کیا بلکہ سینہ سپر ہو کر مخالفین اور غاصبوں سے مقابلہ
آرائی میں بھی جنگ کی"

جمیلہ بیگم کلکتہ مصنفہ فیروزہ ——— عصمت جولائی ۱۹۳۶ء

مولانا مرحوم پہلے شخص تھے جنہوں نے حقوقِ
نسواں کی حمایت میں ایک بلند پایہ مردانہ رسالہ تمدن
جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کے ذریعہ بھائی مرحوم ہر مہینہ
مظلوم عورتوں کے حقوق پر درد انگیز مضامین لکھ کر
غفلت شعار مردوں کو جھنجوڑتے رہتے تھے۔ عصمت و
تمدن کے ذریعہ قوم میں بیداری کی روح پھونک رہے
تھے۔ . . . . . مولانا کی تصانیف اور رسالوں کا اثر
تھا کہ آج گھر گھر مسلمان لڑکیاں تعلیم یافتہ نظر آتی ہیں۔
۳ فروری ۱۹۳۶ء تھی اور دیڑھ دو دن صبح کا وقت
ہم چائے پی رہے تھے۔ سجاد صاحب کے ہاتھ میں اخبار
مطالعہ کر گیا اور ان کے منہ سے نکلا "ارے غضب ہو گیا"
میں گھبرا گئی پیالی رکھ کر پوچھا کیا ہوا۔ کہنے لگے "مولانا
راشد الخیری کا انتقال ہو گیا" میری آنکھوں سے آنسو
جاری ہو گئے دل کی حالت بہت دیر تک خراب رہی۔
. . . . حقوقِ نسواں کے اتنے زبردست حامی اتنے
بڑے مصنف کا دنیا سے اٹھ جانا قیامت تھا"

نذر سجاد حیدر ——— عصمت فروری ۱۹۳۶ء

تیس چالیس سال قبل عورت کی کوئی قدر و
قیمت نہ تھی۔ اس کی پیدائش پر ماتم کیا جاتا۔ چھوٹی
عمر میں لڑکی چند داموں پر فروخت ہو جاتی۔ اس کی آئندہ
زندگی کی کنہ ان کا کبھی فکر نہ کیا جاتا۔ بلکہ بلائے ناگہانی
کی طرح اس کو گھر سے علیحدہ کر دیا جاتا۔ کنوار پنے کے
زمانہ میں وہ والدین بہن بھائیوں کی خادمہ شادی کے
بعد مرد کی لونڈی چار دیواری کی قیدی۔ سارا دن گھر کا
کام کاج کرتی۔ اور کوئی اختیار نہ رکھتی۔ اس کو اپنے حقوق
کے کسی طرز اظہار میں دخل نہ ہوتا۔ اس پر بھی وہ اس
مرد کے کوشے سہتی۔ مرد کا دو وقت کھانا اور کپڑا
اس کی مہربانی خیال کرتی اس وقت اس کے حقوق کا کوئی
پاسبان نہ تھا۔ وہ نہ جانتی تھی۔ یا اس کو خبر دار ہی نہ
کیا تھا کہ خدا کی طرف سے کوئی حق بیاہ مرد پر ہے۔ اگر
ظالم بدکار بدمزاج ہے تو وہ فریب کی رہائی کا کوئی طریق
قصد نہیں۔ اگر مرد بے قصور عورت کو گھر سے باہر نکال
دے تو کوئی اس کی اس الزام میں گرفت کرنے والا نہیں۔
تعلیم سے بے بہرہ رکھنا والدین اپنا فرض خیال کرتے۔ اردو
فارسی پڑھنا۔ ماں باپ بہن بھائی کو خط لکھنا اس کی پردہ
دری میں شامل تھا۔ اگر کوئی لڑکی قدرتاً ہوشیار ہوتی
اور وہ ذرہ بھر اپنے بھائی کی برابری کرنے کا ارادہ کرتی
تو ماں اس کو بیٹے پر نثار کر دیتی اور اس کو بھائی کی دشمن
خیال کرتی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ مظلوم فرقہ دن بدن پست
ہوتا گیا اور قومی بچے کمزور۔ جاہل۔ ڈرپوک پیدا ہوئے
اور جاہل ماؤں کی گودیوں میں پرورش پا کر کم ہمت ہی ہوئے
ظاہر ہے کہ سب قوموں سے پست مسلمان قوم ہے۔
اسی زمانہ میں بے کس فرقہ نسواں پر خدا کی رحمت نازل
ہوئی اور ہمدرد و غمگسار حضرت علامہ صاحب کے کانوں
میں ہماری آہ کا شور سنائی دیا اور ان کی روشن آنکھوں
نے ہمارے دلی زخموں کو دیکھا ان کا نیک ہمدرد دل
ہماری طرف متوجہ ہوا۔ اور نعرۂ راشدی نے ظالم
مردوں کو بتایا کہ عورت بھی خدائے تعالیٰ نے اسی
اشرف المخلوقات سے پیدا کی ہے جس سے تم ہو۔ احکام

ہندوستان کے ۔ سنت احمدی سے آگاہ کیا حقوقِ
نسواں پر روشنی ڈالی ۔ ان کے مبارک قلم نے ہمارے
حقوق کی پاسبانی کی ۔ اس وقت چاروں طرف جو حقوق
کی طالب مستورات نظر آرہی ہیں یہ انھیں محترم کی محنتوں
کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے"

بیگم ڈاکٹر غلام رسول لاہور ——— بنات اگست [illegible]

"علامہ راشد الخیری نے طبقہ نسواں کی وہ
خدمت کی ہے کہ جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ
رہے گا"

بیگم آصف علی کی تقریر خواتین دہلی کے جلسہ میں ۔

"علامہ کے بیان میں اتنی پاکیزگی ہے۔ اور
عورت کا احترام اتنا ہمہ گیر ہے کہ اُردو ادب میں عورت
کو اس صورت میں پیش کرنے کے لئے ہمیں علامہ مرحوم
کا ممنون ہونا چاہیئے ورنہ اس سے پہلے ہمارے ہاں
کی داستانوں اور قصوں میں عورت جس روپ میں
جلوہ گر ہوتی رہی ہے ۔ وہ اہل ادب دوست حضرات سے
پوشیدہ نہیں ۔ "رواج کی بھینٹ" میں انھوں نے
ایک سلیقہ شعار بیوی عطیہ کا ذکر کیا ہے ۔ جس پر عطیہ
کا شوہر سوکن لے آیا ۔ عطیہ زچگی کی تکلیف میں مبتلا
ہے مگر ملاحظہ فرمائیے ۔ کتنی پاکیزگی اور پُراثر طریقے
سے علامہ نے اس کیفیت کو منتقل کیا ہے . . . . .

علامہ راشد الخیری کو محسن نسواں اور معلم نسواں
کہا گیا ہے یہ سب درست لیکن انھوں نے عورت
کے خلوص پاکیزگی وفاکیشی اور ایثار وقربانی میں بہت
گہرے رنگ بھرے ہیں"

احمد ندیم قاسمی ——— امروز لاہور ۲۸ فروری [illegible]

"وہ ہندی عورت کو اپنے خاوند کی فرماں برداری
اور اپنے باپ دادا کی لاج رکھنے کی وہ مشرقی تعلیم دیتے
ہیں جس کو میں تو آج اس صورت میں درست سمجھتا
ہوں کہ مرد بھی ایسی عورتوں کے قابل ہو جائیں ورنہ زمانہ
کا یہ تقاضہ ہے کہ (سات روحوں کے اعمالنامے کے آخری
قصہ میں) احمد جیسے مردوں کا منہ کالا کرکے سر بازار جوتے
لگائے جائیں ۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ جو احمد نے کیا وہ
قصہ کہانی ہے یا مبالغہ ہے ۔ ہرگز نہیں ۔ ہرگز نہیں ۔
ایسی مثالیں ۔ آج روزانہ زندگی میں ہمارے سامنے
موجود ہیں"

بیگم ڈاکٹر نصیر الدین احمد ——— عصمت راشد الخیری نمبر

"آرائش محفل (۱۸۰۱ء) از میر شیر علی
افسوس سے لے کر آج تک مصنفین نے کئی دور طے کئے
. . . . لیکن راشد الخیری جیسے فطرت شناس پیدا
نہیں ہوئے ۔ حقوقِ نسواں کی پامالی کا جو قوم پر
الزام عائد ہو رہا تھا اس کا ازالہ جو کچھ ہوا ہے وہ صرف
راشد الخیری کے دماغ و قلم سے ۔ مضامین کی تازگی
اور احکام نبوی کی تلقین میں جو روح افزا کیفیتیں علامہ
راشد الخیری کے کلام میں موجود ہیں وہ کہیں اور بمشکل
ملیں گی علامہ راشد الخیری کی نظر وسیع اور بلند تھی ممکن
نہ تھی کہ اُن کی آنکھ نسوانی دنیا کی پست حالت پر نہ پڑتی"

سیدہ افضل النساء بیگم حیدرآباد سندھ ——— عصمت فروری [illegible]

آج سے ۶۰ سال پہلے عورت کی جو درگت تھی ۔
اس سے علامہ مغفور بہت متاثر ہوئے ۔ عورت کے
ساتھ ناروا سلوک اور زیادتیاں کی جاتی تھیں اور اس کو
جانور سے بدتر سمجھا جاتا تھا ۔ شادی سے پہلے باپ اور
بھائی کے ہاتھوں اور شادی کے بعد شوہر اور اس کے
عزیزوں کے ہاتھوں ظالم اور جابر سماج کے ہاتھوں

اس کمزور مخلوق سے آہ و بکا کی جو سسکتی دم گھونٹتی ہوئی آوازیں اس کے حلق سے نکلیں ان کو علامہ مرحوم نے کان لگا کر سنا اور دل چیر کر سنا... اسی مسموم فضا میں ایسے ہولناک زمانہ میں ایک گداز اور درد بھرا دل لیکر انھوں نے قلم اٹھایا تو اپنے آنسوؤں کے گلیپ دہلا دئے"

رازق خیری ایم اے ۔۔۔ یکم فروری ۱۹۵۸ء کو ریڈیو پاکستان کراچی سے جو تقریر نشر ہوئی اس کا اقتباس)

"علامہ راشد الخیری نے لاپرواہ دنیا کو سننے۔ انجان دنیا کو سمجھنے اور ساکت دنیا کو عمل کرنے پر مجبور کرکے زمانہ سے یہ تسلیم کرالیا کہ وہ ایک ایسی ناگزیر "شخصیت" کے حامل تھے جسے نظر انداز کرنا ناممکن ہو چکا تھا ان کی پیغمبرانہ نظر (Prophetic vision) وقت کے کہرے کو چیرتی ہوئی ۲۰ ویں صدی کے جاذب نظر تمدن کا سماں باندھ کر اس کے لئے ایک منتخب میدان میں زمین ہموار کر رہی تھی۔

آج برصغیر تقسیم ہو چکا ہے اور راشد الخیری کی آواز مسجدوں سیاسی پلیٹ فارموں صوبائی لیجسلیچروں اور مرکزی اسمبلیوں سے گزر کر بین الاقوامی تعلیمی معاشرتی اور تمدنی مرکز "یونسکو" تک پہنچ چکی ہے۔ جس نے "خواتین کے حقوق کا چارٹر" پاس کرکے راشد الخیری کی صاف دیانتداری پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ . . . . . نئے زمانہ کے ہاتھ علامہ راشد الخیری کے ایک ایک لفظ کو اینٹ کے طور پر اٹھا کر نئے تمدن کی تعمیر میں صرف کر رہے ہیں۔ ان کا استعمال چونے اور گارے کے طور پر ہو رہا ہے ان کا مطمح نظر ideology کا تبدیل ماضی کے جھروکوں سے جھانک کر ہماری نئی بستی کے بننے دیکھتی ہوئی نظر آ رہا ہے جو عصمت کے دامن میں پرورش پانے والے کیا عصمت ملک۔۔۔ سہروردی" کی زبان بن کر مجلس اقوام متحدہ میں کانفرنس پڑھا چکے ہیں۔ جنھوں نے صنف نازک کے بنیادی انسانی حقوق یعنی محبت شعاری کو عالمگیر انسانیت کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ علامہ راشد الخیری کی کوشش کامیاب ہو چکی قطعہ مرغوب ـــــــــ عصمت فروری ۱۹۵۸ء

". . . مجموعی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسوم و رواج، معاشرت سماجی روایات اور معاشی عوامل نے ہمارے ملک کی عورت کو ایسے سخت بندھنوں میں جکڑ دیا تھا جن سے نکلنا محال نظر آتا تھا۔ حضرت علامہ مرحوم نے اس ماحول میں آنکھ کھولی۔ ان تمام خرابیوں کو خود دیکھا پہلو میں ایک دردمند دل تھا جو بے چین ہو گیا۔ ایک سچی تڑپ پیدا ہوئی اور وہ بے اضطراب ہو گئے۔ کہ کسی طرح ان خرابیوں کو دور کر دیں اس کام کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ان کا ایک خاص پیغام تھا ان کی زندگی کا صرف ایک مقصد تھا۔ جس کو وہ اپنے رسالوں، کتابوں، ناولوں افسانوں، کہانیوں سے پورا کرنے میں منہمک رہے۔

. . . . . معاشی حق وراثت غیر مناسب وقف علی الاولاد فتنہ انگیز تعدد ازدواج جہیز۔ عقد بیوگان۔ جاہلانہ ادعا اور پیدائش سے لے کر مرنے کے بعد تک کونسا مسئلہ تھا جس پر علامہ نے قلم اٹھا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے نہیں دکھایا"

محمد احمد سبزواری ایم اے ۔۔۔ عصمت فروری ۱۹۵۹ء

"یہ علامہ مرحوم ہی کا فیض ہے کہ مسلمان بیبیاں جابر مردوں کی غلامی سے آزاد نظر آتی ہیں۔

مرحوم نے عورتوں سے لا کر عورتوں کو ان کے حقوق دلوائے ہیں وہ حقوق جو مذہب نے انھیں دئے مگر مردوں نے غصب کر لئے تھے۔"

شاہ احمد اقبال ساقی ———— عصمت فروری ۱۹۵۳ء

علامہ کے بارے میں یہ شبہ قطعاً غلط ہے۔ کہ وہ صرف عورتوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہے۔ اور ملکی حالات کی طرف بھی نہ دیکھا اگرچہ کے اقتدار کے خلاف انھوں نے کافی لکھا ہے۔ اور پھر ہندو مسلم مناقشات پر ان کے مضامین موجود ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کا بھلا اس میں سمجھتے تھے۔ کہ ایک دوسرے کی زیادتیاں بھول کر سب متحد ہو جائیں۔ اور غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ حالات نے کھل کر کہنے کی اجازت نہ دی۔ لیکن بے شمار ادیبانہ چوٹیں ضرور کر گئے۔

ان کی حقیقت پسندی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے۔ کہ انھوں نے بعض اوقات خود اپنے ممدوحین۔ (یعنی سلمان) شہنشاہوں پر بڑے بھاری اعتراض کر دئے۔ آج سے چند برس پیشتر ساحر لدھیانوی نے اپنی مشہور نظم "تاج محل" میں جب یہ کہا تھا۔ کہ ؎

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

تو بعض تیز مزاج مسلمان جو شاہجہاں کو شاید ولی ہی شمار کرتے تھے۔ بری طرح بھڑک اٹھے۔ ساحر سے پہلے علامہ راشد الخیری نے تاج محل کے بارے میں کیا لکھا۔ یہ شاید انکی نظر سے نہیں گزرا تھا۔

"آگرہ کا تاج محل تمہاری نگاہ میں محبت کا ایک لازوال خزانہ ہے اور ایسے جواہرات سے جگمگا رہا ہے۔ جن کی روشنی کائنات کو مزین کر رہی ہے۔ مگر میری نگاہ میں دریا کی ان لہروں کے آئینے میں۔ جو ہر روز بلکہ ہر لمحہ تاج محل کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہیں بادشاہ کی ان بیویوں کی صورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ جو محبت کے شاہی انعام سے محروم رہیں۔"

آج سے تیس چالیس برس پہلے مغل شہنشاہوں کے متعلق اس قسم کا نقطہ نظر مشکل ہی سے مل سکے گا۔ یہ علامہ راشد الخیری کی حقیقت پسندی اور صدق بیانی کی ایک روشن مثال ہے۔

احمد ندیم قاسمی ———— امروز ۴ر فروری ۱۹۵۱ء

"مظلوم عورت کی حمایت اور طرفداری ان کی تمام تصانیف میں کی گئی ہے۔ ان جیسے مخلص مصنفین مشرق اور مغرب میں بہت ہی کم پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے عورت کو ایسے رنگ میں پیش کیا ہے"

سندھی اخبار ہلال پاکستان ———— ۴ر فروری ۱۹۵۱ء

بیسویں صدی کے ممتاز ادبا اور مصلحان قوم میں علامہ راشد الخیری کا بہت اہم مقام ہے بالخصوص مسلم عورتوں میں بیداری پیدا کرنا ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ..... حقوق نسواں کے لئے وہ مسلسل جہاد کرتے رہے اور غیر منقسم ہند میں "مکتی داتا" (نجات دہندہ) کے نام سے مشہور ہوگئے۔ .... اردو ادب کے ایک بلند مرتبہ ادیب کی حیثیت سے وہ زندہ جاوید ہیں لیکن اس سے بھی بڑی کامیابی ان کی یہ ہے کہ انھوں نے مسلم خواتین میں بیداری کا جذبہ پیدا کیا ...... ادب کی تاریخ میں اپنے قسم کی یہ پہلی مثال ہے کہ ایک مصنف نے صرف ادب کا سہارا لے کر عورتوں کی بیداری کا کام شروع کیا اور اسے اس قدر زبردست کامیابی حاصل ہوئی ......

علامہ راشد الخیری اس صدی کی عورتوں کی جد و جہد کے عظیم محرک اور ان میں روح پھونکنے والے تھے .....

کہ آخر وقت تک اس نے دکھائی اپنی پامردی
حقیقت تو یہ ہے بہبودیٔ نسواں کی حد کر دی

نوری صدیقی لکھنوی ——— عصمت راشد الخیری نمبر

ایسا محسن ہم کو صدیوں تو نہیں سکتا نصیب
عمر بھر ہو کیونکر کہ اک غم آشنا کھو یا گیا

خورشید اقبال حیا ——— عصمت فروری ۱۹۳۸ء

اپنی پستی کی طرف آنکھ جو اٹھ جاتی ہے
صنف کمزور جب اس فکر میں گھبراتی ہے
رہبری کو کوئی رہبر جو نہیں پاتی ہے
راشد الخیری مرحوم کی یاد آتی ہے
جب وہ پاتی ہے گلستانِ وفا کو تاراج
جب نظر آتا ہے بدلا ہوا "دنیا کا مزاج"
جب دبا تا ہے بہت اس کو "زمانہ کا رواج"
راشد الخیریؒ مرحوم کی یاد آتی ہے

ام زہرا ہاشمی ——— عصمت فروری ۱۹۳۹ء

بے زبانوں کا رہا سرمایۂ گفتار تو
فرقۂ نسواں کا تھا تنہا علمبردار تو

نہال سیوہاروی ——— عصمت فروری ۱۹۴۱ء

دلوں میں پھونک دی تھی روح ہمدردیٔ نسواں کی
یہ کیا تھا گر نہ تھا سحرِ حلال راشد الخیری!

نوری صدیقی لکھنوی ——— عصمت فروری ۱۹۴۱ء

تیری کوشش سے وہ فرقہ بن گیا اہل قلم
انگلیاں جس کی قلم ہوتیں اگر کچھ لکھ دیا
تو نے تنظیم و حمایت دل سے کی اُس جنس کی
ابتری و کس مپرسی میں جو تھا بھولا ہوا
جہل کی تاریکیوں میں جو پھنسا تھا آج تک
طبقۂ علمی میں اس کا نام روشن کر دیا

بصیر صدیقی بدایونی ——— عصمت فروری ۱۹۴۱ء

اُس کا کہنا تھا کہ کس دین میں یہ جائز ہے
اپنے اک محسن و مشفق سے حقارت کرنا
اُس نے دکھلایا کہ اقوام کو ہے باعث ننگ
اپنی خواتین کی تعلیم سے نفرت کرنا
قول تھا اس کا کہ جس قوم کی عورت ہے غلام
اُس کا حصہ نہیں، دُنیا میں حکومت کرنا
اُس نے جتلایا کہ اخلاق کی توہین ہے یہ
اہل خانہ سے نہ احسان و مروّت کرنا
اُس کا مسلک تھا کہ انکارِ حقوقِ نسواں
ہے قوانین الٰہی میں خیانت کرنا

زیب عثمانیہ لودیانوی ——— عصمت فروری ۱۹۳۱ء

طبقۂ نسواں میں پھونکی تو نے آزادی کی روح
تو ہی اک عورت کے دل کا تھا جہاں میں رازدار

نسیم فاطمہ آگرہ ——— عصمت فروری ۱۹۳۱ء

لاکھ ڈھونڈھیں لاکھ سر پٹکیں دیارِ ہند میں
غمگسارِ فرقۂ نسواں اب اُن جیسا کہاں

ابوالاعجاز ازل ——— عصمت فروری ۱۹۳۲ء

صنف نازک اُس کی کوشش سے بنی اہل قلم
طبقۂ نسواں کا تھا پہلے قلم ٹوٹا ہوا

قیصر جہاں بدایونی ——— عصمت فروری ۱۹۳۳ء

طبقۂ اہل قلم، گم شعبۂ بانی میں تھا
اور تُو تنہا خواتین کی طرفداری میں تھا
تیری جاں سوزی برائے طبقۂ مظلوم تھی
تیری تحریروں کی دنیائے ادب میں دھوم تھی

بشیر النسا بیگم ——— عصمت فروری ۱۹۳۳ء

جو آج عورتوں میں بیداریاں ہیں پیدا
دراصل ہے نتیجہ تیرے ہی کوششوں کا

خلیق برہانپوری ——— عصمت فروری ۱۹۳۶ء

مل چکی تھیں خاک میں تونے اُجاگر کر دیا
کوششوں سے اُن کو مردوں کے برابر کر دیا

قیصر جہاں ہمایونی ـــــــ عصمت فروری ۱۹۵۶ء

محسنِ اعظم جب آتا ہے زباں پر تیرا نام
کھلنے لیتا ہے جو تیرے بوستانِ کلام
تونے چھوڑا ہے ہمارے دل پہ وہ نقشِ دوام
تاقیامت عورتیں تیرا کریں گی احترام
تو تڑپتا تھا ہمارے غم میں اے عالی نژاد
حشر تک ہم کو تڑپاتی رہے گی تیری یاد

عظمت ایوب بی اے ـــــــ عصمت فروری ۱۹۵۶ء

پیام جس کا ہے حسن معاشرت کا امین
کلام جس کا ہے "انتم لباس" کی تفسیر

آغا صادق ـــــــ عصمت فروری ۱۹۵۶ء

تونے ماؤں بیٹیوں بہنوں کے بخشے حقوق
بے زباں مظلوم بیواؤں کے دلوائے حقوق

فیاض قادری ـــــــ عصمت فروری ۱۹۵۶ء

حبِ نسواں کے لئے شمشیر کی جو بے نیام
ہوگیا دنیا میں بھی اور آخرت میں نیک نام

علاؤ الدین احمد ساحر دہلوی ـــــ عصمت فروری ۱۹۵۶ء

مظلوم عورتوں کا جو تو ترجماں ہوا
ہر سنگ دل کی آنکھ سے آنسو رواں ہوا
دُنیا سمجھ رہی ہے خواتین کا مقام
ہونے لگا ہے عالمِ نسواں کا احترام

خلیق برہانپوری ـــــــ عصمت فروری ۱۹۵۶ء

کون تھا جو ہم غریبوں کے لئے روتا رہا
جان اپنی بدنصیبوں کے لئے کھوتا رہا

کون تھا شیطان سے جو عمر بھر لڑتا رہا
غاصبوں پہ جو پے بہ پے جس کا عصا پڑتا رہا
یہ تھا کوئی فرشتہ صرف اک انسان تھا
جس کے دل میں درد تھا اور بانوی [illegible]

جہاں آرا چودھری ـــــــ عصمت فروری ۱۹۵۶ء

جنابِ راشد الخیری کے دم سے
غم ملت دلوں کا ترجمان تھا
یہ دامن صورتِ آغوشِ مادر
غریبوں کے لئے اک سائبان تھا
اسی کا خون صورتِ قطرہ قطرہ
جواہر ریزہ تھا گوہر فشاں تھا

حفیظ جالندھری ـــــــ حریت مہر فروری ۱۹۵۶ء

نسواں کے اضطرابِ مسلسل کا چہرہ کش
اک داستاں گداز کی رفعت نے ہوئے

شورش کاشمیری ـــــــ چٹان لاہور ۸ فروری ۱۹۵۶ء

اسلام! اے طبقۂ مظلوم کے حامی ادیب
اسلام اے صورت و معنی کے اسلامی ادیب
اسلام اے دخترِ معصوم کے عزت شناس
اسلام اے خواہرِ مظلوم کے رفعت شناس
اسلام اے زوجۂ ذی جاہ کے حق کے امیں
اے خدا آگاہ بر تو آفریں صد آفریں
اسلام اے مادرِ مشفق کی حرمت کے نقیب
اسلام اے جوہرِ نسواں کی عزت کے نقیب

خلیق قریشی ـــــــ ڈیلی بزنس لائل پور ۱۸ فروری ۱۹۵۶ء

اے کہ تیری ذات تھی گنجینۂ مہر و وفا
عمر بھر عورت کی مظلومی پہ تو روتا رہا

تیرے ہر اک ساز میں سوزِ غم پنہاں بھی تھا
تیرا ہر نغمہ علاجِ گردشِ دوراں بھی تھا

آزاد شیرازی ـــــ ڈیلی بزنس لائل پور ۲۳ فروری ۵۲ء

آج پھر اس کا یومِ وصال آگیا — بے نواؤں کی دم ساز جس کی نوا
جس نے توڑا طلسمِ رسوم و قیود — بے زبانوں کو جس نے سہارا دیا

حفیظ ہوشیار پوری ـــــ عصمت فروری ۶۲ء

عورتوں کی آج جو عزت ہے ہندوستان[۵] میں
آ رہی ہیں یہ نظر چاروں طرف اس شان میں
کوئی مانے یا نہ مانے ہو گی ہے یہ ایک بات
اس کا باعث ہے اکیلی، راشد الخیری کی ذات

دعاڈ بائیوی ـــــ عصمت فروری ۳۲ء

۵ غیر منقسم ہند (بھارت پاکستان)

باب بائیسواں ـــــ علامہ راشد الخیری اور اصلاحِ نسواں

خواتین اپنا خضر و مرشد و رہبر کہیں اُس کو
تعجب کا نہیں موقع کہ پیغمبر کہیں اُس کو
(اخترؔ شیرانی)

علامہ راشد الخیری کا مطالبہ حقوقِ نسواں

معمولی بات نہ تھی ایک آگ تھی جو برصغیر ہندو پاکستان میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک لگی ہوئی تھی۔ عورتوں کے حقوق کی حفاظت وحمایت منطق نفسیات اور اخلاقیات کے مطابق اور شرع اسلام کے موافق تھی۔ لیکن کچھ سمجھا گیا کچھ سمجھایا گیا تو یہ کہ یہ شخص عورتوں کو بغاوت پر اُکسا رہا اور ہمارے گھروں کا سکون وچین غارت کر رہا ہے۔

"میں نے اپنے کانوں سے سُنا اور تحریریں آنکھوں سے دیکھی ہیں کہ بعض ناعاقبت اندیش علامہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے عورت کو آزادی کا سبق پڑھا کر مسلمانوں کے گھروں کی خوشی وامن کو غارت کر دیا ہے۔ ہندوستانیوں کے گھر بگاڑ دیئے ہیں"

ـــــــــــ عصمت راشد الخیری نمبر
بیگم ڈاکٹر نصیر الدین احمد

"عورتوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کا الزام اُن پر لگایا گیا .... مگر وہ حقوقِ نسواں کے لئے مسلسل جہاد کرتے رہے۔"

منان گجراتی ـــــــــــ ۳ فروری ۱۹۵۲ء

۱۹۱۳ء میں انہیں قتل تک کی دھمکی دی گئی۔

"حقوقِ نسواں کے متعلق جو الفاظ اس قلم سے نکلے اور اُن پر جو شورش ہو رہی ہے اس کو دیکھ کر خدا کی شان یاد آتی ہے۔ جس مذہب نے علی الاعلان یہ حکم دیا تھا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں جیسا مرداں کے ساتھ۔ آج اُس کے پیرو ایسے شخص کو جو صرف اُن حقوق کا مطالبہ کر رہا ہے جو شرع اسلام نے عطا کئے مار ڈالنے کی دھمکی دیتے ہیں"

ـــــــــــ تمدن نومبر ۱۹۱۳ء

مشہور انشا پرداز حضرت ل احمد اکبر آبادی کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا:۔

"ہر طرف سے اصرار ہے کہ میں حقوقِ نسواں سے ہاتھ اُٹھاؤں خیال فرمایئے کیسی غلط خواہش ہے"

ـــــــــــ عصمت راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء

۲۰ سال بعد ایک مضمون "جہاں آباد کے طائران خوش الحان کی نغمہ سنجی" کے دوران میں ایک خط شائع کیا تھا:

"انگاروں نے آپ کا قلب بھی جلایا یا نہیں حضرت جلنے کے واسطے تو ہم مسلمان ہی ہیں۔ آپ تو مجلس میں چنگی ڈال کر الگ ہوئے۔ کیا اب بھی آپ کو اس سے اتفاق نہیں کہ یہ دیا سلائی آپ ہی کی رکھی ہوئی ہے اگر آپ حقوقِ نسواں پر یہ شور و غوغا نہ مچاتے اور ان نااہلوں کی حوصلہ افزائی اس طرح نہ ہوتی تو ہم کو

یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مولانا ہمارے بڑوں نے جو کچھ کیا تھا وہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ تعلیم نسواں کے اسی واسطے خلاف تھے اب آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا اور جو کچھ آپ دکھائیں گے۔ دیکھنا پڑے گا" ——— عصمت ۱۹۱۸ء

اس میں ذرا شک و شبہ نہیں کہ علامہ مغفور نے ۴۰ سال تک مسلسل حقوقِ نسواں کے لئے قلم سے بھی جہاد کیا اور جب اور جہاں موقع ملا تقریروں سے بھی۔ مگر یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انہوں نے جس قدر حقوقِ نسواں کے لئے لکھا اور کہا اس سے بہت زیادہ اصلاحِ نسواں اور فرائضِ نسواں کے متعلق عصمت اور سہیلی اور پھر بنات۔ یہ پرچے جاری ہی اس لئے کئے گئے تھے کہ عورتوں کو اُن کے فرائض سے آگاہ کیا جائے اور قوم میں سعادت مند بیٹیاں فرماں بردار بیویاں اور عاقبت اندیش مائیں پیدا کی جائیں۔ عصمت علامہ مغفور ہی کے الفاظ میں جاری اس لئے کیا گیا کہ :-

" لڑکیوں کو بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرضِ منصبی ہے۔ جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لئے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں ان کو پیش آئیں گی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے ہونے چاہئیں۔ لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بچوں کی پرورش میں عصمت سے مدد ملے گی۔ اور وہ بتائے گا کہ جس آمدنی کو وہ بے فکری سے خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے

صوانح عمری علامہ راشد الخیری

اور جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کئے ہیں ان کی ذمہ داریاں ان پر کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار کے ہوں گے تو عزت سے بسر کریں گے ——— (تمدن جنوری [illegible])

علامہ مغفور کی یہ قلبی رائے تھی کہ زمانہ حقوقِ نسواں کی حمایت کر دو رکوشش سے کر چکا اس کے لئے مردانہ پرچے موزوں ہیں۔ یہی سبب مردوں کے لئے ایک ماہنامہ تمدن ۱۹۱۱ء میں [illegible] کیا گیا۔ حالانکہ اس کا ادبی معیار بلند تھا اور [illegible] کے بہترین اہلِ قلم تمدن کے لکھنے والے تھے لیکن [illegible] اس وجہ سے کثیر مالی نقصانات اُٹھا کر ۸ سال بعد بند کرنا پڑا اور قوم کی نظر میں مردود ٹھہرا کہ اس کا [illegible] حقوقِ نسواں کی حفاظت اور حمایت تھا۔ جن لوگوں کا خیال تھا کہ علامہ مغفور آزادیٔ نسواں کا سبق پڑھا رہے یا عورتوں کو بغاوت کے لئے اُکسا رہے [illegible] غلطی پر تھے۔ اُنہوں نے چند مضامین پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جتنا مردوں کو عورتوں کے حقوق کی طرف انہوں نے متوجہ کیا اُس سے بہت زیادہ عورتوں کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف۔ یہ تو ان کے مشہور و معروف ضخیم معاشرتی ناول ہیں اور دس دس بیس بیس دفعہ شائع ہوئے ہیں ان میں اور یہ جو ۱۷، ۱۸ طویل افسانے یا ناولٹ ہیں جن کے اوپر تلے متعدد ایڈیشن خود مصنف کے سامنے نکل گئے۔ پھر مختلف افسانوں کے ایک درجن مجموعے اور افسانوں ہی کے نہیں مختلف ان گنت مضامین کے متعدد مجموعے ہیں ان کا لبِ لباب ہے کیا؟ اصلاحِ معاشرت و اصلاحِ نسواں اُن کے ابتدائی معاشرتی ناولوں "صالحات"

ناول "السالحۃ" اور "صبح زندگی" میں کیا مردوں کے خلاف عورتوں کے جذبات بغاوت اُبھارے گئے ہیں یا عورتوں کو اُن فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو ان کے ذمہ ہیں اور جن کو پورا کئے بغیر زندگی کی کامیابی ممکن نہیں اصلاح نسواں کے سلسلے کے ناولوں میں "شام زندگی" وغیرہ کا سلسلہ بہت مقبول ہوا۔ کیا ان میں نسیمہ۔ وسیم دلہن۔ نازلہ۔ عورتوں کے حقوق کی پامالی پر اور مردوں کے مظالم پر زمین آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں یا اپنے فرائض کی ادائیگی سے اپنے کردار کی بلندی سے محو نہ ہونے والے نقش دل پر چھوڑتی ہیں؟

وہ آزادیٔ نسواں جس میں مرد عورت کا امتیاز نہ رہے علامہ مغفور اُس کے سراسر خلاف تھے۔ کسی مضمون کے دوران میں تحریر فرمایا تھا کہ عورتوں نے ناجائز حقوق کا مطالبہ اس لئے شروع کیا ہے کہ مرد اُن کے جائز حقوق پامال کر رہے ہیں۔ اسی کو وہ ری ایکشن فرماتے تھے۔ عورتوں کو انہوں نے ہمیشہ یہ تلقین کی کہ تمہارے ذمہ جو فرائض ہیں ان کی طرف سے کوتاہی کسی حالت میں نہ ہونی چاہیئے۔ آزادیٔ نسواں کے سلسلے میں جو بے حیائی اور بے حمیتی آج کراچی کے مغربی ہوٹلوں اور پاکستان کے اکثر و بیشتر روزناموں کے صفحات پر نظر آرہی ہے اور اس کے جو نتائج مسلمان دن رات سن رہے بلکہ اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں مصور غم رح نے یہ سب تصویریں پہلے ہی سے کھینچ کر رکھ دی تھیں۔ ہماری تمدنی خرابیوں اور معاشرتی برائیوں کی اصلاح کے لئے اُن سے زیادہ کوشش کسی نے نہیں کی۔ انہوں نے جہاں مشرقی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے وہاں نہایت ہی عبرتناک نتائج دکھائے ہیں فضول رسموں کی پابندی اور توہمات کے جنہوں نے گھن کی طرح اندر ہی اندر سوسائٹی کو کھوکھلا کر رکھا ہے۔ مشرق کی جو باتیں خوبیوں بھری انہیں معلوم ہوئیں وہ قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ مغرب میں جو خوبیاں نظر آئیں اُن سے بھی علامہ مغفور نے انکار نہیں فرمایا مگر وہ سب سے پہلے عورت کو عورت اور مختلف حیثیتوں میں فرض شناس اور ذمہ دار عورت دیکھنا چاہتے تھے اور اس کی غفلت لاپرواہی یا کوتاہی سے جو خرابیاں پیدا ہو سکتی تھیں اُن پر بار بار مختلف پیرایہ میں اسے متوجہ فرماتے رہتے تھے۔ انہوں نے اصلاح نسواں کی کوشش ایسی کی اور اتنی کی کہ اگر وہ اس طرف توجہ نہ فرماتے تو برصغیر پاکستان و بھارت میں عورت کا وہ حشر ہو چکا ہوتا جو خدا نہ کرے کہ ہو۔

علامہ مغفور تادم حیات اصلاح نسواں کے لئے جو کوششیں فرماتے رہے ان کی ہلکی سی جھلک مندرجۂ ذیل اقتباسات ہیں جو یہ بھی ثابت کر رہے ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے اور بار بار کہا گیا کہ علامہ راشد الخیری بیسویں صدی کے مصلح اعظم تھے اس میں مبالغہ نہیں ہے حقوق نسواں کے لئے مسلسل جہاد بھی اصلاح تھی اور عورتوں کو ان کے فرائض پر بار بار متوجہ کرنا بھی اصلاح اور بہت بڑی اصلاح۔

حقوق و فرائض

ہم بار بار یہ پہلے بھی کہہ چکے اور اب بھی کہتے ہیں کہ ہماری غرض ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمان عورتوں کی ڈھیلی ڈوری چھوڑ کر بالکل آزاد کردیں اور دوسروں کی ریس میں وہ اصلی جوہر جس پر آج ہم اس ناداری اور افلاس میں بھی ناز کر رہے ہیں ہاتھ سے کھو بیٹھیں۔ لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ ان سختیوں کا تدارک اور ان زیادتیوں کا

ایک سے علاج کریں۔ جو مرض متعدی کی طرح پھیل رہا ہیں"

واعظین اسلام سے درخواست ——— ۱۱ء

"ہمارا منشا تو یہ ہے اور نہ ہوگا کہ حقوق کی چاٹ دے کر عورتوں کو اصل مذہب سے بیزار کریں۔ مسلمان عورتیں اپنے حقوق کی مستحق ہیں تو اس وقت کہ وہ مقدس اور پاک مذہب کے بموجب فرائض کو ادا کریں مگر وہ عورت جو خود ہی فرض کو ادا نہیں کرتی کس منہ سے شوہر پر الزام لگاتی ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا نہیں کرتا۔ . . . عورتیں اگر اپنے حقوق کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں تو پہلے اپنے فرائض پورے کریں اور یقین کریں کہ اگر مرد ان کے حقوق مار بھی رہے ہیں تو زمانہ ان کو سیدھے راستے پر لا کر مظلوموں کے حقوق دلوائے گا۔ اور ضرور دلوائے گا۔ یہ شکایت کہ مردوں نے ہمارے حقوق غصب کر لئے ہم کو آدمی سے جانور بنا دیا صرف وہی بیویاں کر سکتی ہیں جو ان فرائض کو نہایت خوشی اور اطمینان سے انجام دے سکی ہیں جو مذہب نے ان کے ذمہ مقرر کر دئے۔ مگر وہ بیویاں جو آٹھ بجے سو کر اٹھیں گھر سے بے خبر بچوں سے لاپرواہ۔ شوہر سے غافل وہ یہ حق نہیں رکھتیں کہ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں"

عورتوں کے حقوق ——— عصمت ۱۹ء

"غلطی پر ہیں وہ مسلمان جو لڑکیوں کو مسلمات کی تعلیم دے کر ان کی زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔ اگر اس افعی کا زہر چڑھ گیا تو سب کو ڈس کر چھوڑے گا۔ حکومت کا نشہ پہلے مردوں کے دماغ سے اتارو اور جب وہ مسلمان ہو جائیں اس کے بعد عورتوں کو اس سطح پر لاؤ"

شبستانِ زندگی ——— ۱۹۳۱ء

معاشرتی علامہ راشد الخیری

"میں نے اپنی بعض تحریروں اور تقریروں میں یہ کہا ہے کہ مرد عورت کا مرتبہ قریب قریب برابر ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب کبھی نہ تھا کہ ترازو کے دونوں پلڑے میں رتی بھر فرق نہیں . . . . . . اب مسلمان عورت والے کہ برابر کی حیثیت رکھتی ہے غیر صحیح ہے وہ ملک ضرور ہے اور اس کا مرتبہ بھی کچھ کم بلند نہیں مگر وہ اس کا حاکم نہ سہی سر دھرا ضرور ہے"

احکام نسواں ———

مولانا محمد علی مرحوم مولانا شوکت علی اور چند احباب بیگم راشد الخیری صاحبہ کے یہاں تھے۔ دوران گفتگو میں انہوں نے اپنے بھائی شوکت علی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

"مجھے راشد کا یہ اصول بہت پسند ہے کہ اس نے لڑکیوں کی ڈھیلی ڈوری نہیں چھوڑی۔ ایک طرف ان کے حقوق پر بحث کی تو دوسری طرف ان کے فرائض پر۔ یہی وجہ ہے کہ میں گلنار کو اپنے ہاتھ سے عصمت دیتا ہوں"

جہاں آباد کے طائرانِ خوش الحان کی نغمہ سنجی ——— ۱۹۳۶ء

عفت و عصمت

"اگر میدانِ حیات میں جہاں خود غرضی اور درندے ہر طرف منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ عورت کا قدم ڈگمگا گیا تو زندگی کے ان چند لمحوں میں جب نفس اس کو دھوکا دے کر اس کے ایمان پر حملہ کرتا ہے۔ عقل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں تو یہ وہ نازک وقت ہوتا ہے کہ زمین اس ملعون عورت پر شرارے اگلتی ہے۔ چنگاریاں اڑاتی ہے اور انگار برساتی ہے۔ آسمان اس نابکار ہستی کے منہ پر تھوکتا ہے لعنت بھیجتا ہے اور تبرا کرتا ہے"

تفسیرِ عصمت ——— ۱۹۲۵ء

" اُس وقت کی دُنیا میں اس (کلثوم) کو دو چار یا دس پانچ نہیں ہزار ہا مسلمان شرع اسلام کے خلاف سمجھ رہے تھے۔ اور آج مجھ کو اس لئے کہ اس کو سراہ رہا ہوں، نہ معلوم کس قدر گنہ گار خیال کریں گے۔ بہرحال اس فیصلہ کا وقت آئے گا۔ لیکن مسلمان عورت کو یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کی عصمت سرکار دو عالم کی وہ امانت ہے جس کے متعلق "اجہار عباسی" کے الفاظ آج بھی تاریخ میں گونج رہے ہیں اور بچوں کی تربیت خدا کی وہ امانت ہے جس پر قوم کی تباہی و اصلاح کا انحصار ہے جس سے اسلام بنے گا یا بگڑے گا اور اس کی ذمہ دار مائیں اور صرف مائیں ہوں گی "

خدائی راج ———————— سنہ۵ء

" بعض کوتاہ اندیش مائیں محبت کے

میاں بیوی! پردے میں لڑکیوں کے ساتھ پوری پوری عداوت کرتی ہیں۔ بیٹی کو پہلی نصیحت یہ ہوتی ہے کہ چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مگر اپنی بات کو ہمیشہ اونچا رکھیو۔ میاں کو قابو میں لانے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ جب تک گھنٹوں خوشامد نہ کرے جواب نہ دو۔ اگر شروع ہی سے رُعب جم گیا تو بس عمر بھر کے لئے بیڑا پار ہے۔ اور رُعب جمانے کا یہ آسان طریقہ ہے کہ اوّل تو بولو ہی نہیں اور جو بولو تو اس طرح جیسے کوئی کاٹ کھانے کو دوڑا۔

ان باتوں کا نتیجہ شاید اُن کے زمانے میں بھولے بھالے مردوں سے سابقہ پڑنے پر اچھا ہوتا ہوگا۔ لیکن آجکل کے پکے مرد تو ایسی بیوی کے نام پر جھاڑو ہی مار دیں۔۔۔۔ شادی ہو جانے کے بعد لڑکی کا پہلا کام یہ ہے کہ کسی طرح میاں کے دل میں اپنی محبت پیدا کرے اور اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہر طرح اس کی رضامندی حاصل کرنی چاہیے"

بے وقوف بیوی ———————— سنہ۸ء

" بیوی کا سب سے پہلا کام نہ خاوند کی اطاعت ہے نہ فرماں برداری بلکہ اس بات کا پتہ لگانا ہے کہ اس کی طبیعت کا رحجان کس طرف ہے۔ کیا اسباب ہیں جن سے اس کی طبیعت مکدر ہو سکتی ہے اور کون سا سامان ہے جو اس کی مکدر طبیعت کو بشاش بنا سکتا ہے۔ جن لڑکیوں کا یہ خیال ہے یا ان کو یہ تعلیم دی گئی کہ اوّل ہی دن سے خاوند پر رُعب بٹھانا چاہیئے وہ بالکل غلط رستے پر جا رہی ہیں۔ منزلِ مقصود اُن سے کوسوں دُور ہے۔ مشکل ہے کہ وہ اپنی زندگی ہنسی خوشی بسر کر سکیں۔ عمر بھر جوتیوں میں دال بٹے اور تُکا فضیحتی رہے گی "

اچھی بیوی ———————— سنہ۱۰ء

" اگر تکلیف پہنچے تو دل میں رکھو۔ شکایت تو درکنار ہونٹوں تک نہ لاؤ۔ یہ نہ ہو کہ آیا اور گیا۔ رشتہ دار اور غیر سب کے آگے میاں کا رونا کھل رہا ہے۔ یاد رکھنا بیوی خاوند کی سب سے بڑی رازدار ہے۔ رُوح تن سے نکل جائے مگر شوہر کی بات باہر نہ جائے۔ لڑکیوں میں بدگمانی ایک ایسا بڑا مرض ہے جس کا انجام موت سے بھی بدتر ہے جب تک آنکھ سے نہ دیکھ لو کسی بات کا یقین نہ کرنا "

لڑکیوں کی انشا ———————— سنہ۱۱ء

" سسرال میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام بیوی کا یہ ہے کہ وہ جس طرح ممکن ہو شوہر کے دل پر قبضہ کرے اس مقصد کے حاصل کرنے کے واسطے اگر اس کو شوہر کی غیر معمولی خدمت بھی کرنی پڑی تو اس کا فرض ہے کہ وہ کرے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ خولا مدینہ کی ایک عورت ہے جب رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر

یہ عرض کیا ہے کہ میں کوشش کر چکی مگر میرا شوہر توجہ نہیں کرتا۔ آپ کا کیا ارشاد ہے تو آنحضرت نے فرمایا اپنی کوشش کئے جاؤ خدا سے صلہ کی توقع رکھو"

عورتوں کے حقوق ——— ۱۹۱۴ء

"جب عقل سلیم یہ تسلیم کر چکی کہ لڑکی کی آئندہ زندگی کا دارومدار اس کے شوہر پر ہے اور وہ بھی شادی کے اسباب کو اچھی طرح سمجھتی ہے تو اب اس کا سب سے پہلا کام شوہر کو خوش رکھنا ہے خواہ اس کو اس کے حاصل کرنے میں کتنی ہی زبردست قربانی کرنی پڑے"

بیوی کا پہلا فرض ——— ۱۹۱۵ء

ابھی چند دن کی سختیاں تھوڑی سی مار امار ہے سے رام کرنا "ایک" کا بس پھر یہ بیڑا پار ہے

ذہن کو نصیحت ——— عصمت نومبر ۱۹۱۵ء

"اس کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آرام و آسائش کو بالکل ترک کر دے۔ وہ اس قدر بے حس ہو جائے کہ اس کو شوہر کی کوئی بات ناگوار ہی نہ گذرے۔ وہ اس بات کا پتہ لگائے کہ میرے شوہر کو کن چیزوں سے رغبت ہے۔ اور کن چیزوں سے نفرت۔ اور اس کے موافق عمل کرے۔ وہ اس بات کو معلوم کرے کہ میرا شوہر شادی کے بعد کس طریقہ پر زندگی بسر کرنی چاہتا ہے اور اس طریقہ پر بنیاد ڈال دے۔ اس کی لائی ہوئی ہر چیز کو خواہ وہ پسند ہو یا ناپسند بے حد پسند کرے اس کی جو بات ناپسند ہو اس کا کسی سے ذکر نہ کرے اس سے جو تکلیف پہنچے ابتدائی حالت میں اس کا بھی کسی سے اظہار نہ کرے۔ اس بات کی کوشش کرے کہ اس کی نگاہ میں حسین اور خوبصورت معلوم ہو۔

اس کی پیاری چیزوں اور پیاروں کو اپنا پیارا سمجھے گھر میں ماما اور باورچی موجود ہوں مگر اس کے کھانے پینے کا انتظام اپنے ہاتھ سے کرے۔ عمل سے اس کو یقین دلادے کہ تم سے زیادہ مجھے دنیا میں کوئی چیز عزیز نہیں اور نہ ہوگی"

شوہر کے دل میں محبت کیونکر پیدا ہو ——— ۱۹۱۶ء

"مسلمان عورتوں کے واسطے سرور کائنات کے زمانے کا ایک واقعہ ان کے حقوق کا کافی سبق رہا ہے کہ جب ایک عورت نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اپنے شوہر کی خدمت اور اطاعت میں کسی قسم کی کمی نہیں کی میں اس کا گھر ہر روز آراستہ کرتی ہوں۔ اس کی ضرورتوں کا ہر وقت خیال کرتی ہوں اس کی آسائش کو دنیا کی ہر شے پر مقدم خیال کرتی ہوں مگر اس کی خاطر میں کچھ نہیں آتا۔ اب آپ فرمایئے کہ میں کیا کروں۔ سرور کائنات نے یہ الفاظ سن کر جواب دیا کہ اسی طرح کئے جا۔ اور اپنے فرض کو پورا کر۔ تاکہ خدا کے ہاں تو سرخرو رہے"

شوہر کی رضامندی ——— عصمت ۱۹۱۶ء

"آج کل کی تعلیم اور بعض مضمونوں نے لڑکیوں کے دلوں میں یہ خبط پیدا کر دیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے حق برابر ہیں۔ جس طرح میاں کا بیوی پر اسی طرح بیوی کا میاں پر۔ لیکن کسی بیوی کی تباہی اور بربادی کا سبب اس لغو خیال سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا اور جس بدنصیب بیوی کے دل میں یہ خیال جگہ پا گیا کہ شوہر کو اس پر کوئی فضیلت نہیں تو یقیناً اس کی مٹی پلید ہوئی۔ خدا ایسے تباہ کن خیال سے ہر مسلمان بہن اور بیٹی کو بچائے"

ساجن موہنی ——— ۱۹۱۸ء

"شوہر ہمارا خدا ہے نہ رسول۔ وہ ہمارا معاون ہے اور ہم اس کے مددگار"

شام زندگی ———— سنہ [illegible]

"نکاح عورت کی شرافت کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ بڑوں کی لاج اور ماں باپ دادا کی عزت اس وقت عورت کے ہاتھ ہے۔ مرد کو تکلیف کا سامنا عمر بھر رہتا ہے۔ لیکن عورت کی آزمائش کا وقت یہ ہی ہے۔ اس پتلی راستے کی ابتدائی منزلیں کڑی ہیں۔ ہمت سے طے کر لو تو لالوں کی لال رہو گی"

شام زندگی ———— سنہ [illegible]

"آئے دن کے جھگڑے جو عام گھروں میں برپا ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ اگر غور کیا جائے تو میاں بیوی کے خیال کا اختلاف ہے۔ اس لئے بیویوں کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ شوہر کو اپنا ہم خیال کریں یا خود اس کی ہم خیال ہوں"

شام زندگی ———— سنہ [illegible]

"عورت کی زندگی کا ماحصل یہ ہے کہ شادی کے بعد اس کا شوہر اس کا بے حد قدر دان اور محبت کرنے والا ہو۔ جب اتفاق وقت یا بیوی کی لاپرواہی سے یہ موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے یعنی ابتدا میں بیوی اپنے فرائض ادا کرنے میں غفلت کرتی اور یہ بیج درخت بن کر اپنا زہریلا سایہ ڈالتا ہے اور یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ شوہر بیوی سے پریشان ہو کر اس کی اصلاح سے مایوس ہو جاتا ہے تو خود بیوی اور اس کے عزیزوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اب چونکہ پانی سر سے گزر جاتا ہے۔ طرح طرح کی کوشش شوہر کو راہ راست پر لانے کی ہوتی ہے۔ گنڈے تعویذ ہوتے ہیں تنکا بیتیں فیصلے۔ لیکن بے وقوف بیوی اتنا نہیں سمجھتی کہ اصل تعویذ تو وہی تھا کہ شروع ہی میں اس کے شوہر کے دل پر بیٹھ جاتا"

محبت کا تعویذ ———— سنہ [illegible]

"مسلمانوں کے موجودہ تمدن کو ملحوظ رکھ کر یہ لازمی ہے کہ لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دینا چاہیئے کہ اس کی خواہش اور کل اطمینان صرف ماں کی دہلیز تک ہے۔ وداع ہوتے ہی اس کی ہر قوت دنیا نے سلب کر لی اور پیدا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ جو شخص شوہر کی حیثیت میں اس کے سامنے آتا ہے اس کا دل مسخر کرے"

شب زندگی حصہ اول ———— سنہ ۱۹[illegible]ء

"پھوپی جان بھی ان کی عیاری میں برابر کی شریک تھیں انہوں نے اپنی طرف سے غصب کی کوشش نہ کی ہو مگر شوہر کی کوشش میں مزاحمت نہ کرنا اس کی تائید اور شرکت سے کم نہیں"

"تم نے مجھے بتا دیا کہ بیوی عورت نہیں جنت کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ مذہب یہ کہتا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدے کا حکم ہوتا تو بیوی شوہر کو کرتی۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ اگر گناہ نہ ہوتا تو میں تمہاری پرستش کرتا"

شب زندگی ———— سنہ ۱۹[illegible]ء

"آپ کامیابی کا انحصار اور راحت ابدی کا دارومدار صرف شوہر کی زباں برداری رہا۔ اگر اس منزل میں قدم ڈگمگا گیا اس رستے میں تیوری پر بل لے آئیں، اس سفر میں ہاتھ پاؤں کپکپا گئے تو ادھر سے بھی گئیں اور ادھر سے بھی۔ آزمائش کا موقع اور امتحان کا یہی وقت ہے۔ سینے پر آرے کلیجے پر چھریاں اور زخموں پر نشتر چلیں مگر زہر کا گھونٹ شہد اور تلخی کا ہر قطرہ شربت ہو"

نوحۂ زندگی ———— سنہ [illegible]

"اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ خدا کی رضامندی نماز روزہ ہی میں نہیں خلق کے بندوں میں ہے۔ مگر آج اس کو معلوم ہوا کہ شوہر کو ناخوش کرکے اگر خانۂ کعبہ کے اندر اور حضرت رسول کے پاس بھی رہ جائے تو مغفرت ہزاروں کوس دور ہے۔"

شب زندگی حصہ دوم ——— سنہ ۳۲ء

"بیوی کا اولین فرض اگر وہ زندگی اطمینان سے بسر کرنے کی خواہش مند ہے تو شوہر کو رضامند رکھنا ہے — یہ رضامندی جس قیمت پر میسر ہو سکتی ہے۔ اور جس حیثیت سے ہاتھ آ سکتی ہے۔"

شب زندگی حصہ دوم ——— سنہ ۳۲ء

"بعض لڑکیاں شوہر کی ابتدائی محبت پر بھول کر انجام کو بھول جاتی ہیں۔ ان کا فرض اولین یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش ان کی حالت میں خواہ کسی قسم کا تغیر پیدا کرے مگر جہاں تک ان کے امکان میں ہو وہ شوہر کی آسائش میں فرق نہ آنے دیں۔ بچوں کی تربیت ایسی ہو کہ وہ باپ کے اوقات میں خلل انداز نہ ہوں۔ بیوی صبح سات بجے شوہر کو چائے دیتی بچے ہونے کے بعد ایسا نہ ہو کہ سات بجے بچہ رو رہا ہے اور شوہر کی چائے ناغہ ہو گئی۔"

کنواری لڑکیاں خود مکر ہیں ——— سنہ ۲۳ء

"زندگی کی کامیابی شوہر کی رضامندی میں پوشیدہ ہے۔"

شب زندگی حصہ دوم آخری سطر ——— سنہ ۲۳ء

"اگر ایک بیوی کا خط اچھا ہے مضمون خوب لکھتی ہے لیکن روٹی پکانی نہیں آتی وہ کسی طرح بھی اچھی لڑکی نہیں سمجھی جا سکتی اور نہ ہم اس کے تعلیم یافتہ ہونے پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس سے تو وہ لڑکی اچھی ہے جو معمولی لکھنا پڑھنا جانتی ہے مگر خانہ داری کے اصولوں سے واقف ہے۔ ہم کو اس کا چٹکیلا مضمون نہیں چاہیے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ وقت مقررہ پر شوہر کے واسطے لذیذ کھانا تیار کرے۔"

سوانح عمری ملا واحدی

ماؤں کا کال ———

"اس وقت میرے دل نے صاف صاف کہا کہ مسلمان عورت کی جنت شوہر کی خدمت میں ہے۔"

ستونتی ——— سنہ ۳۲ء

"جس قسم کی لڑکیاں آج کل عارض پیدا کر رہے ہیں ممکن ہے وہ آپ کی رائے میں اسلام کے لیے مفید ہوں۔ مگر میں اس جاہل لڑکی کو جو جھونپڑی میں پھٹے پرانے میں شیر خوار ایک بچہ کو گود میں ایک کو پیٹ میں لیے شوہر کے واسطے روٹی پکا رہی ہے۔ اس لڑکی سے جو گریجویٹ کے ساتھ کچھ اور بھی لقب رکھتی ہے اور اسٹیج پر کھڑی دھواں دھار تقریر کر رہی ہے۔ لیکن ادائیگی فرائض سے کوسوں دور ہے۔ بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں۔"

بنات ——— سنہ ۳۰ء

ساس بہو - نند بھاوج

شاہدہ نے نند سے آنسو بھر کے کہا

"بھابی جان بُری ہیں یا بھلی میری تو ساس ہی ہیں میرے مُنہ پر تو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔ اگر منظور نہیں تھا تو صاف انکار کر دیتیں۔ خواہ مخواہ اتنی باتیں بنائیں اور ساتھ ہی مجھ کو بھی لپیٹا۔ وہ بری ایسی ہیں کہ آج اچھی اچھی اُن پر سے قربان کی ہیں۔ کوڑے کی ہوں گی جو مجھ کو ابا جان نے وہاں دھکا دے دیا۔ اب وہ لوگ بُرے ہو گئے میرے واسطے اچھے تھے۔"

صالحات ——— سنہ ۱۸۹۶ء

"میاں، جب گھر میں گھسے بیوی بیمار۔ بیماری کیا ہوئی چھت
کا سر ہو گیا کہ گردن گردن؟ آخر یہی جواب ہوگا کہ کم بخت
گرچہ ایک دن کی بیماری ہو تو کوئی بھگت لے۔ دو دن
کی ہو تو اٹھا لے۔ تیس دن کی مصیبت کون اٹھائے تم
سمجھتی ہو گی اس سے محبت بڑھے گی۔ میاں قدر کرے گا
مگر قیصر محبت یوں نہیں بڑھتی۔ پیاری دل میں گھر کرو
اور پھر گھر کی ملکہ بنو۔ خاک ہو جاؤ اور پھر اکسیر بنو۔
ساس نندیں جو آج تم سے سیدھے منہ بات نہیں
کرتیں چند روز کی حکومت کر رہی ہیں۔ میاں کو ہاتھ میں
لیا اور یہ جھکیں . . . . . وہ بیوی ہی کیا جو میاں کے
تیور نہ پہچانے"

لڑکیوں کی انشا ______ سنہء

"ساس نندیں کتنی ہی ظالم اور کتنی ہی بے انصاف
کیوں نہ ہوں مگر ان کی رضامندی سے خاوند خوش ہو
تو تقدیر پر جبر کر کے ان کی رضامندی کو لازم سمجھنا چاہیے
تاکہ اصل مقصد کسی طرح پورا ہو۔ اس وقت کی تھوڑی
کوفت ہمیشہ کا چین ہے۔ اگر اپنا مقصد یہی قرار
دے لے۔ کہ جس طرح بھی ہو سکے۔ مجھے اس شخص کے
دل میں اپنی عزت و وقعت پیدا کرنی ہے تو ناکام ہونے
کی کوئی وجہ نہیں"

عورت کا مقصد زندگی ______ سنہء

"بہت ہی کم گھر ایسے ہوں گے جہاں یہ خیال کیا جاتا ہو
کہ یہ بیچاری جس سے پہلے کسی کی جان نہ پہچان غیر جگہ
کی رہنے والی۔ پر محلے کی بسنے والی۔ اپنے تمام عزیز اور
رشتہ داروں کو چھوڑ پیاروں سے منہ موڑ۔ جو ہمارے
ہاں آئی۔ ماں جیسی رفیق۔ باپ جیسا شفیق۔ بہن جیسی
مونس۔ بھائی جیسا غمگسار۔ اس امید پر نثار کے ہیں
کہ اس گھر پر حکومت کرے گی۔ نہ یہ کہ ساس بہو کی تمام
امیدوں کا خون ارمانوں کا خاتمہ کر دے۔ ساسیں جس
طرح سر پر ہاتھ رکھ کر لاتی ہیں۔ اگر اسی طرح چھاتی سے
لگا کر رکھیں اور اپنے اس وقت کو آنکھوں کے سامنے
رکھیں جب آپ دلہن بنی گھونگھٹ میں چپکی بیٹھی تھیں
اور ساس نندوں کے طعنے کلیجے پر تیر لگ رہے تھے
تو ہرگز اس طرح ٹھونک ٹھونک کر نہ جلائیں"

ہزار برس کی بہو ______ سنہء

"ایمان والی ساسو! ایمان نہ نگلنا۔ اولاد رکھتی ہو۔ بیٹا
بیٹی آگے ہیں کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھو اور مامتا کو مامتا
سمجھو۔ نہ یہ آسمان سے گریں۔ نہ زمین سے اگیں۔ ماں
باپوں کی بیٹیاں اور بھائیوں کی بہنیں ہیں۔ اسی دنیا
اسی جہان میں اسی شہر میں ایسے ایسے وارث رکھتی ہیں
کہ ان کے پسینہ کی جگہ خون بہا دیں۔ مگر ان کی شرافت
دیکھو کہ تمہارے ظلم سہیں اور اف نہ کریں۔ باتیں سنیں
اور چپکی رہیں۔ جانتی ہیں کہ مرنا ہے اور بھرنا ہے۔
تم ان کو برا کہو رسوا کرو اور یہ مصیبت ماریاں تمہارے
منہ تک کر خاموش ہو جائیں۔ گھر لانے کی لاج اور ساس
بننے کی شرم یہی ہے کہ اٹھتے جوتی۔ بیٹھتے لات۔ کیڑے
ان میں ڈالو۔ پھوہڑ انہیں بناؤ۔ بے ڈھنگا انہیں
بناؤ۔ غرض جو میکے میں سگھڑ نیک سلیقہ والیاں
کہلاتی تھیں تمہارے ہاں قدم رکھتے ہی سو بروں
کی بری ہو گئیں۔

ہزار برس کی بہو ______ سنہء

"ساس نندوں کی حکومت تجھ پر ہمیشہ قائم رہنے
والی نہیں۔ ان کے تعلقات کی خواہ وہ ظلم ہی کیوں
نہ ہوں نرمی سے برداشت کر اور خاوند کے دل میں

گھر کرلے۔ یہ تجھ کو گھر کی ملکہ بنادے گا۔ اور تو وہ وقت جلد دیکھے گی کہ جو آج تجھ پر حکومت کررہے ہیں وہ تجھ سے محبت کریں گے ...... اب جبکہ تو گھر والی ہوئی کوشش کیجیو کہ ماں بن کر تو اپنے بچوں کو وہ جھگڑے نہ دکھائے جو تونے اپنے لڑکپن میں اور میاں بیوی یعنی ماں او باپ میں دیکھے ...... اب تک زمانہ کی غفلت میں جن لوگوں سے واسطہ تھا وہ پہاڑ کو تل بنانے والے تھے اور اب جن سے معاملہ ہے وہ رتی کو بانس پر چڑھانے والے ہیں"

ہونٹوں کو مواتیں ———— ۱۹۶۳ء

میں کیا کروں مجبور ہوں

ہائے پرائے بس میں ہوں

ہے مرحلہ سسرال کا

اور ساس نندوں کا اثر

بہن کا خط ———— ۱۹۶۳ء

"میاں بیوی کو مستقل طور پر ایک زندگی بسر کرنی ہے ساس نندوں کی گفتگو طعنے تشنیع محض عارضی ہیں۔ اگر اس نے شوہر کا دل فتح کرلیا ہے تو یہ وہ فتح ہے جو زندگی بھر عیش کرے گی۔ سمجھدار بیوی ابتدا میں ساس نندوں کی ناجائز سختی پر خاموش رہتی ہے۔ بیوی کے واسطے یہی وقت صبر و تحمل کا ہے اور اگر اس نے اس وقت شوہر کے دل میں اچھے بیج بودیئے اور عارضی تکلیف کو تکلیف نہ سمجھا تو ان بیجوں کے ایسے پھل کھلیں گے کہ آخری سانس تک مرجھانے والے نہیں"

سانس نندیں ———— سہیلی ۱۹۶۳ء

مرد کی کمائی عورت کا سلیقہ | "انسان کا سب سے بڑا جوہر امانت داری

فرض ہے اور عورت کا سب سے بڑا فرض خاوند کی کمائی کا جائز صرف"

گدڑی میں لعل ————

"چڑا لایا دال کا دانہ۔ چڑیا لائی چاول کا [illegible] نے مل کر کھچڑی پکائی۔ اس کا مطلب یہ ہے [illegible] خاوند کی آمدنی بیوی کا سلیقہ۔ دونوں کی محنت سے [illegible]

وبال جان ———— [illegible]

"دنیا میں اس عورت سے زیادہ بے وقوف کون ہوگی جو انجام پر مطلق نظر نہ کرے ... [illegible] لے کر آئے ابھی بیوی سے بات کرنی نصیب نہیں ہوئی کہ تقاضا گیر سر پر موجود ہیں۔ گھر میں بھر میں رونا سی پڑ گئیں۔ اب مہینہ بھر بیٹھے بیٹھے بھگتو"

بکھرے نقیر ———— [illegible]

"شوہر کی کمائی جس کو وہ نہایت محنت مشقت سے کما کر تم کو دیتا ہے بے جا خرچ نہ کرو۔ سوچ سمجھ کر جہاں تک ممکن ہو سکے کام پیسہ میں نکالو۔ پر یہ سمجھو کہ نہ تو اس درجہ فضول خرچی کرو جس سے لوگ نام دھریں اور خاوند کے دل سے گر جاؤ نہ اتنی کنجوسی اختیار کرو کہ یہ مثل سنو۔ جوڑ جوڑ مر جائیں گے اور مال جنوائی کھائیں گے۔ ہمارے نبی پاک صلعم نے فرمایا ہے "راست روی اختیار کر سلامت رہے گا"

مسلی ہوئی پتیاں ————

"بیٹی کا بیاہ ہے۔ خرچ سر پر ہے۔ میاں پریشان ہے کہ کہاں سے لاؤں۔ بیوی کے پاس جو کچھ جمع جتھا ہوئی اس نے نکال سامنے رکھ دی۔ میاں کا دل باغ باغ ہوگیا۔ پریشانی کا بڑا حصہ محض بیوی کی کفایت شعاری سے رفع ہوگیا۔ آج کل ضرورت یہ ہے کہ

کلب میں کسی سے کپڑوں کم نہ ہوں - اور جو کہیں میلے ہوئے تو میں صاحب گھٹنے ٹیک دیں گی - غرض بڑی رقم بیوی کے کپڑوں میں صرف ہونی چاہئیے - میاں کی اچکن تین برس کی ہو مگر بیوی کی کلائی پر گھڑی ضرور ہوگی"

مرنے والیاں کہتی تھیں حق ہمسایہ ماں کا جایا" بہت مشکل تھا کہ پڑوس میں فاقہ ہو اور آپ اطمینان سے کھانا کھائیں - ان کے تعلقات کا میل جول ان بیویوں کے ساتھ ایسا تھا کہ آج اپنوں میں وہ بات نظر نہیں آتی - کچھ تو تھا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ کھانا نکالنے بیٹھیں - میاں کو دیا - بچی کو دیا - آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہیں تو ہمسائی کی لڑکی تتلا کر کہہ رہی ہے استانی جی اماں نے ذرا سا سالن مانگا ہے - بھائی کی روٹی رو کھی ہے"

پہلی بیویاں ______ عصمت سنہ ۱۱ء

"ہر عورت کا جو بیوی کی حیثیت سے خانہ داری کے فرائض انجام دے رہی ہے - پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک بجٹ بنائے اور ہر مد کا علیحدہ علیحدہ حساب رکھے - اگر خرچ آمدنی سے کم ہوگا تو کبھی مالی دقتیں پریشان نہ کریں گی"

خانہ داری کا بجٹ ______ سنہ ۱۳ء

"سگھڑ یا پھوہڑ ہونا روپے کی کمی بیشی پر نہیں - بلکہ طبیعت کی صفائی اور مزاج کی نفاست پر منحصر ہے"

سگھڑاپا ______ سنہ ۱۵ء

"یہ غریب مرد کس مصیبت سے اپنی تنخواہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں - مگر میں تو پھر یہی کہوں گی کہ شاباش ہے ان بیویوں پر جو ایسے گاڑھے پسینے کی کمائی اور ایسی محنت و مشقت کی روزی کی قدر نہ کریں اور دریا دلی سے لٹا دیں یہ ہرگز بیویاں کہلانے کی مستحق نہیں بلکہ دوست کے پردے میں دشمن ہیں"

شام زندگی ______ سنہ ۱۷ء

"جو حالت بیوی کی میکے میں تھی اسی حالت کو وہ شوہر کے ہاں قائم رکھنے کی توقع نہیں کر سکتی - اگر اس کے باپ کی آمدنی پانسو روپیہ ماہوار تھی اور شوہر کی صرف پچاس تو جس طرح اس نے کنوار پتے میں زندگی بسر کی اسی طرح اس کی یہاں بسر کرنے کی توقع کھلی ہوئی غلطی ہے - وہ اگر چکن پہنتی تھی تو یہاں ململ - اور وہاں ریشمی چادرہ اوڑھتی تھی تو یہاں سوتی چادرہ اوڑھے گی"

عورت کا سلیقہ ______ سنہ ۱۸ء

"تعجب ہے کہ جو روپیہ اس مصیبت سے مرد پیدا کرے وہ بیوی پانی کی طرح بہا دے - اور اس بات کا کبھی خیال نہ کرے کہ نوکری جو ارنڈ کی جڑ ہے اگر چھوٹ گئی علالت نے جو صحت کے ساتھ ہے ہاتھ پاؤں کمانے کے قابل نہ رکھے، مصیبت نے جس کا آغاز تعجب نہیں حالات میں انقلاب کر دیا تو کیا کروں گی - آج بے غل غش روپیہ صرف کر رہی ہوں مگر کل کے واسطے تو کچھ محفوظ رکھوں اور یہ سمجھ لوں کہ جس طرح شوہر نے اپنا فرض ادا کیا کہ روپیہ کمایا - اور کما کر میرے حوالہ کیا اسی طرح میں بھی اپنا فرض ادا کروں - اور اس ایک روپیہ میں سے بارہ آنے صرف کر کے چار آنے اس وقت کے واسطے علیحدہ رکھے جب وقت میری شرافت انسانیت اور فرائض کا امتحان کرے گا"

بے دردی ______ سنہ ۱۹ء

"یہ کہہ دینا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہے - بہت ہی لغو ہے - خرچ کرنے والے وہی تو ہیں جو آمدنی سے

واقف ہیں۔ پھر خرچ کیوں نہیں کم ہوتا۔ وہ بیسن کی بجائے موٹا پہنیں۔ مرغن کے بدلے اُبالا کھائیں تو کیوں خرچ آمدنی سے زیادہ ہو"

بے قاعدہ خرچ ــــــــــــــــ ۱۹۲۳ء

گھر اور گھروالی

"جس گھر میں سوئی گرے تو اٹھا لو۔ اب اس میں صاحبزادی کی سہیلیوں اور ماماؤں کے بچوں نے کنوئیں کھود کھود کر گڑھے ڈال دئے۔ مرغیوں کے بڑے بڑے دڑبوں نے گھر کی حیثیت دو کوڑی کی کر دی۔ کہیں کیچڑ کے ڈھیر کہیں خاک کے تودے۔ یہاں چولھے وہاں کھڈیاں دونوں کے بیچ میں کوڑا کرکٹ۔ صحن کیا دنیا بھر کا مجموعہ تھا۔ نعمت خانے کی دست پناہ۔ اس میں دانہ کی کنڈلیاں پانی کے کونڈے۔ مرغیوں کی بیٹ۔ کبوتروں کے پر۔ برتنوں کے ٹکڑے۔ کپڑوں کے چیتھڑے۔ چاروں طرف وہ جھاڑ جھنکار اٹا ہوا کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہ چاہے۔۔۔ ماماؤں کا کیا بگڑتا تھا جس رخ پر ڈالا پڑ گئیں۔ دن بھر بیٹھی مرغیوں کے دانے ٹھونگتیں اور کبوتروں کی کابکیں جھاڑتیں۔ چکنی مٹی کے بورے کچی اینٹوں کے ڈھیر۔ تغار بنے ہوئے۔ پانی پڑا ہوا۔ پختہ سنگین گھر چار دن میں غارت ہو گیا۔ دیواروں پر نظر ڈالو تو اینٹیں گری ہوئی۔ چونا جھڑا ہوا۔ کوٹھے کو جا کر دیکھو تو گھاس اُگی ہوئی ملبا پڑا ہوا۔ موری بند۔ قدمچے ٹوٹے۔ جھلنگے کھرّے۔ ٹھاٹر پڑے۔۔۔۔۔ دالان کی یہ کیفیت کہ حلوائی کی دوکان بھی اچھی ہو گی۔ چاروں طرف مکھیاں بھنک رہی ہیں بڑی بی کے زمانہ کا بنا ہوا گھر لاکھ کا خاک میں مل گیا۔ دری چاندنی۔ چادر۔ غالیچے موجود سب چیزیں تھیں لیکن۔۔۔۔۔ چونے کے دھبے۔ کتھے کے چھینٹے۔ ٹوٹوں گرا۔ ڈھیر ملا ملبہ۔ سنوں خاک۔ بڑی بڑی زمین میں آئی ہوئی۔ چھپی ہوئی جا بجا جیسی چاندنیاں زمین سے بدتر۔ مرزا پور کا بیش قیمت غالیچہ پھینکنے کے لائق اور اس کی یہ قدر کہ انگلی لگی اور حال خروج ہوئی۔ چبوترے کی چوکیاں جیسا کہ مٹی خاک سے گرد آلود اوپر سے بڑا مینہ۔ شیشم اور ساکھو گل کٹ تاہ ہو گیا۔ سامان کا حال یہ کچھ۔ قرینہ اور ڈھنگ وہ کچھ کہ خدا کی پناہ۔ اگالدان اوندھا ہوا۔ پیٹ رکابی پھکی ہوئی۔ کھٹا لگا ہوا۔ چونا لیپا ہوا۔ تواشکے پلنگ بان کی ادوان بلسے دو رنگے۔ پٹیوں میں کان۔ بچھونوں پر قینچیاں۔ پنکھوں پر بوتلیں چاندنی پر کھونٹ غالیچہ پر کشودے۔ کہیں پانی گرا ہوا۔ کہیں رنگ پڑا ہوا۔ کونڈے لڑھکے ہوئے۔ رکابیاں پھیلی ہوئی ایک طوفان بدتمیزی تھا"

صبح زندگی ــــــــــــــــ ۱۹۱۵ء

"صورت ظاہری سے ذرا آگے بڑھ کر دیکھو تو اللہ کا نام۔ گھر کی خاک اُڑ رہی ہے تو بلا سے۔ بیٹے کو تنگو نہیں تو نہ ہو۔ قرض داروں نے ناک میں دم کر دیا تو صدقہ ہے۔ بیوی کے سر پر تو کارچوبی دو شالہ وقت سے زیادہ اور حیثیت سے بڑھ کر ہو گیا۔۔ اس عورت سے زیادہ بے وقوف کون ہو گا جو بغیر کسی انجام کے سوچے اور نتیجے کے سمجھے محض اپنا دل خوش کرنا مقدم سمجھے۔ بالفعل آج ان کے تانگے کے زیور گوٹے بیچتے کے کپڑوں سے کسی غیر محفل اور اجنبی آدمیوں میں عزت بھی ہو گئی تو کل کیا۔ اگر کبھی کوئی بیوی اپنے ہاں آ نکلیں تو گھر میں سکتے لوٹ رہے

ہیں۔ مٹی میں مل وہ گہنا اور دو کوڑی کی ہو گئی وہ عزت۔ خواں بڑا خوان پوشش بڑا۔ کھول کے دیکھا تو آدھا بڑا"

کدڑی میں لال ————— ۱۹۰۹ء

خاندانی عزت کی لاج شخصی عزت سے بہت زیادہ ضروری ہے۔ غریب رشتہ دار امیر ملاقاتیوں سے زیادہ عزت کے مستحق ہیں۔ خدا برکت دے گا اس بہو کے گھر میں جو بجائے ڈیڑھ روپے گز کا کپڑا پہننے کے آٹھ آنے گز کا آپ پہنے گی۔ اور آٹھ آنے گز کا بیٹ نند اور غریب دیورانی کو پہنا کر چار بیویوں میں بیٹھے گی اور سچے زیور سے آراستہ ہو گئی وہ بیٹی جو چار سو روپے کا جھومر لگانے کے بدلے اپنے رشتہ داروں کا پیٹ بھرے گی اور عزت کرے گی جو حاجت مند ہیں"

غریب رشتہ دار ————— ۱۹۰۹ء

"بننا گھر والی کا نہیں ہوتا بلکہ گھر کا ہوتا ہے۔"

گدڑی میں لعل ————— ۱۹۰۹ء

"چاہے اپنے کپڑے پھٹے پرانے میلے کچیلے ہوں لیکن اس گودڑ اور لیتھڑوں والی کا گھر جس وقت سجا سجایا اور بچے ہوشیار تمیزدار دکھائی دیتے ہیں تو بلا تامل یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ گدڑی میں لعل"

گدڑی میں لعل ————— ۱۹۰۹ء

"وہ اللہ کی بندیاں جو نو دس بجے کے قریب سو کر اٹھیں کچھ دیر تک سر جھاڑ منہ پہاڑ پلنگ پر بیٹھی نیند کا ماتم کرتی ہیں۔ گھر میں جھاڑو نہ بہارو۔ فرش پر جھونٹے پھر رہے ہیں۔ برتنوں میں مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ بمشکل تمام منہ دھویا اب ان کا دن دیکھو افیمیوں کی طرح پینک میں ہیں۔ احدیوں کی مانند بیبیاں پڑ گئیں وہاں بیٹھ گئیں۔ جمائیوں پر جمائیاں۔ انگڑائیوں پر انگڑائیاں۔ ہاتھ پاؤں ہیں کہ سن پڑے ہیں۔ گھر ایسا۔ گھر والی ایسی۔ آنے گئے کا کیا خاک بیٹھنے کو جی چاہے۔ آدھ گھنٹے بیٹھتا دس ہی منٹ بیٹھ کر سیدھا ہو لیا۔ تمام خرابیاں فقط دن چڑھے سو کر اٹھنے سے ہیں"

صبح سویرے اٹھنا ————— ۱۹۰۹ء

"پانوں کے واسطے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آدمیوں سے بھی زیادہ مزاج دار ہوتے ہیں۔ زیادہ پانی ملا گل گئے۔ کم ملا مرگئے۔ پانی زیادہ ہو نہ کم۔ بس کافی ہو۔ چھالیہ جہاں تک ممکن ہو کتری کترائی۔ ہر وقت بھری رہنی چاہیئے کسی کو پان دیتے وقت چھالیہ کترنی خاصی بدتمیزی ہے"

پٹاری یا پاندان ————— ۱۹۱۰ء

"سب سے آسان اور سب سے ضروری کام جھاڑو دینا ہے اگر کسی لڑکی کو یہ بھی نہ آئے وہ کیسی بدنصیب ہے۔۔ سگھڑ کی جھاڑو پھوہڑ کا لیپا۔۔۔ ۔۔ ایک جھاڑو تو ایسی ہوئی جیسے بلی نے پنجے مار دئے۔ ایک ایسی ہوئی کہ گھر چندن کر دیا"

لڑکیوں کی انشا ————— ۱۹۱۰ء

"سگھڑ کی جھاڑو نہ دے۔ پھوہڑ کا بچہ نہ کھلائے"

سگھڑ کی جھاڑو ————— ۱۹۱۱ء

"غلطی پر ہے وہ عورت جو شادی کے بعد اپنی زندگی کا فرض یہ نہ سمجھے کہ وہ اس غرض سے پیدا کی گئی ہے کہ وہ شوہر کی سچی رفیق ہونے کے علاوہ اپنی اور اس کی زندگی قدرت کا ایک انعام بنا دینے کی ذمہ دار ہے۔ اور اس کا کام صرف یہ ہی نہیں ہے کہ وہ شوہر سے محبت مروت اور عنایت کی خود تو توقع رکھے اور

اپنے اوپر کسی قسم کی خدمت کو واجب نہ سمجھے۔ اس کا
کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ماؤں باورچیوں سے کھانا
پکوا لے یا خود بیٹھ کر پکا دے۔ بلکہ اس کا کام یہ بھی
ہے کہ اس ذمہ داری پر نگاہ رکھے جو قدرت اور
قانون دونوں نے اس پر عائد کی ہے"

وبالِ جان ——— [illegible]

"عورت خواہ کتنی ہی پڑھی لکھی کیسی ہی حسین خلیق
اور خوش مزاج کیوں نہ ہو اگر پھوہڑ ہے تو اس کی
تمام تعریفیں خاک میں مل جاتی ہیں۔۔۔۔ ایک پھوہڑ
عورت کا بچہ خواہ وہ کیسا ہی گورا اور خوبصورت کیوں
نہ ہو ہمیشہ ایسی حالت میں دکھائی دے گا کہ مٹی میں لتھڑا
کیچڑ میں سنا، چیکٹ کپڑے، منوں میل۔ لیکن سلیقہ
مند عورت کا بچہ گو بدصورت ہو مگر نہلایا دھویا اجلے
کپڑے بدن صاف۔ اگر کچھ نہیں تو اتنا پتہ دے گا کہ
سلیقہ مند ماں کی گود میں پل رہا ہے"

بدسلیقگی ——— ۱۹۱۴ء

• اگر کوئی عورت اپنے فرائض سے غافل ہو جائے اور
صرف اس خیال میں رہے کہ عاقبت کی خوبیاں میسر
ہو جائیں تو اس خیال کو خبط کہا جائے گا۔ جس عورت
کے گھر میں ڈھنگ کا بچھونا تک نہ ہو۔ کوئی ملنے آئے
تو شکلوں کی یہ کیفیت کہ پانی پینے کو جی نہ چاہے وہ
کس منہ سے جنت کی طلب گار ہے۔ اس نے پہلے
ہی اپنے شوہر کا گھر دوزخ کر دیا۔ اور اس کے بدلے
میں دوزخ ہی اس کا گھر ہو گا"

بیوی کے ہاتھوں گھر کی بربادی ——— ۱۹۱۷ء

"مرحوم سرسید نے جس سے بہتر نبض شناس
قوم اس دور میں پیدا نہ کر سکی صاف کہہ دیا تھا کہ عورت
کی ترقی یہی ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر اپنے فرض پورے [illegible]

لسان العصر اور طبقۂ نسواں ———

• اسی دن کو تو کہتے ہیں کہ ہم کو تعلیم کا صرف کی [illegible]
چاہیے تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک روز ماما یا نوکر بیمار [illegible]
ہاتھ ہی کٹ جائیں۔ پہلے بھی نوکر چاکر ہوتے [illegible]
ہم نے بھی نوکروں ہی میں آنکھ کھولی ہے۔ مگر ہماری
بوڑھیوں نے نوکروں کو اس نظر سے دیکھا [illegible]
کہ ہماری زندگی کا تمام دار و مدار ان پر ہے۔ وہ ہیں
تو سب کچھ اور نہیں ہیں تو کچھ نہیں۔ باوجود [illegible]
ان پر بھروسہ نہ کرنے کے محبت کے تعلقات ایسے
کہ مائیں مر کر اور نوکر مجبور ہی ہو کر گھر سے نکلتے [illegible]
یہ نہ ہوتا تھا کہ آج کلّن کی اماں روٹی پکا رہی ہے
تو پرسوں مرزا کی بہن"۔۔۔۔ جن کے بچے افسر [illegible]
کھیلتے تھے اور پیسوں کی جگہ روپے اٹھاتے تھے
انہیں ہمیشہ یہ دیکھا کہ ماما کے آنے سے پہلے گھر [illegible]
کر کے رکھ دیا۔ اپنے ہاتھ سے جھاڑو بہارو۔ اپنے ہاتھ
ٹھنڈا گرم پانی۔ ماما آئی اس نے اور کام کئے اس کے
ساتھ ہی باورچی خانہ میں گھسیں اور جب تک کھانا
تیار ہوا لگی بیٹھی رہیں۔ ماما ان کی مددگار ضرور تھیں
مگر وہ ماماؤں کی محتاج نہ تھیں"

جوہر ندامت ——— [illegible]

• لڑکیوں اور عورتوں کے سپرد جو کام کئے گئے وہی بھی
ورزش تھی۔ کنواری اور ہوشیار بچیوں کا کام یہ تھا
کہ وہ گرمی کے موسم میں پانی کے گھڑے بھر کر کے یعنی
بالا خانہ پر لے جائیں اور چھڑکاؤ کریں۔ اگر بالا خانہ
نہیں ہے انگنائی میں۔ غرض پانی بھرنا — پھر تازہ
پانی الگ کرنا۔ باورچی خانہ میں غسل خانہ میں پہنچانا

ان کا کام تھا۔ سردی سے تو پانی کی گھڑیاں گرم کرتیں۔ بہو بیٹی اور لڑکیوں لیکن پوری عورتوں کے واسطے ان کی عمر اور حیثیت کے موافق کام تھے۔ مثلاً آٹا گوندھنا۔ روٹی پکانا، چارپائیوں کی ادوائیں کھینچنی۔ گھر بھر میں جھاڑو دینی۔ بڑی بوڑھیوں کا کام ان کی عمر کے موافق تھا۔ چھالیہ کترنی۔ ترکاری بنانی۔ سالن بگھارنا مختصر یہ کہ یہ کام ایسے تھے کہ پوری ورزش ہوجاتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کبھی مہینوں بھی دکھ بیماری کا نام سننے میں نہ آتا تھا۔ اگر اوسط نکالی جائے تو آج کل شاید آمدنی کا چوتھائی نہیں تو دسواں حصہ تو ضرور بیماریوں پر صرف ہوتا ہوگا۔

ورزش نسواں کے ضروری ہونے سے انکار نہیں۔ مگر مشرق میں اس طرح تھی کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا اور پوری ہو جاتی تھی"

عورتوں کی ورزش ——————— سنہ ۲۲ء

"جب عید میں آٹھ نو روز رہ جائیں یعنی بیسویں روزے کے بعد بیوی کو سب سے پہلے گھر کے بناؤ سنگھار پر توجہ کرنی چاہیئے یعنی مکان کی ظاہری حیثیت اس کی آمدنی سے کم نہ ہو۔ اگر اس کا شوہر دو سو روپیہ ماہوار بیوی کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ اور اس کے گھر کی حیثیت شوہر کی آمدنی دو سو روپیہ نہیں بتا رہی تو وہ نہایت بدتمیز اور حد سے زیادہ پھوہڑ عورت ہے ... حفظانِ صحت کے اعتبار سے اگر ہر مہینہ نہیں تو کم سے کم ایک سال میں دو مرتبہ گھر کی صفائی ہونی ضروری ہے۔ اگر پختہ گھر ہے تو قلعی اور کچا ہے تو لپائی"

گھر کی ملکہ اور عید ——————— سنہ ۲۰ء

"عورت کی زیب و زینت کا واسطہ زیادہ اس کے شوہر سے ہے۔ لیکن مکان کی صفائی ستھرائی کا واسطہ ہر شخص سے ہے۔ جو شخص گھر میں آئے گا۔ وہ بیوی سے پہلے مکان کی صورت دیکھ کر گھر والی کی بابت رائے قائم کرے گا"

گھر کی صفائی ——————— سنہ ۲۳ء

"یہ خیال غلط ہے کہ گھر صرف روپیہ سے آراستہ ہو سکتا ہے۔ عورت کا سلیقہ مفلسی ہی میں معلوم ہوتا ہے۔ امیر تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ کرنا تو غریب ہی کا ہے۔ اور تعریف کی مستحق وہی عورت ہے کہ باوجود غریب ہونے کے خود بھی میلی نہیں رہتی۔ اور گھر کو بھی درست رکھتی ہے"

گھر کی صفائی ——————— سنہ ۲۳ء

"یہ بات کا ایک وقت ہر کام کی ایک جا" سنہ ۲۶ء

بی بی تو نہ سمجھی ہو گی پھر سن۔ زیور کے معنی سونا چاندی روپیہ جواہر غرض ان اشیاء کا پاس ہونا جو نہایت بیش قیمت ہیں اور جن سے انسان کا تمول و املاک ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی جہاں چند عورتیں جمع ہوتی ہیں وہاں ہر عورت دوسری عورت کو حقیر کرنے کے لئے قیمتی زیور استعمال کرتی ہے۔ اور یہ ایک ایسی رسم ہے جس سے عورت کی مالی حالت کا باسانی پتہ چل سکتا ہے اور مالدار غریب کو اچھی طرح ذلیل کر سکتی ہے"

جہار عالم ——————— سنہ ۲۷ء

بچوں کی پرورش

بچوں کی پرورش کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بیوی شوہر کے فرائض سے ہی سبکدوش ہوجائے۔ بلکہ وہ جن دو اہم فرضوں کے انجام دینے کے واسطے پیدا کی گئی تھی یہ اس کا دوسرا فرض ہے۔ اگر وہ اس فرض کو اس طرح پورا کرے کہ پہلا غارت ہوجائے تو اس نے

"مغرب کی قضا کی اور عشا کی پڑھ لی"

وبالِ جان ———————— عصمت ۱۹۱۸ء

"ان کی بے غیرتی کہو، مجبوری سمجھو۔ مگر یہ تو دیکھو لاکھ بھی بڑبڑ کرتے بھی سُنتے مگر تھوڑی دیر کے بعد وہی ایک کی ایک۔ اِن کا کوئی ٹھکانا نہیں کہ چلی جائیں۔ کوئی وارث نہیں کہ حمایت لے۔ ایک بار کیا ہزار بار پڑھے اور ایک نصیحت کیا لاکھ نصیحتیاں کرو مگر ان کو تو اپنا وقت وہ وقت جو آپ آنکھ بند کرتے گذرا تمہاری ہی دہلیز پر پورا کرنا ہے۔ اس سے زیادہ بے قدری کرو۔ اس سے بڑھ کر مارو پیٹو۔ مر بھی جائینگی تو تمہارے ہی گھر پر اور کفن یا جہیز جو کچھ لیں گی تمہارے ہاتھ سے۔ یہ اگر قصور کریں۔ پڑھنے سے جی چرائیں کام چوری کریں۔ زبان درازی کریں۔ ان کو سزا دو۔ مارو پیٹو۔ ڈانٹو گھرکو۔ مگر جو کچھ کرو خود ہی کرو۔۔۔۔ ۔۔۔۔ ان کی تعلیم ان کی تربیت اور ہر چیز کی ذمہ دار تم ہو۔ جو کچھ کر سکتی ہو کرو۔ شوق سے کرو مگر للہ مردوں کا ہاتھ ان پر نہ اُٹھنے دو"

ہماری بیٹیاں ———————— ۱۹۱۸ء

"پچھلی صدی کی بیویاں جن کے طرزِ معاشرت میں یہ اصول سختی سے شامل رہا کہ "بدنصیب ہے وہ بیٹی جو کنوارپنے میں باپ کے ہاتھ سے پٹی" اس مقولہ کو ایسا پتھر کی لکیر سمجھتی تھیں کہ خواہ بیٹی سے کتنا ہی بڑا قصور اور کیسا ہی زبردست نقصان کیوں نہ ہو مگر ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ گھر کا کوئی مرد باپ یا بھائی بیٹی کو ہاتھ لگائے۔ غالباً ان کا یقین یہی تھا کہ اگر بیٹی آج میکے میں باپ بھائی کے ہاتھ سے پٹ گئی تو سسرال میں شوہر کے ہاتھ سے عمر بھر پٹتی رہے گی"

ہماری بیٹیاں ۱۹۱۸ء

"معصوم بچی! تو نے خانہ داری میں ماں کا ہاتھ بٹایا۔ باپ کی تیمارداری کی۔ بہن بھائیوں کی خدمت کی۔ گرم موسم میں جب جون کی قیامت خیز دوپہر میں جلتا بھلستا پسینے میں شور بور گھر آتا تو کس خاموشی سے کس محبت سے پیٹھ کے پیچھے کھڑی ہو پنکھا جھلتی۔ دس دس گیارہ گیارہ بجے رات کے جب دوست احباب جمع ہوتے اور بیگم سو جاتیں تو اے رخصت ہونے والی بچی تیرے پیارے ہاتھ دیا میں پان بیچ کر باپ کی عزت رکھتے۔ نماز صبح کے بعد جب دودھ پیتے بچے کی وجہ سے رات بھر کی جاگی ہوئی ماں سو جاتی تو اے باپ کی جیتی بچی تو اپنے ہاتھ سے ناشتہ کا انتظام کرتی۔ میں جا بیٹھتا تو چھپا چھپ میرے لئے پان بناتی"

کنواری بچی کے تین دن ———————— ۱۹۲۰ء

"جن میاں بیوی میں سلوک نہیں وہ صرف اپنی ہی زندگی برباد نہیں کر رہے بلکہ اپنے بچوں کی بھی مٹی پلید کر رہے ہیں"

شامِ زندگی ————————

"تعلیم جدید نے جہاں دنیائے نسواں سے بہت سے نقائص دور کئے ہیں وہاں دودھ بھی ماؤں کے سینے سے خشک کر دیا ہے کہ بھیڑ بکری کا شیوہ ہے پھر بھلا شاہدہ کے واسطے اس سے زیادہ کسرِ شان کیا ہوتی کہ وہ کلب ہی میں بیبیوں کے سامنے بچہ کو گود میں لئے چھاتی سے لگائے بیٹھی ہیں اور بچہ چُسر چُسر کر رہا ہے"

جوہرِ قدامت ———————— ۱۹۱۵ء

"بچہ مارنے سے بے غیرت ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ اگر

مارکھا کر دوبارہ اس سے پھر وہی قصور سرزد ہوا اور پٹا اور مار کھا کر جو کچھ خوف دل میں چھپا ہوا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اب کیا چیز ہے جو اس کو اس فعل کے کرنے سے روکے۔ اگر خوف نہ نکلتا اور اس کو پٹنے کا اندیشہ رہتا تو بسا غنیمت تھا لیکن اس مارنے بجائے تنبیہ کے الٹا بے غیرت بنا دیا"

بچوں کی تربیت میں سزا ——— سنہ ۱۹۱۶ء

"ایک ماں جو اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر ریل گاڑی میں سفر کر رہی ہے۔ اگر اس کو معلوم نہیں کہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کھڑکیوں کا بند کرنا یا دیکھ لینا کہ اچھی طرح بند ہیں اس کا فرض ہے یا کسی حادثہ کے وقت خطرہ کی زنجیر کھینچنے کا جو ہر درجہ میں ہوتی ہے اور جس سے گاڑی فوراً ٹھہر سکتی ہے اس کو علم نہیں تو اس کو ریل میں بیٹھنے اور سفر کرنے کا ہرگز حق نہیں"

شوہر کی چار پر ——— سنہ ۱۹۱۶ء

"آج نہیں کل اور کل نہیں پرسوں وقت آئے گا اور ضرور آئے گا کہ مسلمان اس جوہر کو چراغ لے کے ڈھونڈیں گے۔ دنیا ان کا مضحکہ اڑائے گی۔ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گے اور جس طرح آج وہ مذہبیت کو الٹی چھری سے ذبح کر رہے ہیں کل اس طرح وقت ان کا خاکہ اڑائے گا۔ ان کے نالے ان کی اپنی دیواروں سے ٹکرا کر فنا ہو جائیں گے اور ان کی زیادہ جل بجھ کر قلبِ مضطر میں ڈھیر ہو گئی"

مسلمان لڑکیوں کا آزاد ہونا ——— سنہ ۱۹۲۲ء

تربیت | "بچوں کی اچھی تربیت سیکڑوں کے کپڑے اور ہزاروں کے زیور سے لاکھ درجہ بہتر ہے"

گدڑی میں لال ——— سنہ ۱۹۰۹ء

"جس وقت یہ آن مائیں بچہ کو قال دیں گی وہ اسی راستہ پر اپنی عمر پوری کرے گا"

عورت کا مقصد زندگی ——— سنہ ۱۹۱۰ء

"لڑکیوں کی تربیت و تعلیم کی زیادہ تر ان ذمہ دار اور ماں باپ سے اتنا واسطہ نہیں ...... جو مائیں یہ عار رکھتی ہیں کہ ان کی چیاں باپ بھائیوں کے ہاتھ سے ان کی آنکھ کے سامنے مار کھائیں وہ ان ماؤں سے کچھ ہی کم ہیں جو بنا سنوار کر بیٹیوں کو شوہروں کی گود میں دیتی تھیں کہ جاؤ اور زندہ گاڑ آؤ"

ہماری بیٹیاں ——— سنہ ۱۹۱۱ء

"ماں آٹا گوندھ رہی ہے۔ روٹی پکا رہی ہے کرتہ سی رہی ہے۔ کھانا نکال رہی ہے اور لڑکی کا فرض ہے کہ وہ بچہ کو بہلائے۔ ماں اپنا فرض ادا کر رہی ہے اپنے گھر کا کام کاج کر رہی ہے۔ مگر اس کو یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ لڑکی لکھنا پڑھنا سینا پرونا چھوڑ کر اس کے بچہ کو بہلائے۔ یہ وقت لڑکی کا پڑھنا لکھنا سینا پرونا پکانا ریندھنا وغیرہ تمام کاموں کے سیکھنے کا ہے۔ رہا بچوں کا بہلانا اس کی اتنی باقاعدہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہے کہ باقی تمام ضرورتیں گرد ہو جائیں ...... یہ تو ستم اور غضب ہے کہ لڑکی بیٹھی کاپی لکھ رہی ہے ماں کو چار تیار کرنی ہے اور انہوں نے بچی کی کاپی چھوڑ کر بچہ کو گود میں دے دیا اور آپ جا اپنے کام میں مصروف ہو گئیں"

لڑکیوں پر ظلم ——— سنہ ۱۹۱۸ء

"صنف نازک کے زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے بغیر قومی ترقی محال ہے... میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ لڑکیوں کی تعلیم سے زیادہ ان کی تربیت قابل توجہ ہے اور

اولاد کی شادی

بڑے نادان ہیں وہ لوگ جو اپنی حیثیت سے زیادہ بیٹی کے واسطے بر ڈھونڈھتے ہیں۔ سوا اس کے کہ بیٹی کی عمر بھر مٹی پلید ہو اور کیا حاصل۔ ساری سسرال والے بے موت کھیں۔ بات بات پر سینکڑوں طعنے ہیں۔ ماں باپ بچارے تباہ ہو گئے۔ دو بیٹیوں کا جہیز ایک کے حوالہ کیا۔ جو اپنے پاس تھا وہ دیا۔ جو قرض لا وہ دیا۔ رہنے کا ٹھیکرا گروی کیا اور پھر بھی ان کا مزاج نہ پایا۔ مرغی جان سے گئی کھانے والے کو سواد نہ آیا۔ برابر کی حیثیت ہوتی تو کہوں دیتے۔ کہہ دیتے تمہارے آگے بھی بیٹی ہے۔ اب بولیں تو کس منہ سے۔ گدھے اور گھوڑے کی کیا برابری۔ اگر کسی بات میں لڑکی بول اٹھی تو چاروں طرف سے بوچھاڑ ہو گئی چار ہی دن میں یہ دماغ ہو گیا۔ اماں باوا کے ہاں کیا نصیب تھا جو یہاں بڑھ بڑھ کر بولتی ہو۔ عمر بھر دال کھاتے گذری۔ پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہ ہو۔ آج پلاؤ بھی خاطر میں نہیں۔ اگر خدا نخواستہ طبیعت بدمزہ ہو گئی تو کسی کو یقین ہی نہیں آتا۔ غریب کی بیماری بھی جھوٹی۔ درد کے مارے سر پھٹا جا رہا ہے۔ مگر جو سمجھتا ہے وہ نخرہ۔ صبح سے شام تک کام میں پلی رہتی تھیں جب درد نہیں ہوتا تھا۔ آج کیا کر ہوا لگ گئی۔ تو درد ہونے لگا۔ ساس سسروں کی خدمت نہ کی تو دوسرے ہی دن جوتیاں پٹ کر نکلیں۔ اگر کی تو دنیا نے بولی کہنا شروع کیا غریب آدمی کی بیٹی تھی روپیہ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ دن رات کی محنت میں ٹکڑا نصیب ہوتا تھا اب بیٹھی حکومت کر رہی ہیں..... داماد کبھی بھولے بھٹکے سسرال پہنچ گئے تو گویا بھونچال آگیا۔ ساس ہیں وہ بھی جا رہی ہیں۔ سسرے ہیں وہ مرے جا رہے ہیں۔ بیوی ہیں وہ لوٹے جا رہی ہیں۔ چاہے آج گھر کی پٹاری تک بک جائے مگر داماد کی خاطر میں فرق نہ آئے۔ داماد میں کہ ان کے بھا نوبہا ہی نہیں۔ بیچاری نے کسی نہ کسی طرح دو سالن بھی کر لئے۔ تھوڑا سا پلاؤ بھی پکا لیا۔ جلدی جلدی چارپائے بھی ڈال لئے وہ چار روپیہ کا انتظام بھی کر لیا کہ چلتے وقت دے دوں گی غرض اُدھر اُدھر بہت قرض اُٹھا لے لو اگر ان کا پیٹ پورا کیا۔ اب داماد تو سمجھے پہلے بیٹی ہی بگڑ رہی ہے واہ بی واہ۔ ان کے آگے چار روپیہ رکھو گی۔ دس نہ بیس اس سے تو نہ رکھنا ہی اچھا۔ دسترخوان آگئے۔ بیوی صاحبہ باغ باغ ہیں۔ سالن کے تار کو دیکھ کر رہی ہیں اور خوشی کے مارے پھولی نہیں سماتیں۔ داماد صاحب نے ایک نوالہ کھا کر کہہ دیا۔

"سالن میں تمہارا مرچیں زیادہ ہیں"

صالحات

۱۹۰۶ء

یعنی حیات صالحہ

اب موجودہ تمدن اور مغربی تہذیب نے ایک یہ آفت ڈھا دی کہ سب سے پہلے لڑکے کا تمول دیکھا جاتا ہے۔ وہ صرف جوہر شرافت دیکھتے تھے اور کہتے تھے اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں۔ آج مسز فلاں اور ان کی والدہ اس خیال سے خوش ہیں کہ ان کا شوہر اور داماد سسرال کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ مگر ان کا خیال یہ تھا کہ جو ماں کا پوت نہیں وہ ساس کا جمائی نہیں۔ اُس وقت صرف ہڈی کی ٹٹول تھی اب دولت کی پرچول ہے۔ لڑکیوں کے دماغ بگڑ گئے۔ ماں باپوں کے منہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ ابھی بات طے نہیں معاملہ فیصل نہیں۔ ہاں نہیں۔ ہوں نہیں مگر پہلا سوال یہ ہے

خاتے میں منہ سے کچھ نہ بتائی۔ افسوس کا اظہار کیا مجبوری کا سبب کمالگوان و بخت انسانوں نے ایک دسنی۔۔۔ مجھے تعجب ہے اس باپ پر جو مرد ہوکر دوسرے مرد کے جذبات کا اندازہ نہ کرسکا اور حیرت ہے اس ماں پر جو عورت ہوکر دوسری عورت کی فطرت کو نہ پرکھ سکی کہ دونوں ماں باپ خود بھی میاں بیوی اور بچوں والے تھے اور عید کا اہتمام ہر طرح کا کررہے تھے مگر ان کے دل میں بھول کر بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس عید کی خوشی میں شریک ہونے کا حق میاں بیوی بھی رکھتے ہیں"

چہار عالم ———————

"شادی کے وقت میکہ کی جدائی سے لڑکیوں کا افسردہ ہونا ضروری امر ہے اس موقع پر اکثر والدین اور بھائی بہن یہ کہہ کر دلہن کو تسکین دیتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں جلد تم کو بلالیں گے۔۔۔۔ لڑکیاں اس غلط توقع کو لے کر شادی کے وقت یا دوسرے تیسرے پھیرے میں میکے روانہ ہوتی ہیں۔ مگر سسرال پہنچ کر جب چند روز گذر جاتے ہیں (اس لئے کہ ابھی دل نہیں لگا اور اتنی جلدی دل لگنا مشکل ہے) تو یہ فطرتی امر ہے کہ میکے جانے کو دل چاہے اب یہ توقع اس لئے پوری نہیں ہوسکتی کہ بھیجنے والے اس کے واسطے تیار نہیں۔۔۔۔ نتیجہ یہ کہ اس غلط توقع سے مصیبت کا رنج پیدا ہوتا ہے"

غلط توقع ——————— سنہ ۲۲ء

سوتیلی اولاد

"جہاں میں مسلمان مردوں سے خواہش کروں گا کہ اپنی اولاد کو سوتیلی ماں کے قبضہ میں دیتے وقت حقیقی اور مصنوعی ممتا کا وزن کریں وہاں مسلمان عورتوں سے بھی یہ کہوں گا کہ جب تک تعلیم میں مذہبیت داخل نہ ہوگی اور خدا کا خوف ان کے دلوں میں نہ بیٹھا ہوا ہوگا وہ اس یا اس قسم کے اور کسی گناہ سے نہیں بچ سکتیں۔ گناہ سے بچانے والی طاقت وہی ایک ہے جس کا خوف مسلمان مرد و عورت کو ہر برائی سے روک سکتا ہے"

صالحات ——————— تیسری اشاعت کا دیباچہ

"کثرت تو واقعی ان ہی عورتوں کی ہے جو شوہر پر غالب ہوتے ہی ایمان کو طاق میں رکھ دیتی ہیں۔ اگرچہ ان معاملات میں بھی میں شوہروں کو بے گناہ نہیں سمجھتی اور میرا یقین ہے کہ ہر اس عورت کے مظالم کا سبب جو سوکن اور اس کے بچوں پر ٹوٹتی ہیں شوہر کا وجود ہے اور اس لئے مرد عورت سے کم ذمہ دار نہیں۔۔۔۔ مگر جہاں ہمارا کام ان مردوں کے برخلاف جد و جہد کرنا ہے۔ جو پہلی بیوی کے بچوں کے یا پہلی بیوی کے حقوق زائل کردیتے ہیں ان عورتوں کے کمینہ پن پر لعنت ملامت کرنی پڑ جو شوہر کی محبت پر اترا کر آپے سے باہر ہوجاتی ہیں وہاں اس کو بھی نظر کے سامنے رکھنا ہے کہ بعض سوتیلے عزیز بھی اگر شوہر پر قابو پا جاتے ہیں تو دوسری بیوی اور اس کے بچوں کی وہ مٹی پلید ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ"

سوتیلی اولاد یعنی سوکن ——————— سنہ ۲۱ء

اخلاق و عادات

"جس دل میں درد نہیں وہ دل نہیں محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے"

"درد ہی محبت کا ایک پھل ہے اور محبت ہی وہ چیز ہے جس پر دنیا کی ہر شے قربان ہوسکتی ہے۔ رحم اس سے پیدا ہوتا ہے کرم اس کا طفیل ہے۔ اور حق یہ ہے انسانیت اس کا تصدق ہے"

تین بہنیں ——————— سنہ ۳۲ء

"حسن کا سدھڑ کی وجہ سے انسان کچی تعریف کا مستحق ہے ان میں سے ایک غصہ کا ضبط کرنا بھی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو انسان کہلا سکتی ہے ورنہ دُب کر تو چیونٹی بھی کاٹ کھاتی ہے۔ تعریف کے قابل ہیں وہ لڑکیاں اور بہت اچھی ہیں وہ بیٹیاں جو غصہ کے وقت انجام سوچ لیں اور زبان سے کوئی لفظ نکالنے سے پہلے سمجھ لیں"

مظفر آدمی اس کو نہ جانے گا وہ جو کیسا ہی صاحب علم ہو کا جیسے عیش میں یاد خدا نہ رہی ویسے طیش میں خوف خدا نہ رہا"

بچوں کا ادب ——————— [illegible]

استقلال عجیب چیز ہے۔ یہ انسانی زندگی کا بیش بہا جوہر ہے۔ اگر اس جان کا جی چھوٹ جاتا تو ہمارے نبیؐ ہونے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی . . . . . ابتدائی زمانہ میں جو بچے شروع ہوئے کوئی کہتا دولت نکلی کس کا خیال تھا جوا جیتے مگر عقلمند اتنا نہ سمجھ سکے کہ ایک بیوی فقیر میاں کو بادشاہ بنانے کی طاقت رکھتی ہے عورت کا صبر و استقلال ایک لازوال دولت اور قدرت کا وہ نور ہے جو زمین سے نہیں اس کے دل سے نکلتا ہے اور گھر کے در و دیوار تک منور کر دیتا ہے"

شب زندگی ——————— [illegible]

"اپنے ذاتی رنج و راحت سے ہر انسان بلکہ انسان کیا جانور تک متاثر ہوتا ہے۔ مگر انسانیت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی تکلیف سے زیادہ اور اپنی خوشی سے بڑھ کر دوسرے کی تکلیف اور دوسرے کی خوشی کو سمجھے۔ مدد دے جو امکان میں ہو اور خدمت کرے جو ہو سکے۔ خدا کے نیک بندے اور خالق کی اچھی مخلوق وہی ہے جو بندوں کا غلام اور مخلوق کا خدمت گزار ہو"

جوہر قدامت ——————— [illegible]

سوانح عمری ملا نصر الدین (؟)

"جس طرح سارے ریشمی کپڑے کو کیڑا، لکڑی کو گھن، کتابوں کو دیمک لگ جائے اسی طرح آدمی کو قرض لگ جاتا ہے لاکھوں کی آمدنی کیوں نہ ہو مگر قرض کے پیچھے سب خاک بُرے حال کی مثل ہے۔ بیٹیوں والا گھر اور چلنے والا وجود کبھی پہنچتا نہیں۔ میں کہتی ہوں قرضدار آدمی کی جینی ہے سچی گی۔ بھیک مانگ لے۔ فاقہ کر لے مگر قرض نہ لے۔ جس نے قرض لے کر تڑ بھرنا جانا بس دنیا بھر کی مصیبتیں اس پر آ گئیں۔ عزت حرمت حیثیت سب گئی گذری ہوئی۔ لین دار ہزاروں باتیں سنا رہے اور کان دبائے سن رہے ہیں" ——————— صبح زندگی

"شراب کی بابت سنا ہے کہ
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی
مگر میرے خیال میں تو سب سے بڑا کافر قرض ہے جو ایک دفعہ منہ سے لگ کر پھر کبھی نہیں چھوٹ سکتا۔ جس نے ایک دو نہیں لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کو تباہ کر دیا"

قرضدار بیوی ——————— [illegible]

"تقدیر نام ہے نتیجۂ تدبیر کا"

زیور اسلام ——————— [illegible]

"وارث والے سے نہ ڈر بے وارثہ سے ڈر"

شب زندگی حصہ دوم ——————— [illegible]

رسوم و اعتقادات

"دیکھئے وہ کون مبارک وقت ہوگا جب وہ فضول اور بے ہودہ رسمیں جنہوں نے ہم کو بدنام کیا ذلیل کیا مفلس و خوار کیا۔ ہماری طرز معاشرت میں سے خارج ہوں گی۔ جب تک عورتوں میں تعلیم عام نہ ہوگی یہ رسمیں ہم سے جدا نہ ہوں گی لیکن یہ موٹی سی بات ہے کہ جس بات کے کرنے سے حاصل

دین وہ حاصل دنیا بلکہ اُلٹی مَنت کا نقصان اور خواہ مخواہ کی تکلیف وہ کیوں کیا جائے۔"

سات کباڑ ——— سنہ ۱۲ء

"ضرورت یہ ہے کہ وہ فضول اور بے ہودہ رسمیں جو ترتیب مذہب کا جزو بن کر خواتین کی گھٹی میں پڑ گئی ہیں کسی طرح ان کی طبیعتوں سے نکلیں۔"

نارضامندی کی شادی ——— سنہ ۱۱ء

"مسلمانوں پر تباہی کیوں آئی؟ اس تناور درخت کی طرح جس کو دیمک اندر ہی اندر غارت کرتی ہے۔ رسوم کی پابندی نے ان کو کھوکھلا کر دیا۔ جائدادیں اس کی بھینٹ چڑھیں تعلقے اس کی نذر ہوئے۔ رئیسوں کو بھیک اس نے منگوائی۔ امیروں کو فقیر اس نے بنایا نوکروں پر حکومت کرنے والے محض اس کے طفیل آج چلمیں بھر رہے ہیں۔ اور محلوں کی بیٹھنے والیاں اس کی بدولت جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں۔ بڑے بڑے خاندان اچھے اچھے گھرانے امیروں کے بچے وزیروں کی اولاد اس کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی۔ غضب خدا کا آدھ گز کی بچی چھ دن کی جان اور رسموں کی یہ شان کہ کنبہ بھر کا بلاوا اور آدھا شہرجہان . . . . . یہ رسموں کے بندھن یہ بربادی اور تنخیم بربادی کے لچھن، یہ عقیقے اور چالیسویں یہ چھٹی اور چلے وہ دیمک اور گھن ہیں، جنہوں نے عظیم الشان محل سرائیں اور بڑی بڑی عمارتیں چشم زدن میں ڈھا دیں۔"

طوفانِ حیات ——— سنہ ۱۷ء

"مجھ کو جس چیز نے دُنیا اور دین میں برباد کیا وہ شادی اور موت کی رسمیں تھیں، شرک اور قبر پرستی سونے پر سہاگہ . . . . . . میں وہ کم بخت عورت ہوں جس کے معزز اور متموّل شوہر نے محض میری بدولت دردر کی بھیک مانگی۔ وہ نابکار بیوی ہوں جس نے سو روپیہ کی تنخواہ والے شوہر کی تمام عزّت و آبرو اپنی خواہشوں اور جہالت کی رسموں پر قربان کر دی . . . . . بیکے کا اثاثہ اور سسرال کا مال جلے اور چالوں عقیقے اور پھولوں پر لٹا دیا۔ جن لعنتوں نے بربادیاں اٹھائیں جن شہروں نے تنجن چکھے جن مکاروں نے بہاریں دیکھیں آج ان میں سے ایک بھی موجود نہیں۔ اور نہ وقت پر کام آنے والا نکلا۔"

طوفانِ حیات ——— سنہ ۱۷ء

"رسول اللہ صلعم کی شان میں تو خدا یہ فرمائے کہ: کہو میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں" اور ہماری حالت یہ ہو کہیں مُردوں کو سجدہ کر رہے ہیں کہیں تعزیوں میں منتیں مان رہے ہیں۔ کسی جگہ پیروں کے قدم لے رہے ہیں تو کسی موقعہ پر دلیوں کو خدا سمجھ رہے ہیں۔ کیا یہ کھلا ہوا شرک نہیں کہ بچہ بیمار ہے اُس کے گنڈے تعویذ ہو رہے ہیں۔ جو اخوند جی یا پیر صاحب نے فرما دیا ہے اس کی تعمیل ہو رہی ہے۔ مُرغ اور بکرے سریاں اور کلیجیاں چڑھائی جا رہی ہیں۔ کیا یہ ہی وطیرہ سچے مسلمانوں کا تھا؟ کیا رسول اللہ صلعم کے چھوٹے بچوں نے انتقال نہیں کیا۔ کیا حضور نے یہی کیا تھا جو ہم کر رہے ہیں۔ جس وقت آپ کے صاحبزادے ابراہیم نے انتقال کیا جو شیرخوار تھے اس روز سورج گرہن تھا۔ لوگوں نے کہا حضور کے صاحبزادے کی موت کے باعث گرہن ہوا تو آپ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ . . . . مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ بالخصوص عورتوں اور لڑکیوں کو کہ خدا کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں۔ سب اس کے

کیا حقوق کی برابری کسی کی کیا حاجت رفع کر سکتا ہے؟

مذہب اسلام ———— ۱۹۳۳ء

"اگر ہر مسلمان مرد اپنا فرض اسلامی اتنا سمجھ لے کہ خود مسلمان ہو جائے تو وہ موجودہ دنیا کا بہترین مسلمان ہوگا"

مسلمان عورت کی کشتی ———— ۱۹۳۰ء

۱۹۳۱ء کی دو

جذباتِ عقیدت یا اظہارِ حقیقت | نظموں سے

مرحبا اے راشد الخیری فرخندہ صفات
قوم کے حق میں ہوئی بے مثل نافع تیری ذات
جس زمانے میں کہ ہم کو علم سے کچھ مس نہ تھا
جس زمانے میں کہ ہم سے دور تھی راہِ نجات
جس زمانے میں کہ ہم تھے شرک اور بدعت کی پوٹ
جس زمانے میں کہ ہم تھے منبع جرم و عصات
جن دنوں میں ہم کیا کرتے تھے رشتے ٹوٹکے
سیتلا کی تھی پرستش ایک معمولی سی بات
جن دنوں ہم میں تمیز خانہ داری کچھ نہ تھا
دور اندیشی و ہمدردی نہ تھیں ہم میں صفات
بات کرنے کا سلیقہ جن دنوں ہم میں نہ تھا
اتباعِ شوہری پر جب نہ تھا کچھ التفات
جس زمانے میں کہ ہم سہتے تھے سوروجور و ستم
آئے دن ہوتی تھیں جب ہم بیکسوں پر ملامات
راشد الخیری تری آئی حمیت جوش میں
تیری آنکھوں سے نہ دیکھا جا سکا حالِ بنات
کی حمایت اور ہدایت طرزِ خوش اسلوب سے
اپنی تصنیفات سے تو نے دیا آبِ حیات
تو نے دل میں ٹھان لی ہم غمزدوں کی رہبری
تو نے دکھلائی سمجھ لی فرض ہم کو راہِ راست
کل تلک جن کو نہ تھی کچھ بات کرنے کی تمیز
آج ہے ان لڑکیوں کی گفتگو مثلِ نبات
ٹوٹی پھوٹی دو سطر لکھنا جنہیں آتا نہ تھا
آج ہیں وہ صاحبِ تصنیف نو مسلمات
واعظہ ہیں تیری تصنیفات پڑھنے والیاں
ناصحہ ہیں تیری تصنیفات کی کل ناظرات
ناشرہ ہیں شاعرہ ہیں فاضلہ ہیں عالمہ
فیضِ راشد سے کری ہے جن کی تکمیلِ صفات
مخزن و عصمت تمدن کے ذریعے سے مدام
تو نے اصلاحِ معیشت کے وہ سکھلائے نکات
مرد جو ظالم تھے اکثر ہو گئے وہ مہرباں
راستی پہ آ گئیں کج خلق تھیں جو بیگمات

زہرہ اختر بیگم انوری ———— فروری ۱۹۳۱ء

آفریں تجھ پر ہے راشد مرحبا اے رازدار
درد تیرے دل میں اٹھا دیکھ کر حالِ بنات
جو ہمارا درد تھا وہ اپنے سر پر لے لیا
طرزِ بہر لطف سے تو نے بتلائے سب نکات
اپنی تصنیفات میں لکھی ہدایت اس طرح
جس کے پڑھنے سے نصیحت سیکھیں سب منظرات
اس نصیحت کو تری پورے چمن کہئے تو سچ
اس تیرے مضمون کو دُرِ عدن کہئے تو بات
تیری تصنیفات نے گرویدہ سب کو کر لیا
لفظ ہر اک ہے ہمارے واسطے مثلِ نبات
تیری تصنیفات کا شہرہ ہوا ہے دور دور
شوق کی نظروں سے ان کو دیکھتی ہیں بیگمات
رات دن بہبودیٔ نسواں میں گذری ہے تیری
شکریہ کرتی ہیں تیرا ہند کی سب مسلمات

تو نے اے راشد رکھی ہے اس وطن کی آبرو
ورنہ ضائع ہو رہی تھی اس چمن کی آبرو

سلمیٰ خاتون ——————— ۱۹۲۱ء

علامہ کی تصانیف نے بگڑے ہوئے گھر بنا دیے ہیں
(حقیقت)

"مولانا مرحوم لاجواب خوبیوں کے انسان تھے۔ میری مرحومہ بیوی تراب النساء بیگم بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ ہمارے گھر کی ناچاقیاں مولانا کے مضامین سے دور ہوئیں۔"

مرزا حسین علی بیگ حیدرآباد دکن ——————— عصمت مارچ ۱۹۳۶ء

"میری زندگی میں کئی مرتبہ قدم ڈگمگا گئے اور اس وقت علامہ مرحوم کی کسی نہ کسی تصنیف کے کسی حصہ یا عصمت میں ان کے کسی مضمون کو ذہن نے پیش کر دیا۔ اور میں سنبھل سنبھل گئی۔"

بیگم تاج لیلین علی حیدرآباد دکن

مصنفہ سفر آسٹریلیا ——————— عصمت ۵۰ سالہ جوبلی نمبر

"شکیلہ نے کہا باجی تمہیں یاد ہوگا تم نے مجھے عصمت کا وہ پرچہ دیا تھا جس میں مولانا راشد الخیری صاحب نے عورتوں کو مشورے دئے تھے۔ تم اسے افسانہ کہو یا حقیقت لیکن یہ ہے سولہ آنے سچ کہ میں نے مولانا کے مضامین پر عمل کیا اور اس عمل نے میرے گھر میں جادو کا کام کیا۔ اور اب میری زندگی خوشیوں بھری زندگی ہے . . . باجی میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی کہ آپ نے مجھے مولانا راشد الخیری کے مضامین اور کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا اور سیدھی راہ پر لگایا۔ یہ کایا پلٹ سب اسی کا نتیجہ ہے۔

میں شکیلہ کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ واقعی مولانا راشد الخیری صاحب کتنے زبردست محسنِ نسواں ہیں نہ جانے کتنی ہزار لڑکیوں کی زندگیاں ان کی تصانیف نے سنوار دیں۔"

محمودہ حق بی اے ——————— عصمت فروری ۱۹۶۴ء

"ایک خاندان میں دو بہنوں کی شادی اپنے حقیقی ماموں کے ہاں ہوئی۔ دونوں بہنوں کو علامہ کی تصانیف سے بہت گہری دلچسپی بلکہ والہانہ اُنس تھا۔ غالباً مرحوم کی تمام تصانیف پڑھ چکی تھیں جن کے چیدہ چیدہ فقرے اور منتخب اشعار ان کی زبان پر تھے۔ بچاریاں نئی دلہنیں تھیں اور دُوسرا شہر ہونے کی وجہ سے اس گھر کے ماحول اور فضا سے ناواقف لہٰذا اپنی عادت کے موافق یہ شعر گنگناتی رہیں ؎

ماموں کی الفت ٹھیک ہے۔ ماما مانی نیک ہیں
سُسرال میکے سے بھلی اور گھر بھی دونوں ایک ہیں
ہے لاکھ رستہ خوش نُما منزل و لیکن ہے کڑی
اس دل سے پُوچھو درد یہ، جس پر کہ ہو آکر پڑی
پالا ہے ایسوں سے پڑا، تعلیم سے جو دُور ہیں
تہذیب سے ناآشنا۔ نخوت میں چکنا چور ہیں

ساس اور اکلوتی نند نے جب ان کے مُنہ سے بار بار یہ اشعار سُنے تو کہنے لگیں "تمہیں اس کے سوا کوئی دوسری چیز آتی ہی نہیں یا دانستہ ہمیں جلانے کے لئے ایسا کہا جاتا ہے ہم لوگ جاہل تھے تو اپنے لئے کوئی تعلیم یافتہ گھرانا تلاش کرنا تھا۔" اُنھوں نے سمجھایا یہ تو ایک مشہور مصنف کے اشعار ہیں۔ لیکن وہ کہتی تھیں یہ تم خود بنا کر لائی ہو۔ . . . . . دراصل ان کے گھر کا خاکہ ہو بہو وہی تھا جو علامہ مرحوم نے اس نظم میں واقعے سے پندرہ سال پہلے پیش کر دیا تھا۔ . . . . . لڑکیاں سمجھدار تھیں اور کیوں نہ ہوتیں علامہ مرحوم کی نصیحتوں کو گرہ میں

مانہ لیا تھا۔

یہ شب کے ہیں گندن بنی
دُکھ سہہ کے راحت پائی ہے
آفت سے راحت ہے ملی
ذلت سے عزت پائی ہے

رفکیور نے ساس اور شوہر کی ایسی خدمت کی کہ ان کے دل سے وہ خیالات دُور ہوگئے۔

ہیں چند دن کی سختیاں تھوڑی سی ملا مار ہے
ہے رام کرنا ایک کا بس بیڑہ بیڑا پار ہے

اس شعر کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ واقعی کچھ وقت بعد ساس نند کا رنگ بھی بدل گیا اور وہ ان پر مہربان ہوگئیں اور شوہر کا تو کہنا ہی کیا کہ وہ "رام" ہو چکا تھا۔

زینب گلشن مروی

انگرول کا ٹھیاواڑ ——— عصمت فروری ۱۹۵۱ء

"آج میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ میرا اخلاق اور کردار سُدھارنے میں علامہ مرحوم کی تصانیف کا بہت بڑا حصہ ہے"

م۔ن صدیقی ——— عصمت فروری ۱۹۵۴ء

"میں خلوص نیت کے ساتھ اعتراف کرتی ہوں کہ میری آزاد طبیعت اکثر اوقات مولانا مرحوم کی انتہائی مذہبیت سے اُکتا جاتی ...... مگر وہ میری طرح ناتجربہ کار نوعمر تو تھے نہیں وہ زمانہ کے نبض شناس تھے ......

میری ایک عزیز دوست نے جو مجھ سے کئی سال بڑی تھیں مجھے لکھا کہ "میری ازدواجی زندگی ان دنوں بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ ساس نندوں سے اختلاف کا خطرناک نتیجہ برآمد ہوا اور شوہر صاحب ..... کئی کئی روز گذر جاتے ہیں مجھ سے بات تک نہیں کرتے میں اکیلی پڑی اپنی قسمت کو رویا کرتی ہوں۔ گھر میں سب آدمی مجھے تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ خدارا کوئی صورت نکالو۔ بہتر ہوگا کہ ایک خط ان کو لکھ کر مجھ سے صفائی کرا دو۔ ..... اگر کوئی انسدادی تدبیر نہ کی گئی تو وہ دن دُور نہیں جب میں ہمیشہ کے لئے میکے جا پڑوں" خط پڑھنے کے بعد میں متفکر ہوگئی۔ رازداری کی سخت تاکید تھی ...... سوچتے سوچتے بہترین طریقہ یہی نظر آیا کہ شب زندگی شام زندگی ان کو بھجوا دوں ...... کتابیں بھیج دیں اور تیسرے مہینے ان کا خط آیا۔ بہت خوش۔ میری بڑی مدّاح لکھا تھا "ان کتابوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے ایک بہترین راستہ اپنے لئے منتخب کر لیا۔ اور اس شمع ہدایت کی رہبری نے میرے ظلمات کو پھر منور کر دیا ہے۔ میں نے اپنے تمام معاملات درست کر لئے ہیں۔ ساری گتھیاں سلجھ گئی ہیں۔ اور آج فخریہ میں تم کو لکھ رہی ہوں کہ اب میں پھر وہی ہوں جس پر وہ ناز کیا کرتے تھے۔ میں نے اپنی غلطیاں خود پکڑ لیں۔ اور اپنا چور آپ گرفتار کر لیا۔ تمہاری احسان مند ہوں اور اُن کتابوں کے مصنف کے لئے ہمیشہ دُعا گو رہوں گی کہ خدا ان پر رحمت نازل کرے"

انیس فاطمہ بنت بھوق مرحوم

مصنفہ چار رُخ ——— بنات ستمبر ۱۹۳۶ء

"علامہ مرحوم کی ساری کتابیں ہماری زندگی بنانے والی ہیں۔ مگر شام زندگی کے مطالعے نے تو میری کایا پلٹ دی ...... وہی لڑکی شام زندگی پڑھ کر دوسری نسیمہ بن گئی ..... میری بہن بات سے خوش ہوتے۔ اور آپس میں باتیں ہوتیں کہ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ یہ ایسی بدل جائے گی۔ انہیں یہ پتہ نہ تھا یہ "شام زندگی" کا اعجاز تھا"

مسز الطاف حسین ——— عصمت اپریل ۱۹۶۳ء

اہل قلم کی نظر میں

" مولانا راشد الخیری کی تحریک نسواں کا یہ امتیازی وصف تھا کہ وہ حقوق نسواں کے سب سے بڑے حامی ہونے کے ساتھ شریعت اسلامی کے حدود کا پاس نگاہ میں رکھتے تھے۔ اور حقوق نسواں کے حامیوں کے اس گروہ کے سب سے بڑے مخالف تھے جو عورتوں کو مغرب کی کورانہ تقلید کی طرف لے جانے والا ہے"

سید سلیمان ندوی ——— معارف اعظم گڈھ ۱۹۳۶ء

" صبح زندگی۔ شام زندگی۔ شب زندگی کا وجود جب تک اُردو میں ہے کوئی ان کے مصنف کے نام کو کیسے بھول سکتا ہے۔ ان سطور کے راقم نے اپنے ابتدائی دور میں جن اہل قلم کے مضامین و تصانیف سے اُردو سیکھی ان میں ایک مرحوم بھی تھے"

" وہ عورت کا حقیقی غم خوار تھا۔ ہر عورت کو بہترین بیٹی۔ بہترین بہن۔ بہترین بیوی۔ بہترین ماں دیکھنے کا آرزومند تھا ...... اس نے تبلیغ شرافت کی کی۔ حیا و عصمت کی کی۔ مشرقیت کی کی۔ حوا کی بیٹیوں کو وہ عائشہ و فاطمہ کی خوش نصیب کنیزیں بنانا چاہتا تھا۔ مس سینگر اور ڈاکٹر میری اسٹوپس کی غلامی کی طرف لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مسلمان عورت بنانا چاہا۔ جنت کی حور بنانا چاہا۔ راجہ اندر کے اکھاڑے کی پری نہیں۔ بندہ اپنی بندگی آدا کر کے مالک سے جا ملا۔ عجب نہیں کہ فرشتوں کی زبان پر یہ معروضہ آگیا ہو اے حمد سے بے نیاز تیرے اس بندہ کے اُٹھ آنے کے بعد اب کون افسانہ کی میٹھی میٹھی زبان میں تیرا نام اور تیرے احکام سُنا سُنا کر رلائے گا دلوں کو تڑپائے گا گرمائے گا"

عبد الماجد دریابادی ——— صدق لکھنو

" مولانا کی شخصیت ایسا ترشا ہوا الماس ہے جس کے کئی پہلو ہیں۔ اور الماس کو جس پہلو سے بھی دیکھو اس کی تابانی اور درخشانی نظر کو لُبھاتی ہے۔ اُنہوں نے اپنی تمام عمر طبقۂ نسواں کی حمایت میں بسر کردی لیکن طبقۂ نسواں کی حمایت" سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے کہ وہ آجکل کے حامیان نسواں کی طرح بے پردگی آزادی۔ آزاد روی اور بے حیائی کے حامی تھے۔ اور ان کا مقصد یہ تھا کہ عورتیں جو کچھ بھی کریں اس کی ہر حال میں تائید کی جائے۔ بلکہ اُنہوں نے حمایت نسواں کے ساتھ ہی ساتھ تربیت نسواں کا کام بھی جاری رکھا۔ ان کا عقیدہ راسخ یہ تھا کہ مسلمان عورت کو سب سے پہلے مسلمان بننا چاہیئے۔ کیونکہ اسلام نے جو حقوق مسلمان عورت کو دئے ہیں ان کی مستحق عورت اس حالت میں ہوسکتی ہے کہ وہ فرائض ادا کرے جو مسلمان عورت کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ کیونکہ حقوق و فرائض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دین محض فرائض عائد نہیں کرتا یا محض حقوق ہی نہیں دیتا بلکہ حقوق کو فرائض سے مشروط قرار دیتا ہے"

عبد المجید سالک ——— اخبار چٹان لاہور ۱۹۵۱ء

" علامہ راشد الخیری بیسویں صدی کے مصلح اعظم تھے مسلمان عورت خاوند کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی ایک طرف تو عورت کو آزادی کا درس دیا جس میں خاوند کی رضامندی اور خوشنودی لازم و ملزوم ٹھیرائی دوسری طرف مرد کو حقوق نسواں کا پاس دلا کر مرعوب کیا...... موجودہ لڑکیاں مغربی تہذیب کے جس مخرب اخلاق عنصر کی دلدادہ ہیں اور جس سے ہماری پرانی اسلامی روایات متزلزل ہیں اس کے خلاف علامہ مرحوم تمام عمر برسر پیکار رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی طریقہ تعلیم نسواں کی خامیوں کا احساس ہونے لگا...... علامہ مرحوم نے عورت کو عورت بن کر دیکھا۔ اور قلم کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں عورتوں کے دلوں میں اترے ان کو عورت کے

مختلف اوراقِ زندگی کا علم تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم نے کبھی لغزش نہ کی وہ جو کچھ لکھتے تھے حقیقت پر مبنی تھا ... مولوی اصلاح و بہبودی کو دوسرے الفاظ میں عورت کی اصلاح و بہبودی ہے۔ علامہ مرحوم نہ صرف طبقۂ نسواں کے مصلح اعظم تھے بلکہ دائرہ ذکور بھی بڑی حد تک علامہ مرحوم کا گرویدۂ احسان ہے۔ ... اس جنیعالم نے عورت کی سوشل زندگی کو مذہب کے ایسے قالب میں ڈھالا ہے کہ عورت کا ہر فعل عبادت کے رتبہ پر پہنچتا ہے"

احسان اللہ خاں لودھی ایم اے ایل ایل بی ———— عصمت جولائی [illegible]

"ملک کے کسی اہلِ قلم نے صنفِ نازک کی اصلاح کی اتنی سعی نہیں کی جتنی مولانا مرحوم نے تا عمر جاری رکھی ... مولانا نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے کیرکٹر بہت نمایاں رکھے ہیں۔ اچھے اور برے دونوں طرح کے کیرکٹر پیش کر کے یہ واضح کیا ہے کہ مسلمان عورتیں پہلے کس درجہ ترقی یافتہ اور محاسن ذاتی سے متصف تھیں اور اب ان کی حالت کتنی خراب ہو گئی ہے۔ اور جہالت اور تنگ نظری نے انہیں کس پستی میں پہنچا دیا ہے"

پروفیسر علی عباس حسینی ———— عصمت راشد الخیری نمبر

"ان کی عورت ہندوستانی (پاکستان اور بھارت کی) عورت ہے جس کی پامالی، کس مپرسی اور زبوں حالی پر وہ خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اُن کی تحریر کے ایک ایک لفظ میں ہمدردی کا رنگ اس قدر رچا ہوا ہے کہ پہلی ہی نظر میں ساری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور چونکہ ہندوستانی عورت کی زندگی کا پس منظر بہت ہی دردناک غم انگیز ہے اس لئے زندگی کے نشیب و فراز بیان کرتے وقت ان کا انداز بہت ہی زیادہ دردناک اور الم انگیز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قریب قریب ان کے تمام ناولوں میں رنج و الم کا عنصر غالب ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں ہندوستانی عورت کی زخمی جذبات و احساسات کی بھی جھلک آنسوؤں اور کراہوں کی تصویر کھینچی ہے ان کا مجموعی تاثر اگرچہ پڑھنے والے کو رنجیدہ [illegible] ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں ہمدردی کے جذبے کا ایک سیلاب اُمنڈنے لگتا ہے۔ عورتوں پر ایسی ایسی بپتائیں پڑتی ہیں کہ جن کو سُن کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ لیکن وہ ان سب کو نہایت [illegible] پیشانی سے برداشت کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ بہادر ہیں۔ ان میں ہمت ہے۔ استقلال ہے وہ گھبراتی نہیں بلکہ حوادث کے طوفان کا مقابلہ کرتی ہیں ...... وہ عورتوں کو پست حالت میں پیش کرتے ہیں تو ان کے عیوب ایک ایک کر کے گناتے ہیں صرف اس خیال کے پیش نظر کہ اس کا اثر پڑھنے والوں پر زیادہ گہرا اور زیادہ دیرپا ہو لیکن ساتھ ہی ... ایک ایسا کردار بھی پیش کر دیتے ہیں جس کی حیثیت آئیڈیل کی ہوتی ہے۔ وہ سب اچھی باتیں کرتا ہے۔ دو مختلف کرداروں کا مقابلہ اس چیز کو خاص طور پر واضح کر دیتا ہے جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ یعنی اصلاح کا پیغام۔ ہنر بتلانے کی ایک صورت ترقی کرنے کا ایک لائحہ عمل ان کی پیش کی ہوئی عورت باحیا ہوتی ہے۔ وہ حسن و عشق کی محفلیں منعقد نہیں کرتے ان کے نزدیک عورت کو محبت کرنی چاہیئے لیکن وہ محبت صرف شوہر ہی سے ہو سکتی ہے۔ اور وقت پڑنے پر اس کو شوہر کا سب سے بڑا سہارا ثابت ہونا چاہیئے ... لیکن عورت کو یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ مرد کو خوش رکھنا اس کا سب سے بڑا فریضہ ہے"

ڈاکٹر عبادت بریلوی ———— عصمت فروری [illegible]

"مولانا کی خدمات اصلاح نسواں کے باب میں اتنی متنوع اس قدر ہمہ گیر اور اس درجہ وسیع ہیں کہ ان پر نقد و تبصرہ تو

بڑی چیز ہے۔ معمولی اعتراف کے لئے بھی مستقل تصنیف کی ضرورت ہے"

مولانا نیاز فتح پوری ——— عصمت فروری ۱۹۳۹ء

"ان کرداروں کو ایک جگہ جمع کرکے انہوں نے ہماری زندگی کے بعض ایسے مسائل پیش کردئے ہیں جن پر اُن سے پہلے غور نہیں کیا گیا تھا۔ کسی فن کار میں یہ حوصلہ تھا کہ سماج کی اس دُکھتی ہوئی رگ پر نشتر رکھ سکے۔ علامہ راشد الخیری کا نشتر کسی قسم کی رو رعایت کا قائل نہیں ہے اُن کی تشخیص ہمیشہ صحیح ہوتی ہے ان کا نشتر اپنے فرض سے بخوبی آشنا ہے وہ فاسد مادے کو نہایت ہوشیاری سے باہر نکالتے ہیں خاوند اور بیوی کے تعلقات دو شادیوں کے نتائج ساس اور بہو کی رقیبانہ چشمک امیری اور افلاس کا فرق اور تصادم بیوگی کے لئے بے آب و رنگ اور پرانے مصائب صبح و شام یہ ہماری روزانہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں سبھی مگر ان کا افراد اور معاشرے کی ذہنیت پر جو اثر ہوتا ہے اتنا گہرا اور دائمی ہوتا ہے کہ اس سے ملک و قوم کا مستقبل متاثر ہوتا ہے۔

علامہ راشد الخیری کی جس خوبی نے مجھے سب سے زیادہ زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ وہ خوش گوار ازدواجی زندگی کے پیغمبر تھے۔ اس حیثیت سے مردوں پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے ان کی تحریروں کا اثر بہت وسیع اور گہرا ہوا انہوں نے ہزارہا خاندانوں کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا اور مردوں میں اعتدال و انصاف کے جذبے کو پکارا ان کی تعلیم یک طرفہ نہیں تھی۔ اس معاملے میں اُن کے یہاں نہایت توازن ملتا ہے۔ انہوں نے عورتوں میں بھی سلیقہ رکھ رکھاؤ اور شوہر پرستی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ جاہل اور بد زبان عورتوں کی انہوں نے کھُل کر مذمت کی ہے ...... اُردو کے ناولوں اور افسانوں میں عورت کا جو صالح تصوّر میں نے راشد الخیری کے یہاں پایا وہ مشکل ہی سے کسی مصنف کے یہاں نظر آیا۔ راشد الخیری عورت کو جن صفات سے متصف دیکھنا چاہتے ہیں اُن کا فقدان ہی ہر کہانی کے المیہ کی بنیاد ملتا ہے۔ انہوں نے ازدواجی زندگی کو بہت اونچی سطح پر لے جانا چاہا ہے۔ انہوں نے فریق ثانی کے جذبات کا احترام کرنا سکھایا ہے۔ اُن کی کہانی کی عورت پر نہ جنس سوار ہے اور نہ سیاست۔ عورت کے لئے تو ان کی گھریلو زندگی کے معاملہ اور باہمی تعلقات ہی سب کچھ ہیں اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو راشد الخیری نے جس عورت کے چہرے سے نقاب اُٹھائی ہے وہی در اصل ہمارے معاشرے کی صحیح نمائندہ ہے ...... معاشرے پر ان کے جو احسانات ہیں اُن کا اعتراف ادبی نقاد ہی نہیں بلکہ ہر ایمان دار آدمی کا فرض ہے"

مسلم معاشرہ پر مصور غم کا احسان

از شجاع احمد خاں ——— امروز کراچی ۲ فروری ۱۹۵۳ء

"مولانا کی کثیر التعداد تصانیف سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی تمام زندگی صنف کمزور کی حمایت و وکالت میں بسر ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آنے والی نسلیں ہمیشہ مولانا کو ممنونیت اور افتخار کے ساتھ یاد کریں گی کہ انہوں نے عورت کو وہی درجہ دلانے کی لگاتار کوششیں کیں جو اسے اسلام نے عطا کیا تھا۔ مولانا تقریباً پچاس سال تک مسلمان عورتوں کے حقوق کے لئے لڑتے رہے۔ ان کی تمام کتابیں صرف ایک مقصد کی حامل ہیں یعنی صنف نازک کو قعر مذلت سے نکال کر بام ترقی پر لے جانا"

ضیاء الدین احمد برنی

انگریزی سے ترجمہ ——— بمبئی کرانیکل

"عورت کی آزادی کی ہمارے ملک میں کئی راہیں ہیں بالکل مشرقی بالکل مغربی اور مشرقی مغربی کے درمیان۔ علامہ نے

...میں علامہ کی یاد باقی رہے گی... علامہ راشد الخیری
...ت ادب کی مملکتوں میں ایک غیر معمولی شخصیت رہیں گے
...عظیم ساجی مصلح کی حیثیت سے بھی زندہ رہیں گے"
...یزی روزنامہ خیبر میل پشاور
...مقالہ خصوصی سے ——— ۴ فروری ۵۱ء

" علامہ راشد الخیری اس صدی کی عورتوں کی جدوجہد کے
...یم محرک تھے وہ خواتین کے مکتی داتا تھے ... عورتوں کو
...اوت پر اکسانے کا ان پر الزام رکھا گیا تھا مگر وہ مذہب پرست
...یب تھے۔ انہوں نے عورتوں کو بغاوت پر آمادہ نہیں کیا
...ن کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کو ان کے حق ملیں۔ انہوں نے
...عورتوں کو فرماں بردار بیٹی اور خدمت گذار بیوی ہونے کی تعلیم دی"
...ڈان گجراتی ترجمہ زینت خاطر ——— ۳ فروری ۵۲ء

" شاید ہی کوئی لکھا پڑھا گھرانا ہوگا جہاں مولانا کی
کتابیں نہ ہوں۔ پاکستان میں ان کتابوں کی زیادہ ضرورت
ہے کیونکہ آزادی کے بعد حالات اس امر کے متقاضی ہیں
کہ ہمارا مستقبل ان اصولوں پر تعمیر ہو جن کی تبلیغ مولانا
راشد الخیری فرماتے رہے"
نسیم اختر ——— آفاق لاہور ۴ فروری ۵۱ء

چاہتی ہو گر کہ پیدا تم میں ہو شانِ تمیز
نثر دیکھو راشد الخیری کی اور نظمِ عزیز
عزیز لکھنوی ——— عصمت ۱۰ء

جہاں میں زندہ رہنے کا عجیب گر سکھا دیا
ذرا ذرا سی لڑکیوں کو آدمی بنا دیا
ڈاکٹر سعید بریلوی ——— عصمت فروری ۳۸ء

سکھایا عالمِ نسواں کو اس نے باہنر ہونا
ترقی۔ تربیت۔ علم اور فن سے بہرہ ور ہونا
دلوں کو مرنے والے کے یہ احسان یاد آتے ہیں
آختر تہرانی ——— عصمت فروری ۳۹ء

یہ وہی تھا فیض سے جس کے دیارِ ہند میں
صنفِ نازک اب نہیں پہلی جہالت کا شکار
خانہ داری کے اصولوں سے کیا واقف انہیں
جا کے تا سسرال میں ہونے نہ پائیں شرمسار
اک نہ اک اصلاح رہتی تھی اسے مدِ نظر
اس کی ہر تصنیف ہے اس بات کی آئینہ دار
ابو الاعجاز ازل ——— عصمت فروری ۳۹ء

چپہ چپہ پر بپا اصلاح کا اک شور تھا
کیا تاثر تھا تیری تحریر میں کیا زور تھا
نہال سیوہاروی ——— عصمت فروری ۴۱ء

الغرض تو بے غرض بے لاگ خدمت گر رہا
لاکھوں اُجڑے گھر بسائے۔ لاکھوں دل میں گھر کیا
توڑے ہیں بند غلامی تیری تحریکات نے
گُر بینپنے کے سکھائے تیری تصنیفات نے
تیری دلسوزی کا نسوانی ادب ممنون ہے
جس کی رگ رگ میں رواں تیرے جگر کا خون ہے
بشیر النسا بیگم حیدرآبادی ——— عصمت فروری ۴۳ء

مصلح بنے طبقۂ نسواں کے حضرت راشد اگر جو یہاں
تعلیم کی ہر سو صدا پھیلی ضیا۔ کچھ جہل کا باقی رہا نہ نشاں
عورت کے ساتھ انصاف کیا۔ مرد و زن کا دل صاف کیا
ہم بے کس ہستیوں پر آکر۔ راشد نے بڑا الطاف کیا
ڈاکٹر قیصر صدیقی ——— فروری ۴۷ء

طبقۂ مظلوم کی کشتی کے مخلص ناخدا
اے کہ تو ہمدرد بھی تھا اور حقیقی رہنما
بات سمجھائی ہے تو نے دلنشیں انداز سے
کر دیا واقف ہمیں نیکی بدی کے راز سے
مسز الطاف حسین ——— فروری ۵۲ء

راہ تعمیر و ترقی کی دکھائی جس نے
قسمت طبقۂ مظلوم بنائی جس نے
پھر وہ اصلاح کا اک عزم جواں یاد آیا

آغا صادق ———— عصمت فروری

طبقۂ نسواں کو پستی سے ابھارا آپ نے
صنف نازک کو اندھیرے سے نکالا آپ نے

[illegible] ڈاکٹر ———— عصمت فروری

ادب کا درس مسلمان عورتوں کو دیا
یہ کام کر گئے علامہ راشد الخیری

اسد ملتانی ———— عصمت فروری

ترے تیر کی گو کڑی ہیں کمانیں
بڑی دل نشیں ہیں مگر داستانیں
ترے غیر فانی ادب نے عطا کی
خواتین کو لذتِ خود شناسی
ہر اک لفظ تیرا متاعِ ادب ہے
ابھی تجھ کو دنیا نے پرکھا ہی کب ہے

ادیب سہارنپوری ———— عصمت جوبلی نمبر

کسی طرح بھی نہ گھٹتی مصیبتِ نسواں
کسی طرح بھی نہ مٹتی نحوستِ نسواں
بدلتے لاکھ - بدلتی نہ حالتِ نسواں
کبھی بھی بھرتا نہ زخمِ جہالتِ نسواں
نہ ملتا گر اسے مرہم مصورِ غم کا

آزل لاہوری ———— عصمت جولائی

وہ عورتوں کا مددگار ہے وہ دار اٹھا
وہ بے کسوں کا خبردار جاں نثار اٹھا
شبانہ روز وہ تھا اور خدمتِ نسواں
پناہ بخش و نگہبانِ عصمتِ نسواں

احسن مارہروی ———— عصمت مارچ

جناب راشد الخیری کے دم سے
غم ملت دلوں کا ترجماں تھا
زبان و دل جہاں بھی تھے ہم آہنگ
اسی کا رنگ زیبِ داستاں تھا
گھروں میں مسجدوں میں مکتبوں میں
دعا گو اس کا ہر پیر و جواں تھا

حفیظ جالندھری ———— عصمت فروری

وہ کہ اس دھن میں رہا تا مرگ پابندِ فغاں
ہند میں پیدا ہوں کچھ مائیں - اچھی بیٹیاں
وہ کہ جس نے خار و خس کو رشکِ سنبل کر دیا
ہاں اسی سنبل کو بادِ مرگ نے گل کر دیا

جوش ملیح آبادی ———— عصمت جولائی

جس کا زورِ قلم چارۂ رنج و غم
جس کی تحریر، تدبیرِ دفعِ بلا
جس کی ہر بات ہر دل میں گھر کر گئی
جس کا ہر لفظ، اک ناوک بے خطا

حفیظ ہوشیارپوری ———— عصمت فروری

لہو روتا رہا وہ عورتوں کے خوابِ غفلت پر
عیاں کرتا رہا داغِ جگر صفحاتِ عصمت پر
بسر کی خدمتِ نسواں میں ساری زندگی اپنی
زبانِ خامہ سے آنسو بہائے اُن کی حالت پر
کوئی افسانہ ہو - اصلاح سے خالی نہیں اس کا
تھی کچھ اتنی محیط اصلاحِ نسواں اس کی فطرت پر
خواتین اپنا خضر و مرشد و رہبر کہیں اس کو
تعجب کیا نہیں موقع کہ پیغمبر کہیں اس کو

اختر شیرانی ———— عصمت فروری

۳-مزار
گرانڈ ٹرنک روڈ
دلی دروازہ
آصف علی روڈ
ارون ہسپتال
کوٹلہ فیروز شاہ
مزار علامہ راشد الخیری

۵۔ علامہ راشد الخیری

رازق صاحب

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ میرا سب سے رفیق بچہ کون ہے؟" شادی کے چند ماہ بعد ایک روز میرے شسر نے مجھ سے پوچھا۔ پینے نظریں اُوپر کیں وہ مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ "آپ بتایئے" تو گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل پینے دل میں سوچ کر خود سوال کرلیا۔

"رازق!" اُن کی آواز میں بڑا اعتماد اور چہرہ پر چمک تھی۔

آج اتنے سال گذرنے کے بعد باپ کو یاد کرکے رازق صاحب ایسے ہی آبدیدہ ہو جاتے ہیں جیسے کل کی بات ہو۔ اُن کی آواز میں رقت اور چہرہ پر اُداسی چھا جاتی ہے۔ ان کو اپنے والد علامہ راشد الخیری سے محبت نہیں عشق تھا۔ اور باپ بھی بیٹے کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔ باپ کی علالت کا طویل زمانہ رازق صاحب نے جس کرب و اضطراب سے گذارا وہ دیکھا نہ جا تا تھا۔ گھر کا ہر فرد کچھ دیر کے لئے کر سیدھی کر لیتا مگر وہ ہردم کمر بستہ دل شکستہ۔ آنسو آتے تو برابر کے کمرے میں جا کر پونچھ لیتے۔ اور پھر جی ابا جان حاضر ہوا" دل کڑا کرکے والہانہ اور وارفتہ باپ کی پائنتی کھڑے ہو جاتے۔

ابا جان علامہ راشد الخیری بار بار فرماتے "رازق کو کیا ہوا ہے رازق کیا کرے گا"

اگر رازق صاحب کے دل میں باپ کی لگن اور ٹیک نہ ہوتی تو کون جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا۔ رازق صاحب نے ہوش سنبھالتے ہی باپ کی ایک ایک سطر کو سینے سے لگا اور سر پر رکھا۔ اگر اس کا نام تنگ نظری ہو سکتا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ رازق صاحب نے اس منفعت کے دور میں بھی علامہ راشد الخیری کی تمام تصانیف اور ان کے رسائل کو جاری رکھ کر ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اُنھوں نے اپنے باپ کی روایت کو قائم رکھا۔ ان کے خیالات کو مشعل راہ بنایا اور ان کے مقاصد پر مرد آہن کی طرح جمے رہے۔ اُن کا دل مصفّیٰ ہے اُن کا ضمیر روشن ہے۔ اور ابا جان کی سوانح حیات خدا کے فضل و کرم سے تیار اور مکمل ہے۔ اس عمر میں دس دس بارہ بارہ گھنٹے تنہا کام کرنا آسان نہیں ہے مگر جب دل کو لگن ہوتی ہے جب محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ جب حُسن کی بارگاہ میں عشق سربسجود ہوتا ہے تو زندگی پکار پکار کر کہتی ہے مجھے یہیں کھو جانے دو۔ مجھے یہیں رہ جانے دو مجھے اُس کی تلاش ہے مجھے ڈھونڈ لینے دو مجھے پا جانے دو۔ اور پھر انسان کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کی اُسے تلاش ہوتی ہے۔

علامہ راشد الخیری کی سوانح حیات کے متعلق اتنا کہوں گی اُردو میں ایسی جامع اور مکمل سوانح حیات ملنی مشکل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے خاندانی حالات اُس زمانے کی تہذیب تمدن اور معاشرت کو خوبصورتی سے اُجاگر کرتے ہیں۔ رواداری۔ ایثار قربانی انسانی ہمدردی کی بے شمار مثالیں سامنے آتی ہیں جو اپنی نوعیت سے اہم اور غیر فانی ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک کی اُنگلی میں پھانس چبھتی تو سارا کنبہ جُڑ جاتا۔ اور ایک فرد واحد کی نالائقی سارے خاندان کی نظر میں نالائقی

تحریر کی مالک تھیں۔ مگر افسوس بستر سے [illegible] نہیں کر سکتی ہیں
ہمارے سر پر [illegible]۔ اس میں شک نہیں
کہ اس زمانے میں رسوخ بہت بڑی چیز ہے۔ مگر کسی کی قدر
کرنے کے لئے کسی کو رستہ نہیں دکھاتا۔ انسان کی عزت اس کا
کردار [illegible]۔

چند روز ہوئے ایک دن [illegible]
کشتیاں کے بازار میں خرید و فروخت کے لئے نکلی [illegible]
دس گیارہ سال کا بچہ ماں کے ساتھ پٹری پر جا رہا تھا
یکایک وہ اٹھ کر رکا اور اس نے پاؤں تلے پڑے
ہوئے کاغذ کو اٹھا کر چوما اور آنکھوں سے لگا کر کہا۔
" امی دیکھیے جناب راشد الخیری کا نام کسی نے
نیچے ڈال دیا کتنے برے لوگ ہیں ان کو گناہ ہوگا"
اس نے بچے کو چمکارا اور وہ پرچہ لے کر اپنے پرس
میں ڈال لیا۔ گویا بچے کے کان علامہ راشد الخیری کی
عظمت اور خوبیوں سے اتنے بہرہ ور تھے کہ اس نے
زمین پر پڑے ہوئے کاغذ پر نام دیکھ کر عقیدت اور
محبت سے چوم کر آنکھوں سے لگایا۔

ایک صاحب جو کراچی میں ایک بڑے عہدے
پر مامور ہیں۔ ذکر کرتے تھے کہ کراچی کی کسی سڑک پر موٹے
سے عصمت لکھا ہوا ہے۔ مگر سڑک پر سے گزرتے
وقت مجھ کو رسالہ عصمت کا خیال آجاتا ہے اس لئے
میں ڈگمگا کر نکل جاتا ہوں پاؤں نہیں رکھتا۔ ان باتوں سے
پتہ چلتا ہے کہ چٹانیں اپنی جگہ موجود رہتی ہیں۔ کوڑا کرکٹ
ہر جگہ اڑتا ہے اور فضا کو آلودہ کرتا ہے۔

آج جب رازق صاحب ابا جان کی سوانح حیات
ختم کر رہے ہیں میرے کانوں میں بار بار وہ الفاظ گونج
رہے ہیں جو باپ نے بیٹے کے لئے کہے تھے۔

رازق صاحب ابا جان کی [illegible] کے متعلق لکھتے
ہوئے اُمور [illegible]
ہوئے نہیں بلکہ اسلام کے [illegible]
خداوند تعالیٰ [illegible]
سلامت رکھے۔ آمین

آمنہ نازلی

ستمبر کا پرچہ

اگست میں خریدار رسالہ کا انتظار نہ کریں کیونکہ
یہ سالگرہ نمبر جولائی اگست کا مشترکہ پرچہ ہے۔
اس کے بعد اب ۳۰ اگست کو ستمبر کا پرچہ شائع ہوگا
اور پاکستان کے تمام خریداروں کو ستمبر کی شروع تاریخوں
میں پہنچے گا۔ انشاء اللہ

منیجر